اچھا لگتا ہے

انجم انصار

☆ رخسانہ احمد، کراچی۔ اس ناول کو پڑھ کر بہت سی باتوں کی سمجھ آئی۔ ایسے ناول لڑکیوں کو ضرور پڑھنے چاہئیں۔

☆ صالحہ بانو، پنجاب۔ انجم باجی! اب آپ اس جیسا ناول کب لکھیں گی۔ نگین کا کردار اے وَن کردار ہے۔

☆ مسز ظہیر، کراچی۔ ناول پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک اچھی معلم بھی ہیں۔ بات کہنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔

☆ فیروزہ بیگم، کراچی۔ اس ناول کو پڑھ کر بہت سی لڑکیاں ضرور سنور جائیں گی اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔

☆ رضوانہ پرنس، لندن۔ انجم! ہمیں آپ کا اندازِ تحریر بہت پسند ہے۔ ہماری تو آپ اُستاد ہیں۔ اگر آپ کے مشورے نہ ہوتے تو میری دو کتابیں اتنی جلدی شائع نہ ہو پاتیں۔

قارئین کرام!

یہ چند آرائیں جو میں نے شامل کی ہیں۔ آپ کو میرا ناول پڑھ کر کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے لئے میں واقعی منتظر رہوں گی۔ آپ پبلشر کی معرفت مجھے خط بھی لکھ سکتے ہیں یا مجھے اس نمبر پر فون بھی کر سکتے ہیں: 0345-3289656۔ اور اب اجازت دیجئے اس دُعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہمیشہ خوش وخرم، صحت منداور کامیاب وکامران رکھے۔ آمین ثم آمین۔

دُعا گو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

اچھا لگتا ہے

''اللہ......آج بھی تم جاؤ گی؟'' نگین نے حیرت سے فریال کو دیکھا' جو کالج سے چھٹی کے بعد گھر جانے کے بجائے اپنی خالہ کے گھر جا رہی تھی۔

''ہاں' میری خالہ بہت بیمار ہیں۔ یہی تو وقت ہوتا ہے میرے پاس۔ کالج سے واپسی پر خالہ کے کچھ کام کاج نمٹاتی ہوئی چلی جاتی ہوں۔''

''اب مجھے اکیلے گھر جانا پڑے گا'' نگین نے پریشان آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا کروں میں؟ مجبوری ہے میری۔ میری خالہ کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں مگر ان کے سسرال والے اتنے برے ہیں کہ وہ بے چاریاں جلدی جلدی ان کو دیکھنے بھی نہیں آ سکتیں۔''

''تمہاری خالہ تو تمہارے روزانہ جانے سے بے حد خوش ہو جاتی ہوں گی؟''

''ہاں بہت خوش، مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق سی آ جاتی ہے۔ وہ اپنی ساری بیماری بھول جاتی ہیں۔''

فریال نہ جانے کب تک اپنی خالہ کی بیماری کا نقشہ کھینچتی۔ ایک دن نگین کالج جانے کے بجائے اپنی کزنز کے ساتھ آئس کریم پالر گئی تو وقت وہی چھٹی کے بعد کا تھا اور فریال کسی اسمارٹ سے لڑکے کے ساتھ بیٹھی باتیں بنا رہی تھی۔

فریال نے نگین کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ آئس کریم کھاتے ہوئے کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

نگین دانستہ اس کی ٹیبل کے سامنے سے کھنکھار کر گزری تو فریال کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''سنو' کل تمہاری بیمار خالہ تو خوب ہٹی کٹی سی نظر آئیں'' اگلے دن وہ اس کی کھنچائی کر رہی تھی۔

''میں عدیل کے بارے میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی۔''

''مگر بتانا ضروری تو نہیں سمجھا' وہ تو میں نے خود ہی دیکھ لیا ورنہ تمہاری خالہ کی بیماری نہ جانے کتنا طول کھینچتی۔''

''یار، ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو انٹرنیٹ کے توسط سے دوستی ہوئی ہے' ملاقات ہوئی تو اچھا لگا' عدیل بہت ڈیسنٹ سا بندہ ہے اور مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔''

''اچھا......! چند دنوں میں پیار بھی ہو گیا۔ وعدے وعید بھی ہو گئے ہوں گے' یہ تو بڑی فلمی سی سچویشن ہے'' وہ ہنستی چلی گئی۔

''ہاں' وہ کہتا ہے کہ میں اس کی آئیڈیل ہوں۔''

''اور وہ تمہارا آئیڈیل ہوگا...... ہے ناں؟''

''ہاں' وہ ہے ہی بہت اچھا، اتنا اچھا کہ اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

"اس کا اندازہ تمہیں کیسے ہوا؟"

"وہ کہتا ہے، تعلیم مکمل کر کے وہ جلد اچھی سی جاب ڈھونڈے گا اور اس کے بعد مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے جائے گا۔ وہ میری دگرگوں حالت سے بے حد پریشان رہتا ہے۔ اور تم تو جانتی ہی ہو میرے گھر کے حالات...... سگے اور سوتیلے رشتوں کی وجہ سے گھر میں ہر وقت کی تو تکار رہتی ہے۔ ذرا جو سکون ہو گھر میں۔ جب سے ابا جی کا انتقال ہوا ہے، یہ رسا کشی مزید تیز ہو گئی ہے۔ دونوں بھابیوں کا بس نہیں چلتا ورنہ اماں کے ساتھ ساتھ مجھے اور باجی کو گھر سے نکال پھینکیں۔"

"کیا واقعی......!" یہ سب سن کر نگین کی آنکھیں حیرت سے پھیل رہی تھیں۔

"وہ تو شکر ہے اللہ کا، جس فلیٹ میں ہم رہتے ہیں، وہ ابا جی نے اماں کے نام کر دیا تھا ورنہ ہم تو اپنے گھر سے بھی بے دخل کر دیے جاتے۔"

"بھائی تو تمہارے اچھے ہیں، وہ تو تمہیں کچھ نہیں کہتے......"

"اچھے ہیں نہیں، تھے...... جب تک ابا جی زندہ رہے، دونوں بھائی ہم پر چیخ کر نہیں آتے تھے۔ اب تو جان عذاب کر رکھی ہے ہم بہنوں کی۔ باجی کے اگر سسرال والے لالچی ہیں اور انہیں گھر بٹھا دیا ہے تو اس میں باجی کا کیا قصور ہے مگر انہیں ہر زیادتی ہماری باجی کی نظر آتی ہے۔

باجی نے بتایا کہ ان کے سسرال والے کہتے ہیں کہ گھر سے اے سی مانگ کر لاؤ، کپڑے دھونے کی مشین لاؤ۔ (سسرال لالچی جو ہے) اس پر ہمارے بھائیوں نے کہا، تم نے اپنے شوہر سے یہ فرمائش کی ہوگی نا کہ اے سی لگواؤ، کپڑے دھونے کی مشین خرید کر دو۔ جب ہی تو ان کی ہمت ہوئی، اگر تم خاموشی سے عزت کے ساتھ رہتیں تو ان کی یہ مجال کیوں ہوتی مگر تم کیسے رہ سکتی تھیں......

باجی نے کہا کہ ان کے میاں نے ان کو مارا ہے تو بڑی بھابی بولیں۔ "جو عورتیں اپنے میاں کے ساتھ زبان چلاتی ہیں وہ ہمیشہ پٹا کرتی ہیں۔ چھوٹی بھابی کا کہنا یہ تھا کہ تم دنیا کی پہلی عورت تھوڑی ہو جو اپنے شوہر سے پٹی ہو، شادی کے بعد اکثر بیویاں اپنے شوہروں سے پٹا کرتی ہیں۔ یہ تو کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے کہ تم شکایت کر رہی ہو۔

باجی خود گھر آ کر نہیں بیٹھی ہیں، ان کے سسرال والوں نے بٹھایا ہے مگر اس سلسلے میں امی پر بھی طعنے پڑتے ہیں کہ بیٹیوں کی تربیت انہوں نے اچھی نہیں کی، اگر وہ خاندان والوں سے ہی اچھے تعلقات رکھتیں تو باجی کا رشتہ باہر کیوں ہوتا اور میرے لیے بھی لوگ اپنی جوتیاں رگڑ دیتے۔ امی نے چونکہ کسی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اس لیے یہ سب انہیں دیکھنا پڑ رہا ہے۔ کنواری کے لیے آج تک کوئی رشتہ نہیں آیا اور جو بیٹی بیاہی تھی، وہ بھی گھر آ کے بیٹھ گئی ہے۔

یقین کرو نگین، باجی تو بہت فون کرتی ہیں دولہا بھائی کو مگر وہ انہیں لینے ہی نہیں آتے ہیں۔ کئی دفعہ تو وعدہ بھی کیا مگر پھر اپنی بات سے مکر گئے۔ واقعی، ہم دونوں بہنوں کی قسمت ہی خراب ہے۔"

"کہیں اسی وجہ سے تو نہیں تم نے عدیل سے دوستی کی ہے؟"

"نہیں یار، کہیں پلاننگ کر کے بھی پیار ہوا ہے۔ وہ تو سیدھا سادا سا بندہ ہے، جو میری ہر بات رغبت سے سنتا ہے۔ میری پریشانیوں سے پریشان ہو جاتا ہے اور مجھے خوش دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دکھنے لگتی ہے۔ اگر عدیل نہ ہوتا تو میں بھی ہر وقت اپنی سائرہ باجی کی طرح ڈری ڈری اور سہمی سی رہتی۔ نہ جانے یہ بھابیاں

اپنی نندوں کو نوکرانیاں کیوں سمجھتی ہیں۔ باجی جب اپنے اسکول کی جاب سے گھر پہنچتی ہیں تو جا کر دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہیں اور وہ دونوں نواب زادیاں سوائے باتیں بنانے اور آرام کرنے کے کچھ نہیں کرتیں۔ میری تو بس یہی دعا ہے کہ عدیل کو کہیں اچھی سی جاب مل جائے اور میری پریشانی کی زندگی ختم ہو، جہاں میری ہر ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے۔ ہنسی کیوں، روئی کیوں، اچھے کپڑے کیوں پہنے، بالوں میں نیا کلپ کیوں لگایا، نئی چپل کہاں سے آئی؟ پرانی چپل کس کو دی اس طرح کی باتیں تنگ ہوتی ہیں۔ میرے گھر کیسی کیسی نیچ باتیں ہوتی ہیں، میں کسی کو بتا نہیں سکتی۔"

"مگر تم تو کہتی تھیں بی اے کے بعد ماسٹر کرو گی اور اس کے بعد کسی کالج میں لیکچرر شپ اور مستقبل کے تمام پلان کہاں گئے سب تمہارے؟"

"عدیل کو میرا جاب کرنا ہی پسند نہیں ہے تو پھر کیوں کروں میں وقت ضائع اپنے گھر میں بیٹھ کر ہر وقت کے طعنے تشنے کھانے سے کہیں یہ بہتر نہیں ہے کہ اپنے محبوب شوہر کے محبت بھرے ڈائیلاگ سنوں۔ نوکری چاکری کرتی ہوئی عورت مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ گو میں آج کی لڑکی ہوں مگر مجھے عورت کا وہی انداز اچھا لگتا ہے کہ میں گھر رہوں اور میرا میاں اپنی سب کمائی لا کر میری جھولی میں ڈال کر کہے، سنبھالو اپنے پیسے اور جو دل چاہے کرو، جہاں دل چاہے خرچ کرو۔"

"کیا وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے؟"

"ارے اس کی باتیں سنو گی تو مجھ پر رشک کرو گی کہ اللہ تعالیٰ نے کیسا چاہنے والا بندہ مجھے دیا ہے۔ روزانہ ایک غزل لکھتا ہے وہ مجھ پر، کبھی میرے بالوں پر، کبھی میری آنکھوں پر، کبھی میرے چہرے پر۔ میرے پاس تو اس کی پوری بیاض جمع ہو گئی ہے۔ اور میری آواز تو اسے اتنی پسند ہے، کہتا ہے...... فری، تم بولتی رہا کرو۔ میں سنتا رہوں گا اور جب میں چپ ہوتی ہوں تو اسے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ وہ کہتا ہے میری آواز میں جھرنوں کا سا ترنم ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر، میری باتیں سن کر طمانیت حاصل کرتا ہے۔"

"لگتا ہے بڑے نمبری قسم کے مجنوں ہیں تمہارے عدیل صاحب۔ ایسی باتیں تو میں نے صرف فلموں میں ہی سنی ہیں، حقیقت میں تو ایسا کسی کو نہیں دیکھا۔"

"اللہ ایسا پیار کرنے والا بندہ تجھے بھی دے۔ جب کسی سے محبت کرے گی۔ تب ہی تو تجھے پتا چلے گا کہ خوشی کیا ہے، مسرت کسے کہتے ہیں، طمانیت کیا ہوتی ہے؟ اور اپنا جان جاناں اور اس کی چاہت کا احساس ہوا، پانی سے بھی زیادہ ضروری لگتا ہے۔"

"فریال! لگتا ہے اس سمیسٹر میں تو تم گئیں۔ اس سے ملنے کے بعد بھی اس کی باتیں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہیں۔"

"فیل تو شاید میں پہلے ہو جاتی، عدیل سے ملنے سے قبل زندگی بے آب و گیاہ سی تھی، اب تو میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوں گی۔ واقعی یہ احساس تو اس سے مل کر ہوا ہے کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے"

"لگتا ہے ابھی اور ترقی کرو گی...... ڈائیلاگ اچھے یاد ہو رہے ہیں۔"

"نگین، تجھے ملواؤں میں عدیل سے......؟"

"نہیں بھئی، مجھے کوئی شوق نہیں ہے ملنے ولنے کا۔ یوں بھی کباب میں ہڈی بننے کا فائدہ!"

"تمہاری مرضی ورنہ اس سے ملتیں تو میری پسند کو یقیناً سراہتیں۔" فریال کا لہجہ فخریہ تھا۔

''داد تو میں تم دونوں کو ہی دے رہی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے اپنے گھر کی جانب مڑ گئی۔ کالج سے ان کے گھر کا راستہ کوئی بہت زیادہ دور نہیں تھا۔

اب نگین دانیا کے ساتھ گھر جانے لگی تھی۔

''یہ فریال نے تمہارے ساتھ جانا کیوں چھوڑ دیا، تم لوگ تو ایک ہی بلاک سے آتی ہو؟'' دانیا کو تشویش تھی۔

''وہ واپسی پر اپنی خالہ کے گھر جاتی ہے' اس کی خالہ ان دنوں شدید بیمار ہیں۔'' اس نے فریال کا پردہ رکھا۔

☆☆☆

سیاہ مرسیڈیز سڑک پر ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ نگین گاڑی چلانا سیکھ رہی تھی۔

اور وہ اس کے برابر بیٹھا ہوا' اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اسٹیئرنگ کو بیلنس کر رہا تھا۔ اس کا وجود اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کے جسم اور کپڑوں سے اٹھنے والی مہک وہ محسوس کر رہی تھی۔

برابر سے کوئی دہاڑتا ہوا ٹرک گزرا تو وہ اس کے مزید قریب ہو گیا۔ اب اس کا دایاں بازو اس کے شانوں پر سے ہوتا ہوا اسٹیئرنگ تک پہنچ رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی اس کے بالوں کو چھو رہی تھی۔

اور یوں اس کا جگمگاتا سا وجود اس کے پہلو میں سمٹ آیا تھا۔

نگین نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے بال' اس کے چہرے پر اڑ رہے تھے۔

''سنیئے...... گیئر میں تبدیل کرتا رہوں گا۔''

''تو میں کیا کروں گی؟ گاڑی تو پھر آپ ہی چلا رہے ہیں' مجھے چلانے دیں ناں۔''

''گاڑی تو تم ہی چلا رہی ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تم ہو' میں تو نہیں ہوں۔ ہاں...... اپنے ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھو' اس کو بیلنس کرنا سیکھ جاؤ گی تو گاڑی چلانا کون سا مشکل کام ہے۔''

''مگر میں کب تک سیکھوں گی؟''

''یہ تو تم پر منحصر ہے...... نگین! دو دن میں بھی سیکھ سکتی ہو' دو ہفتے میں بھی...... اور ایک مہینے میں بھی نہیں۔'' اپنا جملہ مکمل کر کے اب وہ دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''مگر تمہاری ہمراہی میں مجھ سے کچھ سیکھا ہی نہیں جاتا۔''

''بھئی مجھے دوش مت دو۔''

''تمہیں کیوں نہیں' سارا قصور تو تمہارا ہی ہے۔''

''میرا قصور......؟''

''ہاں' سو فیصد تمہارا قصور۔ ایسی گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہو' میں گڑبڑا سی جاتی ہوں۔''

''تھینکس گاڈ! میں سمجھا کہ ابھی تم یہ کہنے والی ہو کہ میں ایک نالائق ڈرائیور بھی ہوں۔''

''میں چاہتی ہوں کہ بس جلدی سے ڈرائیونگ سیکھ لوں تاکہ سب کو حیران کر دوں۔''

''حیران کر دینے والی تو تمہاری شخصیت ہے ہی'' وہ ہنسا۔

''خواہ مخواہ میں ہی ''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' اب وہ جھک کر اس کے کان میں نہ جانے کون سا فسوں پھونک رہا تھا۔

''اچھا! کیا آپ ڈرائیونگ کے بعد مجھے فلائنگ بھی سکھائیں گے؟''

''کیوں نہیں' یہی تو میری خواہش ہے۔''

''آپ نے فلائنگ بھی سیکھی ہے؟''

''میں کچھ عرصے کمرشل پائلٹ رہا ہوں۔''

''بادلوں کے سنگ اڑتے ہوئے کیسا اچھا لگتا ہوگا!''

''پہلے کا تو پتا نہیں' ہاں تمہارے ساتھ ضرور اچھا لگے گا'' وہ مسکرایا۔ اس کا ملائم محبت بھرا لہجہ کس قدر مقناطیسی تھا۔ وہ ایک ٹک اسے ہی دیکھے چلی گئی۔ اس کی گہری اور قدرے بھاری آواز کا زیروبم کس قدر دلکش ہے' اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے آتی گاڑی کو دیکھ کر وہ بدحواس سی ہوئی تو اس نے برق رفتاری سے اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ کر گاڑی کو سائڈ میں لے لیا۔

مگر ایک دم طوفان سا آ گیا۔ پہلے پہل تو وہ یہی سمجھی کہ شاید ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔

''توبہ ہے...... چوتھی دفعہ آئی ہوں تجھے جگانے' ایسے گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔ بھابی جان' فہد اور سیمی کے ساتھ کب سے آئی بیٹھی ہیں۔'' امی نے اس کے پہلو میں رکھا ہوا تکیہ اس کے منہ پر دے مارا تھا اور پانی کے گلاس سے چھینٹے الگ پھینکے تھے۔

اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کنوارپنے کا خواب از خود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

''آپ کو پتا ہے کہ میں گہری نیند سے اچانک اٹھوں تو سر میں درد ہو جاتا ہے۔''

اپنے خواب سے جدائی کتنی تکلیف دہ تھی۔

''آپ باجی سے کہہ دیتیں' وہ بنا دیتیں چائے۔ ایسے کون سے لاٹ صاحب آ گئے تھے جو سارے گھر کی حاضری ضروری تھی۔'' (بقیہ جملے وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی)

''فہمی نماز پڑھ رہی ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ پڑھتی پڑھاتی بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ جائیں مہمانوں کے پاس، میں چائے بناتی ہوں' ابو سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں؟''

''اونہہ...... تمہارے باوا ضرور بازار جائیں گے۔ ان کے خاندان کا کوئی آ جاتا تو پھرکی بن جاتے' اس وقت ٹی وی پر روئی کے بھاؤ ایسی دلچسپی سے سن رہے ہیں کہ اس سے نمٹ کر فوراً روئی لینے جائیں گے۔ میں فروٹ چاٹ بنا چکی ہوں، مٹر تل لیے ہیں۔ تم بس دہی پھلکی بنا کر لپالپ کباب تل کر لے آؤ۔''

''اف! چائے کے ساتھ دس قسم کے لوازمات۔ آپ انہیں کھانے پر ہی روک لیتیں تو اس دردسری سے تو نجات ملتی'' اس نے اکتا کر کہا۔

''دردسری کیسی' میرے میکے والے آئے ہیں۔'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''آپ نے خواہ مخواہ چائے کا جھنجٹ کیا' انہیں کھانا کھلا دیتیں'' وہ اپنی بیزاری چھپا کر بولی۔

''کھانا بھی وہ کھا کر جائیں گے۔ کہہ دیا ہے میں نے ان سے کہ جانے نہیں دوں گی۔ اتنے عرصے بعد تو میرا بھتیجا' بھتیجی آئے ہیں۔'' (امی کی خوشی دیدنی تھی)

چائے بناتے ہوئے اس کا ذہن پھر اسی خواب میں جا الجھا' اسی طرح کے خواب وہ دو مہینے سے تواتر سے دیکھ رہی تھی۔ ہر خواب میں مقام دوسرا ہوتا مگر وہ بندہ ایک ہی تھا۔ سحر انگیز شخصیت' جذباتی' بھاری سی آواز والا...... اس پر ہر ہر لمحہ نثار ہونے والا۔

یقیناً گھر میں کیبل لگنے کے اثرات ہیں یہ۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ ٹی وی کے ہر بہار چینل پر اسی طرح کے تو ڈرامے آتے ہیں۔ ہیرو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیے اپنی ہیروئن سے سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے

ہیں...... لاحول ولاقوۃ! اس نے خود پر نفرین بھیجی۔

اور جب وہ تھوڑی دیر بعد ٹرالی دھکیلتی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو فہد اپنے پھپھو رے سے قصے سنا رہا تھا۔

وہ شام کو شائع ہونے والے کسی اخبار سے منسلک تھا۔ اس حوالے سے اس کے پاس چٹپٹی خبروں کا خاصا مواد ہوا کرتا تھا جنہیں امی بڑے ذوق شوق سے سنا کرتی تھیں۔

”پھوپی جان! جب وہ لڑکی اپنا افسانہ میرے پاس لے کر آئی تو میں نے اس کا لباس دیکھ کر ہی کہہ دیا کہ ناقابل اشاعت ہے مگر جب میں نے افسانہ پڑھا تو پھوپو جانی' میں آپ کو بتا نہیں سکتا' ایسے دھانسو افسانے تو اپنے چچا غالب بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔“

”درست فرمایا آپ نے' غالب شاعر تھے' افسانہ نگار نہیں“ تگین نے جملہ کسا۔

”اور جس ماڈل گرل کے کیٹ واک کی تصاویر میں نے اپنے شوبز کے صفحات پر لگائیں تو وہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ کسی فیشن شو کی تصاویر نہیں تھیں' وہ تو اس کے بھائی کی مہندی کے فنکشن کی تھیں۔ مجھے اس قدر ہنسی آئی کہ بتا نہیں سکتا۔“

”فہد بھائی! آپ اپنی بے وقوفی کی حرکتوں پر ہنستے کیوں ہیں' رو دیا کریں۔ پھر آپ کو ہنسی نہیں آئے گی۔“ وہ بالکل دھیمے لہجے میں بولی تھی' اسے چائے کا کپ دیتے ہوئے اس کا یہ جملہ کسی نے بھی نہیں سنا تھا۔

”تگین! شکر اور دینا، تم نے تو بالکل پھیکی ہی چائے پکڑا دی۔“ ممانی نے اسے آواز دی تو وہ ان کے پاس ہی جا بیٹھی۔

ممانی جان کو شوگر تھی اور وہ اپنے کپ میں چار چمچے چینی کے ڈال کر شاداں سی چائے کے سپ لے رہی تھیں۔

فہد پھر کسی بات پر ہنسا۔ اس نے غور سے دیکھا' اس کا تھل تھل کرتا وجود ہنسنے کے بعد بھی ہل رہا تھا۔ موٹاپے کے ساتھ ساتھ وہ کوتاہ قد بھی تھا۔ ہنستا تھا تو اس کی آنکھیں بند سی ہو جاتی تھیں۔ لش لش چمکتے جوتوں کے ساتھ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔

سیاہ مرسیڈیز اگر فہد چلائے تو اس کے پیر تو بریک تک بھی نہ پہنچیں۔ یکبارگی اس کے ذہن میں کوندا سا چمکا تو لبوں پر مسکراہٹ کی کلیاں از خود کھلنے سی لگیں۔

”تگین! تمہارا دل کسی کے گھر آنے کو نہیں چاہتا؟“ فہد پوچھ رہا تھا۔

”بالکل بھی نہیں، مجھے اپنے گھر میں رہنا اچھا لگتا ہے۔“

”مگر فہمی باجی کو تو لے کر نکلا کرو' جب سے ان کی منگنی ٹوٹی ہے' وہ زیادہ ہی گھر گھسنی ہو گئی ہیں۔ وہ باہر نکلیں گی تو ان کی طبیعت بھی بہلے گی۔“ وہ رسان سے سمجھا رہا تھا۔

”فہمی باجی تو شروع سے ہی آنے جانے کی چور ہیں۔“

”اور تم شاید ڈاکو!“ وہ اس کی بات کا جواب دے کر خود ہی ہنسنے لگا جیسے کوئی نیا نکورا سا لطیفہ سنا دیا ہو۔

”لگتا ہے' اخبار میں ہنسنے کی نوکری ملی ہے تمہیں...... تھکے ہارے کالم نگاروں اور نامہ نگاروں کو تم پرانے پرانے لطائف سنا کر انہیں ہنساتے رہو۔“

”روؤں گا تو میں اس وقت جب تم میرے پلے باندھ دی جاؤ گی“ اس نے بھی ہنستے ہوئے بدلہ لے لیا۔

”مسئنے' ایسی خوش فہمیاں پالیں' جنہیں پال پوس سکیں۔“ وہ دہی پھلکیاں دیتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

”کیوں' اب خوابوں کو بھی برڈ فلو ہو گیا ہے کیا؟“ وہ بلاوجہ' بلاجواز ہنستا چلا جا رہا تھا' جیسے برا ماننا تو اس نے سیکھا ہی نہ ہو۔

اور ادھر خواب کا سرا آتے ہی کالی مرسیڈیز پھر تیزی سے در آئی تھی۔ امرت ٹپکاتا لہجہ اس کے کانوں میں رس سا گھول رہا تھا۔ اور وہ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔

فہمی اندر داخل ہوئی تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میری بیٹی میرے پاس بیٹھے گی“ ممانی جان نے اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے کہا۔

مگر فہمی باجی ان کے مد مقابل صوفے پر بیٹھ گئیں۔ چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ ان کی رنگت تگین کے مقابلے میں پہلے ہی کم تھی مگر اب مزید کم ہو گئی تھی۔ براؤن کاٹن کے سوٹ میں وہ گہری سانولی سی نظر آ رہی تھیں۔

”امی! میں بریانی کے ساتھ قورمہ بناؤں یا کڑھائی گوشت؟“ وہ نماز سے فارغ ہو کر پوچھنے کے لیے آئی تھیں۔

”فہد سے پوچھ لو' جو اس کو اچھا لگے وہی پکا لو“ امی نے کہا۔

فہمی نے نظر اٹھا کر فہد کو دیکھا۔

”ہماری باجی کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ ہے۔ کچھ بھی بنا لیں' خوب کھاؤں گا۔“

”وہ تو اندازہ ہے کہ تمہاری خوراک کتنی ہے“ تگین آہستگی سے بولی تھی مگر فہمی گفتگو میں مزید حصہ لیے بغیر باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ مہمانوں کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔

”یہ اپنی فہمی کم گو تو پہلے ہی تھی' اب تو اسے بالکل ہی چپ سی لگ گئی ہے“ ممانی جان کہہ رہی تھیں۔

”حساس بھی تو بہت ہے“ امی نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

”اب مت کرنا کہیں اس کی منگنی' ڈائریکٹ شادی کرنا۔ یہ منگنی کا جھمیلا تو بہت برا ہوتا ہے۔“

”نہیں بھابی! کوئی رسم بری نہیں ہوتی' بس لوگ اسے برا بنا دیتے ہیں۔ اپنے خاندان میں آخر لوگوں کی منگنیاں ہوتی ہی ہیں۔ ہمیں کہاں اندازہ تھا کہ وہ لوگ اتنے برے ہوں گے کہ ان کا کھیل ہی منگنی کرنا تھا کہ دوسری اچھی لگی تو پہلی کو چھوڑ دیا اور تیسری اچھی لگی تو دوسری کو چھوڑ دیا۔“

”مجھے کسی نے بتایا ہے...... ہے ایک اچھا لڑکا۔ میں فون کر کے پوچھوں گی، اگر اچھے لوگ لگے تو لے کر آؤں گی میں اپنی فہمی کے لیے۔“ اب ممانی جان رازداری سے کہہ رہی تھیں۔

”پہلے تم اپنے طور پر فہمی کی تصویر دکھا دینا، اگر انہیں تصویر پسند آ جائے تو پھر لے کر آنا۔“

”وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر جس دن میں لوگوں کو لے کر آؤں' تم تگین کو سامنے نہ آنے دینا۔ آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بڑی بیٹھی رہ جاتی ہیں اور چھوٹیوں کی ہو جاتی ہے۔“

”اچھی بات ہے“ امی بھی ان سرگوشیوں کا جواب دھیمی آواز میں دے رہی تھیں۔

مگر تگین کے کانوں میں ہر جملہ پڑ رہا تھا۔

اور فہد سب کچھ سنتے ہوئے بھی' اپنے آپ کو لاتعلق سا پوز کر رہا تھا' جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔

”تگین باجی! آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتی ہیں؟“ سمی اس سے شکایت کر رہی تھی۔

”ان دنوں تو امتحان کا بھوت سوار ہے، اس سے چھٹکارا پا لوں تو کسی دن آؤں گی۔“

”میں نے تو سنا ہے آج کل لڑکیاں بھی خوب نقل کرتی ہیں' پھر امتحانوں سے کیا ڈرنا“ فہد کہہ رہا تھا۔

“ہاں کرتی تو ہیں مگر سب میں یہ ہمت نہیں ہوتی” وہ مسکرائی۔

“اچھا...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری کزن صاحبہ خاصی بزدل ہیں۔ حد ہو گئی بھئی...... تم نقل تک نہیں کرسکتیں...... چچ...... چچ!”

“ہاں‘ اس سلسلے میں تو کہہ سکتے ہو‘ نہ پسٹل میرے پاس ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا سامان۔”

“پھر تو پاس کروانے کے لیے پھوپا جان کو کسی سے کہنا پڑتا ہوگا۔ بھائی! دو ہزار فی پیپر کے لے کر ہماری بچی کو پاس کرادو۔ انگریزی کے پانچ ہزار لے لیتا مگر پوری کاپی خود حل کر کے رکھنی ہوگی۔ سوائے رول نمبر لکھنے کے کچھ نہیں لکھا ہوگا۔ چینی جاپانی کی طرح ہماری بچی انگریزی بھی نہیں جانتی” اس نے مذاق اڑایا۔

“نہیں‘ پاس تو میں خود ہو جاتی ہوں۔”

“ارے...... کیا واقعی! ارے واہ!”

“ہاں‘ امتحانی کاپی پر ایک غم زدہ سا خط لکھ آتی ہوں جو ممتحن کا دل پاس کر دینے کی حد تک چیر دیتا ہے۔”

“ارے واہ! اچھے ہتھکنڈے اپنائے ہوئے ہیں” اب اس کا لہجہ تمسخر بھرا ہو گیا تھا۔

“جنگ اور امتحان میں ہر چیز جائز ہے” وہ ہنسی۔

“محبت بھول گئیں تم......؟”

“جسے میں بھول ہی گئی تو اس کا کیا ذکر۔ ہاں اگر تمہارے اخبار میں کوئی مسائل و مشورے کا کالم ہو تو مجھے دلوادو۔ میں لوگوں کو ایسے ایسے نئے نکورے‘ سچے اور کھرے مشورے دوں گی کہ لوگوں کا بھی بڑا بھلا ہوگا۔”

“وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر میری اخبار سے چھٹی ہو سکتی ہے۔ ایسے سچ کو معاشرے کا بگاڑ کہا جاتا ہے۔”

“یہی تو مصیبت ہے کہ جھوٹی باتوں کو جھوٹی خبروں کو انتہائی ایمانداری سے سچ ثابت کیا جاتا ہے۔” وہ فہد سے بڑی دلچسپی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

رات گئے وہ جاتے ہوئے نگین کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

“فرصت کہاں ملتی ہے فہد بھائی! کالج سے آ کر اتنا پڑھنا ہوتا ہے کہ ان دنوں تو میں گھر کے کام بھی نہیں کر رہی مگر پھر بھی میرے سارے اسائنمنٹ ادھورے پڑے ہوئے ہیں۔”

“کالج سے آ کر یہ سونا بناتی ہے۔ سونے کی بے حد شوقین ہے اور جب شام کو اٹھتی ہے تو مجال ہے کہ کہیں جانے کا نام لے۔ فہمی کا تو نام بدنام ہے کہ وہ کہیں آتی جاتی نہیں ہے مگر اس سے کہو تو فوراً صفاچٹ منع کر دیتی ہے۔” امی سب کے سامنے اس کی شکایتیں کر رہی تھیں۔

تب سونے کے ذکر پر اس کے ذہن میں وہی خواب گھوم سا گیا جو اسے نہ جانے کہاں تک لے گیا تھا۔

“آپ لوگ کیسے آئے؟ کیا فہد بھائی نے گاڑی لے لی ہے۔”

خواب کی وہ کالی مرسیڈیز ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔

“ابھی کیسے لے سکتا ہے گاڑی یہ...... نئی نئی نوکری ہے، تنخواہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ ابھی تو اوور ٹائم کا بھی کچھ نہیں مل رہا۔ ہم تو ٹیکسی سے آئے ہیں” ممانی جان کہہ رہی تھیں۔

“ارے گاڑی کون سی بڑی چیز ہے۔ وہ بھی آجائے گی” امی کی نظریں فہد بھائی کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔

☆☆☆

“کیا بات ہے ہیروئن صاحبہ! کیا آج خالہ کے ہاں ہلے کرنے نہیں جا رہیں؟” چھٹی کے بعد فریال اس کے ساتھ ساتھ پیدل گھر کی جانب چلی تو نگین نے پوچھا۔

“آج عدیل کی بائیک ان کے بہنوئی لے گئے ہیں۔”

“اوہ‘ یہ بات ہے‘ آج آپ کی چھٹی ہے؟” نگین نے چھیڑا۔

“کہہ رہے تھے وہ کہ بائیک آ گئی تو آ جاؤں گا۔” فریال نے بتایا۔

“اس کا مطلب ہے کہ ابھی بھی موصوف کے آنے کی امید ہے؟”

“نہیں‘ آنا ہوتا تو اب تک آ جاتے‘ اب تو دیر ہو گئی ہے۔”

“اب کچھ پڑھ وڑھ بھی لو۔ فیل ہو گی تو خواہ مخواہ تمہارے گھر میں ٹینشن بڑھے گی۔”

“فیل تو نہیں ہوں گی‘ تیاری میں کر رہی ہوں۔”

وہ دونوں امتحانوں اور نوٹس کی باتیں کرتے ہوئے جا رہی تھیں کہ وائٹ ہنڈا اکارڈ کے بریک ان کے بہت قریب چرچرائے۔

نگین اچھل کے پیچھے ہٹی۔

فریال نے مڑ کر دیکھا تو قوس قزح سی اس کے چہرے پر چھا گئی۔

“نگین! تم گھر جاؤ‘ میں عدیل کے ساتھ جا رہی ہوں” فریال نے کہا۔

نگین نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا تو فریال اسی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی زن سے اس کے پاس سے گزر گئی۔

“لاحول ولاقوۃ!...... مجھے رکنے یا دیکھنے کی کیا ضرورت تھی” گھر کی جانب جاتے ہوئے وہ خود پر نفرین بھیج رہی تھی۔

سخت گرمی‘ لو کی تیزی نے اس کا برا حشر کر دیا تھا۔ دس منٹ کی مسافت بھی دوبھر ہو گئی تھی۔

گھر پہنچی تو امی‘ ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں اور ابا ہنوز اپنی دکان پر تھے۔ فہمی باجی نے اسے شربت کا گلاس دے کر اپنے کمرے کی راہ لی اور وہ وہیں پنکھے کے نیچے لیٹ گئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے اٹینڈ کرے۔

دس بارہ گھنٹیاں جب تواتر سے بجتی رہیں تو اس نے ریسیور اٹھایا۔ “ہیلو......!” (اس کی آواز میں تھکن نمایاں تھی)

“نگین‘ گھر پہنچ گئیں آپ؟” ایک اجنبی آواز انتہائی اپنائیت لیے ہوئے تھی۔

“جی...... مگر آپ کون؟”

“آپ کا اپنا‘ ویسے میرا نام زیور ہے۔”

“شٹ اپ! اور آئندہ یہاں فون کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا......”

“سخت گرمی اور پھر شاکنگ پنک سوٹ میں تم بیر بہوٹی سی لگ رہی ہو اور اب غصے میں تو نہ جانے کیا حال ہوگا؟”

“کیا...... کیا...... کیا” اس نے ریسیور کو غور سے دیکھنے کے بعد سامنے گھر کی کھڑکی پر نظر ڈالی‘ کہیں کوئی آمنے سامنے کا لڑکا اسے دیکھتے ہوئے تو یہ بکواس نہیں کر رہا؟

مگر کہیں کوئی نہیں تھا اور اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

یہ کون تھا......؟ جسے یہ تک معلوم تھا کہ میں نے شاکنگ پنک سوٹ پہنا ہوا ہے؟ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

”نگین! میرا تو کوئی فون نہیں آیا“ فہمی باجی نہا کر آئیں تو اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”کیا آپ کا کوئی فون آنا تھا؟“ وہ انہیں گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، حمیدہ آنٹی نے کہا تھا کہ وہ میٹرک کی دو لڑکیاں ٹیوشن کے لیے میرے پاس بھیجیں گی۔ پہلے تو میں نے منع کر دیا تھا مگر بعد میں ہامی بھرلی، اسی سلسلے میں شاید کوئی فون آئے۔“

”فون تو آیا تھا مگر اس سلسلے میں نہیں“ نگین نے کہا۔

”اچھا، تو کیا اب ٹیوشن کی لڑکیاں نہیں آ رہیں؟“ فہمی باجی پوچھ رہی تھیں۔

”اوہو...... یہ بات نہیں ہے۔ کسی صاحب کا تھا، ٹی وی، فلم میں چانس نہیں ملا ہوگا اس لیے وہ فون پر ڈائیلاگ سنا رہے تھے۔“ نگین نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا، کسی لفنگے کا تھا، ٹائم پاس کر رہا تھا۔“ فہمی بال سلجھاتے ہوئے بولیں۔

نگین بے ساختہ ہنسی تو ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ نے روشنی سی کر دی۔

☆☆☆

کئی دن سے اسے بخار آ رہا تھا مگر وہ کالج باقاعدگی سے جا رہی تھی۔ آج بخار کی تمازت سے اسے چکر سا آیا تو دو پیریڈ پہلے اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

”فریال! میں گھر جا رہی ہوں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید میں کل کالج بھی نہ آ سکوں۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ مس نگہت کے نوٹس میں بنا لوں گی۔“

”تم چلو گی میرے ساتھ؟“ نگین نے پوچھا۔

”میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں، کالج کے بعد مجھے خالہ کے پاس بھی تو جانا ہوتا ہے ناں“ اس نے شوخی سے کہا۔

”اوہ، میں تو بھول ہی گئی تھی، تمہاری غیر نصابی سرگرمیوں کے متعلق، اچھا میں چلتی ہوں“ اس کے لبوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

کالج سے آ کر وہ بستر پر جیسے ڈھے گئی۔ وائرل انفیکشن تھا۔ بخار بھی خوب تیز چڑھا۔

اگلے دن وہ ہلکا سا ناشتا کر کے دوا کھا کے اپنے بستر پر لیٹی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پھر بجتی چلی گئی۔

اس نے اٹھایا ”السلام علیکم! نگین بول رہی ہوں۔“

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہی اجنبی آواز ماؤتھ پیس پر ابھری۔

”آپ...... ! آپ کون ہیں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔ اس دن کا رانگ نمبر پھر اس کے ذہن میں دستک سی دینے گا۔

”ارے پہچانی نہیں آپ ...... میں زبور بول رہا ہوں۔“

”کیوں کیا ہے فون آپ نے یہاں؟“ وہ غصے سے بولی۔

”نگین! صرف آپ کے لیے۔“

”مگر کیوں؟“

”آپ کی طبیعت خراب ہے ناں؟“

”آپ سے مطلب؟“

”وہ تو بڑا گہرا ہے۔“

”صاف صاف بتائیے، یہاں کیوں فون کر رہے ہیں آپ، مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ اور اگر کوئی الٹی سیدھی غلط فہمی ہوئی ہے تو جان لیجئے، میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ایک عدد بوائے فرینڈ لے کر گھوموں۔ مجھے نفرت ہے ایسی لڑکیوں سے، گھن آتی ہے مجھے ایسی لڑکیوں سے۔ امید ہے کہ اب آپ اپنی قماش کی کوئی لڑکی ڈھونڈ لیں گے اور یہاں فون ہرگز نہیں کریں گے، انڈر اسٹینڈ!“

”نگین! مجھے تمہارے سوا کوئی اچھا ہی نہیں لگتا تو کیا کروں؟ جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، میرا دل میرے قابو میں نہیں رہتا۔“

”آپ نے مجھے کہاں دیکھ لیا؟ میں تو کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہوں۔ لگتا ہے کوئی زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے آپ کو۔ اس شہر میں ہزاروں لڑکیوں کا نام نگین ہوگا۔ یوں کریں، آپ کہیں اور ٹرائی کریں......شاید کوئی ایسے ڈائیلاگ سن کر مسحور ہو جائے مگر میری نظر میں ایسے لڑکے دو کوڑی کے ہوتے ہیں۔ اور آپ کی اوقات دو کوڑی کی ہوگی تو فون کریں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

مگر چند لمحوں بعد ہی ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بج رہی تھی۔ اس نے غصے سے ریسیور اٹھایا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پاگل ہو تم جو یہاں بار بار فون کر رہے ہو۔ مسٹر! اب اگر تم نے یہاں فون کرنے کی جرأت کی تو یاد رکھو، طبیعت صاف کروا دوں گی ہاں۔“

”ارے ارے اتنا غصہ۔“ اتنی دھونس مگر میں نے تو اس سے قبل کوئی فون ہی نہیں کیا“ فہد بولا۔

”اوہ فہد بھائی! آپ...... میں سمجھی نہ جانے کون لفنگا ہے۔“

”آواز سنے بغیر ہی شروع ہو گئیں۔ میں تو ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اور تم نے بے مہار سنا دیں۔ اخبار والوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔“ وہ ہنس رہا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے فہد بھائی! پھر رانگ نمبرز کی بکواس مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے۔“

”جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہوتی ہے، تب کون سا تمہارے لبوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ لگتا ہے ہر وقت انگارے چبائے بیٹھی رہتی ہو۔“ وہ پھر دل جلا دینے والی ہنسی ہنس رہا تھا۔

”او کے، کیوں فون کیا اس وقت؟“ اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

”لو اصل بات تو میں بھول ہی گیا، امی نے کہا ہے کل رات کا کھانا آپ سب لوگ ہمارے ساتھ کھائیں۔ سچی بات بتاؤں، یہ دعوت صرف تمہاری وجہ سے ہے کہ کسی بہانے تو تم ہمارے گھر آؤ۔“

”مگر میری تو طبیعت خراب ہے، بخار آ رہا ہے مجھے۔“

”دعوت ہونے میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ ٹائم ہے۔ بخار اتر جائے گا۔“ وہ پھر ہنسا۔

”آپ امی سے بات کر لیں، وہ تو ضرور جائیں گی۔“

”پھپھو سے تم خود کہہ دینا، میں اس وقت جلدی میں ہوں مگر یاد رہے نگین! تم کل ضرور آ رہی ہو، میں انتظار کروں گا۔“

اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

‘‘کس کا تھا فون؟’’ امی کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے ریسیور کریڈل پر رکھتے دیکھ چکی تھیں۔

‘‘ممانی نے کل رات کی دعوت کی ہے۔’’

‘‘کتنے سارے دن ہو گئے اپنے بھائی کے گھر گئے ہوئے۔’’ وہ سرشاری سی ہو گئیں۔

‘‘مگر میری تو طبیعت خراب ہے‘ میں نہیں جاؤں گی۔’’

‘‘اچھا‘ کل دعوت میں جاتے ہوئے بیماری کا بہانہ ہے مگر پرسوں پیر کو کالج دوڑی چلی جاؤ گی۔’’

‘‘امی‘ یہ آپ کہہ رہی ہیں؟ کیا مجھے بخار نہیں ہے؟’’ وہ استفہامیہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

‘‘بخار تو ہے مگر خدانخواستہ ایسی کیفیت تو نہیں ہے کہ دو گھڑی کے لیے اپنے ماموں کے گھر بھی نہ جا سکو۔’’

‘‘وہاں جا کر مجھے بوریت ہوتی ہے۔ یسمی کی بے سروپا باتیں‘ فہد بھائی کی لن ترانیاں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔’’

‘‘سچی بات یہی ہے کہ تم وہاں جانا نہیں چاہتیں۔ تمہارے باپ کو میرے میکے والوں سے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔ لگتا ہے اپنے باپ کی عادتیں تم میں بھی در آئی ہیں۔’’

‘‘آپ فہمی باجی کو لے جائیں ناں اپنے ساتھ؟’’

‘‘وہ تو اب کہیں نہیں جاتی‘ بابا تمہارے جائیں گے نہیں‘ اب تم نے بھی انکار کر دیا ہے۔’’

‘‘اچھا ہے ناں‘ میری وجہ سے فہمی باجی کو کمپنی رہے گی ورنہ کل اتوار کا دن وہ خواہ مخواہ بور ہوتیں۔’’ اس نے بہانہ گھڑا۔

‘‘کوئی نہ جائے‘ اب مجھے کسی کی پروا نہیں رہی ہے۔ ہاں‘ میں ضرور جاؤں گی‘ میرا بھائی بلائے اور میں منع کر دوں‘ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔’’ وہ غصے سے اس کے کمرے سے نکل گئیں۔

اور پریشان ہو کر اس نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ امی کے غصے سے وہ ہمیشہ گھبرا جاتی تھی۔

ان کی حکم عدولی اسے پسند نہیں تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ فہد کے گھر جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ جب بھی وہ گئی بور ہو کر آئی، اسی لیے آج اس نے دل کڑا کر کے صاف منع کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ فارم ہاؤس کا ایک ویران سا کونا تھا‘ جہاں ایک چھوٹی سی چوکی پر وہ ہاتھوں کا حلقہ پیروں کے گرد باندھے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔

اس کی نظریں بظاہر پھلوں سے لدے درختوں پر تھیں مگر انداز کچھ یوں تھا کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

شاید وہ ...... خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

‘‘نگین! ...... نگین ...... نگین!’’ کسی نے اسے پکارا۔

آواز کی بازگشت پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

‘‘نگین ...... نگین ...... نگین!’’

یہ یقیناً کوئی الوہی صدا تھی‘ جو اسے اپنی جانب کھینچنے لگی۔

وہ فارم ہاؤس سے باہر کی جانب لپکی۔

‘‘نگین ...... میں یہاں ہوں‘’’ آواز اب قدرے قریب تھی۔

اس کے قدموں میں بجلیاں بھر گئیں۔ اس نے دیکھا‘ دریا کے کنارے وہ کشتی میں اس کا منتظر تھا۔

اسے دیکھ کر وہ کسی قلانچیں بھرتی ہوئی ہرنی کی طرح اس کے پاس جا پہنچی۔ مارے خوشی اور سرشاری سے اس کا سانس تک پھول گیا تھا۔

‘‘کہاں تھیں تم ......؟’’ ‘‘میں اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔’’

‘‘کوئی بھی نہیں‘ انتظار تو میں تمہارا کر رہی تھی۔ جیسے ہی تمہاری آواز سنی‘ میں بھاگی چلی آئی۔’’ اب وہ اس کے مدمقابل کشتی میں بیٹھ چکی تھی۔

‘‘آج کہاں کی سیر کرنی ہے؟’’ چپو چلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

‘‘جہاں تم لے جاؤ گے‘ وہیں جاؤں گی۔’’ اس نے مسکرا کر کہا۔

‘‘پکی بات!’’ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

‘‘ہاں پکی اور سچی بات’’ اس نے اپنا دودھیا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیا‘ جسے اس نے تھام کر چوم لیا۔

‘‘میں تو دریا کے اس پار لے جاؤں گا‘ چلو گی میرے ساتھ؟’’

‘‘ہاں چلوں گی۔’’

تب اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اب کشتی چلاتے ہوئے‘ وہ گیت بھی گا رہا تھا۔

اس کی مسحور کن آواز‘ اس کے کانوں میں صور پھونکتی ہوئی اس کے دل تک جا پہنچی تھی۔

وہ تھی اور اس کے سنگ خواب نگر کا شہزادہ تھا۔

پانی پر تیرتی ہوئی کشتی چلتی چلی جا رہی تھی۔

اور پھر ...... کچھ دیر بعد وہ ...... ایک کنارے پر رک گئے۔

‘‘بھوک لگی ہے‘ کچھ کھاؤ گی؟’’ اس نے پوچھا۔

‘‘ہاں۔’’

‘‘آؤ ...... نیچے اتر آؤ’’ اس نے اسے سہارا دے کر یوں اتارا جیسے وہ کانچ کی گڑیا ہو۔

اپنی چھاگل سے جوس نکال کر اسے دیا۔ جسے وہ ایک سانس میں پی گئی۔

‘‘تم بھی پی لو‘ پیاس تو تمہیں بھی لگ رہی ہو گی؟’’

‘‘تم نے پی لیا‘ پیاس میری بجھ گئی۔’’

‘‘تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟’’ اس نے پوچھا۔

‘‘ہاں‘ بے حد۔’’

تب اس کے چہرے پر مسرت کا اجالا سا پھیل گیا۔

‘‘اب ہم کہاں جائیں گے؟’’ اس نے پوچھا۔

‘‘بہت آگے‘ بہت اوپر ......’’

تب اسے لگا کہ اس کا وجود فضاؤں میں اڑان بھر رہا ہے اور وہ اس کا بازو تھامے اس کے سنگ سنگ ہے۔

کبھی وہ بادلوں کو چھوتے ہوئے گزر رہی ہے۔ تو کبھی ستاروں کو تھامتے ہوئے۔

ابھی وہ قوس قزح کے رنگوں کے پاس پہنچنے والی ہی تھی کہ اسے یوں لگا کہ کسی نے اس کے پیروں سے زمین

کھینچ لی ہو۔

بادل گرجنے لگے۔ سمندر میں جیسے طغیانی آ گئی۔

''حد ہو گئی ہے نگین! کوئی ایسے بھی سویا کرتا ہے؟ دو گھنٹے ہو گئے لائٹ گئے ہوئے۔ اتنی گرمی میں تمہیں کیسے نیند آ رہی ہے؟ اٹھو ذرا جنریٹر تو چلا دو۔ مجھ سے تو اس کی رسی ہی نہیں کھینچی جاتی۔''

اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا امی......!'' وہ گھبرائی ہوئی سی پوچھ رہی تھی۔

''جنریٹر چلانے کو کہہ رہی ہوں۔ تمہارے بادا سستے کے چکر میں ایسا خرید کر لائے ہیں کہ چار آدمی تو اس کے اسٹارٹ کرنے کے لیے چاہئیں تب کہیں جا کر یہ چیخ چلائے گا اور پنکھا چل سکے گا۔''

''امی' آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میرے کان پر آ کر ایسی چیخیں آپ کہ عجیب سا خوف میرے دل میں اتر آیا۔ دیکھیے تو میرے ہاتھ تک کانپ رہے ہیں۔''

''ارے بیٹا! اول شب کوئی اتنی گہری نیند سوتا ہے۔ نقارے بج جائیں اور تمہاری آنکھ نہ کھلے۔ دیکھو تو اپنے آپ کو ہر مسام سے بارش کی طرح پسینہ بہہ رہا ہے' اتنی سخت گرمی میں تم سوتی رہیں' مجھے تو حیرت ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں امی آپ' آئندہ میں ایسے کبھی نہیں سوؤں گی'' وہ اپنے آپ کو سرزنش کر رہی تھی۔

☆☆☆

یہ تیسری رات تھی جب وہ اپنا احتساب کر رہی تھی۔

غلطی ساری میری ہی ہے۔ فریال سے دوستی اور اس کی باتیں سن کی میرا ذہن بھی نہ جانے کہاں کہاں اڑا پھرتا ہے۔ جب ہی تو یہ بے سروپا خیالات خوابوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

وہ اپنے آپ کو جلی کٹی سنا رہی تھی۔ اگر کسی کو یہ سب پتا چل جائے تو کتنی بری بات ہو گی کہ نگین بھی عام سی لڑکی نکلی۔

اف مجھ میں اور فریال میں کیا فرق رہ گیا...... اسے جھرجھری سی آ گئی۔

اب میں نہ تو فریال کی کوئی بات سنوں گی اور نہ کیبل کے رومانٹک ڈرامے دیکھوں گی۔

ایسی چیزوں کے ذہن پر بڑے برے اثرات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح سے سمجھا رہی تھی۔

تھینکس گاڈ! خوابوں کی آوازیں نہیں ہوتیں۔

اگر امی کو پتا چل جاتا کہ میں خوابوں میں کس کس نگری کی' کس کے ساتھ سیر کر کے آئی ہوں تو وہ کیا کہتیں؟

یقیناً وہ مجھے ایک بری لڑکی سمجھتیں۔

کیا میں ایک بری لڑکی ہوں؟ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بھل بھل بہہ رہے تھے۔ نہیں' ہرگز نہیں۔ اس کا روم روم یہی جواب دے رہا تھا۔ تو پھر یہ سب کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ؟

پھر میں ایسے خواب کیوں دیکھتی ہوں؟

میں خوابوں کے شہزادے کے ساتھ کیوں اڑی اڑی پھرتی ہوں؟

یہ شاید تمہاری عمر کا تقاضا ہے کہ کوئی تمہیں چاہے' اس کے نفس نے اسے بہکایا۔

نہیں' یہ بری صحبت کا اثر ہے۔ اس کے دماغ نے اسے لتاڑ دیا۔

ایسے میٹھے اور سہانے خواب جو دل کی بستی کو سرسبز و شاداب کر دیں' دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ نہ پکڑے جانے کا خوف' نہ کوئی تہمت اور نہ ہی کوئی سبکی۔

من آنگن کا راجا منٹوں' سیکنڈوں میں دنیا گھما دے اور کسی کو پتا نہ چلے۔

ایک سرشاری' خوشی اور قربت کا ایک اچھوتا سا احساس مل جائے تو کیا ہے؟ دل کی تاویلیں اسے نئے باغ دکھا رہی تھیں۔ جہاں ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔

حیا اور پاکیزگی لڑکیوں کا وصف ہوتا ہے۔ اس کے لیے تنہائی یا تصور کی کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ دماغ نے اسے لتاڑا۔

الٰہی' میں کیا کروں؟

ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے کیسے نوچ کر پھینکوں؟

ان فاسد خوابوں نے میرے کنوارے جسم کو چھو لیا اور میں ان جزیروں سے نکل کر بھی نہ آئی۔

اپنی اس بے مائیگی پر اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

اے اللہ! تو مجھے معاف کر دے۔ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور ہمیشہ ایک اچھی لڑکی رہنا چاہتی ہوں۔

رونے سے اسے قدرے سکون حاصل ہوا۔

مگر پھر بھی اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے وہ ساری رات اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی۔

وہ نڈھال سی ہو گئی مگر چلنا بند نہیں کیا' پھر اسے چکر سے آنے لگے۔

مگر یہ خوف بھی دامن گیر تھا۔ جوں ہی وہ آنکھیں بند کر کے اپنا سر تکیے پر رکھے گی تو اس کے خوابوں کا شہزادہ فوراً آ جائے گا اور وہ اس سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکے گی۔

تھک کر جب اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ بستر پر ڈھے گئی۔

اور جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو کوئی خواب اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

کوئی شہزادہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا کہ رات کو جب تک وہ تھک کے چور نہ ہو جاتی' بستر پر نہ جاتی۔

اور پھر وہ فریال سے بھی کترانے لگی۔ (جیسے کسی جراثیم کے لگ جانے کا کوئی خدشہ ہو)

''نگین! تھوڑی دیر رکنا' میں تمہارے ساتھ اسٹاپ تک چلوں گی'' فریال کہتی۔

''نہیں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔ امی کے ساتھ کہیں جانا ہے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی آگے نکل جاتی۔

''فریال آج شام کو میں اسٹڈی کرنے تمہارے گھر آ جاؤں؟'' فریال پوچھتی۔

''نہیں بھئی' آج تو ہمارے گھر بہت مہمان آ رہے ہیں۔ میں خود نہیں پڑھ سکوں گی۔ تمہارے آنے کا پھر فائدہ؟''

''اچھا تم میرے گھر آ جاؤ۔ کمبائن اسٹڈی کرنے سے جلد یاد ہو جاتا ہے۔''

''تمہیں تو پتا ہی ہے' میرے ابا جی کتنے سخت ہیں۔ میرا کہیں آنا جانا پسند ہی نہیں کرتے ہیں'' وہ صفا چٹ انکار کر دیتی۔

رفتہ رفتہ وہ فریال سے دور ہونے کی کوششیں کر رہی تھی۔ جس میں وہ کبھی کامیاب ہو جاتی اور کبھی سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

''نگین! دیکھ میرا یہ بریسلیٹ' یہ ویلنٹائن ڈے پر مجھے عدیل نے لے کر دیا ہے۔''

''دیا ہوگا'' وہ بے پروائی سے کہتے ہوئے اٹھ جاتی۔

''ہوتا کوئی تجھ سے محبت کرنے والا تو آج تیری کلائی بھی یوں سونی نہ ہوتی'' اس کا لہجہ رحم آمیز ہو جاتا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ایسی بے تکی چیزوں کی۔''

''نگین! آج میرا یہ سوٹ کیسا لگ رہا ہے؟'' کالج میں سنیچر کے دن بغیر یونیفارم آنے کی اجازت تھی۔

''بہت خوبصورت!'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ یوں بھی سرخ اور بلیک کلر اس کا فیورٹ تھا۔

''عدیل لایا ہے' لاہور کی ریت سے' میرے لیے۔''

''سنو' تمہارے پاس عدیل کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہے کیا؟'' ایک دن اس نے فریال کو جھاڑا۔

''تم کیوں جلنے لگی ہو مجھ سے'' فریال نے کہا۔

''میں کیوں بھلا تم سے جلوں گی مگر ہر بات میں عدیل کا نام سن سن کر مجھے چڑ سی ہونے لگی ہے۔''

''وہ اس لیے کہ تمہارا کوئی چاہنے والا جو نہیں ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اور یوں بھی جن لڑکیوں کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہوتا' وہ کسی طرح بھی کم تر نہیں ہوتی ہیں۔'' نگین نے فریال کو خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نگین! بات بوائے فرینڈ کی نہیں ہو رہی۔''

''پھر کس کی بات ہو رہی ہے؟''

''سنو' زندگی میں کسی کے پاس محبت ہوتی ہے اور کسی کے پاس محبت نہیں ہوتی۔ جن کے پاس محبت نہیں ہوتی' ان کا دکھ بھی صرف محرومیٔ محبت کا ہوتا ہے۔''

''مگر تمہاری محبت کا نام تو صرف اور صرف عدیل ہے۔'' اس نے اسے پھر جھاڑا۔

''میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ محبت کا صرف ایک ہی رنگ ہے۔ اس کے تو ہزاروں' لاکھوں بلکہ کروڑوں رنگ ہوں گے اور ہر رنگ ایک دوسرے سے جدا مگر دنیا کی ہر خوشی ...... اور ہر غم کا تعلق صرف اور صرف محبت سے ہے۔ اور یہ قطعی دوسری بات ہے کہ میری خوشی اور...... میرے پیار کا نام عدیل ہے...... اور تمہارے پاس نہ کوئی خوشی ہے' نہ کوئی غم ہے اس لیے تمہاری زندگی کسی باسی اخبار کی طرح ہے' خبریں تو بہت ہیں مگر ان میں کوئی تازگی اور چاشنی نہیں ہے۔''

فریال اپنا ذاتی فلسفہ بیان کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں' لہجے میں ایک انجانا سا فخر ہلکورے لے رہا تھا۔

''یہ چٹخارے دار اور لچھے دار باتیں تم اسی کو سنانا جو تمہارے لیے باؤلا ہو چکا ہے۔'' فریال کو آئس کریم پارلر کی جانب مڑتے دیکھ کر وہ تیزی سے اپنی گلی میں گھس گئی' جو سیدھی اس کے گھر تک جاتی تھی...... آج شاید مسافت کچھ زیادہ ہی تیزی سے طے کر لی تھی۔ دس منٹوں میں وہ گھر میں تھی۔

''السلام علیکم امی!'' کتابیں رکھ کر وہ لاؤنج میں آ گئی مگر امی کسی رانگ نمبر کو ڈانٹ رہی تھیں۔ ''ارے ہیلو کہنے کے بعد بولتا کیوں نہیں ہے' سانپ سونگھ گیا ہے تجھے یا میری آواز پسند نہیں آ رہی۔ بول کیا نام ہے تیرا؟ کیوں فون کیا ہے' کیا کام ہے؟''

امی کی اس تفتیش پر نگین بے اختیار مسکرانے لگی۔

☆☆☆

''اونہہ' بنتے ہیں پڑھے لکھے مگر نہ تمیز نہ تہذیب کہ عید کے موقع پر اکلوتی بہن کو خالی عید کارڈ بھجوا دیا۔ پورے گاؤں میں سب بہنوں کی عیدیاں آتی ہیں۔ خالہ کلثوم بوڑھی ہو گئیں مگر ان کی عیدی آنی بند نہیں ہوئی۔ مامی زینب' نواسوں اور پوتوں والی ہو گئیں مگر ان کے بھائی عید کے موقع پر اپنی بہن کو نہیں بھولتے۔ زینب مامی کوئی اکلوتی بہن نہیں ہیں' سات بہنیں ہیں اور ان کا بھائی بھی کوئی سگا نہیں ہے' پھر بھی وہ بہنوں کے مان اور عزت کو سمجھتا ہے اور ایک ہمارا بھائی ہے' کنجوس' مکھی چوس۔ جس کا کبھی اپنی بہن کو کچھ دینے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ بنتے بڑے طرم خاں ہیں۔ کراچی میں اپنا بزنس کر رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ گھر میں شو بازی کی ہر چیز جمع کر کے رکھی ہوئی ہے مگر تکلیف ہوتی ہے تو صرف بہن کو دینے پر۔

''بھاوج کمینی بھی ایسی ذلیل ہے' سارا سال اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کو بھرتی رہتی ہے مگر اپنی نند کا اسے کبھی خیال نہیں آتا۔ ایسی بھاوج اللہ کسی دشمن کو نہ دے' کتنے سال ہو گئے' اس نے گاؤں کا رخ نہیں کیا۔ بھائی دو چار سال کے بعد آ جاتا ہے تو مٹھائی کا ایک ڈبا دے کر سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا۔''

''چپ ہو جائیں امی! خواہ مخواہ شور مچا کر آپ اپنی طبیعت خراب کرتی ہیں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے ماموں کے دیے ہوئے جوڑے کی۔ آپ کے پاس کپڑوں کی کمی ہے کیا؟ آپ کا بیٹا کسی کے آگے کوئی چھوٹا ہے بھلا۔ ہماری اپنی زمینیں ہیں۔ ہمارا اپنا اناج ہے۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ تیرے میرے کا کوئی آسرا رکھیں'' شجاع نے سمجھایا۔

''پھر بھی بھائی کا مان تو ہر بہن کو ہوتا ہے۔'' ان کے لہجے میں ملال سا گھلا تھا۔

''مت سوچا کریں ایسی کوئی بات' جس سے آپ کو تکلیف ہو۔ کون سی چیز ایسی ہے' جس کا آپ کو ارمان ہو اور میں آپ کو دلا نہ سکوں؟ اللہ کا احسان ہے کہ ہماری زمینیں کم ہونے کے باوجود نقصان میں نہیں جا رہیں۔ امی جان! جس کا مجھ جیسا بیٹا ہو تو اسے تو کسی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہونی چاہیے۔''

''مگر تمہارے ماموں کی ان زمینوں پر تو ہمیشہ نظر رہتی ہے۔ ابا کا حویلی جیسا بڑا مکان اپنے نام کر لیا پھر بھی نیت نہیں بھری۔ چھوٹے مکان کے کاغذات پر بے ایمانی سے میرے دستخط لے لیے پھر بھی سواد نہیں آیا اور اب بھی ہر سال اناج کا حصہ لینے کے لیے اپنے ہرکارے دوڑاتے ہیں کہ سال بھر کا اناج بھیجو۔ زعم علیحدہ جتاتے ہیں کہ یہ ان کے باپ دادا کی زمینیں ہیں۔ مگر یہ احساس کبھی نہیں کرتے کہ وہ بہن جو شادی کے صرف تین سال بعد بیوہ ہو کر دو ننھے ننھے سے بچے لے کر باپ کی دہلیز پر آ بیٹھی تھی' تو ماں باپ نے یہ زمینیں اسی وقت اپنی بیٹی کے نام کر دی تھیں تو یہی بھائی ہنس دیے تھے کہ کیکر میں ببول کیسے لگیں گے مگر ان بنجر زمینوں سے اناج اگایا تو کس نے' میرے بیٹے ...... ورنہ پہلے خاک اڑا کرتی تھی وہاں اور یہ بات سب جانتے بھی ہیں مگر اس حقیقت سے انحراف کرتے ہیں کہ اس زمین کا سینہ چیر کر کس نے اپنا پسینہ بہایا۔''

''ارے چھوڑیئے امی! ماموں جان تو کنجوس سے ہی ہیں۔''

''ایسا ویسا' یہ تو ہمیشہ کا ہی ایسا تھا۔ ابا جی مرحوم کا فرید بھائی کے بارے میں یہ کہنا تھا' چمڑی چلی جائے مگر دمڑی نہ جائے۔''

''حد ہو گئی امی! ماموں جان کی عادتوں کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ ان سے خفا ہو رہی ہیں۔'' شجاع نے ہنس کر کہا۔

''بات خفگی کی نہیں ہے' انہیں کون سی میری خفگی کی پروا ہوگی۔ بات اصول کی ہے' جس کی اکلوتی بیوہ بہن ہو' جس سے ملنے کے لیے بھائی پورا سال نہ جائے۔ وہ عید کے موقع پر اپنی بہن کو صرف عید کارڈ بھیج دے' ذرا غور

سے دیکھو، کارڈ میں سوائے نام لکھنے کے انہوں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ اگر دو لفظ محبت کے لکھ دیتے تو اس میں بھی کیا ان کا خرچہ ہو جاتا۔ کارڈ نہ آتا تو شاید اتنا رنج نہ ہوتا جتنا کارڈ دیکھ کر ہو رہا ہے۔ اب اگر کسی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ کیا تیرے بھائی نے عیدی بھیجی تو پتھر کی تو ہو جاؤں گی ناں؟“

”امی، پلیز! آپ ان کا گھر میں ذکر بھی نہ کیا کریں۔“

”کیسے نہ کروں ذکر، اللہ اسے لمبی حیاتی دے۔ ہے تو وہ میرا بھائی۔ پر شجی بیٹا! بہنوں کو ایک آس تو ہوتی ہے ناں! کوئی پوچھے یا نہ پوچھے مگر مامی زینب تو ضرور پوچھے گی کہ تمہاری عیدی کیا آئی، تو فری میں بے عزتی تو میری ہو ہی گئی ناں۔“

”نہیں امی! ایسا مت سوچا کریں۔“ ”آپ کو فرحت کے ہاں جو عیدی بھیجنی ہے، جو اس کے کپڑے بنوانے ہیں اس کی طرف اپنا ذہن رکھیے۔ میری ایک ہی بہن ہے، میں نہیں چاہتا کہ عید کے موقع پر اسے اپنی سسرال میں بیٹھ کر کسی قسم کی سبکی ہو۔“

”یہی تو میں کہتی ہوں کہ جس طرح تو سوچتا ہے، اس طرح میرا بھائی کیوں نہیں سوچتا۔ اسے اپنے حق کے ساتھ اپنا فرض کیوں نہیں یاد آتا؟“

”وہ اس لیے امی کہ ماموں جان کا رویہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا، وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا، مجھے تو آج یہ بات سمجھ آئی ہے کہ نہی کی منگنی کیوں ٹوٹی۔ دکھا دیے ہوں گے فرید بھائی نے سمدھیانے والوں کے سامنے اپنی کنجوسی کے مظاہرے۔“ ”کراچی جیسے شہر میں ایسے اچھے سمدھیانے کس کو ملے ہیں جو خالی لڑکی خوشی خوشی بیاہ کر لے جائیں۔“

”امی! لالچی لوگوں سے اللہ تعالیٰ بچائے۔ اب اپنی بہن فرحت کے سسرال والے جب بھی چالاکی کی، مکاری کی اور لالچ کی باتیں کرتے ہیں تو ہمیں کتنا غصہ آتا ہے، آپ تو جا کر فرحت کی ساس کی اچھی خاصی کھنچائی تک کر آتی ہیں۔ میں بھی جا کر باتیں سنا دیتا ہوں فیروز کو۔ اب بے چاری نہی کی منگنی ٹوٹنے کا تو سب کو ہی افسوس ہوا ہے۔ اچھی بھلی لڑکی تھی۔ خواہ مخواہ منگنی ٹوٹنے کا غم لے کر بیٹھ گئی۔ سنا ہے کہ کہیں آتی جاتی تک نہیں ہے۔“

”بیٹا! بڑے شہروں میں یہ منگنیاں ڈھنگیاں ہوتی ہیں۔ جو بے ڈھنگا پن زیادہ دکھاتا ہے اور وہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اور یوں بھی ان کی کوئی شرعی اور قانونی حیثیت تو ہوتی نہیں۔“

”آپ نے ممانی جان کو خط تو بھیجا تھا ناں، جب نہی کی منگنی ٹوٹی تھی۔“

”ہاں، ہاں بھیجا تھا مگر اس پر بھی واویلا مچایا تھا تمہاری ممانی نے کہ افسوس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میری بیٹی کوئی مر تھوڑی گئی ہے۔ منگنی کی مبارک باد بھیجی نہیں، ٹوٹنے کا پرسا دیا ہے۔“

”اچھا، مجھے نہیں پتا یہ بات۔ ایسے بھی بھلا کوئی کہتا ہے؟“ شجاع کو یہ باتیں سن کر خاصی حیرت ہو رہی تھی۔

”اسے تو ہمیشہ سے مجھ سے چڑ رہی ہے۔ میری سیدھی بات کو بھی وہ پہلے الٹا کر کے دیکھتی ہے۔ میں نے بھی اس کی بہن کو کہہ دیا تھا کہ تمہارے خاندان میں شاید مبارک باد چلتی ہوگی مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ جب منگنی میں بلایا ہی نہیں تھا تو کیا مجھے الہام ہو جاتا۔ اور اس جاہل لٹھ نے یہ بات بھی ہزار سے ضرب دے کر آگے پہنچا دی تھی۔“

”دفع کریں امی! جن لوگوں کی باتیں دکھ دیتی ہوں یا جو لوگ اچھے نہ لگتے ہوں ان سے دور دور ہی رہنا چاہیے۔“

”ارے ہم کون سے کراچی جاتے ہیں یا وہ کہاں ہمیں اپنے گھر بلاتے ہیں مگر اتنی دور بیٹھ کر ناراضیاں خوب پالتے پوستے ہیں۔ بڑے شہروں کے لوگ بھی عجیب ہی ہوتے ہیں۔“

”ہاں امی! بہت ہی عجیب اور بہت ہی چالاک۔“

☆☆☆

”اگر آپ تربیت صحیح کرتیں تو یہ نوبت کیوں آتی، غضب خدا کا شام کے پانچ بج رہے ہیں اور فریال صاحبہ ابھی تک کالج سے ہی نہیں لوٹی ہیں۔“ شاہنواز پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

”آئے گی تو تمہارے سامنے ہی پوچھتی ہوں کہ دیر کیوں ہوئی؟“

”لڑکی اگر غیر ذمے دار ہے تو اس کی تربیت پر پہلے حرف آتا ہے، بڑی بہن صاحبہ ہیں کہ اسکول سے شاپنگ سینٹر چلی جاتی ہیں، وہاں سے کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی ہیں اور شام کو آ کر بتا دیتی ہیں کہ میں یہاں گئی تھی، میں وہاں گئی تھی۔ سسرال والوں نے انہیں گھر بٹھا دیا ہے تو کوئی تو ان میں ایسی بات ہوگی ہی...... اب ان کی غیر موجودگی میں کوئی آ کر کچھ پوچھے تو بات کردار پر آ جاتی ہے ناں۔“ شاہنواز کی بیوی ثریا اپنے کمرے سے نکلیں تو اپنے میاں کی ہمنوا بن گئیں۔

”ایسا تو صرف ایک ہی دفعہ ہوا تھا جب سائرہ اپنے اسکول کی ٹیچرز کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھی۔“ شائستہ بیگم نے احتجاج کرنا چاہا۔

”ارے چھوڑیے آپ، یہ تو روزمرہ کا معمول ہے۔ شاہنواز کو تو آج پتا چلا ہے کہ فریال دیر سے گھر آتی ہے مگر ایسا تو آئے دن ہوتا ہے۔“ ثریا نے بل کھا کر کہا۔

”یہ سب اماں جان کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ میری بیٹی ایسا کرے تو میں سر کچل کر رکھ دوں گا۔“

”بیٹا، کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بیٹیوں اور بہنوں میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی عافیت میں رکھے اور ان سب کو ہمیشہ نیک توفیق دے۔“ شائستہ بیگم کا لہجہ ملال بھرا سا ہو گیا۔

”السلام علیکم!“ فریال اندر داخل ہو کر کھسیا سی گئی۔ اس کے سلام کا نہ تو کسی نے جواب دیا تھا اور نہ ہی اسے کسی نے محبت سے دیکھا تھا بلکہ اس کی جانب اٹھنے والی ہر نظر تفتیشی سی تھی۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ شاہنواز کا لہجہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

”بھائی جی! کالج سے واپسی پر میں کوچنگ سینٹر چلی گئی تھی۔ وہاں دو کلاسیں لیں، وہاں سے سیدھی آ رہی ہوں۔“

”بیٹا! بتا کر تو تمہیں جانا چاہیے تھا ناں، میں اتنی پریشان رہی، تمہارے بھائی علیحدہ......“

”مجھے معاف کر دیں بھائی جی، آئندہ بتا کر جاؤں گی۔“ فریال کا لہجہ گھگھیا سا گیا۔

”تم میرا غصہ جانتی ہی ہو، اب اگر بتائے بغیر گئیں ناں...... تو پھر دیکھ لینا اپنا حشر، باپ مرا ہے تمہارا، بھائی ابھی زندہ ہیں۔“

”بس بس، زیادہ ٹسوے مت بہاؤ اور جاؤ اپنے کمرے میں۔“ ثریا نے ہتک آمیز لہجے میں کہا اور شاہنواز کو لے کر باہر نکل گئیں۔ شام کو روزانہ کہیں نہ کہیں جانا ان کا معمول تھا۔

رات کو چھوٹا بیٹا دلنواز اپنی بیوی صابرہ کو اس کے میکے سے لے کر گھر پہنچا تو کھانے کی میز پر شائستہ بیگم اکیلی بیٹھی تھیں۔ آنکھیں خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔؟

”کیسی خاموشی ہو رہی ہے گھر میں؟ گھر کے سب لوگ کہاں ہیں؟“

”لڑکیاں اپنے کمرے میں ہیں، شاہنواز اپنی بیوی کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے۔“

''اماں جان' آپ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''پورا ایک سال گزر گیا، انہیں گئے ہوئے۔ لگتا ہے کہ برسوں بیت گئے۔ وقت کتنا آہستہ گزر رہا ہے۔'' وہ خود کلامی کی سی کیفیت میں بول رہی تھیں۔

''ائی یہ کئی سے بول رئی اماں آپ کہ وقتاں آہستہ آہستہ گزرر ہے۔ اب تو وقتاں بہت جلدی میر گزر جاتے۔ ابھی پرسوں تو اتوار آیا تھا جی اور اب تین دن چھوڑ کر پھر اتوار ہے ناں۔''

''میں بات کر رہی ہوں تمہارے سسر کی۔ لگتا ہے انہیں گئے ہوئے زمانہ بیت گیا۔''

''ابی مئیں کیا بولوں جی!'' ابھی تو مرے ہیں باوا جی، میرے کو تو کل کی بات لگتی۔''

''صابرہ' تمہارے لیے کل مرے ہوں گے' مجھے تو لگتا ہے پتا نہیں کتنے ڈھیر سارے دن ان کے بغیر گزر گئے۔'' (شائستہ بیگم کو غصہ ہی تو آ گیا)

''جی' آپ صحیح بولے اماں جان! باوا جی تو میرے دل میں زندہ ہیں ناں۔ ان کی آواج میرے کاناں میں گھوم رہی ابھی تک۔ صابرہ بیٹی' میرے کو چنے کی دال کا حلوا بنا کر دو۔ صابرہ بیٹی' میں آج گلاب جامن کھاؤں گا۔ بہوت کھاتے تھے مرحوم' بہوت زیادہ انہوں شوق تھا کھانے کا...... کھا کھا کر مر گئے۔''

''شوگر کا مریض اگر احتیاط نہیں کرے گا تو نقصان تو ہو گا ہی' ہم انہیں احتیاط کروانا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح مانتے ہی نہیں تھے اور آخر کھا کھا کر اپنا بیڑا غرق کر لیا۔'' دلنواز نے کہا۔

''ان کی صحت تو اچھی خاصی تھی' پتا نہیں کیوں اتنی جلدی چلے گئے۔ ان کے ساتھ کے لوگ ابھی تک بیٹھے ہیں۔ ان کے جانے کی کوئی عمر تھوڑی تھی'' شائستہ بیگم کا لہجہ رو دینے والا سا ہو گیا۔

''سب نے ہی جانا ہے اماں جان! آپ کے رونے سے وہ زندہ تو نہیں ہوئیں گے ناں' پھر فائدہ جی!''

''اماں جان! کیا ہی اچھا ہو کہ ابا جان کی یہ برسی ہم نئے گھر میں جا کر کریں' یہ فلیٹ تو اب بہت چھوٹا سا لگتا ہے۔'' دلنواز نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

''بہوت خوبصورت بنگلاں ہے وہ' میں دیکھی اس کو۔'' صابرہ نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں' وہ گھر صرف میری وجہ سے خاصا سستا مل جائے گا'' دلنواز نے احسان دھرا۔

''مئیں سوچ رہی کہ بڑے سے لان میں شامیانہ لگا ہو' فرشی دری بچھی ہو۔ بہت سارے لوگاں قرآن پاک پڑھ رہے ہوں اور اماں جان کالی ساڑی میں اداس بیٹھی ہوں اور میں......''

''صابرہ! یہ تمہاری شادی کی سالگرہ کی تقریب نہیں ہو رہی۔'' شائستہ بیگم نے بات کاٹ کر کہا۔ ''ان کی برسی سادگی سے ہو گی اور اسی گھر میں ہو گی۔''

''میرے کو تو خوائی نخوائی کی برائی ملتی ہے' میرے کہنے کا مطلب اماں جان آپ سمجھے ہی نہیں۔'' صابرہ بعد میں تاویلیں دے رہی تھی۔

''مجھے تمہاری محبت' تمہاری سادگی کا اندازہ ہے صابرہ مگر اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرنا۔ نہ میں یہ فلیٹ بیچ رہی ہوں اور نہ ہی کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ہاں' جس کو اس گھر میں تکلیف ہو وہ یہاں سے جا سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں اور سیدھے اپنے کمرے میں آ گئیں۔

''ایسا ہی اج کرتی ہمیشاں' بی پاشا کوئی بات نہیں' سننا چاہتے'' صابرہ ساس کو جاتا دیکھ کر اچھی خاصی کھسیا گئی تھیں۔

''صابرہ' تمہیں امی سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔ خوب پٹر پٹر زبان چلتی ہے۔ دیکھ لینا' ایک دن ہم ہی ناپتے رہ جائیں گے۔'' دلنواز نے جھنجلا کر بیوی سے کہا۔

''اجی کیسے بول رئی آپ۔ مئیں تو بہوت سنبھل کر بات کرتی ہوں جی! آپ اچھی بات کو بھی غلط ٹائم پر کرتے ہیں۔''

''ایسی بات میں نے کون سی کہہ دی جو ٹائم بھی غلط ہو گیا؟'' دلنواز اب الجھے ہوئے لہجے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

''جو بنگلاں دیکھ کر ہم آئے تھے' اس کا تذکرہ آپ کتنے بدصورت انداز میں کیے تھے۔ یہ نکو سوچا آپ!''

''پھر کس طرح کرتا میں تذکرہ۔ امی تو یہ کابک نما فلیٹ کسی طرح چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ساری زندگی اسی پنجرے میں رہتے ہوئے گزرے گی۔''

''آپ پریشان نکو ہو' میں سوچتی......''

''صابرہ! ویسے تو بہت قابل بنتی ہو۔ تم ہماری امی کو اپنی باتوں سے متاثر نہیں کر سکیں۔'' دلنواز اسے یوں پریشان سا سوچتا ہوا دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کھدا کی خصم (خدا کی قسم) آپ کی اماں جان کو خائل (قائل) کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔''

''ہمیں تو پاگل بنا کر رکھ دیتی ہو......'' دلنواز کی جھنجلاہٹ دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔

''تحسین کریں۔ مئیں آپ کو جیسا دیکھا' ایسے ہی ہیں آپ' ہو!''

''واہ بھئی! مان گئے۔ اپنے میاں کو پاگل کہنا کتنا اچھا لگتا ہے یا شاید سب بیویاں اپنے میاں کو پاگل سمجھتی ہیں۔''

''آہ خوائی نخوائی آپ تو جان آ جائے۔ مئیں ایسا نکو بولی' ہاؤ۔''

☆☆☆

فریال کئی دن سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ نگین روزانہ سوچتی' اس کی طبیعت پوچھے مگر گھر میں ان دنوں ابو جان کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

وہ بے بات پر ہر ایک سے الجھ رہے تھے۔ بجلی کا میٹر چیک کرنے والا آیا' تو اس سے لڑ پڑے کہ ہمارا بجلی کا بل اتنا زیادہ کیوں آتا ہے۔

''بھائی صاحب! آپ جتنی بجلی خرچ کریں گے' اتنا ہی بل آئے گا'' اس نے رسانیت سے سمجھایا۔

''ہمارے محلے میں تو لوگوں کا ہر وقت اے سی چلتا ہے مگر ان کا اتنا بل کیوں نہیں آتا؟''

''پھر آپ ان سے پوچھ لیں کہ انہوں نے اپنے میٹر کے ساتھ کیا کوتک کر کے رکھے ہوئے ہیں؟'' وہ میٹر چیک کر کے پین اپنے کان کے پیچھے رکھ کر چلتا بنا۔

مگر ابو بے ایمانداری کے نقصانات پر ایک گھنٹا لیکچر دیتے رہے۔ ان کا کہنا تھا' یہ دور صرف بے ایمانوں کا ہے۔

دھوبی آیا تو اس سے جھک جھک کرنے لگے۔

''تم میرے کرتے شلوار پر کلف لگا کر کیوں نہیں لاتے؟''

''صاحب جی! آپ چار روپے فی کپڑا دھلائی دیتے ہو' اتنے پیسوں میں کلف کیسے لگ سکتا ہے؟''

''فیکٹری والا تو لگا کر دیتا ہے۔ تم دنیا کے انوکھے دھوبی ہو' کپڑے صرف کھنگال کر لے آتے ہو۔''

''صاحب جی! آپ فیکٹری والے کو دس روپے فی کپڑا دیتے ہیں۔ آپ مجھے آٹھ روپے دے دیں' میں آپ کی مرضی کے مطابق کپڑے دھو دیا کروں گا۔''

’’اچھا‘ مجھے ہی بے وقوف سمجھ لیا ہے تم نے‘ محلے میں دھو تم چار روپے فی کپڑا اور مجھ سے لو تم آٹھ روپے فی کپڑا۔ جاؤ‘ اب تم سے کپڑے ہی نہیں دھلوانے۔ ایسے کپڑے تو گھر کی مائی بھی دھو دے گی۔‘‘ فرید احمد کے مارے غصے کے کف بہنے لگا۔

’’کیا ہو گیا ہے آپ کو‘ کیوں ہر آئے گئے سے لڑ رہے ہیں؟‘‘ امی انہیں سمجھاتیں مگر وہ اور چڑھ چڑھ کر آتے۔

’’ہاں ہاں‘ تم بھی کہہ دو میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پاگل ہو گیا ہوں میں...... سب کو کاٹ کھانے کو آتا ہوں۔‘‘

ابو کے غصے کا اصل سبب یہ تھا کہ انہوں نے جس آدمی کو گاؤں اناج لینے کے لیے پھوپو کے پاس بھیجا تھا، پھوپو نے اسے بیس بوریوں کے بجائے صرف دو بوریاں دی تھیں۔

’’طفیل تو سچی سچی آپ ہی بتا دے‘ کہیں بقیہ بوریاں تو نے بیچ میں تو غائب نہیں کر دیں؟‘‘ (ابو کو اصل شک طفیل پر ہی تھا)

انہیں یہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ پھوپو ان کے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتی ہیں۔

’’قسم لے لیں بڑے صاحب! آپا جی نے بوریاں ہی صرف دو دیں مگر باتیں ہزار سنائیں۔ ہٹے کٹے لوگوں کو مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی اور جی‘ انہوں نے پتا نہیں کیا کیا اور کہا۔ ان کا بیٹا انہیں سمجھا رہا تھا مگر وہ چپ نہیں ہو رہی تھیں...... آپا جی‘ بڑے غصے والی ہیں۔ دو چار گالیاں تو انہوں نے مجھے بھی دیں مگر میں چپ کر گیا۔ کیا فائدہ اگر کچھ کہتا تو انہوں نے یہ بوریاں بھی واپس لے لینی تھیں۔‘‘ طفیل آگ پر پیٹرول ڈالنے کی پوری سعی کر رہا تھا۔

’’ابھی پچھلے سال میں گاؤں گیا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ آپا جی نے تو میری بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ وہ بات جو کبھی ہوئی نہیں‘ تو میں یقین کیوں کروں؟‘‘

’’تم بھی صحیح کہہ رہے ہو‘ طفیل بھی جھوٹا نہیں لگ رہا۔ یوں کرو کہ تم خود مل آؤ اپنی بہن کے پاس جا کر۔ پھر شاید تمہیں یقین آ جائے گا۔‘‘ امی نے انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

’’میں گاؤں چلا جاؤں؟‘‘ ابو نے حیرت بھری نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

’’ہاں‘ حرج ہی کیا ہے۔ اپنے کانوں سے اس کی زہریلی باتیں سنو گے تو تمہیں یقین آئے گا۔ منہ پھٹ تو وہ ہمیشہ کی ہی ہے۔ مجھ سے تو جب بھی بات کی‘ بدتمیزی سے کی مگر تم نے کبھی یقین ہی نہیں کیا۔ کندھوں پر زبان پڑی ہوتی ہے تمہاری آپا کی۔‘‘ امی کو دل کی بھڑاس نکالنے کا اچھا موقع مل رہا تھا۔

’’گاؤں تو میں خود چلا جاتا مگر آج کل دکان پر کوئی ایماندار سیلز مین نہیں ہے‘ جس کو بھی رکھتا ہوں وہ چوری کیے بغیر نہیں رہتا۔ کیش پر ہاتھ صاف نہ کر سکیں تو چیزوں پر کر جاتے ہیں۔ اتنی بڑی دکان ہے۔ بے حساب سامان ہے۔ کس کس چیز پر نظر رکھوں۔‘‘

طفیل کا چھوٹا بھائی گاؤں سے آیا تو اس نے اپنی لن ترانیاں بیان کرنی شروع کیں کہ آپا جی تو پورے گاؤں کے سامنے آپ کو ذلیل کر رہی ہیں۔ ایک بھائی وہ بھی بے غیرت‘ دانے مانگنے کے لیے اپنے نوکر دوڑا دیتا ہے۔ اس کی بکواس کسی صورت ختم نہیں ہو رہی تھی۔

ابو جب پریشان ہوتے تھے تو ان کا غصہ گھر میں بھی نظر آتا تھا۔ گزشتہ دو دن سے وہ اس بات پر ہی امی سے لڑ رہے تھے کہ چائے کی پتی اتنی جلدی ختم کیوں ہوئی؟

’’کھانے پینے کی چیزیں استعمال کے بعد ختم ہو ہی جاتی ہیں‘‘ امی اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

’’نہیں‘ یہ بات نہیں ہے۔‘‘ وہ غصے میں دہاڑے تھے۔

’’پھر کیا بات ہے؟‘‘

’’تم سوچتی ہو کہ میری کریانے کی دکان ہے‘ چیزوں کو کتنی بے دردی سے خرچ کر دوں‘ وہ دکان سے اٹھ کر گھر میں آ جائیں گی۔‘‘

’’گاؤں سے اناج نہیں آیا‘ ساری مصیبت اسی وجہ سے ہے ورنہ گھر میں کتنے لوگ چائے پینے والے ہیں اور کتنی پتی گھر میں خرچ ہوتی ہے‘ یہ بات بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔‘‘

امی بھی کبھی ابو سے دب کر نہیں رہتی تھیں۔

آج چوتھا دن تھا‘ فریال کالج نہیں آئی تھی اور گھر کے ان لڑائی جھگڑے والے حالات کی وجہ سے نگین کا بھی اس کے پاس جانا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا ٹیلی فون نمبر بھی نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

اس دن کالج سے آ کر وہ اپنی چھوٹی سی ڈائری تلاش ہی کر رہی تھی جس میں فریال کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ ڈائری بھی نہ جانے کس کھوہ میں جا کر چھپ گئی تھی کہ فریال کا فون آ گیا۔

’’کہاں غائب ہو اتنے دن سے، کیا اپنے مجنوں کو پیاری ہو گئیں؟‘‘ اس کی آواز سنتے ہی نگین شروع ہو گئی باتیں بھگارنے۔

’’مجھے ملیریا ہو گیا ہے۔ اس وقت بھی ایک سو تین بخار ہے‘ گھر آ کر میری اپلی کیشن لے جاؤ۔ اتنی کمزوری ہو رہی ہے‘ لگتا ہے مزید ایک ہفتے کالج نہیں جا سکوں گی۔‘‘ فریال کا لہجہ بھی انتہائی نحیف سا تھا۔ وہ خاصی رک رک کر بات کر رہی تھی۔

’’فرو! میں شام کو تیرے پاس آتی ہوں۔‘‘

اور جب وہ اس کے گھر گئی تو وہ اسے اپنی اپلی کیشن کے ساتھ ایک گلابی لفافہ بھی دے رہی تھی۔

’’یہ کیا ہے فریال!‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔

’’میرا یہ خط تم عدیل کو دے دینا۔ کالج کے پاس جو آئس کریم پارلر ہے‘ تمہیں بس وہیں تک جانا ہو گا‘ عدیل وہاں آ کر تم سے لے جائے گا۔‘‘

’’فریال! تم جانتی ہی ہو‘ یہ سب میں نہیں کر سکتی‘‘ نگین روہانسی سی ہو گئی۔

’’دوست نہیں ہے میری؟‘‘

’’بس‘ میں نے کہہ دیا ناں‘ ایسا میں نہیں کر سکوں گی۔‘‘

’’وہ کیا سوچے گا بھلا...... پلیز نگین!‘‘ فریال اب اس کی خوشامد کر رہی تھی۔

’’تم فون کر کے بتا دو کہ عشق کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے۔ وہ آ کر خود دیکھ لے گا پھر جو دل چاہے اسے دے دینا۔‘‘

’’بخار تو اس وقت بھی مجھے ہے۔ دیکھ لے‘ کیسے ہاتھ پیر جل رہے ہیں۔‘‘

’’روز روز آئس کریم ٹھونسو گی تو بخار تو ہونا ہی تھا۔ لگتا ہے تجھے تو ٹائی فائیڈ ہو گیا ہے۔ فلموں میں تو ہیروئن کو بیماری کوئی بھی ہو‘ اسے خون کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ایسے میں صرف ہیرو کا خون دیا جاتا ہے۔ اس سے کہو کہ آ کر تجھے ایک دو خون کی بوتلیں دے جائے تاکہ تیری صحت بھی کچھ غنیمت ہو۔‘‘

’’اب ایک ہاتھ کھائے گی میرا۔ دیکھو تو سہی‘ اس نے کتنا پیارا اور محبت بھرا سا خط لکھا ہے مجھے...... تو اس کا جواب تو دینا ہی ہے ناں۔‘‘

’’اخاہ! یہ شاعرانہ خط آیا ہے تمہارے نام۔‘‘ نگین کی نظریں اب خط پر پھسل رہی تھیں۔ جس میں لکھا تھا۔

''میری جان' میری زندگی!
مانند گل مسکراؤ۔

غنچۂ شوق لگا ہے کھلنے
پھر تجھے یاد کیا ہے دل نے

میری نازک سی شہزادی' بیمار کیوں ہو گئی ہو؟
کیا بات ہوئی؟
کیسا چہ کہ لگا؟
یہ بخار آیا تو کیوں آیا؟
کیا ہو گیا جان عدیل! اپنے آپ کو سنبھالو۔
دیکھو تو سہی بخار تمہیں ہے اور جل میں رہا ہوں۔
میری آنکھوں سے
میری سانسوں سے
ایک آگ لپٹی جا رہی ہے۔ ہاں' میں جل رہا ہوں۔
تمہارے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔
برا مت ماننا' اپنی تصور کی دنیا میں تم سے ہر روز ملتا ہوں مگر ہجر کی صعوبتیں کم ہونے میں نہیں آتیں۔

روز تنہائیوں میں اک چہرہ
تولتا ہے مجھے ترازو سا

فری! یہ مانا تمہیں بخار ہے مگر ایسا بھی کیا کہ تم اپنی کھڑکی میں بھی کھڑی نہیں ہوتیں۔
چھت پر بال سکھانے تک نہیں جاتی ہو۔
میں کہاں تک تمہارے تصور سے باتیں کروں، اگر تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا تو یقیناً میری حالت تم سے زیادہ ابتر ہو جائے گی۔
فریال! تمہاری صحت' میری زندگی ہے اور میری زندگی کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔
میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر میرا یہ قلم میرے احساسات کا ترجمان نہیں ہے۔ سو یہی کہوں گا۔

چاند سا مصرع اکیلا ہے میرے کاغذ پر
چھت پر آ جاؤ میرا شعر مکمل کر دو
میں تمہیں دل کی سیاست کا ہنر دیتا ہوں
اب اسے دھوپ بنا دو مجھے بادل کر دو
اپنے آنگن کی اداسی سے ذرا بات کرو
نیم کے سوکھے ہوئے پیڑ کو صندل کر دو
تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو مر جاؤں گا
یوں کرو جانے سے پہلے مجھے پاگل کر دو

تمہاری آمد کا شدت سے منتظر

تمہارا اپنا عدیل۔''

''اف..... کیا غم زدہ سا خط ہے مگر اس کے جواب میں تم نے بھی شعرا کے دیوان کھنگال ڈالے ہوں گے..... ہے ناں؟'' نگین اسے شوخی سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''اچھا' یہ بات ہے' اب تم میرا جواب بھی پڑھنا چاہتی ہو۔ مگر تم یہ بند کا بند لفافہ اسے دو گی' کھولنا ہرگز نہیں!'' فریال کا لہجہ تنبیہہ لیے ہوئے تھا۔

''جی نہیں..... میں یہ لفافہ لے کر جا ہی نہیں رہی تو دینے اور کھولنے کا سوال کہاں سے آ گیا۔ فری، وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا؟''

''سوچنے دو' اچھا ہے..... چار چھ خطوط وہ تمہیں اور لکھ دے گا' یوں چند اچھے شعرا کا کلام تمہارے پاس بھی جمع ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے' نہ لے کر جاؤ..... کوئی بات نہیں' جب تیرا وقت آئے گا ناں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی'' فریال کھسیائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میرا ایسا وقت آ ہی نہیں سکتا'' نگین کا لہجہ بھی مضبوط تھا۔

''یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم! پیار کی شاہراہ کب سامنے آ جائے' یہ بھی بھلا کسی کو پتا ہے۔''

''ہاں، اندھوں کو پتا نہیں ہوتا مگر آنکھیں رکھنے والوں کو پتا ہوتا ہے۔ تم تو تھیں ہی اسی چکر میں، اپنے گھر کے کثیف ماحول سے کچھ دیر کے لیے نجات حاصل کرو سو اس کو دیکھ کر ہی تمہاری مرجھائی حسرتیں' پھول بن گئیں۔ جو مسحور کرنے کے بجائے لو دے رہی ہیں مگر تم نہ تو سمجھ رہی ہو اور نہ ہی سمجھنا چاہتی ہو۔ اب تم خود ہی سوچو کہ ایک انجانا سا لڑکا تمہارے پاس آیا اور تم اس کی ہر بات پر ایمان لے آئیں..... جانے بغیر' پہچانے بغیر' جیسے اس نے کبھی بھی' کسی معاملے میں بھی تم سے کبھی جھوٹ بولا ہی نہ ہو۔''

نگین نے اس کی اچھی خاصی کھنچائی کر دی تھی۔

تب فریال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''نگین' تم یقین کرو، یہ سب از خود ہوا ہے' اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''بعض فریب بڑے خوبصورت ہوتے ہیں' اس میں لوگ بہ آسانی پھنس جاتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

''تم مجھ پر یقین نہیں کر رہی ہو مگر قسم سے ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اس کا دل میرے سینے میں نہ جانے کیسے دھڑکنے لگا' مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''یہ سب فلمیں دیکھ دیکھ کر تمہارا دماغ خراب ہوا ہے ورنہ اچھی خاصی تھیں تم......''

''تو قسم لے لے' فلموں کا کوئی ہیرو کبھی بھایا ہی نہیں۔''

''مگر ہے تو وہ بھی ہیرو سا'' نگین اس کی تصویر غور سے دیکھ رہی تھی' جو فریال نے تکیے میں سے نکال کر اسے دکھائی تھی۔

''اور پوز دیکھو' کس قیامت کا ہے۔ ہاتھوں میں گلاب کی کلیاں لیے بیٹھے کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ فلم میں بھی آ سکتا ہے' کافی سے زیادہ خوبصورت ہے۔''

''پر میں تو اس جیسی خوبصورت نہیں ہوں۔''

''بدشکل بھی نہیں ہو۔''

‘‘مگر وہ کہتا ہے کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں۔’’

‘‘جھوٹ بولنے کا ماہر لگتا ہے۔’’

‘‘یہی بات میں نے بھی اس سے کہی تھی۔’’

‘‘پھر شرمندہ سا ہو گیا ہوگا‘ ہے ناں۔’’

‘‘نہیں۔’’

‘‘تو پھر......؟’’

‘‘وہ میری بات سن کر ہرٹ ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے یوں ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے‘ جیسے میں نے اس کی تذلیل کر دی ہو۔’’

‘‘فریال تم تو اتنی سمجھ دار سی لڑکی تھیں‘ اب ایسی بے وقوفی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟’’ نگین کو اس کی باتیں دکھی کر گئی تھیں۔

‘‘یہ بات نہیں ہے‘ پہلے مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔’’

‘‘کیا معلوم نہیں تھا؟’’ نگین حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

‘‘یہی کہ سچی خوشی کس کو کہتے ہیں۔’’

‘‘اب کوئی انہونی بات معلوم ہو گئی کیا؟’’

‘‘ہاں‘ پیار اور خوشی دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ عدیل مجھے اچھا لگتا ہے‘ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اور پیار کرنے والے کو دیکھ کر دل کھنچنے لگتا ہے۔ اس کی پر محبت باتوں نے میرے سونے جیون میں خوشیاں بکھیر دی ہیں۔’’

‘‘مجھے لگتا ہے تمہارا بخار ابھی اتنی جلدی اترنے والا نہیں ہے۔ تم ابھی اور آرام کرو پھر ملیں گے۔ اوکے......!’’ نگین اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نگین ابھی فریال کے کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی چھوٹی بھابی کو دیکھ کر متامل سی ہو گئی۔ وہ اسے عجیب تمسخر بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

‘‘ارے‘ اب بخار اتنی بڑی بیماری ہو گئی کہ لوگاں پوچھنے کو آ رہے انہوں کو۔’’

‘‘اچھا بھابی‘ میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ!’’ نگین تیزی سے کہتے ہوئے گزر گئی۔

‘‘ہاں ہاں‘ بھئی جاؤ۔ مگیں کون سی تم سے باتاں کرنے کو مری جا رہی۔ یہاں تو سب ایک ایک کر کے بیماری کے ٹریلر دکھاتے بھئی۔ نکو کوئی بیمار نکو کوئی کمزور۔ میری تو قسمت کھر اب کہ ایسے ایسے جھوٹے لوگاں میں پھنس گئی۔’’

☆☆☆

نگین جب کالج سے نکلی تو اسی وقت بارش شروع ہوئی تھی اور پھر چند ہی منٹوں میں بارش چھما چھم برس رہی تھی۔ موسم بہار کی اس بارش نے فضا کو دھندلا سا کر دیا تھا۔ سڑک کے کناروں پر لگی اسٹریٹ لائٹس روشن ہونے لگی تھیں۔

فریال کو کالج سے غیر حاضر ہوئے آج آٹھواں دن تھا۔

نگین الٹے ہاتھ سے ماتھے پر چھجا بنائے تیز چلتے ہوئے جا رہی تھی۔ ابھی وہ اپنے گھر کی جانب جانے والی گلی تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اس کے بے حد قریب نئی نسان سنی کے بریک چرچرائے۔

گھبرا کر وہ پیچھے ہٹی اور دیکھا تو عدیل گاڑی میں سے اتر رہا تھا۔ نگین نے اس کو پہچان کر نظر انداز کر دیا اور

جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

‘‘پلیز نگین! میری بات سنیے’’ اس کی پشت پر آواز ابھری۔

اس نے یکبارگی مڑ کر دیکھا۔ عدیل اس کی سمت آ رہا تھا۔

‘‘جی فرمائیے؟’’

‘‘فریال اب کیسی ہے؟’’

‘‘ٹھیک......’’ اس سے مختصر جواب نہیں ہو سکتا تھا۔

‘‘اس سے کہیے گا کہ میرے خط کا تو جواب دے دے۔’’

‘‘جی!’’ یہ کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ اسے عدیل کا اس طرح راستے میں روک کر مخاطب کرنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

اگلے دن جب فریال کالج آئی تو اس نے اسے بھی بے مہار سنا ڈالیں۔ ‘‘نہ جانے کس لفنگے سے دوستی کی ہوئی ہے کہ وہ راہ چلتوں کو روک روک کر تمہارا پوچھ رہا تھا۔’’

‘‘میرا دیوانہ جو ہے’’ فریال اس بات کو بھی بڑے زعم سے سن رہی تھی‘ جیسے عدیل کی پریشانی اس کے لیے کسی اعزاز کا درجہ رکھتی ہو۔

چھٹی کے وقت وہ کالج سے ابھی پچاس قدم بھی آگے نہیں گئی تھیں کہ عدیل اپنے کسی دوست کے ساتھ گاڑی سے ٹیک لگائے باتیں کرتا نظر آیا۔

‘‘نگین! میں تجھے عدیل سے ملواؤں؟’’ فریال اس کا ہاتھ کھینچتی اس کے پاس لے گئی۔

‘‘عدیل! یہ میری بے حد پیاری سی‘ لاڈلی سی‘ نخریلی سی بچپن کی دوست ہے نگین!’’

‘‘میں نے انہیں کل پکارا تھا‘ یہ رکی ہی نہیں’’ عدیل کے لہجے میں شکایت اُمڈ آئی۔

‘‘مجھے یوں راستے میں رکنا اچھا نہیں لگتا ہے’’ اس کے لہجے میں بیزاری کی واضح چمک تھی۔

‘‘اور یہ میرا دوست زبور!’’ عدیل نے اپنے دوست سے تعارف کرایا‘ جو چپ چاپ کھڑا نگین کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا‘ جو سو فیصد بوریت کے تھے۔

‘‘زبور......!’’ اس نے چونک کر نظر اٹھائی‘ اس کی آنکھوں میں برہمی رچی ہوئی تھی۔

‘‘نگین! یہ عدیل کا بہت اچھا دوست ہے۔ ان دنوں عدیل کی بائیک خراب ہے مگر زبور اپنی گاڑی پر عدیل کو ہر جگہ لیے پھرتا ہے۔’’

‘‘ٹائم کی جو فراوانی ہے ان کے پاس۔ گھومیں گے نہیں تو وقت کیسے گزرے گا ان کا۔’’ نگین نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

‘‘نگین رکو‘ میں بھی گھر چلتی ہوں’’ فریال نے کہا۔

‘‘نہیں‘ تم بات کرو۔ مجھے جلدی بھی ہے’’ وہ تیزی سے چلتے ہوئے سامنے گلی میں مڑ گئی۔

‘‘ہوں...... یہ تھے وہ حضرت!...... فریال سے میرا نام پوچھ کر سڑک پر کھڑے ہو کر میرے کپڑوں کا رنگ دیکھ لیا اور لگے فون پر ڈائیلاگ بھگارنے......’’

‘‘بدمعاش کہیں کا!’’ مارے غصے اور جھنجلاہٹ کے اس نے سڑک پر تھوک دیا‘ جیسے سڑک کا وہ حصہ اس کا چہرہ ہو۔

☆☆☆

بادل اور آنکھیں ایک ہی منظر پیش کرنے والی دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ فریال کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ رہے تھے مگر نگین کا غصہ کسی صورت کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ غصے کا جتنا اسٹاک تھا‘ اس نے سب ہی نکال دیا تھا۔

فریال نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی سہیلی نگین اسے لفظوں سے بھی لہولہان کر سکتی ہے۔

اب فریال لاکھ قسمیں کھا رہی تھی کہ اس نے زبور کو نگین کا فون نمبر نہیں دیا تھا۔

”پھر اسے الہام ہو گیا……؟ یا میرا نام میرے ماتھے پر لکھا تھا جو اس نے پڑھ لیا اور……“

”پلیز! میری بات کا یقین تو کرو“ فریال نے گھگیا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”یقین ہی تو کیا ہے‘ جب ہی تو پوچھ رہی ہوں تم سے کہ کیا میری بیماری کے بارے میں اسے ڈاکٹر نے انفارم کیا تھا؟“

”میں مانتی ہوں‘ میری بھی غلطی ہے، تمہارا غائبانہ تعارف میں نے عدیل سے کرا رکھا ہے اور زبور عدیل کا گہرا دوست ہے۔“

”تمہارے عدیل کے تو نہ جانے کتنے دوست ہوں گے جو میرے نام پتے وہ ریوڑیوں کی طرح بانٹ رہا ہے۔ وہ تمہارا عاشق ہے‘ اسے صرف تم سے سروکار ہونا چاہئے۔ اسے یہ حق کس نے دیا ہے کہ اس کے دوست میرے گھر فون کریں۔“ نگین کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا تھا۔

اور فریال وضاحتیں کرتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی تھی۔

”غلطی تو میں اپنی مان رہی ہوں ناں۔ دیکھ‘ مجھے معاف کر دے“ فریال نے نم لہجے کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

”ٹھیک ہے“، نگین نے بات ختم کر کے اپنا رخ دھیرے سے موڑ کر اپنی نظریں اپنی فائل پر جما دیں۔

فریال سمجھ رہی تھی، اس کی خفگی کم ضرور ہوئی ہے مگر ختم نہیں ہوئی۔ ”آج کینٹین میں کولڈ ڈرنکس اور برگر میری جانب سے“ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں‘ میرا موڈ نہیں ہو رہا“ اس نے کہا۔

”تم جانتی ہو‘ مجھے کینٹین میں تمہارے بغیر کھاتے ہوئے کبھی لطف نہیں آتا“ فریال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں چٹنی کے ساتھ برگر کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”نگین! ایک بات کہوں‘ اگر برا نہ مانو تو……“ اس کا مزاج نارمل دیکھ کر فریال نے ملائمت سے کہا۔

”ہاں‘ کہو۔“

”زبور بہت اچھے گھرانے کا بہت ہی ڈیسنٹ سا لڑکا ہے۔ تمہاری اس کے بارے میں رائے بالکل غلط ہے۔“

بڑی اداس سی شام تھی۔ آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ابابیلیں ہوا کو قینچیوں کی طرح کترتی ہوئی سیاپے بھر رہی تھیں۔

”شائستہ بیگم غم زدہ سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی کہ وہ محسوس کر رہی تھیں۔ ایک ہفتے بعد عید کا تہوار آ رہا تھا۔ ان کے دونوں بیٹوں نے اپنے اور اپنی بیوی بچوں کے کپڑے بنائے تھے مگر بہنوں کے لیے کوئی بھائی ایک دوپٹا تک نہیں لایا تھا۔

”بیٹا‘ تم فریال اور سائرہ کے لیے ایک ایک جوڑا لے آتے۔ آخر تمہاری بہنیں ہیں۔“ ناشتے کی میز پر انہوں نے صرف اتنا کہا تھا مگر ان کا یہ جملہ دونوں بیٹوں کے اینٹ بن کر لگا تھا۔

”مکان آپ کے نام ہے‘ پینشن آپ کو مل رہی ہے…… آپ تو ہمیں ہمارا حق نہیں دے رہی ہیں‘ اس پر بھی آپ چاہتی ہیں کہ ہم بہنوں کو جوڑے لا کر دیں۔“

”جوڑے سے تو انہوں اسٹارٹ لیا ہے‘ پھر کہیں گی ایک ریشمی جوڑا‘ ایک سوتی جوڑا‘ دونوں کے ساتھ سینڈلیں پھر میچنگ جیولری۔ اور اب بچ گئیں امی جان‘ تو ان کے لیے بھی ہر بھائی دو تین جوڑے بنا کر دے اور اپنی بیوی‘ بچوں کو زہر ملا کر کھلا دے۔“ بڑی بہو ثریا کا لہجہ بھی زہریلا سا تھا۔

”تمہارے ابا کی پینشن آتی ہی کتنی ہے‘ صرف ساڑھے تین ہزار۔ اس میں بارہ سو کی تو ہر ماہ میری دوا آ جاتی ہے۔ فریال کے کالج کی فیس‘ کتابوں کا خرچہ سب انہی پیسوں میں سے تو خرچ ہوتے ہیں۔“ شائستہ بیگم اپنے اخراجات کی تفصیل بتاتے ہوئے خاصی رنجیدہ سی تھیں۔

”میرے کو معلوم ہے کی سوتیلے ماواں کتی بھی محبت کرتے تو وہ جھوٹی اچ ہوتی‘ یہ میں نکو بولتی‘ سوب ایسا بولتے ہاں۔ اب میں اباجی مرحوم کی کتی خدمت کی۔ کسی موقعے پر نکو میں بولی۔ وہ جو بھی کام بولے‘ کر دی۔ کر کو نہ دیتی تو کرتی بھی کیا میں۔ میری ہمت اچ کیا پڑتی کہ اباجی کو نکو بولتی، امی پاشا کو نکو بولتی۔ ایسا بھی وخت آیا کی کالے کالے راتوں کو جب ٹھنڈے ٹھنڈے ہوایاں چل رئے ہوتے میں مزے میں خرخر پڑی سوتی ہوتی تو یہ امی جان آن کر جگا دیتے۔ ”ایو صابرہ اٹھ…… باوا جی کے کمرے کے انگاراں چپ کر گئیں۔ جا بیرچی خانے سے انگاران بھر کو لے آ۔“

”صابرہ! ایسا صرف ایک دفعہ ہوا تھا جب انہیں نمونیے کا اٹیک ہوا تھا۔ ایمبولینس آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ میں‘ سائرہ اور فریال ان کے ہاتھ پیر رگڑ رہے تھے مگر تم تو ایسا سنا رہی ہو کہ جیسے ہر رات تمہیں پکی نیند سے پکڑ کر جھنجوڑ کر اٹھا دیا گیا ہو کہ اٹھو اور آتش دان میں کوئلے بھر دو۔“

”امی جی! میں یہی بول ریوں۔ اس گھر میں کھدمت کا صلہ نکو ملتے۔ کوئی میرے دل کا حال نکو جانے۔ میں کبھی کسی کو بول نہیں سکتی۔ میرا دل جیسے سوکھے پتے ویسا لرزا تھا جی اور سوب یہ سمجھتے میں مٹاخے مار لیتی بیٹھی۔“

”تم لوگ سب بچے ہو اور میں نے شاید سب کے ساتھ زیادتیاں بھی کی ہیں۔ شاید یہی بات ہو‘ اس لیے یہ دن دیکھنے کو مل رہے ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے امی! اگر آپ کے اپنے سگے بیٹے ہوتے تو آپ کا رویہ قطعی مختلف ہوتا۔ آپ ان پر پورا بھروسا کرتیں۔ آپ اپنے دل کا حال جو اپنی بیٹیوں کو سناتی ہیں‘ وہ اپنے بیٹوں کو سناتیں مگر آپ نے تو انہیں کبھی کا سمجھا ہی نہیں۔ ثریا نے تیکھی چتونوں سے صابرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو‘ جب میری شادی ہوئی تو یہ شاہنواز اور دلنواز چھوٹے سے تھے۔ ان دونوں کو

جنا تو نہیں مگر پالا تو میں نے ہی ہے۔ جب بخار ہو جاتا تھا تو ساری ساری رات ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ان ماتھے پر رکھتی تھی اور اپنے کلیجے سے لگا کر اپنے پاس سلاتی تھی۔ کیا پیدا کرنے والی ہی ماں ہوتی ہے' پالنے وال ماں کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔''

''امی! اگر آپ نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح پالا تو ہم بھی تو آپ کو ماں کی طرح لیے بیٹھے ہیں۔ آج کل کوئی اپنی سگی ماں کا اتنا خیال نہیں کرتا جتنا کہ ہم کرتے ہیں'' شاہنواز نے فخر سے کہا۔

''یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے اپنی ماں نہیں سمجھتے۔''

''امی' ہمیں آپ سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ آپ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہیں۔ سائرہ کو گھر م بٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے اس کے گھر روانہ کریں۔ سائرہ کی وجہ سے ہمارے گھر کے ماحول میں جو ٹینش ہے' وہ اس کے جانے سے ختم ہو گی۔

''اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ سائرہ آپ کو بہت ورغلاتی ہے۔ بہوؤں سے آپ کا دل خراب کرتی ہے۔ ثریا اور صابرہ سے اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہر وقت کی دانتا کل کل نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ صبح کے گئے جب شام کو تھکے ہارے گھر آتے ہیں تو گھر کی پریشانیاں ہماری تھکاوٹ میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔'' دلنواز کا لہجہ بھی زعم بھرا تھا۔

''بیٹا! یہ بات تم سب جانتے ہو کہ سائرہ کو ہم نے خود بلا کر گھر نہیں بٹھایا ہے۔ اس کے سسرال والے اسے از خود یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ اب اگر وہ اسے اپنے گھر میں نہیں بساتے تو کیا میں اسے اپنے گھر سے نکال دوں؟ بدنصیب بیٹی کا ٹھکانا بھی اس کے ماں باپ کا گھر ہی ہوتا ہے۔'' شائستہ بیگم کا لہجہ گلوگیر سا ہو گیا تھا۔

''نہیں امی جی! سائرہ کی زبان شروع سے ہی تیز تھی۔ سسرال جا کر اس کی زبان کوڑا بن گئی تھی اس لیے وہ ایسے حال کو پہنچی ہے۔ پہلے میکے میں بھابیوں کو تنگ کیا تو وہ خاموش ہو گئیں مگر جب سسرال والوں کو پریشان کیا تو انہوں نے اسے گھر ہی بٹھانا تھا۔ یہ اپنے کرتوتوں کے سبب گھر بیٹھی ہے اور مظلومی کا تمغا الگ حاصل کرنا چاہتی ہے'' ثریا نے تنک کر کہا۔

''بیٹا' تم جو بھی کہو' ٹھیک ہی ہو گا۔ جو بیٹیاں اجڑ کر اپنے میکے آ جاتی ہیں دنیا ان کو ہمیشہ سے برا ہی کہتی آئی ہے۔ کوئی ان کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ ان کے خواب کیا تھے اور ان کی تعبیریں کیسی نکلیں؟''

''مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے گھر میں سائرہ کو ہر وقت موضوع کیوں بنایا جاتا ہے اور وہ ہر وقت سب کی ہمدردیاں کیوں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اسکول میں پڑھاتی ہیں' اچھی خاصی تنخواہ ملتی ہے' اپنے خرچ خود پورے کریں۔ عید کے لیے اپنے کپڑے بنائیں' اپنی بہن کے بھی بنائیں۔ اول تو انہیں اپنے کھانے کے پیسے دینے چاہئیں اور اگر نہیں دیتیں تو اپنا کھانا پینا علیحدہ کر لیں اور اگر اپنے ساتھ امی کو بھی شامل کرنا چاہیں تو بے شک کر لیں مگر اپنے ہاتھ کی مٹھی تو ڈھیلی کریں۔ یہ کیا کہ ہر ایک پر نظر ہے کہ فلاں کو میرے ساتھ یہ کرنا چاہیے اور فلاں کو یہ کرنا چاہیے۔ ارے بھئی' اس مہنگائی میں کوئی کسی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا ہے' ہاں۔'' دلنواز نے اپنی بات ختم کر کے سب کو دیکھا۔

☆☆☆

ممانی جان کسی خاتون کو لے کر آئی تھیں۔ خاتون کے ہمراہ ان کی چاروں بیٹیاں بھی تھیں۔ امی نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ نگین سامنے نہ آئے مگر اس نے کمرے کی جھری سے سب کو دیکھنے کا پروگرام

الا تھا اور اس کی بھنک بھی امی کو نہیں تھی۔

گھر کو نک سے سک تک درست کر دیا گیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ امی ڈرائنگ روم کے لیے ایک سینٹری اور دو صورت ڈیکوریشن پیس تک خرید لائی تھیں۔ کشن کور تک نئے چڑھائے گئے تھے۔

چائے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا اور ہلکے کاسنی سوٹ میں فہمی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

''میرا ایک ہی لڑکا ہے' مجھے چندے آفتاب اور چندے ماہتاب سی دلہن چاہیے'' لڑکے کی ماں فہمی کو دیکھ کر چھ زیادہ خوش نہیں ہوئی تھیں حالانکہ فہمی ان کی چاروں کالی سی بیٹیوں کے سامنے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ب ناٹے قدوں کی تھیں مگر لمبائی کی کمی موٹاپے نے پوری کر دی تھی۔

''ہماری بھابی نے تو پچاس لڑکیاں دیکھ کر اپنے بیٹے کا رشتہ کیا تھا'' خاتون تو فخر سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ ساٹھ ستر دیکھ لیجیے گا'' امی نے کلس کر کہا۔ مہمانوں کے چہروں سے کچھ کچھ اندازہ تو انہیں ہو ہی چلا تھا۔

''نہیں بھئی' ہم تو سیدھے سادے سے لوگ ہیں جو ہمیں اچھی لگی' اسی کو بیاہ کر لے جائیں گے مگر ابھی تک کوئی پسند ہی نہیں آ رہی۔ لگتا ہے کہ اب حسن کا کال سا پڑ گیا ہے' جدھر جاؤ اینگی بینگی سی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔''

اب وہ خاتون ہنس رہی تھیں اور ان کی ناک کی ہیرے کی لونگ بھڑک سی رہی تھی۔

فہمی باجی اور امی کے ادھر ادھر ہونے پر انہوں نے ممانی سے صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارے جمال کے لیے تو مناسب نہیں ہے۔

''بھئی' میں نے تو تمہیں پہلے ہی تصویر دکھا دی تھی اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ گوری نہیں ہے' سانولی ہے مگر تمہاری لڑکیوں سے اجلی ہے۔ یہ سب باتیں سن کر تم آنے کے لیے کس قدر بے تاب تھیں۔ تین روز سے میرے گھر کے چکر لگا رہی تھیں کہ لے جا کر دکھا دیں اور اب آئی ہو تو مزاج ہی نہیں مل رہے۔''

''ہم تو ایسے ہی آ گئے کہ دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے حالانکہ بھائی جان نے کہہ رکھا ہے کہ گریجویٹ سے کم سے شادی نہیں کروں گا مگر کل ہم جس لڑکی کو دیکھنے جائیں گے وہ انٹر ہے اور پرسوں جانے کا جہاں پروگرام ہے وہ تو ابھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی ہے مگر اس طرح جانے سے معلومات تو بڑھتی ہیں کہ کس کا دل ہے اور کس کا نہیں۔''

''اس حرج میں لوگوں کا کتنا خرچ ہو جاتا ہے۔'' ممانی جان لوازمات سے بھری ٹرالی کو دیکھتے ہوئے تاسف سے کہہ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر شرمندگی کے آثار بے حد نمایاں تھے۔

''آپا' یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ یہ سب تو لوگ اپنی عزت کے لیے کرتے ہیں بلکہ ہم اس سے پہلے جس گھر میں گئے تھے تو انہوں نے لڑکی کو سارا زیور پہنا کر ہمارے سامنے کیا تھا۔ (ان کے ہاں دستور ہی یہی تھا اور مجھے تو بہت پسند بھی آیا) جو چیزیں وہ اپنی بیٹی کو جہیز میں دینا چاہتی تھیں' وہ سب انہوں نے لڑکی کو پہنا دی تھیں۔ (کہ لڑکے والوں کو اندازے نہ لگانا پڑیں) ہم تو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ سر سے پیر تک وہ سونے میں لدی تھی' جیسے گوندنی کا پیڑ ہو۔ اگر دو چار لڑکے ہوتے تو اسی وقت رشتہ دے دیتی مگر ہماری بھی مجبوری ہے کہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے' سارے ارمان اسی کے توسط سے نکالنے ہیں اور خاندان میں بھی اپنا سر اونچا رکھنا ہے۔ وہ لڑکی تھی تو بہت اچھی مگر چھوٹے قد کی تھی۔ اسی لیے ہم نے اسے پسند نہیں کیا کہ جہیز تو سب ہی دیتے ہیں مگر لڑکی بھی تو اچھی ہونی چاہیے' جسے دیکھ کر سب کہیں کہ واہ خالدہ' کیا بہو لے کر آئی ہو۔ ایسی تو کسی کے ہاں نہیں آئی۔ واہ خالدہ' تم نے تو

کمال کر دیا۔ واہ خالدہ، تم نے تو سب کو ہرا دیا۔"

"بڑے اونچے پروگرام ہیں آپ کے' آپ کو تو کسی ماڈل گرل کو دیکھنا چاہیے۔ سانچے میں ڈھلی خوبصورت سی لڑکی مل جائے گی۔ اگر اس کے معیار پر آپ کے سپوت پورے اترے" ممانی جان نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔ انہیں اپنی پڑوسن کی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"ایک ہی تو میرا بیٹا ہے' اس کے لیے حور نہیں لاؤں گی تو کس کے لیے لاؤں گی۔" اب ان صاحبہ کی چکنی سی ناک کے نتھنے بھی پھڑک رہے تھے۔ وہ شاید اسی موضوع پر مزید کوئی تقریر کرنا چاہتی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ میں شاید آپ کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکی تھی۔"

امی تو ممانی جان کو مزید روکنا چاہ رہی تھیں مگر ممانی جان اپنے مہمانوں کو لے کر جلد چلی گئیں۔

اور اس شب فہمی باجی پر دورہ پڑ گیا۔

ابا جی کے سامنے باجی کی یہ کیفیت پہلی مرتبہ ہوئی تھی' وہ بے حد پریشان سے ہو گئے۔

"کہیں یہ مرگی تو نہیں ہے۔ سنا ہے اسی میں دورے پڑتے ہیں" وہ امی جان سے پوچھ رہے تھے۔

"نہیں' کسی دشمن نے اس پر عمل کروایا ہے اور اس کا رشتہ بھی باندھ دیا ہے اس لیے اس پر دورے پڑنے لگے ہیں۔ یہ اس پر ساتواں دورہ پڑا ہے۔"

"فیروزہ! بے وقوفوں جیسی باتیں نہیں کرو' میں کل ہی کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ ٹھیک ہو جائے گی میری بچی!"

"ڈاکٹروں کے پاس اس کا علاج نہیں ہے' ایسے کیس صرف عامل حل کر سکتے ہیں۔ میں پرسوں پھر ایک بابا کے پاس گئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سارا وظیفہ وہ خود پڑھیں گے۔ چاند کی تاریخوں میں جنگل میں جا کر پڑھنا ہوگا۔ اس کام کے پیسے بھی وہ نہیں لیں گے مگر جو بچی کا صدقہ وہ دیں گے اس کے لیے انہوں نے پچیس ہزار مانگے ہیں۔"

"ایسی باتیں سچا عامل نہیں کرتا ہے' تم یقیناً کسی ڈبا پیر کے پاس ہو آئی ہو۔ اس چکر میں پھنس گئیں تو کبھی نکل نہ پاؤ گی۔ میں نے بے شمار لوگ دیکھے ہیں جو الٹی سیدھی باتوں پر یقین کر کے اپنا وقت اور پیسہ دونوں ہی تباہ کرتے ہیں۔" ابا جی نے انتہائی مشتعل لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں فہمی کو برباد کر دوں؟" امی کا غصے اور رنج سے برا حال تھا۔

"یہ میں نے کب کہا ہے؟"

"مگر ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ پچھلی گلی کی شبانہ کو بھی ایسا ہی مرض لاحق ہوا تھا۔ اس کی ماں نے ڈاکٹروں کا بے حد علاج کروایا۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب وہ بابا سے علاج کروا رہی ہیں اور بچی کو اچھا خاصا افاقہ بھی ہے۔"

"مگر فہمی کا علاج ڈاکٹر ہی کرے گا۔ یہ بات تم اچھی طرح سمجھ لو فیروزہ! اور اگر تم اس کو لے کر کسی بابا کے پاس گئیں تو یاد رکھنا' مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم شاید جانتی نہیں ہو' میں غصے میں کس نہج تک جا سکتا ہوں۔" ابا جی غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ اس شب انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میری فہمی مر جائے گی" امی نے اپنے آپ سے کہا اور سورہ مومنون کی آخری چار آیات پڑھ کر باجی کے کانوں میں پھونکنے لگیں جو آج ہی ممانی جان نے فون پر امی کو بتائی تھیں۔

باجی چپ چاپ امی کے پاس لیٹی تھیں اور ان کی آنکھیں بند تھیں مگر نگین کو لگ رہا تھا کہ ان کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے۔ ایک ہلکی سی رلائی اس نے ان کے اوپر ڈال دی۔

فہمی نے ایک تشکر بھری نظر نگین پر ڈالی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

رات خاصی بیت چکی تھی' نگین اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی اس نے اپنی ڈائری لکھنی تھی جو اس کا روز کا معمول تھا اور پھر کلمے کی پوری تسبیح بھی پڑھنی تھی' جس کی وجہ سے وہ اپنے خوابوں سے محفوظ ہو گئی تھی۔ کتنے ہی سارے دن ہو گئے تھے' اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ اگر میں تسبیح نہ پڑھوں تو......" اس کے دل نے بہکایا۔

☆☆☆

فہمی باجی کا علاج ڈاکٹر بینش کر رہی تھیں۔ وہ مشہور و معروف ماہر نفسیات تھیں۔ انہوں نے اس بیماری کو سو فیصد سائیکی کیس قرار دیا تھا۔

"ہمارے گھرانوں میں لڑکی کی شادی کا ذکر اور اس کے حوالے سے باتیں اس قدر ہوتی ہیں کہ حساس ترین لڑکیاں اپنی سوچوں کا محور صرف ایک ہی نقطے پر مرتکز کر دیتی ہیں اور ان کی تنہائیاں ہمہ وقت اسی نقطے کے گرد دائرے کی صورت میں گھومنے میں صرف ہوتی ہیں اور جب کسی وجہ سے ان کا یہ دائرہ ٹوٹ جاتا ہے تو یہ نقطہ مرکز سے ہٹ جاتا ہے۔" "ایسے میں ذہنی خلفشار اعصاب پر اثر ڈالتا ہے اور اعصاب سے جسم کا نظام متاثر ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر بینش نے ایسے کیسز کا بھی ذکر کیا جس میں لڑکیاں اپنے خیالات' اپنے تصورات میں اتنی انوالو ہوتی ہیں کہ جب دل چاہے' وہ اپنے اوپر دورہ ڈال لیتی ہیں۔

"ایسی صورت میں مریضوں کو تنہائی سے بچایا جائے اور ان کا شیڈول ایسا ٹائٹ رکھا جائے کہ فرصت کا کوئی لمحہ ان کو میسر نہ ہو۔"

باجی کو مصوری کا شوق تھا۔ ابا جان ڈھیر پینٹنگز کا سامان اٹھا لائے تھے۔ باجی کو مطالعے کا بھی شوق تھا۔ نگین نے دلچسپ اور شگفتہ کتب کا ڈھیر لگا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شام کو وہ انہیں واک پر بھی لے جانے لگی تھی۔

گھر کے قریب ہی ایک پارک تھا' جہاں نگین اور فہمی روز ہی جاتیں۔ آدھے گھنٹے جوگنگ ٹریک پر بھی دوڑتیں اور جب گھر آتیں تو پسینے سے تر ہوتیں۔

اس شام پارک سے واپس آئیں تو دونوں ہی تھکن سے چور تھیں۔ سوچا تھا کہ شاور لے کر تھوڑی دیر آرام کر لیں گی مگر جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں تو گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

نگین نے باجی کو اور باجی نے نگین کو حیرت سے دیکھا۔ فہد ٹی وی لاؤنج میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان لٹکائے گا رہے تھے

اس بے وفا کا شہر ہے
اور ہم ہیں دوستو

"واہ بھئی واہ! یہاں تو محفل غزل چل رہی ہے۔ فہد بھائی! آپ ٹی وی پر کیوں نہیں گاتے۔ ہم اپنی سہیلیوں میں شو بھی مار سکیں گے کہ ہمارا کزن ٹی وی کا سنگر ہے۔" نگین نے ہنس کر کہا۔

"شو تو تم ابھی بھی مار سکتی ہو......" وہ کھنکھارے۔

"کیا ماروں گی میں شو کہ ایک شام کے غیر معروف اخبار میں میرا کزن جاب کرتا ہے۔ ارے شام کے اخبار

تو کوئی اتنی رغبت سے پڑھتا بھی نہیں ہے۔’’ وہ ہونٹ دبا کر بولی۔

‘‘اتنا اچھا گانا گا رہا تھا‘ لے کر سب ختم کروا دیا۔’’ امی چاول چنتے ہوئے بولیں۔ فہد بھائی کو دیکھتے ہی بریانی پکانے کی تیاری شروع کر دیتی تھیں۔

‘‘ہاں فہد بھائی! پلیز ..... آج کچھ سنا ہی دیں۔’’

‘‘دل تو چاہتا ہے کہ ایک دن سب کچھ سنا ہی ڈالوں‘’ ان کے خواب ان کے لبوں پر جگمگانے لگے۔

‘‘فہد! اگر کوئی غزل سنا رہے ہو تو میں بیٹھوں ورنہ میں شاور لینے جا رہی ہوں‘’ فہمی باجی نے کہا۔

تب فہد نے پروفیشنل گلوکار کی طرح تقریر کی‘‘ آج موڈ نہیں ہے‘ طبیعت بھی نرم گرم سی ہے۔ آواز میں بم کھر ونچ ہے‘’ اور پھر وہ کھنکھارے اور کانی آنکھوں سے نگین کو دیکھا۔

‘‘اگر ترانے کی کوئی اور ادا بھی یاد ہو تو اس سے بھی فیض یاب ہو جائیں‘’ نگین نے گھڑکا۔

تب فہد نے آنکھیں بند کر کے میچائیں‘ نتھنے پھلائے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان لٹکائے او گانے لگے

مجھے دیکھ کر جب تم یوں ٹھنڈی آہیں بھرتی ہو
اچھی لگتی ہو ...... اچھی لگتی ہو

فہد کا گانا خاصا طویل تھا‘ نگین نے مسکراتے لبوں سے فہمی باجی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں دبے پاؤں اٹھ گئیں۔

اور جب گانا ختم کر کے انہوں نے داد حاصل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں تو امی جان چاول چننے کے بجائے ٹکر ٹکر اپنے بھتیجے کو دیکھ رہی تھیں اور ان کی آواز کے واری نیاری جا رہی تھیں۔

‘‘اے لو! مجھے تو پتا ہی نہیں چلا آج تک، میرے بچے کی اتنی اچھی آواز ہے۔ اب کے میلاد شریف میں نعتیں تم ہی پڑھنا۔’’

‘‘چھوڑیے پھوپو! مجھے کہاں آتا ہے گانا وانا‘ نہ ہی میری کوئی آواز اچھی ہے‘’ وہ خفت سے کہہ رہے تھے۔

‘‘لیجیے‘ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا یخ ملک شیک اور چٹپٹی لوبیے کی چاٹ۔’’ نگین ٹرے میں لے کر آئی اور فہد کے سامنے رکھ دی۔

فہد نے گلاس اٹھا کر ایک شکایتی سی نظر نگین پر ڈالی اور ایک سانس میں گلاس خالی کر کے واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

‘‘اوہ‘ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا‘ آپ کو تو چائے دینی چاہیے تھی‘ میں نے خواہ مخواہ ملک شیک دے دیا’’ وہ شرارت سے ہنسی۔

‘‘اس بلا کی تو گرمی پڑ رہی ہے‘ کس سے پی جاتی چائے’’ امی برا سا منہ بناتے ہوئے بولیں۔

‘‘میں تو فہد بھائی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ گلوکاروں کو اپنے گلے کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب اتنا ٹھنڈا ملک شیک انہوں نے پی لیا‘ خدا نہ کرے اگر ان کی آواز بیٹھ جائے تو خواہ مخواہ کی پریشانی تو ہو جائے گی ناں۔’’

‘‘ارے تو کیا ہو جائے گا‘ کیا بیٹھی ہوئی آواز صحیح نہیں ہوا کرتی ہے؟’’ امی کی جو سمجھ میں آ رہا تھا‘ بولے چلی جا رہی تھیں۔

‘‘اونہہ‘ آپ کو نہیں پتا امی! اگر فہد بھائی کی آواز خراب ہو جائے گی تو پھر یہ بہت ہی برا گائیں گے ...... بہت ہی برا‘’ نگین کی آنکھوں میں شرارت تھی مگر فہد حسب عادت ہنسنے کے بجائے چپ سے ہو گئے‘ یوں جیسے انہیں نگین کا مذاق اچھا نہ لگا ہو۔

‘‘اچھا پھوپو! چلتا ہوں میں‘ پھر آؤں گا۔’’

‘‘ارے‘ میں تو تمہارے لیے بریانی پکا رہی ہوں‘ وہ کھا کر جانا۔’’

‘‘نہیں‘ پھر کبھی سہی۔ اس وقت تو مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔’’ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

‘‘کسی کنسرٹ میں تو نہیں جا رہے ہیں آپ؟’’ نگین نے پھر انہیں چھیڑا۔

‘‘نہیں .....’’ اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

زیتون کے تیل کو ہلکا سا کنکنا کر کے پورے سر کی تقریباً ایک گھنٹے مالش کی‘ چہرے کا فیشل کیا اور پھر پیڈی کیور اور مینی کیور کیا۔ ریڑھ کی ہڈی کا مساج علیحدہ تھا۔

‘‘ہوگی کوئی مجھ جیسی بہن ......؟’’ مالش کر کے نگین نے پوچھا۔

‘‘نہیں‘ بالکل نہیں۔’’ فہمی نے مسکرا کر کہا۔ یوں بھی ڈاکٹر بینش کی ہدایتوں پر مکمل عمل ہو رہا تھا اور اس کے نتائج بھی مثبت حاصل ہو رہے تھے۔ کہاں تو ہر دوسرے دن فہمی کو دورہ پڑ رہا تھا اور اب پندرہ دن میں صرف ایک دفعہ پڑا تھا‘ وہ بھی گھر والوں کی غفلت سے۔ انہوں نے ٹی وی پر ایک ایسی مووی لگا دی تھی جس میں ہیروئن کی شادی کا ہونا ایک عذاب دکھایا گیا تھا۔

‘‘اب لیجیے‘ کھائیے یہ مینگو کسٹرڈ۔ بطور خاص آپ کے لیے بنا کر ٹھنڈا کیا ہے اور اس کے اوپر کی ساری ڈریسنگ میرا اپنا کمال ہے۔ مہندی کے کون کی طرح کریم کی ٹیوب سے یہ سارے گل بوٹے میرے زرخیز ذہن کی اختراع ہیں۔ دیکھیے تو کیسا خوبصورت پھولوں کا جال بنایا ہے جبکہ میری ڈرائنگ بھی بری ہے۔’’

‘‘ہاں‘ سارے پھول آم جیسے لگ رہے ہیں’’ فہمی نے شرارت سے کہا۔

‘‘دیکھیے‘ تنقید بالکل نہیں ہوگی ورنہ یہ پورا باؤل آپ کو ختم کرنا ہوگا۔’’

‘‘تم بے فکر رہو ...... بہت ٹیسٹی ہے۔ منٹوں میں صاف ہوگا۔’’

نگین اپنی باجی پر بھرپور توجہ دے رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ فہمی کی طبیعت دھیرے دھیرے بہتر ہو رہی تھی۔

دونوں بہنیں ہنسی مذاق کے ساتھ کسٹرڈ کھانے میں مصروف تھیں۔

‘‘فہد آئے گا شام کو ......’’ امی ہاتھ پونچھتے ہوئے کمرے میں آئیں تو انہوں نے پہلی بات یہی کی۔

‘‘پھر کیا حکم ہے آپ کا؟’’ نگین نے فہمی کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

‘‘اس کے لیے بھی کسٹرڈ بنا کر رکھ دو۔ وہ میٹھا شوق سے کھاتا ہے۔’’

‘‘فریج میں دو باؤل اور رکھے ہوئے ہیں۔ ایک آپ فہد بھائی کو کھلا دیجیے گا مگر دوسرا بڑا والا میری فہمی باجی کے لیے ہے‘ وہ کسی کو نہیں ملے گا۔’’

‘‘کیوں‘ تم کیا کہیں جا رہی ہو؟ تم خود ہی کھلا دینا اور ایک آدھ چیز اور بنا لو‘ میرا بھتیجا ہے وہ آخر ......’’ امی نے کہا۔

‘‘اس وقت تو میں فون سننے جا رہی ہوں‘ جس کی گھنٹی کافی دیر سے چیخ رہی ہے۔ ہاں بریانی آپ ہی پکائیے گا‘ مجھ سے نہیں بنتی ہاں ...... اور بریانی کے بغیر وہ کچھ کھاتے نہیں ہیں۔’’

لاؤنج میں آ کر ریسیور اٹھایا اور ابھی السلام علیکم ہی کہا تھا کہ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ جیسے کوئی قصداً

بولنا نہ چاہتا ہو۔ ہاں، گہرے گہرے سانس لینے کی آواز بدستور آ رہی تھی۔

''ہیلو...... آواز نہیں آ رہی...... ہیلو......؟''

مگر لگتا تھا کہ کسی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

''اگر کوئی بولنا نہیں چاہ رہا تو میں ٹیلی فون بند کر رہی ہوں۔ اتنا فالتو وقت نہیں ہے میرے پاس کہ گونگے فون بھی سنوں'' وہ بڑبڑائی۔

''پلیز! ٹیلی فون بند نہیں کرنا۔'' زبور نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''تم......!'' اس کی آواز سن کر نگین کو حیرت تھی۔

''نگین! کیا تم اپنی ناراضگی ختم نہیں کر سکتیں؟'' زبور بڑے شکستہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں، اگر تمہاری اوقات دو کوڑی کی ہوئی تو یہاں فون کرو گے۔'' (اس کے لہجے کا جلال بڑھ رہا تھا)

''میں تو تمہارے سامنے اپنے آپ کو دو کوڑی کا بھی نہیں سمجھتا۔''

''پھر فون کرنے کا مطلب......؟''

''میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا مگر اپنی خفگی ختم کر دو۔''

''میں اپنی خفگی ختم کروں یا نہ کروں، اس سے تمہیں کیا فائدہ......؟ اور پھر جب میرا تم سے کوئی واسطہ ہی نہیں تو ان باتوں کا مطلب؟ لگتا ہے عجیب سر پھرے شخص ہو۔'' وہ بے رحمی سے ہنسی۔

''یہ تم نہیں سمجھو گی نگین! بالکل بھی نہیں سمجھ سکو گی۔ بہت سی باتیں صرف محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ محبت تو دل دو ندی کی طرح چلتی ہے اور خود ہی اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔ یہ کسی کو کہاں لے جائے گی، یہ اس کو پتا ہی نہیں ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک ندی مجھے بھی اپنے ساتھ بہائے لے جا رہی ہے مگر تمہیں یہ ادراک ہو ہی نہیں سکتا'' وہ دکھی سے لہجے میں ہنسا۔

''اس او کے...... ہاں مجنوں جی! اپنی بات پر قائم رہنا۔ مجھے تمہاری شکل اب نظر نہیں آنی چاہیے، انڈر اسٹینڈ؟'' اور اس کا جواب سنے بغیر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اور پھر...... وہ واقعی اسے نظر نہ آیا۔

''خس کم جہاں پاک'' وہ دل ہی دل میں خوش ہو گئی۔ فریال سے بھی اس کا رابطہ برائے نام کا ہی رہ گیا تھا۔

وہ تو چاہتی تھی کہ ہر ربط ہی ختم ہو جائے مگر اچانک ہی فہمی باجی کا رشتہ طے ہو گیا، اس دفعہ منگنی کی رسم نہیں ہوئی تھی صرف بات پکی ہوئی تھی اور شادی ایک سال بعد متوقع تھی۔

فہمی کے سسرال سے چار ٹوکرے مٹھائی کے آئے تھے جسے عزیز و اقارب میں بانٹا جا رہا تھا۔ رسم کے دن تو کسی کو بلایا نہیں گیا تھا، اب مٹھائی بھیج کر سب کو اطلاع بھی دی جا رہی تھی۔

گھر میں سب ہی بہت خوش تھے۔ ایسے میں فریال کی طرف کا ملال بھی اس کے دل سے از خود ختم ہو گیا تھا اور ان کے ہاں مٹھائی لے کر وہ خود پہنچ گئی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم فہمی باجی کی تو کیا، اپنی شادی کی مٹھائی تک نہیں کھلاؤ گی، بلانا تو دور کی بات ہے۔''

''اچھا......'' وہ ہنس پڑی۔

''فہمی باجی کے سسرال والے کیسے ہیں؟'' فریال نے پوچھا۔

''ممانی جان کے جاننے والے ہیں، اچھے ہی ہیں۔''

''شادی کب تک ہو گی؟''

''ایک سال تو لگ جائے گا۔ دولہا میاں بسلسلۂ ملازمت دوبئی میں ہوتے ہیں، جب وہ اپنی سالانہ چھٹیوں ں گھر آئیں گے تو شادی ہو گی۔''

''ایک سال تو پتا بھی نہیں لگے گا، یوں بھی وقت تو پر لگا کر گزر رہا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ ایک سال کا عرصہ تو تیاریوں میں ہی گزر جاتا ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ تم نے اپنی ناراضگی ختم کر دی، میں تو بیمار پڑ گئی تھی کہ ذرا سی بات پر بچپن کی سہیلی چھوٹ گئی۔'' فریال نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے محبت سے کہا۔

''پرانی باتوں پر مٹی ڈالو۔ کوئی دوسری بات کرو۔ اتنے عرصے بعد تم سے مل رہی ہوں۔ سچ، تمہاری رارتیں بہت یاد آتی تھیں۔ جب اسکول میں تم، ثمرہ کا لنچ کھا لیا کرتی تھیں اور وہ بے چاری یہی سمجھا کرتی تھی اس کی امی نے خالی ڈبا دے دیا، لنچ رکھنا بھول گئیں۔

''ہاں نگین! یادیں تو دل سے جڑی ہوتی ہیں۔ ان کو بھلانا مشکل ہوتا ہے، خاص طور پر بچپن کی یادیں تو کبھی لائے نہیں بھولتیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... جب ہی تو میں سب سے پہلے مٹھائی لے کر تمہارے پاس آئی ہوں۔''

''یہ سال تو چٹکی بجاتے میں گزر جائے گا، تم کہو تو میں شادی میں اپنے ساتھ عدیل کو بھی لے آؤں۔ شادی ی تقریب میں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کون کہاں سے آیا ہے؟'' فریال شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

''میرے خیال سے نہیں کہ پھر تمہارا یہ جملہ ہو گا کہ عدیل کے دوستوں کو بھی بلا لوں'' نگین نے سرزنش کرتے ئے کہا۔

''ارے زبور تو اب نظر ہی نہیں آتا۔ اس نے تو اپنا یہ سمیسٹر بھی مس کر دیا ہے۔ بہت شرمندہ سا تھا بے چارہ۔ اس کی وجہ سے میری دوستی پر بھی بال آ گیا۔ عدیل اس کو فون کر کر کے تھک جاتے ہیں مگر وہ نہیں ...... ایک ایک کر کے اس نے اپنے سب دوست چھوڑ دیے ہیں۔''

''اچھا، اب میں چلتی ہوں۔ ابھی اپنے محلے میں بھی مٹھائی بانٹنی ہے۔'' اس نے اس کی بات انتہائی بے ہجی سے سنتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ہمی باجی کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد ایک بار بھی انہیں دورہ نہیں پڑا تھا۔ نکھوں کی چمک اور چہرے کی سرشاری بڑھ سی گئی تھی۔

امی نے جہیز کی چیزیں خریدنی شروع کر دی تھیں اور فہمی باجی اپنے جہیز کا سامان گنگناتے ہوئے پیک کر کے ی پیٹی میں رکھا کرتی تھیں۔

امی شروع سے ہی اپنا کام وقت سے پہلے کرنے کی قائل تھیں۔ اس لیے روز ہی کہیں نہ کہیں چلی جاتیں اور اپنی فہرست کے حساب سے کچھ نہ کچھ خرید کر لے آتیں۔

ایک دوپہر بیڈ کورز خریدنے کے بعد وہ قریبی کیفے میں آئس کریم کھانے امی کے ساتھ چلی آئی۔ ابھی اس پ سے چمچہ لے کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ اچانک سامنے نظر پڑی۔

زبور اکیلا اداس سا بیٹھا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی' بکھرے ہوئے بال اور کھوئی کھوئی سی آنکھیں۔

کتابیں اس کی میز پر رکھی تھیں۔ کولڈ ڈرنکس کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

زبور کی نظر جیسے ہی نگین پر پڑی، وہ خفیف سا ہو کر فوراً کیفے سے باہر نکل گیا۔ جیسے اس کے وہاں بیٹھنے سے نگین کا کوئی نقصان ہو رہا ہو۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا بات تھی؟ وہ جتنا اس سے بھاگ رہی تھی' اتنا ہی وہ اس سے ٹکرا رہا تھا۔

اس دن ایک کزن لاہور سے اس کے پاس آ رہی تھی۔ وہ ائرپورٹ اسے لینے گئی تھی...... اور جب وہ اسے سامنے سے آتا دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی تو سہیلی سے پہلے زبور آتا دکھائی دے گیا تھا۔

پہلے تو وہ اسے یوں سرشار سا دیکھ کر حیران ہوا مگر جب دیکھا کہ نگین کے مہمان اس کے ہمراہ ہی آئے ہیں تو نظریں جھکا کر وہ پاس سے گزر گیا۔ جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو۔

اور پھر اگلے دن اس سے پھر سامنا ہو گیا۔ ممانی جان کا گائنی کا کوئی آپریشن اچانک ہی ہو گیا تھا۔ اس دن امی صبح سے ہی ممانی کے پاس تھیں۔ شام کو اس کے ساتھ انہیں واپس آنا تھا۔

وہ لفٹ میں سینوتھ فلور پر جا رہی تھی۔ سیکنڈ فلور سے جب زبور لفٹ میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

''خیریت نگین!'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں' سب ٹھیک ہے۔''

''پھر...... تم یہاں......؟'' اس کی تسلی کسی طرح نہیں ہو رہی تھی۔

''میری ممانی بیمار ہیں۔'' اس دن شاید وہ آدمیوں کی جون میں تھی۔

''تم کہو تو میں لفٹ سے اتر جاؤں؟ اگر میری وجہ سے تمہیں کوفت ہو رہی ہو؟''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

مگر سیکنڈوں کا راستہ اسے کتنا طویل لگا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہی تھی، اگر لفٹ خراب ہو گئی' تو کیا ہو گا؟

وہ اپنے فلور پر اسے بغیر دیکھے اتر گئی۔ مگر زبور اسے اس وقت تک برآمدے میں کھڑا دیکھتا رہا جب تک کہ وہ راہداری میں دوسری سمت مڑ نہیں گئی۔

اور پھر اس دن تو حد ہی ہو گئی۔ وہ جیولر کے ہاں باجی کے لیے سیٹ پسند کر رہی تھی۔ امی اس کے برابر بیٹھی تھیں اور بڑی دلچسپی سے زیورات کا معائنہ کر رہی تھیں۔

فہمی باجی باوجود اصرار کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔ چار پانچ سیٹ سامنے کھلے رکھے تھے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جڑاؤ سیٹ لے یا سادہ سونے کا۔

''اب لے بھی چکو'' امی نے ٹہوکا دیا۔

''یہ والا ٹھیک رہے گا'' اس نے بڑے سے بالے والا سیٹ اٹھایا' اس کا ہار تکونی طرز کا تھا۔ ''باجی پر یہ اچھا لگے گا'' اس نے ماں سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا...... آج کل کس طرح کے زیور لڑکیوں کو پسند آتے ہیں۔ فہمی نے جب تمہاری پسند کو اپنی پسند کہہ دیا ہے تو کوئی سا بھی لے لو' مجھے تو سب ہی اچھے لگ رہے ہیں۔''

''یہ بڑے جھالے والا رانی ہار کے ساتھ کا سیٹ بھی تو اچھا ہے ناں؟'' نگین اب دوسرے سیٹ کو دلچسپی سے

یکھ رہی تھی' جس کا ٹیکا بھی اسی ڈیزائن کا تھا۔

اس بڑی سی دکان میں سارے سیٹ ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور فیصلہ کرنا بہت مشکل کام نظر آ رہا تھا۔

یہ لے لوں' نہیں یہ اچھا ہے۔ نہیں یہ زیادہ اچھا......

''نگین! اب لے بھی چکو' بہت دیر ہو گئی ہے۔'' امی نے کہا۔ یوں بھی آج بہت دیر ہو گئی تھی اور ابھی تک انہوں نے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔

ابھی وہ تذبذب کا شکار ہی تھی کہ کونے میں رکھا چک پٹی کے ساتھ کا سیٹ جس میں بڑے بڑے جھمکے ہاروں کے ساتھ تھے' اس کے سامنے کسی نے رکھا اور کہا۔

''میرے خیال سے یہ بہت خوبصورت ہے اور پہن کر اچھا بھی بہت لگے گا۔ بالکل نیا نکور اڈیزائن ہے۔ اس میں نفاست بھی ہے اور خوبصورتی بھی اور دلکشی تو بے حد ہی ہے۔''

''ہاں واقعی'' اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ پتا نہیں کیوں' اس کی نظر اس سیٹ پر کیوں نہیں گئی تھی۔ اس نے سیٹ کا ٹیکا اپنے ماتھے پر لگا لیا۔

اور تشکر بھری نظریں جب اس نے اوپر اٹھائیں تو سامنے زبور کھڑا تھا اور اس کے اس روپ کو دیکھ کر تو وہ گنگ سا ہو گیا تھا۔ آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔

''تم...... اور یہاں......؟'' اس نے بھری ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کا کیا حشر کر ڈالے گی۔

''یہ میرے بڑے بھائی کی دکان ہے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھتا ہوں یا پھر اپنی دوبئی والی شاپ پر چلا جاتا ہوں'' اس نے رک رک کر بڑے سنبھل کر کہا۔

''یہ کوئی تمہارے ابو کا جاننے والا ہے کیا؟ اگر ہے تو کوئی رعایت بھی کر دے گا یا نہیں'' امی نے گو رازداری سے ہی کہا تھا مگر ان کے جملے زبور کے کانوں میں بھی پڑ گئے تھے۔

''آنٹی! آپ صرف پسند کیجئے۔ یہ آپ کی اپنی دکان ہے۔ قیمت کی تو آپ فکر ہی مت کیجئے۔''

''نہیں' یہ سیٹ مجھے پسند نہیں آ رہا۔ کسی دوسری جگہ دیکھتے ہیں۔'' نگین اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بیٹا' ابھی تو تمہیں بہت پسند آ رہا تھا۔ اب ایک منٹ میں اس میں کیا کیڑے نکل آئے۔'' انہیں بھی غصہ آ گیا۔ (اچھے خاصے ایک کام سے نمٹ جاتے۔ اب پھر دوسری دکانوں میں دھکے کھاؤ)

''نہیں امی! بس چلیں یہاں سے' مجھے یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ بے حد چیپ سا لگ رہا ہے۔ مجھے اندازہ ہے اس ٹائپ کی جیولری باجی کو بالکل پسند نہیں ہے' وہ تو اس کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گی۔ اونہہ! یہ بھی کوئی ڈیزائن ہے۔ حلق تک کو دباتا ہوا گلوبند...... اور اگلدان کے ڈیزائن کے جھمکے۔'' نگین کرسی پیچھے کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

اور زبور کے لبوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

☆☆☆

لوگ کہتے ہیں کہ پیری انسان کو جھکا دیتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ والدین کا سر اولاد بھی جھکا دیتی ہے مگر شائستہ بیگم کو پیری اور اولاد کے ساتھ ساتھ حالات نے بھی جھکا دیا تھا۔

اول تو وہ کہیں آنے جانے کی شوقین ہی نہیں تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد ان کا اپنے گھر کے سوا کہیں دل

ہی نہیں لگتا تھا اور اگر مجبوری میں انہیں کہیں جانا پڑ جاتا تو مارے باندھے جاتیں۔

ان کی کوئٹہ والی خالہ عرصے سے بیمار تھیں۔ پہلے تو وہ گاہے بہ گاہے انہیں جا کر دیکھ آیا کرتی تھیں مگر اب تو عرصہ ہو گیا تھا خالہ کے پاس گئے ہوئے۔

ان کی بیماری مزید بڑھی تو انہوں نے کئی فون کر ڈالے کہ آن کر دیکھ جاؤ' شاید میرا وقت قریب آ گیا ہے۔

شائستہ بیگم کو اپنی کوئٹہ والی خالہ سے بہت محبت تھی۔ انہیں یاد تھا کہ کوئٹہ والی خالہ نے ان کے بچپن میں بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ خالہ کی بیماری سن کر وہ بے چین سی ہو گئیں۔

''یہ کوئٹہ والی خالہ کیا نام ہوا' آپ کی دوسری خالہ سکھر میں رہتی ہیں' ان کو تو آپ سکھر والی خالہ نہیں کہتیں'' ثریا (بڑی بہو) نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ نام ہم نے ہی رکھا تھا۔ ہماری یہ خالہ کراچی سے باہر کبھی نہیں نکلی تھیں۔ خالو ابا کو بھی باہر کہیں جانے سے دحشت ہوتی تھی' ایک بار نہ جانے کیسے اور کس کی شادی میں خالو ابا خالہ کو کوئٹہ لے گئے' وہاں یہ لوگ دو ہفتے رہ کر آئے مگر جب بھی ان کے گھر کوئی جاتا' خالہ کوئٹہ کی کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتیں' تب ہم نے اپنی خالہ کا نام کوئٹہ والی خالی رکھ دیا تھا۔ جس کو سن کر وہ مسکرا دیا کرتیں اور پھر یہ نام ایسا پڑا کہ چھوٹے بڑے سب ان کا اصلی نام لینے کے بجائے کوئٹہ والی خالہ کہنے لگے۔ اور اب تو وہ بے چاری اتنی بیمار ہیں کہ ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ فون بھی گلوگیر لہجے میں کیا تھا'' شائستہ بیگم نے ملول سے لہجے میں بتایا۔

''تو جا کے لے آیئے ناں آپ'' صابرہ نے ساس سے کہا۔

''ہاں میں ابھی جا رہی ہوں۔ سائرہ اور فریال بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں' بس ......شام تک آ جاؤں گی'' چلتے سے انہوں نے اپنی بڑی بہو ثریا سے کہا۔

''ارے امی! آپ نے اپنے اوپر ناحق پابندیاں لگائی ہیں۔ اب گھر سے نکل رہی ہیں تو دو چار دن تو خالہ کے پاس رہیے تا کہ انہیں بھی خوشی ملے ورنہ وہ بھی کیا سوچتی ہوں گی' ہم نے آپ کو باندھ کر رکھا ہوا ہے'' ثریا نے لگاوٹ سے کہا۔

''ہور کیا......اپنی کھالہ کے پاس پندرہ دناں کے لیے جائیں ناں آپ۔ انہوں بھی خوش ہوئیں گے'' صابرہ نے بھی اپنے لبوں پر مسرت سجا کر کہا۔

''بیمار کی خدمت کرنے کے بے حد فضائل ہیں' ہماری اماں تو پچھلے سال غیروں کی خدمت کرنے ان کے پاس دو مہینے رہی تھیں' ہماری بھابی کی اماں کی سہیلی کو فالج ہو گیا تھا۔ ہماری اماں ان کو پکا کر کھلاتیں' کپڑے بدلتیں، ان کے کپڑے دھوتیں، ان کے کپڑے سیتیں اور آج کل لوگ اپنے سگے رشتے داروں کی خدمت کرنے سے کتراتے ہیں'' ثریا نے اترا کے کہا۔

''آپ کی بھابی کی اماں کی سہیلی آپ کی اماں کی مالک مکان تھیں اور آپ کی اماں نے اس ماہ تو کیا آئندہ چار ماہ تک کرایہ نہیں دیا تھا اپنے مالک مکان کو جو اوپر کے مالے میں رہتے تھے۔'' فریال نے جل کر کہا۔

''ہم لوگاں تو فی سبیل اللہ سب کی کھدمتاں کرتے'' صابرہ نے شانے اچکا کر کہا۔

''میں شام کو آ جاؤں گی' بچیاں بھی میرے ساتھ جا رہی ہیں۔'' انہوں نے بہوؤں کی باتوں کو تمسخر سے سن کر کہا اور باہر نکل گئیں۔

''اونہہ! شام کو ہی آ جانا......ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے۔'' ثریا مشین پر اپنا سوٹ سیتے ہوئے

بڑبڑائیں۔

''گھومنے پھرنے والی ساسیں کتنی اچھی ہوتی ہیں ناں؟'' صابرہ ہنس کر ثریا سے بولیں جو سر جھکائے مشین چلا رہی تھیں۔

''ہوتی ہوں گی' ہمیں کیا......؟''

''بھابی جان! میں تو اپنی بہن کے گھر جا رہی' تم بھی چلے جاؤ ناں۔''

''ثنا کے بورڈ کے امتحان ہونے والے ہیں' اس کا حرج ہو گا۔'' ثریا نے کہا۔

''نکو حرج ہوں گا۔ ثنا تو پڑھائی میں اچھی دکھتی۔''

''جب تک نیا سوٹ نہ ہو' میں بھابی یا باجی کے ہاں نہیں جاتی ہوں' وہ لوگ تو بوتیک کے ایک سے بڑھ کر ایک کپڑے پہنتی ہیں۔ میں بار بار پہنے ہوئے مائی کے دھلے ہوئے پھٹکار مارے سوٹ پہن کر جاؤں گی تو احساس کمتری محسوس ہو گا۔''

''میری ساڑی چاہیے تو پہن لیو'' صابرہ نے وسیع القلبی سے کہا۔

''نہیں' ساڑی تم پر بہت اچھی لگتی ہے' مجھ پر نہیں۔ موٹے لوگ جو چھوٹے قد کے بھی ہوں ان پر شلوار قمیص ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''پھر جلدی کائے کو نہیں سیتے تم'' صابرہ ہنسی۔

''ڈیزائن والا سوٹ سینا کوئی آسان تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ ریڈی میڈ لیا ہے'' ثریا نے مسکرا کر کہا۔

''ٹھیک بولیو تم......'' صابرہ اپنے بال بناتے ہوئے بولی۔

''ارے ہاں' یاد آیا......تم نے چھوٹی چنڈال کی بات سنی'' ثریا نے مشین کی ہتھی روک کر سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں' میں تو کچھ نہیں سنی'' صابرہ کنگھا پھینک کر ان کے پاس آ بیٹھیں۔

''فریال کا دماغ بہت خراب ہو گیا ہے۔''

''وہ تو ہمیشہ کا ہے جی!''

''ہے کچھ نہیں مگر اپنے آپ کو سمجھتی بہت ہے۔''

''بھائیاں کی کمائی پر نازاں کرتے ہیں ناں۔''

''اوقات دھیلے کی نہیں ہے اور باتیں بڑی بڑی۔''

''خوہ خاف کی پری ہے انے۔''

''آج میں نے فریال سے کہا' ہمارے رشتے داروں میں ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے بچے وچے بھی کوئی نہیں ہیں، اگر تم چاہو تو میں تمہاری ان سے شادی کرا دوں۔ گھر بھی ان کا پورا بھرا ہوا ہے۔ خوب شاندار سا ڈرائنگ روم ہے۔ اونچے اونچے صوفے رکھے ہیں۔ بڑی بڑی پینٹنگز لگی ہوئی ہیں۔ ہر کمرے میں اسپلٹ اے سی۔ یہ لمبی سی کار۔ ان کی جہیز کے لیے بھی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ بس بوڑھے والدین ہیں اور دو بہنیں......ان کی کسی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔''

''اتنا اچھا رشتہ سن کر وہ خوش ہوتی ہوں گی۔''

''جی نہیں......ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ فریال صاحبہ غصے سے تنک کر بولیں، بھابی جان: مجھ پر یہ مہربانی کیوں'

مجھے تو نہیں کرنی شادی۔ آپ کی کئی بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں' ان کی کیوں نہیں کروا دیتیں ہیں آپ' یہ ثواب میرے ہی طفیل کیوں سمیٹ رہی ہیں۔'' اور اس پر ہی بس نہیں کیا......''

''کچھ ہور بھی بولے وہ؟''

''ہاں......'' ثریا کا لہجہ گلوگیر سا ہو گیا'' فریال انتہائی ہتک آمیز لہجے میں بولی، بھابی جان! آپ اتنی اچھی مت بنیئے جتنی اچھی آپ ہیں نہیں۔ یہ ہے بھلائی کا صلہ......اچھی بات کرو اور جوتے کھاؤ۔ بات کرنے کی تمیز تو دونوں بہنوں کو نہیں ہے۔ ہر وقت کاٹ کھانے کو آتی ہیں۔ میں تو کہہ کر پچھتائی۔ سچ......صبح سے ابھی تک دل برا ہو رہا ہے اور سر میں درد علیحدہ۔''

''بھابی پاشا......اجی آپ کائے کو ان کے بیچ میں پڑتیں۔ شادی کرتے کرڈ بولو ئیں کرتے مرڈاپن کو کیا؟ مری باتاں آپ یاد رکھنا' ان کی نہیں ہوں گی شادیاں......ہاں۔''

''یہ تو مجھے بھی پتا ہے' یہ دونوں بھی ساری زندگی ہمیں پریشان کریں گی۔''

''جب اماں جان کو دیکھو ذرا کچھ فکر انہیں۔ کیسے گھوم لے رئیں' تو کیسے ہوں گی شادیاں انہوں کی۔''

''میری بچی ثنا ابھی چھوٹی سی ہے مگر میں نے اس کے لیے ابھی سے سوچنا شروع کر دیا ہے۔ کسی ڈاکٹر سے یا کسی انجینئر سے یا کسی پائلٹ سے اپنی ثنا کو بیاہوں گی'' ثریا نے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔

''ایسا ہی ہوں گا بھابی جان! اپنی ثنا ہے ہی اچھی بہت۔ اللہ اتی دیر ہو گئی' یہ مائی کاں اڑن چھو ہو گئی ماں۔ ایو کاں مرگئی مائی۔ اپنا کفن سیتی بیٹھی ہو۔ ایک ساری پر استری کتنے گھنٹے کرتے بیٹھے تم۔'' صابرہ اپنی ملازمہ پر چلائیں۔

''بیٹا! جلدی کرو ناں' اتنی دیر ہو گئی۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ میرے ساتھ چلو' میں تمہاری کھالہ کے گھر جا رہی۔''

''امی' اس وقت تو میں کہیں نہیں جا سکتا' یہ وقت تو میرے کھیلنے کا ہے'' منور نے کہا۔

''تم کیوں نہیں چل رہے ہمارے ساتھ' تم کو معلوم نہیں' تمہاری کھالہ اور رعنا ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''امی پلیز! میں پھر کسی دن چلا جاؤں گا مگر آج کسی صورت میں نہیں جا سکتا۔'' منور نے گھگیا کر کہا۔

''ائی میں صدقے پاشا' میں واری اپنے بچے کے۔ ارے اتی عمر ہو گئی تمہاری' معلوم نہیں تم کو کہ رعنا تمہارا انتظار کیوں کر رہی ہوں گی؟''

''خواہ مخواہ میں ہی' میں نے تو اس کو نہیں کہا تھا ناں انتظار کرنے کو۔''

''بے فضول باتاں نکو کرو بیٹا، میرے کو دیر ہو رہی۔ ایک دم جلدی چلو تم' میں بول دی ہاں۔''

''امی! پلیز' کبھی تو میری بات سمجھ لیا کریں۔ میں نے کہا ناں میں نہیں جاؤں گا، میں نہیں جاؤں گا۔ میں کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا'' منور کو بھی غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

''ارے دیوانے پوتے' اٹھارہ برس کا ناں' معلوم تم کو تمہارے باوا...... جب بائیس برس کے تھے' جب ہمارے باوا ان کے نکاح میں دیے میرے کو۔ اور پھر اپنی رعنا کا ناک نخشہ بہوت خوبصورت ہے۔ میں انہوں کو اپنی بہو بناؤں گی ہاں۔''

''جب میں شادی کروں گا' تب بنائیں گی ناں۔ ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوا اور پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک میری فریال پھوپو کی شادی نہیں ہو جاتی' سائرہ پھوپو اپنے گھر میں خوشی سے نہیں جاتیں' اس وقت تک میں شادی کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔''

''ارے پگلے! تیری پھوپیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں گی۔ یہ لوگاں ایسی ہی اچ بیٹھتے، ہاں۔''

''امی' آپ بھی بہت بھولی ہیں۔ جس بارے میں آپ کو سوچنا چاہیے' ادھر سوچتی نہیں ہیں اور جو بات ابھی وقت میں ہے نہ کیا اس میں' اس طرف دماغ لڑا رہی ہیں۔ پاپا آپ کے بارے میں بالکل صحیح کہتے ہیں' آپ کا خیال ہے کہ آپ کے پاس دو دماغ ہیں مگر کام میں آپ ایک کو بھی نہیں لاتیں۔''

''ارے بیٹا' رعنا جیسی لڑکی ڈھونڈنے سے نہیں ملنے کی۔ اچھی لڑکیوں کے رشتے بہوت جلدی ہو جاتے' پھر انہوں یا خد (قد) نکالے ہیں۔ اپنے باوا کے گھر میں نوکراں کے ہوتے بی سارا کام خد کر لیتی بوٹی۔ باہر گھومنے کا بھی شوق ٹوں انہوں کو۔ میٹرک میں پڑھتے بیٹھے وہ......اور سوب سے خابل انہوں۔ انہوں فیل بھی کبھی نہیں ہوئے۔''

''مجھے تو بالکل باؤلی سی لگتی ہے۔ ہر وقت ہنستی رہتی ہے کھی کھی کر کے۔'' منور نے برا سا مان کر کہا۔

''باؤلی نکو بولو ابا! وہ ایک دم اسکیل ویسی سیدھی۔ بات کو گھماتی پھراتی نکیں ناں وہ اور تم اپنے ددھیال میں چالالی' مکاری کی باتاں سننے کے عادی۔ تمہارے کو وہ کائے کو اچھی لگتی ابا!''

''اس وقت تو میچ شروع ہونے والا ہو گا اور پوری ٹیم مجھ پر تف بھیج رہی ہو گی اس لیے امی' خدا حافظ!'' منور ہاتھ ہلاتا باہر نکل گیا۔

اور صابرہ کا موڈ خراب ہو گیا اور نگیں مائی پر چلانے' جو ان کی نئی ساڑی کو جلا لائی تھی۔ پوری استری پلو پر دھا کر رہ گئی تھی۔

''اجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ۔ میری نئی ساڑی تم نے جلا دیے۔ تمہارے باوا دیے تھے میرے کو۔ دماغ بھس ہو گئے تمے ناں۔ انکھاں باغاں میں سیر کو گئے تھے کیا؟ جواب کیوں نکیں دیتی' حلق میں پھوڑا پھوٹا کیا؟ کٹے گی ناں پیسے تو بہوت اچھا لگے گا۔ پھر سوچے گا ناں تھو بڑا......!''

☆☆☆

آج پھر فریال کو کالج سے آنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ شائستہ بیگم کا مارے ہول کے برا حال تھا۔

''پتا بھی ہے کہ یہ بھائی اور بھابیاں دو منٹ میں بے عزتی کر کے رکھ دیتے ہیں تو خود ہی محتاط رہنا چاہیے۔'' دل ہی دل میں بڑبڑا رہی تھیں۔

ٹہل ٹہل کر ان کی ٹانگیں تھک گئیں۔ دو بجے گھر آنے والی بیٹی جب شام چار بجے تک گھر نہ پہنچے تو اس کی ماں کا کیا حال ہو گا؟

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس وقت دونوں بہوئیں اپنے اپنے کمروں میں تھیں ورنہ ان کے اس ٹہلنے کے بھی جواز طلب کیے جا سکتے تھے۔

''الٰہی' خیریت سے میری بچی گھر آ جائے'' ان کا روم روم دعا گو تھا......اور دماغ نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہا تھا۔

ساڑھے چار بجے فریال جب گھر آئی تو اس کے الٹے بازو پر پلاسٹر بندھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے لبوں سے چیخ ہی تو نکل گئی۔

''واپسی پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسل گئی تھی۔ میری سہیلیاں اسپتال لے گئیں۔ وہاں ایکسرے ہوئے' ے ڈاکٹر کے چیک کرنے اور پھر پلاسٹر بندھنے میں ٹائم لگا۔ یوں بھی اسپتال میں خاصا رش تھا' لگتا ہے ا ن کافی لوگ پھسلے ہیں۔''

''اب تم پندرہ دن بالکل کالج نہیں جاؤ گی'' امی نے فیصلہ عائد کیا۔

’’نہیں امی! پیر تو میرے ٹھیک ہیں‘ ہاتھوں سے تھوڑی کالج جاتی ہوں۔‘‘

’’مگر آنکھیں کھول کر تو نہیں رکھتی ہو ناں۔‘‘ انہیں غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

’’ارے نہیں امی! یہ تو ذرا سی چوٹ ہے‘ اللہ نے مجھے بال بال بچالیا۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔‘‘

’’فریال‘ نہ یہ خوشی کی بات ہے اور نہ اطمینان کی۔ اگر تم آنکھیں کھول کر چلتیں تو نہ راستے میں گرتیں اور نہ ہی چوٹ لگتی۔ اب صرف تمہارے ہی چوٹ لگی ناں‘ کوئی دوسری لڑکی تو کیلے پر سے نہیں پھسلی...... اور ایسا صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ تم میں لاابالی پن بے حد ہے۔‘‘

امی کا یہ جملہ کمرے سے آتے ہوئے بڑی بھابی نے بھی سن لیا تھا۔ فوراً اندر آئیں اور چمک کر بولیں۔

’’فریال! ایک شام کی روٹی ہی تم پکاتی ہو تو ہاتھوں پر یہ غلاف چڑھا آئیں تاکہ ایک کام سے بھی تمہار چھٹی ہو جائے۔ غضب خدا کا‘ جس گھر میں دو دو جوان لڑکیاں ہوں اور کام دھیلے کا بھی نہ کریں۔ اب ہم ا بچوں کو دیکھیں یا گھر کو دیکھیں۔‘‘

’’بھابی! یوں کریں آپ بھی اسی طرح دونوں ہاتھوں میں غلاف چڑھا ئیں‘ آپ کو بستر پر پڑے لگا کر تینو ٹائم کھانا ملے گا‘ ہلنے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔‘‘ فریال کا دل تو جلا ہوا ہی تھا‘ اس لیے کہنے سے باز نہیں آئی۔

’’تمہاری طرح آرام طلبی کی عادی ہوتی تو یہ سب بھی کر لیتی‘ اب ہڈحرام کیسے بن جاؤں؟‘‘

وہ دانت پیستی ہوئی چل دیں مگر ان کی آنکھوں میں ایسی نفرت تھی جیسے اسے کچا ہی چبا جائیں گی۔

چھوٹی بھابی صابرہ نے پلاسٹر دیکھا تو اچھی خاصی تفتیش کر ڈالی۔ ’’ایو تم صبو صبو گرے تھے یا دوپہراں میں سچی بول دیو کاں جا رہے تھے تم؟ لگتا میرے کو بس کا ایکسی ڈنٹ ہوا۔ کاناں پٹ ہوتے بیٹھے تھے ناں تمہارے اس واسطے اے اچ ہوا۔ تم اکیلے گرے تھے یا تمہاری دوستاں بھی گر گئے تھے۔ کس کس کو چوٹاں لگیں ماں اور کس کو خالی مٹی جھڑی۔ ڈاکٹر کے پیسے کون لوگاں دیے۔ بل کتے کا بنے۔ ادھاری تو نہیں چڑھی ابا۔ تم چوڑی وا پاجامے میں بہوت اچھے لگ رئے ناں‘ اس لیے گرے تم۔ یہی اچ سچ ہے جو میں بول دی۔‘‘

اور فریال ان کے تمام سوالات کے جواب انٹ شنٹ دیے چلی جا رہی تھی۔

مطمئن تو خیر وہ نہیں ہوئی تھیں مگر پوچھ کچھ کرنے سے ایک قرار سا انہیں آ گیا تھا۔

اور جب وہ کمرے میں آ کر بستر پر لیٹی تو سائرہ باجی نے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔ ’’ارے میری پیاری ک جھوٹی بہن! مجھے تو سچی بات بتا دے کہ آج تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟‘‘

’’عدیل اپنی بائیک بہت تیز چلا رہا تھا‘ بس پھسل کر گر گئی اور فریکچر ہو گیا۔‘‘ اس نے ہنس کر کہا۔

’’اگر مر جاتی تو......‘‘ وہ دہل سی گئیں۔

’’ارے بائیک سے گر کر بھی کوئی مرتا ہے۔‘‘ اس نے ان کی بات ہنسی میں اڑائی۔

’’کیوں نہیں مرتے‘ ذرا اخبار پڑھا کر‚ تو بائیک سے گرتی اور پیچھے سے کوئی تیز رفتار ٹرک تجھے کچلتا ہوا چلا جاتا تو......؟‘‘

’’اچھا تھا...... گھر کی کل کل کا ایک باب تو بند ہو جاتا۔‘‘ وہ زبردستی مسکرائی۔

’’فریال‘ میری پیاری بہن! تو عدیل کے ساتھ مت گھوما کر۔ سچی‘ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔‘‘ سائرہ نے لجاجت سے کہا۔

’’بڑی مشکل فرمائش ہے آپ کی اور میرے لیے پورا کرنا ناممکن ہے۔‘‘ وہ ہنسی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں

یں آنسو دمکنے لگے۔

☆☆☆

بعض دفعہ ہنسنے کے لیے وجہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فہمی باجی کا جب سے رشتہ طے ہوا تھا‘ وہ بے ات ہنسنے لگی تھیں۔

مائی کے ہاتھ سے گلاس ٹوٹا وہ ہنس پڑیں۔

امی نے پرانا اخبار انہیں پکڑا دیا‘ وہ ہنس دیں۔

نگین نے کسی غلط رنگ کا دوپٹا اوڑھ لیا‘ وہ ہنس دیں۔

امی پڑوس سے آئی کھیر کو دہی سمجھ بیٹھیں اور وہ ہنس دیں۔

ان کو اس طرح ہنستا مسکراتا دیکھ کر امی کی آنکھوں میں بھی موتی بھر جاتے۔ بے رونق ہونٹ جاگ پڑتے۔

اس دن نگین نے اپنے بالوں کا جوڑا بنایا‘ آج کسی سہیلی سے سیکھا تھا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی۔ بالوں کو ایسا کھسوٹ کھسوٹ کر بنایا تھا کہ تمام پنیں میخیں سی لگ رہی تھیں اور ہر طرف سے بال نکل نکل کر اس کے منہ پر آ رہے تھے۔ نگین کے چہرے پر ایک عجیب گھبراہٹ سی نظر آ رہی تھی۔ اور وہ بار بار اپنے بے تکے جوڑے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

فہمی اس کا جوڑا اور اس کی شکل دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

اس کی کھنکھناتی سی ہنسی سن کر نگین کھسیا کر رہ گئی۔

’’خواہ مخواہ ہنس رہی ہیں باجی آپ!‘‘ نگین بولی۔

’’تم چاہتی ہو میں روتی رہوں؟‘‘ فہمی نے کہا۔

’’اللہ نہ کرے‘ کیسی باتیں کرتی ہیں آپ‘‘ وہ زچ سی ہو گئی۔

’’نگین! میں تو چاہتی ہوں......‘‘ وہ بات کرتے کرتے رکیں۔

’’ہاں ہاں...... میں اچھی طرح جانتی ہوں‘ آپ کسے چاہتی ہیں؟ آپ اپنے دوبئی والے منگیتر کو چاہتی ہیں‘ ہے ناں......‘‘ نگین نے بات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیا تھا۔

اور فہمی‘ اپنی بہن کی شرارت جان کر اب مسکرائے چلی جا رہی تھیں۔

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔

’’لیجیے آپ کے منگیتر کا نام لیا‘ لگتا ہے موصوف کی ہی دستک ہے؟‘‘

فہمی باجی نے اٹھایا۔ کوئی آواز ہی نہیں تھی۔ ’’لگتا ہے کسی نے جان بوجھ کر کاٹا ہے۔‘‘ انہوں نے ہیلو کی گردان سنا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

گھنٹی پھر بجنے لگی۔

’’میں فہمی بول رہی ہوں‘‘ باجی نے کھنکھار کر کہا مگر لائن پھر ڈس کنیکٹ کر دی گئی۔

’’ہمارے تو وہ نہیں ہیں اس لیے اب ریسیو نہیں کروں گی۔ اگر تمہیں آلکس آ رہا ہو تو بٹن بند کر دینا تاکہ نہ گھنٹی بجے اور نہ ہی تمہیں اٹھنا پڑے۔‘‘ ان کے جملوں میں بھی حس مزاح بڑھنے لگی تھی۔

گھنٹی پھر بجنے لگی۔ فہمی باجی اس کے برابر لیٹی اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتی رہیں۔

نگین نے لیٹے لیٹے ریسیور اٹھایا۔ ’’نگین بول رہی ہوں۔ اگر تم زبور ہو تو بتا دو‘‘ اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

مگر چند گہرے سانس لینے کے بعد از خود لائن ڈس کنیکٹ کر دی گئی۔

اس کا مطلب ہے کہ یہ فون زبور کا نہیں تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔ تو پھر کس کا تھا؟

''اب یہ گونگے فون بار بار کون ریسیو کرے۔'' جھنجلا کر اس نے پلگ ہی نکال دیا اور غور سے فہمی باجی کو دیکھنے لگی جو یقیناً کچھ سوچ رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں باجی!'' اس نے کشن اپنے سر کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ خوشیوں کا زمانہ کم ہوتا ہے اور غموں کا زیادہ۔ اس لیے جب خوشیاں ملیں تو اس وقت کو گنوانا نہیں چاہیے...... کہ پتا نہیں یہ رت نصیب میں آئے کہ نہ آئے۔''

''کیا خوشیوں کا محبت سے بھی تعلق ہے؟'' نہ جانے کیوں وہ یہ پوچھ بیٹھی۔

''محبت تو روشنی ہے۔ ایسی روشنی جو زندگی میں رم جھم سی کر دے۔ خوشی کے سنگ ہو تو اسے چکا چوند کر دیتی ہے اور غم کے ہمراہ ہو تو اسے وہ اپنا غم عزیز ہو جاتا ہے۔''

''کیا ہر محبت سچی ہوتی ہے؟'' یہ سوال اس کا روم روم پوچھ رہا تھا۔

''نہیں، اس کا تعلق مقدر سے ہے۔''

''اور وہ لوگ جو آپ کے دل و دماغ پر چھا جائیں؟'' نگین نے پوچھا۔

''وہ لوگ مقدر کے سکندر ہوتے ہیں'' فہمی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا' ایسا بھی ہوتا ہے'' نگین من ہی من میں کہہ رہی تھی۔

اور فہمی باجی آنکھیں موندے دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھیں۔

اور نگین کو نہ جانے کیوں ایک اطمینان سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس کے لبوں پر ایک مسکان سی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

گاؤں اور شہر کی شادی میں یہی فرق سب سے بڑا ہے کہ شہروں میں دکھاوا بہت ہوتا ہے جبکہ گاؤں میں ایسی باتوں کو تکبر کا نام دیا جاتا ہے۔

شہر میں شادی ہو تو قریبی رشتے داروں کو بھی کارڈ پہنچایا جاتا ہے تب وہ آ کر شرکت کرتے ہیں۔ اگر کسی کے کارڈ میں کمی رہ جائے' کسی کا نام لکھنا بھول جائیں تو وہ نہیں آتا ہے اور ناراضگیوں کے ٹیلر بھی عرصے تک چلتے ہیں۔

گاؤں میں شادی ہو تو قریبی رشتے دار تو کیا' برادری کے لوگ از خود آتے ہیں۔

کام کو پوچھتے ہیں اور اس تقریب میں ذاتی طور سے حصہ لینا چاہتے ہیں۔ دوسرے کی خوشی کو بھی اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔

گاؤں میں ماسی رحمت کے بیٹے کی شادی تھی اور شجاع بھی اس شادی میں بھرپور شرکت کر رہا تھا۔ مہندی' مایوں کی ہر رسم میں وہ پیش پیش تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ گیت تک اس نے گائے تھے۔ آواز بھی اچھی تھی اور برات میں جب دوست بھنگڑا ڈالتے ہوئے حفیظ کو لے کر آئے تو سب سے آگے شجاع ہی تھا۔

سفید کلف کا کرتا شلوار' براؤن واسکٹ اور براؤن کھسے...... وہ مسند پر بالکل دولہا کے ساتھ تھا۔

دبلا پتلا سا حفیظ صرف بہت سارے ہاروں کی وجہ سے دولہا لگ رہا تھا ورنہ ساری وجاہت تو شجاع کے چہرے پر تھی۔

نکاح کے بعد حفیظ کی سالیاں ایک گلاس میں دودھ بادام کا شربت لے کر آئیں۔ گلاس کے اوپر کارچوبی

ا، ڑھا ہوا تھا۔

ایک شوخ سی چنچل لڑکی نے کہا ''یہ دولہا بھائی کے لیے ہے۔ آدھا وہ پئیں گے اور باقی آدھا دلہن۔''

''پہلے ہم چیک کر لیں پھر اپنے دوست کو دیں گے۔'' شجاع نے گلاس لیا اور دو گھونٹ بھر لیے۔

''یہ تو آپ نے جھوٹا کر دیا'' لڑکی ماتھے پر مصنوعی تیوریاں ڈال کر بولی۔

''اگر اس میں آپ کچھ ملا کر لے آتیں تو ہمارا دولہا تو گر جاتا ناں......'' شجاع ہنس کر بولا ''دولہا کی معاملات اس کے دوست نہیں رکیں گے تو کون کرے گا؟''

اور فرح اس کے اس شوخ جملے اور وجاہت بھری شخصیت کو دیکھتے ہی کھو سی گئی۔

''اب یہ آپ کو پورا پینا پڑے گا'' اس کے دل کی آواز کو یہ جملہ سہارا دے رہا تھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ'' شجاع نے اس سے دوبارہ گلاس لے کر پورا خالی کر دیا اور ہنس کر بولا ''آپ نے اپنا نقصان خود کر دیا ناں...... دولہا کو پلاتیں تو نیگ فوراً مل جاتا۔ مجھے پلانے سے کچھ نہیں ملا آپ کو...... جائیے را گلاس فوراً لے آئیے۔''

''آپ کو کیا پتا' میرا کتنا نقصان ہو گیا۔'' اس کے لب دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ دوسری لڑکیاں آن لی آن میں دوسرا گلاس لا کر حفیظ کو پلا بھی چکی تھیں۔

''خوب تیز میٹھے شربت میں' جس میں گدرے ہوئے باداموں کے ساتھ زعفران بھی ملا دیا گیا تھا' حفیظ کو یتے ہی اچھو سا لگ گیا۔ تین چار تو چھینکیں بھی آ گئیں۔

شجاع اس کی کمر سہلانے اور پگڑا اتار کر اس کا پسینہ پونچھنے میں پیش پیش تھا۔

''شجاع یار! پگڑ اب اتار بھی دے' سکون لگ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے' نہ پہنو۔ نکاح تو ہو ہی چکا ہے'' شجاع نے دھیرے سے کہا۔

اب لڑکیاں حفیظ سے نیگ مانگ رہی تھیں۔ حفیظ ٹال مٹول کر رہا تھا۔ بہنیں' کزنز اور سہیلیاں ہنسی مذاق ر رہی تھیں۔ نیگ کی بڑھوتی کے لیے ایک سے ایک تاویلیں دے رہی تھیں۔

مگر فرح ایک جانب چپ چاپ یوں کھڑی تھی' جیسے اسے اس معاملے سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

اور پھر حفیظ نے کیا نیگ دیا۔ اور کس کس کو دیا۔ اسے کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں میں تو شجاع کا سراپا اجالے سے کر رہا تھا۔ جو مہندی کے دن سے روپ بدل بدل کر اس کے ہارے دل پر قبضہ کر بیٹھا تھا۔

''یہ فرحت آپا کا بھائی شجاع...... اتنا سوہنا سا ہے' یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

اس کا ہنسنا، اس کا چلنا، اس کا دیکھنا۔ اور...... اس کا بولنا! یہ سب اسے کتنا خاص لگ رہا تھا۔

اس نے شدت سے سوچا۔

کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

فرح خود بھی بے حد خوبصورت لڑکی تھی مگر شجاع نے اس پر صرف ایک اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی تھی۔

اس کے کسی دوست نے اس کی جانب اشارہ بھی کیا تھا کہ وہ لڑکی مسلسل تمہیں دیکھے چلی جا رہی ہے۔

تب اس نے دوست کو دھیمے سے گھڑک دیا تھا۔ غصہ ویسے ہی اس کی ناک پر بیٹھا رہتا تھا۔

وہ لڑکیوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں بنانے کا کبھی عادی ہی نہ تھا۔ فرح کی مسلسل نظروں کی تپش اس نے محسوس تو کی تھی مگر لا ابالی پن سے سر جھٹک دیا تھا۔

"جھلی نہیں تو......" اس نے زیر لب یہی کہا تھا۔

"فرح پتر! ذرا مہماناں نوں ویکھ......" اس کی ماں نے اسے یوں خاموش سا ایک جگہ بیٹھا دیکھ کر کہا۔

کھانا شروع ہو چکا تھا اور سب براتی کھانا کھا رہے تھے۔ بڑے شہروں والا رواج ابھی اس گاؤں میں نہیں آیا تھا کہ برات کے ساتھ لڑکی کے رشتے دار بھی کھانا کھا لیں۔

میزبان' مہمانوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔

"بہن جی! تسی اور لو......"

"یہ گرما گرم نان ہیں......ایہہ لو۔"

"ارے واہ! یہ تو تسی چکھا ہی کوئی نہیں۔"

فرح کا دل چاہا کہ شجاع کی پلیٹ میں جا کر خود سالن ڈالے مگر اس نے اپنے اوپر قابو پایا۔

شجاع اس وقت حفیظ سے خوب مذاق کر رہا تھا۔

"بھئی دولہا کھانا نہیں کھاتے' وہ اپنی دلہن کے ساتھ کھاتے ہیں۔"

"اسے تو کل سے بھوک لگ رہی ہے۔ یہ کیا صوفے پر بیٹھ کر ہماری شکلیں دیکھے گا؟" حفیظ کے دوسرے دوست نے کہا۔

"کیا حرج ہے' دیکھ لے۔ یوں بھی اب دوستوں سے ساتھ تو اس کا چھٹ جانا ہے' اب آزادی کا کھانا اس کے لیے نہیں رہا۔ اب جو بھابی کھلائے گی' وہ کھائے گا۔ جو وہ کہے گی' وہ کرے گا۔" شجاع کے جملے قہقہوں کے پھول بن رہے تھے اور حفیظ کھانا کھاتے ہوئے ہنس رہا تھا۔

"کیا تو شجاع کو نظر لگا کر رہے گی" اس کی سہیلی نے اسے وہیں مردانے میں کھڑا دیکھا تو چپکے سے کہا۔

تب وہ وہاں سے ہٹی اور اس جانب چلی آئی جہاں شجاع اور ان کی بہن فرحت بیٹھی ہوئی تھی۔

"خالہ جی! میں آپ کو سالن لا دوں" وہ ان سے پوچھنے لگی۔

"نہیں بیٹا! میں کھا چکی ہوں۔"

"فرحت آپا! میں آپ کو میٹھا لا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"میں میٹھا کھاتی ہی نہیں ہوں' کھیر بس ایک چمچہ چکھ لی ہے۔ ہمارے ہاں تو میٹھے کے شوقین شجاع بھائی ہیں۔ جس دن امی کوئی میٹھا نہ بنائیں تو وہ گڑ کھا لیتے ہیں مگر میٹھے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔" فرحت اپنی کسی کزن کو سنا رہی تھی اور فرح کو اپنے من میں ایک مٹھاس سی اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے فرحت اسے جتا رہی ہو کہ آگے خیال رکھنا' میرا بھائی میٹھا بے حد شوق سے کھاتا ہے۔

دلہن رخصت ہوئی تو اس کی آنکھوں میں ڈھیر آنسو تھے۔ (پتا نہیں اب شجاع کو کب دیکھوں گی)

"ارے دلہن سے زیادہ تو اس کی سہیلی رو رہی ہے" کسی نے کہا۔

"سہیلی اس لیے رو رہی ہے کہ میری شادی کیوں نہیں ہو رہی" دولہا کا کوئی دوست بولا تو سب ہی ہنس پڑے' جن میں شجاع کا قہقہہ سب سے نمایاں تھا۔

اور فرح کو ایسا لگا جیسے اس کے کورے من پر خوشیوں کے ساون کا کوئی چھینٹا پڑ گیا ہو۔

اور جب کسی کورے برتن پر پانی پڑے تو وہ کیسا سن سن بولتا ہے اور فرح کو اپنی رگ رگ سے کچھ ایسی ہی [illegible]یں آ رہی تھیں سن......سن......سن............!

☆☆☆

ڈائری لکھ کر وہ تھک سی گئی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ آنکھیں زبردستی موند لیں تو خوابوں کا [illegible] پلکوں پر دستک سی دینے لگا۔

نہیں' میں ایک اچھی لڑکی ہوں۔ خوابوں کے جزیروں میں کسی اجنبی کے ساتھ پھرنا اچھا نہیں ہوتا ہے۔

تسبیح پڑھ کر دعائیں پھونک کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ تھکن سے اس کا وجود شل ہو رہا تھا مگر نہ جانے کیا [illegible] کہ نیند اس سے قطعی روٹھی ہوئی تھی۔ تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ لائٹ آن کی تو ساڑھے تین کا عمل تھا۔

"اف! آدھی سے زیادہ رات بیت گئی اور میری آنکھوں میں نیند کا گمان تک نہیں ہے۔" اس نے بیرونی کھڑکی کھول دی اور اپنا چہرہ چوکھٹ پر رکھ دیا۔ چاند کی چودھویں تھی۔ جگمگ کرتا چاند اس پر جھک آیا تھا۔

تاروں کی برات ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ چاندنی راتیں کتنی فسوں خیز ہوتی ہیں۔ یکبارگی اس نے سوچا۔

ٹھنڈی ہوائیں اس کا منہ چوم رہی تھیں اور رات کی رانی کی سحر انگیز خوشبو اسے مسحور کر رہی تھی۔

یکا یک اسے یوں لگا کہ چاند اس کی کھڑکی میں اتر آیا ہو۔ ارے یہ چاند تو میرے پاس آ گیا۔ اتنا قریب [illegible] میں ہاتھ لگا کر چھو بھی سکوں......اور پھر ایک عجیب بات ہوگئی' چاند میں سے زبور نکل آیا۔ وہیں کھڑکی کی چوکھٹ کی دوسری جانب اس کے بے حد قریب وہ کھڑا تھا۔

"نگین! میں تم سے دور رہ کر بھی دور نہیں رہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔"

"یہ میں کیسے یقین کر لوں؟"

"یہ بات تم اپنے دل سے پوچھ لو کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"

"اپنے دل سے......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔"

تب اسے یوں لگا جیسے اس کی سانسوں کے ہر ردھم سے ایک ہی صدا آ رہی ہو۔

اچھا لگتا ہے۔

اچھا لگتا ہے......!

"اللہ کیا ہو گیا ہے مجھے' آج میں جاگتی آنکھوں سے کیوں سپنے دیکھ رہی ہوں۔" دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر [illegible] سختی سے آنکھیں میچ کر اس نے سوچا۔

آنسو اس کے رخساروں پر ہیروں کی طرح پھسلنے لگے۔

مگر اس کی ہارٹ بیٹنگ ایک ہی نغمہ الاپ رہی تھیں۔

"اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا لگتا ہے......!"

☆☆☆

آج ڈائری لکھنے کی تسکین میں قطعی ہمت نہیں تھی مگر ایسا کئی روز سے ہو رہا تھا۔ وہ قلم ہاتھ میں لیتی تو وہ اینٹھ جاتا...... مجال ہے، کچھ لکھ تو دے۔ وہ اپنی ڈائری پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہتی۔ بے تکے گل بوٹے بناتی او کاغذ سیاہ ہو جاتا، تب وہ تھک کر قلم رکھ دیتی۔

آج بھی وہ کافی دیر سے صفحے پر دائرے در دائرے بناتی چلی جا رہی تھی مگر کوئی نقطہ اس کے ہاتھ نہیں آر تھا۔

”شاید موسم بھی عجیب ہے اور صبح و شام کی گھڑیاں بھی بے کیف...... ! عجیب ہو کا سا عالم ہے۔ دل کہیں نہیں لگ رہا۔ نہ کوئی آتا اچھا لگ رہا ہے...... اور نہ کہیں جانا۔ اپنی فیورٹ ڈشز کھا کر بھی مزہ نہیں آ رہا۔ اپ پسندیدہ سلوائے ہوئے ملبوسات کو پہننے کو دل نہیں چاہتا۔ پتا نہیں کیوں ایسا ہو رہا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی قیم چیز میں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔“ اس نے قلم روک کر کچھ توقف کیا۔ کمرے میں حبس زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر وہ پھر لکھنے میں محو ہو گئی۔

”مجھے چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی گرم تھپیڑوں کی طرح لگتی ہے۔ شاید میں بیمار ہوں...... بہت زیادہ...... میں بیمار ہونے والی ہوں۔ آج بھی سر میں سخت درد ہے۔ ٹیبلٹ نے بھی افاقہ نہیں دیا۔ پژمردگی پورے وجود م چھائی رہی۔

امتحان قریب ہیں، پڑھنے بیٹھی ہوں تو سارے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ کیا لکھا ہے، کچھ بجھائی تک نہیں دیتا۔ ایک عجیب سی کیفیت ہے، جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتی یا شاید...... گرمیوں کے دن ہوتے ہی ایسے بے کیف ہیں! خزاں کے اثرات دل و دماغ کو بھی اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔“ اس نے قلم اپنی ڈائری کے وسط میں ر رکھ دیا۔

”دل کی باتوں پر کبھی عمل نہیں کرنا چاہیے۔ دل کے راستے تو پتا نہیں کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں تک چلے جاتے ہیں کہ پیائش تک میں نہیں آسکتے، تو اس جانب قدم بڑھانے کا فائدہ!“

وہ اپنے آپ کو دیر تک سمجھاتی رہی مگر دل ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا اور یہی کہہ رہا تھا کہ ہر فیصلہ دل کرتا ہے اور پھر وہ زبردستی اپنے بستر پر آلیٹی۔

سر کے سخت درد کے باعث آنکھیں خون رنگ تھیں۔ دماغ کی باتیں، دل کسی صورت نہیں سمجھ رہا تھا یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بندھی ہوئی چوٹی کھول دی۔ ننھے ننھے سے ٹاپس کانوں سے نوچ کر رکھ دیے۔ چوڑی اتار دی۔

”اللہ میری آنکھوں میں نیند کیوں نہیں آ رہی۔“ بیٹھے سے وہ پھر لیٹ گئی۔ من کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ نرم گداز تکیے پر یوں سر پٹخ رہی تھی جیسے کسی تکلیف میں ہو۔ تکیا بینٹ کی طرح چبھ رہا تھا۔

”اے مہربان نیند! میری آنکھوں میں سما جا۔“ اب وہ اوندھی لیٹی دونوں ہاتھوں کو رحل کی طرح کھولے چہرے کو بیچ میں ٹکائے گھڑی کی جانب دیکھے چلی جا رہی تھی۔

ٹک...... ٹک...... سناٹے میں دیوار گیر گھڑی کی آواز شور کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ گھڑی نے دو بجائے۔ پھر تین بج گئے۔

ساڑھے چار بجے تو مرغوں کی بانگیں بھی شروع ہو گئیں۔ اس نے زبردستی اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں مگر نیند کی شاید یہ جسارت نہیں تھی کہ ایسی تپتی سنگلاخ زمین پر اپنے قدم رکھے۔

☆☆☆

شائستہ بیگم غم زدہ سی بیٹھی تھیں۔ سائرہ کے سسرال والوں سے صلح کی جو بات چیت چل رہی تھی، وہ یکدم ختم ہو گئی تھی۔ بیچ میں جو صاحبہ تھیں، انہوں نے شائستہ بیگم سے آ کر معذرت کر لی تھی اور ابھی وہ آ کر یہی بات بتا کر گئی تھیں کہ اتنے جھگڑالو اور بدتمیز لوگوں سے کوئی بات کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اب آپ سائرہ کو اس کی سسرال میں بھیجنے کے بجائے خلع لینے کے بارے میں سوچیے۔

”بیٹا، تمہاری تو ان سے رشتے داری بھی ہے، تمہاری وجہ سے اس رشتے کی ہامی بھری تھی، اب تم ہی کوئی ایسی سبیل نکالو کہ سائرہ کا گھر بس جائے۔ اگر اس کا گھر بھی اجڑ گیا تو میں فریال کی شادی کے بارے میں کب سوچوں گی۔“ شائستہ بیگم کے لہجے میں پریشانی اور غم یکساں گھلے ہوئے تھے۔

”خالہ! یہ آپ کی بے وقوفی ہے کہ سائرہ کو اپنے پاس بٹھا کر اسے بسانا چاہتی ہیں۔ اپنی سسرال میں تو وہ صرف تین ماہ رہی ہے۔“

”وہ لوگ تو زبردستی چھوڑ کر گئے تھے، میں نے کوئی خود تو نہیں بٹھایا تھا اور نہ ہی میں نے ان سے کوئی شرطیں منوائی تھیں، جس سے وہ ناراض ہوئے۔“

”یہی تو آپ کی بے وقوفی تھی۔ میں نے اول دن سے آپ سے کہا تھا کہ وہ چالاک لوگ ہیں۔ اس پر آپ نے کہا کہ آج کل بے وقوف کون ہوتا ہے۔ اپنے معاملے میں سب ہی چالاک ہیں۔ آپ کی بھول یہیں سے شروع ہوئی اور ان کی چالاکی کو مکاری بننے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے بارہا جتایا مگر آپ سمجھی ہی نہیں۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ سائرہ کو بسائیں گے اور نہ ہی میرا یہ خیال ہے کہ وہ اس کا جہیز واپس کریں۔“

”خالہ! جس طرح میں اپنا وقت گزار رہی ہوں، میں ہی جانتی ہوں، اگر میرے ساتھ بچوں کا جھمیلا نہ ہوتا تو کب کی گھر آ جاتی اور چین سے زندگی بسر کرتی، جیسے سائرہ کی بسر ہو رہی ہے۔“ منیزا تو کہہ کر چلتی بنی تھی مگر شائستہ بیگم پریشان سی بیٹھی تھیں۔

اور پھر ان کی پریشانی مزید بڑھ گئی اور سر گھوم کر رہ گیا۔ ثنا، ان کی بڑی پوتی میٹرک کا پریکٹیکل دے کر آئی تو اس نے پہلی بات یہی کی۔

”امی! آج ہم نے فریال پھوپو کو ایک لڑکے کے ساتھ بائیک پر جاتے دیکھا تھا۔“ بچی کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر وہ ششدر سی رہ گئی تھیں۔

”دماغ خراب ہے کیا، میں تو کب کی کالج سے آ چکی ہوں۔“

”میں نے آپ کو ٹھیک پونے ایک بجے دیکھا تھا پھوپو! ہماری اسکول بس آپ کے کالج کے سامنے سے گزری تھی۔ آپ اس لڑکے کے ساتھ بائیک پر بیٹھیں تو آپ کی چوٹی آگے آ گئی تھی اور آپ کے بالوں پر وہی نیلا ہیئر بینڈ لگا ہوا تھا جو آج صبح میں نے آپ کو دیا تھا۔“

”پوری کراچی میں صرف یہی ایک ہیئر بینڈ نہیں ہوگا“ فریال کا لہجہ گھبرایا ہوا سا تھا۔

”شرم کرو فریال! شرم کرو‘ اب تو گھر کے بچے بھی تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ رہے ہیں۔ کئی دفعہ اس کالے سے لڑکے کے ساتھ میں خود دیکھ چکی ہوں مگر کہتی کچھ اس وجہ سے نہیں ہوں کہ گھر میں خواہ مخواہ لڑائیاں ہوں گی۔ ماحول خراب ہوگا‘ پڑھنے لکھنے والے بچوں کے ذہنوں پر برا اثر پڑے گا مگر تم نے تو اپنی ناک کٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔“ ثریا نے تنک کر کہا۔

”اب آپ کی بچی بے تکی بکواس کر رہی ہے تو میں کیا کہوں‘ بچی کی بات کا یقین کیا جا رہا ہے مگر میری بات کا نہیں۔“ فریال اپنے موقف پر بدستور ڈٹی ہوئی تھی۔

چھوٹی بھابی صابرہ چائے پی چکیں تو طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولیں ”ثریا بھابی! ائی کیا آپ کی مغز ماری گئی جی۔ دفع کریو آپ‘ وہ جانیں انوں کے کام جانیں۔“

”صابرہ! میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں‘ کل کو کوئی باہر کا بندہ دیکھے گا تو بھائیوں کو ہی برا بھلا کہے گا‘ بھابیوں کو کوسے گا۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ بدتمیز نندیں کتنی بے قابو ہو رہی ہیں۔“

”اب میں کیا بولوں‘ بھابی پاشا! بولنے کو مونہہ اچ کہاں رہ گیا۔ ایو بھابی جان! آپ اٹھیے نا‘ چائے ٹھنڈی ہو کر جا رہی۔ خوائی نخوائی (خواہ مخواہ) کے چکراں میں کاہے کو پڑتے آپ!“

”ثنا! ادھر آؤ‘ میرے پاس۔“ شائستہ بیگم نے پوتی کو اپنے پاس بلایا۔ ”تمہیں یقین ہے‘ جس لڑکی کو تم نے دیکھا تھا‘ وہ تمہاری فریال پھوپھی تھیں؟“ شائستہ بیگم کا لہجہ غموں سے چور تھا۔

ثنا نے چونک کر اپنی دادی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں امڈتے دریا کو دیکھا اور فوراً بولی ”ہاں دادی! شکل تو میں نے نہیں دیکھی تھی‘ بس پیچھے سے دیکھا تھا۔ وہ بھی نیلے ہیئر بینڈ کی وجہ سے مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ فریال پھوپو ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہوں“ ثنا یہ کہہ کر رکی نہیں‘ سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اب شائستہ بیگم کے آنسو بے آواز بہہ رہے تھے۔

ثریا جان کر سامنے سے ہٹ گئی تھیں اور صابرہ اپنی بہن کے گھر فون ملا رہی تھیں۔ فون شاید ان کی بھانجی نے اٹھایا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے منہ سے پھول جھڑنے شروع ہو گئے تھے۔

”اللہ میں خربان! کتنے دناں ہو گئے...... یہ سورج غریب خانے پو نہیں چمکا۔“

☆☆☆

فون پر ”سی ایل آئی“ لگ گیا تھا۔ بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو نگین نے سی ایل آئی پر ناآشنا نمبر دیکھا اور پھر گھڑی پر نظریں جم گئیں۔

”یہ رات کے ایک بجے فون کرنے کا کس کو شوق ہے؟“ کچھ سوچ کر اس نے ریسیور اٹھایا...... ”ہیلو......!“

”تھینکس گاڈ! تم مل گئیں“ زبور کی اطمینان بخش آواز سنائی دی۔

”جی فرمائیے...... اتنی رات گئے ڈسٹرب کرنے کی وجہ؟“ وہ خاصے کھردرے لہجے میں بولی۔

”میں مستقلاً باہر جا رہا ہوں...... یہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ سوچا کہ آپ کو خدا حافظ کہہ دوں۔“

”مگر مجھ سے مطلب......؟ کس حوالے سے کیا ہے آپ نے مجھے فون؟“

”دل کے حوالے سے‘ جو ہزار سمجھانے کے باوجود میری مانتا ہی نہیں ہے۔“

”لگتا ہے آپ کا دل بھی آپ کی طرح پاگل ہے۔“

”ہاں‘ یہ تو ہے۔ میں اب شاید واپس پاکستان نہ آؤں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے بھی خواہ مخواہ کی الجھن سے نجات مل جائے گی۔“

”لیکن آپ کہیں گی تو میں رک سکتا ہوں۔“

”میں کیوں کہنے لگی‘ آپ کل کے جاتے آج چلے جائیں‘ میری بلا سے۔“

”نگین!“ زخموں سے چور آواز میں کہا گیا۔

”جی!“ وہ کچھ کہتے کہتے یکدم رک سی گئی۔

”یہ دل بڑا رسوا کروا دیتا ہے۔ ساری آن بان‘ شان...... اس کے سامنے بہہ جاتی ہے‘ جیسے میں تہی دست تم سے مخاطب ہوں۔“

”جی......“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا جواب دے۔

”سنو...... کیا تم مجھے روک نہیں سکتیں؟“

”مگر کیوں......؟“

”کیا کسی کو چاہنا‘ بہت بڑا جرم ہوتا ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”زندگی تو خیر گزر جائے گی۔ وقت کا کام گزرنا ہی ہوتا ہے مگر تمہیں مجھ جیسا چاہنے والا دوسرا نہیں مل سکتا۔“

”تم مجھے بددعا دے رہے ہو۔“

”نہیں‘ ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”ہوسکتا ہے‘ میری زندگی کا ساتھی تم سے بھی زیادہ مجھے چاہے؟“ بے اختیار وہ کہہ گئی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے گہری سانس لی پھر آپ ہی آپ دھیرے سے ہنسا۔ ایسی ہنسی جس میں محرومیوں اور غموں کی آمیزش ہو اور جس میں سسکیاں موتیوں کی طرح پروئی گئی ہوں اور پھر وہ بڑے شکستہ سے لہجے میں یوں گویا ہوا

جانِ محسن میری تقدیر میں کب لکھا ہے
ڈوبتا چاند‘ تیرا قرب‘ گجر سناٹا

اس سے پہلے کہ وہ سرزنش کرتی‘ اسے ٹوکتی‘ اسے روکتی‘ اس نے ریسیور خود ہی کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ لائن کٹ گئی تھی اور وہ ریسیور کانوں سے لگائے بیٹھی تھی اور اس کی سحر انگیز آواز اس کی سماعت میں ایک چھناکا سا پیدا کر رہی تھی۔

ڈوبتا چاند...... تیرا قرب...... گجر سناٹا......!

کتنی ہی دیر وہ اسی سحر میں ڈوبی رہی اور جب وہ اٹھی تو اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔

”ارے‘ آج صبح صبح بغیر کہے میرے سارے کپڑے استری کر کے رکھ دیئے“ امی خوش دلی سے کہہ رہی تھیں۔

”آج تو مجھے بھی چائے کے لیے نہیں کہنا پڑا“ ابا جی کے لب بھی مسکرا رہے تھے۔

”افوہ......! پہلے تو یہ وائٹ سوٹ تم نے اپنے لیے پسند کیا تھا اور اب یہ اچانک کیسے فیصلہ کر لیا کہ اسے مجھے ہی پہننا چاہیے۔“ فہمی ہنستی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ ”جبکہ کل رات تو تمہارا یہ کہنا تھا کہ یہ سوٹ صرف تم پر ہی اچھا لگے گا۔“

اسے اس سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کو کیا جواب دے؟ بس وہ ہنستی چلی جا رہی تھی۔ خوشی کی کوئی کرن اس کے اندر دور تک چراغاں سا کر رہی تھی۔

رات کو آنے والے زبور کے فون نے تو یکدم اس کا لائحہ عمل ہی تبدیل کر دیا تھا اور روشنی کا یہ جگر جگر کرتا احساس' ایک واضح اور نمایاں تبدیلی کا احساس لیے اس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔

زبور ایک اچھا لڑکا ہے۔ زبور اسے دل کی گہرائیوں کے ساتھ چاہتا ہے اور پیار کرنے والے قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔

اسے اپنی ذات کے اندر سے ابھرتی ہوئی یہ سرگوشیاں اچھی لگ رہی تھیں۔ مگر پھر ایک تذبذب کا سا احساس اس کی تمام خوشیوں کو مٹھی میں بند کر رہا تھا۔

شاید ہاں' شاید نہیں کی کیفیت اس کے چہرے پر کبھی خوشیوں کی برسات کر دیتی اور کبھی غم کے بادل امڈ کر آ جاتے۔

اگلے دن کالج کی لڑکیاں میڈم نگہت کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ ان کی طبیعت ایکا ایکی بے حد خراب ہو گئی تھی۔ نگین کالج سے واپسی پر ہمیشہ سیدھی گھر جاتی تھی مگر آج کالج فیلوز کے ساتھ میڈم نگہت کو دیکھنے جا رہی تھی۔ پہلے تو فریال کا بھی ان کے ساتھ جانے کا پروگرام تھا' مگر عدیل کو محو انتظار دیکھ کر وہ کھسک گئی تھی۔

بس میں بے حد رش تھا۔ نگین آخری سیڑھی پر کھڑی تھی۔ بس تیزی سے چلی، ابھی کچھ ہی دور چلی ہو گی کہ غلط سمت سے آنے والے اسکوٹر کو بچاتے ہوئے بس جو مڑی تو نگین بس سے باہر جا کر گری۔ سڑک پر گرنے کے باعث اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ نگین کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی گری تھیں اور ان کے بھی چوٹیں آئی تھیں۔ یہ حادثہ کالج کے قریب ہی وقوع پذیر ہوا تھا تو جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی۔ ''گرلز کالج کی لڑکیاں بس سے گر کر زخمی ہو گئیں۔''

جس اسپتال میں نگین اور دیگر طالبات کو لایا گیا تھا' وہاں تھوڑی دیر میں ہی مجمع سا لگ گیا۔

نگین کے سر میں چھ ٹانکے آئے تھے اور ہاتھ اور کہنیاں بھی چھل سی گئی تھیں۔ وہ خاصی سراسیمہ سی تھی۔ اس نے دیکھا، زبور انتہائی پریشان سا اس کے قریب کھڑا ہے۔

''آپ کہیں تو میں آپ کے گھر فون کر کے بتا دوں؟'' زبور نے نگین سے کہا۔

''اس وقت گھر میں امی جان اور باجی ہوتی ہیں۔ اسپتال کا نام سن کر وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔''

''چھوڑ دیجیے' اگر تکلیف نہ ہو تو......''

''تو آیئے پھر......'' اس نے اس کے کالج کا بیگ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور وہ دھیرے دھیرے اس کے ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی اس کی گاڑی تک آ گئی۔

اور جمال کا دل چاہا کہ چیخ کر نگین کو منع کر دے۔ ''خبردار! اس کی گاڑی میں مت بیٹھنا......''

مگر اس کی آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کہتا بھی تو کس حوالے سے کہتا؟

جمال جو لوگوں کے مجمعے میں نگین کے بے حد قریب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا' بے چین سا ہو گیا۔ وہ بوائز کالج میں حال ہی میں اکنامکس کا لیکچرر تعینات ہوا تھا۔ کالج آتے جاتے اس کی نظر نگین پر پڑتی تھی اور پھر اس کا گھر نگین کے محلے میں بھی تھا۔

ین ایک شریف اور اچھی لڑکی تھی' یہ بات وہ عرصے سے جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ زبور اپنی ں میں محبت کی قندیلیں روشن کیے نگین کو تکا کرتا ہے۔ جمال کو نگین اس وقت سے اچھی لگا کرتی تھی جب وہ لی طالبہ تھی اور اس کی چھوٹی بہن کی ہم جماعت بھی۔ نگین کو دیکھ کر اس کا اکثر دل چاہتا کہ وہ اسے جا کر یہ ے کہ وہ اسے بہت اچھی لگتی ہے۔

اس کے بولنے کا انداز' اس کے ہنسنے کی ادا' اس کا ہنستے سمے آنکھوں کا بند کر لینا' اس کے گال کا ڈمپل' اس کی ت...... اس کی تنہائیوں میں شور مچائے رکھتی ہے مگر وہ ایک انتہائی سلجھا ہوا لڑکا تھا۔

وہ جانتا تھا' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر' اچھی فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود بھی وہ شخصیت کے لحاظ سے اس مرتبے نہیں ہو سکتا جسے دیکھ کر کوئی لڑکی اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیتی۔

مال کا قد چھ فٹ تو ضرور تھا مگر جسم سرانچ کے بانس کی طرح دبلا' معمولی نقوش کا حامل یہ شخص ہمہ وقت ے رہتا تھا' جس کے پیچھے اس کی ذہین آنکھیں ہمہ وقت چھپی رہتی تھیں۔

ین کی خوبصورتی نے جہاں اس کے دل کی دنیا کو اتھل پتھل کر دیا تھا وہاں اس کی شرافت نے بھی اس کے سا جمایا تھا۔ اس کی کلاسز گرلز کالج کی چھٹی کے وقت آف ہو جاتی تھیں۔ اس کے نکلنے کا وقت بھی عین تھا جب نگین کالج سے نکلا کرتی تھی اور آج بخار کی وجہ سے وہ جلد نکل آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ نگین ستوں کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔

نگین تو اپنے گھر پیدل جایا کرتی تھی' یہ آج کہاں جا رہی ہے۔ فریال کی روش تو وہ عرصے سے دیکھ ہی رہا تھا یہ آج نگین کہاں جا رہی ہے؟

اس کو بس میں سوار ہوتا دیکھ کر' وہ بس اسٹاپ پر کھڑا یہی سوچے چلا جا رہا تھا۔ تب یہ خبر اس تک بھی آ پہنچی گرلز کالج کی لڑکیاں بس سے گر گئیں اور وہ دیوانہ وار جائے وقوع پر جا پہنچا تھا۔

نگین کو دیکھ کر اسے تقویت ہوئی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بال بال بچا لیا تھا مگر نگین کو یوں زبور کے ساتھ ی میں جاتا دیکھ کر اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔

''تم کیوں پریشان ہو رہے ہو جمال! اپنی شکل دیکھی ہے تم نے...... اس نے کون سا تمہاری گاڑی میں بیٹھنا '' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

مال ساکت سا کھڑا' ٹکٹکی باندھے نگین اور زبور کو دیکھ رہا تھا اور اس کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

زبور نے گاڑی کا دروازہ کھولا...... اور وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دوران سفر دونوں ہی خاموش تھے...... نہ نے کچھ کہا اور نہ نگین کچھ بولی۔

زبور نے اس کے گھر کے قریب گاڑی روکی اور وہ اس پر ایک گہری نظر ڈال کر گاڑی بڑھا کر لے گیا اور وہ دیکھتی رہی جب تک کہ گاڑی دوسری سمت نہ مڑ گئی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی اسے دیکھتے ہی نے لگیں۔

''کہہ تو رہی ہوں ناں' بس سے صرف میں ہی نہیں گری اور بھی لڑکیاں گری تھیں۔ سب کے چوٹیں آئی ''

''اگر بس کے پہیے کے نیچے آ جاتی تو......'' امی اچھی خاصی پریشان ہو گئی تھیں۔

ہی باجی نے تو اسے زبردستی بستر پر لٹا دیا تھا۔ دودھ' جوس اور سوپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اسے پلا رہی

تھیں۔

''نہ جانے کتنا خون بہہ گیا ہوگا میری بہن کا......'' انہیں یہ ملال کھائے جا رہا تھا۔

''رنگ تو بالکل ہلدی ہو گیا ہے۔'' امی بار بار اس کی شکل دیکھ رہی تھیں اور پھر وہ پورے چھ دن کالج نہیں گئی۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ زبور نے اسے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ کہاں تو وہ مجھے روز فون کر رہا تھا اور اب میری خیریت بھی نہیں پوچھی۔ اس کے دل میں یہ خیال در آیا۔

فریال کا فون آیا تو وہ اس سے بلاوجہ باتوں کو طول دیتی چلی گئی۔

''تمہارے عدیل کا کیا حال ہے؟''

''فرسٹ کلاس!''

''اور ان کے دوستوں کا......؟''

''زبور تو کینیڈا جا رہا ہے، اپنے بڑے بھائی کے پاس۔ اس کے پاس کینیڈا کی امیگریشن ہے، جب ہی تو......''

''اس کے گھر والے نہیں سمجھا رہے۔''

''ارے' بہت سمجھا رہے ہیں کہ پہلے اپنا ایم بی اے مکمل کر لو مگر وہ مان ہی نہیں رہا ہے' کہہ رہا ہے کہ اب کراچی میں دل نہیں لگتا۔''

''ہوں...... یہ بات ہے'' اس کے دل نے سوچا۔

امی فہمی باجی کے ساتھ مارکیٹ گئیں تو اس نے سی ایل آئی پر اس کا نمبر تلاش کیا اور پہلی مرتبہ اس کے نمبر ڈائل کیے۔ یہ موبائل کا نمبر تھا۔ زبور نے خود ہی اٹینڈ کیا تھا۔

''ہیلو......! زبور بول رہا ہوں۔''

''میں...... بات کر رہی ہوں'' وہ آہستہ سے بولی۔

''نگین...... یہ تم...... تم...... بول رہی ہو......!'' اس کے لہجے میں حیرانی رچی ہوئی تھی۔

''ہاں...... میں......'' وہ چھن سے ہنس دی ''مگر آپ نے کیسے پہچانا......؟''

''تمہیں پہچانتا نہ...... تو جیتا کیسے...... بالآخر میرے دل کے تار تمہارے دل تک جا پہنچے...... مگر پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا۔ واقعی مجھے یقین نہیں آ رہا'' اس کا لہجہ مسرور اور شاداں سا ہو گیا۔

''آپ کینیڈا جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نگین! میں جا رہا تھا...... مگر اب نہیں۔''

''ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟'' ناز سے پوچھا گیا۔

''کسی کو مجھ پر رحم آ گیا اور بس......!''

''اپنا ایم بی اے تو پورا کر لو۔''

''میرا پڑھنے میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا تو کیا کرتا؟''

''اب آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیجیے۔''

''اور کس پر توجہ دینی ہو گی......؟'' وہ شرارت سے ہنسا۔

''پتا نہیں......'' وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس دی اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

طبیعت میں پژمردگی' بے چینی اور تھکن...... جو اسے نڈھال سا کیے ہوئے تھی' پل بھر میں ہوا ہو گئی اور اس ے لب بے اختیار گنگنانے سے لگے۔

☆☆☆

وہ باغ کے گوشے میں' پھولوں کے پاس بیٹھی ہوئی خود بھی کوئی پھول لگ رہی تھی۔ وہ' جو...... خوابوں میں کسی ے سنگ جاتے ہوئے ڈرا کرتی تھی' آج حقیقت میں اپنے چاہنے والے کے مدمقابل تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو نگین؟'' زبور نے چاہت بھری نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔ وہ چھن سے ہنس دی۔

''کچھ بھی نہیں۔ اور آپ......؟'' اس نے مسکراتے لبوں سے پوچھا۔

''میں...... میں تو اپنی خوش قسمتی پر حیران ہوں اور

؎ ایسا گم ہوں تیری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

اور وہ پھر شرما سی گئی۔

''کچھ اپنے بارے میں بتاؤ نگین!'' اب وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے' سینے پر اپنے دونوں ہاتھ باندھے پوچھ رہا تھا۔

''بہت ڈرپوک تھی' بے حد بزدل بھی...... مگر نہ جانے کیا ہوا...... کہ میں آج آپ کے سامنے یوں بیٹھی ہوں کہ ہر خوف زائل ہو گیا ہے۔''

''پیار میں بہت طاقت ہوتی ہے' وہ جس کو چاہے اپنی جانب کھینچ لیتا ہے' جس طرح میرے پیار نے تمہیں یہاں بلا لیا۔''

''شاید ایسا ہی ہو......'' وہ گم صم سی ہو گئی، جیسے کسی نے اس پر فسوں پھونک دیا ہو۔ اور زبور کا دل چاہا' اس کا چاند سا ہالہ اپنی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے بھر لے...... وہ بنا پلکیں جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ہے ازل سے ملاپ روحوں کا
پیار کب آزما کے ہوتے ہیں
بجلیاں پوچھ کر نہیں گرتیں
حادثے کب بتا کے ہوتے ہیں''

بات عجیب و غریب بھی ہے اور حیرت انگیز بھی کہ جو نہیں، ہوتا ہے وہ ہو جاتا ہے......اور جو ہونا ہوتا ہے وہ نہیں کی لامحدود وسعتوں میں کسی جگہ جا چھپتا ہے۔ کہاں جا چھپتا ہے؟ اس کا کھوج کوئی نہیں نکال پایا ہے۔

نگین زبور کو سخت ناپسند کرتی تھی' اس کو دیکھ کر غصہ آتا تھا۔ اس کی آواز سن کر تلملا جاتی تھی' راب...... اس ے باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر حیا اور سرشاری کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

وہ عکس جو محبت کے وجود سے پھوٹتا ہے تو قوس قزح کی طرح دکھائی دیتا ہے اور زندگی کو جادو کی طرح اپنا اسیر کر لیتا ہے۔

''اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مسلسل میری جانب؟'' نگین نے شرما کر پوچھا۔

’’میں اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ میرے مد مقابل میری محبت بیٹھی ہے۔

جب سے میری آنکھوں میں تیرا عکس حسین ہے
فردوس نگاہوں میں مری کچھ بھی نہیں ہے

’’سنو، یہ فردوس کون صاحبہ ہیں؟‘‘ اس نے مصنوعی غصے سے کہا اور زبور بے اختیار ہنس دیا۔

☆☆☆

سہیلی کی سالگرہ کا بہانہ بنا کے نگین زبور کے ساتھ کلفٹن کے ساحل پر تھی۔ دونوں گیلی ریت پر بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے اردگرد کے ماحول سے بالکل غافل تھے۔

پتا نہیں محبت میں یہ طاقت کہاں سے آ جاتی ہے کہ بزدل کو بھی بہادر بنا دیتی ہے۔ نگین کے نظریات پانی کے ریلے کی طرح بہہ چکے تھے۔

’’یہ میں جان گیا ہوں کہ محبت کی آگ کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ دوسرے تک پہنچتی ضرور ہے جیسی کہ تم تک جا پہنچی۔ حالانکہ میں تو مایوس بھی ہو گیا تھا۔‘‘ زبور نے پرمحبت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’یہ محبت کسی بلا کی طرح دل میں گھس کر بیٹھ جاتی ہے، پھر چاہے کتنی خوشامدیں کرو، یہ نکلتی ہی نہیں ہے۔‘‘ نگین کے لہجے میں شہد اور خمار یکساں تھا۔

’’تم تو محبت کو بلا نہ کہو‘‘ زبور نے ہنس کر کہا۔

’’محبت شاید جادو ہے، جس پر چڑھ جائے اسے اپنا اسیر کر لیتی ہے۔ لگتا ہے تم نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا ہے۔‘‘ وہ ہنس دی۔

’’ہاں، بہت بڑا جادوگر ہوں میں، ہمیشہ یاد رکھنا۔‘‘ زبور بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

’’یہ موسم، یہ ماحول آج سے پہلے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا۔ حالانکہ بارہا ان مقامات پر آ چکی ہوں۔‘‘ اس نے اپنے پاؤں پانی میں ڈال دیے۔

’’اس کی خوبصورتی کی وجہ تم ہو۔ جب ہی تو یہاں محبت کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ جگہ میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ شاید محبت اپنی تابناکیوں کے ساتھ مزید خوبصورت ہو جاتی ہے۔‘‘

’’چلیں، اب گھر چلیں......؟‘‘

’’نہیں، ابھی نہیں...... تھوڑی دیر اور بیٹھو...... سہیلی کی سالگرہ اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی۔‘‘

’’پھر کب ختم ہو گی؟‘‘

’’پہلے میرے ساتھ ہوٹل چلو۔ وہاں ڈنر تو کر لیں...... ورنہ امی نے پوچھا کہ سالگرہ میں کیا کھا کر آئیں تو کیا جواب دو گی؟‘‘

’’ہاں، یہ تو ہے۔‘‘ نگین کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ’’سخت بھوک لگ رہی ہے، کھانا کھائیں۔‘‘

’’سالگرہ میں شریک مہمان گفٹ لے کر بھی تو اپنے گھر جاتے ہیں۔‘‘ زبور کھانے کے بعد اس سے کہہ رہا تھا۔

’’وہ تو چھوٹے بچوں کو گفٹ ملتے ہیں۔‘‘ نگین نے کہا۔

’’بعض تقریبات میں بڑے بچوں کو بھی گفٹ ملتے ہیں‘‘ زبور نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

’’اچھا...... مثلاً...... کیا؟‘‘

’’د فیوم کا سیٹ......‘‘ اس نے اپنے چرمی بیگ سے گرین پیکٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

’’یوں دے رہے ہیں آپ مجھے؟‘‘

’’ا گھر جا کر یہ کہہ سکو کہ تم سالگرہ سے ہی آئی ہو۔‘‘

’’اب سالگرہ کی کیپ اور بیلون کی کمی رہ گئی ہے۔‘‘ نگین نے ہنس کر کہا۔

’’وہ آئندہ کسی دوسری سالگرہ میں لے جانا۔‘‘ وہ بھی اس کے ساتھ ہنس دیا۔

☆☆☆

لہاں تو فہمی کی سسرال والے شادی کے لیے آنا کانی کر رہے تھے، وہاں اب اتنی جلدی مچی کہ ہتھیلی پر بہانے دے رہے تھے۔

’’ اگلے مہینے کی کوئی تاریخ دے دیجئے۔ میرے لڑکے کو سال کے سال چھٹی ملتی ہے۔ چھٹی ختم ہو جائے گی تو اگلے برس کو چلی جائے گی۔‘‘ بی سمدھن دہلیز لیے بیٹھی تھیں۔

’’ٹھیک بات ہے‘‘ ریحانہ بیگم نے ان کی بات مان لی اور جلدی جلدی ہر کام نمٹائے جانے لگے۔ عزیزوں کو بلا لیے گئے۔ کارڈز چھپنے دینے کا کام بھائی کے ذمے لگا دیا گیا۔ کھانے پکوانے کی ذمے داری فہد پر ڈال دی اور نگین کو کہہ دیا کہ کالج سے چھٹی لے کر گھر بیٹھ جائے۔

نگین جو کالج جانے سے زیادہ زبور سے ملنے جاتی تھی، اسے یہ شرط خاصی گراں گزری۔

’’امی! کالج سے آ کر سب کام کر لوں گی مگر کالج کی چھٹی نہیں کروں گی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ارے بیٹا! پندرہ دن کی تو بات ہی ہے۔ تم گھر میں نہیں بیٹھو گی تو کام کیسے ہو گا؟ میں اکیلی جان بازار ہی کی یا گھر کو دیکھوں گی؟‘‘

’’ٹھیک ہے، گیپ کر کے چلی جایا کروں گی‘‘ لہٰذا نگین ایک دن کالج جاتی اور دو دن چھٹی مناتی۔ زبور کو یہ بات خاصی شاق گزرتی...... اور جب وہ پانچ دن تک کالج نہیں گئی تو اس کا خط فریال لیے چلی آئی۔

’’محترمہ! آپ نے ہمارا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر ہم پیغام رساں کے فرائض انجام دینے کے لیے حاضر ہیں۔ لیجئے، اپنے ہیرو کا پیغام محبت...... کہ آپ کی جدائی میں وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہوں

نگین نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر لفافہ لیا تو دل بے قرار کا احوال کچھ یوں رقم تھا۔

پیاری نگین! سدا خوش رہو۔

ہم مان لیتے ہیں
فرصت نہیں ملتی
تمہیں اپنی پڑھائی سے
کبھی گھر کی صفائی سے
کبھی بابی کے چنگل سے
ہم مان لیتے ہیں
فرصت نہیں ملتی
کبھی تو چنک بھی جاتا ہے

وہاں سکھیوں سے ملنا ہے
پھر اس کے بعد کتابوں سے الجھنا ہے
کبھی بازار جانے سے
کبھی کاجل لگانے سے
چلو ہم مان لیتے ہیں
تمہیں فرصت نہیں ملتی
یہ سب کچھ مان لیتے ہیں
مگر اک آرزو دل کی
تمہیں دل سے بتاتے ہیں
بس اک لمحے کو آ جانا
بس اتنا بتا جانا
تمہاری نیند میں اب بھی ہمارے خواب پلتے ہیں
یقیں جانو' یہ اک لمحہ ہر دیوار گرا دے گا
ہمیں صدیاں بنا دے گا۔

تمہارا اپنا زبور۔''

☆☆☆

شاہنواز اپنی بیٹی کے اے ون گریڈ لانے پر بہت ہی خوش تھا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ ثنا اپنے میٹرک کے امتحان میں کسی پرچے میں لڑھک نہ جائے کہ عادی تھا۔ سائرہ کی کمپارٹ آئی تھی اور فریال کی بھی مگر ثنا نے کمال کر دیا' نہ صرف پاس ہوئی بلکہ بہت اچھے نمبروں سے۔ ''اے ون تو بہت اچھا گریڈ ہے بھئی'' وہ سرشا سے ہنسا۔

''بھائی جی! اسی بات پر مٹھائی کھلایئے بلکہ اچھی سی دعوت بھی۔''

شاہنواز نے اسی وقت ایک ہزار کا نوٹ فریال کو تھما دیا۔ ''مٹھائی بھی منگا لو اور اپنی پسند کی کوئی چیز پکا لو۔''

''بھائی جی! اس خوشی میں آپ کو بہنوں کو سوٹ دینے چاہئیں'' سائرہ نے ہنس کر کہا۔ شاہنواز نے دونو بہنوں کو ایک ایک ہزار کا نوٹ پکڑا دیے۔

شائستہ بیگم اپنے بچوں کو یوں خوش و خرم دیکھ کر جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دینے لگیں۔ شاہنواز کا موڈ بہت اچھا تھا۔ انہوں نے بھی ثنا کی یہ کامیابی ان کی دعاؤں کے طفیل ڈال دی۔ ماں کا مان مزید بڑھ گیا اور کے جاتے ہی ثریا کا موڈ یکدم آف ہو گیا۔

''کیا ضرورت تھی یوں پیسوں میں آگ لگانے کی۔ حرام کی کمائی تو آپ کے پاس نہیں آتی جو یو لٹا دی۔''

''کوئی بات نہیں' سوتیلی ہی سہی مگر ہیں تو وہ میری بہنیں! خون تو ایک ہی ہے، اگر میں نے ان کو اپنی خو میں شریک کر لیا تو ایسا کون سا گناہ ہو گیا؟''

''گناہ تو خیر نہیں ہوا مگر ان سب کے دماغ تو خراب ہو جائیں گے نا' اب سکندر کا آٹھویں کا رزلٹ آئے تو اپنے بٹوے کا منہ کھول دیجیے گا۔ لٹا دیجیے گا اپنی ساری کمائی۔''

''دیکھا جائے گا'' آج شاہنواز کو اپنی بیوی کی باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی (خوشی کی کوئی نہ کوئی رگ مثبت اطوار سے بھی شاید ملتی ہے۔)

ثریا باورچی خانے میں سالن چڑھانے آئیں تو صابرہ کے آگے کلیجا کھول دیا۔ ان کا جلال کسی صورت کم ں ہو رہا تھا۔

''دیکھو تو سہی' کیسے موقع تاک کر یہ بہنیں وار کرتی ہیں۔ دی دھیلے کی چیز اور بھائی کو منٹوں میں بے وقوف ہا۔ اپنے آپ کو عقل مند کہتے ہیں مگر اول درجے کے پاگل ہیں ہمارے میاں' ہاں......''

''بھابی پاشا! آپ کے سوچنے کا انداز بہوت اچ غلط ہے۔ شاہنواز بھائی کو واقی بڑی خوشی ملی نا' اس لیے ذرا ہلا گئے ہیں انوں۔ انوں خوش ہیں تو آپ کو بی ان کی خوشی میں خوش رہنا چاہیے۔ آپ دل چھوٹا نکو رہے۔ جب میرے بیٹے منور کا اے ون گریڈ آئے گا ناں تو میں بی دو آنے کے پٹھانے بانٹوں گی۔'' (مٹھائی انوں کی) میرے جذبے بی ایسی اچ ہیں دیوانے شانے۔''

''تم تو دو آنے کے بانٹو گی' ہمارے پاگل میاں نے تو ہزاروں لٹا دیے'' ثریا نے جل کر کہا۔

''ہاؤ! یہ تو میں مثال میں بولی تھی ناں۔ دو آنے سے مراد بہت سارے پیسے بولتے۔ خ تو بھابی پاشا خ (ق) ہوتا ہے ناں۔ وہ ضرور دیو آپ' کچھ بی کم نہیں ہوئیں گا آپ کا۔''

☆☆☆

ثنا کو اچھے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ ثنا بہت خوش تھی۔ اس کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو جائے۔ ڈاکٹر بن جانا اس کا خواب تھا۔

ان دنوں گھر کا ماحول بھی خاصا خوشگوار تھا۔ شاہنواز اور دلنواز کے ماتھوں پر تیوریاں نظر نہیں آتی تھیں۔ سائرہ کبھی اپنی بھابیوں سے بے تکلفی سے باتیں نہیں کرتی تھی مگر ماحول کا اثر شاید اس پر بھی ہو گیا تھا۔ ایک شام وہ صابرہ کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

''بھابی' آپ ق کو خ کیوں بولتی ہیں؟''

''تم لوگ بی تو ق کو ک بولتے۔ مثلاً قیمے کو کیمہ بولتے۔ مرغی کو مرگی بولتے۔ قائداعظم کو کائداعظم بولتے۔''

''اچھا' ہمیں تو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا۔'' سائرہ ہنسی۔

''احساس تو نکو ہونا چاہیے' بس اپنی باتاں دوسرے کو معلوم پڑ جائیں ناں تو یہی اچ بہوت ہے۔''

''ہاں' یہ بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔'' سائرہ ان سے متفق ہوتے ہوئے بولی۔

''ہم کم از کم ق کو خ تو بولتے نا' ساؤنڈ تو ویسا ہی ہوتا۔ بس ذرا گہرائی میں فرق آ جاتا۔''

''ہاؤ' برابر بولیو آپ......'' سائرہ نے کہا اور صابرہ نے ہنس کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''ایو سائرہ! کتے اچھی باتاں کر رئی ناں تم! میں سچ بولتیوں۔''

☆☆☆

جب ذہن کہیں اور ہو اور زبان ذہن کا ساتھ نہ دے رہی ہو تو کسی بات میں ربط اور تواتر برقرار نہیں رہتا۔ اس وقت نگین کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

آج وہ شام چار بجے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ جھوٹ بولنے میں دقت ہوئی تھی مگر جب وتیرہ ہی بن گیا تھا تو روزانہ نت نئے جھوٹ بولنے لگی تھی۔

بعض مرتبہ تو اسے خود اپنی باتوں پر حیرت ہوتی مگر آج شاید تھکن زیادہ تھی یا زبور کے رومانی ڈائیلاگ کا نشہ زیادہ تھا۔ اس کا دماغ ابھی زبور کے ساتھ ہی تھا۔ اس کی باتیں دل میں گلاب سے کھلائے دے رہی تھیں۔ وہ کپڑے چینج کر کے لاؤنج میں آئی تو فہمی نے پوچھا۔

نگین، میں بریانی لے آؤں تمہارے لیے؟ مسالے والی بنائی ہے، تمہاری پسند کی۔’’

‘‘ہاں، کل کے لیے کپڑے ابھی پریس کروں گی۔’’ وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

‘‘ارے...... کیا کھانا ابھی نہیں کھاؤ گی؟’’ فہمی نے حیرت سے کہا۔

‘‘فریال دو دن سے چھٹی پر ہے۔’’

‘‘ہو گی...... مگر کھانا کب کھاؤ گی؟’’

‘‘کل میں کالج کے بعد پریکٹیکل کرنے کوچنگ سینٹر جاؤں گی۔ کالج میں پریکٹیکل سمجھ میں ہی نہیں آرہے ہیں۔’’

‘‘تو کھانا بھی وہیں کھا لینا’’ فہمی نے جل کر کہا۔

‘‘فہمی باجی! آپ کو کون سے ہوٹل کا کھانا پسند ہے؟’’

‘‘ہوٹلوں میں ابا جی کب سے لے جانے لگے۔ مجھے تو صرف ہوٹلوں کے نام ہی پتا ہیں۔ کبھی اندر سے جا کر کہاں دیکھا ہے کسی ہوٹل کو؟’’

‘‘میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی’’ وہ جھینپ کر کھسیا سی گئی۔

‘‘کھانا لے آؤں، آج تمہاری پسند کی بریانی پکی ہے؟’’

‘‘اس وقت میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا کچھ کھانے کو۔’’ اور فہمی کا دل دھک سے رہ گیا۔

‘‘یہ تم کہہ رہی ہو نگین! پیٹ بھرے پر کھا لینے والی؟’’

‘‘اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔’’

‘‘آج صبح تو تم ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کر کے گئی تھیں۔’’

‘‘کالج میں انٹ شنٹ کھا لیا تھا ناں، اس لیے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ پریکٹیکل بھی دو کر لیے اس لیے تھکن بھی زیادہ ہو رہی ہے۔’’ وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتی چلی جا رہی تھی۔

‘‘نگین! ایک بات پوچھوں......؟’’

‘‘ہوں......’’

‘‘سچ سچ بتاؤ گی؟’’

‘‘ہاں...... ہاں، کیا بات ہے؟’’ اس نے بے پروائی سے پوچھا۔

‘‘میری طرف دیکھو...... اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو۔’’ فہمی نے اس کا چہرہ گھما کر اپنے سامنے کیا۔ تب نگین نے نظریں جھکا دیں اور آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

‘‘کون ہے وہ؟’’

‘‘پتا نہیں۔’’

‘‘مجھ سے بھی چھپاؤ گی تم...... اپنی بہن سے؟’’

‘‘نہیں...... ایسی بات تو نہیں ہے۔’’

‘‘تو پھر بتاؤ، آج تم کس کے ساتھ گئی تھیں؟’’

‘‘زبور کے ساتھ۔’’

‘‘اور کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟’’

‘‘بہت زیادہ دن نہیں ہوئے۔’’

‘‘نگین! ایک بات پوچھوں......؟’’ فہمی نے کہا۔

‘‘جی......’’ اس کی نظریں زمین کو چھو رہی تھیں۔

‘‘تم اتنی بہادر تو کبھی نہیں تھیں تو پھر یہ کیسے اتنی نڈر بن گئیں...... جب کہ جانتی ہو کہ ابا جان کتنے سخت ہیں اور امارے گھرانے میں ایسی باتیں کتنی معیوب سمجھی جاتی ہیں؟’’

‘‘باجی! محبت میں بندہ شاید نڈر ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ زبور مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس کے بغیر جینے کا تصور تک نہیں کر سکتی اور وہ بھی......’’

‘‘وہ تم سے محبت کرتا ہے، تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا تو اس سے کہو کہ رشتہ بھجوا دے اور تم سے شادی کر لے۔’’

‘‘یقیناً ایسا ہی ہو گا مگر ابھی تو ہم ٹھیک طرح سے ملے بھی نہیں ہیں۔’’

‘‘مزید کتنا عرصہ اور لگے گا، ایک دوسرے کو جاننے میں؟’’ فہمی کا لہجہ دوٹوک سا تھا۔

‘‘بس جلد ہی......’’

‘‘اگر تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو اندازہ ہے، کیا کچھ ہو سکتا ہے؟’’

‘‘میں بہت محتاط رہتی ہوں۔ سوائے ہوٹل میں جا کر کچھ کھانے پینے کے، ہم کہیں جاتے ہی نہیں۔’’

‘‘نگین! یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔’’

‘‘آپ ایک دفعہ زبور سے مل لیں تو آپ کے خیالات بھی میرے ہم نوا ہو جائیں گے۔’’

‘‘تمہارے ساتھ باغوں اور کھلیانوں میں جا کر تو نہیں مل سکتی۔ اس سے کہنا کہ کسی دن مجھ سے فون پر بات رے۔’’

‘‘ٹھیک ہے باجی! میں کل ہی آپ کی بات کرا دوں گی۔’’

فہمی کی زبور سے بات ہو گئی تھی۔ زبور نے انتہائی سلجھے ہوئے لہجے میں اپنا تعارف کرایا تھا اور نگین کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ فہمی نے بطور خاص اسے باور کرایا تھا کہ وہ نگین کا یوں باہر ملنا بالکل پسند نہیں کرتی ہے۔ زبور نے وعدہ بھی کیا تھا اور نگین کو اپنی آن اور جان قرار دیا تھا مگر اس کے باوجود فہمی مطمئن سی نہیں ہوئی ھی۔ کہیں من میں ایک کھٹک سی اتر آئی تھی۔

‘‘خدا کرے کہ زبور ایسا ہرگز نہ ہو جیسا کہ وہ سمجھ رہی تھی۔’’ اس نے اپنا سر جھٹک دیا تھا۔

☆☆☆

شجاع اپنے دروازے کے سامنے حفیظ سے بات کر رہا تھا۔ حفیظ چہرے پر توفقّی کا احساس لیے ہنس ہنس کر واب دے رہا تھا، احساس برتری کا نشہ اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

‘‘تمہاری بھابی بڑی بھلی ہے۔ جو میں کہتا ہوں، وہی کرتی ہے مگر میں اسے پھر بھی دبا کر رکھتا ہوں، اگر سختی

ناں نہ کروں تو اس کے دماغ خراب ہو جائیں گے۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' خواہ مخواہ تم بھابی جی کو پریشان کرتے ہو۔'' شجاع کو حیرت تھی (حفیظ کی شادی کو ابھی تین ماہ ہی تو ہوئے تھے)

''تمہیں پتا نہیں ہے ناں' بیوی کی ہر بات مانو تو وہ سر پر بیٹھ جاتی ہے، اترنے کا نام نہیں لیتی۔ اس لیے کبھی کبھی سختی بھی ضروری ہوتی ہے۔'' وہ نتھنے چڑھائے' آنکھوں میں غرور کے لشکارے مارتے کہہ رہا تھا۔

''بھئی' مجھے تو نہیں سمجھ آتیں یہ پاگلوں والی باتیں'' شجاع اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

''پہلے مجھے بھی نہیں پتا تھا۔ شادی کے بعد ہی پتا چلا تھا۔ غصہ' ڈانٹ پھٹکار بیوی کے لیے دوا کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوا بھی وہ جو اسے فائدہ دے۔''

''ہم تو بھئی ایسی دوا نہیں پلائیں گے۔ خوا مخواہ ہی......'' شجاع ہنس رہا تھا۔

''یہ کہنے کی باتیں ہیں۔ تیرا غصہ تو پہلے ہی سوا نیزے پر رہتا ہے۔ تو' تو اضافی گھن گرج کے ٹانک بھی پلائے گا۔'' وہ ہنستا چلا گیا جیسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''اب میں تیرے نقش قدم پر تو چلنے سے رہا۔''

''اب میں جاؤں' راہ دیکھ رہی ہوگی بھابی تیری'' حفیظ کے چہرے پر گلگوں سا اجالا پھیل گیا۔

''ہاں ہاں' جلدی جاؤ ورنہ ڈانٹ پڑے گی۔ کہاں رہ گئے تھے تم...... اتنی دیر میں آئے ہو سیب لے کر۔ خریدنے گئے تھے یا توڑنے......'' شجاع نے اس کے ہاتھ میں سیبوں کا شاپر دیکھ کر شرارت سے کہا اور گھر میں جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''رکنا شجو بھائی! صرف ایک منٹ...... یہ آپ کا کارڈ آیا ہے'' پیچھے سے پوسٹ مین نے آواز لگائی۔

''ارے' یہ کس کا کارڈ آ گیا؟'' شجاع لفافہ چاک کرتے ہوئے ڈیوڑھی سے اندر آ گیا۔

''کس کا خط ہے؟'' عظمت نے چاول چنتے ہوئے پوچھا۔

''آپ بوجھیں' کہاں سے آیا ہوگا؟'' اتنا بتا دیتا ہوں' یہ شادی کا کارڈ ہے'' شجاع کارڈ پڑھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''لاہور سے تمہاری پھوپی کے گھر سے آیا ہوگا۔ ان ہی کے ہاں ہمیشہ تقریبات اچانک ہی ہوتی ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے چاول کا پرات باورچی خانے میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''نہیں امی' کارڈ تو اپنے فرید ماموں کے ہاں سے آیا ہے۔ فہمی کی شادی ہو رہی ہے'' شجاع نے کارڈ پڑھ کر ماں کو پکڑا دیا۔

''اونہہ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ اپنی زبان میں کارڈ چھپواتے ہوئے شرم آتی ہوگی'' انہوں نے دیکھ کر بے دلی سے رکھ دیا۔

''کم پڑھے لکھے لوگ انگریزی میں کارڈ چھپواتے ہیں۔ امی میں بھی اپنی شادی کا کارڈ انگریزی میں چھپواؤں گا۔'' شجاع تمسخر سے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''احساس کمتری کے مارے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ باؤلوں کی نقل کریں گے۔''

''پھر اردو میں چھپے گا ناں میرا کارڈ...... اس بات کو لاک کر دیں'' شجاع نے شرارت سے پوچھا۔

''ابی فرحت کا بھی اردو میں چھپا تھا ناں۔ یہ کوئی ایسا مشکل مرحلہ تھوڑی ہے جس پر سوچا جائے'' عظمت ے ہوئے بولیں۔

''کارڈ ویسے اچھا ہے' لگتا ہے کارڈ پر خاصے پیسے خرچ کیے ہیں ماموں نے...... دیکھیے تو سہی' پچاس روپے ہیں ہوگا یہ کارڈ'' شجاع نے کارڈ ماں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہمارے ماموں کی شوبازی کی ہمیشہ کی عادت ہے۔ کردیے ہوں گے خرچ۔ جہیز پر جھنڈی دکھا دیں ''

''یا پتا شادی بھی اچھی ہو رہی ہو' دکان تو ان کی بہت بڑی ہے۔ پانچ آدمی تو ملازم ہیں ان کی دکان پر۔''

''یسا خرچ کرنے کے لیے دل چاہیے اور فرید کے پاس ایسا دل نہیں ہے۔''

''ہیں کیا' وہ جو دل چاہے کریں یا نہ کریں۔''

''ہاں' یہ تو ہے'' عظمت اب پالک کی ڈنڈیاں توڑنے میں مصروف ہوگئیں مگر دل میں ایک انی سی چبھ گئی' ال جو نہیں آیا تھا۔

''امی آج بہت گرمی ہے' چائے مت بنایئے گا۔''

''میں نے تیرے لیے پہلے ہی لسی بنا کر رکھی ہے'' عظمت نے بیٹے کو بڑے سے گلاس میں لسی دیتے ہوئے

''شادی میں جائیں گی آپ؟'' شجاع نے گلاس خالی کر کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے' یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں شادی کتنے ہفتے بعد ہو رہی ہے؟'' وہ پھر پالک کی پرات اپنے سامنے لے لیں۔ (ایک آس تھی' کارڈ کے بعد بھائی بھی چلا آئے گا)

''کتنے ہفتے بعد؟'' وہ ہنسا۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے بیٹا! دور دراز رہنے والوں کو دو تین ہفتے پہلے مطلع کیا جاتا ہے تا کہ وہ بھی اپنی لیں۔''

''باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں ہر کام اصول اور قاعدے کے تحت ہوتا ہے۔ یہ فرید ماموں کے گھر کی ہے۔ اور وہ بھی پہلی پہل تقریب'' شجاع تمسخر سے بولا۔

''فہمی کی شادی کب ہو رہی ہے؟''

''آج سے تین دن بعد ہے۔ فرحت کا نہ کارڈ ہے اور نہ ہی ہمارے کارڈ میں اس کا نام لکھا ہے۔ اب آپ ام بتایئے کہ کراچی یہاں سے کب روانہ ہوں گی' کل یا پرسوں۔''

''جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی کے بلاوے کیا اس طرح کھڑے کھڑے دیے جاتے ہیں؟ اول کر دینا چاہیے تھا۔ لوگ تو دس دس بہنوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان سے ایک بہن کے پاس آیا نہیں وہ بول رہی تھیں مگر لہجہ گلوگیر سا تھا۔

''لگتا ہے کہ جلد ہی معاملہ نمٹ گیا ہو اس لیے ماموں نہ آ سکے ہوں۔ آپ چلی جائیں ورنہ خواہ مخواہ کی بنائیں گے'' شجاع نے سمجھایا۔

''بناتے ہیں تو دکھالیں' میرا تو دل اب پھٹ گیا ہے' کیا تھا ہمارے اس کارڈ کے ساتھ فرحت کا کارڈ بھی خط میں بلانے کی تاکید بھی کرتے' تب مجھے بھی یوں لگتا بھائی اپنی خوشیوں میں مجھے دل سے شریک

کرنا چاہتا ہے مگر انہوں نے تو صرف ایک کارڈ بھیج کر احسان کیا ہے کہ آتی ہو تو اچھا ہے' نہیں آتی ہو تو ا
زیادہ اچھا ہے۔"

"امی' یہ سب ممانی جان کی وجہ سے ہوا ہے' وہ چاہتی ہی نہیں ہیں کہ ہم کراچی ان کے گھر جائیں۔"

"یہ اطوار تو اس کے شروع سے ہی تھے۔ ایک خدا واسطے کا بیر اس نے مجھ سے باندھا ہوا ہے۔"

"آپ نہیں جائیں گی تو انہیں باتیں بنانے کا موقع مزید مل جائے گا" شجاع نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر چلی گئی...... تو وہ باتیں پھر بھی بنائے گی' اس کی عادت ہی ایسی ہے' جس طرح بعض لوگوں' سسرال والوں سے اللہ واسطے کا بغض ہوتا ہے' کچھ ایسا ہی رویہ اس کا میرے ساتھ تھا۔"

"لوگ پوچھیں گے تو کیا کہیں گی آپ' اپنی بھتیجی کی شادی میں کیوں نہیں گئیں؟"

"میں خود جواب دے دوں گی تو مارے فکر کے دبلا مت ہو" وہ غصے سے بولیں۔

"ارے رے...... آپ مجھے دبلا کہہ رہی ہیں، اس پورے گاؤں میں میرا جتنا قد' میری جیسی صحت کس ہو گی۔ میرے جیسے ڈولے تو لوگ بنانا چاہتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ امی، مجھ پر فخر کیا کریں' آپ کا بیٹ جوان ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔"

"ہاں ہاں' مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ ہیرو ہے تو جب ہی حفیظ کی شادی میں ایک گھرانا تیرا دیوانہ عظمت ہنس کر بولیں۔

"کون دیوانہ ہو گیا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تیرے دوست حفیظ کی شادی اپنی فرحت کی سسرال میں ہوئی ہے ناں' اس شادی میں دلہن کی سہیلی فرح پیش پیش تھی۔ اس کی بڑی بہن فرحت کے گھر بار بار چکر لگا رہی ہے اور ہمارے گھر آنے کا بھی کہہ رہی ہے۔"

"لو یہ بھی کوئی بات ہوئی' آنے دو۔"

"جھلا نہیں تو' تو میرا مطلب ہی نہیں سمجھا۔"

"کیا مطلب ہوا بھلا......؟ کسی مہمان کو آنے سے تو منع نہیں کرتے ناں۔"

"پگلے ہیرو! وہ تیرے چکر میں ہیں" وہ ہنسیں۔

"مگر کیوں؟"

"شادی کرنا چاہتی ہیں اپنی بہن سے تیری۔"

"ابھی کیسے کر سکتا ہوں میں" شجاع بے پروائی سے بولا۔

"کیوں، تجھے کون سی بہنیں بیاہنی ہیں ابھی۔ اللہ کا شکر ہے' تیرے اوپر کون سی ذمے داریاں ہیں۔ شادی میں اس لڑکی کو میں نے اپنی بہو کی نظر سے تو نہیں دیکھا مگر سوچ رہی ہوں' اب کسی دن فرحت کے جا کر دیکھ آؤں، اگر اچھی لگی تو ہم بھی رسم کر لیں گے۔"

"نہیں امی' ابھی کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے میں ایک بڑا سا مکان تو بنا لوں' یہ مکان تو چھوٹا ہے، بے حد چھوٹا۔" شجاع نے تاسف سے کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے' یہ گھر چھوٹا ہے؟ ہمارے گھر میں ہے ہی کون...... میں اور تو...... ہمارے حساب سے تو خاصا کشادہ ہے۔ تین کمرے ہیں' خوب بڑا سا صحن ہے اور کیا چاہیے۔ جتنا بڑا صحن ہے' لوگوں کے گھر اس چھوٹے ہوتے ہیں۔"

"امی' میں اس صحن میں تین کمرے مزید بنوانا چاہتا ہوں اور یہ جو تین کمرے ہیں ان کو دو بڑے کمروں میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ ایک خوب بڑا سا آپ کا کمرا۔ گاؤں سے شہر سے جو کوئی آپ کے پاس آئے' اس بڑے کمرے میں بیٹھے۔ آپ کا کمرا تو سب سے اچھا ہونا چاہیے۔"

"کمرے بھی بن جائیں گے بلکہ یہ بعد میں بھی بن سکتے ہیں مگر اس کا شادی سے کیا تعلق ہے؟"

"نہیں امی' پہلے گھر اچھا ہو جائے' آنے والی بھی آ کر عیش کرے۔"

"تو کیا میں جا کر لڑکی نہ دیکھوں' فرحت بہت تعریفیں کر رہی ہے۔"

"نہیں' دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے مگر ابھی کہیں رشتہ نہ دے دینا۔" شجاع دھیمے لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"وہ کیوں بھلا؟"

"وہ اس لیے امی جان، کہیں لڑکی والے جلدی جلدی کا شور نہ مچا دیں۔"

"ٹھیک ہے' اب فرحت آئے گی تو اس کے ساتھ جا کر دیکھ آؤں گی۔ میں بھی تو دیکھوں' کیسی ہے وہ لڑکی، جس کی تعریف کرتے تمہاری بہن نہیں تھک رہی۔ ایسے ہنستی ہے، ایسے چلتی ہے، ایسے دیکھتی ہے۔ لگتا ہے فرحت تو اس کی عاشق ہو گئی ہے۔"

"ایسی بات ہے تو امی، آپ اس کی تصویر ساتھ لے کر آنا' میں بھی تو دیکھوں کیسی حور پری ہے جسے دیکھتے ہی میری بہن نے پاس کر دیا۔"

"یہ کام مشکل ہے۔ میں تصویر نہیں لا سکتی۔"

"پھر فرحت سے کہنا اسے لے کر کسی بہانے سے ہمارے گھر آ جائے۔"

"ہاں' ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ہم بعد میں ان کے گھر جائیں گے' پہلے ان کو بلا لیتے ہیں۔"

"کس طرح بلائیں گی؟" شجاع نے ماں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"بہانے کہاں رکھے ہیں میرے پاس۔ تیری شادی میں بلا لیں گے۔ شادی میں تو عزیز و اقارب' دوست احباب سب ہی کو پوچھا جاتا ہے۔" عظمت سادگی سے بولیں۔

اور شجاع ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

"اب ایسی کیا بات ہو گئی جو تیری ہنسی ہی نہیں رک رہی" وہ برا مانتے ہوئے بولیں۔

"ارے میری سادہ لوح امی! ابھی آپ میری شادی کے لیے لڑکی کو دکھانا چاہتی ہیں اور اب اس کو دکھانے کے لیے کیا مجھے ایک شادی خواہ مخواہ میں کرنی پڑے گی؟" وہ پھر ہنسنے کے لیے پر تولنے لگا۔

"ارے میرے دماغ سے ہی نکل گیا کہ میں کیا بات کہہ رہی تھی۔" اپنی بات کا مطلب سمجھ کر وہ بھی خفت سے مسکرانے لگیں۔

"امی! اپنے پڑوس میں ماسٹر صاحب کی بیٹی سلمٰی کی شادی ہونے والی ہے۔ فرحت اس شادی میں آئے گی تو ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔"

"میرے خیال سے ماسٹر صاحب کی ان لوگوں سے رشتے داری بھی ہے۔ وہ لوگ لازمی مدعو ہوں گے۔"

"پھر دیکھنا کیا مشکل ہے" شجاع دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے' پہلے تم دیکھ لو، اگر پسند آ گئی تو رشتہ دے دیں گے۔" عظمت نے کہا۔

"نہیں امی! اگر آپ کو اچھی لگی تو رشتہ دے دیجیے گا۔ میری پسند آپ کی پسند ہے' میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔"

''جیتارہ بیٹے' جیتارہ!'' عظمت بیٹے کو محبت اور فخر سے دیکھنے لگیں۔

''پھر پکی بات ہے' آپ فہمی کی شادی میں کراچی نہیں جارہی ہیں؟'' اس نے ماں سے پھر پوچھا کہ شاید ان کا فیصلہ تبدیل ہوگیا ہو۔

''ہاں' مجھے نہیں جانا'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''شجاع......!'' باہر سے کوئی شجاع کو آواز دے رہا تھا۔

''اچھا امی' میں ابھی آیا......'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

اور عظمت بیگم پھکا پھک رونے لگیں۔ ان کے آنسو یوں تواتر سے بہہ رہے تھے جیسے بے مول موتی ہوں مگر ایک ایک آنسو اس بات کا بین کررہا تھا کہ ان کی بے عزتی ہوئی ہے۔ ان کے بھائی نے ان کا مان نہیں رکھا۔ ان کو اس عزت واحترام سے نہیں بلایا گیا جس کی وہ مستحق تھیں۔

☆☆☆

''اے......کیا سوچے چلی جارہی ہو......دیکھو تو' تمہاری آئس کریم پانی بن گئی'' عدیل نے فریال سے کہا' جو کھوئی کھوئی سی اس کے مقابل کرسی پر بیٹھی تھی۔

''عدیل' تم مجھے اپنی امی اور بہنوں سے کیوں نہیں ملواتے ہو؟''

''تم نے کبھی کہا ہی نہیں'' وہ بے پروائی سے ہنسا۔

''اب تو کہہ رہی ہوں ناں' مجھے ان سے ملنا چاہیے۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا خیال تمہارے دل میں اچانک کیوں آیا؟''

''میں تمہاری ہونے والی بیوی ہوں' اس لحاظ سے میں ان کی بھی بہو اور بھابی ہوں گی۔ کیا مضائقہ ہے کہ میں انہیں پہلے سے دیکھ لوں اور کیا ہی اچھی بات ہو کہ ہماری دوستی ہوجائے۔''

''اتنے گٹس ہیں تم میں؟''

''کیوں نہیں؟''

''میں تو سوچ رہا تھا کہ شادی کے بعد تم اکیلے گھر کا مطالبہ کروگی۔ آج کی لڑکیاں جوائنٹ فیملی سسٹم کو کہاں پسند کرتی ہیں۔''

''مگر مجھے دل سے پسند ہے' میں تمہاری ماں اور بہنوں کے ساتھ رہنا چاہوں گی۔''

''ٹھیک ہے' ملوادوں گا کبھی......ایسی بھی کیا جلدی ہے۔''

''مجھے جلدی ہے عدیل' میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔'' فریال نے بے صبری سے کہا۔

''آج کل تو وہ خاندان میں کسی کی شادی میں شرکت کرنے حیدرآباد گئی ہوئی ہیں۔ واپس آجائیں تو لے چلوں گا۔''

''کب آئیں گی وہ سب' شادی سے؟'' وہ بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔

''کہہ کر تو یہی گئی ہیں کہ اتوار تک آجائیں گے مگر حیدرآباد جاکر وہ کراچی کو بھول جاتی ہیں۔ وہاں ہمارے بہت سے رشتے دار ہیں۔ امی کا دل بھی حیدرآباد میں بہت لگتا ہے اور چاروں بہنوں کو وہاں جاکر بے حد مزہ آتا ہے۔ ان سب کا بچپن وہیں گزرا ہے' کراچی میں تو یہ سب لوگ انتہائی بے دلی سے رہ رہے ہیں۔''

اور پھر پورا مہینہ ہی گزر گیا۔ عدیل کی ماں اور بہنیں حیدرآباد سے واپس ہی نہیں آئی تھیں۔

''اللہ میں ان سے کب ملوں گی؟'' ایک دن وہ انتہائی بے تابی سے کہہ رہی تھی۔

''خالی گھر دیکھنا چاہتی ہو تو چلو میرے ساتھ۔ میں تیار ہوں مگر مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ لڑکی جو میری شریک بننے والی ہو اسے میں اس طرح اپنے گھر لے کر جاؤں۔ تمہیں یوں آتے دیکھ کر میرے محلے والے کیا ں گے؟ اوپر کے حصے میں کرائے دار رہتے ہیں' وہ کیا خیال کریں گے کہ کیسی لڑکی ہے' کسی لڑکے کے ساتھ گھر میں کیوں آرہی ہے؟'' عدیل انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ایسا میں کب چاہتی ہوں'' فریال بوکھلا سی گئی۔

''تم جانے کے لیے اتنا تڑپ رہی ہو تو میں نے کہا' خالی گھر میں چلی چلو......اچھا ہے' پہلے ہی سے اپنے گھر دروازے' کھڑکیاں دیکھ لینا۔''

''مجھے دروازوں' کھڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میرے کمرے میں چار دروازے ہیں اور دو کے لاک خراب ہیں۔ پریشانی تو تمہیں ہوسکتی ہے'' اب وہ ارت پر اتر آیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے'' وہ جھلا ہی تو گئی تھی۔

''پھر کب چل رہی ہو میرے گھر؟'' اب وہ اسے باقاعدہ چھیڑ رہا تھا۔

''میں نہیں جارہی......'' اسے اس ذکر سے خفت سی ہونے لگی تھی۔

''پلیز! کل چلو ناں میرے ساتھ' میرے گھر' سارا کھانا بازار سے لے آؤں گا' ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔''

''عدیل! کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟''

''اب اگر امی حیدرآباد سے نہیں آتیں تو اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ تم اس گھر میں نہ جاؤ' جہاں تمہیں کے لیے جانا ہے۔ پلیز! چلو ناں' میرے ساتھ......میرے گھر'' عدیل لجاجت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''پلیز! میرا مذاق مت اڑاؤ......جب تمہاری امی آئیں گی تو مجھے لے جانا ورنہ ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اور پھر یونہی کئی ہفتے بیت گئے۔ نہ فریال نے پوچھا اور نہ ہی عدیل نے تذکرہ کیا۔

ایک دو دن وہ خاصی تاخیر سے آیا تو فریال پریشان سی ہونے لگی۔

''سنو' مجھے یوں کیفے میں اکیلے بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں مسخر بھری سی ہوجاتی ہیں۔ ایسے میں اپنی ذات بڑی بے مایہ سی لگنے لگتی ہے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' وہ اکل کھرے انداز میں بولا۔

''جس دن نہ آنا ہو تو میرے موبائل پر میسج دے دیا کرو۔''

''میرے موبائل کا کارڈ ختم ہوگیا ہے۔''

''تو تم مجھے پہلے سے بتا دیتے کہ کل میں نہیں آؤں گا یا پرسوں بھی نہیں آؤں گا۔ کم از کم میری یوں خواری تو ں لگتی۔''

''امی کی طبیعت خراب ہے ان دنوں۔ اس وقت بھی دوا لینے نکلا تھا۔ میں نے سوچا' تمہیں بتاتا چلوں۔''

''ارے......تمہاری امی حیدرآباد سے آگئیں؟'' وہ بے تابانہ پوچھ رہی تھی۔

''ہاں' آگئیں......''

''کب آئیں؟''

''کافی دن ہو گئے۔''

''تم نے بتایا نہیں'' اس کے لہجے میں شکوہ امڈ آیا۔

''تم پوچھتیں تو بتا دیتا'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''اس وقت میں چلوں تمہارے ساتھ؟''

''اپنی شکل دیکھی ہے' بارہ بج رہے ہیں۔ کل ٹھیک ٹھاک ہو کر آنا' سنیچر ہے' یونیفارم کے بغیر ہو گی' لے جاؤں گا۔''

اور پھر اگلے دن وہ لائٹ اور ڈارک جامنی کلر کے لان کے سوٹ میں نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ کالج سے بھی دو پیریڈ پہلے نکل آئی تھی۔

''سنو...... میرا تعارف کیا کہہ کر کراؤ گے؟'' بائیک پر اس کے ساتھ جاتے ہوئے وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

''تم بتاؤ' کیا کہہ کر کراؤں؟'' وہ شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

''کہہ دینا کہ آپ کی طبیعت پوچھنے آئی ہیں۔''

''مگر کس رشتے سے' کس حوالے سے...... اور آخر کیوں؟''

''کہہ دینا کہ میں تمہارے دوست کی بہن ہوں۔''

''امی نے اگر یہ کہہ دیا کہ تمہارے دوست کیوں نہیں آئے؟ یا یہ اپنے بھائی کے ساتھ کیوں نہیں آئی تو پھر خود ہی سنبھالنا'' اب وہ شرارت سے ہنسے چلا جا رہا تھا۔

جب عدیل کی بائیک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئی تو فریال کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ یہ آبادی لوئر کلاس کی تھی۔

چھوٹے چھوٹے مکان...... جن کے دروازوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے گلیوں میں بھاگ رہے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے مکانات اپنے مالکوں کی خستہ حالت کی تفسیر خود بتا رہے تھے۔

عدیل نے ایک شکستہ حال مکان کے سامنے اپنی بائیک روک دی۔

فریال نے ایک نظر مکان پر ڈالی۔ دوسری نظر عدیل پر جہاں چٹانوں جیسا عزم اس کے چہرے پر مجسم تھا۔ پیسا تو عورت کی قسمت کا ہوتا ہے، اگر میری قسمت میں ہوا تو پیسا بھی آ جائے گا۔

''اور اگر نہیں ہوا تو تم بھی اسی ماحول کا حصہ بن جاؤ گی'' اس کے دماغ نے اسے ڈرایا۔

''کیا سوچنے لگیں تم؟'' عدیل اسے یوں سوچتا دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔

''اوہ...... کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔'' اس نے اپنے پراگندہ خیالات کو جھٹکا اور گھر کے اندر قدم رکھ دیا۔

☆☆☆

شجاع کے پڑوس میں ماسٹر صاحب کی بیٹی سلمیٰ کی مایوں تھی۔ سارے گھر کا ہی بلاوا تھا۔ فرحت نے آ کر پہلے ہی سے بتا دیا تھا کہ فرح اس شادی کی ہر تقریب میں موجود ہو گی۔

ماسٹر صاحب کے گھرانے سے اچھے مراسم تھے مگر ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس سبب شجاع ان کے ہاں خاص خاص مواقع پر ہی جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلاوا ہونے کے باوجود شجاع نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''پھر تم فرح کو کیسے دیکھ سکو گے؟''

''جب اللہ کو منظور ہو گا' دیکھ لوں گا۔ اس طرح جانا عجیب سا لگتا ہے'' وہ الکس بھرے لہجے میں بولا۔

''عجیب کیوں' انہوں نے تمہیں بلایا ہے' تم کوئی بن بلائے مہمان تھوڑی ہو گے؟''

''نہیں فرحت' ایسی جگہ جا کر بندہ بور ہی ہوتا ہے جہاں کوئی اپنا دوست نہ ہو...... کوئی سنگی ساتھی نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے تم مجھے ساڑھے دس بجے لینے آ جانا اور میرے گھر پہنچا دینا' میں رات کو رک نہیں سکتی۔ میری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اور جب وہ گیارہ بجے شب ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا تو تقریب اپنے عروج پر تھی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ ھولک پر کوئی گیت گا رہا تھا۔

ایک سنہری رنگت والی لڑکی دوپٹا کمر پر کسے لڈی ڈال رہی تھی۔ اس کا جسم کسی لچکیلی شاخ کی طرح ڈول رہا ھا۔ اس کی گہری سبز آنکھیں کاجل سے تلوار سی بنی ہوئی تھیں اور پیٹھ پر بال کسی آبشار کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ہ جھک کر دھیمے دھیمے ٹھمکا لگا رہی تھی اور شجاع...... ہکا بکا سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''یہی تو فرح ہے'' فرحت نے پاس آ کر اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ تو فرح نہیں ہے'' وہ دھیرے سے بولا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے؟'' فرحت حیرت سے شجاع کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے پتا ہے' جب ہی تو کہہ رہا ہوں'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

''تو پھر کون ہے یہ؟'' فرحت کا دھیما لہجہ تمسخر آمیز ہو گیا تھا۔

''یہ تو نشہ ہے......''

''کیا......؟'' فرحت نے ایسی گفتگو کبھی بھائی کے منہ سے نہیں سنی تھی۔

''ہاں' یہ جسے دیکھ لے اسے گھائل کر دے'' شجاع کا لہجہ بھی لڑکھڑا سا گیا۔ یوں جیسے بن پیے ہی اسے نشہ ڑھ گیا ہو۔

فرحت نے ایک نظر فرح پر ڈالی۔ فیروزی اور شاکنگ پنک کے امتزاج میں اس کا جسم پھوٹا پڑ رہا تھا...... گریبان میں چاندی کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ لڈی ڈالتے ہوئے اس کا اوپر بٹن کھل گیا تھا اور وہ اس سے نا آشنا اپنی ایڑیاں اٹھائے کسی مورنی کی طرح ناچ رہی تھی اور شجاع کو دیکھ کر تو شاید وہ بجلی بن گئی تھی۔ دھیما انداز ق آمیز ہو گیا تھا...... اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ یہی بجلی شجاع کے تن من کو خاکستر کر چکی ہے۔

☆☆☆

آج فہمی کی مہندی تھی۔ میرج ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

گانوں میں لڑکے والوں سے برابر کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ مووی والے باری باری دونوں گروپوں کی کوریج ہے تھے۔ لڑکے والوں کی ٹیم میں کسی کی آواز اچھی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی تیاری سے آئے تھے۔ لڑکیاں ای گانا شروع کرتیں' اسے بیچ میں ہی ادھورا چھوڑ کر دوسرا گیت شروع کر دیتیں۔ لگتا تھا کہ وہ گھبرا گئی تھیں۔ ان ے اس انداز کو دیکھ کر لڑکی والوں کا گروپ انہیں خوب ہوٹ کر رہا تھا۔

فہد کی بہن سمی اور دیگر کزنز خوب تیاری سے آئی تھیں۔ سب کی آوازیں بھی اچھی تھیں...... اور گیتوں کا انداز بھی خوب تھا۔ اپنے گیتوں میں کبھی دولہا کی ماں کا مذاق اور کبھی ان کی بہنوں کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔

ممانی جان اور نگین' دونوں فہمی کے پاس تھیں۔ نگین حیران تھی کہ وعدہ کرنے کے باوجود فریال کیوں نہیں

آئی۔ کتنے سارے کام اس سے لینے تھے۔

مسلسل جاگنے سے آج فہمی کو حرارت سی ہوگئی تھی۔ گرین اور ییلو کلر کے حسین امتزاج میں وہ بے حد پیار لگ رہی تھی۔ آج اسے پھولوں کا گہنا پہنایا گیا تھا۔

یہ کمبائن مہندی کا فنکشن تھا اسی لیے خصوصی مہمانوں کے انتظار میں رسم کے لیے دیر ہو رہی تھی اور گیتوں دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

دولھا والوں میں سے کچھ خواتین نے رنگ میں بھنگ ڈالنا دھیرے دھیرے شروع کیا۔

”ارے بھئی ثمینہ! دولھا کی بڑی بہن صاحبہ! کہاں لے آئیں آپ؟“

”آج تو آپ کے خوب لتے لیے جا رہے ہیں کہ خوب۔ کالی کوئل ہو۔ بھئی تمہارا تو میک اپ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ (قہقہے)

”چال بھی بطخ کی طرح ہے‘ ہمیں تو اس سے پہلے پتا ہی نہیں چلا‘ آج لڑکی والوں نے باور کرا ہے۔“ (قہقہے)

”بھئی جٹھانی صاحبہ‘ کہاں ہو؟ (قہقہے) تمہیں پتا چلا کہ نہیں کہ تم تو لگائی بجھائی میں ماہر ہو‘ بہت کرلیا تم عیش‘ لگتا ہے آنے والی دیورانی تمہاری صحیح خبر لے گی۔“

”ارے خالہ جان! آپ نے اپنے لڑکے کا رشتہ کہاں جوڑ دیا۔ ذرا دیکھیے تو سہی‘ اس طرح کی جاتی بزرگوں کی عزت۔“

”کیوں بھئی‘ ایسی کیا بات ہوگئی؟“ دولھا کی اماں حراساں سی ہوگئیں۔

”نہ سمجھنے والوں کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے مگر سمجھ داروں کے لیے بہت بڑی بات ہے۔“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیا بات ہوئی ہے؟ لڑکیوں کے گیتوں سے میرے کان تو پٹ ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ابھی پٹ مت کیجیے۔ سوچیے...... سمجھیے‘ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا“ انتہائی سرگوشیوں میں زہر انڈیلا گیا۔

”جلدی بتاؤ ناں‘ میرا دل گھبرا رہا ہے“ ان کا چہرہ ہلدی سا ہوگیا۔

”بات تو خاص نہیں ہے مگر خاص بھی ہوسکتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں بزرگوں کی عزت ہی نہیں ہے۔ لڑ والوں کے گیت سنے آپ نے...... اے پودینے والے پودینہ ذرا دیتا جا اور پیسے میرے پاس نہیں ہیں‘ اے پودینے والے، دولھا کی اماں لیتا جا۔ ابھی آپ کی بہو گھر میں آئی نہیں ہیں مگر ماشاء اللہ جب ان کے گھر والو کے یہ خیالات ہوں گے تو وہ کیا چیز ہوں گی۔“

”یہ سب اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے“ دولھا کی اماں بھی آزردہ سی ہوگئیں۔

”اگر شروع سے ہی بہو پر کڑی نظر رکھی جائے تو مجال ہے کہ وہ اپنے پر پرزے نکال سکے ورنہ تو آج کل بہوئیں اپنی ساسوں کو ڈرا دھمکا کر رکھتی ہیں“ خاتون نے ان کی بیٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں آنٹی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ لوگ ہماری یوں عزت افزا کریں گے۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لڑکیوں کی جانب سے ڈھولک پر نیا گیت ابھرا

آکاش پر بادل ہیں
اچھی ہیں میری ساسو

پر تھوڑی سی پاگل ہیں

”اے لو! آپا! تم تو بہو لانے سے پہلے پاگل بھی ہوگئیں۔ بہو کے آنے کے بعد کیا کیا ہوگا؟ یہ بھی سوچا یا نہیں؟“ سرگوشی سرگوشی میں اچھی خاصی ذہنوں میں شیلنگ کی جا رہی تھی اور آخر اثرات ظاہر ہونا شروع ہو ہی گئے۔

”رانی...... چھو...... پارو!“ ساس نے اپنی بیٹیوں کو پکارتے ہوئے کہا ”اب میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے یہ سب‘ ان سب کو کسی طرح چپ نہیں کرایا جاسکتا؟“

”اماں آپ بس تھوڑی دیر اور صبر کرلیں۔ ہم ان کو وہ جواب دیں گے کہ نانی تو کیا ان کو نانا بھی یاد آجائیں گے۔“

”خدایا‘ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ اپنی سب بری سمیٹ کر گھر چلی چلوں۔ میرے اکلوتے بچے کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں گے یہ لوگ؟ عزت دینے والے تو نظر نہیں آتے“ اماں نے پریشان ہوکر کہا۔

”رسم ہونے دیں‘ پھر دیکھا جائے گا۔“ بیٹیوں نے ماں کو تسلی دی۔

ادھر لڑکی والوں کا گروپ بلند آواز میں گا رہا تھا

اے باجی‘ اے بے بی‘ تم کو معلوم
دولھا کے بھائیوں کی پھٹ گئیں پتلون“

”دولھا کے تو کوئی بھائی ہے ہی نہیں‘ یہ تو گانا ہی غلط ہوگیا“ دولھا والے ہنسے۔

”چلو گیت میں تبدیلی کرلیتے ہیں

اے باجی ‘ اے بے بی‘ تم کو معلوم
سارے براتیوں کی پھٹ گئیں پتلون

”ایل لو...... ان لوگوں نے تو سب کی ہی کرکری کردی۔“ آگ لگانے والیاں جملہ کس کر قہقہے لگانے لگیں۔

”رانی...... چھو...... آپ ناصر کو لے آئیے تاکہ دونوں کی رسم ہوجائے۔“ فیروزہ نے ناصر کی بہنوں سے کہا۔

بادل ناخواستہ چاروں بہنیں دوپٹا لے کر اٹھیں اور بھائی کو لے کے اسٹیج پر آئیں جہاں پہلے ہی سے فہمی بیٹھی ہوئی تھی۔ ناصر کی ماں اور بہنوں نے دلہن کی سلامی کی رسم بے دلی سے ادا کی اور چند منٹوں میں ہی فارغ ہوگئیں۔ اپنے ساتھ آنے والی مہمان خواتین کو اس رسم میں شریک بھی نہیں کیا۔ ان سب کا انداز بھی بے دلی کا تھا اور رویہ بھی بے مروتی کا سا۔

فہد کی چھوٹی بہن نے ناصر کے ہاتھ پر ذرا سی مہندی لگا کر اس کی چھنگلی پکڑلی اور ہنس کر کہا ”ناصر بھائی‘ پچیس ہزار مہندی لگائی ہوگی۔“

”یہ بہت زیادہ ہے“ ناصر کی چاروں بہنیں ایک ساتھ بولیں۔

”اچھا‘ تو پھر پچاس ہزار کردیتے ہیں۔“

”کیا مکان کا بیعانہ دینا ہے کہیں؟“ بڑی بہن نے تمسخر سے کہا۔

”ہم اپنے گھر میں رہتے ہیں‘ بیعانہ وہ دیں جن کے پاس اپنا مکان نہ ہو“ سیمی نے ہنس کر کہا۔

ناصر پریشان ہوکر اپنی بہنوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہ خود ہی بول اٹھے ”کچھ کم کریں‘ اتنے پیسے میں نہیں دے سکتا۔ بے شک ساری رات میرے ہاتھ پکڑے بیٹھی رہیں۔“

”اچھا‘ نہ آپ کی بات، نہ ہماری بات‘ صرف دس ہزار روپے دے دیں۔ ہماری کزنز اور ہماری سہیلیاں بہت ساری ہیں‘ یہ پیسے سب میں بٹیں گے۔“

''دس ہزار روپے بہت زیادہ ہیں' اتنے پیسے کبھی دیکھے ہیں؟'' دولہا کی بہنیں طنز سے بولیں۔

''چار ہزار کی تو میں سینڈل پہنتی ہوں۔ دس ہزار کیا چیز ہیں میرے لیے'' سیمی نے اترا کر کہا۔ چھوٹی ماموں زاد بہن ہونے کے ناتے ساری ڈیلنگ وہی کر رہی تھی۔ جبکہ نگین ممانی جان کی مدد سے آئی ہوئی بری اپنی رشتے دار خواتین کو دکھا رہی تھی۔

ساس اپنی کرسی سے اٹھ کر سیمی کے پاس چلی آئیں اور تمسخر سے بولیں ''بھئی! پہلے تم مجھے اپنی سینڈل تو دکھادو' میں بھی تو دیکھوں کہ چار ہزار کی سینڈل کیسی ہوتی ہے؟''

''ہاں ہاں' ہم بھی تو دیکھیں کہ چار ہزار کی سینڈل کس ڈیزائن کی ہوتی ہے کیونکہ ان کی کزن بھی ایسی ہی سینڈل پہننے کی عادی ہوں گی۔''

نگین' جو کھانے کی اطلاع دینے مہمانوں کے پاس آئی تھی یہ جملے سن کر اسے خفت سی ہونے لگی۔

''ارے آنٹی' یہ تو سب مذاق کی باتیں ہیں' آپ صرف ایک ہزار روپے دے دیجیے' لڑکیاں مہندی لگائی کا مول تول یوں ہی کرتی ہیں۔ اس کا مطلب کوئی پیسے وصولنا نہیں ہوتا'' نگین ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کی حتی المقدور کوشش کر رہی تھی۔

''نہیں بھئی' اب تو ہم پہلے سینڈل ہی دیکھیں گے۔ پتا تو چلے کیسی کیسی نواب کی اولادیں یہاں موجود ہیں؟'' ساس صاحبہ کا پارا چڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ مذاق کی بات آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔

سیمی گھبرا سی گئی۔ پریشانی میں اسٹیج سے اترتے ہوئے اس کا پاؤں مڑا اور سینڈل کا بکل ٹوٹ گیا۔ تب دولہا کی بہن نے اس کی ٹوٹی ہوئی سینڈل کو سب مہمانوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''مہمانان گرامی! آپ سب بھی ملاحظہ فرمالیجیے' ٹوٹی پھوٹی سینڈلیں' یہ لڑکیاں چار چار ہزار میں خرید کر لاتی ہیں۔ جھوٹے دیکھے ہیں مگر مہا جھوٹے آج ہی دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ لو سو روپے' یہ ہے مہندی لگائی۔'' سو کا نوٹ انہوں نے نگین کے ہاتھ پر دھر دیا۔ یوں جیسے تھوک دیا ہو۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے یہ بھی بہت ہے'' نگین آنسوؤں کو پیتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

مگر اسی اثنا میں سیمی نے وہ نوٹ اٹھایا اور فہمی پر سے صدقہ اتار کر ان کے سامنے ڈال دیا۔

''توبہ ہے...... ایسی مہندی نہ کہیں دیکھی' نہ سنی۔ کس قدر بے عزتی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کیوں چلے آئے آپ کے ساتھ؟'' ایک مہمان خاتون نے دولہا کی اماں سے کہا۔

''لگتا ہے' ان کے ہاں سمدھیانے والوں کی عزت کا رواج نہیں ہے'' دوسری خاتون نے بھی بہنوں کے کانوں میں سیسہ انڈیلا۔

''ارے آپا! یہ کہاں رشتہ جوڑ لیا تم نے' ہمیں تو یہ لوگ جھگڑالو سے لگتے ہیں۔ اچھا ہے' نکاح پہلے نہ کیا۔ ابھی بھی شادی میں تین دن ہیں' اس میں بہت کچھ سوچ سکتی ہو۔'' ایک صاحبہ مزید دل جلانے اور دماغ خراب کرنے کو موجود تھیں۔

''آیئے بھئی' کھانا کھالیجیے'' لڑکی والوں نے مہمانوں سے کہا تو سب اپنا غصہ بھول کر کھانے پر پل پڑے۔

ساس کا غصہ جوان کے چہرے کے زاویوں کو بگاڑ رہا تھا' وہ بھی کھلکھلاتے ہوئے کھانے کی طرف بڑھ گئیں۔

''فہمی کا جہیز کل آپ لوگ منگوالیں'' فیروزہ نے اپنی سمدھن سے کہا۔

''ٹھیک ہے' ہم کل صبح منگوالیں گے۔ اچھا ہے' کمرا جلدی سیٹ ہو جائے تو کوئی پریشانی نہیں رہتی۔''

''گیتوں اور رسموں میں لڑکیوں کی باتوں کا برا نہ مانیے گا' یہ تو صرف ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہوتی ہیں'' ممانی جاتے سمے سب سمدھنوں سے بطور خاص کہہ رہی تھیں۔

''نہیں بہن! ہم لوگوں نے بھی خوب انجوائے کیا تھا'' سسر صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

ہندی کے ایک دن بعد رت جگا تھا۔ سب مہمان خاصی دیر سے ہی سوئے تھے۔ اگلا دن برات کا تھا۔ ٹیلی ن کی گھنٹی نے فجر سے پہلے ہی شور مچا دیا۔

ی نے کسل مندی سے فون اٹھایا اور جمائی لے کر بمشکل ہیلو کہا۔

''ایک افسوس کی خبر ہے' ہمارے داماد کا انتقال ہو گیا ہے۔ آج ہم برات نہیں لا سکتے'' سسر صاحب کہہ تھے۔

''مگر آپ کی تو کسی بیٹی کی شادی ہی نہیں ہوئی'' فیروزہ کو حیرت سی ہوئی۔ (نیند یکدم اڑ چکی تھی)

''ایک بچی میری پہلی بیوی سے تھی۔ اس کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں۔''

''مگر آپ نے اپنی کسی شادی شدہ بیٹی کا تعارف تو کبھی نہیں کرایا...... کہاں ہے وہ؟''

''اس کے سسرال والے ہم سے ناراض تھے' انہوں نے آنا جانا بچی کا بند کر رکھا تھا۔''

''اوہ' یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔''

''اسی لیے آپ کو یہ بات بتا رہے ہیں چونکہ میں اپنی بیٹی کو آج اپنے گھر لے آؤں گا' اس لیے دسویں تک ادی مؤخر کر دی جائے گی۔''

''مگر کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ آج سادگی سے نکاح کر دیں۔ دسویں کے بعد سادگی سے رخصتی۔ کیونکہ فہمی لے کپڑوں میں ملبوس ہے۔''

''ایسا میرے لیے مشکل ہوگا' صرف دس دن کی ہی تو بات ہے۔''

م میں جب فیروزہ اور نگین شریک ہوئیں تو دلہن کے کمرے میں مہمان خواتین ٹھہری ہوئی تھیں اور اس نے بیڈ کور پر پاندان سجائے باتیں مٹھارے جا رہی تھیں۔

''یہ فرنیچر گھٹیا والا ہے۔''

''مشینری بھی زیادہ نہیں ہے۔ فریج اولڈ ڈیزائن کا ہے۔ اے سی تو دیا ہی نہیں۔''

''پہناوئی کے جوڑے تو سارے کے سارے ہی تھرڈ کلاس ہیں۔ ساس کے لیے کوئی زیور تو ہے ہی نہیں اور ن کے لیے کوئی قیمتی چیز۔''

نگین اور ان کی امی یہ سب باتیں سن کر پریشان ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا اور پھر ہفتہ بھی گزر گیا۔ فہمی کی سسرال سے کسی قسم کا کوئی فون نہیں آ رہا تھا۔

ی کا جہیز باقاعدہ کھول دیا گیا تھا۔ بڑے دیگچے میں چائے بن رہی تھی۔ ڈنر سیٹ کی پلیٹوں میں لوگوں کو انا کھلایا جا رہا تھا۔

''بھائی صاحب' یہ آپ بتا تو دیں کہ فہمی کے نکاح اور رخصتی کے بارے میں آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟'' فرید لے دو عزیزوں کے ہمراہ ناصر کے والد سے پوچھنے پہنچ گئے تھے۔

''ی الحال تو بہت مشکل ہے۔ میرا بچہ اپنی دکھیا بہن کو دیکھے گا یا اپنی خوشیوں کو۔ بچی کی عدت تک تو آپ یہ بھول جائیے۔''

ان سب حالات کا اثر فہمی پر پڑ رہا تھا اور اس کو بار بار بخار چڑھ رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت انتہائی ابتر تھی۔ اس کی سسرال جا کر آنے والے لوگ طرح طرح کی کہانیاں سنا رہے تھے۔

شادی کے لحاف نندیں اوڑھ کر سو رہی تھیں۔ کمبل بچے اوڑھ رہے تھے۔ واشنگ مشین میں کپڑے لگے تھے۔ استری بھی نکال لی گئی تھی۔ شیشے کی میز کا شیشہ تڑخ گیا تھا۔ کسی بچے کی بال لگ گئی تھی۔ میک باکس بچیاں آزما رہی تھیں۔ اپنے جہیز کو ابھی اس نے برتا تک نہیں تھا کہ پامال ہونا شروع ہو گیا تھا۔

تب پھر فیروزہ اپنی بھاوج اور فہد کو ساتھ لے کر گئیں اور جا کر کہا۔

”آپ کا دکھ اپنی جگہ ہے مگر ہمارے فرض کے بارے میں بھی تو کچھ سوچیے۔“

”کیا سوچیں، ہمارے پاس تو سوچنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں۔“ ساس نے بے توجہی سے کہا۔

”ایک مایوں بیٹھی دلہن کے خواب اجڑ رہے ہیں، آپ کو اس کا احساس تک نہیں ہے؟“

”اگر آپ کو جلدی ہے تو کہیں اور دیکھ لیجئے، ہم فی الحال شادی ہی نہیں کر سکتے۔ ہمارے بیٹے کی شادی ہو گی، کس سے ہو گی، اس کے بارے میں ہمیں خود علم نہیں ہے۔“

”اور ہماری بچی کا جو جہیز آپ کے گھر آ چکا ہے؟“

”ایسا کون سا لاکھوں کا جہیز آپ نے دے دیا ہے۔ سڑا بسا جہیز، اس سے زیادہ ٹھکٹے دے دیں۔ آ منگوا لیں، ہم تو تھوکتے بھی نہیں اس پر۔“

تب اسی لمحے فیروزہ بیگم کو اندازہ ہو گیا کہ لالچی لوگوں کا ارادہ تبدیل ہو گیا ہے اور وہ ایک بار پھر مات کھا گئی اگلے دن جہیز جس صورت میں آیا، سب ہی کو افسوس تھا۔ ڈنر سیٹ میں سے آدھی چیزیں غائب تھیں کورز کی تعداد بھی پوری نہیں تھی۔ جہیز کے چھ قیمتی جوڑے غائب کر لیے گئے۔

”جب قسمت ہی پھوٹی ہے تو چیزوں پر کیا رونا۔ شادی کا جب وقت آئے گا تو یہ چیزیں دوبارہ بنالی جا گی۔“ فیروزہ اپنے آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

مگر ممانی جان خاموش سی ہو گئی تھیں۔ اس افسوس ناک واقعے کا انہوں نے گہرا صدمہ لیا تھا۔ ان توسط سے یہ رشتہ طے پایا تھا اور اس ضمن میں وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہی تھیں۔

وہ فیروزہ کو دلاسے تو دے رہی تھیں مگر انہیں خود کسی صورت قرار نہیں آ رہا تھا اور جب ان کے سامنے دورہ پڑا تو ان کی اپنی حالت غیر سی ہو گئی۔ فیروزہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بیٹی کو دیکھے یا بھاوج کو سنبھالے۔

”فیروزہ! تم مجھے معاف کر دینا، مجھے واقعی نہیں پتا تھا کہ ناصر کی فیملی اس قدر رذیل ہو گی۔“

”بھابی! یہ سب نصیب کی بات ہوتی ہے، اس میں بھلا آپ کا کیا قصور۔“

”نہیں، قصوروار تو میں بھی ہوں جو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی انہیں پہچان نہیں سکی۔“ ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”اللہ کی اس میں یقیناً کوئی مصلحت ہو گی جو ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔“ فیروزہ بڑے صبر سے کام لے رہی

”پھر بھی، تم مجھے دل سے معاف کر دینا۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک

”بھابی جان......!“ فیروزہ نے ایک چیخ ماری اور دم بھر میں سب کو اکٹھا کر لیا جو انہیں لٹانے کے میں لانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔

☆☆☆

صابرہ کے چھوٹے بھائی کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ جہاں اپنے ملبوسات خصوصی طور پر تیار کروا رہی تھیں، وہاں نت نئے گیت بھی یاد کر رہی تھیں۔

اپنی امی کے گھر سے آتیں تب بھی ان کے لب گنگناتے رہتے۔ اس وقت وہ اپنے دوپٹے پر بیل ٹانک رہی تھیں اور دھیمے سروں میں گا رہی تھیں۔

ایوماں ایوماں دلہن کے بے خدرے لوگاں
ساس میری آئی کے بولی بستر بچھاؤماں
ایوماں ایوماں فرشاں پر سونے والے لوگاں
ایوماں ایوماں دلہن کے بے خدرے لوگاں
ساس میری آئی کے بولی کھانا کھلاؤ ماں
ایوماں ایوماں فاقاں سے رہنے والے لوگاں
ایوماں ایوماں دلہن کے بے خدرے لوگاں

(ترجمہ اور تفصیل...... یہ گیت حیدرآبادی لوگوں میں لڑکے والے گاتے ہیں۔ جس طرح شادی بیاہ کے گیتوں میں ایک دوسرے پر چوٹیں کی جاتی ہیں، اس میں بھی دلہن کے گھر والوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

سنو لوگو! دلہن جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہاں کے لوگ تمیز و تہذیب سے بے بہرہ ہیں۔ دلہن کی ساس جب آئی تو اس نے کہا، میرے بیٹھنے کے لیے بستر بچھاؤ تاکہ میں بیٹھ سکوں مگر وہ لوگ ایسا نہ کر سکے کہ انہوں نے کبھی بستر دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ تو ہمیشہ ننگے فرش پر بیٹھنے اور سونے کے عادی تھے۔ دلہن کی ساس جب آئی تو اس نے کہا کہ میرے لیے کچھ کھانے پینے کو لاؤ مگر وہ لوگ میزبانی کے وصف سے ناواقف تھے اور اتنے غریب تھے کہ زیادہ تر فاقے سے رہتے تھے۔

سنو لوگو! دلہن جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں کے لوگ کسی کی عزت کرنا نہیں جانتے ہیں۔

”صابرہ بھابی! آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ کے ہاں کے گیت بھی بڑے مزے مزے کے ہیں۔“

”سائرہ! تم چلنا ناں ہمارے ساتھ شادی میں، تم کو بہوت اچھا لگے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں اور فریال دونوں چلیں گے آپ کے ساتھ۔“

”تم کو بہوت مزہ آئیں گا۔ جب برات جائے گی تو دلہن والے دولہا کا راستہ ڈنڈا اڑا کے روکتے۔“

”وہ کیوں؟“

”اپنے نخ (حق) نئیں لیں گے کیا“ صابرہ ہنسی۔

”اچھا اچھا، آپ کے ہاں بھی نیگ لینے کے لیے گاڑی رکوائی کی رسم ہوتی ہے؟“ سائرہ کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔

”وئی تو میں بی بول رئی تھی۔“ (وہی تو میں بھی کہہ رہی تھی)

"آپ کے بھائی زیادہ اچھے ہیں یا بھابی......؟" سائرہ نے پوچھا۔

"انوں چاند سورج کی جوڑی ویسے دکھتے۔ آج بھابی کی چھوٹی بہن آنے کا بول دی تھی ناں، تم انوں نے دیکھنا۔ انوں بی پھولوں کے ویسی لگتی، ......بالاں (بال) تو بہت لمبے انوں کے، پیراں تک آ رہے وہ۔"

"اچھا، شام کو مہمان آ رہے ہیں۔ کوئی خاص چیز پکوانی ہو تو مجھے بتا دیجئے۔" ان دنوں صابرہ کے اپنی نندوں کے ساتھ اچھے مراسم چل رہے تھے۔

"خورمہ میں پکالی، ڈبل کا میٹھا بنالی، ہور رائتے کے بینگن بی کاٹ کر نمک کے پانی میں چھوڑ دیے۔"

"بازار سے کچھ نہیں منگوائیں گی کیا؟"

"نہیں، ہم لوگاں کو ہاتھ کا کھانا ہونا اچھا دکھتا۔"

"چلیں، میں آپ کے کمرے کی ڈسٹنگ بھی کر دیتی ہوں۔" سائرہ نے جھاڑن لے کر چیزوں کو نفاست سے پونچھنا شروع کر دیا۔

اور صابرہ نے دوپٹے پر بانکڑی ٹانکتے ہوئے دوبارہ گنگنانا شروع کر دیا۔

ساس میری آئی کے بولی ساڑھی دلاؤ ماں
ایو ماں ایو ماں دھوتی لپیٹنے والے لوگاں
ایو ماں ایو ماں دلہن کے بے خدرے لوگاں

"صابرہ، دو گھنٹے ہو گئے چائے کا کہے ہوئے۔ کیا میرے مرنے کے بعد چائے بناؤ گی؟" دلنواز اپنے کمرے سے آیا اور صابرہ کو یوں گنگناتے دیکھا تو بھڑک ہی گیا۔ یوں بھی آج اس کے سر میں صبح سے سخت درد تھا۔

"کیسی بری زبان نکالے جی آپ! اللہ نہ کرے، آپ کی چھاؤں کو بھی کچھ دھکا لگو، کتے فضول باتاں کر رئے آپ۔ میں جارئی بیرچی خاناں میں۔ میں ابھی بنا کر لاتی چائے۔" وہ دوپٹا پھینک کر باورچی خانے کی جانب لپکیں۔

"اب باورچی خانے میں جا کر سو مت جانا" اس کی پشت پر دلنواز کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اب میں پاواں کا سالن تو نکو بناتی بیٹھی۔"

سائرہ اپنے کمرے میں بیڈ کور چینج کر رہی تھی تو اس نے دیکھا، چند منٹوں میں صابرہ چائے ٹرے میں لیے دلنواز کے پاس جا رہی تھیں مگر ان کے لبوں پر اب یہ گیت تھا۔

میرے بلماں کی زبان لمبی
کردے طبیعت ہر ایک کی وہ گندی

تب سائرہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

"تم ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو" اس نے اس کے کان کے پاس جیسے سرگوشی سی کی۔ اس کی اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

آج وہ پھر گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر زبور کے ساتھ نکل آئی تھی۔ زبور گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ اس کا بایاں بازو نگین کی کمر میں حمائل تھا۔ کیسٹ پر مغنیہ کوئی محبت بھرا گیت الاپ رہی تھی۔ گاڑی کا خنک اور بہت ماحول فسوں خیز تھا۔

"اپنے خوابوں میں بھی تم میرے ساتھ اسی طرح جاتی تھیں ناں؟" زبور نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے شرما کر کہا۔ وہ چند ہی دنوں میں اپنے بارے میں رائی سے رتی تک ہر بات اسے بتا چکی تھی۔

"آج کہاں لنچ کرنا ہے؟" لاڈ سے پوچھا گیا۔

"جہاں پرسوں لنچ کیا تھا۔ کتنے ٹیسٹی کھانے تھے وہاں کے۔"

"نہیں، اب کہیں اور چلتے ہیں تاکہ چینج ہو۔ روز روز ایک ہی ذائقہ تو بور کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک مصروف ہوٹل میں بوفے میں شامل تھے۔ اچانک نگین کی نظر فہد پر پڑی، وہ ٹی وی کے کسی فنکار کے ساتھ تھا۔

شاید اس کے انٹرویو کے سلسلے میں اس کے ساتھ آیا تھا۔ فنکار کے پیر میں بھی بلیاں بندھی ہوئی تھیں، کبھی یہاں کبھی وہاں۔

نگین ایک دم آڑ میں ہو گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں سے اڑ کر کسی دوسری جگہ چلی جائے جہاں فہد کی نظریں اسے دیکھ نہ سکیں۔

"کیا بات ہے نگین! اتنی بدحواس سی کیوں ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟" زبور اس کو یوں سراسیمہ سا دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

"میرا ایک کزن بھی اس بوفے میں شریک ہے۔" لرزتے لہجے میں اس نے بتایا۔

"اپنا اسکارف باندھ لو اور سامنے صوفے پر ترچھی ہو کر بیٹھ جاؤ...... میں تمہارے سامنے بیٹھ جاؤں گا۔"

"مگر کالج یونیفارم میں وہ کہیں پہچان نہ لے؟"

"اب تم اس قدر ڈرو گی تو وہ تمہارے سامنے بھی آ سکتا ہے۔"

"سن گلاسز لگا لوں؟"

"ہاں، لگا لو...... یوں بھی ہمارے شہر میں آشوب چشم سارا سال چلتی ہے" زبور نے مسکرا کر کہا۔

"آپ ہنس رہے ہیں اور میری جان جا رہی ہے۔"

"کھاتے وقت کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔"

اور فہد شاید نگین کے سامنے آ ہی جاتا۔ وہ اپنی پلیٹ لبالب بھر کے اسی جانب دوسرے صوفے کی طرف آیا مگر اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی برق رفتاری سے جمال بیٹھ چکا تھا۔

فہد اب دوسری جانب چلا گیا تھا مگر نگین کا مارے گھبراہٹ کے برا حال تھا۔ وہ ہنوز پیٹھ موڑے سر جھکائے پانی کے گلاس سے منہ ہٹا ہی نہیں رہی تھی۔

"وہ دفع ہو گیا ہے، اب تو کھانا کھا لو" زبور نے دھیرے سے کہا۔

"میں ایسے خوف زدہ ماحول میں کھانا نہیں کھا سکتی۔"

"چلو اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں سے کچھ اور کھا لیتے ہیں۔" زبور نے بھی اپنی پلیٹ رکھ دی۔

اور وہ سیدھے ہاتھ سے اپنا پرس اپنے دائیں جانب کندھے پر آڑا کیے باہر نکل آئی۔

''آج بال بال بچے ہیں ورنہ آپ نہیں جانتے کہ یہ فہد بھائی میرا ناطقہ بند کر سکتے تھے۔''

''اونہہ...... میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''یار جمال' تو یہاں کہاں آ گیا؟'' آصف نے اسے آتے دیکھ کر پوچھا۔

''ایسے ہی ایک دوست نظر آ گیا تھا۔ اس سے ہیلو ہائے کرنے رک گیا تھا۔ آؤ چلو' اگزیبیشن سائڈ پر چلتے ہیں۔ پہلے اس سے نمٹ لیں پھر کھانا کھائیں گے۔''

''نہیں' پہلے کھانا پھر ہی کچھ اچھا لگے گا'' آصف' جمال کے ساتھ کالج سے سیدھا یہیں آیا تھا۔

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جمال کو نگین نظر آ گئی۔ اس کے قریب کھڑا ہوا تو اس کی پریشانی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔

''یوں جب فہد...... نگین کے قریب صوفے پر بیٹھنے کے لیے بڑھا تو جمال قصداً وہاں بیٹھ گیا۔

اس کا مقصد نگین کو بچانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فہد کو یہ بات پتا چلے کہ نگین زبور کے ساتھ ہوٹل میں لنچ کے لیے آئی ہے۔

''یہاں آنے سے پہلے تو کھانے کے لیے شور مچا رہے تھے اور اب جب پیسے خرچ ہو گئے ہیں تو پلیٹ اور چمچے سے کھیل رہے ہو۔''

''اتنے سارے آئٹم دیکھ کر پیٹ بھر گیا۔ اب کوئی پچپن ڈشز چکھ سکتا ہے؟'' جمال نے بات بنائی۔

''کم کھانے والوں کو تو ہوٹل میں جا کر کھانا ہی نہیں کھانا چاہیے۔ اب پانچ سو روپے پر ہیڈ میں تم نے سو روپے کا بمشکل کھایا ہوگا۔ ہو گیا ناں خواہ مخواہ کا نقصان۔'' آصف نے شاہی ٹکڑے کا بڑا سا پیس منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی نقصان نہیں ہوا' تم پریشان مت ہو۔'' جمال مسکرایا۔

''یار! تم نقصان کو نقصان ہی سمجھا کرو۔''

''میں کہہ رہا ہوں ناں' فائدہ ہوا ہے ہمارا'' جمال کی مسکراہٹ گہری سی ہو گئی۔

''وہ کیسے؟'' آصف نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ تم نے تو سات سو روپے کا کھانا کھا لیا ہے' بیلنس تو ہو گیا ناں...... بلکہ فائدہ ہی ہوا ہے۔''

تب آصف آئس کریم کے دوسرے فلیور کھاتے ہوئے ہنس پڑا۔

☆☆☆

اکثر گھرانوں میں اتوار کی صبح خاصی تاخیر سے ہوتی ہے۔ فرید احمد کے گھرانے کا بھی یہی وتیرہ تھا۔ فیروزہ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتی تھیں' نگین اور فہمی بھی دن چڑھے اٹھتی تھیں اور یوں گیارہ' ساڑھے گیارہ کے قریب ناشتا ہوتا تھا۔

ممانی جان آئیں تو سب کو اس ٹائم ناشتا کرتے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''اے لو! اب ناشتا ہو رہا ہے تو دوپہر کا کھانا کس وقت کھاؤ گے تم لوگ؟''

''ساڑھے تین چار تک'' نگین نے خفت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر تو رات کے کھانے کی چھٹی ہو جائے گی۔''

''نہیں ممانی جان! چھٹی نہیں ہوگی...... وہ گیارہ ساڑھے گیارہ تک......''

''او پھر کھاتے ہی لیٹ جاؤ گے تو ہضم خاک ہوگا۔ جب ہی تو صحتیں ایسی ہیں'' ممانی جان کا لیکچر جاری

''یے بھابی! آپ ناشتے میں شریک ہو جائیے۔ میں نے آلو کی ترکاری میں زیرے کے ساتھ تھوڑی سی انی بھی ڈالی ہے۔ بڑی خوشبودار ترکاری بنی ہے اور یہ پوریاں بھی گھر کی ہیں۔'' فیروزہ بڑے چاؤ بھاوج سے کہہ رہی تھیں۔

''یں بھئی' میں دو دفعہ ناشتا نہیں کرتی۔''

''چھ بجے کا ناشتا اب تک تو ہضم ہو چکا ہوگا۔ پلیز ممانی جان! یہ پوری ذرا حلوے کے ساتھ ہی چکھ ''فہمی نے کہا۔

''اچھا' تم کہتی ہو تو کھا لیتی ہوں۔'' فہمی کا لاڈ بھرا اصرار وہ رد نہیں کر سکیں۔

''یسی ہیں پوریاں؟''

''چھی ہیں' خستہ بھی اور سنکی ہوئی بھی......''

''بات ہے تو اور لیں'' فہمی نے ازخود ان کی پلیٹ میں پوری رکھ دی۔

''نہیں بیٹا' یہ بھی میں نے تمہاری وجہ سے کھائی ہے۔ بس' اب صرف چائے لوں گی۔''

ید احمد اخبار لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور لڑکیاں کسی کام سے اٹھیں تو وہ فیروزہ کے قریب ہو گئیں ازدارانہ لہجے میں بولیں۔

''وزہ' میں آج تم سے بڑی ضروری بات کہنے آئی ہوں۔''

''ہاں' کہو۔''

''تم فہمی کو مجھے دے دو۔'' انہوں نے بڑی لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہی تو آپ کی ہے ہی اور نگین بھی'' وہ الجھ کر بولیں۔

''تم میری بات نہیں سمجھی ہو'' چائے کا کپ انہوں نے میز پر رکھ دیا۔

''آپ کہیے' میں سمجھ جاؤں گی۔'' فیروزہ کے ذہن میں یہی آیا کہ شاید اب وہ کوئی اچھا سا رشتہ لانے کی تمہید رہی ہیں' پہلے بھی فہمی کے لیے دونوں رشتے وہی لائی تھیں...... اور شادی کے نہ ہونے کا بہت زیادہ غم انہوں ا تھا کہ بیمار تک ہو گئی تھیں۔

''فیروزہ! میں آج تم سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ فہد کو تم اپنا بیٹا بنا لو اور میں فہمی کو اپنی بیٹی بنا لیتی ہوں۔''

''بھابی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' فیروزہ کی حیرت دیدنی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں' جب گھر میں لڑکی موجود ہے تو مجھے فہد کے لیے باہر کی لڑکی دیکھنے کی کیا ت ہے؟''

''ہی تو فہد سے بڑی ہے۔''

''سال بھر ہی تو بڑی ہے ناں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھنے میں تو وہ چھوٹی ہی لگتی ہے۔''

''نہیں بھابی جان! ایسا مت سوچئے' آپ کا ایک ہی بیٹا ہے' آپ اپنے ارمان پورے کیجیے۔ فہد کے لیے خوبصورت سی لڑکی کا انتخاب کیجیے۔ فہمی کی بھی کہیں نہ کہیں ہو جائے گی۔''

ہد کے حوالے سے کی جانے والی باتیں انہیں یاد تھیں' جو وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے حوالے سے اکثر کیا کرتی

تھیں۔

''فیروزہ! کیا تم مجھے مایوس لوٹا دینا چاہتی ہو؟''

''یہ بات نہیں ہے بھابی! فہد میرا بھتیجا ہے' میں نہیں چاہتی کہ آج کوئی غلط فیصلہ ہو' جس کا خمیازہ بعد میری بچی کو بھگتنا پڑے۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوگا فیروزہ! تم مجھ پر یقین رکھو۔ میں فہمی کو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔''

''کیا آپ نے اس سلسلے میں فہد سے پوچھا ہے؟''

''مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اولاد ایسی ہرگز نہیں ہے۔''

''پھر بھی پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے۔''

''میں نے فہد سے اتنا تو ضرور پوچھا تھا کہ فہد اگر میں تمہاری شادی اپنی پسند سے کرنا چاہوں تو......؟ اس نے فوراً کہا۔ ''امی جان! میں تو آپ کی پسند پر ہی شادی کروں گا۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ اس سلسلے میری کوئی علیحدہ رائے ہوگی۔''

''اللہ میرے فہد کو سدا سلامت رکھے۔'' اب فیروزہ کی آنکھوں سے برسات شروع ہو چکی تھی۔

''تو میں یہ سمجھ لوں کہ......تم نے میری بات مان لی ہے؟''

''بھابی جان! فہد تو مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ اس سے اچھا تو اس دنیا میں کوئی داماد ہو ہی نہیں سکتا میں پھر بھی اس سلسلے میں فرید سے پوچھ لوں' آپ تو جانتی ہی ہیں کہ الٹے دماغ کے مرد ہیں۔ جس کو میں کہوں' اس میں کیڑے نکالتے ہیں۔ میرے میکے والوں کے مقابلے میں اپنے خاندان کو اہمیت دیتے ہیں۔''

''ہاں ہاں تم پوچھ لو۔ میں ایک ہفتے بعد جواب لینے آؤں گی۔''

فیروزہ نے اپنے میاں سے تذکرہ کیا تو وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

''تمہاری بھاوج نے اپنی زندگی میں پہلی بار عقل مندی کی اور بہت اچھی بات کی ہے۔ فہد واقعی بہترین ہے۔ فہمی کے لیے بہت مناسب رہے گا۔ اخلاق' تمیز' تہذیب' تعلیم سب ہی اس کے پاس ہے۔ جھکی ٹائپ کا نہیں ہے' ہمیشہ ہنستا' ہنساتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ فہمی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

''تو میں رضامندی دے دوں کہ آپ کا رشتہ ہمیں قبول ہے؟'' فیروزہ نے پوچھا۔

''فوراً سے پیشتر دے دو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا ارادہ تبدیل ہو جائے۔'' فرید احمد ہتھیلی پر فوراً سرسوں جمانے فکر میں تھے۔

''اب اتنی بھی جلدی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ گھر پہنچ کر اپنا برقع اتارنے نہ پائیں اور ہمارے سے رضامندی کا فون پہنچ جائے۔'' فیروزہ نے برا مان کر کہا۔

''اب ایسا ہی ہو رہا ہے'' فرید احمد نے ہنس کر کہا۔

''مگر میں ایک دو دن بعد جواب دوں گی۔''

''مگر دینا ''ہاں'' میں ہی کہ فہد سے اچھا رشتہ فہمی کو نہیں مل سکتا۔''

''ٹھیک ہے......'' فیروزہ نے ہنکارے میں گردن ہلا دی۔

گھر میں ہونے والی ان باتوں سے نگین اور فہمی بھی لاعلم نہیں تھیں۔ فہمی ایک دو دن تو بالکل چپ رہی مگر جس دن فیروزہ نے اپنی بھاوج کو رضامندی کا فون کرنا تھا' اسی صبح فہمی نے صاف انکار کر دیا۔

''امی! میں کسی صورت فہد سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔ ہمیشہ مجھے باجی کہتا آیا ہے۔ اب کیا وہ میرا نام لے گا؟''

''ظاہر ہے' نام ہی لے گا۔ شادی کے بعد تو تمہیں باجی کہنے سے رہا۔''

''مگر مجھے تو باجی سننے کی عادت ہے'' فہمی اپنے موقف پر ڈٹی تھی۔

''تو آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ آپ کا نک نیم ''باجی'' رکھ دیں۔ یوں آپ کو بھی عجیب نہیں لگے گا'' نگین شرارت سے بولی۔

''بیٹا' وقت کے ساتھ ساتھ انسانی عادات بھی بدلتی رہتی ہیں بلکہ بدلنا بھی چاہیے۔ تم دیکھ لینا کہ جب فہد تمہیں فہمی پکارا کرے گا تو تمہیں اسی تخاطب کی عادت پڑ جائے گی'' فیروزہ بیٹی کو رسان سے سمجھا رہی تھیں۔

''پھر بھی مجھے نہیں کرنی فہد سے شادی' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ناں؟''

''کوئی وجہ نہیں ہے۔ آپ بس ممانی جان سے کہہ دیں کہ وہ مجھ پر یہ احسان عظیم نہ ہی کریں تو بہتر ہوگا۔''

''اے لو' اس میں احسان کی کون سی بات ہوگئی۔''

''یہ احسان ہی تو ہے ان کا' جو آپ سمجھنے کے باوجود بھی نہیں سمجھ رہی ہیں'' فہمی زچ ہو کر بولی۔

''کیا فرسٹ کزنز میں آپس میں شادیاں نہیں ہوتیں' تمہاری دنیا سے انوکھی شادی تو نہیں ہو رہی۔''

''نہیں امی' یہ بات ہرگز نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''ان کے لائے ہوئے رشتے میں کج پڑ گئی اور شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ خاندان میں بدنامی اور جگ ہنسائی ساتھ ساتھ ہوئی اور پیسے کا ضیاع بھی۔ جہیز کی چیزوں کی جو بربادی تھی وہ اس کے علاوہ تھی۔ اب اس نقصان کے ازالے کے لیے انہوں نے فہد کو پیش کر دیا ہے۔ ہمارے زخموں پر مرہم لگانے کے لیے انہوں نے یہ رشتہ دے دیا ہے۔ ممانی جان کی پریشانی' ان کی اچانک بیماری اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں اور پھر شاید ان کے ذہن نے انہیں یہ راہ سجھائی کہ تاوان کے طور پر فہد کا رشتہ دے دیا جائے۔ یوں ہمارے آنسو بھی پنچھ جائیں گے اور خاندان میں ان کی واہ واہ الگ ہو جائے گی کہ ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی کو انہوں نے اپنے اکلوتے فرزند کی بہو بنا لیا۔''

''اول تو ایسی بات ہے نہیں لیکن......اگر میں تمہاری بات مان بھی لوں تو میری بھاوج نے اچھی ہی بات کی ہے ناں' کوئی برائی تو وہ نہیں کر رہیں۔ ان کی نیکی کو میں ڈھونگ نہیں بنا سکتی۔ ان کی محبت کو میں دکھاوا نہیں کہہ سکتی۔''

''امی' آپ کیا کسی کو کچھ کہیں گی مگر مجھے یہ پورا یقین ہے کہ یہ سب ماموں جان نے کہا ہوگا۔ بلکہ انہوں نے ممانی اور فہد پر زور ڈالا ہوگا۔ ممانی بے چاری ڈر گئی ہوں گی۔ انہوں نے فہد کے آگے ہاتھ جوڑے ہوں گے تب فہد بھی راضی ہو گیا ہوگا۔''

''اچھا ایسا ہوا ہوگا۔'' اب امی بھی سراسیمہ سی ہو گئیں۔

''بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا میں انہیں منع کر دوں......'' وہ خاصی روہانسی سی ہو گئیں۔

''ہاں' آپ ان کو فوراً منع کر دیجیے' مگر اس انداز سے کہ انہیں برا بھی نہ لگے۔

''پھر کہاں ہوگی تمہاری شادی......؟ غیروں میں کس کس کو جانچتی اور آنکتی پھروں گی؟'' ان کی بات بھی سچی تھی۔

''امی! اگر اللہ نے میرے نصیب میں شادی لکھی ہے تو وہ ضرور ہوگی اور اگر میرے مقدر میں نہیں ہے تو وہ کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ عین وقت پر آپ کے یہ لاڈلے بھتیجے فہد بھی سرپٹ بھاگ جائیں گے'' فہمی نے انہیں سمجھایا۔

''ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی'' وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ بیٹی کی باتیں سن کر ان کے پسینے سے چھوٹ گئے تھے۔

اور جب فیروزہ بیگم نے بودا سا بہانہ بنا کر منع کیا تو ان کی بھاوج نے بہ آسانی ان سے اگلوالیا کہ یہ انکار فہمی کی جانب سے ہے بلکہ فہمی کی تمام تر باتیں بھی انہیں معلوم ہو گئیں۔

ادھر فہمی خوش تھی کہ امی' ماموں جان کے ہاں جا کر منع کر آئی ہیں۔ اس کے ذہن سے ایک نادیدہ سا بوجھ بھی اتر چکا تھا۔

ایک شام وہ نہا کر اپنے لمبے بالوں کو سلجھا رہی تھی کہ فہد گھر میں کسی طوفان کی طرح داخل ہوا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا کیا یا بالکل ہی پاگل ہو چکی ہو یا پھر اپنے آپ کو عقل کی بو بو سمجھنے لگی ہو؟'' وہ غصے میں بپھرا ہوا کہہ رہا تھا۔

''کیا بات ہے' اتنا دماغ کیوں آؤٹ ہو رہا ہے تمہارا......؟'' وہ سمجھی کہ پرسوں اس کی گائیکی کا مذاق جو اڑایا تھا' اس کی چھوٹی بہن نے گھر جا کر فہد کو بتا دیا ہے اور فہد اس کا بدلہ لے رہا ہے۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''میری وجہ سے' میں نے کیا' کیا ہے؟'' وہ منہ پر آئے بال پیچھے جھٹک کر بولی۔

''پگلو جو ہو تم......فہمی' میں نے نہ تم پر کوئی احسان دھرنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی پاپا کی ڈانٹ پھٹکار کی وجہ سے یہ رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔''

''اگر میں یہ مان بھی لوں کہ تم سچے ہو تو اس سے قبل یہ خیال تمہارے دل میں کیوں نہیں آیا تھا؟ میرے بارے میں اس وقت کیوں سوچا گیا' جب میری مہندی کی رسم ہونے کے بعد رشتہ ختم کر دیا گیا۔ تم نے اس وقت ہی قدم بڑھانے کا کیوں سوچا جب مجھے بے چاری کا خطاب مل گیا۔ ہائے بے چاری فہمی' کتنی بدقسمت ہے کہ منگنی ٹوٹی اور اب مہندی کے بعد رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ یہ نعرے جب پورے خاندان میں لگ گئے تب ہی تم نے رحم کھانے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

فہمی کے آنسو اس کے لہجے سے بھی چھلک رہے تھے اور مارے غصے کے وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

فہد نے اس کے لرزتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محبت بھرے لہجے میں دھیمے سے یوں گویا ہوا

''فہمی' تمہارا غصہ بجا ہے......تمہاری ایک ایک بات سچ ہے مگر دیر سویر تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور جب تم میرے نصیب میں تھیں تو کسی دوسرے کے پاس کیسے جا سکتی تھیں۔ اچھا ہوا کہ تمہاری منگنی ٹوٹی۔ بہت اچھا ہوا کہ مہندی کے بعد یہ رشتہ ٹوٹا مگر یہ بہت برا ہوگا کہ تم میرے لیے انکار کر دو۔ سنو......یہ بات میں بالکل سچ کہہ

رہا ہوں کہ......مجھے بھی یقیناً تم تک پہنچنے میں دیر ہوئی ہے مگر اب مزید دیر تو نہیں ہونی چاہیے۔''

''تمہیں پتا ہے ناں کہ تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔'' فہمی نے اپنے ہاتھ چھڑائے اور رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''مگر میں تو تمہیں چھوٹا سمجھتا ہوں......گو قد آور میں بھی نہیں ہوں مگر تم تو میرے سامنے بالکل گڑیا سی ہو......اتی سی......'' اس نے ہنس کر ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

''غلطی ہے تمہاری۔''

''میری کوئی غلطی نہیں ہے مگر تمہاری باتوں سے میں صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں جس بنا پر تم مجھ سے شادی سے انکاری ہو'' فہد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''وہ کیا......؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''میری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میری جاب بے حد معمولی ہے۔ چھٹی کرتا ہوں تو تنخواہ کٹ جاتی ہے۔ تم اپنی سہیلیوں کو میری بابت کوئی بھی بات فخر سے نہیں بتلا سکتیں کیونکہ میں شام کے ایک غیر معروف اخبار میں کام کرتا ہوں جسے لوگ پڑھ کر بسوں میں ہی چھوڑ جاتے ہیں۔'' فہد کا لہجہ دکھی سا ہو گیا تھا۔ اب وہ فہمی کی جانب دیکھنے کے بجائے زمین کو دیکھ رہا تھا جیسے اس سے نظر ملانے کے قابل نہ رہا ہو۔

''نہیں فہد! ایسی بات ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی میں ان سطحی باتوں کو کوئی اہمیت دیتی ہوں۔''

''تو پھر انکار کیوں کر رہی ہو؟ یقین مانو میں تمہارے سارے دکھ چن لوں گا اور تمہارے لب سدا مسکرائیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے' اب کھڑے کیوں ہیں ابھی تک......جائیے اور ممانی جان کو بھیج دیجیے'' نگین جو دوسرے کمرے میں کھڑی باتیں سن رہی تھی' باہر آ کر بولی۔

فہمی شرما سی گئی اور فہد ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اور پھر ایک شام انتہائی سادگی کے ساتھ فہمی رخصت ہو کر ممانی کے گھر چلی آئی۔

نہ شور' نہ ہنگامہ' نہ رشتے دار اور نہ ہی دوست احباب۔ ممانی جان کے ساتھ کل نو افراد آئے تھے اور گھر میں اس سے بھی کم لوگ تھے۔ اباجی نے کام کاج کی غرض سے دکان کے دو ورکرز کو کہہ دیا تھا۔ مسجد میں نکاح ہوا۔ گھر آ کر کھانا کھایا گیا۔ فیروزہ نے تو کسی فوٹو گرافر کو بھی نہیں کہا تھا۔ فہد کے ساتھ ایک فوٹو گرافر اور ایک مووی میکر ضرور تھا۔ جو چند لوگوں کی تصاویر بنائے چلا جا رہا تھا۔

گو یہ شادی آناً فاناً طے ہوئی تھی مگر ممانی جان بہت اچھی بری لائی تھیں۔ زیورات کے دو سیٹ تھے مگر دونوں ہی بہت خوبصورت تھے اور پھر رات دس بجے تک اس کی رخصتی بھی ہو گئی۔

ولیمہ دس دن بعد مقامی ہوٹل میں تھا' جس میں فہد نے اپنے تمام دوستوں کو بلایا تھا۔ ممانی جان کی اپنی فیملی کے بھی تمام لوگ تھے۔ فہد سیاہ ڈنر سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

فہمی بھی ریسٹ کلر کے شرارے میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ نگین نے اپنی باجی کو یوں سرشار سا دیکھ کر خوشی کا سانس لیا۔

''لوگوں کی تو سات سات بیٹیوں کی شادیاں کتنی آسانی سے ہو جاتی ہیں' اپنی ایک کی بھی کتنی مشکل سے

ہوئی۔" ایک شام فیروزہ اپنے میاں سے کہہ رہی تھیں۔

"اللہ کا شکر کرو ہو تو گئی۔ اگر اب بھی نہ ہوتی تو ہم کیا کر سکتے تھے؟"

"اللہ رکھے میرے بھائی بھاوج کو، میری پریشانی میں وہی کام آئے۔ تمہاری طرف کا تو کوئی نہیں پھٹکا۔"

"فہمی کا نصیب ہی فہد کے ساتھ بندھا ہوا تھا تو اس کی شادی میرے خاندان میں کیسے ہو سکتی تھی۔ نیک بخت، یہ اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے۔ اس میں تمہارے میکے والوں کا کوئی احسان نہیں ہے۔ اچھے خاصے خرانٹ سے لوگ ہیں۔ فہمی جتنا جہیز لے کر گئی ہے اتنا تمہارے بھتیجے کو کہیں اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ ہم نے فہد کو سلامی میں بائیک تک کے پیسے دے دیے کہ اپنی فہمی کو رکشا' ٹیکسی کے لیے خوار نہ ہونا پڑے۔" فرید احمد زعم بھرے لہجے میں بولے۔

"دنیا دیتی ہے' تم نے دے دیا تو کون سا احسان کر دیا۔" فیروزہ بیگم کو اپنے میاں کی باتیں پسند نہیں آ رہی تھیں۔

"چاہو تو تم یہ بات اپنے بھائی بھاوج کے کانوں میں ڈال سکتی ہو کہ ہم نے اپنی بیٹی کو جہیز آج کل کے ریٹ سے زیادہ دیا ہے۔ نک سے سک تک رائی سے رتی تک ہر چیز دی ہے۔ ہم نے نہ صرف لڑکے کی اوقات سے زیادہ دیا بلکہ ہم نے تمہارے بھائی کی حیثیت سے بھی زیادہ دیا ہے۔" یہ کہہ کر فرید احمد رکے نہیں' باہر نکل گئے اور فیروزہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

فرید احمد نے ان کے میکے کے کبھی بھی گن نہیں گائے تھے، یہ احساس ان کو دکھ سا دے گیا۔

☆☆☆

جمال کالج سے تھکا ہارا آیا تو لیٹا ہوا تھا۔ ٹی وی کا ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بلاوجہ مختلف چینلز چیک کر رہا تھا۔

"جمال بھائی! پچھلی گلی سے فرید صاحب کی بیٹی کی شادی کا جو کارڈ آیا تھا ناں......؟"

"آیا ہوگا" وہ بے دلی سے بولا۔

"اس دن اس کی شادی نہیں ہوئی۔"

"کیوں؟" اب وہ اسپورٹس کا چینل دیکھ رہا تھا۔

"آج پڑوسن امی کو آ کر بتا رہی تھیں کہ مہندی کی تقریب میں بدمزگی ہو گئی تھی' بعد میں لڑکے والوں نے بہانے سے رشتہ ختم کر دیا۔"

"کر دیا ہوگا' ہمیں کیا؟ تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔" چھوٹی بہن کو ڈانٹ کر وہ اپنی پسندیدہ ریسلنگ دیکھ رہا تھا جس میں ٹرپل ایچ' شون مائیکل سے لڑ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ شون مائیکل اب جیتا کہ تب جیتا مگر ٹرپل ایچ بے ایمانی سے جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔

جمال کی چھوٹی بہن خاصی باتونی تھی' بھائی سے ڈانٹ کھانے کے بعد بھی وہ دھیمے لہجے میں اسے بتا رہی تھی۔

"پڑوسن امی کو بتا رہی تھیں، فرید صاحب کی بیٹی فہمی کی شادی دوسری جگہ چپ چپاتے ہو گئی۔ سنا ہے کہ گھر میں ہی ہوئی ہے اور دولہا' اپنی دلہن سے عمر میں بھی کم ہے۔"

"اچھا' تم نگین کی بہن فہمی کی بات کر رہی ہو؟" جمال لیٹے سے اٹھ بیٹھا جیسے اس کے لیے یہ خبر بڑی اہم

ہو۔

"بتا تو رہی ہوں کہ فرید صاحب کی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا تھا۔" ربیع پھر شروع سے بتانے لگی۔

"مجھے کیا پتا فرید صاحب کون ہیں؟" وہ الجھ کر بولا۔

وہ کالج سے آ کر لیٹا نگین کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے وہ اسے نظر ہی نہیں آئی تھی۔

اسے کیا پتا کہ اس کی چھوٹی بہن بھی اسی گھر کی بابت بتا رہی ہے۔

"کارڈ تو ہمارے گھر آیا تھا ناں۔ تم یوں کرو......امی کے ساتھ جا کر کوئی گفٹ ان کے ہاں جا کر دے آؤ۔"

"بھائی' ان کے ہاں سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے' امی تو میرے ساتھ نہیں جا سکیں گی۔ ان کے پیروں کا درد اور سوجن کہاں کم ہوئی ہے۔"

"چلو میں تمہارے ساتھ چلا چلوں گا" وہ بولا۔

"آپ چلیں گے میرے ساتھ؟" وہ حیران سی ہو گئی۔ اس سے قبل جمال محلے میں کسی کے گھر اس طرح نہیں گیا تھا۔

"ظاہر ہے' تم اتنی ڈرپوک سی جو ہو' محلے میں بھی اکیلی نہیں جا سکتیں۔"

"بھائی جان! کبھی ہمت ہی نہیں پڑی اکیلے جانے کی' ہمیشہ آپ کے ساتھ یا امی کے ساتھ جانے کی عادت ہے۔"

"یہ تو اچھی عادت ہے" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"تو پھر کب چلیں گے آپ؟"

"جب تم تحفہ لے کر آؤ گی۔"

"امی تو کہتی ہیں کہ لفافے میں پیسے رکھ کر دے دو۔ اپنی پسند کی چیز لے لیں گے۔"

"نہیں' اس طرح کا لفافہ دینا اچھا نہیں لگے گا۔"

"تو پھر کیا دیں؟"

"اچھا کل کالج سے واپسی پر کچھ خرید کر لاتا ہوں۔"

اگلا دن تو کیا' پورا ہفتہ گزر گیا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کوئی پرفیوم' کوئی پرس یا پینٹنگ یا کوئی خوبصورت سا دل کی شکل کا لاکٹ ...... جو اس کے سینے پر ڈولتا رہے۔

لاحول ولاقوۃ...... یہ تحفہ تو فہمی کے لیے ہوگا' کوئی نگین کے لیے تھوڑی ہے جو وہ اتنا جذباتی سا ہو رہا ہے۔

کوئی کتاب لے لوں! یقیناً اسے پہلے نگین پڑھے گی' پھر اپنی بہن کو دے گی کہ گھروں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

کوئی تاریخی کتاب' پتا نہیں اسے تاریخ سے دلچسپی بھی ہے یا نہیں؟

کوئی شاعری کی کتاب...... اشعار سے یقیناً اسے لگاؤ ہوگا...... یا پھر اس کو سمجھ میں ہی نہ آتے ہوں...... تو کتاب تو وہ الٹ پلٹ کر ہی رکھ دے گی۔

"کیا لوں......؟ کیا نہ لوں......وہ پریشان سا ہو گیا۔

اور پھر...... وہ ایک خوبصورت سا بو کے اور ایک کارڈ لے آیا۔

’’جمال بھائی! اتنا خوبصورت بو کے...... دل کی شکل کا بنا ہوا...... اور سرخ گلابوں سے لش لش چمکتا‘ مہکتا سا۔‘‘ ربیع نے اسے گالوں سے لگالیا۔

’’اگر بہت اچھا لگ رہا ہے تو اسے گھر میں رکھ لو اور لفافے میں پیسے رکھ کر دے آؤ‘‘ امی نے بیٹی کو اتنا خوش دیکھا تو اپنا اکلوتا مشورہ دے ڈالا۔

’’نہیں امی...... ! نگین خوش ہوں گی۔ فہمی باجی کو بھی اچھا لگے گا۔‘‘

اس شام وہ دھڑکتے دل سے پہلی دفعہ نگین کے گھر پہنچا تو دروازہ نگین نے ہی کھولا تھا۔

’’جی آپ......؟‘‘ وہ اجنبی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

’’ہم آپ کی پچھلی اسٹریٹ 18 سے آئے ہیں۔ بی 101 سے۔ ہمارے ہاں فہمی باجی کی شادی کا کارڈ آیا تھا مگر ضروری کام کی وجہ سے آ نہیں سکے تھے۔ آج سوچا کہ مبارک باد ہی دے آئیں۔‘‘ ربیع نے نگین کو بو کے اور کارڈ دروازے پر ہی تھما دیا۔

’’آیئے ناں اندر پلیز!‘‘ وہ رستہ دیتے ہوئے بولی۔

جمال‘ ربیع کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اب وہ ایک نفیس سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

’’آپ لوگ چائے لیں گے یا ٹھنڈا؟‘‘ نگین میزبانی کے اصول نبھا رہی تھی۔

’’پلیز‘ آپ تکلف مت کیجئے۔ چائے ہم پی کر آئے ہیں۔‘‘

’’پھر بھی‘ کچھ نہ کچھ تو لیجئے ناں‘‘ اس نے ایک باسکٹ میں رکھی چیزیں ان کے سامنے بڑھائیں۔ ’’امی اس وقت ابا جی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں‘ وہ آئیں گی تو کیا کہیں گی۔‘‘

’’کچھ نہیں کہیں گی‘‘ جمال نے ایک چیری اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔

’’نگین! آپ بھی ہمارے ہاں آیئے گا‘‘ ربیع نے کہا۔

’’ہاں‘ کیوں نہیں‘‘ وہ مسکرا کر بولی۔

’’مگر آپ ہمیں یاد ضرور رکھیے گا کہ کبھی دوبارہ آنا ہوا تو آپ پوچھنے لگیں کہ کون ہو بھئی‘ کیوں آئے ہو کیا کام ہے؟‘‘

جمال کی باتیں سن کر نگین اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکی اور بے اختیار ہنس دی۔ یوں جیسے کلیاں ایک دم اپنی آنکھیں کھول بیٹھی ہوں۔

’’میرا نام ربیع ہے‘ گرلز کالج میں سیکنڈ ائر میں پڑھتی ہوں۔‘‘

’’اور مجھے جمال احمد کہتے ہیں‘‘ اس کا شگفتہ سا لہجہ محبت سے گندھا ہوا تھا جیسے وہ اپنا تعارف نہ کرا رہا ہو بلکہ اسے اپنے آپ سے ملوا رہا ہو کہ آؤ مجھے جانو۔ ’’آؤ‘ مجھے سمجھو......!‘‘ ......اور آؤ‘ میرا یقین کر لو......!

’’اور میں نگین ہوں‘ فہمی باجی کی چھوٹی بہن۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

’’یہ تو ہمیں پتا ہے‘‘ بے اختیارانہ جمال کے منہ سے نکلا۔

’’جی...... آپ...... مجھے جانتے ہیں؟‘‘ وہ حیران سی رہ گئی۔

’’جی ہاں‘ محلے کی وجہ سے یہ تو پتا ہے ہی ناں کہ فرید صاحب کی دو بچیاں ہیں۔ پہلی بچی کی شادی کا کارڈ ہمارے گھر آیا تھا‘‘ جمال نے بات سنبھالی۔

’’اچھا نگین! اب اجازت دیجئے‘ مگر یہ پکا والا وعدہ کیجئے...... کہ آپ ہمارے گھر ضرور آئیں گی۔‘‘

’’جی ضرور......‘‘ نگین متبسم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اور چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی جمال کی نظریں اس کا سراپا اپنی آنکھوں میں جیسے جذب کر رہی تھیں۔ کسی لڑکی کو اگر کوئی شدتوں کے ساتھ دیکھے تو اس کے دل کی دھڑکن از خود تیز ہو جاتی ہے۔ نگین نے بھی چونک کر جمال کو دیکھا۔

’’اچھا‘ انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی‘‘ وہ مسکراتے ہوئے لبوں سے کہہ رہا تھا۔

’’جی ضرور......‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس شخص کو میں نے کہاں دیکھا ہے کہ انجانا سا لگ ہی نہیں رہا۔ یوں لگ رہا ہے کہ میں اسے اچھی طرح سے جانتی ہوں۔

’’کون ہے یہ شخص؟ اس کو دیکھ کر عجیب سا کیوں لگا؟ وہ الجھ سی گئی اور جلدی سے گیٹ بند کر دیا۔ اجنبی لوگوں کو وہ اتنی اہمیت دینے کی کبھی قائل نہیں تھی۔ محلے سے کوئی آتا جاتا تو فیروزہ بیگم ہی بھگتا دیا کرتی تھیں اور وہ ڈرائنگ روم میں جھانک کر نہیں دیا کرتی تھی۔

بعض دفعہ اسی بات پر وہ اچھی خاصی ناراض بھی ہو جاتی تھیں۔

’’کیا کہیں گے لوگ‘ اس گھر میں ایک مغرور سی لڑکی بھی رہتی ہے‘ جس سے آ کر سلام بھی نہیں کیا جاتا؟‘‘

’’کہنے دیں آپ......لوگوں کا کام ہی باتیں بنانا ہوتا ہے۔‘‘ وہ بڑے آرام سے کہتی۔

’’تمیز اور تہذیب سب لڑکیاں اپنے میکے سے سیکھ کر جاتی ہیں...... اگر شربت لے کر تم آ جاتیں تو کیا ہو جاتا؟‘‘

’’ایک گھنٹے بیٹھ کر بور ترین باتیں سننی پڑتیں۔‘‘

مگر آج وہ اپنے اصول خود ہی توڑ بیٹھی تھی۔ جمال اور ربیع کو دیکھ کر پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا تھا کہ انہیں گیٹ سے ہی چلتا کر دے مگر نہ جانے کیسے وہ انہیں اندر لے آئی۔

بولنے والی لڑکیوں اور مسکراتی نظروں سے دیکھنے والے لڑکوں سے اسے سخت چڑ تھی مگر آج وہ دونوں اسے برے نہیں لگے تھے۔ سیدھے سادے‘ معصوم سے اور بے ضرر سے وہ بہن بھائی اسے اچھے ہی لگے تھے۔

’’فہمی باجی آئیں گی تو ان کے ساتھ چلی جاؤں گی‘‘ اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑے بو کے کو بے اختیار اپنے چہرے سے لگا کر سونگھا تو اندر تک ایک دل آویز سی مہک نے اسے مسحور کر دیا۔

☆☆☆

کراچی سے طفیل آیا ہوا تھا۔ فرید احمد کی دکان کا جز وقتی سیلز مین۔ وہ شجاع کو فہمی کا رشتہ ختم ہو جانے اور دوبارہ شادی کی تفصیل بتا رہا تھا۔

’’بھائی بھی ہمارا عجیب ہی ہے‘ اتنا پریشان رہا مگر ہمیں اطلاع نہیں کی۔ انسان اپنے غم میں تو شریک کر لیا کرے۔ وہ مجھے بتاتا...... تو میں فہمی کی شادی فرحت کے جیٹھ سے کروا دیتی۔ ان کا بھی نکاح ٹوٹا ہے۔ کم از کم فہد کے مقابلے میں سنا کر پیسے والا بھی بہت ہے اور شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔‘‘

’’فہد کو پسند کرنے میں ممانی کا ہاتھ ہو گا جو ممانی نے کہا ہو گا...... اسی کو ماموں نے قبول کر لیا ہو گا۔‘‘ شجاع نے رائے دی۔

’’میں تو آج تک فیروزہ کی خصلت کو نہیں سمجھ سکی ہوں‘ سسرال والوں سے اس نے خواہ مخواہ کا بیر پال رکھا

ہے۔ اب اتنی بڑی بات ہو گئی ہے مگر ہمیں غیروں سے خبریں پتا چل رہی ہیں۔"

"بے چاری فہمی کے ساتھ اتنا کچھ ہوا اور ہمیں پتا ہی نہیں۔ ہمیں پتا ہوتا تو فہد سے اچھی جگہ اس کی شادی کروا دیتے۔"

"آپ شادی میں جاتیں تو وہ غم میں بھی آپ کو شریک کرتے۔ ان کے گھر میں تو موت کے سے دن تھے، جب فہمی کی شادی کینسل ہو گئی تھی۔ فرید بھائی بیمار تک ہو گئے تھے" طفیل نے بتایا۔

"چلو، وہ پریشان تھے، بیمار تھے...... نمک حرام! یہاں بھی کھاتا ہے، وہاں بھی کھاتا ہے مگر ذمے داری کا کوئی کام کبھی نہیں کرنا جانتا...... ایک فون کرنے میں تیرے کتنے پیسے ٹھک جاتے......" اب عظمت نے طفیل کو کھری کھری سنائیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

☆☆☆

"اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری باجی کی شادی ہو گئی۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ تمہیں اب کالج آنے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی" زبور شکایتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"گھر میں اس قدر کام تھا' کیسے آتی میں۔ اور اب بھی روزانہ فہد بھائی اور باجی آجاتے ہیں تو کام تو روزانہ ہی بڑھ جاتا ہے۔"

"اتنے سارے دن ہو گئے ہیں ان کی شادی کو' ابھی بھی تمہاری باجی روزانہ میکے آتی ہیں۔" زبور کے لہجے میں تحیر سا تھا۔

"ہاں، روزانہ آتی ہیں' کبھی دن میں' کبھی شام میں۔ اب امی اکیلے تو سب کام نہیں کر سکتی ہیں ناں۔"

"تو میں کیا کروں؟ جب تک تم کو دیکھ نہ لوں' میں جو بے چین سا پھرا کرتا ہوں۔"

"آپ صبر کیجیے' اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے" نگین نے مسکرا کر کہا۔

"چلو، سی سائیڈ چلتے ہیں۔ گیلی ریت پر تمہارے ساتھ چلنا اچھا لگتا ہے۔"

"نہیں' آج مجھے جلدی گھر جانا ہے۔ شام کو ممانی جان بھی باجی کے ساتھ گھر آئیں گی۔"

"تو کیا آج تم مجھے یہی بتانے آئی ہو کہ تم سے دل بھر کر باتیں بھی نہیں کر سکوں گا؟"

"میرے موبائل کا کارڈ ختم ہو گیا ہے ورنہ یہ بتانے کے بجائے تمہیں فون کر دیتی' کالج سے۔"

"یہ تو بہت زیادتی ہے۔"

"اب میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"ایک کپ آئس کریم تو میرے ساتھ کھا سکتی ہو۔"

"گلا بہت خراب ہے میرا' آئس کریم بالکل نہیں کھاؤں گی۔"

"چلو کافی پی لو۔"

"او کے!"

اور پھر چند دن بعد وہ کیفے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور زبور اس بات پر بضد تھا کہ اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں لنچ کرے۔

"نہیں زبور' میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔"

"اچھا' فائیو اسٹار ہوٹل میں تو چلو گی...... تمہارے ابا جی نے کبھی بھولے سے بھی وہاں لنچ نہیں کرایا ہوگا۔"

"تم کتنی ہی باتیں بنا لو مگر ان دنوں میں کہیں جانے کا نہیں سوچ سکتی۔"

"آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ اس کے اس گریز پر حیران ہو رہا تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ ابا جی مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ وہ اب بار بار پوچھتے ہیں کہ کالج سے آنے میں اتنی لیٹ کیوں ہونے لگی ہو۔"

"تم بتا دیتیں کہ پریکٹیکل میں دیر ہو جاتی ہے۔"

"یہی کہا تھا میں نے۔"

"پھر ہوئی تسلی ان کی؟"

"جی نہیں" وہ کہہ رہے تھے کہ پہلے تو ہفتے میں دو دن پریکٹیکل ہوتے تھے' اب یہ روزانہ کیوں ہونے لگے ہیں؟"

"تم کہہ دیتیں' ہماری نئی پروفیسر پڑھانے کی بہت شوقین ہیں۔ وہ طالبات کو گھر جانے ہی نہیں دیتی ہیں۔"

"جی نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے۔" نگین ہنسی "چھٹی کے وقت ہم سے پہلے بھاگتی نظر آتی ہیں میری کیمسٹری اور فزکس کی پروفیسرز۔ کیسے کہہ دیتی؟ بس آئیں بائیں شائیں کر کے اپنی جان چھڑائی مگر مجھے لگ رہا تھا کہ ابا جی میری باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔"

"کیا ایسا کچھ انہوں نے کہا ہے......؟" زبور نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نہیں' کہا تو کچھ نہیں مگر مجھے ان کی آنکھیں متفکر سی نظر آ رہی تھیں...... اس لیے میں مزید محتاط ہو گئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس بارے میں ابا جی کو کچھ پتا چلے۔"

"اچھا ہے' پتا لگ جائے پھر تم نڈر ہو کر مجھ سے ملنے آنا" زبور نے ہنس کر کہا۔

"لگتا ہے دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ نہ تم میرے ابا جی کو جانتے ہو نہ ان کے غصے کو اور نہ ہی ان کی ضدی طبیعت کو۔ میں ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ یوں بھی باجی کی شادی کے بعد ان کی تمام تر توجہ صرف مجھ پر مرکوز ہو گئی ہے۔"

"پھر اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا چاہیے ناں۔ یہ کیا کہ ابا جی کے ڈر سے تم مجھ سے ملنا بھی چھوڑ دو۔" زبور نے کہا۔

"میرے ذہن میں تو سوائے محتاط ہونے کے کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔"

"مگر میرے پاس ہے" زبور مسکرایا۔

"وہ کیا؟"

"فہمی باجی کو تو میرے بارے میں پتا ہے ناں؟"

"وہ تو ہے' تم سے بات بھی ہو چکی ہے ان کی۔"

"میں تو سوچ رہا ہوں کہ ان کی اور فہد کی ہم لوگ۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں دعوت کر دیتے ہیں۔ اب تو ہنی مون سے آئے ہوئے بھی انہیں مدت ہو گئی ہے۔ اس طرح فہد کو بھی پتا چل جائے گا اور یوں ہمارے حق کے دو ووٹ پکے ہو جائیں گے جو مستقبل قریب میں ہمارے کام آ سکتے ہیں۔"

"ایسا غضب بھی مت کیجیے گا۔ فہد بھائی کو بلانے کا مطلب ہے کسی بات کو اخبار میں دے دینا۔ وہ [illegible] ئیں گے۔ ممانی اپنی بہن کو' وہ اپنی اماں کو یوں چوبیس گھنٹے میں یہ خبر پورے پاکستان میں گشت کرے گی [illegible]

کسی لڑکے سے عشق کر رہی ہیں۔"

"تو کیا نہیں کر رہی ہو؟" زبور کے لہجے کے ساتھ آنکھیں بھی شرارت پر اتر آئیں۔

"ہاں' ایسا تو ہے مگر کیا اس کے لیے اعلانات بھی ضروری ہیں؟"

"کیا مضائقہ ہے......" اب وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

"زبور باز آ جاؤ ورنہ میں تم سے ملنے بھی نہیں آؤں گی۔"

"نگین! یہ بات تم سچ سچ بتانا...... کہ کیا اپنے اوپر یہ پابندی برداشت کر سکو گی؟" وہ دونوں ہاتھ اپنے سینے باندھے اسے پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"پتا نہیں......" وہ پیٹھ موڑ کر ناراض سی ہو گئی۔

"یار......! میری محبت نے تو تمہیں خاصا نڈر بنا دیا تھا' اب کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"یہ بہادری پل بھر میں ہوا بھی ہو جاتی ہے کہ یہ ساعتیں پل پل میں اپنے رنگ جو بدلتی ہیں۔"

"مگر میرے دل کی صدائیں تو صرف ایک ہی نام جانتی ہیں۔ نگین...... نگین...... نگین! اور اسی نام کی صا سنتی ہیں...... کیا سمجھیں...... اور ایک تم ہو کہ......" وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

"عاشق صاحب! اب میں جاؤں...... آج بھی میں لیٹ ہو گئی ہوں۔"

"دل تو نہیں چاہ رہا۔"

"اب اس دن آؤں گی جس دن ابا جی معروف ہوں گے۔"

"موبائل پر ایس ایم ایس کر دینا مجھے۔"

"لگتا ہے اب موبائل کا یہی کام رہ گیا ہے" وہ ہنسی۔

"ہاں' پیار کرنے والوں نے ہی پوری دنیا میں موبائل سسٹم کو مقبول کیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اف...... بہت دیر ہو گئی مجھے" نگین کی نظر اپنی رسٹ واچ پر پڑی تو وہ پریشان ہو گئی۔

"آؤ گھر تک تمہیں گاڑی پر چھوڑ دوں۔"

"نہیں' تم جاؤ۔ میں خود چلی جاؤں گی" وہ بیگ کاندھے پر لٹکا کر کیفے سے نکل آئی۔

ابھی وہ اپنی گلی میں داخل ہوئی تھی کہ ایک مانوس سا گاڑی کا ہارن اسے اپنی پشت پر سنائی دیا۔ اس۔ گردن موڑ کر دیکھا، ابا جی گاڑی روکے ہوئے تھے۔

"آج بھی دیر ہو گئی تمہیں۔ میں دو دفعہ کالج کا چکر لگا آیا ہوں۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟" وہ پریشان لہجے ما بولے۔

"میری انگریزی کی بک فریال کے گھر رہ گئی تھی' وہی تو لے کر آ رہی ہوں میں" نگین نے ڈرتے ہو کہا۔

"جب ہی تم مجھے نظر نہیں آئیں۔"

اور نگین ایک گہرا سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ "آج اللہ نے مجھے بال بال بچایا ہے" وہ اپنے دل ما سوچ رہی تھی۔

"تمہاری دوست فریال' کالج کیوں نہیں آ رہی؟" ابا جی اس سے پوچھ رہے تھے۔

"فریال کا بخار ہی نہیں اتر رہا اس وقت بھی ایک سوتن تھا۔" نگین نے وثوق بھرے لہجے میں باپ سے

کہا۔

جب کہ اسے یہ تک پتا نہ تھا کہ یہ فریال تواتر سے چھٹیاں کیوں کر رہی ہے؟ نہ ہی اس کا فون آیا تھا اور نہ ہی نگین کو اتنی فرصت ملی تھی کہ فون پر ہی اس کا حال احوال پوچھ لیتی۔

☆☆☆

فکر اور صدمے سے کبھی کوئی مسئلہ طے نہیں ہوتا۔ یہ بات فریال اچھی طرح جانتی تھی مگر پھر بھی......! نہ تو اس کے صدمے میں کوئی کمی آ رہی تھی اور نہ ہی اس کی فکر کے بادل کسی صورت میں چھٹ رہے تھے۔

سوچ سوچ کر وہ ذہنی طور پر لہولہان سی ہو گئی تھی۔

ہنستی مسکراتی لڑکی کو ایک چپ سی لگ جائے تو عجیب سا لگتا ہے مگر وہ ہر ایک کی بات کو ہوں' ہاں میں ٹال رہی تھی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ عدیل کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کی گاڑیاں مانگ تانگ کر لایا کرتا تھا۔ اس کی اپنی بائیک کی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی مگر اس کا گھر اور اس سے زیادہ اس کے گھر والوں کو دیکھ کر وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔

عدیل تو معمولی نقش و نگار ہونے کے باوجود اسے بہت اچھا لگا کرتا تھا کہ اس کی باتیں اسے دلی خوشی عطا کیا کرتی تھیں مگر اس کی ماں اور بہنیں تو نری جاہل تھیں جنہیں گفتگو کرنے کے آداب بھی نہیں آتے تھے۔

"امی! یہ فریال ہے' میری دوست" عدیل نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا...... یہ کہاں مل گئی تمہیں؟" وہ تمسخر سے بولیں۔

"فریال میرے دوست کی بہن بھی ہیں۔"

"بھئی' ہم تو صاف بات پوچھیں گے کہ یہ چکر اس نے چلایا ہے یا تم نے......؟"

"چکر تو کسی نے نہیں چلایا' یہ میری قسمت میں تھی، اس لیے مجھ سے آ ملی...... اب یہ میری بہت اچھی دوست ہے۔"

"بیٹا! گھومو پھرو اور عیش کرو مگر شادی مت کرنا' ایسی لڑکیاں جہیز لے کر نہیں آتیں۔" ماں کے قہقہے میں اس کی بیٹیاں بھی شامل ہو گئیں اور فریال کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے ذہن پر سنگ باری کر رہا ہو۔

"اماں' دیکھنا ذرا...... میم صاحبہ کی تو سٹی سی گم ہو رہی ہے۔" عدیل کی منجھلی بہن نے تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تو صاف بات کرتے ہیں تاکہ تم کہیں اور ٹرائی کرنا چاہو تو کر سکو۔ عدیل جیسے لڑکوں کی کمی نہیں ہو گی مگر ہم تمہیں ہتھیلی کا چھالا نہیں بنا سکتے اور تم ہمارے گھر میں خواہ مخواہ ہی آ گئیں" عدیل کی بڑی بہن نے اسے بری طرح لتاڑتے ہوئے کہا۔

"مگر...... میری تو عدیل کے ساتھ صرف دوستی ہے۔" فریال بمشکل کہہ پائی تھی ورنہ تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"ارے یہ کیا کہہ رہی ہو' دوستی ہے...... لڑکوں سے دوستی کا مطلب صرف ایک ہی ہوتا ہے" دوسری بہنیں منہ پر دوپٹا رکھ کر لگیں کھی کھی کرنے۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ سب...... تم جانتے ہوئے انجان بن رہی ہو یا ہمیں بے وقوف بنا رہی ہو۔" عدیل

کی اماں نے اس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا دیا۔

''سنو......! دوستی...... محبت...... اور عشق! یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میں نے کہا ہے ناں ک عدیل کے ساتھ گھومو پھرو، عیش کرو مگر شادی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی بھی چار بہنیں ہیں، ان ک شادیاں ہوں گی تب عدیل کا نمبر آئے گا۔''

''اور جب تک تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔'' اس کی چاروں بہنیں ایک دوسرے کو ٹہوکا دیتے ہوئے ہنسنے لگیں۔

''ارے آپ لوگ کیا بے کار کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ چائے پلائیں اس کو، یہ آج پہلی دفعہ ہمارے گھر آ ہے۔''

''عدیل بھیا! تم باز ا رہے ٹھنڈی بوتل پکڑ لو...... اس موسم میں باورچی خانے میں کون گھسے گا'' چھوٹی بہ تڑخ کر بولی۔

''فریال! آؤ میرے کمرے میں آ جاؤ، یہ لوگ تو ایسی ہی ہیں'' عدیل یکدم کھسیا سا گیا تھا۔

''ہاں ہاں جاؤ۔ اچھی اچھی باتیں کرو، ہمیں باتیں کرنی کہاں آتی ہیں؟'' اماں کو آنکھ مارتے ہوئے بڑ بہن تمسخر سے بولی۔

''میں چلتی ہوں عدیل!'' وہ روہانسی سی ہو گئی۔

''ارے ابھی تو آئی ہو، کچھ دیر تو بیٹھو۔ اتنی جلدی تو ہرگز نہیں جانے دوں گا۔''

''میری تو طبیعت سی خراب ہو رہی ہے اور سر الگ گھوم رہا ہے۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں عدیل سے بولی۔

ایسی باتیں اس نے اپنی زندگی میں بھلا کہاں سنی تھیں۔

''اے لو...... یہ تو ایسے شرما رہی ہیں جیسے کہیں شرفاء سے ان کا تعلق ہو۔'' ایک بہن نے دوسری بہن کے کہن مارتے ہوئے قصداً زور سے کہا۔

''جی......!'' وہ قعر ذلت میں جیسے گری جا رہی تھی۔

''جی کی بچی! ایک جوان لڑکے کے ساتھ بائیک پر اس سے لپٹی چمٹی تو تم یہاں تک آئی ہو۔ تو پھر یہ ادا کیسی دکھا رہی ہو؟'' عدیل کی بڑی بہن قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں۔

''آپ لوگ شاید مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم، غلط کو غلط ہی تو سمجھیں گے۔''

''عدیل! میں جا رہی ہوں'' وہ تیزی سے باہر نکلتے ہوئے بولی اور سب بہنوں نے ایک مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ان کی آوازیں اس کے کانوں میں ایک لاوا سا ڈال رہی تھیں۔

''فریال رکو......'' عدیل اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔

''پلیز! میں اس وقت گھر جاؤں گی۔''

''ناراض ہو کر جا رہی ہو ناں! میں تمہیں اسی وجہ سے اپنے گھر نہیں لانا چاہتا تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول عجیب دقیانوسی سا ہے۔ میں جانتا تھا کہ تم یہاں آ کر پریشان ہو جاؤ گی۔''

''عدیل! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی......'' اور بقیہ جملے اس کے گلے میں جیسے پھنس کر رہ گئے۔

''فریال پلیز! مجھے معاف کر دو۔ میری چاروں بہنیں نری جاہل ہیں۔ وہ جان ہی نہیں سکتیں کہ تم میر لیے کیا ہو۔'' عدیل اس کے سامنے کھڑے ہو کر گڑگڑا رہا تھا۔

''حسینہ مان جائے گی'' عدیل کی گلی کا کوئی لڑکا ان دونوں کو یوں باتیں کرتے دیکھ کر پاس سے کہتا ہوا گزرا۔

تب وہ بھاگنے کے انداز میں سڑک تک آئی، رکشا کو ہاتھ دیا اور بے دم ہو کر اس میں گر گئی۔ اور پھر بہت سارے دن گزر گئے، اسے ایک چپ سی لگ گئی۔ اپنا موبائل اس نے مسلسل آف کر رکھا تھا۔ کالج جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کسی سہیلی سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

نگین، جو اس کی گہری سہیلی تھی، جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کر لیا کرتی تھی، اس کو بھی اس قیامت سے لاعلم رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فہمی کی مہندی میں بھی نہیں گئی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ مہندی کے بعد اس کا رشتہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ فہمی کی شادی فہد سے ہو گئی ہے۔ اس کا اپنا غم ہی اتنا بڑا تھا کہ وہ اس میں اپنے آپ کو چور چور پاتی تھی۔

سائرہ یہ بات اس سے کئی دفعہ پوچھ چکی تھی ''تمہارا منہ بڑا کیوں سوجا ہوا ہے، کوئی خاص بات؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''کیا عدیل سے تمہاری لڑائی ہو گئی ہے؟''

''نہیں۔''

''سمسٹر میں فیل ہو گئی ہو؟''

''نہیں۔''

''کسی کی کوئی بات بری لگی ہے؟''

''ہاں۔''

''کس کی......؟''

''عدیل کے گھر والوں کی۔''

''تو عدیل سے شکایت کر دیتیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں رہی۔''

''کیوں بھئی...... عدیل تو تمہارا بہت قریبی دوست ہے۔'' سائرہ نے ہنس کر کہا۔

''میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔''

''کیسے بھئی، اتنا بڑا فیصلہ کیونکر کر لیا؟''

''اس کے گھر والے بہت خراب ہیں۔ اجڈ، جاہل، گنوار، بدتمیز اور بیچ۔'' وہ ایک سانس میں کہتی چلی گئی۔

''کیا وہ بھی ایسا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو اس کا اس میں کیا قصور......؟''

''میں اس کے گھر والوں کے ساتھ نہیں رہ پاؤں گی۔''

''اکیلے گھر میں رہ لینا۔''

''ایسا وہ نہیں کر سکے گا، اس پر بہت ذمے داریاں ہیں۔''

''سوچ لو، محبت کرنے والے مشکل سے ہی ملتے ہیں۔''

''سوچ لیا، میں کانٹوں بھرا گلاب نہیں لے سکتی۔''

"شاید ہم دونوں بہنوں کی قسمت خراب ہے، میں شادی کے بعد نہیں بس سکی اور تم محبت کے سفر میں ہی حراساں ہو گئیں......" سائرہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"عدیل بہت اچھا ہے......مگر......" وہ سوچ کر ہی لرز گئی۔

"اگر مگر چھوڑو......" سائرہ باجی نے سمجھانا چاہا۔

"میں نے تو سب کچھ ہی چھوڑ دیا" وہ آب دیدہ سی ہو گئی۔

بے عزتی اور غم جب ہم وزن ہو جائیں تو دل کو کسی صورت قرار نہیں آتا اور اپنا آپ اپنی نظروں میں گر سا جاتا ہے۔

ان دنوں وہ اپنے کمرے میں یوں چھپ رہی تھی جیسے سب سے پردہ کر رہی ہو۔ کھانا کھاتی تو حلق میں نوالہ پھنستا۔ (خوب گھومو پھرو، عیش کرو مگر شادی نہیں کرنا۔) اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگتے۔ پانی پیتی تو اچھو سا لگ جاتا۔ (ٹھیک کہہ رہی ہو تم، غلط کو غلط ہی سمجھیں گے) زہریلی آوازیں اسے ڈسنے لگتیں۔

اس کی رنگت ہلدی سی ہو گئی۔ مسلسل جاگنے اور کثرت گریہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے سے پڑ گئے۔

"کیا ہو گیا فریال تجھے......؟" امی اسے دیکھ کر پریشان سی ہو رہی تھیں۔

"میرے سر میں سخت درد ہے، کسی کل چین نہیں آ رہا۔"

"ڈاکٹر کے چل میرے ساتھ۔"

"پین کلرز ہیں میرے پاس مگر افاقہ ہی نہیں ہو رہا۔"

"آ......میں تیرے سر میں تیل ڈال دوں۔ بال دیکھو کیسے روکھے روکھے سے ہو رہے ہیں، جب سر میں خشکی بڑھے گی تو درد تو ہو گا ہی۔" ایک دن امی نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کے سر میں تیل لگانا شروع کیا۔ وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے دھیمے دھیمے مالش کر رہی تھیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے غنودگی سی تو ضرور آ جاتی مگر وہ آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ چین کی کوئی کلی اس کے دل میں نہیں کھل رہی تھی۔

وہ سب کتنی عجیب و غریب سی تھیں۔ ان کا انداز گفتگو کس قدر عامیانہ تھا۔ وہ جتنا سوچتی، اتنی ہی پریشان ہو جاتی۔

☆☆☆

موسم عشق کی آہٹ سے ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں، دن دیوانے ہو جاتے ہیں

فرح اس کے حواسوں پر چھا کر رہ گئی تھی۔ شجاع اپنی آنکھیں بند کرتا اور وہ چھم سے آ جاتی۔ محبت آدمی کو کتنا بے بس کر دیتی ہے، بے قراری سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ یہی کچھ شجاع کے ساتھ ہو رہا تھا فرح کے سوا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

شجاع کا دل یہی چاہتا کہ وہ اسی کے بارے میں سوچتا رہے یا ہمہ وقت اسی کا تذکرہ ہوتا رہے۔ فرحت آ تو وہ بہن سے فرح کے گھرانے کی باتیں ہی کیے جاتا۔

"شجاع بھائی! آپ پریشان نہ ہوں، ہم آپ کا رشتہ دیں گے تو وہ کھٹ سے قبول کر لیں گے۔ اس کے میٹرک کے امتحان ہونے والے ہیں، اگر ابھی سے رشتہ دے دیا تو اس کے رزلٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔"

"اگر اس بیچ کہیں اور سے رشتہ آ گیا اور اس کے گھر والوں نے قبول کر لیا تو میں تو مارا جاؤں گا ناں۔" وہ صبری سے بولا۔

"فرحت، تو جا کر بھائی کا رشتہ دے آ، وہ فیل ہوتی ہے تو ہو جائے، یوں بھی میٹرک کر کے وہ اسپتال کی ڈاکٹر ڈی بن جائے گی۔" عظمت بیگم اپنے بیٹے کی بے کلی کو محسوس کر رہی تھیں۔

"چلو رشتہ نہ دو مگر اس کے والدین کے کانوں میں بات تو ڈال سکتے ہو کہ ہمارا ارادہ ہے، ہم فرح کے لیے اپ کے گھر آئیں گے" شجاع بڑی بہن کو کسی پروفیسر کے سے انداز میں سمجھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں جا کر کہہ دوں گی۔"

"پھر ہمیں کب آ کر بتاؤ گی؟" شجاع نے پوچھا۔

"اگلے ہفتے جب گھر آؤں گی تب بتا دوں گی۔"

"ہفتے سے پہلے کیا چکر نہیں لگے گا؟" وہ بولا۔

"تو جا کر خود پوچھ آنا بہن سے" عظمت کو بیٹے کی جلد بازی پر ہنسی آنے لگی۔

اور پھر شجاع کی اگلے دن عید سی ہو گئی۔ فرح اپنی بہن کے ساتھ ان کے پڑوس میں آئی تھی، وہاں سے وہ دونوں شجاع کے گھر بھی آ گئی تھیں۔

دروازہ شجاع نے ہی کھولا......اور فرح کو دیکھ کر وہ تو مبہوت سا ہو گیا تھا۔ شاکنگ پنک سوٹ پر کالے ریشم ے آڑی آڑی سی بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی سی آنکھوں میں سرمے کی باریک سی تحریر تھی۔ لمبے بالوں کی لی اس کے سینے پر پڑی تھی۔

"کیا آپ ہمیں اندر نہیں آنے دیں گے؟" اس کو یوں اپنی طرف وارفتگی سے دیکھتے ہوئے پا کر وہ اترا کر لی۔

"ارے آیئے ناں پلیز!" وہ خجل سا ہو کر ہٹ گیا۔

"ارے میری فرح بیٹی آئی ہے؟" عظمت نے اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"ہم آپ کے پڑوس میں آئے تھے، سوچا کہ یہاں تک آئے ہیں تو آپ سے بھی ملتے چلیں" فرح کی بڑی ہن کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا! تم لوگ ہمارے پڑوس میں بے شک نہ آؤ مگر میرے پاس ضرور آیا کرو۔ یہ فرح تو مجھے اپنی بیٹی جیسی گتی ہے" عظمت مارے لاڈ کے اس کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر بیٹھ گئیں۔ فرح شرما سی گئی۔

فرحت نے شجاع کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "چائے کے ساتھ کچھ چیز لے آؤ۔"

"کیا لاؤں......؟" وہ سرشاری سے بولا۔

"جو تمہارا دل چاہے لے آؤ۔"

"مٹھائی کی ساری دکان اٹھا لاؤں؟" وہ خوشی سے لبریز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"لے آؤ بھائی!" فرحت نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ ایک ایک چیز فرح اور اس کی بہن کو بصد اصرار کھلا رہا تھا۔ ٹھائی کی مختلف اقسام سے بھری ہوئی ٹیبل کو فرح کی بہن سرشاری سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جس ارادے سے ائی تھیں، وہ انہیں از خود پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''خالہ جی! آپ سب لوگ ہمارے گھر ضرور آیئے گا'' چلتے سے فرح کی بہن بطور خاص کہہ رہی تھیں۔

''بہت جلد آؤں گی' میری بیٹی فرح میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو لے...... انشاءاللہ مٹھائی لے کر آؤں گی۔''

''امی! مٹھائی تو امتحان پاس ہونے کے بعد دی جاتی ہے' آپ امتحان ہونے کے بعد ہی مٹھائی لے جائیں گی؟'' شجاع نے متبسم لہجے میں کہا' اس کا بس ہی نہیں چل رہا تھا کہ اصل بات سب کو بتا دے۔

''وہ اس لیے پتر......! کہ مجھے پتا ہے میری بیٹی نے پاس ہی ہونا ہے۔''

''اگر فیل ہونے والے پرچے کر دیے تو......؟'' شجاع خواہ مخواہ بات کو طول دے رہا تھا۔

''میری دعاؤں سے وہ تب بھی پاس ہو جائے گی۔ تب فرح نے خمار بھری نظروں سے شجاع کو دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ اب کیا کہتے ہو۔ اور شجاع نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

''اب تو ہم کہتے ہی رہیں گے اور تمہیں سننا ہی ہوگا۔''

''ہاں' میں تمہاری محبت بھری باتیں ہر پل سنوں گی......'' وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بولی۔

تب شجاع کے دل میں ڈھیر ساری طمانیت کا احساس جاگزیں ہو گیا۔

☆☆☆

ناصرہ کسی دوسرے شہر سے تبادلہ کروا کے اس کالج میں آئی تھی۔ بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ پڑھائی میں اچھی اور دوستانہ مزاج کی حامل مگر یہ اس کی طبیعت کی حلیمی تھی کہ اس کے حلقۂ احباب میں سہیلیاں معمولی گھرانوں کی تھیں۔ رضیہ کے پیر میں لنگ تھا۔ ناصرہ نے اس سے بڑھ کر دوستی کی۔ ساجدہ کی رنگت بے حد سیاہ تھی اور نقوش بھی بے حد معمولی تھے' اس پر اس کا مزاج بھی آتشیں...... ناصرہ نے اس کو بڑی محبت سے اپنے گروپ میں شامل کیا بلکہ اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

کالج کی چھٹی ہوتی تو وہ اپنی بڑی سی سیاہ مرسیڈیز میں اپنی تمام سہیلیوں کو اس میں بھر لیتی اور سب کو ان کے گھروں پر چھوڑتی۔

''یہ ناصرہ اپنی جیسی خوبصورت لڑکیوں کو اپنی دوست کیوں نہیں بناتی؟'' ثمرہ نے نگین سے کہا۔

''تاکہ اس کی راجدھانی قائم رہے۔ وہ سب اس سے اتنی متاثر ہیں' اسے کالج آئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا، ہر طرف ناصرہ کی واہ واہ ہو رہی ہے'' روبینہ نے جل کر کہا۔

روبینہ نے خود آگے بڑھ کر ناصرہ سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناصرہ نے اسے صرف ہیلو ہائے تک رکھا تھا۔

''تم پولیس آفیسر کی بہن اس سے دب کر جو نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ سب تو ناصرہ کے گیت اجتماعی طور پر گاتی ہیں۔'' نگین نے ہنس کر کہا۔

ناصرہ چونکہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اس کی نوازشیں بڑھنے لگیں' جن کی دھوم دوسرے کالجوں تک بھی پہنچنے لگی۔

ناصرہ نے کسی لڑکی کو گرمیوں کے چار سوٹ گفٹ کیے۔

ناصرہ نے کسی کو میک اپ کا سامان دیا۔

ناصرہ نے کسی کی فیس دی۔

اور پھر یہ خبر بڑے زور شور سے سنی گئی۔

کالج کی دس غریب لڑکیوں کے گھر ناصرہ نے ماہانہ راشن ڈلوانا شروع کر دیا۔ (اس کی جتنی بھی واہ واہ ہوتی' وہ لم تھی۔ کالج کی غریب لڑکیاں اس کے آنے سے پہلے گیٹ پر کھڑی رہتیں)

''امیر بندہ ہو تو ایسا ہو جس سے کسی کو فیض بھی پہنچے'' کالج کی لڑکیاں کھلے عام تبصرہ کرتیں۔ سب کا خیال تھا کہ اگر وہ الیکشن میں کھڑی ہو جائے تو بلا مقابلہ یونین کی صدر بھی بن سکتی ہے۔

کالج کی پروفیسرز ناصرہ کی عزت کرنے لگیں۔ کالج کے چپراسی اس کا ایسا خیال رکھتے جیسے وہ کالج کی کوئی پروفیسر ہو۔

مگر نہ جانے کیا بات تھی' نگین کو ناصرہ اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے یہ بات ثمرہ سے بھی کہی۔

''وہ تمہاری طرح خوبصورت ہے اور کالج میں تم سے زیادہ مقبول ہے' یہ بات تم سے ہضم نہیں ہو رہی ہوگی'' ثمرہ بے اختیار ہنس پڑی ''تمہارے ابا جی کی بھی تو دکان ہے' تم نے تو کبھی اپنی سہیلیوں میں پرفیوم کی بوتلیں یا گھی کے ڈبے نہیں بانٹے۔''

''یہ بزنس ابا جی کا ہے' اس میں میرا کیا سروکار۔'' نگین نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ تمہارے ابا جی کی صرف ایک دکان ہے۔ گاڑی بھی پرانے ماڈل کی ہے۔ ناصرہ کا باپ شاید بہت بڑا بزنس مین ہوگا۔ پیسے کی یقیناً بہتات ہوگی۔ جب ہی آئے دن وہ کبھی کسی گاڑی میں آتی ہے اور کبھی کسی گاڑی میں' جو ساری کی ساری اسی سال کے ماڈل کی ہیں۔'' ثمرہ نے اس کے بارے میں پوری رپورٹ پیش کر دی۔

''ہوگی لاٹ صاحب کی بچی! مگر جانے کیوں مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

ناصرہ کا طوطی نہ جانے کب تک بجتا رہتا مگر اس کا ڈراپ سین بہت جلد ہو گیا۔ کسی نئی لڑکی کو ناصرہ نے اپنے گروپ میں شامل کیا تھا' اس کے گھر راشن بھی ڈلوانا شروع کر دیا تھا اور اس لڑکی کو بوتیک کے ایک دو جوڑے بھی گفٹ کر دیے تھے۔

ایک دن کالج سے چھٹی پر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تو اگلے دن آ کر اس نے پورے کالج میں ناصرہ کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

''ناصرہ ہمیشہ ان لڑکیوں کو اپنی دوست بنایا کرتی تھی جو احساس کمتری کا شکار ہوتی تھیں' جو پیسے کے ساتھ ساتھ شکل و صورت میں بھی بے حد معمولی ہوتی تھیں۔ وہ ان لڑکیوں کو یہ باور کراتی کہ خوشیوں پر تمہارا بھی حصہ ہے۔ تمہاری شکل و صورت اس قابل نہیں ہے کہ کبھی تمہاری شادی ہو سکے۔ آؤ میں تمہیں ان راہوں تک لے جاؤں...... جہاں جا کر تم اس معمولی جسم سے بھی بہت سی دولت اکٹھی کر سکتی ہو۔

بے وقوف لڑکیاں اس کی باتوں میں آ کر بہ آسانی کال گرلز بن رہی تھیں اور ناصرہ ان پر کمیشن حاصل کر رہی تھی۔ نت نئی گاڑیاں اور چڑیوں کو شکار کے لیے دانہ اس کا گروپ مہیا کر رہا تھا جنہوں نے اس ٹائپ کی لڑکیوں کو تعلیمی اداروں میں داخل کیا تھا۔ (ایسے گروپس معصوم سی بچیوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں' یہ حقیقت ہے)

''یہ سب بکواس کر رہی ہے'' پہلے دن جب یہ صورت حال کھلی تو وہ پیلی سی پڑ گئی تھی مگر صائمہ اور دیگر دو لڑکیاں بھی اس کے خلاف صف آرا ہو گئیں جو اپنا گوہر آبدار لٹا آئی تھیں اور جنہیں تاسف کے لیے کوئی کونا بھی نہیں مل پا رہا تھا۔ تب اگلے دن سے وہ کالج سے از خود غائب ہو گئی۔

”یہ ناصرہ کالج کیوں نہیں آ رہی......؟“ ثمرہ نے نگین سے پوچھا۔

”شاید کسی دوسرے شہر میں چلی گئی ہو۔ کلرک بتا رہا تھا' اس کے تمام کاغذات جعلی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا ایڈریس تک غلط تھا اور جب اس نام کی مزید چیکنگ کی گئی تو اس کی میٹرک کی سند تک جعلی نکلی۔ وہ تو سرتاپا فراڈ تھی۔“

”کیسی کیسی چڑیلیں...... بھیس بدل کر معصوم بچیوں کا خون پیا کرتی ہیں۔ اللہ سب کو اپنی حفظ میں رکھے۔“ ثمرہ لرزتے لبوں سے کہہ رہی تھی۔

اور نگین سوچ رہی تھی کہ میری چھٹی حس نے مجھے ناصرہ سے دور رکھا...... کہ اسے پہلے دن سے ہی ناصرہ کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔

☆☆☆

عدیل کے سامنے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسائے خاموش بیٹھی تھی۔

عدیل اسے مسلسل سمجھا رہا تھا مگر وہ خاموش سی ایک ٹک اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

آج وہ پچیس دن کے بعد کالج آئی تھی۔ کالج کی چھٹی کے بعد وہ سیدھی گھر جانا چاہتی تھی مگر عدیل بائیک لے کر سامنے آ گیا۔

”تم چلو' میں آتی ہوں......“ اس کے گھر والوں کے جملوں کی تپش دل و دماغ کو ہنوز بھسم کیے دے رہی تھی۔

”پکا وعدہ ہے ناں!“ اسے یہ گمان گزرا کہ شاید وہ وہاں نہ آئے۔

”میں آ رہی ہوں......“ اور پھر کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے تھی مگر خاموش اور غم زدہ سی۔

”اب تم چاہو کہ میں اپنی ماں اور بہنوں کو گولی مار دوں تو میں یہ کام نہیں کر سکتا کہ بہرحال میں ان کا بیٹا ہوں اور ان کا بھائی ہوں' جیسی بھی ہیں' وہ میری بہنیں ہیں۔“

”یہ میں نے کب کہا ہے؟“

”مگر تمہاری ناراضگی ختم ہونے کا نام کب لے رہی ہے۔“

”میں تو بس یہی کہنے آئی ہوں کہ شاید ہماری دوستی کا سفر یہیں تک تھا“ فریال نے کہا۔

”مجھ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”صرف تم پر بھروسا کرنے سے راہ کی کٹھنائیاں کم تو نہیں ہو سکتیں۔“

”تم اپنے اندر ہمت پیدا کرو۔“

”وہ مجھ میں نہیں رہی۔“

”پھر کیا کرو گی...... میرے بغیر رہ سکو گی تم؟ یہ تو سوچو......“ عدیل ایک جذب کے عالم میں اس سے کہہ رہا تھا۔

”محبت میں انسان کو کچھ ملے یا نہیں ملے۔ سیکڑوں غم اور آنسو ضرور مل جاتے ہیں۔ یہ دیوانی محبت انسان کو یہ سوغاتیں ضرور دیا کرتی ہے۔ اور اس کے بعد انسان کہیں کا بھی نہیں رہ جاتا اس لیے تمہارے بجائے یہ سوغاتیں میرے پاس رہ جائیں گی اور ان ہی کے ساتھ میری زندگی بھی بسر ہو جائے گی۔“

”مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ذہن بیمار ہے' جب ہی ایسی باتیں تمہارے دماغ میں آ رہی ہیں۔ ہماری محبت کوئی

غبارہ تو نہیں تھی' جس کی ہوا نکل جانے سے وہ پھس ہو گئی ہے۔“

”عدیل! محبت میں عزت کی شرط پہلے ہوتی ہے اور جہاں عزت نہ ہو' وہاں سے محبت بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا' جن سے ہم محبت کریں' انہیں ہم ذلیل بھی کریں اور جہاں ذلت سر اٹھائے کھڑی ہو' وہاں محبت کی پرچھائیں بھی نہیں ہوتی۔“

”مجھے نہ فلسفہ آتا ہے اور نہ ہی موٹی موٹی باتیں۔ سیدھا سادا بندہ ہوں اور تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں سمجھانے کے لیے میرے پاس کوئی ایسا کلیہ نہیں ہے جس سے تمہارے دل کی دنیا روشن ہو سکے۔“

”ٹھیک ہے' میں چلتی ہوں۔“

”جاؤ...... مگر یہ سوچ لینا کہ میں تمہیں پکاروں گا...... اور تمہارے دل میں میری محبت کی کوئی نہ کوئی رمق ایسی ضرور ہو گی...... جو تم میری جانب دوڑی چلی آؤ گی۔ یاد رکھنا' ایسا ضرور ہو گا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ ایسی کوئی بات ہو گی مگر اب نہ تم مجھے خط لکھنا اور نہ ہی مجھ سے ملنے کے لیے کالج کے گیٹ پر کھڑے ہونا۔“

”ٹھیک ہے' میں جا رہا ہوں...... مگر ہم جلد ملیں گے۔ اس وقت تک کے لیے خدا حافظ۔“

عدیل اس کے سامنے سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے اس طرح جانے پر اس کا دل مزید دکھ سے بھر گیا۔ اسے جانا ہی تھا تو مجھ سے ملا کیوں تھا۔

اور فریال کے خاموش سے آنسو اس کے رخساروں کو بھگونے لگے اور یادیں سر اٹھانے لگیں۔

بعض فیصلے جبری ہوتے ہیں اور آج ایسا ہی فیصلہ فریال نے بھی کر لیا تھا کہ اب وہ عدیل سے کبھی نہیں ملے گی۔

کتنی ہی دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید اس کے پیروں میں سکت نہیں رہی کہ وہ چل سکیں۔ کتنا وقت ضائع ہوا میرا دماغ کہہ رہا تھا۔

”مس صاحب! آپ کے لیے کچھ اور لاؤں؟“ ویٹر متبسم چہرے اور لہجے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں' کچھ نہیں۔“

وہ ابھی بھی یونہی بیٹھی تھی۔ خالی الذہن سی۔ کیفے میں لڑکے اور لڑکیوں کی آمد بڑھ رہی تھی۔ گرلز کالجز کے قریب یہ کیفے ملن سینٹر بھی تھا۔ محبت کے متوالے اس کے کیبنز میں آ کر ملاقات کیا کرتے تھے۔ اب کچھ لوگ لڑے تھے۔ ان کے بیٹھنے کے لیے تمام کیبن فل ہو گئے تھے۔ انتظار ہو رہا تھا کہ کوئی اٹھے تو ہم جا بیٹھیں۔

”مس صاحب! کیا آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟“ ویٹر نے آ کر پھر پوچھا۔

”نہیں......“ اور پھر چونک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کو اٹھتا دیکھ کر کئی جوڑے اندر آنے کو لپکے مگر وہ کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

لڑکے لڑکیوں کے سرگوشیانہ لہجے اور قہقہے اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے مگر اس کے اندر کا شور کچھ سننے نہیں دے رہا تھا۔ اور پھر وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح باہر نکل آئی۔

☆☆☆

محبت میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش نہیں ہوا کرتی ہے۔ ایسے میں دن اور رات کا امتیاز بھی ختم ہو جاتا ہے۔

نگین جو اول شب سو جانے کی عادی تھی، اس وقت رات گئے وہ فون پر زبور سے باتوں میں محو تھی۔

وہ اس سے پوچھ رہا تھا ”اس وقت تم نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں؟

”ڈارک گرین، لیلنن کا سوٹ ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”اچھا، وہ...... جو ایک دفعہ تم کالج میں بھی پہن کر آئی تھیں۔ جس پر جامنی بیلیں بنی ہوئی ہیں، کرتے اسٹائل میں شرٹ ہے۔ جس پر تم نے جامنی خوبصورت سے بٹن بھی لگائے تھے، جس کی زنجیر زگ زیگ انداز کی تھی؟“

”ہاں وہی، مگر کالج میں تو بہت پہلے پہنا تھا...... وہ بھی شاید صرف ایک مرتبہ ہی۔“

”مگر مجھے آج بھی یاد ہے...... جب تم کالج سے نکلی تھیں تو تمہارے پیر کے نیچے اپنا دوپٹا آ گیا تھا اور تمہارا پیر مڑتے مڑتے بچا تھا مگر پھر بھی تمہاری سینڈل کا اسٹرپ نکل گیا تھا۔“

”بڑی اچھی یادداشت ہے تمہاری......!“ وہ ہنسی۔

”ہاں، یہ تو ہے مگر اس کی ایک خاص الخاص وجہ ہے!“

”وہ کیا؟“

”محبت کرنے والوں کے دل روشنی سے جھرمر جھرمر کرتے ہیں اس لیے اس روشنی میں محبت کرنے والے کی ہر چیز آ کر فٹ ہوتی چلی جاتی ہے۔ بلکہ جم سی جاتی ہے آنکھوں میں۔“

”اچھا...... یہ یادداشت کا تعلق دل سے کب سے ہونے لگا؟“ وہ ہنستی چلی گئی۔

”دل ہی تو سب کچھ ہے۔ یہ نہ رہے تو دماغ بھی بے کار ہے، اور نفرت کرنے والوں کے دلوں میں گھپ اندھیرا رہتا ہے اس لیے ان کی یادداشت بھی بے حد خراب ہوتی ہے“ اس کا لہجہ وثوق بھرا تھا۔

”یہ آپ کو کیسے پتا چلا؟ کیا یہ کسی دانشور کی تحقیق ہے؟“

”یہ میری اپنی ذاتی تحقیق ہے“ وہ ہنس کر بولا تو ایک آسودہ سی مسکراہٹ نگین کے لبوں پر بھی پھیل گئی۔

”نگین، تم میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہیں؟“

”ایسا کبھی ہو سکتا ہے کیا۔“ ناز سے کہا گیا۔

”نہیں......“ اس کا لہجہ بھی زعم بھرا تھا۔

”تو پھر ایسی بات کیوں کی؟“ نگین کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔

”تم چپ جو ہو گئی تھیں۔“

”زبور، مجھے تمہاری باتیں سننا اچھا لگتا ہے، جب میں اکیلی بیٹھی ہوتی ہوں تب بھی مجھے تمہاری آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ میں تمہارے جملے بعد میں بھی کشید کرتی رہتی ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، اس وقت اپنے بیڈ پر بیٹھی ہو یا نیچے کارپٹ پر صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی ہو۔“

”میں اس وقت اپنے بیڈ پر آرام سے پیر پھیلائے بیٹھی ہوں۔ کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا ہے اور میں چاند کو بھی دیکھ رہی ہوں اور دوسرے چاند کی باتیں کانوں میں فسوں پھونک رہی ہیں۔“

”ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں یا اتار دی ہیں؟“

”اتنی پیاری چوڑیاں تم نے دی ہیں، میں نے آتے ہی اتار دیں۔ یوں بھی میں چوڑیاں کہیں جانے میں ہی پہنتی ہوں۔“

”تمہارے بال بندھے ہوئے ہیں یا کھلے ہوئے؟“

”کھلے ہوئے ہیں، بندھے ہوئے بالوں میں نیند ہی نہیں آتی۔“

”تمہارے بالوں کا آبشار پشت پر پھیلا ہوا ہے یا چہرے پر بھی لپک لپک کر آ رہا ہے؟“

”زبور کوئی اور بات کرو ناں......“ وہ جھنجلا سی گئی۔

”میں اپنا تصوراتی حصار بنا رہا ہوں...... تم کہتی جا رہی ہو اور میرے سامنے ایک فلم سی چل رہی ہے۔ نگین، تم مجھے صاف دکھائی دے رہی ہو۔ بستر پر پیر پھیلائے، بال کھولے جس طرح مجھ سے باتیں کر رہی ہو، یہ میری اپنی پرسنل فلم ہے۔ جسے صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں“ اس کا لہجہ بھی خمار آلود سا تھا۔

”مت دیکھا کرو اتنی فلمیں......“ وہ تو قلی سے ہنسی۔

”جانو، یہ بات تم مجھ سے کیسے کہہ رہی ہو؟“ وہ جرح پر اتر آیا۔

”بھئی مذاق کر رہی ہوں۔ تم تو ہر بات ہی اپنے دل پہ لے لیتے ہو۔“

”پھر دل رکھنا بھی تو سیکھو میرا“ وہ شوخ سے لہجے میں بولا۔

”تو سنو...... اب پرسوں کے بجائے میں کل تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں...... ہے ناں خوشی کی خبر کہ کل میں تمہارے ساتھ گھوموں گی۔“

”بھئی پرسوں کا کینسل مت کرو اور کل بھی چلو...... خوشی تو یہ ہوئی، تمہیں روز دیکھنے کو ملے۔“

”پرسوں صبح ابا جی حیدر آباد سے آ جائیں گے۔“

”اللہ کا شکر، تمہارے ابا جی نے کراچی سے قدم تو باہر نکالا...... ورنہ ان کا خوف تلوار کی طرح تمہارے سر پر سوار رہتا ہے۔“

”آج شام ہی تو وہ حیدر آباد گئے ہیں۔ جب ہی تو میں اتنی آزادی سے فون پر باتیں کر رہی ہوں۔“

”تو پھر باتیں کرو ناں......!“

”تم کہاں بیٹھے ہو اس وقت......؟“ اس نے اس کے ہی انداز میں پوچھا۔

”ڈائننگ ٹیبل پر، سخت بھوک لگ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ کھانا بھی کھا رہا ہوں، ہمارے کک نے آج میری پسند کی چوپسی اور چائنیز رائس بنائے ہیں۔“

”اچھا تو اس وقت آپ دو دو کام ایک ساتھ کر رہے ہیں؟ کھانا بھی کھا رہے ہیں اور مجھ سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔“

”دو نہیں بلکہ تین کام ایک ساتھ کر رہا ہوں“ وہ چہکا۔

”تین کیسے؟“

”ٹی وی بھی ساتھ ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میچ بھی آ رہا ہے۔ میچ دیکھنا اور کھیلنا مجھے ہمیشہ پسند رہا

ہے۔“

”تو پھر میری پرسنل فلم جو تم دیکھ رہے تھے‘ وہ کہاں گئی؟“

”اس وقت میچ میں چھکا تم نے ہی تو مارا ہے۔ میری فلم تمہیں اس وقت پچ پر لے آئی ہے اور تم آسٹریلیا کے خلاف کھیل رہی ہو۔“

”اف‘ ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ آج تو ساری رات باتوں میں کٹ گئی ہے۔“

”ایسا صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ آج آپ کے ابا جی جو گھر پر نہیں ہیں۔“

”ظاہر ہے‘ اب ابا جی کی گھر میں موجودگی میں‘ میں تم سے یوں باتیں کر سکتی ہوں؟“

”اے...... کیا تم اپنے ابا جی سے یہ نہیں کہہ سکتیں کہ روزانہ حیدرآباد چلے جایا کریں؟“ زیور نے شوخی سے کہا۔

”اچھا! میں کہوں گی ان سے؟ آج بھی ان کا موڈ نہیں ہو رہا تھا مگر ان کے دوست کا فون آیا تو جانے پر تیار ہوئے۔“

اور پھر اچانک ہی کال بیل کی آواز پر وہ چونک سی گئی۔ اس وقت گھر میں کون آیا ہے؟ ”اچھا زیور...... خدا حافظ......!“

ریسیور کریڈل پر رکھ کر جیسے ہی اس نے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا سوچا‘ ابا جی گھر میں داخل ہوتے ہی امی کو جھڑک رہے تھے۔

”ہر وقت ٹیلی فون انگیج رکھتی ہو۔ جاتے ہوئے گاڑی کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا‘ میں گھر میں فون کر رہا ہوں مگر مستقل انگیج...... ایک گھنٹے‘ دو گھنٹے‘ تین گھنٹے...... یہ تم گھنٹوں فون سے ہی لگی رہتی ہو۔ کوئی کام نہیں ہے تمہیں۔ آئے فون کا بل تو تم ہی بھرنا۔ پریشان ہو کر رہ گیا میں‘ محلے کے کمال صاحب نے لفٹ دی تو میں گھر پہنچ پایا ہوں۔“

”ارے‘ آج تو میں صبح سے فون کے قریب بھی نہیں پھٹکی...... نمی اور فہد تو لاہور گئے ہوئے ہیں‘ ان کا فون تک نہیں آیا۔“

”پھر اتنی لمبی کال کون کر رہا تھا؟“ وہ یہ کہہ کر چپ سے ہو گئے۔

اور نگین نے کتاب اپنے سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”ارے یہ تو پڑھتے پڑھتے ہی سو گئی ہے“ ابا جی اس کے کمرے کی لائٹ بند کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”بعض دفعہ لائن خراب بھی ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے فون نہیں مل رہا ہوگا“ امی کہہ رہی تھیں اور بستر پر لیٹی نگین یکدم کانپ سی گئی۔

اگر ابا جی کمرے میں یکدم آ جاتے اور اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیتے تو گھر میں قیامت آ جاتی تھی۔

تب وہ اگلے دن انتہائی سفاکی سے زیور سے کہہ رہی تھی۔ ”اب آپ رات کے وقت مجھے گھر پر فون نہیں کریں گے۔“

”تمہارا موبائل جو کھو گیا ہے‘ اس وجہ سے کیا تھا۔“

”پتا نہیں‘ میں کہاں رکھ کر بھول گئی ہوں۔“

”لو اس وقت تک تم میرا موبائل اپنے پاس رکھ لو مگر تم سے باتیں کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”امی نے پوچھ لیا کہ یہ کس کا موبائل ہے تو کیا کہوں گی؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”تم نے اپنی سہیلی سے چینج کیا ہے‘ یہ کہنا کیا بہت مشکل ہے؟“

”ٹھیک ہے‘ کہہ دوں گی۔“

☆☆☆

پہلے تو وہ چونکا پھر حیران ہوا! اور پھر سرشار سا ہو گیا۔

شجاع اپنی بہن فرحت کے گھر سے نکلا ہی تھا‘ ایک پیارا سا گول مٹول سا بچہ اسے ایک لفافہ دے کر بھاگ گیا۔

شجاع نے مڑ کر دیکھا‘ وہ پپو تھا‘ فرحت کے پڑوس کا شریر سا بچہ۔

اس وقت گلی بالکل سنسان سی تھی۔ ادھر ادھر بھی کوئی نہیں تھا۔

شاید یہ لفافہ وہ بچہ غلطی سے مجھے تھما گیا۔ پتا نہیں‘ کس کا خط ہوگا...... وہ عجیب ادھیڑ بن میں لگ گیا۔

مگر پپو تو مجھے جانتا تھا‘ یہ غلطی اس سے کیسے ہوئی...... اسے اچنبھا سا ہوا۔

لفافے کے اوپر کسی کا کوئی نام نہیں تھا‘ بس کونے میں ایک چھوٹا سا چاند بنا ہوا تھا۔ جیسے پہلی کا چاند ہو۔

اس نے لفافہ کھولا تو اس پر ایک نظر ڈال کر وہ مسکرا اٹھا۔ یہ فرح کی جانب سے اس کے لیے خط تھا‘ جو بنا القاب کے شروع کیا گیا تھا۔ یہ فرح کی محبت ہی تھی کہ وہ اسے خط لکھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”سنیے!

کیسے ہیں آپ؟

جب سے میں آپ کے گھر سے آئی ہوں‘ آپ کی تصویر میرے دل میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر وقت آپ ہی کا خیال میرے دل میں سمایا سا رہتا ہے۔ یہ کیا کر دیا آپ نے مجھے...... کہ آپ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔

پڑھنے بیٹھتی ہوں تو سب لفظ غائب ہو جاتے ہیں اور میری کتابوں پر آپ کی شبیہہ ابھر آتی ہے۔ کل امی نے مجھ سے کہا ”فرحت کتابیں پڑھنے کے بجائے اس میں کیا دیکھ رہی ہو‘ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا آنکھیں۔

یہ کتاب میں آنکھیں کہاں سے اگ آئیں؟

’امی‘ میری آنکھوں میں تکلیف ہو رہی ہے‘ میں نے کھسیا کر بات بدلی۔

’پھر کتاب کو کیوں گھورے چلی جا رہی ہو؟‘

یاد نہیں ہو رہا ناں!

تب امی بکتی جھکتی چلی گئیں...... اور آپ کی آنکھیں شرارت سے ہنسے چلی گئیں۔

سنیئے! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کل شام بھی میں کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی...... خیالوں ہی خیالوں میں آپ سے باتیں کر رہی تھی‘ باجی نے مجھ سے کہا اگر ٹی وی نہیں دیکھ رہیں تو بند کر دو۔ میں نے کہا‘ میں اس سے باتیں کر رہی ہوں۔

تب وہ ہنس کر بولیں‘ پاگل‘ ٹی وی سے بھی کوئی باتیں کرتا ہے۔‘

تب میں نے کھسیا کر کہا۔ اس کا پروگرام ہی اتنا دلچسپ تھا کہ میں بری طرح اس میں محو ہو گئی تھی۔

اس پر وہ ہنس کر بولیں' خبرنامے کو پسند کرنے والے اتنے زیادہ لوگ ہیں' یہ آج ہی پتا چلا۔'

سنیے! آپ مجھے بے حد شریر سے لگے' کیا آپ ہر دم ایسے ہی رہتے ہیں؟ شوخ و شگفتہ سے۔ اس دن آپ نے میری پلیٹ میں کتنی ساری مٹھائی ڈال دی تھی۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے برفی بہت پسند ہے؟

جب آپ میری پلیٹ میں لڈو ڈال رہے تھے تو میں نے کہا تھا' لڈو میں شوق سے نہیں کھاتی ہوں تو آپ نے دھیرے سے کہا تھا مگر میں بہت شوق سے کھاتا ہوں۔

اور آپ کی یہ بات میں نے اپنے پلو سے باندھ لی۔ مجھ سے تو کبھی ایک لڈو بھی نہیں کھایا جاتا مگر اس دن...... صرف آپ کی خوشنودی کے لیے وہ دونوں لڈو میں کھا گئی۔

'آپ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ آپ کو اچھا لگا تھا ناں! مگر بعد میں باجی نے میرا وہ مذاق اڑایا کہ بتا نہیں سکتی۔

سنیے' آپ کی امی مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ ایسی چاہنے والی ماں تو خوش نصیبوں کو ملا کرتی ہیں...... آپ دیکھیے گا کہ میں ان کا آپ سے بھی زیادہ خیال رکھوں گی۔ ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔

جب وہ مجھے پاس ہونے کی دعائیں دے رہی تھیں تو مجھے یوں لگا کہ زندگی کے تمام امتحانات میں' میں ہمیشہ پاس ہوتی چلی جاؤں گی...... چلیے آپ بھی آمین کہہ دیں......!

سنیے! آنکھیں تو ہمیشہ ہی سندیسہ دینے کا کام کرتی ہیں مگر یہ سندیسے چپکے چپکے دینے چاہئیں تاکہ کوئی دیکھ نہ لے مگر اس دن آپ تو سب کے سامنے ہی اپنی چاہت اور پسند کا اعلان کر رہے تھے۔

ہاں' میں سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ کی آنکھیں آپ کے دل کی باتوں کی کھلی کھلی ترجمانی کر رہی تھیں۔

سنیے! جب سے آپ کو دیکھا ہے...... اور جب سے آپ کے گھر سے ہو کر آئی ہوں' میں اپنے آپ کو بھول چکی ہوں۔

جاگوں تو آپ کا خیال!
سوؤں تو آپ کا خیال!
کھانے بیٹھوں تو آپ کی فکر۔
باہر نکلوں تو نظریں آپ کو ڈھونڈیں۔

اور جب آسمان کو دیکھتی ہوں...... تو سوچتی ہوں یہ چاند تو آسمان پر جگمگا رہا ہے اور میرا چاند میرے خیالوں میں جگمگا رہا ہے۔

آپ فرحت باجی کے گھر تو آتے رہتے ہیں، کبھی ہمارے گھر بھی آجایا کریں۔ کوئی آپ کو یاد کرتا ہے اور ہر وقت یاد کرتا ہے' یہی سوچ لیا کریں۔

آج بڑی ہمت کر کے پپو کے ہاتھ آپ کو خط بھیج رہی ہوں۔ ہاں' اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

فقط آپ کی اپنی فرح۔"

شجاع نے خط پڑھ کر اسے چوم لیا۔ اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔

میں تو دل ہی دل میں اس سے باتیں کرتا رہا اور اس نے اپنے دل کی باتیں خط میں لکھ کر مجھ تک پہنچا بھی دیں۔

وہ تو مجھ سے بھی آگے نکل گئی...... جو کام مجھے پہلے کرنا چاہیے تھا وہ اس نے کر دیا۔ اس نے خط پھر نکالا اور

اس شوق سے پڑھنے لگا جیسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہو اور مسکراہٹ مزید گہری ہوتی چلی گئی...... اور پھر وہ آپ ہی آپ ہنس پڑا۔

جھلی کہیں کی...... وہ بے اختیار کہہ گیا۔

☆☆☆

گھر آیا تو اپنی خوشی اس سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔

"فرحت کی ساس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت خراب ہے" اس نے اپنی مسکراہٹ پیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا' کسی کے بیمار ہونے پر خوش نہیں ہوا کرتے اور فرحت کی ساس بے چاری تو بڑی نیک عورت ہے" عظمت نے کہا۔

"نہیں' مجھے تو فرحت کے بچوں پر ہنسی آرہی تھی۔ ایسی شرارتیں کر رہے تھے۔" اس نے بات بنائی۔

"کیوں' کیا وہ آج اسکول نہیں گئے تھے؟"

"چھوٹا والا آج نہیں گیا تھا" شجاع نے کان کھجاتے ہوئے گڑبڑا کر کہا۔

"میں نے ارہر کی دال چاول پکائے ہیں' تم تو نہیں کھاؤ گے۔ ابھی کباب تل کر دیتی ہوں' پراٹھے کے ساتھ کھا لینا۔"

"نہیں امی! میں دال چاول کھا لوں گا۔ سب چیزیں کھانی چاہئیں۔" وہ دیگچی سے چاول لیتے ہوئے بولا۔

"شجاع' یہ بات تم کہہ رہے ہو؟" عظمت حیران تھیں۔ جس کی چڑ ہی ارہر کی دال تھی اور وہ اسے گھوڑوں کا کھاجا کہا کرتا تھا۔

"واہ...... مزہ آگیا آج تو......" کھانا کھا کر وہ وہیں پلنگ پر لیٹ گیا۔

"کوئی نئی خیر خبر......؟" عظمت کو تجسس سا ہوا۔

"ذاکر کے بیٹا ہونے والا ہے...... وہ بہت خوش ہے" اس نے از خود کہا۔ (دل خوش ہو تو صرف خوشی کی باتیں کرنے کو من چاہتا ہے)

"بڑی جھوٹی ہے اس کی ماں' ابھی پرسوں ہی تو میں نے پوچھا تھا اس سے کہ دادی کب بن رہی ہو؟ تو کہنے لگی' ابھی تو دور دور تک کوئی آثار نہیں ہیں۔ میرا تو دل ڈر رہا ہے' اس کی بڑی بہن کے بھی کوئی بچہ نہیں ہوا۔ خالہ نے بھی دو بلیاں پال رکھی ہیں' ممانی کا گھر بھی خالی ہے۔ وہ بھی طوطوں سے دل بہلاتی ہیں۔ تم ہی دعا کرو کہ میرے آنگن میں بچے کی چہکار گونجے' اب آئے گھر...... دیکھنا کیسی اس کی ٹانگ لیتی ہوں کہ ہر ایک کی کرید رکھتی ہو' کس کو چھینک آئی' کس کے درد ہوا ہے' سب معلوم ہے مگر اپنے گھر کا کچھ پتا نہیں۔ چالاک کہیں کی...... مجھے تو ہمیشہ سے بری لگتی ہے' ہاں......"

"ارے چھوڑیے امی! ہمیں کیا' ہمارا کیا تعلق۔ کوئی چھپائے یا دکھلائے' ہماری بلا سے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے ہی غلط سنا ہو' شاید وہ یہ کہہ رہا ہو کہ پہل کا میرا بیٹا ہو جائے تو اچھا ہے" شجاع نے اپنی بات خود ہی ہلکی کرنے کی کوشش کی۔

"ارے تو کیا تم بہرے ہو گئے ہو جو صحیح بات سنائی نہیں دیتی......" دلچسپ موضوع یکدم ختم ہو جانے پر انہیں مزہ نہیں آرہا تھا۔

’’پتا نہیں امی مجھے کیا ہو گیا ہے، سر میں سخت درد ہو رہا ہے‘‘ شجاع نے اپنی کنپٹیاں پکڑ کر دبائیں۔

’’لا...... میں سر دبا دوں، تو کہے تو تیل لگا دوں؟‘‘ عظمت پریشان سی ہو گئیں۔

’’اوہ، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، صرف نیند پوری نہیں ہوئی ہے میری۔‘‘

’’کیوں نہیں ہوئی؟‘‘ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھیں۔

’’رات دیر تک ماسٹر صاحب کے گھر کی شادی کی مووی بھی تو دیکھتا رہا تھا۔‘‘

’’اے لو...... تم نے پوری دیکھ لی؟‘‘

’’ہاں، جب دیکھنے بیٹھا تو پتا بھی نہیں چلا۔‘‘

اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ اس مووی میں سوائے فرح کے اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔

’’میں گرما گرم چائے بنا کر دیتی ہوں، انہیں کسی دم قرار نہیں آ رہا تھا۔

’’نہیں امی، نہ چائے نہ لسی...... میں دو چار گھنٹے سوؤں گا تو فریش ہو سکوں گا۔ کوئی بھی مجھے بلائے تو آپ مجھے جگائیے گا نہیں۔‘‘ شجاع اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا کہ اس کا دل کھلی آنکھوں سے سپنے دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔

’فرح، تم نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے...... اس نے اپنے آپ سے کہا۔

سنیے......!

سنیے......!

سنیے......!

اس کے کانوں میں ایک جلترنگ سا بجنے لگا۔

☆☆☆

صابرہ کی بھانجی رعنا ایک دن گزارنے کے لیے اپنی خالہ کے پاس آئی تو خالہ کی الماری سیٹ کی، ان کے کمرے کی ترتیب چینج کی۔ شوکیس کے سارے برتن باہر نکال کر پہلے دھوئے، پھر خشک کر کے اندر رکھے۔

شام کو جب بھائی اسے لینے آیا تو وہ کام کاج سے فارغ ہو کر نہا دھو کر بستر پر جو لیٹی تو سو گئی۔

’’خالہ انے سو گئی کیا، یہ تو خرخر کرتی بیٹھی اے۔ انوں سونے واسطے آئی تھی کیا......؟‘‘ بھائی ٹھٹھا مارتا ہوا بولا تو منور بھی ہنسنے لگا۔

’’اتے زور کو کائے کو باتاں کرتے جی‘‘ صابرہ اپنی ساڑھی کا پلو کمر میں اڑستے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ’’انے سو رئی نا، چپ، اٹھا کو بٹھا دیں گے ماں تم لوگاں۔‘‘

(وہ سو رہی ہے، تم لوگ اتنی زور سے باتیں مت کرو ورنہ آواز سے وہ اٹھ جائے گی)

’’بہت تھک گئی تھی جی باوا، اتا کوئی نہیں تھکتا ماں...... کیسی بے خبر ہو کو پڑ گئی۔‘‘

(وہ بہت تھک گئی تھی اس لیے گہری نیند میں سو رہی ہے)

’’پن اک ذرا سو کو اٹھیں گی نا تو بہوت ہی بہوت اچھی دکھیں گی‘‘ صابرہ چاہت بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔

’’ایو رعنا...... اٹھ کو بیٹھو ناں......‘‘ خالہ کے منع کرنے کے باوجود جنید نے بہن کو جگا دیا اور وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

’’سچ سچ بول دیو بھائی! آپ کاں سے آ رئے؟‘‘

’’آسماناں سے تو نئیں آ رئیے ماں...... کیا گھر نہیں چلتیوں‘‘ جنید نے بہن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

’’میں تو کھالہ کو پہلے ہی اچ بول دی تھی کہ آج ہی میرے کو گھر جانے کا ہے۔‘‘

’’منور ذرا دکان سے سیر بھر مٹھائی تو لے کو آ جا...... آج رانا آئی ہوئی ہے ناں، میں مارے خوشی کے کچھ بھی نہیں کری‘‘ صابرہ نے بیٹے سے کہا۔

’’آپ ابو سے کہہ دیتیں...... وہ بازار سے لے آتے پھل وغیرہ۔ وہ تو آج صبح سے ہی گھر میں ہیں۔‘‘

’’کتے دفعے بول دی میں، پرانوں کے کاناں جیسے پٹ ہیں۔ سوتے بیٹھے ہیں وہ آج صبو سے۔ اجاڑا نے مائی اتا سا کام اب تک کر کو نئیں دیے۔ کتے دفعے بولی میں آج، میٹھا اچھا سا پکالیں مگر وہ بی دوپہراں سے کپڑے دھوتی بیٹھی ہے۔ مائی کیا کر رئی اے......‘‘ صابرہ نے آواز دی۔

’’میں گھر جا رہی ہوں باجی جی! آج ڈھیروں ڈھیر لادی دھلوالی آپ نے۔ ٹانگوں میں درد ہو گیا ہے میرے۔ اب گھر جا کر لیٹوں گی۔ ہاں، میٹھا آپ خود پکا لینا۔ مجھے ویسے ہی دیر ہو گئی ہے۔‘‘ اس نے بڑا سا دوپٹا سینے سے ہٹا کر سر پر جمایا اور کھٹ کھٹ کرتی چلتی بنی۔

’’لیو، چلی گئی نواب زادی‘‘ صابرہ غصے سے بڑبڑائی۔

’’کھالہ! آپ ایسی نخراں والیاں کائے کو رکھتے، آپ بی نکال اچ باہر کریو‘‘ جنید نے کہا۔

’’ارے، یہاں بڑی مشکل ہے ان لوگاں کی۔ پورے علاقے کی عورتاں بیگم صاب بننے کی شوخین (شوقین) سوب مائیاں کو لگاتے کاماں کے واسطے، میں بولتیوں ایچ (ایک ہی) مل جائے سو غنیمت۔‘‘

’’کھالہ! آج تو جانے دیو، ہم پھر آئیں گے ناں، تو پھر ہر چیز کھائیں گے۔ اس وخت تو اندھارا (اندھیرا) ہو گیا ناں بول کے......‘‘ جنید نے رعنا کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور عین اسی وقت سائرہ ایک ڈونگے میں دہی بڑے، دوسرے میں فروٹ چاٹ اور تیسرے میں سوجی کا گرما گرم حلوہ لیے چلی آئی۔

’’بھابی! آپ تو آج صبح سے ہی رعنا کے ساتھ صفائی ستھرائی میں مصروف ہیں۔ شام کا یہ ناشتا میں نے بنا لیا۔‘‘

سائرہ نہا کر آئی تھی۔ اس کے بے حد لمبے بال اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے پلیٹ میں حلوہ جنید اور منور کو دیا۔

رعنا اس کے خوبصورت بالوں کو ستائش سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھی۔

’’کتے لمبے بالاں ہیں باپ......!‘‘

اور سائرہ شرما کر مسکرا دی اور رعنا کی پلیٹ میں نکالنے لگی۔ صابرہ کا چہرہ یہ سب دیکھ کر خوشی اور دلی مسرت ے کھل سا گیا۔

’’ایو رعنا...... دیکھو ناں...... تمہاری یہ سائرہ پھوپو کتی اچھی ہے ناں...... کتا پیار کرتی تم کو...... میرے کو وب مالوم آج یہ اسکول سے آ کر سوئے نہیں ہوئیں گے، ساری دوپہراں انوں تمہارے واسطے پکاتے بیٹھے ی ہو......‘‘ صابرہ اپنی نند کی تعریف کھلے دل سے کر رہی تھی۔

’’اللہ یہ تو بہوت مزے کا ہے‘‘ رعنا نے حلوے کا چمچہ منہ میں رکھتے ہوئے خالہ سے کہا۔

''جی ہو...... ہماری سائرہ کے ہاتھاں میں ذائخہ (ذائقہ) بہت اچ ہے ناں......اس لیے......''

صابرہ کی گردن فخر سے تن گئی کہ اس کے سسرال والے اس کے ساتھ کتنے اچھے ہیں۔

☆☆☆

نگین کے گھر کا فون کئی دن سے خراب تھا، ون ایٹ پر شکایات کرا کرا کے تھک گئے، کوئی شنوائی نہیں ہوئی، کسی نے بتایا اسلام آباد ڈائریکٹ کمپلین کرو، فون بارہ گھنٹے کے اندر ٹھیک ہو جاتا، بارہ کا پہاڑہ بھی پورا پڑھ لیا۔

فون کی گڑگڑاہٹ روز افزوں تھی، ہر طرح کا میوزک از خود سنائی دے رہا تھا۔

گھنٹی بجی، نگین نے ریسیور اٹھایا، آواز اتنی بھاری اور اجنبی سی تھی کہ وہ پہچان نہ سکی۔

''کون بول رہا ہے بھئی۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

لائن اچانک چند لمحوں کے لیے کلیئر ہوئی تو آواز صاف سنائی دی۔

''تو میرا نام نہ پوچھا کر
میں تیری ذات کا حصہ ہوں
میں تیری سوچ میں شامل ہوں
میں تیری نیند کا قصہ ہوں
میں تیرے خواب کا حاصل ہوں''

زبور جذبات سے بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اچھا، یہ آپ ہیں......'' وہ ہنس دی۔

''ہاں...... میں......'' فون کی گڑگڑاہٹ شروع ہو چکی تھی۔

''کیوں فون کیا؟'' اس نے چیخ کر پوچھا۔

''تم نے اپنا موبائل کیوں آف رکھا ہوا ہے۔'' زبور کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔

''گھر میں مہمان ہیں، اب میں ہر وقت تو منہ سے موبائل لگا کر نہیں پھر سکتی ناں۔''

''یار، تم تو اب بہت بور کرنے لگی ہو......''

''آواز نہیں آ رہی......زور سے بولو۔''

''کیا کہا، سنائی نہیں دے رہا۔''

''تم اپنا موبائل آن کرو، میں اس پر رنگ کرتا ہوں۔''

''او کے!'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس کے موبائل پر بیل ہوئی تو ابا جی نے پکارا ''نگین، دیکھو تمہارے موبائل کی آواز تمہارے کمرے سے آ رہی ہے۔''

نگین اندر لپکی۔ ''ہاں فریال، کہو کیا بات ہے؟'' وہ قدرے اونچی آواز میں بولی۔

''دماغ خراب ہے کیا، میرا فون، تمہیں فریال کا لگ رہا ہے۔''

''فریال اس وقت میں مصروف ہوں، گھر میں مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔ تم بعد میں بات نہیں کر سکتیں۔'' وہ قصداً بلند آواز میں بات کر رہی تھی۔

''کیا مطلع ابر آلود ہے؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں، بہت زیادہ!''

''اچھا، کب کروں فون؟''

''دو گھنٹے بعد تا کہ کچھ تو کام نمٹ جائے۔''

''ٹھیک ہے، مگر موبائل آف مت رکھنا۔''

''اچھا......'' اور اس نے موبائل بند کر کے اپنی دراز میں ڈال دیا۔

کمرے سے وہ باہر آئی تو اسے یوں لگا جیسے ابا جی کی سماعت اس کے کمرے کی جانب ہی تھی۔

''میں جا رہا ہوں، کھانا دکان پر بھجوا دینا۔'' وہ امی سے کہہ رہے تھے۔

ابا جی کے جاتے ہی اس نے زبور کے موبائل پر بیل دی۔ اس کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً کال کی۔

''مطلع صاف ہو گیا ہے کیا۔'' وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔''

''وہی تمہاری محتاط عادتوں نے تو مجھے بھی ہولا کر رکھا ہوا ہے۔ کوئی دیکھ نہ لے، کوئی سن نہ لے۔ فلاں نے لیہ لیا تو کیا ہوگا، فلاں کو پتا لگ گیا تو کیا ہوگا نے بور کر کے رکھ دیا ہے۔ اٹ از ٹو مچ یار......''

''میں تو شروع سے ہی ایسی ہوں۔''

''بات کرنے کو دل چاہتا ہے تو تم منع کر دیتی ہو۔ باہر گھومنے کا پروگرام بناتا ہوں تو تم کینسل کر دیتی ہو۔ اس وقت چھم چھم بارش ہو رہی ہے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس خوب صورت موسم میں تمہارے ساتھ گھوموں......مگر تم مج سے بات کرنے تک کی روادار نہیں ہو۔ یار ایسا ظلم تو نہ کیا کرو مجھ پر۔ کوئی ایسا کرتا ہے اپنے چاہنے والے سے۔''

''اس کا ایک ہی حل ہے کہ تم اپنی امی سے کہہ دو کہ تمہاری شادی کر دیں۔ تمہاری تنہائی خود ختم ہو جائے گی۔''

''میں اپنی امی سے یہ کہوں کہ وہ میری شادی کر دیں۔'' وہ لفظوں کو چبا چبا کر بولا۔

''ظاہر ہے کہ تم ہی کہو گے، اب محلے والے تو ان سے جا کر کہنے سے رہے۔''

''تم میری امی کو جانتی ہو کہ وہ کیسی ہیں، اور میری بات سن کر کیا کہیں گی۔''

نہ میں تمہاری امی کو جانتی ہوں اور نہ ان کی عادتوں کو......اس لیے کیا کہہ سکتی ہوں......مگر اندازہ یہی ہے وہ بہت خوش ہو جائیں گی، مائیں تو اپنے بیٹوں کی شادی کے خواب ان کے پالنے سے ہی دیکھنے شروع دیتی ہیں۔''

''جی نہیں، میری امی ایسی نہیں ہیں جیسی تم سمجھ رہی ہو۔ وہ مجھے بہت ہی چھوٹا سمجھتی ہیں، وہ کہیں گی کہ ابھی مہاری عمر ہے شادی کی۔ ابھی تم صرف بائیس سال کے تو ہو، اتنے سے بچے کی تھوڑی شادی ہوتی ہے۔''

''زبور......عقیقہ ہو گیا تمہارا۔'' اس نے جل کر کہا۔

''ہاں، وہ تو ساتویں دن ہی ہو گیا تھا۔''

''بسم اللہ اور آمین ہوئی۔''

''یار، کیا باتیں کر رہی ہو تم؟''

’’میں کوئی بچہ ہوں کیا؟‘‘

’’بچے تو ہو تم...... مگر پالنے میں کھیلنے کے بجائے، کسی کے دل سے کیوں کھیلنے لگے۔‘‘

’’خود مذاق کرلو، کوئی بات نہیں، میں اگر کوئی بات کہہ دوں تو کیسی کھینچائی کرنے لگتی ہو۔‘‘ اب وہ ہنس ر تھا۔

’’کیا یہ تمہارا مذاق تھا!‘‘

’’پہلے میری بات سنو، میں نے اپنی امی کو بتا دیا ہے، امی میں ایک شہزادی سے شادی کرونگا، اور وہ شہزاد میں نے دیکھ بھی لی ہے۔ میں سب کہہ چکا ہوں ان سے......!

’’پھر کیا کہا انہوں نے؟‘‘ نگین نے سانس روک کر پوچھا۔

’’یہی کہ اس شہزادی سے تم مجھے بھی ملوانا، میں بھی تو دیکھوں کہ میرے بیٹے کو کیسی شہزادی پسند آئی ہے۔‘‘

’’تو تم انہیں ہمارے گھر کیوں نہیں لے آتے، کہ میں انہیں شہزادی لگ رہی ہوں یا کنیز......!‘‘

’’وہ آئیں گی تو لاؤں گا......!‘‘

’’کیا وہ ہمارے گھر آنا نہیں چاہتیں......! وہ حیرت سے بولی۔‘‘

’’توبہ ہے، دسوسے کیسے جلدی آجاتے ہیں، تمہارے دل میں۔ بھئی میری امی ان دنوں کینیڈا میں ہیں جب وہ پاکستان آئیں گی، تب ہی انہیں لے کر آؤں گا ناں......!‘‘

’’کیا وہ کینیڈا میں مستقل رہتی ہیں؟‘‘ نگین نے پوچھا۔

’’میرے دو بھائی کینیڈا میں ہیں اور دو دوبئی میں ہیں، اس لیے وہ گھومتی پھرتی ہیں، کبھی کینیڈا کبھ دوبئی......!‘‘

’’یہاں کب آئیں گی...... پاکستان میں بھی تو ان کا ایک بیٹا رہتا ہے ناں......!‘‘

’’یہاں ہم تین بھائی ہیں، جب بھائی انہیں آنے دیں گے تو وہ یہاں آئیں گی۔‘‘

’’ظاہر ہے کہ ابھی وہ دو چار سال وہیں رہیں گی...... ان کے بیٹے ان کو آنے جو نہیں دیں گے، یہاں والے ان سے جا کر مل آئیں گے، اللہ اللہ خیر صلا...... ہے ناں یہی بات......!‘‘

’’بے وقوفی کی باتیں مت کرو، تم میری ہو اور میری ہی رہو گی، اللہ نے تم کو میرے لیے ہی تو بنایا ہے۔‘‘ ا جذب سے کہہ رہا تھا۔‘‘

’’زیور...... ملنے کے جو جائز طریقے ہیں، اگر ان کو اپنایا جائے تو ایسی پریشانیاں تو نہیں ہوں گی ناں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، امی کا فون آتا ہے، تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ پاکستان آجائیں، میں آپ کو بے حد مس کر رہاں ہوں۔‘‘

’’ان کا فون آئے گا تو تب کہو گے، ہوسکتا ہے کہ ان کا پندرہ دن فون نہ آئے۔‘‘ نگین نے کہا۔

’’میں آج رات کو خود فون کروں گا، اور کہوں گا کہ فوراً پاکستان آجائیں۔ آپ کے بیٹے کو ایک بہ ضروری بات آپ سے کرنی ہے، اب تو خوش ہو ناں۔‘‘ وہ ہنس کر بولا۔

’’وقت سے پہلے میں خواہ مخواہ کی خوشیاں کیوں دکھلاتی پھروں...... جب کہ مجھے ایسا لگ بھی نہیں رہا کہ ہمارا فون سنتے ہی کراچی کا ٹکٹ کٹا کر فوراً آجائیں گی۔‘‘

’’لگتا ہے، تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے......!‘‘

’’اگر ایسا ہوتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی......!‘‘

’’کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے...... کہ اگر تم مجھے ایسے ہی ترساتر سا کر ملتی رہیں، تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔‘‘

’’دماغ تو تمہارا ہمیشہ کا خراب ہے۔ اچھا خدا حافظ...... امی میں آرہی ہوں، یہ فریال کی بچی اتنی لمبی بات کرتی ہے کہ میں بالکل بھول گئی، آپ نے مجھے گرائنڈر پر لہسن پینے کو کہا تھا‘‘ موبائل آف کرنے سے پہلے نگین بولی تو زیور نے مسکرا کر فون بند کر دیا۔

’’مگر زیور کی بات سے اس کے دل میں کج سی پڑ گئی تھی......!‘‘

’’’لڑکیاں محبت کی شاہراہ پر قدم رکھتے ہی اپنے گھر بسانے کی بات سوچنے لگتی ہیں۔!‘‘

’’اور لڑکے، محبت کو بھی لاابالی انداز میں لیتے ہیں۔!‘‘

’’جتنی فکریں لڑکیاں پالتی ہیں، اس کی چوتھائی بھی لڑکے نہیں رکھتے۔!‘‘

☆☆☆

شادی کے بعد فہمی اپنے سسرال میں خوش تھی۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک رہتی تھی۔ شادی کے بعد نہ کوئی دورہ پڑا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا ڈپریشن......!

فہد کا رویہ بھی ٹھیک تھا۔ وہ ایک سادہ طبیعت کا لڑکا تھا، نرمی سے بات کرنے کا عادی، طنز، طعنے، تشنے نہ اس نے کبھی کسی کو دیئے تھے، اور نہ ہی اس قسم کی باتوں کو وہ پسند کرتا تھا۔

ماموں، ممانی بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کہیں دعوت میں جانا ہوتا، تو ممانی اسے سر سے پیر تک سجا کر لے کر جاتیں۔ ایک ہی نند تھی، اس سے بھی بڑی دوستی تھی۔

شادی کو کئی مہینے ہو گئے تھے، مگر ابھی تک دعوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ ماموں، ممانی کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔

فہمی کو پھول پسند تھے، فہد اپنے آفس سے واپسی پر اس کے لیے پھولوں کے کنگن اور بالوں میں لگانے کے لیے موتیے کی لڑیاں لے کر ضرور آتا۔

فہد کے اس محبت بھرے رویئے کے باوجود کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کے ساتھ اداکاری کر رہا ہو۔ کبھی وہ تن تنہا بیٹھا ہوتا، تو عجیب کھویا کھویا سا دکھائی دیتا، حزن و ملال اس کے چہرے پر مجسم ہوتا فہمی اس کے پاس جا بیٹھتی...... تو ایک زبردستی کی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر لیتی۔

’’فہد...... آپ کیا سوچتے رہتے ہیں......؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں......‘‘ وہ زبردستی مسکرایا۔

’’اچھا، ابھی خلاؤں میں کیا گھور رہے تھے......؟‘‘

’’دیکھو...... سامنے دیوار پر ایک مکڑی چل رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے جالے سمیت یہاں نہ گر پڑے۔‘‘

’’کہاں ہے مکڑی، کہاں ہے جالا...... مجھے بتائیں ناں...... میں ابھی صاف کر دوں گی...... مگر مجھے تو کہیں بھی نظر نہیں آرہی وہ مکڑی......!‘‘

’’چلی گئی ہوگی...... اس کے لیئے چھتوں کی کمی ہے کیا...... کہیں اور نکل گئی ہوگی......!‘‘

’’مگر آپ مجھے بتائیں تو سہی، آپ نے کس طرف دیکھی تھی۔‘‘

’’ارے چھوڑو ان چیزوں کو...... جب میں گھر آجایا کروں تو تمہیں ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، صرف مجھے دیکھو، مجھ سے باتیں کرو...... میں ہوں ناں......‘‘ وہ اس کی سیاہ لمبی چوٹی اپنے ہاتھوں پر لپیٹتا ہوا بات کا رخ ہی تبدیل کر دیتا۔

’’فہد ایک بات پوچھوں......؟‘‘

’’ہوں۔‘‘

’’سچ سچ بتاؤ گے......!‘‘

’’ہوں۔‘‘

’’وعدہ کرو۔‘‘

’’افوہ...... بات بھی کرو ناں۔‘‘ اتنی لمبی تمہید! وہ الجھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’تم میرے ساتھ خوش ہو ناں؟‘‘

ایک شب وہ چپ چاپ بظاہر ٹی وی دیکھنے میں محو تھا، مگر اس کی نظریں کہیں اور تھیں۔

وہ اس کے پہلو میں ضرور بیٹھا تھا مگر اس کا من کہیں اور تھا۔

اور فہمی یہ سب دیکھتے ہوئے، سمجھتے ہوئے...... بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

’’تمہیں یہ ادراک کیسے ہوا کہ میں ناخوش ہوں۔‘‘ وہ الٹا تفتیش پر ڈٹ گیا۔

’’وہ اس لیے کہ میں تمہاری آئیڈیل نہیں ہوں اور اس لیے بھی کہ عام سی شکل و صورت کی لڑکیاں کسی کے بھی خوابوں میں نہیں آیا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم نے کسی بھی طرح مجھ سے شادی تو کر لی ہے، مگر اب مجبوری میں نبھا رہے ہو۔‘‘

’’فہمی مجھے نہیں معلوم کہ تم میری بات کا یقین کرو گی بھی یا نہیں مگر یہ سچ ہے کہ تم میرے خوابوں میں کبھی نہیں آئیں اور نہ ہی میری آئیڈیل ہو...... کہ ایک آدھ بار بہتے پانی پر ایک شکل بنانے کی کوشش کی تھی...... مگر لہروں کی روانی نے پل بھر میں مٹادی تھی۔ جس کا اس وقت تو افسوس ہوا، مگر بعد میں تاسف بھی نہ رہا۔ یوں بھی میں ایک پریکٹیکل قسم کا بندہ ہوں۔ جو صرف حال پر نظر رکھتا ہے اور اسی کو بہتر بنانا چاہتا ہے اور فہمی یہ تو تم کبھی گمان بھی نہ کرنا کہ تمہارے ساتھ رہ کر میں خوشی سے دور رہوں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے آنے سے زندگی میں مسرت اور طمانیت کا احساس ہوا ہے۔‘‘

’’خوشی سے رچے بسے لوگ خلاؤں میں کیا تکتے رہتے ہیں؟‘‘ فہمی کا لہجہ اب چہکتا سا ہو گیا تھا۔

’’میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ جس گھرانے میں تم نے آنکھ کھولی، تمہاری پرورش ہوئی۔ نہایت شاہانہ وقت گزارا مگر یہاں ہمارے گھر آ کر کہیں تمہیں ایسا تو نہیں لگ رہا کہ آگے بڑھنے کے بجائے تم پیچھے کی طرف سفر کر رہی ہو۔ میری محدود آمدنی میں تمہیں بہت سی آسائشات حاصل نہیں ہو پائیں گی۔‘‘ وہ بڑے کرب سے کہہ رہا تھا۔

’’صرف یہی بات......‘‘ ایک انجانا سا بوجھ اس کے ذہن سے خود ہی اتر گیا۔ اور وہ مسکراتے لبوں سے پوچھ رہی تھی۔

’’ہاں، صرف یہی بات!‘‘

’’مجھے اس کی پروا نہیں ہے، میرے نصیب میں ہو گا تو اللہ مجھے یہاں دے دے گا، مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔‘‘ وہ بے اختیار مسکرا دی تھی۔ ایک دل آویز سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو منور سا کر دیا تھا۔

’’مگر مجھے تو پروا ہے ناں...... کہ جیسے تمہاری امی نے جہیز میں ائر کنڈیشن دیا، مگر ہم اس کو اس وجہ سے نہیں چلا پا رہے کہ ماہانہ پانچ ہزار کا اضافی بجلی کا بل دینا بہت مشکل ہو گا۔‘‘

’’افوہ...... مجھے تو شروع سے ہی اے، سی میں رہنا پسند نہیں تھا، جو تازہ ہوا کی بات ہے، وہ اے سی میں کہاں...... اور اب تو ویسے بھی موسم اچھا ہو گیا ہے۔ گرمی کا زور تو کب کا ختم ہو گیا۔‘‘

’’پھر بھی، میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ تم اپنی سب چیزیں استعمال کرو۔‘‘

’’اگر تم برا نہ مانو تو میں جاب کر لوں، میری جاب سے کچھ نہ کچھ فرق تو پڑے گا ہی۔‘‘

’’نہیں، ابھی فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دوسرے اخبار میں اپلائی کیا ہے، امید ہے کہ وہاں جاب مل جائے گی، جس سے تنخواہ میں کافی فرق پڑے گا۔‘‘

’’انشاء اللہ!‘‘ فہمی کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور اس کو پر مسرت اور یوں سرشار سے دیکھ کر فہد بھی مسرور سا ہو گیا۔

☆☆☆

ثریا کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا، جو اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے سوا کسی دوسری طرف دیکھنا وقت کا ضیاع سمجھتی ہیں۔

شاہنواز شروع سے ہی اس کی مٹھی میں تھا، وہ سیاہ کرتی یا سفید، شاہنواز کو کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کہتی، وہ اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا۔

شائستہ بیگم سوتیلی ساس تھیں۔ ثریا نے انہیں کبھی منہ ہی نہیں لگایا تھا، یوں بھی یہ شادی شاہنواز کی پسند کی تھی، آفس میں نئی اکاؤنٹنٹ کو آئے پندرہ دن ہی ہوئے تھے، شاہنواز اس کو دل دے بیٹھے تھے۔ چٹ منگنی کے بجائے پٹ سے بیاہ ہو گیا تھا۔

ثریا کا انداز توقلی کے لیے ہوئے تھا۔ شاہنواز کا آنکھوں کی تارا بھی تھیں۔ جتنا بھی اتراتیں وہ کم تھا۔ اس لیے ساس کو کبھی ساس سمجھا ہی نہیں۔

شائستہ بیگم اس کا گریز سمجھ رہی تھیں اس لیے وہ بھی دور دور ہی رہیں۔ لوگوں پر خواہ مخواہ کا حاوی ہونا انہیں از خود پسند نہیں تھا۔

ثریا کی شادی کو اٹھارہ سال ہو گئے تھے اور وہ یہی دیکھتی آ رہی تھی کہ شاہنواز اپنی سوتیلی والدہ سے گھلنا ملنا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہیں، اس کی انہیں پروا تک نہیں ہوتی تھی۔ وہ بیمار ہوتیں تو شاہنواز ان کے کمرے میں جھانکتے تک نہیں تھے۔ وہ اپنی دنیا میں مست رہتے تھے۔

ثریا کہتی کہ بچوں کو لے کر ہمیں باہر جانا ہی، وہ ان کے ساتھ باہر چلا جاتا۔ بھولے سے بھی کسی بہن کو نہ پوچھتا۔

ثریا کہتی کہ مجھے بچوں کے لیے شاپنگ کرنا ہے، وہ انہیں شاپنگ کرا دیتا۔ کبھی ماں کے لیے کچھ لانے کی عادت ہی نہیں تھی۔

باپ کے زمانے میں بھی والدہ اور سوتیلی بہنوں کی پروا نہیں کی تھی، باپ کے انتقال کے بعد ان پر خواہ مخواہ غصہ آنے لگا تھا۔ کسی بھی معاملے میں ان کا بولنا شاہنواز کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

ثریا اس سے کوئی بات کہتی 'امی فضول خرچ ہیں، اپنے لیے مہنگے مہنگے کپڑے خرید لاتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ لڑکیوں کے لیے اٹھا کر رکھیں، کل ان کے کام آئیں گے، شاہنواز اس کی جھوٹی باتوں پر فوراً یقین کر لیتا کہ شروع سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

جو بات ثریا کہتی، شاہنواز کو ویسا ہی نظر آنے لگتا تھا۔ یہ کون سی میری سگی ماں ہیں، اس کے ذہن کے کونے میں دبا یہ بیج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

ثریا کی یہ دلی خواہش تھی کہ ساس اور دونوں نندوں کو اپنے گھر سے نکال دے، تا کہ ان کے تصرف میں گئے دو کمرے اسے مل جائیں۔ اسے یہ بات کچھ عرصے پہلے ہی معلوم ہوئی تھی کہ شائستہ کا ایک فلیٹ بھی ہے۔

مگر اس کو اس پلان میں کامیابی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

پتا نہیں کب دفان ہوں گی یہ کم بختیں۔ ایک دن اس نے جل کر سوچا۔ اپنا فلیٹ کرائے پر اٹھا رکھا ہے اور ہمارے سینے پر مونگ دل رہی ہیں۔

صبح اٹھو ان کی شکلیں دیکھو، رات کو سونے کے لیے لیٹو تو ان کی شکلیں دیکھو۔ لوگوں کے تو بارہ سال کے بعد حالات بدل جاتے ہیں، میں نے اٹھارہ سال کا عذاب کاٹ لیا، مجال ہے کہ اس جنجال سے جان چھوٹے۔

فون پر بڑی آپا سے دکھڑا رویا۔ "آپا جانی...... میں تو تھک گئی ہوں۔ اپنی نندیں، چڑیلیں سی لگتی ہیں مجھے۔ کیا یہ لوگ میرا سب خون پی جائیں گے، تب مجھے ان سے نجات ملے گی۔" وہ بھکا بھک روئے چلی گئی۔

"پریشان کیوں ہوتی ہے، میں ہوں ناں تیری آپا۔ آج ہی اپنے بابا جی کے پاس جاتی ہوں، کچھ نہ کچھ پڑھائی کا پوچھتی ہوں میں۔ دیکھنا چٹکیوں میں صفایا ہو جائے گا ان سب کا۔ ان کے پاس ہر چیز کا علاج موجود ہے۔"

"آپا جانی، آپ کے یہ بابا بہت زیادہ پڑھنے کا بتاتے ہیں، گھر کے دھندوں میں، میں اتنا نہیں پڑھ سکتی۔ کیا آپ کسی دوسرے بابا کے پاس نہیں جا سکتیں؟"

"تم پریشان مت ہو، تمہارے بجائے میں پڑھ لوں گی۔ انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بڑی باجی کے لیے بھی تو میں نے پڑھا تھا۔ کیسے ان کی جٹھانی بھاگی تھیں ان کے گھر سے۔"

آپا جانی کو پڑھتے ہوئے آج چوتھا ہی روز تو تھا۔ شاہنواز گھر میں آیا تو اس کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا اور آنکھیں جیتی سنگ لاخ جیسی خون آشام......!

"امی کہاں ہیں؟" آتے ہی پہلا سوال کیا گیا۔ ثریا سمجھی کہ بابا کے طفیل شاید کوئی کرشمہ ہونے والا ہے (اب شاہنواز ان سے کہے گا۔ آپ اپنی بیٹیوں کے ساتھ کہیں کرائے پر رہنے کا بندوبست کیجیے یا پھر اپنے فلیٹ میں دفع ہو جائیے۔ کاہے کو چڑھا رکھا ہے اسے کرائے پر)

"باورچی خانے میں ہوں گی۔ شام کو جب تک اپنے ہاتھ کی دودھ پتی کی چائے نہ پی لیں، انہیں چین تھوڑی آتا ہے۔" اس نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

شاہنواز باورچی خانے میں گیا تو وہ رات کی روٹیاں پکانے میں مصروف تھیں۔

"امی آپ کیوں روٹیاں پکا رہی ہیں؟"

"سائرہ کو بخار ہے اور فریال کے ہاتھ میں درد ہے، میں نے سوچا، چلو میں ہی پکا لوں، یوں بھی تو خالی ہی ٹھی تھی۔"

"آپ کی بہوئیں کیا مر گئی ہیں جو آپ پکانے بیٹھ گئیں؟"

"اللہ نہ کرے۔ بچوں کے کام کوئی کم ہوتے ہیں" بیٹے کے غصے کو انہوں نے رسان سے ٹھنڈا کرنے کی وشش کی۔

"ثریا......!" وہ دہاڑنے والے لہجے میں بولا۔

"جی...... کیا ہوا...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی۔" وہ بھاگ کر آئی، سوچا صبح طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شاید بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے۔ ورنہ وہ تو بیوی کو بڑے لاڈ سے بلایا کرتا تھا۔

"مجھے امی باورچی خانے میں کام کرتی نظر نہ آئیں اور اب اگر نظر آئیں تو پھر دیکھنا اپنا حشر۔ جاؤ گلاس لے کر آؤ۔"

ثریا بوتل کے جن کی طرح ایک گلاس کے ساتھ جگ بھی لے آئی۔

شاہنواز نے شاپر میں سے جوس کی تھیلی نکالی اور جگ میں انڈیل دی۔

"امی یہ ملک شیک دو گلاس ہوگا، مگر اچھے جوس سینٹر کا ہے، یہ آپ پی لیجیے، ہمارے آفس میں آج ایک علیم صاحب کہہ رہے تھے، آم توانائی بحال کرتا ہے اور اس کی طاقت اگلے سیزن تک رہتی ہے۔ آپ ملک یک روزانہ پیا کیجیے اور آم بھی باقاعدگی سے کھائیے۔"

"ارے بیٹا، اتنا مجھ سے کہاں پیا جائے گا، تم بچوں کو دو۔" شائستہ بیگم اس مہربان سلوک کی کہاں عادی تھیں۔ وہ بھی گھبرا سی گئیں۔

"ارے یہ لوگ تو روزانہ پیتے ہیں، رات کو واک کا تو صرف بہانہ ہوتا ہے، جوس سینٹر سے جا کر ملک شیک پیتے ہیں، مگر اس کی اصل ضرورت تو آپ کو ہے۔ آپ میرے سامنے پی جائیے۔"

اور شائستہ بیگم کو ایک گلاس پینا ہی پڑ گیا۔

"ہاں یہ دوسرا گلاس ساتھ لے جائیں۔ ارے آپ کہاں لے کر جائیں گی۔" شاہنواز نے بقیہ جوس گلاس میں ڈال کر ان کے کمرے میں جا کر ٹیبل پر ڈھک کر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے، آج اپنی اماں کی بڑی ٹلے نویسی (خوشامد) ہو رہی ہے۔" رات کو کھانے کے بعد جب ثریا میاں کے ساتھ واک پر نکلی تو کہا۔

"کیوں، تمہیں کیا کوئی تکلیف پہنچی ہے؟" اس کا لہجہ کاٹ کھانے والا تھا۔

"مجھے کیوں ہوتی تکلیف، میری بلا سے۔ آپ روزانہ ان کے منہ میں نوالے دیجیے۔"

"اب اگر تم نے امی کو موضوع بحث بنانے کی کوشش کی تو تمہاری طبیعت سب کے سامنے ہری کر دوں گا۔" اس نے باؤں چیخ کر کہا اور آدھے راستے سے گھر مڑ آیا اور ثریا حق دق سی رہ گئی۔ شاہنواز کا تو ایسا وتیرہ نہیں تھا، تو پھر یہ سوتیلی ماں کی محبت کہاں سے امڈ آئی۔

شاہنواز نے اپنے کسی دوست سے کوئٹہ سے لیڈیز سویٹر منگوائے تھے، عرصے سے ثریا نے اس سے فرمائش کر رکھی تھی۔

دوست دو سویٹروں کے ساتھ ایک نہایت عمدہ گرم شال بھی لے آیا تھا۔ یہ شال اس کی جانب سے تھی۔

’’شاہنواز دونوں سویٹر شائستہ بیگم کے پاس لے کر گیا، امی ان سویٹروں میں سے جو آپ کو پسند ہو وہ آپ لے لیجیے۔‘‘ اس کا لہجہ تعظیم بھرا تھا۔

’’میرے پاس سویٹر ہے بیٹا، تم ثریا کو دے دو‘‘ اس سے قبل شاہنواز انہیں صرف دکھایا کرتا تھا۔ دینے کی عادت تو کبھی اس میں تھی ہی نہیں۔

’’نہیں امی پلیز آپ ایک سویٹر رکھ لیں۔‘‘

انہوں نے سفید سویٹر رکھ لیا، پیلا سویٹر رہنے دیا۔

’’اور یہ گرم شال تو ہے ہی آپ کے لیے‘‘ خوب صورت ایمبر ائیڈری کی سیاہ شال شاہنواز نے ان کے شانوں کے گرد لپیٹ دی۔

’’اچھی ہے مگر......‘‘ وہ کچھ کہنے کو رکیں۔

’’اچھی ہے، تو اسے میری امی ہی اوڑھیں گی۔‘‘

یہ سب دیکھ کر ثریا کا خون کس قدر جل رہا تھا، یہ وہی جانتی تھی۔

’’لو یہ سویٹر تمہارے لیے ہے۔‘‘ شاہنواز نے دوسرا سویٹر ثریا کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے بے دلی سے تھام لیا۔

’’میں نے تو شاہ کے لیے منگوائے تھے، ابھی سے نہیں جمع کروں گی تو بعد میں کیا کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گی۔‘‘ ثریا قصداً زور سے بولی، جیسے یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ بڑی بی، تم نے اپنی پوتی کا سویٹر چھینا ہے، یہ تمہارے لیے نہیں، بلکہ بچی کے لیے رکھنا تھا مگر تم نے اچک لیا۔

’’اچھا......شاہ کے لیے رکھو گی، تو سفید سویٹر تھوڑی رکھا جاتا، وہ تو امی پر ہی سجے گا۔‘‘

تب ثریا نے غور سے شاہنواز کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایک غرور سا تھا۔ ایک شادمانی، جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

شاہنواز کسی کام سے باہر نکلا تو اس کی انگلیاں ٹیلی فون کے ڈائل پر ناچ رہی تھی۔

’’آپا جانی کیا پڑھ دیا تم نے۔ لگتا ہے عمل ہی الٹا ہو گیا ہے، شاہنواز وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔‘‘

’’تو کیا ہو گیا اسے، کیا سر کے بل چلنے لگا وہ۔‘‘

’’یہی سمجھ لیں۔ آپ کے بابا کا نسخہ مجھے تو راس نہیں آیا، اپنی ماں بہنوں کو گھر سے نکالنے کے بجائے، وہ مجھ پر چڑھ کر آ رہے ہیں، کیا پڑھ دیا آپا تم نے۔‘‘

’’ارے ابھی پورا عمل کہاں ہوا ہے، پندرہ سو روپے تو باباجی نے لیے ہیں، اور چار کالی مرغیاں علیحدہ۔ عمل لازمی ہو گا۔ تم مجھے پڑھنے دو۔ ہو گا اثر......تم بے فکر رہو۔‘‘

’’ٹھیک ہے پڑھ لو، مگر کام نہیں ہوا ناں، تو میں آپ کو پیسے نہیں دوں گی، میرا جی ہی نہیں ٹھک رہا، تو کیسے یقین کر لوں۔‘‘

’’سب ٹھیک ہو جائے گا، تم پریشان مت ہو، ابھی میرا وظیفہ ادھورا ہے، جب پورا ہو جائے گا، اسی وقت اس کا اثر ہو گا۔‘‘ آپا کی تسلیاں جاری تھیں۔

’’پھر بھی آپ اپنے بابا سے رابطہ تو کریں، اور انہیں بتائیں کہ جس شخص نے اپنی سوتیلی ماں کو کبھی نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ ان کے قدموں میں اپنا آپ کیوں بچھائے دے رہا ہے؟‘‘

’’اچھا میں جا کر پوچھتی ہوں، شاہنواز میں یہ تبدیلی کیونکر آئی ہے؟‘‘

’’مجھے فوراً بتایئے گا، میں بہت پریشان ہوں۔‘‘

’’تم فکر مت کرو۔ میں ابھی آ کر بتاتی ہوں۔‘‘

اور پھر آدھ گھنٹے بعد آپا جان کا فون آ گیا تھا۔

’’ثریا......وہ باباجی کہہ رہے ہیں کہ شاہنواز پر کسی نے بڑا بھاری عمل کروایا ہے۔ کروانے والی کوئی عورت ہے، اس کا یہی مقصد ہے کہ شاہنواز کو لوٹے اور اس کے بیوی بچوں کو در بدر کروا دے۔‘‘

’’اللہ بیڑا غرق کرے ان لوگوں کا، کیسے کیسے پلان بنائے جا رہے ہیں اور مجھے کچھ پتا ہی نہیں۔‘‘ اب ثریا روئے چلی جا رہی تھی۔

’’فکر مت کر میری بہن، باباجی کے پاس اس کا بھی توڑ ہے، بس انہیں پانچ ہزار روپے دینے ہوں گے۔ وہ خود اس عمل کا اتار کریں گے۔‘‘

’’آپا، آپ پیسوں کی پروا مت کیجیے گا، جو وہ کہیں گے، میں دے دوں گی مگر اس ناگہانی افتاد سے تو مجھے بچایئے۔‘‘ ثریا خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

’’میں تیرے لیے پھر جاؤں گی ان کے پاس، مگر تو اپنا رونا تو بند کر۔‘‘

’’مجھے تو لگ رہا ہے کہ ان پر کوئی اثر وغیرہ بھی ہو گیا ہے۔‘‘ ثریا نے سسکی لی۔

ثریا کا یہ گمان صحیح تھا، مگر اسے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ اثر اسے آفس میں ہوا تھا۔ ایسا اثر جو اس کی زندگی میں کسی بھونچال کی طرح آیا تھا۔

شاہنواز کے باس کی خالہ کا انتقال انڈیا میں ہوا تھا اور وہ بے حد مغموم سے ہو گئے تھے۔ کتنے دن تک تو وہ آفس نہیں آئے اور جب وہ آئے تو ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

’’سر آپ کی خالہ کے انتقال کا ہم سب کو بے حد افسوس ہوا ہے۔‘‘ آفس کے لوگ اجتماعی طور پر ان سے تعزیت کر رہے تھے۔

’’میری اپنی ماں تو بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں، یہی بس ایک خالہ تھیں، جو اکثر و بیشتر انڈیا سے مجھے فون کرتی رہتی تھیں۔‘‘

’’آپ سے ملنے وہ آتی ہوں گی۔‘‘ کسی نے پوچھا۔

’’نہیں، کبھی نہیں آئیں، ویزے کے مسائل نے انہیں کبھی آنے ہی نہیں دیا اور مجھے ان کی خدمت کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا، مجھ سا بدقسمت کون ہو گا۔ میری ماں کی سوتیلی بہن جو میرے لیے ماں جیسی تھیں۔ میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ ان کی دعائیں میرے لیے کسی خزانے سے کم نہیں تھیں، اب میں ان سے محروم ہو گیا ہوں۔‘‘

’’سر، آپ ان کے خرچ کے لیے ماہانہ اخراجات تو ہمیشہ بھیجتے رہے ہیں۔‘‘ اکاؤنٹنٹ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا ’’اس دور میں تو لوگ اپنے سگے والدین کا خیال نہیں رکھتے ہیں اور آپ تو اپنی ماں کی سوتیلی بہن کا اس قدر خیال رکھتے تھے۔‘‘

’’ایسے لوگ بہت بدقسمت ہوتے ہیں، جو اپنے والدین کو پائیں اور ان کی طرف سے منہ موڑ لیں۔ ایسے لوگ زندگی میں چاہے کتنے ہی آگے بڑھ جائیں، آپ نوٹ کیجیے گا ایک تشنگی، کوئی محرومی ان کی ذات سے چمٹ

کر رہ جاتی ہے۔" باس کہہ رہے تھے اور شاہنواز کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کی ننگی کمر پر ہنٹر برسا رہا ہو۔

جب اس کی ماں کا انتقال ہوا...... وہ بہت چھوٹا سا تھا، بوڑھی نانی نے اسے پالا پھر وہ بھی مر گئیں۔

وہ دس سال کا تھا، اور دلنواز آٹھ سال کا جب ان کے والد نے شائستہ بیگم سے دوسری شادی کی تھی۔ شائستہ ایک محبت کرنے والی ماں تھیں جو ہمیشہ دونوں بھائیوں سے محبت کرتی تھیں۔ بیمار ہو جاتے، تو اپنے پاس سلاتیں، منہ میں نوالے دے کر کھانا کھلاتیں، محلے میں کسی بچے سے لڑائی ہو جاتی تو ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتیں۔ اور وہ ان کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتا تھا۔ ان کی کوئی بات بری لگتی تو اسی وقت جواب کا پتھر حاضر ہوتا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کی ننھیال والوں نے یہی سکھایا تھا کہ سوتیلی ماں بات کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتی ہے۔

باس کی باتوں نے شاہنواز کے دل پر خاصا اثر کیا تھا اور اب وہ خاص طور پر شائستہ بیگم کا خیال رکھنے لگا تھا۔

وہ پانی پینے کے لیے گلاس لے کر اٹھتیں، تو شاہنواز ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر پانی بھر کر دے دیتا۔

کھانے کی میز پر جب تک وہ نہ آ جاتیں، وہ کھانا نہیں شروع کرتا۔

آفس جانے سے پہلے اور آفس سے آنے کے بعد ان کو سلام کرنے ان کے کمرے میں ضرور جاتا...... اور وہ اپنی دعاؤں کے خزانے اس پر وارنے لگتیں۔

شائستہ بیگم کی طبیعت کئی روز سے خراب تھی۔ سائرہ نے کئی دفعہ ان سے کہا کہ وہ ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کروالیں، مگر وہ ٹالے چلی جا رہی تھیں۔

اور ایک شام جب انہیں چکر آیا، تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ شاہنواز نے انہیں یوں چکراتے دیکھا، تو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

"اپنی حالت دیکھ رہی ہیں آپ، کس قدر پیلی ہو رہی ہیں، کیا کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا ہے آپ نے؟" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔

"کھانا تو خیر ٹھیک ٹھاک کھا رہی ہیں، آج دوپہر کو بھی کڑھی چاول بے حد شوق سے کھائے تھے۔" ثریا نے کلستے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے، جو تم پٹر پٹر بولے چلی جا رہی ہو۔" شاہنواز کو غصہ ہی تو آ گیا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے یہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شائستہ بیگم نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

"اندھا نہیں ہوں میں اور نہ ہی میں نے اپنی آنکھیں کہیں رہن رکھ دی ہیں۔ آپ آج کل اتنی چپ چپ سی کیوں رہتی ہیں۔ یقیناً کوئی ایسی بات ضرور ہے جو آپ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔"

شاہنواز نے محبت بھرے انداز میں پوچھا تو ان کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

"میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا، اب یہ خواہ مخواہ میری شکایت کرنے بیٹھ جائیں گی۔ شاہ کو غلط فہمی ہوئی تھی، اس لیے میں نے فریال کو صرف سمجھایا تھا، ڈانٹا نہیں تھا، اور جب کچھ بات ہی نہیں تھی، تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں...... مگر اس کا مطلب یہ تھوڑی ناں ہے کہ منہ پھلا کر بیٹھ جائیں، نند بھاوج کی بھی کوئی لڑائی ہوتی ہے۔ وہ تو دودھ کی سی ملائی ہوتی ہے۔"

ثریا یہ سمجھی کہ اس دن فریال کو جو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی، بڑی بی اسی کا ملال دابے بیٹھی ہیں۔ اس لیے اس نے جلدی سے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی۔

"ثریا، تم کمرے سے دفع ہو جاؤ!" شاہنواز چنگھاڑا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" ثریا کے آنسو پل بھر میں جل تھل کرنے کو تیار تھے۔

"ٹھیک ہے، کچھ نہیں کیا ہوگا، مگر اس وقت اپنے کمرے میں چلی جاؤ!"

"کیوں؟" زبان کے بجائے اس نے استفہامیہ نگاہوں سے پوچھا۔

"کبھی تو مجھے اپنی ماں سے اکیلے میں بھی بات کرنے دیا کرو، ہر وقت تلوار کی طرح سر پر تنی رہتی ہو۔"

تب ثریا اسی وقت اٹھ کر اندر چلی گئی۔

ایسی بے عزتی، جس کا کہ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ساس، نندوں کے سامنے وہ زعم سے رہنے کی سدا کی عادی تھی اور آج اسے بے عزت کر کے کمرے سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کے تو پیر...... جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ کتنی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر وہ باہر آئی تھی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے بھل بھل بہہ رہے تھے اور وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی سسک رہی تھی، جسم الگ لرزہ براندام سا تھا۔

"کیا ہوا بھابھی؟ کائے کو رو رہے آپ۔" صابرہ اپنے کمرے سے نکلی تو ثریا کو یوں روتا دیکھ کر متحیر سی رہ گئی۔

"کچھ نہیں ہوا؟" وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اپنے کمرے میں بڑھ گئی۔

صابرہ کچھ سوچ کر مسکرائی اور ہنستے ہوئے بولی "میرے کو سب مالوم ہے، کیا بات ہے؟"

"کیا معلوم ہے تمہیں۔" ثریا نے بھیگی بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ کیا آئینہ نہیں دیکھے کیا؟ آپ کی شکل بتاتی بیٹھی ہے کہ کیا ہوئی آپ کے ساتھ!" صابرہ پھر ہنس دی۔

"کیا کہہ رہی ہو، میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔" اپنی آنکھیں پلو سے پونچھتے ہوئے ثریا نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"میرے کو اچھی طرح مالوم ہے آپ کو پیٹ ہے بول کے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" ثریا کے لہجے میں غصہ بھی در آیا۔

"ہاں، ہاں، چھپاؤ متو...... میرے کو مالوم...... صبوں سے کچھ کھائی پی بھی نئیں رہے، اوپر سے الٹیوں پہ الٹیاں کر رئی بول کے۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ثریا نے الجھ کر کہا۔

"تو پھر کائے کو الٹیاں کر کے رو رہے آپ؟" صابرہ نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ سارا فساد بڑی بی کے اشارے پر ہو رہا ہے۔" اس نے آنکھ کے اشارے سے ساس کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کائے کو ماں، تم کو وہ رلاتے۔"

"بیٹے کو اپنی مٹھی میں جو کر لیا ہے انہوں نے۔ آج میاں جی نے کمرے سے دھتکارا ہے، کل گھر سے بھی

باہر نکال سکتے ہیں، میری اوقات تو دو کوڑی کی بھی نہیں رہی ناں۔‘‘ ثریا کی آنکھوں کی برسات برسنے کو تل گئی۔

’’انوں خوائی نخوائی (خواہ مخواہ) آپ کی آنکھاں سوجا دیئے بول کے، وہ ایسا کچھ کری تو انوں کے سامنے آئیں گا، دیکھ لیناہاں۔‘‘ صابرہ نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے تسلی دی۔

’’جتنا مجھے رلایا ہے، دیکھ لینا تم، یہ اس سے زیادہ روئیں گی۔‘‘ ثریا نے کہا۔

’’ہور...... کیا......‘‘ صابرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’باباجی کچھ نہ کچھ تو کرشمہ دکھائیں گے ہی۔‘‘ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

’’کیا بولی آپ......؟‘‘ صابرہ نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

’’شاہنواز پر جادو کر کے یہ سمجھتی ہیں کہ مجھے سڑک پر لے آئیں گی، تو ایسا تو قیامت تک نہیں ہوسکتا۔ میرے بھی مرے جیتے موجود ہیں۔‘‘ ثریا نے چھاتی پیٹ کر کہا۔

’’برو بر بول کے بولی آپ۔‘‘ (آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں)

’’ارے یہ ثریا کی زندگی ہے، اسے خود ہی گزارنے دو، مگر وہ چلتر بیگم یہ سمجھتی ہیں کہ میری زندگی وہ خود گزاریں۔ اب تو سگے بیٹے بھی اپنی ماؤں کے نہیں رہے...... اور وہ سوتیلے کو بھی اپنی انگلی کا چھلا بنانا چاہتی ہیں۔ بنالیں بے وقوف وہ شاہنواز کو، مگر میری آہ تو ایک دن انہیں لگے گی ہی۔‘‘ ثریا زارو قطار روتے ہوئے بولی۔

’’انشاء اللہ ضرور لگے گی۔‘‘ صابرہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

’’تم یقین نہیں کرسکتیں میرے سر میں ایسی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں کہ سر چکرا رہا ہے۔‘‘ ثریا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو دباتے ہوئے کہا۔

’’اس لیے اچ تو میں بولی تھی آپ کو پیٹ ہے۔‘‘ صابرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’حد ہوگئی ہے تمہاری سوچ پر بھی، اب بڑھاپے میں...... اپنا تماشا بنواؤں گی کیا؟‘‘

’’کیوں بڑی عمر کی عورتاں کے بچے کو ہوتے۔‘‘ صابرہ کا لہجہ معصومیت بھرا تھا۔

’’ہوتے ہوں گے، مگر میری فیملی تو مکمل ہے۔‘‘

’’سچی بولتیوں، آپ ایک بچہ پیدا کرلو۔ شاہنواز بھائی پورے آپ کے ہوں گے۔‘‘

’’اب میرے ساتھ بکواس تو کرو نہیں تم...... اف...... میرا سر......‘‘ سر کو دباتے ہوئے وہ صابرہ کو سرزنش کرتے ہوئے رک سی گئی۔

’’بھابی، میں سر دبا دیوں۔‘‘

’’نہیں...... تم رہنے دو۔‘‘ وہ تکلفاً بولی اور تکیے پر سر ڈال دیا۔

’’پن آپ ایسا پڑ گئے تو اچھا نہیں دکھرا، دبادی میں ذرا سا تو میرا کیا کام بڑھ جائیں گا۔‘‘

’’اچھا دبا دو۔‘‘ بالوں سے کلپ نکال کر اس نے بال کھول دیئے۔ چھوٹے چھوٹے، الجھے ہوئے بال اس کی گردن پر پھیل گئے۔

صابرہ نے اپنی پوروں سے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو بال گیلے تھے۔ ’’بھابی بالاں گلے (گیلے) ہیں بول کے بی سر دکھ رہا ہوئیں گا۔‘‘

’’ہاں نہا کر بال یونہی لپیٹ لیے تھے۔‘‘ ثریا نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

صابرہ ہلکے ہاتھ سے سر کو دبانے لگی۔

’’صابرہ تمہارے ہاتھوں سے بہت آرام مل رہا ہے۔‘‘

’’ابھی دومنٹ میں سارا دردواڑن چھو ہو جائیں گا...... مگر اب میرے کو بتاؤ ناں آپ، اصل معاملہ کیا ہوا ہے۔‘‘ صابرہ کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ثریا پر کیا افتاد آپڑی ہے۔

’’یہ ہماری ساس صاحبہ جو ہمہ وقت مظلومیت کا اشتہار بنی پھرتی ہیں، کسی بابے سے عمل کروا کے شاہنواز کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔‘‘ ثریا نے رازداری سے صحیح خبر سنائی۔

’’ارے چھوڑیئے بھابی آپ یہ باتاں، شاہنواز بھائی کوئی جن تھوڑی ناں تھے جو وہ اپنے خابواچ (قابو میں) کرلیئے۔‘‘ صابرہ نے ٹھٹھا لگا کر کہا۔

’’ہر شوہر کوئی جن سے کم ہوتا ہے، ہماری اماں تو ابا کو بھوت تک رہتی تھیں، ان کو جب بھی غصہ آتا تو وہ کہتیں، ارے ان کا کیا ہے، یہ تو پل میں اولیاء پل میں بھوت!‘‘

’’یہ تو مثالاں میں بول کے بولتے، سچی میں تو ایسا اچ نہیں ہوتا۔ شاہنواز بھائی تو بہوت اچھے دکھتے۔ لگتا ہے کہ آپ کو اڑا اڑی میں کوئی باتاں غلط اچ لگ گئیں۔ ایسا کائے کو انہوں کرتے۔‘‘ صابرہ کو کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا، آخر اٹھارہ سالہ زن مریدی کے مظاہرے وہ کیونکر بھول سکتی تھی۔

’’اونہہ! تم سے بات کرنا تو دیوار سے سر پھوڑنا ہے۔ سیدھی بات تمہاری سمجھ میں کہاں آتی ہے۔‘‘ ثریا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور صابرہ ہنس کر اپنے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

’’ہاؤ...... کیا اچ بولتے یہ لوگاں......‘‘

ادھر شائستہ بیگم کے کمرے میں شاہنواز ان سے پوچھ رہا تھا۔

’’پلیز امی بتایئے ناں، کیا بات ہے؟‘‘ شاہنواز کا لہجہ ہی نیا نیا سا تھا۔ اس انداز میں تو کبھی اس نے ان سے بات نہیں کی تھی۔

اب وہ شائستہ بیگم کی آنکھوں کے آنسو اپنی پوروں سے پونچھ رہا تھا۔

’’سائرہ کے سسرال والوں کی باتیں، جو وہ دوسروں سے کررہے ہیں، مجھ تک بھی پہنچ رہی ہیں کہ وہ لوگ اسے بسانا نہیں چاہتے، بلکہ ان کے ہاں طلاق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لڑکے کی بہنیں تو جاوید کے لیے دوسری لڑکی دیکھ رہی ہیں۔‘‘ وہ دکھ سے بولیں۔

’’آپ نے ایسی بات سنی تھی، تو مجھے بتانا چاہیے تھا۔‘‘

’’بیٹا تم کیا کرلیتے، کوئی کسی کا نصیب کیسے بنا سکتا ہے۔‘‘

’’میں جا کر پوچھتا ہوں، وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں دوسروں کی باتوں پر کلی یقین نہیں کرنا چاہیے، آج کل زیادہ تر لوگ بے پر کی اڑایا کرتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید وہ لالچی قسم کے لوگ ہیں۔ سائرہ کا جہیز ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا ہوگا، اگر ایسی بات ہوئی تو میں سائرہ کے نام کچھ کیش فکسڈ کرادوں گا، تاکہ اس کی ماہانہ آمدنی بھی ملتی رہے اور اصل رقم ہماری بہن کے نام محفوظ رہے۔ آپ کی یہی خواہش ہے ناں کہ سائرہ اپنے گھر میں چلی جائے اور وہاں ہنسی خوشی رہے۔‘‘

’’بیٹا، کسی بھی ماں کی اس کے علاوہ کیا آرزو ہوسکتی ہے۔‘‘

’’میں مفاہمت کی کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی ضرور کوشش کروں گا۔‘‘

"وعدہ کرو بیٹا کہ معاملہ سہولت سے طے کرو گے، غصے سے نہیں۔" شائستہ بیگم کا دل نہ جانے کیوں بے چین سا تھا۔

"آپ بے فکر رہیے امی، جو آپ چاہتی ہیں، انشاء اللہ وہی ہوگا۔" شاہنواز نے ان کے بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی اپنی سسرال میں عزت سے رہے، تو صرف ماں کو ہی اچھا نہیں لگتا، بہن بھائیوں کو بھی اچھا لگتا ہے۔ اس کے میکے کے دوسرے لوگوں کو بھی اچھا لگتا ہے......اور......"

"آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں، ہم لوگ کوئی لڑائی جھگڑا کرنے تھوڑی جا رہے ہیں، ہم تو صلح صفائی کی غرض سے جا رہے ہیں اور جب ہم وہاں سے آئیں گے تو نہ صرف آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی بلکہ سائرہ کی بھی۔" شاہنواز نے ماں کی بات کاٹ کر انہیں تسلی دی۔

"کتنی عجیب بات ہے، ہمیں سائرہ کی سسرال میں بہت پہلے جانا چاہیے تھا، اس کو گھر بیٹھے اتنے مہینے ہو گئے ہمیں آج خیال آیا ہے۔" دل نواز نے تاسف سے کہا۔

"جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے، وہاں سسرال والے چڑھ چڑھ کر آتے ہیں اور ہم دو بھائیوں کی موجودگی میں انہوں نے ہماری معصوم سی بہن کو گھر بٹھا دیا اور ہم ایک دفعہ بھی پوچھنے نہیں گئے، کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟" شاہنواز انتہائی دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"چلو اب جا تو رہے ہو۔ اللہ بس خیر کی خبر لائے، اور میری بچی کے سارے دکھ ختم ہو جائیں۔" شائستہ بیگم نے دونوں بیٹوں سے کہا۔ "ہاں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ جوش سے بات مت کرنا، ہوش سے کرنا۔"

☆☆☆

وہ لوگ ان دونوں کو دیکھ کر یک دم بوکھلا سے گئے۔ سائرہ کے گھر بیٹھنے کے بعد پہلی مرتبہ دونوں بھائی اس کی سسرال جو گئے تھے۔

"آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے۔ کب آ رہے ہیں آپ لوگ؟" شاہنواز نے جاوید کے ابا سے پوچھا۔

"ہمارا تو کوئی پروگرام نہیں ہے......اگر ہوگا بھی تو تمہیں کیوں بتائیں؟ تم کس بارے میں پوچھ رہے ہو؟" بڑے میاں نے چندراتے ہوئے کہا۔

"اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا انکل ہم نے آپ سے، ظاہر ہے کہ ہم اپنی بہن کے بارے میں ہی پوچھنے آئے ہیں۔ جاوید خود چھوڑ کر گھر گئے اور پھر لینے نہیں آئے۔ آج ہم یہی کہنے آئے ہیں، اختلافات ہر گھر میں ہو جاتے ہیں، مگر ان کو ختم کر دینا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ہر گھر کا ماحول مختلف ہوتا ہے، نئی آنے والی کو ہر چیز پہلے مشکل لگتی ہے، مگر بعد میں وہ اس کی عادی ہو جاتی ہے۔ ہماری بہن سائرہ بے وقوف ضرور ہے، مگر بد لحاظ نہیں ہے، اس کی کوتاہیوں کو آپ سب نظر انداز کر دیجیے، وہ آئندہ کسی کو بھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گی اور آپ لوگ بھی اسے اپنے گھر کے فرد کی طرح اپنے گلے سے لگا لیجیے۔"

"نہیں بھئی ہم آپا دھاپی والی لڑکی کو کیسے اپنے گھر میں لا سکتے ہیں اور پھر اسے گلے سے بھی لگا لیں۔ ایسے باؤلے نہیں ہیں ہم۔" ساس نے جیسے فضیحتے سنانے کا آغاز کر دیا۔

"ہم تو اسے اپنے گھر میں بھی گھسنے نہ دیں۔ ایسی فتنی بہن تمہاری نہ کبھی دیکھی نہ کبھی سنی۔"

"میں اپنی تنخواہ نہیں دوں گی، میرا خرچ تم چلاؤ، تمہاری بہنیں سلائی کرتی ہیں، میں نہیں کروں گی۔" انہوں نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان، بہت سے معاملات صرف میاں بیوی سے متعلقہ ہوتے ہیں، اس میں دوسرے لوگوں کو نہ دلچسپی لینی چاہیے اور نہ دخل دینا چاہیے۔ کوئی بھی بیوی اگر کماتی ہے تو وہ لامحالہ کسی نہ کسی طریقے سے اپنے گھر پر ہی لگاتی ہے اور سائرہ کے میکے والوں کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ان پر خرچ کرنے کا سوچے گی، ہماری تو ابھی ایک ہی بہن کی شادی ہوئی ہے، ہم نے تو ابھی اپنے ارمان تک پورے نہیں کیے۔ رہی شوہر کی بات، تو اس کا اپنی بیوی کا خرچ اٹھانا لازمی ہے، وہ اس سے کیسے پہلوتہی کر سکتا ہے۔" شاہنواز دھیمے اور نرم لہجے میں بول رہا تھا۔

جبکہ سائرہ کے سسرال والوں کے لہجے اور انداز تمسخر بھرے تھے، شاید وہ یہ سوچ بیٹھے تھے کہ انہیں سائرہ کو بھی ذلیل کرنا ہے اور اس کے بھائیوں کو بھی۔

"ارے بھیا، تم تو ناحق آئے۔ گھر بسانے والیوں کے یہ وتیرے نہیں ہوتے۔ اس کی تو یہ عادت ہے کہ چمڑی چلی جائے پر دمڑی نہ جائے۔"

"اسکول سے تنخواہ ملی تو شاید اپنی اماں کو دے آئیں، اور میاں کو جھنڈی دکھا دی اور کنجوس اتنی کہ ماں سے ملنے ان کے گھر جاتیں تو ہمیشہ بھوکی آتیں۔ ہمارے گھر آ کر کھانا کھاتیں......اور اپنے پیسے خوب سینت سینت کر رکھتیں۔ میرے کمرے کا پنکھا خراب ہوا، پانی کی موٹر جلی، ٹیوب لائٹس گر کر ٹوٹیں، گیٹ کا کنڈا ٹوٹا، کسی بھی چیز کے لیے میاں کو پیسے نہیں دیے، میاں بے چارہ مانگ کر تھک گیا، مگر سیانیت سے کہہ دیا کہ اسکول میں کمیٹی میں دے دیے، میرے پاس دمڑی نہیں ہے۔ ایسی ہوتی ہیں بہوئیں...... جو گھر کو نہ دیکھیں، گھر کی چیزوں کو نہ دیکھیں، تو کماتی ہوئی بہو لانے کا ہمیں کیا فائدہ ہوا۔" ساس صاحبہ کہانی کے سے انداز میں سائرہ کی شکایتوں کا پوٹلا کھول رہی تھیں۔

"کیا آپ کا یہ خیال تھا کہ ہماری بہن آ کر آپ سب کے خرچے بھی برداشت کرے، اسی لیے آپ نے ایک ملازمت کرنے والی بہو کا انتخاب کیا تھا۔" دلنواز کو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ خاصا تلخ سا ہو گیا۔

"ارے دنیا کی بہوئیں وہ وہ خدمتیں کرتی ہیں کہ دیکھتے رہ جاؤ۔ تن سے، من سے اور دھن سے بھی۔ اپنی نندوں تک کا جہیز جمع کرتی ہیں اور ہمارے خاندان میں تو ایسی بھی ہیں جو اپنا جہیز اٹھا کر اپنی نندوں کو دے دیتی ہیں۔"

"تو پھر آپ اپنے خاندان میں سے ہی لے آتیں، ناحق باہر کی لڑکی لائیں، اسے بھی تکلیف ہوئی اور آپ کو بھی۔" دلنواز کہہ گیا۔

"ہم تو اپنی خالہ کی بیٹی کو لے آتے، مگر انہیں پتا تھا کہ جاوید بھائی بیمار رہتے ہیں۔ وہ تو ہم سے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ بیمار آدمی کی شادی نہیں کرنی چاہیے، اس لیے ان کے ہاں رشتہ ہی نہیں دیا تھا۔" چھوٹی نند نے روانی میں کہہ دیا۔

یہ ان دونوں کے لیے نئی اطلاع تھی۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔

"جاوید کو کیا بیماری ہے؟" اب دل نواز کسی وکیل کی طرح جرح کر رہا تھا۔

"ارے بھئی آج کل کون ایسا ہے جو کلی طور پر صحت مند ہے، ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگا ہوا ہے۔ تم

میرے سامنے کوئی ایک شخص لے آؤ، جس نے آج تک دوا نہ پی ہو اور اس کا ڈاکٹر نے علاج نہ کیا ہو۔" جاوید کے ابا سگریٹ کے کش لیتے ہوئے فلسفہ گڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"وہ الگ بات ہے، مگر جاوید کو کیا بیماری ہے؟" دلنواز کی تفتیش جاری تھی۔

"ارے وہی نزلہ بخار اسے بچپن سے ہے، ٹھنڈے کمرے سے باہر آئے تو چھینکیں شروع۔ ٹھنڈی چیزیں کھا لے تو کھانسی شروع۔ احتیاط کرتا نہیں ہے اس لیے لوٹ پلٹ کر بیماریاں آ جاتی ہیں۔" ان کی اماں نے بے پروائی سے کہا۔

"پھر بھی ڈاکٹر سے علاج کروانا چاہیے تاکہ طبیعت بحال رہے۔" شاہنواز نے کہا "بیماری کو بھی بے پروائی سے نہیں لینا چاہیے۔"

"ارے تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم بے پروا ہیں۔ ڈاکٹر مبین سے باقاعدگی سے علاج کروایا ہے۔" ساس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اوہ نفسیاتی مریض ہیں محترم...... جب ہی ان کا اپنا دماغ نہیں چلا اور جیسا ماں باپ نے کہا، ویسا ہی انہوں نے کیا اور ہماری بہن کو گھر بٹھا دیا۔" دل نواز نے بے اختیار کہا۔

"خالہ جان، جاوید اگر بیمار ہیں تو پہلے آپ ان کا مکمل علاج کروایئے۔ اب کوئی ایسا مرض نہیں رہا ہے، جو لاعلاج ہو۔ اب دوسری بات کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ ہمیں تو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہے کہ جاوید نفسیاتی مریض ہیں۔" شاہنواز کے لہجے میں دکھ کی شدتیں گھلی ہوئی تھیں۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" دلنواز نے اٹھ کر اجازت چاہی۔

"ٹھہریں......! ایک منٹ کے لیے رکیے آپ لوگ!" جاوید جو اندر کمرے میں بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا، غصے میں لال چہرے کے ساتھ باہر آیا اور چیخ کر بولا۔

"ہاں...... ہاں میں نفسیاتی مریض ہوں۔ مجھے بجلی بھی لگتی رہی ہے۔ بچپن میں پاگل خانے میں بھی داخل کرادیا گیا تھا...... مگر اتنا پاگل نہیں ہوں، جو آپ کی بہن جیسی فضول خرچ عورت کو برداشت کروں...... مجھے علاج کی نہ پہلے ضرورت تھی اور نہ اب ہے۔ میں بقائمی ہوش و حواس آپ سب کے سامنے حلفیہ کہتا ہوں......

میں سائرہ کو طلاق دیتا ہوں!

میں سائرہ کو طلاق دیتا ہوں!

میں سائرہ کو طلاق دیتا ہوں!"

☆☆☆

منہدم عمارتوں پر بجلی گرے یا طوفان ٹوٹے وہ متاثر نہیں ہوتیں مگر ہرے بھرے آشیاں پر تو تیز ہوا کا جھونکا بھی قیامت ڈھا دیتا ہے۔

اور سائرہ بھی وہ بدنصیب دلہن تھی، جس کے جہیز کے جوڑے ابھی پلاسٹک کی تھیلیوں سے نہیں نکلے تھے۔

اس نے اپنے تن کو ابھی قوس قزح کے رنگوں سے سجایا تک نہیں تھا کہ اس کی ہستی پر برق آ گری تھی۔

پڑوسن کو شاید ثریا بھابی سے کچھ سن گن ملی تو صابرہ کے پاس آ کر کسی چسکے والی کہانی سننے کے لیے پوچھ رہی تھیں (جسے محلے میں آگے بھی پہنچانا تھا)

"ارے کیا افتاد پڑی تمہاری نند سائرہ پر، جو اس کے سسرال والوں نے قصہ ہی پاک کر دیا۔"

"اس کو خسمت (قسمت) ہی بولتے۔"

"مگر ثریا تو بتا رہی تھی، جاوید نے کھڑے کھڑے طلاق دے دی......!"

"اب کیا بولوں پاشا، بولنے کو مونہہ اچ کہاں رہ گیا، بڑے ظالم لوگاں تھے وہ......"

"سائرہ کون سی کم ہو گی، تم تو بھاوج ہو، تم سے زیادہ کون جانے گا اس کی عادتوں کو، اب تم کھول کر بتاؤ اصل بات کہ جو اس کے سسرال والوں نے اس کے ساتھ کیا، صحیح کیا؟ ثریا بھابی تو کہہ رہی تھیں سیر کو سوا سیر ملے تھے، یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"بے فضول کی باتاں نکو کرو۔ میں سچ بولتیوں سائرہ بہت اچھی ہے۔ انوں میرے سنگات بہت اچھی رہتی۔" صابرہ نے تنک کر کہا۔

چٹپٹی باتیں اگر طول نہ کھینچیں تو سارا مزہ ختم ہو جاتا ہے۔ صابرہ کے لہجے کی مار نے ان کے تمام تفتیشی عزائم ر پانی پھیر دیا۔

"اچھا میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی" پڑوسن نے بھی گود میں پڑا دوپٹا کندھے پر ٹانگا اور صابرہ کے کمرے سے ل کر ثریا کے پورشن میں داخل ہو گئیں۔ محلے میں گھومنے کا فائدہ ہی کیا اگر دو جملے آگے سنانے کے لیے بھی نہ ملیں۔

وہاں ثریا نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

یہ سب دیکھ کر صابرہ نے مائی کے ہاتھ کے دھلے ہوئے چکنے برتنوں کو کیبنٹ سے نکال کر باورچی خانے ں پھینکنا شروع کر دیا۔ دیگچیوں کے شور نے سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔

ثریا بھی پڑوسن کو چھوڑ کر آنگن میں چلی آئی جہاں صابرہ مائی کی کھینچائی کر رہی تھی۔

اور جب ثریا نے بھی صابرہ کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کی تو بے چاری پڑوسن بے نیل مرام برا سا منہ ناتے ہوئے اپنے گھر روانہ ہو گئیں۔ آج تو ان کا آنا ہی بیکار رہا تھا۔

"دوسروں کے دکھاں پر لوگاں کتے خوش دکھتے۔" صابرہ اپنے دل میں سوچتے ہوئے، سائرہ کے پاس جا ٹھی۔ ان دنوں وہ اپنے کمرے سے باہر تک نہیں آ رہی تھی اور خاموشی کا لبادہ اس نے از خود اوڑھ لیا تھا۔

عورت کے دل میں کم سنی سے ہی ہزاروں خوف بھر دیئے جاتے ہیں۔

جوانی کو وہ کچی ٹھلیا سمجھنے لگتی ہے، جسے قدم قدم پر کنکروں سے واسطہ پڑتا ہے، مگر اس کی تو شادی ہی ایک کچی ہانڈی بن گئی تھی۔

جب وہ بیاہ کر جاوید کے گھر گئی تو عجیب نفسا نفسی والا ماحول تھا، جہاں ذلالتیں بھی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ موجود تھیں۔

”سائرہ...... یہ جامنی سوٹ جو بری کا ہے، یہ تم پر نہیں اٹھے گا۔“ ساس اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے کہتی۔

”تو پھر......؟“ وہ استفہامیہ لہجے میں پوچھتی۔

”یہ میری بیٹی کو دے دو، اس کا رنگ صاف ہے، تم سے زیادہ اچھا لگے گا اس پر۔ تمہارا رنگ سانولا نہیں، کالا ہے۔“

”دے دیں......“ اس کا لہجہ بجھ سا جاتا۔

”ٹیکا، جھومر، نتھ کسی سے مانگ کر چڑھائی تھی، واپس کر دو۔ تقاضے پر تقاضا آ رہا ہے کہ ابھی تک دل نہیں بھرا تمہاری دلہن کا۔“

”جی، لے لیں۔“

”ہاں سونے کا سیٹ میری نند کا ہے، وہ بھی واپس کرنا ہوگا۔ ایسا بھاری سیٹ تو تمہارے میکے کا بھی نہیں ہے۔ تم نے خوب شو مار لی۔“

”آپ کی طرف سے تو مجھے سونے کا ایک تار نہیں ملا۔“ نہ جانے کیسے یہ جملہ اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔

”اپنا کلیجے کا ٹکڑا تجھے سونپ دیا، پھر بھی تسلی نہیں ہو رہی۔ ہم نے تو سنا تھا کہ بیوی کے لیے شوہر سے بڑی کوئی دولت نہیں ہوتی، مگر تمہارے ساتھ تو ایسا نہیں لگ رہا، تمہیں تو ہر وقت ٹکڑے چاہئیں۔“

”نہیں امی، یہ میں نے کب کہا۔“ وہ پریشان ہو کر کہتی۔

”کہنے کی کیا ضرورت ہے، تمہاری شکل پر ٹھیکرے برس رہے ہیں۔ کتنی تم خوش ہو رہی ہو، صاف نظر آ رہا ہے۔“

تب وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔

وہ اس کی شادی کا گیارھواں روز تھا، گھر میں پکی دال روٹی اس سے کھائی نہ گئی۔ جاوید اس کے لیے باہر سے ایک چکن تکہ اور پراٹھا لے آیا۔

وہ اپنے بیڈروم میں اس سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہی تھی۔ جاوید اس کی کسی بات پر شاید ہنس رہا تھا کہ اس کی نندیں کسی فوج کی طرح مارچ کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں ”اچھا یہاں بند کمرے میں دعوت ہو رہی ہے۔

اتنی جلدی بدل گئے بھائی آپ...... اپنی بہنیں یاد نہیں آئیں آپ کو......“

”کیا مطلب!“ جاوید گڑبڑا سا گیا۔

”اپنی بیوی کو چھپ چھپا کر تر مال کھلا رہے ہیں، شرم آنی چاہیے آپ کو۔“

اس سے پہلے کہ جاوید اپنی چھوٹی بہنوں کو کوئی تلخ و ترش کہتا۔ ساس صاحبہ کمرے میں وارد ہو کر بولیں۔

”یہ چوری چکاری کی عادت تو آنے والی ڈال رہی ہے۔ اس میں میرے جاوید کا کیا قصور۔“

”میں پوچھتی ہوں کہ کون سے نواب کے گھر سے آئی ہو، جو دال حلق سے نہیں اترتی تو ہوٹل بازی کرتی ہو۔ تمہاری اماں، تمہیں کن کن ہوٹلوں میں لے کر جاتی تھیں، جو آج تم نے میرے بچے کو بہکایا۔“

”جی وہ تو خود لائے ہیں، میرے لیے......“ وہ سراسیمہ سی ہو گئی تھی۔ ماحول اس حد تک بھی نیچ ہو سکتا ہے، اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

”آج تو ٹھونس لو، مگر آئندہ خیال رکھنا، میری بچیاں بھی ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کو کھلائے بنا تمہیں ہی کھلاتی رہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلتی بنی تھیں اور اس کے حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔

وہ جلدی سونے کے لیے لیٹ جاتی تو دروازہ پیٹ دیا جاتا۔

”سائرہ ایسی بے غیرتی مت دکھاؤ، اس گھر میں جوان بیٹیاں رہتی ہیں، ان کا ہی کم از کم لحاظ کر لیا کرو۔“

”جی......“ وہ شرم اور غم سے سفید سی پڑ جاتی۔

”یہ دس بجے رات کو کون سا سونے کا ٹائم ہوتا ہے، جو تم میاں کو لے کر کمرے میں چلی جاتی ہو۔ ارے مت بناؤ میرے بچے کو پاگل، وہ بہت سیدھا ہے۔“

چھٹی کے دن اٹھنے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو ایسے ایسے جملے اسے مارے جاتے کہ وہ لہولہان سی ہو جاتی اور مارے شرم کے اس سے نظریں نہ اٹھائی جاتیں۔

وہ جتنے دن سسرال میں رہی ایک خوف کی انی اس کے کلیجے میں گڑی رہی۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ویسا نہ ہو جائے۔

اور جب اسے گھر بٹھا دیا گیا تو اس کے خوف نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ وسوسے اور واہمے ہر وقت اس کا پیچھا کرتے رہتے۔

اس کے سوتیلے بھائیوں نے کبھی اس کے کسی مسئلے میں دلچسپی نہیں لی تھی اور جب لی تو امید و بیم کا ایک باریک تار جو ان دونوں کو جوڑے ہوئے تھا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔

شائستہ بیگم اس تمام معاملے کو قسمت کے خانے میں رکھ رہی تھیں۔

فریال، بہن کا دکھ جان کر اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ گیا تھا۔

”پاگل ہو تم، اچھا ہے ایک پاگل سے مجھے نجات ملی، اس کے ساتھ رہتی تو نہ جانے کتنی تکلیفیں سہنا پڑتیں۔“ اس نے سکون سے کہا تھا۔

سائرہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں کسی کو یہ احساس ہو کہ طلاق ہونے کا وہ غم منا رہی

جس اسکول میں وہ جاب کرتی تھی، وہاں بھی اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کی ہستی پر کوئی بم گر چکا

اس کی ساتھی ٹیچرز کو یہ پتا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کچھ خفگی چل رہی ہے، جس بنا پر سائرہ اپنے میکے بیٹھی ہوئی ہے مگر انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ اسے طلاق ہو گئی ہے۔

”ارے واہ! آج سفید سوٹ میں تو تم کالج گرل لگ رہی ہو، تم سے دو چوٹیاں لال ربن کے ساتھ بنا کر شولڈر بیگ لے کر اپنے جاوید کے گھر چلی جاؤ ناں، تو وہ پہلی بات تم سے یہی کرے گا، کہاں ہو جانم......؟

اب جلدی سے گھر چلی آؤ۔"

"ہاں' کیا تم نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔" ایک ٹیچر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"سائرہ بہت سلم ہوگئی ہے' جاوید ایک نظر اب دیکھ لے تو ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگنے بیٹھ جائے گا اور ا کھاتے میں ساری غلطیاں ڈال کر کہے گا۔ بیگم مجھے معاف کردو' جو تم کہو گی' میں ویسا ہی کروں گا' مگر پلیز اب اپنے گھر چلی چلو کہ تم بن جیا اداس ہے۔" دوسری ٹیچر نے بھی شوشا چھوڑا۔

اور وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے اپنی کلاس لینے چل دی۔

اب اس کے پاس کہنے کے لیے رکھا ہی کیا تھا کہ نہ وہ اس کے گھر جا سکے گی اور نہ ہی وہ اب اس کو منا آئے گا کہ اس کے تین بول نے تو اس کے مابین کا ہر رشتہ ہی ختم کر دیا تھا۔

اور جب وہ دکھاوا کرتے کرتے تھک گئی تو بیمار پڑ گئی۔

فریال اس کا دھیان بٹانے کے لیے دل سے گڑھ کر مزے مزے کے قصے سناتی' مگر اس کے لب مسکرا پر آمادہ نہ ہوتے۔

اس کا ذہن ہر وقت سائیں سائیں سا کرتا اور وہ چپ چاپ آسمان کو تکتی رہتی۔

ان دنوں گھر کی فضا عجیب سوگوار سی ہو گئی تھی۔

شائستہ بیگم بیٹی کے دکھ کو سمجھ رہی تھیں اور اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔

فریال اپنی بہن کو دیکھ کر مسکراتی تو کمرے سے نکلتے ہی اس کی آنکھوں میں ساون آ موجود ہوتا۔

یہی کیفیت شائستہ بیگم کی تھی۔ ان کے لبوں سے پہلے آنکھیں جل تھل مچا رہی تھیں۔

مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ غم کاہے کا منایا جا رہا ہے' سائرہ کی تو اسی دن علیحدگی ہو گئی تھی' جب جاوید ا ہمارے ہاں پہنچ گئے تھے۔ ثریا کئی بار سفا کی سے کہہ چکی تھیں۔

ثریا کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ یہ بات اول دن سے سب کو پتا تھی' سائرہ کے سسرال والے لڑاکو قسم کے ذرا ذرا سی بات پر آستین چڑھا کر آتے تھے۔ نادانستگی میں غلط لوگوں سے ناتا جڑ گیا تھا۔

اور یہ بھی معلوم تھا کہ سائرہ کو گھر میں بٹھا کر ان کا ارادہ کوئی اچھا نہیں ہے' ادھر ادھر سے مسلسل ایسی ہی خبر شائستہ بیگم کے پاس بھی پہنچ رہی تھین' جن سے وہ خاصی پریشان بھی تھیں۔

مگر دل سے یقین نہیں تھا۔ شرفا میں بھلا ایسا کہاں ہوا کرتا ہے اور اس خاندان میں آج تک ایسا ہوا نہیں تھا۔

شادی کرتے وقت تو کسی کے ذہن میں یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ آئندہ ایسا سلوک کیا جائے گا۔

اور پھر وہ لڑکیاں جو گھر بٹھا دی جاتی ہیں، ان کے تصورات کا ہالہ بھی گھر جوڑنے کا ہی ہوا کرتا ہے۔

اور سائرہ بھی ایسا ہی سوچا کرتی تھی اور ان دنوں بھی وہ بیمار سی اپنی سوچوں کو پرے دھکیل رہی تھی۔ کیا کچھ سوچتی رہی تھی۔

اس کی ایک کمزور سی روشنی سے اس نے کتنے بہت سے فانوس روشن کر رکھے تھے۔

وہ جب اپنے گھر چلی جائے گی تو اپنے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کرے گی۔ اپنی نئی بیڈ شیٹس استعمال کر گی۔ میرون کلر کا کارپٹ ڈالے گی' اسی رنگ کے جھالر والے پردے لگائے گی۔ کمرے میں سجاوٹ کی کوئی چ نہیں ہے' وہ بھی لا کر رکھے گی' اپنی اور جاوید کی بڑی سی تصویر فریم کروا کے سامنے دیوار پر لگائے گی' تا کہ صبح اٹھ

جاوید کی نظر سامنے تصویر پر پڑے' کمرے میں اگر وہ موجود بھی نہ ہو' مگر وہ اس کو نظر آتی رہے۔

جاوید کو اس کے بال پسند ہیں' تو روزانہ شام کو اپنے بال کھلے رکھا کرے گی۔ اس کا قد لمبا اور جسم دبلا ہے' وہ ساڑھی پہننے کا شوق پورا کرے گی' روزانہ نت نئی رنگوں کی ساڑھیاں مختلف اسٹائل سے پہنا کرے گی۔

بالوں میں موتیے کی لڑی ضرور ہوا کرے گی اور بیڈ پر گلاب کی پتیوں سے جاوید بھی لکھا کرے گی۔

مگر یہاں تو ایک دم ہی فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ ساری امید کی کونپلیں یک دم مرجھا سی گئی تھیں اور سائرہ کی رنگت پیلی سی پڑ گئی تھی۔

وہ اپنے آپ کو اتنی ناتواں سی محسوس کر رہی تھی کہ قدم تک بڑھایا نہیں جا رہا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایسی مریضہ ہے جس کی بیماری میں ہی اسپتال سے چھٹی ہو چکی ہو۔

اپنے گھر کے ماحول سے وہ واقف تھی' اپنی بھابیوں کے تیور کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہ رہی تھی کہ موضوع سخن اس کی ذات ٹھہرے۔

وہ اپنے آپ کو کھینچ کر آنگن تک لاتی اور گملوں میں پانی دیتے ہوئے اپنی توجہ بٹاتی، تب اسے گملے کا کھلا پھول ایسی آنکھ سے مشابہ لگتا جس سے صرف آنسو بہہ رہے ہوں۔

ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھتی تو ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کہیں کہرام مچا ہوا ہو، تب پریشان ہو کر وہ اپنا سر تھام لیتی اور آنکھیں دریا بہا دیتیں۔

خدایا میں کیا کروں۔ میرا کیا قصور ہے۔ اگر میری ذات بے نشاں ہو گئی ہے' تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔

وہ اپنے آپ سے پوچھ پوچھ کر تھک چکی تھی مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ تب اس نے برش کے ساتھ رنگوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مصوری سے اسے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی اور اس کی ڈرائنگ بے حد عمدہ تھی مگر اس کی تصویریں اتنی شکستگی کی عکاسی کر رہی تھیں جنہیں دیکھ کر لبوں سے صرف آہ آزاد ہوتی تھی۔

"اللہ یہ کیسی تصویراں بنائی تم نے؟" صابرہ نے روتی' سسکتی عورت کا پورٹریٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے آنسو اس تصویر میں آ گئے ہیں شاید......" وہ زیر لب بولی۔

"نکورونا سائرہ تم...... تم تو چپ کر کو بیٹھ گئے' اپنے حق کے لیے دو باتاں بی نکو بولے۔" "تمہاری جگہ کوئی ہوتی ناں تو انوں کے ظلم جلدی اچ ساروں میں بوما بوم کر دیتی کہ یہ لوگاں ایسے ہیں' ویسے ہیں...... پھر...... کسی محفل میں یہ لوگاں مونہہ دکھانے کے قابل نکو رہ جاتے۔"

"بھابی' بعض لوگ ذلیل ہو کر بھی ذلت محسوس نہیں کیا کرتے ہیں۔"

"اس کا تو فیشن چل رہا ناں آج کل۔" صابرہ نے مسکرا کر کہا۔

"مگر میرا سفر شاید چند قدموں کا ہی تھا۔ جو جاوید نے مجھ سے یوں پیچھا چھڑا لیا۔"

"سائرہ' تم کو بے قصوری کی سزا ملی ہے' دیکھنا اچ ان لوگوں کے سامنے آئے گا۔"

"اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟"

"دل کو تسلی تو ملیں گی ناں۔"

"بھابی' یہ اطمینان' تسلی سکون اور عافیت جیسے جملے میری زندگی میں نہیں رہے ہیں۔"

"ایسا کائے کو سوچی تم...... ہم مر گئے کیا۔ ہمارے ہوتے بی کائے کو ایسا بولتی۔" صابرہ نے اسے کھینچ کر سینے سے لگایا۔ تو وہ اس کے شانے پر سر رکھے اپنی گھٹی گھٹی سسکیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسری طرف شاہنواز بھی خاصا دل گرفتہ سا تھا۔

''امی میں نے ایسا ہرگز نہیں چاہا تھا' مگر جاوید تو نہ جانے غصے میں کیا کچھ بکتا چلا گیا۔'' شاہنواز بار بار کھسیاتے ہوئے لہجے میں کہہ چکا تھا۔

''نہیں بیٹا، ایسا اس کی قسمت میں لکھا تھا' اس لیے ہوگیا۔ شائستہ بیگم نے شاہنواز سے یہی کہا تھا۔

''دیکھا...... میری آہ لی تھی ناں' کیسے ان کے آگے آیا' کتنا رلایا تھا بڑھیا نے مجھے۔ اب دیکھو کیسا رو رو کے گھر کو بھر رہی ہیں۔'' ثریا (بڑی بہو) اپنی آپا سے فون پر سرشاری سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں بھئی، یہ ہمارے باباجی کا کمال ہے۔ انہوں نے ایسا پڑھ کر پھونکا' تمہاری ایک نند تو ان کی آگ میں ہی جھلس گئی۔'' بڑی آپا نے زعم بھرے لہجے میں کہا۔

''کام تو خیر انہوں نے اچھا کیا' مگر میرا مسئلہ تو حل نہیں ہوا ناں۔'' ثریا نے متفکر سے لہجے میں کہا۔

''تمہاری نندیں رو رو کر بے حال ہو رہی ہیں' پھر بھی تمہاری تشفی نہیں ہو رہی۔'' آپا نے ہنس کر کہا۔

''جو میں چاہ رہی تھی وہ تو نہیں ہوا آپا۔''

''یہ بتاؤ پہلے کمزور درخت زمین بوس ہوتا ہے یا تناور درخت؟'' آپا نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ کمزور درخت ہی پہلے گرے گا۔'' وہ الجھتے ہوئے بولی۔

''بس تم بھی یہ سمجھ لو' سائرہ کے اس غم نے ان سب کو اندر سے توڑ کے رکھ دیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ میں ہی الجھی رہیں گی' تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گی ہاں...... ہمارے بابا کوئی معمولی نہیں تھے۔ خود چلے کاٹے انہوں نے جب ہی تو یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خود ہی سوچو کہ پہلے تم رو رہی تھیں اور اب وہ سب مل کر رو رہی ہیں۔''

''مگر پھر بھی یہ میرے مسئلے کا حل تو نہیں ہے ناں...... اب تو سائرہ کبھی ہمارا گھر چھوڑ کر جائے گی ہی نہیں۔ اپنے گھر چلی جاتی' تو زیادہ اچھا تھا ناں۔'' ثریا کو بھائیوں کے لاڈ پسند نہیں آرہے تھے' شاہنواز اپنی بہن کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنی بہن کی دلداریوں میں صرف ہو رہا تھا۔

''تم پریشان مت ہو' تمہاری یہ نندیں ایسی غارت ہوں گی کہ تمہیں نظر بھی نہیں آئیں گی۔''

''مگر کب......؟''

''بہت جلد۔'' آپا نے خوش خبری سنائی۔

''آپ کے منہ میں گھی شکر۔''

''مگر شکر سے پہلے باباجی کا محنتانہ پانچ ہزار دے جاؤ۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں ہاں۔''

''میاں کی جیب کاٹنے کا موقع تو ملنے دیں، وہ ملے گا جب ہی تو دینے آؤں گی۔''

''تمہاری کمیٹی بھی تو اس ماہ ملے گی' جو تم نے شاہنواز سے چھپ کر ڈالی ہے۔''

''اس کی تو میں اپنی چوڑیاں لوں گی آپا۔ ڈکیتی کے بعد سے ہاتھ خالی ڈھنڈار سے پڑے ہیں۔''

''چوڑیاں بعد میں لے لینا' پہلے بابا کے پیسے بھیجو۔ آگے بھی ان سے کام لینا ہے۔ کیا سوچیں گے وہ اپنے دل میں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مری ہوئی آواز میں ہامی بھرلی۔

☆☆☆

فریال اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اس نے نہ تو عدیل کو فون کیا تھا اور نہ ہی وہ ان راہوں پر گئی تھی جہاں عدیل سے ملنے کا کوئی امکان ہو۔ اس نے تو اپنے اس البم کی تمام تصویریں پھاڑ کر جلا دی تھیں' جن میں عدیل اس کے ہمراہ تھا۔ اس کے باوجود عدیل کسی ہوا کے مست جھونکے کی طرح اس کے خیالوں میں آنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

''فریال ہم نے ایک ساتھ کتنے سپنے دیکھے' کیا وہ سب ٹوٹ جائیں گے؟''

''ہاں سپنے ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔'' وہ اپنے آپ کو سمجھاتی۔

''فریال تمہارے بنا یہ جیون مجھے بڑا سونا سا لگتا ہے۔''

''مگر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

بستر پر آنکھیں موند کر لیٹتی تو وہ آنکھوں میں چھم سے آجاتا...... تو وہ جاگتی رہتی۔ اس کے سونے کے اوقات لم سے کم ہوتے جارہے تھے۔

کالج آتی تو اس کے چہرے پر ویرانیوں کا بسیرا ہوتا۔

''فریال کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟'' سہیلیاں پوچھا کرتیں۔

''ہاں' ملیریا بگڑ گیا ہے۔'' وہ ازخود باتیں بناتی۔

ایک دن وہ نگین کو اپنے اوپر گزرنے والی قیامت سے باخبر کرنا چاہتی تھی۔ دونوں سہیلیاں کالج سے چھٹی پر ایک ساتھ ہی چلی تھیں۔

فریال اپنے ذہن میں جملے ترتیب دے رہی تھی کہ کس طرح بات کا آغاز کرے۔

''فریال میرا نیا موبائل دیکھا تم نے۔'' نگین نے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اچھا ہے۔''

''اچھا نہیں' بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔'' نگین کھلکھلائی۔

''کیوں' اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ تصویر کھینچنے والے موبائل اب اتنے خاص تو نہیں رہے ہیں۔ قیمتاً بھی خاصے سستے ہوگئے ہیں۔ ہر دوسرے بندے کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔''

''یہ زبور نے مجھے دیا ہے' اس لیے بہت اچھا ہے۔'' نگین نے توضیح بیان کی۔ ''ہاں دیکھو اس کا نمبر کتنا ایزی ہے۔''

''تمہارا اپنا موبائل کہاں گیا؟ جو زبور کا موبائل دابے بیٹھی ہو۔ وہ بھی بہت اچھا تھا۔''

''پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ مل ہی نہیں رہا۔''

''اتنی بھول بھلکڑ کب سے ہوگئی ہو تم۔''

''یار' اب میں اپنے آپ کو بھول چکی ہوں' تو موبائل کہاں یاد رہتا۔'' نگین نے ہنس کر کہا۔

''ہوں......'' فریال نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کیا بات ہے' بڑی اداس سی ہو؟ نگین نے اس کے شکستہ لہجے کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں' وہی تو بتانا چاہ رہی تھی تمہیں۔''

''اچھا عدیل سے نوک جھونک ہوئی ہوگی۔ ہے ناں۔'' نگین نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری بات بھی کسی حد تک صحیح ہے۔'' فریال کا لہجہ غم سے لبالب بھر گیا۔

’’تمہاری عادت ہی ہے لڑنے بھڑنے کی‘ مت تنگ کیا کرخواہ مخواہ۔ نگین نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

’’تمہارا مشورہ نوٹ کرلیا ہے میں نے...... مگر یہ بات ایسی نہیں ہے‘ جیسی تم سمجھ رہی ہو۔‘‘

’’اچھا‘ پھر بکو......‘‘

فریال کا خیال تھا کہ وہ عدیل کے بارے میں ایک ایک بات سے اسے آگاہ کردے گی کہ سامنے سے زبور آتا دکھائی دیا اور نگین کے چہرے پر قوس قزح سی پھیل گئی۔

’’فریال تم چلو‘ میں آتی ہوں۔‘‘ وہ زبور کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔

زبور نے ایک نظر فریال کو دیکھا‘ ہاتھ ہلایا اور نگین کو ساتھ لیے آگے بڑھ گیا۔ کبھی میرا بھی یہی وتیرہ تھا‘ میں نگین کو نظر انداز کرتی ہوئی عدیل کے ساتھ چلی جایا کرتی تھی۔

وقت کیسے پلٹ پلٹ کر سامنے آتا ہے‘ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی جارہی تھی۔

وہ اپنی سوچوں میں ہی مست تھی کہ قریب گاڑی کے بریک چرچرائے۔ اس نے مڑ کر دیکھا‘ نگین کے ابا جی شاید کالج سے لوٹ کر آرہے تھے۔

’’بیٹا‘ نگین تمہارے ساتھ نہیں ہے۔‘‘ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

’’ہماری کلاس کا ایک گروپ میڈم نگہت کی طبیعت پوچھنے ان کے گھر گیا ہے۔ نگین بھی ان کے ساتھ گئی ہے۔‘‘

’’تم نہیں گئیں؟‘‘ ان کا لہجہ ہنوز حیرت زدہ تھا۔

’’انکل مجھے بخار آرہا ہے‘ اس لیے میں نہیں گئی۔‘‘

’’نگین کتنی غیر ذمے دار ہے‘ بتا کر بھی نہیں گئی۔ اب میں تو پریشان ہوجاتا ناں۔‘‘ انہوں نے کہا۔

’’نگین نے مجھے کہا تھا کہ میں گھر جا کر آپ کو فون کردوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئے۔

تب گھر پہنچ کر اس نے نگین کے موبائل پر میسج دیا کہ تم اپنے گھر آکر یہی بتاؤ گی کہ میڈم نگہت کو دیکھنے گئی تھیں اور میڈم کو دیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤ گی‘ ابا جی گھر پر ہیں۔

’’فریال پھپھو یہ آپ کی تصویر ہے۔‘‘ ثنا ایک کتاب میں سے تصویر نکالتے ہوئے اس کے پاس باورچی خانے میں پہنچ گئی۔

’’کون سی تصویر۔‘‘ فریال نے روٹی سینکتے ہوئے ایک نظر ڈالی تو دھک سے رہ گئی۔

وہ عدیل کے ساتھ کھڑی تھی‘ عدیل کا ایک ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔ فریال کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پارک کا کوئی خوب صورت سا گوشہ تھا۔

یہ تصویر کیسے بچ گئی‘ میں تو سب جلا چکی ہوں۔ وہ سوچ رہی تھی اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اتنی محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ کھنچوائی ہوئی تصویروں کو آگ میں جھونکا گیا تھا۔

’’اللہ پھپھو آپ کتنی پیاری لگ رہی ہیں ناں اس تصویر میں۔‘‘ ثنا نے کہا۔

’’میری تصویر...... ذرا میرا چشمہ تو لانا۔‘‘ تصویر ہاتھ میں لے کر اس نے ثنا سے کہا۔

ثنا کمرے میں گئی اور اس نے تصویر چولھے میں ڈال دی۔

’’پھپھو آپ کا تو دھوپ کا چشمہ ہے‘ آئی سائیڈ کا تو نہیں ہے ناں۔‘‘

’’ہاں مجھے یاد ہی نہیں رہا۔‘‘

’’مگر اس تصویر میں آپ کے ساتھ کون ہے؟‘‘ ثنا نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

’’کون سی تصویر؟‘‘ ثریا کے کانوں میں بھی بھنک پڑ گئی تھی۔

’’میں نے پھپھو کے کمرے سے ایک کتاب پڑھنے کے لیے جو اٹھائی تو اس میں سے ان کی ایک تصویر گر گئی۔ تصویر میں ایک لڑکا بھی تھا۔ میں وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ وہ موصوف ہیں کون؟‘‘

’’کون سی تصویر ثنا۔‘‘ فریال نے روٹی کمال اطمینان سے بڑھاتے ہوئے توے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

’’وہی جو ابھی میں نے آپ کو دی ہے۔‘‘

’’کہاں دی ہے۔ دکھاؤ تو مجھے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ کس کی تصویر ہے‘ کس کے ساتھ ہے۔‘‘

’’ابھی تو دی تھی۔‘‘ وہ کچن کے کیبنٹ کھول کھول کر جھانکنے لگی۔

’’اگر ابھی دی تھی تو یہیں ہوگی‘ مگر گڑیا تم نے تو مجھے کچھ نہیں دیا۔‘‘

’’پھپھو آپ بہت جھوٹی ہیں۔‘‘ ثنا کو یک دم غصہ ہی تو آگیا۔

’’میں جھوٹی نہیں ہوں‘ تم پاگل ہو۔ اتنی سی بات بھی تمہیں یاد نہیں رہی۔‘‘

’’خوامخواہ میری بچی کو پاگل کہنے کی ضرورت نہیں ہے‘ تم لوگوں کا تو آوا کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔‘‘ ثریا کا لہجہ زہریلا سا تھا۔

’’بھابی آپ میرے منہ نہ لگیے ہاں۔‘‘

’’کیوں‘ کیا کرلو گی تم۔‘‘ ثنا کو پیچھے دھکیل کر وہ غصے سے سامنے تن کر کھڑی ہوگئیں۔

’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ چولھا بند کیے بغیر اندر کمرے میں آگئی۔

امی‘ سائرہ باجی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ انہیں بار بار بخار چڑھ رہا تھا اور صابرہ بھابی دلنواز بھائی۔ کے ساتھ اپنے میکے کی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔

تب وہ تکیے میں منہ چھپا کر روتی چلی گئی۔

عدیل تم سے الگ ہوجانے کے بعد بھی تمہارے حوالے میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہیں۔

سسکتے سسکتے وہ سو گئی اور جب آنکھ کھلی تو اس کے موبائل کی بیپ بج رہی تھی۔

’’ہیلو۔‘‘ وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

’’فریال میں بول رہا ہوں عدیل۔‘‘

’’کیوں فون کیا ہے مجھے؟‘‘

’’ایک زبردست نیوز سنانی تھی۔‘‘

’’مگر مجھے تو کسی بات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔‘‘ اس کا لہجہ ہنوز شکستہ سا تھا۔

’’یار بات تو سنو، مجھے جاب مل گئی ہے۔ تنخواہ بھی بہت اچھی ہے۔‘‘ وہ سرشار لہجے میں بولا۔

’’اچھا۔‘‘

’’میں اب راولپنڈی چلا جاؤں گا۔‘‘

’’اچھا۔‘‘

’’وہاں مجھے آفس سے مکان بھی ملے گا۔‘‘

’’اچھا۔‘‘

”کیا تم خوش نہیں ہوئیں' یہ سب سن کر۔“ وہ حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

”عدیل...... خوشیاں تو اب مجھ سے بہت دور چلی گئی ہیں۔ ان کا اب میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔“

”ہوسکتا ہے کہ اب بھی ہو جائے۔“

”میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتی ہوں۔“

”میری ایک بات توجہ سے سنو گی۔“

”ہاں' کہو......“

”ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں اور پنڈی میں سکون سے رہیں گے۔“

”تمہارے گھر والے نہیں مانیں گے۔“

”فریال ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

”ایسی شادی کو میرے گھر والے تسلیم نہیں کریں گے۔“

”اگر میں اپنے گھر والوں کے بجائے اپنے چند دوستوں کو لے کر تمہارے رشتے کے سلسلے میں آؤں تو......!“

”میرے بھائی ایسا رشتہ قبول نہیں کریں گے جس میں تمہاری ماں یا بہنوں کی خوشی اور اجازت شامل نہ ہو۔“

”تو پھر تو ایک ہی راہ بچتی ہے۔“

”مگر میں یہ سب نہیں کر سکتی۔“

”کل مل سکتی ہو۔“

”نہیں۔“

”پلیز صرف ایک بار مل لو، ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے جو تمہیں بھی قبول ہو۔“

”مجھے ایسا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تو آنے سے فائدہ۔“

”جب ہم دونوں مل کر بیٹھیں گے تو یقیناً ایسی روشنی ضرور نظر آئے گی' جس سے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی' ہوسکتا ہے کہ ہمارا ملن کبھی نہ ہوسکے اور شاید ہو بھی جائے۔ فریال میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا مگر پلیز کل کالج کے بعد مجھ سے ملنے آ جاؤ۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہی ہو۔“

”ٹھیک ہے' میں آ جاؤں گی۔“ اس کی آواز حزن و ملال میں گندھی ہوئی تھی۔

اور اگلے روز وہ اسے اپنے سامنے بٹھائے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیے بڑے مسحور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”فریال مجھے یقین تھا۔ ہر لمحے۔ ہر آن کہ وہ گھڑی ضرور آئے گی جب تم میرے پاس آ جاؤ گی اور ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ گی۔ میری جاب کا ملنا...... اور راولپنڈی میں جانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں کہ ہم سب سے دور محبت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری ماں' بہنیں تمہاری عزت نہ کر سکیں' تمہیں پہچان نہیں سکیں' تمہاری محبت' عزت اور منزلت وہ میری آنکھوں میں تلاش نہیں کر سکیں۔

”کورٹ میرج کرنا کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم دنیا کے پہلے فرد ہیں' جو اس طریقے سے شادی کرنے جا رہے ہیں۔ برسوں سے یہ طریقہ رائج ہے اور رہے گا۔ ہمیں اپنے ذہن کو وسعت دینی چاہیے۔ تم ہمیشہ یہ یاد رکھنا کہ ہم نہ کوئی گناہ کر رہے ہیں اور نہ ہی کوئی ایسا غلط کام' جو کسی ذلت کا پیش خیمہ بنے۔

”پیار کرنے والے ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے تو پھر ہم کیوں اپنے خوابوں میں آگ لگائیں۔ ہم کیوں اپنی چاہت کو اپنی پشیمانی سمجھیں۔“

”ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر اللہ نے مجھے اسی لیے دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی بتاؤں۔“

”فریال یہ میرا ایمان ہے۔ مجھے یقین تھا۔ میں یہ بات یوں جانتا تھا جیسے یہ بات خدا نے آسمانوں میں لکھی ہو اور میں نے اپنی آنکھوں سے پڑھی ہو۔“

”جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو تمہاری آنکھوں کی سفیدی میں شریانوں کی گہری سرخی تھی۔

”تم میری بات سن کر شاید ہنسو گی فریال کہ میں نے بہت دور کھڑے ہو کر بھی تمہاری آنکھوں میں تیرتے ہوئے ڈورے دیکھ لیے تھے۔

”تب میرا من تمہیں دیکھ کر ہمکنے لگا تھا اور میں ایک تہی دست کی طرح تمہارے لیے بے قرار سا ہو گیا تھا۔

”پھر میں نے تمہیں ایک مارکیٹ میں دیکھا۔ تمہارے ساتھ تمہاری دونوں بھابیاں بھی تھیں اور مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگا جیسے بھٹکی ہوئی کسی ہرنی کی آنکھیں مجھے اپنی طرف بلا رہی ہوں۔ مجھے پکار رہی ہوں۔“

”عدیل آ جاؤ...... آ جاؤ...... عدیل جلدی آ جاؤ...... میرے پاس آ جاؤ...... کہ تم ہی مجھ سے محبت کر سکتے ہو۔ اور تم ہی میرے اپنے ہو سکتے ہو...... یہاں اپنوں میں رہ کر بھی میں بے حد تنہا ہوں...... بے حد تنہا......!

عدیل کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا اور من میں ایک تراوٹ سی اتر رہی تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کا مسیحا ہو جو بوند بوند امرت اس کے حلق میں ٹپکا رہا ہو۔

”عدیل...... میرے عدیل...... اس کے ہاتھ اس نے اپنی آنکھوں سے لگا لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

عظمت بیگم کے گھر میں جب فرحت اپنے بچوں کے ساتھ آ جاتی تو بچے' مرغیاں اور کبوتر بیچ صحن میں ایک ساتھ شور مچایا کرتے۔

شجاع جو شور و غل کو ناپسند کرتا تھا۔ ان دنوں وہ مجال ہے کہ بچوں کو سرزنش تو کر دے۔

آج بھی صبح سے فرحت آئی ہوئی تھی...... اور بچے حسب عادت نانی کے گھر آ کر دھما چوکڑی میں مصروف تھے' کوئی مرغیوں کے پیچھے بھاگ رہا تو کوئی کبوتر کے ساتھ غٹرغوں غٹرغوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔

عظمت اپنے نوسوں' نواسیوں کو تنبیہہ کر رہی تھیں۔ ارے چپ ہو جاؤ' شور نہ کرو۔ تمہارے شجی ماموں گھر میں ہیں' ابھی کمرے سے نکل کر ایک ایک کی طبیعت صاف کر دیں گے ہاں۔

اور شجاع اپنے کمرے میں بظاہر کتاب ہاتھ میں لیے' نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

فرحت کے بچے اپنی شرارتوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔ اس کا چھوٹا بچہ گلی کی دو بطخوں کو گھیر کر صحن میں لے آیا تھا۔ اب قیں...... قیں...... کی آوازیں بھی صحن میں سر اٹھا رہی تھیں۔

”دیکھ ماں جا' ان بطخوں کو گھر سے باہر نکال خواہ مخواہ کا شور بڑھ گیا ہے گھر میں۔“ عظمت بچوں کو مسلسل سمجھا رہی تھیں' مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی تھی۔

”ابھی بلاتی ہوں' شجی کو...... پھر دیکھنا اپنا حال۔“ عظمت بیگم نے بچوں کو ڈراوا دیتے ہوئے کہا۔

”شجی ماموں اب بہت اچھے ہو گئے ہیں' اب وہ ہمیں کچھ نہیں کہتے۔“ فرحت کے بچے زعم بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

اور شجاع اپنے کمرے میں بیٹھا آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ اس کے خیالوں کی رانی فرح اس کے پاس آ کر بڑے ناز سے کہہ رہی تھی۔

''سنیے' میرے خط کا جواب کب دیں گے؟''

''آج ہی دوں گا۔''

''پھر وہ مجھے کب ملے گا۔''

''آج ہی مل جائے گا۔''

''کس کے ہاتھ بھجوائیں گے۔''

''تمہارے ہی پوسٹ مین پپو کو دے دوں گا۔''

؟؟ پھر جلدی سے بھیج دیجیے ناں' میں نے اسے پڑھنا ہے۔'' اس کا چہرہ کتاب پر ابھرا' اس کی خوشامد کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ابھی لکھتا ہوں خط۔''

''شجی بیٹا' آؤ کھانا کھالو۔'' عظمت نے آواز لگائی۔

''ابھی بھوک نہیں ہے' تھوڑی دیر بعد کھاتا ہوں۔''

''لو ابھی کہہ رہا تھا جلدی کھانا پکاؤ' اب بھوک ہی نہیں ہے۔''

''اماں' میں ذرا اپنا حساب کتاب لکھ لوں۔ بس ابھی آتا ہوں۔'' اس نے ماں کو تسلی دی اور اس کا قلم کاغذ پر پھسلنے لگا۔

میری اپنی فرح

سلام محبت......!

تم نے پہلے خط لکھ کر مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ میں بھی ہر لمحے تمہیں یاد کرتا ہوں۔ مجھے بھی تم ہر سو دکھائی دیتی ہو اور میں بھی ہر لمحے' ہر آن تم سے باتیں کیا کرتا ہوں۔

اور اگر کوئی میری محویت توڑ دے تو میری حرکات بھی تمہاری جیسی ہوتی ہیں۔ لگتا ہے' ان دنوں ہم دونوں کی کیفیت بالکل ایک جیسی ہے۔

خیالوں میں رہنا کبھی مجھے نہیں بھایا تھا اور اب تمہارے خیالوں اور خوابوں میں وقت اچھا گزرتا ہے۔

تم میٹرک کے امتحان سے جلدی سے فارغ ہو جاؤ پھر میری امی تمہارے گھر آئیں گی۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ جو میں چاہتا ہوں' وہی خواہش میری امی اور میری بہن کی بھی ہے۔

اور اب تو ہر پل یہی دعا ہے کہ وہ وقت جلدی سے آ جائے کہ تم میرے پاس آ جاؤ' اور میں تم سے دنیا بھر کی باتیں کروں۔

فرح جب ماسٹر صاحب کے گھر مہندی میں' میں نے تمہیں لڈی ڈالتے دیکھا تو مجھے یک بارگی یوں محسوس ہوا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں اور پھر تمہارے سنگ سنگ میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا تھا۔

ویسے تم بہت خوش قسمت ہو، میرا دل تم پر آیا ہے۔ میں جو کسی کو نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا' تمہارے حسن کی تاب نہیں لا سکا۔ یہ میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں کہ تم جیسا حسین کوئی نہیں ہو سکتا مگر اس روئے زمین پر مجھ جیسا پیار کرنے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔

اس کا احساس تمہیں وقت آنے پر ہو گا اور وہ وقت اب زیادہ دور نہیں رہا ہے پھر بھی خط کا سلسلہ جاری رکھنا، اس سے ایک آسودگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔

فقط......تمہارا اپنا شجاع......!

خط کا جواب آنے میں دو دن بھی نہ لگے۔ پپو نے جب اسے لفافہ پکڑایا تو وہ اتنی کوئیک سروس پر حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا فرح جواب دینے میں ہفتہ' دس دن تو لے گی مگر اس کا خط پڑھ کر اس نے خط لکھنا شروع دیا تھا۔ جگہ جگہ اشعار کا استعمال کیا گیا تھا' جن کا مضمون کے ربط سے کوئی تعلق نہیں تھا' مگر شاید اس کے علم میں بات تھی کہ محبت کرنے والے اشعار کا سہارا ضرور لیا کرتے ہیں۔ ان بے معنی اور بے محل اشعار کو پڑھ کر بھی جاع مسحور ہو گیا' اور ان سے اتنے مطلب کشید کیے' جتنے کہ شاعر کے ذہن میں بھی نہیں ہوں گے۔ اس کا یہ خط بھی اسے حفظ ہو گیا اور مزاج مسرور سا۔

''امی آج ساگ گوشت اچھا پکا ہے' فرحت کے گھر دے آؤں۔'' شجاع نے ماں سے کہا۔

''بیٹا کل آلو والے پراٹھے دینے گئے تھے' پرسوں کوفتے۔ روز روز چیزیں دینے جاؤ گے تو تم خود ہی اکتا جاؤ گے۔ ایسا رکھو کہ جاتے رہو اور تمہارے معمولات میں کسی قسم کی اکتاہٹ بھی نہ آنے پائے۔'' عظمت بیگم نے زبان سے سمجھایا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟ فرحت میری اکلوتی بہن ہے۔ اس سے میں کبھی اکتا سکتا ہوں۔''

''یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔''

''اس کے بغیر کوئی چیز کھاؤں تو حلق میں اٹکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے دے آؤ۔'' عظمت کھانے کی پوٹلی باندھنے بڑھ گئیں' مگر وہ سوچ رہی تھیں کہ اس سے قبل بھی تو گھر میں نت نئی چیزیں بنا کرتی تھیں مگر یہ شجی بہن کے گھر روز روز تو نہیں جایا کرتا تھا۔

کبھی ان کا دل چاہتا کہ فرحت کے بچوں کے لیے کوئی چیز پکا کر بھیج دیں تو یہ شجی فوراً ہی کہہ دیا کرتا تھا' کیا ملا بہن کے گھر روز روز چکر لگاؤں گا' مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ جب وہ آیا کرے تو جتنی مرضی چاہے کھانے پکا کر اس کے ساتھ دے دیا کریں۔

اور اب یہی شجی ان سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ فرحت کے بغیر کچھ نہیں کھا سکتا۔

اللہ میرے بچوں میں آپس میں یونہی محبتیں قائم رکھنا۔ یہ بچے میری سب سے بڑی دولت ہیں' ان کے دل ملے رہیں۔ وہ پوٹلی شجی کو دیتے ہوئے دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں۔

اور شجی بنا ٹھنا' مسکراتا ہوا پوٹلی لے کر چل پڑا تھا۔

آج اسے اپنا خط بھی دینا تھا اور فرح سے اس کی تصویر بھی لینی تھی۔

☆☆☆

صابرہ حیران تھی ایکا ایکی دلنواز کا موڈ کسی پھرکی کی طرح کیسے بدل گیا ہے۔ وہ کمرے میں جاتی' دلنواز با ا جاتا۔ وہ کھانے کو بیٹھتی' دلنواز ہاتھ کھینچ لیتا۔

گھر والے بھی یہ کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ سائرہ کی وجہ سے گھر کا ماحول کچھ اس قسم کا تھا کہ کسی نے بھی ائرہ کو نہیں کریدا تھا۔

مگر گھر میں کام کرنے والی مائی ایک چالاک اور منہ پھٹ تھی۔ وہ دلنواز کا روٹھا روٹھا سا انداز دیکھ کر صابرہ بول اٹھی۔

''صابرہ باجی، کیا آپ کی اپنے میاں جی سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہے۔''

''کائے کو پوچھتے تم؟'' صابرہ نے آنکھیں نکالیں۔

''آپ کے میاں جی آپ سے بات جو نہیں کر رہے۔ ابھی آپ نے چائے انہیں دی' انہوں نے بغیر پیے ٹیبل پر رکھ دی اور اپنی اماں کے کمرے میں جا کر کہہ رہے ہیں' امی آپ کے ہاتھ کی چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''اجاڑ...... تم کو اتنی پنچائیت کائے کو جی۔ میاں بیوی کے سنگات (ساتھ) ہزار باتیں ہوئیں گی سو ہوئیں گی۔ تمہارے پیٹ میں کائے کو سول اٹھ ریا۔'' صابرہ تلملا کر بولی۔

''میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی باجی جی...... آپ لوگ ہر وقت ہنستے رہتے ہو ناں تو خوشی ہوتی ہے دیکھ کر۔ اب بھائی جی غصے میں ہیں تو اچھا نہیں لگ رہا۔''

''تم کام تن (ملازمہ) ہو ناں' فقط اتاچ کام ہے تمہارا اپنے کاماں سے کام رکھو ہاں۔ صابرہ نے اسے اس کی اوقات یاد دلائی۔

مگر صابرہ خود پریشان سی تھی کہ میاں جی کے غصے کی وجہ کیا ہے۔ جتنا وہ اپنے دماغ پر زور ڈال رہی تھی اتنی ہی اس کی بدحواسیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سالن میں نمک کی جگہ چینی ڈال دی تھی۔ چائے کی پتی کی جگہ پسا ہوا گرم مسالہ ڈال دیا تھا۔

دلنواز کے اکھڑ انداز کی وجہ سے دل میں ایک دھکا دھک ہوئے جا رہی تھی۔

''سنتے ہو جی۔'' دلنواز کمرے میں رات گئے آیا تو وہ بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی تھی۔

''کیا ہے؟'' وہ اکھڑ پنے سے بولا۔

''میں اتیچ بات بولتیوں کہ میں آپ کی ناراجگی برداشت نکو کرتیوں۔''

''پرسوں کہاں گئی تھیں تم؟'' وہ غصے سے بولا۔

''اپنی آپا کے گھر گئی تھی ناں اور انوں کے سنگات بازار کا چکر لگائے تھے۔''

''اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔ سوچ کر بھی شرم آ رہی ہے۔'' دلنواز کا لہجہ ہنوز سلگا ہوا تھا۔

''میں کیا غلط کری؟'' اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات تم اپنے آپ سے پوچھو۔'' شعلوں کی تپش باقی تھی۔

''اللہ میں صرف ایک ساڑھی لی ناں۔ میری آپا تو چار پانچ لیے ساڑھیاں بول کے۔''

''میں ساڑھیوں کی بات نہیں کر رہا۔''

''پھر ایسا کیوں بول رہے آپ؟''

''پہلے تم اپنے عاشق صادق کا خط پڑھ لو اور پھر اپنے آپ سے پوچھو کہ کتنے پانی میں ہو۔''

صابرہ نے جھپٹ کر خط لیا اور ایک سانس میں پڑھتی چلی گئی۔

میری جان صابرہ

سلام محبت......!

پرسوں اچ تم سے بازار میں ملا، دل جھوم کے بیٹھا۔ دو ملاقاتاں ہوئیں تم سے مگر تم میرے دل سے نہیں نکلا رئے۔ سچی بولتا' تمہارا منہ چوم لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ ابھی تک تمہاری فکر اچھی ہوتی۔ ساڑھی میں بہت اچھے دکھتے تم۔ بلاؤز کی پھولاں کیا تم آپ بنائے تھے' بہت پیارے لگے۔ بالاں بھی بہت خیامت ابھی تک۔ کو

ان میرے گھر آؤ ناں۔ میں بہوت سارا وخت تمہارے سنگات (ساتھ) گزارنا چاہتا ہوں۔ پہلے کی یاداں ابھی تک دلاں میں دستک دیتے۔

کاش شادی کے بعد ہم دونوں یوں دو مختلف ملکوں میں نہ بچھڑتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ تم کب آ رہے' میرے ہاں۔ جب سے تم ملے میں تم کو روزانہ اچ یاد کرتا ہوں۔

تمہارا اپنا...... ڈی مجید!

خط پڑھنے کے ساتھ ہی صابرہ کی ہنسی کسی طرح نہیں رک رہی تھی۔

''کیوں ہنس رہی ہو پاگلوں کی طرح؟'' دلنواز اس کی ہنسی سے مزید کلس کر رہ گیا۔

''بتایا تھا ناں آپ کو حیدرآباد دکن میں ماڈ خواتین مردوں کی طرح باتاں کرتے۔ یہ میری بچپن کی سہیلی دردانہ مجید کا خط ہے۔ ایک دفعہ وہ مجھے مارکیٹ میں ملی تھی۔ انوں نئے نئے آئے ناں حیدرآباد سے اس لیے ایسی الٹی باتاں کرتے وہ......!''

''اچھا وہ دردانہ مجید جو یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے میاں بہت ہینڈسم ہیں۔'' دلنواز کو بھی یاد آ گیا۔ واقعی اس کا طرز تخاطب قطعی مردانہ تھا۔

''ہاں...... ہاں وہی دردانہ...... انوں تو لکھے یہ خط' جس کو پڑھ کر آپ لہرا گئے۔''

''لہرایا نہیں بلکہ بل کھا گیا۔'' دلنواز نے ہنس کر کہا۔ تب صابرہ بھی ہنسنے لگی۔

☆☆☆

فہمی امید سے تھی' ان دنوں اس کا الٹیوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ممانی جان اس کا بے حد خیال رکھ رہی تھیں۔ یہاں تک اسے اپنے ہاتھ سے کھلا رہی تھیں۔

فہد جہاں خوش تھا وہاں پریشان بھی تھا۔ جس اخبار میں اس نے اپلائی کیا تھا' وہاں اس کے بجائے کسی دوسرے کو لے لیا گیا تھا' حالانکہ وہ تجربے میں اس سے جونیئر تھا۔

وہ اپنی نئی جاب کے سلسلے میں خاصا پر یقین تھا۔ جاب کا نہ ملنا اس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا سا تھا۔

''اب گھر میں پیارا سا مہمان آنے والا ہے۔ اس کے لیے پہلے سے تیاریاں کرنی ہیں۔'' ممانی جان فہد سے کہہ رہی تھیں۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ فی الوقت کہیں سے دو چار ٹیوشن ہی پکڑ لی جائیں۔ جس سے آنے والے خرچے سے [illegible] جائے۔

''فہد میں کچھ دنوں کے لیے امی کے ہاں چلی جاؤں؟'' ایک شام فہمی نے پوچھا۔

''کیوں' کیا یہاں تمہیں آرام نہیں مل رہا؟''

''بات نہیں ہے۔ ممانی جان کی خود طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ مجھے بستر سے اترنے نہیں دیتیں۔ یوں مجھے [illegible] لگ رہا ہے۔''

''کیسے اچھا لگے گا؟'' وہ آفس سے آ کر کھانا کھاتے ہوئے اسے باتیں بھی کر رہا تھا۔

''[illegible] کر ایک ہفتہ امی کے ہاں رہ کر آؤں گی تو کہہ دوں گی کہ اب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے اور کسی [illegible] کمزوری بھی محسوس نہیں کر رہی۔''

''تو گویا جھوٹ بنانے کا پلان بنایا جا رہا ہے۔''

''نہیں بھئی' یہ بات نہیں ہے۔ اب بچہ پیدا کرنے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہمہ وقت بستر پر بے ہوش پڑے رہو۔''

''تم کمزور بھی تو بہت ہو۔'' اس کے لہجے میں محبت کے ساتھ فکر بھی ہم وزن تھی۔

''کیا دبلی عورتوں کے بچے نہیں ہوتے۔'' وہ ہنسی۔

''ہوتے ہیں مگر وہ اپنی ڈائیٹ کا بھرپور خیال رکھتی ہیں۔ تمہاری جیسی ان کھانی نہیں ہوتی ہیں۔''

''کھاتی تو ہوں میں۔ اب ہر وقت تو جگالی نہیں کر سکتی ناں۔''

''وہ تو تمہیں کرنا پڑے گی۔'' فہد اس کے منہ میں نوالہ دیتے ہوئے بولا۔

''وہ کیوں بھلا۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تم تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہ کچھ کھاتی رہا کرو۔ کبھی پھل' کبھی جوس' کبھی کچھ اور میری خواہش ہے کہ میرا بچہ خوب صحت مند گل گوتھنا سا ہو۔ جسے فوراً گود میں لے کر خوب پیار کروں اور خوب اچھالوں۔''

''اچھا' اس لیے مجھے پہلوان بنانا چاہتے ہیں۔'' فہمی نے شرارت سے کہا اور فہد اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔

''ہاں پہلوان بنانا چاہتے ہیں مگر کسی اکھاڑے میں بھیجنے کے لیے نہیں اپنے بچے کے لیے۔ تم صحت مند ہوگی اس کی اچھی طرح پرورش کر سکو گی۔ تم خود کمزور' بیمار اور نڈھال سی ہوگی' تو اپنے آپ کو دیکھو گی یا اپنے بچے کو۔'' فہد نے اسے پیار سے سمجھایا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور فہد نے اس کے منہ میں پھر ایک نوالہ دے دیا۔

☆☆☆

''اف خدایا! آج نو دن' چھ گھنٹے اور چالیس منٹ بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' زبور نے نگین سے کہا۔

''اباجی کی طبیعت خراب تھی' وہ ہر وقت گھر میں رہتے تھے۔ میں کس طرح ملنے آ سکتی تھی۔''

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا' یہ تمہارے اباجی اتنے گھر گھسنے کیوں ہیں۔ جب دیکھو گھر میں ہیں، انہیں کوئی باہر کا کام نہیں ہے۔''

''کیا خیال ہے تمہارا، طبیعت خرابی میں اسپتال میں جا کر ایڈمٹ ہو جاتے۔''

''تو پھر یہ اسپتال کس لیے بنے ہیں۔ کیا تھا کہ اگر وہ دس پندرہ دن اسپتال میں رہ آتے۔ لگتا ہے تمہار گھر میں انہیں کوئی درست مشورہ دینے والا بھی نہیں ہے۔''

''اب زیادہ بے تکی تقریریں کیں ناں تو ابھی گھر چلی جاؤں گی۔''

''اچھا ڈراؤ تو مت اور ایک زبردست بات سنو۔''

''کیا تمہاری امی پاکستان آ گئی ہیں؟'' بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

''نہیں بھئی' یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہے؟''

''پہلے آنکھیں بند کرو۔''

نگین نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اب اپنی آنکھیں کھول سکتی ہو۔'' وہ زعم بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

نگین نے آنکھیں کھولیں تو سیاہ مخملی ڈبیا میں ایک خوب صورت انگوٹھی اس کی ہتھیلی پر دھری جگمگا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''

''انگوٹھی ہے۔ جیولر ہوں' رولڈ گولڈ کی چیز تو دینے سے رہا۔ اس کا ڈیزائن میں نے خود پسند کیا ہے۔''

''یہ بہت خوب صورت ہے' مگر اسے میں نہیں لے سکتی۔''

''وہ کیوں؟'' اب حیران ہونے کی اس کی باری تھی۔

''اب میں گھر جا کر یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ سہیلی سے موبائل کی طرح کوئی انگوٹھی بھی بدل لی ہے۔''

''افوہ! دکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

''پھر بھی' امی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ ہمارے گھر میں کسی چیز میں کہیں کوئی تالا نہیں ہے۔''

''میری خوشی کے لیے بھی نہیں پہنو گی۔''

''ہاں آپ کے سامنے پہن کر آپ کو واپس کر دوں گی۔''

''تو کیا اس انگوٹھی کو میں اپنی جیب میں لے کر پھرا کروں۔''

''تو کیا ہوا' جیولر کی جیبوں میں رولڈ گولڈ کی چیزیں تھوڑی ہوتی ہیں ایسی ہی چیزیں ہوتی ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''بہت تیز ہوتی جا رہی ہو' نگین تم۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تمہاری صحبت کا اثر ہے۔''

''امی سے میری رات کو بھی فون پر بات ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھیں وہ؟''

''میں نے تمہاری تصویریں بھیجی تھیں انہیں۔''

''پھر......؟'' اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔

''وہ کہہ رہی تھیں یہ نیک پروین تمہیں کہاں مل گئیں؟''

''ایسا کیوں کہا انہوں نے؟''

''وہ......دراصل ہمارے خاندان کی لڑکیاں بہت ایڈوانس ہیں ناں اور تمہاری تقریباً تمام تصویریں کالج نیفارم یا کاٹن کے سمپل سے سوٹوں میں تھیں۔''

''کیا انہیں تصویریں پسند نہیں آئیں؟''

''ہاں نہیں آئیں۔ جب ہی ان کا بیٹا انگوٹھی لے کر آ گیا ہے۔'' زبور ناراض سے لہجے میں بولا۔

''میں تو تمہاری امی کی بات پوچھ رہی ہوں۔ تم خوامخواہ ناراض ہو رہے ہو۔''

''جس عورت کے خود بال کٹے ہوئے ہوں۔ اسے اپنی بہو کی لمبی چوٹی کس طرح اٹریکٹ کر سکتی ہے۔'' زبور نے کہا۔

''تو تمہیں کوئی گنجی ڈھونڈنی چاہیے تھی جو تمہاری امی کے معیار پر تو پورا اترتی۔'' نگین غصے میں کہہ تو گئی مگر ب زبور کو کھل کھلاتے دیکھا تو خود بھی مسکرانے لگی۔

''جانو' تم میری امی کو پسند آئی ہو اور بہت پسند آئی ہو۔ وہ تو تمہارا فون نمبر مانگ رہی تھیں بات کرنے کے یے۔ میں نے اس وجہ سے نہیں دیا کہ کہیں تمہارے اباجی کو نہ پتا چل جائے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ وہ آتے ہی ہارے گھر جائیں گی۔''

''اور کیا کہہ رہی تھیں؟''

''وہ کہہ رہی تھیں نزلہ کھانسی بہت بڑی بیماری ہے۔ نگین سے کہنا اپنے اباجی کو حیدرآباد کے کسی اچھے سے

اسپتال میں داخل کر دیں۔'' فہد نے شرارت سے کہا تو وہ اس کو مارنے کے لیے لپکی۔

سمندر کا کنارا تھا۔ دونوں گیلی گیلی ریت پر آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک ثانیے کے لیے رکی مگر وہ کہاں اس کے ہاتھ آنے والا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔

اور نگین تھک کر وہیں گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گئی۔ اس کے آس پاس بے فکر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے' بچے کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے تھے پھر اچانک ہی اس نے دیکھا جمال پانی میں پیر ڈالے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا اور نگین کا فاصلہ چند گزوں پر محیط تھا۔

مگر اس کی نظریں سامنے پھیلے ہوئے وسیع سمندر کی جانب مرکوز تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے نگین کو دیکھا نہیں ہے۔ وہ اسے اپنے آپ میں مست نظر آیا۔

نگین نے دیکھا کہ زبور اسی کی جانب آ رہا تھا۔ وہ ساحل پر رکھے کیبن کی آڑ میں ہو گئی۔

زبور اسے ڈھونڈتا ہوا آگے نکل گیا۔ تب بے اختیارانہ اس کے قدم جمال کی جانب بڑھ گئے۔

''السلام علیکم......!'' اس نے جمال کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

''وعلیکم السلام۔'' جمال نے اسے دیکھ کر حیرانی کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ وہ سڑک پر کھڑی زبور کی گاڑی دیکھ کر ہی پہچان گیا تھا۔

''سر آپ اکیلے گھوم رہے ہیں۔ آپ کی بہن نہیں آئیں؟''

''آج میں کالج سے سیدھا اسی طرف آ گیا۔ نہ جانے کیوں آپ ہی آپ یہ دل چاہ گیا کہ پانی کو دیکھے۔'' اپنا جملہ مکمل کر کے وہ خود مسکرا دیا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔'' اس کی کمزوری شکل دیکھ کر وہ بولی۔

''ہاں' ہاں بالکل ٹھیک ہوں میں۔ بس آج کل سیزن کا بخار انجوائے کر رہا ہوں۔''

''ارے...... آپ بخار میں...... اپنے پیر پانی میں ڈالے بیٹھے ہیں!'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں...... تا کہ بخار کی حدت کم ہو جائے۔''

''ایسا نہ کریں' آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''اچھا' آپ کہتی ہیں تو باہر آ جاتا ہوں۔''

نگین نے دیکھا' کہیں زبور تو نہیں آ رہا تو اپنی بات جلدی ختم کر لے۔ جو نہ جانے کیوں شروع ہو گئی تھی۔ اس کے اس انداز سے ہی جمال سمجھ گیا۔

''اچھا نگین صاحبہ میں گھر چلتا ہوں۔ یاد رکھئے اور مزاج پرسی کرنے کا احسان مند رہوں گا۔'' وہ اس کی جانب ہلکا سا جھکا اور چلتا چلا گیا۔ اس نے ایک دفعہ بھی اس سے نہیں پوچھا کہ تم کس کے ساتھ آئی ہو؟ کالج ختم ہونے کے بعد ہی سائیڈ آنے کا کیسے ٹائم نکال لیا؟

یہ سوچ کر نگین خود ہی محجوب سی ہو گئی مگر پھر سر جھٹک کر اسی جانب چل دی جہاں سے زبور اسے آتا دکھائی دے رہا تھا جو اسے اچھا لگتا تھا۔ جس کی ہمراہی کے وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

زبور اور وہ...... دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جوں جوں ان کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا شادمانی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ اب وہ اسے دیکھ کر اپنے ہاتھ ہلا رہی تھی۔

☆☆☆

گھر آ کر جمال کا بخار بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر جیسے ڈھے گیا تھا۔

اس کے ذہن میں بار بار سمندر آ رہا تھا مگر جلتا ہوا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کسی نے پانی میں آگ لگا دی ہو۔

نگین کا کسی مقناطیسی انداز میں اس کی سمت آنا اور اس سے بات کرنا اس کے لیے حیران کن تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ان دنوں وہ زبور کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی سمت کھنچی چلی آئی۔

اس کی ہمراہی کے باوجود اس کا اس کی طرف چلا آنا، چاہے وہ سیکنڈوں کے لیے ہی آئی تھی مگر وہ نقطے اس کی حیات پر محیط ہو گئے تھے۔

میرے پیار نے جب اسے اپنی طرف کھینچ لیا تو اس کا دل میری جانب کیوں ملتفت نہ ہوا۔ اس کی یہ سوچ اسے نڈھال سا کر رہی تھی۔

جب ذہن کی شکست و ریخت نے اسے پژمردہ سا کر دیا تو وہ بے سدھ سا ہو گیا۔

ربیع جب رات گئے اس کے کمرے میں آئی تو وہ بخار میں جل رہا تھا۔

''امی' ہم سمجھ رہے تھے کہ ابھی بھائی جان آئے نہیں ہیں، وہ تو اپنے کمرے میں بخار میں پڑے ہیں۔''

ماں نے ٹھنڈی پٹیاں رکھیں' دوا پلائی' تب کہیں جا کر بخار کچھ کم ہوا۔

''بیٹا تم نے بتایا کیوں نہیں تمہاری طبیعت خراب ہے۔'' ماں اسے دلیے کا پیالہ دیتے ہوئے بولیں۔

''جب میں گھر آیا تو آپ دونوں سو رہی تھیں' اس لیے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر خود بھی سو گیا۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''میں تیری شادی کر دیتی ہوں تا کہ کوئی تو تیرا خیال رکھے۔ یہ بات تو طے ہے اپنا خیال تو تم کبھی نہیں رکھ سکتے۔'' وہ اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے بولیں۔

''اماں کے پاس تو ہر معاملے کا حل صرف میری شادی ہے' ہے ناں اماں۔'' اس نے لاڈ بھرے لہجے میں ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اتنی دفعہ کہا ہے تجھ سے' جب طبیعت خراب ہو تو مجھے بتایا کر۔ اتنے تیز بخار میں چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ربیع اتنی دیر سے تمہارے موبائل پر رنگ کر رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی کہ بھائی جان کے موبائل سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا۔''

''بخار میں اماں...... آرام کرنے کو دل چاہتا ہے' اتنی دیر سویا ہوں' اب طبیعت بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''اتنا سا منہ نکل آیا ہے میرے چاند کا۔ کل کالج نہیں جانے دوں گی ہاں۔''

''ٹھیک ہے' نہیں جاؤں گا۔ اب تو خوش ہیں ناں آپ!''

''میں سوپ بنا کر بھیجتی ہوں' پورا پیالہ پی لینا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''جی اچھا۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

وہ اس کے کمرے سے اٹھ کر گئیں تو وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر چت لیٹ گیا۔

کمرے کی کھڑکی سے آسمان کا چاند نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نگین کا چاند سا چہرہ چمکنے لگا۔

''ارے آپ بخار میں پانی میں پیر ڈالے بیٹھے ہیں۔''

اس کی بانسری کی طرح بج اٹھنے والی آواز اس کے کانوں میں بار بار ٹکرانے لگی۔

اس نے ٹی وی لگایا تو ہر چینل پر ایسے غل غپاڑے والے پروگرام آ رہے تھے کہ دل اوبھ سا گیا۔

تب شیلف میں سے ایک شعری مجموعہ لے کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔

ارشد ملک کی نظم پڑھنی شروع کی تو اس کے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے شاعر نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

لیٹے سے وہ اٹھ بیٹھا...... اور وہ خوب صورت نظم ایک دریچہ سا بن گئی جس میں نگین کا چہرہ جھانکنے لگا۔ اور نظم کا لہجہ ایک پکار سا بن گیا۔

تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
تیرا مہتاب چہرہ اور گہری جھیل سی آنکھیں
تری زلفیں، حسین پلکیں، تیرا لہجہ
تیرا وہ کھلکھلانا
اور کسی بھی بات پر ہنسنا
وہ پھر کچھ سوچنا اور سوچ کر گم صم سا ہو جانا
خیالوں اور خوابوں میں ہمارے ساتھ رہتا ہے
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
کسی کے ساتھ چلنا ہو
کسی سے بات کرنی ہو
کسی کا پیار سے تکنا
کسی بھی پھول کا کھلنا
کوئی بھی گیت گاتے ہوں
کوئی بھی شعر پڑھتے ہوں
تمہیں بھی ساتھ رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
مگر جب رات ہوتی ہے
تیری ہی بات ہوتی ہے
وہاں اک چاند ہوتا ہے
ترا یہ پھول سا چہرہ
مجھے چندا میں دکھتا ہے
فضاؤں میں ہواؤں میں
تیری خوشبو بکھرتی ہے
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں

تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں

☆☆☆

فریال نے ٹیکسی والے کو اپنے گھر کا پتا بتایا تو لمحے بھر کے لیے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ گھر جائے یا جائے، اس نے سوچا۔

''بیٹھو ناں...... فریال......'' عدیل دروازہ کھول کر خود بیٹھا تو اسے آواز دی اور وہ ایک معمول کی طرح اس ے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

کورٹ میں شادی کرنے کے بعد ٹیکسی میں وہ دونوں گھر آ رہے تھے۔ عدیل کا یہ خیال تھا کہ نکاح کے بعد یال کے گھر والے اسے قبول کر لیں گے۔

اس وقت فریال سلک کے ہلکے گلابی سوٹ میں تھی اور اس کی انگلی میں عدیل کی دی ہوئی ہلکی سی سونے کی گوٹھی تھی، جو عدیل نے نکاح کے بعد اس کو پہنائی تھی۔ ٹیکسی میں دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

خوف اور گھبراہٹ سے فریال کی ہتھیلیاں پسیج رہی تھیں اور اس کی انگلیاں بار بار بائیں ہاتھ کی اسی انگلی کو چھو ہی تھیں، جس میں وہ انگوٹھی تھی۔

یہ شادی اگر عام حالات میں ہوتی تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔ ایسی خاموشی تو نہ ہوتی۔ جیسی اس وقت اسے وس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک نظر عدیل کو دیکھا۔ وہ ٹیکسی سے باہر بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں میرا اقدام غلط ہے یا صحیح...... اس نے اپنے سر کو جیسے تھام سا لیا۔

''کیا ہوا فرو؟'' عدیل نے اسے یوں نڈھال سا دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

''بس دل گھبرا رہا ہے، یوں لگ رہا ہے جیسے میرا دل ڈوب جائے گا۔''

''اپنے آپ کو سنبھالو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

عدیل نے اس کے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس وقت ہر وشش جیسے بے سود تھی، فریال کے بدن پر لرزہ سا طاری تھا۔

عدیل کا سارا وجود اس سے باتیں کرنے کو بے قرار تھا لیکن اس کی دگرگوں حالت دیکھتے ہوئے وہ خود بھی یشان ہو گیا تھا۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے اس کے گھر کے سامنے رکی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

گھر کے باہر سناٹا تھا۔ کوئی بھی باہر نہیں تھا۔ یکبارگی اس نے سوچا کہ گھر میں نہ جائے۔ خوامخواہ گالیوں اور وسنوں کے سوا تو کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔

شاید امی اور سائرہ باجی اس کو معاف کرا دیں۔ سائرہ باجی کو تو ویسے بھی سب پتا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ اندر چلو ناں......!'' اسے یوں گو مگو کی صورت میں دیکھ کر عدیل نے ٹہوکا دیتے ہوئے ہا۔

فریال نے ایک لمحہ سوچا، شاید حد سے بڑھے ہوئے خوف کا نام بہادری ہے۔

ایسے تہیے سے وہ عدیل کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب بڑھی جیسے وہ سب کو لمحہ بھر میں قائل کر دے گی۔

☆☆☆

گھر کے سب لوگ آنگن میں یوں سوگوار بیٹھے تھے جیسے کوئی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔

بہن یا بیٹی جب وقت پر گھر نہ پہنچے تو گھر والوں کی کیا حالت ہوتی ہے؟

اس وقت پتے کے ہلنے سے بھی گھر والے چونکنے سے ہو رہے تھے۔

شاہنواز تو کالج تک گھوم آیا تھا۔ کالج کی سہیلیوں سے یہی پتا چلا تھا' فریال تین دن سے کالج نہیں آ رہی تھی۔

دلنواز نے نگین کو فون کیا تو وہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔ مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں' میں تو کچھ جانتی ہی نہیں۔

''مجھ سے تو فریال نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ ہاں' وہ پچھلے چند دنوں سے کچھ پریشان ضرور تھی۔''

نگین نے عدیل کے بارے میں بھی کوئی ذکر نہیں کیا تھا جبکہ فریال کے گروپ کی ایک لڑکی نے انتہائی تمسخر بھرے لہجے میں بتایا تھا کہ وہ تو کسی لڑکے کے ساتھ اکثر گھوما کرتی تھی اور ہم نے اس سے دوستی نہیں رکھی تھی۔

کالج کی دیگر لڑکیوں نے بھی اسے گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔

دلنواز نے جب نگین سے پوچھا کہ کیا فریال کی کسی کے ساتھ دوستی کا چکر ہے تو وہ آنکھیں چرا کر رہ گئی تھی اور اس کے انداز سے ہی دلنواز کو بہت کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

اور اب وہ سب سر نہواڑے بیٹھے تھے۔ دروازے کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ اچانک دروازہ ایک آواز سے کھلا۔

فریال' عدیل کا ہاتھ تھامے گھر میں داخل تو ہو گئی مگر گھر کے سب لوگوں کو یوں آنگن میں ایک ساتھ غم زدہ سا بیٹھا دیکھ کر دلگرفتہ سی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''کیوں آئی ہو تم؟ کس کی اجازت سے تم نے ہمارے گھر میں قدم رکھا؟'' شاہنواز نے گرج کر کہا۔

''فریال' جس تیزی سے تم قدم بڑھا کر آئی ہو اس سے زیادہ تیزی سے تم لوٹ جاؤ۔'' دلنواز نے فریال کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے شادی کی ہے' کوئی گناہ نہیں کیا'' عدیل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''جس شادی کا ہمیں علم ہی نہیں اور جس میں کوئی شریک ہی نہیں ہوا' اس کی صداقت پر کیسے یقین کر لیں؟''

''یہ ہمارا نکاح نامہ ہے'' فریال نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے پرس سے نکاح نامہ نکالتے ہوئے کہا۔

''ہمیں دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے'' شاہنواز غصے سے بولا۔

''پھر بھی ایک نظر دیکھ تو لیں۔'' وہ ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''جب تمہیں ہماری ضرورت نہیں تھی' تو ہم کیوں دیکھیں؟''

''بھائی جی! مجھے معاف کر دیں اور صرف ایک بار میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں'' وہ گڑگڑائی۔

''نہیں...... ہرگز نہیں۔ تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''بھائی جی! پلیز......'' اب وہ دلنواز کے سامنے ہاتھ جوڑے سسک رہی تھی اور اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تمہاری بہن لوفروں کی طرح گھومتی ہے مگر یہ ڈھٹائی سے آنکھوں میں دھول جھونکا تی تھی اور آخر دکھا دی ناں اپنی اوقات......'' ثریا نے تمسخر سے اپنے میاں سے کہا۔

''امی! مجھے معاف کر دینا......'' فریال لرزتے وجود کی طرح ماں کی طرف بڑھی۔

شائستہ بیگم پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا اپنا وجود خود زلزلوں کی کیفیت میں تھا۔ پھر بھی بلکتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر وہ آگے بڑھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنے سینے میں چھپا کر تحلیل ہو جائیں۔

ب تانبا پگھلاتا جملہ ان کے کانوں میں پڑا۔

''امی! رک جایئے آپ......'' شاہنواز نے ان کے قدموں میں جیسے بیڑیاں ڈال دیں ''آپ کا بھی اس سے کوئی سروکار نہیں رہے گا۔''

''ہاں فریال' اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ ہم تمہارے لیے مر گئے ہیں اور تم ہم سب کے لیے مر چکی ہو اور آئندہ اس گھر میں تم کبھی قدم رکھنے کا سوچنا بھی نہیں۔''

''امی......!'' وہ ہونٹوں کو کچل کر تڑپ سی گئی۔ اتنی بڑی سزا تو اس نے سوچی تک نہ تھی۔

''وہ لڑکیاں جنہیں اپنی اور اپنے گھر والوں کی عزت کا کوئی احساس نہیں ہوتا' انہیں کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اپنے میکے والوں سے کسی قسم کا کوئی واسطہ رکھیں۔ تم اپنی منحوس صورت لے کر جتنی جلدی نکل سکتی ہو' نکل جاؤ'' دلنواز غصے سے کہہ رہا تھا۔

صابرہ کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سب کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہیں رہی تھی۔

''چلو فریال!'' عدیل نے اس کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

سائرہ دہلیز پر پتھر کی سی مورت بنی کھڑی تھی۔

''کیسی تربیت کی آپ نے اماں جان! ایک نے گھر نہیں بسایا اور دوسری نے ہمارے گھر پر کالک تھوپ دی۔'' ثریا نے ہنس کر ساس سے کہا۔ اس کی ہنسی کوڑے بن کر لگ رہی تھی ''اگر اس کو گھر سے نہ نکالتے تو میری شا پہ اتنا برا اثر پڑتا۔''

''اب چلو بھی'' عدیل نے اسے ٹہوکا دیا۔

جانے سے پہلے آنسو بھری نظروں کے ساتھ پلٹ کر اس نے پیچھے دیکھا۔

امی اس کا وجود اپنی نظروں میں بھر رہی تھیں۔ سائرہ تیورا کر زمین پر گر چکی تھی۔ شاہنواز اور دلنواز اس کو ملنے کے بجائے پھنکارتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسی کو دیکھ رہے تھے۔

فریال کا قدم گھر کی دہلیز سے باہر نکلا تو پیچھے سے اتنی زور سے دروازہ بند کیا گیا کہ اس کی کڑیاں بھی تڑپ کر نہ اٹھیں۔

☆☆☆

شاہنواز جو کچھ عرصے سے ماں کی راہوں میں پھول بچھا رہا تھا' اس وقت اس کی زبان انگارے اگل رہی تھی۔

''کسی کی بھی بیٹی کے لوفر ہونے کی وجہ اس کی ماں کی نااہلی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے فرائض صحیح طرح سے ادا نہیں کر پاتی' جو اسے ادا کرنے چاہئیں۔ ویسے تو آپ کی فریال سے بڑی دوستی تھی مگر اس نے گھر سے بھاگنے

کی اطلاع آپ کو نہیں دی۔'' شاہنواز کی زبان برابر زہر اگل رہی تھی۔

''سائرہ! تم تو بہن تھیں' ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کیا کرتی تھیں' تم تو اس کے اس پروگرام سے ضرور آگاہ ہو گی یا پھر وہ تمہارے پلان پر چلی تھی؟'' میاں کے رنگ دیکھ کر ثریا نے بھی کھنچائی کر ڈالی۔

''مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے کچھ......'' سائرہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ ضبط کرتے کرتے اس کی آواز تک بیٹھ گئی تھی۔

''ایسا تو نہیں لگ رہا تمہارے چہرے سے۔ نہ ہی تم اتنی پریشان تھیں جتنے یہ گھر کے سب لوگ تھے۔'' ثریا کی تفتیش کسی صورت کم نہیں ہو رہی تھی۔

''پھر مجھے اپنی پریشانی...... آپ کو کس طرح دکھانی چاہیے تھی؟'' سائرہ نے زچ ہو کر پوچھا۔

''چپ کرو' زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ ابھی ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں گی'' ثریا کی اس وقت بن آئی تھی۔ اس وقت وہ جتنا بھی زہر اگلتی' وہ کم تھا۔

''چپ ہو جاؤ ثریا!'' شاہنواز نے ماں کا سفید ہوتا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''کیوں' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ ہمیشہ آپ کی بہنوں نے مجھے جھوٹا بنایا۔ آج اللہ نے کیسی اصلیت کھولی ان کی۔'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے جلال بھرے لہجے میں بولی۔

''ثریا! میں نے کہا ناں کہ چپ ہو جاؤ۔ بس' اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' شاہنواز نے اسے گھرکا اور شائستہ بیگم اپنے آنسو دوپٹے سے خشک کرتے ہوئے بستر پر آ کر جیسے ڈھے گئیں۔ اس وقت ان کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ان کی کمر توڑ دی ہو۔

☆☆☆

کبھی کبھی محبت کا ٹکراؤ نفرت سے ہو جایا کرتا ہے تو صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔

یہاں بھی بات تو محبت کی تھی مگر اس کا مسئلہ خاصا گمبھیر ہو گیا تھا۔ نفرت کی اوس محبت کے گلاب پر جو آ گری تھی۔

ہوا یوں کہ پیغام رساں پپو کے ہاتھ سے خط لے کر اس کے بڑے بھائی اشرف نے پڑھ لیا تھا اور وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔

فرح کا گھر تو ان کے پڑوس میں ہی تھا' وہاں جا کر اس نے کچھ نہیں کہا مگر شجاع سے جب وہ ملا تو اس کی طبیعت صاف کر دی۔

''شجاع بھائی' یہ ٹھیک ہے کہ فرح کے ساتھ آپ کی محبت کا دور چل رہا ہے مگر کسی چھوٹے بچے کو اس طرح کی پیغام رسانی کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔''

''وہ تو بس میں نے یوں ہی دے دیا تھا کہ پڑوس کا گھر ہے' جا کر دے دے گا'' شجاع واقعی جھینپ گیا تھا۔

''پپو تو یہ کام گزشتہ دو ماہ سے باقاعدگی سے کر رہا ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا ہے کہ ہفتے میں تین خط فرح باجی دیتی ہیں اور چار خط شجاع بھائی دیتے ہیں۔'' گو اشرف اپنی برہمی کو چھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر اس کے لہجے میں سلگتے شرارے شجاع سے چھپ نہیں سکتے تھے۔

''اچھا یار ناراض نہ ہو' آئندہ نہیں دیں گے خط اسے۔ ہاں' جب تیرا وقت آیا ناں تو مجھے دے دیا کرنا اپنا

میں خود جا کر دے آیا کروں گا ہاں'' اس نے بات کو مذاق کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی' مجھے یہ سب باتیں انتہائی فضول لگتی ہیں۔''

''نہیں یار! کبھی کبھی فضول باتیں بھی اچھی لگتی ہیں'' شجاع نے ہنس کر کہا۔

''جو بات غلط ہے' وہ غلط ہی ہوتی ہے۔ جس لڑکی کو اپنے آپ پر قابو نہ ہو' وہ آگے کیا کام کرے گی۔ وہ اپنی نہیں تو کسی اور کی کیا بن کے رہے گی؟ معاف کرنا یار! میں ایسی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔''

''نہیں یار! فرح ایسی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں تو محبت کی آگ نے جلا کر رکھا ہوا ہے ورنہ وہ تو میرے خط تو اب بھی بڑی مشکل سے دیتی ہے'' شجاع نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پر آگ تو دونوں جانب ہی ہے ناں؟'' اشرف نے پوچھا۔

''ہاں یار! ایسا تو ہے'' شجاع معصومیت سے ہامی بھرتا ہوا بولا۔

''آپ لوگ ایک دوسرے کے عزیز بھی ہیں۔ رشتے داری دور کی سہی' پر ہے تو سہی۔ آپ ان کے گھر جا کر مل سکتے ہیں۔'' اشرف نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اور شجاع اس کے جملے پر غور ہی کرتا رہ گیا کہ وہ اسے سمجھا رہا ہے یا کلسا رہا ہے؟

''چپ کیوں ہو گئے' میں کیا غلط کہہ رہا ہوں؟'' اشرف نے اسے بولنے کو اکسایا۔

''اب روز روز تو کوئی کسی کے گھر نہیں جایا کرتا ناں۔''

''تو کیا رشتہ مانگنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' وہ درپردہ تفتیش کر رہا تھا۔

''ہاں' ہے تو سہی......'' شجاع کے لبوں پر مسکراہٹ کے دیے روشن ہو گئے۔

''کچا ارادہ یا پکا ارادہ؟'' اشرف نے ہنس کر پوچھا۔

''یاراں' کچے ارادے تو کھیل ہوتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' تم محبت کا کھیل نہیں کھیل رہے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں فرح کے ساتھ ٹائم پاس کروں۔''

''تو پھر کب تک......؟'' اشرف نے ہنس کر پوچھا۔

''اس کے امتحان تو ہو جائیں' دو ڈھائی مہینے کی بات ہے۔''

''اچھا' یہ بات ہے...... پھر تو پیشگی مبارک ہو'' اشرف نے بہ آسانی اس کے آئندہ کے پروگرام اگلوا لیے

☆☆☆

اشرف ایک کینہ پسند لڑکا تھا اور شجاع کے ساتھ تو ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رکھا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں ہم جماعت بھی رہے تھے مگر پھر بھی ان کا آپس میں کوئی یارانہ نہیں تھا۔

شجاع ہمیشہ فرسٹ آیا کرتا اور اشرف رعایتی نمبروں سے پاس ہوتا۔ استاد ہمیشہ شجاع کی تعریف کرتے اور اشرف کو تنبیہ کی جاتی۔

ایک ہی خاندان کے دو افراد جب تعلیمی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں تو ان میں دوستی کا رشتہ مشکل سے بنتا ہے۔

شجاع مردانہ وجاہت کا حامل نوجوان تھا جس کا چھ فٹ تین انچ قد اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا

تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد اشرف نے اپنی اماں سے کہا، وہ فرح سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

"بڑی نک چڑھی سی لڑکی ہے وہ" بہنوں نے اعتراض کیا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے پسند ہے۔"

"اتراتی بھی بہت ہے۔"

"اترانے دو، اس عمر میں سب لڑکیاں اتراتی ہیں۔"

"اپنے حسن پر اسے غرور بھی بہت ہے۔"

"خوبصورت لوگ تو ہوتے ہی گھمنڈی ہیں" وہ ہنسا۔

"گھر کا کام کاج بھی اسے نہیں آتا۔"

"تم لوگ سکھا دینا۔"

"تمہارے چھوٹے قد کا بھی مذاق اڑاتی ہے اور ہماری کالی رنگت پر ہنستی بھی بہت ہے۔" بہنوں کا یہ اعتراض سن کر وہ کچھ دیر گم صم سا رہ گیا۔

بھائی کو خاموش دیکھ کر بہنوں کا حوصلہ بڑھا اور سرشار لہجے میں بولیں اور خالہ جمیلہ کی بیٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہا "صادقہ خوبصورت بھی ہے اور اچھی عادتوں کی بھی۔ مجال ہے کہ کبھی زور سے قہقہہ جو لگائے۔ فرح تو کسی محفل میں چلی جائے تو دو دو گز کے قہقہے لگاتی ہے اور شور مارنے کی عادت تو اس کی ایسی بری ہے کہ ذرا جو اچھی لگتی ہو۔ اس کے مقابلے میں صادقہ بہت پیاری ہے۔ اشرف بھائی! اگر آپ کہیں تو ہم صادقہ کے لیے آپ کا رشتہ لے کر جائیں؟"

اشرف کے نقوش تو معمولی سے ہی تھے۔ اس پر اس کا مٹاپا بھی بہت تھا جو اس کے کوتاہ قد پر بہت عجیب سا لگا کرتا تھا۔ یوں وہ خواہ مخواہ احساس کمتری کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اس کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس کی شخصیت میں ایسی کوئی جاذبیت نہیں ہے جو کسی کو متاثر کر سکے اس لیے اس کا لہجہ ہمیشہ جلا بھنا سا رہا کرتا تھا۔

اشرف کی یہ دلی خواہش تھی کہ کبھی وہ شجاع کو اپنے سے کم تر دیکھ سکے مگر قسمت نے کبھی اسے یہ موقع فراہم نہیں کیا تھا۔

پپو کے ہاتھ سے خط لے کر وہ درحقیقت شجاع کو ذلیل کرنے گیا تھا مگر جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ فرح سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل پر برچھیاں سی چل گئی تھیں۔ پڑوس کی لڑکی کا رشتہ دو محلے دور سے آئے، یہ اسے کسی طرح گوارا نہ تھا۔

اسے شجاع سے یہ پتا چل گیا تھا کہ فرح کے لیے شجاع کا رشتہ دو ڈھائی ماہ بعد جائے گا۔ اب اس کے پاس یہی وقت تھا اور اسی میں اسے ایسا کچھ کرنا تھا کہ شجاع اس کا منہ دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔" اشرف نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تو پھر سمیرا، نسرین اور شائلہ میں سے کسی کا انتخاب کر لیں۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔" اشرف نے غصے سے کہا۔

"تو پھر آپ ہی بتا دو ناں بھائی! ہم آپ کا رشتہ لے کر کہاں جائیں؟"

"اپنے پڑوس میں فرح کے لیے" وہ زیر لب مسکرا کر بولا۔

تب اگلے دن ہی اشرف کی ماں مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ فرح کے گھر چلی گئی۔

اشرف کی اپنی زمینوں کے علاوہ علاقے میں ایک دکان بھی تھی۔ فرح کی ماں نے اشرف کی ماں کا خیر مقدم اور سوچ کر جواب دینے کو کہا۔

"سوچنا کیسا...... رشتے داری کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی ہوں اور جان لو کہ پڑوسیوں کے حقوق بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ میں نے ہرگز نہ نہیں سننی ہے، ہاں!"

"پھر بھی...... کچھ وقت تو دیں ناں۔"

"منگنی کے لیے وقت لے لو مگر فیصلہ کرنے کے لیے نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے، صرف دس دن ہی دے دو۔ میں اس کے ابا سے مشورہ کر لوں پھر آپ کو بتاؤں گی۔"

"مگر صرف "ہاں" سنوں گی میں۔" اشرف کی ماں نے سمدھن کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے، اگر اس کا نصیب آپ کے بیٹے کے ساتھ جڑا ہے تو ہر صورت مجھے ہاں ہی کرنی پڑے گی۔"

"یہ بات تو تمہاری سو فیصد درست ہے۔ بچوں کے رشتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کہاں ہونے ہیں۔ یہ فیصلے تو اوپر والا کرتا ہے۔"

فرح کی ماں نے چائے کے ساتھ خاصا اہتمام بھی کیا تھا جبکہ محلے داری میں اتنی خاطرداریاں نہیں چلتی نہیں۔

اشرف کی ماں نے چلتے وقت فرح کو خوب پیار کیا اور ہاتھ پر سو روپے کا نوٹ بھی رکھا۔

"اماں! یہ خالہ مجھے سو روپے کیوں دے گئیں؟" فرح نے حیران ہو کر ماں سے پوچھا۔

"وہ تجھے پسند کر گئی ہیں" اماں نے ہنس کر کہا۔

"مگر کیوں؟" دل میں اتھل پتھل سی شروع ہو گئی۔

"اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آ رہی؟" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"نہیں اماں، میں واقعی نہیں سمجھی" وہ معصومیت سے بولی۔

"ارے وہ تجھے اپنے اشرف کی دلہن بنانا چاہتی ہیں۔"

اور فرح کے ہاتھوں سے نوٹ چھوٹ کر آنگن کے پودے میں الجھ گیا۔

☆☆☆

یہ بات اس کی قسمت میں تھی یا اس کی بے احتیاطی...... اس نے ٹی وی لاؤنج میں پیر رکھا ہی تھا کہ پیر پھسل گیا۔

مائی ابھی ٹاکی لگا کر گئی تھی، فرش گیلا تھا اور اس کے پیروں میں ربڑ کے چپل تھے۔

اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر وہ چاروں شانے چت گر پڑی۔ ابا جی گھر پر ہی تھے۔ انہی کو فوراً گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ فیروزہ مسلسل اس کے اوپر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں مگر اس کی کنڈیشن ہی ایسی تھی کہ ڈاکٹر کو ڈی این سی کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

وہ پھول جو ابھی کھلا بھی نہیں تھا، وہ آنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

فہمی کو جو غم تھا سو الگ تھا‘ فہد کا چہرہ اتر گیا تھا اور ممانی جان تو ڈھے سی گئی تھیں اور ان کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔

”اگر لڑکی ہوتی تو بچ جاتی‘ یقیناً لڑکا ہی ہوگا جو یوں ضائع ہوگیا۔“

امی انہیں سمجھا رہی تھیں‘ درخت کے کچے پھل ضائع بھی ہو جاتے ہیں‘ آئندہ کے لیے دعا کرو کہ وہ جیتی جاگتی اولاد دے۔

ممانی کا ملال کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ جب فہد نے جاب کرنے کی اجازت نہیں دی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی مگر اس کے باوجود فہمی نے بچے کا خیال نہیں کیا اور گیلے فرش پر چلتی چلی گئی۔

”یہ ابارشن صرف بے پروائی کی وجہ سے ہوا ہے‘ اگر خیال رکھتیں تو کاہے کو یہ سب دیکھنا پڑتا۔“

”فہد نے اسے سمجھایا تھا کہ چار پانچ ماہ تک گھر سے نہیں نکلو‘ پہل کی اولاد کو نظر بھی جلدی لگا کرتی ہے مگر وہ ایک ضدی‘ شوہر کی بات بھی مان کر نہ دی۔ اگر مان جاتی تو یہ سب کیوں دیکھنے کو ملتا؟“

”ماں کے گھر جانے کا ہڑکا نہ جانے لڑکیوں کو کیوں اتنا ہوتا ہے‘ اتنے سال زندگی کے وہاں گزارنے کے باوجود ان کا دل ہی نہیں بھرتا۔“ ممانی جان کی تقریریں کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔

”بھابی! آپ دادی جلد ہی بن جائیں گی‘ بس دعا مانگیں“ فیروزہ انہیں سمجھاتیں۔

”ارے میرا اکلوتا بچہ ہے‘ اگر اس کے اولاد نہ ہوئی تو وہ تو اکیلا رہ جائے گا۔ اس بے چارے کا تو بھائی بھی نہیں ہے اگر بیٹا نہ ہوا تو کیا ہوگا؟“ ممانی جان کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

”آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں جو بچہ ضائع ہوا‘ وہ لڑکا ہی ہوگا؟“ فیرزہ بیگم نے چڑ کر کہا۔

”ہزاروں مثالیں ہیں میرے سامنے کی۔ بیٹی پیٹ میں ہو اور ماں چھت سے گر پڑے تو وہ ضائع نہیں ہوتی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی“ فیروزہ کو غصہ ہی تو آگیا۔ عورت ہو کر بیٹی کی تذلیل کیے جارہی تھیں۔

”میں یہ باتیں اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہ سیانوں کی باتیں ہیں۔ لڑکی سخت جان ہوتی ہے اور لڑکا نازک ہوتا ہے‘ اگر کسی کی کہنی بھی لگ جائے تو بعض مرتبہ بیٹا ضائع ہو جاتا ہے۔“

”اب یہ فہمی نے ایسا جان بوجھ کر تو نہیں کیا ناں؟“

”اگر وہ کہا مانتی تو ایسا نہ ہوتا“ ان کی وہی گردان جاری تھی‘ جسے سن کر وہ عاجز آچکی تھیں۔

پندرہ دن کے بعد فہد نے جب اسے گھر چلنے کو کہا تو فیروزہ نے انکار کر دیا۔

”کیوں بھئی‘ اب گھر جانے میں کیا امر مانع ہے؟“ وہ حیران ہو کر بولا۔

”فہمی سوا مہینہ کر کے آئے گی۔ اس کو اتنی کمزوری ہوگئی ہے کہ کھڑی ہوتی ہے تو چکر آتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے‘ جیسی تمہاری مرضی“ فہد چپ چاپ لوٹ گیا تھا۔

”یہ ادائیں تو بچہ پیدا کر کے زچہ دکھاتی ہیں۔ یہ خواہ مخواہ اترا رہی ہیں۔“ ممانی جان کے جملے سینہ بہ سینہ ہوتے ہوئے ان کے گھر بھی آپہنچے تھے۔

”ہم تو سوچ رہے تھے فہمی اپنے گھر میں گئی ہے تو اس کا ماحول بھی ویسا ہی محبت آمیز رہے گا۔ بھابی جان نے جیسا کہا تھا‘ ویسے ہی رکھیں گی مگر ان کا اصلی رنگ تو بہت جلدی دکھائی دے گیا“ فیروزہ اپنے گھر میں کڑھ کر

[illegible] نہیں۔

”ہوا کیا ہے؟“ اباجی نے پوچھا۔

”ہوا تو کچھ نہیں‘ بے بات کی بات جب بنے تو غصہ ہی آتا ہے۔“

”یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیوں غصہ آرہا ہے؟“

”فہمی کے ابارشن کا ذمے دار نہ صرف فہمی کو ٹھہرایا جارہا ہے بلکہ میری بے پروائی کی مثالیں الگ بیان کی جا رہی ہیں۔ جیسے اصل ماں وہ ہیں“ فیروزہ نے جل کر کہا۔

”کہنے دو۔ جاہل عورتیں اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ تم کیوں اپنے دل پر لے رہی ہو۔ ایک کان سے سنو [illegible] سے اڑا دو۔“

”یہ بات نہیں ہے“ فیروزہ نے تنک کر کہا۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”ساس صرف ساس ہی ہوا کرتی ہے۔ کتنی ہی رشتے داری ہو وہ سب دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ساس کا [illegible] جلد بدیر نظر ضرور آجاتا ہے۔“ فیروزہ اپنے شوہر سے دل کی بات کہہ ہی گئیں۔

”تمہارا خاندان ہی ذلیل ہے تو کیا کریں۔ ان کی اوقات سے زیادہ جہیز دیا‘ گاہے بہ گاہے کچھ نہ کچھ اپنی [illegible] دلانا کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ تمہیں باتیں سناتی ہیں تو ان سے بڑھ کر کم ظرف کون ہوگا؟“

☆☆☆

اور واقعی اس کی ہنسی کو نظر لگ گئی۔ وہ جو بات کرنے سے پہلے مسکراہٹ کے پھول اور ہنسی کی کرنیں بکھیرا [illegible] تھی‘ یکدم اس نے سنجیدگی کا چولا پہن لیا تھا۔ قہقہے سن کر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔

[illegible] کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ پپو کو وہ خط نہیں دے سکتی تھی‘ اس کو تو اس بات کا علم [illegible] تھا کہ شجاع کو بھیجے گئے کئی خطوط اشرف کے ہاتھ میں آچکے تھے جنہیں وہ حفظ کر چکا تھا۔

وہ تو بس یہی جانتی تھی کہ پپو کے بھائی اشرف کا اس کے لیے رشتہ آیا ہوا ہے اور جہاں سے رشتہ آتا ہے‘ ان [illegible] ہر معاملے میں محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

”[illegible] باجی! اب آپ نے مجھے ٹافی دینی بھی بند کر دی ہے۔ آپ مجھے خط دے دیں‘ میں شجاع بھائی کو [illegible] گا مگر ٹافی تو دے دیں“ ایک شام پپو اس کے گھر آکر اس کے رویے کی شکایت کر رہا تھا۔

”مجھے نہیں بھیجنے کسی کو خط‘ ہاں ...... یہ تم ٹافی لے لو“ وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

[illegible] کی بڑی بہن جو اس کی ہمراز تھی‘ اپنی سسرال میں کسی شادی میں لاہور گئی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ ماں کو کوئی [illegible] سکتی تھی۔

[illegible] اسے اتنا اندازہ تو ضرور تھا کہ اتنی جلد اس کی ماں اشرف کی ماں سے ہامی نہیں بھریں گی مگر یہ خطرہ اپنی [illegible] وہ اشرف کا رشتہ قبول کر سکتی ہیں۔ یوں بھی اشرف کے گھرانے کی مالی حالت ان کے گھر کے مقابلے [illegible] بہتر تھی اور پھر ابھی کون سا شجاع کا رشتہ اس کے لیے آگیا تھا۔

[illegible] کا دل چاہا کہ شجاع کی بہن فرحت آپا کو جا کر ساری بات بتادے مگر وہ اپنے اندر اتنی ہمت ہی نہیں [illegible]

[illegible] شاہدہ سے رائے لی تو اس نے بھی یہی سمجھایا ”فرحت آپا تیری ہونے والی نند ہے۔ آئندہ زندگی

میں اگر کبھی اس رشتے کے حوالے سے کوئی نرمی گرمی ہوئی تو تیری یہی نند اس بات کے ساتھ تیرے بھی چیتھڑے اڑا کر رکھ دے گی۔ اور ہر جگہ یہ گاتی پھرے گی کہ فرح اس کے بھائی سے شادی کے لیے تڑپ رہی تھی۔ خود گھر آ کر کہا' اپنے بھائی کا رشتہ جلدی سے میرے لیے لا کر ڈالو اور یوں تیری عزت خاک بھی نہیں رہے گی۔''

''مگر وہ لوگ تو خود چاہتے ہیں کہ میں ان کے گھر بیاہ کر آؤں۔'' شجاع نے اپنے خطوط میں اسے یہی نوید سنائی تھی۔

''مگر اس وقت یہ باتیں کسی طرح مناسب نہیں ہیں۔'' شاہدہ اسے ہر صورت روک رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فرح ایک جذباتی سی لڑکی ہے اور محبت کے طوفان سے ٹکرا کر اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا ہے۔

ادھر فرح کو شاہدہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فرحت آپا کے پاس جا کر سب کچھ بتا دے اور کہہ دے کہ آپا' آپ لوگ جلدی سے آ جائیں ورنہ اماں میرا رشتہ اشرف کے ساتھ طے کر دیں گی۔ اشرف' جسے اس نے کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا' اسے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

اور شجاع سے ملنے کے بعد تو اسے چہار سو شجاع ہی نظر آتا تھا اور وہ اسی کو اپنا بنانا بھی چاہتی تھی۔

اور پھر ایک بھری دوپہر میں' جب کھانا کھا کر (گھر کے سب لوگ سو رہے تھے) وہ فرحت آپا کے گھر پہنچ گئی۔

فرحت آپا کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ سب کو لسی کے گلاس دے رہی تھیں۔ ایک لسی کا گلاس انہوں نے اسے بھی تھما دیا۔

''فرح' تم تو میرے گھر آتی ہی نہیں ہو۔'' انہوں نے اس سے شکوہ کیا۔

''آج...... آ تو گئی......'' اس نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''میں تو تمہیں کب سے یاد کر رہی تھی اور تم آج آئی ہو۔''

''اچھا آپا' اب میں جلدی جلدی آیا کروں گی۔'' اس کا دل چاہا کہ کہہ دے کیا میں مہمانوں کے جانے کے بعد آ جاؤں؟

''تیرے امتحان کب ہو رہے ہیں فرح؟''

''صرف ڈیڑھ مہینہ رہ گیا ہے۔''

''بس تو امتحان دے دے' پھر میرے پاس روز آیا کرنا۔''

اور وہ حق دق سی رہ گئی۔ اس کے پاس اتنا ٹائم کہاں تھا؟ ''آپا! میرا یہ دل چاہتا ہے' آپ کو روز دیکھوں'' اس نے اس آسرے پر کہا شاید وہ یہ کہہ دیں۔ ''تیرا گھر کون سا دور ہے' روز آ جایا کر۔''

مگر وہ تو ہنس کر کہہ رہی تھیں۔ ''ارے میری گڑیا! تو روز ہی آیا کرنا...... مگر یہ ڈیڑھ مہینہ صرف اپنی پڑھائی پر لگا دے۔ خبردار! جو کہیں گھر سے قدم باہر نکالا۔ اتنی سخت گرمی میں تیرا رنگ بھی جل جائے گا۔''

اور اس نے آنکھوں تلے آئے ہوئے اندھیرے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا ''آپا! شاید آپ کو پتا نہیں' لوگ گھر میں بھی بیٹھ کر جل جاتے ہیں۔''

فرحت نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ ہی شاید مایوسی بھرا تھا۔ ''اللہ نہ کرے۔ اچھی بات منہ سے نکالا کر۔ تو پیاری سی ہے اور انشاء اللہ پیاروں میں ہی جائے گی۔''

نند کے بچے کو دھکا سا لگا تو فرحت پانی کا گلاس لے کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ انہیں سلام کر کے بے

ل مرام مایوس سی اپنے گھر لوٹ آئی۔

جو بے کلی اس کے دل میں تھی' وہ مزید بڑھ گئی۔ فرحت آپا کے پاس جا کر بھی وہ اپنے دل کی بات انہیں بتا ہیں پائی تھی...... اور وہ بھی اس کے چہرے کا حزن و ملال دیکھ کر بھی کچھ سمجھ ہی نہیں سکی تھیں۔

ب دل کو لگی ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ماں کھانے کو کہتی تو نوالے اس کے حلق میں پھنسنے لگتے۔ ماں کہیں جانے کو کہتی تو وہ صفاچٹ انکار کر دیتی۔ بیٹھتی تو چکر آتے' کھڑی ہوتی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا۔

ایک دن وہ لڑکھڑا کر گری تو ماں پریشان سی ہو گئی۔ ''فرح بیٹا! تو ٹھیک تو ہے ناں؟''

''ہاں امی! مجھے کیا ہونا ہے'' وہ اداسی سے بولی۔

''پھر اتنی پریشان سی کیوں ہے؟''

''بس' امتحان کی فکر ہے' اگر فیل ہو گئی تو کیا ہو گا؟''

''دفع کر امتحان کو' مت دینا مگر اپنا آپ تو اچھا رکھ'' ماں نے تسلی دی۔

''کیسے رکھوں میں اپنے آپ کو راضی'' اس نے دل میں سوچا۔

''یہ سب باتیں' شجاع کو تو معلوم ہونا چاہئیں'' اس کے دل میں خیال آیا۔ ''مگر کیسے پتا چلے انہیں' کتنے ہی دن ہو گئے تھے' وہ اپنی بہن کے گھر بھی آتے دکھائی نہیں دیے تھے۔

''امی! آج ماسٹر صاحب کے گھر چلیں۔'' اگلی ہی شام اس نے اپنی ماں سے کہا۔

''ہاں چلو' میرا بھی دل کہیں جانے کو چاہ رہا ہے اور ماسٹر صاحب کی بیوی بہت اچھی خاتون ہیں۔''

اور جب وہ ماسٹر صاحب کی گلی میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے' شجاع کے گھر کے دروازے پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔

''کہاں چلے گئے وہ' مجھے بتائے بغیر۔'' ایک غم کا پہاڑ اس کے سینے پر جیسے آ گرا تھا۔

''عظمت آپا کے بھائی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اور شجاع اچانک ہی کل رات کراچی چلے گئے۔''

''کب آئیں گی خالہ؟'' فرح نے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالا دیتے ہوئے پوچھا۔

''بہت عرصے بعد گئی ہیں عظمت آپا کراچی۔ اتنی جلدی تھوڑی آئیں گی۔ ایک ہی تو بھائی ہے ان کا...... اور اس کا بھی ہارٹ کا کوئی چکر ہو گیا ہے۔ وہ بھی کہاں آنے دے گا انہیں۔''

جو خوشی اور سرشاری گھر سے جاتے وقت اس کے چہرے پر تھی' یہ سن کر معدوم سی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا شجاع اسے راستے میں ہی نظر آ جائے گا' پھر وہ انہیں اپنے گھر لے جائے گا اور وہ چپکے سے اسے اپنا خط پکڑا دے گی جس میں اپنے خدشات کی ایک ایک بات اسے لکھ دی تھی۔ تڑا مڑا خط' رومال میں لپٹا ہوا اس کی ہتھیلی کے پسینے سے بھیگا جا رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا ہونے والا ہے' میری پریشانی شجاع تک پہنچ ہی نہیں پا رہی......'' وہ ہراساں سی ہو گئی۔

''امی! گھر چلیں ناں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''ارے ابھی بیٹھو بیٹا!! ابھی تو آئی ہو'' ماسٹر صاحب کی بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔ تب وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

ماسٹر صاحب کی بیگم اسے شادی کا البم دکھا رہی تھیں۔ جس میں فرح کی تصویریں بھی تھیں مگر اس کو اس وقت

کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اور جب وہ ان کے گھر سے اٹھی تو اس کی نظریں شجاع کے گھر کے تالے پر بھی اٹک گئیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھر کا تالا توڑ کر وہ اندر داخل ہو جائے اور در و دیوار کو چیخ چیخ کر بتا دے کہ اس کے ساتھ انجانے میں کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے۔

''سنو...... تم شجاع سے کہہ دینا کہ وہ ہمارے گھر فوراً آئے'' شجاع کے گھر کی دیوار کے سہارے چلتے ہوئے اس نے دھیرے سے دیوار سے کہا اور پھر اپنی اس حرکت پر خود ہی الجھ گئی۔

کاش! ان بے جان دیواروں کی سماعت اور گویائی ہوتی تو کتنی بہت سی دلوں کی باتیں دلوں کے اندر یوں شور نہ مچایا کرتیں۔ تب حقیقت میں دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگا کرتا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد اشرف کی ماں پھر موجود تھیں۔

''فرح میٹرک کا امتحان دے لے پھر سوچتے ہیں'' امی نے ابا سے مشورہ کر کے انہیں یہی جواب دیا تھا۔

''تم منگنی امتحانوں کے بعد کر لینا مگر ہامی ابھی بھر لو'' اشرف کی ماں بھی ان کی جان کو ہی آ گئی تھی۔

''منگنی' ہامی سب ایک ساتھ کریں گے'' دوٹوک لہجے میں کہا گیا۔

''یہ تو ہمیں ٹالنا ہو گیا؟''

''ٹالنا کیسا...... سچی بات یہی ہے۔ ابھی ہمارا داماد بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ آئے گا تو اس سے بھی رائے لیں گے۔ بیٹی داماد سے پوچھے بغیر تو ہامی نہیں بھر سکتے ناں۔''

''میں تمہاری پڑوسن ہوں' میرا حق فرح پر پہلے ہے۔''

''یہ میں نے کب کہا تمہارا حق کم ہے' تم تو میری بہن جیسی ہو۔''

''قائم رہنا اپنی اس بات پر؟''

''ہاں ہاں' کیوں نہیں۔''

''تم نے تو میرے دل میں چراغاں سا کر دیا ہے۔''

''یہ چراغ یوں ہی روشن رہیں گے۔''

تب اشرف کی ماں نے خوش ہو کر فرح کو لپٹاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر سو کا نوٹ پھر رکھ دیا اور فرح کو یوں لگا جیسے کسی نے جلتا ہوا کوئلہ اس کی ہتھیلی پر دھر دیا ہو۔

''امی! دیکھیے خالہ کو......'' فرح کی آواز تھی یا غم کی صدا......!

ماں نے پلٹ کر بیٹی کو دیکھا اور سو کا نوٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اشرف کی ماں کے ہاتھ میں رکھ کر ان کی مٹھی بند کرتے ہوئے کہا'' آپا! یہ لینا دینا' ہامی بھرنے کے بعد ہونا چاہیے۔''

''ارے یہ سو کے نوٹ کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ تو میں اپنی فرح کے اوپر سے وار کر کے کسی کو دے دوں'' اشرف کی ماں سے اپنی خوشی جیسے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

''آپ کی بات صحیح مگر ہر کام اپنے وقت پر ہو تو اچھا لگتا ہے ناں۔''

''ہاں' یہ تو ٹھیک ہے۔'' انہوں نے نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں گردن ہلائی۔

اور فرح کے مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو سے آ گئے اور وہ جھٹ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

''جھلی کہیں کی' ابھی سے شرما گئی'' اشرف کی اماں نے سوچتے ہوئے قدم باہر بڑھا دیے۔

☆☆☆

''امی! ہم جمال بھائی کے لیے نگین کے ہاں جائیں۔'' ربیع نے ماں سے پوچھا۔

''ہاں' لڑکی تو خوبصورت ہے۔ جمال کے ساتھ سجے گی'' ماں نے خوش ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے' پھر کل ہی جاتے ہیں ان کے ہاں۔'' ربیع کا لہجہ خوشیوں سے معمور تھا۔

''کہاں جا رہی ہو کل......؟'' جمال کمرے میں داخل ہوا تو ربیع کی آدھی بات ہی سن پایا تھا۔

''نگین کے گھر جائیں گے۔''

''مگر کیوں بھئی' یہ ایکا ایکی پروگرام کیسے بن گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ کے رشتے کے سلسلے میں جائیں گے۔ پتا نہیں کیوں' ان کو دیکھ کر ہمیشہ میرا یہ دل چاہا ہے کہ ان کو ی بھابی ہونا چاہیے۔''

''نہیں بھئی' اس خیال سے تو کبھی ان کے ہاں جانا بھی نہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''مجھے نہیں کرنی اس سے شادی۔ نخریلی سی لڑکی ہے وہ......'' اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے جمال نے کہا۔

''خیر نخریلی تو نہیں'' ربیع نے حمایت کی۔

''تمہیں کیا پتا......؟''

''مگر تمہیں اس کے بارے میں کیسے پتا ہے؟'' امی نے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسے ہی' میرا خیال ہے۔ ایک دفعہ تو گیا تھا ناں میں ربیع کے ساتھ۔''

''بیٹا! کسی کے بارے میں سرسری اندازہ حتمی نہیں ہوا کرتا۔''

''آپ کو کیا پتا' وہ کیسے لوگ ہیں؟''

''اتنے عرصے سے اس محلے میں رہ رہے ہیں۔ فرید احمد کا شمار شریف لوگوں میں ہی ہوتا ہے۔''

''پھر بھی' مجھے پسند نہیں ہے وہ'' اب جمال منہ پھیرے کہہ رہا تھا۔

''چلو' تمہیں جو پسند ہو وہ بتا دو۔''

''جب ہو گی تو بتا دوں گا'' یہ کہہ کر جمال رکا نہیں' تیزی سے باہر نکل گیا۔

''دیکھا' اس طرح کرتے ہیں بھائی جان! جہاں ان کی شادی کا ذکر ہو' فوراً کسی نہ کسی بہانے سے منع یتے ہیں۔''

''اب شادی بھی بھلا زبردستی تو نہیں کی جا سکتی۔ پتا نہیں کیا چاہتا ہے' کسے چاہتا ہے؟ اور کیوں انکار کرتا ہے'' ماں سوچتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''یہ ہے تمہارا سوٹ...... یہ سوئٹر...... یہ رہی شال...... اور یہ ڈیکوریشن پیس'' زبور نے ڈبوں میں سے نکال نام چیزیں نگین کے آگے ڈھیر کر دیں۔

''مگر کس خوشی میں یہ عنایات کی جا رہی ہیں؟''

''امی لائی ہیں کینیڈا سے' کل ہی رات تو وہ پہنچی ہیں کراچی'' زبور نے کہا۔

"تمہاری امی یہ سب چیزیں خود اپنے ہاتھ سے مجھے دیتیں تو مجھے بہت اچھا لگتا۔"

"وہ تو یہی کہہ رہی تھیں مگر میں اٹھا لایا۔"

"مگر کیوں......؟"

"امی کی سفری تھکان ہفتہ دس دن تک چلے گی۔ پھر ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جو ان سے ملنے آئے گا وہ اس کو چیزیں نکال نکال کر دیتی رہیں گی۔ مجھے یقین تھا کہ تمہاری یہ چیزیں جو ممی بطور خاص تمہارے لیے لائی ہیں' وہ بھی میری کزنز میں بٹ جائیں گی۔"

"مگر میں اپنے گھر یہ سب سامان کیسے لے جا سکتی ہوں؟"

"کہہ دینا میری سہیلی زیبی کی امی لائی ہیں کینیڈا سے۔"

"امی پوچھیں گی' زیبی کون ہے تو پھر......؟"

"نئی سہیلی بنی ہے۔"

"میں اتنے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"پھر...... میں امی سے جا کر یہ کہہ دوں کہ آپ کی ہونے والی بہو نے تمام چیزیں میرے منہ پر مار دیں؟"

"نہیں' تم یہ چیزیں اپنی الماری میں رکھ لو۔ یہ سوچ کر کہ میری امانت ہیں اور جب تمہاری امی ہمارے گھر آئیں گی تو وہ لے آئیں۔"

"اب اتنی جلدی تو وہ نہیں آ سکیں گی ناں۔"

"ٹھیک ہے جب ان کی تھکن اترے' تو دو چار سال بعد آ جائیں" نگین نے جل کر کہا اور زیور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"یار' تمہاری یہی تو باتیں ہیں جو دل میں پھول سے کھلا دیتی ہیں۔"

"مگر میرے من کے پھول تو مرجھانے لگے ہیں زیور!"

"ایسا مت سوچا کرو جانو!"

"تمہاری ممی کی جانب سے ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور میری ایک پھوپی پنجاب سے آ کر مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی ہیں جیسے وہ مجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔"

"کیا ان کا بیٹا بھی آیا ہوا ہے ان کے ساتھ؟"

"ہاں' وہ بھی آیا ہے۔"

"کیسا ہے وہ؟"

"پتا نہیں۔"

"مجھ سے زیادہ اسمارٹ ہے کیا؟"

"ہو سکتا ہے کہ ہو...... مگر میں نے اسے نظر بھر کر ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا۔"

"دیکھنا بھی نہیں کہ انتظار کا سے اب بہت کم رہ گیا ہے۔"

"کتنا کم......؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس یہ سمجھو کہ جتنی جلدی ممکن ہوا میں ممی کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔ میری ممی چونکہ ہارٹ پیشنٹ ہیں اس لیے انہیں تھکان بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ تم ممی کا خیال رکھو اور مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں ہے' وہ آرام سے آئیں۔"

"مگر جانو! مجھے تو تم سے زیادہ جلدی ہے۔" زیور نے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامتے گہرے لہجے میں کہا۔

محجوب سی ہو کر اس نے نظریں جھکا دیں۔

☆☆☆

فیروزہ بیگم کا جسم بھاری بھرکم سا تھا اور آرام کرنے کی بھی وہ بے حد شوقین تھیں۔

انہیں ہر وہ کام اچھا لگتا تھا جو بستر پر لیٹ کر کیا جائے۔ بستر پر لیٹ کر وہ اخبار پڑھتیں' ٹی وی دیکھتیں۔

سبزی کٹتی تو تخت پر پیر پھیلا کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کاٹتیں۔ حد تو یہ ہے کہ نٹنگ بھی وہ لیٹ کر کرتیں۔

فرید احمد گھر میں نہ ہوتے تو وہ اپنا کھانا بھی بستر پر بیٹھ کر کھاتیں۔ دوپہر کو لمبی تان کر سونا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ جس دن سو نہ پاتیں' ان کا سر بھاری سا ہو جاتا۔

اور یہ فرید احمد کی چڑ تھی کہ وہ جب گھر میں آئیں اور فیروزہ انہیں سوتی ہوئی ملیں۔

"تم ہر وقت سوتی رہتی ہو۔ تمہارا دل نہیں گھبراتا بستر پر لیٹے لیٹے؟" وہ اکثر ان سے کہا کرتے۔

"جان ہے تو جہان ہے۔ انسان کو آرام بھی کرنا چاہیے" وہ ان کی بات ہنسی میں اڑاتیں۔

"مجھے تو بستر میں لیٹ کر وحشت ہوتی ہے" وہ غصے سے کہتے۔

"ہمیں تمہارے وجہ بے وجہ گھومنے سے ہوتی ہے۔"

اور اب فرید احمد باہر گھومنے پھرنے کے بجائے صرف گھر ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بستر سے بے وجہ اٹھ بھی لگتے تو فیروزہ انہیں ٹوک دیتیں۔

فرید احمد کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا' ان دنوں وہ بستر پر آرام کر رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے انجیو گرافی کے بعد بتایا تھا کہ ان کے دل کی ایک نالی بلاک ہے۔

قسمت اچھی تھی اور دعائیں بھی باریاب ہوئیں کہ انجیو پلاسٹک سے وہ بلاکٹ نکل گیا اور اوپن ہارٹ سرجری کی نوبت نہیں آئی۔

فیروزہ بیگم کا یہ سو فیصد خیال تھا کہ روزانہ سورہ فاتحہ پڑھ کر پانی پلانے سے فرید احمد کا بلاکٹ نکلا تھا۔

حقیقت بھی' اللہ نے فرید احمد کو نئی زندگی دی تھی۔ اسپتال سے گھر آنے کے بعد انہوں نے پہلا فون اپنی بہن عظمت کو کیا تھا' جس کو سن کر وہ اپنے بھائی کے پاس دوڑی چلی آئی تھیں۔

راستے میں شجاع نے ان سے کہا تھا "امی! اگر ماموں جان فہمی کی شادی کے وقت اسی طرح ایک فون کر دیتے تو کیا ہم لوگ اس کی شادی میں شریک نہ ہوتے۔"

"پرانی باتوں پر مٹی ڈال' میرا بھائی بیمار ہے۔ کوئی ایسی بات نہ کرنا جو اس کے دل کو لگے۔" عظمت سارے راستے بھائی کی زندگی کی دعائیں کرتی آ رہی تھیں اور جب کراچی آ کر بھائی کو دیکھا تو ان کے آنسو کسی طرح خشک نہیں ہو رہے تھے۔

انہیں کراچی آئے پندرہ دن ہو گئے تھے مگر فرید احمد انہیں جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔

"نہیں آپا! ابھی مت جاؤ۔ تم سے باتیں کر کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر کی اداسی کم ہو رہی ہو۔"

عظمت اپنے ہاتھ سے ہلکی پھلکی غذا تیار کر کے بھائی کو کھلا رہی تھیں۔ ان کی ہمہ وقت یہی کوشش تھی کہ بھا
ہنستا مسکراتا رہے اور اس کے دل و دماغ پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ پڑے۔

شجاع بھی بہت عرصے کے بعد ماں کے ساتھ کراچی آیا تھا۔ اس نے نگین کو جب دیکھا تھا تو وہ چھوٹی سی
اور اب تو وہ ایک حسین دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔ لمبا سرو سا قد‘ پیروں تک آتے ہوئے بال‘ بڑی بڑی
آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب‘ وہ تو اسے دیکھ کر متحیر سا رہ گیا۔ یہی کیفیت عظمت کی تھی۔ نگین بہت اچھی
تھی۔

اور عظمت بیگم کے ارمان ان کی آنکھوں سے جھانکنے بھی لگے تھے۔ وہ جہاں جاتی‘ ان کی نظریں اس
بلائیں لیتی رہتیں۔

”جب گھر میں میری اتنی پیاری سی بھتیجی موجود ہے تو میں شجاع کے لیے باہر کی لڑکی کیوں لاؤں؟“ یہ نکتہ
کے دل میں جم سا گیا۔

شجاع نے اگر فرح کو نہ دیکھا ہوتا یا شاہراہ عشق میں اتنا آگے بڑھا نہ ہوتا تو وہ نگین کو دیکھ کر ہی شادی کا فیص
کر لیتا مگر اس کے دل میں تو فرح کا سراپا ہر طرف سے حاوی تھا اور وہ اس کو پل پل یاد آ رہی تھی۔

نگین نے نیوی بلیو سوٹ پہنا‘ جس پر اسکائی بلیو نلکیوں کا کام تھا۔ شجاع کو وہ اتنا اچھا لگا کہ چپکے سے جا
بوتیک سے خرید لایا اور اپنی اٹیچی کے نیچے چھپا دیا۔ میری فرح یہ سوٹ پہن کر کتنی پیاری لگے گی۔ وہ خیالوں
خیالوں میں سوچ کر مسکرا دیتا۔

نگین سبز جوڑے میں نظر آئی تو ویسا ہی جوڑا وہ بھی لے آیا۔ نگین نے کہنی تک بھر کر رنگا رنگ چوڑیاں پہن
تو وہ بھی چوڑیوں کا ڈھیر اٹھا لایا۔

یہ بھی اتفاق تھا‘ چوڑیاں لاتے وقت عظمت بیگم کی نظر پڑ گئی۔ ”ارے اتنی ڈھیر ساری چوڑیاں کس کے
لایا ہے؟“

”اپنی بہن کے لیے‘ اس کے سسرال والوں کے لیے‘ اس کے پڑوسیوں کے لیے۔“ روانی میں وہ کہ
چلا گیا۔

”اپنی بہن کے ہاتھ دیکھے ہیں‘ اتنی چھوٹی چوڑی اس کے چڑھ ہی نہیں سکتی‘ اس کے تو ڈھائی نمبر کی چوڑ
آتی ہے۔“

”پھر یہ کس نمبر کی میں لے آیا؟“ وہ پریشان سا بولا۔

”یہ تو دو نمبر کی ہوں گی‘ فرح جیسی لڑکیوں کے ہی آ سکتی ہیں۔ چلو فرحت کی نند کی بچیوں کو دے دوں گی۔“

”کسی نہ کسی کے تو کام آ ہی جائیں گی ناں۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

”ہاں‘ یہ تو ہے مگر تجھ سے ایک غلطی ہو گئی؟“

”وہ کیا؟“

”اپنی نگین کے لیے بھی لے آتا۔“

”اچھا لا دوں گا۔“

”ارے ان میں سے ہی نہ دے دوں‘ یہ سرخ چوڑیاں“ عظمت بیگم نے سرخ دمکتی بانکوں کی طرف ہاتھ
بڑھایا۔

”نہیں امی! یہ نہیں......“ وہ تڑپ کر آگے بڑھا۔ ”یہ جانے والی چوڑیاں ہیں۔ ان میں سے آپ نہ دیں‘
میں اسی طرح کی اور چوڑیاں آپ کو لا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے“ وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھ گئیں۔

اور شجاع عالم تصور میں فرح کو چوڑیاں چھنکاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس دفعہ عظمت کی یہ شکایت دور ہو گئی تھی کہ بھاوج ان کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی ہے۔ فیروزہ بیگم اپنی نند کی
خوب خاطر مدارات کر رہی تھیں۔

فرید احمد کو بھی بہن کا آنا اچھا لگا تھا۔ ان سے پرانی پرانی باتیں سن کر وہ بھی مسرور ہو رہے تھے۔

”شجاع! تم اور آپا کراچی کی سیر کر لو۔ میں طفیل سے کہہ دوں گا، وہ کراچی کے تمام تفریحی مقامات دکھا دے گا
ورنہ آپا جا کر کیا کہیں گی‘ بھائی نے اپنے شہر کی سیر بھی نہیں کرائی۔“ فرید احمد نے کہا۔

”نہیں بھیا! مجھے کہیں نہیں جانا‘ تم سے باتیں کر کے جو سکون اور خوشی مجھے ملتی ہے‘ وہ کہیں جانے میں کہاں
ملے گی۔ اللہ نے میرے بھائی کو نئی زندگی عطا کی ہے‘ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہیں۔“

”پھر بھی شجاع تو جا کر شکایت کرے گا ہی ناں“ فیروزہ نے ہنس کر کہا۔

”نہیں ممانی جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ کے لذیذ کھانے کھا کر مجھے خوب لطف آ رہا
ہے۔“

”تم لوگ آتے کہاں ہو۔ مجھے تو یہ حسرت ہی رہتی ہے کہ تم آؤ اور میں بھی اپنے ارمان پورے کروں“
فیروزہ نے محبت سے شجاع کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ممانی جان! اگر ایسی بات ہے تو اب ہم بار بار آئیں گے۔ کیوں امی؟“ شجاع نے شرارت سے ماں کو
دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں‘ کیوں نہیں۔ اب میں انشاء اللہ فرحت کو بھی لے کر آؤں گی‘ ماموں ممانی کے گھر آ کر وہ بھی
بہت خوش ہو گی۔“

”میں انتظار کروں گی آپا!“ فیروزہ نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔

لمبا تڑنگا‘ سرخ و سفید شجاع انہیں بھی بہت اچھا لگا تھا۔ نہی کے سلسلے میں وہ جتنی خوار ہوئی تھیں اس کا انہیں
اندازہ تھا۔ ”کیا ہے اگر شجاع نگین سے شادی کر کے کراچی کا ہو جائے۔“ ان کے دل میں یہ بات بار بار آ رہی
تھی اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ خاطر مدارات کے درجات بلند سے بلند تر ہو رہے تھے۔

”آپا! اب تم بھی کراچی آ جاؤ۔ کب تک اکیلی پڑی رہو گی۔“ ایک دن فیروزہ بیگم نے اپنی نند سے کہا۔

”میں اکیلی کہاں ہوں...... میری بیٹی‘ داماد‘ نواسے‘ نواسیاں اور پھر محلے کے سارے گھر عزیزوں کے ہی تو
ہیں۔ اور پھر کوئی بھی اکل کھرا نہیں ہے۔ ہر کسی کے خوشی و غم میں سارے ایسے بھاگے چلے آتے ہیں جیسے ان کا
اپنا کار (کام) ہو۔“

”پھر بھی بڑے شہر جیسی آسانیاں کہاں ہیں وہاں؟“

”نہ ہوں‘ ہم تو عادی ہیں وہاں کے اور اپنی زمینوں کے بغیر میں کیسے رہ سکوں گی۔“

”اور اگر شجاع کی شادی کسی شہر میں ہو گئی پھر......؟“ فیروزہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر انہیں دیکھا۔

''ارے جسے بیٹی دینی ہوگی' وہ شجاع کو دیکھے گا یا جگہ کو؟ دلہن رخصت ہو کر ہمارے گھر آئے گی یا ہم سب لوگ رخصت ہو کر اس کے شہر جائیں گے؟'' اپنی بات مکمل کر کے عظمت بیگم کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں اور فیروزہ بیگم کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

اور انہوں نے سوچ لیا تھا' نگین کے لیے یہ شجاع تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔

☆☆☆

گھر میں ایک عجیب دکھ بھرا سا سناٹا اتر آیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سائرہ اور شائستہ بیگم اپنی سانس بھی روک کر لے رہی ہوں۔

گھر میں ہنسی...... قہقہے...... اور...... باتیں صرف ثریا کی ہی گونج رہی تھیں۔ اس کو تو ایسا لگ رہا تھا جیسے فریال کے جانے سے اسے کوئی خلعت مل گئی ہو۔ فون پر وہ اپنی آپا کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھیں' جن کے بابے کے طفیل اس کا کانٹا نکل گیا تھا۔

''صابرہ! اللہ کا شکر ادا کرو کہ فریال جیسی بلا سے ہم دونوں کا پیچھا چھوٹا۔'' وہ بار بار صابرہ کو یہ باور کرا رہی تھی۔

''وہ برا کری' اس کے ساتھ ہمارا کیا ہوئیں گا بول کے......'' صابرہ کو ہر صورت صرف فریال کا ہی نقصان نظر آ رہا تھا۔ ثریا کی لچھے دار باتیں پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

''اگر فریال ہمارے گھر میں رہتی تو اس کے اطوار تو ایسے ہی برے رہنے تھے اور ایک گھر میں رہنے کے اثرات اگر میری بیٹی ثنا پر برے پڑتے تو تمہارے بیٹے منور پر بھی اچھے نہ پڑتے۔''

''ایمان سے......'' مارے غم کے صابرہ کا چہرہ فق ہو گیا۔

''اور کیا...... کتنے ہی گھرانے میں نے ایسے دیکھے ہیں جہاں بری لڑکیوں کو دیکھ کر اچھے لڑکے بھی بگڑ جاتے ہیں۔ ہماری بڑی ممانی کے چچا کا لڑکا تو پڑوس کی لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔'' ثریا خوب لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

''ثریا بھابی! برابر بول کے بولے تم'' صابرہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''یہ سوچو کہ ایک بہت بڑی مصیبت ہمارے سر سے ٹل گئی'' ثریا نے سرشار لہجے میں کہا۔

''انوں بالکل خیامت (قیامت) تھے۔ اچھا ہوا' انوں چلے گئے یہاں سے......'' صابرہ کا لہجہ پریشانی کی آنچ پر پکا ہوا تھا۔

''واقعی' اللہ نے ہماری سن لی'' ثریا نے کھل کھلا کر کہا۔

''میں تو شکرانے کے نفل پڑھنے کو بیٹھتی' اللہ نے ہم سب لوگاں کے بچوں کو بچا کر رکھا'' صابرہ نے ہنس کر کہا تو ثریا نے بھی اونچا سا قہقہہ لگایا۔

شائستہ بیگم نے وضو کرتے اپنی بہوؤں کے جب یہ تمسخر بھرے جملے سنے تو وضو کے پانی کے ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی تیزی سے گرنے لگے۔

☆☆☆

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے (بلکہ اکثر ایسا ہو جایا کرتا ہے) کہ جوائنٹ فیملی سسٹم کا ہر کونا...... ایک جدا صوبے کی طرح بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔ تب ہر سو محبتوں کا کال سا پڑ جاتا ہے۔

یوں بھی محبت کے سوا بھی جو غم ہیں' وہ بھی محبت کے نہ ہونے کے سبب ہیں۔

زبان کی ہر بات دل کی نہیں ہوا کرتی' اس کو سمجھنا نہ صرف مشکل ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو محال ہو جاتا ہے۔

ان دنوں تو ویسے بھی شائستہ بیگم زبان کے تیروں کی لپیٹ میں تھیں۔ زبان کے زخم انہیں جس قدر گھاؤ لگا رہے تھے' اس کی اذیت وہی محسوس کر سکتی تھیں۔

فریال کے جانے کے بعد سے وہ اپنے آپ کو تنہا سا محسوس کر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا ایک بازو کٹ گیا ہو اور دوسرا مفلوج۔

فریال کی غلطی کا جو دکھ تھا' وہ اپنی جگہ تھا مگر ان کی بہوؤں کے کچوکوں (طعنے' تشنے) نے انہیں بالکل ہی ادھ موا سا کر دیا تھا۔

اس وقت محلے کی کوئی خاتون ان کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ثریا کی بیان بازی کے بعد اب صابرہ ان کو چسکے لے لے کر فریال کے بارے میں زہر اگل رہی تھی۔

''اللہ غلام کی شکل نکو دے...... بے شک غلام بنا دے...... اللہ معاف کرے...... فریال کی شکل دیکھی آپ...... اتنی اچھی نہیں' پر جتنی بری انوں اپنے آپ کو بنائے رکھتی' چیختے چلاتے رنگ پہنتے' گھٹیا سی جیولری لٹکا کر کالج جاتے اور میک اپ تو تمام وقتاں کرتے۔ میں تو اچھی طرح بول دی انوں کو...... فریال! ایسا فیشن تم نکو کرو' جو تم پر اچھا نہیں دکھتا مگر وہ ایک کان سے بھی نکو سنتے...... اور اس پر طراری کا یہ عالم...... ابھی یہاں' ابھی وہاں۔ ایکدم اچھال چھکا......

لوگاں انوں مزاخ (مذاق) میں بھی بولتے۔ ایو فریال! کیا پیاری دکھ رئی آج' بالاں کھول کے تم سوب کو پیارے دکھتے تو وہ تکھین (یقین) کر لیتے مگر مجال ہے کہ کبھی بالاں میں پن ہی اڑا لیتی۔ میرے کو چڑانے واسطے جان جان کر وہی حرکاتاں کرتے جو اچھی نہیں دکھتی۔

میں انوں کو کئی بار بی سمجھائے' کالج سے وخت پر آنا چاہیے' سہیلیوں کی سنگات اتنا وخت نہیں لگانا چاہیے کہ گھر والے بی پریشان ہونے کو بیٹھ جائیں مگر وہ سنتے ہی نہیں تھے۔ سنیچر کو کالج میں یونیفارم کی پابندی نکو ہوتی' اس دن تو وہ ایسی تیاری کرتے بیٹھتے کہ اللہ کی پناہ۔ میرے کو تو ایسا دکھتا کہ کسی فیشن کی پریڈ میں وہ جاتے بیٹھے ہیں۔ انوں کی اماں' جب ان کو کچھ نہیں بولتے تھے تو ہم بھی کسی کی جان کو نکوا نکتے بیٹھتے۔ اب دیکھ لیو' کیا حشر کری وہ۔ کورٹ میں جا کر کسی غنڈے موالی کے ساتھ نکاح کر لی وہ۔ کیسا غلط کر لی' اب انوں کی اماں روتے بیٹھتے ہیں ناں!

کیا خاندان...... کیسے لوگاں......؟ کچھ نہیں مالوم کسی کو؟ شادی کر کے کہاں کو لے گئے یہ بی مالوم نکو۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم' یہ سب بے جا آزادی نے دن دکھائے ہیں مگر اب تمہاری ساس منہ کھول کر کچھ کہہ نہیں

سکتیں' پڑوسن کو بھی جملے مار کر طمانیت سی ہوئی۔

''ہونہہ! اب انوں کو اپنا مونہہ (منہ) چھپانا مشکل ہو گیا' بول کے۔'' صابرہ نے ٹھٹھا لگایا۔

''نندیں تو سب ہی کی تیز ہوتی ہیں مگر تمہاری تو شکل سے گاؤدی سی نظر آتی تھیں...... مگر سادگی کے لبادے میں ایسی ہر فن مولا ہوں گی......'' پڑوسن نے باقی جملے منہ میں داب کر اپنے کلے پیٹنے شروع کر دیے۔

''ہماری تو دونوں ہی نندیں بہت اچ تیز ہیں جی۔''

''وقت پر شادی ہو جاتی تو ایسا نہ ہوتا'' اب ہائے...... کے ہنکاروں سے گفتگو میں چار چاند لگ رہے تھے۔

''ایسی لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتی ہیں۔ میں تو اسی واسطے اپنے بھائیوں کے لیے سوچی اچ نہیں۔''

''اچھا کیا ورنہ زندگی ضیق ہو جاتی' تمہارے میکے والوں کی......'' پڑوسن صابرہ کو تسلی دے کر چلتی بنیں۔

اور صابرہ دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی کہ اس کی زندگی سے ایک ایسا کانٹا خود بخود ہی نکل گیا تھا' جس کے ہونے سے اس کا تن من یقیناً زخمی ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

''ایو خالہ جان! آپ کی بیٹی فریال کی بی کیسی خسمت جی......! آپ کی چھوٹی' لاڈلی بیٹی کی اتی خاموشی سے شادی ہو گئی۔ آپ کے تو سارے ارماناں مٹی میں مل گئے نا جی!'' صابرہ کی بڑی بہن فاخرہ تعزیت کے یہ جملے شائستہ بیگم کے سامنے بول رہی تھیں اور اسی سلسلے میں وہ ان کے پاس آئی تھیں۔

اور شائستہ بیگم' چپ چاپ سی یوں بیٹھی تھیں کہ جیسے ان کے پاس ان کے کسی سوال کا جواب ہی نہ ہو۔

''آپ نے سوچا تو ضرور ہوئیں گا کہ میں فریال کی شادی میں یوں کروں گی تو ایسا اچ ہوں گا...... یوں کروں گی تو ویسا اچ ہوئیں گا'' صابرہ اپنی ساس کو دم سادھے بیٹھا دیکھ کر بولی۔

''یہ سوب باتاں تو شادی میں ہوتی ہیں ناں'' فاخرہ کھلکھلا کر مزید گوہر فشانی کرتی ہوئی بولیں۔ ''خالہ جان! آپ جب بھی فریال کی شادی کی باتاں کرتے تھے تو کتے ارماناں رکھتے تھے۔ بارات کی راہوں میں پلکاں بچھائیں گے۔ داماد کے پیراں زمین پر پڑنے نہیں دیں گے۔ ان کو ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھیں گے۔ کاں تو بی چلے گئے آپ کے وہ سارے خاباں (خواب) آپ کی بیٹی' آپ کے سوب ارماناں کو کچل کر چلی گئی۔ اب تو خاندان بھر میں الگ بدنام اچ ہو جائیں گے۔''

''ہاں' یہ تو برابر ہے'' صابرہ نے بھی منڈیا ہلائی۔

''ایو خالہ جان! آپ کو تو مالوم ہے کہ لوگاں تاک میں لگے رہتے۔ چیل اڑی تو بھینس اڑی بول دیتے۔''

''اجی ہو' آپ صحیح بول رئیں آپا......!'' صابرہ مستقلاً اپنی بہن کی ہر بات کو سچ قرار دے رہی تھی۔

''ایو خالہ! آپ اپنا غم ہلکا کرنے کا کچھ کیجیے...... نہیں تو آپ بیمار پڑ جائیں گی ناں۔ آپ تو ایسے پیلے دکھ رئیں...... کہ دل میرا پھٹنے کو لگتا ہے جی......'' فاخرہ بھی انہیں شاید رلانے کے لیے آئی تھیں۔

شدت ضبط سے شائستہ بیگم کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئی تھیں...... مگر ان تماش بینوں کے سامنے انہوں نے اپنا کوئی آنسو بہانے کے بجائے ایک گہری سانس لی اور پاس رکھا پانی کا گلاس ایک سانس میں چڑھا کر کہا۔

''بیٹا......! اللہ کے بھید' اللہ ہی جانے۔ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے۔'' شائستہ بیگم نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور اٹھ گئیں۔ یوں بھی سائرہ کا بخار تو اتر سے چڑھ رہا تھا اور اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ذمے داری ان ہی کی تھی۔

''تمہاری بڑھیا تو بھاگ گئی' بات نکو کری میرے سے۔'' فاخرہ بہن کے کمرے میں آ کر مسکرا کر بولیں۔

''وہ بے چاری بات کرنے لائخ (لائق) نکو رئی۔'' صابرہ نے ہنس کر فاخرہ سے کہا۔

''پھر بھی تم چوکنی بیٹھ کو رہنا اور سسرال والوں سے زیادہ رابطہ نکو رکھنا...... خاص طور پر اپنی جٹھانی ثریا سے...... ہاں۔''

''کیوں آپا! ایسا کائے کو بول رئے آپ......؟''

''ثریا بڑے کائیاں (مکار) دکھتے میرے کو۔''

''نہیں آپا! ایسی کوئی باتاں نہیں۔ خالی خولی کو فقط مغالتہ آپ کا...... جی ہو......'' صابرہ نے بہن کو تسلی دی۔

''میرے کو ایکدم مکار دکھتی وہ...... سب کے خاں مارنے جانتی وہ...... ہاں۔''

''نہیں آپا' آپ انوں کے بارے میں غلط اندازے لگاتے بیٹھے۔ ثریا بھابی کے سنگات (ساتھ) تو میں ہنستی بیٹھتی ہوں ناں......'' صابرہ نے ہنس کر کہا۔

''جو میں بول دی' اس پر تم غور اچ نہیں کرئی ماں۔ منور...... تمہارا اکلوتا بیٹا ہے ناں...... ابا!''

''ہاں' وہ تو ہے...... مگر یہاں منور کا ذکر کائے کو آ گئے؟''

''کیا تم یہ بات نہیں سنی کیا کہ آج کل روپیہ پیسہ لڑکیوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی ضمانت بن کو بیٹھا ہے۔''

''ہاں' وہ تو میں سنی مگر......؟''

''اگر مگر تم چھوڑ دیو۔ اب تمہاری نند کی شادی ہڑاہڑی (افراتفری) میں ہوئی ناں۔''

''ہاں' وہ تو ہوئی...... اور وہ دفان بھی ہو گئی۔''

''جب فریال کی شادی اتی مصیبتوں سے بھاگ کر ہوئی تو ثنا کے اندر کون سے ہیرے ٹنکے ہوئے ہیں۔ جیسی پھوپی ہو گی ویسی ہی بھتیجی...... دیکھ لینا' ایک دن وہ تمہارے منور پر کیسے ڈورے ڈالتی بیٹھے گی۔''

''نہیں آپا' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔'' صابرہ نے بہن کی بات اڑائی۔

''اچھا' یہ تو تم مانتی ہو ناں کہ منور تمہارا خاصا ضدی اور اڑیل بیٹا ہے؟''

''تو پھر......؟'' صابرہ نے حراساں نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس گھر میں ثنا بھی رہتی ہے ناں...... یہ نہ ہو کہ وہ تمہارے جیٹھ کی بیٹی سے شادی کے لیے اڑ جائے اور تم ہاتاں ملتی بیٹھی رہو۔''

''ایسا اچ خیامت تک نہیں ہوئیں گا۔'' صابرہ نے زعم بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے سسرال کے کرتوتاں کا کیا پتا؟'' بہن نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''ایسا اچ نہیں ہو سکتا آپا! جس گھر میں' میں نے زندگی گزاری' وہیں کی بیٹی کو میں لے آؤں' یہ کبھی نہیں ہوئیں گا۔ میری بہو تو فقط رعنا ہی بنے گی' ہاں۔ جو میں کہہ دی وہی اچ ہوئیں گا' ہاں!'' صابرہ کا لہجہ اٹل تھا۔

''پھر بھی' نظر رکھنے میں کوئی باتاں نکو...... تم ہشیار رہو۔ یوں بھی کوئی رسم تو نہیں ہوئی ناں رعنا کی منور کے سنگات۔'' بہن کے دل کی بات ان کے لبوں تک بھی آ گئی' جس کے نہ ہونے سے ان کے دل میں اندیشے ناگ کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔

''آپا' ایسی بات ہے تو میں رسم بھی کر دیتی ہوں۔ تم کہو تو ایک ہفتے بعد ہم منور کی منگنی کر لیں؟''

''اپنے سسرال کی غم کی فضائیں تو تھم لینے دیو۔ سوب کے چہرے زرد سسکتے نظر آ رہے ہے......ایک دم'' فاخرہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''یہی اچ بات ہے آپا! اپنے بچوں کی یاداں' کتا اچ دامن چھڑاؤ' مسکیں چھوڑتی۔ پن نہیں چھوڑتی۔'' صابرہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ چلتے وقت فریال کی آنکھوں سے بہنے والے جھرنے کا منظر وہ بھلا نہیں پائی تھی۔

''وہ برا کری تھی ناں' اس لیے برا ہوا۔ تم کائے کو انوں کا غم منانے کو بیٹھ گئے؟'' فاخرہ نے بہن کا ملال بھرا چہرہ دیکھ کر اسے ایک دھموکا جڑتے ہوئے کہا۔

تب صابرہ اپنی آپا کی خوشنودی کے لیے خواہ مخواہ ہی ہنس دی۔

☆☆☆

''عید کی کیا کیا تیاری کر لی تم نے؟'' زبور اس سے کیفے میں بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

''ایک سوٹ بوتیک سے لیا ہے اور ایک کاٹن کا بنایا ہے اور بس!''

''اف......صرف دو سوٹ!......بس؟'' زبور نے برا سا منہ بنایا۔

''عید پر کیا دس سوٹ بنائے جاتے ہیں؟'' اس نے خفگی سے کہا۔

''دس سے بھی زیادہ۔ عید کے بعد عید ملن پارٹیز شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کی تیاری بھی تو پہلے سے کر لی جاتی ہے ناں؟''

''ہمارے ہاں ایسی پارٹیز نہیں ہوتیں۔ چھوٹا سا ہمارا خاندان ہے۔ عید کے دن سب ہمارے گھر آ جاتے ہیں۔ ابا جی سب کو عیدیاں دیتے ہیں اور بس۔ ہم لوگ کہیں جاتے ہی نہیں ہیں۔''

''اپنی بہن نغمہ کے گھر تو جاؤ گی' وہاں کون سا سوٹ پہن کر جاؤ گی؟''

''جب سے باجی کی ڈی این سی ہوئی ہے' ممانی جان کا موڈ خراب سے خراب تر ہو رہا ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ ممانی جان عید کے موقع پر بھی ہمارے گھر آئیں اس لیے ان کے ہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''وہ نہ بلائیں' تم خود چلی جانا۔ آخر بہن کا گھر ہے تمہاری۔''

''ہم لوگ ایسے کسی کے گھر نہیں جاتے' جب تک کوئی بلائے نہیں۔ ممانی جان باجی تک سے تو ڈھنگ سے بات نہیں کر رہی ہیں تو ہم سے کیا کریں گی۔''

''اچھا یہ بتاؤ' عید کے کسی بھی دن تم ہمارے گھر آؤ گی؟ ممی تم کو دیکھ کر بے حد خوش ہوں گی۔''

''زبور! میں تمہارے گھر کیسے آ سکتی ہوں؟''

''گاڑی میں آنا اور اگر تمہارے ابا کی گاڑی ہمیشہ کی طرح دھکے سے اسٹارٹ ہو رہی ہو تو مجھے فون کر دینا' میرا ڈرائیور گاڑی لے کر آ جائے گا' تم آ جانا۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کیا بہانہ کروں گی میں جانے کا......کہ اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جا رہی ہوں۔'' نگین نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو صاف صاف بتا دینا کہ اپنے مستقبل کے ساتھی سے ملنے جا رہی ہوں۔'' اب زبور اسے شرارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کہہ دیا ناں' ہمارے گھر کا فلمی ماحول نہیں ہے۔ پتا نہیں کالج سے واپسی پر میں کیسے اور کیونکر تم سے ملنے آ جاتی ہوں' یہی بہت ہے۔''

''اچھا اب پہلے ایک منٹ کے لیے آنکھیں بند کرو' پھر تم سے اس سوال کا جواب لوں گا کہ عید پر تمہیں ہ ے گھر آنا چاہیے یا نہیں؟''

نگین نے کسی معصوم بچے کی طرح آنکھیں میچ لیں۔ دراز پلکوں کی جھالر چہرے پر لو دینے لگی اور تراشیدہ ا ب مسکراہٹ پر آمادہ ہو گئے۔

زبور اسے دیکھتے ہوئے ایک پیکٹ اس کے سامنے رکھ کر بولا ''اب آنکھیں کھول لو۔''

''یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے اس پیکٹ کو دیکھ رہی تھی' جسے زبور نے اپنے بیگ میں سے نکال کر اس کے ا منے دھرا تھا ''یہ کیا ہے......زبور؟''

''تمہارا عید کا تحفہ!''

''میرا عید کا تحفہ......؟'' نگین نے حیرت سے اس جہازی پیکٹ کو دیکھا جسے توڑ مروڑ کر وہ نہ جانے کیسے ا پنے بیگ میں رکھ لایا تھا۔ ورنہ اتنا بڑا پیکٹ تو صرف کسی اٹیچی کیس میں ہی آ سکتا تھا۔

''اسے کھول کر دیکھو تو سہی! اور پلیز اسے دیکھنے کے بعد یہ مت کہہ دینا کہ اسے میں اپنی الماری میں رکھ ''وں۔''

نگین نے کھولا......تو بوتیک کے اعلیٰ قسم کے پانچ سوٹ تھے۔ سارے ہی رنگ اس کی اپنی پسند کے' ہر وٹ کے ساتھ میچنگ جیولری کے نازک سے سیٹ' ہم رنگ پرس اور چوڑیاں۔

''اتنا سارا سامان' میں اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی نہیں لے جا سکتی۔''

''ٹھیک ہے پھر ٹی سی ایس کی طرف سے تمہیں یہ بیگ مل جائے گا' زیبی کی طرف سے۔ ویسے زیبی میری ڑی بہن کا نام بھی ہے۔''

''خدا کے لیے ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ گھر والے تفتیش کے لیے جاسوس ہائر کر لیں گے۔ ہمارے ہاں کوئی کسی کو اتنی عیدی نہیں دیا کرتا۔''

''اچھا یہ پرپل سوٹ تو لے جاؤ' یہ تو میں نے بڑے دل سے تمہارے لیے لیا ہے۔ عید کے بعد یہی سوٹ پہن کر آنا۔'' زبور کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے'' اس نے پرپل سوٹ اور اس کی میچنگ اپنے بڑے سے بیگ میں ڈال لی اور کتابیں ہاتھ میں پکڑ لیں پھر گھڑی پر نظر ڈال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب سنو گرینڈ نیوز!'' وہ نگین کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں کہو......؟''

''میری ممی عید کے بعد تمہارے گھر آئیں گی۔''

''واقعی......!'' خوشی اس کی نس نس میں دمکنے لگی۔

''ہاں' یہ بات رات ہی ممی نے مجھ سے کہی ہے۔''

''کس دن آئیں گی وہ؟''

''دن کا تو مجھے پتا نہیں' ہاں عید کے بعد آئیں گی۔''

''ظاہر ہے' عید ملن پارٹیز سے نمٹ کر ہی آنا ہوگا'' نگین نے جل کر کہا۔

''ہاں' یہ تو ہے۔ ہماری فیملی میں تو عید سے ہی پارٹی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ گرینڈ پارٹی ہمارے گھر ہوتی

ہے۔ پوری فیملی مدعو ہوتی ہے اس میں۔"

"پھر تو یہ سلسلہ خاصا دراز ہو جاتا ہوگا؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔"

"عید کے بعد بقرعید آ جائے گی' تمہارے ہاں پھر پارٹیاں شروع ہو جائیں گی اور بقرعید کے بعد آ جائے گا محرم...... تو ظاہر ہے محرم میں تو آنے سے رہیں" نگین کو اب اچھا خاصا غصہ آ چلا تھا۔

"تم سے تو کوئی بات کرو تو غصہ اتنی جلدی آ جاتا ہے" زبور نے اسے رسان سے بٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں تو میں کیا کروں۔"

"ممی جیسی بات کرتی ہیں' میں تمہیں آ کر بتا دیتا ہوں...... غلطی شاید میری ہی ہے' اب وہ جس دن آنے کا کہیں گی تو میں اسی دن بتاؤں گا' پہلے سے ایک بات بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"اور میرا خیال ہے کہ ایسا دن کبھی نہیں آئے گا۔" نگین کا لہجہ دوٹوک تھا۔ مگر زبور کے ماتھے کی شکنیں بڑھ رہی تھیں۔

☆☆☆

فلیٹ بہت چھوٹا سا تھا مگر آفس کی جانب سے ملا تھا۔ اس لیے کرائے کی کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ کھانا پکانے کے چند برتن' مرچ مصالحے' ایک دری اور دو چادریں' گلاس اور لوٹا۔ یہی کچھ سامان تھا جو عدیل خرید سکا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ خریدنا اس کے بس میں بھی نہ تھا۔

"یہ ہوتا ہے پسند کی شادی کرنے کا پہلا نقصان کہ تیسرے درجے کا جہیز بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہر چیز خود ہی رگڑ رگڑ کر حاصل کرنا ہوگی۔" عدیل نے بظاہر ہنس کر کہا تھا مگر فریال کے خاصے کس کر لگا۔

"میں نے آزدبانو کے فلیٹ میں بچوں کے ٹیوشنز کے لیے کہہ دیا ہے" فریال نے اسے بتایا۔

"یہ غریب لوگوں کی کالونی ہے' فری میں پڑھوانا تو سب پسند کریں گے' ٹیوشن فیس کسی سے نہیں دی جائے گی اور اگر کسی نے دی تو سو روپے میں کئی بچے پڑھوانے چاہیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں؟ ٹیوشن پڑھانے کے سوا تو کوئی کام نہیں کر سکتی ہوں۔"

"سلائی تو تمہیں آتی ہے ناں؟"

"ہاں' وہ تو آتی ہے بلکہ بہت اچھی آتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں بوتیک سے کام لا کر تمہیں دے دیا کروں گا بلکہ وہ لوگ اپنی مشین بھی دے دیں گے۔ یوں آمدنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے' پھر میں اپنا گھر سجا لوں گی۔" فریال کے خواب اس کی آنکھوں سے اتر کر ہونٹوں کی منڈیروں تک آ گئے۔

اور اس کی زندگی کا نیا دور مشین کے پہیے کے ساتھ شروع ہوگا۔

☆☆☆

"یہ فریال گھر سے اتنی آسانی سے نہیں گئی ہے" ثریا نے رازداری سے صابرہ کو بتایا۔

"پھر کیسے چلی گئی وہ......" صابرہ کی حیرانی بجا تھی۔

"ہماری آپا کے ایک بابا ہیں' انہوں نے اسے نکالا ہے" ثریا نے زعم سے کہا۔

"انوں کو بابا اپنے فنکاری سے نکال دیے کیا؟" صابرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہ فنکاری نہیں ہے' ہمارے بابا کے کمالات ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے ہیں' ہر ایرے غیرے سے ملتے تک نہیں ہیں' بس ہماری آپا کے جاننے والے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ خاص کرم ہوا ہے ہم پر۔"

"اب وہ بابا کس کو گھر اچ سے نکال باہر کریں گے؟" صابرہ نے پوچھا۔

"تم دیکھتی جاؤ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ثریا نے ہنس کر کہا۔

"اپنے بابا کے پاس تم مجھے بھی لے جاؤ ناں۔" صابرہ کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا۔

"میں ابھی تک خود ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئی' پہلے میں تو چلی جاؤں پھر تمہیں بھی لے جاؤں گی۔"

"انوں پیسے لے کر کام کرتے کیا؟" صابرہ نے پوچھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جو حیلے بہانوں سے پیسے اینٹھتے ہیں' وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"نہیں بھئی' ہماری آپا نے انہیں زبردستی تھوڑے سے پیسے مٹھائی کے نام پر دیے تھے۔" ثریا ان کی تعریف کرتے ہوئے ان کے اوصاف بھی بڑھاتی چلی گئیں۔

"بھائی جان' آپ جلدی ہو کر آئیے ناں...... تاکہ پھر میں بھی آپ کی سنگات ان سے ملنے کو جاؤں۔"

"بے فکر رہو' تم کو ضرور لے کر جاؤں گی۔"

"میرے ایک بھائی حیدرآباد دکن سے کراچی آ جائیں۔ وہ وہیں پھنسے بیٹھے...... حالانکہ ہم ان کی شادی کراچی کی لڑکی سے کر دیے۔"

"جس جس کو تم بلانا چاہو گی' وہ اڑتا ہوا چلا آئے گا' اب تم بے فکر ہو جاؤ۔"

"اللہ کیسے کیسے نیک لوگاں ہیں' جن کی دعائیں فوراً پوری ہوتیوں۔" اب صابرہ کے چہرے پر خوشی کی سرشاری اپنی سرخی الگ ہی دکھا رہی تھی۔

ثریا کو گو اپنی آپا کے یہ بابا زیادہ پسند نہیں تھے کہ پیسے ہر کام کے اتنے زیادہ لیتے تھے کہ اسے غصہ سا آ جاتا تھا مگر جب سے فریال کا کانٹا انہوں نے نکالا تھا' وہ ان کی ذات پر دل سے یقین کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بابا جی کو دو ہزار علیحدہ مٹھائی کے لیے دیے تھے۔

"واقعی' آپا ٹھیک کہتی ہیں' وہ واقعی ایک بااثر شخصیت تھے۔" ابھی کتنے بہت سے کام تھے جو ان سے کرانا باقی تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب تمام مسئلے چٹکیوں میں حل ہوتے چلے جائیں گے۔

"ایسے نامی گرامی بابے تو قسمت والوں کو ملا کرتے ہیں" ان کی آپا اس کے سر پر الگ احسان رکھ رہی تھیں۔ "میں نے تو ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ میری بہنا کا یہ کام فوری کرنا ہے...... جب ہی تو......" وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر واہ واہ کی مبارک بادیں سمیٹنا شروع کر دیتیں۔

"ایسے بابا کے تو پاؤں چومنے چاہئیں" آپا نے اترا کر مزید ستارے بابا کی ذات اقدس میں ٹانکنے شروع کیے۔

"ٹھیک ہے' میں کسی دن کے آستانے پر حاضری کے لیے جاؤں گی" ثریا نے کہا۔

"تم جاؤ گی تو تمہارا اپنا ہی فائدہ ہوگا" آپا نے ان کے جلالی وجود کا نقشہ کھینچ کر اسے بتایا۔

ثریا کے دل پر آپا کی باتوں کا بہت اثر ہوا تھا۔ دوسرے صابرہ اس کی جان کو آئی ہوئی تھی کہ اس کو بھی جلد از جلد بابا کی زیارت کرائی جائے تو وہ ایک دن...... ان کے آستانے پر پہنچ ہی گئی۔

مگر یہ کیا…… ایک بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

’’تم دل سے نہیں گئی ہو گی ناں اس لیے انہوں نے باہر تالا ڈلوا دیا ہو گا ورنہ وہ کہاں جاتے ہیں‘ ہمیشہ وہیں ملتے ہیں۔‘‘

اگلی مرتبہ ثریا باوضو گئیں تو پھر اسی تالے نے ان کا استقبال کیا۔

’’تمہارے من میں بابا کے لیے کوئی نہ کوئی کھوٹ ہو گی…… اس لیے تمہاری نظروں کو دھوکا ہوا۔ یہی تو ان کی کرامات ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتیں۔‘‘ آپا کا لہجہ تکریم سے لبالب بھر گیا۔ تب ثریا کو اپنی بدقسمتی کا یقین ہونے لگا کہ ایسے پہنچے ہوئے بابا اسے اپنے پاس آنے کی اجازت تک نہیں دے رہے تھے۔

ثریا اپنی بدقسمتی کا صدمہ نہ جانے کتنے دن اور سہتی کہ دو دن کے بعد ہی اصل صورت حال تمام اخبارات میں سامنے آ گئی۔ پہنچے ہوئے کرامات والے بابا‘ جو اصل خبر جان کر قصداً روپوش ہو گئے تھے‘ ان کو ان کے گینگ سمیت بازیاب کر لیا گیا تھا اور پھر وہی نامی گرامی بابا کسی ریپ کیس میں اندر کر دیے گئے۔ بقول ان کے کہ وہ لڑکی پر سے جن اتار رہے تھے مگر ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق لڑکی کو نشہ آور شربت پلا کر اس کی آبرو لوٹی گئی تھی۔ جب پولیس نے ان کا ریمانڈ لیا تو ایسی ہی بے شمار کہانیوں کا انہوں نے اعتراف کر لیا تھا‘ جن کی کوئی رپٹ ہی درج نہیں کروائی گئی تھی۔

سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنانے والا‘ اللہ کی ذات پر یقین نہ کرنے والوں کو جھانسا دینے والا، بے صبرے لوگوں کو پاگل بنانے والا‘ تعلیم یافتہ لوگوں کو جہل میں دھکیلنے والا…… یہ تھی بابا کی حقیقت۔

اخبارات میں بابا کے شرمناک اعترافات بھرے ہوئے تھے‘ جن کو پڑھ کر ثریا کی حالت دگرگوں سی ہوتی جا رہی تھی۔

’’بھابی! تمہارے بابا تو ایسے نہیں ہیں ناں؟‘‘ صابرہ نے اخبار پڑھ کر ثریا سے پوچھا۔

’’اخبار پڑھ کر تو مجھے کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا‘‘ ثریا کو یہ کہنے کی قطعی ہمت نہیں تھی کہ یہ کالے کرتوتوں والے اسی کے بابا ہیں۔

’’اچھے لوگ تو چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں تمہارے بابا کے پاس ضرور جاؤں گی‘‘ صابرہ کی رٹ کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

’’مگر اب میں کہیں نہیں جاؤں گی‘‘ ثریا نے برملا کہا۔

’’کیوں‘ ایسی بات کیا ہو گئی؟ اپنے کام تو آپ کرا لیے‘ میں بولی تو جانے میں دل نہیں چاہ رہا آپ کا۔ دیورانی بھی‘ بہن جیسے ہوتے ناں‘ پھر بھی آپ میرے کو اپنی بہن نہیں سمجھتے۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے……‘‘

’’آپ مجھ کو لے جانا نہیں چاہتے‘ جب بھی میں بولتیوں‘ آپ انکار کے بہانے ڈھونڈنے بیٹھتی ہیں‘ بول کے۔‘‘

’’صابرہ! یہ اخبارات جس بابا کو گالیاں دے رہے ہیں‘ وہ وہی بابا تھے‘‘ آخر ثریا نے سچ کہہ ہی دیا۔

’’اللہ نہیں……‘‘ صابرہ حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہو گئی۔

’’ہاں‘ جھوٹے…… رذیل…… اور لوگوں کو گمراہ کرنے والے بابا! اگر کوئی کام ہوتا ہے تو صرف اللہ کی رضا سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہاں کر سکتے ہیں۔ ہاں‘ ان میں چند ایک اچھے ضرور ہوں گے مگر زیادہ تر ایسے ہی ہوتے

ں۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے والے‘ لوگوں کا مال کھانے والے۔‘‘

’’اللہ نے کیسے بچایا‘ اس کے پاس جانے سے پہلے ہی اس کا پول کھل گیا۔‘‘

’’ہاں، یہ اللہ کا ہم پر واقعی کرم ہے۔‘‘

’’میں تو دو نفل شکرانے پڑھنے کو بیٹھتی کہ ایسی جگہ قدم جانے سے بچ گئے‘‘ صابرہ دہل کر اٹھ گئی اور ثریا اپنی آپا فون کر کے دسویں دفعہ انتہائی غصے سے بولی۔

’’آپا! تم نے تو پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔ ویسے تو بڑا دعویٰ ہے کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہو۔ لوگوں کو ان کی شکلوں پہچان لیتی ہو اور تم کیسے بدبخت انسان کے پاس جاتی رہیں۔ اللہ کا شکر کرو کہ سوائے مالی نقصان کے کچھ نہ ہوا ورنہ……‘‘

اس سے آگے تو کسی سے بھی کچھ نہ سوچا جاتا تھا۔

☆☆☆

رات فون پر زبور سے دیر تک بات ہوتی رہی پھر جب سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اس کی باتوں کا رس اس کانوں میں دیر تک شہد سا گھولتا رہا تھا۔

’’نگین! جب تم بال کھول لیتی ہو تو میرا دل تو تمہاری زلفوں کا ہی اسیر ہو جاتا ہے۔ تم جب ہنستی ہو تو گال کا پل بہت خوبصورت لگتا ہے اور مجھے دیر تک یاد آتا ہے۔‘‘

’’ہاں‘ جب تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہو تو مجھ سے ایک لفظ بولا نہیں جاتا ہے۔ تمہاری واز کتنی سحر انگیز سی ہے…… میری روح تمہاری جانب ہمکنے سی لگتی ہے۔‘‘

’’نگین! تم میرے لیے کیا ہو‘ تمہیں اس کا احساس کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔‘‘

نگین بستر پر لیٹے لیٹے مسکراتی رہی اور زبور کی پیار بھری باتیں اپنی ڈائری میں لکھتی رہی۔ صبح کا نہ جانے کون ا پہر تھا جب اس کی آنکھ لگی۔

کالج جانے کے ٹائم جب وہ نہیں اٹھی تو فیروزہ بیگم نے ناشتا ٹیبل پر لگانے کے بعد اسے جگایا۔

’’نگین! کیا آج کالج جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟‘‘

’’جانا ہے کالج۔ آج تو میرا پریکٹیکل بھی ہے‘‘ وہ گھبرا کر اٹھی۔

کالج جانے کے لیے ہبڑ دبڑ میں تیار ہوئی اور بغیر ناشتا کیے نکل گئی۔

’’اب دیکھیے‘ بھوکی پیاسی نکل گئی ہے کالج۔ میں نے پراٹھے بنائے‘ آملیٹ بنایا اور اس نے ایک لقمہ نہیں یا‘‘ فیروزہ کو افسوس سا ہو رہا تھا۔

’’ارے‘ وہ تو اپنی بکس بھی ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ گئی‘‘ ابا جی اس کی کتابیں دیکھ کر بولے اور پھر کتابوں کے سے ایک کاپی کھول کر یونہی دیکھی تو انہیں چکر سا آ گیا۔ وہ دیوار تھام کر قریبی کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کی نظریں صفحات پر دوڑنے لگیں۔

یہ نگین کی ڈائری تھی‘ جس میں زبور کے ساتھ گھومنے پھرنے کی تفصیلات کے ساتھ آئندہ کے پروگرامز بھی رج تھے۔

’’فیروزہ……!‘‘ وہ جتنی شدت کے ساتھ چیخ سکتے تھے‘ چیخے۔

’’کیا بات ہے……؟‘‘ وہ تیزی سے بھاگ کر آئیں کہ مبادا کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔ اندر آ کر

دیکھا تو فرید احمد کسی پتے کی طرح کانپ رہے تھے مگر آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

''جی...... کیا ہوا؟'' ان کا رواں رواں ان سے سوال کر رہا تھا۔

''نگین نے ہمارے چہرے پر کالک تھوپ دی ہے'' وہ ایسے غم زدہ سے لہجے میں بولے کہ فیروزہ ساکت انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

''میں کچھ سمجھی نہیں......'' چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے میاں سے پوچھا۔

''تمہاری بیٹی کسی زیور نامی لڑکے کے ساتھ پورے شہر میں گھومتی پھرتی ہے اور ہم اندھے بنے گھر میں بیٹھے ہیں۔''

''نگین کسی لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے؟'' فیروزہ نے بے یقینی سے شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں غلط نہیں کہہ رہا۔ یقین نہ آئے تو اپنی لاڈلی کی یہ ڈائری پڑھ لو کہ کس کس طرح وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔'' فرید احمد نے نگین کی ڈائری بیوی کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

فیروزہ نے جب ڈائری کے چند صفحات ہی پڑھے تو ان کے بھی اوسان سے خطا ہو گئے۔

''یہ ہے ہمارے لاڈ پیار کا انجام...... یہ ہے ہمارے بھروسے کا انعام...... یہ ہے ہماری سفید پوشی کا نیلام......'' فرید احمد غصے اور غم سے کہہ رہے تھے۔ ناشتا میز پر رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا مگر کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔

دوپہر کے لیے کوئی کھانا نہیں پکا۔ اور جب نگین کالج سے واپسی پر زیور سے ملتی ہوئی گھر پہنچی تو گھر کی مغموم سی فضا کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ امی اور ابا جی ڈائننگ روم میں بیٹھے تھے۔

''ابا جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

وہ کچھ بولنے کے بجائے کڑے تیوروں سے نگین کو دیکھتے رہے۔

''امی! خیریت تو ہے ناں، آپ اتنی خاموش اور افسردہ سی کیوں بیٹھی ہیں؟'' اس نے ماں سے پوچھا اور وہ دکھ اور غم سے اسے دیکھتی رہیں۔

''نگین! میری بات کان کھول کر سن لو'' فرید احمد نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جی ابا جی!'' وہ حیرت سے باپ کی طرف گھومی۔

''کل سے تم کالج نہیں جاؤ گی۔''

''مگر کیوں ابا جی!'' اس نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

''اس کیوں کا جواب تم خود اپنے آپ سے پوچھو کہ تم کیسی بیٹی ہو؟ کیا بیٹیوں کو تم جیسا ہونا چاہیے؟ کیا والدین کو اپنے بچوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے؟'' وہ نگین کی ڈائری اسے دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''کیا جوان لڑکیوں کے لیے بوائے فرینڈ کی ضرورت بہت ضروری ہوتی ہے؟'' اب فیروزہ اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں امی! ایسی بات نہیں ہے'' وہ آج والدین کی نظروں سے گر چکی تھی۔

''یہ زیور اسی شہر میں ہوتا ہے ناں، جس کے سنگ تم ہر جگہ گھوما کرتی ہو اور رات رات بھر ٹیلی فون پر باتیں کیا کرتی ہو؟'' ماں کا سوال تھا یا طمانچہ، اس کا چہرہ فق سا ہو گیا۔

''مگر...... امی!...... زیور ایسا...... نہیں ہے۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''وہ کیسا ہے...... اچھا یا برا...... میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہی...... میں تو صرف یہ پوچھ رہی ہوں کہ ہماری

ہماری چاہت میں یقیناً ایسی کوئی کمی تھی...... جس کے لیے تم نے زیور کا سہارا لیا؟ کیسے کیسے طریقوں سے تم نے ہمیں بے وقوف بنایا...... اور ہم بے وقوف بنتے چلے گئے...... تمہاری باتوں پر اعتبار کرتے چلے گئے...... آج کالج میں دیر ہو جائے گی، ہم نے یقین کر لیا۔ آج فلاں سہیلی کی منگنی میں جانا ہے، ہم نے بھروسا کر لیا۔ آج کوچنگ سینٹر جانا ہے، ہم یقین کر بیٹھے...... کہ ہمارے ذہن میں کہیں کوئی نکتہ ایسا تھا ہی نہیں کہ ہماری بیٹی ہمیں [illegible] کر کہیں جا سکتی ہے؟''

''امی! پلیز...... آپ میری صرف ایک بات سن لیں۔ زیور واقعی مجھ سے پیار کرتا ہے اور مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔'' نگین نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''پیاری بیٹی! اول تو وہ تم سے کبھی شادی کرے گا ہی نہیں اور جو اس طرح ٹائم گزارنے والے لڑکے ہوتے ہیں، وہ پیار میں بھی مخلص نہیں ہوا کرتے ہیں اور بالفرض اگر تم اپنی بات میں سچی تھیں تو یہ بات تم مجھے بتا سکتی تھیں، ابا جی کو بتا سکتی تھیں...... اور میں نے تو کبھی تم سے روایتی ماؤں والا سلوک نہیں کیا تھا، میں تو تمہاری دوست تھی، اگر تم شروع میں ہی مجھے بتا دیتیں تو میں خود زیور سے بات کرتی۔ میں خود اس سے کہتی کہ تم اپنی ماں کو لے کر ہمارے گھر آؤ مگر افسوس...... کہ تم نے اپنے باپ کو کتنے بڑے صدمے سے دوچار کیا ہے۔ پتا نہیں کتنے لوگوں نے تمہیں دیکھا ہو گا۔ اس شہر کراچی میں ہمارے بے شمار ملنے والے ہیں، کسی نہ کسی نے تمہیں زیور کے ہمراہ دیکھ کر نہ جانے کیا کچھ سوچا ہو گا۔''

''امی! ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔''

''بیٹا! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ پورے شہر نے اپنی آنکھیں رہن رکھ دی ہوں۔'' فیروزہ نے انتہائی دکھ سے نگین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی! میری غلطی ضرور ہے مگر پلیز! آپ مجھے معاف کر دیں'' نگین گڑگڑاتے ہوئے ماں سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں بیٹا! اب میں کچھ نہیں کر سکتی۔ تم کل سے کالج تو کیا گھر سے باہر بھی نہیں جا سکو گی۔ تم جانتی نہیں ہو، تمہارے باپ کس قدر ضدی ہیں۔ اب تم ہمہ وقت گھر کی چہار دیواری میں رہو گی، گھر سے باہر جانے پر تم پر مکمل پابندی ہو گی۔''

''مگر امی! میرے امتحان ہونے میں صرف ایک ماہ رہ گیا ہے، آپ مجھ پر یہ ظلم نہ ہونے دیں۔''

''ہم نے تم پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے، ظلم تو تم نے کیا ہے ہم پر، ہمارے اعتماد کا خون کر کے۔ تمہارے امتحان کے بارے میں ہم کیا سوچیں، تم نے تو خود ہمیں امتحان میں ڈال دیا ہے۔ باپ تمہارا بیمار ہے اور تم نے کیسا چرکہ لگایا ہے اس کے دل پر۔''

''امی پلیز! آپ مجھے اس پریشانی سے نکلنے کا کوئی حل تو بتائیے، میں کیا کروں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''مجھے خود نہیں معلوم تو میں تمہیں کیا بتاؤں گی'' فیروزہ بیگم کمرے سے باہر نکلیں تو فرید احمد گھر کے سب موبائل اکٹھے کر رہے تھے اور گھر کے ٹیلی فون کے تار اوپر جا کر وہ خود ہی کاٹ آئے تھے۔ اب ان کی نظریں فیروزہ سے نگین کا موبائل مانگ رہی تھیں۔

''نگین! اپنے پرس سے وہ قیمتی موبائل تو مجھے دے دو، جو تمہاری کسی سہیلی نے تمہیں گفٹ کیا تھا'' فیروزہ نے بیٹی سے اس کا موبائل لیا اور پھر اسی کمرے میں چلی گئیں جہاں فرید احمد خاموشی سے بیٹھے تھے۔

''لوگ کہتے ہیں کہ سروس کرنے والی عورتیں اپنی اولاد کی بہتر طور پر نگہداشت نہیں کرسکتیں مگر فیروزہ! تم تو ہمہ وقت گھر میں رہتی تھیں' تم سے اپنی بیٹی پر نظر نہیں رکھی گئی؟ میں تم سے کہتا تھا کہ ہمارا فون رات رات بھر انگیج رہتا ہے تو تم ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ فون کی لائنوں میں گڑبڑ رہتی ہے۔ میں نے باپ ہو کر کئی دفعہ اسے چیک کیا' ایک مرتبہ مجھے خدشہ سا ہوا تھا کہ نگین کو کسی لڑکے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھا تھا' اس کے بعد عرصے تک کال لینے جاتا رہا مگر تم تو اتنی بے فکر رہیں کہ کبھی اپنی بیٹی کی نگرانی ہی نہیں کی ......'' اور فیروزہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہیں۔

''فیروزہ! اب وقت کا یہ تقاضا ہے کہ اپنی شریف' نیک اور دین دار بچیوں پر بھی کبھی بھروسا نہ کیا جائے' ان پ کڑی نظر رکھی جائے کہ جوانی کی عمر بھٹکنے والی ہوتی ہے۔ معصوم بچیوں کو کوئی بھی بہکا سکتا ہے، کوئی بھی انہیں سیدھی راہ سے ڈگمگا سکتا ہے۔ ایسے میں والدین کو اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔''

''پلیز فرید! آپ خاموش ہو جائیں ...... آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ مجھ سے واقعی غفلت ہوئی کہ میں نگین پر اعتماد کر بیٹھی۔ فریال کے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کے بعد بھی اس کی ایسی نگرانی نہیں کی جو مجھے کرنی چاہیے تھی حالانکہ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ اس کی دوست کیسی فاش غلطی کر چکی ہے۔''

''فیروزہ ......! بیٹی تو مہمان بھی ہوتی ہے اور شیشہ بھی ...... اب اس مہمان کو اپنے گھر با حفاظت جانا چا ناں۔ اس کی عزت کے شیشے پر کسی قسم کا کوئی بال نہیں آنا چاہیے۔'' فرید احمد کا لہجہ گلوگیر سا ہو گیا تھا۔ ''اگر کوئی کہہ دے کہ آپ کی لڑکی تو فلاں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے تو کیا یہ کسی اعزاز کی بات ہو گی یا بے عزتی کی؟'' فری احمد بیوی سے شکایتی لہجے میں سوال کر رہے تھے۔ ''ہماری نگین کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہوا کہ عزت اور عزتی میں کتنا کم فاصلہ ہوتا ہے۔''

کمرے کے دوسری جانب نگین باپ کی یہ ساری باتیں سن کر پسینے پسینے ہو گئی تھی اور لبوں سے بے اختیار آ بلند ہوئی۔

☆☆☆

فہد ماں کے کہنے پر فہمی کو گھر لے آیا تھا مگر فہمی بے حد چپ چپ سی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا جیسے اس کے لب مسکرانا بھی بھول گئے ہوں۔ ایک عجیب سی سوگواری اس کے چہرے پر مجسم ہو گئی تھی۔

ہر غلطی' ہر کوتاہی' ہر بری بات کی ذمے دار اس کی اپنی ذات ٹھہر گئی تھی۔ تب پلکوں کی منڈیروں پر آنسو رہتے اور تنہائی پاتے ہی ایک ایک کر کے اس کے من میں اترنے لگتے۔

ادھر ممانی جان کا رویہ بھی فہمی کے ساتھ یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ کہاں وہ ملائمت بھرا ان کا لہجہ اور اب وہ اس سے انتہائی کھردرے لہجے میں بات کیا کرتیں۔

''سارا دن اکیلی اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہو' تمہارا دل نہیں گھبراتا'' ایک دن انہوں نے تنگ کر کہا۔

''پھر کیا کروں؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کوئی فائدہ۔ اب جاب کیوں نہیں کر لیتیں تم؟''

''اب دل ہی نہیں چاہتا کچھ بھی کرنے کو۔'' اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

''تمہارا دل بڑا عجیب ہے۔ بے وقت کی راگنی ہی الاپنا جانتا ہے۔ جب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا' اس وقت ایسی پاگل ہو رہی تھیں کہ میں یہ کر لوں' میں وہ کر لوں۔''

''کیا آپ کی یہ خواہش ہے کہ میں نوکری کروں؟''

''مجھے الزام مت دو' تمہیں ہی بہت شوق تھا جاب کرنے کا۔ ہر وقت کی تکرار تھی فہد سے ...... تو اب کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''کوئی ویکنسی نظر آئے گی تو کر لوں گی۔''

''کسی اسکول میں کر لو۔ اب تو ہر محلے میں کئی کئی اسکول ہیں۔ بی ایڈ تو تم نے کر ہی رکھا ہے۔''

''جی اچھا' اپلائی کرتی ہوں۔''

تب فہمی نے کئی اسکولوں میں اپنا سی وی بھجوا دیا ...... اور بالآخر ایک اسکول میں اسے جاب مل گئی۔ اسکول بھی گھر سے کوئی خاص دور نہیں تھا۔ وہ بہ آسانی پیدل ہی آ جا سکتی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی نہیں تھی تو بہت بری بھی نہیں تھی۔

پہلی تاریخ کو جب اسے سیلری ملی تو اس نے فہد کو دینی چاہی۔

''نہیں بھئی' یہ اپنے پاس ہی رکھو۔ تمہارے پیسے میں کیوں لوں گا؟''

''آپ ممانی جان کو دے دیجیے گا۔ گھر کا خرچ تو وہی چلاتی ہیں ناں۔ میں اپنے ہاتھ سے دوں گی تو اچھا نہیں لگے گا۔''

''نہیں' وہ تمہارے پیسے ہرگز لینا پسند نہیں کریں گی۔ اپنے پیسے تم اپنے پاس ہی رکھو' اپنے لیے کوئی بھی چیز لینا چاہو تو لے لو۔''

''اپنے لیے تو کوئی چیز لینے کو اب دل ہی نہیں کرتا۔''

''یاسیت کا لبادہ جو تم نے اپنے اوپر چڑھا رکھا ہے' وہ اتار پھینکو۔ تب ہی تمہیں ہر چیز اچھی لگے گی۔ جو لوگ اپنے اوپر پریشانیوں اور غموں کو مسلط کر لیتے ہیں' انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔'' فہد نے اسے ملائمت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں ایسا خود سے تھوڑی چاہتی ہوں' بس اب دل کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اپنے دل کو سمجھاؤ' نہ مانے تو اس کے کان مروڑ دو۔ ٹیچرز تو اپنے اسٹوڈنٹس کو ان کی نالائقی پر اچھا خاصا سرزنش کیا کرتی ہیں' تم سے اپنے دل کو نہیں سمجھایا جاتا۔''

''میرا دل لوگوں کی باتیں برداشت نہیں کر پاتا۔''

''امی کی باتوں کا برا نہ مانا کرو۔ وہ جو محسوس کرتی ہیں' کہہ بھی دیتی ہیں۔ سمجھ دار لوگ اپنے دل کی ہر بات کسی سے کہتے نہیں ہیں مگر ایسی دانش مندی سے وہ کوسوں دور ہیں۔''

''آپ کا رویہ کون سا دوستانہ رہا تھا' جب میں امی کے گھر گئی ہوئی تھی۔''

''اب میں پھپھو کے گھر جا کر آپ کے لاڈ پیار تو نہیں کر سکتا تھا'' فہد نے مسکرا کر کہا تو فہمی جھینپ سی گئی۔

☆☆☆

عظمت بیگم اور شجاع کو کراچی سے آئے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے ...... مگر کراچی کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

''پنجاب آتے ہی دونوں ہی شدید قسم کے فلو کی لپیٹ میں آ گئے تھے، سو بستر پر لیٹے ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی، اس کا کوئی نہ کوئی سرا کراچی ضرور پہنچ جاتا۔

فرحت کے بچوں کی موسم سرما کی تعطیلات تھیں، وہ بھی ان دنوں ماں کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

’’حیرت ہے امی، اس دفعہ فیروزہ ممانی نے خاطر مدارات کے اپنے ہی ریکارڈ توڑ دیے۔‘‘ فرحت نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں حیرت تو مجھے بھی ہوئی تھی مگر جب اس کی بلائیں لیتی ہوئی نظریں شجاع پر پڑتی دیکھیں تو سب معاملہ سمجھ میں آ گیا......‘‘ عظمت مسکراتے لبوں سے کہہ رہی تھیں۔

’’ہر ماں کو اپنا بیٹا کسی ہیرو سے کم نہیں لگتا ہے۔ مجھ سے تو کوئی راستہ پوچھنے کے لیے کوئی خاتون بات کرنے لگیں تو امی یہی سمجھتی ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی ہے......‘‘ شجاع ماں کی یہ باتیں سن کر چڑ کر بولا۔

’’تجھے کیا پتا کہ کیسا گبرو ہے تو، جو تجھے ایک دفعہ دیکھ لے، پلکیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔‘‘ عظمت بیگم کا لہجہ محبت اور زعم سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

’’ہاں کراچی میں تو وجاہت ناپید ہو گئی ہے ناں، وہاں کے لڑکے مردانہ وجاہت کے حامل ہی نہیں ہوتے۔‘‘ شجاع نے ہنس کر ماں سے کہا۔

’’ہوتے ہوں گے......مگر مجھے تو شجاع سے اچھا ایک نظر نہیں آیا......! سارے ہی دبلے دبلے سے لگے اور ناٹے بھی......!‘‘

’’ہر ماں کا یہی خیال ہوا کرتا ہے، اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی اچھا نہیں لگتا......اب فرحت کے بیٹے کیسے کالے کالے سے ہیں مگر فرحت سے پوچھو، تو یہی کہے گی کہ ان سے بڑھ کر کوئی خوب صورت نہیں، کیوں فرحت، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں......‘‘ شجاع نے بہن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

’’ہاں......یہ تو ہے......ہر ماں......اپنے بچوں کو اپنے دل کی آنکھ سے دیکھتی ہے......اس لیے اسے ایسا لگتا ہے۔‘‘

’’شجاع باؤ......آپ کا خط ہے......‘‘ پوسٹ مین نے آواز لگائی تو شجاع آلکس سے اٹھتا ہوا باہر گیا...... اس سردی میں کہاں سے خط آ گیا......!

لفافہ لے کر جب وہ آیا......تو حیرت سے اسے تکے چلا جا رہا تھا۔

’’کس کا خط ہے پتر......؟‘‘ عظمت بیگم نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

’’ماموں رشید کا، امریکا سے......‘‘ شجاع نے لفافے کی پشت پر لکھے ہوئے ایڈریس کو پڑھ کر کہا۔

’’رشید بھائی کا خط!‘‘ عظمت نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔

رشید ان کے سوتیلے بھائی تھے، ہمیشہ کے اکل کھرے، کبھی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا۔ فرحت کی شادی کا کارڈ بھیجا تو سوائے مبارک باد کے کارڈ کے کچھ نہیں آیا تھا۔ طفیل کا بڑا سالا ان کی امریکا کی شاپ پر ملازم تھا، وہ سال دو سال بعد جب پنجاب آتا تو رشید بھائی کی امارات کے قصے بیان کرتا مگر رشید بھائی نے کبھی کسی کو کچھ بھیجنا تو درکنار، خط وط بھی نہیں لکھا تھا۔ گزشتہ تیس سال سے وہ امریکا میں آباد تھے۔

’’وہیں پر کسی غیر ملکی خاتون سے شادی کر لی تھی، نہ بیوی کو لے کر کبھی وطن آئے، اور نہ ہی اپنے بچوں کو کسی سے ملوایا۔

’’سنا تھا ان کے دو بیٹے تھے اور دونوں نے غیر مسلموں کی طرح پرورش پائی تھی۔‘‘

اور اب ایکا ایکی ان کا خط آیا تھا......عظمت بیگم کی پریشانی اپنی جگہ بجا تھی......’’جب تیس سالوں میں کوئی نہیں لکھا تو اب کیوں لکھ دیا!‘‘

’’امی پہلے آپ خط سن لیں، اپنے تبصرے بعد میں کیجیے گا۔‘‘ شجاع نے ماں کو بڑبڑاتے دیکھ کر کھنکھار کر خط ھنا شروع کیا۔

’’عظمت آپا......!

السلام علیکم!

آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ آج رشید کو آپ لوگوں کی کیسے یاد آ گئی۔ آپ کی حیرت بھی بجا ہے مگر میں بھی اپنی جگہ سچا ہوں۔ ہمیشہ آپ سب کو یاد کرتا رہا ہوں۔ طفیل کے سالے ابرار سے کرید کرید کر سب کی خیریت چھتا رہا ہوں۔ آپ کو یہ بات سن کر ہنسی آئے مگر مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ پچھلے مہینے آپ کی گائے بھوری بیمار ہو کر مر گئی تھی جس کا آپ نے بڑا سوگ منایا تھا!

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نیم کا درخت آپ کے آنگن میں ہے اور اس کے نیچے تخت پر بیٹھ کر آپ سارا کام رتی ہیں۔ شجاع وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ آپ کا پاندان اسی تخت پر دائیں جانب رکھا رہتا ہے۔

پیاری آپا آپ ہمیشہ میرے دل میں رہتی تھیں مگر آج آپ مجھے بے حد یاد آ رہی ہیں۔

میں شاید بے حد بدنصیب شخص ہوں۔ آگے بڑھنے کے چکر میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ وقت بھی مجھ سے خفا ہو گیا۔

پہلے اپنی محبت کے اظہار کا ٹائم نہیں ملا اور جب اظہار کرنا چاہا تو اللہ کے پاس جانے کا ٹائم آ گیا۔

میں شدید بیمار ہوں اور بیماری کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ پتا نہیں کس وقت بلاوا آ جائے۔

میری بیوی میری بیماری سے گھبرا کر نہ صرف مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے بلکہ اپنے کسی دوست کے ساتھ عیاشانہ ندگی بھی بسر کر رہی ہے۔ اس کو یہ خطرہ تھا کہ میرے جراثیم کہیں اس کو بیمار نہ ڈال دیں۔

میرے دونوں بیٹے تو بیوی سے پہلے ہی چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ان کا تو یہ مشورہ تھا کہ بیماری کی صعوبتوں کو ھیلنے کے بجائے مجھے موت کا ٹیکا فوراً لگوا لینا چاہیے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بجائے، مجھے ایک آسان وت کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اسی میں میرے لیے بھلائی ہے اور اسی میں میرے لیے بہتری ہے۔

میرے اپنے، جن کی خاطر میں اپنا آپ بھول گیا، اپنی شناخت بھول گیا۔ جن کو اونچا لے جانے کے لیے یں خود نیچے گر پڑا۔ اپنا تن من دھن سب ان پر لٹاتا رہا اور وہ سب پرائے بن بیٹھے اور مجھ سے یوں لاتعلق ہو گئے جیسے ان سے میرا کبھی کوئی ناتا ہی نہیں تھا۔

تب مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ سزا مجھے اپنی مٹی سے بے وفائی کرنے پر ملی ہے۔ یہ دن مجھے اس لیے دیکھنے پڑ رہے ہیں کہ میں نے رشتے داریوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ ان سے ملنے کو تضیع اوقات جانا......اور جو صلہ رحمی رتا ہے تو اس کا نقصان تو اسے ہوتا ہی ہے۔

دراصل تکبر ایک مدہوشی کا بھی نام ہے۔ ایسی غفلت جس میں انسان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ بے ہوشی میں کیے جانے والے کام صحیح کیونکر ہو سکتے ہیں۔

اور آج میں اپنا بویا ہوا کاٹ رہا ہوں۔ اگر میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر آیا تو آج میرے بھی مجھے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

عظمت آپا آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ کا بیٹا بے حد سعادت مند اور فرمانبردار ہے۔ ہمارا پورا گاؤں شجاع پر فخر کرتا ہے کہ بیٹا ہو تو شجاع جیسا ہو۔ میری دعا ہے کہ آپ سدا اپنے ہونہار بیٹے کے ساتھ رہیں اور زندگی کی لطافتوں سے سیراب ہوتی رہیں۔

اللہ تعالٰی میرے فرید بھائی کو بھی کل صحت او زندگی دے۔ میرا تو آپ دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔

میری یہ دلی خواہش ہے کہ آپ اپنے شجاع کی شادی ان کی بیٹی نگین سے کر دیں تاکہ ہمارا یہ خاندان ہمیشہ جڑا رہے اور محبتیں پھلتی پھولتی رہیں۔

شجاع اگر نگین سے شادی کرے گا تو میری یہ تمام تر دولت شجاع اور نگین کے نام ہو گی۔ گو بیماریوں اور علاج معالجے میں میرا پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا ہے مگر پھر بھی یہ رقم پاکستان کے چالیس پچاس کروڑ سے کم نہ ہو گی۔

ایسا ہی ایک خط میں فرید بھائی اور فیروزہ بھابی کو بھی لکھ رہا ہوں۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں آپ سے بھی طلب کرتا ہوں اور بھائی جی سے بھی مانگوں گا۔

پیاری آپا پردیس میں موت سے قریب تر اس بھائی کو خلوص دل سے معاف کر دینا۔ بھائی تو بہنوں کا مان ہوا کرتے ہیں مگر میرا شمار ان لوگوں میں تھا جو صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور کسی کے سامنے اپنا تعلق کسی پسماندہ علاقے سے بتاتے ہوئے کمتری محسوس کرتے ہیں۔

اپنے بچوں کا تو مجھے یہ علم بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ کاش میں کسی مسلمان عورت سے شادی کرتا تو میرے بچے دور رہ کر بھی کوئی نہ کوئی تعلق تو مجھ سے رکھتے! ایسا تو نہ کرتے کہ انہوں نے اپنی خوشبو تو کیا اپنی آواز تک سے مجھے محروم کر رکھا ہے۔

میں آنکھیں بند کر کے جیک اور میک کو پکارتا ہوں تو میری سماعت پر صرف ایک ہی پتھر بار بار آ کر گرتا ہے، ڈیڈی آپ کو موت کا ٹیکا فوراً لگوا لینا چاہیے۔

میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ ان کی شرارتوں اور محبتوں کے لمحات کو کھینچ کر اپنی پلکوں پر بٹھا لوں مگر ایسا کوئی لمحہ میری گرفت میں نہیں آ پاتا......!

یہ کتنی بڑی سزا ہے میرے لیے کہ میری یادیں بھی مجھ سے متنفر ہو گئی ہیں اور وہ میرے پکارنے پر بھی نہیں آتی ہیں۔

میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر بغیر وصیت لکھے میں مر گیا تو میری ساری دولت کسی بھی حق دار کو نہ مل سکے گی۔ اس لیے میں نے وکیل سے اپنا وصیت نامہ تیار کروا لیا ہے۔

اس وصیت نامے کو تیار کرنے کی وجوہات میری اپنی غلطیاں ہیں، جن کی میں ہر صورت میں کچھ نہ کچھ تلافی کرنا چاہتا ہوں۔

کاش میں وہ غلطیاں نہ کرتا تو میری زندگی اتنی عبرت ناک نہ ہوتی، کاش......!

ابا جی میری شادی فیروزہ بھابی کی بہن سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ اچھی تھیں، سگھڑ، خوب صورت اور سب کا دل موہ لینے والی تھیں مگر مجھے ان کا برقع اوڑھنا سخت ناپسند تھا۔ ان کی شرم و حیا بری لگتی تھی۔ سو میں نے ابا جی کو صفا چٹ انکار کر دیا کہ ایسی لڑکی مجھے پسند نہیں۔

جب پاکستان میں، میں نے جاب کی تو مجھے تنخواہ ملی۔ اماں نے کہا کہ پہلی تنخواہ ملی ہے، اپنی بہن عظمت کے لیے کوئی تحفہ لے کر آ۔

پتا ہے، میں نے ان سے کیا کہا تھا...... آج بھی سوچتا ہوں تو شرم سے گڑ جاتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ عظمت آپا کون سی میری سگی بہن ہیں۔ سوتیلے بہن بھائیوں پر کون خرچ کرتا ہے جو میں آپا کے لیے تحفہ لاؤں۔ میں خواہ مخواہ اپنے پیسے میں آگ لگا دوں۔ وہ میری بہن نہیں ہیں۔

میری یہ بات سن کر اماں نے خاصا گل مچایا اور خوب روئی بھی تھیں مگر میرے دل پر ان کے آنسوؤں نے کوئی اثر نہیں کیا اور سب سے بڑی بات، آپ کی شادی کے لیے رکھا زیور کوئی چور نہیں لے گیا تھا، وہ میں نے اڑایا تھا۔ میں ان دنوں باہر جانے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا اور پیسے کی سخت ضرورت تھی اور اس زمانے میں وہ تیس ہزار کا زیور میرے لیے بہت بڑی رقم تھی جو میرے تمام خرچے نمٹانے کے بعد بھی میرے کام آئی اور کبھی کسی کو مجھ پر شک تک نہ ہوا۔

ہاں آپا میں چور بھی ہوں۔ ایسا چور جو اس وقت بے حد خوش تھا کہ اسے کوئی سزا نہیں ملی۔ اس کا نام تک کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔

مگر اب سوچتا ہوں کہ سزا تو مجھے ملی مگر اکٹھی ملی۔ آج میں اپنے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھام کر بھی خود نہیں پی سکتا۔

اپنی نئی زندگی چوری کی رقم سے شروع کی تھی تو مجھے کیسے کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جاتیں۔

اماں مجھ سے کہتی تھیں کہ جو لوگ حرام کمائی کماتے ہیں ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ شاید وہ تیس ہزار تیس لاکھ سنپولیے بن کر میری ہر کمائی پر حرام کمائی کی پھنکاریں مارتے رہے!

فرید بھائی ضدی اور اکھڑ ضرور تھے مگر بے ایمان نہیں تھے مگر میں نے ابا جی کے کانوں میں فرید بھائی کے خلاف ہمیشہ زہر اگلا......

ابا جی نے جو مجھے گندم خریدنے کے پیسے دیے تھے، وہ مجھ سے فرید بھائی نے نہیں چھینے تھے بلکہ میں نے ہڑپ کر لیے تھے۔

مجھے یاد ہے، ابا جی ہمیشہ فرید بھائی سے ناراض سے رہے اور انہیں کبھی اعتماد کے قابل نہیں جانا اور اس کی وجہ صرف میری ذات تھی کہ میں نے بارہا ایسے مواقع پیدا کیے جس میں فرید بھائی کو ہمیشہ سبکی محسوس ہوئی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میری زندگی اس انداز میں پلٹا نہ کھاتی تو شاید مجھے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس تک نہ ہوتا۔

پیاری آپا اس وقت آپ مجھے اپنے قدموں میں محسوس کیجیے۔ آپ کا یہ ناخلف بھائی اپنا سر آپ کے قدموں میں رکھے بیٹھا اپنی فاش غلطیوں کی معافیاں طلب کر رہا ہے۔"

تب عظمت اپنی جگہ سے اچھل کر ہٹ گئیں۔ جیسے واقعی رشید ان کے پاس ہو اور آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

"اے پاک پروردگار...... تو میرے بھائی رشید کو معاف کر دینا اور اس پر رحم کرنا......" ان کا رواں رواں دعا گو ہو گیا۔

شجاع نے اٹھ کر ماں کو پانی پلایا اور پھر بقیہ خط پڑھنے لگا۔

"عظمت آپا...... میرے وصیت نامے میں نگین اور شجاع کے نام درج ہیں۔ آپ لوگوں کے ایڈریس ہیں۔ میرے مرنے کے بعد میرا وکیل پاکستان آئے گا۔

’’اگر ان دونوں بچوں کی شادیاں کسی بھی وجہ سے نہیں ہو پاتیں تو پھر وہ رقم کسی بھی رفاہی ادارے، میں لگانے کا مجاز ہوگا۔ اپنا ایڈریس اور فون نمبرز لکھ رہا ہوں۔ امید ہے زندگی کے آخری لمحوں میں آپ لوگوں کی آواز سن سکوں گا۔

فقط آپ کا گناہ گار بھائی رشید‘‘

عظمت بیگم کو خط سن کر سکتہ سا ہوگیا۔ اور آنسو کسی جھرنے کی طرح ان کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ بھائی رشید کو ان کے بیوی بچے آخری وقت میں چھوڑ گئے، یہ غم بھی انہیں کھا رہا تھا۔

’’یہ رشید ہمیں اتنی بڑی رقم کیوں دے رہا ہے؟‘‘ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئیں تو انہوں نے شجاع سے پوچھا۔

’’مذاق کر رہے ہوں گے۔ نانا جی بتاتے تھے کہ مذاق کرنے کی ان کی عادت تھی۔ کون دیتا ہے کسی کو اپنی دولت، دیکھ لینا، اب کوئی خط آئے گا تو لکھا ہوگا کہ یہ ان کا مذاق تھا۔‘‘

’’ہاں امی دماغ چل گیا ہے ان کا شاید، زندگی میں انہوں نے کبھی ایک پائی نہیں بھیجی، ابھی کہاں سے آ گیا ان کا آخری وقت! بہ مشکل پچپن سال کے ہوں گے۔ شجاع بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ سب ان کا مذاق ہے۔ کنجوس لوگ مرتے مرجائیں اپنا مال کسی کو نہیں دیتے۔‘‘

’’نہیں مجھے اس کا یہ خط جھوٹا نہیں لگ رہا۔ ایک ایک بات اس نے سچی لکھی ہے۔‘‘ عظمت بیگم نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ ان کے جہیز کا زیور واقعی کوئی چور لے گیا تھا۔

’’چلئے مان لیا کہ وہ سچے ہیں تو کیا وہ اپنے بچوں کو اخبارات اور ٹی وی کی مدد سے ڈھونڈ نہیں سکتے۔ اچھی یا بری، اولاد ہے ان کی۔ ان کے پیسے پر، ان کا حق ہے۔ ان کا پیسہ ان کو ہی ملنا چاہیے۔‘‘ شجاع نے وثوق بھرے لہجے میں کہا۔

’’جب وہ اپنے بیوی بچوں کو دینا ہی نہیں چاہتے تو ہم کون ہوتے ہیں، انہیں مشورہ دینے والے۔‘‘ فرحت کا لہجہ سرشار تھا۔

’’جب قسمت کی دیوی خود ہی مہربان ہو رہی ہے تو ہمیں اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ چالیس پچاس کروڑ تو کیا، تم زندگی بھر کتنی ہی محنت کر لو پچاس لاکھ نہیں کما سکو گے۔ کیا ہے کہ اگر تم نگین سے شادی کر لو تو حسین ترین بیوی کے ساتھ ساتھ کروڑوں کی رقم بھی مل جائے تو برا کیا ہے......‘‘ رشید ماموں کا خط پڑھ کر فرحت کی سرشاری کا عجیب عالم تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں شجاع کی شادی نگین سے ہو جائے۔

’’مگر مجھے تو فرح سے شادی کرنی ہے۔ میں کیسے نگین سے شادی کر سکتا ہوں۔‘‘ شجاع نے بہن کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

’’کون سا ہم نے فرح کے لیے رشتہ ڈال دیا ہے۔ ہم نے تو ابھی کوئی بات ہی نہیں کی تو فرح کا ذکر کہاں آ گیا۔‘‘ فرحت نے ناپسندیدگی سے کہا۔

’’پر مجھے تو اچھی لگتی ہے ناں۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا...... کہ میں فرح سے شادی کروں گا......‘‘ شجاع نے کھسیا کر ہنستے ہوئے کہا۔

’’یہ اس وقت کی بات تھی بھائی جب آپ کی لاٹری نہیں نکلی تھی...... اور آپ گاؤں کے اس معمولی سے مکان میں رہتے تھے۔ اب تو آپ کسی بڑے زمیندار سے اس کی شاندار حویلی خرید سکتے ہیں۔ اسے اپنے خوابوں کی

طرح سجا سکتے ہیں۔ شاندار کار خرید سکتے ہیں۔ اعلیٰ قسم کے ملبوسات سے اپنی الماریاں بھر سکتے ہیں تو پھر اس میں فرح کا کہاں گزر ہوگا۔‘‘

رشید بھائی کا خط نہیں آیا تھا مگر مجھے نگین اس سے پہلے پسند آ گئی تھی۔ کراچی جانے کا تو صرف بہانہ ہو گیا مگر نگین کی محبت اللہ نے میرے دل میں ڈالنی تھی۔ اتنی اچھی لگی مجھے اپنی بھتیجی کہ جب سے آئی ہوں وہ مجھے پل پل یاد آ رہی ہے۔‘‘ عظمت نے اپنے ارمان اپنی آنکھوں میں سجا کر کہا۔

’’امی، آپ اور فرحت یہ سب باتیں رشید ماموں کے پیسے کی وجہ سے کر رہی ہیں ناں۔‘‘

’’رشید بھائی، بے شک ہمیں پھوٹی کوڑی نہ دیں، مگر میری بہو نگین ہی بنے گی۔‘‘

’’امی بری بات منہ سے کیوں نکالتی ہیں۔ رشید ماموں نے جب لکھا ہے تو وہ کیوں نہیں دیں گے، خط کو بھی آپ سنبھال کر رکھیں، یہ بھی وصیت نامے کا کام دے گا۔ میرے بھائی کے پاس جب پچاس کروڑ آئیں گے تو ایک دو کروڑ تو وہ مجھے بھی دے دے گا۔‘‘ فرحت نے ہنستے ہوئے ماں سے کہا۔

’’ایک دو کروڑ کیوں، پانچ کروڑ تو دے گا ہی...... آخر تمہیں بھی حویلی خرید کر سیٹ کرنی ہوگی اور حویلی کے لحاظ سے پھر اس کے خرچ بھی ہوں گے۔‘‘

’’واہ رشید ماموں، آپ نے تو وہ کام کر دیا جو کسی کے سگے بھی نہ کر سکیں۔ آپ کا امریکا جانا آپ کے حق میں اچھا نہ سہی مگر ہمارے حق میں تو بہت ہی اچھا رہا۔ ان کا پیسہ ہماری قسمت کا تھا۔ شاید اسی وجہ سے ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگے، اگر وہ نہ جاتے تو ظاہر ہے کہ رشید ماموں اس نہج پر کیوں سوچتے۔‘‘

’’مگر میں نگین سے شادی نہیں کروں گا۔‘‘ ماں، بہن کی باتیں سن کر شجاع نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

’’ماں کے حکم کی نافرمانی کرنا چاہتا ہے۔‘‘ عظمت کے آنسو ان کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔

’’ہم لوگ شادی سے انکار کریں گے تو فرید ماموں بھی ناراض ہو جائیں گے۔ یوں ہمارے فیصلے سے فرید ماموں بھی امی سے لاتعلق ہو جائیں گے۔‘‘ فرحت نے سمجھایا۔

’’مگر میں فرح کے بغیر نہیں رہ سکتا۔‘‘ شجاع نے سر تھام کر وہیں بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’فرح میں ایسی کیا خاص بات ہے، پھیکی شلجم، تیسرے درجے کا بھی جہیز نہ دیں، ساری کی ساری بہنیں اول نمبر کی مکار...... بیاہی بہنوں کی کسی سسرال سے نہیں بنی۔ سب الگ گھر میں بیٹھی ہیں۔ ایسے فتنے گھرانے کی لڑکی لانے کا فائدہ جو ہمارے گھر کا سکون بھی تباہ کر دے۔‘‘

’’مگر امی، آپ نے تو وعدہ کیا تھا، اس کا رشتہ لینے اس کے گھر جائیں گی۔‘‘

’’ہاں بیٹا، یہ بات بھی میں ہی کہہ رہی ہوں کہ فرید بھائی کی بیٹی لا کر ہمارا خاندان آپس میں جڑے۔‘‘

’’فہمی کی شادی اپنے ماموں کے گھر ہوئی ہے، وہ کون سی اپنے سسرال میں خوش ہے۔ دونوں خاندان آپس میں ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کر رہے ہیں اور اس سے قبل آپ ہی یہ کہا کرتی تھیں کہ خاندان میں شادیاں ہونے سے لڑائی جھگڑے بڑھا کرتے ہیں۔ پرانی پرانی باتوں کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ فیروزہ ممانی کی کوئی عادت بھی آپ کو پسند نہیں تھی۔ اب ان کی بیٹی لانے کے لیے آپ ایسی بے چین ہو گئی ہیں کہ اللہ کی پناہ!‘‘ شجاع طیش کے عالم میں آنگن میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

’’ٹھیک کہہ رہے ہو تم، فیروزہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی مگر اپنی بھتیجی کو میں نے کبھی برا نہیں کہا۔ میری بھتیجی میری بہو بنے، اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے!‘‘ عظمت بیگم کا لہجہ آرزوؤں اور ارمانوں سے

گندھا ہوا تھا۔

’’مگر میں نے نگین کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں۔‘‘

’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔‘‘

’’مجھے فرح سے اچھا کوئی نہیں لگ سکتا!‘‘

’’شادی کے بعد اپنی باتوں پر ہنسا کرو گے۔‘‘

’’فرح مجھے اچھی طرح سمجھتی ہے، اس کے ساتھ میں خوش رہوں گا۔‘‘

’’نگین بھی تمہیں خوش رکھے گی، وہ فرح سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ وہ تمہارا اس سے زیادہ خیال رکھے گی۔‘‘

’’امی آپ کو اپنے بیٹے کی خوشی کا احساس نہیں ہے۔‘‘

’’بیٹے تمہیں اپنی ماں کے احساسات کی کوئی پروا نہیں۔‘‘

’’اللہ میں کیا کروں...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ماہ کراچی جانے کی وجہ سے میری زندگی میں ایسا طوفان بھی آ سکتا ہے۔‘‘

’’یہ طوفان نہیں ہے۔ یہ خوشی کی لہر ہے، جس کے سنگ سنگ چلتے ہوئے ہم سب خوش رہیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے جو دل چاہے کریں، مگر اس خوشی میں میرے دل کی مرضی کبھی شامل نہیں ہو گی۔‘‘ شجاع نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا اور ناراض سا باہر نکل گیا۔

’’امی! آپ رشید ماموں کو فون تو کر لیں۔ ان کی خیریت تو معلوم کر لیں۔ یہ خط بیس دن پہلے کا چلا ہوا ہے۔ پتا نہیں اب تک وہ دوسری دنیا میں جا چکے ہوں اور ان کا وکیل پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہا ہو۔‘‘ فرحت یکدم ہی بے صبری سی بن گئی۔

’’اللہ نہ کرے، اللہ رشید بھائی کو لمبی زندگی دے، شجاع آئے گا تو بات کروں گی۔‘‘

’’اللہ...... کتنا مزہ آئے گا جب میرا بھائی بڑی سی کار میں بیٹھ کر میرے گھر آیا کرے گا، گارڈ اس کے ساتھ ہوا کرے گا، میری پورے محلے میں دھاک بیٹھ جائے گی، فرحت کا بڑا بھائی پیسے والا ہے۔‘‘ فرحت نے آنکھیں بند کر کے کسی معصوم بچے کی طرح کہا اور عظمت بیگم اس کی یہ باتیں سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر پھر رشید کی بیماری کا سوچ کر دھواں دھار رونے لگیں...... کہ فرحت کے لیے ان کو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

فرح کو یہ تو پتا چل گیا تھا کہ شجاع کراچی سے واپس آ گیا ہے مگر کراچی آ کر وہ اس سے کیوں رابطہ نہیں کر رہا، اس سلسلے میں وہ واقعی حیران تھی۔

ملا کی دوڑ مسجد تک...... جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ فرحت آپا سے ملنے چل دی۔ وہ اس وقت اپنے گھر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

’’ارے میری فرح آ گئی۔‘‘ اس کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

’’کہیں جا رہی ہیں آپ......؟‘‘ ان کو یوں تیار دیکھ کر کہا۔

’’ہاں امی کے ہاں جا رہی ہوں، کراچی سے آئے ہوئے انہیں چار دن ہو گئے، صرف مل کر آ گئی ہوں مگر اب ہفتہ دس دن رہوں گی ان کے پاس۔‘‘

’’خالہ جان ٹھیک ہیں۔‘‘ اس نے اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

’’ہاں ٹھیک ہیں، آتے ہی وہ اور شجاع بھائی فلو کا شکار ہو گئے ہیں۔ سخت نزلہ، کھانسی اور بخار ہے اور بھائی جان کی تو ذرا سی طبیعت خراب ہو جائے تو اتنا شور مچاتے ہیں، اس لیے تو میں رہنے کے لیے جا رہی ہوں۔‘‘

’’آپ میری طرف سے بھی خالہ جان کو پوچھ لیجیے گا۔‘‘

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں۔‘‘

’’فرحت آپا، آپ میرے گھر کیوں نہیں آتیں۔‘‘ فرح نے شکایتی لہجے میں کہا۔

’’اچھا، اب پکا وعدہ! امی کے گھر سے آ جاؤں تو پھر تجھ سے ملنے کے لیے آؤں گی۔‘‘

’’سچی میں......‘‘ فرح کی آنکھیں دلی مسرت سے چمکنے لگیں۔

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میں تو کب سے آنا چاہ رہی تھی...... خیر...... اب بہت جلد آؤں گی۔‘‘

فرحت اپنی امی کے ہاں دس دن گزار کر آ چکی تھیں۔ اور پھر انہیں آئے ہوئے بھی ہفتہ ہو گیا...... جب وہ نہیں آئیں تو فرح ان کے گھر جا پہنچی!

’’فرحت آپا، آپ نے مجھ سے بالکل جھوٹا وعدہ کیا تھا آنے کا...... آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آئیں۔ کب سے میں آپ کی راہ دیکھ رہی تھی۔‘‘ فرح نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

’’میرے پاس کہاں فرصت ہے۔ محلے میں کہیں آتا جاتا تم نے مجھے دیکھا ہے جو تمہارے گھر آؤں گی، نہیں بھئی، میرا آنا بہت مشکل ہے۔‘‘ انہوں نے اکل کھرے لہجے میں کہا۔

’’جب ہی تو میں چلی آئی، آپ کے پاس کہ میری آپا مجھے یاد کر رہی ہوں گی۔‘‘ فرح نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

’’بھئی تمہارا میرا کیا مقابلہ، میں چار بچوں کی اماں، ڈھیروں ڈھیر کام، گھر کی ذمے داریاں، میں کہاں محلے میں چوکڑیاں بھر سکتی ہوں۔ ابھی تم پر کوئی ذمے داری نہیں ہے اس لیے وقت کی فراوانی ہے اور جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم اس وقت کے لیے ترسا کرو گی۔‘‘

شادی کے ذکر پر فرح کا چہرہ گلگوں سا ہو گیا۔

’’اشرف کی اماں آئی تھیں، وہ بتا رہی تھیں انہوں نے تمہارے لیے رشتہ ڈالا ہے۔‘‘ فرحت نے ہنس کر مذاق سے لہجے میں کہا۔

’’یہی تو میں بتانا چاہتی تھی آپ کو...... وہ چاہتی ہیں کہ میری اشرف کے ساتھ شادی ہو جائے۔‘‘ فرح نے پھولے پھولے سانسوں میں کتھائے دل کہہ سنائی اور مطمئن ہو کر فرحت کو دیکھا۔

اسے یہ یقین آ گیا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فرحت آپا گھڑی کی چوتھائی میں یہ خبر شجاع تک پہنچا دیں گی اور منٹوں میں وہاں سے اس کے لیے رشتہ آ جائے گا تب یہ اشرف کا گھرانا منہ دیکھتا رہ جائے گا۔

’’اچھا، اشرف کا رشتہ ابھی قبول نہیں کیا گیا؟‘‘ فرحت نے پرشوق لہجے میں پوچھا۔

’’نہیں...... نہیں تو......!‘‘ فرح نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے کی ہنسی اسے عجیب سی لگی۔

’’حیرت ہے اتنے اچھے رشتے کو تمہاری اماں ابھی تک لٹکائے بیٹھی ہیں، انہیں تو اس کو فوراً قبول کر لینا چاہیے۔‘‘

’’جی...... آپا...... یہ آپ کہہ رہی ہیں کہ امی کو اشرف کا رشتہ قبول کر لینا چاہیے۔‘‘ فرح نے پھٹی پھٹی نظروں سے فرحت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شجاع نے اپنے خطوں میں اسے یہی باور کرایا تھا کہ اس کی بہن اور اس کی ماں اس کی ہم نوا ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے وہی اس کے گھر والے بھی چاہتے ہیں۔

وہ فرح کو پسند کرتا ہے تو اس کے گھر والے بھی فرح کو اس کی زندگی کی ساتھی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔

''ہاں بھئی، صحیح تو کہہ رہی ہوں میں...... تم رخصت ہو کر اپنے پڑوس میں جاؤ گی، سسرال دور ہو تو مسائل خاصے بڑھ جاتے ہیں۔ اتنی قریب سسرال تو قسمت والیوں کو ملتی ہے اور پھر اشرف بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور میری یہ دلی دعا ہے کہ تم اشرف کے ساتھ بے حد محبت کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرو۔''

''جی آپا......'' فرح نے جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے فرحت کو دیکھا!

''تم ایک اچھی لڑکی ہو اور اچھی لڑکیاں ہی اپنے ماں باپ کے حکم پر سر جھکایا کرتی ہیں اور پھر تم ماشاءاللہ بہت سی بہنیں ہو، تمہارے بعد بھی تمہاری ماں کو کئی لڑکیوں کو نمٹانا ہوگا۔ اچھا ہے تمہاری جلدی سے شادی ہو جائے تو تمہاری ماں پھر دوسری بچیوں کے بارے میں سوچے!''

''خالہ جان تو ٹھیک ہیں ناں......'' فرح نے چلتے وقت بے صبرے انداز میں پوچھا کہ بجلی کی طرح اس کے دل میں یہی خیال آیا کہ شاید فرحت آپا کی ماں بیماری میں چل بسی ہیں اور ان کی اچانک رحلت سے فرحت آپا کا دماغ الٹ گیا ہے اور ان کو اس کا اور شجاع کا کوئی بھی تعلق یاد نہیں رہا ہے۔

''ہاں امی کو کیا ہونا تھا، ٹھیک ہیں وہ۔ بھائی جان بھی خیریت سے ہیں بس امریکا سے ہمارے گھر مہمان آنے والے ہیں۔ ان کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔''

''کوئی خاص مہمان؟'' فرح کے دل میں کرید سی ہوئی۔

''خاص نہیں بلکہ خاص الخاص......'' فرحت نے ہنستے ہوئے کہا۔ تب فرح اپنے آنسو سنبھالتی ہوئی تیزی سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

زندگی کا یہ نیا موڑ کتنی جلدی آ گیا تھا' جس کے بارے میں وہ سوچ تک نہیں سکی تھی۔ وہی کیفے تھا...... اور وہی مخصوص کھڑکی کے پاس والی ٹیبل۔

مگر آج زبور کے ساتھ کوئی نئی لڑکی تھی اور زبور اس کے ساتھ خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے سے امرت ٹپک رہا تھا اور وہ خمار بھری آنکھوں سے اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

وہ لڑکی آئس کریم کھاتے ہوئے اس کی باتوں کے جواب شرمیلے انداز سے دے رہی تھی۔

نگین نے یہ سب دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔

وہ جب دبے قدموں اس کے سامنے پہنچی تو وہ اس کو دیکھ کر شرمندہ ہونے کے بجائے مسکرا کر بولا'' مجھے تو ازخود پتا چل گیا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟''

''تمہیں خواہ مخواہ میں ہی پتا چل گیا'' وہ تلخی سے بولی۔

''نگین! تم گزشتہ ایک ماہ سے کالج نہیں آ رہی ہو' فون پر کسی سے رابطہ نہیں کر رہی ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم پیا گھر جانے کی تیاریوں میں مگن ہو۔''

''کیا یہ خبر تمہارے لیے خوشی کا درجہ رکھتی ہے؟'' اس نے تلملاتے ہوئے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا جو اسے لینے تو زنظروں سے گھورے چلی جا رہی تھی۔

''ظاہر ہے' خبر تو بڑی فنٹاسٹک ہے۔ تمہاری شادی سے مجھے خوشی نہیں ہوگی تو کس کو ہوگی؟''

''اچھا...... تم میری شادی کا سن کر خوش ہو رہے ہو؟'' وہ جل ہی تو گئی تھی۔

''اچھا ہے' تمہاری پڑھائی سے جان چھوٹی۔ اب تم شادی کے بعد ٹھاٹ سے اپنے میاں پر حکم چلایا کرنا۔''

''زبور...... کاش! تم اپنی والدہ کو لے کر میرے گھر آ جاتے تو یہ حالات نہ ہوتے مگر تم تو ہمیشہ ہی مجھے ٹالتے رہے اور میں بے وقوف بن کر تمہاری بے ایمان باتوں پر یقین کرتی رہی۔ کتنی دفعہ دل نے کہا کہ تم جھوٹے ہو اور مجھے بے وقوف بنا کر اپنا وقت پاس کرتے ہو مگر میں تمہاری جھوٹی باتوں کے سحر میں مدہوش رہی۔ ایسا کیوں کیا تم نے...... زبور! بتاؤ' کیوں کیا؟'' روتے ہوئے وہ اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔

''نگین! تم مجھے دوش مت دو، اگر میرا وقت تمہارے ساتھ اچھا گزرتا تھا تو تمہارا بھی گزرتا تھا۔ یہ تمہارا ہی کہنا تھا کہ میرے ساتھ گھوم کر تمہیں زندگی خوبصورت لگتی ہے۔ اگر مجھے تمہارا ساتھ اچھا لگتا تھا تو تمہیں بھی میرا قرب پسند تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر تم بھی یکسوئی سی محسوس کرتی تھیں۔ یاد ہے' ایک مرتبہ تم نے میرے سینے پر سر رکھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ زندگی کا تمام تر وقت یونہی بیت جائے اور جب آنکھ کھلے تو زندگی کی شام ہو رہی ہو۔ مجھے تو اتنے ڈائیلاگ بولنے بھی نہیں آتے تھے' جتنے تم بولتی تھیں...... میں تو تمہاری باتیں سن کر سحر زدہ سا تمہیں دیکھے جاتا تھا۔''

''زبور! تم نے مجھے شادی کا خواب دکھا کر فریب دیا ہے یا شاید ہر لڑکا فریب کے لیے یہی ایک ہتھیار پسند کرتا ہے اور بے وقوف لڑکیاں' اس جھوٹے خواب کے طفیل ارزاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔''

''میں نے خواب دکھائے تو تم نے کیوں دیکھے؟'' وہ ہنسا ''نگین! تم تو اپنے آپ کو عقل مند اور فریال کو ہمیشہ بے وقوف کہا کرتی تھیں تو خود کیوں بے وقوف بن گئیں۔ تم تو خاصی چالاک ہو، میری امارت سے متاثر رہی ہو اور یوں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں میں ایک بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ لڑکیوں کی شادی تو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے مگر لڑکوں کی شادیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کی تعلیم دیکھی جاتی ہے، ان کی جاب کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر بزنس ہو تو اس کی ساکھ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کو کہاں تک پھیلایا ہے، کیا ٹارگٹ ہے؟ اس کو کہاں تک لے جانا ہے؟ کسی کے پاس بھی کتنا ہی پیسہ کیوں نہ ہو، وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا، وہ اس کو ہمیشہ اور بڑھانا چاہتا ہے اور پھر میری ممی تو مجھے بہت چھوٹا سمجھتی ہیں۔ ابھی میرے بڑے بھائیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں تو میری باری کہاں آ سکتی ہے؟''

اور نگین اسے دیکھ کر اور اس کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ زبور کی باتیں اس کے ذہن پر سنگ باری سی کر رہی تھیں۔ آخر اس نے اپنا سر تھام لیا۔ درد کی شدت سے اس کی نسیں پھٹی جا رہی تھیں۔

''پتا نہیں، میں تم سے کیوں ملی؟ پتا نہیں، میں تمہاری باتوں میں کیوں کر آئی؟'' وہ مسلسل کہہ رہی تھی اور آنکھوں سے ایک جل تھل تھا جو بہے چلا جا رہا تھا۔

زبور کی ہنسی کی آوازیں اسے وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں، جو اس کے دل کو کچوکے دے رہی تھیں۔

''میں کیوں اس فراڈی شخص کے لیے آنسو بہا رہی ہوں؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''وہ مجھے اچھا لگتا تھا، اس کا ساتھ، اس کی باتیں دل کو اچھی لگتی تھیں۔ یہی تو اس نے طمانچہ مارا ہے کہ صرف اپنے وقت کو کیف آور بنانے کے لیے میں اس کے ساتھ گھوما کرتی تھی۔ اگر میں اس کی جھوٹی باتوں کو سچ سمجھتی چلی گئی تو یہ میری بھی تو غلطی ہے......'' اس کے دماغ نے اسے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا اور وہ خود ہر فرد جرم اپنے اوپر عائد کرتی چلی جا رہی تھی۔

شرمندگی، غم اور تاسف! جب ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو پسینے کی بوندیں ایک طوفانی بارش کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ نگین کے مساموں سے جیسے بارش ہو رہی تھی اور دل تو یوں دھڑک رہا تھا کہ اس کی دھڑکن اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

''نگین...... نگین...... نگین!'' اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے پکارا ہو۔

اس وقت اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ پکارنے والی آواز کو مڑ کر دیکھتی۔

''نگین! کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، کب تک سوتی رہو گی؟'' امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ چونک کر، آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''اٹھ جاؤ بیٹا! ناشتا کر لو، دیکھو تو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔''

''امی! کیا میں سو رہی تھی؟'' وہ آنکھیں کھولے ماں کو دیکھ رہی تھی مگر ذہن خواب کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

''ہاں، بے چین سی نیند تھی شاید، سوتے میں تکیے پر سر ادھر ادھر پٹخ رہی تھیں۔ رات دیر سے سوؤ تو نیند پوری نہیں ہوتی۔''

اور نگین اٹھ کر سوچنے لگی کہ شاید جو زبور نے مجھ سے کہنا تھا، وہ اس نے مجھ سے خواب میں آ کر ہی کہہ دیا ہو۔

''نہیں، میرا زبور ایسا نہیں ہو سکتا'' دل اسے پھر فریب کی وادیوں کی جانب دھکیلنے لگا۔

خواب کی کیفیت ایسی پریشان کن تھی کہ وہ اس کے شکنجے میں پورے ہفتے گرفتار رہی۔ کبھی اسے زبور کی ہنسی سنائی دینے لگتی، کبھی وہ لڑکی نظر آنے لگتی جو اس کے ساتھ بیٹھی کیفے میں آئس کریم کھا رہی تھی۔ اور وہ بیٹھے بیٹھے جھرجھری سی لے لیتی۔

ی کے جب بے شمار راستے ہوں تو ان بہت سے راستوں پر چل کر کوئی بھی انسان منزل تک نہیں پہنچ پاتا، کیفیت ان دنوں نگین کی تھی کہ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟

☆☆☆

شائستہ بیگم کو ہر وقت فریال کی فکر لگی رہتی۔ وہ ہر نماز کے بعد اس کی پیشانی پر پھونکا کرتیں۔ ''اللہ، میری بچی کو سلامت رکھنا۔ اے پاک پروردگار، میری بچی جہاں بھی ہو، تو اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا...... یا رب زندگی میں اس کی شکل مجھے دوبارہ ضرور دکھانا۔''

دعا مانگتے ہوئے ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا اور وہ تڑپ کر کہتیں ''اے میرے مولا! میری چھوٹی سی بیٹی اپنی کوتاہیوں کی سزا جھیل رہی ہے...... اس کو تو آسانیاں فراہم کرنا۔'' تب ان کی ہچکیاں بندھ جاتیں سجدے میں سر رکھے روئے چلی جاتیں۔

فریال کے جانے کے بعد سائرہ عجیب سائیکی سی ہو گئی تھی۔ خلاؤں میں دیکھتی تو دیکھتی رہ جاتی۔ بھائیوں بھابیوں سے بات چیت کرنا اس نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ ماں سے بھی کم کم ہی بات ہوتی۔ اسکول سے بھی لمبی چھٹی لی ہوئی تھی، جو اب بغیر تنخواہ کے چل رہی تھی۔ پرائیویٹ اسکول ہوتا تو کب کی خلاصی ہو چکی ہوتی۔ اس کا اسکول سرکاری تھا جو ابھی تک نوکری جمی ہوئی تھی۔

ہر وقت وہ اپنے کمرے میں رہتی، کسی کے سامنے کھانا تک نہ کھاتی...... اور کبھی یوں لگتا کہ وہ اپنے آپ سے بھی عاجز آ گئی ہو۔

شائستہ بیگم کو جب بھی موقع ملتا، اسے اپنے ساتھ کہیں نہ کہیں لے جاتیں، جس سے اس کی طبیعت قدرے بہل جاتی۔ پارک میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو دلچسپی سے دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔ ایک بیٹی نہ جانے کہاں تھی، جس کا کوئی اتا پتا تک ان کے پاس نہ تھا۔ شائستہ بیگم کا یہ دکھ وقت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ دوسری ان کے سامنے گھل گھل کر ختم ہو رہی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اب شائستہ بیگم کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ دونوں بیٹیوں کے دکھ ان کے سینے پر پہاڑ کی مانند کھڑے تھے۔

''امی، میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی نوکری سے استعفا دے دوں'' ایک دن سائرہ نے ماں سے کہا۔

''نہیں بیٹا! ایسا تو سوچنا بھی نہیں، اگر یہ جاب تم نے چھوڑ دی تو دوبارہ تو ملے گی بھی نہیں۔''

''اسکول کی ساتھی ٹیچرز کو نہ میں نے اپنی طلاق کا بتایا ہے اور نہ ہی فریال کی شادی کا۔ وہ ہر وقت یہی پوچھتی ہیں کہ تم اپنے گھر کب جاؤ گی۔ جاوید کے حوالے سے ان کے مذاق ایسے ہوتے ہیں کہ میرا سر پھٹنے لگتا ہے۔ میں انہیں کتنا ہی منع کروں، وہ باز ہی نہیں آتیں۔ اور جس دن میری اسکول میں طبیعت خراب ہوئی تھی، اس دن میں آپ کو بتاؤں......؟'' سائرہ نے کہا۔

''ہاں، کیا بات ہوئی تھی؟'' شائستہ بیگم نے بیٹی کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے اسکول کی دو ٹیچرز حج کرنے جا رہی تھیں۔ سب نے ان سے کہا، آپ سائرہ کے لیے خاص طور پر

دعا کیجیے گا کہ اس کی اپنے شوہر جاوید سے دوستی ہو جائے اور یہ اپنے گھر چلی جائے۔"

"بیٹا! تم اپنے اسٹاف کو بتا دو کہ تمہاری علیحدگی ہو گئی ہے۔ قصور ان کا نہیں ہے' وہ یہ سب تم سے ہمدردی میں کر رہی ہیں اور ان کی باتیں تمہارے لیے کسی تازیانے کا کام دے رہی ہیں۔"

"کیا میں ان کو یہ بتا دوں کہ میری چھوٹی بہن نے کورٹ میں شادی کر لی ہے؟" سائرہ کسی معصوم بچی کی طرح ان سے پوچھ رہی تھی۔

"فریال کا کوئی بھی ذکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے اور اگر کبھی کوئی پوچھے تو تم کہہ دینا ہماری نانی کے پاس راولپنڈی گئی ہوئی ہے۔"

"نانی تو انڈیا میں رہتی ہیں' راولپنڈی میں تو کوئی بھی نہیں رہتا" سائرہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اب کون تحقیقات کرنے جا رہا ہے' خود سے تم کچھ بھی نہ کہنا، اگر فریال کا ذکر آئے تو حتی المقدور ٹالنے کی کوشش کرنا اور جب کسی طرح خلاصی نہ ہو تو یہی کہہ دینا کہ فریال راولپنڈی میں نانی اماں کے پاس رہتی ہے اور وہاں اس کا بہت دل بھی لگ گیا ہے۔"

یہ جملے کہتے ہوئے شائستہ بیگم کی آنکھوں کے ساتھ لہجہ بھی بھرا سا گیا اور وہ پانی پینے کا بہانہ کر کے سائرہ کے پاس سے اٹھ گئیں کہ ان کو روتا دیکھ کر وہ ان سے زیادہ رویا کرتی تھی۔

☆☆☆

پنڈی میں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا مگر فریال کا دل بالکل بھی نہیں لگا تھا۔ عدیل جیسا نظر آتا تھا' حقیقت میں اس کے برعکس تھا...... لالچ اور کمینگی اس کی فطرت میں رچی بسی تھی۔

پتا نہیں کس طرح اس نے یہ جاب حاصل کر لی تھی ورنہ وہ اس کے بھی قطعی قابل نہ تھا۔ مسلسل سلائی کرتے کرتے فریال تھک سی گئی تھی اور اسے ایسا بخار چڑھا تھا جو اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"کیا بات ہے، بہت آرام کرنے لگی ہو؟ جب گھر آؤں بستر پر مری پڑی ملتی ہو' یہ مشین کیوں بند رہتی ہے؟ سجانے کے لیے تھوڑی آئی ہے۔ کام کیا کرو تاکہ پیسہ آئے۔ مگر تم تو نواب زادی بنی آرام کرتی رہتی ہو ہاں۔"

"طبیعت خرابی میں کام کیسے کروں؟ مسلسل کام کرتے کرتے تو یہ حال ہو گیا ہے۔" ایک دن فریال نے اس سے شکایت کی۔

"نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے' بیمار ہو یا صحت مند کام تو تمہیں کرنا پڑے گا۔ کام نہیں کرو گی تو یہ گھر کیسے چلے گا؟" عدیل نے بے پروائی سے کہا جیسے اس کی بیماری سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

"میں جو بھی کماتی ہوں' تم ایک ایک پیسہ مجھ سے چھین لیتے ہو' میرے پاس تو دوا کے پیسے تک نہیں ہیں" فریال کا لہجہ گلوگیر سا ہو گیا۔ اس وقت بھی اسے ایک سو چار کے قریب بخار تھا اور سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔

"اچھا...... اب الو کی پٹھی مجھ سے زبان بھی چلائے گی" عدیل اس کی چوٹی کھینچتا ہوا بولا "اے! اترائی کس بات پر ہے؟" اس نے دونوں شانے پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے کہا۔ "یہ کاروبار تیرے بھائیوں نے شروع نہیں کروایا۔ میں نے خود کیا ہے' اپنے تعلقات سے۔ بوتیک کی مالک سے آرڈر منگواتا ہوں تو اپنے تعلقات سے...... ورنہ تمہیں کون جانتا تھا' تمہیں کون دیتا یہ مشین...... ہاں؟"

"میں بیمار ہوں' اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔" فریال نے اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے بمشکل کہا۔

"اے...... یہ نخرے چھوڑ دے۔ یہ کام تو اب تیرے باپ کو بھی کرنا پڑے گا۔ مرد مگر مرنے سے پہلے کام کرتا

ہ۔ یہ فلیٹ تمہارے عیش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اور ایک بات میری غور سے سن لے...... اپنی اوقات یاد رکھ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی...... تو ہے کیا چیز؟ تیری تو یہ کاری گری تھی کہ مجھے پھانس لیا۔ میں نہ ملتا تو ں اور کو پھانس لیتی...... کہ کرنا تو یہی کچھ تھا۔ اب کام کرتے ہوئے موت کیوں آ رہی ہے؟"

"جب ہمت تھی تو کام کر لیتی تھی' اب بیماری میں خود چلا نہیں جا رہا...... مشین کیسے چلا سکتی ہوں؟" فریال نے بےبسی سے لہجے میں کہا۔

"بیماری میں حلق تو بند نہیں ہوا' تو کام کرنا کیوں بند کر دیا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے یا اپنی اوقات بھول گئی ہو۔ فریال بیگم! اب تمہاری حیثیت بے حد کمتر ہے۔ تمہارے گھر والے تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم ان کے لیے مر گئی ہو۔ میرا تو یہ احسان ہے کہ تم جیسی عورت کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے ورنہ مردے کو کون رکھتا ہے۔"

"خدا کے لیے عدیل! خاموش ہو جاؤ۔ مجھے اتنی بڑی سزا نہ دو...... جو تمہارے کہنے میں آ کر میں اٹھا رہی ہوں۔ دکھ اور ذلت جب ایک ساتھ گلے مل جائیں تو کلیجا پھٹتا ہی ہے۔"

"اچھا' اب میرے گھر میں بیٹھ کر مجھ پر آوازیں نکالو گی' مجھ پر چلاؤ گی...... دو کوڑی کی عورت! تو ہے کیا چیز' کس زعم پر یوں اچھلتی ہے" عدیل نے طیش میں آ کر ایک بھرپور زناٹے کا ہاتھ فریال کے چہرے پر جما دیا۔ اس کے چہرے پر اس کی انگلیوں کے نشان جیسے ثبت ہو گئے۔ عدیل تو ڈکارتا چلاتا باہر چلا گیا اور فریال اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔

عدیل کی شخصیت کے اس رخ کے بارے میں تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس سے سلائی کے پیسے لے کر خود عیش کر رہا تھا۔ وہ گھر میں کھانا تو کھاتا ہی نہیں تھا اور فریال اپنے لیے دال' دلیہ پکا کر گزارہ کر رہی تھی۔

صادقہ باجی جو اس علاقے کے ایک بڑے بوتیک کی مالکہ تھیں' انتہائی نیک فطرت خاتون تھیں۔ فریال ان کے بوتیک کے لیے جب سے کام کر رہی تھی' ان کے کلائنٹس کو اس کا کام بے حد پسند آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مہارت کے ساتھ صفائی بھی غضب کی تھی۔

صادقہ باجی جب فریال کی طبیعت پوچھنے آئیں تو اس وقت عدیل کے گرجنے برسنے کی آوازیں باہر آ رہی تھیں۔ وہ قصداً محلے میں کسی دوسرے گھر چلی گئیں' اس محلے میں ان کی کئی ورکرز رہتی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب صادقہ باجی' فریال کے پاس آئیں تو انہوں نے دیکھا' فریال نہ صرف بخار میں پھنک رہی تھی بلکہ عدیل کے تھپڑ سے اس کا منہ بھی سوجھا ہوا تھا۔ فریال انہیں دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ صادقہ باجی نے اسے قریبی ڈاکٹر سے دوا دلوائی اور سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو تم اپنی سلائی کے مجھ سے آدھے پیسے لیا کرنا' بقیہ آدھے پیسے میں اپنے پاس جمع کر لیا کروں گی کہ تمہارا شوہر اس قابل نہیں ہے کہ اس پر کلی بھروسا کیا جائے۔"

تب فریال نے اپنے اوپر بیتنے والی ہر بات انہیں کہہ سنائی۔

"ایسی بات ہے تو تم اپنی امی کو خط لکھ کر معافی مانگ لو۔ جیسا یہ شخص نظر آ رہا ہے' اس سے کوئی بعید نہیں ہے' تمہیں چھوڑ کر فرار ہو جائے یا تمہیں کسی اور قسم کا کوئی نقصان پہنچا دے۔ معافی مانگنے سے تمہیں اپنے گھر کا کوئی ٹھکانا تو مل جائے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں باجی! ذرا طبیعت سنبھلے تو میں امی کو ضرور خط لکھوں گی۔ اپنے بھائیوں سے

معافی مانگوں گی۔ یہاں تو میرا اب ایک لمحے کے لیے بھی رہنے کو دل نہیں کر رہا۔“

مگر فریال سے خط لکھا ہی نہیں گیا۔ اس کا بخار نمونیے میں تبدیل ہو گیا اور عدیل اسے چھوڑ کر پتا نہیں کہاں چلا گیا کہ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے ادھ موئی سی ہو گئی!

☆☆☆

موسم بھی بے کیف سا اور کچھ جمال کی طبیعت بھی پژمردہ سی تھی۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس سے بستر سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔

”بیٹا! کیا بات ہے‘ کالج نہیں جانا کیا؟“ اماں نے اسے دوسری بار جگاتے ہوئے کہا۔

”اماں! آج آپ کا چیک اپ کروا دیتا ہوں‘ آپ کو چکر بھی مسلسل آ رہے ہیں اور بلڈ پریشر بھی لو ہے اس لیے آج کالج سے چھٹی سمجھئے“ یہ کہہ کر وہ کروٹ بدل کر پھر لیٹ گیا۔

”بیٹا! ڈاکٹر ندا کا کلینک کون سی دور ہے‘ میں دن میں ربیع کے ساتھ چلی جاؤں گی‘ تم کیوں خواہ مخواہ چھٹی کر رہے ہو؟“

”مجھے پتا ہے‘ آپ ایسے ہی ٹالتی ہیں۔ گزشتہ دو ہفتوں میں آپ کتنی بار گئی ہیں۔ ایک بار بھی نہیں‘ آج میں چھٹی کروں گا تو آپ کو میرے ساتھ لازمی جانا پڑے گا۔“ جمال نے ماں سے ہنس کر کہا اور رضائی اپنے اوپر تان لی۔

”میں آج ضرور جاؤں گی‘ تم بے فکر رہو۔“

”پکی بات ہے ناں“ وہ بستر سے باہر نکلتا ہوا بولا۔ آج اماں کا لہجہ بھی وثوق بھرا تھا۔

”ہاں ہاں‘ پکی بات!“ انہیں ہنسی سی آ گئی۔

جمال کے کالج جانے کے بعد گھر کے کاموں کو بھگتا کر انہوں نے ربیع کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر ندا کے کلینک میں اپنا چیک اپ کروایا۔ بلڈ پریشر واقعی بے حد لو تھا۔ اسی کی وجہ سے انہیں چکر آ رہے تھے۔ جوڑوں کے درد کی ٹیبلٹ ڈاکٹر نے تبدیل کی۔

وہ دونوں ماں بیٹی واپس گھر پیدل ہی آ رہے تھے۔ گھر کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ تیز رفتار گاڑی سامنے سے ایسے آتی نظر آئی‘ جیسے اماں پر چڑھ جائے گی۔

ربیع نے تیزی سے اماں کو اپنی طرف کھینچا۔ اماں تو دوسری طرف آ گئی تھیں اور وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کو نہ جانے کیسی جلدی تھی کہ اس کے پیروں پر سے چڑھاتا وہ بھاگ گیا۔

اس کے دونوں پاؤں بری طرح کچل گئے تھے۔ ربیع اسی وقت بے ہوش ہو گئی۔ جمال کالج اور اماں بیمار...... وہ بدحواس سی ہو گئیں۔ ربیع کا خون کثرت سے بہہ گیا تھا۔ جب وہ اسپتال پہنچی تو ڈاکٹرز نے دونوں پیروں میں کمپاؤنڈ فریکچر بتایا تھا۔

پیروں پر پلاسٹر چڑھوا کر جب اماں گھر پہنچیں تو وہ اس سارے واقعے کا ذمے دار اپنے آپ کو ٹھہرا رہی تھیں۔ ڈرائیور کی بے پروائی اور عجلت نے ایک جوان چلتی پھرتی لڑکی کو یوں مریضوں کی طرح بستر پر ڈال دیا تھا۔ ربیع حراساں سی ہو گئی۔ ہوش آنے کے بعد اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی ماں کو کن الفاظ میں تسلی دے اور جمال کے سر پر تو جیسے آسمان گر پڑا تھا اور وہ اپنی بہن کی تیمارداری میں یوں جت گیا تھا جیسے وہ کوئی ننھی سی بچی ہو۔ نوالے تک اس کے منہ میں دے رہا تھا۔

”میری پیاری سی ربیع بہت جلد اچھی ہو جائے گی“ دوسرے کمرے میں وہ ماں کو تشفی دیتا ہوا کہہ رہا تھا۔ تب اس نے سوچا‘ میں تو بہار ہوتے ہوئے بھی خزاں جیسی ہو گئی۔ تب آنسوؤں کی بوچھاڑ چھپانے کے لیے اس نے ل منہ تک ڈال لیا۔

☆☆☆

یوں تو وہ کئی دنوں سے تاک میں تھی کہ کسی طرح کوئی موقع مل جائے تو وہ زیور کو اپنے بارے میں کچھ بتا سکے ابا جی کے ساتھ ساتھ امی کی نگرانی بھی ایسی کڑی تھی کہ وہ کچھ کر ہی نہیں پا رہی تھی اور پھر اسے یہ موقع خود ہی گیا۔ ابا جی کو اپنے کسی دوست کی عیادت کے لیے اچانک جانا پڑا اور امی کے پاس محلے کی ایک خاتون آ کر ئیں جو محلے کی رائی سے رتی تک کی خبر دینے کی عادی تھیں۔

نگین نے ابا جی کی الماری کو کھکھوڑا تو جلد ہی اپنا موبائل ڈھونڈ نکالا۔ فوراً ہی زیور کو رنگ کیا تو وہ اس کے بتائے غیر حاضری سے بے حد پریشان تھا۔

”کیا ہو گیا تمہیں‘ میں تو روزانہ تمہارے گھر کا چکر تک لگا کر جا تا رہا ہوں۔“

تب وہ ساری روداد اس کو بتاتی چلی گئی۔ اس کی ڈائری نے ان دونوں کے مابین تعلق کا ہر پردہ اٹھا دیا تھا۔

”اب تم ہاؤس اریسٹ ہو تو میں پولیس میں اطلاع دے دوں“ اس نے ہنس کر کہا۔

”ایسے حالات میں بھی تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟ زیور! مجھے نہیں لگتا کہ اب میں دوبارہ تمہیں فون بھی ملوں گی۔“

”پھر میں امی کو تمہارے ہاں بھجوا دوں؟“

”تمہاری امی کی مصروفیات‘ تھکن اور ڈیلنگ کے پروگرام ہی اتنے ہیں کہ تم ان کو کہاں بھیج پاؤ گے۔“

تب زیور یکدم خاموش ہو گیا۔

”میری آواز آ رہی ہے تمہیں......؟“

”ہاں......“ اس سے مختصر جواب شاید کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”زیور! شاید ہماری دوستی یہیں تک تھی۔ اب زندگی کا وہ موڑ آ رہا ہے کہ میں کسی دوسری سمت مڑ جاؤں گی دوسری طرف۔ تمہیں شاید کبھی یاد بھی نہ آئے کہ کوئی لڑکی تمہیں دل سے پسند کرنے لگی تھی۔“

”ہوں......“ وہ پھر ایک گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

”زیور‘ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں...... پلیز! کچھ تو بولو......“

”میں کیا بولوں......؟“ وہ کھسیائی ہوئی ہنسی ہنس دیا۔ ”نگین! میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے‘ مجھے معلوم تم میری بات کا یقین نہیں کرو گی مگر یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور اس وقت میرا تمہاری باتیں سن کر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ مجھے کیا کہنا چاہیے‘ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کچھ نہیں مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم مجھے کبھی بے وفا نہ سمجھنا۔“

”ے میرے باوفا محبوب! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی“ اس نے تلخی سے سوچا اور تمسخر سے ہنس دی۔

”اے...... ہنس کیوں رہی ہو؟“

”بات ختم...... کھیل ختم...... ہنسی تو آئے گی ناں......“ وہ غصے سے بولی۔

وہ خواب جس کے رنگ وقت کے ساتھ پھیکے پڑ گئے تھے‘ ان لمحات میں وہ اسے حقیقت بنتا نظر آ رہا تھا۔

’’نگین بیٹا! آنٹی کے لیے چائے تو لاؤ‘‘ فیروزہ بیگم نے ڈرائنگ روم سے اسے آواز لگائی۔

’’اچھا زیور! ...... خدا حافظ! ...... شاید میں اب تم سے کبھی رابطہ نہ کرسکوں‘‘ یہ جملے کہتے ہوئے اس کا لہ مایوس سا تھا۔ اور جواب میں زیور سے کچھ بھی کہا نہ گیا۔ نہ آس، نہ نراش۔ کوئی بھی لفظ اس کو سنائی نہیں دیا۔

تب اس نے موبائل بند کرکے اسی جگہ رکھ دیا جہاں اباجی نے اسے چھپا کر رکھا تھا۔ چائے بناتے ہو اس کی آنکھوں میں آنسو بے اختیار آرہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ نہ اب وہ زیور کو دیکھ سکے گی اور نہ کبھی اس ک آواز سن سکے گی۔

اس کو یہ بھی یقین تھا کہ زیور کی ممی اس کے رشتے کے سلسلے میں اس کے گھر کبھی نہیں آئیں گی۔ زیور کی تما باتیں اس کو فراڈ معلوم ہورہی تھیں۔ امی کو چائے دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آج کالج چھوڑ ہوئے اسے پندرہ دن سے زائد ہوگئے تھے۔ کسی دوست سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

زیور کا خیال اس کے دل میں بار بار آرہا تھا مگر وہ اسے پیچھے دھکیلے جارہی تھی۔

’’تمہارے اباجی تو شام کو واپس آئیں گے۔ بارہ بج گئے، تم نے ابھی تک دوپہر کے لیے کچھ چڑھایا نہیں محلے کی خاتون گئیں تو امی اس کے سر پر کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

’’آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ رات کا سالن رکھا ہے، آپ وہ کھا لیجیے گا۔‘‘

’’پھر بھی کچھ نہ کچھ تو پکاؤ بیٹا! تمہارے اباجی اگر جلدی آگئے تو انہیں تازہ سالن ملنا چاہیے ناں۔‘‘

’’میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا پکاؤں ...... آپ ہی بتادیں۔‘‘

’’اچھا یوں کرو دوپہر کے لیے مٹر چاول بنالو اور شام کے لیے آلو گوشت کا سالن بنا کر رکھ دو۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘‘ وہ چپ چاپ آنگن میں بچھے تخت پر آکر چاول بیننے لگی۔ دروازے پر بیل ہوئی تو فیروزہ بیگم گئیں۔

’’آپ کون ......؟‘‘ اجنبی خاتون کو دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گئیں۔

’’میں زیور کی ممی ہوں۔‘‘ آنے والی خاتون نے اپنا تعارف کرایا۔ فیروزہ بیگم نے ایک نظر انہیں دوسری نظ پاس کھڑے لڑکے پر ڈالی جن کی شکلوں سے امارت کا اظہار ہورہا تھا اور یوں بھی ڈائری میں پڑھا نام زیور انہیں رٹ گیا تھا۔

’’جی فرمایئے؟‘‘ وہ ان کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھیں۔ جیسے سوچ رہی ہوں کہ انہیں باہر سے ہی فار کردیا جائے۔

’’کیا آپ مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟‘‘ خاتون انتہائی شائستہ لہجے میں بولیں۔

’’جی آیئے!‘‘ فیروزہ بیگم نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

نگین نے اپنے خیالوں سے نکل کر دروازے کی سمت جو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ زیور اپنی آنکھوں میں ایک فاتحانہ سی چمک لیے اپنی ممی کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہورہا تھا۔

نگین حیرت سے ہکا بکا تھی۔ وہ ہاتھ میں چھری اور پیاز لیے یوں ساکت سی بیٹھی تھی جیسے اسی حالت میں فریز ہوگئی ہو۔ زیور نگین کو کانی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اندر کمرے میں ماں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اور جب اسے حقیقت کا احساس ہوا تو فوراً باورچی خانے میں بھاگی۔

جھٹ پٹ کیتلی میں چائے دم کی، فریزر سے کباب نکال کرلیا جھپ تلے۔ امی نے جو چاولوں میں ڈالنے کے لیے مٹر چھیل کر رکھی تھی وہ تیزی سے تلی اور شکر قندی جو کھیر کے لیے ابل رہی تھی اس کی منٹوں میں چاٹ بنا کر کسی بوتل کے جن کی طرح ٹرالی سجا کر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

فیروزہ بیگم اس وقت ان سے کہہ رہی تھیں ’’مجھے نہیں معلوم کہ نگین کے والد زیور کا رشتہ قبول کریں گے یا نہیں مگر بہر حال میں ان سے اس کا ذکر ضرور کروں گی۔‘‘

’’رشتے ناتے طے کرتے وقت اگر ہم اپنے بچوں کی پسند کا بھی خیال رکھ لیں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے اور مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ یہ میرے زیور کی پسند ہے۔‘‘ مسز شاہ اپنے دیر سے آنے کی مختلف تاویلیں بیان کررہی تھیں اور فیروزہ بیگم کھسیائے ہوئے انداز میں ان کی ہر بات سننے پر مجبور تھیں۔

’’اگر آپ اجازت دیں تو میں نگین کو یہ انگوٹھی پہنا سکتی ہوں۔‘‘ انہوں نے اپنے پرس سے ہیرے کی جھلمل کرتی ایک انگوٹھی نکال کر فیروزہ بیگم کی طرف دیکھا۔

فیروزہ بیگم کا دل چاہا کہ ان سے فوراً یہ کہہ دیں۔ ’’ہاں ہاں، پہنا دیں ...... دیر کس بات کی ہے۔ مجھے بھی زیور بہت اچھا لگا ہے‘‘ مگر اپنے شوہر کے مزاج سے واقف تھیں اس لیے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’نہیں، ابھی آپ اتنی جلدی نہ کریں۔ میں ان کے والد سے مشورہ کرکے آپ کو بتاؤں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ہم آپ کے فون کے منتظر رہیں گے۔‘‘ نگین کو یہ سب اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ پریشان کن خواب کی برف از خود کھل گئی تھی۔ زیور کی ممی نے اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا تھا اور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے باتیں کررہی تھیں۔

زیور بھی اسے چوری چوری پر محبت نظروں سے تکے چلا جارہا تھا۔

فیروزہ بیگم کو بھی مسز شاہ اور زیور دونوں ہی پسند آئے تھے۔ کافی دیر تک وہ ماں بیٹا ان کے گھر رہے، چلتے وقت زیور کی ممی نے نگین کو اپنے گلے سے لگا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ فیروزہ بیگم سے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئی تھیں۔

زیور نے چلتے وقت اسے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا، جس میں اپنی فتح مندی کا احساس نمایاں تھا۔

’’لگ تو اچھے لوگ رہے ہیں۔ اب دیکھو تمہارے اباجی کیا کہتے ہیں؟‘‘ فیروزہ بیگم گیٹ بند کرکے آئیں تو اپنے آپ سے کہہ رہی تھیں۔

’’اچھے لوگ سب کو اچھے ہی لگتے ہیں، آپ دیکھیے گا ...... اباجی کو بھی پسند آئیں گے۔ نگین نے وثوق بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

’’اگر ایسا ہوجائے تو اچھی بات ہے‘‘ فیروزہ بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

’’ایسا ہی ہوگا‘‘ آپ دیکھ لیجیے گا۔‘‘ نگین نے ہنس کر کہا اور چاول کی پرات لے کر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

فہمی پریشان تھی کہ گھر کے فون کے ساتھ ساتھ اباجی اور نگین کے موبائل یکدم کیوں بند ہوگئے۔ اسی طرح جب کئی دن ہوگئے تو وہ گھر آگئی۔ یوں بھی ان دنوں اس کے اسکول میں موسم سرما کی تعطیلات تھیں۔

’’امی! اگر گھر کے فون خراب تھے تو آپ کیا مجھ سے باہر کہیں سے رابطہ نہیں کرسکتی تھیں؟‘‘ اس نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔

’’رابطہ کرکے کیا کرتی؟‘‘ ماں نے کہا۔

"مجھے تسلی تو ہو جاتی کم از کم کہ فون خراب ہیں۔"

"یہاں حالات خراب تھے اس لیے قصداً فون بند کر دیے گئے تھے۔ اب یہ باتیں میں تمہیں باہر سے جا کر کیا بتاتی' کوئی اچھی باتیں تو تھیں نہیں' جن کو سن کر تم خوش ہوتیں۔"

"میں سمجھی نہیں امی!"

تب فیروزہ بیگم نے نگین کی ڈائری سے پڑھنے والی تمام باتوں کا احوال اسے کہہ سنایا۔ "یہ تو بہت بری حرکت کی نگین نے۔ فریال سے اس کی دوستی تھی' کچھ نہ کچھ اثر تو اس پر پڑنا ہی تھا ناں۔ دوست خواہ کیسے بھی ہوں مگر لڑکیوں کو اپنے اچھے بھلے کی تمیز تو ہونی چاہیے...... ہر گرلز کالج کے باہر لڑکوں کا جم غفیر ہوتا ہے...... اور یہ لڑکے بہکانے کے لیے ہی کھڑے ہوتے ہیں۔"

یہ تو اتفاق ہے کہ زیور کا تعلق ایک اچھی فیملی سے ہے۔ جب اس کی ماں کو پتا چلا تو وہ زیور کا رشتہ لے کر آ گئیں ورنہ زیادہ تر لڑکے تو اس نہج پر آ کر غائب ہو جاتے ہیں مگر زیور نے ایسا نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی ماں کو لے آیا رشتے سمیت۔"

"امی اس میں زیور کا قصور نہیں ہے بلکہ نگین کا ہے، اگر وہ اسے لفٹ نہ دیتی تو وہ اسے اپنے ساتھ زبردستی تو کہیں نہیں لے جا سکتا تھا۔"

"اسی بات کا تو تمہارے ابا جی کو غصہ ہے" فیروزہ بیگم فہمی کو ان کے ابا جی کے بارے میں بتانے لگیں۔ "کتنے گلاس اور کتنی پلیٹیں' انہوں نے غصے میں آ کر دیوار پر دے ماری تھیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس رشتے کا ذکر تمہارے ابا جی سے کیونکر کروں؟"

"آپ ان صاحبہ کو کسی بھی طرح ٹال دیں' ابا جی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے" فہمی نے ماں کے پاس جگہ بناتے ہوئے لیٹتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بہن کی آنکھوں میں زیور کو دیکھ کر جو ہیرے چمکنے لگے تھے' اس کا کیا کروں؟ پھر نہ لڑکا برا ہے اور نہ ہی فیملی۔" فیروزہ عجیب تذبذب کا شکار ہو گئی تھیں۔

"امی! آپ یہ بات بھی تو سوچیے' اگر یہ رشتہ قبول کر لیا جائے تو زیور کی ماں نگین کی وہ عزت نہیں کر سکیں گی جو انہیں اپنی بہو کی کرنی چاہیے تھی۔"

"بیٹا! یہ تو بعد کی باتیں ہیں' مجھے تو تمہارے ابا جی کے مزاج سے خوف آتا ہے کہ کہیں مجھے یہ طعنے نہ ملیں کہ تمہاری بیٹی نے جو اپنے لیے بر ڈھونڈا تھا' تم بھی اسی سے بیاہنے کو تیار ہو گئیں۔ تمہاری بیٹی نے بڑی خوبی کا کام کیا تھا' جس نے تمہارا کام بھی ہلکا کر دیا۔"

"امی' آپ تو ناحق اپنے آپ کو پریشان کر رہی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ پسند کی شادی کوئی بری بات نہیں ہے مگر اپنی پسند کو سڑکوں اور پارکوں تک پھیلانا غلط ہے۔ اگر زیور کو نگین پسند آ ہی گئی تھی تو اس کو پہلے اپنی می سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔"

"ٹی وی کے ڈراموں اور فلموں میں تو ہیرو خود رابطے کرتے ہیں تو وہ کیسے پیچھے رہ جاتا" فیروزہ بیگم نے تلخی ے کہا مگر فہمی کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

"میڈیا سے بچنا یا بچانا...... واقعی کوئی آسان کام تھوڑی ہے۔"

☆☆☆

عظمت بیگم کی بات اپنے بھائی رشید سے ہو گئی تھی۔ خط میں لکھے گئے' ان کے نمبر پر فون کیا تھا تو انہوں نے فوراً ہی ریسیو کیا تھا۔ اس دن ان کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔

"بھائی! ایسی کیا بیماری آ گئی جو تم امید کا دامن چھوڑ بیٹھے ہو۔"

"بیماری نہیں' بیماریوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے' صرف ایک ہاتھ تھوڑا سا کام کرتا ہے۔ دوسرا ہاتھ وں بے جان ہے جیسے وہ میرے جسم کا حصہ ہی نہ ہو۔ ٹانگیں میری جواب دے گئی ہیں۔ وہیل چیئر پر ایک ے سے دوسرے کمرے میں جاتا ہوں۔ دس گھنٹے روزانہ کے لیے ایک ملازم بھی رکھا ہوا ہے جو میرے ارے کام کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے پرہیزی کھانا بنا کر کھلا کر جاتا ہے۔"

"کاش! میں پہلے رابطہ کر لیتا تو تم سب لوگوں کو ایک بار دیکھ بھی لیتا مگر اب میرے پاس شاید ٹائم کم ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ بہت جلد میرے جسم کا بالائی حصہ بھی مفلوج ہو جائے گا۔ مذہب سے ساری زندگی دور رہا' نماز پڑھنے کا بھی وقت ہی نہیں ملا۔ قرآن پاک کبھی کھول کر نہیں دیکھا۔ حج اور عمرے کے لیے کبھی دل میں لپک پیدا نہیں ہوئی۔ ورلڈ ٹور کرتا رہا مگر جہاں جانا چاہیے تھا' وہاں جا نہیں پایا۔ یا مجھ جیسے گناہگار اور نافرمان کو میرے رب نے اپنے پاس آنے نہیں دیا۔ اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جن کی تعداد یقیناً کروڑوں میں ہو گی جو صاحب حیثیت بھی ہوں گے مگر وہ اس لحاظ سے بدقسمت ہوں گے کہ انہوں نے نہ کبھی حج کیا ہو گا اور نہ عمرہ...... اور نہ ہی ان کا دل چاہا ہو گا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں' جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی...... خالی ہاتھ رہا۔"

"اللہ میرے بھائی کو لمبی حیاتی دے۔ انشاء اللہ تم عمرہ بھی کرو گے اور حج بھی...... کیسے کیسے معذور لوگوں کو اللہ بلاتا ہے۔ اس میں اور ہم انسانوں میں یہی تو واضح فرق ہے کہ وہ توبہ پسند کرتا ہے' توبہ قبول کرتا ہے اور معاف کر دیتا ہے۔ معافی مانگنے والوں سے وہ خوش ہوتا ہے اور انہیں خوب نوازتا ہے۔ رشید بھائی! تم اللہ سے معافی مانگو اور اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دو...... دیکھ لینا' اللہ تعالیٰ تمہیں صحت بھی دے گا اور دیگر تمام معاملات میں بھی بہتری دے گا۔ بیوی بھی تمہاری واپس آ جائے گی اور بچے بھی۔"

"عظمت آپا! تمہاری باتیں سن کر دل کو ایک عجیب سی طمانیت ہو رہی ہے اور ایک سرور سا محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ رہی بیوی کی واپسی کی بات تو اس کے آنے کی نہ کوئی تمنا ہے اور نہ ہی کوئی ایسی خواہش مگر کاش' میرے بچے واپس آ جائیں۔ بے شک وہ میرے پاس نہ رہیں مگر اپنی شکل مجھے دکھا دیں۔ یہ محل جیسا گھر جو کئی برسوں میں' میں سجا سکا تھا' میں نے اپنے دونوں بیٹوں جیک اور میک کے نام کر دیا ہے۔ شاید زندگی کے کسی دور میں واپس آ جائیں اور بقیہ رقم' جس کا تذکرہ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا' وہ نگین اور شجاع کو شادی ہونے کی صورت میں ان دونوں کو مل جائے گی۔"

"مجھے تو نگین ویسے بھی بہت پسند ہے اور اب تمہارا بھی اصرار ہے' اس سلسلے میں' میں بہت جلد فرید بھائی کے پاس جاؤں گی۔"

"اچھا آپا! اب تم لوگ رابطے میں رہنا اور مجھے خط بھی لکھتے رہنا۔ اب میں ہر چھوٹی سی بات سے خوشیاں کشید کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی کو بیکار گنوانے کا افسوس ہے۔ کاش کوئی کبھی پیسے کے پیچھے نہ بھاگے۔ یہ پیسہ انسان کو پاگل بنا کر رکھ دیتا ہے۔"

"آپ نے فرید بھائی کو خط لکھ دیا تھا کیا؟" فرحت کے اشارے کرنے پر عظمت نے بھائی رشید سے

پوچھا۔

''ہاں' لکھ تو دیا ہے مگر ابھی پوسٹ نہیں کر سکا ہوں۔ پچھلے دنوں طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ خیر آج ہی اس خط کو پوسٹ کرواتا ہوں۔''

''میں بتا دوں گی فرید کو۔''

''تم ضرور بتا دینا...... ویسے انہیں بھی میرا خط جلد ہی مل جائے گا۔''

عظمت بیگم نے بھائی فرید کو کئی بار فون کرنے کی کوشش کی مگر فون ہی مل کر نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں ان کے فون میں ایسی کیا گڑبڑ ہو گئی ہے جو ٹھیک ہی نہیں ہو رہی۔ وہ پریشان سی ہو گئیں۔

☆☆☆

اپنی سسرال میں ہونے والی تقریبات سے نمٹ کر فرح کی بہن آ گئی تھی اور فرح نے اپنے اوپر بیت جانے والی اس آفت سے اسے فوراً ہی باخبر کر دیا تھا۔

''تو ہمیشہ کی جھلی ہے...... بات کچھ ہو گی اور سمجھی کچھ اور ہو گی۔''

''نہیں آپا! یہی بات ہے' انہوں نے باتوں باتوں میں صاف منع کر دیا ہے کہ شجاع کے لیے آس لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''باتوں باتوں میں منع کیا ہے۔ صاف جواب تو نہیں دیا...... اور تجھے اتنی عقل کہاں سے آ گئی جو باتوں میں سے سوال و جواب بھی تیری عقل میں آنے لگے۔'' آپا نے خوب اس کا مذاق اڑایا۔

''تو پریشان مت ہو' میں خود فرحت آپا کے پاس جاؤں گی اور کھل کر بات کروں گی۔''

''ٹھیک ہے'' فرح نے پھر آس کا دامن پکڑ لیا۔

''کب جاؤ گی آپا تم......؟'' فرح نے بے صبری سے پوچھا۔

''ایک دو دن میں چکر لگاؤں گی۔''

''آپا' تم ابھی نہیں جا سکتیں کیا؟'' فرح کے دل کا حال کسی بے بس پرندے کی طرح تھا۔

''پاگل ہوئی ہے کیا' اس وقت رات کے دو بجے کسی کے ہاں جانے کا ٹائم ہوتا ہے کیا۔ تو بے فکر رہ' میں کل صبح ہی ناشتے سے فارغ ہو کر ان کے ہاں جاتی ہوں۔ جو بات ان کے گھر میں سب کے چہروں پر لکھی تھی' وہ اتنی جلدی مٹ کیسے سکتی ہے۔''

''شجاع کی شادی کا ابھی ہم نے سوچا بھی نہیں ہے کہ کب ہو گی۔ ایک ہی تو ہمارا بھائی ہے، اچھی طرح سوچ بچار کر طے کریں گے اور پھر ابھی اس کی ایسی عمر کہاں آ گئی جو ہم پریشان ہوں۔ جب وقت آئے گا تو ہو جائے گی۔''

فرحت نے صبح صبح فرح کی آپا کو اپنے گھر میں بلا جواز اور بیکار کی باتیں کرتے دیکھا تو انہوں نے از خود اسے سنا ڈالا (کہ اس سے پہلے تم اس موضوع پر آؤ' ہم خود ہی بتا دیتے ہیں کہ ہمارے کیا عزائم ہیں)

مگر وہ بھی ایک سیانی' لفظوں سے کھیلنا بھی خوب جانتی تھی۔ ''ایک بھائی ہو تو بہنوں کے دل میں ڈھیروں ڈھیر ارمان ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے منگنی پھر نکاح کرنے کو دل چاہتا ہے۔''

''ہاں ہوتے ہیں مگر ابھی ہماری کزن پڑھ رہی ہے، جہاں ہمارا ارادہ ہے'' فرحت نے بڑی بے رحمی سے ان کے دل پر چرکا لگایا۔

''کیا آپ شجاع کی شادی گھر میں ہی کرنا تو نہیں چاہتیں؟''

''ظاہر ہے' گھر میں ہی کریں گے اور گھر میں ہی کرنا چاہیے۔ ایک ہی تو میرا بھائی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اس کے لیے ادھر ادھر دیکھیں۔''

''کیا شجاع بھی یہی چاہتا ہے؟'' فرح کی بہن بھی کم نہیں تھی۔ شجاع کے خط ایک دو تو اس نے بھی پڑھے تھے۔

''شجاع کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو امی کریں گی وہی ہو گا اور شجاع بھائی بھی وہی مانے گا جو گھر والوں کی رضا ہو گی۔''

''فرح کا رشتہ آیا ہوا ہے' اشرف کا......'' اب فرح کی آپا کھل کھلا کر اپنے موضوع پر آ گئی تھی۔

''ہاں' سنا تو میں نے بھی ہے' ہر لحاظ سے اچھا لڑکا ہے۔ اپنے محلے کا بھی ہے، دیکھا بھالا ہے۔ تمہاری اماں کو تو فوراً رشتہ قبول کر لینا چاہیے۔''

''آپ کو اور خالہ جی کو ہماری فرح بہت پسند تھی' ناں' میں نے سوچا پہلے آپ لوگوں سے بھی پوچھ لیا جائے ورنہ کہیں آپ بعد میں شکایت کریں کہ فرح پر حق ہمارا پہلے تھا۔'' یہ آخری پانسا تھا جو فرح کی بہن نے شجاع کی آپا کی بساط پر پھینک ڈالا۔

''فرح ہمیں پسند تھی اور پسندیدہ رہے گی کہ وہ ہے ہی بہت اچھی...... مگر اشرف بہت اچھا لڑکا ہے' آج کل ایسے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ تمہاری اماں کو چاہیے فرح کے لیے یہ رشتہ فوراً قبول کر لیں۔ شجاع کی تو اول ابھی شادی نہیں ہو رہی اور جب ہو گی تو گھر میں ہی ہو گی۔ ہاں...... گھر میں کوئی اچھی لڑکی نہ ہوتی تو یقیناً ہم فرح کے علاوہ کسی کے بارے میں نہ سوچتے...... وہ تو ہم سب کو اچھی لگتی ہے۔''

تب فرح کی بہن چپ چاپ واپس چلی گئی۔

☆☆☆

شجاع کی بے کلی بڑھ گئی تھی۔ وہ فرح کے بارے میں جتنا سوچتا...... مایوسی کے سانپ پھنکاریں سی مارتے۔ ماموں رشید کے خط اور پھر فون پر بات ہونے سے ماں اور بہن کے خیالات یکسر بدل گئے تھے۔ وہ دونوں واپس جانے کے پروگرام بنا رہی تھیں' ان کا خیال تھا کہ بس جلدی سے شجاع اور نگین کی شادی کر کے امریکا اطلاع دے دی جائے تاکہ وہ خوش ہو کر شاید ایک چوتھائی رقم اپنے ہاتھ سے ہی دولہا دلہن کے لیے بھجوا دیں۔

شجاع اپنا اٹیچی کیس کھولتا تو اس میں رکھی چوڑیاں' پازیب اور بوتیک کے سوٹ نظر آتے جو اس نے فرح کے لیے بڑی چاہت سے خریدے تھے۔

''اگر میں یونہی خاموش رہا تو فرح کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا' مجھے فرح کو ہر صورت حاصل کرنا ہے۔'' یہ سوچ کر اس نے ماں کے نام ایک رقعہ لکھا اور بیگ میں دو جوڑے ڈال کر اپنے دوست صابر کے پاس پنڈی جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بس فراٹے سے پنڈی کی طرف گامزن تھی۔ اور ادھر گھر میں عظمت بیگم شجاع کے جانے سے بے خبر کراچی جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

☆☆☆

کسی کو سمجھنا اور پہچاننا کتنا مشکل کام ہے۔ اوکھی باتیں بھی سیدھی لگنے لگتی ہیں۔

زبور...... لفظ سلجھانے بیٹھا تو گھنٹے پل بھر میں بیت گئے اور اس ذرا سے عرصے نے صدیوں کا سفر طے کر لیا۔

واہمے' شکوک اور حقیقت ایک دوسرے کے سنگ سنگ بن کر اسے لہولہان کرنے لگے۔ تب زندگی نقطے سے

پھیل کر کائنات بن گئی۔

زیور اور عدیل کی کلاس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نہ دونوں کی بچپن کی یاری تھی اور نہ ہی آپس میں کو رشتے داری۔ عدیل سے اس کا ناتا اتفاقی طور پر جڑ گیا تھا۔

ایک مرتبہ وہ گاڑی میں رات گئے کسی تقریب سے لوٹ رہا تھا تو کسی اچکے نے گن پوائنٹ پر اس کا موبائل اور پرس چھینا۔ عدیل بھی وہیں قریب کھڑا تھا اور یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایسے مواقع پر کوئی بھی کسی کے معاملے میں بولا نہیں کرتا ہے مگر عدیل نے کراٹے کے دو ہاتھ اس اچکے پر لگائے اور وہ اپنا نقلی پستول چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ زیور یہ دیکھ کر عدیل کا ممنون و مشکور ہو گیا اور پھر دوسری مرتبہ اس سے عدیل اس وقت آ ٹکرایا جب اس کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی اور وہ کسی مکینک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ عدیل نے اسے یوں پریشان سا دیکھا تو فوراً پاس آیا اور کسی ماہر کاریگر کی طرح اس کی گاڑی منٹوں میں ٹھیک کر دی تھی...... اور زیور اس کا احسان مند سا ہو گیا تھا...... شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی زبان نہیں رک رہی تھی۔

“یار، تم بار بار مجھ سے ٹکرا رہے ہو...... تو کیوں نہ ہم دوست بن جائیں...... گو میں تمہاری طرح امیر کبیر نہیں ہوں مگر دوستی میں تو ان باتوں کو نہیں دیکھا جاتا......” یہ بات عدیل نے بڑے جذباتی انداز میں کہی تھی اور زیور نے بے ساختہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اپنے گلے سے بھی لگا لیا تھا۔

زیور کو یہ مطلق احساس نہیں تھا کہ زیور اس پر کئی ماہ سے ورک کر رہا تھا۔ وہ اچکا اس کا اپنا دوست تھا جو دو طمانچے کھا کر اڑن چھو ہو گیا تھا۔ اسی طرح گاڑی کا وائر اس نے خود نکالا تھا، جب زیور “مال” میں گھوم رہا تھا اور پھر وہی ہوا جو عدیل چاہتا تھا۔

زیور دوست بن کر عدیل پر چھنا چھن خرچ کرتا۔ شرٹس، گھڑیاں، پرفیوم...... اس کو تحفے میں دیتا، مانگنے پر گاڑی بھی دے دیتا۔ ادھار پیسے بھی دے دیتا، جس کی ادائیگی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

جب عدیل نے دیکھا کہ وہ بالکل ہی سیدھا سادا سا ہے، مکاری اور چلتر پن اس میں نہیں ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گرلز کالج کے سامنے کھڑا ہونے لگا۔ زیور تو اتنا سیدھا تھا کہ وہ عدیل کو اس اچکے کے ساتھ بائیک پر ایک ساتھ جاتے دیکھ کر بھی نہیں پہچان پایا تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کوئی اس نہج پر بھی اسے بے وقوف بنا سکتا ہے۔

وہ تو بس نگین کو دیکھا کرتا تھا...... وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے یوں لگا کرتی تھی جیسے وہ اڑتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔ ایک دن گرلز کالج کے سامنے وہ کھڑا تھا، عدیل اس کے پرس سے پانچ سو کا نوٹ فنکاری سے نکال کر فریال کے ساتھ کیفے جا چکا تھا اور وہ خاموش سا اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے نگین کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ نکلی اور تیزی سے گزری۔ زیور کو قطعی نظر انداز کر کے وہ مزید تیزی سے گزری۔

کاش...... تم ایک لمحے کے لیے میرے سامنے رک جاؤ...... زیور نے دعا مانگی۔ نگین کے پیر میں کوئی پتھر لگا، وہ جھکی اور زیور کو یوں لگا جیسے ساری کائنات ڈول گئی ہو۔ وہ جھک کر پھر سیدھی ہو کر پھر اڑتی ہوئی چلی گئی مگر زیور کو اپنا آپ سنبھالا نہیں گیا۔

اور جب وہ نگین سے دوستی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سب کو بھول بیٹھا۔

اور پھر ایک دن اسی اچکے نے پاس آ کر کہا۔ “تم جس عدیل کو اپنا دوست سمجھ رہے ہو وہ دوست نہیں ہے۔ تمہیں لوٹ رہا ہے۔ مجھے مارنے کے اس نے پانچ سو روپے دیے تھے اور پلان بھی خود بنایا تھا” مگر زیور کو ان

باتوں کی جانب سوچنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

“جاؤ جاؤ، بیکار کی باتیں مت کرو” اس نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا...... مگر آج اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔

نگین کا اس کی جانب راغب نہ ہونا اور پھر کتنی کاوشوں سے وہ اس کی محبت پر ایمان لائی تھی اور اب اسے امید کے بعد پھر نا امیدی سی ہونے لگی تھی۔ فیروزہ بیگم نے اس کی ممی کو کوئی فون ہی نہیں کیا تھا۔

اور جب اس کی ممی نے دوسری مرتبہ جا کر یاد دہانی کرائی تو انہوں نے یہی بتایا کہ ابھی وہ نگین کے والد سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کر سکی ہیں۔

“بہن! آپ کو تو یہ بات اپنے شوہر سے فوراً کرنی چاہیے تھی۔”

“اگر یہ لوگ اس طرح گھومنے پھرنے کے بجائے صحیح راستہ اپناتے تو شاید مجھے بھی کوئی دشواری نہ ہوتی۔”

“میں یہ مانتی ہوں کہ نگین اور زیور دونوں سے غلطی ہوئی ہے مگر اس غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دیں” زیور کی ممی نے انہیں رسان سے سمجھایا۔

“ٹھیک ہے، میں اپنے شوہر سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گی۔”

“مگر کب تک بتائیں گی؟” زیور کا پژمردہ چہرہ انہیں بھی پریشان کیے دے رہا تھا۔

“آپ بے فکر رہیں، میں بہت جلد آپ سے رابطہ کرتی ہوں۔” فیروزہ بیگم نے اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

پوسٹ مین نے جب بیل بجا کر خط دیا، تو اس وقت گھر میں ثریا ہی تھیں۔ شائستہ بیگم سائرہ کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں اور صابرہ حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے اپنے بھائی سے ملنے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

“یہ کس کا خط آ گیا؟” ثریا نے حیرت سے خط کو دیکھا۔ اوپر شائستہ بیگم جلی حرفوں میں تحریر تھا۔ اس نے لفافہ پلٹ کر دیکھا، پیچھے فریال لکھا ہوا تھا۔

“اچھا، اب ان کمینی بیگم کو بھی رابطے کی ضرورت پیش آ گئی۔” بڑبڑاتے ہوئے فوراً لفافہ پھاڑ کر خط پڑھا۔ جوں جوں خط پڑھ رہی تھیں، ان کا غصہ سوا نیزے سے بلند ہو رہا تھا۔

یہ غصہ انہیں عدیل کے بجائے فریال پر تھا۔ اس نے ایسے سحر انگیز انداز میں خط لکھا تھا جسے اس کے بھائی پڑھ لیتے تو اسی لمحے اسے لینے کے لیے بھاگتے۔

وہ کچھ دنوں سے دیکھ رہی تھیں کہ شاہنواز ڈھکے چھپے انداز میں فریال کو یاد کر رہے تھے، گاہے بہ گاہے وہ فریال کا ذکر از خود کرنے لگے تھے۔ اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز لاتے تو انہیں فریال یاد آنے لگتی۔ پاس تھی تو اتنا خیال نہیں آتا تھا جتنا اس کے جانے کے بعد انہیں آنے لگا تھا۔

اب یہ خط پڑھ کر ان کے پتنگے ہی لگ گئے۔ عدیل اگر اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا تو وہ کیا کریں؟ یہ تو معلوم ہی تھا کہ ایسے رشتے پائیدار نہیں ہوتے ہیں مگر اس کا مطلب قطعی یہ نہیں تھا کہ بھاگ کر بھائی جاتے اور بہن کو تسلی دلاسے دلاتے ہوئے بھاوجوں کے سر پر لا بٹھاتے۔

“اونہہ! اتنی مصیبت سے ایک بلا میرے گھر سے نکلی، اب اس کو دھوم دھام سے پھر خوش آمدید کہوں” اس نے برا سا منہ بنایا “پیٹ میں اگر کوئی بچہ لے کر بیٹھی ہو تو اس کو بھی پالوں” (پریشانیوں نے سر اٹھایا) میری تو

زندگی انہی کاموں کی رہ گئی کہ سسرال والوں کی چالوں سے بچوں' ان کا مقابلہ کروں اور پھر ان کی آل اولاد کی خدمتیں کر کے اپنا وقت گزاروں۔ اس سے اچھا یہ نہ ہو کہ میں یہ خط ہی پھاڑ کر نیست و نابود کر دوں۔

ثریا نے اسی وقت خط کے پرزے پرزے کیے اور دروازہ کھول کر باہر ہوا میں اڑا دیے۔ ''اب کیسے آؤ گی' فریال تم......'' دروازہ بند کر کے اس نے مسکرا کر سوچا ''تم اپنے آپ کو عقل مند سمجھتی تھیں کہ بھائیوں سے معافی مانگ کر پھر میری چھاتی پر مونگ دلو۔ دیکھو' کیسا جواب دیا ہے میں نے تمہیں' تمہارا خط ہوا میں بکھیر دیا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہارا پیغام کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ تم جیسی بدکردار لڑکی کا سایہ میں اپنی پاک دامن بیٹی پر کبھی نہیں ڈال سکتی' تم ہمیشہ کی بدتمیں اور بد ہی رہو گی۔ تم جیسی لڑکیاں یوں ہی بھٹک بھٹک کر فنا ہو جاتی ہیں تو فریال' تم بھی ہو جاؤ۔ یوں بھی تم ہم سب کے لیے مر چکی ہو۔''

☆☆☆

جب پریشانی آتی ہے تو تنہا نہیں آتی۔ اپنے ساتھ دوسری پریشانیوں کو بھی لے کر آتی ہے۔ فریال کی طبیعت بھی کلی طور پر ٹھیک بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ خبر ایک بم کی طرح اس پر گری کہ عدیل پر کیشئر کے ساتھ مل کر چوری کرنے کا الزام عائد ہوا اور وہ فریال کو بتائے بغیر اپنا سامان لے کر کہیں چلا گیا۔

شاید عدیل واپس آ جائے' جیسے ایک دو ہفتوں کے بعد وہ اس کے پاس لوٹ آتا تھا۔ وہ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ہاتھ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ آفس کے لوگ کوارٹر خالی کرانے آئے تو اسے پتا چلا کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ دفتر والوں نے اسے نوکری سے مستقل بنیاد پر نکال دیا ہے اور وہ پنڈی سے چلا گیا ہے۔

وہ پریشان ہو کر صادقہ باجی کے پاس پہنچی تو انہوں نے اپنے گھر میں اسے جگہ دے دی۔ یوں بھی اس کا سامان ہی کیا تھا۔ مستقل پریشانیوں کے حصار میں رہنے کی وجہ سے وہ مزید حراساں سی ہو گئی تھی۔ صادقہ باجی نے لگ کر علاج کرایا تو وہ بوتیک کا کام کرنے کے قابل ہو گئی۔

''فریال ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گی؟'' ایک دن فریال رات کے کھانے سے فارغ ہو کر چائے بنا کر صادقہ کے ساتھ پی رہی تھی کہ صادقہ باجی نے اس سے کہا۔

''باجی! آپ کی بات کا بھی میں برا مان سکتی ہوں' جس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب شوہر تک بغیر بتائے بھاگ گیا۔''

''میں چاہتی ہوں' تم ایک خط اپنی ماں کو ضرور لکھ دو۔ میری بات کا قطعی یہ مقصد نہیں ہے کہ میں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے بوتیک کی ترقی صرف تمہاری محنت کی وجہ سے ہے۔ اب اگر میں اس کی مزید شاخیں قائم کرنے کا سوچ رہی ہوں تو اس میں تمہاری بہترین مشاورت بھی شامل حال ہے۔ اس کے باوجود میری یہ خواہش ہے کہ تمہارے گھر والے تمہارے حال سے بے خبر نہ رہیں۔''

''ٹھیک ہے باجی! میں خط لکھ دیتی ہوں مگر میرے گھر کے لوگ بہت سخت دل کے ہیں' میری غلطی کی مجھے ہرگز معافی نہیں دیں گے۔''

''یہ تم سوچ رہی ہو مگر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' صادقہ باجی نے پیار بھرے لہجے میں اسے سمجھایا' تب فریال نے رائی سے رتی تک ہر بات خط میں لکھ دی اور خط رجسٹرڈ پوسٹ کر دیا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

صادقہ باجی نے اس سے ایک دو دفعہ خط کی بابت پوچھا اور جب کئی ہفتے گزر گئے تو انہوں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا اور دل میں سوچنے لگیں۔

اتی' فریال ٹھیک کہتی تھی۔ اس کے بھائی انتہائی سخت دل کے ہیں۔ اصولوں کے معاملے میں کبھی کوئی سمجھوتا یں کرتے اور بھائیوں کے سامنے اس کی ماں کی ایک نہیں چلتی۔

☆☆☆

''ائی اجاڑ ان پو تو جیسے نوے سرے سے جوانی برس رئی۔ میں بات اچ کر رئی...... ہور انوں خراٹوں پے ا نے لیتے پڑ ئیں......'' صابرہ کی بھابی ہنس کر اپنے میاں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیسی باتاں کرتے بھابی آپ! بھائی میاں بوڑھے کہاں دکھتے' کتنا پیارے سے ہیں ناں میرے بھائی۔ ارے کالا رنگ اب فیشن میں آ گیا بول کے' میں تو اب چلتیوں'' بھابی نے ہنس کر شرارت سے کہا تو صابرہ لی ماں کو غصہ سا آ گیا۔

''بے فضول کے باتاں کرو نکو...... میرا بچہ نواب جہانگیر کیسا خوبصورت ہے ابا۔ میں سچ بولتیوں اس کے نہ پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ کیا چاند سورج کے ویسے چہرہ تھا۔ اب بیماریوں نے اس کا رنگ جھلسا دیا تو کیا ہوا' ے کو تو کوئی فرق نہیں لگتا ماں۔ اتنے دناں بعد تو میرا بچہ آیا ہے حیدر آباد سے۔ میرے کو تو دل نہیں بھرتا' اس لی شکل دیکھتی رہوں بول کے۔''

''اب کیا بولوں اماں پاشا! آپ کا تو بیٹا ہے ناں' کیسے بھی ہوتے' وہ تو آپ کو اچھے دکھتے ناں۔'' صابرہ کی ھاوج کو بھی جملے مارنے کا خاصا لپکا تھا۔

''نکہت آرا کو تو یہ بی نیں مالوم خوبصورت مرد عورتاں ویسے دکھتے۔'' صابرہ نے کھنچائی کی۔

''ائی کیا آپ کی مغز ماری گئی جی!'' صابرہ کی بات سن کر وہ لگیں ہنسنے۔

''کراچی آ کر لگتا ہے' آپ کا دماخ اپنے آپوں میں نکو رہا'' صابرہ کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔ اتنے برسوں بعد ھائی بھاوج حیدر آباد سے آئے تھے اور بھاوج کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے میاں کا اس کے میکے والوں کے سامنے خوب دھڑا کے سے مذاق اڑائیں اور وہ تھک نہیں رہی تھیں بول بول کے۔ سب کو برا بھی لگ رہا تھا مگر وں پروا نہیں تھی۔

''وئی تو میں بی بول رئی تھی' جب کا جب میرے بچے کے پیچھے لوگاں پڑے رہتے۔ پاکستان آ کر کیسے گھوم رئیں' کبھی کسی کے گھر جاتے تو کبھی کسی دوسرے کے۔ ذرا کچھ فکراچ نیں کہ اپنے شوہر کا کچھ کھیال (خیال) میں۔'' صابرہ کی اماں نے غصے سے بہو کو دیکھا جو شادی کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان آئی تھیں۔

تب نکہت آرا کے شوہر جمائی لے کر اٹھ بیٹھے۔ اپنی بیوی کے چہرے پر جلال دیکھا تو فوراً ان سے بولے کہت آرا اچ گیا کی اچ آیا۔ (میں ابھی آتا ہوں)'' اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

''اللہ یہ کہاں چلے گئے۔ میرے کو لگتا کہ اب یہ ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں گے' گھر میں بیکار پکائے آپ گاں نے خورمہ' نان......'' نکہت آرا نے ہنس کر کہا۔

''بھابی پاشا! آپ کے سوچنے کا انداز بہت اچ غلط ہے۔ بھائی کو کیا مالوم نیں کہ آج دعوت ہے گھر میں' ل کیوں جانے لگے' بول کے۔'' صابرہ چیخ کر بولی۔

''میرے کو لگتا' اب مجھے داخلہ لینے کا ہے' آپ لوگاں کی باتاں سر پر سے گزر جاتیں ناں' بول کے۔ اس لے تھوڑی بہوت سمجھداری سیکھنے کا ہے میرے کو۔'' نکہت آرا کھلکھلا کر بولیں۔

☆☆☆

بس تیزی سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھی۔ مسافر کچھ سو رہے تھے۔ اور کچھ اونگھ رہے تھے۔

ڈرائیور نے اپنی نیند بھگانے کے لیے فل والیوم میں ٹیپ ریکارڈر چلایا ہوا تھا۔ اس کی آواز اور میوزک شور سے شجاع کے کان پھٹنے لگے۔ دھم...... دھم...... دھم...... اس کا سر پھٹنے لگا۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چاندنی رات تھی...... اور چاند اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

فرح کو چاندنی راتیں کس قدر پسند تھیں۔ اپنے ہر خط میں لکھا کرتی تھی۔ میں چاند کو تکتے تکتے تمہیں کھو لگتی ہوں...... اور پھر تمہارا چہرہ مجھے چاند کے ہالے میں نظر آنے لگتا ہے......!

شجاع نے شکایتی سی ایک نظر چاند پر ڈالی تو اسے چاند بھی اداس اداس سا لگا۔

''میں نے فرح سے محبت اور وعدے کوئی توڑنے کے لیے تھوڑی کیے تھے۔ جو اماں کے سامنے سپرا دوں......'' اس کی تیوری از خود چڑھ سی گئی۔

''فرحت یوں تو میری ہر بات مانتی ہے، مگر ماموں رشید کا خط آنے پر کیسی بدل گئی ہے۔'' وہ تاسف، سوچ رہا تھا ''بہنیں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ بھائی کا خیال ہی نہیں۔''

''اگر پیسے میں اتنی طاقت ہوتی کہ محبت خریدنے کا مجاز ہوتا تو آج میرا دل بھی اسی جانب ہمک رہا ہو فرح مجھے یوں یاد نہ آ رہی ہوتی۔'' اس نے ماموں رشید کے پیسے پر نفرین بھیجی۔

بس ایک جھٹکے سے رکی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ ڈرائیور بس بند کر کے نیچے اتر رہا تھا۔

''کیا بات ہے!'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہاں آدھے گھنٹے بس رکتی ہے، مسافر تو شاید سب سو گئے ہیں، میں ذرا چائے شائے پی آؤں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شجاع نے سر ہلا کر کہا۔

''تم نے آنا ہے تو آ جاؤ، پانی شانی پی کر فریش ہو جانا۔'' اسے جاگتے دیکھ کر ڈرائیور نے کہا۔

''نہیں، میں اپنی سیٹ پر آرام کر رہا ہوں۔''

بس کے رکنے کے باعث چاند بھی رک گیا تھا۔ شجاع نے اسے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ اسے دلاسا دے رہا ہو۔

''کچھ نہیں ہوگا، تم گھبراؤ مت...... سب ٹھیک ہو جائے گا......!''

''کیسے ٹھیک ہوگا......؟ نہ ماں کو میرا خیال ہے اور نہ ہی بہن کو......'' وہ سیٹ پر اپنے دونوں بازوؤں میں ڈال کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور چائے پی کر آ گیا تھا...... اور بس تیزی سے روانہ ہو گئی تھی۔

اسے اپنے دل کی دھمک اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا...... مگر دل پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔

''فرح...... فرح...... فرح......'' اس کا دل ایک پکاری بن گیا۔

کچھ بھی نہیں ہے باغ بہاراں تیرے بغیر
پھیکا پڑا ہے رنگ گلستاں تیرے بغیر
آئے نہ حرف بندہ نوازی پہ اب تیری
ذرہ نہ ہو سکے گا درخشاں تیرے بغیر
آجا کہ اب تو جان پہ بن آئی ہے میری
ممکن نہیں حیات کا ساماں تیرے بغیر
کلیاں سسک رہی ہیں تو بلبل اداس ہے
گلشن بھی لگ رہا ہے بیاباں تیرے بغیر

''ہاں فرح، تیرے بغیر تو واقعی کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، اگر تو نہ ملی، تو یہ باقی ماندہ زندگی کیسے گزرے گی۔'' وہ کھڑکی پر سر نہواڑے سوچنے لگا۔

''شجاع...... اگر تم نہ آئے، تو میرے گھر والے میرا رشتہ اشرف سے کر دیں گے۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا فرح...... میری امی اور بہن تمہارے گھر ضرور آئیں گی۔''

''تمہارے والدین کو میرا رشتہ قبول کرنا ہوگا۔ اگر میری شادی تم سے نہ ہوئی، تو میں زہر کھا لوں گی۔''

''جب تک میں زندہ ہوں، ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔''

''تم نہیں جانتے شجاع، تمہاری بہن اب مجھے پسند نہیں کرتی۔ میں فرحت آپا کے پاس بار بار گئی، مگر وہ میرے گھر نہیں آئیں۔''

''فرحت آپا غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں۔ اب تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔'' میں اسی وقت گھر جاؤں گا، جب امی مجھ سے فون کر کے یہ وعدہ کریں گی کہ شجاع تم گھر آ جاؤ۔ تم جیسا چاہتے ہو، وہی ہوگا۔ ہم فرح کا رشتہ مانگنے جائیں گے اور اس کی شادی تم سے ہی کریں گے مگر خدارا تم گھر لوٹ آؤ۔''

''کیا واقعی ایسا ہی ہوگا۔''

ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ضرور ملو گی، یہ میرے دل کی آواز ہے اور دل کی آواز کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔''

''میں تو اشرف کے بھائی کے ہاتھ آپ کو خط بھیجتی تھی، یہ بیچ میں اشرف کیوں آ گیا۔ اس سے تو کبھی میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اشرف کو تو میں نے کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔'' فرح اس سے پوچھ رہی تھی۔

''اشرف بڑا کائیاں (مکار) آدمی ہے۔ ہمیشہ مجھ سے لڑتا رہا اور منہ کی کھاتا رہا، اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے زیر کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ تم سے شادی کر لی جائے۔ گاؤں کی سب سے خوب صورت لڑکی جو شجاع سے محبت کرتی ہے، اس کو اپنا بنایا جائے۔ تاکہ شجاع کو تکلیف پہنچے اور اس تکلیف سے وہ اپنی خوشیاں کشید کر سکے۔''

''مگر میں تو اسے ہمیشہ سے ناپسند کرتی رہی ہوں، اس نے کبھی ہنس کر بھی مجھے دیکھا تو میں غصے سے منہ پھیر لیا کرتی تھی۔'' فرح شکایت کر رہی تھی۔

''ہاں، میں یہ سب جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے کہ اشرف تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا مگر وہ ذلیل شخص ایسا ہی ہے، اس کی ذہنی اپروچ اسی قسم کی ہے۔ میرے یار دوست پہلے بھی اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے مگر اب یقین آ گیا ہے۔''

”تم جلدی سے آجانا شجاع۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ فرح کا تصوراتی پیکر اس سے مسلسل باتیں کر رہا تھا۔

”میں بہت جلد آؤں گا۔ بس امی میرا خط پڑھ کر مجھے فون کر لیں، میں اسی روز واپس آجاؤں گا۔“

”پنڈی...... پنڈی...... پنڈی......“ کنڈیکٹر جائے مقصود پر پہنچ کر آوازیں لگا رہا تھا۔

تب چونک کر اٹھتے ہوئے اس نے حسرت سے قدم بڑھائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہاں آگیا تھا۔

شجاع کا خیال تھا کہ اس کا خط پڑھتے ہی امی اس کو فوراً فون کریں گی، وہ ان کی طبیعت سے واقف تھا۔

اور پھر خط میں بھی اس نے اپنا کلیجا نکال کر ماں کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اتنی وکالت نہیں کر سکتا تھا جتنا سب کچھ اس نے خط میں لکھ دیا تھا۔

اپنے ارمان اپنی چاہتیں، امنگیں، اپنے خواب...... سب ہی کچھ تو اس نے لکھ دیا تھا۔

مگر امی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ اسے آئے دو دن ہو گئے اور انہوں نے اسے فون ہی نہیں کیا تھا۔

کراچی میں جب اس نے بچے بچے کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھے تو اپنے لیے بھی ایک لے آیا تھا۔ امی کو اس کا نمبر یاد نہیں ہوتا تھا، ان کا کہنا تھا، ایک گز لمبا نمبر کیسے یاد کروں۔ تب اس نے ان کے کمرے کی دیوار پر جگہ جگہ وہ نمبر لکھ دیا تھا۔ بقول فرحت کے شجاع نے تو دیوار کو کاپی بنا دیا ہے۔ ہر طرف اپنے موبائل کا نمبر جلی حرفوں میں لکھ دیا ہے۔

وہ اپنا لمبا چوڑا خط امی کے پاندان میں رکھ کے آیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ امی کے سوا کوئی پاندان کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

مگر جب فرحت کے چھوٹے بیٹے نے نانی سے پیسے مانگے، تو عظمت بیگم نے اس سے کہا جا پاندان کی کلیا میں سے لے لے (وہاں وہ اپنی ریزگاری ڈال لیا کرتی تھی)

بچے نے پٹاری کھولی، مٹھی بھر کے جہاں ریزگاری نکالی، وہاں وہ خط بھی ہاتھ میں لے کر چرمرا کر پھینک دیا...... اور پھر وہ خط نہ جانے کیسے کچرے میں چلا گیا کہ عظمت بیگم کو علم ہی نہ ہو سکا کہ ان کا بیٹا اپنا دل نکال کر وہاں رکھ گیا ہے۔

بیٹے کے بغیر بتائے جانے سے وہ پریشان ہوتیں، تو اسے فون ضرور کرتیں مگر شجاع کا دوست حفیظ جب یہ کہہ کر گیا کہ میں لاہور جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد آؤں گا تو عظمت بیگم یہی سمجھیں کہ وہ کہہ رہا ہے کہ شجاع اس کے ساتھ جا رہا ہے اور وہ دونوں ایک ہفتے بعد آئیں گے۔ اس سے پہلے بھی شجاع، حفیظ کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ سو کسی نے بھی شجاع کو فون ہی نہیں کیا۔ نہ ماں نے نہ بہن نے۔

شجاع کو جب پنڈی میں پانچواں روز تھا تو وہ خاصا پریشان ہو گیا۔ آخر امی اس کو فون کیوں نہیں کر رہی ہیں؟

تب اس نے خود فون کیا تو ماں نے پہلی بات یہی کی۔ ”پتر جتنا مرضی رہ لے، اچھا ہے تازہ دم ہو جائے گا“ بیمار بھی خاصا پڑا تھا۔“

”امی! آپ فرح کے گھر گئی تھیں۔“ شجاع نے بے صبرا ہن کر پوچھا۔

ہاں ہاں، کل جاؤں گی۔ پرسوں مہندی میں تو نہیں جا سکی تھی۔

”کس کی مہندی؟“ وہ پریشانی سے بولا۔

”بیٹا، فرح کی مہندی کی بات کر رہی ہوں۔ اس کی ماں نے اس کی شادی اشرف سے طے کر دی۔

اں۔ دونوں گھرانے بہت خوش ہیں۔ اچھا ہے بچی اپنے پڑوس میں ہی بیاہ کر چلی جائے گی، میکا قریب ہو تو اچھا ل رہتا ہے۔“

”میں آج آرہا ہوں امی......“ وہ بے چین ہو کر بولا۔

”تیری مرضی ہے پتر، جب دل چاہے آ۔ فرحت میرے پاس ہے۔ مجھے کوئی اکیلا پن نہیں ہے۔

☆☆☆

عدیل کے دوست ایجنٹوں کو پیسے دے دے کر پانی کے راستے قطر جا رہے تھے اور جو وہاں پہنچ گئے تھے ان ے گھروں کے حالات برق رفتاری سے تبدیل ہو رہے تھے۔ ایسے گھرانے جو ضروریات زندگی سے عاری تھے اب ان میں آسائشیں نظر آرہی تھیں۔

عدیل ایک لاکھ روپے تو اپنی کمپنی سے چوری چکاری میں اڑا لایا تھا اور باقی فریال کی کمائی کے پیسے بھی اس ے ہاتھ میں آئے تھے۔ اس نے اسے ایک پائی نہیں دی تھی۔ اب یہ رقم اس کے کام آنے والی تھی۔

اور یہ بھی اس کی قسمت ہی تھی کہ اس کے دوست نے اسے اس ایجنٹ سے بھی ملوا دیا تھا جو لوگوں کو قطر بھجوا رہا تھا ورنہ اتنے اچھے دوست کس کے ہوتے ہیں۔

ایجنٹ نے اسے یہ مژدہ بھی سنا دیا تھا کہ وہ نہ صرف اسے جلد قطر پہنچا دے گا بلکہ اپنے ایک دوست کے توسط ے اسے معقول جاب بھی دلوا دے گا۔

ایجنٹ کی باتیں سن کر وہ سرشار سا ہو گیا تھا اور اس کے گھر میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

جانے سے پہلے ہی ریال کی چھنک سنائی دینے لگی تھی۔ اماں کی فرمائشیں بھی روزانہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ چار رتج۔ چار ٹی وی۔ چار واشنگ مشینیں اور مصالحہ پیسنے کی مشین تو بیٹا ایک دو جھٹکوں میں ہی بھیج دینا۔“

”اماں ایک ابھی آئی نہیں ہے، چار، چار کا کیا اچار ڈالو گی۔“ وہ ہنسا تھا۔

”بیٹا چار بہنیں گھر میں بیٹھی ہیں اور جن بہنوں کا بھائی ملک سے باہر ہو وہ جہیز میں یہ چیزیں لے کر تو ضرور ماتی ہیں۔“

”کیا یہ چیزیں جہیز میں نہ ہوں تو شادی نہیں ہو گی۔ میری بیوی کے دونوں بھائی پیسے والے تھے۔ انہوں ے تو ایک کوڑی کا جہیز نہیں دیا۔“ عدیل تمسخر سے ہنستے ہوئے بولا۔

”بیٹا، یہ چیزیں تو فخر کی ہیں۔ تم دو گے تو تمہاری عزت ہو گی، سسرال میں تمہاری بہنیں دب کر نہیں رہیں گی اور رہا تمہاری بیوی کے بھائیوں کا احوال...... تو وہ لوگ کنجوس تھے، وہ تو اسی بات پر خوش ہو گئے ہوں گے کہ چلو بلا ے ہٹی۔ یوں بھی جہاں سگے، سوتیلوں کا چکر ہو۔ وہاں بہنوں کو کچھ نہیں ملا کرتا۔“

”میں تو پریشان ہو گیا تھا اس سے شادی کر کے، جتنا اس نے کمایا نہیں، اس سے زیادہ وہ علاج میں بہانا ہاہتی تھی۔ ایک دفعہ بخار کی گولی کیمسٹ سے لا کر دے دی تو نخرے سے بولی کہ ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ، اس طرح کوئی دوا نہیں کھاؤں گی۔ جیسے میں اسے زہر کھلا رہا تھا۔ اعتماد تو وہ مجھ پر کرتی ہی نہیں تھی۔“

”ارے حرافہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، ہمیشہ اپنی چلاتی ہیں۔ اپنی مرضی سے لڑکا پھانسا، اپنی مرضی سے شادی لی اور ظاہر ہے کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہو گی۔ تیری بات کیوں مانتی۔“ اماں نے اسے سمجھاتے ے کہا۔

”ہاں اماں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ بہت ہی مکار قسم کی تھی فریال۔ اب دیکھو آرڈر میں لے کر آیا اور مالکوں سے

دوستی اس نے گانٹھ لی۔ صادقہ باجی جو بوتیک کی مالکہ تھیں۔ اس کی ایسی طرف داری کر رہی تھیں' جیسے وہ ان کی کوئی سگی ہو۔” عدیل نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

“بیٹا تو سیدھا سادا سا معصوم' تو کیا جانے مکار اور کمینی عورتوں کے ہتھکنڈے۔ شکر کر کہ تو گھر آ گیا۔ ورنہ وہ تو تجھے کھا جاتی' ہاں......”

“اب اماں ایسی بھی بات نہیں ہے کہ کوئی مجھے آسانی سے نگل لے۔” عدیل نے ہنس کر کہا۔

“چلتر عورتوں کو تو کیا جانے۔ میری مان' تو فریال کو فارغ کر کے جانا' ورنہ یہ نہ ہو کہ جب تو آئے تو وہ تیرے سر کو آ جائے۔ پیسہ نہیں چھوڑتیں ایسی عورتیں' ہاں......”

“پتا نہیں' کہاں ہوگی وہ......” “کمپنی کے کوارٹر سے تو بے دخل کر دیا ہوگا۔” عدیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

“جائے گی کہاں؟” اماں نے انگلی پر چونا لگا کر چاٹتے ہوئے کہا۔ “وہیں صادقہ باجی کے ساتھ اٹکی ہوگی! گھر والے کہاں قبول لیتے ہیں، ایسی دیدہ ہوائی لڑکیوں کو۔”

“ٹھیک ہے' صادقہ باجی کی بوتیک کی معرفت فریال کو طلاق بھجوا دیتا ہوں۔” اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

“یہ کی ہے عدیل نے کام کی بات۔” بہنوں کے چہروں پر اطمینان اتر آیا۔

اور پھر واقعی اس نے اسی شام...... طلاق لکھ کر صادقہ باجی کی بوتیک کے ایڈریس پر بھجوا دی۔

“ایسی لڑکیاں جو خودسر ہوں' سزا تو ان کو بھی ملنی چاہیے۔” عدیل کی بڑی آپا نے مسکرا کر کہا۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔

“خودسری کے ساتھ ساتھ ہما ہمی بھی بہت تھی۔ کسی کے لڑکے کو الو بنا کر گھومتی تھی اور چاہتی تھی اسے نیک پروین بھی کہا جائے اور جب اس کو اس کی اوقات بتا دی گئی تو کیسے تلملا کر ہمارے گھر سے بھاگی تھی۔” دوسری بہن نے ہنس کر اس کے جانے کی اداکاری بیان کی۔ سرشاری چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

“مگر بھئی تھی بڑی ہٹ دھرم، ذلیل ہو کر بھی ذلت محسوس نہیں کی اور ہمارے معصوم سے بھائی سے شادی رچا کر ہی رہی۔” چھوٹی آپا کو ابھی تک اس پر غصہ تھا۔

“میں نے تو اس الو کی پٹھی کو بتیرا سمجھایا تھا...... کہ تم عدیل کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہو تو گھوم پھر لو مگر دیکھو شادی کا نام نہ لینا ورنہ پچھتاؤ گی۔ اس کے اوپر اپنی بہنوں کی ذمے داریاں بہت ہیں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے' ہر کام اور ہر بات کے لیے ہم اسے ہی دیکھتے ہیں۔”

“مگر اس وقت اس کی سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آ رہی تھی اور ایسی پارسا بن رہی تھی جیسے اس نے کسی لڑکی کے ساتھ دوستی کر رکھی ہو......” بڑی آپا نے کلس کر کہا۔ ان کا غصہ طلاق دلوانے کے بعد بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

“اچھا ہے' حرافہ کو سزا ملی۔ میرے بیٹے کو چھیننا چاہ رہی تھی' لے لیا میرا بیٹا۔ آ گیا وہ اپنوں کے پاس۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ کون رہتا ہے بھلا جس کے اپنے اسے اپنانے کو تیار نہ ہوں۔ عدیل نہ ملتا تو وہ کسی اور سے شادی رچا لیتی۔ اسے تو کسی نہ کسی کا شکار کرنا تھا۔ ہم تو پھر بھی شریف لوگ ہیں کہ طلاق دے دی' ہمیں کیا پتا' اب وہ کس کو پھانسے بیٹھی ہوگی اور کس کے ساتھ رہ رہی ہوگی۔” اماں نے بھی تمباکو پھانک کر اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

☆☆☆

ایجنٹ نے پیسے لے کر یہ نوید سنا دی تھی کہ آئندہ پندرہ بیس دنوں میں جانے کی تاریخ پتا چل جائے گی۔

عدیل کی ماں' بہنوں نے اپنے پورے خاندان میں یہ خبر ڈنکے کی چوٹ پر پھیلا دی تھی کہ عدیل کو قطر میں

ل گئی ہے اور وہ ایک ماہ کے اندر جانے والا ہے۔

یہ خبر ان کے خاندان میں اتنی اہم تھی کہ ان کی فیملی میں' ہر اس گھر میں اس گھرانے کی دعوتیں ہو رہی تھیں اں لڑکیاں کنواری بیٹھی تھیں۔ اور وہ سب خوب مزے سے یہ دعوتیں کھا رہے تھے۔

وہ لوگ جنہوں نے پہلے عدیل کو کسی قابل نہ جانا تھا، وہ بھی اس سے عزت و تکریم سے پیش آ رہے تھے۔

یل کو چھوٹے موٹے تحائف بھی دیئے جا رہے تھے' اس کی اماں بہنوں کی بھی الگ چو چو پو پو ہو رہی تھی۔

“عدیل بیٹا وہاں جا کر بھول نہ جانا۔” عدیل کی خالہ نے کہا۔

“خالہ جان' ایسا بھی بھلا ہو سکتا ہے۔”

“باہر جا کر لوگ بھول جاتے ہیں ناں، اس لیے کہہ رہی ہوں۔”

“نہیں خالہ جان' وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہوں گے۔ میں تو اپنی پیاری خالہ کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔” اس س کر کہا اور مارے لاڈ کے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گیا۔

“اچھا پھر میرے بیٹوں کا بھی خیال رکھنا۔ وہاں جانے کے بعد تم انہیں بھی وہاں نوکری دلوا دینا۔” انہوں ت بھرے لہجے میں کہا۔

“خالہ جانی...... ابھی میں تو جا کر جم جاؤں' پھر دیکھوں گا۔ پردیس تو پردیس ہوتا ہے' وہاں بھی سو خرچے ہیں' جو کسی کو نظر نہیں آتے۔” عدیل نے اپنے کالر جھاڑتے ہوئے تو فکی بھرے لہجے میں کہا۔ جیسے بہت ے صاحب ہو۔

“تم تو انشاءاللہ جم جاؤ گے ہی...... مگر پاکستان میں کہاں نوکریاں ہیں۔ میرے بچے تو درخواستیں دے دے ل گئے اور جو نوکریاں ہیں' وہاں اتنی کمائی نہیں ہے۔”

“ہاں خالہ' باہر کی بہار تو علیحدہ ہی نظر آتی ہے۔” عدیل ہنسا۔

“ب ہی تو کہہ رہی ہوں تم سے' تم میرے تینوں بیٹوں کے لیے کوشش کرنا تاکہ میں اپنی دونوں بچیوں کو ان جہیز دے سکوں۔”

“ٹھیک ہے خالہ جان! یہ آپ سے پکا پکا وعدہ ہے' جب میں کسی کو بلانے کی حیثیت میں ہوں گا' تو سب پہلے اپنے بھائیوں کو ہی بلاؤں گا۔ ان سے زیادہ اور کون میرا قریبی ہوگا...... اور میں تو ان سب کو ویسے ہی چاہتا ہوں۔”

“تو تو ماشاءاللہ اپنی نوکری پر جا رہا ہے۔ جانے سے پہلے منگنی تو کر کے جاتا' تاکہ جب آتا تو بہنوں کے ساتھ تیرا نمبر بھی آ جاتا۔” خالہ اب اونچی اڑانیں اڑ رہی تھیں۔

“خالہ جانی' منگنی تو کیا شادی بھی کر لوں گا مگر ابھی ایک چکر تو لگا آؤں۔ ویسے آپس کی بات ہے' آپ اپنی کائی اتنی جلدی مت کیجئے گا۔” یہ جملہ اس نے قدرے رازداری میں خالہ سے کہا۔

ب خالہ بے وجہ ہی ہنس پڑیں۔ چمن آرا شرما گئیں۔ خالہ کی نظریں دونوں کی بلائیں لینے لگیں۔ چلتے وقت ے نام پر انہوں نے نئے رومال کے ساتھ پانچ سو روپے عدیل کے ہاتھ پر رکھے اور اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر دبا

ان کے چہرے کی مسرت کی ہر کرن یہی کہہ رہی تھی کہ عدیل کو وہ اپنا داماد سمجھ رہی ہیں۔

یل نے بھی جھک کر اس انداز میں آداب کر کے چمو کو پیار اور اپنائیت بھری نظروں سے دیکھا کہ اس کے

اس انداز پر اس کی بڑی آپا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

’’کمینہ بہت ہی بڑا اداکار ہے۔‘‘ گھر واپسی پر وہ ہنسے چلی جا رہی تھیں۔ عدیل‘ خالہ کے گھر میں فنکا
رہا تھا۔

’’خالہ کی بونی بیٹی کو ہم اپنے گھر لائیں گے۔ بی اے کیا کر لیا ہے‘ اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھنے لگی۔
چھوٹی آپا نے گھر آ کر کہا۔ ’’خالہ بھی چالاک بن رہی ہیں‘ کماؤ لڑکے کو دانہ ڈال رہی تھیں۔‘‘

’’شادی کون کر رہا ہے‘ میرے پیچھے اگر تم لوگوں کی گا ہے بہ گاہے دعوتیں ہوتی رہیں تو کیا برا ہے۔‘‘
نے ٹھٹھا لگایا۔

’’اس سے اچھی کیا بات ہے۔‘‘ چھوٹی آپا بھی ہنس پڑیں۔ دعوتیں کھانے کا انہیں یوں بھی بہت شوق

’’میری مان‘ کل بڑی چچی کی دعوت میں بھی کوئی آسرا دے دینا۔‘‘ بڑی آپا نے ہنس کر کہا۔

’’یہ بات نہیں کہو آپا‘ ہاں……‘‘ عدیل نے منہ بنا کر کہا۔

’’کیوں‘ ایسی کیا بات ہے۔ ناصرہ تو یونیورسٹی میں ایم اے کر رہی ہے۔‘‘

’’یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر انہوں نے آدھی بات بھی مجھ سے کی ناں……‘‘

’’تو کیا ہوگا؟‘‘ بہنوں کے چہرے اتر گئے۔

’’پھر میں سو جان سے اسی سے شادی کروں گا۔ مجھے ناصرہ دل سے پسند ہے۔ انگریزی پھٹ پھ
جانتی ہے۔ ایسی قابل لڑکی…… کہاں مل سکتی ہے مجھ کو۔ اگر قطر کے نام پر مل جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہ
عدیل کا لہجہ سنجیدہ سا ہو گیا اور سپنے آنکھوں میں سج گئے۔

’’ارے جا‘ تجھے کیا پتا تیری ویلیو کیا ہے۔ ایم اے ہوتا کیا ہے آج کل‘ کچھ بھی نہیں۔ تو دیکھ لینا‘
تیرے لیے ڈاکٹر لاؤں گی۔ تیری خالائیں تو دیکھنا کیسی خوشی خوشی میری بہو سے انجکشن ٹھکوانے آیا کریں
اماں نے توقف سے کہا۔

اور عدیل منہ کھولے اماں کو دیکھنے لگا۔ اتنی اونچی اڑان بھرنے کا تو واقعی اس نے سوچا تک نہیں تھا۔
میٹرک تھرڈ ڈویژن پاس لڑکے کو اگر ڈاکٹر بیوی مل جائے……تو اس کی خوشی دیدنی ہی ہوگی۔

☆☆☆

مسز شاہ‘ جب زیور کے ساتھ ساتھ اپنے دو بڑے بیٹوں کو لے کر نگین کے گھر پہنچیں تو اس دن فریدا
میں ہی تھے۔

فیروزہ بیگم نے جب انہیں بتایا کہ زیور کی ماں آئی ہیں‘ تو ان کا خون ہی کھول گیا‘ بڑی منت سماجت
وہ ڈرائنگ روم میں آئے۔

’’بھائی صاحب‘ میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میرے بیٹے کی یہ حرکت درست نہیں تھی‘ کہ وہ آپ کی لڑ
ساتھ گھومتا پھرتا رہا‘ مگر میری گزارش ہے کہ بچوں کی غلطیاں معاف کر دی جائیں۔‘‘

’’وہ غلطی جب میری بیٹی کی بھی تھی‘ تو میں آپ سے کیا کہہ سکتا ہوں۔‘‘ فرید احمد کو ان کا یوں آ کر معاف
کرنا عجیب سا لگ رہا تھا۔

’’ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ زیور کو اپنا بیٹا بنا لیں۔ ان کے اکڑے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے
مسز شاہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

’’نہ میں آپ کو جانتا ہوں‘ نہ آپ کی فیملی کو۔ میں کیونکر یہ فیصلہ کر سکتا ہوں۔‘‘ ان کا لہجہ ہنوز اکھڑپنے کا حامل تھا۔

’’جب دو نئے خاندان ایک دوسرے سے پہلی مرتبہ متعارف ہوتے ہیں تو دونوں ہی انجان ہوتے ہیں…… مگر پھر آپس میں میل جول سے ایک دوسرے کو جانتے چلے جاتے ہیں۔‘‘ مسز شاہ نے دھیمے لہجے میں اپنی فیملی کے بارے میں بتانا شروع کیا اور فرید احمد کے چہرے کا تناؤ ختم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔

اور وہ ان سے بات کر کے مسرور سے ہو گئے۔ نگین اپنے کمرے میں بیٹھی دعائیں کر رہی تھی جب وہ اندر آئے اور نگین کو دیکھتے ہوئے کہا ’’بیٹا اچھی سی چائے بنا کر لاؤ…… اور دکان پر فون کر کے طفیل سے کہنا کہ ناشتے کا سامان فوراً پہنچا دے۔

’’ابا جی‘ فون تو میرے پاس نہیں ہے۔‘‘ اس نے اپنی خوشی کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا۔

’’میری الماری میں جو بریف کیس ہے‘ اس میں سے نکال لو۔‘‘

تب وہ اڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی۔ اسے تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس کا موبائل کہاں ہے۔ جھٹ موبائل نکال کر طفیل کو چیزوں کا آرڈر کرنے لگی۔

’’بس کریں باجی‘ کیا بہت بڑی دعوت ہے؟‘‘ اس کو رکتا نہ دیکھ کر طفیل نے حیرت سے پوچھا۔

’’صرف دس ہی آئٹم تو بتائے ہیں…… مگر فوراً سے پہلے لے کر آنا‘ مہمان اتنی دیر رکیں گے نہیں۔‘‘

طفیل بھی جلد سامان لے آیا‘ اور اس نے ٹرالی میں سجا کر طفیل کے ہاتھ ہی چائے بھجوا دی۔ ان سب کے سامنے جاتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔

چلتے وقت زیور کی ممی اسے پیار کرنے آئیں تو وہ بری طرح شرما رہی تھی۔

’’پریشان مت ہوناں بیٹا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے ابا جی‘ زیور کا رشتہ ضرور قبول کریں گے۔‘‘ زیور کی ممی اس کو گلے سے لگاتے ہوئے کانوں میں جیسے امرت گھول رہی تھیں اور مارے تشکر کے جیسے اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

اور وہ ان سے یوں چمٹ گئی جیسے اپنے وجود سے کوئی پیغام دے رہی ہو۔

’’آپ میری ہیں……اور……میں آپ کی ہوں اور یہ وعدہ کر لیں کہ آپ میرا ہاتھ کبھی نہیں چھوڑیں گی۔‘‘

اس کے وجود سے پھوٹتے ہوئے اس پیغام کو محسوس کرتے ہوئے زیور کی ممی نے اسے بغور دیکھا اور اس کی روشن اور صبیح پیشانی پر اپنے پیار کی نشانی ثبت کر دی۔

☆☆☆

دوست روکتا ہی رہ گیا مگر شجاع بھاگتا ہوا بس کے اڈے پر پہنچا۔ جو بس جانے کے لیے تیار تھی‘ اس کی تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔

’’مجھے بہت ضروری پہنچنا ہے‘ میں کھڑے ہو کر سفر کر لوں گا۔‘‘

’’بابو جی‘ دوسری بس دو گھنٹے بعد چلے گی۔ آپ آرام سے بیٹھ کر چلے جانا۔‘‘

’’نہیں میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔‘‘ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جائے اور فرح کے پاس پہنچ جائے۔

وہ ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ کسی مسافر نے اپنے بچے کے ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کی۔ وہ بچے کو گود میں

لے کر بیٹھ گیا۔

بس ابھی دو ڈھائی میل ہی چلی تھی کہ خراب ہو گئی...... اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور' کنڈیکٹر کی مدد سے ٹھیک ٹھاک کر رہا تھا اور مارے پریشانی کے اس کا برا حال۔

جب پیچھے سے اسے دوسری بس آتی نظر آئی تو اسے ہاتھ دینے والوں میں وہ سب سے آگے تھا۔

یہ بس فراٹے سے چل رہی تھی اور اسے وہ بھی سست لگ رہی تھی۔ چائے کے اڈے پر بس کا رکنا بھی اسے برا لگ رہا تھا اور جب وہ گاؤں پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ ہو کا عالم تھا۔

اپنے گھر جانے کے بجائے وہ فرح کے گھر کے سامنے پہنچا۔ اس کا اور اشرف کا گھر نیلی پیلی بتیوں سے سجا ہوا تھا۔ شادی مبارک کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ رات کے وقت وہاں بھی سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شادی کے گھر کے مہمان بھی سونے کے لیے لیٹ گئے ہیں۔ ناچار تھکے ہوئے قدموں سے جب وہ گھر پہنچا تو ایک ہی دستک پر ماں نے دروازہ کھول دیا۔

''اتنی سردی میں رات کو کیوں سفر کیا' صبح آ جاتے۔''

''امی مجھے سردی نہیں لگتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' تم اندر رضائی میں لیٹو' میں دودھ میں انڈا پھینٹ کر لاتی ہوں۔ آج ٹھنڈ کچھ زیادہ ہی ہے اور تم نے جرسی تک نہیں پہنی ہوئی ہے۔''

''فرح کی شادی کب ہے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''شادی کیا...... رخصتی بولو...... نکاح تو اس کا مہندی والے دن ہی ہو گیا تھا۔ کل صبح ناشتے کے بعد رخصتی ہو جائے گی۔''

''فرح کا نکاح ہو گیا ہے!'' اسے دھکا سا لگا اور سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔

''ہاں پتر' تمہارے جانے کے بعد کارڈ آیا تھا اس کے گھر سے مگر جب تک تم حفیظ کے ساتھ لاہور جا چکے تھے۔''

''لاہور جا چکا تھا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، حفیظ ہی تو بتا کر گیا تھا کہ وہ لاہور جا رہا ہے' تمہیں لے کر......''

''آپ نے میرا خط نہیں پڑھا تھا کیا؟'' اب وہ ماں کے سامنے بیٹھا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔

''بیٹا تو نے مجھے کون سا خط بھیجا ہے' جو میں پڑھتی۔ میں نے تو تیرا کوئی خط نہیں پڑھا۔''

''سچ کہہ رہی ہو ماں؟''

''تیری جان کی قسم پتر! میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔''

تب وہ بے اختیار رو پڑا۔ وہ ایسا بلک بلک کر رو رہا تھا کہ عظمت بیگم اسے چپ کراتے کراتے خود بھی روہانسی ہو گئیں اور بالآخر وہ بھی رونے لگیں۔

☆☆☆

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ روئے یا ہنسے۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس نہج تک تبدیل ہو جائیں گے کہ ابا جی کو زبور کی فیملی اس حد تک پسند آ جائے گی کہ وہ اس کا رشتہ زبور کے ساتھ طے کرنے کے

ارے میں سوچنے لگیں گے۔

ابا جی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر امی سے اپنے کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔ زبور کی فیملی کی امارت' ے بڑے نام۔ اونچے اونچے حوالے انہیں بے حد متاثر کر چکے تھے۔

''لڑکا تو اچھا ہے' اور خاندان بھی برا نہیں ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم اپنی نگین کو زبور کے ساتھ بیاہ دیں۔''

''ہاں' میرا بھی یہی خیال ہے...... اور پھر مسز شاہ اتنی محبت اور خوشامد سے یہ رشتہ طلب کر رہی ہیں۔''

''ہاں' میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ زبور سے اچھا داماد ہمیں نہیں ملے گا۔''

اور عین اسی وقت نگین کے موبائل پر بیل ہوئی۔ نگین نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا تو وہ زبور ہی تھا۔

''کیا بات ہے؟ اتنی رات گئے کیوں فون کیا ہے؟'' وہ مخمور لہجے میں بولی۔

''تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اور میرے سسرال والوں کے کیا احوال ہیں؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔

''سب بھلے چنگے ہیں۔'' اسے ہنسی سی آ گئی۔

''نگین...... میں تو مایوسیوں کے اندھیروں میں گھر گیا تھا۔ اللہ نے امید کا سورج روشن کیا تو میری جان میں جان آئی ہے اور جب سے امی اور بڑے بھائی تمہارے ابا جی سے مل کر آئے ہیں' میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا ہیں ہے۔''

''میں بھی نا امیدی ہو گئی تھی...... اور یہاں تک سوچنے لگی تھی کہ اب نہ تم کو کبھی دیکھ سکوں گی اور نہ کبھی مل کوں گی۔''

''اب تو ہم بہت جلد مل جائیں گے۔ اللہ نے ہماری سب دعائیں سن لی ہیں۔''

''ہاں زبور، اب تو واقعی ایسا ہی لگ رہا ہے کہ میں نے جو رو رو کر دعائیں کی تھیں، اللہ نے ساری کی ساری ول کر لی ہیں۔''

''ہماری محبت کو بھی کسی کی نظر نہیں لگی۔ اگر نظر لگ جاتی تو ملن مشکل ہو جاتا۔''

''نظر تو خیر لگی تھی...... مگر اتر گئی۔'' نگین نے ہنس کر کہا۔

''اگر یہ سب اقدامات پہلے ہی ہو جاتے تو ایسی نوبت ہی نہیں آتی۔ مجھے بھی اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو رہا ہے۔''

''اب نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے واقعی ہماری سن لی۔''

''تو اس خوشی میں' میں کل گھر آ جاؤں۔ اب تو ابا جی بھی کچھ نہیں کہیں گے۔'' زبور ہنسا۔

''اے...... زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے' تم میرے ابا جی کو جانتے نہیں ہو۔ وہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے تم سے درشت لہجے میں پوچھ لیا۔ کیا بات ہے صاحب زادے! آپ اس وقت بغیر بلائے ہمارے گھر ں کیوں آئے ہیں، تو کیا جواب دو گے؟'' نگین نے اسے ڈراتے ہوئے کہا۔

''میں شیروانی کا ناپ دینے آیا ہوں۔ آنٹی نے کہا تھا کہ ابا جی مجھے اپنے ساتھ درزی کے پاس لے کر جائیں گے۔ ہاں مجھے مت لیجئے گا، وہ میں نے ملتان سے خاص آرڈر پر بنوالیے ہیں۔'' زبور نے شوخی سے کہا تو بھی کھل کھلا کر ہنس دی۔

اس کی بانسری کی طرح بج اٹھنے والی ہنسی زبور کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ سرشار سا ہوگیا۔ کتنے دنوں بعد سنی تھی اس نے یہ ہنسی۔ نگین کی ہنسی نے اس کے من میں ایک تراوٹ سی ڈال دی۔

''اچھا' پھر بعد میں بات ہوگی۔ تم سو جاؤ۔''

''اوکے......!'' اور وہ اپنا موبائل اپنے سینے پر رکھ کر زبور کی باتوں سے خوشیاں کشید کرنے لگی۔

☆☆☆

دعائیں تو فرح نے بھی بہت مانگی تھیں مگر کوئی بھی قبول نہیں ہوئی تھی۔ کتنی ساری تو اس نے منتیں مان لی تھیں...... مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔

آخری وقت میں اس نے اشرف کو کوسنے تک دے ڈالے تھے...... مگر اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنی قسمت کے یوں پلٹا کھانے پر حیران سے زیادہ پریشان سی تھی۔ اس کا دل' اس کے دماغ کا ساتھ کسی صورت نہیں دے پا رہا تھا۔

ایک چاہنے والا محبوب بغیر کچھ کہے' بولے چپ چاپ منظر سے غائب ہوجائے تو اس کے دل کی حالت بے کل تو ہونی ہی تھی اور محبوب بھی ایسا جو اپنی نظیر آپ تھا۔

اس کا صرف نام ہی شجاع نہیں تھا وہ واقعی بہادر سا تھا۔ دنگل میں لڑکوں کو ہرا دیا کرتا تھا۔ باتوں میں کوئی اس سے جیت نہیں سکتا تھا۔ اپنے دوستوں میں اس کا اپنا ٹیکا تھا۔

مگر جس سے اس نے محبت کی، اس کو یوں تہی دامن سا چھوڑ کر چلا گیا اور واپس پلٹ کر اس کا حال تک نہ پوچھا۔ فرح کا شکوہ غلط نہیں تھا۔

بات عجیب ہی تھی...... مگر فرح کا دل ابھی تک شجاع کے لیے ہمک رہا تھا، اسی کے لیے بے چین تھا...... اور وہ اسی کے لیے تڑپ رہی تھی۔

فرح کا رونا کسی صورت نہیں رک رہا تھا۔ اس کی بہنیں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔

''بھول جا اسے' بے ایمان تھا وہ۔ پاگل بناتا رہا وہ...... اور جب مانگنے کا وقت آیا تو وہ گاؤں سے بھاگ گیا۔'' چھوٹی آپا نے تو شجاع کو گالیاں تک دے ڈالی تھیں۔

''نہیں آپا' وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا۔'' وہ اپنی بڑی بہن کے سینے پر سر رکھے سسک رہی تھی۔

''فرو...... وہ اول نمبر کا جھوٹا تھا۔ چلو میں یہ بات مان لوں کہ اس کی ماں بہن نے تیری شادی کا اسے نہیں بتایا ہوگا مگر جب شادی کا کارڈ بھجوایا تو اسی دن وہ گاؤں سے کہیں اور نکل گیا۔''

اپنی بہن کی یہ باتیں سن کر فرح کی آنکھوں کی بوچھاڑ مزید تیز ہوگئی۔

''شجاع...... تم ایسے تو نہیں لگتے تھے۔'' اس کا دل سوالی بن کر خود اپنے آپ سے یہ پوچھ رہا تھا۔ محبت اور چاہت کا یہ کیسا انداز ہے جس نے میرے من میں ہر سو اندھیرا کردیا ہے۔

''فرو میری بہن' تو بس اب یہ یاد رکھ کے تو اشرف کی بیوی ہے' اسی کے لیے جینا ہے اور اسی کے لیے مرنا ہے۔'' آپا اسے سنوارتے ہوئے مسلسل سمجھا رہی تھیں۔

اپنے آپ کو سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے' یہ ادراک اسے پہلی مرتبہ ہورہا تھا۔

''آپا شاید میں ہار گئی۔ اس لیے شجاع مجھے نہیں مل سکا' اگر میری قسمت اچھی ہوتی تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا' جو بھل بھل بہے جارہے تھے۔

''ایسی بات نہیں ہے فرح...... اللہ تجھے چپے چپے پر کامیابیاں عطا کرے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ بعض دفعہ ہم ایسے لوگوں سے بھی محبت کر بیٹھتے ہیں جو چاہے جانے کے ہرگز قابل نہیں ہوتے۔ شجاع اس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ تیرے ماتھے کا جھومر بنتا۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ شجاع نے تو میرے سارے بھروسے کو تاراج کردیا۔''

''اب اس کمینے شخص کے بارے میں سوچنا بھی نہیں' اور نہ ہی اشرف کے سامنے کبھی بھولے سے بھی ذکر کرنا۔'' آپا نے اسے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

''شوہر ہمیشہ کانوں کا کچا اور وہمی ہوتا ہے' کبھی اس کے سامنے ایسی بات نہ کرنا جس میں شجاع یا اس کے گھر والوں کا کوئی ذکر ہو۔''

''ٹھیک ہے!''

''اور اس کی ہر یاد کو دل سے اچھی طرح کھرچ کر پھینک دینا اور صرف اشرف سے ہی محبت کرنا۔''

''آپا...... یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں اپنی سانسوں کو اپنے جسم سے کیسے نکال سکتی ہوں۔'' فرح آپا کے گلے لگ کر بلک کر رونے لگی اور آپا جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کے سمجھانے کا اس پر اثر ہورہا ہے اور وہ ان کی ہر بات کے جواب میں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے کی گردان الاپ رہی ہے تو شاید سب ٹھیک ٹھاک ہی ہے...... مگر اس کو یوں روتا دھوتا دیکھ کر وہ بھی غم زدہ ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں کہ شجاع نے اپنی محبت کا جو بیج فرح کے سینے میں بویا تھا وہ ایک تناور درخت بن چکا تھا۔

وہ جو اچھے کپڑے پہننے کی شوقین تھی۔ وہ جو زیورات کی دلدادہ تھی۔ آج مہنگے شرارے اور بھاری بھرکم زیورات میں بھی اتنی اداس اور غمزدہ تھی جیسے اس سے بڑھ کر تہی دست کوئی دوسرا نہ ہو۔

☆☆☆

فرح نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا کمرا سجا ہوا تھا۔ کمرے کی چھت سجی ہوئی تھی۔ بیڈ کے چاروں اطراف چمک دار پنی کی کلیاں اور پھول لٹک رہے تھے۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا اسے اس کمرے میں آئے ہوئے۔ اشرف شاید کمرے میں ابھی نہیں آیا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگی میز پر دو گلاس دودھ کے ڈھکے ہوئے رکھے تھے۔

میں کب اس کمرے میں آئی...... اسے یاد ہی نہیں آرہا تھا۔ سر میں سخت درد ہوا تو اسے اچانک یاد آیا۔ آرسی مصحف کے وقت شیشے میں اشرف کی شکل دیکھ کر وہ چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے ہوش کب آیا اور کب اس کی رخصتی ہوئی' یہ سب اسے قطعی یاد نہیں آرہا تھا۔

یاد تھی تو صرف بڑی آپا کی بات۔ فرح، اپنی نئی زندگی کا سفر محبت کے ساتھ شروع کرنا۔ جب تیری قسمت میں اشرف لکھا تھا تو تیری شادی شجاع سے کیسے ہوسکتی تھی۔ اب تم بھی اس کی سچائی سے سیوا کرنا اور اسے شکایت کا موقع نہ دینا۔

آپا کی بات یاد آتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بیڈ کے سامنے ہی اس کی ڈریسنگ ٹیبل رکھی تھی۔ اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو آنکھیں لال انگارہ اور متورم نظر آئیں۔ اپنی سسکیاں اپنے من میں داب کر وہ چپ چاپ

بیٹھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں اشرف بھی آ گیا۔

''میکا چھوڑنے کا بہت غم ہے تمہیں؟'' اس نے آتے ہی پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔

''جبھی رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں۔''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''فرح میں زندگی میں بے ایمانی پسند نہیں کرتا ہوں' مجھے امید ہے کہ تم میرے ساتھ شرافت کے ساتھ رہنا پسند کرو گی۔''

''جی!'' وہ حیرت سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنی دلہن سے کوئی اس طرح بھی بات کرتا ہے' وہ دل میں سوچ رہی تھی۔

''معصوم بننے کا ناٹک مت کرو...... کہ جیسا پوز کر رہی ہو' ایسی تم ہو نہیں۔'' وہ بے رحمی سے ہنسا۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ واقعی الجھ سی گئی تھی۔ سر اس کا درد کے مارے یوں بھی پھٹا جا رہا تھا۔ اس پر اشرف کی اوٹھی اوٹھی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں۔

''میرا مطلب صاف ہے' جو کچھ تم شادی سے پہلے کرتی رہی ہو' وہ اب مت کرنا۔'' اشرف اس کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں کیا کرتی رہی ہوں؟''

''کیا یہ بھی مجھے بتانا ہو گا۔''

''ہاں' بتانا تو ہو گا؟''

تب اشرف نے اس کے وہ خط' جو اس نے پپو سے چھینے تھے اس کے سامنے رکھ دیئے اور ہنس کر کہا۔

''اپنے یار کو جو تم نے خط لکھے تھے' وہ بھی پڑھ لو...... اور اپنے پاس رکھ لو کہ یہی تحفہ ہے تمہارا۔ تا کہ کبھی غلط کام کی بابت سوچ بھی نہ سکو۔'' فرح کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ اشرف نے پپو سے خط چھین کر اپنے پاس سینت کر رکھ بھی لیے ہوں گے۔

مارے شرم اور بے عزتی کے اسے چکر سا آیا۔ اس سے قبل کہ وہ گر پڑتی اشرف نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر کہا۔ ''فرح میں نے تو تم پر رحم کھا کر شادی کی ہے' ورنہ بدمعاش لڑکی سے تو کوئی شادی بھی نہیں کیا کرتا ہے۔ اب مجھے کیا پتا کہ تمہارا یارانہ خطوط سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچا تھا۔ ہماری شادی میں شجاع شریک نہیں ہوا۔ اس کا مطلب تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ منہ دکھانے کے قابل ہوتا تو ضرور آتا۔ اس کے کرتوت ہی ایسے تھے کہ شادی سے پہلے وہ گاؤں سے چلا گیا۔''

''اسے کچھ نہ کہنا۔ اس کی کوئی غلطی نہیں۔'' یکبارگی اس کے منہ سے نکلا۔

''الو کی پٹھی......! میرے گھر میں بیٹھ کر بھی اس کی وکالت کرتی ہے۔'' اشرف نے ایک ہاتھ اس کی کمر پر مارا اور وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جھونکا کھا کر اس کے قدموں پر گر پڑی۔

اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کانوں میں کئی دھاتیں وہ پگھلا پگھلا کر ڈال رہا ہو۔

سہاگ رات ایسی بھی ہوتی ہے' ایسا تو اس نے کسی سے بھی نہ سنا تھا۔

وہ تو پہلے ہی زخم خوردہ تھی...... اور اب تو وہ اپنے ہر مسام پر ایک ایک آبلہ لیے بیٹھی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ کس طرح ہے۔ کس طرح وہ سانس لے رہی ہے۔ کس طاقت سے وہ دیکھ رہی ہے اور کس احساس تلے وہ خود کو محسوس کر رہی ہے۔

''یہ ٹکر ٹکر دیکھ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہے کہ تو بہت معصوم ہے' کسی سے تیرا یارانہ نہیں' میں تجھ پر بہتان گڑھ رہا ہوں۔ جا معاف کیا میں نے تجھے کہ تیرے یہ خط فوٹو اسٹیٹ کروا کے میں نے تیرے خاندان میں نہیں بانٹے' تیری بہنوں کے سسرالوں میں نہیں بھجوائے...... کہ کہیں بھی تم لوگ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ مان میرا احسان کہ تجھے وہ عزت دے رہا ہوں' جس کے تو قابل نہیں تھی۔''

تب یک بارگی فرح کی آنکھوں تلے اندھیرا سا آ گیا۔

اپنی معصوم سی محبت کی اتنی بڑی سزا۔ وہ واقعی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس شخص کے ساتھ میری زندگی کیسے گزرے گی۔ اس نے سوچا۔

''اب پتھر کیوں ہو گئی تو......! جا کپڑے بدل کر آ...... یہ اداکاری میں نہیں دیکھ سکتا' جس کی تو عادی ہے۔'' وہ بستر پر لیٹ کر زہریلے لہجے میں بولا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

''ایو ماں' اجاڑ وخت کاں سے کاں پہنچ گیا' ہور کا ماں دیکھو تو کتے پڑے۔ آج کام تن (ملازمہ) نہیں آئی تو گھر کے لوگاں کسی کام کو بی ہاتاں نہیں لگاتے۔ فانوساں پو کتی گرد جم گئی مگر کوئی صاف کرنے والا نہیں۔ اب میں کیا کیا کرنے کو بیٹھتی ماں۔ دال میں کھٹا ڈال کے پکالی۔ چاول دم دے کر رکھ دیئے۔ آج چھٹی کی وجہ سے میٹھا بی بنالی......

''اللہ مٹی پڑ کو جاؤ میری یاد...... چولھے پر خورمہ تھا ناں...... ہور میں چولھا بند بی نہیں کری۔'' ایک دم صابرہ نے ماتھا پیٹ لیا اور خدا حافظ کیے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا جو وہ اپنی بہن سے کر رہی تھیں اور بھاگتی ہوئی باورچی خانے میں آ ئیں۔ جہاں شائستہ بیگم جھپا جھپ روٹی پکا رہی تھیں اور قورمے کی پتیلی نیچے رکھی تھی۔

''آپ روٹی کائے کو بناتے بیٹھے۔ میں تو چاول پکا کے بیٹھی۔''

''سائرہ کے لیے دو پھلکے ڈال رہی ہوں' اس کو فلو ہے۔'' شائستہ بیگم نے دھیرے سے کہا۔

''آپ میرے کو بول دینا تھا ناں' جہاں میں اتنا کام کری۔ دو روٹیاں نکو بنا سکتی تھی کیا؟'' صابرہ نے اپنے کام کاج کا احسان ان پر دھرا۔

شائستہ بیگم نے ایک شکایتی نظر صابرہ پر ڈالی اور چپ چاپ باورچی خانے سے نکل گئیں۔ وہ یہ پوری کوشش کرتی تھیں کہ اپنا اور اپنی بیٹی کا کام خود کریں۔ اس کے باوجود بہوؤں کے احسانات ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ اپنے کمرے میں آ کر ان کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔

فریال بیٹا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بے عزت کیا۔ اپنی دکھی بہن کو بھی بیمار کر دیا۔ ان کی سوچ کی اڑان پھر فریال تک جا پہنچی۔ یوں بھی ان دنوں انہیں فریال کچھ زیادہ ہی شدت سے یاد آ رہی تھی۔

وہ بستر پر کمبل اوڑھ کر لیٹتیں تو انہیں یوں لگتا کہ وہ ان کے پہلو میں آ لیٹی ہو۔ تب ایک ان دیکھا سا مکالمہ ان کا شروع ہو جاتا۔

''کھانا کھا لیا فرو۔''

"ہاں کھا لیا۔"

"دودھ کا گلاس لیا۔"

"لے لیا......!"

"پھر اتنی کمزور سی کیوں لگ رہی ہو۔"

"آپ سے دور ہوں ناں۔ آپ کو یاد کرتے کرتے بے حال ہو چکی ہوں اور اس دوری نے مجھے کمزور سا کر دیا ہے۔"

"پھر میرے پاس آ جا فرو۔ دیکھ تیری ماں تجھے اتنا یاد کرتی ہے تو آ جا میرے پاس۔"

"میں تو آنا چاہتی ہوں...... مگر آپ مجھے آنے ہی نہیں دے رہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے میری چاند۔"

"ہاں امی، میں دو مرتبہ آئی اور دونوں دفعہ کسی نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔ میں کتنی دیر تک دروازے پر دستک دیتی رہی مگر کسی کو میری دستک سنائی ہی نہیں دی۔"

"فرو...... تو ایک بار پھر...... آ جا...... میں دروازہ کھولوں گی۔"

"بھائی نہیں آنے دیں گے مجھے' پھر کیا کرو گی۔"

"اگر اب ایسا ہوا تو میں بھی یہ گھر چھوڑ دوں گی۔ جس گھر میں' میری اولاد کے لیے کوئی جگہ نہ ہو' وہاں میں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"پکا وعدہ ہے ناں امی۔"

"ہاں' بیٹا پکا وعدہ ہے۔"

"پھر میں آؤں گی۔"

"جلدی آنا بیٹا، ایسا نہ ہو کہ جب تم آنے کا ارادہ کرو تو میں یہاں نہ ہوں۔"

"آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"بیٹا' اب میں زندگی کی سیڑھیاں اتر رہی ہوں۔ کیا پتا' کب اور کس لمحے زندگی کی شام ہو جائے اور میری پیاسی روح تجھ سے ملے بغیر ہی روانہ ہو جائے۔"

"امی ایسی باتیں مت کریں۔"

"پھر جلدی سے آ جا، میرے پاس۔ میرا رواں رواں تجھے دیکھنے کو ترس رہا ہے۔

"ٹھیک ہے امی' میں آؤں گی...... ضرور آؤں گی......"

"اچھا بیٹا ضرور آنا......" اور ان کی آنکھیں جل تھل سی ہو گئیں۔

☆☆☆

جمال نے باہر کی کسی کمپنی میں اپلائی کافی عرصے پہلے کیا تھا۔ وہاں سے جواب آ گیا تھا۔ اچھے مشاہیرے پر اسے دبئ جاب کی آفر آ گئی۔

"بیٹا تم جاب پر جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ قسمت بار بار دستک نہیں دیتی ہے۔" اماں نے سمجھایا۔

"نہیں اماں...... میں ربیع کے بغیر کہیں بھی رہنے کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"اب تو اس کا پلاستر بھی کھلنے والا ہے' تم خواہ مخواہ کیوں منع کر رہے ہو۔"

"مجھے تو ڈاکٹر صاحب کی یہ بات یاد ہے کہ ربیع کی ٹانگوں میں فرق نہ رہے اور ہڈی ٹھیک طرح جڑ جائے۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گی' تم خواہ مخواہ پریشان مت ہو۔"

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب ربیع کا پلاسٹر کھول دیا گیا۔ ہڈی تو جڑ گئی تھی...... مگر چال میں فرق آ گیا تھا۔ وہ [illegible] پاؤں قدرے گھسیٹ کر چل رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر جمال کا دکھ اس کے چہرے سے آشکارا تھا۔

اماں اسے حوصلہ دے رہی تھیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا پاؤں معمول کے مطابق ہو جائے گا' مگر جمال [illegible] ایسا کبھی نہیں ہو گا۔

اب وہ کالج سے آ کر اپنا سارا وقت ربیع کے ساتھ گزارتا۔ اس کے لیے طرح طرح کی کتابیں لاتا۔ اس کی [illegible] فلموں کی سی ڈیز لاتا...... یا اس کے پسندیدہ پرانے فلمی نغمے۔ جنہیں وہ بڑے شوق سے سنا کرتی تھی۔

ایک دن وہ اس کے لیے مختلف قسم کی جیولری خرید رہا تھا۔ اس نے نگین کو اپنی بہن فہمی کے ساتھ شاپنگ [illegible] دیکھا۔

جمال نے اپنی نظر ہٹا لی...... مگر نگین اسے پہچان کر اس کے پاس آئی' سلام کر کے ربیع کے بارے میں [illegible]

"کیا آپ کو ربیع کے بارے میں نہیں پتا؟" جمال نے حیران نظروں سے پوچھا۔

"ربیع کو کیا ہوا؟" اس کے چہرے پر بے چینی سی پھیل گئی۔

"ٹریفک حادثے میں اس کے دونوں پیر کچل گئے تھے' ایک ٹخنے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب ہڈی تو جڑ گئی [illegible] اس کی چال میں لنگ سا آ گیا ہے۔

"اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔" نگین کا چہرہ دکھی سا ہو گیا۔ "میں امی کے ساتھ آؤں گی...... آپ کے گھر۔" [illegible] نے اس سے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی......" جمال اس کو دیکھ کر اگلی دکان میں چلا گیا۔ اس کی موجودگی میں وہ خریداری کر رہی [illegible] تھا۔

"یہ کون حضرت تھے' جن سے تم یوں تڑ تڑ باتیں کر رہی تھیں۔" فہمی کو اس کا یوں بے تکلفانہ انداز قطعی نہیں [illegible]

"حیرت ہے' اپنے محلے کے ہیں پروفیسر جمال۔ ان کی بہن ربیع ہمارے گھر آئی تھی۔ آپ کی شادی کا تحفہ [illegible] کر گئی تھی۔"

"اب اپنا تحفہ پکا کر رہی تھیں کیا؟" فہمی نے ہنس کر کہا۔

"اب وہ تحفہ کیا دے گی' وہ تو خود بیمار پڑی ہے اپنے گھر میں۔" نگین نے بے چارگی سے کہا۔ اسے ربیع کے [illegible] جان کر دلی افسوس ہوا تھا۔

☆☆☆

[illegible] ماہ بعد سائرہ نے اسکول جوائن کیا تھا۔ کمزور تو وہ پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی' مگر اب اس کی طبیعت بالکل [illegible] اس کی کولیگز اس کو اپنے درمیان پا کر بہت خوش تھیں۔

"آج گلابی سوٹ میں سائرہ بالکل کھلی ہوئی کلی لگ رہی ہے۔ اگر کسی بانکے سجیلے کی اماں دیکھ لیں تو فوراً

رشتہ دے دیں۔" ایک ٹیچر نے ہنس کر کہا۔

"مگر بے چاری کو مایوس و نامراد جانا پڑے گا کہ جاوید صاحب کی بیگم کو بھلا کوئی ایسی ویسی نظروں سے د سکتا ہے۔" دوسری ٹیچر نے بھی ہنس کر کہا۔

فری پیریڈز میں اس کے اسکول کی ٹیچرز ایسے ہی مذاق زیادہ کیا کرتی تھیں۔

"راحیلہ میری بات سنو گی تم۔" کاپیاں کریکشن کرتے ہوئے سائرہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

"ہاں ہاں بولو...... کیا بات ہے؟"

"میرا اب جاوید سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"ارے لڑائی جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے۔ اب معاف بھی کر دو ناں، خواہ مخواہ...... بیکار کی باتوں کو طول دے رہی ہو۔" مسز جمشید اپنے بچے کا ٹوپا بنتے ہوئے بولیں۔

"ہم میں علیحدگی ہو چکی ہے۔ پلیز، اب جاوید کا ذکر میرے حوالے سے مت کیا کریں۔" سائرہ نے بڑی ہمت سے یہ جملہ کہا اور سامنے رکھا پانی کا گلاس چڑھا گئی۔

"ارے کب ہوئی طلاق...... اف...... آہ...... اوہ......" کی آوازیں...... تعزیت سی کرنے لگیں۔

"پلیز...... میرے حال پر رحم کریں...... اور اس حوالے سے کوئی بات نہ کریں۔" اس نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا "اب ہم علیحدہ ہو چکے ہیں۔"

"ارے لعنت بھیجو۔ وہ تم جیسی لڑکی کے قابل ہی نہیں تھا۔" اب تعزیت کا انداز دوسرا رخ اختیار کر گیا تھا۔

"مجھے کسی پر کچھ بھی بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب مقدر میں کسی کا ساتھ نہیں ہوتا تو ایسے ہی حوالے ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی ٹیڑھی میڑھی باتیں آ جاتی ہیں۔ مجھے کوئی ملال نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو بھی میرے لیے غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اور پھر کسی نے بھی سائرہ سے اس موضوع پر بات کرنے کی جسارت نہیں کی۔

وہ جو اسکول سے صرف اس وجہ سے بھاگ رہی تھی کہ لوگوں کی باتیں برداشت کرنے کی اس میں نہ ہمت تھی اور نہ ہی سکت۔ ماں کے مفید مشورے پر عمل پیرا ہونے سے اس کی پریشانیاں کافی حد تک ختم ہو گئی تھیں۔ باقاعدگی سے اسکول جانے سے اس کا وقت بھی اچھا گزر رہا تھا اور ذہن بھی اپنی طالبات میں لگ جاتا تھا۔ سائرہ کو صحت مند ہوتا دیکھ کر شائستہ بیگم بھی خوش تھیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ جس نے موت کے منہ میں جاتی سائرہ کو واپس بلا لیا تھا۔

☆☆☆

زبور کی ممی اپنے بیٹوں کے ساتھ جب تیسری مرتبہ فرید احمد کے گھر آئیں تو انہوں نے رشتہ کرنے کی ہامی بھر لی۔

"پہلے آپ ہمارے گھر آیئے، اس کے بعد ہم ایک چھوٹی سی رسم کرنے آپ کے گھر آئیں گے۔" مسز شاہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم آپ کے ہاں اس اتوار کو آئیں گے۔"

"نگین کو بھی آپ اپنے ساتھ ضرور لایئے گا۔" زبور کی ممی نے چاہت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایسا کرنا میرے لیے مشکل ہوگا، کیونکہ ہمارے ساتھ بیٹی اور داماد کے ساتھ میری نند بھی ہوں گی۔ اگر

نگین ہمارے ساتھ جائے گی تو انہیں باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔"

"کتنی عجیب بات ہے، جن کی خوشی کے لیے ہم یہ سب کر رہے ہیں، وہی انجوائے نہ کر پائیں۔ میرا زبور تو نگین کی کمی ضرور محسوس کرے گا۔"

"آپ جب ہمارے ہاں آئیں تو اپنے ساتھ زبور کو ضرور لے کر آئیں، مگر اس کو ہماری مجبوری سمجھ لیں۔" فیروزہ بیگم نے انہیں سمجھایا۔

"آپ اپنے ساتھ جتنے مہمان لانا چاہیں لے آئیں۔ بس ہمیں تعداد بتا دیں کہ کتنے مہمان آپ کے ساتھ آئیں گے۔"

فیروزہ بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا، ان کا دل چاہا کہ کہہ دیں کہ پچاس کے قریب مہمان ہوں گے...... کہ چند قریبی دوستوں کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔

"ہم صرف گھر کے لوگ ہی آئیں گے۔ ہماری سمدھن، میری بڑی بیٹی فہمی اور اس کا شوہر ہمارے ساتھ ہوں گے۔" فرید احمد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔"

ممانی جان کو جب فہمی نے بتایا تو وہ اسی وقت ان کے گھر آ گئیں اور فیروزہ بیگم سے کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔

"یہ تمہارے کون سے ملنے والے ہیں، فہمی کی شادی میں تو آئے ہوں گے۔ دیکھا تو میں نے ضرور ہوگا۔ مہماں......؟"

"نہیں آپا آپ نے دیکھا بھی نہیں، ان دنوں مسز شاہ اپنے بچوں کے پاس کینیڈا گئی ہوئی تھیں۔"

"اچھا لڑکا تو آیا ہوگا، وہ کیا کرتا ہے؟"

"خالی لڑکے کو بلا کر میں کیا کرتی۔ وہ جیولر ہے۔ صدر میں بہت بڑی شاپ ہے ان کی، دبئی میں بھی اس کی والی ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔"

"حیرت ہے، جیولر داماد ہے، پھر بھی تم نے فہمی کے جہیز کا زیور اس کی دکان سے نہیں خریدا۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ سونا ہمیشہ جاننے والے کی دکان سے خریدنا چاہیے۔" ممانی جان بھی اپنے داؤ پیچ سے معلومات حاصل کرنا چاہ رہی تھیں۔

"اس وقت یہ تھوڑی پتا تھا کہ زبور میرا داماد بنے گا۔" فیروزہ بیگم نے سنبھل کر کہا۔

"اچھا، پھر کب پتا چلا۔"

"چند دن پہلے زبور کی امی رشتہ لے کر آئی ہیں، تو ہم نے اس بارے میں سوچا۔ ورنہ ہم نے تو اس نہج پر سوچا ہی نہیں تھا۔ ہاں حلقہ دوستی میں یہ گھرانا عرصے سے شامل تھا اور بہت محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا۔ فہمی کا اور اسی وجہ سے تو نہیں لیا کہ یہ لوگ پیسے ہی نہ لیتے اور یہ سب ہمیں منظور نہیں تھا۔"

"اب اتنے بڑے گھرانے میں رشتہ جوڑا ہے، تو اتوار کو کیا لے کر جاؤ گی؟" ممانی جان، فیروزہ سے پوچھ رہی تھیں۔

"آپ بتایئے، میں کیا لے کر جاؤں، مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں ہے، فہمی بھی گھر میں گئی...... تو ان باتوں کا کبھی خیال ہی نہیں رکھا۔" فیروزہ نے پوچھا۔

"کم از کم گیارہ کلو مٹھائی ہو۔ دو اچھے قسم کے بوکے ہوں۔ زبور کے لیے ہار ہو، ماں، بہنوں کے لیے پھولوں کے کنگن ہوں۔ چاہو تو زبور کے لیے کوئی انگوٹھی بھی لے لو۔"

"انہوں نے انگوٹھی لانے کو منع کیا ہے، یوں بھی جیولر فیملی ہے۔ ہم کتنی ہی اچھی انگوٹھی لے جائیں ان کی آنکھوں میں جچے گی تھوڑی۔"

"ہاں یہ تو ہے، پھر بھی لڑکے کے لیے ایک اچھا سا کرتہ شلوار لے لو۔ لڑکے کی ماں اگر شلوار قمیص پہنتی ہیں شلوار قمیص کا جوڑا لے لو اور اگر وہ ساڑی پہنا کرتی ہیں تو ایک اچھی سی ساڑی لے لو اور ایک جوڑا زبور کے باپ کے لیے لے لو۔"

"آپا، کوئی منگنی تھوڑی ہو رہی ہے، ہم نے صرف رشتہ قبول کیا ہے اور اس خوشی میں انہوں نے ہماری دعوت کی ہے، تو اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" فیروزہ نے گھبرا کر کہا۔

"یوں تو تم ایک کلو کا مٹھائی کا ڈبا بھی لے جاؤ گی تو کوئی بات نہیں ہوگی، اور اپنے گھر میں رشتے ناتے کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان سب تکلفات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ہے۔"

"مگر جب لڑکی باہر دی جاتی ہے اور سمدھیانہ بھی ہم سے مالی لحاظ سے بھاری ہو تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"یوں تو زبور کی ایک بہن بھی ہے، اس کو اگر کچھ نہیں دیا تو شاید اسے اچھا نہ لگے...... اور پھر یہ سات آٹھ بھائی بھی ہیں۔ اتنے سارے لوگوں کے جوڑے گھوڑے تو میں نہیں دے سکتی۔" فیروزہ بیگم نے اکتا کر کہا۔

"ہاں بہن کو بھی ایک جوڑا دے دو، وہ خوش ہو جائے گی، اور اس سے زیادہ اس کی ماں ہوگی کہ انہوں نے میری بیٹی کو اہمیت دی۔" ممانی جان فیروزہ کو سمجھا رہی تھیں۔

"میرے پاس گھر میں بہت سے ان سلے سوٹ رکھے ہوئے ہیں، آپ دیکھ لیں تو ساڑی اور سوٹ گھر میں ہی سے نکل آئیں گے۔" وہ انہیں لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں اور ایک اٹیچی کھول کر ان کے سامنے کپڑے ڈھیر کر دیئے۔

"فیروزہ برا مت ماننا، جو کپڑے تم نے سینت کر رکھے ہوئے ہیں اب ان کا دور دور فیشن نہیں ہے۔ میں گھر میں رہنے والی عورت ضرور ہوں مگر کپڑے کی اتنی پرکھ ضرور رکھتی ہوں کہ اب دو ولی کی ساڑیاں فیشن میں نہیں ہیں۔ شاموز کے سوٹ بھی پسند نہیں کیے جاتے۔ سلک اور بنارسی کپڑے کا فیشن ہمیشہ رہتا ہے، اگر اس کے جوڑے یا ساڑیاں ہوتیں تو تمہارے کام میں آ جاتیں۔"

"اب ان کپڑوں کا میں کیا کروں گی۔ سال ہا سال سے جمع کر رہی تھی میں۔" فیروزہ تو روہانسی ہو گئیں۔

"عقل مند یہی کہتے ہیں کہ کپڑا کبھی جمع نہیں کرنا چاہیے، ضائع تو خیر نہیں ہوگا۔ ادھر ادھر لینے دینے میں کام آ جائے گا کہ تحائف ہر قسم کے آتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی جوڑا تمہارے پیسے والے سمدھیانے میں دینے کے قابل نہیں ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" فیروزہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

"اب مشورہ دے رہی ہوں تو تمہارے ساتھ بھی چلنے کو تیار ہوں۔ مارکیٹ سے اچھی قسم کے جوڑے خرید لو...... اور اگر گھٹیا خریدنا چاہتی ہو، تو مت دو...... کہ نہ دینے پر وہ برا نہیں مانیں گے، جتنا لے کر وہ ناخوش ہوں گے۔"

"برے کیوں دوں گی، اچھے ہی خریدوں گی...... مگر آپ میرے ساتھ چلیے۔"

تب فیروزہ بیگم اپنی بھاوج کے ساتھ جا کر زبور کی امی کے لیے فرنچ شفون کی پلین ساڑی، ان کی بیٹی کے لیے سلک کا ایمبرائیڈری کا سوٹ، والد کے لیے اور زبور کے لیے سوٹ کا کپڑا خرید لائیں۔ جسے فرید احمد نے بھی بہت پسند کیا۔

زبور کے گھر والوں نے اپنے مہمانوں کا بھرپور سواگت کیا۔ سب کو ہار پہنائے...... اور ایک پرتکلف عشائیے کا اہتمام کیا۔ نگین کے لیے ڈھیر سارا کھانا پیک کروا کے واپسی پر بھجوایا۔

فرید احمد وہاں سے آ کر مسلسل تعریف کر رہے تھے۔ فہمی اور ان کے شوہر بھی وہاں لوگوں کے سلیقے اور محبت کو سراہ رہے تھے۔ سوائے ممانی جان کے کہ زبور کے گھر والوں نے انہیں اپنے گھر میں بلا کر اپنے پیسے کا تماشا دکھایا ہے کہ ہم تم سے بہت بڑے ہیں اور تم لوگ ہم سے بہت کم تر ہو۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، اگر وہ لوگ ہماری خاطر و مدارات نہیں کرتے تو آپ کہتیں کہ ان لوگوں نے اپنے حساب سے مہمان داری نہیں کی۔"

"میں نے تو صاف بات کی ہے، اگر تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

آئندہ اتوار ان لوگوں کے آنے کا تھا، وہ بھی گھر ہی کے لوگ آ رہے تھے مگر فیروزہ بیگم ان کا سجا سنورا گھر دیکھ آئی تھیں۔ اس لیے ڈرائنگ روم کے پردے بدل دیئے، قالین چینج کیا۔ ایک نیا صوفہ خریدا گیا۔

ہاں کھانا سب گھر میں پکا۔ فہمی ایک دن پہلے سے آ گئی تھی۔ اس کے ہمراہ ممانی جان بھی ساتھ آ گئی تھیں۔

اور جس دن وہ لوگ آنے والے تھے نگین کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی خوشیوں میں کس کس کو شریک کر ڈالے۔

گھر کا کونا کونا اس نے صبح سے ہی چمکا دیا تھا اور شام کو نہا دھو کر اس نے وہی سوٹ پہن لیا تھا جو عید کے موقع پر زبور نے اسے گفٹ کیا تھا اور جسے اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا کر رکھا تھا۔

"یہ سوٹ تم نے کب خریدا تھا۔" فیروزہ بیگم نے اس کو پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ فہمی باجی نے گفٹ کیا ہے۔ پرسوں تو لائی ہیں وہ میرے لیے۔" نگین نے اپنی بہن کا ہاتھ آہستہ سے دبا کر کہا۔

"ہاں، بہت اچھا ہے۔ میری فہمی کی جو پسند ہے۔" فیروزہ بیگم تعریف کر کے کسی کام سے اٹھ گئیں۔

"نگین یہ تو تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہاری شادی زبور سے ہو رہی ہے۔ اگر نہ ہوتی تو تم ان چیزوں کو دیکھ کر آنسو بہانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کر پاتیں۔"

"باجی، میری محبت سچی تھی، اس لیے زبور مجھے مل رہا ہے۔ اگر میری محبت میں کھوٹ ہوتی تو کبھی نہ ملتا۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"شاید یہی بات ہو۔" فہمی بھی مسکرا دی۔

مقررہ وقت مسز شاہ آئیں...... تو اس قدر تام جھام سے آئیں کہ گھر والے ہکا بکا رہ گئے۔

نگین کے لیے پانچ بھاری بھرکم جوڑے، ایک سونے کا سیٹ، فیروزہ بیگم، ممانی جان اور فہمی کے لیے سلکی لاٹ۔ فرید احمد اور فہد کے لیے عمدہ قسم کے سوٹ۔ نگین کی چوڑیاں، سینڈلیں اور میچنگ کا ڈھیروں ڈھیر سامان تو تھا۔ اس کے ساتھ بڑا سا بیوٹی بکس اور گیارہ مٹھائی کے اور گیارہ پھلوں کے ٹوکرے۔

زبور خود بھی ساتھ آیا تھا اور شرمایا شرمایا سا بیٹھا تھا۔ اس کا بڑا بھائی مسلسل مووی بنا رہا تھا۔ دوسرا بھائی ہر ہر

زاویے سے سب کی تصاویر بنا رہا تھا۔

''بہن آپ نے تو بہت تکلف کر ڈالا۔'' فیروزہ بیگم نے ان سے کہا۔

''یہ سب میں نے اپنی ہونے والی بہو کے لیے کیا ہے' کسی پر کوئی احسان تھوڑی کیا ہے اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو میرے پتا نہیں کتنے ارمان ہیں جو میں پورے کروں گی۔''

مسز شاہ کی خواہش تھی کہ ان کے لائے ہوئے جوڑوں میں سے کوئی جوڑا پہن کر نگین سب کے سامنے آئے۔ مگر فیروزہ بیگم نے پھر معذرت کی کہ نہ تو ہمارے ہاں منگنی ہوتی ہے اور نہ ہی شادی سے پہلے لڑکی کو اس طرح سجا سنوار کر سسرال والوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

نگین سمپل سی بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت پر ڈارک سوٹ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ مسز شاہ نے اس کو دیکھ کر اس پر سے ہزار کا نوٹ اتار کر ان کے گھر کی ماسی کو دے دیا۔

زبور اسے بار بار کن انکھیوں سے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

بسم اللہ پڑھ کر مسز شاہ نے ہیرے کی موٹی سی انگوٹھی اپنے پرس سے نکالی اور نگین کی انگلی میں ڈال دی اور نگین کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اس کے پرس میں پانچ ہزار کا لفافہ رکھ دیا۔

''اب یہ ہماری بیٹی ہے اور ہم بہت جلد اسے اپنے گھر لے جائیں گے۔'' وہ فیروزہ بیگم سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ کی امانت ہے آپ جب دل چاہے لے جایئے گا۔'' فیروزہ بیگم کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مہمان کھانا کھا کر رخصت ہوئے تو ممانی جان بولیں۔ ''فیروزہ تم نے تو بہت اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے۔''

''بھابی! میں ہاتھ مارنا جانتی تو فہمی کے لیے بھی کوشش کرتی۔ یہ سب نصیب کی باتیں ہیں۔''

''پھر بھی...... وہ لوگ بہت امیر ہیں۔'' ممانی جان کو بھی جوڑا ملا تھا...... اور وہ ان کو پسند بھی بہت آیا تھا اس لیے وہ زبور کے گھر والوں کی مسلسل تعریفیں کر رہی تھیں۔

''بھابی! امیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا دل بھی بڑا ہے' بہت سے لوگ امیر ہوتے ہیں مگر بے حد کنجوس ہوتے ہیں۔ مجال ہے کہ اپنا پیسہ وہ خرچ تو کر دیں۔'' فیروزہ نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ میری بہن کی قسمت اچھی ہی رکھے' جیسے قدر دان وہ نظر آ رہے ہیں' اللہ کرے وہ ویسے ہمیشہ رہیں۔'' فہمی نے کہا۔

اگلے دن فہمی اور ممانی جان اپنے گھر چلی گئیں۔

نگین اپنے موبائل پر زبور سے باتیں کرنے لگی۔ اس کی پیار بھری باتوں میں شوخی مزید بڑھ رہی تھی۔

پوسٹ مین نے بیل بجا کر خط دیا تو فرید احمد لفافے کی پشت پر رشید احمد کا نام پڑھ کر حیران ہو گئے۔

''کس کا خط آیا ہے؟'' فیروزہ نے ماسی کو ٹرے دیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ایک پاؤ والے مٹھائی کے ڈبے محلے میں بٹوا رہی تھیں۔

''رشید کا خط آیا ہے امریکا سے۔'' انہوں نے لفافہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

اور خط پڑھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''کیا ہوا...... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔'' فیروزہ میاں کو یوں پریشان دیکھ کر بولیں۔

''ایک گلاس پانی مجھے دے دو......'' وہ بمشکل بولے اور خط پھر کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا۔

☆☆☆

''رشید' تم نے بھی حد کر دی' اتنی تاخیر سے خط لکھا'' فرید احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر خط لفافے میں رکھ دیا۔

''کیا بات ہے؟'' فیروزہ میاں کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھیں' جس کے رنگ پل پل بدل رہے تھے۔

''رشید بہت بیمار ہے' ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کے بچنے کی بالکل امید نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر کوئی خدا تھوڑی ہو گئے' جو ان کی ہر بات سچ ہو گی۔ دیکھ لینا آپ' رشید بھائی ٹھیک ہو جائیں گے۔ بڑی خالہ کی نند کو ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں نکال سکیں گی' آج اس بات کو آٹھ سال ہو گئے۔ وہ فاتحہ کا مستقل وِرد رکھنے کی وجہ سے وہ ماشاءاللہ بھلی چنگی ہیں۔ آج کل ڈاکٹر ایسے ہی ہولاتے ہیں' آپ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔'' فیروزہ نے میاں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''رشید نے ایک دوسری بات بھی لکھی ہے'' فرید احمد نے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''کیسی بات؟'' فیروزہ نے فرید احمد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم یہ خط خود ہی پڑھ لو'' انہوں نے لفافہ فیروزہ کو پکڑا دیا۔

خط پڑھ کر فیروزہ کا سر بھی گھوم سا گیا' پاس رکھا پانی کا گلاس وہ چڑھا گئیں۔

''اسے کہتے ہیں قسمت! اگر یہ خط چند روز قبل ہمیں مل جاتا تو ہم کیوں نگین کا رشتہ زبور سے کرتے۔ کس آسانی سے ہاتھ سے اتنی کثیر رقم نکل گئی'' فیروزہ کا لہجہ افسردگی سے رچا ہوا تھا۔

''رشید نے ہر کام دیر سے کیا...... اپنی بیماری کی اطلاع بھی اتنی تاخیر سے دی...... اور خط بھی سوچ سوچ کر لکھا فون ہی کر دیتا...... تو آج ہم یوں تہی دامن تو نہ ہوتے'' فرید احمد ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''ہم بھائی رشید کو بتا دیں گے کہ نگین کی منگنی کے بعد تمہارا خط ملا...... ورنہ ہم تمہاری بات ضرور مانتے۔ تو وہ تھوڑی بہت رقم ہمیں وہ دے ہی دیں......'' فیروزہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تمہارے خیال سے وہ کتنی رقم دے دیں گے؟''

''زیادہ نہ سہی' بس بارہ کروڑ دے دیں' چار کروڑ میں نگین کو دے دوں گی' چار کروڑ فہمی کو اور بقیہ چار کروڑ ہم وہ لے لیں گے اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اگر نگین ان کی بھتیجی ہے تو فہمی بھی ہے اور آپ ان کے بھائی' اس طرح بارہ کروڑ وہ اپنی بہن اور ان کے دونوں بچوں میں بانٹ دیں' دونوں گھرانے نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ ان کو خوب دعائیں بھی دیں گے۔''

''تم خط کا متن سمجھی ہی نہیں ہو' اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر نگین کی شادی شجاع سے نہیں ہوتی تو یہ رقم ان کو نہیں دی جائے گی۔ اس کا اس رقم کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ بھائی اور بہن کے گھرانے آپس میں جڑے رہیں۔''

''پھر تو ہماری یہ لاٹری نہیں نکلی......'' فیروزہ کا چہرہ غم زدہ سا ہو گیا۔

''ہاں' یہ دکھ بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ پیسہ آیا اور دستک دے کر آگے نکل گیا۔''

’’رشید بھائی نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ آپا کو انہوں نے خط لکھ دیا ہے اور وہ ان کے خیال سے سو فیصد مت
ہیں تو کیا آپا ہمیں یہ بات فون کر کے نہیں بتا سکتی تھیں؟‘‘

’’گزشتہ ایک ماہ سے تو فون کے تار ہم نے از خود الگ کر رکھے تھے۔ صرف ہفتہ' دس دن ہی تو ہوئے ہی
جب ٹیلی فون کا سلسلہ بحال ہوا ہے۔‘‘

’’اس کا تو یہ صاف مطلب ہے کہ نگین کی قسمت میں شجاع کا ساتھ نہیں تھا اور جب زبور سے اس کا ناتا
ہی گیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔‘‘ فیروزہ کا ملال کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں میں پچاس کروڑ کی
مختلف شکلوں میں ناچ رہی تھی۔

’’اب کر ہی کیا سکتے ہیں ہم......‘‘ فرید احمد دیوار کے سہارے سے اٹھ کھڑے ہوئے......اور صحن میں خوا
مخواہ چکر لگانے لگے۔

ربیع کے گھر مٹھائی لے کر نگین خود گئی تھی حالانکہ فیروزہ بیگم نے اسے منع بھی کیا تھا کہ لڑکیاں اپنی منگنی
مٹھائی خود نہیں بانٹا کرتیں۔

’’مجھے ربیع کی عیادت کے لیے بھی جانا ہے' وہ کیا سوچے گی کہ اس کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور میں
لگ جانے کے بعد بھی اسے دیکھنے کے لیے نہیں آئی۔‘‘

’’پورے محلے میں مائی مٹھائی بانٹ رہی ہے' ان کے ہاں تم جاؤ گی؟‘‘

’’تو کیا ہوا' یہ میری منگنی کی مٹھائی ہے' مجھے ہی بانٹنی چاہیے‘‘ نگین نے ہنس کر کہا۔

’’ٹھیک ہے' چلی جاؤ۔ میری طرف سے بھی پوچھ لینا اور بتا دینا کہ تمہارے ابا کی علالت کی وجہ سے گھر
نکلنا نہیں ہوتا ورنہ میں بھی آتی۔‘‘

نگین جب گھر سے باہر نکلی' اس وقت فرید احمد خط پڑھنے میں محو تھے ورنہ اسے ٹوک ہی دیتے کہ وہ مٹھا
دینے ان کے گھر خود کیوں جا رہی ہے۔

ربیع گھر میں بستر پر بیٹھی کتابیں پڑھ رہی تھی۔ جب وہ اس کی ماں کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچی تو ر
کا چہرہ نگین کو دیکھ کر کھل سا گیا۔

’’میں آپ کو بے حد یاد کر رہی تھی' شاید میری دعا قبول ہو گئی' آپ خود ہمارے گھر آ گئیں۔‘‘

’’میں تو اس سے پہلے آ جاتی مگر مجھے پتا ہی نہیں چلا۔‘‘

’’یہ مٹھائی کس سلسلے کی ہے؟‘‘ ربیع کی ماں نے خصوصی طور پر تیار کیے ہوئے ڈبے پر منگنی مبارک لکھا دیکھا
پوچھا۔

’’میری انگیج منٹ ہوئی ہے‘‘ وہ شرما کر بولی۔

’’ارے اتنی جلدی آپ کی منگنی ہو گئی اور ہم سوچتے ہی رہ گئے‘‘ ربیع کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

’’کیا مطلب......؟‘‘ وہ چونکی۔

’’برا مت مانیے گا نگین! آپ کو جب سے دیکھا تھا' میں آپ کو اپنی بھابی کے روپ میں دیکھنے لگی تھی.
میری یہ دلی خواہش تھی کہ جمال بھائی کی شادی آپ سے ہو۔‘‘

’’اب تم نے دیر کر دی تو اس میں میرا کیا قصور...... ورنہ میرے بھی مزے ہوتے کہ اپنا میکا دو قدم پ
چھت پر چڑھے اور امی کو ہاتھ ہلا دیا‘‘ نگین نے شوخی سے کہا۔

’’اگر ایسی بات ہے تو صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے' آپ ختم کر دیں اور ہم جھٹ جمال بھائی سے آپ کی شادی کر دیں گے۔ میرے بھائی اتنے اچھے ہیں......اتنے اچھے ہیں' اتنا اچھا کوئی ہو ہی نہیں سکتا......‘‘ ربیع شدت جذبات میں کہتی چلی گئی۔

’’ربیع! ایسا نہیں کہتے......‘‘ نگین نے پریشان ہو کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔

ربیع نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ’’کیا تمہاری منگنی اپنی پسند سے ہوئی ہے؟‘‘

’’نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ وہ اپنے دل کا چور چھپاتے ہوئے ہنس دی۔

’’بیٹا......! زبان کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ جب ہامی بھر لی تو پھر اس پر قائم رہتے ہیں۔‘‘ ربیع کی ماں نے شربت کا گلاس نگین کو دیتے ہوئے ربیع کو سمجھایا۔

’’مگر جمال بھائی کے لیے تو نگین سے اچھی کوئی نہیں ہو سکتی......‘‘ وہ کسی معصوم بچے کی طرح سادگی اور محبت سے رچے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

’’ایسا کیوں کہہ رہی ہو......لڑکیوں کی کوئی کمی ہے بھلا......ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہیں......اور تم دیکھ لینا' جمال صاحب کو بہت اچھی لڑکی ملے گی' مجھ سے بھی اچھی۔‘‘

’’آپ سے اچھی تو ہو ہی نہیں سکتی‘‘ ربیع نے کہا۔

’’یہ تمہاری محبت ہے ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔‘‘

’’پتا نہیں کیوں' مجھے جمال بھائی کے لیے جب بھی خیال آیا' آپ ہی کا آیا۔ امی نے سوچا تو آپ کے بارے میں سوچا۔‘‘

’’اچھا......‘‘ نگین ربیع کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہنسنے لگی۔

’’جمال بھائی کے سامنے جب بھی شادی کا نام لیا جاتا تھا' موضوع بدل دیا کرتے تھے مگر میں جب آپ کا نام لیتی تھی تو مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل جاتی تھی۔ میرا یہ پکا خیال تھا کہ وہ آپ کے بارے میں منع کرتے ہیں مگر دل سے منع نہیں کرتے۔ آپ کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں ستارے سے چمکتے میں نے دیکھے تھے اور اب آپ کی بھی منگنی ہو گئی......ان کو پتا چلے گا......تو کیسا دکھ ہو گا انہیں۔‘‘

’’میری منگنی سے انہیں دکھ کیوں ہو گا......؟‘‘ نگین نے حیرت اور دکھ سے ربیع سے پوچھا۔

’’وجہ تو مجھے نہیں پتا اور نہ ہی بھیا بتائیں گے' بس......یہ میرا اپنا خیال ہے۔‘‘

’’ربیع' تمہارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو تمہارے بھائی سے صرف ایک آدھ بار ہی ملی ہوں۔‘‘ نگین کو اب اس ذکر سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

’’بے شک آپ ہمارے گھر بھی کبھی نہیں آئیں مگر میں روز آپ کو اپنے گھر سے دیکھتی تھی، کالج آتے جاتے اور آپ مجھے اچھی لگتی تھیں......اور یوں میں آپ کا ذکر اپنے بھیا سے کرتی رہتی تھی اور بھیا میری باتوں کا بس ہوں ہاں سے دیتے رہتے تھے۔‘‘

’’اب کیا بیکار کی باتیں لے کر بیٹھ گئی......جس کا جہاں نصیب ہوتا ہے' وہیں جاتا ہے۔ اللہ اسے اپنے گھر میں خوش رکھے۔‘‘ ربیع کی امی نے ربیع کی باتوں سے پریشان ہو کر کہا کہ وہ اس موضوع سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔

’’ٹھیک ہے امی' مگر میں جمال بھائی کو نہیں بتاؤں گی کہ نگین کی کہیں منگنی ہو گئی ہے‘‘ ربیع نے ماں کو جتاتے ہوئے کہا۔

''وہ پوچھے گا کہ یہ کس کی منگنی کی مٹھائی آئی ہے تو کیا کہے گی؟''

''میں کہہ دوں گی' ان کے ہاں کوئی مہمان آئے ہوئے تھے' ان کی منگنی ہوئی ہے' اس کی مٹھائی آئی ہے۔''

''جو دل چاہے کہہ دینا'' امی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''اچھا' اب میں چلتی ہوں'' نگین اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز' تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیے۔ شادی کے بعد آپ کہاں آ سکیں گی ہمارے گھر۔''

''شادی کے بعد میں اسی شہر میں رہوں گی...... آتی جاتی رہوں گی۔''

''آپ کے رشتے داروں میں رشتہ ہوا ہے کیا؟''

''نہیں' رشتے دار تو نہیں...... ہاں امی اور ابو کے فیملی فرینڈز ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں؟'' ربیع کی جرح کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''جوئیلر ہیں...... کراچی میں کئی شاپس ہیں اور دوبئی میں بھی ان کی برانچ ہے۔'' نگین کا لہجہ زعم بھرا سا ہو گیا۔ اب وہ کھڑے ہو کر جانے کا قصد کر رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے بہت بڑے لوگ ہیں وہ'' ربیع کا چہرہ اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اتر گیا۔

''بہت بڑے تو نہیں ہیں موصوف کا قد تو پانچ فٹ دس انچ ہے۔'' نگین نے مذاق میں بات ٹالتے ہوئے کہا تو ربیع بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اچھا خدا حافظ!'' نگین نے اسے الوداعی بوسہ کرتے ہوئے جانے کی اجازت چاہی اور آنٹی کو سلام کرتے ہوئے گھر سے باہر قدم نکالا۔

جمال گھر کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ نگین کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر حواس باختہ سا ہو گیا۔

''آپ اور یہاں......'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''ربیع کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔''

''تو پھر بیٹھیے ناں؟''

''بہت دیر سے آئی ہوئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے......'' اس نے نظریں جھکا لیں اور جانے کیسے اس کی نظریں نگین کے پیروں پر لگی مہندی کی بیل میں الجھ گئیں۔ چھنگلی کے برابر کی انگلی میں خوبصورت سا چھلا بھی تھا...... آن کی آن میں نظریں اس کے ہاتھوں کی مہندی پر آ کر رک گئیں۔

''مبارک ہو!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

دو قدم بڑھانے کے بعد وہ مڑی اور حیرت سے پوچھا ''آپ کو معلوم ہے؟''

''کیا معلوم ہے؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میری منگنی کا......؟''

''ہاں......'' وہ کچھ سوچ کر مسکرایا اور تیزی سے گھر کے اندر قدم بڑھا دیے جہاں ربیع اپنی مما سے کہہ رہی تھی ''امی! آپ مٹھائی کو پلیٹ میں رکھ دیں اور اس ڈبے کو کوڑے کی باسکٹ میں ڈال دیں...... جس پر جلی حرفوں میں منگنی مبارک لکھا ہوا ہے۔''

☆☆☆

اسکول کی کسی ٹیچر کے توسط سے سائرہ کا رشتہ آیا تھا۔ جمیل اختر کی پہلی بیوی مر گئی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بھی تھے۔ وہ سائرہ کے ساتھ عقد ثانی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ایک بہن سائرہ کے ساتھ اسکول میں پڑھاتی تھیں۔

شائستہ بیگم نے سوچ کر جواب دینے کا کہا تھا مگر شاہنواز اور ثریا نے جب سنا تو گھر میں فضیحتا مچا دیا۔

''کنوارے لڑکے سے شادی کی تو وہ نبھایا نہیں گیا تو شادی شدہ مرد اور دو بچوں والے سے کیسے نباہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو چار دن کے بعد ہی بھاگ کر آ جائے گی۔ ہمیں تو اپنے گھر پر تماشا ہاؤس کا بورڈ لگا دینا چاہیے۔ لوگوں کو یہ پوچھنا نہ پڑے کہ آئے دن کے تماشے یہاں کیوں رچائے جاتے ہیں۔'' ثریا نے تمسخر بھرے لہجے میں ساس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو جس سے کسی کا دل دکھے۔ سائرہ اگر بدنصیب ہے تو اس کا مذاق تو مت اڑاؤ۔ کیا کوئی ماں ایسا چاہتی ہے کہ اس کی بچی سرخ جوڑے میں سسرال جائے...... اور اپنا گھر اجاڑ کر ماں کے لھے سے لگ کر بیٹھ جائے۔ یا کوئی بیٹی یہ آرزو لے کر ایجاب و قبول کرتی ہے کہ میں بسوں گی نہیں؟ اللہ نہ ے کہ کسی لڑکی پر یہ وقت آئے۔ یہ تماشا تو اس کی زندگی نے ہی دکھایا ہے اس میں میری سائرہ کا کیا قصور۔''

''امی جان! نہ سائرہ کا قصور ہے کہ جاوید پاگل تھا اور نہ فریال کا قصور ہے کہ وہاں عدیل نے فریال کو پاگل بنا دیا۔ آپ کی تو دونوں بیٹیاں جلیبی کی طرح سیدھی سادی ہیں۔ چنٹ تو ہم بہوئیں ہیں جو سچی بات بھی کہتی ہیں تو آپ جھوٹ اور بہتان کہہ دیا کرتی ہیں'' ثریا میاں کی شہ پر ساس پر خوب چڑھ کر آ رہی تھی۔

''میں نے کتنی دفعہ آپ سے کہا تھا کہ فریال پر سختی کریں۔ وہ بگڑ رہی ہے مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ کالج سے دیر سے آئی تو آپ نے کچھ نہیں کہا۔ سہیلیوں کے نام لے کر ادھر ادھر اڑتی پھری' آپ نے اس کی ہر جھوٹی بات پر یقین کیا۔''

''ہاں بیٹا! ساری غلطی میری ہی تھی، اسی لیے میری جھولی میں غم آ گرے ہیں۔ مگر سائرہ کی شادی ہو جانے حالانکہ میرے غموں میں کچھ تو کمی آئے......'' شائستہ بیگم نے غموں سے چور لہجے میں کہا۔

''امی! اب اس گھر کے فیصلے آپ ہمیں کرنے دیں۔ جمیل سے شادی کے بعد اس گھر میں روز ہنگامے ہوا یں گے۔ غصہ ہمارا ویسے ہی تیز ہے، اگر کسی کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔'' شاہنواز نے اس موضوع پر بات ختم کر دی۔

اور شائستہ بیگم...... اپنے کمرے میں بیٹھی یہ سوچنے لگیں کہ اس گھر کے لوگ اب یہ چاہتے ہیں کہ سائرہ یہاں ہو کر اپنی زندگی گزار دے۔ رنگوں اور بہاروں کا اب اس کی زندگی سے کسی قسم کا واسطہ نہ رہے؟

''فریال' تم میرے پاس ہوتیں تو ہم دونوں مل کر سائرہ کے لیے کچھ کرتے...... مگر تم تو ایسی گئیں کہ ماں تک بے خبر ہو گئیں' اپنے بارے میں دو لفظ لکھنے تک گوارا نہیں کیے۔ نئی زندگی کی خوشیوں کے جھمیلوں میں اتنی مگن یہ احساس تک نہیں کہ بوڑھی ماں کو کبھی یاد کر لو۔'' ان کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

فون کی گھنٹی بجی تو بے اختیار انہیں یوں لگا جیسے فریال نے انہیں یاد کیا ہو۔ وہ دیوانہ وار فون کی طرف لپکیں۔

''امی!'' ریسیور پر انہیں آواز سنائی دی۔

''میری فریال تو کہاں ہے۔ جلدی سے میرے پاس آ جا...... میری چندا! تجھے احساس بھی نہیں ہے کہ تیری لی تجھے ہر وقت یاد کرتی ہے۔ اب کیا ہے' اتنے عرصے بعد مجھے فون......'' وہ دھواں دھار روتے ہوئے

بولیں۔

"امی جان' کائے کو رورئے آپ...... میں صابرہ بولتیوں" ریسیور سے آواز کھنکھار کر آئی تو انہیں پتا چلا کہ وہ فریال نہیں تھی۔

"میں سمجھی کہ شاید فریال نے فون کیا ہے" اداس لہجے میں انہوں نے کہا۔ سسکیاں اور آہیں اپنے سینے میں گھونٹ لیں۔

"وہ کائے کو فون کریں گی آپ کو...... وہ اب آپ کی محبتاں کے خائل اچ نکیں رہے۔ بھول جائیے آپ انہوں کو......!"

"کیا کہہ رہی ہو تم...... کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھول سکتی ہے۔ اپنی ممتا اپنے سینے سے کھرچ کر پھینک سکتی ہے؟" ان کا لہجہ آنسوؤں سے لبالب بھر گیا۔

"امی جی' آپ میری بات مانیے' آپ آج ایک اچ بار زندگی بھر کا رونا رولیو' کیوں کہ پھر تو آپ سوب لوگاں کے سامنے رو بھی نکیں سکیں گے۔"

"کیوں ایسی بات کر رہی ہو صابرہ تم!" ان کا لہجہ شاکی تھا۔

"اس لیے کہ آپ ہمیشاں رونے کے موخے (مواقع) ڈھونڈ کے پھرتے...... اس طرح روتے بیٹھتے تو مر جائیں گی آپ...... کائے کو اپنی جان کی دشمن ہوتے آپ......" اور شائستہ بیگم نے گم صم سی ہو کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ یہ صابرہ کا مزاج بھی خوب تھا۔ پل میں تولہ پل میں ماشا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ جس لہجے میں بات کرے' وہ لہجہ رات کی رانی
کونپل کونپل شمعیں اس کی' وعدہ رات کی رانی
میرے دل کے کاغذ پر تیری یاد کا موسم' خاموشی سے لکھے
تتلی' پھول' ہوائیں' بادل' خوشبو' رات کی رانی

زبور اپنے بیڈ پر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا خوشگوار موڈ میں گنگنا رہا تھا۔ نگین اور اس کی باتیں اس کے ذہن میں قوس قزح کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس کی نگین سے بات ہوئی تھی۔ شاکنگ پنک کلر اس کا فیورٹ تھا۔ یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ شادی کا جوڑا شاکنگ پنک ہی ہو۔

"مگر ہمارے ہاں تو عروسی جوڑا ہمیشہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے" نگین نے اسے شرماتے ہوئے لہجے میں بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے' نکاح کے وقت تم سرخ ڈریس پہن لینا مگر رخصتی کے وقت شاکنگ پنک غرارہ زیب تن کر لینا' یہ رنگ صرف تمہارے لیے ہی بنا ہے۔"

"شادی کے دن کیا میں بار بار ڈریس تبدیل کرتی رہوں گی؟" وہ الجھ کر بولی تھی۔

"میں تمہیں ہر رنگ میں دیکھنا چاہوں گا' یہ تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔"

"اوکے' آپ عروسی جوڑا شاکنگ پنک کلر میں ہی لے آیئے۔"

"اور کیا لے کر آؤں؟" اب وہ شرارت پر آمادہ ہو رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا' اب بری تو میری پسند سے تھوڑی ہوگی' جو آپ لائیں گے' وہ میں پہن لوں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا' جس کی شادی ہو اور بری اس کی پسند کی نہ بنے۔ ممی نے تو مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جا کر تمہاری پسند کی چیزیں بوتیک پر آرڈر کر دوں۔"

"اف...... میں کہاں جا سکوں گی آپ کے ساتھ...... شاپنگ کرنے" وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ "میں نے کہہ دیا ناں' اب میں سامنے بھی نہیں آؤں گی۔"

"اچھا' فون پر اپنی پسند کے بارے میں تو بتا سکتی ہو' میں نے تو تمہیں زیادہ تر کالج یونیفارم میں دیکھا ہے۔ یہ پتا ہی نہیں کہ کون کون سے کلرز تمہارے ہارٹ فیورٹ ہیں اور کون کون سے ناپسندیدہ؟"

"زبور......! اب آپ کی پسند میری پسند ہوگی...... جو آپ کا من چاہے لے لیں، وہ میرا ہارٹ فیورٹ ہوگا۔"

"ارے...... کیا واقعی! تم پتی ورتا قسم کی بیوی بننے والی ہو؟" وہ شوخ سے لہجے میں ہنس پڑا۔

"جی ہاں......" (انتہائی سنجیدگی سے کہا گیا)

"مگر یار! ایسی بیویاں تو اب صرف فلموں یا ٹی وی ڈراموں میں نظر آتی ہیں...... حقیقت میں تو ان کا وجود اکا دکا ہی ہوتا ہے، اور وہ بھی کہیں کہیں۔ ہر جگہ تو وہ ہوتی بھی نہیں ہیں۔"

"ہوتی تو ہیں ناں، اکا دکا ہی سہی...... مگر آج بھی ان کا وجود ہے۔"

"مگر میں یہ سب نہیں چاہتا...... یار! ہم دونوں ایک اچھے دوست بن کر زندگی گزاریں گے۔"

"کیا محبت کرنے والی بیوی' اپنے شوہر کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنے والی کو دوست نہیں سمجھنا چاہیے؟"

"کیوں نہیں؟" وہ گڑبڑا سا گیا۔

"سنیئے دوستوں کی بھی بہت سی کیٹیگریز ہوتی ہیں ناں' بے حد اچھا دوست' اچھا دوست، نام کا دوست' بظاہر دوست ہو مگر دوست محسوس نہ ہو...... اور میں آپ کی بے حد اچھی دوست بھی بننا چاہتی ہوں" نگین نے گہرے لہجے میں کہا۔

"واؤ...... ایسا لگتا ہے کہ میری لاٹری نکل آئی ہو" وہ سرشاری سے کھلکھلا اٹھا۔ "ایسی باتونی اور پٹر پٹر بولنے والی (نان اسٹاپ بولنے والی) بیوی مجھے ملے گی یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔"

"یہ تو مجھے نہیں پتا کہ مجھ سے شادی کر کے آپ کی لاٹری نکلے گی یا نہیں مگر مجھے یہ دل سے اچھا لگ رہا ہے کہ میری شادی آپ سے ہو رہی ہے۔ ہاں' نہ اب آپ مجھے فون کریں گے اور نہ ملنے کی کوشش کریں گے۔"

"وہ کیوں بھئی؟"

"امی' ابا جی سے کہہ رہی تھیں کہ نگین کی شادی اسی سہ ماہی میں کر دیتے ہیں بلکہ ربیع الاول میں۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے...... یعنی صرف ڈیڑھ ماہ بعد تم میرے پاس ہوگی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب فون نہ کیا کریں ورنہ دولہا بن کر روپ نہیں آئے گا۔"

"اچھا......! اپنے روپ کے بجائے میرے روپ کی فکر ہے؟"

"دوست ہوں ناں...... اپنے سے زیادہ اب آپ کی فکر تو کروں گی۔"

"پھر موبائل کا کیا کام رہ جائے گا' جب تم سے بات نہ ہو۔"

"اپنے موبائل کا آپ جو دل چاہے کریں مگر اب میں آپ کو ہرگز فون نہیں کروں گی...... اور نہ آپ کا فون

ریسیو کروں گی۔ فہمی باجی کہہ رہی تھیں اگر تم لوگ پہلے ہی سے اتنی باتیں کر لو گے تو بعد میں کیا باتیں کیا کرو گے؟

"تم نے کہہ دینا تھا کہ بعد میں ہم لڑا کریں گے، یہ بھی تو باتوں کی ایک گرج دار سی قسم ہے۔"

"اللہ نہ کرے کیوں لڑنے لگے ہم...... میں تو آپ کو بالکل بھی نہیں ڈانٹوں گی" وہ شوخ بھرے لہجے میں بولی۔

"میں بھی بہت جلد معاف کر دیا کروں گا" زبور نے ہنس کر کہا تو نگین کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

"معافی کس بات کی؟ میں نے کیا قصور کیا ہو گا؟"

"یہ تو میں بتاؤں گا ناں...... تم میرے پوائنٹ آف ویو سے کیوں سوچ رہی ہو" زبور نے ہنس کر کہا اور پیار بھرے لہجے میں بولا "نگین! میری قسمت میں تم لکھی تھیں تو حالات بھی خود ہی تبدیل ہوتے چلے گئے۔"

"ہاں یہ تو ہے، میری قسمت میں یہ بک بک کروانے والا جوئیلر لکھا تھا۔"

"مطمئن رہو باتیں بھی سونے اور ہیرے جیسی کیا کروں گا۔"

زبور بستر پر لیٹا اپنی اور نگین کی باتوں کا لطف اٹھا رہا تھا کہ کسی کے آنے پر وہ چونک کر سیدھا ہوا اور ماما کے پکارنے پر وہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

شادی کے اگلے دن دلہن کو اس کے میکے والے لینے آتے ہیں۔ یہ رسم فرح کے گھرانے میں بھی نبھائی جاتی تھی۔

صبح سے ہی بہنوں اور سہیلیوں نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اماں نے صبح سے ہی پوریاں، حلوہ، چنے اور آلو کی ترکاری بنا کر رکھ لی ت۔ اگلے دن بہنیں اور سہیلیاں دلہن کا ناشتا لے کر جاتی تھیں۔

دلہن کو لینے اتنے سویرے نہیں جاتے۔ شادی کا گھر ہے۔ تھکے تھکائے براتی صبح دیر سے ہی اٹھتے ہیں۔ بڑی خالہ نے سمجھایا بھی تھا۔ بڑے شہروں میں تو دولہا، دلہن ظہر تک اٹھ پاتے ہیں مگر یہ پنجاب کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں بڑے شہروں والی ایسی بے تکی عادتیں کسی میں نہیں تھیں اس لیے بہنوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آنکھ کھلتے ہی فرح کے پاس پہنچ جاتیں۔ یوں بھی پڑوس کا معاملہ تھا، ایسا کون سا کہیں دور دراز جانا تھا۔

بڑی خالہ کے منع کرنے کے باوجود بھی بہنیں اور سہیلیاں صبح دس بجے فرح کی سسرال ناشتے کی سینیاں لے کر پہنچ گئیں۔

"فرح تو ناشتا بھی کر چکی" اس کی بڑی نند نے ہنس کر کہا۔

"کب کیا اس نے ناشتا؟" باجی نے مسکرا کر پوچھا۔

"صبح چھ بجے...... اشرف بھائی تو سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ وہ حسب عادت پانچ بجے اٹھ کر باہر چلے گئے، ہم نے فرح کو تیار بھی کر دیا۔"

بہنیں جب فرح کے کمرے میں پہنچیں تو وہ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی۔

"کیسی ہو؟" سہیلی نے کہنی ماری۔

"ٹھیک۔"

"اپنی سسرال پسند آئی؟" آپا نے پوچھا۔

"جی!"

"ناشتا کر لیا؟"

"جی......!"

اشرف کی بہنوں نے ان کا لایا ہوا ناشتا ان کے سامنے ہی چن دیا۔ بھنے ہوئے قیمے کے ساتھ پراٹھے بھی لاکر رکھ دیے۔ سمدھیانے والوں کی خاطر مدارات تو کرنی ہی تھی۔

"فرح ہمارے ساتھ بھی ناشتا کر لو" بڑی آپا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

"لگتا ہے اشرف بھائی نے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر کھلائے ہیں۔ جب ہی بی بنو کچھ کھانے کا نام نہیں لے رہیں؟" اس کی سہیلی نے سب کے سامنے اسے چھیڑا۔

اور اس سے مسکرایا تک نہیں گیا۔

ہنسی مذاق میں ناشتا کیا گیا۔ سہیلیاں اس کو چھیڑتی رہیں، اشرف کی بہنیں ہنستی رہیں اور وہ یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کا سر یوں جھکا جا رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں بیٹھی ہو۔

اشرف کی بہنیں دسترخوان بڑھانے کے لیے باہر گئیں تو بہنیں اس کے مزید قریب آ بیٹھیں، سہیلیاں اس کے پاس ہی گھس بیٹھیں۔ کسی نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالا تو دوسری نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"ہاں اب بتا...... میاں جانی نے کیا تحفہ دیا؟ اور تیری خوبصورتی کی تعریف کس طرح کی؟" سہیلیوں نے ایک آنکھ میچ کر شرارت سے پوچھا۔

اور اس کی آنکھوں میں اپنی سہاگ رات کا وہ منظر اسی شدت سے در آیا اور اشرف کی آواز اس کا سینہ کھرچنے لگی۔

"فرح! اپنے یار کو جو تم نے خط لکھے تھے، وہ بھی پڑھ لو اور اپنے پاس سینت کر رکھ لو کہ یہی تحفہ ہے تمہارا تاکہ کبھی غلط کام کی بابت سوچ بھی نہ سکو۔ فرح! میں نے تو تم پر رحم کھا کر شادی کی ہے ورنہ بدمعاش لڑکی سے تو کوئی شادی بھی نہیں کیا کرتا ہے۔ اب مجھے کیا پتا کہ تمہارا یارانہ خطوط سے شروع ہو کر کہاں تک پہنچا تھا۔ ہماری شادی میں شجاع شریک نہیں ہوا، اس کا مطلب تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ منہ دکھانے کے قابل ہوتا تو ضرور آتا۔ اس کے کرتوت ہی ایسے تھے کہ شادی سے پہلے وہ گاؤں سے چلا گیا۔ فرح، تو بدمعاش ہے، تو بدکردار ہے، جا میں نے تجھ پر احسان کیا، تیرے خط فوٹو اسٹیٹ کروا کے تیرے خاندان میں نہیں بانٹے۔ تو اس قابل نہیں تھی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہتی۔"

سوچتے سوچتے اس کے مساموں سے بارش کی طرح پسینہ نکلنے لگا اور پھر وہ بڑی آپا کی جانب لڑھک گئی۔

"ارے فرح! کیا ہوا......؟ ٹھیک تو ہے ناں تو......؟" آپا نے گھبرا کر اسے بستر پر لٹا کر اس کے چہرے کا پسینہ اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے پریشان ہو کر پوچھا۔

فرح نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے منہ پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش ہونے کا کہا اور انتہائی نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہاں، میں ٹھیک ہوں۔"

اس کے مردہ لہجے اور آنکھوں میں بھرے خوف کو دیکھ کر آپا کے دل کی کلی یکدم مرجھا سی گئی۔ فرح کو اس شادی پر راضی کروانے کے لیے انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے تھے...... اور اب اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ایک شب میں ہی اس نے دکھوں کی کتنی بڑی مسافت طے کر لی ہے۔

”چپ ہو جاؤ سب، فرح کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی اس کو تنگ نہ کرے“ آپا نے سب کو رازدارانہ لہجے میں کہا اور سب کو گھر چلنے کا اشارہ کر کے باہر جا کر اشرف کی ماں سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔

اور جب دونوں جانب سے اسے سہارا دیتے ہوئے بہنیں اپنے گھر میں داخل ہوئیں تو اس کی ماں کو یوں لگا جیسے کسی مریضہ کو لے کر آ رہی ہوں۔ فرح پاؤں کہیں اٹھا رہی تھی اور دھر کہیں رہی تھی۔

اس کے گالوں کی تمازت۔ آنکھوں کی شوخی اور لبوں کا فسوں...... تو ایک شب میں ہی خس وخاشاک ہو گیا تھا۔

جیسے خوشی چھپائے نہیں چھپتی اسی طرح غم کو چھپانا بھی بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ فرح کی شکل دیکھ کر ہی لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے ارمانوں کو سولی پر چڑھا دیا ہو۔ خوشی کی کوئی بھی رمق، کہیں پر بھی تو نہیں تھی۔

”اللہ میری بچی کی مدد کرنا“ ان کے روم روم نے پکارا۔ اماں بھاگ کر اس کی جانب بڑھیں اور اسے اپنے بازوؤں میں تھاما...... اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ان کے بازوؤں میں آ کر جھول سی گئی۔ اس مرتبہ وہ مکمل بے ہوش ہو گئی تھی۔

”فرح...... فرح...... فرح!“ ماں بہنیں اسے پکار رہی تھیں مگر اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

شائستہ بیگم کی نیند پہلے ہی بہت کم تھی مگر اب تو بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تکیے پر سر پٹختے پٹختے تھک جاتیں مگر نیند آنے کا نام نہیں لیتی۔

آج کی رات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ سائرہ بے خبر سو رہی تھی۔ رات کے کوئی تین بجے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر آنگن میں پلنگ پر آ کر لیٹ گئیں۔ رات کی رانی کی ہر سو پھیلی ہوئی مہک نے انہیں قدرے سکون پہنچایا اور وہ وہیں لیٹ گئیں۔

فجر کی اذان سے کچھ دیر پہلے صابرہ اٹھی تو وہ پلنگ پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

”آپ کائے کو جگ رئے اب تک کا۔“ (آپ ابھی تک کیوں جاگ رہی ہیں؟)

”اب تو صبح ہو گئی ہے بیٹا! اذان بس ہونے ہی والی ہے۔“

”لائٹ جانے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ آپ تو بہت دیر سے آنگن میں بیٹھے ہیں ناں، رات کو سوئے نکیں ناں آپ؟“

”ہاں، نیند نہیں آئی مجھے، سر میں بھی درد ہے میرے۔“

”امی جی، آپ کو چشمہ بنوا دینا ہے ہم نے، پھر درد نہیں ہوئیں گا آپ کو، دیکھ لینا آپ“ صابرہ نے محبت سے کہا۔

”نہیں بیٹا! میں خود بنوا لوں گی۔ چشمے کا شاید نمبر بڑھ گیا ہے اس لیے سر میں مسلسل درد ہے۔“

”کیسی باتاں کرتے امی جی آپ...... آپ کا کیا ہم پر کوئی نخ (حق) نکیں ہے کیا...... ماں ہیں ناں آپ۔ آپ تکلیف کو بیٹھتے، ہم لوگاں پوچھتے بھی نکیں۔“ صابرہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ محبت سے رکھ دیے اور ہنس دی اور شائستہ بیگم کے ذہن میں فریال کی معصوم سی ہنسی اور اس کے دانتوں کی جگمگاہٹ پھیل گئی۔ جب وہ اپنی کسی بات کو منوانے کے لیے یونہی ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیا کرتی تھی۔

انہوں نے اپنی ڈبڈبائی نظروں سے دیکھتے ہوئے صابرہ سے کہا ”صابرہ! تم بہت اچھی ہو۔ خوبیاں، خامیاں

مں میں ہوتی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ تم میں خوبیاں زیادہ ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے امی جی! میں واخی (واقعی) بہوت اچھی ہوں۔“ صابرہ شرارت بھرے لہجے میں ہنستے ہوئے بولی، ”مگر آپ کے بیٹے میری تعریفاں نکو کرتے تو کیا کروں ماں۔“

”تم تو دن چڑھے تک سونے کی عادی ہو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ اس کی شرارت کو سمجھے بغیر شائستہ بیگم نے محبت سے کہا۔

”آج میرے کو نیند نکیں آ رہی، تو کائے کو سو جاؤں۔“

”پھر کوئی باتیں کر لو۔“ ان کا من چاہا کہ آج صابرہ سے اپنی فریال اور سائرہ کے بارے میں باتیں کرتی چلی جائیں، جب وہ چھوٹی تھیں تو کیسے شرارتیں کرتی تھیں۔ فریال کیسے کمرے میں چھپ کر انہیں ڈرایا کرتی تھی۔ سائرہ کیسے گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی۔ ڈھیر ساری گڑیاں۔ پلاسٹک کے بڑے سے ٹب میں چھوٹی سی رضائی کے سہارے کیسے کنارے کنارے کھڑی رہتی تھیں۔ ان کی شادیاں ہوتی تھیں تو کترنوں کے جوڑے بنا کرتے تھے۔ فریال ان کے دوپٹے کو کونے سے پھاڑ کر گڑیوں کی ساڑیاں بنایا کرتی تھی...... اور پھر خوب دھوم دھام سے گڑیوں کی شادیاں ہوتی تھیں اور جب سہیلیوں سے لڑائیاں ہوتیں تو وہ کترنیں مانگی جاتیں اور ایک دوسرے کے گھر میں بھیجی جاتیں اور جو چند دنوں میں کوڑے کی باسکٹ تک پہنچ جاتیں۔

اولاد کی محبت ماؤں کو شاید باؤلا ہی بنا دیتی ہے۔ شائستہ بیگم ہمہ وقت اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچتی رہتیں اور ان ہی کے بارے میں باتیں کرنے کی خواہش مند تھیں مگر اس وقت صابرہ انہیں حیدر آباد دکن کے اش نوابوں کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی جسے وہ بے دلی سے سن رہی تھیں۔

”امی جی! میں کیا بتاؤں آپ کو...... حیدر آباد کے چند نواباں کی محلاں کے اندر کی باتاں عجیب وخریب (عجیب وغریب)“

”ارے، کیا واقعی......“ انہوں نے اس کا جوش خطابت دیکھ کر پوچھ ہی ڈالا، ورنہ سر کے درد نے انہیں ایسا بے حال کر رکھا تھا کہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ایک اچ چھوکری اگر باپ کو پسند آ گئی ناں تو کچھ فرخ نکیں پڑتا کی بیٹے بھی اس کو اچ پسند کر لیتے“ صابرہ نے رازدارانہ لہجے میں انہیں بتایا۔

”ارے نہیں بھئی......“ سن کر ہی انہیں پھریری سی آ گئی۔

”میں سچ بولتیوں...... ایسا ہی سنا ہے میں نے اور ایسا ہی دیکھا ہے لوگاں نے...... کہ اگر رشتے کے بھایان ابا، بی اچ پوٹی سے رنگ رلیاں مناتے رہتے۔ یہ بات سوب (سب) کو آپس میں معلوم رہتی اور وہ پوٹی کو بھی معلوم رہتا۔ محل کے مرد لوگاں کیا بولتے معلوم، کی ایک نل سے کتے بھی لوگاں بھی پیاس بجھا لے سکتے۔“

(ایسے لوگوں کے بارے میں محل کے دوسرے افراد کیا رائے رکھتے تھے۔ پتا بھی ہے، وہ یہ کہ ایک نل سے اور انسان پیاس بجھانے والے یہی لوگ ہیں۔ ایسے انسان جو کتوں جیسی خصوصیت رکھتے ہیں)

شائستہ بیگم اب منہ کھولے صابرہ کی باتیں سن رہی تھیں اور اوباش لوگوں کی حرکتیں سن کر ان کا خون کھول رہا تھا۔

☆☆☆

فرح کی ناک چھدی نہیں تھی، شادی کے دن اس نے پیچ والی نتھ پہن لی تھی مگر اب شادی کے بعد اشرف کی

اماں کا یہ ارمان تھا کہ ان کی بہو اپنی ناک میں لونگ ضرور پہنے اور فرح ناک چھدوانے سے ڈر رہی تھی۔ یوں شادی کے بعد کے حالات نے سارے ارمانوں کا ویسے بھی خون کر دیا تھا کہ کچھ کرنے یا بننے سنورنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اشرف کی کوئی بھی بات اپنے میکے میں نہیں بتائی تھی۔ اس کی بہنوں کا یہ خیال تھا کہ وہ حسن ہے اور اشرف چونکہ شکل وصورت کا معمولی ہے اس لیے وہ اس کو پسند نہیں آیا۔ جبکہ اس کی آپا کا یہ خیال شجاع کی محبت اس کے دل میں ہے۔

شادی کا دسواں دن تھا، وہ اپنی ساس کے پاس خاموش سی بیٹھی تھی۔ ساس اس کی پیاری سی شکل کی کر رہی تھیں۔ اشرف سامنے بیٹھا اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ (جیسے وہ اس قابل ہی نہ ہو)

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر خوش ہونا چاہیے یا خوف زدہ ہونا چاہیے، ہنسنا چاہیے یا اس کی ساس نے اس کے کان میں کچھ کہا اور اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں دوبارہ اسے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کچھ پوچھا۔ پریشان سی ہو کر اس نے رضامندی میں سر ہلا دیا اور پھر وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی کہ کس برق رفتاری سے اس کی ساس نے ایک چھوٹی سی بالی بیچ سے ناک میں ڈال دی اور وہ سی کر کے رہ گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو پھسل گئے۔

”دیکھ اشرف، اب کتنی پیاری لگ رہی ہے اپنی فرح! چھوٹی سی بالی اس کی ناک میں کتنی بج رہی اماں تو فخر سے پوچھ رہی تھیں۔

اور وہ اس کو دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

فرید احمد نے عظمت آپا کو فون کیا تو انہوں نے پہلی بات ہی یہی پوچھی کہ تمہارے پاس بھائی رشید کا ہے یا نہیں؟

”ہاں، خط تو آ گیا ہے، بیماری کی اطلاع کے ساتھ ساتھ انہوں نے دوسری بات بھی لکھی ہے۔“

”پھر دیر کس بات کی ہے، تم گاؤں آ جاؤ اور نگین اور شجاع کی شادی فوراً کر دو تا کہ ہمارے بچوں کو کروڑ روپے تو مل جائیں ورنہ ہمارے بچوں کا حق دوسروں کے پاس چلا جائے گا۔“

”بھائی رشید کا خط اگر مجھے پہلے مل جاتا تو میں فوراً ہی آ جاتا مگر اب میرے لیے آنا مشکل بلکہ ناممکن فرید احمد نے ایک گہری سانس بھر کر کہا، جس کی اداسی عظمت بیگم تک سے چھپی نہیں رہ سکی۔

”خیریت تو ہے، مسئلہ کیا ہے؟“

”وہ میں نے اپنے ملنے والوں میں نگین کے رشتے کی ہامی بھر لی ہے۔ وہ لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ لڑکا جیولر ہے اور بہت اچھا ہے۔“ فرید احمد نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”ہامی بھری ہے، نکاح تو نہیں کیا ناں......؟“ عظمت بیگم نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”نہیں، صرف ہامی بھری ہے۔ معمولی سا لین دین ہوا ہے اور بس...... ابھی تو کسی رشتے دار کو بھی یہ نہیں۔ ہاں منجھی اور آپا یہ سب ضرور جانتی ہیں۔“

”تم تو ہمیشہ کے ہی بے وقوف ہو۔ لعنت بھیجو اس رشتے پر۔ جو انہوں نے دیا ہے، وہ ان کے منہ پر کہہ دو آپ کے ہاں رشتہ کرنے پر میری بڑی بہن ناراض ہو گئی ہے اور میں اس کی ناراضی برداشت نہیں

اس لیے میں اب اپنے بھانجے سے ہی نگین کی شادی کروں گا۔“

”ارے آپا، کیسی بات کر رہی ہو، زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے اس فیملی سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ان کے بیٹے سے کروں گا، کیا کہیں گے وہ لوگ...... کہ زبان دے کر میں...... میں......“ وہ پھر ہکلاہٹ کا شکار ہو گئے۔

”ارے بھائی! زبان گوشت کی بنی تو ہوتی ہے۔ اس طرف پلٹا لو یا دوسری طرف۔ اس میں لچک ہے، ات ہے، زندگی ہے۔ یہ کسی کو نہیں دی جا سکتی۔ دفع کرو ان لوگوں کو۔“

”تو...... تو کیا میں یہ بات ختم کر دوں؟“ فرید احمد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”اور کیا...... قسمت کوئی بار بار تھوڑی دستک دیتی ہے۔ ایسے مواقع اگر ان لوگوں کو ملتے تو کیا وہ تمہاری طرح زبان کی پاسداری کرتے پھرتے؟“

”ٹھیک ہے آپا! میں معذرت کر لوں گا اور ہم لوگ بہت جلد گاؤں آتے ہیں...... آپ بھی تیاری کر لیں کہ اب یہ تقریب ہو گی؟“

”تم بس آ جاؤ...... گھر ہی کی تو بات ہے۔ دن، تاریخ تمہارے آنے پر طے کر لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں جلد ہی آتا ہوں“ فرید احمد نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر جو سر گھمایا تو پریشان سے ہو گئے۔

دروازے کے وسط میں اداس اور پریشان سا چہرہ لیے نگین کھڑی تھی۔

انہیں ایسا لگا جیسے ان کی تمام تر باتیں اس نے سن لی ہوں۔ ”امی کہاں ہیں تمہاری؟“ انہوں نے اپنی آواز میں زبردستی شگفتگی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا“ وہ شاکی لہجے میں کہتے ہوئے اپنے کمرے میں بھاگتے ہوئے تیزی سے چلی گئی۔

☆☆☆

وہ بری طرح ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی کی اڑانیں اونچی سے اونچی ہوتی جا رہی تھیں جیسے کہ وہ زینہ چڑھ رہی ہوں مگر اشرف کی ہنسی کا ہر وار فرح کو برچھی کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

وہ بار بار اپنے جملے دہرا رہا تھا جیسے کہ وہ اس کے زریں اقوال ہوں۔ اس کی ہنسی کا نقارہ ایک گولا سا بن گیا تھا جو اس پر آگ سی برسا رہا تھا اور اس آگ کی تمازت سے فرح جھلسی چلی جا رہی تھی اور بالآخر وہ بلک ہی اٹھی اور پوچھ بیٹھی۔

”اشرف! اگر ایک کم عمر لڑکی محبت کے نام پر کسی کو خط لکھ دے تو اتنی بڑی مجرم ہو جاتی ہے کہ اس کے قصور معاف ہی نہیں ہو سکتے۔“

”محبت میں کوئی کند ہو جاتا ہے اور کوئی تیز...... مجھے کیا پتا تمہیں محبت کے تھپیڑے کہاں تک بہا کر لے گئے۔“

”میں آپ کو اتنی دفعہ بتا چکی ہوں کہ شجاع کو میں نے صرف خط ضرور لکھے۔ انہوں نے بھی خط لکھے اور بس!“

”مگر تمہاری تو اس کے ساتھ شادی ہو رہی تھی؟“

”شادی ہونا ہوتی تو ضرور ہوتی مگر ان کی بہن اپنے قریبی خاندان میں ہی اپنے بھائی کی شادی کرنا چاہتی ہیں اسی وجہ سے شاید وہ پیچھے ہٹ گئے۔“

”جب لڑکیاں خود گلے کا ہار بن جائیں تو ٹائم پاس کرنے میں حرج ہی کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو شجاع کا نام سن کر ہی غصہ آنے لگا ہے۔“

”میں مانتی ہوں‘ مجھ سے غلطی ہوئی ہے مگر آپ مجھے معاف کر دیں۔ اب تو میں آپ کی بیوی ہوں......!“ فرح نے اپنے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

”تم اب گھر میں ہی رہا کرو گی“ وہ غصے میں دہاڑتا ہوا بولا۔

”جی...... ٹھیک ہے‘ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”پڑوس میں اپنی ماں کے پاس جاؤ گی تو برقع اوڑھ کر جاؤ گی اور ہفتے میں صرف ایک بار وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔ رات کو ہرگز نہیں رکو گی۔“

”ٹھیک ہے‘ جیسی آپ کی مرضی“ اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

فرح کی ہنسی‘ چہکنا‘ بات بے بات قہقہے سب اڑن چھو ہو گئے تھے۔ ایک سنجیدگی نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ ماں کے گھر وہ اب ہفتے میں صرف ایک بار ہی جا رہی تھی۔ جب جاتی تو برقع پہن کر نقاب گرا کر جاتی۔ محلے میں جانا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سہیلی صبا کی منگنی ہوئی‘ سارے گھر کا بلاوا تھا۔ اس کی ساس‘ نندیں سب تو اس میں شرکت کے لیے گئے مگر عین وقت پر اس نے پیٹ میں درد کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا‘ یہ سب دیکھ کر اشرف دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

وہ جب اپنے گھر جاتی تو بہنیں کرید کرید کر پوچھتیں...... اشرف کیسا ہے‘ تجھے کیا کہتا ہے اور وہ اکتا سی جاتی۔

اور ایک دن اپنی بہنوں کے پے در پے سوالات سے عاجز آ کر وہ بولی ”وہ یہ سب باتیں نہیں کرتے۔“

”ہائے‘ کیوں نہیں کرتے؟“

”وہ کہتے ہیں جو شوہر ڈائیلاگ بولنے کے عادی ہوتے ہیں وہ غنڈے موالی ہوتے ہیں۔“

”دیکھ‘ تو کچھ چھپا تو نہیں رہی ہے...... مجھے تو سچ سچ بتا دے کہ کوئی بات ہو تو تجھے کوئی مشورہ دے سکوں۔“ ایک دن بڑی آپا نے اس سے بڑی رازداری سے پوچھا۔

”آپا! میرے پاس تو دکھانے کو کچھ نہیں ہے تو چھپاؤں گی کیا؟“ وہ تلخی سے بولی۔

اور آپا اس کی شکل دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

فیروزہ تو میاں کی بات سن کر اچھل پڑی تھیں۔ عظمت آپا کا مشورہ ان کو بے حد پسند آیا تھا۔ زیور کی ماں جو چیزیں نگین کے لیے لے کر آئی تھیں‘ انہوں نے ایک کر لی تھیں۔ فرید احمد نے خود جانے کے بجائے طفیل کا انتخاب کیا تھا کہ خط کے ہمراہ یہ چیزیں وہ دے آئے گا اور اسی دن سب لوگ گاؤں روانہ ہو جائیں گے۔

”فہمی کو بھی بتا دیں کہ اسے ساتھ چلنا ہے‘ بہن کی شادی میں جانے کے لیے“ فیروزہ نے کہا۔

”تم فون کر دو تا کہ دو چار دن میں وہ بھی تیاری کر لے۔“

اور ادھر نگین نے پریشان ہو کر زیور کو فون کیا۔

”زیور شاپ پر ہے‘ وہیں فون کر لو“ اس کی ماما نے کہا۔ شاپ پر فون کیا تو وہ باہر تھا۔ دوبارہ گھر پر فون کر کے کہا۔

”آنٹی! میں بہت پریشان ہوں......“ نگین نے پریشان سے لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی چیخیں روکی ہوئی تھیں۔

”کیا بات ہے بیٹا!“ انہوں نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”میرے ابو جی مجھے گاؤں لے کر جا رہے ہیں‘ وہاں وہ میری شادی اپنے بھانجے سے کرنا چاہتے ہیں“ بالآخر وہ سسکیاں لینے لگی۔

”منگنی ہو جانے کے بعد......! وہ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟“ زیور کی ماما نے اپنے غصے کو قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے ایک چچا امریکا میں ہیں...... وہ اس شادی ہونے پر انہیں کثیر سرمایہ دیں گے“ نگین نے انہیں بتایا ”شاید پچاس کروڑ!“

”تم فکر مت کرو۔ میں کچھ کرتی ہوں‘ اب بالکل بھی پریشان مت ہونا۔“ اور نگین نے ایک آسودہ سا سانس لیا۔ اسے یقین تھا کہ ماما نے جس ذہانت کے بل بوتے اس کا رشتہ حاصل کیا ہے‘ اسی طرح وہ اس کو اس بحران سے بھی نکال لیں گی۔

☆☆☆

”اے لو‘ تمہارے ہاں تو رشتہ جوڑنا اور توڑنا بھی بچوں کا سا کھیل ہو گیا۔ لڑکے والوں نے اتنی دھوم دھام سے منگنی کی‘ اب ان کو ٹکا سا جواب دے دیا جائے گا‘ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے“ ممانی جان نے فہمی سے کہا۔

”اس رشتے سے پھوپو جان جو ناراض ہو رہی ہیں‘ اس لیے ایسا ہو رہا ہے۔“

”تمہارے باپ کو کیا پہلے اپنی بہن کا خیال نہیں آیا تھا جو منگنی کے بعد ایسا کر رہے ہیں۔“ ان لوگوں کو پچاس کروڑ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا ورنہ وہ اور باتیں بناتیں۔

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں، جیسے امی نے فون پر بتایا‘ میں آپ کو بتا رہی ہوں۔“

”پھر بھی یہ سب اچھی باتیں نہیں ہیں...... اس قسم کی حرکتوں کو اوچھی حرکتیں کہتے ہیں...... یا تو کسی سے وعدہ نہ لیا جائے اور جب کیا جائے تو اسے پورا نبھایا جائے...... نگین کی منگنی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ایک دم میں منگنی توڑنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے...... اصل بات تمہارے گھر والوں نے تمہیں نہیں بتائی“ ممانی جان بھی ذہین فطین تھیں‘ فہمی کی بات سن کر انہوں نے تمسخر سے کہا۔

”آج کل تو نکاح کی کوئی اہمیت نہیں رہی‘ لوگ نکاح توڑ کر دوسری جگہ رشتہ طے کر دیتے ہیں یہ تو پھر منگنی ہے۔ اب ابو پھوپو کی ناراضی تو نہیں دیکھ سکتے ناں؟“ فہمی نے چڑ کر کہا۔ ممانی جان کی باتیں اسے ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

”بھئی ہم تو سچی بات کہتے ہیں‘ تمہیں کیوں بری لگ رہی ہیں؟“ ممانی جان نے اسے منہ بناتے دیکھ کر کہا۔

”بات تو میری بہن کی ہے‘ اب اس کی شادی امی ابو گاؤں جا کر کرنا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی۔ ہمارے والدین نے جو سوچا ہو گا‘ وہ بہتر ہی سوچا ہو گا۔“

”ایسا بہن کا خیال رکھنے والے تو نہیں ہیں تمہارے باوا...... اپنی بیٹی کی منگنی کرتے وقت نہ بہن سے مشورہ لیا اور نہ ہی اسے بلایا۔ فہمی کی شادی میں وہ شریک نہیں ہوئیں‘ فرید احمد کو ان کی پروا تک نہیں تھی۔“

”اب اگر وہ پروا کر رہے ہیں تو کیا بری بات ہے؟“

”نہیں بھئی‘ بہت اچھی بات ہے۔ ایسا ہی رہا تو وہ وقت دور نظر نہیں آتا جب لوگ منگنی توڑنے کی بھی مٹھائی بانٹا کریں گے“ ممانی ہنس کر کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اور فہمی جز بز ہو کر رہ گئی۔

اگلے دن اسکول کی چھٹی کی اور فہد کے ساتھ سویرے ہی گھر آ گئی۔ فہد اسے چھوڑتے ہوئے اپنے آفس چلے گئے تھے۔

نگین بہن کو دیکھ کر بھاگ کر گلے ملی اور بے اختیار رونے لگی۔ ”کیا بات ہے‘ خیریت تو ہے ناں......؟“ فہمی پریشان سی ہو گئی۔

''میرے کمرے میں آئیں'' نگین اسے اندر لے آئی اور شروع سے آخر تک ہر بات فہمی کو بتا ڈالی۔

''یہ تو صریحاً پیسے کے لالچ میں تمہارا رشتہ ختم کیا جا رہا ہے اور یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے'' وہ یکدم دکھی سی ہو گئی۔

''امی اور ابو کو کون سمجھائے جنہیں پچاس کروڑ کی چھنک صبح و شام سنائی دے رہی ہے۔''

''میں کوشش کروں گی مگر یقین نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ تو میری ساس عقل مند ہیں' انہوں نے یہ بات سن کر ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی دوسری بات ہو گی' تمہارے ابا ایسے نہیں ہیں جیسے وہ اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی اس بات پر مجھے بہت غصہ بھی آیا تھا۔''

اور جب فہمی نے ماں سے بات کی تو انہوں نے اس کو الٹا خود ہی لتاڑ ڈالا ''آتی ہوئی دولت کو ٹھکرانا بے وقوفوں کا کام ہوتا ہے۔ اگر آج ہم تمہاری سسرال میں تم سے سو کھی محبت جتائیں تو تمہیں صبح و شام طعنے پڑیں' جب بھی تمہارے گھر جاتے ہیں تو بھرے پڑے جاتے ہیں۔ اگر تم پیسے والوں میں بیاہی ہوتیں تو آج تمہاری زندگی ایسی نہ گزر رہی ہوتی جیسے آج گزار رہی ہو۔''

''میں الحمدللہ خوش ہوں' فہد میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے'' فہمی نے ماں سے کہا۔

''چھ سات ہزار کی تنخواہ کے لیے اسکول میں تو رگڑ وا رہا ہے ناں تمہیں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ! اسکول کی جاب کر کے میں اپنے آپ کو خود ریلیکس محسوس کرتی ہوں۔''

''اگر تمہارے میاں کے پاس پیسا ہوتا تو پیسا خرچ کر کے بھی خوشی محسوس کرتیں۔''

''اگر ایسی بات ہوتی تو ہر پیسے والا خوش و خرم رہا کرتا۔ یہ دکھ' تکلیفیں اور آنسو غریبوں کے حصے میں آتے'' فہمی نے انہیں رسان سے سمجھایا۔ ''زبور بہت اچھا لڑکا ہے اور پھر یہ نگین کی پسند کی شادی ہو رہی ہے۔ زبور کی ماں نے بڑے باعزت طریقے سے منگنی کی ہے۔ بھوکے ننگے تو وہ لوگ بھی نہیں ہیں۔ جہاں آپ نے طے کر دیا' اسی پر قائم رہیے۔ نگین کی قسمت میں اگر بے تحاشا دولت لکھی ہے تو وہ زبور کے توسط سے بھی اسے مل جائے گی۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں...... مجھے تمہارے باپ کی ہر بات صحیح لگ رہی ہے۔ مجھے تمہاری پھوپو عظمت کی باتیں بھی درست لگ رہی ہیں اور تمہاری بات بھی غلط نہیں لگ رہی۔''

فہمی سمجھ گئی' ان حالات میں ماں سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا ہے اور اس گھرانے میں ہمیشہ باپ کی چلتی رہی ہے اس لیے وہی کچھ ہو گا جو ابو چاہیں گے۔ وہ اپنی بہن پر ایک ترحم کی نظر ڈال کر رہ گئی۔

وہ اس کی بہن ہو کر بھی اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی' کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

گاؤں جانے سے ایک دن قبل طفیل ایک بڑے سے سوٹ کیس میں زبور کے گھر سے آئے ہوئے تمام تحائف رکھ کر دے آیا تھا اور ساتھ میں خط بھی۔

یہ سب چیزیں وصول کرنے کے بعد نہ ان کے ہاں سے کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی کوئی گھر میں آیا تھا۔ جبکہ فرید احمد کا یہ خیال تھا کہ ان کے گھر سے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔

اس وقت وہ ریل کے فرسٹ کلاس سلیپر میں نگین اور فیروزہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ فہمی نے جانے سے معذرت کر لی تھی۔ ان دنوں اس کی اپنی طبیعت بھی ایسی ہی چل رہی تھی۔ دوبارہ پریگنینسی کے ابتدائی ایام تھے۔ ریل کے سفر میں اگر اسے کچھ ہو جاتا تو ساری برائی اسی کے نام آنی تھی اس لیے اس نے ازخود انکار کر دیا تھا۔

نگین کا دل آنسوؤں اور آہوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں سے شکوہ تھا کہ وہ اس کے احساسات کو سمجھ کر بھی سمجھ نہ سکی تھیں۔

اسے زبور کی ماں سے بھی گلہ تھا کہ اس کا احوال سن کر بھی انہوں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

ریل آگے کی طرف بھاگ رہی تھی مگر اس کا ذہن پیچھے کی طرف قلانچیں مار رہا تھا۔

'زبور کے بچے! تمہارا دماغ خراب ہے' اب میں اتنے سارے گفٹ اٹھا کر اپنے گھر جاؤں گی؟ امی نے ٹوہ لیا کہ یہ اٹیچی بھر کے جوڑے کہاں سے لائی ہو تو میں کیا وضاحتیں پیش کروں گی'

'میرا اور تمہارا ساتھ...... نہ ہوتے ہوئے صرف اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں...... اور محبت میں ایسی کشش ضرور ہوتی ہے کہ وہ دور نہیں رہ سکتی......'

'ہم دونوں دوست بن کر رہیں گے' یہ پتی ورتا قسم کی بیوی بننے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسی بیویاں تو ٹی وی اور فلموں میں نظر آتی ہیں اور حقیقت میں تو ایسی بیویاں اکا دکا ہی ہوتی ہیں۔'

'نگین کہاں ہو' کہاں چھپی بیٹھی ہو۔ جلدی سے نکل کر آ جاؤ۔'

سوچیں جب اس کا من بھی کچلنے لگیں تو اس نے اپنا سر باہر کھڑکی سے ٹکا دیا اور دوسرے ہاتھ کا چھجا بنا کر چپ چاپ اپنے آنسو بہاتی رہی۔

فیروزہ بیگم اس کی اداسی اور آزردگی کو محسوس کر رہی تھیں مگر ان کا یہ خیال تھا کہ شجاع جیسی وجیہہ اور مقناطیسی شخصیت جب اپنی محبت کے پھاہے رکھے گی تو وہ سب بھول جائے گی۔

اس وقت ان کی نظروں میں شجاع کا سراپا چھایا ہوا تھا۔ چھ فٹ چار انچ کا شجاع جب سیاہ سوٹ میں ملبوس' نگین کا ہاتھ تھامے اپنی بڑی سی گاڑی میں آیا کرے گا' دو دو گارڈز اس کے ساتھ ہوا کریں گے تو سارا محلہ سر اٹھا کر ان کی بیٹی اور داماد کو دیکھے گا۔

میری نگین سونے اور جواہرات سے لدی کتنی خوبصورت لگا کرے گی' ممانی جان تو ہکا بکا سی رہ جائیں گی۔ میں تو کہہ دوں گی' بے شک کہیں بھی رہو مگر اپنی ایک کوٹھی کراچی میں بھی بنواؤ تا کہ لوگوں کو پتا چلے کہ مکان کیسے بنتے ہیں اور کیسے سجائے جاتے ہیں۔

اگر پچاس کروڑ میں سے دس کروڑ وہ بینک میں فکسڈ کر دے تو کتنا منافع ماہانہ ملا کرے گا؟ وہ اپنے ذہن میں ہی حساب کتاب میں مصروف ہو گئیں اور لب ازخود ہی مسکرانے لگے۔

کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو ان کا سر فرید احمد سے ٹکرا گیا۔ ''کیا بات ہے بھئی' ناشتے دان کھولو گی کیا؟ کھانے کے بجائے ٹکریں مارو گی؟'' وہ مسکرا کر بولے۔

انہوں نے باسکٹ میں سے ناشتے دان نکالا اور بھنا ہوا قیمہ اور ورقی پراٹھے نکال کر نگین کو بھی آواز دی۔ ابھی تک سب چیزیں گرم تھیں۔

''مجھے بھوک نہیں ہے'' اس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

فرید احمد کو پلیٹ دیتے ہوئے وہ سوچنے لگیں کہ آج کل ہوا' پانی' خوراک سے زیادہ پیسے کی اہمیت ہے۔ یہ تو نگین کو تب پتا چلے گی جب اس کے ہاتھ میں دولت آئے گی۔ وہ یہ بے وقوفی کی باتیں نہ صرف بھول جائے گی بلکہ خود اپنے آپ پر ہنسا کرے گی۔

☆☆☆

''لوگ جاہلوں سے ناتا جوڑتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں' اس کی یہ وجہ ہوتی ہے کہ جاہل لوگ بہت جلد اپنی

سطح پر آ کر بات کرنے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود تمہاری پسند‘ تمہاری چاہت اور تمہاری بے وقوفی کو ہم نے مقدم سمجھا اور اس دو کوڑی کے گھرانے میں ہم نہ صرف تمہارا رشتہ مانگنے گئے بلکہ خوشامد کی حد تک ان کی چاپلوسی کی کہ کسی طرح وہ نگین کا رشتہ تمہارے لیے قبول کر لیں اور جب انہوں نے رضامندی دی تو ہم نے ان کی اوقات کے حساب سے نہیں‘ اپنے مرتبے کے حساب سے نگین کو تحائف دیے۔ اپنے گھر میں ان کو بلا کر عزت دی‘ اپنے ذی حیثیت مہمانوں سے ان کو ملوایا اور آج ...... ہماری محبت‘ چاہت کا کیا صلہ دیا ہے ان لوگوں نے ...... ہمارے تحائف انہوں نے واپس بھجوا دیے اور یہ خط لکھا ہے انہوں نے کہ ہماری آپا ناراض ہو گئی ہیں اور ہم ان کی یہ ناراضی برداشت نہیں کر سکتے‘ اس لیے یہ منگنی توڑ رہے ہیں اور نگین کو لے کر اپنے گاؤں جا رہے ہیں جہاں اس کی شادی ہمارے بھانجے سے ہو گی۔‘‘ مسز شیرازی اپنے بیٹے زبور کو سامان کے ساتھ وہ خط دکھا رہی تھیں جو طفیل ان کے ہاں دو دن پیشتر دے کر گیا تھا اور اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

’’مگر ماما! اس میں نگین کا کیا قصور؟ وہ تو ایسی نہیں ہے۔‘‘ زبور ہکا بکا سا یہ سب سن کر پریشان ہو رہا تھا۔

’’سوئیٹ ہارٹ! شادی صرف لڑکے۔ لڑکی کی نہیں دو خاندانوں کی ہوا کرتی ہے۔ تم نے جس لڑکی کا انتخاب کیا تھا وہاں نہ تعلیم تھی اور نہ ہی پیسا۔ اور ان دونوں چیزوں کی کمی سے کچھ لوگ ذہنی بیمار ہو جاتے ہیں‘ ان میں فیصلہ کرنے تک کی سکت نہیں رہتی ہے‘ یہی حالت اس وقت نگین کے باپ کی ہے‘ بہن ناراض ہو گئی تو بیٹی کی منگنی توڑ دی۔ بھائی ناراض ہو جائے گا تو وہ بیٹی کا نکاح توڑ دے گا اور یہاں تو اور بھی مسئلہ ہے...... ‘‘ وہ توقف کے بعد مسکرائیں۔

’’کیسا مسئلہ؟‘‘ زبور نے پوچھا۔

’’میری نگین سے بات ہوئی تھی‘ اس نے بتایا تھا کہ اس کے ایک چچا امریکا میں رہتے ہیں‘ انہوں نے شجاع کی اور اس کی شادی ہونے پر ایک قیمتی گفٹ دینے کا وعدہ کیا ہے اور دونوں فیملیز یہ گفٹ حاصل کرنے کی وجہ سے یہ شادی ضرور کرنا چاہتی ہیں۔‘‘

’’صرف گفٹ کی وجہ سے ان لوگوں نے یہ منگنی توڑ دی۔‘‘ زبور کو واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔

’’بھوکے‘ ننگے لوگوں کا مسئلہ ہمیشہ پیسا ہی ہوا کرتا ہے۔ جس کے پاس جو چیز نہ ہو‘ وہ اس کی طرف لپکتا ہے۔ انہیں قیمتی گفٹ مل رہا ہے تو منگنی تو کیا وہ نکاح کو اہمیت نہیں دیتے۔‘‘

’’واقعی‘ بڑے عجیب لوگ نکلے‘ خود ہی خوشی خوشی منگنی کی اور بھونڈی سی وجہ بتا کر منگنی توڑ کر گاؤں بھی روانہ ہو گئے۔‘‘ زبور ہنوز حیرت زدہ تھا۔

’’پاگلوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ میں نے تو نگین سے کہا تھا کہ اگر وہ کہے تو میں پھر تمہارے گھر آتی ہوں اور تمہارے والدین سے بات کرتی ہوں‘ اس پر وہ کہنے لگی۔ آنٹی‘ میرے والد بے حد سخت مزاج اور ضدی قسم کے ہیں، جو ایک بار فیصلہ کر لیں اس پر وہ قائم رہتے ہیں‘ دوسرے میرا کزن بھی کوئی اتنا برا نہیں ہے‘ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میری منگنی کا سن کر اس نے خودکشی کرنے کی کوشش تک کر ڈالی۔ ایسی صورت میں‘ میں بھی اب اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں زبور کو بھی خدا حافظ نہیں کہوں گی۔ آپ اس سے کہیں کہ مجھے بھول جائے اور اپنی فیملی میں ہی شادی کرے۔‘‘

’’نگین نے ایسا کہا‘ آپ سے......؟‘‘ زبور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

’’ہاں بیٹا! کیا اب بھی تم یہ کہو گے کہ میں نے تمہاری پسند کو اپنی پسند نہیں سمجھا؟‘‘

’’نہیں ماما! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ نگین کے ابو واقعی بے حد سخت مزاج اور ضدی قسم کے ہیں بات وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی مگر وہ خود بھی اس نہج پر سوچے گی‘ مجھے حیرت ہو رہی ہے۔‘‘

’’میرے چاند! جیسے والدین ہوتے ہیں‘ ان ہی کی خوبیاں‘ خامیاں ان کے بچوں میں در آتی ہیں۔ نگین میں بھی اپنے باپ کے اثرات زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تو آئیں گے ہی۔‘‘

’’چلتے وقت مل کر بھی نہیں گئی‘‘ زبور کا دکھ کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

’’جب قسمت میں ملنا ہی نہیں لکھا تھا تو ایسے میں وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتی۔ وہ واقعی سمجھ دار قسم کی لڑکی تھی۔ اس نے بالکل صحیح کیا۔ گو کہ انتخاب اس کا غلط ہے کہ تم پر اس نے اپنے کزن کو ترجیح دی۔‘‘

’’میری تو قسمت ہی خراب ہے‘ منگنی ہونے کے بعد ختم ہو گئی‘ نہ کوئی بات نہ کوئی وجہ؟‘‘

’’ارے بیٹا! ہم نے تھوڑی منگنی توڑی ہے‘ یہ تو ان لوگوں نے خود ختم کی ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور...... یہ سب تو انہوں نے کیا ہے‘ تم خط پڑھ لو...... اور دیکھ لو یہ سب سامان جو وہ ہمارے منہ پر مار گئے۔ نہ انہیں یہ احساس تھا کہ ہم اپنے عزیزوں سے کیا کہیں گے کہ یہ رشتہ کس وجہ سے ختم ہو گیا اور نہ ان میں یہ تمیز کہ ہمارے پاس آتے‘ ہم سے مشورہ کرتے اور ہم انہیں یقیناً اس سطح پر ضرور سمجھا لیتے کہ وہ یہ انتہائی بدصورت رویہ نہ اپنا پاتے۔‘‘ مسز شیرازی نے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’کاش! اگر وہ ہمارے گھر آتے تو میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر نگین کے لیے سوالی بن جاتی ...... اور کہتی کہ اگر انہیں اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے کوئی خطیر رقم چاہیے تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں مگر اپنے بیٹے کو ملول دیکھنا پسند نہیں کروں گی۔‘‘ مسز شیرازی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جنہیں پونچھنے کے بجائے وہ زبور کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

زبور نے اپنے ہاتھ سے ماں کے آنسو پونچھے اور ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ’’ماما اس بات میں بھی یقیناً اللہ کی مصلحت ہو گی۔ خدا نہ کرے کہ آپ کبھی میری وجہ سے کسی کے قدموں میں جھکیں۔ آپ جہاں کہیں گی‘ میں اب وہیں شادی کروں گا۔ آپ کو بے وجہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے‘‘ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ باہر نکل گیا۔

تب مسز شیرازی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرائیں اور زیر لب بولیں ’’اچھا ہوا کانٹا از خود نکل گیا ورنہ اپنے زبور سے دور رکھنے کے لیے مجھے نہ جانے کیا کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے ...... ٹاٹ کا پیوند ٹاٹ میں ہی سجا کرتا ہے‘ مخمل میں نہیں۔ یہ تو میری مجبوری تھی کہ اپنے بیٹے کا دل جیتنے کے لیے مجھے اس حد تک سوانگ بھرنا پڑا تھا۔‘‘

☆☆☆

فریال کے پاس اس کے پرس میں وہ دونوں رسیدیں محفوظ تھیں‘ اس کے رجسٹرڈ خطوط وصول کرنے پر ثریا بھابی نے جن پر اپنے دستخط کیے تھے۔

’جب بھائی‘ بھاوج ہی نہیں چاہتے کہ میں اس گھر میں قدم رکھوں تو زبردستی جانے کا کیا فائدہ؟ بھائی تو ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیں گے اور ماں ویسی ہی روتی رہ جائیں گی ...... جیسے وہ اس شب روتی نظر آئی تھیں جب وہ عدیل کے ساتھ نکاح کر کے گھر میں گئی تھی۔ اپنی ماں کا سسکتا اور غم زدہ وجود اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔

صادقہ باجی کا بوتیک بہت اچھا چل رہا تھا۔ وہ اس کی محنت کا پورا پورا صلہ اسے دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسے اپنے پاس بڑی محبت سے رکھا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں رکھا ہوا تھا جب اس کے اپنے بیگانے ہو چکے تھے۔ وہ وہاں بے حد آرام سے تھی مگر عدیل کا خیال اکثر آتا تھا۔

عدیل جب سے گیا تھا‘ لوٹ کر شکل نہیں دکھائی تھی۔ فریال کے پاس اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اب وہ اکثر یہی سوچا کرتی تھی کہ عدیل واپس آ جائے تو وہ اس رقم سے کوئی چھوٹا موٹا بزنس کرے اور وہ اس کے ساتھ

کسی چھوٹے سے گھر میں زندگی بسر کرے۔

صادقہ باجی کے احسانات کو وہ کسی صورت اتار نہیں سکتی تھی۔ مستقل ان کے ساتھ رہنا' کھانے سے لے کر کپڑوں تک اس کا تمام خرچہ وہ خود برداشت کیا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں ''اللہ نے انہیں بہن دی نہ اولاد...... مگر تمہاری صورت میں یہ دونوں کمی از خود پوری کر دی ہیں۔''

ان کے اس محبت بھرے سلوک کو دیکھ کر وہ یہی سوچتی تھی کہ ابھی یہ دنیا نیک لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ دن کا بیشتر حصہ ان کے ساتھ ہی بوتیک میں گزر جاتا تھا۔ گھر میں ایک بوڑھی ملازمہ گھر کا کام کاج کرتی اور کھانا پکاتی تھی۔ بوتیک سے آ کر وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کرتیں یا ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتیں۔ گھومنے کا شوق نہ صادقہ کو تھا اور نہ اب فریال ہی کو رہا تھا۔ رات کا خبرنامہ دیکھ کر دونوں چائے ایک ساتھ ہی پیا کرتی تھیں۔

چائے پینے کے دوران وہ بوتیک سے متعلق بہت سی باتوں پر ڈسکشن کیا کرتی تھیں۔ بوتیک کی ڈیزائننگ کا چارج مکمل طور پر فریال کے پاس تھا۔

صادقہ ایک سیدھی سادی اور نیک صفت خاتون تھیں۔ نئے فیشن کے ملبوسات' ورکنگ ویمن کے ملبوسات' حاملہ خواتین کے ملبوسات بنانے کا آئیڈیا فریال کا ہی تھا۔ جس پر عمل کر کے ان کے بوتیک کی ڈیمانڈ ہر روز بڑھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب انہوں نے اس کی ایک برانچ اسلام آباد میں بھی قائم کر دی تھی جس میں ہمہ وقت رش رہتا تھا۔

تمام ڈریسز کی ڈیزائننگ چونکہ فریال ہی کرتی تھی اس لیے اس نئے بوتیک میں بھی پچیس فیصد منافع وہ فریال کے نام اس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیتی تھیں۔

آج بھی انہیں ایک بڑا آرڈر ملا تھا' جس کی پچاس فیصد پیشگی پے منٹ بھی ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ چائے پیتے ہوئے یہی بات فریال سے ڈسکس کر رہی تھیں کہ پانچ ہزار سوٹ اتنے کم ٹائم میں ہم کیسے تیار کروا سکیں گے۔

''آپ پریشان نہ ہوں' ہم پچاس ٹیلر ہائر کر لیں گے اور مطلوبہ وقت سے پہلے ان کا آرڈر کمپلیٹ کر لیں گے۔''

''ڈیزائن کیا وہی رکھیں' جو پہلے بنائے گئے تھے؟'' صادقہ باجی نے پوچھا۔

''میں نئے ڈیزائن بنا لوں گی' آپ بے فکر رہیں۔''

''بیٹا! اتنی محنت کرو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔''

''نہیں باجی! میں اب سخت جان ہو چکی ہوں' مجھے کچھ نہیں ہو گا۔''

''تم چاہو تو اپنے گھر میں یہ بات بتا دو کہ تم یہاں بہت اچھی جاب کر رہی ہو' اب تو اپنا ذاتی فلیٹ بھی بک کروا دیا ہے' تمہاری امی یہ بات سن کر خوش ہوں گی۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے خط لکھنے کا۔''

''بیٹا! ڈاک کا نظام خراب ہی رہتا ہے' ہو سکتا ہے انہیں تمہارے خط ملے ہی نہ ہوں؟''

''یہ بات نہیں ہے باجی! میں نے امی کو ایک نہیں' دو خط بھیجے تھے اور دونوں رجسٹرڈ تھے' دونوں خطوط ثریا بھابی نے ریسیو کیے۔''

''فون تو تم کر سکتی ہو......؟''

''ہمارا فون شروع سے ہی شاہنواز بھائی کے کمرے کے پاس رکھا رہتا ہے۔ زیادہ تر فون ثریا بھابی ہی ریسیو کرتی ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ فون کیا مگر میری آواز سن کر ہی انہوں نے رانگ نمبر کہہ کر فون کاٹ دیا۔''

''اگر تم کہو تو میں فون پر بات کر لوں' میں اپنے موبائل سے بات کروں گی' انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ کس شہر

سے فون آیا ہے۔''

''کیا فائدہ...... جب بھائی' بھاوج مجھ سے دلی نفرت کرتے ہیں اور کسی صورت نہیں چاہتے کہ میں ان کے پاس جاؤں...... تو میں یونہی ٹھیک ہوں۔ اور پھر کیا پتا میرے جانے سے میری ماں بھی پریشان ہو جائیں اور سائرہ کی سسرال میں بھی غلط سلط باتیں جائیں۔'' فریال کو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ سائرہ جاوید سے فارغ ہو کر گھر آ بیٹھی ہے۔

''جیسی تمہاری مرضی...... میں تو یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم مجھے چھوڑ کر جاؤ۔ بیوگی میں تنہائی کے سوا میرے پاس تھا ہی کیا۔ بوتیک سے آ کر' خاموش دیواروں کو گھورا کرتی تھی' اب کم از کم کوئی بولنے والا تو ہے۔ اور پھر دوسری بڑی بات یہ کہ تم میرے لیے بخت آور ثابت ہوئی ہو۔ میرا بوتیک جو دھیمی رفتار سے چل رہا تھا' اب وہ صرف تمہاری محنت اور گہری دلچسپی کی وجہ سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ پہلے تو مجھے ذرا سا بھی نقصان ہوتا تھا تو پریشان ہو کر انٹ سنٹ (الٹے سیدھے) ڈیزائن سلیکٹ کر لیا کرتی تھی' ذرا سا ڈپریشن ہو جاتا تھا تو کاجو بوجوسی (سست اور پریشان) ہو کر بیٹھ جاتی تھی مگر اب تمہارے دم سے نہ صرف میرے بوتیک میں بلکہ میرے گھر میں' میرے دل میں ایک رونق سی ہو گئی ہے۔''

''میں بھی تو بہت خوش ہوں آپ کے ساتھ...... میں جو عدیل کے ساتھ ہر وقت روتی رہتی تھی' آپ دیکھیے' کیسے ہنستی مسکراتی رہتی ہوں۔''

''اللہ کرے تم سدا یونہی ہنستی کھلکھلاتی رہو۔'' صادقہ باجی نے دعا دیتے ہوئے کہا۔

صادقہ باجی فون ریسیو کرنے اٹھیں تو وہ وہیں گاؤ تکیے کے سہارے ٹی وی دیکھنے لگی۔ اس وقت خبرنامے میں ان لوگوں کے بارے میں ایک رپورٹ دکھائی جا رہی تھی جو بحری راستے سے قطر میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے کی صورت میں گرفتار ہوئے تھے اور پھر وہ یہ دیکھ کر ششدر سی رہ گئی کہ ان میں عدیل بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ بالکل واضح طور پر اسکرین پر آیا تھا۔

عدیل کو دیکھ کر اس کی سسکی سی نکل گئی اور وہ بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔

صادقہ باجی پاس آئیں تو دیکھا کہ فریال کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔

''فریال بیٹا! کیا بات ہے' کیوں رو رہی ہو؟''

تب وہ دھیمے سے لہجے میں بتانے لگی کہ عدیل قطر میں گرفتار ہو گیا ہے۔

''خس کم جہاں پاک...... گرفتار ہوتا ہے تو ہونے دو' تمہیں اس سے کیا؟''

''نہیں باجی! آخر...... وہ ہے تو میرا شوہر!''

تب وہ بات جو صادقہ باجی اس سے چھپائے بیٹھی تھیں اس کو دھیرے دھیرے بتانے لگیں کہ اس نے طلاق نامہ بھیج دیا تھا۔ ''اور اب تمہارا اس برے آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

صادقہ باجی نے اپنی الماری کے سیف سے وہ طلاق نامہ اسے تھما دیا اور کہا ''اسے تم اپنی آزادی کا پروانہ سمجھو۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ وہ تم سے شادی کر کے تمہیں یہاں لے آیا۔ اور تمہارا مجھ سے رابطہ ہو گیا ورنہ اس قماش کے لوگ کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں' تم جیسی معصوم لڑکیاں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

صادقہ باجی کی بات سن کر وہ یکبارگی سن سی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ طلاق نامہ دیکھ کر وہ ہنسے یا روئے؟

☆☆☆

یہ محبت کی خاصیت ہے، جس سے محبت کی جائے، اس کے بارے میں ہر بات کا پتا چل جاتا ہے۔

یہ الہام کی سی صورت میں ہوتا ہے کہ دل خود بخود ہی گواہی سی دینے لگتا ہے اور شاید سچی محبت کی نشانی بھی یہی ہوتی ہے کہ کوئی بات محبت کے خلاف ہو جائے تو دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔

من کی بے کلی بھی اسی طفیل سے ہوتی ہے کہ کسی کل چین ہی نہیں آتا......نرم و گداز بستر میں بھی کانٹے محسوس ہوتے ہیں اور اچانک پریشان ہو کر بے قرار ہو جانا بھی اسی نکتے کا مرہون منت ہے۔

شجاع کی بے قراری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ فرح کی شادی کے بعد تو جیسے وہ بکھر کر رہ گیا تھا۔

اب نہ اسے اپنی ماں کا خیال رہتا تھا، نہ بہن کی پروا تھی اور اپنے بارے میں تو سوچنا ہی بھول گیا تھا۔ گھر سے سویرے نکل جاتا تو رات گئے آتا۔

اپنے لہجے کی شیرینی اور نرمی کو وہ کب کا بھول چکا تھا، جو کوئی اسے مخاطب کرتا تو وہ اسے پھاڑ کھانے کو آتا۔

"فرح شادی کے بعد بہت خوش ہے" اس کی بہن نے بارہا بتایا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے یہ لگا تھا کہ جیسے فرحت جھوٹ بول رہی ہے۔ خواہ مخواہ کے اسے دلاسے دے رہی ہے۔

"کل دیکھا تھا فرحت کو، اتنا پیارا جوڑا پہن کر آئی تھی وہ...... میں نے پوچھا کہاں کا ہے، میکے یا سسرال کا؟ تو وہ ہنس کر بولی "اشرف نے دلایا ہے، شادی کے بعد۔"

"لو، مہینہ شادی کو ہوا نہیں، شاپنگ کرنے بھی لگ پڑے ہیں وہ......؟"

اور شجاع کو یوں لگا جیسے فرحت اس بات کی منتظر رہتی ہے کہ جیسے ہی وہ گھر میں آئے اور وہ فرح کی اشرف کے ساتھ محبت اور چاہت کی کہانیاں نشر کرنا وہ شروع کر دے۔

'کیا اشرف کے ساتھ وہ خوش ہو گی؟' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

'نہیں، ہرگز نہیں، اس کو اشرف بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ بارہا اس نے اس کے سامنے اشرف کا مذاق اڑایا تھا۔'

اگر وہ خوش نہیں ہے تب بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں پچھتر فیصد لڑکیاں غموں اور دکھوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو پھر سمجھایا۔

'شجاع، صبر کر۔ وہ تیری قسمت میں ہی نہیں تھی، وہ سوچتے سوچتے ایک نکتے پر آ کے بے دم سا ہو گیا۔

قسمت میں کیوں نہیں تھی۔ اگر رشتہ مانگا جاتا تو اس کی ماں اشرف کو ہرگز نہ دیتیں......مگر وہ تو شجاع ہو کر بھی ڈرپوک بن بیٹھا۔ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ سارا قصور ہی میرا تھا۔ اس نہج پر آ کر اس کا غصہ مزید آتشیں سا ہو گیا۔

کسی طرح اسے چین نہیں آ رہا تھا، اس کی اپنی محبت کسی اور کی ہو چکی تھی اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

اب وہ سڑک پر چلتا تو راہ میں آئے پتھر کو ٹھوکر مار کر چلتا۔ چائے میں چینی تیز ہو جاتی تو وہ کپ دیوار سے دے مارتا۔ فرحت کے بچے شور مچاتے تو اتنی زور سے انہیں ڈانٹتا کہ سب ہی دبک کر ماں کے پاس بیٹھ جاتے۔

ماں اس کی پسند کے کھانے بناتیں اور وہ چکھ کر نہ دیتا۔ فرحت اس کے آنے کا انتظار کرتی رہتی اور وہ تو بہن کے گھر کا جیسے راستہ ہی بھول گیا تھا۔

فرحت کے پڑوس میں ہی تو وہ دشمن جاں بیاہ کر گئی تھی۔ اب اس میں نہ اشرف کا سامنا کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی اب وہ فرح سے نظریں ملا سکتا تھا۔

فرح سے جدائی کا غم اسے دیمک بن کر کھائے جا رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا، دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے والا شجاع مسکراہٹ کے معنی تک بھول گیا تھا۔

☆☆☆

فرح نے یہ اپنے آپ سے عہد کیا تھا، اپنی زندگی اشرف کی پسند پر گزارے گی۔ وہ دن کو رات کہے گا تو اسے رات ہی سمجھے گی۔

شجاع سے ملنا تو کیا اس کا ذکر تک نہیں سنے گی۔ اب ایسی راہوں پر جانے کا فائدہ بھی کیا تھا، جہاں اس کے لیے صرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔

میاں اس کا حد سے زیادہ شکی مزاج تھا۔ پرسکون زندگی گزارنے کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرنا ضروری تھا۔

یا اللہ، تو میرے دل سے شجاع کی محبت نکال کر پھینک دے۔ اس کا نام تک میں نہ سنوں۔ وہ مجھے کبھی دکھائی نہ دے اور اگر کبھی نظر آ جائے تو میں اسے غیر اہم سمجھتے ہوئے گزر جاؤں۔

یا اللہ، میرے دل کی کوئی بھی دھڑکن، کبھی اس کے نام کا راگ نہ الاپے۔

یا اللہ، مجھے ہمیشہ شجاع سے دور ہی رکھنا اور اشرف کے دل میں میری محبت، میری عزت قائم اور دائم رکھنا۔

یارب العالمین، محبت کرنے کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دینا جو میں سہہ نہ سکوں۔

اے میرے مولا، اب میں اشرف کے نام پر زندگی گزارنا چاہتی ہوں......اس کے دل سے شک کے بیج کو فنا کر دے کہ تو ہی ہر بات پر قادر ہے۔ تیرے لیے کچھ بھی کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میرا شوہر مجھ پر شک کرتا ہے، اس کا یہ شک کسی طرح رفع کر دے۔

میرے مولا! میرا دل ابھی تک شجاع کو برا نہیں کہتا۔ اسے قصوروار نہیں ٹھہراتا......میرے دل سے اس کی یہ چاہت ختم کر دے......! اور مجھے یہ یقین دلا دے کہ وہ واقعی قابل نفرت ہے۔ جس سے کبھی بھی محبت نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کی یاد کی کوئی رمق اپنے دل میں پاؤں۔"

دعا مانگ کر وہ واقعی ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ اس کا ذہنی تناؤ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔

اللہ یقیناً شہ رگ سے بھی قریب ہے، وہ دلوں کے حال جانتا ہے۔ جو میں چاہتی تھی، وہی میرا رب چاہ رہا ہے۔ وہ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ اس نے میرے دل کی بات آخر سن ہی لی۔

اشرف کی سختی قدرے کم ہوئی تو اس کو مزید سکون کا احساس ہوا۔ آخر شوہر ہے وہ میرا......میرا خیال تو رکھے گا ہی۔

فرح کو بخار آیا تو وہ چپ چاپ بستر پر پڑی رہی۔ معمول کے کام بخار میں ہی سرانجام دیتی رہی اور جب پانی کا گلاس دیتے ہوئے اشرف کا ہاتھ اس کی کلائی سے ٹکرایا تو وہ حیرت سے بولا۔

"فرح، تمہیں بخار ہے اور تم نے بتایا تک نہیں؟"

”اونہہ! بخار بھی کوئی بیماری ہے، خود ہی اتر جائے گا۔“

”نہیں...... دوا لو اور جاؤ بستر پر لیٹو“ اشرف کے نرم جملے اس کے دل کی کلی کو کھلا سے گئے۔

مولا......! میں تیرا کتنا شکر ادا کروں...... تو پتھر کو موم بنا دے۔

اشرف کی سختیاں، تیز و تند جملے جو شروع میں اس کو کملا کر رکھ دیتے تھے، اب ان کی وہ عادی ہو گئی تھی۔

کل امی کے ہاں جانا تھا، رات سے ہی وہ بے قرار سی تھی۔ ہفتے میں چند گھنٹوں کے لیے جانا اس کے لیے ایسا تھا جیسے کسی قیدی کی جیل سے رہائی ہو۔ صبح ہوئی تو جلدی جلدی گھر کے کام کر کے اس نے اپنی پسند کا سوٹ پہنا۔ برقع پہن کر نقاب گرا کر ابھی گھر سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ فرحت کے دروازے پر اسے شجاع کھڑا نظر آیا۔ وہ بھی اسی کی جانب متوجہ تھا۔

کتنے عرصے بعد وہ شجاع کو دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنا نقاب اٹھایا۔ شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا عہد، اس کی دعائیں، سب دھری کی دھری رہ گئیں اور آنسوؤں کا پرنالہ آنکھوں سے بہہ نکلا۔

وہ لمحے پچھل کر امر ہو گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے صحرا، سمندر کو دیکھتا ہے۔

”شجاع......“ ایک سسکی اس کے دل سے نکلی جسے اس نے لبوں سے ہی کچل ڈالا اور پھر وہ تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ قدم بڑھا کر اس کے سامنے سے گزرنا آسان کہاں تھا۔

ساس نے حیرت سے فرح کو دیکھا اور پوچھا ”تم تو اپنے گھر جا رہی تھیں، گئی نہیں؟“

”اماں، مجھے یاد آ گیا، اشرف کے کپڑے استری نہیں کیے تھے، کل چلی جاؤں گی۔“

”جھلی نہیں تو...... واپس آ کر کر لیتی استری۔“ ساس ہنس کر اپنے کام میں محو ہو گئیں۔

اور شجاع بھی بہن کے گھر میں جانے کے بجائے کھیتوں میں نکل گیا۔ عرصہ پہلے پڑھی ہوئی نظم کا ایک حصہ اس وقت اس کے لبوں پر تھا۔

روشنی کے ہالے میں کس کو کھوجتی ہو تم
چھپ کے یوں اداسی میں کس کو سوچتی ہو تم
بار بار چوڑی کے سر کسے سناتی ہو
شور سے صدا کس کی توڑ توڑ لاتی ہو
بزم میں بہاروں کی، کھوئی کھوئی لگتی ہو
دوستوں کے ہمراہ بھی، کیوں اکیلی رہتی ہو
موج موج بہتی ہو، آنسوؤں میں رہتی ہو
جھالروں سے پلکوں کی، ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہو
بلبلے کی صورت میں پھوٹ پھوٹ جاتی ہو
دھند سے لپٹ کر کیوں، سونی راہ تکتی ہو
کھڑکیوں سے برکھا کو دیکھ کر بلکتی ہو
سارے سپنے آنکھوں سے، ایک بار بہنے دو
رات کی ابھاگن کو تارہ تارہ گہنے دو
ماضی حال مستقبل کچھ تو کورا رہنے دو

پل تلے سے بہنے دو آنسوؤں کی یہ ندیاں
وقت چلتا جائے گا، بیت جائیں گی صدیاں
بے حسوں کی بستی میں، بے حسی کو رہنے دو
دل تو پورا پاگل ہے اس کو پورا رہنے دو

(فرزانہ نیناں)

☆☆☆

ادھر اپنے کمرے میں جا کر فرح آئینے کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ اس کے آنسو ہیرے موتی کی طرح اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ رونے کی شدت سے آنکھیں سرخ انگارا اور چہرے پر تمازت سی چھا گئی تھی۔

”میری خوبصورتی میں کیا کمی تھی جو تم راستہ پلٹ گئے؟“ اس نے آئینے سے پوچھا۔ اس وقت وہ تنی کھڑی تھی۔

”قسمت کی چوٹ اسے ہی تو کہتے ہیں۔“ آئینہ ہنسا۔

”کیا میں بدقسمت ہوں؟“ گھنے سیاہ بال کھل کر بکھر سے گئے تھے۔

”اللہ نہ کرے۔“ آئینے نے دلاسا دیا۔

”پھر میں کیا کروں؟“

”کچھ نہیں، وقت کے ساتھ ساتھ چلو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ وقت کا مرہم بہت جلد گھاؤ بھر دیتا ہے۔“

”میں بھول کر بھی اسے بھول نہیں پاتی...... تو زخم کیوں کر بھریں گے؟ یہ تو شاید سدا ہی ہرے رہیں گے۔“

”اس انداز میں مت سوچو تم...... غموں اور دکھوں کی آزمائش انسانوں کی ہی ہوتی ہے“

”اپنے اوپر قابو تو تمہیں پانا ہوگا اور ہاں، زخموں کے کھرنڈ بھی نوچے نہیں جاتے ورنہ زخم صدا ہرے رہتے ہیں۔“

اسے ایک جھرجھری سی آ گئی اور دل تھام کر کھڑی ہو گئی کہ اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے آئینے میں سے شجاع نکل آیا ہو۔

وہ اسے دیکھ کر بھونچکا سی ہی تھی کہ اس نے اسے تھام کر اپنے مد مقابل بٹھا لیا اور پوچھا ”تو خوش تو ہے ناں فرح؟“

”ہاں، بے حد خوش ہوں“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”مجھے ایسا لگ تو نہیں رہا۔ پورے چہرے پر افسردگی کا راج ہے۔“

”نظر کا دھوکا ہے، میں تو بہت خوش ہوں“ وہ سراسیمہ سی بول رہی تھی۔

”اس بات کو میرا دل کیوں نہیں مانتا؟“

”اپنے دل کو تم اچھی طرح سمجھا لو۔ میں واقعی خوش ہوں، بے حد خوش۔ میرے جیسا تو شاید کوئی خوش بھی نہ ہو......“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”اچھا...... پھر میں چلتا ہوں، خدا حافظ!“

اور آئینے میں شجاع کا سراپا غائب ہو گیا اور وہ آنکھیں مل کر اسے یوں ڈھونڈنے لگی جیسے وہ یہیں کہیں ہو اور

پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ تکیہ اپنے منہ پر رکھ کر کروٹ لیتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ آج کتنے عرصے بعد شجاع کو دیکھا تھا۔ کتنا کمزور ہو گیا ہے وہ۔ فرحت آپا کے گھر جانے کے بجائے ٹکر ٹکر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اسے یہ پیغام دے رہی تھی کہ فرح، تو...... تو خوش ہے...... مگر میرا حال تیرے جیسا نہیں ہے۔ تیرے بغیر...... مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ شاید اپنی بات کا مزید اقرار لینے کے لیے وہ آئینے میں سے بھی نکل آیا تھا۔

تب وہ بے ساختہ سوچنے لگی۔

جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو
تو ایک بھی شب نہ سو سکو گے
کہ لاکھ چاہو نہ ہنس سکو گے
ہزار چاہو نہ رو سکو گے
کہ خواب کیا ہیں عذاب ہیں یہ
میرے دکھوں کی کتاب ہیں یہ
رفاقتیں ان میں چھوٹتی ہیں
محبتیں ان میں روٹھتی ہیں
پنپتی ہیں ان میں وحشتیں سی
اذیتیں ان میں پھوٹتی ہیں
ان ہی کے ڈر سے خزاں ہیں جذبے
ان ہی سے شاخیں سی ٹوٹتی ہیں
غموں کی بندش ہیں خواب میرے
دکھوں کی بارش ہیں خواب میرے
ابل رہا ہے دکھوں کا لاوا
رہین آتش ہیں خواب میرے
خیال سارے جھلس گئے ہیں
سلگتی خواہش ہیں خواب میرے
اکھڑتی سانسیں ہیں زندگی کی
لہو کی سازش ہیں خواب میرے
جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو
تو ایک شب بھی نہ سو سکو گے

(شاعر۔ وصی شاہ)

☆☆☆

پوری طاقت سے سامنے سے آنے والا اس سے ٹکرایا اور وہ زمین پر گر گیا۔

''اندھا ہے کیا؟'' لعزے ہوتے ہوئے اس نے پوچھا تو اشرف دانت نکالے کھڑا تھا۔

''آنکھیں بند کر کے چلتے ہو یا مے نوشی شروع کر دی ہے جو راہ چلتوں کے ٹکریں مار رہے ہو۔'' اشرف نے ہنس کر کہا۔

شجاع کا دل چاہا کہ گھونسے مار مار کر اس کی شکل بگاڑ دے جو قصداً اس سے ٹکرایا تھا اور ایسی باتیں کر کے اس سے لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''میں اپنے خیال میں مست تھا، تمہیں دیکھا نہیں تھا'' شجاع نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔

''ابھی تک عاشقوں کی مستیاں تم میں سے ختم نہیں ہوئیں'' اس نے تمسخر بھرے انداز میں کہا۔

''اپنا کام کر بھائی...... زندگی میں عشق کے علاوہ بھی کام ہوتے ہیں'' شجاع کسی صورت اس کے منہ نہیں لگنا چاہ رہا تھا۔

''کیوں، فرح کے لیے رونا تمہارا ختم ہو گیا کیا؟'' وہ بے رحمی سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''فرح کا میرا اب کیا ساتھ...... وہ تو تمہاری بیوی ہے۔''

''مگر عاشق تو تم اس کے تھے ناں......'' اشرف کی کمینگی کی سطح کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو اشرف، شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

''لو...... شرم بھی ہمیں آنی چاہیے۔ عاشقوں والے خط تم نے میری بیوی کو لکھے۔ اب شرم کی پوٹلی لے کر بھی ہم پھریں، یہ تو بے ایمانی ہے'' وہ پھر کمینگی سے ہنسا۔

اور وہ اپنے غصے کو بمشکل قابو پاتا...... لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور چلتا چلا گیا۔ ٹینڈے کا کھیت پار کیا تو عارف کی زمینوں پر نکل گیا۔ اور جب رات گئے گھر آیا تو دونوں پیروں میں چھالے تھے۔

☆☆☆

بے حد خوبصورت خبر سے دن کا آغاز ہوا تھا۔ ثنا کا ایف ایس سی کا رزلٹ نکلا تھا، جس میں وہ اے ون گریڈ میں پاس ہوئی تھی۔

ثریا اور شاہنواز کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ بات کرنے سے پہلے ہنس رہے تھے۔ ثنا ان کی اکلوتی بیٹی تھی، اس کی ڈاکٹر بننے کی شدید خواہش تھی اور آج اس کا اے ون گریڈ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اسے میڈیکل کالج میں ضرور داخلہ مل جائے گا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بی گریڈ آ جائے گا۔ اسی فی صد نمبر تو بہت ہوتے ہیں، ثنا نے تو واقعی کمال کر دیا۔'' شاہنواز نے بیٹی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بہنیں سی گریڈ میں پاس ہوئی تھیں اس لیے آپ کو بی گریڈ بھی بہت معلوم ہو رہا تھا مگر میری ثنا مجھ پر گئی ہے۔ میں بھی ایسے ہی شوق سے پڑھتی تھی۔'' ثریا نے کانی نظروں سے ساس کو دیکھتے ہوئے شاہنواز سے کہا اور شائستہ بیگم کی مسکراہٹ بجھ سی گئی۔

''مگر تم تو ڈاکٹر نہ بنیں، میری بیٹی جیسی قابل ہوتیں تو بنتیں۔''

''آپ کو شادی کی ہی جلدی تھی ورنہ ڈاکٹر بھی بن جاتی۔''

''اچھا، بی اے کر کے تو تم آفس میں جاب کر رہی تھیں، میڈیکل کالج میں کب داخلہ لیا تھا'' شاہنواز نے [illegible] بیوی کو شرارت سے چھیڑا۔

''بھائی صاحب! ثریا بھابی ہومیو پیتھک کالج کی باتاں کر رئے، اس میں تو میٹرک کر کے بھی داخلہ اچ مل

جاتا۔'' صابرہ نے ساتھ دیا۔

''نہیں امی! تائی جی حکیمی کورس کی بات کر رہی ہیں۔'' منور نے ثنا کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''نہیں...... میرا یہ خیال ہے کہ ثریا گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک ڈاکٹر بننے کے موڈ میں ہوں گی' وہاں تو شا میٹرک کی شرط بھی نرم ہے'' شاہنواز نے کھلکھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اور ثریا چھن سے بے ساختہ ہنس دی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایک بات پر دس باتیں سناتی مگر آج وہ بہ خوش تھی اور شاید خوشی کے موقعے پر طبیعت میں نظر انداز کرنے کی خوبی در آتی ہے۔ لچک اور ملائمت اس ستاروں کی طرح ٹنک جاتی ہے۔

''بھابی پاشا! آج اللہ نے اتی بڑی خوشی دیے آپ کو، تو اچھا سا سوب لوگاں کو کھانا کھلائیں ناں آپ'' صابرہ نے کہا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ میں ابھی مرغی کا قورمہ پکاتی ہوں۔ شیر مال اور کھیر باہر سے منگا لیں گے۔''

''آپ خود خورمہ (قورمہ) نکو پکائیے۔'' صابرہ نے شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں؟'' ثریا نے حیرت سے دیورانی کو دیکھا۔

''وہ اس لیے کہ آپ ڈھب ڈھب قلیہ (پتلے شوربے کا سالن) پکا کے رکھ دیں گے، جیسا آپ پہلے پکا تھے ثنا کی سالگرہ کے دن......'' صابرہ نے جتایا ''سوب گردن جھکا کر کھا لیے تھے۔''

اس دن تو اتفاقاً شوربہ زیادہ ہو گیا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوگا۔''

''اگر آج بھی...... ایسا اتفاق ہو جائے تو کیا ہوئیں گا۔'' صابرہ نے امداد طلب نظروں سے ثنا کو دیکھ ہوئے پوچھا۔

''آج سب باہر جا کر کھانا کھائیں گے امی! آج آپ اپنی بیٹی کے ساتھ رہیے، باورچی خانے میں گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ثنا نے لاڈ سے ماں کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔

''ٹھیک ہے، جو میری ثنا کہے گی، آج وہی ہوگا۔''

''سائرہ شام کو تیار رہنا اور امی! آپ بھی......'' شاہنواز نے شائستہ بیگم کو خاموش سا دیکھ کر کہا۔

''میں اور سائرہ گھر میں رہ جائیں گے، تم لوگ چلے جانا۔ اگر سب چلے گئے تو گھر میں کیا تالا لگے گا؟''

''ہاں، تالا لگے گا۔ آج سب چلیں گے'' ثنا نے سائرہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مجھے بھی جانا ہوگا'' سائرہ کا لہجہ آلکس بھرا تھا۔

''پھپو! آپ کے بغیر تو مجھے مزہ بھی نہیں آئے گا۔ مجھے تو آج اپنی فریال پھپو بھی یاد آ رہی ہیں۔ میری خوشی کے موقع پر وہ اپنی پاکٹ منی میں سے مجھے گفٹ دیا کرتی تھیں۔ آج وہ ہمارے پاس ہوتیں تو کتنا لگتا۔''

''ہاں، کاش وہ ہمارے پاس ہوتی'' شاہنواز کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

شائستہ بیگم نے تڑپ کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں فریال کی یاد ان کے سوا کسی کے دل میں موجود نہیں ہے مگر شاہنواز کے لہجے نے انہیں یہ باور کرایا تھا کہ فریال ان کے دل میں بھی موجود ہے۔

''افوہ! اب کیا بیکار کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ چلو کمرے میں، میں تمہارا صدقہ اتاروں، ویسے بھی ہلکا ہے تمہارا اور نظر لگانے والے بے شمار ہیں۔'' ثریا کانی نظروں سے ساس کو دیکھتی ہوئی ثنا کو لے کر اپنے کمر

ں چلی گئی اور شائستہ بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ چاندنی کی طرح پھیل گئی۔ اس وقت ثریا کی کوئی اوچھی حرکت انہیں بری نہیں لگ رہی تھی۔

آج انہیں یہ جان کر مسرت ہو رہی تھی کہ شاہنواز، فریال کے لیے اپنے دل میں سوفٹ کارنر رکھتا ہے۔

ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب شاہنواز فریال کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے گھر میں لے آئے گا۔

☆☆☆

شدت غم سے اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا دماغ شل سا ہو گیا ہے۔ اسے ہمہ وقت ایسا ہی لگتا تھا جیسے اس کا ہ کھو گیا ہے۔ اپنی قیمتی چیز کہیں رکھ کر وہ بھول گیا ہے۔ ایسے میں اسے نہ کسی کا آنا اچھا لگ رہا تھا اور نہ کہیں جانا۔

ایک صبح وہ ناشتا کیے بنا باہر جانے کا سوچ رہا تھا کہ عظمت بیگم نے اس سے کہا۔

''آج شام کی گاڑی سے تمہارے ماموں، ممانی اور نگین آ رہے ہیں۔ ان کو لینے اسٹیشن جانا ہے۔''

''کیوں، کیا انہیں گھر کا رستہ معلوم نہیں ہے یا وہ پہلی مرتبہ گاؤں آ رہے ہیں'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

''مگر بیٹا! تمیز اور قائدہ تو یہی ہوتا ہے ناں، مہمانوں کو لینے کے لیے جایا جائے۔''

''نہ مجھ میں تمیز ہے اور رہی قاعدے کی بات...... تو وہ بھی مجھے نہیں آتے۔''

''مگر یہ تو بری بات ہوگی پتر!''

''مجھے اچھی باتیں کرنا نہیں آتیں تو میں کیا کروں؟''

''بیٹا! وہ لوگ کراچی سے آ رہے ہیں...... بھول گئے کیا تم؟ جب ان کے ہاں گئے تھے تو کس قدر خاطر ارات کی تھی، ساتھ ساتھ لے کر پھرا تھا میرا بھائی تجھے۔''

''پھر...... کیا چاہتی ہیں آپ؟'' لہجہ ہنوز اکھڑ ہی تھا۔

''اپنی ماں کی بات بھی نہیں مانے گا کیا؟ اتنے عرصے بعد میرے بھائی کا گھرانا آ رہا ہے۔ ان کو لینے تجھے اسٹیشن جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، چلا جاؤں گا مگر زیادہ ٹلے نویسی (خوشامد) کے لیے نہ کہیے گا کہ ہر وقت آپ کے بھائی کے اگے پیچھے ہی پھرتا رہوں۔''

''تو بے فکر رہ، گاؤں میں اس کا سواگت کرنے والے بہت لوگ ہیں۔''

''یہاں تو دلوں کا نشانہ بنانے والے لوگ ہیں'' وہ غم سے بولا۔

اس سے قبل کہ ماں اس سے کچھ اور کہتی...... وہ باہر نکل گیا۔ مولی بھرے پراٹھے جن کو وہ بڑے شوق سے ھایا کرتا تھا، اس نے لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔

عظمت بیگم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔ سارا دن مہمانوں کے لیے کھانے پکاتے ہوئے وہ یہی سوچتی ہیں کہ پتا نہیں وہ اسٹیشن جائے گا بھی یا نہیں۔

ان دنوں وہ اپنے ہوشوں میں تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ کیا خبر، وہ بھول ہی جائے اور فرید کو خود گھر آنا ے۔ مگر ایسا نہیں ہوا، ان کے تمام خدشات غلط ثابت ہوئے۔ مقررہ وقت پر وہ اسٹیشن سے مہمانوں کو لے کر ھر آ گیا تھا۔

عظمت بیگم نے بھائی کے ساتھ ساتھ بھاوج اور بھتیجی کو گلے لگایا۔ نگین کی پیشانی چومی۔

نگین خاموش سی تھی۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کے تاثر کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ریل کے سفر میں لاکھ آرام ہو مگر تھکن لازمی ہوتی ہے۔ جسم کا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے۔ مجھے سب سے زیاد تھکی ہوئی نگین نظر آ رہی ہے۔" انہوں نے اسے پھر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پھوپو، مجھے کوئی تھکن نہیں ہے" وہ عام سے لہجے میں بولی۔

نگین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مارے باندھے زبردستی آ گئی ہے۔ سارے راستے رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں جل تھل کر لی تھیں۔ اسے عظمت بیگم پر بھی غصہ آ رہا تھا اور باتیں بگھارتی ان کی بیٹی فرحت پر بھی غصہ آ رہا تھا جن کی ملی بھگت کی وجہ سے اسے گاؤں آنا پڑا تھا۔

نہا دھو کر وہ بستر پر ہی لیٹی تھی کہ اس کے موبائل فون پر زیور کا میسج آ گیا۔

"نگین! بعض دفعہ اچانک ہونے والے فیصلے بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ میری ماما نے صحیح کہا تھا کہ شادی اپ جیسے لوگوں میں ہی کرنی چاہیے۔ میری اگر تم سے شادی ہو جاتی تو شاید ہم دونوں کی پرابلمز بڑھ جاتیں۔ تم تو مجھ بھول جاؤ گی ہی...... مگر میں بھی تمہیں بھول جاؤں گا...... زیور......"

نگین سمجھ گئی کہ اس کی ماما نے اسے کس طرح بھرا ہے اور کس انداز میں معاملہ بتایا گیا ہے۔ زیور کے میسج پڑھ کر اسے لگ رہا تھا کہ اسے اس کے جانے سے بے حد دکھ پہنچا ہے اور اپنے دکھ کو چھپاتے ہوئے اس نے میسج دیا ہے۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا کہ وہ اسے اس میسج کا جواب دے اور اپنے اوپر آنے والی اس ناگہانی آف کے بارے میں اسے بتلائے۔ مگر پھر وہ سوچ کر ہی رہ گئی۔ فائدہ ہی کیا تھا۔ وقت اس کی مٹھی سے نکل گیا تھا او اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ زیور کے اس جملے...... کہ تم مجھے بھول جاؤ اور میں بھی تمہیں بھول جاؤں گا کا مطلب یہی کہ نہ میں تمہیں بھول سکتا ہوں اور نہ ہی تم مجھے بھول پاؤ گی۔

کیا بھولنا آسان ہوتا ہے۔ کیا میں اسے بھلا پاؤں گی؟

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا کہ بعض باتوں کا کوئی بھی جواب نہیں ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

رنج، غم، دکھ اگر بے عزتی کے ہمراہ یکجا ہو جائیں تو طبیعت میں وحشت اور بربریت سی آ جاتی ہے۔ ایسا مزاج ان دنوں زیور کا ہو رہا تھا۔ اسے اب کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ بھروسا تو ہر ایک پر سے اٹھ گیا تھا۔ نگین کے گ والوں کا رویہ اور نگین کی باتیں، جو اس کی ماں نے بتائی تھیں اس کے دل میں نفرت کا بیج بو گئی تھیں۔ اپنے آپ دلاسے دے دے کر وہ تھک گیا تھا۔ نگین کو بھی کسیلا سا میسج دے چکا تھا۔

اس کی پر خلوص محبت اور چاہت کا یہ انجام کہ پیسے کے لالچ میں اس کے محبت بھرے گفٹس منہ پر مار گئے تھے۔

ماما ٹھیک کہتی تھیں، ہر خوبصورت چیز...... خوبصورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا غصہ اور رنج ہر روز سیڑھیاں چڑ رہا تھا۔ بہت سی چیز ہیں لوگ ہمیں اچھے لگتے ہیں مگر وہ اچھے نہیں ہوتے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نگین کا (گردن) دبا دے۔

تب اس نے نگین کے موبائل پر میسج کیا۔ "دل نہ چاہتے ہوئے بھی تم سے میں مخاطب ہوں، خدا کر

س چیز کو ہاتھ لگاؤ وہ سونے کی ہو جائے۔ میری اور تمہاری دنیا واقعی الگ تھی، اس لیے قدرت نے مجھ پر یہ مہربانی کی کہ تم سے بچا کر رکھا۔ میں بہت خوش ہوں، بے حد مطمئن ہوں۔ اللہ کا میں جتنا بھی شکر کروں وہ کم ہو گا...... کہ اس نے مجھے تم سے بچا کر رکھا کہ انجانے میں، میں ایک ناگن سے زندگی جوڑنے والا تھا۔ لالچی لوگ زندگی کے ہر موڑ پر دھوکا دیتے ہیں کہ یہ رنگ ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے اور مجھے ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ میں تم سے آج بھی نفرت کرتا ہوں اور کل بھی کروں گا۔ کوشش کرنا کہ کبھی میرے سامنے نہ آؤ کہ اب تم میرے لیے ایسی حقیر ترین ہستی ہو جو بہت بدصورت ہے۔ مجھے تمہاری شکل، تمہاری آواز، سب سے نفرت ہے، زیور۔"

اور نگین بے اختیار ہنس پڑی اور پھر چند لمحوں بعد ہی آنکھوں سے برسات کسی سیلاب کی طرح جاری ہو گئی۔ یہ زیور کا دوسرا میسج تھا، جسے پڑھ کر اسے یوں لگا، اب اس کی یادوں پر بھی اس کا اختیار نہ رہا ہو اور زیور اس ے بہت دور چلا گیا ہو، اتنی دور...... کہ اس کی پہنچ سے بھی دور۔

عظمت بیگم کسی کام سے اس کے کمرے کے سامنے سے گزریں تو اسے یوں بلکتے دیکھ کر تڑپ کر پاس آئیں

"کیا ہوا بیٹا!" انہوں نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

"فہمی باجی یاد آ رہی ہیں۔ اگر وہ آج میرے پاس ہوتیں......"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم...... ایسے وقت میں بہن کا تمہارے پاس ہونا ضروری تھا...... تم دو ہی بہنیں ہو اور ایک رے کی خوشی میں شریک نہ ہو...... دکھ تو ہوتا ہی ہوتا ہے......" عظمت بیگم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔

"فہمی باجی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، ان دنوں......" وہ پھوپو کی گفتگو کا رخ موڑنا چاہتی تھی۔

"تمہاری ممانی بھی عجیب ہی عورت ہیں۔ دنیا سے انوکھے بچے تھوڑی پیدا کرے گی وہ...... جو اس پر خواہ واہ کی پابندیاں لگائی ہیں۔ آنے والے بچے کو کوئی روک نہیں سکتا اور جسے ضائع ہونا ہو، وہ ہر قیمت پر ضائع ہوتا ہے۔ ہمی آ جاتی تو ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جاتی اور تمہارے من میں اجالا سا ہو جاتا مگر کیا کہیں...... تمہاری مانی تو مجھے شروع سے ہی باؤلی سی لگتی تھیں۔ پتا نہیں، میرے بھائی نے اپنی بیٹی ان کے ہاں کیوں بیاہ دی۔ ے پاس فہمی کے لیے کئی رشتے تھے۔ مگر فرید نے ہامی ہی نہیں بھری...... جیسے میں کوئی برے بر بتاؤں گی۔"

"نہیں پھوپو! ایسی بات نہیں ہے، باجی اپنے گھر میں خوش ہیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان دنوں ان کی طبیعت خراب تھی اس لیے انہوں نے سفر سے منع کیا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو تم کیوں اتنا رو رہی ہو۔ شکل تو دیکھو ذرا...... آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں اور چہرہ کملا کر رہ گیا ہے۔"

"آنسوؤں پر بس تھوڑی ہوتا ہے، یہ تو ایسے ہی آ جاتے ہیں۔"

"نہیں بیٹا، بند باندھنا سیکھو، اپنی خوشی کو خوشی سمجھو۔" انہوں نے سمجھایا۔

"ٹھیک کہتی ہیں پھوپو آپ۔" اپنے دوپٹے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب اپنے غموں کو اپنے اندر چھپا کر اسے جینا تھا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اتوار کے دن حکیم صاحب نے اپنے گھر فرید احمد کی فیملی اور عظمت و شجاع کو کھانے پر بلایا تھا۔ فرید احمد ے سے ہی ان کے گھر چلے گئے تھے۔ حکیم صاحب سے رشتے داری کے ساتھ ساتھ دوستی بھی بہت پرانی

تھی۔

"بیٹا شجاع!......تو بھی میرے ساتھ چل! ورنہ حکیم صاحب برا مانیں گے۔" عظمت نے بیٹے کو سمجھایا۔

"آپ ہی جائیں، میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"دیکھ چلا چل، فرید بھائی کیا کہیں گے...... دو مرتبہ بلاوا آ چکا ہے۔"

"کہہ دیا ناں، نہیں جانا......اور جو جس نے کہنا ہے، کہہ دے۔ مجھے پروا نہیں ہے آپ کے بھائی وائی اور نہ ہی حکیم صاحب کی...... بے شک دس مرتبہ کہلوا دیں...... مگر میں نہیں جاؤں گا۔"

"بیٹا...... کیوں ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ جب کہ جانتا بھی ہے کہ فرید بھائی...... نگین کی شادی تجھ سے کر آئے ہیں۔"

"مجھے نہیں کرنی نگین سے شادی۔ مجھے اس سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔"

"مت بن پاگل! قسمت بار بار یوں دستک نہیں دیتی ہے۔ یہ رشید بھائی کی بھی خواہش ہے کہ تیری شا نگین سے ہو۔"

"اگر ماموں رشید پیسے کی بات نہیں کرتے، تو کیا جب بھی آپ اس شادی کی موافقت کرتیں۔"

"ہاں ضرور کرتی، نگین میری اپنی بھتیجی ہے، جو مجھے دلِ و جان سے پیاری ہے۔"

"امی! میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی بھتیجی نگین سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو مگر میں اس سے ہر شادی نہیں کروں گا۔"

"نگین سے تجھے کیا کوئی چڑ ہے؟"

"ہاں ہے...... جب آپ نے فرح سے میری شادی نہیں کی تو میں آپ کی پسند کی لڑکی سے شادی کیوں کروں؟" وہ تیزی سے مڑ کر باہر جانے کے خیال سے گھوما تو گھڑونچی کے پاس نگین کھڑی ہوئی تھی۔

شجاع کو تو یہ پتا تھا کہ وہ ماموں ممانی کے ساتھ حکیم صاحب کے ہاں گئی ہوئی ہے۔

"تم حکیم صاحب کے ہاں نہیں گئیں؟" اس نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"نہیں، میرا بھی کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" غصے سے پوچھا گیا۔

"میں تو بہت عرصے بعد گاؤں آئی ہوں...... شاید بچپن میں کبھی آئی ہوں گی۔ اب اتنے عرصے بعد گاؤں عجیب عجیب سا لگ رہا ہے۔ دل ہی نہیں لگ رہا میرا تو کہیں جا کر کیا کرتی۔"

"کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ ساری زندگی اس گاؤں میں رہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر کیوں ماموں کے ساتھ چلی آئیں؟"

"معلوم نہیں...... یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ میں کیوں آ گئی......بس آ گئی" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"تم جانتی ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں؟" شجاع نے غصے سے نگین کو دیکھا۔

"اچھا...... ایسا ہے کیا؟ میں واقعی نہیں جانتی" اس کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ روشنی کی طرح گئی۔ کسی غم، تاسف، بے عزتی یا کسی ملال کا احساس تک نہ تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا" وہ دہاڑا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے واقعی نہیں آنا چاہیے تھا مگر میرا بس کہاں چل سکتا تھا" یکبارگی اس کی ھوں سے آنسو موتی کی طرح رخساروں پر پھسلنے لگے۔ کاش، میں یہاں نہ آتی۔ کاش......! زبور کی یاد لو دینے ل

"نہ رو بچی! یہ تو پاگل ہو گیا ہے" عظمت نے اس کے آنسو پونچھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ "بکواس نے کی تو اسے عادت ہے۔ خواہ مخواہ باتیں بنا رہا ہے، تم کچھ محسوس نہ کرنا۔ دل کا بڑا چنگا ہے ہاں بس زبان ہی اس کی مت ماری ہوئی ہے۔" عظمت بیگم پریشان ہو کر نگین کو سمجھانے لگیں۔

"یہ بات نہیں ہے نگین!" اس نے جھجکتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ معصومیت سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"میں فرح سے محبت کرتا ہوں اور امی...... میری شادی تم سے کرنا چاہتی ہیں۔" شجاع نے بھی سچ کہنے میں سمجھا۔ "اب تم ہی بتاؤ کیا مجھے تم سے شادی کرنی چاہیے؟"

"نہیں" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی مگر اس کی آنکھوں میں شجاع کے لیے ہمدردی کے جگنو جل اٹھے تھے۔

"ارے پاگل تو نہیں ہو گیا کیا؟ ایسی باتیں کرتے ہیں اپنی ہونے والی بیوی سے...... کیا سوچتی ہوگی کہ ل ہی سٹھیا گیا ہے۔ ارے اب تو فرح کی شادی ہو چکی ہے۔ تیرا اس سے کیا لینا دینا...... وہ اپنے شوہر کے ساتھ راضی خوشی ہے، تو اس کو کیوں بیچ میں لا رہا ہے؟"

"اماں، فرح سے میری شادی ہونا ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ اگر آپ چاہتیں تو فرح بہ آسانی میری بن سکتی تھی مگر آپ نے میری محبت مجھ سے چھین کر...... مجھے لہولہان کر دیا ہے۔" اور پھر وہ نگین سے مخاطب ہو کر بولا "مجھے یقین ہے کہ مجھ جیسے ٹوٹے پھوٹے شخص کا ساتھ تم بھی قبول نہیں کرو گی۔"

"جی" اس نے حیران ہو کر شجاع کو دیکھا۔

شجاع کو اس کی معصومیت اور سادگی پر ہنسی آئی اور وہ زیر لب مسکراتے ہوئے مگر کسیلے لہجے میں دوبارہ پوچھنے

"نگین! تمہیں میرا ساتھ...... یقیناً قبول نہیں ہوگا۔"

"مجھے قبول ہے" وہ بولی اور اپنے کمرے میں چلی آئی اور وہ متحیر سا اسے جاتا دیکھتا رہا، ایک بٹے ہوئے اس نے کس فراخ دلی سے قبول کر لیا تھا۔

ے یہ معلوم ہو کر بھی کہ میرے دل میں فرح کی محبت ختم نہیں ہوئی ہے، کسی حسد یا جلن کا احساس نہیں ہوا عجیب لڑکی تھی یہ نگین کہ ایک ٹوٹے پھوٹے شکستہ شخص کی ہمراہی اسے قبول تھی۔

امی ٹھیک کہتی ہیں، ان کی بھتیجی میں ضرور ایسی خاص بات ہے۔ جوں جوں وہ سوچ رہا تھا اس کی کا طلسم اسے اسیر کرتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ل کے گھر پر تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ قطر کی جیل میں بند تھا۔ وہاں کے وکیل کیس لڑنے کی جو رقم رہے تھے وہ لاکھوں میں تھی۔ یہاں ہزاروں میں ادائیگی کرنا دوبھر تھا۔

احساس تھا کہ گھر والوں کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ اس کو رہا کرانے کی کوئی تدبیر کر سکیں۔

نامرادی میں اس کے دن گزر رہے تھے۔ وہاں جا کر اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اپنے ملک میں وہ کتنا تھا۔

قطر کی جیل میں بند پاکستانیوں کی تصاویر وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ ٹی وی پر بھی انہیں دکھا جا رہا تھا۔ اس وجہ سے عزیز و اقارب سب ہی کو پتا چل گیا تھا کہ عدیل غیر قانونی طور پر گیا تھا اور اب وہ جیل میں بند ہے۔

ان کے عزیزوں میں سے وہ لوگ جو پہلے عزت و تکریم سے دیکھ رہے تھے کہ عدیل کے باہر جانے سے ان کے حالات بدل جائیں گے، اب وہی لوگ تمسخر سے ہنس رہے تھے، مذاق اڑا رہے تھے اور کچھ لوگ ان کے گھ اس انداز میں آ رہے تھے جیسے پرسہ دینے آ رہے ہوں۔

”مشکل ہے عدیل کا واپس آنا، وہاں کا قانون بہت سخت ہے۔“

”تم نے بھی اپنا پلا پلایا بچہ باہر جھونک دیا، کیا مصیبت پڑی تھی باہر بھیجنے کی؟ یہاں ہوتا، چار پیسے کم لاتا مگر نظروں کے سامنے تو ہوتا۔ اب تو خدا جانے تم اس کی شکل بھی دیکھ پاؤ گی یا نہیں۔“

یہ جملے نہیں تھے، تازیانے تھے جن کو سن کر عدیل کی ماں کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ ہاں، بہنیں کہنے والوں کی طبیعت صاف کر رہی تھیں اور یہ باور کرا رہی تھیں کہ عدیل غلط پکڑا گیا ہے، وہ چھوٹ جائے گا۔ کسی اور کے دھوکے میں پکڑا گیا ہے۔ اس کا تو اقامہ آیا تھا، ملازمت کا لیٹر ہے اس کے ہا میں۔ کبھی کبھی ایک نام کا چکر بھی نقصان پہنچا دیتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے بھائی کے ساتھ ہوا ہے مگر کسی کو بھی ا بیانات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ان کے گھر سے نکل کر مہمانوں کے جملے اس طرح کے ہو رہے تھے۔

”اونہہ، کیسا ڈھکن رکھ رہی ہیں بہنیں، جیسے پتا نہیں تھا کہ عدیل کس طبیعت کا ہے۔ یہاں بھی لچا لفنگا سا ادھر سے ہاتھ مار لیا، ادھر سے ہاتھ مار کر اپنا وقت گزار رہا تھا۔ اب ایسے لوگوں کو بند نہیں کیا جائے گا تو کیا شرفا ہوں گے۔ اچھا ہوا مزاج تو ٹھکانے آئیں گے لاٹ صاحب کے۔“

”ارے یہ لوگ چھپا رہی ہیں، بات دوسری ہے۔ کسی پڑیا وغیرہ کے چکر میں پھنسا ہوگا۔ راتوں رات ا بن جانے والے نوجوانوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کی زندگی جیلوں میں سڑتے گزرتی ہے۔“

وہ خالہ جنہوں نے عدیل کی دعوت کر کے اسے نئے رومال کے ساتھ مٹھائی کے نام پر کیش بھی دیا تھا علیحدہ شکرانے کے نفل پڑھ رہی تھیں اور اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ عدیل کا نام ان کی بیٹی کے ساتھ نہیں جڑ ورنہ کیسی تھڑی تھڑی ہو جاتی۔ (بے عزتی ہو جاتی)

شرافت اور عزت، دولت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا احساس ان لوگوں میں شدت سے ہو رہا جہاں پیسے کی کمی نے بے شمار مسائل ابھار رکھے تھے۔

☆☆☆

سائرہ کے اسکول میں نئی ٹیچر ارجمند آئی تھی۔ بہت اچھی تھی۔ اس کی سائرہ کے ساتھ آتے ہی دوستی ہ تھی۔ دونوں خالی پیریڈز میں اپنی کاپیاں چیک کرتے ہوئے باتیں کرتی رہتیں۔ چھٹی کا وقت ہوتا تو دونوں ا ساتھ نکلتیں۔ دونوں کے بس کا روٹ بھی ایک ہی تھا۔ چار پانچ اسٹاپ کے بعد سائرہ اتر جاتی اور ارجمند اس بعد اترا کرتی۔

دوستی جب زیادہ بڑھی تو ارجمند اپنے گھر کے قصے بھی سنانے لگی۔ اس کی چھوٹی بہن کی شادی بڑے لوگوں میں ہو گئی تھی۔ ہر روز اس کی بہن کو طعنے تشنے سننے پڑتے تھے۔ سائرہ چپ چاپ سنتی رہتی۔ اس میں

ہمت نہیں تھی کہ اسے بتاتی کہ میرے ساتھ بھی یہی سب ہوا تھا۔

ایک دن اسے یہ سن کر حیرت کا جھٹکا لگا جب ارجمند نے اسے بتایا کہ اس کا بہنوئی جاوید سائیکی بھی ہے اور ماں بہنوں کے کہنے پر اس کی بہن کو بے حد پریشان کرتا ہے۔

سائرہ یہ سن کر دم بخود سی تھی کہ اس کے سابقہ شوہر کی بیوی......ارجمند کی بہن ہے۔

ارجمند کی باتیں سن کر اس کے اپنے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ ارجمند کوئی بات سناتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنا شروع ہو جاتے۔ ”سائرہ! تم بے حد حساس ہو“ ارجمند اس کی دلگرفتہ کیفیت دیکھ کر کہتی۔

”ہاں، دوسروں کا دکھ مجھے اپنا لگتا ہے۔ قوت برداشت بھی کم ہو گئی ہے اس لیے دل اُمڈ سا آتا ہے۔“

اور ایک دن تو وہ شاکڈ سی رہ گئی جب ارجمند نے اسے بتایا کہ اس کے بھائیوں کو جب یہ پتا چلا کہ جاوید نے ان کی بہن پر ہاتھ اٹھایا ہے تو انہوں نے گھر جا کر جاوید کی ایسی پٹائی کی کہ اس کے ہاتھ پاؤں تک توڑ ڈالے۔

”ہماری بہن گھر آ گئی ہے اور جاوید کے دونوں پیروں اور دونوں ہاتھوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔“

تب سائرہ یہ سوچنے لگی کہ بعض دفعہ لوگوں کے سامنے ان کا کیا کتنی جلد آ جاتا ہے۔ سائرہ کے بھائی کچھ نہیں بولے تھے تو وہ شیر ہو گیا تھا اور یہی شیر دوسروں کے سامنے کتنی جلدی زیر ہو گیا تھا۔

ارجمند بتا رہی تھی کہ جاوید کے گھرانے سے کوئی نہ کوئی ہر روز معافیاں مانگنے ان کے گھر آ رہا ہے مگر اب ہم اپنی بہن کو نہیں بھیجیں گے۔ ہم نے خلع کے لیے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔

☆☆☆

ثنا کے پاس ہونے کی خوشی میں سائرہ نے اپنے گھر میں پارٹی کی تھی۔ جہاں اپنے میکے والوں اور ثنا کی سہیلیوں کو بلایا تھا وہاں صابرہ کی بہن اور بھائی بھاوج کو بھی بلا لیا تھا۔

شائستہ بیگم نے پوتی کو سونے کے ٹاپس تحفے میں دیے۔ سائرہ نے بوتیک کا سوٹ دیا۔

صابرہ نے ایک خوبصورت بیگ کے ساتھ دو ریڈی میڈ سوٹ دیے جو ثنا کو بے حد پسند بھی آئے۔ دادی کے دیے ہوئے ٹاپس تو اس نے اسی وقت پہن لیے تھے۔ نانی، خالائیں اور دیگر رشتے داروں نے کیش کے لفافے دیے جو ثریا بیگم اپنے پرس میں رکھ رہی تھیں۔

ثنا کے رزلٹ سے ثریا اس قدر خوش تھیں، ان کا جوش خطابت بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ”میری ثنا ڈاؤ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے گی، ایس ایم سی اور کے ایم ڈی سی میں تو ہرگز نہ لے۔ ڈاؤ کے آگے کسی کی ویلیو نہیں ہے۔“

ثنا کی کسی سہیلی نے کہا ”آنٹی! ایس ایم سی اور کے ایم ڈی سی گورنمنٹ کالجز ہیں اور ان میں بھی ہر ایک کو داخلہ نہیں ملتا“ مگر ثریا نے چونکہ سن رکھا تھا ڈاؤ میڈیکل کالج بہت اچھا ہے تو وہ اسی کی تعریف میں مست تھیں اور ثنا کو وہ وہاں نہ صرف پڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں بلکہ ڈاکٹر بن کر وہ وہاں پڑھانے بھی لگی تھی۔

صابرہ نے اپنی بھاوج سے ثنا کو ملوایا تو ثنا سلام کر کے اپنی سہیلیوں کی جانب تیزی سے بڑھ گئی۔

”اللہ، کیسی لڑکی ہے یہ۔ انوں پیٹ میں منڈی دے کر سلام بھی نکو کرے۔“ (اس نے جھک کر آداب نہیں کیا)

”بھابی پاشا، ادھر کراچی میں پیٹ میں منڈی نکو دیتے۔“ صابرہ نے ہنس کر ان سے کہا۔

”اپنے حیدرآباد دکن میں تو سوب ابھی تک ایسا ہی اچ کرتے۔“ (ہمارے حیدرآباد دکن میں سب ابھی

تک اسی طرح کرتے ہیں)

''ہوتا ہوئیں گا...... پر یہاں نکو چلتا۔'' صابرہ نے کہا۔ (یہاں اب ایسا نہیں ہوتا ہے)

ثنا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ اس کی سب سہیلیاں بھی خوب قہقہے لگا رہی تھیں۔ کسی دوست کی حال ہی میں انگیج منٹ ہوئی تھی۔ ثنا اور اس کی سہیلیاں اس کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ شرما رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر صابرہ کی بھابی اپنی دوسری نند سے بولیں۔

''انوں تو بہت متاثڑی دکھتی۔ باتاں کیسے کرتی...... ارے باپ! میں خود سنی...... انگارہ بولتی ایک دم ہو۔'' (یہ تو بہت شوخ و چنچل سی ہے۔ باتیں تو بہت ہی کرتی ہے۔ میں نے خود سنا ہے، بڑی غصیلی باتیں کرتی ہے وہ)

''شہراں میں سوب ایسے ہی دکھتے۔'' رعنا کی ماں نے ہنس کر کہا۔ (شہروں کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں)

''دیکھو تو آپا! میرے کو تو کھچی کے ویسی کمر دکھتی...... اور تیزی دیکھو، ابھی یہاں...... اور ابھی وہاں۔ لڑکی ہے یا ہنگامہ......'' بھابی نے صابرہ کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''لڑکیاں تو سوب بولتے اچھے لگتے'' صابرہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میرے کو تو اتنا بولنا اچھا نہیں لگتا۔'' بھابی نے کہا۔

''مگر میرے کو ایسے لوگ بھڑ بدھس لگتے (مکار، چالاک) میں تو چپڑ چپڑ باتاں سناؤں اور وہ خود خالی بیٹھ کر سن رئے'' صابرہ نے نخوت سے کہا اور کندھے اچکا کر ثریا بھابی کا ہاتھ بٹانے پہنچ گئی جہاں کوئی رشتے دار خاتون اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے ثریا بھابی سے آہستگی سے بات کر رہی تھیں۔ ان کی پوری بات سن کر ثریا نے زور سے قہقہہ لگایا اور بلند آواز میں بولیں۔

''خالہ جان! میری بیٹی تو ڈاکٹر بن رہی ہے، میں تو اس کی شادی کسی ڈاکٹر یا انجینئر سے ہی کروں گی۔ آپ کے خالی بی اے پاس لڑکے سے تو اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ثنا کے بارے میں سوچا کیسے؟''

جن لوگوں کو پتا نہیں تھا، ثریا کے بلند لہجے سے ان کو بھی پتا چل گیا۔ خالہ یہ سب دیکھ کر اپنی بے عزتی محسوس کرنے لگیں تب وہ غصے سے بولیں ''اللہ کی شان، ابھی میڈیکل میں داخلہ ہوا ہی نہیں ہے اور تکبر اس سے پہلے آ گیا۔ آج کل ڈاکٹرنیوں کی ویلیو کیا ہے۔ ہر گھر میں موجود ہیں، میرے بیٹے سے شادی کے لیے خود چار ڈاکٹرنیوں نے اپلائی کیا تھا مگر میں نے منع کر دیا کہ پکی عمر کی لڑکیاں مجھے نہیں چاہئیں۔ چھ سال کی ڈاکٹری، دو تین سال فیل ہونے کے، دس سال لگ جاتے ہیں میڈیکل پڑھنے اور ہاؤس جاب کرنے میں...... میں نے تو ثنا کے لیے کم عمری کی وجہ سے بات کی تھی۔ نہ تو نہ سہی...... میرے وسیم کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر تمہارا تکبر دیکھتے ہوئے میں یہ بات پہلے سے کہہ دیتی ہوں کہ ثنا کی شادی کے لیے تم خوب پریشان ہو گی۔ یقین نہ آئے تو اپنے پاس لکھ لو۔''

یہ بات کہنے کے بعد خالہ ٹھہری نہیں اور فوراً چلی گئیں۔

مہمان خواتین اسی بات کو ایشو بنا کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ ثریا کا موڈ آف ہو گیا۔ تب شائستہ بیگم اٹھ کر مہمانوں میں آئیں اور کہا کہ کبھی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ خاص طور پر کسی کی خوشی کی تقریب میں سب ہی کو خوشی خوشی شریک ہونا چاہیے۔

''ثریا کی بات اگر خالہ کو ناگوار گزری تھی تو ہم ان سے معذرت کر لیتے۔ مگر میری معصوم پوتی جس کا رشتہ وہ چاہ رہی تھیں، اسے کوسنا تو نہیں چاہیے تھا۔''

اب سب شائستہ بیگم کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ مگر سب کے دلوں میں یہی بات تھی کہ خالہ نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کی تھی، بس اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا۔ ثریا نے کون سی تمیز کا مظاہرہ کیا تھا جو یہ لوگ خالہ سے چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''عظمت آپا! گاؤں کا میرا مکان جو عرصے سے بند پڑا ہے، وہ میں نگین کو جہیز میں دے رہا ہوں'' فرید احمد نے بہن سے کہا۔

''گاؤں میں تمہارے دو مکان ہیں، تم کس مکان کی بات کر رہے ہو؟''

''میں بڑے مکان کی بات کر رہا ہوں، جس کو میں بیچنا چاہ رہا تھا۔ دوسرا مکان تو کچا ہے۔ لطیفے کے کسی رشتے دار نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں بڑا مکان نگین کو جہیز میں دے رہا ہوں۔''

''سونے کے دو سیٹ اور پچیس جوڑے کپڑے ہم ساتھ لائے ہیں۔ چونکہ ہم جلدی میں آئے ہیں اس لیے آپ کے اور فرحت کے کپڑے نہیں خرید سکے۔ یہ دس ہزار کپڑوں کے ہیں۔ اس میں آپ کی بالیاں بھی آ جائیں گی۔'' فیروزہ نے دس ہزار روپے عظمت بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

''ارے سونا اتنا مہنگا ہے، بالیاں اس میں کہاں آ سکتی ہیں'' عظمت بیگم نے مسکرا کر کہا۔

''آپ میری بالیاں دیکھیے، کتنی اچھی ہیں، صرف چار ہزار کی ہیں'' فیروزہ نے دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اچھی ہیں۔''

''اتنی جلدی ہم بقیہ گھرداری کا سامان تو نہیں خرید سکے۔ یہ پچاس ہزار روپے رکھ لیجیے۔ اس میں ایک بیڈ روم سیٹ کے ساتھ کچھ الیکٹرونکس کی چیزیں آ جائیں گی۔''

''میں نے تو سنا ہے، کراچی میں ایک ایک لاکھ کا صرف بیڈروم سیٹ آتا ہے۔'' عظمت بیگم کی معلومات کسی طرح کم نہیں تھیں۔

''آپا! جو سامان لکڑی کا مضبوط ہوتا ہے وہ لاثانی اور اوک کا کہاں۔ دیکھے ہیں میں نے بھی ایک ایک لاکھ ے بیڈروم سیٹ، نمائشی قسم کے۔ صرف شو بازی ہوتی ہے ان میں، مضبوطی اور پائیداری نام کی نہیں ہوتی اور جو ہمارے پنجاب کے پلنگ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار بھی ہوتے ہیں، اس کا تو کہیں مقابلہ ہی نہیں یا جا سکتا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ پنجاب کے ڈبل بیڈ چوڑے بھی ہوتے ہیں اور لمبے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بھائی رشید کو شادی کے بارے میں خط لکھیں گی یا فون کرنا ہے'' فیروزہ نے پوچھا۔

''خط تو بہت دیر میں پہنچتا ہے۔ فون ہی کریں گے تاکہ اگر وہ شادی پر کچھ بھیجنا چاہیں تو بروقت ہمیں بھی مل جائے۔''

''ہاں ہاں، بھیجیں گے تو وہ ضرور۔ آخر ان کی پسند بھی اس رشتے میں شامل ہے۔'' فیروزہ نے ہنس کر کہا۔

''میں تو یہ جانتا ہوں کہ جو مزہ مل کر رہنے میں ہے، وہ جھگڑے میں نہیں ہے اور جب بہن بھائی مل کر رہ رہے ہیں تو ان کا تو سواد ہی علیحدہ ہوتا ہے۔ اگر بھائی رشید اس شادی سے خوش ہوں گے تو ہم بھی خوشی خوشی ہی یہ رشتہ کر رہے ہیں تاکہ بہن بھائی کی محبت مزید مستحکم ہو۔'' فرید احمد نے مسکرا کر بہن سے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ شجاع کی شادی نگین کے ساتھ ہونے پر میری خوشی کا اندازہ ہی نہیں کیا

جا سکتا۔ اپنی بھتیجی کو دیکھ کر جتنی محبت مجھے آئے گی، اتنی کسی کو آ ہی نہیں سکتی۔''

''یہ بات تو آپا تم نے میرے دل کی کہہ دی ہے۔ شجاع بھی میرا بیٹا رہے گا۔ داماد جیسی غیریت اس میں کہاں ہوگی اور اسے پا کر میں یہ بھول جاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹے کی نعمت سے نہیں نوازا۔ جو بات میرے بھانجے میں ہوگی وہ نہی کے شوہر فہد میں کہاں ہو سکتی ہے'' فرید احمد نے فیروزہ کے اٹھنے کے بعد بہن سے رازداری سے کہا۔

اور عظمت بیگم کا چہرہ خوشی سے گلگوں سا ہوگیا۔ بھائی نے کتنی محبت بھری بات کہی تھی جس کی خوشبو سے ان کا من تک مہک گیا تھا۔

☆☆☆

سمندر میں کتنی ہی طغیانی آ جائے۔ سیلاب کی شدت سے وہ کتنا ہی بپھر رہا ہو، اس کی موجیں سینہ تان کر کتنی ہی سرکشی پر آمادہ ہوں سمندر کی یہ کیفیت ہمیشہ ایسی نہیں رہتی، وہ جلد ہی اپنی نارمل روٹین پر آ جاتا ہے۔ تب اس کا پانی خاموش سا نظر آتا ہے اور لہریں اتنے دھیمے انداز میں بہتی ہیں کہ سر اٹھا کر تک نہیں دیکھتیں کہ کون اس کے پانی میں پیر ڈالے کھڑا ہے۔

یہی کیفیت اب شجاع کی تھی۔ فرح سے شادی نہ ہونے پر جو وہ غیظ و غضب سے بپھرا بپھرا پھر رہا تھا، نگین سے شادی ہو جانے کے بعد وہ جیسے پرسکون سا ہو گیا تھا۔

وہ...... جو اس کے لب مسکرانا بھول گئے تھے، اب مسکراہٹ پر آمادہ ہو گئے تھے۔

نازک سی، بے انتہا حسین نگین، جو دھیمے مزاج کی حامل تھی، اسے بے حد بھائی تھی۔ جو اس کی ہر بات پہ سر جھکا دیتی تھی۔ عظمت بیگم کا جو یہ یقین تھا کہ شجاع نگین کو پا کر سب بھول جائے گا، وہ سو فیصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

ان کی شادی اور ولیمے کی تقریب گھر کے قریب اسکول کے میدان میں ہوئی تھی جس میں گاؤں کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی تھی۔

جس نے بھی دلہن کو دیکھا تھا، بے حد تعریف کی تھی۔ شہر کی دلہنوں کے بارے میں یہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ بے حیائی سے بیٹھی رہتی ہیں، پٹر پٹر باتیں کرتی ہیں اور ان میں شرم و لحاظ رتی برابر نہیں ہوتا ہے مگر نگین کی کوئی بھی ادا ایسی نہیں تھی۔

وہ خاموش، چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ گاؤں کی لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ کا کوئی کوندا نہیں دمکا تھا۔

''بھئی دلہن ہو تو نگین جیسی' جس نے گاؤں کی لڑکیوں تک کو مات کر دیا، شرمانے میں۔'' عزیز کی ماسی نے بلند آواز میں کہا۔

''ہے کس کی بھتیجی'' عظمت بیگم نے فخریہ انداز میں عزیز کی ماسی کو دیکھا اور بھنوئیں اچکا کر بولیں۔ ''اگر نگین امریکا میں بھی پلی بڑھی ہوتی تب بھی ایسی ہی ہوتی۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

''تمہارے ایک بھائی رشید امریکا میں ہی ہوتے ہیں ناں، ان کے بچے کیسے ہیں؟'' عزیز کی تائی اماں مسکراہٹ بھینچ کر پوچھ رہی تھی۔ (ساری کتھا سے وہ واقف تھیں)

''رشید کی تو کوئی لڑکی ہی نہیں ہے، صرف دو لڑکے ہیں۔''

''مگر لڑکوں میں بھی شرم، عزت، غیرت، حمیت، سب ہی ہوتی ہے، وہ کیسے ہیں؟''

''وہ کبھی پاکستان آئے ہوتے تو بتاتی، میں نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔''

''پھر بھی خیر، خبر تو رکھتی ہی ہوں گی۔ آخر وہ تمہارے بھتیجے ہیں۔''

''اچھے ہی ہیں، ان دنوں پڑھائی میں لگے ہوئے ہیں، جب فارغ ہوں گے تو پاکستان کا چکر بھی لگا لیں گے۔'' عظمت بیگم نے اکتا کر انہیں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں اب چپ ہو جاؤ، تمہیں اتنی کریدنے کی کیا ضرورت ہے؟

فیروزہ بیگم اور فرید احمد دس دن گاؤں میں رہے اس کے بعد وہ کراچی روانہ ہو گئے مگر ان دس دنوں میں روزانہ ہی دولھا دلہن کے ساتھ کہیں نہ کہیں وہ مدعو ہوتے تھے۔

نگین بظاہر خوش ہی تھی یا اس نے سمجھوتا کر لیا تھا کہ زبور کو یاد کرنے یا رونے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ملنے والا تھا اور یوں شجاع بھی محبت میں ناکامی کا شکار تھا۔ دونوں شکست خوردہ جب ملے تو اپنے اپنے دکھ بھول گئے تھے یا نوں ہی اپنی ذات سے ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی سعی کر رہے تھے۔

فیروزہ یہ دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں کہ شادی کے بعد نگین کے چہرے پر غم کے کوئی سائے نہیں تھے۔

''اونہہ! پاگل لڑکی...... خواہ مخواہ روتی رہی۔ مجھے معلوم تھا شجاع کو پا کر سب کچھ بھول جائے گی۔ انہوں نے دل میں سوچا اور سرشاری ہو گئیں۔

☆☆☆

''اللہ، دلہن ہو تو ایسی...... شادی کا تیسرا دن تھا، وہ کمرے سے نکل کر مہمانوں کو چائے بنا کر خود دے رہی تھی۔'' اشرف کی بہن نے ماں سے کہا۔

''شجاع کی تو لاٹری نکل آئی۔ کتنی خوبصورت دلہن ملی ہے اسے۔ گوری اتنی...... کہ سفید کپڑا پہنے تو کپڑا اس تن پر میلا لگے پھر تعلیم یافتہ...... شہر کی تمیز سیکھی ہوئی۔ گاؤں کے لوگوں کی کتنی عزت کر رہی ہے۔ سلام میں وہ ہل کرتی ہے۔ گلے ملتی ہے۔ سب کی دعائیں لے رہی ہے۔'' اشرف کی ماں نے پوری تقریر ہی کر دی۔

''فرح، تو بھی ایویں ہی ہے، اتنا کہا تھا شجاع کی شادی میں چل...... تو گئی ہی نہیں'' اشرف کی بہن نے اپنی بھاوج سے کہا۔

''یہ کیوں جاتی ان کی شادی میں، اس کی کوئی خاص رشتے داری تو نہیں ہے۔'' اشرف غصے سے بولا۔

''پاگل، گاؤں میں رشتے داریاں دور یا پاس کی نہیں دیکھی جاتیں۔ خوشی، غمی میں سب کو اکٹھا ہونا ہوتا ہے۔ بھی نہیں گیا اور نہ ہی فرح گئی...... جا کے تو دیکھتے کہ شجاع دولھا بن کر کتنا سوہنا لگ رہا تھا اور اس کی دلہن تو اتنی صورت دکھائی دے رہی تھی کہ اس سے قبل میں نے تو نہیں دیکھی۔''

''اماں آپ کو کیا پتا شجاع کیسا ہے؟ خواہ مخواہ میں تعریفیں کرے جا رہی ہیں۔''

''تو بتا، کیسا ہے وہ؟''

''ایک نمبر کا بدمعاش ہے وہ......''

''کار کی باتیں نہ کیا کر۔ شریف پتر ہے وہ، میں نے اسے ہمیشہ نظریں جھکائے دیکھا ہے۔ اس کے کسی نے ایویں کہہ دیا ہوگا، وہ تو بڑا بیبا سا ہے۔''

''نہیں اماں، آپ کچھ نہیں جانتیں۔ وہ بڑا فریبی ہے۔ لوگوں کو بے وقوف بنا کر خوش ہوتا ہے۔ مجھے پورا

یقین ہے پچھلے دنوں یہ کراچی گیا تھا۔ وہاں کوئی چکر چلایا ہوگا۔ جواہر کے پیچھے ماما، مامی بھاگے چلے آئے اور اپنی بیٹی کی اس سے شادی کردی۔ اگر شجاع کو اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کرنی تھی تو یہاں سے برات لے کر کراچی جاتا اور ان کی لڑکی کو عزت سے بیاہ کرلاتا۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے" اشرف کی بہنیں بھی سوچ میں پڑ گئیں۔

"کبھی آپ نے یہ سنا کہ لڑکی والے خود لڑکے والوں کے گھر میں آ کر اپنی بیٹی کی شادی کردیں؟"

"نہیں، ہم نے تو نہیں سنا۔"

"شجاع کراچی جا کر معاملہ ہی ایسا خراب کر کے آیا ہوگا کہ وہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا ہوگا کہ جتنی جلدی ہوسکے ہماری بیٹی سے نکاح کرلو...... تاکہ دنیا کے سامنے ہماری نظریں نیچی نہ ہوں۔"

"ہاں، ٹھیک کہہ رہا ہے میرا اشرف...... یقیناً یہی ہوا ہوگا مگر بیٹا...... یہ سب تجھے کس نے بتایا۔" ماں نے حیران ہوکر اس سے پوچھا۔

"اماں، میرے بھی ساتھی ہیں۔ جو رائی سے رتی تک کی خبریں مجھے دیتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ یہ شجاع اول نمبر کا بدمعاش ہے۔ ہر بے وقوف لڑکی پر اپنی نظر رکھتا ہے۔ بعض اس کے دام میں آ جاتی ہیں اور بعض بچ جاتی ہیں۔" اشرف نے کانی نظروں سے فرح کو دیکھتے ہوئے کمینگی سے کہا۔

"اماں، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ لڑکی والوں نے سوچا ہو کہ ہمارے دونوں کے سارے ہی رشتے دار جب گاؤں میں رہتے ہیں تو شہر میں شادی کرنے کے بجائے اپنے گاؤں میں ہی شادی کردی جائے تاکہ ساری برادری اس میں شرکت کرے۔ اگر شجاع کراچی برات لے کر جاتا تو گاؤں سے دس بندے بھی نہ جا پاتے۔ یہاں شادی ہونے کا یہ فائدہ تو ہوا کہ پورے گاؤں نے شرکت کرلی اور واہ واہ علیحدہ ہوگئی" فرح سے جب اشرف کی باتیں برداشت نہ ہوئیں تو وہ بھی کہہ بیٹھی۔

"ہاں، یہ بات ہوگی۔ یہ دل کو بھی لگ رہی ہے۔ آخر فرید احمد نے اپنی بہن کے ہاں ہی تو بیٹی دی ہے۔ اگر اس کے گھر آ گیا تو کون سا غیر کا گھر تھا۔" اشرف کی ماں نے پریقین لہجے میں بیٹے سے کہا۔

"الو کی پٹھی! تجھے کس نے یہ باتیں بتائیں" اشرف نے فرح کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایک عام سی بات کہہ رہی ہوں۔"

"تو عام بات نہیں کہہ رہی...... تو اپنے یار کی وکالت کررہی ہے۔" اشرف غصے سے بولا کر بولا۔

"پتر! سنبھل کر بول...... کس طرح بات کررہا ہے تو اپنی بیوی سے" اشرف کی ماں نے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اماں، تو کچھ نہیں جانتی۔ یہ معصوم شکل والیاں اندر سے کتنی میسنی ہوتی ہیں...... اور اگر تو جان لے تو ان کے منہ پر نہ تھوکے۔" اشرف غصے سے باہر نکل گیا۔

فرح رو رو کر ہلکان ہوگئی اور اس کی ساس اسے پیار کرتے ہوئے سمجھاتے ہوئے بولیں "بیٹا، یہ اشرف ہمیشہ کا غصے کا تیز ہے، اس کی کوئی بات کاٹے یا اس کی بات کی ہیٹی کرے (نیچا کرے) تو یہ کاٹ کھانے کو آتا ہے۔ اب تو نے بے شک سچی اور دل لگتی بات کی مگر اشرف کو پسند نہیں آئی، اس لیے تجھے کڑوی کسیلی باتیں سنا گیا ہے۔"

"اماں، مجھے تو لگتا ہے کہ میری قسمت ہی خراب ہے۔ میں ان کی کتنی ہی خدمت کرلوں اور کتنی ہی اپنی وفا کا

یقین دلا دوں مگر یہ ہمیشہ مجھ سے ناراض ہی رہتے ہیں۔"

"سب ٹھیک ہوجائے گا، بچہ ہوجانے دے پھر دیکھنا، یہ کیسا تیرا عاشق بن کر رہے گا۔ میں اس کو اچھی طرح ے جانتی ہوں۔ اوپرا اوپر سے ہی غصہ کرتا ہے۔ تجھے بہت پہلے سے پسند کرتا ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے بھی ب کوئی بات ہوتی تھی تو یہ ہمیشہ کہتا تھا کہ میں فرح سے شادی کروں گا۔ سچی بات ہے، اس وقت تو ہمیں اتنی اچھی بھی نہیں لگتی تھی مگر یہ اشرف تیرے ہی نام کی مالا جپتا تھا۔"

"میرے نام کی" وہ بے آواز ہونٹوں سے بڑبڑائی۔

"ہاں پتر! پریشان نہ ہویا کر...... بہت اچھا ہے میرا اشرف۔ تو دیکھنا کیسے پیار نال تجھے رکھے گا...... ہاں۔" اور وہ حیرت سے اپنی ساس کو دیکھنے لگی جیسے وہ کوئی انہونی کہہ رہی ہوں۔

☆☆☆

فیروزہ بیگم نے کراچی آ کر محلے میں مٹھائی بٹوا دی تھی۔ اب محلے کی خواتین ان کے پاس مبارک کے لیے چلی آ رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ آپ نے بیٹی کی منگنی کی...... اس کے بعد جلد ہی بیاہ دیا۔ ورنہ لوگ منگنی ایک، آدھ سال تک ضرور رکھتے ہیں۔" ان کی پڑوسن یہی سمجھ رہی تھیں، جس سے منگنی ہوئی، وہیں شادی ہوئی ہوگی۔

"ہاں...... آں...... میری نند نے منگنی کے بعد شادی کی جلدی مچادی۔ یوں بھی گھر میں تو بیاہنا ہی تھا اس لیے سال دو سال کا ہے کو کھینچتی؟"

"اچھا کیا...... جلدی بیاہ دیا۔ منگنی کے بعد کا دورانیہ طویل نہیں ہونا چاہیے ورنہ غلط فہمیاں سر اٹھانے لگتی ہیں اور دوسرے لوگ ایسی باتوں کو ہوا دیتے ہیں۔"

"ہاں، اسی وجہ سے شادی جلدی کردی" فیروزہ غائب دماغ سی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

جمال کے ہاں جب نگین کی شادی کی اطلاع پہنچی تو وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

"واہ جمال صاحب! تم تو کوئی بھی کمال نہیں دکھا سکے۔ صدق دل سے ایک لڑکی کو چاہا مگر اس کے دل پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا اور بالآخر اس کی شادی بھی ہوگئی۔"

"نگین کیسی ہیں؟ ہمارے ہاں کہہ کر گئی تھیں کہ جب شادی ہوگی تو وہ ضرور کارڈ بھیجیں گی، وعدہ کر کے...... میں بلایا بھی نہیں؟" ربیع نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ اسے نگین کی شادی کا سن کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

"مگر اس کی شادی تو اپنے گاؤں جا کر ہوئی ہے۔ کیسے وہ تمہیں بلاتی؟" امی نے اسے بتایا۔ بی پڑوسن ان ے گھر جا کر ساری خبر لے آئی تھیں جسے بطور تبرک محلے میں بھی بانٹا تھا۔

"مگر منگنی تو ان کی کراچی میں ہوئی تھی، بتایا تو تھا انہوں نے۔ کراچی میں ہی رہتے ہیں، جیولر ہیں، ان کی راچی کے علاوہ دوبئی میں بھی برانچ ہے...... پھر یہ شادی گاؤں میں کیوں ہوئی؟" ربیع نے ماں سے پوچھا۔

"مگر پڑوسن تو بتا رہی تھیں کہ نگین اپنی پھوپی کے گھر گئی ہے، جو گاؤں میں ہی رہتی ہے اور اس کا پھوپی زاد بھائی گاؤں میں اپنی زمینوں کی ہی دیکھ بھال کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ نگین کی منگنی ٹوٹ گئی ہوگی اور شادی اپنے کزن سے ہوئی...... کیونکہ نگین تو ہمارے ہاں یہ بتا کر گئی تھیں کہ رشتے داری نہیں ہے صرف فیملی فرینڈ ہیں۔"

جمال اپنے کمرے سے یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اسے یہ سن کر ایک دھچکا سا پہنچا۔

اگر اسے اپنی محبت نہیں ملی تو نگین بھی تشنہ ہی رہی۔ کیا تھا کہ زبور کا ساتھ ہو جاتا۔ کم از کم وہ تو سکھی اور بامراد ہو جاتی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اسی شام فیروزہ مٹھائی لے کر ان کے ہاں خود ہی آ گئیں۔

''آنٹی! آپ کے داماد کا کیا نام ہے؟'' ربیع نے پوچھا۔

''شجاع نام ہے، بہت اچھا لڑکا ہے۔ بے حد محبت کرنے والا، میری نند کا ایک ہی بیٹا ہے۔ جب اس نے محبت سے مانگا تو میں کیسے منع کر دیتی'' فیروزہ اترائے ہوئے لہجے میں بتا رہی تھیں۔

''تو پھر آپ نے زبور سے کیوں منگنی کی نگین کی؟'' ربیع نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہیں کیسے پتا ہے کہ نگین کی منگنی زبور سے ہوئی تھی۔'' وہ یکدم گھبرا سی گئیں۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ لوگ ہر بات جانتے ہیں۔

''خود نگین نے آ کر بتایا تھا ہمیں۔ جب وہ اپنی منگنی کی مٹھائی ہمارے گھر لائی تھیں۔'' (اور انہوں نے دل ہی دل میں نگین کو باتیں سنا ڈالیں)

''میری نند نے اتنا زور دیا کہ وہ بات چیت ہمیں ختم کرنا پڑی...... چونکہ آپس کی بات تھی اس لیے نہ دھوم دھڑکا کیا تھا اور نہ ہی کسی کو بتایا تھا۔ ہماری نند کو جب پتا چلا کہ ہم نگین کا رشتہ دوسری جگہ طے کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ جب گھر میں لڑکا موجود ہے تو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی بات بھی کوئی ایسی غلط نہ تھی۔ شجاع ہمارا برسوں کا دیکھا بھالا، اب آپ ہی بتائیے...... ہم باہر کیسے اپنی لڑکی دے دیتے۔'' فیروزہ بیگم لجاجت سے پوچھ رہی تھیں اور جمال کی امی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔

☆☆☆

صابرہ کو جب غصہ آتا تو اس کی ہر ادا سے نظر آتا۔ کام کرنے والی مائی کی تو مشکل ہی آ جاتی کہ وہ انہیں ایسا لتاڑتی (ڈانٹتی) کہ ان کی طبیعت بھی ہری ہو جاتی۔

''یہ دروازوں پو کتی مٹی جمی ہے۔ صاف کائے کو نہیں کرتے۔'' (دروازوں پر مٹی کتنی جمی ہے صفائی کیوں نہیں کرتیں) ٹی وی لاؤنج کا خالین کتا میلا ہو گیا ناں...... جھاڑو لگاتے وخت کمر دکھتی ہوئیں گی۔'' (ٹی وی لاؤنج کا قالین کتنا میلا ہو گیا ہے۔ جھاڑو لگانے سے کمر دکھتی ہو گی)

''مواما لی کتے دن سے پلٹا اچ نہیں، انوں پانی ڈالے کو، سوب پھولاں کھل جائیں گے بول کو۔'' (یہ مالی کتنے دنوں سے نہیں آیا ہے۔ اگر وہ پودوں میں پانی ڈالے تو سارے پھول کھل اٹھیں گے)

''ائی ہلو ہلو تا کی لگاؤ ناں تم۔ تم تو پوچے کا کپڑا سانپ کی طرح لہراتے لگائے بیٹھے ہو۔'' (ارے تم آہستہ آہستہ پوچا لگاؤ، تم تو پوچا سانپ کی طرح لہراتے ہوئے لگا رہی ہو)

''نہیں باجی جی! کب سے صفائی کر رہی ہوں۔ دو گھنٹے ایک گھر میں لگ گئے ہیں میرے، ابھی سفید گیٹ والی کے گھر نہیں گئی۔ اگر زیادہ دیر ہوئی تو چشمے والی آنٹی اور کتے والی آنٹی تو میری جان کو آ جائیں گی۔'' ماسی نے آنکھ بچا کر دروازے کے پیچھے کوڑا کرتے ہوئے کہا۔

''تم کام تن ہوناں (ملازمہ ہوناں) تم کے کام کے پیسے ہم دیتے ہیں ناں، پھر پورا کام کیوں نہیں کرتے؟'' صابرہ کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں کس کی شکل دیکھ لی آج...... مصیبت ہی پے گئی'' ماسی دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ لاؤنج کا پوچا دوبارہ لگا کر سرپٹ بھاگی۔

''ثریا بھابی! آج میں نکو پکاؤں گی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا کچھ کرنے کو۔'' صابرہ نے کہا۔

''کیا بات ہے صابرہ! کوئی خاص بات ہو گئی ہے جو تمہارا یوں موڈ آف ہو گیا ہے؟''

''ہماری بھابی جو حیدر آباد دکن سے آئے ہیں، انوں اب مستقل اقامے کی درخواست بھی دے دی۔ انوں نے یہ سب ہنگامہ کیا ہے۔''

''کیسا ہنگامہ؟'' ثریا نے حیرت سے پوچھا۔

''بڑی آپا کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا کو بیٹھے۔ وہ رعنا کا رشتہ اس کے رشتے داروں میں کرنے کا سوچتے بیٹھے ہیں۔''

''مگر تم تو منور سے کرنا چاہتی ہو ناں؟''

''ہاں، وہ تو میری اول دن سے آرزو تھی، پر دلنواز اتنی جلدی نکاح کا نہیں مانتے، انوں بولتے کہ ابھی منور چھوٹا ہے۔''

''دلنواز ٹھیک کہتا ہے مگر تم منگنی تو کر سکتی ہو ناں۔''

''کیسے منگنی کروں میں۔ وہ بھابی جان تو آپا جان کو الٹے سیدھے سبز باغاں دکھاتے بیٹھے۔''

''تم دلنواز سے مشورہ کر لو...... اور اپنی آپا کو کہہ دو کہ منگنی کے لیے کوئی دن مقرر کر لے۔ پھر ہم سب لوگ جا کر رعنا کو انگوٹھی پہنا آئیں گے۔'' ثریا نے سمجھایا۔

''دلنواز مان جائیں گے ناں؟'' صابرہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کیسے نہیں مانے گا، اسے میں سمجھاؤں گی۔ تمہارا ایک ہی بیٹا ہے۔ تم اس کی سب خوشیاں دیکھو'' ثریا نے بت بھرے لہجے میں کہا۔

''ایو بھابی پاشا! آپ کتے اچھے ہیں۔ میں تو ایکدم پریشان ہو کو بیٹھتی تھی۔''

''منور میرا بھی تو بیٹا ہے۔ تم بے فکر رہو، اس کی شادی رعنا سے ہی ہو گی۔ تمہاری بھابی لاکھ تدبیر کر لے، وہ نا کا رشتہ کہیں اور نہیں کروا سکتی۔ میں جاؤں گی تمہارے ساتھ...... اور آپا سے خود بات کروں گی۔ پھر دیکھنا، تمہاری آپا کیا کہتی ہیں؟'' ثریا نے وثوق بھرے لہجے میں صابرہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرشاری سے کہا۔

''حمول ہے، حمول ہے، میرے کو منور حمول ہے' دیکھ لینا آپ بھی...... آپا یہ ہی اچ بولیں گی'' صابرہ کھل لماتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

نگین اور شجاع اپنے بیڈروم میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بجائے اپنی اپنی سوچ میں مست تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں پاس ہو کر بھی بہت دور ہوں۔

"کیا بات ہے؟ تم اتنی چپ چاپ کیوں رہتی ہو؟"

"کوئی بات نہیں ہے، میں ہمیشہ سے کم گو ہوں...... یا آپ مجھے ایک اچھی سامع کہہ سکتے ہیں۔"

"پھر بھی...... کچھ نہ کچھ تو بولا کرو۔"

"کیا آپ ستاروں پر یقین رکھتے ہیں؟" نگین نے پوچھا۔

شجاع اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا "ہاں، کیوں نہیں۔"

"اور ہاتھ کی لکیروں پر......"

"کچھ کچھ......" وہ مسکرا کر اس کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ کو کسی نے یہ بتایا تھا کہ آپ محبت کس سے کریں گے اور شادی کہیں اور ہوگی؟"

"یہ سب تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی...... یونہی میرے دل میں خیال آیا تو پوچھ لیا۔"

"نگین...... یہ صحیح ہے کہ مجھے فرح سے محبت تھی اور میں اس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ شاید وہ میرے مقدر میں ہی نہ تھی۔ اس کی شادی ہو چکی ہے، تمہارے لیے اس کے لیے جلاپا بے معنی ہے۔ اب میری زندگی میں تم ہو...... صرف تم!"

"میں جل تو نہیں رہی...... میری اس سے بھلا کیوں دشمنی ہونے لگی...... اس نے اپنے حصے کی محبت پالی، میں اپنے حصے کی زندگی گزار رہی ہوں۔"

"تمہاری زندگی بھی پر محبت ہے...... کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں؟" شجاع نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر پوچھا۔

"پتا نہیں" اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آنسو اپنے حلق میں ہی اتار لیے۔

☆☆☆

بھائی رشید ہمیشہ سرپرائز ہی دیتے تھے۔ اس وقت بھی رات کے دو بجے تھے۔ شجاع اور نگین اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ عظمت بیگم کی آنکھ بھی لگ گئی تھی کہ بھائی رشید کا فون آ گیا۔ عظمت نے بات کی تو انہوں نے شادی کی مبارک باد دل کھول کر دی...... اس سے قبل ان کا فون بہت مختصر آیا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" عظمت نے پوچھا۔

"اللہ نے ایک ساتھ اتنی خوشیاں دی ہیں کہ میری طبیعت بھی حیرت انگیز طور پر بہتر ہو رہی ہے۔ پہلی خو مجھے یہ ملی کہ شجاع اور نگین کی شادی ہو گئی۔ دوسری خوشی یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے میرے پاس آ گئے ہی اپنے بچوں کو دیکھ کر میں جی اٹھا ہوں۔"

"تمہارے بیٹوں نے واپسی کا فیصلہ کیسے کر لیا؟" عظمت کو خاصا اچنبھا تھا۔

"میں نے اپنی بیماری کا اشتہار شائع کروایا تھا اور اپنے بیٹوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اپنے جاں بلب باپ سے آ کر مل جاؤ...... اور میرے بچے آ گئے۔"

"اللہ تمہیں لمبی حیاتی دے، تم اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھو۔"

"بہت بہت شکریہ...... یہ میری بہن کی ہی دعائیں ہیں جو میری خوشیاں مجھے واپس ملی ہیں۔ میں نے دولھا دلہن کے لیے کچھ تحائف بھجوائے ہیں۔ وہ جلد تمہیں مل جائیں گے۔"

"کیسے تحائف؟" عظمت کا لہجہ بھی تبدیل ہو گیا۔

"دونوں کے لیے خوبصورت کارڈز ہیں، بکس ہیں، چند ڈائریاں، پین اور ایک یادگار برش ہے۔ اس برش ے میں نے بہت سی پینٹنگز بنائی ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ نگین کا مزاج بھی آرٹسٹک سا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا وں، اس نادر برش کی وہی حقدار ہو سکتی ہے۔"

"اچھا......" عظمت کے گلے سے گھٹے گھٹے انداز سے نکلا۔

"کیا میری اس وقت نگین اور شجاع سے بات ہو سکتی ہے؟"

"اس وقت یہاں آدھی رات ہو رہی ہے، وہ دونوں سو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں پھر کسی دن فون کر کے ان سے بات کروں گا" اور عظمت بیگم الجھ سی گئیں۔

ان کے نادر تحائف ان کی نظر میں دو کوڑی کے تھے لیکن وہ اپنے دل کی بات ان سے کہنے کی ہمت نہیں ہتی تھیں۔

☆☆☆

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔

شجاع کا خیال تھا کہ اسے فرح سے اچھی کوئی لگ ہی نہیں سکتی مگر نگین اسے پسند آ گئی تھی اور اچھی بھی لگ ی تھی اور فرح سے بچھڑنے کا ملال رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ جب تک وہ ناشتے پر موجود نہ ہوتی، وہ لقمہ منہ میں نہ تا۔

نگین گھر میں میک اپ نہیں کیا کرتی تھی اور نہ ہی ہمہ وقت زیورات پہننے کا اسے شوق تھا مگر شجاع اسے اتا۔ اس کا دل یہ چاہتا کہ وہ ہمہ وقت بنی سنوری رہے۔

ایک شام وہ چپ چاپ سی بیٹھی تھی، شجاع اپنے کمرے سے سبز اور شوکنگ پنک بوتیک کا جوڑا، اس کی جیولری اور چوڑیاں لیے اس کے پاس چلا آیا۔

"نگین، فٹافٹ تم اس کو پہن کر دکھاؤ" کپڑے اس کے پاس رکھتے ہوئے اس نے ہنس کر کہا۔

"یہ کہاں سے خریدے ہیں آپ نے کپڑے" اس نے حیرت سے دیکھا۔ اس گاؤں میں تو دور دور تک ہاں ایسی شاپ نہیں تھی جہاں یہ جدید اسٹائل موجود ہو۔

"کراچی سے لایا تھا میں......"

"فرح کے لیے......؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"ہاں......" اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

"پھر یہ آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں؟" وہ دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

’’وہ اس لیے کہ اس کی اصل حق دار اب تم ہی ہو۔‘‘

نگین کو شجاع کا یہ انداز فکر اچھا لگا۔ اپنی زندگی حال سے وابستہ کرنے والا نظر آ رہا تھا۔ ماضی کا ہر باب وہ بند کر چکا تھا۔

جب ہم دونوں ہی ایک کشتی میں سوار ہیں......تو پھر میں یہ اداسیوں کی چادر کیوں اوڑھے بیٹھی ہوں۔

’’آپ نے خود پہنانی ہیں مجھے یہ چوڑیاں......‘‘ نزاکت سے اس نے اپنا ہاتھ شجاع کی جانب بڑھایا۔

شجاع نے اس کا دودھیا ہاتھ تھام کر بے اختیار اپنے لبوں سے لگایا اور وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ سامنے ہی پلنگ پر بیٹھی عظمت پھوپو بظاہر مٹر چھیل رہی تھیں مگر نگین کو احساس تھا کہ وہ کانی نظروں سے ان دونوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

اب شجاع اس کے ہاتھوں میں ہری بانکیں چڑھا رہا تھا اور جب پہنا چکا تو بے اختیار کہہ اٹھا ’’نگین، چوڑیوں سے سج کر تمہاری کلائی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔‘‘

’’آپ نے جو پہنائی ہیں اس لیے......‘‘ وہ بولی۔

شجاع نے ایک نظر نگین کو دیکھا، ایک ملکوتی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو روشن سی کر رہی تھی۔

’’بس اب منٹ میں یہ سوٹ پہن کر مجھے دکھاؤ‘‘ شجاع نے کہا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ کپڑے لے کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ جب دس منٹ بعد آئی تو وہ بجی سنوری سی لگ رہی تھی۔

’’تم لوگ کیا فرحت کی طرف جا رہے ہو؟‘‘ عظمت بیگم نے پوچھا۔

’’ہاں پھوپو!‘‘ شجاع کے بدلے نگین بول اٹھی۔

’’نگین! اوپر کالی چادر لے کر جانا، یہ گاؤں ہے، لوگ دیکھیں گے تو اچھا نہیں لگے گا۔‘‘

☆☆☆

ثنا کے لیے ہاسٹل کے بجائے فلیٹ کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ جہاں چار لڑکیوں نے مل کر رہنا تھا۔ اسی فلو پر شاہنواز کے ایک پرانے دوست کی فیملی بھی رہائش پذیر تھی۔

انہوں نے شاہنواز کو تسلی دلاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ثنا کا بھرپور خیال رکھیں گے۔ اس طرح رہنے میں انہیں گھر کی سی آسودگی حاصل ہو گی۔

جو پیسے وہ ہاسٹل میں کھانے میں خرچ کریں گے، اس سے آدھے پیسے خرچ ہوں گے۔ فلیٹ کا کرا چاروں لڑکیاں مل کر دے دیں گی۔ ان کے کھانا پکانے والی بوا، روزانہ جا کر ان بچیوں کے لیے بھی کھانا پکا کرے گی تاکہ جب ثنا اور اس کی سہیلیاں گھر آئیں تو انہیں گھر کا کوئی کام بھی نہ کرنا پڑے۔ سودا سلف اور دو کاموں کے کرنے کی ذمے داری بھی انہوں نے لے لی تھی۔

شاہنواز کو یہ بات اس وجہ سے بھی پسند آئی تھی کہ مذکورہ فلیٹ میڈیکل کالج کے بالکل سامنے تھا۔ بسو میں آنے جانے کی دردسری بھی نہیں تھی اور خیال رکھنے والے ان کے دوست بھی موجود تھے۔ جن سے ان برسہا برس سے تعلق تھا۔ جو دو مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود قائم تھا۔

ثنا کو بھی یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی تھی کہ ہاسٹل کے گھٹے ہوئے سخت ماحول میں رہنے کے بجائے وہ میں رہے گی جہاں اسے گھر کا سا ماحول ملے گا۔ ہر وقت کی ٹینشن اس کے سر پر سوار نہ ہو گی۔

جس دن وہ پنڈی جا رہی تھی، ائرپورٹ پر سب ہی لوگ اسے چھوڑنے آئے تھے، حد تو یہ ہے کہ شائستہ بیگم اور سائرہ تک تھیں۔

’’ثنا! اگر تم کسی سمیسٹر میں فیل ہوئیں تو یہ صرف تمہاری بے عزتی نہیں ہو گی بلکہ ہم سب کی ہو گی، کیا کہیں گے لوگ کہ نقل کر کے ایف ایس سی کر لیا مگر میڈیکل کی پڑھائی نے چھکے چھڑا دیے۔‘‘

’’میرا خیال ہے، میں تم سے زیادہ ذہین بھی ہوں اور سمجھ دار بھی ہوں، اس لیے اس قسم کا مسئلہ میرے ساتھ تو نہیں ہو سکتا مگر جس طرح تم رو رو کر پڑھے ہو اور چچی کو پریشان کرتے رہے ہو، میں تمہارے نقش قدم پر تو نہیں چل سکوں گی‘‘ ثنا نے جل کر کہا اور منور مسکرانے لگا۔

ثنا جوڈ بڈباتی نظروں سے ماں اور چھوٹے بھائیوں کو دیکھ رہی تھی، صرف منور کی بکواس سن کر اس کا موڈ بھی تبدیل ہو گیا تھا اور جب وہ بورڈنگ کارڈ لے کر خدا حافظ کہنے آئی تو شاید اس کا دل ہی رکھنے کو منور نے اس سے کہا۔

’’ثنا......! آئی مس یو۔‘‘

’’اچھا!‘‘ وہ تحقیر سے مسکرائی۔ ’’مگر میں تمہیں کبھی یاد نہیں کروں گی‘‘ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر مضبوط لہجے میں کہا۔

’’رئیلی......!‘‘ وہ شوخی سے مسکرایا۔

’’جی ہاں‘‘ اور وہ ہاتھ ہلا کر چلتی چلی گئی۔

☆☆☆

شجاع کے دوست حمید کا ولیمہ تھا۔ شجاع اپنے ساتھ نگین کو بھی لے کر گیا تھا۔ نگین فیروزی کامدار غرارے میں گئی تھی۔ عظمت بیگم نے بطور خاص اس جوڑے کا انتخاب کیا تھا۔ فیروزی جڑاؤ سیٹ بھی پہنا تھا۔

گاؤں کی اس شادی میں ہر کوئی نگین کو ہی دیکھے چلا جا رہا تھا۔

’’شجاع کی بیوی کتنی سوہنی ہے۔‘‘ ہر سو یہی خبر تھی۔

نگین کو عجیب سی کوفت ہو رہی تھی کہ سب مہمان خواتین اسے دلہن سے زیادہ اہمیت دے رہی تھیں۔

حمید کی دلہن بھی کراچی سے آئی تھی اور حمید بھی عرصۂ دراز بعد گاؤں آیا تھا۔ اس کی دلہن بھی خوب صورت تھی اور وہ اپنے آپ کو سجانے کے ہنر سے بھی آگاہ تھی۔ شاکنگ پنک اور پرپل کلر کا خوبصورت شرارہ اس تقریب میں منفرد دکھائی دے رہا تھا۔ دلہن تمام مہمانوں سے خوب پٹر پٹر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے باوجود سب کی نظریں نگین پر ہی مرکوز تھیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔

کھانا شروع ہوا تو سب مہمان اپنی باتیں بھی ادھوری چھوڑ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں اور نگین نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ مسلسل نگاہوں کی زد میں تھی۔

’’تسی بھی روٹی لے لیو‘‘ ایک میزبان نے اسے کھانے کے ہال میں جاتا نہ دیکھ کر کہا۔

’’جی، ابھی لیتی ہوں‘‘ اس نے مسکرا کر کہا۔

تب ایک دبلی پتلی لڑکی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بڑے چاہت بھرے لہجے میں بولی ’’آپ شجاع کی دلہن ہیں ناں......؟‘‘ لہجہ وثوق بھرا تھا۔

’’جی ہاں۔‘‘

''کیا نام ہے آپ کا؟''

''نگین!''

''آپ کا نام بھی آپ ہی کی طرح پیارا ہے۔''

''اور آپ......؟''

''میں فرح ہوں، اشرف کی گھر والی۔''

''اچھا آپ ہیں فرح...... میں تو آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔''

''کیوں؟'' وہ سہم سی گئی۔

''شجاع آپ کی بہت تعریفیں کر رہے تھے۔''

''کیوں کر رہے تھے، میرا ان سے کیا ناتا......؟'' خوف اور دہشت کے سائے چہرے پر ابھر آئے تھے۔

''میں آپ کی دوست ہوں فرح! مجھے غیر نہ سمجھو۔'' نگین نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں محبت سے لے کر دبایا۔

فرح نے چاروں طرف چوکنے انداز میں دیکھنے کے بعد آہستگی سے کہا ''نگین! آپ بہت خوش قسمت ہیں، شجاع جیسا انسان قسمت والوں کو ہی ملا کرتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں فرح! مگر کاش...... شجاع کی شادی آپ سے ہو جاتی تو وہ بھی خوش قسمت ہوتے۔ انہوں نے آپ کو بے حد دل سے چاہا تھا مگر مقدر کے آگے بے بس ہو گئے۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں'' فرح لرزتے ہوئے بولی۔

''اللہ کرے آپ ہمیشہ خوش و خرم رہیں مگر آپ یہ کبھی مت سوچیے گا کہ میں نے آپ کے حق پر ڈاکا مارا ہے...... مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ شجاع آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے ورنہ میں کبھی ہامی نہ بھرتی۔''

''آپ ہامی نہ بھرتیں تو شجاع کی شادی کسی اور سے ہو جاتی، میری قسمت میں جو لکھا تھا، وہی مجھے ملنا تھا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ مقدر کے فیصلوں سے ہم آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ آپ خوش ہیں اپنے گھر میں، آپ کے میاں جی اتنی پیاری دلہن پا کر بہت خوش ہوں گے؟'' نگین نے پوچھا۔

''ہاں جی، بے حد خوش ہوں مگر خدا نہ کرے کہ کسی لڑکی کی قسمت میری جیسی ہو۔'' فرح نے پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''آپ کس کو دیکھ رہی ہیں؟''

''اپنی ساس نندوں کو، اشرف نے اپنی ماں بہنوں سے کہہ رکھا ہے کہ جب اسے اپنے ساتھ لے جایا کرو تو چوکسی رکھا کرو، کسی سے یہ بات نہ کرنے پائے۔ میں کافی دیر سے بیٹھی آپ کو دیکھ رہی تھی مگر آپ کے پاس آنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ اب وہ لوگ کھانے کے لیے گئی ہیں تو سب کچھ بھول گئی ہیں۔ ان کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں ان کے ساتھ آئی ہوں۔''

''آئیے چلیے، ہم بھی کھانا کھاتے ہیں۔''

''ہاں چلیں...... مگر آپ یہی ظاہر کیجیے گا کہ نہ مجھ سے ملی ہیں اور نہ ہی مجھے جانتی ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔''

اور پھر واقعی یہی ہوا، کھانے کے دوران اشرف کی ماں فرح کو کھوجتی ہوئی آئی تو اس سے کہا۔

''ارے تو یہاں بیٹھی ہے، مجھے نظر ہی نہیں آئی۔''

''مجھے جگہ نہیں ملی تو میں ادھر آ گئی'' فرح نے وضاحت کی۔

''وہ سامنے فیروزی غرارے والی شجاع کی بیوی ہے جو شہر سے آئی ہے'' اس کی نند نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہو گی......'' وہ بددلی سے بولی۔

''تعارف کراؤں......؟'' نند نے اسے کانی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ تو لیا میں نے اسے، آگے بڑھ کر ملنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس وقت اشرف کے انداز میں ہی بول رہی تھی۔

''غرارہ کتنا پیارا ہے اس کا، ہے ناں......''

''میرے سوٹ کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں، یہ اشرف کی پسند کا سوٹ ہے، کتنی ہی عورتیں مجھ سے پوچھ چکی ہیں یہ کہاں سے لیا؟'' فرح نے جھوٹ پہ جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ اس کے سسرال میں اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں اور ایسی ہی بے تکی باتوں پر فخر کیا جاتا تھا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ اشرف بھائی کی پسند کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔''

اور جب گھر آ کر یہ سب باتیں بہنوں نے اشرف کو بتائیں تو اس کا مارے فخر کے سینہ پھول گیا۔

اور اس شام پہلی مرتبہ رغبت سے محبت سے اس نے فرح سے کہا ''فرح...... تو، تو بہت اچھی ہے۔ تجھ سے بھاتو مجھے کوئی لگتا ہی نہیں۔''

''جی......'' اس نے حیرت سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کھول کر اشرف کو دیکھا۔

''جی کی بچی! میں سچ کہہ رہا ہوں'' وہ اس کی دراز چوٹی اپنے ہاتھ پر لپیٹتا ہوا شوخ لہجے میں بولا تو وہ طمانیت سے مسکرا دی اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ ویسے سے آ کر اس پر کمینی سی جرح نہیں ہوئی جو اس گھرانے کا معمول بن چکا تھا۔

☆☆☆

ادھر شجاع نے نگین کو بلانے کے لیے کسی بچے کو پکارا تو اچانک ہی اس کی نظر فرح پر پڑی...... پیلے سوٹ میں وہ سرسوں کا پھول لگ رہی تھی، پھیکی پھیکی سی آنکھیں، جن میں زندگی کی جوت تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے پورے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ شجاع کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔

فرح ایسی تو نہیں تھی، جیسی وہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جو نگین کو بلانے کے لیے آیا تھا۔ فرح کو دیکھ کر ملول سا ہو گیا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ فرح نے اسے نہیں دیکھا تھا ورنہ شجاع کو یوں ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے وہ پریشان سی ہو جاتی۔

فرح کو یوں غم زدہ ساد یکھنے کے بعد شجاع کا دل شادی کی تقریب میں نہیں لگا اور وہ فرحت کو پیغام دے کر باہر نکل گیا کہ واپسی پر وہ نگین کو گھر چھوڑتی چلی جائے۔

رات گئے جب وہ گھر آیا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر عجیب سی وحشت۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' نگین نے اسے پانی دیتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں، مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا؟'' (لہجہ عجیب اکھڑ سا تھا)

''میں اتنی پریشان جو ہوئی۔''

''ضروری جانا پڑ گیا تھا، ایک دوست کے ساتھ۔''

''اتنی دیر لگ گئی آپ کو......''

''تو پھر......'' وہ غصے سے بولا۔ (آنکھوں میں پہچان تک کی لو نہیں تھی)

''میں پریشان ہو گئی تھی ناں۔''

''نگین! میں آج پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ میرے آنے جانے کے بارے میں پوچھنے والی تم نہیں ہو۔''

''کیوں بھلا؟'' وہ مسکرائی۔

''کہہ دیا ناں، بس......'' چہرے پر وحشت کے سائے مزید بڑھ گئے اور آنکھیں غصے سے باہر نکل آئیں۔

''اچھا، ٹھیک ہے......'' وہ ڈر سی گئی۔ شجاع کا یہ روپ بھلا اس نے کب دیکھا تھا۔

اور وہ تکیہ لے کر چھت پر سونے چلا گیا۔

''کھانا تو کھا لیں......'' وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اوپر چھت پر دوڑی چلی آئی۔

''نیچے جاؤ تم...... میں کھا کر آیا ہوں'' وہ گرجا۔ وہ سہمی سی نیچے آ گئی۔

''کیا بات ہے، کھانا نہیں کھا رہا وہ؟'' عظمت بیگم نے بہو سے پوچھا۔

''ہاں، کہہ رہے ہیں کہ میں کھا کر آیا ہوں۔''

''پھر دورہ پڑا ہے اس پر پاگل پن کا'' عظمت بیگم نے ایک گہرا سانس لیا اور نگین چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اور جب صبح شجاع نیچے آیا تو وہی شجاع تھا۔ ویسے ہی ہنستا ہوا۔ اسی انداز میں سرگوشیانہ لہجے میں بات کر ہوا، جو اس کا معمول تھا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ کوئی بات ہی نہیں تھی۔

نگین کا دل چاہا کہ اس سے اس کے رویے کی شکایت کرے مگر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اسے پتا تھا وہ بھی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے دل پر چوٹ کھائی ہو۔ ان پر یہ لمحات بھی آ جاتے ہیں کہ جب وہ اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ اور یقیناً کل کی شب ایسی ہی تھی۔

شجاع شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا تب وہ زبردستی مسکرانے لگی کہ اسے ایسا ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

ثریا تو یہی سمجھ رہی تھیں کہ اے ون گریڈ آ جانے سے ان کی بیٹی کو فوراً میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا رزلٹ سن کر ہی وہ آپے سے باہر ہو گئی تھیں۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہ بیانات داغیں کہ میڈیکل کالجز خود چل کر ان کے دروازے پر آ رہے ہیں اور ان کی خوشامدیں کر رہے ہیں کہ ثنا کو ہمارے کالج میں داخل کروا دو۔ خدا کے لیے ثنا کا ایڈمیشن ہمارے کروا کے ہماری عزت و توقیر میں اضافہ کر دو۔

مگر جب ایڈمیشن کے لیے کالجز کے چکر لگائے تو پتا چلا یہاں تو ہر دوسری لڑکی کا یہی گریڈ ہے اور پر سے بھی بہت اچھی ہے۔

مرے پر درے اور...... کہ خالی خولی اس گریڈ پر داخلہ بھی نہیں مل رہا...... ٹیسٹ لینے کی دردسری

موجود ہے۔

ادھر ادھر مشورہ کیا تو سب نے ہی رائے دی کہ ہر کالج کا ٹیسٹ دلواؤ۔ داخلہ کہیں بھی ملے مگر ملے تو ......ڈاکٹر تو اس وقت بنے گی جب داخلہ ملے گا اور جب داخلہ ہی نہیں ملے گا تو اس اے ون گریڈ کو کوئی چاٹنا تھوڑی ہے۔

ثنا نے ڈاؤ میڈیکل کے ٹیسٹوں کے ساتھ ایس ایم سی اور ڈی ایم سی تک کے ٹیسٹ دے ڈالے اور کسی بھی ٹیسٹ میں اس کا نام نہیں آیا۔

''خالہ کم بخت کوس کر گئی ہے تو داخلہ کیسے ہو جاتا'' ثریا مارے غصے کے خالہ کے آگے پیچھے تک کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

''پرائیویٹ میڈیکل کالجز بھی ہیں، ان کی فیسیں تو زیادہ ہیں مگر ڈاکٹر یہ بھی بنا دیتے ہیں۔''

''نہیں بھئی، میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ لاکھوں روپوں میں خواہ مخواہ آگ لگا دوں۔'' ثریا نے جھٹ منع کر دیا۔

ثنا نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں۔ مگر ثریا کسی طرح موم نہیں ہو رہی تھی۔

''میں دس لاکھ میں شاندار سی شادی نہ کر دوں، جو اتنے پیسوں میں ڈاکٹر بناؤں ......اور ڈاکٹر بنیں گی تو اپنے لیے بنیں گی، اس میں میرا کیا فائدہ؟ مجھے تو شادی کے لیے پھر پیسے خرچ کرنے پڑیں گے، ابھی اتنے اچھے لوگ نظر نہیں آتے جو یہ کہہ دیں کہ ڈاکٹر لڑکی سے ہم جہیز نہیں لیں گے۔ جس طرح مہنگائی بڑھ رہی ہے، اسی طرح لوگوں میں جہیز کا ہوکا (لالچ) بڑھ رہا ہے۔''

''مگر میری محنت تو بے کار گئی۔ اے ون گریڈ بھی لائی اور میڈیکل میں داخلہ بھی نہیں ملا'' ثنا مسلسل احتجاج کر رہی تھی۔

''ثنا! تم کراچی یونیورسٹی میں بی فارمیسی میں داخلہ لے لو، یہ بھی میڈیکل کی ہی فیلڈ ہے۔ دوا لکھنے کے بجائے ٹیبلٹ بنایا کرنا۔'' منور نے سمجھایا۔ ان دنوں منور آئی بی اے سے ایم بی کر رہا تھا۔ دوسرا سمسٹر تھا اور وہ بہت سخت محنت کر رہا تھا۔

''جی نہیں، مجھے نہیں لینا ایڈمیشن، امی کر لیں اپنی بچت۔''

''تائی امی ......تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ ابھی خالہ نے اپنے لڑکے کا رشتہ کہیں طے نہیں کیا ہو گا۔ میڈیکل نہ سہی شادی ہی سہی ......اچھا ہے، خالہ کی ناراضی بھی دور ہو جائے گی'' منور نے مسکرا کر کہا۔

''منور میں تمہارا سر توڑ سکتی ہوں اس وقت، اگر ذرا بھی میرا دل جلانے کی تم نے کوشش کی'' ثنا نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

''میرا کیا ہے، تم زندگی بھر نہ کرو...... میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا، نہ تو نہ سہی......'' منور نے کندھے اچکائے اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

''بے حد پیاری اور حواس گم کر دینے والی شام کا افتتاح ہو رہا تھا۔

فہد کو یہ شام اس وجہ سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی کہ آج اس کا پرموشن ہوا تھا۔ اس کی تنخواہ میں سات ہزار دو سو پچاس روپے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بونس بھی سال کے چار ہو گئے تھے۔

گھر آتے ہوئے اس نے مٹھائی بھی لے لی تھی اور پھل بھی...... سگنل پر بائیک رکی تو اس نے گجرے بکتے دیکھے۔ لکڑی پر پروئے ہوئے گجرے اسے اچھے لگے۔ تو فہمی کے لیے اس نے دو گجرے لے لیے۔ وہ جانتا تھا کہ فہمی کو پھول بے حد پسند ہیں۔

آج گو آفس میں کام خاصا کیا تھا مگر خوشی کا احساس اتنا حاوی تھا کہ وہ اپنی تمام تھکن بھول کر گنگنا رہا تھا اور جب گھر میں داخل ہوا تو اس کی مڈبھیڑ فہمی سے ہوئی۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ اس لیے کھلے ہوئے بالوں سے قطرہ قطرہ موتی ٹپک رہے تھے۔

''لو، یہ کنگن پہن لو'' گجرے اس کو پکڑا کر وہ ماں کے کمرے میں مڑ گیا۔ امی جان اس کے پرموشن کا سن کر خوش ہوئی تھیں۔

''فہمی کو بتایا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''پہلے آپ کو بتایا ہے، فہمی کو بھی بتا دوں گا۔'' فہمی چائے وہیں لے آئی تھی۔ اور جب اسے فہد کے پرموشن کا پتا چلا تو وہ سرشاری ہوگئی۔

''امی کے گھر چلیں، انہیں بھی بتا کر آتے ہیں۔''

''ہاں، چلو۔''

''بیٹا، اس وقت دونوں وقت مل رہے ہیں، یوں بھی اس حالت میں تمہیں بائیک پر بیٹھ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے ممانی جان!'' فہمی نے فوراً ہی ساس کی بات سے اتفاق کر لیا۔

''ایک بات اور اگر برا نہ مانو تو......؟''

''جی کہیے، ممانی جان!''

''میں نے بزرگوں سے ہی سنا ہے کہ حاملہ عورت کو پھول نہیں پہننے چاہئیں۔'' تب فہمی نے اپنے ہاتھوں سے گجرے فوراً ہی اتار دیے۔

''سب بیکار کی باتیں، اتنے اچھے لگ رہے تھے گجرے، پہن لو تم!'' فہد کو ماں کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔

''نہیں فہد! ممانی جان میرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہیں۔ ایسا میں نے بھی سن رکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔''

''امی کے ہاں کل ٹیکسی میں چلیں گے۔''

''اوکے!'' فہد اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گیا کہ اسے شکرانے کے نفل بھی ادا کرنے تھے۔

☆☆☆

''امی! میری سہیلیاں پنڈی میڈیکل کالج میں بھی اپلائی کر رہی ہیں۔''

''تم بھی کر دو مگر تمہارا داخلہ وہاں بھی نہیں ہوگا کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ جب ایک جگہ سے نہ آ جائے تو ہر جگہ سے نہیں کی صدا آتی ہے۔'' ثریا نے غصے سے کہا تھا۔

''اگر میں ٹیسٹ میں پاس ہوگئی تو کہاں رہوں گی؟'' ثنا کو بعد میں آنے والے مسائل پہلے ہی نظر آ رہے تھے۔

''ہوسٹل میں رہ لینا، دنیا کی لڑکی رہا کرتی ہے...... مگر تم پاس نہیں ہو سکتیں، یہ سوچ کر اپلائی کرنا۔''

ثنا یہی سب سوچ کر ٹیسٹ بھی دے آئی تھی اور اس کا بھی خیال تھا کہ یہاں بھی وہ فیل ہی ہوگی۔ ذرا بھی تو آس نہیں تھی۔ مگر جب اس کے پاس ہونے کا لیٹر آیا تو وہ خوشی سے جھوم گئی۔

ناامیدی کے بعد...... امید کے دیے کا روشن ہو جانا، ایک غیر یقینی سی صورت حال ہوتی ہے جو اس گھر میں درپیش تھی۔ گھر کے سب لوگ دسیوں مرتبہ اس لیٹر کو پڑھ رہے تھے، جس میں متعلقہ تاریخ تک فیس جمع کرنے کو کہا گیا تھا۔

''ذرا خالہ کو فون کر کے بتاؤ، جو یہ کہہ کر گئی تھیں کہ ابھی داخلہ ہوا نہیں ہے اور میں اترا پہلے رہی ہوں۔ انہیں بتاؤ کہ میری ثنا ڈاکٹر بن رہی ہے'' ثریا طنزیہ لہجے میں بلند آواز میں بول رہی تھی کہ مذکورہ خالہ کی رشتے داری شائستہ بیگم سے ہوتی تھی اور یہ سب انہیں ہی سنایا جا رہا تھا۔ ثریا کی یہ باتیں سن کر شائستہ بیگم کو ہنسی آ رہی تھی۔

شاہنواز پہلے تو خاصا ہچکچا رہا تھا کہ ثنا پنڈی میں کیسے رہے گی مگر جب اسے پتا چلا کہ اس کے گروپ کی کئی لڑکیوں کا وہاں ایڈمیشن ہوا ہے اور وہ سب ہاسٹل میں رہیں گی تو وہ بھی راضی ہوگیا۔

''اچھا ہے اس گھر سے ایک بلا جا رہی ہے، گھر میں بے حد سکون رہے گا'' منور ثنا کو جلا رہا تھا۔

''میں ہر سمسٹر کے بعد گھر آیا کروں گی۔ دو سے زیادہ تعطیلات آئیں تو گھر آ جایا کروں گی'' ثنا نے چمک کر کہا۔

''اچھا تو پڑھائی سے زیادہ ہوائی جہاز سے آنے جانے کے علیحدہ خرچے۔ اگر پانچ سال میں تم بیس مرتبہ آئیں گئیں تو تین ہزار فی پھیرے میں ایک لاکھ بیس ہزار تو اضافی خرچ ہو جائیں گے۔''

''ہو جانے دو، تمہیں کوئی تکلیف۔'' ثنا نے غصے سے کہا۔

''بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے تایا کی خون پسینے کی کمائی آسمانوں کی سیر میں خرچ ہوگی۔ اگر تم یہیں کسی کالج سے بی اے کر لو تو کتنے پیسے تائی کے بچ جائیں گے جو تمہارے جہیز میں کام آ جائیں گے۔''

''میں جہیز ہی نہیں لے کر جاؤں گی پھر......''

''ڈاکٹر کیا تم پائلٹ بن جاؤ، ہمارے ملک میں بغیر جہیز کے شادیاں کہاں ہوتی ہیں۔ وہ تو تائی بے چاری کو لادینا ہی پڑے گا۔''

''تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو بس اپنی رعنا کے بارے میں سوچو جو روز تمہیں [illegible] پکا پکا کر کھلائے گی۔''

''اسے پکانا آتا ہے تو کھلائے گی، تمہیں تو انڈا تلنا تک نہیں آتا۔ تم تو اپنے میاں کو ملٹی وٹامن کی گولیاں اور کاڈلور پلا پلا کر وقت گزارہ کرو گی۔''

''میں جانوں، میرا میاں جانے، تمہیں اس سے کیا'' ثنا نے چڑ کر کہا۔

''اللہ، حد ہوگئی...... توبہ توبہ! آج کی لڑکیاں کیسی بے شرم ہوگئی ہیں۔ اپنے میاؤں کی باتیں کتنی رغبت سے آتی ہیں۔ کوئی سنے تو کیا کہے گا۔'' منور اپنے گال پیٹ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا اور وہ جز بز ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ثنا سے لڑنے جھگڑنے کے سوا اسے آتا ہی کیا تھا۔

یا تو عقل کی موٹی تھیں یا پھر...... اپنی اہمیت جتانی تھی یا ناراضگی...... صابرہ کی آپا نے منور کے رشتے آنے جان کر یکدم انکار کر دیا۔

’’صابرہ، میں بھابی جان کو پہلے ہی بول دی کہ رعنا کا رشتہ ان کے بھتیجے کے سنگات (ساتھ) کرنے ہے۔‘‘

’’کوئی نکاح تو نہیں کر لیے آپ......‘‘ صابرہ نے طنزاً کہا۔

’’میں جب انوں کو زبان دے دی تو تمہارا رخ (حق) ختم ہو گیا ناں۔‘‘

’’خالی خولی عورتاں کی باتاں سے تو رشتے نکو ہوتے ناں، وہ کوئی اپی چھلائیں پہنائے، کوئی ہور نشانی دیے تو کائے کی بات پکی ہوئی۔‘‘ صابرہ نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ (انہوں نے ابھی انگوٹھی نہیں پہنائی ہی کوئی اور اپنی نشانی دی تو بات پکی ہی نہیں ہوئی۔

’’میری رعنا میرے کو بھاری نہیں ناں کہ میں تمہارے منور کے لیے انتظار کرتی بیٹھوں گی‘‘ بالآخر آپا نے اصل غصہ دکھا ہی دیا۔

’’اسی واسطے تو ہم آپ کے پاس آنے والے ہیں۔ رعنا کا رشتہ لے کر تا کہ آپ ہمیں منگنی کی کوئی تاریق (تاریخ) دے دیں۔‘‘

’’یہ بولو ناں کہ تم لوگاں منگنی کرنا چاہتے ہو۔‘‘ (آپا کی سمجھ سے کائی ہٹی)

’’اور کیا بول رہی تھی جب سے میں...... آپ نکو سمجھ رہے میری بات‘‘ صابرہ کھلکھلائی۔

’’منور کا رشتہ مجھے سر آنکھوں سے جہول...... اب یہ بولو کہ کب آنے کا ہے تم لوگاں نے......؟‘‘

’’آج اتوار ہے ناں...... بس ٹھیک ایک ہفتے بعد...... اتوار کو ہی...... ہم سوب آتے۔‘‘

’’ارے باپ...... اتنی جلدی، اپنے حیدرآباد دکن میں تو پہلے ’’پاؤ میز‘‘ کی رسم کرتے، پھر پندرہ دن کے بعد منگنی کرتے‘‘ آپا نے ہنس کر کہا۔

منگنی یا شادی سے پہلے لڑکی کے جوتے کپڑے کے ناپ لینے کو ’’پاؤ میز‘‘ کی رسم کہا جاتا ہے۔ یہ رسم اب ترقی یافتہ شہروں میں تو نہیں ہوتی مگر وہ گھرانے جہاں پرانی رسموں پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے، وہاں یہ رسم اب موجود ہے۔ پیر کا ناپ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک میز پر چینی پھیلا دی جاتی ہے۔ سسرال کی عورتیں اس دلہن کا پیر رکھتی ہیں اور اس سے ہی اندازہ لگا لیتی ہیں کہ دلہن کا جوتا کس نمبر کا آئے گا۔ اسی طرح کپڑے کا لینے کے لیے اس کے شانے مونڈھے، لمبائی چوڑائی بالشت کی مدد سے ناپی جاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں گھروں میں کپڑے سینے کا رواج تھا، تو گھریلو عورتیں اسی طرح کے ناپ لے کر کپڑے سیتی ہوں گی اور بیاہ کے موقع پر لڑکی کا ناپ لے کر آتی ہوں گی۔ اب جبکہ ریڈی میڈ کپڑوں کا دور ہے، ایسی رسموں کے میں عمل کرنا تو کیا سننا بھی عجیب ہی لگتا ہے۔

’’کیسی باتاں کرتے آپا آپ بی۔ اب پاؤ میز کی رسمیں کہاں ہوتی ہیں۔ اپنے بچوں نے تو دیکھی نہیں۔‘‘

’’بچوں نے نہ دیکھی ہوں، پر ہم نے تو دیکھی ہیں ناں؟‘‘

’’آپ سوب سچی باتاں کر رئے مگر میرے کو بوتیک سے اچھا سا جوڑا لینے کا ہے۔‘‘

’’رعنا بھی یہی اچ بول رئی تھی۔‘‘ (آپا نے ہنس کر کہا)

’’میں رعنا کی پسند کا ہی لاؤں گی۔‘‘ صابرہ کے لہجے میں فخر کا سمندر ہلکورے لینے لگا۔

’’رعنا اب تمہاری بیٹی ہے ناں۔ تمہارا رخ (حق) ہے جی، جو دل چاہے تم اس کے واسطے لاؤ۔‘‘

اور پھر منگنی کا دن بھی آ گیا۔ صابرہ جھمکوں کے جڑاؤ سیٹ کے ساتھ پانچ جوڑے لے کر گئی۔ رعنا کو رآبادی کھڑے دوپٹے کا سوٹ پہنایا گیا۔ رعنا چونکہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی اس لیے وہ سسرال سے آنے زیور پہلے سے ہی پہن کر آئی تھی۔ ورنہ ان کے ہاں ایک ایک زیور خود پہنانے کا رواج تھا۔

منور نے جب رعنا کو انگوٹھی پہنائی تو ثنا نے اسی وقت ایک بڑا سا لڈو منور کے منہ اور رعنا کے منہ میں دیا۔ رعنا منہ میں لڈو دبا کر ہنس پڑی اور منور...... ثنا کو سرزنش کرتی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ منہ پر رومال رکھ کر اس نے وہ بڑا سا لڈو منہ میں سے نکالا اور رومال پاس رکھی باسکٹ میں ڈال دیا۔

ثنا نے چونکہ دیکھ لیا تھا اس لیے وہ بلند آواز بولی ’’دولھا میاں کہہ رہے ہیں میں اور مٹھائی کھاؤں گا۔‘‘

خاندان کی عورتیں اپنے ہاتھ میں مٹھائی لے کر منور کی جانب بڑھ رہی تھیں اور منور اپنے دائیں جانب ثنا کی چوٹی کو مارے غصے سے اپنے ہاتھ میں لپیٹ رہا تھا۔

رعنا کی آپا نے دولھا، دلہن کا صدقہ اتارنے کے بعد ایک بیش قیمت گھڑی منور کو پہنائی۔ تب ثنا نے رارت سے کہا ’’منور! اب تمہارا وقت بھی رعنا کا ہوا۔‘‘

’’کیوں بھئی؟‘‘ منور ایک اچٹتی سی نظر رعنا پر ڈال کر ثنا سے پوچھنے لگا۔

’’ان کے گھڑیال نے آپ کے ہاتھ کو قید جو کر دیا ہے۔‘‘

’’مجھے بھی بھلا کوئی قید کر سکتا ہے؟‘‘ منور نے مسکرا کر دھیمے سے کہا تو ثنا ہنس دی۔

صابرہ کی بھابی آف موڈ کے ساتھ تقریب میں شریک تو ہوئی تھیں مگر اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔ ہر رسم کو بے اور بے رغبتی سے دیکھ رہی تھیں۔

اپنی کسی عزیزہ کے کان میں وہ بولیں ’’میں اتنا اچھا رشتہ بتائی...... وہ نہیں کری تو اس کی قسمت۔ اب بار بار لاشی ان کا کواڑ (دروازہ) نکو بجائے گی ناں۔‘‘

’’تم کائے کو بے چین ہوتے، وہ جو کری وہ جانے‘‘ عزیزہ نے تسلی آمیز لہجے میں ان سے کہا۔

’’ہاں، یہ تو ہوئیں گا ہی۔ دیکھ لینا تم...... رعنا کی ماں ایک دم چالاک عورت، ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی لپکتی، اب کوئی تیسرا رشتہ آئے گا ناں، تو تم دیکھ لینا، صابرہ کو لعنت دکھا کر کیسی آگے بڑھ جائیں گی وہ۔‘‘

’’دونوں بہناں ہی خرانٹ یکدم (چالاک، عیار) سوب لوگاں جانتے ہیں۔‘‘ عزیزہ نے مرہم کے پھائے تو انہیں سکون ملا اور بے دلی سے پان منہ میں گھمانے لگیں۔

☆☆☆

فریال نے کم عمری میں ایسا دھوکا کھایا تھا، اس کا ہر ایک پر سے بھروسا ہی ختم ہو گیا تھا۔

یوں تو صادقہ باجی بھی کہیں آنے جانے کی شوقین نہیں تھیں...... زیادہ سے زیادہ وہ اپنے ورکرز کے ہاں جاتی تھیں۔ مگر اب مسز رحمٰن کے بیٹے کو جاب ملی تو انہوں نے اپنے گھر میں خصوصی تقریب کی اور فریال اور صادقہ دونوں کو ہی بطور خاص مدعو کیا۔

وہ ان کی پرانی کلائنٹ تھیں جو ان کے بوتیک سے باقاعدگی سے خریداری کرتی تھیں۔

’’فریال! اگر تم چلو گی تو میں جاؤں گی ورنہ میرا خود کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔‘‘

’’میرا کون سا چاہتا ہے‘‘ فریال نے مسکرا کر کہا۔

’’یہی تو میں چاہ رہی ہوں کہ تم انکار کر دو تا کہ مجھے بھی نہ جانے کا کلی بہانہ مل جائے۔‘‘

’’اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔‘‘ فریال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’ہمارے جانے سے مسز رحمٰن بہت خوش ہوں گی، لیکن اگر ہم نہیں جائیں گے تو کوئی ناراض بھی نہیں ہوں گی کہ وہ جانتی ہیں کہ ہم لوگ آنے جانے کے چور ہیں۔‘‘ صادقہ باجی اب گاؤ تکیے کے سہارے لیٹتے ہوئے بولیں۔

’’کیا خیال ہے، ہم آج ان کو حیران کردیں کہ اس سے قبل ان کے ہاں ہونے والی تقریبات میں ہم کئی سے گئے ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ہے۔ تم کہتی ہو تو میں بھی اٹھنے کی کوشش کرتی ہوں۔‘‘

’’کوشش نہ کریں، بلکہ اٹھ ہی جائیں۔ اس وقت ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں۔ نو بجے تک ہمیں نکل جانا چاہیے۔ آدھے گھنٹے کی تو ڈرائیو بھی ہے۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ہے۔‘‘ بالآخر صادقہ باجی اٹھ ہی گئیں۔

فریال کو ایسا فوراً ہی لگا تھا کہ جیسے لڑکیوں کے گروپ میں ثنا بیٹھی ہنس رہی ہو۔ اسی کی طرح نغمگی جیسے کوئل کی کوک، ثنا کا لہجہ بڑا اغنائیہ سا تھا۔

فریال ہمیشہ اس سے کہتی تھی کہ تمہاری آواز بے حد خوبصورت ہے جو لاکھوں میں اپنی شناخت علیحدہ رکھتی ہے۔ اور آج اس کی آواز نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھنے والی لڑکی کوئی دوسری نہیں بلکہ اس کی اپنی بھتیجی ہے۔ مگر ثنا یہاں پنڈی کیسے آ سکتی ہے۔ اگر وہ یہاں آئی ہے تو بھائی اور بھابی بھی آئے ہوں گے اور ان کے ساتھ شاید امی جان بھی ہوں۔

فریال کو یوں لگا جیسے ابھی کسی کونے سے ثریا بھابی نکل آئیں گی اور دل کھول کر اس کی بے عزتی کردیں گی۔ وہ بیٹھے بیٹھے پسینوں سے تر ہوگئی اور ثنا کی جانب سے اپنا رخ قدرے ترچھا کر لیا کہ وہ جب تک دل چاہے اسے دیکھتی رہے اور وہ اسے نہ دیکھ سکے۔

’’تم یہاں کیوں بیٹھ گئیں علیحدہ ہو کر، ادھر آ جاؤ‘‘ صادقہ باجی نے اسے یوں الگ تھلگ سا دیکھا تو پاس آ کر کہا۔

’’میرا دل گھبرا رہا ہے، دل چاہ رہا ہے کہ فوراً یہاں سے چلی جاؤں۔‘‘

’’کس کو دیکھ کر تم پریشان ہوگئی ہو؟‘‘ صادقہ باجی اس کی اڑتی رنگت اور سراسیمہ سا لہجہ دیکھ کر بے اختیار پوچھ بیٹھی تھیں۔

’’یہاں میری بھتیجی ثنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میری فیملی کے دیگر لوگ بھی آئے ہوں۔‘‘

’’کیا مسز رحمان سے تمہاری رشتے داری بھی ہوتی ہے؟‘‘

’’نہیں، مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی ہمارے گھر آئی ہوں۔‘‘

’’پھر تمہاری بھتیجی یہاں کیسے آئی ہے؟‘‘

’’یہی دیکھ کر تو میں حیران ہو رہی ہوں۔‘‘

’’ہوسکتا ہے کہ تمہاری بھتیجی سے ملتی جلتی کوئی لڑکی ہو؟‘‘

’’نہیں، وہ سو فیصد ثنا ہے، میں اس کو کبھی بھی بھول نہیں سکتی۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے، اس تقریب میں تمہارے رشتے دار بھی شریک ہیں تو تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘ صادقہ باجی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

’’آپ بھول رہی ہیں کہ عدیل سے شادی کرنے کے جرم میں مجھے گھر سے ذلیل کر کے نکالا گیا ہے اور اب وہ مجھے یہاں دیکھ کر مزید ذلیل بھی کر سکتی ہیں۔‘‘

’’یہ ان کا گھر نہیں ہے۔ ایسی بات وہ ہرگز نہیں کر سکتیں اور بالفرض اگر ایسا ہوا بھی تو تم اپنے آپ کو تنہا مت پانا، تمہاری باجی تمہارے ساتھ ہے‘‘ صادقہ باجی نے اس کے رخ ہوتے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ڈھائی ہزار اسکوائر فٹ پر محیط فلیٹ اتنا بڑا محل نہیں تھا کہ فریال کو ثنا دیکھ ہی نہیں پاتی۔ وہ کسی کام سے مسز رحمان کے پاس گئی تو واپس آتے ہوئے وہ اپنی فریال پھپو کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔

فریال بھی نظریں چراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ثنا نے ایک بار اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور دوڑتے ہوئے وہ فریال کے گلے سے جا لگی۔

’’فریال پھپو!......فریال پھپو! میں کتنے سالوں کے بعد آپ کو دیکھ رہی ہوں، کیسی ہیں آپ؟ ٹھیک تو ہیں ناں؟‘‘

’’ہاں بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔‘‘

’’اور ہمارے پھوپا جان کیسے ہیں؟‘‘ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ فریال کے تو ذہن میں بھی نہیں تھا کہ عدیل کی بابت بھی کوئی سوال کبھی پوچھا جا سکتا ہے۔

’’وہ بھی ٹھیک ہیں اور ملک سے باہر ہیں۔‘‘ صادقہ باجی نے متبسم لہجے میں اسے بتایا۔

ثنا نے سوالیہ نظروں سے صادقہ باجی کو دیکھتے ہوئے اپنی پھپو پر ایک نظر ڈالی۔

’’یہ میری صادقہ باجی ہیں، میں ان ہی کے ساتھ رہتی ہوں۔‘‘

’’یہ آپ کی رشتے دار ہیں؟‘‘ فریال الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

’’ہاں، خاصی قریبی رشتے داری ہے میری ان کے ساتھ۔‘‘

’’آپ پھوپا کے ساتھ باہر کیوں نہیں گئیں؟‘‘

’’تمہارے پھوپا کی جاب کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ فریال کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے، اس لیے میں اور فریال ایک ساتھ رہتے ہیں۔‘‘ صادقہ باجی نے اسے بتایا۔

’’میرے بارے میں ہی پوچھے جاؤ گی، اپنا کچھ نہیں بتاؤ گی کہ تم یہاں پنڈی کس کے ساتھ آئی ہو؟‘‘ فریال نے بے چینی سے پوچھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے گھر کی ایک ایک لمحے کی بات وہ پوچھے۔

’’پھپو! میرا یہاں میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگیا ہے اور میں ہوسٹل میں رہنے کے بجائے اس پلازا میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں ہوں بلکہ شمسہ آنٹی (مسز رحمٰن) کے برابر والا فلیٹ ہمارا ہے۔ انکل رحمان ابو کے دوستوں میں سے بھی ہیں اور ان کے بزنس میں بھی ابو کا کچھ پیسہ انویسٹ ہے۔‘‘

’’اور گھر کے سب لوگ......؟‘‘ فریال نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

’’گھر میں بھی سب خیریت ہے۔ منور لبو کی منگنی رعنا کے ساتھ ہوگئی ہے۔ دادی جان ٹھیک ہیں۔ سائرہ پھپو ٹھیک ہیں۔‘‘

’’سائرہ گھر کا کب چکر لگاتی ہے؟‘‘ وہ اپنے لبوں کو کاٹتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

’’وہ تو رہتی ہی ہمارے پاس ہیں۔‘‘

"کیوں، کیا جاوید بھائی گھر داماد ہوگئے کیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے آپ کو پتا ہی نہیں، سائرہ پھپھو کو طلاق ہوگئی اور وہ ہمارے پاس آگئیں۔" ثنا نے عام سے لہجے میں بتایا۔

اور فریال چاہتے ہوئے بھی یہ پوچھ نہ سکی کہ میری بہن کو کیوں طلاق ہوگئی۔ اس وقت اس کا ذہن یہی سوچ رہا تھا کہ جب اس کے بارے میں پتا چلا ہوگا کہ ایک بہن نے گھر سے بھاگ کر شادی رچائی ہے، جب ہی سائرہ کو طلاق ہوئی ہوگی۔

"پھپھو! آپ کو سب بہت یاد کرتے ہیں۔ ابو بھی یاد کرتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ اگر فریال یہاں ہوتی تو بہت اچھا لگتا...... سب کو بہت اچھا لگتا" اور فریال کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

"پھپھو، آپ روئیں نہیں، میں جب گھر میں سب کو بتاؤں گی کہ مجھے اپنی پھپھو مل گئیں تو یقین کیجیے، سب بھاگے چلے آئیں گے، آپ سے ملنے کے لیے......" وہ معصوم سے لہجے میں بولی۔

"ثنا، میری ایک بات مانو گی؟" فریال نے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

"جی پھپھو، آپ کہیں......"

"تم یہ بات گھر میں کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ تمہاری ملاقات مجھ سے ہوئی ہے ورنہ میں تم کو کھودوں...... ہاں، ثنا! پھر شاید میں تم کو دیکھ تک نہ سکوں۔"

"کیوں پھپھو! ایسا کیوں ہوگا؟" وہ سادگی سے حیران سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"تم یہ بات ابھی نہیں سمجھ سکو گی۔ بہت چھوٹی سی ہو تم......"

"پھپھو، آپ کو پتا بھی نہیں کہ گھر میں سب لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے، سچ سچ بتانا کہ ثریا بھابی مجھے کتنا یاد کرتی ہیں؟"

"امی...... وہ تو آپ کا ذکر نہیں کرتیں۔" وہ خجل سی ہوکر بولی۔

"میں ان کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہی...... میرا جرم ہی شاید بہت بڑا تھا......" اب وہ دونوں بالکونی میں کھڑی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔

"ثنا! تم یہاں مسز رحمٰن کو ہرگز مت بتانا کہ تم میری بھتیجی ہو" فریال نے اس کے بال سنوارتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی میرے بارے میں تم سے مزید سوال و جواب ہوں......" اب فریال غیر ارادی طور پر ثنا کے لمبے بالوں میں چٹیا کے بل دے رہی تھی اور پھر اپنے پرس سے ایک ہیئر بینڈ نکال کر نیچے بالوں کی پونی ٹیل سی بنا کر ہیئر بینڈ اس میں پھنسا دیا۔

"آپ بھی حد کرتی ہیں پھپھو! کون کرے گا سے سوال و جواب؟"

"سب کریں گے۔ کیا وہ یہ نہیں پوچھ سکتے کہ اس شہر میں تمہاری سگی پھپھو موجود ہیں، تو تم ان کے پاس کیوں نہیں رہتیں؟"

"ہاں پھپھو! مجھے تو واقعی آپ کے پاس آجانا چاہیے۔ کیا میں آسکتی ہوں آپ کے پاس؟" ثنا متبسم آنکھوں اور چہرے کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"میری جان!" فریال نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ "اجازت لینے کی ضرورت تھوڑی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ اس بات کو بھابی جان کبھی منظور نہیں کریں گی اور میں تم سے کبھی کبھار کے ملنے کو بھی ترس جاؤں گی۔ اس لیے میری پیاری ثنا! تم گھر میں کسی سے بھی یہ ذکر نہ کرنا کہ تم نے مجھے کہیں دیکھا یا تم مجھ سے کہاں ملیں؟"

"اوکے پھپھو! مگر جب میرا آپ سے بات کرنے کو دل چاہے تو......؟"

"تم میرا موبائل نمبر نوٹ کرلو۔ جب دل چاہے، مجھ سے باتیں کیا کرنا، اپنی باتیں مجھے بتایا کرنا۔" فریال نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تو آنکھوں کے موتی اس کے رخساروں پر بھی منتقل ہوگئے۔

"آپ رو رہی ہیں؟"

"ہاں، اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھا ہے، خوشی کے آنسو نہیں نکلیں گے کیا؟"

"آپ کو گھر یاد آتا ہے؟" ثنا اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کب یاد نہیں آتا...... میں تو روز آنکھیں بند کرکے تم لوگوں کے درمیان پہنچ جاتی ہوں۔"

"جی نہیں، پھوپا جان کے ساتھ آپ اتنی مگن ہیں کہ ہم سب کو بھول بیٹھی ہیں۔ اگر آپ ہمیں یاد کرتیں تو کیا خط نہیں لکھ سکتی تھیں؟ فون نہیں کرسکتی تھیں یا پھوپا کو لے کر دوبارہ ہمارے گھر نہیں آسکتی تھیں؟"

"میں بہت بدقسمت ہوں ثنا! اتنی بدقسمت کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو" فریال اب دھیرے دھیرے آنسو بہا رہی تھی۔

مسز رحمٰن نے کھانا لگا کر جب فریال اور ثنا کو باتیں کرتے دیکھا تو وہیں چلی آئیں اور پوچھا۔ "ثنا! کیا تم بھی فریال کے بوتیک سے کپڑے لیتی ہو؟"

"آنٹی! ان کا ایک بوتیک کراچی میں بھی تھا اور جب سے یہ یہاں آئی ہیں، وہاں کا بوتیک بند ہوگیا ہے۔ میں یہی پوچھ رہی تھی کہ کراچی والا بوتیک کب اسٹارٹ کریں گی؟" ثنا نے بھی بات سنبھالی۔

"فریال کو تو ہم کراچی کبھی جانے ہی نہیں دیں گے۔ آؤ پہلے کھانا کھالو۔"

فریال سے مارے خوشی کے کچھ کھایا ہی نہیں جارہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ثنا کو اپنے سینے میں چھپا لے اور پھر جی بھر کے آنسو بہائے۔

ثنا کی مسرت بھی دیدنی تھی مگر فریال کے کہنے پر اس نے اپنے اوپر قابو پایا اور کھانا ختم ہوتے ہی اپنی [illegible] کے ساتھ اپنے فلیٹ میں چلی گئی کہ صبح سویرے اسے اپنے کالج بھی جانا تھا۔

☆☆☆

مسز رحمٰن کے گھر سے آکر فریال کو ایک پل بھی نیند نہیں آئی تھی۔ بار بار ثنا کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔

"کتنی پیاری ہوگئی تھی ثنا۔ بال تو اس پر ہی گئے تھے۔ گھٹنوں سے نیچے جھولتی ہوئی چوٹی کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔"

ثنا کا والہانہ انداز اس کی تشنگی کو مزید ہوا دے گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ثنا کو اپنے گھر میں لے کر آئے اور اس سے امی اور سائرہ کے بارے میں رائی سے رتی تک (ایک ایک بات) پوچھے۔

وہ تکیے پر دائیں بائیں اپنا سر پٹخ رہی تھی۔ جب اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا گیا تھا تو وہ یہی سمجھی تھی کہ

وہ اپنے گھر والوں کو نہ تو کبھی دیکھ سکے گی اور نہ ہی کبھی ان سے مل سکے گی مگر آج ثنا کو دیکھ کر، اس سے م کر کے اس کے اندر ایک سمندر سا پھوٹ پڑا تھا اور وہ یادوں کی شوریدہ لہروں کی لپیٹ میں تھی۔

''سائرہ کو طلاق ہوگئی......'' یہ سن کر ہی اسے ایک دھچکا سا پہنچا تھا۔

''امی کتنا روئی ہوں گی......ان کے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

''امی جان...... میں کب آپ سے ملوں گی، میں کب آپ کے سینے سے لگ کر سکون اور طمانیت حا کروں گی؟'' اس کا رواں رواں سوال کر رہا تھا۔ جس کا کوئی جواب بھی اس کے پاس نہ تھا۔

فریال کے منع کرنے کے باوجود ثنا کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر میں فون کر کے بتائے کہ اس ک فریال پھپھو مل گئی ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح زندگی گزار رہی ہیں، ان کا ایک معروف سا بوتیک ہے، پھو سے باہر ہوتے ہیں۔ ثریا کا اتفاق سے ہی فون آ گیا۔ حالانکہ وہ یوں رات گئے کبھی فون نہیں کرتی تھی۔

''امی...... آج میں نے فریال پھپھو کو دیکھا تھا'' ثنا نے ماں کا فون ریسیو کر کے پہلی بات یہی کہی۔

''ارے اس کٹنی، ذلیل عورت کو کہاں دیکھ لیا۔ دیکھ ثنا، اس کے پاس بھول کر بھی نہیں جانا۔ وہ انتہائی م اور بدچلن قسم کی لڑکی ہے۔ اگر تیرے باپ کو یہ پتا چلا کہ تو فریال سے ملی ہے تو یاد رکھنا، اسی دن وہ تمہیں سے کراچی بلالیں گے۔ ڈاکٹری پڑھنا بھی خواب ہو جائے گا۔ فریال جیسی لڑکیاں تو کوٹھوں پر ہوا کرتی ہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو اس قسم کی آبرو باختہ خواتین سے دور دور بلکہ بہت دور رہا کرتی ہیں۔'' ثریا ن میں فریال کے لیے جتنا بھی زہر تھا، اس نے چند جملوں میں سمو دیا تھا۔

''افوہ، آپ تو بات بھی پوری نہیں سنتی ہیں، مجھے لگا تھا...... وہ فریال پھپھو ہیں مگر وہ کوئی اور خاتون تھ تو مجھے پہچانی ہی نہیں اور جب میں نے انہیں پاس جا کر دیکھا تو وہ واقعی کوئی اور تھیں۔''

''ہو سکتا ہے وہ فریال ہی ہو...... ڈراما کر رہی ہو۔ ابھی پچھلے سال اس نے کتنے خط لکھے تھے گھر میں ک معاف کر دو اور گھر آنے دو مگر میں پاگل نہیں تھی کہ اپنے گھر میں بدنامی کا زہر داخل کر لیتی...... میں نے وہ خط پھاڑ دیے تھے۔''

''پھپھو نے خط لکھے تھے، آپ نے انہیں پھاڑ ڈالا......؟'' ثنا کی کیفیت اس وقت انتہائی دکھی سی ہوگ اس کی ماں نے یہ بات گھر میں کسی کو بتائی تک نہیں کہ فریال کا کوئی خط آیا ہے۔

اس نے راتوں کو اپنی دادی کو سجدے میں سر رکھے سسکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی ماں نے یہ خبر ان نہیں دی۔ مارے صدمے اور غم کے وہ گنگ سی ہوگئی۔

''سن رہی ہو ناں ثنا!...... کہ اگر کبھی وہ چڑیل نظر آئے تو اس طرف کا رخ بھی مت کرنا۔ اور کبھی وہ کرنا چاہے تو ہرگز بات مت کرنا۔ وہ بدنامی کا ایسا کوڑھ ہے جس سے دور رہنے میں ہی بھلا ہے۔'' تب ا فون کی لائن ڈس کنکٹ کر دی کہ اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب ہی نہیں تھی۔

فریال پھپھو نے اس سے بالکل صحیح کہا تھا کہ اگر وہ کسی کو بتائے گی کہ اسے فریال پھپھو ملی تھیں تو سب ناخوش ہوں گے۔

''آہ...... میری بدنصیب پھپھو...... واقعی آپ بدقسمت ہیں؟'' اس نے ایک گہری سانس لے کر ''سب کے ہوتے ہوئے بھی آپ سب سے جدا ہیں۔'' ثنا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

☆☆☆

ثریا کی تشفی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ فون کی لائن ہی کٹ گئی تھی۔ اس نے ایک لمبا چوڑا خط ثنا کو لکھا کہ فریال کبھی نظر آئے تو راستہ کاٹ جانا مگر اس ذلیل اور لوفر لڑکی سے شناسائی کا کوئی رابطہ مت رکھنا۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے۔

وہ شادی کے بغیر ہی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ مجھے کئی لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ غلط قسم کے کام کرتی ہے۔ وہ یقیناً مظلوم بن کر تم سے ملے گی۔ وہ یقیناً تمہارے باپ سے بدلہ لینا چاہے گی۔ انہوں نے اسے گھر سے نکالا، وہ بھی یہ دل سے چاہے گی کہ تمہاری ذات کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچایا جائے۔ ثنا بیٹی! میں تمہاری ماں ہوں، تمہارے بارے میں تم سے بہتر سوچ بھی سکتی ہوں اور سمجھ بھی سکتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ نہ تو تم سے کوئی پیار کر سکتا ہے اور نہ ہی تمہارا بھلا چاہ سکتا ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا، فریال یا اس ٹائپ کی کسی بھی ایسی عورت سے دوستی مت کرنا جو دوستی کے پردے میں تمہیں نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔ دوستی بڑا مشکل رشتہ ہوتا ہے۔ دوست بڑی مشکل سے پہچانے جاتے ہیں کہ اکثر دشمن ہی دوستی کے لبادے میں ہمارے آس پاس ہوتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ پیاری بیٹی، آنکھیں کھول کر رکھنا، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں، کوئی تمہیں نقصان پہنچا دے۔

دعا گو تمہاری امی۔

ماں کا خط پڑھ کر ثنا پریشان سی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ فریال پھپھو سے ملی تھی تو اس کو ایک طمانیت کا سا احساس ہوا تھا۔ اسے بالکل بھی یہ نہیں لگا تھا کہ اس کی پھپھو اس کی ذات کو بھی کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں مگر اپنی ماں کا تفصیلی خط پڑھ کر وہ خاصی سہم سی گئی تھی۔ اسے ڈر سا لگنے لگا تھا۔

کیا اب مجھے فریال پھپھو سے نہیں ملنا چاہیے؟ اس نے یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ اور اس کا دل سینے میں یوں دھڑک رہا تھا کہ وہ پریشان سی ہوگئی تھی کہ دل سے آتی صدا کی جانب لپکے...... یا پھر اپنی ماں کی پرخلوص، پرمحبت نصیحتوں پر عمل کرے؟

☆☆☆

جمال نے پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی بہن کے پیر میں لنگ ہے، جو ایک حادثے کی وجہ سے آ گیا ہے۔ اس کے باوجود رشتے کے لیے آنے والی خواتین نے اس کے لنگ پر اعتراض کیا تھا۔

''ہم اپنے صحت مند بھائی کے لیے ایک اپاہج لڑکی کا انتخاب تو نہیں کر سکتے۔''

''یہ تو ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا، آپ سے کچھ چھپایا تھوڑی تھا'' ربیع کی ماں نے اپنی آہیں اپنے سینے میں گھوٹ کر بمشکل کہا تھا۔

''ہمارا خیال تھا کہ معمولی سا ہوگا مگر یہ تو پیر کو کھینچ کر چلتی ہے۔'' انہوں نے ربیع کے سامنے ہی ظالمانہ انداز میں تبصرہ کیا۔

ربیع اپنی آنکھوں میں آنسو لیے باہر نکل آئی تھی اور مہمان خواتین واپس چلی گئی تھیں۔

''امی! اب اگر کوئی مجھے دیکھنے کے لیے آیا تو میں ہرگز اس کے سامنے نہیں آؤں گی'' ربیع نے سخت سے لہجے میں کہا۔

''جاہل لوگ تھے، بات کرنے کی تمیز نہیں تھی'' ماں نے سمجھانا چاہا۔

''نہیں امی! وہ ہر بات ٹھیک کہہ رہی تھیں، کون سی ماں ایسی ہوگی جو اپنے بیٹے کے لیے کسی اپاہج بہو کا انتخاب کرے گی؟''

اور دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے جمال نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ غم اور دکھ حقیقت کی ایسی پگڈنڈی پر آ گئے تھے جہاں سے کوئی راستہ بھی منزل کی طرف جاتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ کسی ہتھوڑے کی طرح جمال کے سر پر لگ رہی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا سر جیسے پھٹ جائے گا۔

''یا اللہ...... رحم کر...... رحم کر کہ تجھ سے زیادہ کوئی رحم کرنے پر قادر نہیں......'' اس نے دعا مانگی اور دو آنسو اس کی آنکھوں سے گر گئے۔

☆☆☆

''فہمی، تم اسکول کی جاب چھوڑ دو۔''

''جی، ٹھیک ہے۔''

''اپنی امی کے ہاں بھی دوڑ دوڑ کر مت جایا کرو۔''

''جی ٹھیک ہے۔''

''اونچی ایڑی کی سینڈل پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جی، بالکل......''

''جس دن پائے یا مچھلی بنے، اس دن تم اپنے لیے کچھ اور پکا لیا کرو مگر گرم چیزیں ہرگز نہیں کھانی ہیں۔''

''ٹھیک ہے ممانی جان!''

فہمی ہر کام وہی کر رہی تھی، جو اس کی ممانی چاہ رہی تھیں۔ اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اس مرتبہ جیتا جاگتا بچہ اس کے پاس آئے۔

کتنے ہی دن ہو گئے تھے، وہ ماں کی طرف نہیں گئی تھی۔ ہاں، ٹیلی فونک رابطہ بڑھ گیا تھا۔ جب وہ فون پر ماں سے بات کرتی تو اسے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔

وہ یہ جان کر بہت خوش تھی کہ نگین اور شجاع ایک دوسرے کے ساتھ پر محبت زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک شام وہ ماں سے فون پر بات کرتے ہوئے ہنس رہی تھی کہ ممانی جان غصے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئیں، اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

''دیکھو، اس ماہ فون کا بل گزشتہ ماہ سے بھی ڈبل آیا ہے اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ تم ہر وقت اپنی ماں کو یہاں کی پل پل کی رپورٹ دیتی رہتی ہو۔ اتنا تو میرے بیٹے کی تنخواہ میں بھی اضافہ نہیں ہوا جتنا کہ ٹیلی فون کا بل بڑھ گیا ہے مگر تمہیں اس سے کیا، گھر کو گھر سمجھتیں تو یوں بے رحمی سے فون کا استعمال نہیں کرتیں۔''

فہمی نے ایک نظر ٹیلی فون کے بل پر ڈالی تو اس میں بیرون شہر کالز کی تفصیل درج تھی۔

''ممانی جان! بیرون شہر فون کالز کا بل ہی دو ہزار روپے ہے۔ لوکل کالز کا تو صرف سات سو روپے ہے۔''

''اچھا...... اب تم مجھے الٹا مورد الزام ٹھہراؤ گی؟'' وہ غصے سے گرجیں۔

''ممانی جان! یہ بات نہیں ہے، میں تو بل میں درج کالز کا ذکر کر رہی تھی'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''زیادہ علامہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ (یہاں لفظ علامہ قابل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے) یہ گھر میرا ہے، تمہارا نہیں ہے۔ یہ ٹیلی فون بھی میرا ہے، تمہارا نہیں ہے۔ مجھے کہیں بھی فون کرنے کے لیے نہ تو تمہاری اجازت درکار ہے اور نہ ہی کوئی تبصرہ۔ ہاں تم جب بھی اپنی ماں کو فون کرو گی، مجھ سے اجازت لے کر

کرو گی...... اور ہفتے میں صرف ایک دن کرو گی۔ فیروزہ کو بھی منٹ منٹ پر فون کرنے کی عادت ہے، کیا کھایا، کیا پیا تک کی معلومات وہ حاصل کرنا چاہتی ہے کہ جیسے ان کی بیٹی تکلیف دہ زندگی بسر کر رہی ہے اس لیے میں روزانہ اس کے فون بھی تمہیں نہیں دے سکتی۔''

☆☆☆

''اسے کہتے ہیں ذلالت، اسے کہتے ہیں کمینگی، اسے کہتے ہیں ملی بھگت۔ فرید احمد نے رشید کو پٹی پڑھا کر فون کروا دیا کہ شجاع کی شادی نگین سے کروا دو تا کہ وہ سستے میں چھوٹ جائے۔ باہر کہیں شادی کرتا تو لاکھوں کا تو بیٹی کو جہیز ہی دینا پڑتا۔ سسرال والوں کی ٹلے نویسی (خوشامد) علیحدہ کرنی پڑتی، داماد کی آؤ بھگت علیحدہ ہوتی مگر وہ تو بیٹی کی شادی کر کے یوں فرار ہو گئے جیسے بیٹی کو ٹھکانے لگا کے آئے ہوں۔ وہاں جا کر ایک خط بھی ایسا نہیں لکھا جس میں داماد اور بیٹی کو کراچی آنے کی دعوت دی ہو۔ نہ چوتھی کی دعوت ہوئی، نہ میکے کے چالے ہوئے...... جو بھی دعوتیں ہوئیں ہمارے طفیل گاؤں میں ہوئیں......'' عظمت بیگم کو خاصا غصہ آ رہا تھا۔ فرحت ماں کے پاس آئی تو دل کے پھپھولے (زخم) پھوڑے بغیر نہیں رہ سکیں۔

''نہیں امی! ساری غلطی رشید ماموں کی ہے، انہوں نے ہی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر ہم شجاع بھائی کی شادی نگین سے کر دیں گے تو وہ پچاس کروڑ کی رقم ان دونوں کو دیں گے'' فرحت نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کہاں تو وہ اپنے مرنے کے دن گن رہا تھا اور کہاں اب وہ اپنی صحت یابی کی باتیں بتا رہا ہے۔ وہ نہیں مرے گا، دیکھ لینا......''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ...... ماموں اتنے بیمار ہیں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے، کیسے زندہ رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے فون پر نہیں بتایا تھا کہ کسی وقت بھی ان کی زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔''

''اب اس کے چراغ میں تیل پڑ گیا ہے۔ نہیں بجھنے کا وہ...... دیکھ لینا تم، آسانی سے دس بیس سال اور کھینچ لے گا۔ ہم چلے جائیں گے مگر وہ زندہ رہے گا۔ کمینہ ہمیشہ کا جھوٹا اور مکار تھا۔ مرتے وقت بھی مکاری الما گیا...... اور مجھے تو لگتا ہے اس کے ساتھ فرید بھی شامل ہے، کس آسانی سے اپنی بیٹی کی شادی کر گیا۔''

''امی، آپ مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ آپ دیکھ لیجئے گا، انشاء اللہ بہت جلد رشید ماموں کی طرف ے کوئی خبر آئے گی۔''

''نہیں آئے گی خبر...... خوشی کی خبریں ہمیں اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتی ہیں۔''

''افوہ...... کیوں نہیں ملتی ہیں، آپ کی بہو کی تعریفیں پورا گاؤں کر رہا ہے کہ بہو ہو تو نگین بھابی جیسی......! یا یہ خوشی کی خبر نہیں ہے۔ سچ سچ بتایئے...... ہمارے پورے گاؤں میں کوئی نگین بھابی جیسی حسین بہو ہے؟ جس فل میں وہ جاتی ہیں، چھا سی جاتی ہیں۔ ہر شخص مبہوت سا ہو کر انہیں دیکھنے لگتا ہے۔'' فرحت نے ماں کو جھاتے ہوئے کہا۔

''اونہہ...... خالی خولی شکل کے سوا ہے کیا اس کے پاس؟ اس کی شکل دیکھ کر میں کیا کروں؟ میرا تو پچاس لاکھ کا نقصان ہو رہا ہے۔ میں اپنے دل میں غم پال کر ہونٹوں سے کیسے قہقہے لگاؤں......؟'' عظمت بیگم نے جل کر ت سے پوچھا۔

☆☆☆

عظمت بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ فرحت بھی چپ چپ سی تھی۔

ابھی ابھی رشید بھائی کا امریکا سے فون آیا تھا، ان کی طبیعت مزید بہتر ہو رہی تھی۔ ہربل علاج انہیں موافق آ گیا تھا۔ کہاں تو وہ وہیل چیئر سے خود اٹھ تک نہیں سکتے تھے اور اب وہ چھڑی کے سہارے اپنے قدموں سے چل رہے تھے۔

عظمت، بھائی کی صحت یابی کا سن کر چپ سی ہو گئی تھیں۔ پچاس کروڑ میں آگ لگتی ہوئی۔ انہیں صاف نظر آ رہی تھی۔

”دیکھو ذرا...... یہاں تو ذرا بھی طبیعت خراب ہو۔ ڈاکٹر امید بھی بے شک دلائے مگر بندہ چٹ پٹ ختم ہو جاتا ہے اور وہاں ڈاکٹر تک مایوس ہو گئے، ٹائم تک بتا دیا گیا پھر بھی ان کا ٹائم نہیں آیا......“ عظمت کو غصہ ہی آ رہا تھا۔

”امی...... ہمیں ان کے زندہ رہنے کی خوشی ہے...... مگر وہ باغ جو انہوں نے ہمیں دکھائے تھے...... اس پر عمل تو کریں۔ کیا ہے کہ اگر وہ پچاس کروڑ نہ سہی تو پچیس کروڑ ہی ہمیں دے دیں۔ گو کہ مہنگائی پاکستان میں امریکا سے زیادہ ہے مگر پھر بھی ہمارے کچھ آنسو تو پچھ جائیں گے ناں۔“

”میں تو یہی جانتی ہوں کہ فراڈی لوگ ہمیشہ کے فراڈی ہوتے ہیں۔ جب رشید کے پاس کچھ نہیں تھا، تب بھی فراڈی تھا اور اب، جب بہت کچھ آ گیا ہے تب بھی وہ فراڈ کر رہا ہے۔ اپنا پیسہ دکھا کر لوگوں کو پاگل بناتا ہے اور بس!“

”نگین تو اچھی ہے، آپ کاہے کو غصہ کر رہی ہیں۔ ماموں نے مکان تک تو دے دیا اور کیا چاہیے؟“

”ہاں، میں سوچ رہی ہوں کہ اسے کرائے پر دے دیں تاکہ شجاع کے ہاتھ میں کچھ پیسہ تو آئے۔ زمینیں سنبھالنے کا اپنا خرچہ کم تھوڑی ہے۔“

”آپ نے نگین سے پوچھا؟“

”اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پھر بھی مکان تو اس کو دیا ہے ناں جہیز میں......؟“

”میں اتنا دماغ خراب نہیں کرتی کہ بعد میں وہ میرے سر چڑھ کر بیٹھے۔“ اور فرحت ماں کی بات سن کر بے اختیار ہنس دی۔

اور جب وہ اگلے دن مکان دیکھنے گئیں تو ان کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔ فرید بھائی نے اچھے والے مکان دینے کی بات کی تھی مگر وہ جو کاغذات دے کر گئے تھے، وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جیسے مکان کے تھے، جو مکان کے نام پر دھبا تھا۔

انہیں یہ گمان گزرا کہ شاید یہ سب غلطی میں ایسا ہو گیا ہے۔ وہ بڑے مکان پر خود ہی پہنچ گئیں تو جا کر پتا چلا کہ فرید احمد نے اپنا وہ مکان اپنے کرائے داروں کو ہی بیچ دیا ہے اور شادی کے موقع پر وہ اپنے مکان کے پیسے بھی

ر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ اب نگین کے جہیز کا مکان جو کسی کھنڈر کا نمونہ تھا، اسے دیکھ کر کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔

”رتا یہ حرکت وہ غیروں میں تو اگلے دن ہی وہ لوگ اس کی بیٹی کو گھر پہنچا دیتے۔“ وہ بلند آواز میں نگین کو لی تھیں۔

لو اس انداز میں دیکھ کر وہ سہمی جا رہی تھی۔ ”اب لوگ رشتے داری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک تو لی بی بی، ان پر احسان کیا اور وہ اس احسان کا صلہ یہ دے کر گیا ہے کہ ایک کھنڈر ہمارے سر منڈھ گیا ہے ا ثار قدیمہ کا محکمہ ہمارے پاس آ گیا ہو اور ہر ٹوٹی پھوٹی چیز ہم نے سنبھال کر رکھنی ہو۔“

”اماں، کیوں شور مچا رہی ہو خواہ مخواہ...... اس میں بے چاری نگین کا کیا قصور؟“

”قصور یہ ہے کہ وہ فرید کی بیٹی ہے۔“

”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”یوں نہیں ہو سکتا۔ نگین اپنے باپ کو خط لکھ کر بتائے کہ پھپھو کے ساتھ جو وہ بے ایمانی کر کے گئے ہیں اس وہ ناخوش ہیں۔ فوراً یہاں آئیں اور کوئی اچھا سا مکان خرید کر دیں...... تاکہ مکان کا کرایہ ہی ملے۔“

”چھوڑیں اماں یہ باتیں، مجھے کوئی مکان دکان نہیں چاہیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہر چیز دے رکھی ہے“ ع نے ماں کو پانی کا کٹورا دیتے ہوئے کہا۔

”پھر رہنا کنوئیں کے مینڈک بن کر...... جن میں آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو وہ ایسے ہی بولتے ہیں۔ ابھی تم لو پہ ہو گے، تو دیکھوں گی کہ کیسے خرچہ پورا ہوگا؟“

”آپ کے پاس پچاس کروڑ بھی تو آئے گا۔ وہ کہاں خرچ کریں گی؟“ شجاع نے طنز سے ہنس کر کہا۔

”یرا تو میکا ہی فراڈی لوگوں کا ہے۔ بھائی رشید نے خواہ مخواہ پیسے کی روشنی دکھا کر دیا تک گل کر دیا۔ ارے تھوڑی اس سے کہا تھا کہ اپنی جائیداد میں سے ہمارے بچوں کو بھی کچھ دو۔ یہ خناس تو خود اس کے اپنے ں آیا تھا۔ صبح و شام فون کر کر کے ہماری زندگی اجیرن کر دی تھی اور جب ہم نے اس کی بات مان لی تو دیکھو صاف جھنڈی دکھا گیا۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے یہ جان لیوا مذاق جان بوجھ کر کیا تھا۔ کوئی بیمار ویمار نہیں ہوا ہاں سے جب گیا تھا تو خوب ہٹا کٹا (صحت مند) سا تھا۔ یہ ایکا ایکی ایسی بیماری آ گئی کہ دماغ تک لوٹ ں ہی پاگل تھی جو اس کی ہر بات کو سچ سمجھ بیٹھی ورنہ عقل کی بات تو یہ تھی کہ مرتے وقت بندہ اپنے بچوں کے ں سوچتا ہے، خاندان والوں کو کون نوازتا ہے...... جو اس نے ایسے اینگے بینگے (الٹے سیدھے) ہمیں فون

”

☆☆☆

اور ماں کے ساتھ اسپتال آیا تھا۔ اس کی فرسٹ کزن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹا اسپتال کی اتر رہے تھے کہ نیچے سے فہمی اور فہد اوپر کی جانب جاتے ہوئے عین ان کے سامنے کھڑے تھے۔

”السلام علیکم آنٹی!“ فہمی کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ منگنی کی تقریب اور آنے جانے سے وہ ان سے خاصی حاصل کر چکی تھی۔

”علیکم السلام“ وہ کھڑتل لہجے میں بولیں۔ (اکھڑ لہجہ)

”آپ یہاں کیسے؟“ فہمی نے کھسیا کر پوچھا کہ وہ عین اس کے سامنے رکی کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔

’’نگین کی شادی کس سے ہوئی؟‘‘ فہمی کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے بے اعتنائی طرح پوچھا جیسے کہہ رہی ہوں، کیا آج گرمی بہت ہے؟

’’ہمارے پھوپی زاد شجاع سے ہوئی ہے اور وہ وہیں گاؤں میں رہتی ہے۔‘‘ فہمی نے سادگی سے

’’پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا‘‘ وہ استہزائیہ لہجے میں کہتے ہوئے زبور کو دیکھ کر مسکرائیں اتر گئیں۔

فہمی بھونچکی سی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ سیڑھیوں کے موڑ پر زبور نے پلٹ کر دیکھا اور نفرت کی لہر ہوئی گزر گئی۔

’’اب اوپر بھی چلوگی یا یونہی کھڑی رہوگی؟‘‘ فہد نے فہمی سے کہا۔

’’کتنی بدتمیز عورت تھی، یہ زبور کی اماں!‘‘

’’یہ تو شروع سے ہی تھی، تمہیں آج پتا چلا ہے۔‘‘ فہد ہنسا۔

’’نہیں، شروع میں ایسی نہیں تھیں، نگین کو دیکھ کر بہت صدقے واری جاتی تھیں...... اور اب یکدم ان کیسا عجیب سا لگا۔‘‘

’’تم لوگوں نے کون سا ان کے ساتھ اچھا رویہ اپنایا تھا۔ منگنی انہوں نے تھوڑی توڑی تھی، پھوپو تھی...... اور اب تم چاہتی ہو کہ وہ نگین اور اس کے شوہر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کرتیں۔‘‘

’’چلو وہ نہ کرتیں...... مگر یہ کیوں کہا کہ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا؟‘‘

’’وہ اس لیے...... کہ وہ گاؤں کے ہی قابل تھی۔ کراچی شہر کے کسی امیر زادے کی بیوی بننے کی تھی۔‘‘

’’یہ تو تکبر کی بات کی انہوں نے۔ یہ بات تو کسی کو نہیں پتا ہوتی کہ اس کا نصیب کس کے ساتھ ہے۔‘‘

’’زبور کی ماں کا اسٹائل ہی ایسا ہے، پہلے جب وہ محبت کے پھول برساتی تھی...... اس وقت بھی مجھے ان لہجے میں دوغلے پن کا احساس ہوتا تھا۔‘‘

’’زبور کو دیکھا تھا آپ نے، کس انداز میں ہمیں دیکھ رہا تھا؟‘‘

’’ہاں، سب دیکھا تھا...... ایسے ہی جیسے کسی غریب ملک کو امیر ملک دیکھا کرتے ہیں‘‘ فہد نے ہنس کر کہا۔

’’افوہ...... میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر رخسانہ نے چیک اپ کر کے کہا ہے کہ بچہ کمزور دوائیں لینی ہوں گی۔‘‘

’’تم یہیں رکو، میں اوپر اسٹور سے لے کر آتا ہوں۔‘‘

’’نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔‘‘

’’تھک جاؤ گی تم...... میں نے غلطی کی تمہیں نیچے ہی چھوڑ کر آنا چاہیے تھا۔‘‘

’’نہیں، میں اب اکیلی کھڑی نہیں ہوسکتی۔‘‘

’’کیوں، کیا بات ہے؟‘‘ فہد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

’’کہیں سے زبور کی ممی نظر آگئیں تو میرے مساموں سے پسینہ تو بارش کی طرح بہنے لگے گا۔‘‘

’’کیوں، ڈر گئیں ان سے؟‘‘ فہد ہنسا۔

’’ہاں، پتا نہیں کیوں...... مجھے ان سے خوف سا محسوس ہوا۔‘‘

’’اتنی خوبصورت عورت سے تمہیں خوف محسوس ہوا؟‘‘

’’ہاں، ان کی فوں فاں سے۔ ان کے تمسخر بھرے استہزائیہ لہجے سے۔ ان کے تکبر بھرے برتاؤ سے اور زبور کی آنکھوں کی نفرت سے۔ ایسی نفرت سے وہ ہمیں دیکھ رہا تھا کہ مجھے جھرجھری سی آگئی تھی۔‘‘

’’اب بے کار کی باتوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ ڈاکٹر نے خاص طور پر کہا ہے کہ خوش رہو۔ کسی قسم کی ٹینشن اپنے اوپر سوار مت کرو۔ اس سے بچے کی صحت پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔‘‘

☆☆☆

’’سنیے...... مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ نگین گاؤں میں گھبرا رہی ہے......‘‘ فیروزہ بیگم نے شوہر سے کہا۔

’’کیا اس نے ایسا کہا تم سے؟‘‘

’’نہیں، فون پر تو اس نے ایسی کوئی بات مجھ سے نہیں کی۔‘‘

’’وہ کیا کہہ رہی تھی، جس سے تم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ گھبرا رہی ہے؟‘‘

’’نگین کہہ رہی تھی...... امی آپ مجھے بے حد یاد آرہی ہیں۔‘‘

’’تم بھی پوری ہی پاگل ہو......‘‘ فرید احمد نے ہنس کر کہا۔

’’کیوں، اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ بیٹیاں ماں کا ہڑکا کیا کرتی ہی ہیں۔‘‘

’’نگین کے اس جملے سے کہیں بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ وہ وہاں گھبرا رہی ہے۔‘‘

’’مگر وہ بھی گاؤں میں کہاں رہی ہے؟‘‘

’’میں اپنی بیٹی کی طبیعت سے واقف ہوں، وہ ہر حال میں گزارہ کرنے والی لڑکی ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اسے بھول جائیں۔‘‘

’’یہ میں نے کب کہا ہے؟‘‘

’’نگین کی شادی کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی کراچی نہیں آئی ہے۔ اسے کراچی تو بلالیں۔‘‘

’’میں چاہتا ہوں کہ اس کا دل اپنی سسرال میں خوب رچ بس جائے...... وہ لڑکیاں جو بھاگ بھاگ کر اپنے میکے میں آتی ہیں، ان کا سسرال میں گزارہ مشکل سے ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’آپ کی بہن اچھی خاصی تیز ہیں۔ مجھے تو ہر وقت یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ نگین کو تنگ نہ کر رہی ہوں، یوں بھی بھائی رشید تو شادی کروا کے سب کو بھولے بیٹھے ہیں، نہ فون کرتے ہیں نہ خط کا جواب دیتے ہیں اور اگر ہم فون کریں تو ریسیو تک نہیں کرتے۔ ان کی آنسر مشین یہی جملے الاپتی ہے کہ مسٹر رشید گھر پر نہیں ہیں، آپ اپنا پیغام ریکارڈ کرادیجیے۔‘‘

’’ہاں، بھائی رشید نے بھی عجیب مخمصے میں ڈال کے رکھ دیا۔ کہاں تو پچاس کروڑ روپے دینے کو ایسے بے چین ہو رہے تھے اور اب شادی پر پانچ دس لاکھ بھی نہیں بھیجے۔ کچھ تو آنسو پچھ جاتے۔‘‘

’’مجھے تو اس میں بھی تمہاری آپا کی کوئی چال لگتی ہے۔‘‘

’’چال کیا ہوگی...... وہ بے چاری بھی سناٹے میں آگئی ہیں۔‘‘

’’اس سے اچھا تھا کہ ہم نگین کی شادی زبور سے ہی کر دیتے۔ ہماری بیٹی کو پسند بھی تھا اور وہ لوگ پیسے کے

لحاظ سے کوئی کم تو نہیں تھے۔“

”زیور تو اچھا لڑکا تھا...... مگر مجھے اس کی ماں چالباز سی لگتی تھی ...... بات کرتے ہوئے نگاہ دوسری جانب رکھتی تھی...... جس سے مجھے عجیب سبکی کا احساس ہوتا تھا...... کئی بار مجھے یوں لگا جیسے وہ کوئی احسان کر رہی ہو۔“

”تمہارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ نگین کا رشتہ جس چاؤ سے انہوں نے مانگا تھا، اتنی محبت سے تو بھائی جان نے بھی نُہی کو نہیں مانگا تھا۔“

”تمہارے خاندان کے لوگ شروع سے ہی تیز طرار ہیں۔ ہم نے بھی صرف فہد کو ہی دیکھا، وہ لڑکا واقعی ہیرا ہے ورنہ تمہاری بھاوج جیسی چلتر عورت مجھے کبھی پسند نہیں رہی۔“

”توبہ ہے، بات کیا ہو رہی تھی اور آپ اسے کہاں لے گئے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ کیوں نہ ہم نگین کو کچھ دنوں کے لیے کراچی بلالیں۔“

”بلالو...... بلکہ یوں کرو کہ تم ایک خط آپا کو لکھ دو کہ نگین اور شجاع کو کچھ دنوں کے لیے کراچی بھیج دیں بلکہ آپ بھی ان کے ساتھ آجائیں۔“

”سنیے...... میں اپنی بیٹی کو اپنے پاس اس لیے بلا رہی ہوں کہ وہ سسرال کے ماحول سے کچھ دن بچی رہے۔ اس کی ٹینشن دور ہو۔ اگر آپا کو بھی بلالیا تو اسے کیا فرق پڑے گا۔ جن لوگوں کی شکلیں وہ صبح و شام دیکھ رہی ہے، یہاں آ کر بھی وہ انہیں ہی دیکھے۔ آپ کا بس چلے تو فرحت اور اس کے بچوں کو بھی ساتھ ہی بلالیں کہ گرمیوں کی چھٹیاں ہیں، یہاں آ کر اپنی تعطیلات گزار لیں۔“

”پوری پاگل ہو تم ...... لکھنے سے وہ کوئی آ تھوڑا ہی جائیں گی مگر یہ تمیز ہوتی ہے کہ بزرگوں کو اہمیت دی جائے۔ ان کو ہم بلائیں گے تو وہ بس خوش ہو جائیں گی۔“

”ارے چھوڑیئے آپ، گاؤں کے لوگ ہر بات کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ نگین سے پہلے وہ دوڑی چلی آئیں گی۔“

”لگا لو شرط، ایسا نہیں ہوگا۔“ بیوی کی بات سن کر فرید الدین خوش دلی سے ہنس کر بولے۔

”میں خط لکھ رہی ہوں...... آپ دیکھ لیجیے، خط کے جواب میں آپ کی آپا بیگم یہاں اپنے ڈھائی من کے وجود کے ساتھ موجود ہوں گی۔“ فیروزہ نے چڑ کر جواب دیا۔

☆☆☆

عظمت بیگم کو اب ہنستی کھلکھلاتی نگین سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ کہاں تو شجاع اتنا اکھڑ مزاج کہ ہر معاملے میں اپنی چلاتا تھا اور اب وہ ہر بات نگین کی مان رہا تھا۔

”شجاع، میں نے اپنے لیے تو کریلے بنائے ہیں۔ تو بتادے کیا کھائے گا؟ کریلے تو، تو نے کبھی چکھے نہیں...... یہ بتادے کہ آج گوشت میں کیا ڈالوں؟“

”ارے واہ پھپو! کریلے کی سبزی تو اتنے مزے کی ہوتی ہے، میں تو وہی کھاؤں گی۔“ نگین نے بے ساختہ کہا۔

”ٹھیک ہے اماں، میں بھی کریلے ہی کھا لوں گا۔“ شجاع نے نگین کو دیکھتے ہوئے مسکرا کہا۔

”زن مرید کہیں کا...... اب جو بیوی کھائے گی، وہی تو بھی کھائے گا؟“

”تو اس سے کیا ہو جائے گا؟“ اب وہ حیرت سے ماں کو تک رہا تھا۔ ”کیا میں نے کوئی گناہ والی بات کہہ

کیا انسان کی پسند ناپسند بدلتی نہیں رہتی۔“

”اتنی تیزی سے نہیں بدلتیں ...... جتنا تیز تو دوڑ رہا ہے۔“

نگین ماں بیٹے کو الجھتا دیکھ کر باورچی خانے کی طرف چل دی کہ اس سے قبل وہ بیٹھی رہی تھی تو عظمت بیگم ے اسی بات پر رگید دیا تھا۔

”اے ہے...... تم ماٹھی سی بیٹھی ماں بیٹے کی لڑائی کا سواد اٹھا رہی ہو۔“

”نہیں پھوپو!“ وہ روہانسی سی ہو گئی۔

”اب شہری چلتر یہاں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ وہ پہلے ہی وہاں سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی، جہاں گوشت، قیمہ...... کریلے، سب پڑے تھے۔ گوشت دھونے کے لیے تھیلی اس نے پیالے میں رکھ کر سنک میں رکھی تو عجیب متلی سی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

”پھپو......!“ ایک بے اختیاری چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور اس نے دیوار کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

عظمت بیگم کے ساتھ شجاع بھی بھاگا چلا آیا۔ وہ چند منٹوں میں ہی پسینے پسینے ہو چکی تھی اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ دونوں نے پکڑ کر اسے بستر پر لٹایا۔

”کیا ہوا نگین تمہیں؟“ شجاع پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

”پہلے گوشت کی خوشبو بری لگی پھر متلی سی ہوئی اور اس کے بعد چکر سا آ گیا۔“

”چلو، جلدی اٹھو...... میں تمہیں کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی......“ شربت کا گلاس نگین کو دیتے ہوئے عظمت مسکرا کر بولیں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، بیمار کو کیا ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جانا چاہیے؟“ شجاع نے ناراض سے لہجے ماں سے کہا۔

”اس وقت تو بالکل بھی نہیں“ انہوں نے اس کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر...... کیوں......؟“ وہ حیرت اور رنج سے ماں کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کل میں خود لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گی چیک اپ کے لیے کہ خوشی کی خبر ہے...... اب تو باپ والا ہے۔“

”ارے کیا واقعی......!“ وہ مسرت سے بولا اور پھر شرما کر باہر نکل گیا۔

اور پھر فوراً ہی اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں فیروزہ بیگم کا لکھا خط تھا جو ڈاکیہ اسے دے کر گیا تھا۔

”لو تمہارا خط آیا ہے“ شجاع خط دے کر پاس ہی بیٹھ گیا۔

”امی نے ہم سب کو بلایا ہے“ نگین نے خط پڑھ کر شجاع کو پکڑا دیا۔

”اماں...... آپ کو بھی بلایا ہے ممانی نے“ شجاع نے خط پر سرسری سی نظر ڈال کر ماں سے کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو عظمت بیگم اس بات پر خوب سناتیں کہ فیروزہ کو اتنے عرصے بعد اپنی بیٹی یاد آئی ہے۔ ادی کے نام پر کیا بیٹی کو پھینک کر گئی تھیں جو اسے بلاوے کا خط تک نہیں لکھا تھا۔

”امی نے آپ کو بھی بلایا ہے“ نگین نے ان سے کہا۔

”کیوں......؟“ وہ اپنی رکھائی زیادہ دیر نہیں چھپا سکیں۔

"کراچی میں گھومنے پھرنے کے لیے۔"

"مجھے نہیں ہے شوق ماری ماری پھرنے کا اور اب تو تمہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔"

"وہ کیوں......؟" نگین کا چہرہ مغموم سا ہو گیا۔

"شروع کے کچھ دنوں میں سفر نہیں کرتے...... نعمی کا حال بھول گئیں...... اپنی چلائی تھی تو کیسے خالی ہاتھ ٭ گئی تھیں" تب نگین سوچنے لگی کہ یہی پھپو پہلے ممانی جان کو صلواتیں سنا رہی تھیں اور آج ان کی ہمنوا بن گئیں (ایک بات میں کتنے رنگ بھرنا وہ جانتی تھیں)

"اتنے دن ہو گئے...... میں کراچی نہیں گئی...... لوگ اتنے یاد آ رہے ہیں مجھے" وہ معصومیت سے بولی۔

"تمہاری ماں نے کہاں بلایا تمہیں...... پتا نہیں کیسی مائیں ہیں آج کل کی...... نہ دل میں ارمان، نہ جوش وہ شادی کر کے جو بھاگیں تو لوٹ کر خبر نہ لی...... اور اب میں نہیں جانے دوں گی۔"

اور نگین اپنے آنسو اپنے حلق میں سٹک کر مسکرانے لگی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں اماں...... ان دنوں احتیاط زیادہ رکھتے ہیں" شجاع نے اسے وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے" اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے؟"

"اب جو بھی دل چاہے...... ان سے کہاں اٹھا جائے گا، میں پکا کر بھیجتی ہوں۔" عظمت بیگم ایک طائرانہ سی نظر نگین پر ڈال کر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

تکبر میں انسان کی بینائی سب سے پہلے کمزور ہو جاتی ہے کہ اپنے سامنے اسے نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی کچھ سجھائی دیتا ہے۔

ہر شخص اپنے سے چھوٹا...... کمزور اور بے مایہ لگتا ہے۔ اور وہ خاندان جہاں تعلیم کی کمی ہو...... وہاں تو تکبر کے تماشے چھچھورپن کی انتہا تک کو پہنچ جاتے ہیں۔

ثریا کی بیٹی ثنا کا جب سے میڈیکل میں داخلہ ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھی اعلیٰ وارفع سمجھنے لگی تھیں۔ جہاں بھی جاتیں، ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ آپ کی لڑکیاں ڈاکٹر بن رہی ہیں یا نہیں اور اگر نہیں بن رہیں تو کیوں نہیں بن رہیں۔

اپنی بھتیجی کے انٹر میں ڈی گریڈ آنے پر وہ خاصی تمسخر آمیز گفتگو کر رہی تھیں کہ اگر تمہارے پاس دماغ ہوتا تو تمہارا اے ون گریڈ آتا۔ اب تو تم ڈاکٹر بننے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتیں۔

"پھپو! میں مریض بننا چاہتی ہوں تاکہ ثنا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھے۔" بھتیجی نے مذاق میں ہی کہا تھا مگر ثریا کے تو آگ ہی لگ گئی۔

"ارے جاہلوں کا ماحول ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ کھا لیا، پہن لیا خوش ہو گئے۔ زیادہ سے زیادہ تم کر ہی کیا سکتی ہو۔ تھرڈ ڈویژن میں انٹر، جس کی نہ کوئی اوقات نہ ویلیو۔ ہم نے اپنی بیٹی کو پڑھاتے وقت اپنا آپ مار لیا تھا۔ پانچ پانچ ہزار کی ٹیوشن لگوا کر دی تھیں۔"

"اور آؤٹ پرچہ حاصل کرنے کے لیے کتنے پیسے دیے تھے؟" بھتیجی نے پھر گرہ لگائی۔

"پلیز، یہ پرچوں کا حصول...... تم جیسوں کے لیے ہی ہے...... جنہیں آگے بڑھنا ہی نہیں ہے۔ جنہیں میاں کی دو روٹی، دو جوتی اور دو گالیاں کھاتے رہنا ہے۔ ڈاکٹروں کی زندگی ایسی نہیں ہوتی، وہ خود کماتی ہیں پنا من خرچ کرتی ہیں۔ ان کے رشتوں کے لیے قطار بنا کر لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔" ثریا کے منہ میں ، ہاتھا، بکے چلی جا رہی تھیں۔

"افوہ...... تم بھی کس سے منہ ماری کرنے بیٹھ گئیں، ذرا سی بچی کے منہ لگ رہی ہو؟" ثریا کی بھاوج نے بہلاتے ہوئے کہا۔

"بات تو دیکھو اس کی کہ ڈی گریڈ آنے پر بجائے شرمندہ ہونے کے، باتیں بنا رہی ہے اور مقابلہ کر رہی ہے۔ ارے اس کا اس سے کیا مقابلہ...... وہ تو ڈاکٹر بن رہی ہے۔"

"میں تو کہہ رہی ہوں کہ بی اے میں داخلہ لے لو مگر یہ کہہ رہی ہے کہ پہلے سی ٹی کروں گی۔"

"ہاں ٹیچر بھٹیچر بننا ہے تو سی ٹی کر لے" ثریا تکبر سے بولیں۔

"ارے آپا، کیا کہہ رہی ہیں...... لڑکیوں کے لیے ٹیچنگ تو بہت اچھا شعبہ ہے۔"

"ہوگا...... ملتا کیا ہے ٹیچروں کو...... سر کے درد کا عارضہ علیحدہ میں۔ چیخ کر بولنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ نہ لہجے میں لچک ہوتی ہے نہ ملائمت۔ مجھے اچھی نہیں لگتیں یہ جھکی قسم کی ٹیچریں جو کسی کی بات سے اتفاق کرنا ہی نہیں جانتی ہیں۔"

"نہیں آپا، ایسا تو نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں، تمہیں کیا پتا، تم نے کون سی دنیا دیکھی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ دیکھ بھال کر کے لائقہ کی شادی کر دو۔"

"ارے، یہ تو ثنا سے بھی چھوٹی ہے عمر میں، اتنی سی عمر میں کیسے شادی کر دوں؟"

"افوہ...... ایک تو موٹی عقل ہے تمہاری...... بھلا ثنا کا لائقہ سے کیا مقابلہ۔ وہ تو ڈاکٹر بن رہی ہے۔ اس کی شادی کا تو کوئی مسئلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مسئلہ تو تمہاری بیٹی کا ہے۔ انٹر تھرڈ ڈویژن کو کون قبولنے آئے گا۔ اچھا ہے، جلدی سے فارغ ہو جاؤ ورنہ کہیں اوور ایج ہو گئیں تو تیرے میرے کی خوشامدیں کرنی پڑیں گی کہ اللہ کے واسطے ہماری بیٹی کے لیے کوئی رشتہ بتا دو۔"

"اللہ نہ کرے، آپا! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بچی کے سامنے۔" انہوں نے پیلی پڑتی لائقہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اور ثریا اونہہ کہہ کر آنچل جھٹک کر گردن تان کر اٹھ کھڑی ہوئیں جیسے انہوں نے لائقہ کا مستقبل جھانک کر دیکھ لیا ہو اور قبل از وقت ماں بیٹی کو بتا کر حیران کر دیا ہو۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی کا عمل ہوگا منور اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ یکدم اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ وہ سوتے سے ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں بند کیے کیے موبائل کانوں سے لگا کر نیند بھری آواز میں بولا۔

"ہیلو!"

"آپ اتنی جلدی سو جاتے کیا؟" رعنا کی کھلکھلاتی آواز ابھری۔

"ہاں...... رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ ابھی آنکھ لگی تھی میری...... اور لے کر تم نے مجھے جگا دیا۔"

''آپ نے فون کیوں نہیں کیے میرے کو؟'' رعنا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''فائنل امتحان نزدیک ہیں۔ کل بھی میری پریزنٹیشن ہے۔'' منور نے جمائی بھری۔ یوں بھی صبح تڑکے وہ جاگ رہا تھا۔

''یہ سوب تو چلے گا...... مگر فون تو کرنا تھا ناں آپ کو۔''

''کیا اسی لیے فون کیا ہے؟'' منور کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا۔

''ہاں...... اس واسطے بھی......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''منگنی کے بعد آپ میرا حال کیوں نئیں پوچھے۔''

''کیوں، بخار و خار آ گیا تھا کیا؟''

''توبہ میری...... باتاں کاں سے کاں لے جاتے آپ...... میں آپ کی منگیتر ہوں ناں......''

''ہاں، یہ سانحہ تو ہو گیا ہے میرے ساتھ'' منور شرارت سے بولا۔

''تو میری حسمت ایسی...... کہ منگیتر جی...... دو بول نخیتاں کے بی نکو کرتے......''

''فلم لائن میں چانس نہیں ملا...... ورنہ تم تو کیا تمہاری ساری سہیلیاں خوش رہتیں۔''

''میری سہیلیاں خوش رہتیں......!'' وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔

''اور کیا...... تم سب سے فخر سے کہا کرتیں کہ تمہارا منگیتر جیسا رومانٹک کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''یہ تو برابر ہے (ٹھیک ہے)'' وہ ناسمجھی سے الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''رعنا، ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گی؟''

''نکو جی...... آپ ایسا کائے کو سوچتے۔'' (زعم بھرے لہجے میں کہا گیا)

''تم یہ فون دن میں نہیں کر سکتی تھیں؟''

''دن میں بھی کروں گی ناں......'' (اس نے بات کا مفہوم ہی تبدیل کر دیا)

''اس وقت کیا مار آئی تھی...... جو مجھے جگایا تم نے؟'' وہ ڈپٹ کر بولا۔

''اللہ جی، کیسے بول رئے آپ؟''

''کیا بات ہے، بولو......'' وہ اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''آپ کیا کیا چیزاں شوخ (شوق) سے کھاتے ہیں؟''

''کیوں......؟''

''میں معلوم کرنا چاہتی ہوں ناں...... تا کہ میرے کو بی پتا لگے کہ ہم دونوں میں کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے۔'' رعنا نے بقراطی لہجے میں کہا۔

''اچھا، آپ کے خیال سے کھانے پینے کی یکسانیت ذہنی ہم آہنگی کی دلیل ہے؟'' منور نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''ہور کیا...... ایسا ہی اچ ہوتا ہے زندگی میں...... اب خالہ جی کھٹی دال، چاول کھاتے۔ خالو جی کو یہ سب اچھا نئیں لگتا...... تو ہر وخت ہڑا ہڑی رہتی ہے ناں آپ کے گھر میں......'' رعنا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا کیا پکانا آتا ہے؟'' منور کی آنکھوں سے نیند تو اڑ ہی گئی تھی، اب اسے بھی رعنا کو

کلساتے ہوئے مزہ آ رہا تھا۔

''میرے کو تو سوب چیزیں اچھی لگتی ہیں۔'' وہ کھلکھلائی۔

''جب ہی تو موٹو ہو رہی ہو...... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ پکانا کیا کیا آتا ہے؟''

''یوں تو اپنی امی جی سے پوچھ کے میں سوب پکا لیتی مگر آلو گوش، پالک گوش، کڑھائی گوش، مٹر گوش، بھنا گوش زیادہ اچھا بنا لیتی۔''

''یہ گوش، گوش کے علاوہ بھی کچھ پکانا آتا ہے؟''

''ہاں آتا ہے مگر گوش میں بہوت شوق سے کھاتی ہوں ناں......'' رعنا نے شرمائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی۔

''مگر میں وجیٹیرین ہوں...... گوشت برائے نام صرف چکھتا ہوں...... آئی سمجھ!''

''آپ کے واسطے دالاں پکاؤں گی، کوتھ میر (ہرا دھنیا) کی چٹنی بناؤں گی۔''

''پلیز دن میں بتانا...... اس وقت تین بجنے والے ہیں، تھوڑی دیر مجھے سونے دو۔ ہاں، آئندہ رات کو مجھے تنگ نہیں کرنا۔''

''اگر تنگ کری تو......؟''

''موٹو...... تمہاری شکایت خالہ جان سے کر دوں گا۔ مجھے تو خواہ مخواہ امی نے پھنسا دیا۔''

''کیا بولے آپ...... آپ کی مرضی نہیں تھی کیا؟''

''ہاں...... ابھی میں پڑھ رہا ہوں، اس جانب سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''کہیں آپ کسی کو اپنا دل اچ تو نکو دے دیے۔''

''ان خرافات کی فرصت نہیں ہے مجھے۔''

''تو میں کیا خصور (قصور) کری جو آپ ایسا بول کے بول رہے۔''

''قصور تمہارا نہیں، میرا ہے...... جسے میں اپنی بات سمجھانے پر بھی قادر نہیں ہوں۔''

''کیا اب آپ خادر (قادر) بھائی کو بولو گے...... اللہ ایسا نکو کرنا آپ، میں اپنے ہاتاں جوڑتی جی!''

''او کے...... اللہ حافظ۔'' منور نے گہرا سانس لے کر فون کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

کبھی کبھی دل بے چین سا ہو جاتا ہے۔ نہ کھانے میں مزہ آتا ہے، نہ پینے میں...... نہ آرام میں نہ کام میں......!

یہی صورت حال فہمی کی ہو رہی تھی...... جوں جوں دن گزر رہے تھے، اس کا ڈیپریشن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کو بتایا تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان دنوں اکثر حاملہ خواتین کو ایسا محسوس ہوتا ہے...... مگر یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، آپ کوئی بھی بات منفی انداز میں نہ سوچا کریں۔

مگر وہ کیا کرتی؟ چمکتا دمکتا آسمان بھی اسے کالی بدلیوں سے ڈھکا نظر آتا۔ یقیناً دوسرے کمرے میں اس کا ہی ذکر ہوا ہوگا۔ ماموں، ممانی اس کا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔

فہد کسی بات پر خاموش ہوتا تو وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگتی۔ وہ خوش ہوتا تو وہ وجوہات تلاش کرنے لگتی۔

پانچواں مہینہ چل رہا تھا مگر اس کی بے کلی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دن فہد کو گھر آنے میں دیر ہوئی تو اس کا

ذہن کہاں کہاں چلا گیا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ اپنی چوڑیاں توڑ کر سفید کپڑے تک پہن بیٹھی تھی اور جب وہ رات گئے آیا تو اسے دیکھ کر اتنا روئی کہ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”بائیک ہی خراب ہو گئی تھی، ویک اینڈ کی وجہ سے کوئی مکینک ہی نہیں ملا۔ کھینچ کر پیدل چلتا ہوا آیا ہوں۔“ مگر اس کے تو آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ کتنے عذاب وہ سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ ممانی جان اس کی یہ کیفیت دیکھ کر جز بز سی ہو رہی تھیں۔ ایسی تو وہ لیک تنی نہیں تھی جیسی وہ اس وقت ہو رہی تھی۔ فہد سے بات کرتے ہوئے آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے۔

”جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو، کیوں اپنی طبیعت خراب کرنا چاہتی ہو۔“ انہوں نے لہجے کو حتی الامکان نرم کرتے ہوئے کہا اور وہ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اندر چلی گئی۔

”کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ فہد نے ماں سے پوچھا۔

”اسی سے جا کر پوچھ لو...... میرے علم میں تو نہیں ہے۔“ انہیں بیٹے کی اس جرح پر غصہ ہی تو آ گیا۔

”پھر کیوں یہ آنکھیں سجائے بیٹھی ہے؟“

”جب مجھے معلوم ہی نہیں تو کیا بتاؤں...... “ وہ پیر پٹخ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ”لو اب اپنی اولاد کو بھی تاویلیں دیتے پھرو کہ ہم نے تمہاری بیوی پر کوئی ظلم نہیں ڈھائے“ جاتے ہوئے وہ خاصی اونچی آواز میں بڑبڑا رہی تھیں۔

فہد یہی سوچتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا کہ آج اس کی غیر موجودگی میں ساس بہو کے مابین کوئی معرکہ ہوا ہوگا مگر جب وہ کمرے میں آیا تو فہمی کھانا میز پر سجائے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم نے ابھی تک نہیں کھایا کھانا......؟“ اس نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے بغیر کبھی کھایا ہے، جو آج کھا لیتی؟“

”مگر اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے؟“

”تو کیا ہوا......“ اس نے بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر دیکھا۔

”اس حالت میں تمہیں بھوکا نہیں رہنا چاہیے۔“

”بس میرا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔“

”امی نے کچھ کہہ دیا تھا؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ممانی جان تو میرا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔“

”تو پھر یہ چھم چھم نیناں کیوں برسے؟“

”پتا نہیں۔“

”رو کر دل ہلکا ہو گیا؟“ وہ ہنسا۔

”میں جان کر تھوڑی روئی تھی، بس خود بخود آنسو چلے آ رہے تھے۔“

”آئندہ یوں مت رونا۔ یہ آنکھیں رونے کے لیے نہیں ہیں۔“

اور فہمی رضامندی سے سر ہلاتے ہوئے مسکرانے لگی مگر اسی شب نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا، وہ بے چین ہو کر اٹھی۔ سر یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ کسی جھولے میں بیٹھی چکرا رہی ہو اور درد کی تیز لہر نے اس کو بے کل کر دیا تھا۔

”فہد اٹھو...... مجھے پانی پلا دو۔“ مہین سی آواز میں اس نے پکارا اور وہیں اس کے پیروں پر ڈھے گئی۔

فہد پریشان ہو کر اٹھا تو وہ بے حال تھی۔ ممانی جان کو ساتھ لے کر اسی وقت اسپتال پہنچا تو اس وقت تک وہ گوہر مقصود کھو چکا تھا۔

ضائع ہونے والا بچہ لڑکی کی صورت میں تھا۔ ممانی جان کے آنسو کسی صورت نہیں رک رہے تھے اور وہ چپ چاپ ساکت سی بستر پر لیٹی یوں دیکھ رہی تھی کہ اس دفعہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی جو وہ یوں خالی ہاتھ رہ گئی [illegible]؟ ہر جگہ کا آنا جانا اس نے چھوڑ رکھا تھا۔ ممانی جان کی ہر ہدایت پر وہ عمل پیرا تھی پھر بھی وہ تہی دست رہی تھی۔

اگلے دن صبح سویرے ہی فیروزہ بیگم بٹی کے پاس آ گئی تھیں۔

”لگتا ہے میری بٹی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ماشاء اللہ بچہ صحت مند تھا، ڈاکٹر مطمئن تھی...... یہ آنا فانا ضائع ہو جانا تو سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کس کی لگے گی نظر، میں نے تو اسے کہیں جانے ہی نہیں دیا تھا۔ گھر میں ہی رہتی تھی۔ بس مجھے تو لگتا ہے کہ میرے گھر کا آنگن سونا ہی رہے گا اور میں پوتا پوتی کی آس لیے ہی چلی جاؤں گی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی آپ...... یہ بس اتفاق ہی ہے کہ ایسا ہو گیا...... ورنہ سب ہی کے بچے ہوتے ہیں۔“

”نہیں فیروزہ، یہ بات نہیں ہے۔ پوچھ لو تم فہمی سے، میں نے تو اسے ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا تھا۔ گھر کا کوئی کام تک اس سے نہیں کروا رہی تھی۔ ٹرے سجا کر کھانا دیتی تھی۔ ماہانہ چیک اپ میں بھی بچے کی کنڈیشن بالکل صحیح تھی مگر ایکا ایکی بلڈ پریشر اتنا بڑھا اور تیز ترین پین ہونے کے سبب بچہ ضائع ہو گیا۔“

”بھابی، اب اس میں نہ آپ کی غلطی نہ فہمی کی...... تو کیا کہہ سکتے ہیں؟“

”ہاں، تمہاری بات صحیح ہے...... مگر جو غلطی میں کر چکی ہوں، یہ اسی کا پھل مل رہا ہے مجھے۔“

”کون سی غلطی......؟“ فیروزہ نے حیرت سے بھاوج کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”باہر کے لوگ کزن میرج نہیں کرتے تو کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی۔ مجھے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی باہر کے خاندان میں کرنی چاہیے تھی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔“

”اگر فہد کی قسمت میں اولاد ہے تو فہمی سے ضرور ہو گی۔ بیکار کی باتیں کر کے کیوں ہلکان ہو رہی ہیں۔“ فیروزہ نے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا ورنہ ان کا تو یہ دل کر رہا تھا کہ اپنی بھاوج کو بے نقط سنائیں مگر اس وقت نہ موقع تھا اور نہ وقت اور نہ ہی ایسی سچویشن تھی کہ وہ ایسا سب کچھ کرتیں۔ ہاں فہمی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برات اتری دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ گئیں۔

☆☆☆

پورے پندرہ دن ہو گئے تھے ثنا سے ملے ہوئے۔ مگر نہ تو اس نے فریال کو فون کیا تھا اور نہ ہی اس سے ملنے کی کوشش کی تھی۔

فریال سمجھ گئی تھی کہ یہ قدغن یقیناً ثریا بھابی نے اس پر عائد کی ہو گی۔ ثنا کو دیکھ کر اس سے دوبارہ ملنے کے لیے تڑپ سی رہی تھی۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اس کے موبائل پر فون کیا۔

”جی پھپھو، کیا حال ہے؟“ اس کا نمبر دیکھ کر اس نے چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تم نے فون کیوں نہیں کیا مجھے؟“ ناراضی اس کے لہجے میں مزین ہو گئی۔

''بس ایسے ہی...... ٹیسٹ ہو رہے تھے ناں میرے...... بس اسی میں مصروف تھی۔'' اس نے بہانہ گھڑا۔

''ثنا، جھوٹ مت بولو۔''

''پھپو! اگر آج آپ نہ کرتیں...... تو سچ میں آج ہی آپ سے رابطہ کرتی...... آپ سے بات کرنے کو بہت ہی دل چاہ رہا تھا۔'' ثنا نے ہنس کر کہا۔

''ثنا...... تمہیں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں تمہیں ثریا بھابی نے منع کیا ہوگا۔''

ثنا خاموش سی ہوگئی۔

''بولو...... ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں...... میں؟'' فریال نے تحکم بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جی پھپو، یہی بات ہے۔''

''ثنا! تمہارا مجھ سے بات کرنے کو واقعی دل نہیں چاہتا۔''

''نہیں پھپو، یہ بات نہیں ہے۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ صبح وشام آپ سے باتیں کروں'' ثنا نے بے تاب ہو کر کہا۔

''گڑیا! بے شک صبح وشام مجھے فون نہ کرو مگر ہفتے میں ایک بار تو مجھے فون کر لیا کرو۔ میں تو سب سے بہتر حال ہوں۔ تمہاری آواز سن کر ہی خوش ہو جایا کروں گی۔''

''امی ناراض ہوں تو ہوتی رہیں، مجھے پروا نہیں ہے، میں آپ سے بات ضرور کروں گی۔''

''تم بھابی کو مت بتانا۔ میں ان کی عادت جانتی ہوں۔ وہ تمہاری سب پڑھائی وڑھائی ختم کروا کے تمہیں اپنے ساتھ کراچی لے جائیں گی۔''

''ہاں، وہ ضدی بہت ہیں۔ جس بات پر اڑ جائیں، اسے پورا کر کے رہتی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، تم مجھے ہر ویک اینڈ پر فون کیا کرو گی یا میں تمہیں کر لیا کروں گی۔''

''ٹھیک ہے پھپو! آپ نے تو میری پریشانی حل کر دی۔''

''کھانا کھا لیا تم نے؟'' فریال کے لہجے میں مامتا سمٹ آئی۔

''ہاں...... آج آنٹی نے بڑے مزے کے چپلی کباب اور نان بھیجے تھے...... وہی کھا کر بیٹھی ہوں۔''

''کیا کر رہی تھیں؟''

''اس وقت تو کل کے لیے اپنے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ میری سہیلیاں کھانا کھا کر واک کے لیے بلا رہی ہیں، اب میں بھی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ...... ہاں، کبھی کوئی مسئلہ یا کوئی پریشانی ہو یا پیسے کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا'' فریال نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''پیاری پھپو! ایسی کوئی پریشانی میرے ساتھ نہیں ہے۔ پاپا نے ڈھیر سارے پیسے میرے اکاؤنٹ میں کروا رکھے ہیں۔''

ثنا سے بات کر کے فریال کے من میں ایک تراوٹ سی اتر آئی اور چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ صادقہ باجی دور بیٹھی فریال کے چہرے کی قوس قزح دیکھ رہی تھیں۔

وہ پاس آ کر بولیں ''فریال میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ کراچی چلو۔ میں تمہاری والدہ اور بھائیوں بات کروں گی۔''

''آپ بھی یہ تماشا دیکھنا چاہتی ہیں، جس کے بارے میں، میں آج بھی سوچتی ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیتے تو شاید میرا انجام ایسا نہ ہوتا۔''

''نہیں فریال! تم غلط نہج پر سوچ رہی ہو۔ عدیل جیسے مرد شادی کی ذمے داری اٹھانے کے قابل ہی نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی یوں ہی بھاگ دوڑ میں تمام ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ کی پریشانیاں علیحدہ سر اٹھاتیں۔ اب کم از کم تمہاری دوبارہ شادی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں باجی! اس بارے میں تو آپ سوچیے گا بھی نہیں...... مجھے تو شادی کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں زندگی بھر کسی سے شادی نہیں کروں گی۔''

''ایسا نہ کہو...... تمہارا انتخاب غلط تھا کیونکہ تم ایک کم عمر نادان لڑکی تھیں۔ جسے نہ تو پرکھنا آتا تھا اور نہ جانچنا۔ تم محبت کے تھپیڑوں میں بہتی ہوئی صحیح غلط کی پہچان کھو بیٹھی تھیں۔ اگر عدیل کا رشتہ تمہارے گھر آتا، تمہارے بھائی جانچ پڑتال کرتے، تو کیا وہ کبھی ہامی بھرتے؟ ہرگز نہیں! وہ صاف منع کر دیتے اور یہی نکتہ نوجوان لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنی پسند کو صحیح سمجھتی ہیں۔ وہ کبھی اس نہج پر سوچنے کی زحمت نہیں کرتیں کہ بہت سی پسندیدہ چیزیں ہمیں نقصان بھی دے سکتی ہیں۔''

''باجی، محبت جب اندھا کر دیتی ہے تو دکھائی کہاں دیتا ہے۔ مجھے تو عدیل کے گھر والوں کا اصل چہرہ نظر آ گیا تھا، جسے دیکھ کر میں پیچھے بھی ہٹ گئی تھی۔ مگر اس کے طلسمی لہجے نے مجھے پھر اپنا اسیر کر لیا، جس میں صحیح غلط کی پہچان ہی کھو بیٹھی۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اب میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی اور جب تمہارے گھر والے صحیح صورت حال جانیں گے تو تمہیں معاف کر دیں گے۔''

''پیاری باجی، ایسا نہ کہیں...... میرے اعصاب میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ مزید بے عزتی برداشت کر سکوں۔ آپ یقین کریں، جب بھی میں تصور میں بھی ایسے کٹہرے کا سوچتی ہوں کہ میں سب کے درمیان جا کر اپنی صفائیاں پیش کروں گی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا ہے اور میرے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح باہر بہنے لگتا ہے۔''

''پھر کیا چاہتی ہوں تم؟ مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟'' آج صادقہ باجی اس موضوع پر مکمل بات کرنے کی خواہش مند نظر آ رہی تھیں۔

''بس اب میرا مرنا اور جینا آپ کے ساتھ ہی ہوگا۔ اگر آپ چاہیں......؟''

اور صادقہ باجی نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب وہ بھی فریال کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔

☆☆☆

جمال اپنی بہن کو فزیو تھراپی سینٹر لے جانے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ تھراپی سے اس کے ٹیڑھے پیر کو کسی حد تک سیدھے ہونے میں مدد ملے گی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تھراپی کے بعد ربیع خاصی تھکن محسوس کرتی تھی۔ وہاں سے وہ اسے کسی نہ کسی پارک لے جاتا۔ جہاں بیٹھے دونوں بہن بھائی بچوں کو کھیلتے دیکھتے، آئس کریم کھاتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔

ایک دن وہ دونوں معمول کے مطابق بیٹھے تھے کہ جمال کی نظر فہمی کے شوہر پر پڑی۔ وہ چپ چاپ خاموش

سا خالی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کی واضح لکیریں دیکھی جا سکتی تھیں۔

جمال کا دل چاہا کہ اس سے پوچھے کہ کس بات نے اس کو اتنا اداس کر رکھا ہے مگر وہ جمال سے ناواقف تھا۔

جمال محلے داری کی وجہ سے اسے پہچانتا تھا۔

''جمال بھائی! یہ فہمی باجی کے شوہر بیٹھے ہیں'' ربیع نے بھی اسے دکھایا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''نگین باجی جب اپنی منگنی کا البم لائی تھیں، اس میں ان کی تصویریں تھیں اور پھر نگین باجی کے ہاں آتے جاتے بھی بارہا دیکھا ہے۔''

''ہاں، ہے تو وہی...... مگر کچھ پریشان حال لگ رہا ہے۔''

''پھر آپ جا کر پوچھ لیجیے۔''

''نہیں، اچھا نہیں لگتا۔'' جمال نے کہا اور پھر ربیع کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

اب فہد ترس بھری نگاہوں سے ربیع کو دیکھ رہا تھا اور ربیع کو قدم بڑھانا دوبھر سا محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے لوگ کیوں اس طرح دیکھتے ہیں۔ آخر دنیا میں لاکھوں لوگ معذور ہیں۔ اگر میں ہو گئی تو کیا ہوا؟ ربیع اپنے بھائی سے کہتی ہوئی چل رہی تھی اور جمال کے دل میں تکلیف کا احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔

''جمال بھائی، آپ اتنے چپ کیوں ہیں؟'' ربیع نے بھائی کی سنجیدگی اور دکھ جیسے بھانپ لیا تو یکدم پوچھ بیٹھی۔

''نہیں تو...... بس گرمی بہت ہے ناں...... کھلی فضا میں بھی اچھا نہیں لگ رہا۔''

''آپ کا اسکالرشپ جو باہر سے آیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ کب تک جانے کا پروگرام ہے آپ کا؟''

''کون سا اسکالرشپ۔ مجھے تو کوئی ایسا لیٹر نہیں آیا، تو میں بن بلائے کہاں جاؤں گا'' جمال اپنے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''جھوٹ مت بولیے جمال بھائی! آپ کا وہ لیٹر میں پڑھ چکی ہوں۔ جان ہوپ کینس یونیورسٹی سے لیٹر آنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ آپ زندگی کا یہ سنہری موقع ہاتھ سے مت جانے دیجیے'' ربیع نے بڑی محبت سے بھائی سے کہا۔

''ربیع، میری اولین ترجیحات تم اور اماں ہو۔ اس کے بعد کوئی دوسری ہو سکتی ہے اور میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ آیا سمجھ میں، اس لیے اس فکر میں تمہیں دبلا ہونے کی قطعاً ضرورت ہے کہ آیا مجھے جانا چاہیے یا نہیں؟''

''جمال بھائی! آپ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں؟''

''میں زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ میرے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟''

''ارے آپ ایسا کیوں نہیں کر لیتے کہ جھٹ پٹ شادی کر لیں۔ بھابی کو ہمارے پاس چھوڑ کر چلے جائیں اور پھر بھابی کو اپنے پاس بلا لیں۔ دو سال کی تو بات ہی ہے، وقت تو چٹکی بجاتے میں گزر جائے گا۔'' ربیع نے اپنی دانست میں اچھا مشورہ دیا تھا۔ مگر وہ ایک گہرا سانس لے کر آگے بڑھ گیا، جیسے یہ بات وہ سننا ہی نہیں چاہتا ہو۔

☆☆☆

یہ عجیب اتفاق ہی تھا کہ ثنا کی ساتھی لڑکیاں، جو اس کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتی تھیں، اچانک ہی تتر بتر ہو گئیں۔ کوثر کی ماں کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اور وہ روتی دھوتی واپس اپنے گھر چلی گئی۔ روبینہ اور شہناز کے باہر سے ایسے شاندار پروپوزل آئے کہ انہیں بھی اپنا میڈیکل چھوڑ کر گھر جانا پڑا۔

ثنا تن تنہا اکیلی فلیٹ میں نہیں رہ سکتی تھی سو شاہنواز کے دوست اسے اپنے گھر میں لے آئے۔

''آنٹی، میں ہوسٹل میں کمرا لے لوں گی۔'' ثنا کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی کے گھر میں رہے مگر آنٹی بضد تھیں کہ ان کے ہوتے ہوئے، اسے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

شاہنواز نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ ثنا ان کے پاس رہے، اس طرح اسے گھر کی سی آسودگی بھی حاصل ہو گی۔

سمیسٹر ختم ہونے کے بعد جب اسے ایک ہفتے کی چھٹیاں ملیں تو وہ گھر چلی گئی۔

''کیوں بیٹا! خاں صاحب کے گھر دل لگ رہا ہے ناں؟'' شاہنواز نے پوچھا۔

''بہت زیادہ، آنٹی اتنا خیال رکھتی ہیں کہ بعض دفعہ تو شرمندگی سی ہونے لگتی ہے۔''

ہاں، ثریا کی جرح دوسری نوعیت کی تھی ''ان کے ہاں اچھا کھانا پکتا ہے یا گھاس پھونس؟''

''بہت مزے دار کھانے بناتی ہیں آنٹی۔'' ثنا ستائش بھرے لہجے میں کہا۔

''تم ان کے ساتھ کھاتی ہو یا علیحدہ؟''

''علیحدہ کیوں کھاؤں گی۔ صبح ناشتا سب لوگ میز پر کرتے ہیں۔ دوپہر کو کالج سے آتی ہوں تو آنٹی کے ساتھ کھاتی ہوں اور رات کو پھر سب گھر کے لوگوں کے ساتھ۔''

''تمہیں تو ہر وقت کچر کچر کھانے کی عادت ہے، اگر بعد میں بھوک لگے تو پھر کیا کرتی ہو؟''

''فریج سے نکال کر کھا لیتی ہوں۔ میرا روم، ٹی وی لاؤنج کے سامنے ہی ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے'' ثریا نے پرسکون ہو کر اطمینان کا سانس لیا۔

''امی، میں جاؤں...... دادی کے پاس؟'' ثنا نے ماں سے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ وہ چنڈال تو دوبارہ نہیں ٹکرائی؟''

''کون چنڈال......؟'' ثنا سمجھ تو گئی تھی کہ ماں کس کی بابت پوچھ رہی ہیں۔ مگر عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ شناسائی کی رمق بھی ظاہر نہ کی جائے۔

''ارے وہی، تمہاری فریال پھپو...... جو گھر سے بھاگی تھی۔''

''نہیں ماما...... وہ کوئی اور تھیں۔ مجھے تو صرف لمبے بالوں کی وجہ سے دھوکا ہوا تھا...... اور پھر وہ بھی مجھے نظر نہیں آئیں۔''

''ارے وہی ہو گی بدذات۔ تجھے دیکھ کر سامنے نہیں پڑے گی۔ اتنی ہمت کہاں ہو گی اس میں کہ آ کر آنکھیں ملائے۔ اس کا خط پنڈی سے ہی آیا تھا۔''

''ہاں امی! ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' ثنا نے بے پروائی سے کہا۔

''ہاں اگر کبھی تجھے دیکھ کر شناسائی کا دعویٰ کرے تو اسے اپنا اصلی نام بھی مت بتانا۔''

''اگر وہ بالفرض پھر ملیں تو اپنا نام کیا بتاؤں؟'' ثنا اپنی ہنسی دبائے کمال معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''ہوں...... آں...... کہہ دینا کہ میرا نام رعنا ہے۔'' ثریا نے الجھ کر کہا۔ ''کچھ بھی کہہ دینا...... کوئی دوسرا نام بتانا کون سا مشکل ہے۔''

''ارے یہ تو سب سے مشکل کام ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ کون ثنا...... میں تو رعنا ہوں اور اس پر اگر انہوں

نے یہ پوچھ لیا کہ رعنا کی منگنی تو منور سے ہوئی ہے۔ تو پھر میں کیا کہوں گی؟"

"اللہ نہ کرے، کیوں ایسی بدفال منہ سے نکال رہی ہے؟"

"میں تو ایک بات کہہ رہی ہوں۔"

"ارے بھاڑ میں جائے وہ منحوس۔ وہ کیوں ٹکرانے لگی تجھ سے؟"

"ہاں...... یہ تو ہے۔" ثنا انہیں چکمہ دے کر دادی کے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں وہ مصلے پر بیٹھی رو رو کر دعائیں کر رہی تھیں۔

ثنا کو دیکھا تو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

"دادی، کیوں رو رہی ہیں آپ؟"

"یہ آنسو تو بیٹا، خود بخود ہی نکل آتے ہیں جب میں اپنی فریال کو پڑھ کر بخشتی ہوں۔"

"پڑھ کر بخشتی ہیں...... کیا مطلب ہے آپ کا...... کہ خدانہ کرے فریال پھپو اب حیات نہیں ہیں؟"

"ہاں بیٹا! اگر وہ زندہ ہوتی تو ضرور رابطہ کرتی۔ یقیناً وہ مر گئی ہے۔ ورنہ وہ مجھ سے ضرور رابطہ کرتی...... معافی مانگتی...... مگر آتی ضرور۔ ہاں، مردے اپنی خبر ہی نہیں دیتے کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ جب ہی تو کوئی خبر مجھے نہیں ملتی۔"

"دادی...... ! میرا دل کہتا ہے کہ پھپو زندہ ہیں۔" ثنا نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فریال کے بارے میں الف سے ی تک سب باتیں انہیں بتا دے۔

"تمہارا دل غلط کہتا ہے، وہ مر گئی ہے۔"

"اچھا اب آپ یہ سوچیں کہ کسی دن فریال پھپو آپ کے سامنے آجائیں اور آ کر کہیں کہ میں زندہ ہوں...... میں خوش و خرم ہوں اور میں بے حد پُر مسرت زندگی گزار رہی ہوں تو پھر آپ کیا کہیں گی؟"

"میں...... خوشی سے اسی وقت مر جاؤں گی" انہوں نے لرزتے ہوئے لبوں سے کہا اور چکرا کر بستر پر گرتی چلی گئیں۔

☆☆☆

"پچھلے ویک اینڈ پر کہاں غائب تھیں......؟" فریال نے فون پر خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

"پھپو، کراچی چلی گئی تھی۔"

"اور وہاں اپنا موبائل مسلسل آف رکھا تم نے......؟"

"ہاں پھپو...... اگر میں وہاں آپ کا فون ریسیو کرتی تو امی میرا کیا حشر کرتیں...... اس لیے اپنا موبائل آف ہی رکھا۔"

"امی کیسی ہیں اور سائرہ باجی؟" فریال کے جملے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں...... دادی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہیں اور سائرہ پھپو خوب ل وشوق سے اسکول جا رہی ہیں۔"

"امی، مجھے یاد کرتی ہیں؟"

"ہاں، بہت کرتی ہیں۔"

"تم تصویریں لے کر آئی ہو ان کی......؟"

"پھپو! اس دفعہ تو نہیں لا سکی۔ ہاں، آئندہ جب بھی جاؤں گی تو یاد سے لاؤں گی۔"

"اور بھابی وغیرہ کیسی ہیں؟"

"سب اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔"

"مسز رحمان کے فلیٹ میں آ کر کوئی پریشانی تو نہیں ہو رہی......؟" فریال کا ذہن پھر ثنا کی جانب لوٹ اس کی اپنی بھتیجی اسی کے شہر میں موجود تھی اور غیروں کے ہاں رہ رہی تھی۔

"نہیں پھپو! آنٹی بہت اچھی ہیں۔ میرا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ پہلے تو مجھے اپنے کپڑے خود پریس کرنے تھے۔ اب ان کی مائی میرے کپڑے پریس کر کے الماری میں ہینگ کر کے جاتی ہے۔ آنٹی کہتی ہیں کہ بیٹا تم قت صرف پڑھائی میں صرف کرو۔"

"ٹھیک کہتی ہیں وہ...... ثنا...... تم کسی دن میرے بوتیک ہی آجاؤ۔"

"کیسے آؤں پھپو......؟" وہ بے چارگی سے بولی۔

"یوں کرو...... تم مسز رحمان کے ساتھ بوتیک آجاؤ۔ ایک دو سوٹ بھی لے لینا اپنے لیے۔"

"آنٹی کہہ رہی تھیں کہ آپ کے بوتیک کے کپڑے قدرے مہنگے بھی ہوتے ہیں۔" ثنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مگر تمہارے لیے تو فری ہوں گے۔"

"اب میں آپ کا نقصان تو نہیں کروں گی ناں آ کر......" ثنا نے قہقہہ لگایا۔

"میری جان! تم پر خرچ کر کے میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب میری آمدنی بہت اچھی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پھوپا جان آپ کو خوب بڑے بڑے ڈرافٹ بھیج رہے ہیں؟" ثنا نے شرارت سے

کہا۔

''ہاں...... آں...... تمہارے پھوپا جان...... بھی......'' فریال کے جملے اس کے گلے میں پھنسنے لگے۔

''فریال پھپو! میری ایک بات مانیں......'' ثنا نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں، کہو...... کیا بات ہے؟''

''پھپو...... روپے پیسے کی تو کوئی حد نہیں ہے۔ جس کے پاس جتنا ہو، کم ہی ہوتا ہے۔ آپ یہاں بوتیک چلا رہی ہیں...... پھوپا علیحدہ پڑے ہیں اور کمائی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا آپ بھی پھوپا کے پاس چلی جائیں۔'' ثنا نے اپنے تئیں خاصی عقل مندی کی بات کی تھی۔

فریال کو ایک دم چپ سی لگ گئی۔ وہ کہے تو کیا کہے؟

''ٹھیک کہہ رہی ہوں نا پھپو......!'' اس کی خاموشی کو ثنا نے رضا مندی سے تعبیر کیا۔

''گڑیا! کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو مگر ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے ابھی وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے اس وہ وہاں تنہا ہیں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو آپ ان کو واپس پاکستان بلا لیں۔ ماشاءاللہ آپ کا بوتیک سرپٹ بھاگ رہا جب پھوپا بھی آپ کے بزنس میں شامل ہو جائیں گے تو...... آپ کی کامیابیاں دیکھنے والی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے، جب وہ آئیں گے تب اس موضوع پر بات ہو گی'' فریال جتنا اس موضوع سے بھاگ تھی، ثنا اتنی ہی باتیں کر رہی تھی۔

''اب پھوپا کب آئیں گے؟'' اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے تو انہیں دیکھا ہے۔ جب آپ کے گھر آؤں گی تو تصویریں دکھائیے گا اپنی۔''

''ارے ابھی تو گئے ہیں۔ تمہارے پنڈی آنے سے ایک ہفتہ قبل...... اب سال ڈیڑھ سال سے پہلے چکر لگائیں گے'' فریال نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اب جب ان کا فون آئے تو میرا اسلام ضرور کہیے گا۔''

''کہہ دوں گی۔''

''ہاں، ایک چیز آپ کو ضرور دوں گی۔ چلتے وقت دادی نے مجھے چنے کی دال کا حلوہ بنا کر دیا تھا۔ وہاں جب تک رہی، خوب کھایا۔ اب آپ دادی کے ہاتھ کا حلوہ کھائیے گا تو مزہ آ جائے گا۔''

''امی کے ہاتھ کا حلوہ'' فریال کے گلے میں پھندے سے لگنے لگے اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ایک دم سے جل گئے۔

☆☆☆

''سوب سمجھتی ہوں تمہاری باتاں میں منور پاشا! ابی ثنا پنڈی سے آئی تھی تو تے اپنی پڑھائی کا خیال نیں تھا۔ اس روز انوں کے سنگات ٹھٹھے مارتے بیٹھتے تھے۔ (روز اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے تھے) ابی تمہیں فون کر کے بلاتی تو تم ہر بار نکو بولتے۔ ایک بار تو میں بی سنی کہ کہہ دو کہ میں گھر اچ میں نیں ہوں بول واہ بیٹا واہ، کوئی اس طرح کرتا ہے اپنی منگیتر کے ساتھ۔''

''امی! میرے فائنل امتحان نزدیک ہیں۔ پروجیکٹ میں پھنسا ہوا ہوں میں...... اب میرے پاس اتنا تو نہیں ہے ناں کہ روزانہ دو گھنٹے باؤلے پنے کی رعنا کی باتیں سنوں۔''

''ہو...... میں سوب جانتی بیٹھی...... رعنا اب باؤلی بھی ہو گئی...... اس سے باتاں کرنے کو من بی نہیں چاہتا تمہارا۔ ثنا آئی تھی، جب بھی تے امتحاناں میں تھے ناں، تو پھر کیوں بول کے بولے اس کے سنگات'' صابرہ کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''امی کمال کرتی ہیں آپ بھی...... ثنا کو میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں اس کی تو مجھے عادت ہے۔ اس کے بغیر اتنی بوریت ہو رہی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میں اس کا مزاج سمجھتا ہوں اور وہ میرا۔''

''مگر تمہاری منگنی تو رعنا سے ہوئی ہے ناں۔ اس سے مزاجاں ملاؤ۔ دوسری لڑکی سے کائے کو مخابلہ (مقابلہ) کرتے بیٹھے تم۔''

''افوہ...... مقابلے کی بات نہیں ہے۔ رعنا میری بات ہی نہیں سمجھتی ہے۔ تو کیا بات کروں گا اس سے؟''

''جب باتاں کرو گے تو وہ تے سمجھے گی ناں...... اچھی بچی ہے وہ...... بہوت مخبتاں کرتی وہ میرے سے۔''

''امتحان سے تو فارغ ہونے دیجئے آپ...... نہ جانے کس مصیبت میں ڈال دیا آپ نے۔ منگنی کر لے بیٹا...... میری بھانجی ہے...... ورنہ کوئی اور لے اڑے گا۔ آپ نے پریشانی کا جال بچھایا اور میں نے آپ کی بات مان لی۔'' منور جل کر کہہ بیٹھا۔

''میں سوب سچ بولی تھی۔''

''اب منگنی ہو گئی ہے تو باتیں کیوں نہیں کرتا، ہنسی مذاق کیوں نہیں کرتا جیسے الزام رکھے جا رہے ہیں اور اگر میں نے کوئی مذاق کر لیا تو اتنا اندازہ ہے کہ محترمہ آٹھ آٹھ آنسو روئیں گی۔''

''وہ کیوں بھلا...... ایسا اچ کیوں ہوئیں گا؟'' صابرہ نے حیرت سے بیٹے سے پوچھا۔

''وہ اس لیے...... کہ آپ کی جبلن بھانجی کو میری بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور وہ سیدھی بات کر کے بھی ایسے مطلب نکالیں گی...... کہ جو وہی نکال سکتی ہیں کہ اس کا اندازہ ہے مجھے۔''

☆☆☆

جمال کی والدہ نے رازداری سے پڑوسن کو ربیع کی تصویر دے کر اس کے لیے رشتے کی کوشش کرنے کو کہا تھا اور آج وہ یہ خوش خبری لے کر آئی تھیں کہ ربیع کی تصویر لڑکے والوں کو بے حد پسند آئی تھی۔

''تم نے یہ بات بتا دی ہے ناں کہ لڑکی کے پیر میں لنگ ہے، وہ پیر گھسیٹ کر چلتی ہے؟''

''سب بتا دیا ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ علاج ہو رہا ہے اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ مسلسل فزیوتھراپی سے یہ خامی دور ہو جائے گی۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ لڑکے والوں نے اس عیب سمیت ربیع کو پسند کیا۔''

''ہاں...... وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ اکلوتی لڑکی ہے۔ جہیز بھی اچھا ملے گا تو لڑکے کی ماں نے کہا کہ ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے، بس لڑکی اچھی ہو۔''

''پھر کب آئیں گے وہ لوگ......؟'' ربیع کی والدہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''اب کے اتوار کو آنے کا کہا ہے مگر انہوں نے بھی یہ کہا ہے کہ لڑکی والوں کو بتا دینا کہ یہ لڑکے کی دوسری شادی ہے، پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''پہلی سے بچے بھی ہوں گے'' ربیع کی والدہ کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ ان کی بیٹی ابھی خود بچی تھی اور اب بچوں والے کا رشتہ آیا تھا۔

''نہیں کوئی بچہ وچہ نہیں ہے'' پڑوسن نے تسلی دی۔

''اکثر لوگ پہلی بیوی کے بچوں کو چھپاتے ہیں۔ تم اس سلسلے میں مکمل چھان بین کر کے بتانا۔''

''ارے آپا! میں کیوں غلط بیانی کرنے لگی۔ لڑکے کے دفتر کا فون نمبر لے لینا اور جمال سے مکمل معلومات کروانا کہ وہ کس قماش کا ہے۔ کیسی عادتوں کا ہے، جھگڑالو ہے یا نہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ پہلے وہ لوگ آ کر ربیع کو دیکھ جائیں، پھر جمال بھی معلوم کر لے گا۔''

جمال کو جب اس رشتے کے بارے میں ماں نے بتایا تو وہ بھی خوش ہو گیا اور اتوار کے دن کا انتظار کرنے لگا۔

پڑوسن کے ساتھ جب لڑکے کی والدہ آئیں تو ربیع ان کو دیکھ کر چونک گئی۔

''آنٹی! ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

''بیٹا! میں بھی اسی شہر کراچی میں رہتی ہوں۔ دیکھا ہو گا تم نے مجھے کہیں ضرور، ایک شہر میں بہت سے لوگ ایک دوسرے سے بارہا ٹکراتے ہیں۔''

''ارے ہاں، یاد آ گیا۔ پہلے فہمی باجی کی منگنی آپ کے بیٹے سے ہوئی تھی ناں۔'' ربیع، جو تمام معاملات سے بے خبر تھی، بے ساختگی سے بولی۔

''ہاں ہوئی تھی مگر اللہ کا شکر چنڈالوں اللہ نے بچایا۔ بڑے ہی چالاک لوگ تھے وہ۔''

''کون فہمی......؟'' ربیع کی والدہ پریشان سی ہو کر ربیع سے پوچھنے لگیں۔

''امی...... نگین باجی کی بڑی بہن! جن کی پہلے منگنی ٹوٹ گئی تھی، مہندی میں ہم لوگ بھی تو گئے تھے۔ مہندی کے گیتوں پر ہی بدمزگی بڑھی تھی اور اتنی بڑھی کہ ان لوگوں نے شادی ختم کر دی تھی۔''

''ہاں بھئی، توڑ دی تھی...... کہ آنکھوں دیکھی مکھی کون نگل سکتا ہے۔ کوئی بات ہی ہوئی ہو گی، جو ہم نے یہ رشتہ ختم کیا ہو گا۔ ویسے بھی میری عادت نہیں ہے کہ کسی لڑکی کا عیب چار لوگوں میں بتاتی پھروں۔ مگر جب مجھے پتا چلا کہ لڑکی ہی شریف نہیں ہے تو بھئی گناہوں کی پوٹ کو کون اپنے گھر میں لے کر جاتا ہے۔''

ربیع کی ماں یہ سب باتیں سن کر پسینے پسینے ہو رہی تھیں۔ ادھر پڑوسن کے چہرے پر بھی ملال اور تاسف کا احساس بڑھ رہا تھا کہ وہ کس کو لے کر ان کے گھر آ گئی ہیں۔

''بھئی، میں تو سچی بات کہتی ہوں۔ منیر عالم میرا بڑا لاڈلا بیٹا ہے۔ چھت سے اچانک گر جانے کی وجہ سے اس کی دونوں ٹانگوں میں راڈ ڈلے ہوئے ہیں۔ مگر چھڑی کی مدد سے جب وہ چلتا ہے تو ذرا پتا نہیں چلتا کہ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔''

''میں معذرت خواہ ہوں...... میں اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو نہیں دے سکتی۔'' ان کی مکارانہ باتیں سن کر ربیع کی والدہ نے یکدم ہی فیصلہ کر لیا۔

''مجھے آپ کی پڑوسن نے بتایا تھا کہ آپ ربیع سے کر دیں گی اس لیے چلی آئی...... ورنہ میرے بیٹے کے لیے کوئی کمی تھوڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جہاں دل چاہے اپنے بیٹے کے لیے لڑکیاں منتخب کر لیں مگر ہم تو سوچ بھی نہیں

سکتے۔'' ان کا یہ دل چاہ رہا تھا کہ یہ عورت فوراً ہی ان کے گھر سے چلی جائے۔ انہیں فیروزہ بیگم کے وہ آنسو یاد تھے، جو یہ رشتہ ختم ہونے کے بعد انہوں نے بہائے تھے۔

''میرے منیر کو تو صحت مند، چاق چوبند لڑکیاں مل سکتی ہیں، تم لیے بیٹھی رہنا اپنی اپاہج بیٹی کو۔ دیکھ لینا، کوئی فکر نہیں کرنے کا۔'' وہ چلتر پنے سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ربیع کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا ہو گیا۔ اسے تو ان کے آنے کا مقصد معلوم ہی نہیں تھا۔

''دیکھو تو، اچھا بھلا صحت مند بیٹا اپاہج ہو گیا ہے مگر باتیں تو دیکھو، ساری کی ساری تکبر سے گندھی ہوئی......'' پڑوسن اپنے کلّے پیٹتے ہوئے بولیں۔

''اللہ! ایسے فریبی لوگوں سے تو ہمیشہ مجھے بچا کر رکھنا۔'' ربیع کی والدہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بولیں اور ربیع کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے یا یہیں بیٹھی رہے؟

☆☆☆

''یوں تو تمہاری چاروں بہنیں ایک سے ایک ہیں مگر یہ ثریا باجی تو حرفوں کی بنی ہیں، ایسی باتیں مارتی ہیں کہ اللہ توبہ! اب سفارشوں کے طفیل دوسرے شہر میں ان کی ثنا کا میڈیکل میں داخلہ کیا ہو گیا ہے کہ ان کے تو گویا سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔'' صفیہ نے اپنے میاں سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا آخر......؟ ثریا باجی جب بھی تمہارے ہاں آتی ہیں، تمہاری شکایتیں شروع ہو جاتی ہیں۔''

''ان کی عادت ہی ہمہ وقت چٹکی لینے والی ہے تو کیا کروں'' صفیہ نے جل کر کہا ''پتا ہے کہ لائقہ نے انٹر کا امتحان ٹائیفائیڈ کے درمیان دیا، ناصر کے چوٹ لگ گئی تھی اس لیے اس کا رزلٹ خراب رہا مگر وہ جب بھی آئیں گی، سب کے رزلٹ پوچھیں گی۔ اپنے بچوں کے گن گائیں گی۔ ہم تو کسی کے گھر جا کر ان کے بچوں کو ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کرتے مگر یہ ان کی شروع سے ہی عادت ہے۔ ایک مرتبہ ناصر کو ہم نے تیسری کلاس ریپیٹ کروائی، اس چھوٹے سے بچے کو بار بار ذلیل کرتی رہیں اور وہ پریشان ہو گیا۔ ''ارے تم پچھلے سال بھی تیسری جماعت میں تھے۔ اس سال بھی تیسری جماعت میں ہو۔ کیا یہ کلاس زیادہ پسند آ گئی ہے۔ اس جماعت میں کیا گھر بنا لیا ہے۔'' وہ بچہ اتنا حواس باختہ سا ہو گیا تھا کہ وہ جب بھی آتیں اسٹور روم میں چھپ جایا کرتا۔ اور اب آئیں تو ہماری لائقہ کی نالائقی بیان کرتی رہیں۔''

''صفیہ! بات یہ ہے، جن لوگوں کے بچوں کی تعلیمی حالت شاندار ہوتی ہے، وہی دوسروں کے بچوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اپنے بچوں کی خراب تعلیمی حالت ایک دکھتی رگ ہوتی ہے۔ چاہے وجوہات کچھ بھی ہوں، تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے نمایاں کامیابیاں حاصل کریں اور جب وہ یہ ٹارگٹ حاصل نہیں کرتے تو وہ چھپنے لگتے ہیں اور ثریا باجی جب یہی دکھتی رگ دباتی ہیں تو زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔''

''کیوں کرتی ہیں وہ ایسی اوچھی حرکتیں؟ اگر بچوں نے ان کی طبیعت صاف کر دی تو مجھے کچھ مت کہیے گا۔ اب نہیں رہی برداشت میری'' صفیہ نے غصے سے میاں سے کہا۔

''بس، بس...... زیادہ مزاج دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ میری بڑی بہن ہیں۔ اب میں ان سے بدتمیزی سے بات تو نہیں کر سکتا۔ تم ان کی بات کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیا کرو۔ اب وہ خالی دیواروں کو تو ٹکرانے سے رہیں؟''

''اب آپ جیسا برف جیسا مزاج ہر کسی کا نہیں ہو سکتا کہ کوئی کچھ ہی کہہ دے، مسکرا کر چپ ہو جاتے ہیں مگر

مجھ میں نہیں رہی طاقت۔ غضب خدا کا، میری لائقہ کو کہہ رہی تھیں کہ اوورایج ہو جائے گی تو اس کے رشتے کے لیے تیرے میرے کی خوشامدیں کرتی پھرو گی۔ اللہ نہ کرے، ایسی نوبت آئے۔ شرم بھی نہیں آتی اپنی سگی بھتیجی کے لیے کیسے کیسے لفظ منہ سے نکالتی ہیں۔"

"ارے دفع کرو ان باتوں کو۔ لائقہ کو ٹیچر بننے کا شوق ہے۔ اس کو ٹریننگ کروادو۔ اب آج کل لڑکیوں کو پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرنی چاہیے۔"

"آپ کی بھانجی ثنا ڈاکٹر کیا بن رہی ہیں، ان کی اماں یہ چاہتی ہیں کہ وہ جس کا دل چاہے آپریشن کر ڈالیں۔ ان کے سسرال والے تو سب سیدھے سادے لوگ ہیں، اسی لیے ان کی زبان کندھوں پر پڑی رہتی ہے۔" صفیہ نے غصے سے کہا۔

☆☆☆

"اری نیک بختی، ذرا ہلو بول، کوئی سن لیا تو کیا بولے گا بول کے۔" (اری نیک بخت، آہستہ بول کسی نے سن لیا تو کیا کہے گا؟)

"آپا جان! یہاں تو سسرال کا مطلب صرف ایک یچ ہے کہ دوسروں کا منہ دیکھ دیکھ کر باتاں کرو۔" نگہت نے غصے سے کہا۔

"بس میں بول دی...... آج خیوم (قیوم) بھائی کے گھر تو آج سوچ لے کو بیٹھی ہوں کہ جاؤں گیچ نمیں۔" (آج قیوم بھائی کے گھر نہیں جاؤں گی)

"کائے کو ایسی باتاں کرر ے تم...... جبکہ مالوم بھی ہے کہ خیوم بھائی اپنی ذات سے کتنے اچھے ہیں۔ سوب کا خیال رکھتے...... اور پھر کتنے بڑے نباب (نواب)۔"

"وہاں صابرہ اور فاخرہ ہوئیں گی ناں، ان دونوں کی شکلاں دیکھنے کو بی میرا دل اچ نمیں کرتا۔ انہوں رعنا کے سلسلے میں کیسا ذلیل کرایا میرے کو۔ ہاں بھر کو...... منع کر دیے وہ...... انسان کی ایک یچ زبان ہوتی ہے ناں...... انہوں کی ہزاروں زباناں ہیں۔ بے حد کمینی بہناں ہیں دونوں" نگہت آرا نے کلس کر کہا۔

"نگہت آرا ایسی بے کار باتاں نکو کرو آپ...... وہ کاں، آپ کاں؟ وہ زمین سے بھی نیچو، آپ آسمان سے بھی اوپر۔ فاخرہ رعنا کے لیے انکار کری ناں...... چلو میں دوں گی اپنی بیٹی آپ کے بھتیجے کو۔ میں بات رکھوں گی اونچی آپ کی...... آپ کائے کو غم کرتے ہاں۔"

"ارے تم شوکت آپا...... تم دو گی اپنی بیٹی......؟" نگہت آرا نے حیرت سے اپنی خالہ زاد بہن کو دیکھا۔

"ہاں، میں دوں گی...... کہ میں آپ سے دل سے محبتاں کرتی ہوں ناں۔ اور آپ میرے کو اتنی پیاری کلیجے میں رکھنے کے لاخ (لائق) لگتی ہیں۔"

"میں تو یہ اچ سوچا نکو...... کہ تمے میرا اتنا خیال ہوئیں گا۔" نگہت آرا مارے خوشی کے بے حال سی ہو گئیں۔

"میں تو پہلے اچ سوچ کو بیٹھی تھی کہ نگہت...... میرے گھر کو آئیں گی پر جب آپ فاخرہ کے گھر چلے گئے...... رعنا کے لیے تو میں چپ کر کو بیٹھ گئی۔"

"میں اب کے جمعے کو آؤں گی اپنی بھابی کے سنگات" نگہت آرا نے خوشی سے کہا۔

"پر آپ یہ بات کسی کو بی نکو بتائیے گا، شادی کے وخت تک۔ جلنے والے خوب ہوتے ہیں ناں...... اس واسطے" شوکت آپا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"آپ پروانہ کرو...... میں خوب سمجھتی۔"

تب شوکت آرا نے خوشی سے گہرا سانس لیا۔ ان کی جاہل اور پھوہڑ بیٹی کے لیے کس آسانی سے رشتہ آنے والا تھا۔

نگہت چاہے کتنی بھی تیز وطرار تھیں مگر شوکت آپا کے سامنے کچھ بھی نہیں تھیں۔ شوکت آپا اپنی میٹھی باتوں سے ہر ایک کو شیشے میں اتارنے کے فن میں ماہر تھیں۔

☆☆☆

نواب قیوم کی بیٹی کی مایوں تھی۔ خاندان کی لڑکیاں اور خواتین سب ہی مل کر خوب گانے گا رہی تھیں۔ نگہت آرا (صابرہ کی بھاوج) نت نئے گانوں میں خوب پیش پیش تھیں۔

کیسے پاگل یہ دنیا کے لوگاں ماں
چھت پوکائے کو جاتے یہ لوگاں ماں
آنکھا کھلے رکھو تاکا جھانکی نکو
اپنے آنگن کو دیکھو پہلے ماں
چندا سجا کیسے پاگل
دل میں کرتا ہے کیسی ہلچل
اس کے ہونٹاں کی لالی تکو ماں
اس کے سینے کی دھڑکن سنو ماں

"نگہت کے گیت سن کر سب ہی کو بے حد ہنسی آ رہی تھی۔ گاتے ہوئے وہ اداکاری بھی کر رہی تھیں۔ خواتین کی ہنسی ان کو مزید شہ دے رہی تھی۔

لڑکیاں اپنی تالیوں سے تال کا سماں باندھ رہی تھیں اور نگہت آرا اب ساڑی کے پلو سے گھونگھٹ نکال کر دلہن کے چلنے کی ادائیں دکھا رہی تھیں۔

دولھا بولے ہاں...... ہاں...... ہاں......
دولھن بولے ناں...... ناں...... ناں......

نگہت آرا مسخروں کے سے انداز میں کولھے ٹھمکاتے ہوئے نقلیں اتار رہی تھیں۔ خواتین کے قہقہے چھتوں کو پھاڑ رہے تھے۔ لڑکیاں شرماتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھے بری طرح ہنس رہی تھیں۔

تب ہی نگہت آرا نے دوسرا گیت شروع کیا۔

دولھا بولے آؤ میری رانی......
دولھن بولے ہائے میری نانی......

تب ایک دم طوفان کی طرح چکراتی، بلبلاتی اور آگ برساتی صابرہ کسی کمرے سے برآمد ہوئی اور نگہت آرا کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بھابی پاشا! یہ سب کیا فضول باتاں لگائے بیٹھی ہو تم...... اخلاخ (اخلاق) بھی کوئی چیز ہے ناں بول کے...... مگر تمے تو کوئی شرم ہی نہیں دکھتی ہے۔"

"میں کیا غلط کری......؟" نگہت آرا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ تم اپنے آپ سے پوچھو کہ کیا کرتی بیٹھی ہو تم۔ مہندی مایوں میں شادی بیاہ کے گیتاں ضرور گاؤ مگر یہ اوچھی اوچھی حرکاتاں کائے کو کرتے بیٹھے تم......؟“

”اچھا میرے کو سبق پڑھانے کو آئے ناں تم...... مگر شاید یہ بی بھول گئے کہ یہ اسکول نہیں ہے جی، شادی کی محفل ہے......اور مجھ پر باتیں مارنے سے تمہارا کلیجا ٹھنڈا نکیں ہوئیں گا۔ برف کی سلاں رکھوا اپنے بستر پر...... جہاں ہر وخت آگ جلا کو بیٹھتے تم...... یہ فضول باتاں نکیں ہیں صابرہ! یہ تو شادیوں کے گیت ہیں...... جو سوب گاتے بیٹھے۔ کیوں لڑکیو، میں ٹھیک بولی ناں“ انہوں نے سارے سامعین کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”برو بر بولتے آپ...... آپ تو ہنسا کے بیٹھے تھے ناں......“ ایک لڑکی صابرہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے بولی۔

”یہی اچ کہنا چاہتی ہوں میں“ نگہت آرا ناز سے مسکرائی جیسے اس نے صابرہ کو زیر کر دیا ہو۔ ”ماں، بیٹی بیاہنا بھی کوئی معمولی کام تو ہے نکیں۔ اجاڑ دل کیسا بھاری ہو جاتا کی، پہاڑ بن جاتا......ایسے میں ہنسی مزاخ (مذاق) کرنا کائے کو برا ہوتا۔ میں تو سوب کا دل لگا کے بیٹھی ہوں جی!“

صابرہ یہ سب سن کر مزید آگ بگولا ہو گئی۔ ”بھابی پاشا! آپ کو کچھ تحکل (عقل) ہے کی نکیں کہ اتنے بیٹھنے والیاں میں کنوارے بچیاں بی ہیں۔ اور آپ چھاتیوں پر ہاتھ مار مار کے ٹھمکے لگاتے بیٹھے۔ یہ کوئی اچھی باتاں ہیں کیا بول کے۔“

صابرہ کی یہ بات سن کر رعنا اپنی جگہ سہم سی گئی کہ ہنسنے والوں میں اس کا قہقہہ سب سے آگے تھا۔

”رعنا، اندر آ کو بیٹھو تم......“ صابرہ نے غصے سے کہا۔

”جی ہو“ اس نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور اسی وقت اندر چلی گئی۔ صابرہ نے تیکھی چتونوں سے شوکت آپا کو دیکھا اور شوکت آپا اپنا چپاتی سامنہ پیٹتے ہوئے بولیں۔

”کیسے عجیب لوگاں ہے بھئی...... (کیسے عجیب لوگ ہیں) شادی کے گھر میں مذاخاں (مذاق) کو برا بولتے بیٹھے۔ (شادی کے گھر میں مذاق کی باتوں کو برا کہتے ہیں) اب صابرہ کی وجہ سے ہم سوب رونے کی باتاں تو نکیں کریں گے ناں۔ نباب صاب کو ایسا اچ کیا اچھا دکھے گا کیا؟“

”ہاں ہاں، بالکل نہیں......“ نگہت آرا کے ساتھ سب کی منڈیاں ہلنے لگیں۔ تب صابرہ اپنی بھاوج کو کانی نظروں سے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی کہ اب وہ کسی کے ساتھ منہ ماری کرنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر نگہت آرا اپنے دل میں کہہ رہی تھیں کہ صابرہ بیگم، تم کو تو میں اس قدر ذلیل کر کو بیٹھوں گی کہ ساری تمہاری تحکل (عقل) پیروں اچ آ جائے گی بول کے۔ تم جو میرے ساتھ کری، وہ میں نکو بھول کے بیٹھوں گی۔ آخر کو تمہاری بھاوج ہوں...... تم سے نکو دب کو بیٹھوں گی۔“

☆☆☆

موسم گرما کی تعطیلات تھیں......اشرف کی دو شادی شدہ بہنیں بھی اپنے بچوں کے ساتھ گھر آئی ہوئی تھیں۔ دوسرے شہر سے ماموں ممانی آئے تو اپنے چار بچوں کو ان کے ہاں ہی چھوڑ کے چلے گئے کہ چھٹیوں میں بچے مزے لوٹیں۔

بچے اتنے شیطان اور بدتمیز کہ لوگ ان کے بجائے طوفان کی تمنا کر لیں اور پھر تمیز تو انہیں چھو کر نہیں گئی تھی۔ اشرف کی نانی ان کی بڑی خالہ کے ہاں رہتی تھیں۔ چاروں ماموؤں میں سے کوئی بھی ممانی بھی انہیں اپنے گھر رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیتی تھی اور اب ان دنوں اشرف کی ماں کی باری تھی اور نانی جان اپنے نک چڑھے مزاج

ے ساتھ ان کے ہاں موجود تھیں اور فرح کو ناکوں تلے چنے چبوا رہی تھیں۔

بڑھاپے میں جہاں بعض خواتین کے لبوں سے صرف دعاؤں کے پھول جھڑتے ہیں، وہاں کچھ خواتین ایسی ہی ہوتی ہیں کہ وہ اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے لوگوں کی زندگیاں اجیرن کر دیتی ہیں۔

نانی جان کا مزاج خاصا کڑوا تھا۔ سالن میں مزہ نہ آتا تو وہ پلیٹ اٹھا کر پھینک دیتیں۔ بلاوجہ کی تنقید کرنا ان کا مشغلہ تھا۔

”یہ آلو گوشت میں اتنے بڑے آلو کاٹ کر کون ڈالتا ہے...... یہ انسانوں کے لیے کھانا بنایا ہے یا ڈھور ڈنگروں کے لیے؟“

”مسالہ بھونا نہیں تم نے...... ہراندھ آ رہی ہے گوشت سے۔“

”اے خدایا...... یہ کڑھی دس منٹ میں کیسے پک گئی؟ یہ تو چھ گھنٹے پکتی ہے، جب مزہ آتا ہے اس میں۔“

”اف یہ کھیر بنی ہے یا دودھ میں چاول گھوٹ کے دے دیے۔ جس کو کھیر اور فیرنی کا فرق معلوم نہیں اس کے ہاتھ میں سواد کیسے آئے گا؟“

”نہیں بھئی، میں نہیں کھا سکتی یہ گھاس پھونس...... جب کھانے میں ذائقہ ہی نہ ہو تو سینے پر گھونسا مار کر ہم کھانا نہیں کھا سکتے۔“

”اے لو...... یوٹھا کی موٹھا ہو گئیں۔ (اتنی بڑی ہو گئیں) اور تمہاری میا (ماں) نے سسرال جانے سے پہلے کچھ سکھایا بھی نہیں...... مجال ہے کہ جو کسی کھانے میں مزہ ہو۔“

”اے بی، کیا تمہارے ہاں مسجد سے کھانا آتا تھا جو تمہیں پتا ہی نہیں کہ کس چیز میں کتنا مصالحہ ڈلتا ہے۔“

اور فرح ایسی باتیں سن کر سہم سی جاتی۔

”ہماری اماں کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ ہے۔ بدمزے کھانے نہیں کھا سکتیں“ اشرف کی اماں تو فلی بھرے لہجے میں اسے مزید کلساتیں اور فرح کو زبردستی مسکرانا پڑتا اور دل میں وہ دہاڑیں مار کر روتی۔

وہ بہنیں جو بھائی کی شادی سے پہلے گھر کا ہر کام کیا کرتی تھیں، اب وہ پھلی بھی پھوڑ کر نہ دیتیں۔ گھر میں رہتیں تو ہنسی مذاق اور ٹھٹھے ختم ہونے میں ہی نہ آتے۔ ہر وقت منہ کچر کچر چلا کرتا اور یا پھر موڈ میں آتا تو محلے کی مٹر گشت کو نکل جاتیں۔

”صالحہ کی بہوئیں بدذات ہیں، مکر کر کے پڑی رہتی ہیں۔“

”شدو خالہ کے ہاں سمدھیانوں سے لڑائیاں چل رہی ہیں۔“

”ناصرہ کی نند راجی بے پناہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی بھابیاں بتا رہی تھیں۔ ہر وقت سوتی رہتی ہے۔ کھا کھا کے موٹی بھینس بن رہی ہے۔“

”مرغی والی آپا جی کے ہاں کراچی سے مہمان آنے والے ہیں۔ وہ گھروں سے پلنگ مانگتی پھر رہی ہیں۔“

”لمبی فہمیدہ کا نکاح ٹوٹ گیا ہے۔ وہ ہر وقت روتی رہتی ہے۔“

فرح کو اپنی نندوں کی باتوں سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ محلے کی یہ کہانیاں سن کر ان پر کوئی رائے زنی کرے۔ وہ صبح سویرے ناشتا بنانا شروع کرتی تو پراٹھے بناتے بناتے وہ تھک سی جاتی۔ مگر کھانے والوں کی نہ نیت بھرتی اور نہ ہی پیٹ اور وہ نڈھال سی ہو جاتی۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹی بہن ہونے کے ناتے اس پر کام کا اتنا بوجھ کبھی پڑا بھی نہیں تھا۔ مگر یہاں تو وہ کام کر کر کے ادھ موئی سی ہوئی جا رہی

تھی۔

کئی بار اس نے اشرف سے کہا تھا کہ اتنی سخت گرمی میں اس سے روٹیاں اور پراٹھے نہیں پکائے جاتے مگر اس نے اسی وقت اسے لتاڑ کر کہا تھا کہ شادی سے پہلے تمہارے گھر میں نوکر چاکر نہیں لگے ہوئے تھے۔

''تمہارے گھر سے اچھا گھر ہے ہمارا......کھلا اور ہوادار سا۔ بڑے بڑے کمرے۔ تمہارے گھر میں تو کابک کی طرح کمرے بنے ہوئے ہیں اور پورے ٹبر کے لیے ایک بونا سا فریج۔ ہمارے گھر میں تو کتنا بڑا فریج ہے۔ کپڑے دھونے کے لیے بھی مشین موجود ہے۔ جبکہ تمہارے گھر میں ابھی تک ہاتھوں اور ڈنڈوں کی مدد سے دھلائی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے......مجھ میں بڑی ہمت ہے۔ میں بالکل نہیں تھکتی۔'' فرح نے اس کی نان اسٹاپ تقریر سن کر کہا۔

اس دن بھی وہ کم و بیش پینتیس پراٹھے پکا کر جو اٹھی تو اسے چکر سا آ گیا۔ اس نے برتنوں سے بھرے باورچی خانے کو ایک نظر دیکھا۔ سارے برتن جھوٹے پڑے تھے اور بہنیں ذرا سی بھی مدد نہیں کر رہی تھیں۔ پیاس بھی لگتی تو اسے پکارتیں۔ رہی سہی کسر نانی جان نے پوری کر دی تھی۔ ''میرے سر میں مالش کر، میرے پیر دبا......'' وہ دبا دبا کر تھک جاتی اور انہیں تسلی نہ ہوتی۔ ''اری تو میرے پیر دبا رہی تھی یا سہلا رہی تھی، ایسے دباتے ہیں کہ ہتھیلی کا دباؤ تک نہیں پڑتا۔'' ایک تو بلا کی گرمی، کڑوی کسیلی باتوں کا بوجھ۔ پھر چولھے کے پاس مسلسل بیٹھنے کی وجہ سے وہ تکان سے چور ہو گئی تھی۔ اپنے پہلے چکر کو نظر انداز کر کے...... برتن دھو کر جب کھڑی ہوئی تو ایسا سر چکرایا کہ دیوار تھامتے بنی۔ اشرف کی ماں کسی کام سے جو اس طرف آئیں تو اس کو چکراتے دیکھ چکی تھیں۔

بھاگ کر پاس آئیں اور سرشار لہجے میں بولیں ''جھلی کہیں کی۔ بتایا کیوں نہیں کہ دن چڑھ گئے ہیں۔''

''نہیں امی! گرمی کی وجہ سے طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

''ہونہہ، پاگل نہیں تو...... تجھے کیا پتا...... کہ کس وجہ سے تیری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کیا تو نے بچے جنے ہیں...... جو سب باتیں معلوم ہوں گی۔ ادھر آ، میرے پاس......کوئی الٹی بھی ہوئی یا نہیں۔'' وہ مزید کریدنے لگیں۔

''مگر میں تو گرمی کی وجہ سے......'' وہ سر پکڑتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی۔

''آرام سے کام کر لینا۔ چل آ کے بیٹھ میرے پاس'' وہ خوشی سے بولیں۔ ''منہ کڑوا سا ہو رہا ہو گا ناں۔ ایسا ہی ہوا کرتا ہے'' وہ بے مہار ہنسیں۔

''ہونہہ، یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ تو کام مت کر۔ باقی کام میری بیٹیاں کر لیں گی'' فرح نے سوچا۔

''ارے کیا ہوا، بڑے لاڈ اٹھائے جا رہے ہیں بہو کے؟'' بڑی آپا آم چوستی ہوئی پاس آ کر بولیں۔

''اب تم لوگ پھپھو بننے والی ہو۔'' اماں نے سرشار لہجے میں کہا۔ ''تیاری کر لو نیگ لینے کے لیے۔ پہلا پہلا بھتیجا آئے گا، ہاں۔''

''اچھا، بڑی سیانی ہے، بتایا تک نہیں۔ ارے چھپانے والی بات کیا تھی.....اور پھر کب تک چھپاتیں...... ہے ناں اماں'' بڑی آپا نے آم کی گٹھلی صحن میں پھینکتے ہوئے بدتمیزی سے ہنس کر کہا۔

''اس کی عادت ہی ہے چھپانے کی تو یہ بے چاری بھی کیا کرے'' چھوٹی آپا پاس آئیں تو اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے رائے دی۔

''امی...... میں کیا چھپاتی ہوں؟'' وہ پریشان سی نظروں سے انہیں تکتے ہوئے بولی۔

''اے لو، یہ بھی ہم بتائیں......؟'' انہوں نے تیکھی نظروں سے اپنی بہن کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بتادو ناں آپا! یہ بے چاری بھی سوچتی ہو گی کہ پاگلوں کو کچھ پتا ہی نہیں چلتا......اور یہ من موجیاں کرتی رے۔''

''رات کو خوب بیٹھے پان کھاتی ہو ناں......''

''اشرف نانی بھی لا کر کھلاتا ہے......اور پرسوں آئس کریم بھی چوری چوری کھائی تھی ناں اپنے کمرے میں......'' وہ ہنسیں۔

''جی...... میں نے......؟'' وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

''اور کیا ہم جھوٹ تھوڑی کہہ رہے ہیں۔ تم روزانہ اپنے کمرے سے جو کوڑا نکالتی ہو، ہم نے اس میں خود پان کے کاغذ، ٹافی کے ریپر اور آئس کریم کے خالی کپ دیکھے ہیں۔''

''اوہ......وہ تو بچے کھا کر میرے کمرے میں چھوڑ جاتے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی ''پوچھ لیجیے آپ گڈو ے...... بے بی نے پان کھائے تھے، اس کے کاغذ ہوں گے۔''

''اب کسی کے بھی ہوں مگر نکلے تو تمہارے کمرے سے۔ ہم تو تمہیں ہی سمجھیں گے۔'' وہ کھسیا کر اپنے پاس ھڑے بچے کو گود میں لے کر چلی گئیں۔

''کیا کھائے گا میرا بچہ! بڑا بھوکا سا لگ رہا ہے؟'' وہ اسے آم کھلاتے ہوئے بیان بازی علیحدہ کر رہی تھیں بچے سے زیادہ خود کھا رہی تھیں۔

وہ پانی پی کر پھر کام کرنے میں جت گئی کہ اس سے خلاصی تو کسی صورت میں نہیں تھی۔

رات میں اشرف کا رویہ قدرے بہتر تھا۔ ''کل تم کو اماں...... ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گی۔''

''ہوں'' اس نے بے توجہی سے سنا۔ مارے تھکن کے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

''سنو، اگر ہمارے ہاں لڑکا ہوا تو میں اس کا نام شعیب اختر رکھوں گا۔'' وہ پرمسرت لہجے میں بولا۔

''شعیب اختر کیوں؟''

''جھلی......وہ بہترین کرکٹ کھیلتا ہے......تاکہ ہمارا بیٹا بھی کرکٹ کھیلے۔''

''مگر تمہارا نام تو اختر نہیں ہے تو پھر اختر کیوں لگاؤ گے؟'' اتنا اسے بھی علم تھا کہ باپ کا نام لگاتے ہیں۔

''بس مجھے شعیب اختر پسند ہے ناں...... اس لیے پورا نام رکھوں گا۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''اور اگر لڑکی ہوئی تو......؟''

''میرے نہیں ہو گی لڑکی وڑکی۔''

''کیوں، تمہیں الہام ہو گیا ہے کیا......؟''

''واقعی، کمینی سی عورت ہے تو...... شکل اچھی نہیں ہے تو بات تو منہ سے اچھی نکالا کر...... جو لوگ لڑکی لڑکی الاپتے ہیں ناں، ان کے ہاں لڑکی ہی ہوتی ہے۔ دیکھ لینا، اگر لڑکی ہوئی تو تیری وجہ سے ہی ہو گی۔ بڑی بدبخت عورت ہے، اچھی بات منہ سے نکالتی ہی نہیں ہے۔''

''اللہ جو بھی دے، نصیب والا دے۔'' اس نے اشرف کے برہم مزاج کو دیکھتے ہوئے بات ختم کرنے کی سعی کی۔

"سب سے زیادہ تو شجاع جلے گا، جب میرا پتر ہوگا۔" وہ آپ ہی آپ ہنستے ہوئے بولا۔

"وہ کیوں بھلا......" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"وہ اس لیے...... کہ میں نے اسے ہرا دیا...... اس کی بیوی اور اماں ابھی پرسوں ہی آپا کو ملی تھیں کہیں۔ آپا نے پوچھا تھا اس کی ساس سے...... کہ دادی کب بن رہی ہو تو شجاع کی ماں کلس کر بولی تھیں...... کہ شہر والی لڑکیاں جلدی مائیں نہیں بنتی ہیں۔ آپا بتا رہی تھیں کہ اس کی بیوی کا مارے خفت کے ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔"

"ہوں......" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

"کل تو ڈاکٹر سے چیک اپ کرا کے آئے گی تو میں اچھی سی بچے کی تصویر دیوار پر چپکا دوں گا کہ ویسا ہی بچہ ہو۔ خوبصورت اور صحت مند سا۔"

"ہوں......" وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

"ابھی کسی کو بتانا نہیں کہ ہمارے ہاں بچہ آ رہا ہے ورنہ پہل کے بچے پر نظر بڑی جلدی لگتی ہے۔"

"ہوں......" اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

اور جب اگلے دن فرح چیک اپ کے لیے پہنچی تو نگین بھی وہیں موجود تھی۔ پریگننسی ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر نے دونوں کو ایک ساتھ ہی بتایا۔ "نگین، آپ کی رپورٹ پوزیٹو آئی ہے۔ آپ حمل سے ہیں اور فرح، آپ کی رپورٹ نگیٹو ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب! اس کو چکر تو بڑے لمبے لمبے آتے تھے۔" ساس کو یوں لگا جیسے ڈاکٹر جھوٹ بول رہی ہے۔

"اماں جی، گرمی کتنی سخت پڑ رہی ہے اور پھر یہ کتنی کمزور ہے، خون کی کمی ہے۔ ناخن دیکھیں، کیسے سفید ہیں اس کے، چہرہ کیسا پھیکا سا ہو رہا ہے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے حلقے...... کیلشیم کی بھی بے حد کمی ہے۔ اتنی کمزور لڑکی کے تو ابھی بچہ ہونا بھی نہیں چاہیے اور پھر ہے کتنی چھوٹی سی...... مجھے تو بے حد کم عمر سی لگ رہی ہے۔" ڈاکٹر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ناں جی...... کوئی چھوٹی عمر نہیں ہے۔ میرے تو اس عمر میں دو بچے ہو گئے تھے۔"

"اماں جی، تمہاری اور بات ہے۔ اس عمر میں بھی اچھی صحت کی حامل ہو اور چاق چوبند ہو مگر اپنی بہو کی شکل دیکھو تو ایسا لگ رہا ہے کہ اسے رج کر روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو آپ...... یہاں تو یہ حال ہے کہ کھائے بکری کی طرح اور سوکھے لکڑی کی طرح۔" اشرف کی ماں کو غصہ ہی تو آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ ڈاکٹرنی فرح کی کوئی خاص رشتے دار ہے اور موقع پا کر اس کے جوتے لگا رہی ہے۔

"ٹھیک، ٹھیک ہے...... آپ اپنی بہو کو متوازن غذا کے ساتھ ساتھ یہ دوائیں بھی دیں اور طاقت کے ٹیکے بھی لگوائیے ورنہ کبھی بیمار پڑ جائے گی۔"

اور اشرف کی اماں ڈاکٹرنی کو نفرت سے گھورتے ہوئے کلینک سے باہر نکل آئیں۔

سارے راستے وہ اسے گالیاں سناتے ہوئے چل رہی تھیں۔ جیسے وہ فرح کی کوئی سگی ہو اور فرح اس صورت حال سے مزید خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔

"کب ہوگا بچہ......؟" گھر میں قدم دھرا ہی تھا کہ سب بہنوں نے کورس میں پوچھا۔

"یہ نخرے تھے اس کے، کوئی بچہ وچہ نہیں ہو رہا......" ساس نے تمسخر سے فرح کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ...... پھر جو چکر آیا تھا...... دیوار کو پکڑ کر جو چل رہی تھیں، وہ سب کیا تھا؟"

"اداکاری تھی اور بس......"

"پھر بھی ڈاکٹر نے کیا کہا، آخر کب ہوگا بچہ؟" بڑی آپا کو کوئی تسلی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے...... کہ یہ ہر وقت بستر پر مری رہا کریں۔ جاؤ...... سو جاؤ، کر لیں گے ہم کام......"

"کھانا تو میں پکا کر گئی تھی اماں!" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اسے ان سب باتوں کا مطلب ہی سمجھ نہیں رہا تھا۔ اس سے کہاں غلطی ہوئی تھی، وہ یہ جان ہی نہیں پا رہی تھی۔

"گھر میں ہر وقت کام ہوتا ہے۔ کھانا دینا کیا کام نہیں ہے۔ اب ہم سب کو دیں گے، رکھیں گے، اٹھائیں گے۔ یہ سب کام ہی ہے ناں۔ مگر تمہیں اس سے کیا، تم جاؤ...... اپنے کمرے میں آرام کرو۔"

اور وہ پانی کا گلاس پی کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور جب اپنے بستر پر لیٹی تو وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اس ٹینشن کی کیفیت میں بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

"الو کی پٹھی! لے کے نام کٹوا دی ناں ہماری" اشرف اس کے سر پر کھڑا بری طرح دہاڑ رہا تھا۔ آج وہ گھر جلدی آ گیا تھا۔

وہ گہری نیند میں تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اشرف کس بات پر ناراض ہو رہا ہے؟ اس نے مندھی مندھی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ غصے سے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہل رہا تھا۔

"اٹھ کے بیٹھ، دن میں بھی بھلا کوئی سوتا ہے، جو تو یوں گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے۔"

اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی جیسے بیٹھنا اس کا حق نہ ہو۔ "تو، تو کہتی تھی کہ میں بہت کام کرتی ہوں۔ تو اس وقت ابا باپ کام کر رہا ہے گھر میں؟"

اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ کچھ بولنا چاہا، اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔ کیا فائدہ تھا کچھ بولنے سے۔ لڑائی نے طول ہی پکڑنا تھا۔

"لیں، پانی پی لیں آپ" اس نے پاس رکھے ہوئے کولر میں سے ایک گلاس اسے نکال کر دیا۔ اس کی سہیلی نے بھی بتایا تھا کہ جب اشرف کو غصہ آئے تو پانی پلا دیا کرو۔ غصہ آگ ہوتا ہے، پانی سے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

پانی پی کر اس کی برہمی کم ہوئی اور وہ بیٹھ گیا۔ "کمینہ شجاع...... جیت گیا۔ اس کے ہاں بچہ ہو رہا ہے، ہمارے نصیب سوکھے پڑے ہیں۔"

"ہمارے ہاں بھی بچہ ہو جائے گا، پریشانی کی کون سی بات ہے" اس نے اپنے پلو سے اشرف کے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہماری شادی پہلے ہوئی تھی، اس حساب سے ہمارے ہاں پہلے ہو جانا چاہیے تھا ناں۔"

"کیا پتا، ہمارے ہاں جڑواں بچے ہو جائیں، ایک ساتھ دو بچے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ اشرف کو مطمئن کرنے کے لیے وہ اپنی جانب سے پوری سعی کرتی تھی۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔ پھر تو لاٹری نکل آئے گی ہماری۔"

"ہاں، ایسا ضرور ہوگا۔ لاٹری میں ہمارا انعام ضرور نکلے گا۔"

"کیا واقعی......؟" وہ مسکرا کر اس سے پوچھنے لگا "اماں کہتی ہیں جس کے خاندان میں جڑواں بچے ہوتے

ہوں، وہاں ہی ہوتے ہیں پر ہمارے خاندان میں تو آج تک کسی کے ہاں جڑواں بچے نہیں ہوئے'' وہ پھر اداس سا ہو گیا۔

''میرے خاندان میں تو دو تو کیا، تین تین بچے تک ہوئے ہیں۔'' اس نے جھوٹ گھڑا۔

''کس کے......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہماری اماں کی ایک رشتے کی بہن انڈیا میں رہتی ہیں۔ ان کے ہاں جڑواں بچے ہوئے۔ ابا کے پھوپی زاد بھائی بنگلہ دیش میں رہتے ہیں ان کے تو سارے بچے ہی جوڑوں کی صورت میں آئے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ہاں بھی ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔''

''آج رات کو میرے ساتھ چلنا ٹہلنے کے بہانے۔ تجھے آم کا شربت پلا کر لاؤں گا۔'' اشرف نے خوش ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

''کھانا کھایا تو نے؟''

''نہیں ڈاکٹر کے پاس سے آنے کے بعد سو گئی تھی۔''

''جا، لے کر آ جا...... کھانا۔ دونوں ساتھ کھاتے ہیں۔''

اور جب وہ کھانے کے بعد برتن لے کر باہر رکھنے گئی تو اس کی نندیں، اپنی اماں سے کہہ رہی تھیں۔

''ایسے ہوتے ہیں زن مرید...... جنہیں اپنی بیوی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ہمیں دکھانے کے لیے بک بک کرتے ہیں اور بیوی کو دیکھ کر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے ہیں۔''

اور فرح دل ہی دل میں ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زندگی کتنی مشکل تھی...... اور اس کو مزید مشکل اس کی سسرال والوں نے بنا دیا تھا۔

☆☆☆

فہمی کی بھوک پیاس جیسے سب اڑ گئی تھی۔ صبح کا ناشتا ماسی اس کے کمرے میں رکھ گئی تھی اور اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہ لے آئی تھی اور وہ مستقل چھت کی کڑیاں گننے چلی جا رہی تھی۔

''باجی جی! تسی روٹی کھائیو......'' ماسی نے جاتے جاتے کہا۔

''ٹھیک ہے، کھا لوں گی'' فہمی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور تیزی سے چلتے پنکھے کی پنکھڑیاں دیکھنے لگی۔ رفتار تیز ہو تو کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا اور جب دھیرے دھیرے چلے تو پنکھے کے پر کیسے جھومتے ہوئے چلتے ہیں۔ جیسے کوئی پھول گھوم رہا ہو۔

''اور ایک میں ہوں...... کوئی پھول میرے پہلو میں ہمکتا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرے اولاد ہی نہیں ہوگی۔'' اس نے سوچنا شروع کیا تو اسے یوں لگا جیسے وہ کسی صحرا میں بھاگ رہی ہو اور پانی کی کوئی بوند بھی اس کے لیے نہیں ہے۔

''ارے فہمی! تم یہاں اکیلی پڑی ہو۔'' فیروزہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے یوں ساکت سا دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

''میرا بستر سے اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔ وہ ماں کی بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکی تھی۔''

''ارے، تم نے تو ناشتا بھی نہیں کیا۔ یہ انڈا پراٹھا اور کپ کی چائے یونہی ہے۔''

اب فیروزہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''امی، میرا کسی چیز کو بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''فہمی! تم ابھی زچہ ہو۔ دل چاہے یا نہ چاہے، تمہیں کھانا چاہیے تھا اور یہ بھابی جان ویسے تو بہت محبت ٹھارتی پھرتی ہیں، ان سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ آ کے دو نوالے بچی کے منہ میں دے دیتیں۔''

ممانی جان بھی باہر کھڑی سن گن لے رہی تھیں، فوراً کمرے میں آئیں اور چمک کر بولیں ''یہ میں نہیں کہتی، بڑے بوڑھوں کی مثال ہے کہ جو ماں سے زیادہ چاہے وہ پھا پھا کٹنی۔ تم ماں ہو، اپنی بیٹی کی خدمت کرو، میں تو اپنا لیجا چیر کے بھی کھلا دوں گی۔ پھر بھی ساس ہی کہلاؤں گی۔ یوں کرو کہ تم فہمی کو اپنے گھر لے جاؤ۔ ہماری طرف ے اجازت ہے۔ جتنی خدمت کر سکتی ہو اپنی بیٹی کی کرو۔ اپنے ہاتھوں سے نوالے کھلاؤ، تیل کی مالش کرو۔ آخر اماں ہو...... اور دنیا کی مائیں کرتی ہیں، ایک تم کر لو گی تو کوئی یہ مجھ پر احسان نہیں ہوگا۔''

''کم از کم سوا مہینے تک تو آپ کو اپنے گھر میں رکھنا چاہیے تھا۔'' اب فیروزہ جز بز سی ہو گئیں۔

''نہ مجھ میں دم ہے اور نہ ہمت کہ تمہاری بیٹی کی ٹلے نویسی کروں۔ جب سے بیاہ کر لائی ہوں سوائے خدمتیں رنے کے میں کر کیا رہی ہوں۔ میں تو بھر پائی ایسی بہو سے۔''

''ٹھیک ہے، میں لے جا رہی ہوں۔ اب اگر چار دن بعد فہد لے جانے کے لیے آ گیا تو بھیجوں گی نہیں'' فیروزہ لب بھینچ اس کے کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''تم جی بھر کر رکھو...... ہم لینے نہیں آئیں گے'' ممانی جان نے کلس کر کہا۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے آپ کا......'' فیروزہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''فیروزہ......! میرا ایک ہی بچہ ہے۔ میں اس کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ فہمی کے ہاں اولاد ہوگی۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ خناس بھر گیا ہے...... اتنی جلدی جلدی پریگنینسی ہوگی تو بچہ ضائع ہونا ہی تھا جب کہ ڈاکٹر نے بھی کہا تھا کہ پہلے صحت پر توجہ دو۔ مگر آپ تو چاہتی ہیں کہ بچے درخت سے توڑ کر لے آ جائیں۔''

''میں پاگل...... میرے دماغ میں خناس۔ مجھے تمہارے سارے کچوکے قبول مگر خدا کے لیے فہمی کو اپنے گھر اس وقت تک رکھو جب تک میرے دل سے یہ غم نہ مٹ جائے۔''

''چلو فہمی!'' فیروزہ نے سرعت سے فہمی کو اٹھایا۔

اور وہ ماں کے سہارے سے اس طرح چلنے لگی جیسے اس گھر کو آخری بار دیکھتے ہوئے جا رہی ہو۔

ان دونوں نے دہلیز سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ ممانی جان نے تیزی سے گیٹ بند کر دیا۔ دروازے کی لکی سی چرچراہٹ پر دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں فہمی کی پالتو بلی...... اداسی سے منہ اٹھائے فہمی کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اکٹر کبریٰ صرف پیر اور ہفتے کو حاملہ خواتین کو چیک کیا کرتی تھیں باقی یوم دیگر مریضوں کے لیے تھے۔ نگین طلال کا ٹیکا لگوانے کے لیے ایک دن چھوڑ کر ان کے کلینک جاتی تھی۔ ڈاکٹر کبریٰ کی اسسٹنٹ اس کے ٹیکا لگاتی

تھی۔

اس دن وہ ٹیکا لگوانے گئی تھی کہ اس نے اپنے محلے کی راجی کو دیکھا۔ ایک بڑی سی چادر میں وہ اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے، حراساں سی وہ ڈاکٹر کبریٰ کے کلینک پہنچی تھی۔

”کیا بات ہے راجی! کیوں اتنی پریشان سی ہو؟“ ڈاکٹر کبریٰ گاؤں کے سب لوگوں کو ہی جانتی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب، آپ مجھے چیک کر کے بتائیے کہ بچہ کب تک ہوگا۔“

”بچہ ہوگا...... مگر تمہاری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔“ انہیں یاد تھا کہ اس کا منگیتر خاندانی لڑائیوں میں مارا گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے راجی کی شادی کا سوچا ہی نہیں تھا۔

”جاوید مرا نہیں ہے۔ وہ روز میرے پاس آتا ہے جب سب سو جاتے ہیں۔“ راجی رازدارانہ لہجے میں بولی

”مگر وہ میرے سوا کسی کو نظر نہیں آتا۔“

”مگر اس کے جنازے میں، میں خود شریک ہوئی تھی۔“ ڈاکٹر کبریٰ نے حیرت سے اسے دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر کوئی شبہ ہو۔

”اگر وہ مر گیا ہوتا تو میرے پاس کیسے آتا۔ یہ بچہ اسی کا ہے“ اس نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کس کا گناہ سمیٹ کر آئی ہو تم؟“ ڈاکٹر کبریٰ کی آواز خاصی اونچی ہوگئی تھی۔

”آپ جو کہیں گی، میں وہ قسم کھا لوں گی مگر آپ یقین کریں، یہ جاوید کا ہی بچہ ہے۔ وہ روز آتا ہے جی!“

”کتنے مہینے کا ہے؟“ ڈاکٹر کبریٰ اسے چیک کرتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”میرے حساب سے تو پانچ مہینے کا ہے۔“

انہوں نے چیک اپ کیا تو خاصی حیرت زدہ سی رہ گئیں اور جب پریگننسی ٹیسٹ کروایا تو ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

”راجی! تمہیں تو کوئی پریگننسی نہیں ہے۔“ وہ انتہائی دکھ سے راجی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”مگر ڈاکٹر صاحب، میں پانچ ماہ سے پاکی کا نہانا بھی نہیں نہائی ہوں اور وہ روز آتا ہے، جاوید......“

”یہ سائیکی کیس ہے راجی! اپنی ماں کو میرے پاس بھیجنا۔ میں اسے سمجھاؤں گی ......اور تم جاؤ، تمہیں کچھ نہیں ہوا۔“

نگین حیرت سے چور جب ڈاکٹر کبریٰ کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھیں۔

”یہ نفسیاتی امراض ......لڑکیوں کے خوابوں اور تصورات میں کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں کہ وہ جیسا سوچتی ہیں، ان کے جسم میں بھی ویسی ہی تبدیلیاں ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ کاش نفسیاتی مریضوں کو بھی کوئی ویسا سمجھا کرے۔ ان کا علاج کرایا کرے......اور لڑکیوں کی جانب سے ان کے اہل خانہ کبھی بے پروانہ رہا کریں۔“

دوسرے ہی دن راجی کی ماں لرزتی کانپتی سی ڈاکٹر کبریٰ کے کلینک میں موجود تھی۔

”تم راجی کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں......“ ڈاکٹر کبریٰ نے چھوٹتے ہی پہلا سوال یہ کیا۔

”اس منحوس سے کون شادی کرے گا، جس کا منگیتر شادی سے پہلے ہی مر گیا۔“

”تم اپنے بیٹوں سے کہو تو سہی کہ راجی کی شادی ہو جانی چاہیے۔“

”اس کے بھائی پیسے والے ہیں، وہ کسی غریب سے کیسے کر دیں، ان کی ناک نیچی ہوگی۔“

”تم اپنے بیٹوں کو سمجھاؤ کہ کسی نیک، صحت مند اور شریف لڑکے سے شادی کر دو۔ بے شک وہ غریب ہی ہو۔ کم از کم راجی کی ذہنی حالت تو سدھر جائے گی۔“

”وہ تو جی، کمرے میں اندھیرا کیے ہر وقت پڑی رہتی ہے۔ آپ ہی آپ بولتی ہے، آپ ہی آپ ہنستی ہے، مجھے تو لگتا ہے، اس پر کوئی جن آ گیا ہے۔“

”کوئی جن بھوت نہیں آیا ہے۔ وہ نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔ اس کی جلدی شادی کر دو......ورنہ وہ مر بھی سکتی ہے۔“

”اچھا جی! میں تو پھر زور دوں گی بیٹے پر کہ راجی کی شادی چھیتی (جلدی) ہی کرنی ہے۔“ ماں نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں جلدی سے تم اس فرض سے فارغ ہو کہ لڑکی اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ اپنے اندر کے شور کو خود ہی سہتی رہے اور مسکراتی رہے۔

☆☆☆

نگین کو ٹیلی فون پر پتا چلا تھا کہ فہمی گھر آ گئی ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے۔ اسے اپنی بہن، اپنا گھر بہت یاد آ رہا تھا۔

”شجاع، میں گھر چلی جاؤں؟“ ایک شب اس نے بڑی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”تم چلی جاؤ گی تو پھر میں کیا کروں گا؟“

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“

”میں ساتھ چلا گیا تو یہاں ماں اکیلی رہ جائیں گی۔“

”اسکول تو تمام بند ہیں ناں۔ آپ فرحت آپا سے کہہ دیں کہ پندرہ بیس دن کے لیے اماں کے پاس آ جائیں۔ اتنے میں ہم کراچی گھوم آئیں گے۔“

”اپنی حالت کا اندازہ ہے، سفر کرو گی؟“

”کچھ نہیں ہوگا مجھے، بس تم میرے ساتھ چلو۔ پلیز شجاع، میرا دل یہاں گھبرا سا رہا ہے۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے امی کے پاس لے چلو۔“

”ٹھیک ہے، کل چلتے ہیں۔“ شجاع اس کی بات رد نہیں کر سکا۔

اگلے دن جب وہ جانے کے لیے نکلے تو عظمت بیگم نے خاصا فضیحتہ بھی مچایا۔ نگین کے ساتھ ساتھ شجاع کو بھی خوب صلواتیں سنائیں مگر شجاع مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

”پتا نہیں کم بخت نے کیا گھول کر پلا دیا۔ اس کی ہر بات مانتا ہے۔ مجال ہے کہ کبھی ماں کی بھی بات مان لے۔“ عظمت اب اپنا دکھڑا فرحت کے سامنے رو رہی تھیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔

”ٹھیک ہے، ان کی اپنی زندگی ہے۔ گزارنے دیں انہیں، آپ کو کیا......آپ کا مقصد سمجھانا تھا۔ اگر وہ نہیں سمجھتے تو آپ دفع کریں۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو جلاتی ہیں۔“

”بڑی بہن کے ہاں کون سے بچے ہوئے ہیں جو اس کے ہاں ہوں گے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ شجاع بھی ناٹھا کھڑا سا ہی رہے گا۔ کوئی بچہ وچہ نہیں ہوگا اس کے ہاں۔“

”اللہ مالک ہے، جب اللہ نے یہ خوشی دکھائی ہے تو انشاء اللہ اس آنگن میں میرے بھائی کے بچے کھیلیں

گے بھی۔‘‘

’’جب میں نے منع کیا تھا کہ کچے دنوں میں سفر نہیں کیا کرتے تو اس کو میری بات ماننی چاہیے تھی ناں؟ مگر ہے ناں فیروزہ کی بیٹی۔ ہر بات میں میری بیٹی کرتی ہے۔‘‘

’’امی! شجاع بھائی بتا رہے تھے کہ ان کی ممانی جان نے فہمی کو گھر بٹھا دیا ہے۔ اسی وجہ سے نگین پریشان ہو کر اپنے گھر گئی ہے۔‘‘

’’فہمی بھی فیروزہ کی بیٹی ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوئی ہوگی...... جو اس کو اس کی ساس نے گھر بٹھا دیا۔‘‘ عظمت بیگم کمزحل سے لہجے میں بولیں۔ ’’فہمی میں اپنی ماں کا رنگ زیادہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ پہلوٹھی کا بچہ بالکل اپنی ماں کی عادتوں پر جاتا ہے۔‘‘

’’مگر شجاع بھائی تو آپ پر نہیں گئے، ان کی طبیعت میں لچک ہی نہیں ہے۔ جو دل چاہتا ہے کرتے ہیں۔ ایک منٹ میں اولیا اور ایک منٹ میں بھوت والی مثال ان پر صادق آتی ہے۔‘‘ فرحت نے مسکرا کر کہا۔

’’شجاع! اپنے باپ پر گیا ہے، تمہارے باپ بھی ایسے ہی تھے۔‘‘

’’تو یہ کہیے ناں کہ لڑکیاں زیادہ تر اپنی ماؤں کا عکس ہوتی ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہی بات ہے۔‘‘

’’مگر نگین بھابی تو ایسی نہیں ہیں، جو بات کہو...... حلیمی سے مان جاتی ہیں۔ آڑھی مانگ نکال کر چوٹی بناتی تھیں، میں نے کہا بھابی! آپ کی ایسی روشن پیشانی ہے، آپ سیدھی مانگ نکال کر چوٹی بنایا کیجیے۔ اس دن سے وہ سیدھی مانگ نکالنے لگیں۔‘‘ فرحت نے بھاوج کی تعریف کرتے ہوئے ماں کے بستر میں لیٹتے ہو کہا۔

’’یہ سب میاں کو دکھانے کی باتیں ہیں۔ میں نے کراچی جانے کو منع کیا تھا مگر چونکہ ان کی ماں نے بلایا تھا اس لیے انہوں نے ہرگز نہیں رکنا تھا۔ اس حالت میں بھی دیکھو، کیسے بھاگ کر گئی ہیں۔‘‘

’’ارے چھوڑیئے امی! جب سے شادی ہوئی ہے، وہ گئی کہاں تھیں...... شادی کے بعد پہلی مرتبہ تو اپنے میکے گئی ہیں۔ ان کی چوتھی تک تو ہوئی نہیں۔‘‘

’’اب اس میں بھی ہمارا قصور ہے کیا؟ بیٹی داماد کو گھر بلانا کوئی آسان ہوتا ہے۔ پیسے خرچ ہوتے ہیں، یہی سوچ کر ان لوگوں نے نہیں بلایا۔‘‘

’’چلیں چھوڑیں، اب تو بلا لیا...... بلکہ آپ تک کو آنے کو کہا۔‘‘

’’وہ جانتے ہیں میری عادت کہ ان کی بیٹی کے ساتھ ساتھ نہیں گھوموں گی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا بہو کے ساتھ ساتھ گھومنا۔‘‘

’’حکیم صاحب کی بیوی تو اپنے بیٹے بہو کے ساتھ ہنی مون تک پر چلی گئی تھیں۔‘‘

’’وہ تو جھلی ہے۔ بیٹے نے شرما شرمی ماں کو بھی پوچھ لیا اور وہ بھی ساتھ لد گئیں۔ نہ تمیز نہ حیا۔ بعد میں، میں نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔‘‘

’’اب کل حکیم صاحب کی بیگم کہہ رہی تھیں کہ ان کے بڑے بھائی کے لیے کوئی لڑکی بتاؤ۔ میں نے کہا خالہ! آپ کو لڑکی نہیں کوئی عورت ڈھونڈنی چاہیے۔ آپ کے بھائی کی بیوی کو مرے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ [illegible] سال کی لڑکی ہے ان کے۔ آپ تو کہیں ایسی جگہ شادی کریں اپنے بھائی کی جو ان کی بچی کو بھی سنبھالے۔‘‘

’’ٹھیک کہا تم نے۔‘‘ عظمت بیگم نے بیٹی کو سراہتے ہوئے کہا۔

’’مگر اس پر وہ بولیں کہ بھائی میرا پیسے والا ہے۔ اس کو تو کوئی کم عمری لڑکی چاہیے، اگر شہر کی پڑھی لکھی مل جائے تو بہت اچھی بات ہوگی۔‘‘

’’یہ فہمی کی نہ کروا دیں شادی...... یہاں؟‘‘ عظمت بیگم نے دور کہیں سوچتے ہوئے کہا۔

’’کمال ہے امی! فہمی تو شادی شدہ ہے۔ وہ کوئی لڑکا ہے، جو اس کی دوسری شادی آپ کروا دیں گی۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ فہمی کی یہ ناراضی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس کی ممانی اسے طلاق ہی دلوا کر رہے گی۔ بڑی کائیاں (تیز) عورت ہے۔ طلاق کے بعد فہمی کی شادی ہم یہاں گاؤں میں کرا دیں گے...... فرید احمد کے اوپر ایک احسان الگ رہے گا کہ ان کی اجڑی ہوئی بیٹی کو ہم نے آباد کروا دیا۔‘‘

’’اللہ نہ کرے کہ فہمی کو طلاق ہو۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں امی......‘‘ فرحت اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی...... اور تاسف بھری نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔

’’فرحت، تو میری یہ بات لکھ کر رکھ لے۔ فہمی کو طلاق ہی ہونی ہے اور وہ ہو کر رہے گی۔‘‘ عظمت بیگم نے بقراطی لہجے میں کہا۔

☆☆☆

کبھی برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا
بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
کوئی بارش ہو، یہ کاغذ، ذرا بھی نم نہیں ہوتا

”مجھ پر دکھوں کے پہاڑ گزر گئے اور تجھے خبر تک نہیں ہوئی...... دیکھ تو سہی کیسی بے نیل و نامرادی ہوں میں۔“ فہمی نے نگین کو دیکھ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”میری باجی......“ نگین اس سے بے اختیار چمٹ گئی۔ کتنی کمزور اور کتنی مایوس سی نظر آتی تھی فہمی اسے۔ اس کا دل غم سے پھٹنے لگا۔

نگین سے گلے مل کر کتنی ہی دیر فہمی بھی روتی رہی۔ جب اس کی سسکیاں کسی صورت میں بند ہونے کو نہیں آئیں تو فیروزہ نے اسے زبردستی علیحدہ کیا اور پانی پلایا۔

”باجی اپنے آپ کو سنبھالیے۔ دیکھیے تو سہی آپ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔“ نگین نے دوپٹے کے پلو سے اس کے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”کتنے عرصے بعد دیکھا ہے تمہیں۔ نہ تمہاری شادی میں شریک ہوئی اور نہ ہی تم میرے دکھوں میں شریک ہوئیں۔“

”یہ تو اتفاق ہے باجی کہ آپ کے ساتھ ایسا ہو گیا۔ درختوں سے اکثر کچے پھل جھڑ ہی جایا کرتے ہیں۔ اب اس اتنی سی بات کو آپ اپنی جان کا عذاب مت بنائیں۔“

نہ یہ اتنی سی بات ہے اور نہ ہی یہ جان کا عذاب۔“ فہمی پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

”پھر یہ کیا بات ہے؟“ نگین نے بہن کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی انہونی سی بات کہنے والی ہو۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں بدقسمت ہوں۔ رو رو کر میری شادی ہوئی۔ امی ابو کتنے پریشان ہو گئے تھے میرے لیے۔ بہت مجبوراً فہد کا رشتہ قبول کر لیا گیا۔ جو شاید امی کو اتنا پسند بھی نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ میری قسمت میں اولاد ہی نہیں لکھی۔ ہونی ہوتی تو فوراً ہی ہو جاتی۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اور پھر آپ کی شادی کو بہت زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔“

”پہلی مرتبہ اتفاق ہو گیا کہ بچہ ضائع ہو گیا...... مگر دوسری بار میرے ساتھ ہی اتفاق کیوں ہوا۔ میں تو ہر ممکن احتیاط کر رہی تھی۔ باقاعدگی سے اپنا چیک اپ کروا رہی تھی۔ بچہ کمزور ضرور تھا مگر ٹھیک ٹھاک تھا۔“

”باجی جس روح نے جس وقت آنا ہے‘ وہ اسی وقت آئے گی اور جب تک اللہ کا حکم نہیں ہو گا‘ کوئی خوشی نہیں ملے گی‘ اس لیے ہم سب کو اس کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔“

”مگر میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں؟“

”جیسے بھی ہو سمجھائیں۔ ابھی آپ کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے تو برس ہا برس بعد اولاد ہوتی ہے۔“

کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میں کوشش کروں گی کہ دل سے غم کی چادر کو جلد ہٹا سکوں۔“

”آپ یہ سوچیے کہ فہد بھائی آپ کو آزردہ سا دیکھ کر کتنے ملول سے رہتے ہوں گے۔“

”ہوں......“

”ممانی جان کو کتنا دکھ ہوتا ہو گا۔ آپ کو یوں آنسو بہاتے دیکھ کر۔“

”ہاں۔“

”تو پھر سب کو خوش رکھیے۔ یہی آپ کی خوشی ہو گی۔“

”چندا...... سب کو خوش رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے‘ لگتا ہے ابھی تجھے آٹے چاول کا بھاؤ معلوم نہیں ہوا ہے۔ عظمت پھپھو شاید تیرا بہت خیال رکھتی ہیں۔“

”ہاں بہت رکھتی ہیں۔“ نگین نے ہنس کر کہا۔

”مگر تو دبلی تو اس قدر ہو رہی ہے۔ گاؤں میں رہ کر رنگ تک دب گیا۔“ فیروزہ بیگم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ملک شیک کا گلاس پکڑاتے ہوئے کہا۔

”وہ...... تو دوسری وجہ سے ہے۔“ نگین نے شرماتے ہوئے کہا۔

”ارے واقعی! بتایا تک نہیں۔“ فیروزہ نے خوشی سے کہا۔

”میں نے سوچا‘ جا کر بتا دوں گی۔“

”عظمت پھپھو نے اس حالت میں سفر کرنے سے منع تو نہیں کیا۔“

”ہاں کیا تو تھا...... مگر آپ سب اتنا یاد آ رہے تھے کہ میں ضد کر کے آئی ہوں...... مگر سارے راستے اپنے اوپر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتی آئی ہوں۔“

”اب خوب ڈھیر سارے دن رہنا تم دونوں میرے پاس۔ کتنے عرصے بعد میرے گھر میں رونق ہوئی ہے۔ ،، نہ تم دونوں کے جانے کے بعد گھر میں ایسی خاموشی چھا گئی ہے کہ دل ہمہ وقت گھبرایا رہتا ہے۔“

نگین کے آنے سے فہمی کی طبیعت پر بھی خوشگوار اثر پڑا تھا۔ وہ جو ہر وقت آنکھوں میں آنسو بھرے الٹی یدھی باتیں سوچا کرتی تھی، اس کے لب بھی مسکرانے لگے تھے۔

”شجاع تیرا خیال رکھتا تو ہو گا۔“ دونوں بہنیں پاس پاس لیٹی ہوتیں تو باتیں بھی چلتی رہتیں۔

”ہاں بہت رکھتے ہیں خیال وہ میرا۔“

”فرحت آ کر نند پنا تو نہیں دکھاتی۔“

”بالکل بھی نہیں!“

”اور گاؤں کے کسی گھر میں کوئی خاص آنا جانا ہے۔“

”نہیں...... کسی کے ہاں بھی نہیں جاتی، ماسوائے تقریبات کے!“

”وہ کیوں بھلا۔ اس طرح تو شہروں میں ہوتا ہے۔ گاؤں میں تو لوگ سب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ۔۔ کے ساتھ تم بھی جایا کرو۔“

”میرا کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

”کیوں بھلا......!“

“بس ایسے ہی۔ میرا دل گھر میں ہی لگتا ہے۔”

“کہیں ایسا تو نہیں تجھے اب بھی زبور یاد آتا ہو۔”

“نہیں باجی...... میں نے اپنی یادوں کے تمام چراغ گل کر دیئے۔”

“اچھا ہی کیا۔ زبور بہت برا ہے۔ کچھ عرصے قبل مجھے ملا تھا تو نفرت اور تمسخر بھرے لہجے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔”

“ہوں......” اس کا ذکر سن کر نگین سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

فہمی زبور اور اس کی ماں کو برا بھلا کہتی رہی اور نگین چپ چاپ سنتی رہی۔

“شجاع واقعی بہت اچھا ہے۔ تیرا کتنا خیال رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہمہ وقت محبت سے مسکراتی ہیں تجھے دیکھ کر!”

“ہاں...... آں......” نگین نے جمائی بھر کر کہا۔

“تجھے نیند آ رہی ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آج بھی رات بھر باتیں کریں گے۔”

“باجی گزشتہ چار راتوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ دن کی نیند میں رات کی نیند کہاں پوری ہوتی ہے۔”

“ہاں یہ تو ہے، چلو سو جاؤ۔ شجاع بھی سوچتا ہوگا کہ میکے جا کر اس کو بھول ہی گئی ہو۔”

اور جب نگین اپنے کمرے میں پہنچی تو شجاع واقعی جاگ رہا تھا۔

“دے دی بہن نے اجازت!” وہ ہنس کر بولا۔

“اتنے ڈھیروں دنوں کی باتیں ہیں، چند دنوں میں تو پوری نہیں ہو سکتی ناں۔”

“اسی لیے میں سوچ رہا ہوں صبح گاؤں چلا جاؤں۔ جب تم فون کرو گی تو آ کر لے جاؤں گا۔”

“ابھی کچھ اور دن کراچی رہ لیتے آپ......”

“نہیں۔ امی اداس ہو گئی ہوں گی۔ میں جلدی جاؤں گا تو وہ خوش ہو جائیں گی۔”

“ہاں، یہ تو ہے۔”

“اچھا تو پھر کب آؤ گی؟” اس نے ہنس کر پوچھا۔

“اگر یہ بات ہے تو ساتھ ہی چلتی ہوں۔”

“نہیں نہیں، تم رج کر رہو، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ کیا مذاق بھی نہ کروں تم سے۔ بتاؤ......” اس کا لہجہ شریر سا ہو گیا۔ تب وہ جھینپ کر ہنس دی۔

☆☆☆

فریال اپنی کسی کلائنٹ کے ساتھ باتوں میں اتنی محو تھی کہ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ ثنا مسز رحمان کے ساتھ اس کی بوتیک میں داخل ہو چکی ہے۔

جب ثنا کسی بات پر ہنسی تو اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مسز رحمٰن کے ساتھ ثنا اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔

فریال کی آنکھوں میں جیسے خوشی کے تمام رنگ سمٹ آئے۔ دوڑ کر ان کی طرف آئی۔

“آنٹی کیا چاہیے آپ کو؟” گو وہ پوچھ مسز رحمٰن سے رہی تھی مگر تمام حسیات ثنا سے ہی مخاطب تھیں۔ وہ اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی تھی۔

“کیا لو گی؟” اور ثنا آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنا پرس ساتھ نہیں لائی ہے اس لیے

کچھ بھی نہیں لے گی۔

“آج تو ہم یونہی آ گئے تمہارے بوتیک میں۔ ادھر سے گزر رہے تھے۔ میں نے ثنا کو بتایا کہ میں اپنے ملبوسات ”نازک بوتیک“ سے خریدتی ہوں۔ اس نے کہا چلیں آج ایک راؤنڈ لے لیں۔” مسز رحمان نے ہنس کر کہا۔

“ضروری نہیں کہ آپ کچھ خریدیں تب ہی میرے بوتیک میں آئیں۔ ویسے بھی آ سکتی ہیں۔”

“اسی لیے تو آ گئے۔”

مسز رحمان کا دل چاہ رہا تھا کہ مجسموں پر سجے ہر جوڑے کو دیکھیں، جب کہ فریال کا دل یہ چاہ رہا تھا کہ وہ صرف ثنا سے ہی بات چیت کرتی رہے۔

ان کو بصد اصرار کولڈ ڈرنکس پلائیں۔ چلتے وقت اس نے ثنا کو ایک جوڑا دیتے ہوئے کہا۔ “یہ آخری پیس رہ گیا ہے یہ تم لے لو۔ بے حد سستا سا ہے۔”

“پھر بھی کتنے کا ہے؟” مسز رحمان نے پوچھا۔

“صرف پانچ سو روپے کا۔ آخری پیس کی وجہ سے ورنہ اس کے ساتھ کے سوٹ خاصے مہنگے گئے ہیں۔”

“کسی اور سوٹ کا آخری پیس نہیں بچا ہوا۔ میں اپنی بھانجی کے لیے بھی لے لوں۔” انہوں نے خوب صورت نفیس سے سوٹ کو دیکھ کر بے صبری سے پوچھا۔

ثنا نے سوچا کہ وہی سوٹ مسز رحمان کو دے دے مگر فریال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ایسا کرنے سے منع کیا۔

“فی الحال تو کوئی نہیں ہے۔” فریال نے کہا۔

“یہ لو پانچ سو روپے......” مسز رحمٰن نے اپنا بٹوا کھولا۔

“ارے آنٹی میں آ کر دے جاؤں گی۔”

“ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اس بہانے ثنا میری بوتیک پر دوبارہ آ جائیں گی۔” فریال کے چہرے پر خوشی کی کرنیں بکھر گئیں۔

“مجھے اس کے پیسے نہیں چاہئیں۔ یہ میری طرف سے ہے۔” مسز رحمان نے پانچ سو کا نوٹ فریال کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

ثنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھنے کو کہا اور پھر وہ خدا حافظ کہتی ہوئی مسز رحمان کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اور فریال کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ یہ سوٹ اس نے بطور خاص ثنا کے لیے ڈیزائن کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فیروزی کلر اس کا ہارٹ فیورٹ ہے۔

“ثنا اس کو پہن کر کتنی اچھی لگے گی۔” وہ آنکھیں بند کر کے یہی سوچے چلی جا رہی تھی۔

“بھتیجی سے مل کر اتنی خوش ہو کہ دن میں بھی سو گئیں۔” صادقہ باجی دور سے بیٹھی اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پاس آ کر بولیں تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

“فریال گھر چلیں۔”

“آج اتنی جلدی۔” یہ دونوں شام سات بجے تک بوتیک میں ٹھہرا کرتی تھیں۔ جبکہ بوتیک رات کو نو بجے بند ہوا کرتا تھا۔

’’ہاں، آج گھر جا کر کوئی مزے دار سی چیز کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔‘‘

’’پتا نہیں بوا نے کیا پکایا ہوگا۔ میں جا کر چکن جل فریزی بناتی ہوں۔‘‘

’’اس گرمی میں کوئی دردسری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زینوز سے لیتے ہوئے چلتے ہیں۔‘‘

وہ دونوں ٹی وی دیکھتے ہوئے کھانا کھا رہی تھیں۔ اس وقت خبرنامے میں قطر سے آنے والے لوگوں کو دکھایا جا رہا تھا۔ جو کسی رفاہی تنظیم کی مدد سے وہاں سے رہا ہو کر پاکستان آئے تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے، بڑھی ہوئی داڑھی، ننگے پیر۔ عدیل کو دیکھ کر وہ یک ثانیے کے لیے دہل سی گئی۔ ہاتھ کا نوالہ بے ساختہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں گر پڑا۔ صادقہ باجی نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے جو ٹی وی پر نظر کی۔

عدیل...... گھبرائے ہوئے لہجے میں اپنے ایجنٹ کی شکایات بیان کر رہا تھا جس نے اس کے پیسے لے کر اسے غیر قانونی طور پر قطر میں داخل کیا تھا اور اس کی پاداش میں وہ بغیر کسی جرم کے جیل میں رہا تھا۔

صادقہ باجی نے ٹی وی کا بٹن بند کر دیا۔

’’فریال کھانا کھاؤ تم...... تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں جو یوں پریشان ہو گئیں۔‘‘

’’ہاں...... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں...... مگر اپنے پیاروں سے دوری کی سزا تو میں بھی کاٹ رہی ہوں۔‘‘

’’میرا تم سے خون کا رشتہ نہیں ہے شاید...... میں تمہارے غم کم نہیں کر سکی ہوں۔‘‘ صادقہ باجی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

’’یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید میں زندہ درگور ہوتی۔ یہ آپ ہی ہیں۔ جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا...... اور آج میں جو کچھ بھی ہوں اللہ کی رحمت کے بعد آپ کی وجہ سے ہوں۔‘‘

فریال کڑھنا چھوڑ دو۔ یہ آزمائش...... کسی کسی کے لیے ہوتی ہے اور جو اس میں سے نکل گیا، اسے سارے کے سارے سکھ مل جاتے ہیں۔ بس اللہ کی ذات سے کبھی ناامید مت ہونا۔ امید اور ناامیدی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ امید ہاتھ پکڑ کر چلتی ہے اور کبھی دل کو شکستہ نہیں ہونے دیتی اور ناامیدی پہلے دل کا ریزہ ریزہ کرتی ہے اور پھر پیر کھینچ کر گرا دیتی ہے اور تم جانو جو منہ کے بل گر جائے اس کے اٹھنے میں بہت وقت لگتا ہے۔‘‘

تب فریال ایک گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

کتنے فون کیے تھے مگر فون سدا انگیج ہی ملتا۔ موبائل پر فون کیا تو یہی آواز سنائی دیتی کہ اس وقت ساری لائنیں بزی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد فون کیا تو پھر یہی جواب پایا۔

جھنجلا کر نگہت آرا اپنی بھاوج کے ساتھ شوکت آپا کے ہاں لڑکی دیکھنے پہنچ گئیں۔ اس وقت ان کی لڑکی اپنے فلیٹوں کے بچوں کے ساتھ پٹھو کھیل رہی تھی۔ بال ایک دوسرے کو تاک تاک کر ماری جا رہی تھی اور جہاں نشانہ خطا ہوتا وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر یکساں پتھروں کا مینار بنانے کی کوشش کرتی۔

اس وقت گیند اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے نوشابہ کو مارنے کے لیے جو آڑی ہو کر پھینکی تو سامنے سے آتی نگہت آرا کے لگی۔

’’اے ہے...... یہ کون بدتمیز ہے، دیکھتا نہیں اے کہ کون آ رہا ہے۔‘‘

’’اور بدتمیز کے طور پر صالحہ سامنے آ گئی ’’آنٹی ہم تو کھیل رہے تھے۔‘‘

’’اپنے آپ کو نکو دیکھتے کیا۔ ایسی ہڑونگا ہو کے بچوں کے سنگات کھیل رہئیں تم۔‘‘ نگہت نے غصے میں کہا۔

اور جب شوکت آپا کے ہاں مطلوبہ لڑکی کے طور پر صالحہ خاتون سامنے آئیں تو سب کے رنگ اڑ گئے۔ کیسی بدتمیز اور پھوہڑ سی لگ رہی تھی وہ...... شلوار کا پائنچا ایڑی میں پھنسائے گھوم رہی تھی۔

شوکت آپا نے آنکھ کا اشارہ بھی کیا کہ منہ دھو کر آؤ تو اس نے اس اشارے پر کان نہیں دھرا تھا۔

’’کیا ہے؟‘‘ ٹھیک ہے بس...... اماں...... جب میں بول دی تھی کہ بریانی کھاؤں گی تو کاہے کو نئیں پکائے آپ...... بس آج میں کچھ بی نئیں کھاؤں گی۔ میں بول دی۔‘‘

ماں نے جب اسے کھانا کھانے کے بہانے باہر بھیجنا چاہا تو وہ سب مہمانوں کے سامنے اپنی کھلی ناراضی دکھا رہی تھی۔

اور جب پلک جھپکتے کے ساتھ دہی بڑے اور کباب آئے تو مہمانوں سے زیادہ کھانے میں وہ پیش پیش تھی۔

شوکت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مہمانوں کو حلق تک ٹھنسا دیں۔

شوکت آپا ادھر ادھر ہوئیں تو نگہت کی بھاوج نے ان سے رازداری سے کہا۔ ’’آپا...... یہ لڑکی دکھانے لائے تھے آپ...... میرا بچہ نکس دیکھے آپ...... اس کے ساتھ یہ لڑکی اچھے لگے گی کیا۔ انوں کی کمر دیکھی آپ...... میرے کو کمرا دکھتی۔‘‘

’’میرے کو کھد معلوم نئیں تھا کہ یہ لڑکی ایسی اچ ہوئیں گی۔ پہاڑن سی...... کھا کھا کے موٹی ہوں گی۔‘‘

’’بس جلدی چلو...... کچھ بھی بات نئیں کرنا آپ...... میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔‘‘

شوکت آپا مہمان داری کرتے ہوئے نہال ہو رہی تھیں۔ چائے سے پیشتر انہوں نے آئس کریم تک منگوالی تھی۔

’’اس وخت تو ہم ادھر سے گزر رہے تھے تو سوچا آپ سے ملتے چلیں۔ اس بہانے گھر دیکھ لیں گے۔‘‘

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں...... تم بار بار آؤ۔‘‘

’’میرا بھتیجا تو پڑھنے جا رہا ہے باہر۔ اس واسطے شادی کا پروگرام تو کینسل ہو گیا ہے۔ جب اس کی پڑھائی ختم ہوگی، جب وہ سیٹ ہوگا تب بھائی جان کچھ سوچیں گی۔‘‘

’’ہاں ابھی تو انوں بہت چھوٹے دکھتے۔ شادی لائخ عمر بی نکو۔ چار چھ سالاں تو ایسے ہی اچ گزرے جاتے ہیں۔‘‘ ان کی بھاوج نے بے دلی سے صالحہ خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تب تو امی پانوں کی ٹرے جو وہ ہاتھ میں تھامے انہیں کھلانے کے واسطے لائی تھیں وہ پاس رکھے فریج کے اوپر رکھ دی اور صالحہ خاتون سے بولیں۔

’’اماں یہ آئس کریم بہہ کر جائے گیں ناں...... اس کو فریزر میں رکھ دو ورنہ ضائع ہو جائے گی اور بیرچی خانے (باورچی خانے) میں بوا جی کو بول دیو کہ چائے کا پانی اتار دے۔ اتنی گرمی ہو رہی ہے ناں، گرم چائے تو جلا کو رکھ دے گی۔‘‘

نگہت آرا کے لیے یہ ٹریلر کافی تھا۔ وہ اپنی بھاوج کا ہاتھ تھام کر خدا حافظ کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

’’الو کی پٹھی! پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھ کو بیٹھی ہیں۔ جان بوجھ کے بغیر بتائے آئیں گی تو لڑکی تو نکو سجے گی ناں۔ گھر میں پارلر سے سج کر کون لڑکیاں بیٹھی ہوں گی۔‘‘ شوکت بڑبڑا رہی تھیں اور صالحہ سب باتوں سے بے فکر آئس کریم تیزی سے کھا رہی تھی۔

☆☆☆

گفتگو کرنے کا کچھ اس میں ہنر ایسا تھا
وہ میری بات کا مفہوم بدل دیتا تھا
(محسن بھوپالی)

یونیورسٹی سے منور فارغ ہوا تو وہ اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ دوست سے خوب گپ شپ ماری تو مارکیٹ میں جا گھسا۔ گرمی کے حساب سے دو چار شرٹس لیں۔ مارکیٹ کے پاس فائیو اسٹار ہوٹل میں تصویروں کی نمائش کئی روز سے چل رہی تھی۔ اس کو دیکھنے میں بھی اس کا آدھ گھنٹے سے زیادہ ٹائم خرچ ہوا۔

اور جب وہ گھر جا رہا تھا تو اس کا سو فیصد یہ خیال تھا کہ خالہ اور رعنا واپس اپنے گھر جا چکی ہوں گی۔

مگر جب پہلا قدم ہی گھر میں رکھا تھا تو اسے اپنے خام خیالی پر تعجب ہوا۔ رعنا گہرے جامنی سوٹ میں ملبوس کہہ رہی تھی۔

''خالہ جی، یہ گرمی تو ایک دم آگ دکھتی۔ پتا نہیں کب تک جی کو جلا کے بیٹھے گی۔''

''اونہہ تم کیا جلو گی۔'' اس نے سوچا۔

''آداب خالہ جان!'' جھک کر خالہ کو سلام کیا۔

''جیتے رہو...... جیتے رہو۔ یونیورسٹی سے اتنی دیر میں آتے تم۔''

''ہاں' میں دوستوں کے ساتھ مصروف تھا۔ آج ایک دوست کی سالگرہ بھی تھی۔''

''اچھا! دوست کی سالگرہ یاد تھی۔ اپنی رعنا کی سالگرہ تم بھول کے بیٹھے۔'' خالہ نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

''آج رعنا کی سالگرہ ہے!'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور دل میں سوچا کہ اپنی سالگرہ اپنے گھر میں بیٹھ کر منانی تھی۔

''میں امی جی کو بولی اس بار میں خالہ جان کے پاس سالگرہ مناؤں گی۔'' رعنا نے شرماتے ہوئے کہا۔

''منور کو میں نے اس وجہ سے نہیں بتایا تھا کہ سسپنس رہے۔'' صابرہ نے بیٹے کی طرف داری کرتے ہوئے کہا'' ورنہ...... وہ اس طرح خالی ہاتھ تھوڑی ناں گھر میں داخل ہوتا۔ اپنی رعنا کے واسطے پھولاں لے کر آتا اور اپنی جانب سے کوئی اچھا سا تحفہ بھی دیتا۔''

''ہاں...... یہ تو برابر ہے۔'' فاخرہ نے بہن کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رعنا نے اس کی جیب میں لگا قلم سرعت سے نکال کر بڑے لگاوٹ بھرے انداز میں کہا۔ ''مگر منور تو میرے کو تحفہ دے بھی دیئے۔''

''اچھا...... کیا اسے یاد تھا۔''

''ہاں، ہاں، ضرور یاد ہوگا۔ آخر اس کا منگیتر ہے ناں۔''

''منور نے کیا دیا ہے رعنا، مجھے بھی تو بتاؤ۔'' صابرہ بے صبری سے پوچھ رہی تھی۔

''یہ...... یہ میرے کو قلم دیئے ہیں تاکہ میں انوں کو لمبے لمبے خطاں لکھ کر بھیجوں۔'' رعنا نے اس کی جانب دیکھ کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔

رعنا کی بات سن کر وہ گڑبڑا سا گیا اور مارے شرمندگی کے اس کی نظریں جھک گئیں۔ کیا سوچتی ہوں گی امی کہ میں کیسا لیچڑ سا ہوں۔

''اللہ صابرہ تیکو کیا بتاؤں۔ یہ منور بیٹا تو شرما کو بیٹھے۔'' فاخرہ نے بہن سے کہا۔ (اللہ صابرہ تمہیں کیا بتاؤں نور بیٹا تو شرما رہے ہیں۔ فاخرہ نے کہا)

''جی ہو...... میں سوب دیکھ رئی۔''

نور کا دل چاہا کہ اپنا قلم جھپٹ لے...... مگر گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔

رعنا شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی۔ فاخرہ خالہ زعم بھرے انداز میں صابرہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ صابرہ اپنی بہن کی باتوں پر تائیدی انداز میں سر ہلا رہی تھیں' چہرے پر مسکان تھی' مگر وہ دانت پیس رہی یں۔ یہ ان کے غصے کی خاص ادا تھی۔

''ہاں صرف منور ہی تھا جو کچھ نہیں بول رہا تھا مگر اب صرف اس کی آنکھیں بول رہی تھی۔

''جھوٹی' میں نے کب دیا ہے تمہیں اپنا قلم۔ خود ہی جیب سے نکال لیا اور بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ اولہہ ...اس گمان میں بھی مت رہنا کہ میں تمہارے املے کی غلطیوں سے لبالب محبت نامے پڑھنا پسند کروں ''

مگر رعنا اس کا قلم اپنے ہاتھ میں یوں گھما رہی تھی جیسے وہ کسی خزانے کی چابی ہو اور اس خزانے کی وہ مالک ''

☆☆☆

بارش کھڑکی کے شیشے پر آنسو بہا رہی تھی۔

س کے لیے رو رہی ہے؟ کس کا غم ہے اسے؟ کون نہیں رہا؟ کیوں بادل زور زور سے بین کر رہے ہیں؟

ہاں نہیں رہا۔ فہمی نے دل میں سوچا۔

نگین کے آجانے کی وجہ سے وہ اپنا غم بھولنے کی بہت کوشش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہنستی بھی تھی۔ اونچے قہقہے بھی لگاتی تھی مگر رات کو جب اپنے کمرے میں لیٹتی تو اپنے پہلو کی تنہائی اس کا دل مسوسنے لگتی۔

''اگر میرا بچہ ہوتا تو میری کلائی پر سر رکھے میرے سینے میں منہ چھپا کر سو رہا ہوتا۔ اس کا لمس میں محسوس تی۔''

وہ آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھوں کو اپنے سینے سے یوں لگا لیتی جیسے اس کا بچہ اس کے ساتھ چمٹا سو رہا ہو اور اپنے بے ثمر وجود کو دیکھتی تو اندر سے ایک ہوک سی اٹھتی۔

''یارب العالمین! ہر عورت کو اولاد ضرور دینا۔ اس کے بغیر ایک عورت کی تکمیل ہی نہیں ہوتی ہے۔

دن کی سخت گرمیوں کے بعد بارشوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ سب ساون کی خوشیاں مناتے دکھائی دے تے مگر فہمی کو یہ برستی دھواں دھار بارش آنسو بہاتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس دفعہ تو اس نے بھرپور تیاری کی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سے گدے، رضائیاں' دلائیاں۔ خوب صورت لی نرم ململ کے استر کے ساتھ اوڑھنے کی چادر۔ بچے کا ہونٹ صاف کرنے کے لیے ہلکے گلابی رنگ میں ململ اسے کسی نے بتایا تھا کہ کچے رنگ میں ململ سے بچے کے ہونٹ صاف کیے جائیں تو وہ گلابی ہو جاتے انڈ والا چھوٹا سا تکیہ۔ جس پر بچہ سر رکھے تو وہ گول رہے۔ سادی لان پر امبرائیڈری کے جھبلے۔ رات کی میں وہ اپنے بیگ سے ایک ایک چیز نکال کر دیکھا کرتی تھی۔ اس شب بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ ایک ایک ستر پر پھیلائے انہیں شوق سے دیکھ رہی تھی۔ ننھا سا ٹیڈی بیئر تک طبلہ بجاتا ہوا گول گول گھوم رہا تھا اور لیہ لر کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

اچانک بجلی کی گڑگڑاہٹ اور ٹوائے کی آواز سے ساتھ والے کمرے میں نگین کی اچانک آنکھ کھلی۔ فہمی کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس نے درز سے جھانکا تو وہ حیران رہ گئی۔ رات کے تین بجے فہمی اپنے بستر پر چیزیں سجائے بیٹھی تھی۔

کچھ دیر تو اسے یہ سوچنے میں ہی لگ گئی کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ ہمت کر کے وہ اندر داخل ہو حیرت اور خوشی سے بولی۔

"اللہ کتنی خوب صورت چیزیں ہیں۔ کہاں سے خریدے ہیں یہ خوب صورت کپڑے؟"

"بازار میں تل تو سب جاتا ہے مگر یہ سب میں نے خود بنائے ہیں۔"

"باجی ان کو سنبھال کر رکھنا۔ آئندہ بچے کے لیے یہ چیزیں کام آ جائیں گی۔"

"میرے لیے تو یہ سب بیکار ہی ہے۔ تم چاہو تو یہ سب چیزیں اپنے ساتھ لے جانا۔ تمہارے بچے کے کام آ جائیں گی۔"

"میں کیوں لے جاؤں۔ جس کا بچہ ہے وہ خود تیاری کرے...... اور مجھے تو بھئی سینا پرونا بھی نہیں آتا ہے نہ ہی اس کا شوق ہے۔"

"پھر تو کیا کرے گی؟" فہمی نے پریشان ہو کر نگین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"باجی! کیا پھوہڑ عورتوں کے بچے کپڑے نہیں پہنتے۔"

اس کی بات سن کر فہمی کے چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی سی پھیل گئی۔

اور یہی نگین چاہتی بھی تھی۔

"ویسے مجھے اپنی سسرال میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، میری نند کو بھی سلائی وغیرہ بالکل نہیں آتی۔ بچے قمیص کا بٹن ٹوٹ جائے تو وہ بٹن لگانے کے بجائے وہ شرٹ ہی پہنانی بند کر دیتی ہیں۔"

"مگر یہ کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔"

"مگر مجھے سلائی کڑھائی سے دلچسپی ہے ہی نہیں تو کیا کروں۔"

"پھر بھی پھٹا، ادھڑا تو سینا ہی پڑتا ہے۔ اس سے کہاں عورت کی جان بچتی ہے۔"

"میری تو بھئی بڑی آسانی سے بچ جاتی ہے۔"

"وہ کیسے؟" اب فہمی کے حیران ہونے کی باری تھی۔

"اگر شجاع اپنی آستین میں بٹن لگانے کو کہیں تو میں صاف کہہ دیتی ہوں کہ پھپھو سے لگوا لیں۔"

"پاگل ہے تو بھی۔ بٹن لگنے میں ایک منٹ نہیں لگتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... مگر سوئی دھاگا ڈھونڈنے میں تو آدھا گھنٹا لگ جاتا ہے۔ فرحت آپا جب ہمارے گھر آتی ہیں ان کے بچے ہر چیز کو بے جگہ رکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ جب آتے ہیں ٹی وی کا ریموٹ تک کھو جاتا ہے۔ استری کا پلگ ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹیلی فون کی ڈائری کسی کونے میں جا کر پڑ جاتی ہے۔ جھاڑو تنکا تنکا ہو کر بکھر جاتی ہے۔ ایسے میں سوئی دھاگا ڈھونڈنے کا کریڈٹ میں قطعی حاصل نہیں کرنا چاہتی۔ فرحت آپا کے جانے کے بعد جب مائی جھاڑو لگانے آتی ہے تو عظمت پھپھو اس کے کوڑے کو ایسی خوردبین نظروں سے دیکھتی ہیں۔ اے ہے...... یہ نیل کٹر کوڑے میں جا رہا ہے، ارے رے...... یہ دوپٹے کی بیل بھی جا رہی ہے...... ہے...... یہ سارے بٹن...... بھی جا رہے ہیں۔" نگین نے اپنی ساس کی آواز نکال کر ان کی نقل اتاری۔

تب فہمی بے اختیار ہنس پڑی۔

"باجی میں آپ کے ساتھ سو جاؤں۔ بجلی چمک رہی ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، آ جاؤ میرے پاس۔" فہمی نے برق رفتاری سے بیڈ پر پھیلی ہوئی تمام چیزیں اپنے یں رکھتے ہوئے کہا۔

تب نگین ان کے بازوؤں پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور فہمی نے اس کو اپنے ساتھ لٹاتے ہوئے اس کے بالوں پر اپنا ھ دیا۔

اور تب اس کے آنسو قطرہ قطرہ کر کے اس کے بالوں پر ٹپکتے چلے گئے اور نگین نیند کی آغوش میں گم ہوتی لی۔

☆☆☆

فہمی کے جانے کے بعد فہد نے ایک دو بار فون بھی کیا کہ اس کی خیریت معلوم کرے، مگر فیروزہ بیگم نے غصے بار اس سے یہی کہا کہ اس وقت وہ سو رہی ہے۔

"گھر آ کر خیریت نہیں معلوم کر سکتا کیا؟ کیا اس کے گھر آنے پر پابندی ہے؟ جو وہ یوں فون کا سہارا لے رہا

فیروزہ بیگم کا خیال تھا کہ جب فہد گھر آئے گا تو وہ اسے اس کی ماں کی باتیں ضرور سنائیں گی کہ کتنی بدتمیزی کی انہوں نے۔ تاکہ وہ اپنی ماں سے باز پرس کرے۔ وہ یہ تک بھول بیٹھی تھیں کہ وہ ان کی نند ہوتی ہیں۔

مگر فہد نے تو پھر فون کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی...... ایسا لگتا تھا کہ اسے یہ یاد ہی نہیں اس شہر میں اس کی ئی بھی رہتی ہے۔ جس سے وہ محبت بھی کرتا ہے۔

شجاع گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ فیروزہ بیگم نے نگین کو اپنے پاس روک لیا تھا۔

"فہمی کی طبیعت نگین کی وجہ سے بہلی ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت مزید بہتر ہو جائے گی تو میں نگین کو چھوڑنے جاؤں گی۔"

اور شجاع نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

فہمی کو گھر آئے پورا ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے فہد کا گھر نہ آنا ایک عجیب سی سچویشن پیدا کر رہا تھا۔

فہمی کا مارے ہول کے برا حال تھا۔

"امی میرا یہ خیال ہے کہ ممانی جان نے مجھے طلاق دلوا دی ہے۔ فہد طلاق کے کاغذات تیار کروا رہے ہوں اسی وجہ سے وہ رابطہ نہیں کر رہے۔"

"نے دیں طلاق...... میں بھی دیکھوں...... کہ پھر بھابی جان کس منہ سے محفلوں میں شرکت کریں گی۔"
بیگم نے غصے سے کہا۔

"امی ایسا نہ کہیں۔" فہمی لرزتے ہوئے بولی۔

"اگر فہد بھائی فون نہیں کر رہے تو آپ کر لیں۔" نگین نے کہا۔

"ممانی کے کمرے میں ہوتا ہے، پہلے وہی اٹھائیں گی۔"

"ایا ہوا آپ ان سے کہنا کہ فہد سے بات کرنی ہے۔"

"ڈر لگ رہا ہے، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو......"

"آپ ان کے موبائل پر کیوں نہیں رابطہ کر لیتیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، فہد کے موبائل پر بار بار ڈائل کیا گیا مگر ہر دفعہ انگیج کی ٹون سنائی دیتی رہی۔ اب موبائل تو ہر وقت انگیج نہیں ہو سکتا ناں۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔"

"باجی...... میں ان کے آفس فون کرتی ہوں اور کہوں گی کہ فہد صاحب کو بلا دیں۔"

"کرلو...... اخبار کا دفتر ہے۔ شاید بلا بھی دیں۔"

نگین نے فون ملایا تو کسی اختر صاحب نے کہا' اب وہ یہاں نہیں ہوتے اور فون بند کر دیا۔

"فہد بھائی کا کیا کسی دوسری جگہ جوائن کرنے کا پروگرام تھا۔"

"نہیں ایسا تو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ان ڈیڑھ مہینوں میں بن گیا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔"

تب نگین نے فہمی کے گھر فون ملایا۔ فون ممانی جان نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"ممانی جان فہد بھائی سے بات کرا دیں۔" نگین نے ان کی خیریت پوچھنے کے بعد کہا۔

"وہ گھر میں نہیں ہے۔"

"کب آئیں گے؟"

"پتا نہیں!"

"اچھا وہ آئیں تو کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر چکر لگا لیں۔"

"جب وہ آئے گا تو کہہ دوں گی۔" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

اور پھر اس بات کو بھی پندرہ دن گزر گئے اور فہد نہ آیا اور نہ ہی ٹیلی فون کیا۔

فہمی اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ بہن کو دیکھ کر زبردستی مسکراتی اور جب وہ ادھر ادھر ہوتی تو وہ پریشانیوں کے جنگل میں تنہا بھاگتی چلی جاتی۔ اس کا ذہن نئی نئی تاویلیں بیان کرتا۔ ممانی جان نے فہد کی دوسری شادی کر دی ہے اور فہد اپنی نئی بیگم کے ساتھ ہنی مون منانے کہیں گیا ہوا ہے۔ تب مری' ایوبیہ' سوات' کاغان کے خوب صورت لمحات اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتے۔

"فہد...... پلیز رک جاؤ۔ میں اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکتی۔" جب مری میں وہ پنڈی پوائنٹ سے کشمیر پوائنٹ پیدل جاتے تو وہ روٹھ کر بیٹھ جاتی۔

"گود میں لے کر چلوں کیا۔" فہد شرارت سے کہتا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ شرم سے سرخ پڑ جاتی۔

"چلو گھوڑے کی سواری کرتے ہیں، چلو۔" وہ کسی خوب صورت گھوڑے کو ہائیر کر لیتا اور اس کے ساتھ گھوڑے کی لگام خود ہاتھ میں لے کر چلتا۔

ٹھنڈے چشمے میں پتھروں پر بیٹھے سوات میں وہ کتنی خوش تھی۔ تیزی سے پانی کو بہتے دیکھ کر اس نے کہا تھا "فہمی دل چاہتا ہے کہ ساری زندگی یونہی بیٹھا رہوں اور زندگی کی شام ہو جائے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہارے ساتھ کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"اور اگر اس پانی میں' میں ڈوب جاؤں۔ تو......؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"دوسری چھلانگ میں بھی پانی میں لگا دوں گا تمہیں کیسے ڈوبنے دوں گا کہ میں اچھا تیراک بھی ہوں۔"

"جئیں گے تو دونوں ساتھ ساتھ ہی جئیں گے۔" فہمی گھٹنوں پر سر رکھے سوچے چلی جاتی۔ فہد کی پرمحبت باتیں اس کے دل و دماغ پر دستک سی دیتیں۔ اس کا شبہ آگیں لہجہ اسے یادوں کے محل میں اسیر کیے رکھتا مگر جب قیقت کا پتھر ٹکراتا تو وہ کانچ کا محل پاش پاش ہو جاتا۔

"اونہہ یہ بھی دیکھنا تھا مجھے......" وہ گہری سانس بھرتی۔

"اب وہ مجھے چھوڑ کر' مجھ سے بے نیاز ہو کر یوں چلا گیا ہے جیسے مجھے جانتا ہی نہیں تھا۔"

سب اچھے ماحول میں کھانا کھا رہے تھے' نگین اپنی نند کے بچوں کی شرارتیں سنا رہی تھی۔ فرید احمد بھی دلچسپی ے نگین کی باتیں سن رہے تھے۔

فیروزہ بیگم نے حکیم جی کی بیوی کے بارے میں پوچھا تو نگین ان کی حماقتیں سنانے لگی۔ فیروزہ کی ہنسی کسی طرح نہیں رک رہی تھی۔ فرید احمد کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کا اجالا سا پھیل گیا تھا۔

مگر فہمی کی تمام تر توجہ ٹی وی کی جانب تھی' جہاں کوئی مغنیہ اپنی پرسوز آواز میں غزل گا رہی تھی اور فہمی اس کی جانب اتنی محو تھی کہ ہاتھ کا نوالہ منہ تک نہیں گیا تھا۔ اسے وہ غزل اپنی زندگی کی روداد سی لگ رہی تھی۔

کیسے ہوتے ہیں بچھڑنے والے
ہم یہ سوچیں بھی تو ڈر جاتے ہیں
دل جو ٹوٹے تو سر محفل بھی
بال بے وجہ بکھر جاتے ہیں
اب نہ دیکھو میری بنجر آنکھیں
چڑھتے دریا تو اتر جاتے ہیں
اب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو
لوگ رستے میں ٹھہر جاتے ہیں
خالی دامن سے شکایت کیسی
اشک آنکھوں میں تو بھر جاتے ہیں
تم کہاں جاؤ گے سوچو محسن
لوگ تھک ہار کے گھر جاتے ہیں

ہنستے ہنستے فیروزہ بیگم کی نظر جب فہمی پر پڑی تو وہ کسی سرسوں کے پھول کی طرح زرد لگی۔ آنکھوں میں آنسو بہائے، وہ پتا نہیں کہاں تھی۔

انہوں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا تو وہ چونکی۔

"ٹی وی کیوں بند کر دیا۔"

"تاکہ تم پہلے کھانا کھاؤ۔"

"مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ کا نوالہ بھی دسترخوان پر رکھ دیا۔

"فہمی بیٹا اگر تم اپنا خیال نہیں رکھو گی' تو کون رکھے گا۔ میری جان زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں' تم اس کا بہادر بن کر مقابلہ کرو۔"

"میں تو بہت کمزور ہوں' اپنا دفاع نہیں کر سکتی' مقابلہ کرنے کی مجھ میں سکت کہاں ہے۔"

''فہد تم سے محبت کرتا ہے۔ وہ تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔''

''فی الحال تو وہ غائب ہے۔ نہ گھر میں ملتا ہے اور نہ آفس میں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ہے کہاں؟''

''تم پر سکون رہو۔ تمہارے ابو کسی کو دفتر بھیج کر اس کے بارے میں معلومات کروائیں گے۔''

''زبردستی بلوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب وہ خود ہی مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں تو میں زبردستی کیوں ان کے سر پر منڈھوں گی۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہیں باجی آپ......؟''

''میں تو اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں...... مگر یہ سب وسوسے از خود میرے دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔''

آج نگین زبردستی ہی فہمی کو لے کر مارکیٹ چلی آئی تھی۔ چھوٹی موٹی شاپنگ کرتے ہوئے وہ بچوں کے سامان کے ایک بڑے اسٹور پر چلی گئیں۔

''آپ کو کس کلر کی شاپنگ کرنی ہے؟'' سیلز گرل نے ان سے پوچھا۔

''ہر کلر کی۔'' فہمی نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ پنک کلر کی شاپنگ کریں گی یا بلو کلر میں؟'' سیلز گرل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ان کلرز کا کوئی خاص مطلب ہوتا ہے۔'' نگین نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں، اگر آپ کو لڑکی کے کپڑے اور اس سے وابستہ چیزیں خریدنی ہیں تو ہم آپ کو پنک کلر کے مختلف شیڈز میں لڑکیوں کی چیزیں دکھائیں گے اور اگر آپ کو بیٹے کے کپڑے خریدنے ہیں یا اس کی چیزیں خریدنی ہیں تو ہم آپ کو بلو کلر کے شیڈز دکھائیں گے۔ نیلے رنگ کا سامان دکھائیں گے۔''

''یہ باتیں بڑے شہر والوں کو ہی معلوم ہوں گی۔ ہمارے گاؤں میں تو کسی کے لڑکا ہو یا لڑکی ہر رنگ کے کپڑے پہناتے ہیں۔'' نگین نے ہنس کر کہا۔

''یہاں اگر کسی کے بیٹا ہو اور اس کی ماں اس کو پنک کلر کے کپڑے پہنا دے تو دوسرے یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ ماں کیسی بے وقوف ہے۔ اسے کلر ایجوکیشن تک نہیں ہے۔'' سیلز گرل نے بتایا۔

اب نگین چھوٹے بچے کے بلو اور پنک دونوں میں ہی کپڑے خرید رہی تھی۔ فہمی کو سفید لیس کی جھالر لگا پالنا پسند آ گیا تھا۔

''نگین یہ بھی لے لیتے ہیں۔''

''میں اس کو کیسے لے کر جاؤں گی؟''

''ابا جی طفیل کے ہاتھ بھجوا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر لے لیں۔''

''ارے یہ واکر کتنی خوب صورت ہے بھئی نیلے کلر میں۔'' نگین نے وہ بھی لے لی۔

جب دونوں بہنیں لدی پھندی ہاتھ میں واکر اور پالنا اٹھائے اسٹور سے واپس نکلیں تو سامنے سے زبور نگین کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔

مگر نگین مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے اس کے پاس سے یوں گزری جیسے اس کو دیکھا تک نہ ہو۔

زبور نے کھنکھار کر اپنا احساس دلایا اور اس کو آگے بڑھتے دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھا ''نگین ایک منٹ رکو!''

[illegible] وہ رکی نہیں۔

[illegible] سے آتی ٹیکسی کو اس نے ہاتھ دیا، لپ جھپ سامان گاڑی میں ڈالا، پالنا ٹیکسی کی چھت پر رکھوایا اور [illegible]ل پر بھاگنے لگی۔

''[illegible] نے زبور کو دیکھا تھا؟'' گاڑی میں فہمی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں دیکھا تھا۔''

''وہ تمہیں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا تھا۔''

''ہاں۔'' وہ رک گیا تھا۔

''اس نے تمہیں پکارا تھا۔''

''[illegible] نے اس کی آواز سنی تھی۔''

''وہ شاید تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید...... وہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔''

''ہاں''

''تم رکی کیوں نہیں!'' فہمی نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

''[illegible] فائدہ تھا رکنے سے، کیا فائدہ تھا مختلف تاویلیں بیان کرنے سے۔ باجی۔ جب وقت کی کڑیاں ہاتھوں [illegible]ئیں تو پلٹ کر دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

''[illegible] رکتی، میں کیوں وضاحتیں بیان کرتی۔ میں اسے کیوں یہ یقین دلاتی کہ اس سے جدا ہونے میں [illegible]صور نہیں ہے۔ جب یہ سب میری تقدیر میں تھا تو اب میں راضی بہ رضا ہوں۔''

''[illegible] کہتی ہو تم۔'' فہمی سر جھٹک کر باہر دوڑتے ٹریفک کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

[illegible] تو نہیں تھا صرف ہلکا ہوا تھا۔ جسم میں درد تو تھا ہی مگر ایک تھکان سی اس کے روم روم میں موجود تھی۔

[illegible] اس دن بعد اپنے آفس آیا تھا مگر کرسی پر بیٹھا قلم ہاتھ میں پکڑے خالی الذہن سا بیٹھا تھا۔ سامنے [illegible]راق پر لکھنے کے بجائے لکیریں کھینچ رہا تھا۔

[illegible] ماہ اس کا عارضی تبادلہ اسلام آباد کا ہو گیا تھا۔ یہ اس کے اخبار کے ریسرچ کا خاص شعبہ تھا جہاں [illegible] خاص بھیجا گیا تھا۔

''[illegible] گھر چھوڑنے کا اتنا صدمہ ہے کہ ابھی تک طبیعت ہی ٹھیک نہیں ہو پا رہی۔'' اس کے دوست [illegible]ف ریڈنگ کرتے ہوئے کہا۔

''[illegible] بیمار ہی نہیں پڑتا' اس دفعہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ طبیعت ٹھیک ہی نہیں ہو پا رہی۔''

''[illegible] خاص بات تو ہوئی ہے ناں۔ بھابی کو چھوڑ کر تمہیں یہاں آنا پڑا ہے۔'' شکیل اس پر ایک مسکراہٹ [illegible] کہتا ہوا دوسرے روم میں چلا گیا۔

''[illegible] خاص بات تو ہوئی ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

[illegible] و روز کتنے پر سکون اور پر محبت گزر رہے تھے۔ فہمی کے ساتھ اس کی اچھی خاصی ذہنی ہم آہنگی [illegible]وں روزانہ اپنے آنے والے بچے کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے۔ فہمی بھی ہر چھوٹی سے چھوٹی [illegible] نے کی عادی تھی۔

’’بچے کا جھولا دائیں طرف رکھا جائے گا۔ بیڈ کو پردے کے ساتھ لگا دیں گے۔ ڈریسنگ ٹیبل اگر سائیڈ روم میں رکھ دیں تو بچے کو واکر چلانے کے لیے اچھی خاصی جگہ کمرے میں ہی مل جائے گی۔ ٹب نیلا ہوگا اور بچے کو نہلانے والی کرسی ملٹی کلرز کی ہوگی۔ میوزیکل جھنجھنا جھولے پر سیٹ کر دیں گے تو جیسے ہی جھولا ہلے گا بچہ میوزک سنے گا۔‘‘

اور پھر اس کے سارے خواب آہوں میں ڈوب گئے۔ دوسری مرتبہ خالی ہاتھ رہ جانے سے صدمہ اسے بہت ہوا تھا مگر اس نے فہمی پر اپنے دل کا دکھ عیاں نہیں کیا تھا۔

’’اکثر لوگوں کے بچے ضائع ہو جاتے ہیں، یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔‘‘ اس نے فہمی سے یہی کہا تھا۔

فہمی روتی رہی تھی اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی تھی مگر وہ اپنا دکھ سمیٹے اسے دلاسا دینے میں محو تھا۔

اور پھر اس شام جب وہ فہمی کے لیے بہت ساری چیزیں لے کر گھر آیا تو امی نے اسے بتایا کہ تمہاری فیروزہ ہنگامہ کر کے فہمی کو اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

’’آخر کیوں؟‘‘ اس کی تیوری تن سی گئی۔

’’تمہاری ساس کا یہ کہنا ہے کہ یہاں دلہن رانی کی خدمت اچھی طرح نہیں کی جا رہی بلکہ میں فہمی کو بھوکا رہی ہوں۔ نہ کھانے کو دے رہی ہوں نہ پینے کو۔ اور ایسا ظلم وہ برداشت نہیں کر سکتیں۔‘‘

’’دماغ خراب ہو گیا تھا ان کا کیا؟‘‘ اسے غصہ ہی تو آ گیا۔

’’ہاں یہ بھی کہہ کر گئی ہیں کہ اب وہ فہمی کو نہیں بھیجیں گی اور فہد اسے لینے کے لیے آیا تو وہ بھی منہ کی کھائے فہمی اب یہاں ہرگز نہیں آئے گی۔‘‘ فہد کی ماں نے بھی بات کو خوب بڑھا چڑھا کر اسے بتایا۔

’’ٹھیک ہے رہیں خوب دل بھر کے اور جب آنے کو دل چاہے تو خود ہی آ ئیں۔ میں اسے لینے کے نہیں جاؤں گا۔‘‘

’’میں نے بھی یہی کہا تھا۔ اپنی بیٹی کو دل بھر کے اپنے گھر میں رکھو اور خوب اس کی خدمتیں کرو۔‘‘

فہد جو خوشی خوشی گھر آیا تھا، اس کا سر یہ افتاد سن کر بھاری سا ہو گیا۔ فہمی کے لیے لائے ہوئے لان کے سوٹ اس نے الماری میں پھینکے اور بستر پر لیٹ گیا۔

بستر سے اس کی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی۔ فہمی ایسی نہیں ہے۔ وہ پڑھی لکھی سمجھ دار سی لڑکی ہے۔ میں اس خود بات کرتا ہوں۔ اس نے فیروزہ بیگم کے نمبر ڈائل کیے۔ فون فیروزہ بیگم نے ریسیو کیا تھا۔

’’کیا بات ہے؟ ابھی تو فہمی کو آئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے، اتنی جلدی مزاج ٹھکانے آ گئے تمہارے ا تو تمہاری اماں خوب اکڑ دکھا رہی تھیں؟‘‘

’’پھپھو آپ میری فہمی سے بات کرا دیں۔‘‘

’’اونہہ بات کرا دیں!‘‘ وہ بڑبڑائیں۔

’’پلیز پھپھو......‘‘ اس کا لہجہ ملتجی سا ہو گیا۔

’’وہ گہری نیند سو رہی ہے، میں اسے نہیں اٹھا سکتی۔‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

ایک ہفتے بعد اس نے پھر فون کیا۔ شومئی قسمت یہ فون بھی فیروزہ بیگم نے اٹینڈ کیا تھا۔

’’کیوں، کیا ہے فون......؟‘‘ وہ جہالت سے بولیں۔

’’پھپھو آپ فہمی سے میری بات کرا دیں۔‘‘

’’وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔‘‘

’’کیوں بھئی۔‘‘ اس نے اپنا غصہ پی کر کہا۔

’’یہ تم آن کر خود پوچھ لو۔‘‘ وہ تمسخر سے بولیں۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

باہر صحن میں اماں شاید اسے سنا رہی تھیں یا حقیقتاً مائی سے باتیں کر رہی تھیں مگر ان کی آواز فہد کے کمرے میں صاف آ رہی تھی۔

’’جو لڑکیاں اپنی ماؤں کے اشارے پر چلتی ہیں ان ہی کے گھر بگڑتے ہیں۔ ہماری بہو کی استانی بھی ان کی اماں ہیں۔ وہ جو سبق دیتی ہیں اس پر ہی وہ عمل کرتی ہیں۔ وہ لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے اشاروں پر ناچا کرتی ہیں، ان کے کبھی گھر نہیں بسا کرتے۔‘‘

’’کیا میرا گھر بھی اب اجڑنے والا ہے۔‘‘ اس نے پریشان سا ہو کر سوچا۔ تب درد کی ایک چمک اس کی کنپٹی کے پاس ایسی ہوئی کہ وہ تکلیف سے بے حال ہو گیا۔

ایک پریشانی آئی تو پریشانیوں نے اس کا گھر ہی دیکھ لیا۔ گھر کے دروازے پر گن پوائنٹ پر اس کا موبائل چھنا۔ گھر میں چوری ہوئی۔

اس کی بائیک خراب ہو گئی اور پھر ایمرجنسی طور پر اس کا عارضی تبادلہ اسلام آباد کا کر دیا گیا۔ چلتے چلتے بھی وہ پھپھو کے گھر فون کرتا رہا مگر ان کے گھر میں کوئی نہیں تھا یا سی ایل آئی پر ان کا نمبر دیکھ کر کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔

پریشان سا وہ اسلام آباد آ گیا اور یہاں آتے ہی وہ ایسا بیمار پڑا تھا کہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس ایک ماہ میں امی کو بھی دو چار فون ہی کیے تھے۔

زیادہ فون وہ اس وجہ سے بھی نہیں کر رہا تھا کہ امی نے اس کی دوسری شادی کروانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

گو کہ وہ ان کی اس بات کو سختی سے منع کر چکا تھا مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

’’اب خاندان میں شادیاں کرنے سے اچھے نتائج سامنے نہیں آتے ہیں۔ ہمیشہ باہر ہی کرنی چاہیے۔ باہر کے لوگ رشتے داروں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔‘‘

’’ہوتے ہوں گے مگر میں نے اپنی زندگی فہمی کے ساتھ ہی بسر کرنی ہے، میرے لیے آپ کسی قسم کی کوئی بھی تگ و دو کرنے کی کوشش نہ کریں۔‘‘

’’جب فہمی ہی تجھے چھوڑ کر جا چکی ہے تو کس کے آسرے کی بات کر رہا ہے۔‘‘

تب فہد کو فہمی پر غصہ سا آ گیا۔ اسے یوں بتائے بغیر اپنی ماں کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت تھی اور بالفرض اگر چلی بھی گئی تھی تو کیا اسے فون نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی مرتبہ فون کرنے کے باوجود بھی اس نے کوئی بھی جوابی فون اسے نہیں کیا تھا۔

یہ بیویاں یوں تو خوب ساتھ رہنے، ساتھ جینے کی قسمیں کھاتی ہیں مگر جوں ہی سسرال کی دہلیز پار کر کے میکے کے صوبے میں قدم رکھتی ہیں اپنا ہر وعدہ اور اپنی ہر بات بھول جاتی ہیں۔

پتا نہیں محبت کی باتیں، چاہت کے پل اور خوشیوں کے لمحے ان کی گرفت سے کیسے نکل جاتے ہیں۔

رات کو جب وہ تھکا ہارا اپنے فلیٹ میں آیا تو چودھویں کا چاند بجھا بجھا سا اس کی کھڑکی سے نظر آ رہا تھا۔

"کیا وہ اپنی ماں کی بات مان کر دوسری شادی کرلے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" دل نے کہا۔

"فہمی بھی اپنی ماں کی طرح جھگڑالو اور بدتمیز ہے۔" اس کے دماغ نے شہہ دی۔

"اور پھر ایک بنجر زمین کو اپنے پاس رکھنے کا فائدہ......" دماغ کی دوسری تاویل بڑی گہری تھی؟

"نہیں بالکل نہیں۔" دل......فہمی کی محبت میں پور پور ڈوبا ہوا تھا۔

"نہد کہاں ہو تم؟ میں تمہیں یاد کرتی ہوں!" اسے یوں لگا جیسے فہمی کی یہ آواز اس کے دل میں پکار بن کر ہر سو چھا رہی ہو۔

یہ یادیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ جب چاہے آواز بن جائیں اور جب چاہے تصویر۔ اس نے سوچا اور خود ہی ہنس دیا۔

چودھویں کا چاند جب اس کی کھڑکی میں آ کر ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا تو کسی شاعر کی خوب صورت نظم اس کے من میں پھول کی طرح کھلتی اور مسحور کرتی چلی گئی۔

"تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
ترا مہتاب چہرہ اور گہری جھیل سی آنکھیں
تری زلفیں حسین پلکیں تیرا لہجہ
ترا وہ کھلکھلانا اور کسی بات پر ہنسنا
پھر کچھ سوچنا اور سوچ کر گم صم سا ہو جانا
خیالوں اور خوابوں میں تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
کسی کے ساتھ چلنا ہو
کسی سے بات کرنی ہو
کسی کا پیار سے تکنا
کسی بھی پھول کا کھلنا
کوئی بھی گیت گاتے ہوں
کوئی بھی شعر پڑھتے ہوں
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں
سہانی رات ہوتی ہے
تیری ہی بات ہوتی ہے

وہاں اک چاند ہوتا ہے
تیرا یہ پھول سا چہرہ
مجھے چندا میں دکھتا ہے
فضاؤں میں ہواؤں میں
تیری خوشبو بکھرتی ہے
تمہیں ہم ساتھ رکھتے ہیں
تمہیں ہم یاد رکھتے ہیں
تمہاری یاد سے دل کا نگر آباد رکھتے ہیں

☆☆☆

بلیک ہنڈا اسٹی ایک جھٹکے سے سگنل پر رکی۔ پھول بیچنے والے گاڑیوں کی جانب لپکے۔

"دس روپے کی جوڑی۔" نوشی کی جانب ایک بچہ ایک ڈنڈی میں پروئے ہوئے کنگن لیے اس سے خوشامد ے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

نوشی نے ایک نظر زیور کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ لے لوں یا منع کردوں۔

"لے لو۔" زیور نے پچاس کا نوٹ نکال کر بچے کو دیا۔ بچہ اپنی جیب سے پیسے نکال کر گننے لگا تا کہ واپس پیسے دے سکے۔

"رہنے دو۔" زیور نے سڑک کراس کرتی ہوئی کالج کی لڑکیوں کو دیکھا۔

آخر میں جانے والی لڑکی بالکل نگین کی طرح تھی۔ گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے کسی بات پر ہنس کر نوشی کو دیکھا اور سرعت سے سڑک پار کرگئی۔

مگر زیور کو یوں لگا جیسے اس کی ہنسی کسی جھرنے کا ترنم ہو اور اس ترنم نے اس کے دل کو ایک کروٹ سی دلادی ہو۔ سفید یونیفارم میں اس کا سڈول جسم ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مورتی پر پہنا دیا ہو۔ کیسا سانچے میں ڈھلا جسم تھا اور آبشار جیسے بال' جسے وہ بے پروائی سے سر کو جھٹکتے ہوئے پیچھے کر رہی تھی۔

یونیفارم پہنی ہوئی لڑکیاں ایک جیسی لگتی ہیں۔ ان کی شکل ابھر کر سامنے آتی ہی نہیں۔ مگر وہ لڑکی......شاید نگین کا پرتو تھی۔ زیور اس کو دیکھ کر ہل سا گیا۔

اب سگنل کھل گیا تھا مگر ٹریفک جام ہونے کے باعث گاڑیاں بے بس سی کھڑی تھیں اور زیور کی نظر میں وہ لڑکی کھوے چلی جارہی تھی جو چند سیکنڈوں میں اس کے سامنے سے گزری تھی۔

اس نے تو نگین کی یادوں کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا تھا۔

اس دن بھی مارکیٹ میں نگین کو دیکھ کر جب اس نے پکارا تھا تو وجہ یہی تھی کہ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ نوشی سے شادی کر چکا ہے، جو خوب صورتی میں بھی اس سے زیادہ ہے اور خاندانی شرافت' عزت اور دولت میں بھی اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ گنوائے ہوئے لمحات پر وہ نفرین بھیجتا ہے مگر وہ رکی نہیں تھی۔ اس کو دیکھ کر یوں چلتی گئی جیسے وہ دیکھے جانے کے قابل تک نہ ہو۔ نہ ہی اس کے چہرے پر کسی قسم کا ا تھا نہ غبار۔

اس کا ذہن اب اس جانب نہیں جارہا تھا۔ وہ شاید نگین کی یادوں کا کوئی رنگ تھا جو اس کے سامنے لہرایا

تھا۔ تب وہ نہ جانے کیوں نگین کے خیالوں میں کھو سا گیا۔

”زبور...... میں کتابیں لے کر بیٹھتی ہوں ناں تو سارے لفظ تمہاری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔“ اس نے شرما کر کہا تھا۔

”پھر کیا کرتی ہو؟“

”ظاہر ہے‘ تم سے باتیں کرنے لگتی ہوں۔“

”اور تمہاری امی سمجھتی ہوں گی کہ بچی بڑی پڑھائی کر رہی ہے۔“

”ہاں اور کیا۔“

”یہ تو اچھی بات ہے کہ تم مجھ سے باتیں بھی کر لیتی ہو اور امی سے کوئی خدشہ بھی نہیں ہوتا۔“ وہ ہنس کر بولا تھا۔

”خدشہ تو سامنے آ گیا جب ماہانہ ٹیسٹوں میں‘ میں فیل ہوئی۔ تب امی کہنے لگیں‘ اتنا پڑھنے پر جب دو دو چار چار نمبر آئے ہیں تو نہ پڑھنے پر تو کالج والے کوئی اسپیشل لیٹر ایشو کرواتے کہ یہ لڑکی ہمارے کالج میں پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔“

”پھر تم نے کیا توضیح بیان فرمائی۔“

”میں نے بھی کہہ دیا‘ ان دنوں آشوب چشم کی بیماری تھی۔ حالانکہ وہ تو امتحانوں کے بعد ہوئی تھی۔ تب بے چاری مطمئن ہو گئی تھیں۔“

یک دم ہارن کے شور سے وہ واپس اپنے حواسوں میں آیا۔ گاڑیاں فراٹے سے آگے بڑھ رہی تھیں اور اس کے یوں رکے رہنے سے پیچھے کی گاڑیاں اپنا غصہ اور گالیاں اپنے گاڑی کے ہارن کے طفیل نکال رہی تھیں۔

”کہاں ہیں آپ؟“ نوشی نے اپنا نرم دودھیا سا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھا۔

اور اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو ایک نظر اپنے برابر سوئی ہوئی گلابی گاؤن میں ملبوس اپنی بیوی کو غور سے دیکھنے لگا۔

جس کا خوب صورت ناک نقشہ تھا۔ بے حد صاف رنگ‘ ہنستی تھی تو گال پر ڈمپل پڑ جاتا تھا مگر اس کو دیکھ کر اس کا دل یوں نہیں دھڑکتا تھا جیسے نگین کو دیکھ کر یا سوچ کر دھڑکتا تھا۔

نگین میں پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اسے ریشمی ریشمی سی لگتی تھی۔ جب ہی اس کے ہاتھ سے یوں پھسل گئی کہ وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ جو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ نگین کی تمام تر یادیں جڑ سے نکال پھینکی ہیں یہ شاید غلط تھا۔ یادوں کی کوئی قلم اس کے سینے میں دبی رہ گئی تھی جو ڈھیرے ڈھیرے پروان چڑھ کر آج پھل دینے پر اتر آئی تھی۔

اس کی گاڑی کے سامنے سے کون لڑکی گزری تھی۔

”مگر یہ آشوب چشم سارا سال تو نہیں رہ سکتی ناں۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اپنی امی کو جلدی بھیجو‘ مگر تمہاری مما کا تو مجھے دیدہ ہوائی سا لگتا ہے۔ ان کا تو ٹکوا ہی گھر میں نہیں ٹکتا ہے۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

”اے وہ تمہاری ہونے والی ساس ہیں۔ ان کی عزت کرو، خبردار جو اپنے شوہر کی والدہ کا مذاق اڑایا۔“

”چلو معاف کر دو۔ یہ سب مذاق میں کہہ رہی تھی۔“ اس نے اپنے ریشمی ہاتھ باہم جوڑ دیے۔

اور اس کا دل بے قابو سا ہو گیا۔ بجلی کی سی ساعت میں اس نے ان کو تھاما اور بے اختیارانہ انہیں لبوں سے لگا لیا۔

اس نے یوں ہاتھ کھینچا جیسے بجلی کا سا کرنٹ اسے لگا ہو۔

اب وہ معذرت خواہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”آل رائٹ!“ وہ اپنا بیگ کاندھے پر رکھ کر جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

اور جب وہ اپنے تسمے باندھ کر جو کھڑا ہوا تو اس کی شرٹ کے بٹن میں اس کے کھلے لمبے بال کی ایک لٹ پھنس چکی تھی۔

”کیا جانے کو دل نہیں چاہ رہا جو میری مشکیں باندھ رہی ہو‘ اپنی زلفوں سے۔“

”ہشت!“ وہ سرخ سی ہو گئی اور زبور کی رگوں میں ایک سنسناتی سی میٹھی لہر دوڑ گئی۔ عین اسی لمحے نوشی نے اس کی جانب کروٹ لی۔ اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے آ گیا۔

اور وہ خالی خالی نظروں سے اپنی بیوی کو تکنے لگا کہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی یہ دل میں سناٹا سا کیوں محسوس کر رہا ہے۔

”اونہہ پاگل ہو گیا ہوں میں...... بے وقوف ہوں‘ نایاب سی لڑکی پا کر بھی اس دو ٹکے کی لڑکی کو یاد کر رہا ہوں۔“ ممی کی باتوں کی بازگشت اسے سنائی دی تو اس کا حوصلہ بڑھا۔

”نوشی اٹھو۔“ وہ سوتی ہوئی نوشی کو محبت سے جگا رہا تھا۔

”جانو‘ کیا بات ہے؟“ وہ مندی مندی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”دیکھو کتنی خوب صورت چاندنی رات ہے آؤ ہم کھڑکی میں بیٹھ کر دیکھیں۔“

”اس وقت۔“ اس نے پاس رکھے کلاک پر نظر ڈالی۔ شب کے ڈھائی بج رہے تھے۔

”طبیعت ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“ اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو تم۔“ وہ الجھ کر بولا۔

”یہ چاند اور تاروں سے باتیں تو پاگل قسم کے لوگ کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے‘ تم سو جاؤ۔“ وہ قصداً مسکرایا۔

”اور آپ......؟“

”میں بھی سو جاؤں گا۔“ اس نے ریشمی دلائی اپنے اوپر ڈالتے ہوئے کہا اور گہری سانس بھر کر اپنا سر تکیے پر دیا۔ وہ اپنی بند آنکھوں سے واضح دیکھ رہا تھا۔ اسے دور ٹیلے پر کھڑی نگین صاف نظر آ رہی تھی۔ وہی چہرہ‘ وہی قد اور وہی شہد آگیں آواز جو سیدھی دل میں اتر جائے۔

وہ اپنا آنچل ہلا کر اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ زبور جلدی سے آؤ‘ میرے پاس۔

”تم وہیں رکو...... میں آ رہا ہوں......“ اس نے کہا۔

اور پھر گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے چاروں جانب ایسے دیکھنے لگا جیسے نگین کو ڈھونڈ رہا ہو۔

☆☆☆

ایک رم جھم سی تھی خیالوں میں
پیار کے پھول مسکرائے تھے
زندگی کے حسین لمحے جب
ساز ہستی پہ گنگنائے تھے

”یہ شجاع تمہیں کچھ زیادہ فون نہیں کرتا......؟“ فہمی نے کہا۔

”کرنے بھی چاہئیں۔ بیوی دوسرے شہر میں ہو تو میاں کو ہمہ وقت رابطے میں رہنا چاہیے۔“

”فہد نے تو مجھے ایک فون بھی نہیں کیا“ فہمی دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”فہد بھائی بھی کریں گے۔ آپ کی سسرال میں ممانی جان ہر محاذ پر حاوی ہیں۔ جب مائیں بیٹے کی مشکیں باندھ کر رکھیں تو وہ بے چارے بھی کیا کریں؟“

”شجاع بھی تو اپنے گھر کا اکلوتا ہے‘ اس پر تو کوئی حاوی نہیں۔“

”شجاع غصے کے زیادہ تیز ہیں اسی لیے کوئی ان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پھرتا‘ سب کو اپنی عزت عزیز ہوتی ہے۔“

”پھر تو ہر بہو کو غصے کا تیز ہونا چاہیے تاکہ کوئی اسے دبا نہ سکے۔“

”اللہ نہ کرے‘ کیسی باتیں کرنے لگیں آپ۔ غصہ تو آگ ہوتا ہے اور اللہ اس آگ سے سب کو بچا کر رکھے۔“ فون کی گھنٹی بجی تو فہمی نے ہنس کر کہا۔

”میرا تو خیال ہے‘ تمہارے عاشق میاں جی کا ہی فون ہے۔“

فہمی نے ریسیور اٹھایا تو بے اختیار ہنس دی اور آنکھوں سے تائید کی۔

”کیا بات ہے‘ کیا اپنے گھر کو بھی بھول گئیں اور اپنے گھر والے کو بھی؟“ شجاع نے فون پر پوچھا۔

”نہیں‘ ایسی تو کوئی بات نہیں“ اسے ہنسی سی آگئی۔

”تو پھر اماں جان کے پاس زیادہ ہی دل لگ گیا ہے؟“

”اماں کے پاس کس کا دل نہیں لگتا؟“ (اس نے اس کا وار اس پر ہی لوٹا دیا)

”میرا تو واقعی نہیں لگ رہا۔ کمرے میں جاتا ہوں تو عجیب گھبراہٹ سی ہوتی ہے‘ تمہارے بغیر کمرا کاٹنے کو آتا ہے۔“

”اچھا تو کیا میں آجاؤں......؟“

”ہاں‘ فوراً سے پہلے......“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”اتنی جلدی تو نہیں آسکتی۔“

”تو پھر کب آؤ گی؟“

”آنا تو آپ کے پاس ہی ہے۔ ایک دو ماہ اور رہنے دیں۔ میری وجہ سے فہمی باجی کی طبیعت ٹھیک ہے۔ وہ ذرا نارمل ہو جائیں تو میں آجاؤں گی۔“

”وہ اگر دو سال نارمل نہ ہوئیں تو......؟“ اسے غصہ ہی تو آگیا تھا۔ صرف پندرہ دن رکنے کی بات ہوئی تھی۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ ایک دو ماہ اور کی بات کر رہی تھی اور آگے بھی اس کا پروگرام کوئی واضح نہ تھا۔

”اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“

”بس‘ تم گھر آجاؤ۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“

”شجاع‘ پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں رہ کر میری صحت بھی اچھی ہو رہی ہے اور جب میں صحت مند ہوں گی تو بچے پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے...... رہ لو...... مگر زیادہ نہیں کہ تمہارے بغیر میرا بالکل بھی دل نہیں لگ رہا ہے۔“ اس نے پژمردہ سے لہجے میں کہا۔

”ایک بات کہوں......؟“

”ہاں کہو...... پیسے چاہیے ہوں گے۔ وہ میں کتنے بھیجوں......؟“

”افوہ...... کیا ضروری بات صرف پیسوں کی ہو سکتی ہے؟“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ اس نے حیران سے لہجے میں پوچھا۔

”میرا بھی آپ کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔“ اس نے شرمیلے سے لہجے میں کہا۔

اور شجاع سرشار سا ہو کر بے اختیار ہنس پڑا ”یہ اپنی اماں کے گھر میں بیٹھ کر باتیں بنانی بہت آگئی ہیں۔ میاں کو واپس بھجوا کر کہہ رہی ہو کہ دل نہیں لگ رہا۔“

”میں نے تو نہیں کہا تھا آپ کو جانے کے لیے؟“

”میں تو ایسے ہی کہہ رہا ہوں۔ ٹھیک ہے رج کر رہو مگر خوب کھانا پینا‘ میرا بچہ خوب صحت مند اور خوبصورت سا ہونا چاہیے۔ ہاں اماں نے اصلی گھی بجھوایا ہے‘ تمہارے لیے طفیل کا بھائی لے کر آرہا ہے۔“

نگین کا دل چاہا کہ کہہ دے میں اصلی گھی میں پکا سالن تو کبھی کھا ہی نہیں سکتی۔ مجھے تو اس کی خوشبو ہی عجیب سی لگتی ہے مگر دانستہ چپ رہی اور اچھا کہہ کر فون منقطع کر دیا۔

☆☆☆

تمام پیڑ جلا کے خود اپنے ہاتھوں سے
عجب شخص ہے کہ سایہ تلاش کرتا ہے

اسلام آباد میں نمائش لگی تھی۔ اس میں ایک اسٹال صادقہ باجی کا بھی تھا۔ انہوں نے اپنے بوتیک کے دیدہ زیب ملبوسات وہاں رکھے تھے‘ جو بہت پسند کیے گئے تھے۔ وہ نمائش کا آخری دن تھا۔ جب صادقہ باجی اور فریال اپنے بوتیک پر کھڑی تھیں‘ ٹی وی کیمرا نمائش کی کوریج کر رہا تھا۔ فریال کو تو معلوم بھی نہیں تھا۔ وہ صادقہ باجی کی کسی بات پر بے اختیار ہنس رہی تھی۔ ٹی وی کے خبرنامے میں ان کے اسٹال کو بمشکل ۳۰ سیکنڈ دکھاتے ہوئے بتایا گیا تھا‘ آج کل خواتین بوتیک سے بے حد نام بھی کما رہی ہیں اور پیسا بھی۔ فریال کو ہنستے ہوئے ٹی وی پر دکھایا گیا تھا۔

یہ رپورٹ فریال کے گھر میں بھی چل رہی تھی مگر کسی نے فریال کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اماں نماز میں مصروف تھیں۔ سائرہ اسکول کی کاپیاں چیک کرنے میں مگن۔

ثریا اپنی بہنوں سے فون پر مصروف اور صابرہ اپنی ساڑی پر پریس کر رہی تھی۔

وہ گھر جہاں سے گئے فریال کو کئی برس ہو گئے تھے' آج ٹی وی پر نظر آ رہی تھی مگر یہ اس کی قسمت کہ گھر والوں نے اس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا جبکہ ہر کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا اور سب جگہ یہی چینل لگا ہوا تھا۔

دوسری جانب عدیل اپنے گھر میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کام کرے جو اپنا جیب خرچ چلائے۔

جیب کاٹے' موبائل چھینے یا کسی شاپ پر سیلز مین کے طور پر کام کرے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں الجھا ہوا تھا کہ ٹی وی پر اس کی نظر پڑی۔ فریال شاندار سوٹ پہنے کھڑی ہنس رہی تھی' صادقہ باجی اس کی کسی بات کا جواب دے رہی تھیں۔ پس منظر میں ان کے بوتیک کے کپڑے دکھائے جا رہے تھے اور سب سے زیادہ پسندیدہ اسٹائل ان ہی کا قرار دیا گیا تھا۔

''ہوں..... وہیں ہے ابھی تک وہ..... ٹھیک ہے' کام کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب وہ کمائے گی اور میں کھاؤں گا۔'' وہ ہنس دیا اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

اگلے دن جب اس نے صادقہ باجی کے گھر فون کیا تو فریال نے ہی ریسیو کیا تھا۔

''فریال! میں آ گیا ہوں باہر سے..... تم بتاؤ تمہارے پاس کب آؤں؟'' اس کا لہجہ شہد میں گندھا ہوا تھا۔

''میرا آپ سے اب کیا تعلق......؟'' ہمت کر کے اس نے کہا۔

''ارے پاگل ہو گئی ہو کیا' میں تمہارا شوہر ہوں۔ کچھ عرصے پہلے باہر چلا گیا تھا' ابھی لوٹا ہوں۔ تمہارے لیے بہت کچھ لایا ہوں۔'' وہ اسے لارے لپے دیتا ہوا بولا۔

''میں نے کہا ناں' میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''کیوں پاگل بن رہی ہو۔ میاں بیوی میں لڑائی ہو ہی جایا کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان لڑائیوں کو طول دیا جائے۔ جو ہوا برا ہوا' اب مزید برا نہیں ہونا چاہیے۔ اب جیسے تم کہو گی' میں ویسے ہی رہوں گا۔''

تب پریشان ہو کر فریال نے لائن کاٹ دی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا فریال! کیوں رو رہی ہو؟'' صادقہ باجی اس کے پاس دوڑی چلی آئیں۔

تب اس نے عدیل کی بابت بتایا کہ وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک تو طلاق کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

''میری جان! تمہیں اب اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا طلاق نامہ ہمارے پاس موجود ہے۔ میں واچ مین کو اس کی تصویر دکھا کر کہوں گی کہ میری غیر موجودگی میں اس کو ادھر آنے کی اجازت نہ دے۔ ہاں' اب تم کوئی فون ریسیو نہیں کرو گی۔ اس ذلیل شخص سے میں ہی بات کروں گی۔'' صادقہ باجی نے اسے دلاسا دلاتے ہوئے کہا۔

دس دن بعد وہ صادقہ باجی کے گھر پر تھا اور ان کی خوشامدیں کر رہا تھا۔ فریال کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

صادقہ باجی نے پہلے اس کی تمام باتیں سنیں اور پھر انتہائی سخت لہجے میں کہا کہ آئندہ تم نے فریال سے کوئی رابطہ کیا' یا اس گھر پر قدم رکھا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔

''وہ لوگ دوسرے ہوتے ہوں گے جو دامادوں کے خوف سے طلاق یافتہ بیٹیوں کو دوبارہ ان کے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں۔ اور اگر میں نے تمہیں جیل میں ڈلوا دیا تو تمہیں شاید اندازہ نہ ہو کہ قطر کی جیل سے تو چھوٹ کر تم واپس آ گئے مگر یہاں سے چھوٹ کر تم نہیں جاؤ گے۔ میں چوری' ڈاکا زنی کے مقدمے بھی تم پر کروا سکتی ہوں۔''

عدیل تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے قطر کے حوالے سے اس کی کہانی صادقہ باجی کو معلوم ہو گی اور سے اس نے ان کا صرف نرم رویہ ہی دیکھا تھا۔

آج تو نہ صرف ان کا لہجہ سنگلاخ تھا بلکہ ان کی آنکھوں سے نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

''اب تم یہ مت سمجھنا عدیل کہ فریال کوئی لاوارث لڑکی ہے۔ اب وہ میری بیٹی ہے' اب نہ تم اس کو کوئی گزند پہنچا سکتے ہو اور نہ ہی اس کو حراساں کر سکتے ہو۔''

عدیل یہ سب جان کر بے نیل و مرام واپس لوٹ آیا اور اس وقت کو کوسنے لگا جب اس نے صادقہ باجی سے فریال کو ملوایا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے اپنے پیر پر خود ہی کلہاڑی ماری تھی۔

☆☆☆

خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اس کی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رت جگا سا

اور آخر جمال کی کوششیں رنگ لائیں۔ کینیڈا کی ایک ملٹی نیشن کمپنی میں اسے جاب مل گئی۔ جس میں اماں اور ربیع کے ویزے بھی اسے مل گئے۔

ٹورنٹو میں اس کا عرصۂ ملازمت دو سال تھا۔ جس کے بعد اسے واپس پاکستان آنا تھا اور اسی کمپنی میں کام کرنا تھا جہاں اس کا اپائنٹمنٹ ہوا تھا۔

وقت' حالات اور کیفیات کچھ ایسی دلخراش یادیں لیے ہوئے تھے' اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں دور چلا جائے۔ ملازمت کا یہ پروانہ اس کے لیے ڈھیروں خوشیاں لایا تھا۔

''میں اپنی بہن کا اچھی طرح علاج کروا لوں گا۔ اور جب واپس آؤں گا تو وہ اپنے پیروں پر چلتی ہوئی آئے گی۔''

ربیع نے سنا تو بہت خوش ہوئی' یوں بھی وہ سیر و تفریح کی دلدادہ تھی۔

''بھائی جان! آپ کی شادی وہیں کر دیں گے اور ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ کبھی واپس پاکستان نہیں آئیں گے۔''

''نہیں بیٹا' اپنا ملک اپنا ہوتا ہے۔ کسی کے ملک میں جا کر ہم کتنے ہی سال رہ لیں' ہم وہاں کے باشندے نہیں قرار دیے جا سکتے۔ اور جب تم وہاں جاؤ گی تب جا کر تمہیں پتا چلے گا کہ اپنا ملک کیسے یاد آیا کرتا ہے۔''

''ابھی تو جانے کی اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس کس کو جا کر بتاؤں کہ ہم لوگ کینیڈا جا رہے ہیں۔''

''جانے سے پہلے محلے میں مل کر جانا۔ یوں بھی گھر بند کر کے چابی تو پڑوسیوں کو ہی دے کر جائیں گے۔''

''امی! خالی گھر بند پڑے پڑے خراب ہو جائے گا۔ آپ اسے بیچ دیں۔ جب کبھی دوبارہ آنا ہو گا تو کہیں اچھا سا گھر خرید لیں گے۔'' ربیع نے مشورہ دیا۔

''نہیں بیٹا! یہ اپنا پرانا محلہ ہے۔ برسوں سے لوگوں کو جانتے ہیں' ان لوگوں سے دور رہ کر بقیہ زندگی کے

سال گزارنے مشکل ہوں گے۔ ویسے بھی اس گھر سے جذباتی سی وابستگی ہے۔" اماں کہہ رہی تھیں۔

اور جمال سوچ رہا تھا' اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلی بار نگین کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے گیٹ کے سامنے کھڑی اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی' اس کی ہنسی میں کیسا ترنم تھا۔ وہ اسے تنہائیوں میں رم جھم کی طرح سنائی دیتی تھی۔ یک طرفہ محبت کی نہ اہمیت ہوتی ہے اور نہ ہی زندگی......!

مگر جمال کے لیے اس کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے دل سے وہ ہٹی تھی۔ وہ تو شجر سایہ دار بن کر رہ گئی تھی۔

جمال کا جب دل چاہتا' اپنی اس محبت کے شجر کے نیچے بیٹھ جاتا اور نگین کو ہنستا مسکراتا' باتیں کرتا دیکھتا رہتا اور اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں اس سے محو کلام تھا۔

"میں دو سال کے لیے جا رہا ہوں' مجھے یاد کرو گی؟"

"بہت زیادہ یاد آؤ گے۔"

"اور جب میں واپس آؤں گا تو تمہیں کیسے پتا چلے گا؟"

"میں دوڑ کر خود ملنے آ جاؤں گی۔"

"ملنے مت آنا مگر خوش رہنا۔ تمہاری خوشی سے مجھے تسکین ہوگی۔"

"میں خوش ہوں' خوش رہوں گی۔ پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔"

"پردیس میں اپنا خیال رکھنا' اتنی محنت مت کرنا کہ تھک جاؤ۔"

"اچھا اب مجھے بھی مشورے دینے لگی ہو۔"

"کیوں' کیا مجھے آپ کا خیال نہیں ہے؟"

"پتا نہیں۔"

"جمال! دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ اس کا احساس ہی دوسرے کے دل میں از خود جگہ بنا لیتا ہے۔"

"مگر تمہیں کیا پتا کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں؟"

"تمہیں کہنے کی کچھ ضرورت نہیں' تمہاری تو آنکھیں بولتی ہیں۔ زبان سے کچھ نہ بولو مگر آنکھوں سے سب کہہ جاتے ہو۔ رائی سے رتی تک ہر بات۔"

"مگر تم نے تو میری آنکھوں کی طرف بھی کبھی نہیں دیکھا۔ تمہیں کیا معلوم کہ وہ بولتی ہیں یا گونگی ہیں۔"

"مجھے ہر ایک کی خبر ہوتی ہے۔"

"اچھا!" وہ ہنس پڑا اور پھر اپنی ہنسی کی آواز سے ہی چونک پڑا۔ نگین اس کے خوابوں کی رانی تھی اور اب وہ خیالوں کے دریچے تک بھی آنے لگی تھی۔

"جمال' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ کسی کی بیوی کے بارے میں تم اس طرح سوچو۔ اب وہ پرائی امانت ہے۔" اس نے خود کو سرزنش کی۔

"خیالوں اور خوابوں پر بھی کسی کا کوئی بس چلا ہے' یہ تو ہوا کے ریلے کے ساتھ آتے ہیں اور میری ہستی کو مسحور کر کے چلے جاتے ہیں۔"

جمال کو یوں لگا جیسے وہ تر و تازہ سا ہو گیا ہو۔ نگین کے چند جملوں نے اس میں سرشاری کی ایک نئی روح پھونک دی ہو۔ تب وہ مسکراتے لبوں کے ساتھ اپنی فائل ہاتھ میں لیے باہر نکل گیا کہ ابھی اسے اپنے بہت سے ادھورے کام نمٹانے تھے۔

جمال کا دل نگین کے خیالوں سے آباد تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ محلے میں پچھلی گلی کے عارف صاحب سے وہ مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت چل کہیں رہا تھا اور قدم کہیں رکھ رہا تھا اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔

سامنے سے آتے ہوئے شخص سے وہ بری طرح ٹکرایا۔

"خیریت تو ہے جمال صاحب! آج کیا سوتے ہوئے چل رہے ہو" ٹکرانے والے صاحب بھی محلے کے ں تھے۔ جمال مجوب سا ہو کر ان سے معذرت کر رہا تھا اور وہ اس کو دیکھ کر مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔

دو قدم چلنا بھی میرے لیے دشوار ہوا
ہم نے چوراہے پہ یادوں کا بھرم کھول دیا

☆☆☆

پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں' اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

"یہ لے...... اپنے گلے میں ڈال لے" فرح کی ساس نے دو تین تعویذ اسے دیتے ہوئے کہا۔

"کس چیز کے لیے ہیں اماں!" فرح نے سادگی سے پوچھا۔

"لے ابھی تک اتنی معصوم ہے' پتا ہی کچھ نہیں کہ گھر والے کیوں پریشان ہیں؟"

"کیوں پریشان ہیں؟" اب وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"موٹی عقل' تیرے بچے کے لیے بے کل ہو رہے ہیں۔ اشرف ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر اس کے اولاد ہیں ہوئی تو ہماری نسل کیسے چلے گی؟ تیری ماں تو ایک کنجوس عورت ہے۔ اس سے تو بابے پر بھی پیسے خرچ نہیں یے گئے۔ اب پورے سات سو روپے خرچ کر کے یہ تعویذ لائی ہوں۔ بابا نے کہا' اسی سال انشاء اللہ میرا پوتا اجائے گا۔"

"جی ڈورا ڈال کر پہن لوں گی" وہ تعویذ لے کر جاتے ہوئے بولی۔

"ڈورا بھی میں لے آئی ہوں' مجھے پتا تھا کہ یہ کام بھی تجھ سے نہیں ہوگا' ابھی میرے سامنے پہن اس لو" تب فرح نے تعویذ کا ہار اسی وقت اپنے گلے میں ڈال لیا۔

"اب تو ٹھیک ہے ناں......" وہ ساس سے بولی۔

"کیا پتا...... ٹھیک ہے یا غلط...... غلطی تو میں کر ہی چکی۔"

"کیسی غلطی......؟"

"اپنی بھانجی سے اشرف کی شادی کر دیتی تو کب کی دادی بن چکی ہوتی...... اور اس کے آنے سے میرے گھ میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوتیں۔ بڑی بختاں والی لڑکی تھی وہ...... اور ایک تیرا قدم گھر میں آیا۔ اری مرغیاں بیمار پڑیں' چار مرغے آناً فاناً مر گئے۔ بھوری (بھینس) نے دودھ دینا کم کر دیا۔ اشرف کی دکان پر گھاٹا ہونے لگا۔ میرے وہ بھائی جو تیری ماں کا تھوڑا بہت خیال رکھتے تھے' انہوں نے ان پر سے بالکل ہی ہاتھ

اٹھالیا۔ وہ بے چاری بیٹیوں کے ہاں رہتی پھرتی ہیں۔ ان کا خرچہ بھی بیٹیوں نے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

”ہاں، سارا قصور میرا ہی ہے۔“ فرح وہاں سے اٹھتے ہوئے سوچ رہی تھی اور کنپٹیوں میں درد علیحدہ ہو رہا تھا۔

”فرح، میری کمر کھجا دے۔ کھجلی ہو رہی ہے“ نانی نے آواز دی تو وہ ان کے پاس چلی گئی۔ ”خالی بیٹھے رہنے سے تیرا دل نہیں گھبراتا؟“

”کام کر کے بیٹھ جاتی ہوں، پھر کیا کروں؟“

”تجھے میں نظر نہیں آتی۔ اب دانوں سے میری کمر پک رہی ہے۔ ذرا کنگھا لے کر کھجا دے۔“

”نانی! میں پاؤڈر لگا دیتی ہوں، دانوں کو کھجاؤں گی تو پک جائیں گے۔“ فرح ان کی کمر پر پاؤڈر لگا چکی تو وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

”یہ تیری کمر پر دانے کیوں نہیں نکلتے......؟“

فرح کا دل چاہا، کہہ دے کہ میں ہر وقت آم نہیں کھاتی، مگر ان کے برا ماننے کا خدشہ تھا اس لیے مسکراتی ہوئی اٹھ آئی۔

☆☆☆

”نگہت آرا (صابرہ کی بھاوج) کو اپنے بھتیجے کے لیے کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اور ان کی بھاوج روزانہ ہی کسی نہ کسی کے گھر چلی جاتیں اور منہ لٹکائے واپس آتیں۔

”میرے کو تو اب یہ لگتا کہ حسن کا تو خال (کال) ہو گیا ہے۔“

-”جی ہو......کوئی بی لڑکیاں اچھی نکیں دکھتی۔ جس کو دیکھو کھا کھا کے موٹی ہوتی بیٹھی۔ اپی حیدرآباد دکن میں لڑکیاں ڈھونڈنے کو اتنی مشکل نکیں۔“

”وہاں تو لڑکی کو بیٹھا برس لگتے ہی اچ کوئی تخریب (تقریب) ہوتی۔ سوب لوگاں لڑکی کو پھولاں پہناتے، مٹھائی کھلاتے۔ سوب کو پتا چل جاتا کہ لڑکی بڑی ہو گئی ہے۔“

”مگر یہاں کراچی میں تو ایسا نکو ہوتا ناں، لڑکی جوان بھی ہو جاتی، مگر انہوں کے گھر والے اس کو بچہ بولتے۔“

”یہی اچ وجہ ہے ناں ماں ادھر رشتوں کے واسطے پکڑا دھکڑی دکھتی۔ لڑکے والیوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے گھر لے کو جاتے۔ اور جا کو دیکھنے میں ایسی ایسی لڑکیاں ملتیں کہ اللہ کی پناہ......! آج کل لڑکیاں اپنے آپ کو آپ ہی برا بناتے بیٹھے ہیں۔“

”اب دیکھو ناں، ہلکے بالاں ہیں تو انہوں کو کائے کو کٹاتے بیٹھے۔ اب پرسوں ہم لوگاں جو لڑکی جا کو دیکھے تھے، ایکدم گنجی دکھتی تھی ناں۔“

”جی ہو۔“

”پھر مٹاپے پرانوں فلیپر پہنتے۔ کولہاں الگ الگ ڈگ مگ جیسے چلتے، کتنا برا لگتے تھے وہ، پرانوں کی امی کو دیکھائی نکو دیتے۔“

”وہ کوئی کھاس (خاص) فیشن سمجھ کو بیٹھے تھے۔“

”نگہت، میرے کو تو ایسا ہی اچ لگتا کہ میرے بیٹے کے لیے کوئی لڑکی ہی نکو۔ ماں، میں تو پریشان ہو کر

بیٹھی......“

”بھابی پاشا! آپ پریشان نکو ہوئیے، میں ہیرا اچ لڑکی ڈھونڈ کو دیوں گی ناں۔“

”میرے کو فاخرہ انکار کیے ناں۔ اب میں ثریا کی بیٹی کا پوچھ کو بیٹھتی ہوں، انوں ڈاکٹر بن رہے۔“

”اللہ، میرے کو ڈاکٹر بہو ملے گی ناں، تیکو منہ میں مٹھائی بھر کو دیوں گی۔ بس ایک بار دیکھی تھی میں انوں کو، پھولاں جیسی ڈالی دکھی تھی۔“

تب اگلے ہی دن نگہت آرا صابرہ کے گھر باتیں مٹھارنے کے لیے موجود تھی۔

”صابرہ! تم کی جٹھانی کیسی ہوتی تمرے ساتھ......“

”ایسی ہی اچ جیسی جٹھانیاں، دیورانیاں ہوتے نے۔“

”پھر بھی تم لوگاں کی دوستی ہوتی یا نئیں۔“

”میری سوب کے ساتھ اچھی دوستی ہے“ صابرہ نے ابرو چڑھا کر کہا۔

”میں تو ایسا ہی اچ پوچھ رہی تھی۔“ صابرہ نے بات ٹالی۔

”میں کسی کی سنگات جھگڑ کو نہیں رہتی اور نہ ہی میری زبان انگارا بولتی“ صابرہ نے زعم بھرے لہجے میں کہا۔

”برابر بولی۔“ (ٹھیک کہا تم نے) میں سوب جانتی ہوں، تم کتنی اچھی رہتی سوب کے ساتھ“ نگہت آرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

تب صابرہ اس کا جملہ سن کر یہ سوچنے لگی کہ یہ بھابی پاشا نے اس کی تعریف کی تھی یا اس پر طنز؟ اور جب ہن نے کام نہیں کیا تو سادگی سے ہنس کر کہا۔ ”جی ہو۔“

☆☆☆

جب کوئی خود ہی پاگل ہو جائے تو کیا کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے لڑکوں کی شادیاں ہوتی ہیں مگر ان کی عقل کا گا (کوا) نہیں لے کر جاتا، جیسے ہمارے بیٹے کی لے کر گیا ہے۔“ عظمت بیگم اپنی پڑوسن حکیم جی کی بیوی سے اپنے ل کے پھپھولے (زخم) پھوڑ رہی تھیں۔

”شجاع تو بڑا سمجھ دار لڑکا ہے۔ سب کا خیال رکھنے والا۔ اس سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ بھی زن مرید بن ر بیٹھ جائے گا۔ زن مرید تو میرا بیٹا ہے۔ جو صبح کام پر جانے سے پہلے بیوی سے اجازت لے کر جاتا ہے اور اگر وہ کسی دن منع کر دے تو مجال ہے کہ چلا جائے۔ سارا دن گھر میں بیٹھا اس کے ساتھ ہوحق (ہنسی مذاق) کرتا ہے گا مگر مجال ہے کہ گھر میں بیٹھ کر اس کا دل گھبرائے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر اب تو عورتوں کی سی باتیں کرنے لگا ہے۔“ حکیم جی کی بیوی رازدارانہ لہجے میں بولیں۔

”عورتوں کی سی......؟“ عظمت بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ گلابی سوٹ کے ساتھ تو نے کڑھائی والا دوپٹا کیوں نہیں لیا، اس کے اتھ ٹاپس پہننے تھے۔ کبھی کہے گا، بال کھول کر آگے ڈالا کر، ماتھے پر چھوٹی بندیا لگا کر گھوما کر، اس طرح بہت سوہنی لگتی ہے۔ جن کپڑوں کے نام اور فیشن عورتوں کو پتا نہیں ہوں گے وہ اس کو معلوم ہیں......اور پھر اندر کمرے میں بیٹھ کر دونوں اتنا ہنستے ہیں کہ باہر بیٹھ کر میرا دل برا ہونے لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔“

”یہی حال شجاع کا ہے، اس کا تو غصہ مشہور تھا۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو مرنے مارنے ادہ ہو جایا کرتا تھا مگر اب تو اول اسے نگین کی کسی بات سے بھی اختلاف ہوتا ہی نہیں ہے اور اگر میرے سمجھانے

پر ہو بھی جائے تو اتنے پیار سے اسے سمجھاتا ہے کہ وہ ہاں جی ہاں جی کرنے لگتی ہے۔ اور رہی ہنسنے کی بیماری تو مجھے لگتا ہے شادی کے بعد یہ بیماری سب کو ہو جاتی ہے۔ بڑے شیخ کی بیوی کل آ کر یہی سنا رہی تھی کہ مجھے سمجھ نہیں آتی ہے کہ اکیلے بیٹھے میاں بیوی بند کمرے میں ہر وقت کس طرح ہنس سکتے ہیں؟‘‘

’’لطیفے یاد ہوں گے آپ کی بہو کو شہر سے آئی ہے ناں وہاں تو لطیفے بھی خوب ہوتے ہوں گے۔ وہی سنا کر ہنساتی ہو گی۔‘‘ حکیم جی کی بیوی کا تبصرہ بڑا جاندار تھا جسے سن کر عظمت بیگم کو ہنسی آ گئی اور کہنے لگیں۔

’’چلو میری بہو کو تو لطیفے سنانے کی بیماری ہو گی مگر تمہاری بہو کو بھی کیا لطیفے آتے ہیں؟‘‘

’’شکل سے تو ایسا نہیں لگتا میں کوئی ہنسی کی بات بھی سناتی ہوں تو منہ سڑا کے بیٹھی رہتی ہے۔ مجال ہے کہ چہرے کی شکنیں ہی ختم ہو جائیں۔ ہاں میاں کے ساتھ ہر وقت ہی ہی کرے گی‘‘ حکیم جی کی بیوی کہہ رہی تھیں اور عظمت بیگم کے لب مسکرا رہے تھے۔

’’مگر عظمت آپا! تمہارے رویے کی وجہ سے میری بہو پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔‘‘ حکیم جی کی بیوی شاکیانہ بولیں۔

’’میرے رویے کی وجہ سے! میں سمجھی نہیں؟‘‘

’’آج چار مہینے ہو گئے آپ کی بہو کو میکے گئے اب کوئی اتنے دنوں کے لیے بہوؤں کو میکے بھیجا کرتا ہے؟ اب میری بہو بھی ہر ہفتے اپنے گھر جانے کی ضد کرتی ہے اور اگر اسے کچھ کہو تو فوراً کہہ دیتی ہے کہ لوگ تو اپنی بہوؤں کو مہینوں کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ آپ سے ایک دو دنوں کے لیے نہیں بھیجا جاتا۔‘‘

’’میں کیا کروں شجاع میری بات سنتا ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اسے جانے کو بھی منع کیا تھا ان دنوں کچے دن تھے مگر وہ کہاں ماننے والی تھی میاں کو بھر دیا اور وہ لے گئے۔‘‘

’’چلو اگر لے گیا تھا تو ساتھ لے کر آنا تھا۔‘‘

’’ہاں میں نے بھی بہتیرا الٹا اس کو اس حال میں اسے میکے چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ وہاں کا ماحول بھی روتا پیٹتا سا ہے۔ نہی بھی روٹھ کر گھر بیٹھ گئی ہے یا اسے گھر بٹھا دیا گیا ہے مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا۔‘‘

’’آپ بلوایئے اسے شجاع پر زور دیجئے ورنہ جب لڑکیوں کا شادی کے بعد میکے میں دل لگنا شروع ہو جائے تو سمجھ لیں کہ وہ سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتیں اس لیے شجاع کو سمجھائیں کہ اب بال بچہ ہونے والا ہے اسے اپنے گھر آ جانا چاہیے۔‘‘

’’ہاں ہاں...... کہوں گی میں اس سے۔ ویسے بھی گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ جب سے اسکول کھلے ہیں فرحت بھی اتوار کے اتوار آتی ہے ورنہ چھٹیوں میں تو خوب رہ کر گئی تھی وہ۔‘‘

شام کو شجاع آیا تو عظمت بیگم نے پہلی بات یہی کی ’’بیٹا! نگین کو گھر گئے اب دن ہو گئے مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔ اس کے بغیر گھر میں دل ہی نہیں لگ رہا۔ اس کو فون پر کہو کہ تمہارے ماموں کے ساتھ جہاز سے آ جائے۔‘‘

’’کیا تھا میں نے اسے فون مگر اب ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اب وہ فراغت کے بعد ہی آئے گی۔‘‘ شجاع نے ماں کو بتایا۔

’’بیٹا! اس نے جو کہہ دیا تم نے اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا؟‘‘

’’کیوں اس میں بے یقینی کی کون سی بات ہے؟‘‘

’’اس کی ماں چاہتی ہے کہ تم گھر داماد بن کر رہو اور یہاں سے چلے جاؤ۔‘‘

’’مگر ممانی نے مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔‘‘

’’اپنی بیٹی کو اپنے گھر قصداً روک رکھا ہے تو اس کا مطلب ہی یہی ہے کہ تم بار بار وہاں کے چکر لگاؤ اور جب وہاں کے عادی ہو جاؤ تب تم از خود وہاں رہنے کا پروگرام بنا لو۔‘‘

’’تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے جس سے ممانی کا سارا پروگرام فیل ہو جائے؟‘‘ شجاع نے مسکراتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

’’تم فون پر نگین کو ڈانٹتے ہوئے کہو کہ فوراً گھر آ جائے بچہ گاؤں میں ہی پیدا ہونا چاہیے۔‘‘

’’ٹھیک ہے کہہ دوں گا‘‘ تب عظمت بیگم کے چہرے پر خوشی کی ایک روشنی سی پھیل گئی۔

اور جب رات کو شجاع نے اسے فون کیا تو اس کی طبیعت خاصی خراب تھی۔

’’کیا بات ہے نگین؟‘‘

’’شروع میں تو اتنی الٹیاں نہیں آئیں جتنی کہ اب آ رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے کمزوری سی ہو رہی ہے۔‘‘

’’کھانے پینے کا اپنا خیال رکھ رہی ہو ناں؟‘‘

’’ہاں امی کے ساتھ ساتھ نہی باجی کچھ نہ کچھ میرے منہ میں زبردستی ڈالتی رہتی ہیں۔ اس وقت بھی میں پی چکی ہوں۔‘‘

’’تم کہو تو میں آ جاؤں تمہارے پاس......؟‘‘

’’ڈلیوری کے وقت آ جایئے گا۔ بار بار آئیں گے تو پھپھو کو اکیلا پن لگے گا اور وہ بور ہوں گی۔‘‘

’’اپنی ساس کا تمہیں بے حد خیال رہتا ہے۔‘‘ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

’’کیوں نہیں ہو گا۔ آخر ان کے پاس ہی مجھے ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اور جس کے پاس ہمیشہ رہنا ہوتا ہے اس سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں اور اللہ کا شکر ہے کہ پھپھو مجھے بے حد چاہتی ہیں۔‘‘

’’ہوں......‘‘ شجاع یکبارگی خاموش سا ہو گیا۔

’’آپ چپ کیوں ہو گئے؟‘‘

’’بس تمہاری طبیعت کی طرف سے پریشان ہو گیا ہوں۔‘‘

’’پریشان مت ہوں یقیناً اللہ کرم کرے گا۔ آپ پھپھو سے کہیں کہ وہ میرے لیے دعا کریں۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘‘ شجاع نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

’’کب آ رہی ہے نگین؟‘‘ اگلی صبح عظمت بیٹے سے پوچھ رہی تھیں۔

’’وہ فارغ ہو کر آئے گی۔‘‘

’’کیوں تیری بات کو اس نے اہمیت نہیں دی جو من میں آ رہا ہے وہی کر رہی ہو گی ہے ناں؟‘‘

’’میں نے خود اس سے کہا ہے کہ جب بچہ ہو جائے تب آنا۔‘‘

’’کیوں پہلا بچہ سسرال میں ہونا چاہیے تھا۔‘‘

’’اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے سفر کرنے کو منع کیا ہے اس لیے وہ نہیں آ سکتی۔‘‘

’’اس نے کہہ دیا اور تم نے یقین کر لیا...... ارے جھوٹوں کا خاندان ہے۔ اگر ان کی باتوں پر یقین کرتا رہا [illegible] نہیں بچے گا تو۔‘‘

''اماں! خواہ مخواہ ذرا سی بات کو طول دے رہی ہیں آپ۔ کیا ڈاکٹر اس حالت میں سفر سے منع نہیں کرتے کیا' کون سی عجوبہ بات ہے یہ؟''

''جب میں نے جانے کو منع کیا تو میری بات تو نہیں مانی تھی۔ وہ تو اپنے مزاج سے چلتی ہے۔ اب ڈاکٹر کی بات کیسے مان رہی ہے؟''

''اب مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں؟'' شجاع نے الجھ کر کہا۔

''ایسا تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لگتا ہے اس دفعہ فیروزہ نے تجھے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ تجھے نگین کی ہر بات سچ لگ رہی ہے۔ چالاک عیار سی لڑکی ہے' اپنی خوبصورتی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔''

''اب بس بھی کریں آپ......'' شجاع کو وحشت ہو رہی تھی۔

''اس لیے شادی کی تھی کہ بیوی تیری خدمت کرے گی۔ اس لیے تو نہیں کہ وہ میکے بیٹھ جائے۔ شادی کے بعد اتنے دن سسرال نہیں رہی جتنے میکے' میں نے تو سنا تھا کہ نئی دلہنوں کا دل اپنے میاں کے بغیر کہیں نہیں لگتا۔ تیری بیوی تیرے بغیر کیسے خوش رہ رہی ہے۔ کہیں دال میں کالا تو نہیں' میکے میں کہیں اس کا کوئی سگا تو نہیں بیٹھا ہوا' جس کی خاطر وہ آنے سے انکاری ہو رہی ہے۔'' اب عظمت بیگم نے دوسری چال چلی۔

''اماں! اب ایک لفظ مت بولنا نگین کے خلاف'' شجاع غصے میں بپھر کر بولا۔

''کیوں' کیا میں بھی منہ باندھ لوں اور بہو بیگم سے ڈر کر رہوں؟''

''وہ ایسی نہیں ہے' جیسی آپ سمجھ رہی ہیں۔ آپ سے بے حد محبت کرتی اور عزت کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ گاؤں میں رہنا چاہتی ہے۔''

''ارے بیٹا! تو بھی شہر کی لڑکی کی باتوں میں آ گیا' یہ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔''

''اماں! وہ آپ کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتی ہے۔''

''شجاع بیٹے! فیروزہ بھی زبان کی بہت میٹھی ہے مگر وہ بھی کبھی سسرال میں نہیں رہی بلکہ فرید کو بھی برسوں گاؤں نہیں آنے دیا۔ اب فہمی کو ہی دیکھ لو' اپنی ننھیال میں بیاہ کر گئی مگر اس کی ممانی اس سے ناخوش ہیں اور سسرال والوں نے اسے میکے بٹھا دیا ہے۔ ظاہر ہے' اس کی زبان ہی ایسی ہو گی جو کسی کو برداشت نہیں ہو گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' پریشان ہو کر شجاع نے اپنا سر تھام لیا۔

''نگین سے فون پر لارے لپے کرنے کے بجائے ایک ٹیلی گرام بھیج دے کہ شرافت سے اپنی سسرال سے آ جاؤ۔ بہت رہ لیں میکے۔ دیکھ کیسی بھاگتی ہوئی آئے گی گھر اپنے۔''

☆☆☆

عین منزل پہ ہوئی شام تو پھر کیا ہوگا
جستجو یونہی ہوئی ناکام تو پھر کیا ہوگا
شمع امید کی جلائی تو ہے ڈرتے ڈرتے
بجھ گئی یہ بھی سرِشام تو پھر کیا ہوگا

وہ بہت بھاگتا رہا تھا' بالآخر بھاگتے بھاگتے تھک گیا۔ کراچی واپس آیا تو اماں کا سوال اس کے سر پر تلوار بن کر پھر لٹک رہا تھا۔

''فہد بیٹا! دوسری شادی کر لے' تجھے بھی سکون مل جائے گا اور مجھے بھی۔''

''نہیں اماں! یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''تیری بیوی تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ تجھ سے کسی قسم کا ناتا نہیں رکھنا چاہتی۔ پھر تو کس آس پر بیٹھا ہے؟''

''نہیں اماں! ایسا نہ کہیں' وہ ایسی نہیں ہے۔''

''مت اپنے آپ سے جھوٹ بول اور نہ ہی دلاسے دے کر اپنے آپ کو بہلا...... میری بات سن لے' ، ، کی لمحہ سے گزرے گی۔ میں نے تیرے لیے بہت اچھی لڑکی دیکھ لی ہے۔ شگفتہ نام ہے' تیری زندگی میں پھول ،ن کر آئے گی اور تو بھی کھل اٹھے گا۔''

وہ چپ چاپ بیٹھا ماں کی بات سن رہا تھا۔

''انٹر پاس ہے شگفتہ' بیس سال کی ہو گی بمشکل۔ فہمی سے تو خاصی چھوٹی ہے۔ تین بہنیں اور پانچ بھائی اس بڑی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے بات بھی کر لی ہے۔ وہ لوگ دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔ بس ان کی ایک ہی شرط ہے کہ اگر پہلی بیوی کو طلاق نہیں دیتے تو کوئی رابطہ بھی نہیں رہے گا اور نہ اس کے ساتھ پہلی والی ور لکھا جائے گا۔'' اماں سرشاری میں تفصیل بتا رہی تھیں۔

''اماں' پلیز...... آج چار ماہ کے بعد میں گھر واپس آیا ہوں۔ بہت تھکا ہوا ہوں' آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں مجھ سے جس سے میرے دماغ کی چول چول اور ہل جائے۔''

''بیٹا! یہ سب کارن میں تمہیں سکھ دینے کے لیے کر رہی ہوں' مجھے معلوم ہے کہ تو اس کے ساتھ خوش نہیں ہے۔''

''یہ کس نے کہا آپ سے؟''

''میں ماں ہوں تیری' تیرے دکھ اور سکھ چہرے سے پڑھ لیتی ہوں۔ تو جتنا پریشان ہے' کیا مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔''

''ٹھیک ہے' اس موضوع پر پھر بعد میں بات کریں گے۔ پہلے مجھے کچھ کھانے کو دے دیجئے' مدت سے گھر لے کھانے کو ترس رہا ہوں۔ بازار کا کھانا کھا کھا کر بھوک بھی میری مر گئی ہے۔''

''ارے' میں تو تجھے دیکھ کر سب ہی بھول بیٹھی۔ دو منٹ میں تیرے لیے لاتی ہوں' چنے کی دال کا حلوہ تو ں نے بنایا ہی تیرے لیے تھا۔''

تب فہد اپنا سر صوفے کی پشت پر رکھ کر سوچنے لگا کہ کروں تو کیا کروں......؟ بیوی بتائے بغیر گھر سے گئی۔ ماں بتائے بغیر نئے رشتے جوڑنا چاہتی ہے۔ ایسے میں' میں کروں تو کیا کروں......؟

☆☆☆

بے شک کہ بہت پیار سے ملتا ہے وہ مجھ سے
سب کچھ ہے مگر پہلے سا انداز نہیں ہے

شجاع کا تار پڑھ کر نگین بے اختیار رونے لگی۔

''امی! میں ابھی گاؤں جاؤں گی۔ آپ میرے ساتھ چلیں ورنہ مجھے سوار کرا دیں' وہاں وہ اتار لیں گے۔''

''پاگل ہو گئی ہو تم...... ایک بے وقوف شخص کی باتوں میں آ گئیں' جسے سوجھ بوجھ تک نہیں ہے۔''

''امی! یہ بے وقوف اور سوجھ بوجھ سے عاری شخص آپ نے ہی میرے لیے پسند کیا تھا۔ میں نہیں جاؤں گی و بہ باتیں بنائیں گی اور ذرا سی بات فسانہ اختیار کر لے گی۔''

”یہ کہو کہ تمہاری ساس بھی بھابی جان جیسی نکلیں..... اف میری بیٹیوں کے نصیب.....! دونوں کو ہی ناقدرے لوگ ملے۔“

”نہیں امی! شجاع اچھے ہیں‘ بس کانوں کے ذرا سے کچے ہیں اور یہ خامی شاید ایشیائی مردوں میں ۸۰ فیصد پائی جاتی ہے۔“

”مگر میں تمہیں کسی صورت میں نہیں جانے دوں گی۔ تمہارے جانے سے بچے کو کچھ ہو جائے تو میرا تو نام بدنام ہو جائے گا۔ ماں کے گھر گئی تھیں‘ خالی ہاتھ لوٹ کر آ گئی ہیں۔“

”مگر میں شجاع کی خفگی برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تم موبائل پر فون کر کے اسے سمجھا دو‘ بات سمجھ جائے گا۔“

”فون پر تو انہوں نے خود ہی اجازت دے دی تھی مگر اب اچانک ان کا یہ ٹیلی گرام آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے‘ جیسا ان کو فیڈ کیا گیا‘ وہی زبان وہ اپنا رہے ہیں۔“

”نگین! تمہیں پھپو کی بات ماننی چاہیے تھی‘ اس وقت تمہیں کراچی نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیا اب زندگی کا یہی مطلب رہ گیا ہے کہ ہم فلاں کی بات مانیں‘ ہم فلاں کے مشورے اپنائیں؟ زندگی ہماری ہو مگر اسے گزارے کوئی اور.....“

”اب ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے‘ میں گاؤں جا رہی ہوں‘ آپ لوگ مجھے جانے سے نہیں روکیے۔“

”تم نہ سہی‘ میں تو شجاع سے بات کر سکتی ہوں“ فہمی نے اس کے موبائل کے نمبر ڈائل کیے۔

شجاع نے فون ریسیو کیا۔

”شجاع بھائی! آپ کا ٹیلی گرام مل گیا ہے۔ نگین کل آنے کا کہہ رہی ہے۔ اس کی طبیعت خاصی خراب ہے۔ امی روک رہی ہیں مگر وہ کسی صورت نہیں رک رہی۔ اب وہ کل شام تیز گام سے سوار ہو جائے گی۔ امی اس کے ساتھ آئیں گی۔“

”نہیں‘ نہیں۔ اگر اس کی طبیعت خراب ہے تو اسے آنے سے روکو“ شجاع گھبرا کر بولا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر آپ نگین سے ہی بات کر لیں۔“ تب نگین نے سنا‘ وہ اس سے امرت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”نگی! اپنا خیال رکھو‘ اس حالت میں سفر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے پاس جلد آتا ہوں۔“

”اگر ایسی بات تھی تو ٹیلی گرام کیوں دیا آپ نے؟“

”یار! سمجھا کرو‘ یہ ٹیلی گرام تو اماں کو خوش کرنے کے لیے دے دیا تھا۔ ہاں‘ تمہیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔“

”آپ کو پتا ہے‘ آپ کا ٹیلی گرام پڑھ کر میں خوب روئی تھی“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اف..... مجھے اندازہ تھا کہ تم خود سے نہیں رکی ہو‘ یہ سب ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے۔“

”شجاع! یقین کرو‘ میں سوچ رہی تھی کہ جب آپ جا رہے تھے تو میں آپ کے ساتھ چلی جاتی اور اپنے ساتھ فہمی باجی کو بھی لے جاتی‘ یوں ان کی بھی آب و ہوا تبدیل ہو جاتی۔“

”کہہ تو تم صحیح رہی ہو مگر یہ اچھی باتیں بعد میں یاد آئیں تمہیں.....؟“

”سوری شجاع! تمہیں میرے بغیر تکلیف ہو رہی ہے.....“ نگین نے خفت بھرے لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں‘ ہم جلد ملیں گے۔ اپنا خیال رکھو اور بس!“ وہ جاندار سی ہنسی ہنسنے لگا۔

اور فیروزہ بیگم کی پریشانی از خود ختم ہو گئی۔

☆☆☆

”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ نگین نہیں آئے گی‘ اول نمبر کی ضدن ہے وہ۔ جو مرد اپنی بیویوں کو سر پر چڑھا لیتے ہیں تو ان کی اپنے گھر میں کچھ نہیں چلا کرتی۔ وہی ہوتا ہے جو بیوی چاہتی ہے‘ میاں کی ویلیو دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔“ عظمت بیگم اپنے دل کی بھڑاس اپنی پڑوسن حکیم جی کی بیوی کے سامنے نکال رہی تھیں۔

”ہاں ہاں! ایسا ہی ہوتا..... سر پر چڑھنے کے بعد بیوی نیچے اترنے کو تیار کہاں ہوتی ہے۔“

”شجاع نے خوب غصے بھرا ٹیلی گرام نگین کو بھیجا کہ اس کو پڑھتے ہی فوراً گاؤں آ جاؤ۔ بچے کی ولادت گاؤں میں ہونی چاہیے۔ آج دسواں دن ہے‘ اس نے ایک کان سے سنا دوسرے کان سے اڑا دیا۔ جب شوہر اپنی ویلیو خود گراتے ہیں تو ان کا یہی انجام ہونا چاہیے“ عظمت بیگم کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”میری بہو تو اچھا خاصا ڈانٹتی تک ہے اور وہ سر جھکا کر ہنستا رہتا ہے۔ میں نے بھی اس سے کہہ دیا کہ اگر تیری بیوی کے یہی اطوار رہے تو بعد میں پتا بھی کرے گا۔“ حکیم جی کی بیوی نے بتایا۔

”بڑے شہر کی لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں۔ بات کو اس طریقے سے کہتی ہیں کہ بات بھی کہہ دی اور یہ بھی پتا نہیں لگنے دیا کہ انہوں نے بات کہی ہے۔ ان کا مدعا اس آسانی سے پورا ہو جاتا ہے کہ میں تو حیرت زدہ رہ جاتی ہوں۔ بظاہر سیدھی سادی معصوم صورت..... مگر حرکتیں ایسی کہ الامان الحفیظ.....!“

”آپا‘ تم تو بڑے شہر کی لڑکیوں کی بات کرتی ہو۔ ان کا تو ہزاروں سے رابطہ ہوتا ہے‘ سیکڑوں باتیں سیکھ کر آتی ہیں مگر ہماری بہو تو اس چھوٹے سے گاؤں سے آئی ہے‘ جس کا نام بھی کسی نے نہیں سنا..... مگر اپنے تمام معاملات میں سیکھی سکھائی آئی ہے۔ جہیز تو واجبی سا لائی ہے مگر تعویذ گنڈے پورے لائی ہے۔ چینی میں کیا ملانا ہے‘ نمک میں کیا گھولنا ہے۔ پلنگ کے ساتھ کیا باندھنا ہے؟ درخت کے ساتھ کیا لپیٹنا ہے..... اور کم بخت ساس کے دروازے پر کیا لٹکانا ہے جیسے سبق اس نے چوتھے دن ہی شروع کر دیے۔ جب میں نے گھر میں چاروں طرف تعویذوں کے جھنڈے دیکھے تو پوچھا۔ بی بی‘ یہ سب کیا ہے؟ شادی تو تمہاری ہو گئی ہے‘ اب میرے گھر میں جھنڈیاں کیوں لگا دی ہیں؟ اس پر وہ ہنس کر بولی‘ بہت بڑے بابا سے لائی ہوں‘ اس کے طفیل سب آپس میں محبت سے راضی خوشی رہیں گے‘ میں نے کہا اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب بڑی محبت سے رہتے ہیں اس لیے یہ سب ہٹا دو یہاں سے۔ اس پر وہ بولی‘ میں نے تو بڑے پیسے خرچ کیے ہیں‘ ان تعویذوں کی وجہ سے ہم پر کوئی غلط عمل نہیں کر سکتا‘ تب میں نے کہا‘ جہاں صبح و شام قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے‘ چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھی جاتی ہے‘ وہاں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ سب یہاں سے ہٹاؤ۔ اس پر بڑی جز بز ہوئی۔ میرے کمرے سے تو ہٹا لیے مگر اپنے کمرے سے نہیں ہٹائے ہیں۔ پانی بھی مانگو تو آدھے گھنٹے میں پڑھ پھونک کر دیتی ہے۔“

”تمہاری بہو تو بڑی تعلیم یافتہ ہے کہ بغیر پڑھے کوئی چیز دیتی ہی نہیں“ عظمت بیگم نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہی تو کہہ رہی ہوں میں‘ بہوئیں چھوٹے علاقوں کی آئیں یا بڑے شہروں سے اپنے معاملوں میں ہر فن

مولا ہوتی ہیں۔‘‘

’’کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو...... مگر میرے شجاع کو جتنا گرایا جا رہا ہے اس سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔‘‘

’’آپ نے پوچھا نہیں کہ تم نے ٹیلی گرام دیا تھا‘ اس کا کیا جواب آیا؟‘‘

’’ہاں پوچھا تھا اس سے کہ تیری بیوی تیرے ٹیلی گرام سے کتنا ڈری؟‘‘

’’تو پھر کیا کہا اس نے؟‘‘

’’یہی کہ وہ تو آ رہی تھی مگر میں نے خود منع کر دیا ہے۔‘‘

’’ایسا جھوٹ‘ اللہ توبہ!‘‘ اب حکیم جی کی بیوی اپنے کلے پیٹ رہی تھیں۔

’’شجاع ساری برائی اپنے اوپر لے لیتا ہے کہ اس کی بیوی کو کوئی کچھ کہنے نہ پائے۔‘‘

’’یہ تو زن مریدی کی سب سے گھٹیا قسم ہوتی ہے جو بیوی پر حرف بھی نہیں آنے دیتے بلکہ سب وار اپنے اوپر روک لیتے ہیں۔‘‘

’’پتا نہیں میرے بیٹے پر کیا کر دیا فیروزہ نے کہ اسی کی بولی بولتا ہے وہ؟‘‘

’’کیا شہر کی عورتیں بھی بابوں پر یقین رکھتی ہیں؟‘‘

’’وہ تو یہاں سے زیادہ رکھتی ہیں...... اور ان کے بابے بھی بڑے قابل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے بنگال سے ہوتا ہے۔‘‘

’’جب ہی شہر کی لڑکیاں مشکل سے دبا کرتی ہیں۔‘‘

’’دبتی کہاں ہیں‘ دباتی ہیں۔‘‘

’’ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ......! اب ریت ہی نئی آ رہی ہے۔ پہلے بہوئیں ڈرا کرتی تھیں ساسوں سے‘ اب ساسیں اپنی بہوؤں سے ڈر کر رہ رہی ہیں۔‘‘

’’نہیں بھئی...... میں تو نہیں ڈرتی‘ میں کیوں ڈروں خواہ مخواہ میں؟‘‘

’’خیر‘ ڈرتی تو میں بھی نہیں ہوں...... بعض دفعہ تو اپنی بہو کی ایسی طبیعت صاف کرتی ہوں کہ وہ حواس باختہ سی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’اچھا کرتی ہو۔‘‘

’’تم بھی ٹھیک کرتی ہو۔‘‘

اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔ کھی‘ کھی‘ کھی...... شاید اپنے کارناموں کا احساس ہو رہا تھا یا اپنی بلند حیثیت پر نازاں تھیں۔

☆☆☆

ابا جی کسی کام سے حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ نگین امی کے ساتھ اپنے روٹین چیک اپ کے لیے اسپتال گئی ہوئی تھی۔ فہمی گھر میں اکیلی تھی۔ سر میں سخت درد تھا۔ مائی سے تیل لگوایا تو اس نے گردن تک چپڑ کر رکھ دی تھی۔ سر کے درد کے بجائے اسے تیل کی چپچپاہٹ سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد وہ لان کا زرد سوٹ پہنے آنگن میں بیٹھی تھی۔ لمبے سیاہ بال آبشار کی طرح اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ بالوں سے پانی موتی بن کر گر رہا تھا اور وہ درخت پر پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے بال بھی سلجھا رہی تھی۔ دفعتاً بھڑے ہوئے دروازے کو ہاتھ کے دباؤ سے کسی نے دھکا دیا اور صحن میں آ گیا۔

فہمی نے چونک کر دیکھا۔ فہد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بڑھا ہوا شیو‘ پریشان بال اور سرخ سرخ آنکھیں۔ فہمی بے اختیار کھڑے ہو کے اس کی جانب بڑھی اور برق کی سی رفتار سے اس کے سینے سے جا لگی۔

’’اتنے دنوں بعد آئے ہیں آپ!‘‘ وہ سسک اٹھی۔

’’تم نے کون سا رابطہ کیا تھا مجھ سے؟‘‘

’’یہ بات آپ کہہ رہے ہیں؟ گھر پر آپ ملتے نہیں تھے۔ آفس سے چلے گئے تھے‘ موبائل بند رہتا تھا۔ میں بھلا کیا کرتی......؟‘‘ اب اس کے آنسو رخساروں پر اتر آئے تھے۔

فہد نے اپنے ہاتھوں سے وہ ہیرے چن لیے اور اس کو ساتھ لگاتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے بولا ’’تم اپنا گھر چھوڑ کر کیوں گئیں؟‘‘

’’اس کا مطلب ہے پوری بات آپ کو معلوم ہی نہیں۔‘‘

’’تمہیں دیکھ لینے کے بعد اب میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔‘‘ اب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ ’’امی میری دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں‘‘ کچھ لمحے توقف کے بعد فہد نے کہا۔

’’اور آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ اگر امی کی بات ماننی ہوتی تو میں تمہارے پاس کیوں آتا؟ جبکہ میرا کوئی فون پھپو نے تمہیں نہیں دیا۔‘‘

’’اگر میں آپ کو دوسری شادی کی اجازت دے دوں تو......؟‘‘

’’تو پھر بھی میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔‘‘

’’فہد! میرا کیا قصور ہے‘ تم مجھے بتلاؤ؟‘‘

’’کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بس زندگی امتحان لیتی رہتی ہے اور ان امتحانات سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’مگر میں تو بہت ڈرپوک قسم کی عورت ہوں۔‘‘

’’میری رفاقت میں تمہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اب کیا پروگرام ہے تمہارا......؟‘‘

’’پہلے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں اور کوئی اچھی سی چیز کھانے کے لیے آپ اتنے میں غسل کر لیں‘ شیونگ بکس بھی واش روم میں ہے‘ شلوار کرتہ میں آپ کو دیتی ہوں۔ ابا جی کا سوٹ آپ کو ٹھیک آ جائے گا۔‘‘

تھوڑی دیر بعد وہ ہنستے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

’’میرے ساتھ گھر چلو تم...... بہت عیش کر لیے میکے میں تم نے۔‘‘ فہد اس پر شریر سی نظر ڈال کر بولا۔

’’اس وقت بنا بتائے امی کو میں چلی گئی تو وہ پریشان ہو جائیں گی۔‘‘

’’مجھے بھی تو بغیر بتائے آئی تھیں‘ میری پریشانی کا تمہیں خیال نہیں آیا؟‘‘

’’آپ تھوڑی دیر رک جائیں۔ امی اور نگین آتی ہوں گی پھر گھر چلتے ہیں۔‘‘

’’تم نے اگر کل چلنا ہے تو میں رک جاتا ہوں مگر لے کر ساتھ ہی جاؤں گا۔‘‘

تب فہمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ فیروزہ بیگم اور نگین جب گھر آئیں تو فہد کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''چلو' تمہیں بیوی تو یاد آئی ورنہ بھابی جان نے تو اپنے محلے میں مشہور کر دیا ہے کہ اب فہمی گھر نہیں آئے گی۔''

''پھپھو! اتنے دنوں بعد ملے ہیں' کوئی دوسری بات کریں۔''

''بھابی جان کی باتیں میں بھول نہیں سکتی فہد! وہ اس لیے میری بچی بیاہ کر لے گئی تھیں کہ میری بچی پر ظلم توڑیں گی؟''

''کسی نے کوئی ظلم نہیں توڑے فہمی پر' میں اس کا عینی شاہد ہوں۔''

''اب وہ تمہاری دوسری شادی کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ کیا میں اس بات سے انجان ہوں؟''

''جب میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تو کیا وہ میری زبردستی شادی کریں گی اور اس وقت تو میں فہمی کو لینے آیا ہوں۔''

''فہد بیٹا! بے وقوف کسی اور کو بنانا۔ میں بھی اسی شہر میں رہتی ہوں۔ میں تمہاری ماں کے پلان سے بے خبر نہیں ہوں۔ وہ کسی شگفتہ کے لیے تمہارا رشتہ دے چکی ہیں۔ لڑکی والوں نے یہ رشتہ قبول بھی کر لیا ہے۔ اور گیارہ ربیع الاول کو تمہاری شادی ہے۔''

''میری شادی ہو رہی ہے اور میں لاعلم ہوں۔'' فہد نے ہنس کر فہمی کی طرف دیکھا' جس کا چہرہ سرسوں کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

ابھی چند لمحے پہلے وہ ازخود دوسری شادی کی اجازت فہد کو دے رہی تھی اور اب فہد کی دوسری شادی کا سن کر اس کی پریشانی اور غمی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''تم دوسری تو کیا تیسری اور چوتھی شادی بھی کر لو مگر اب فہمی تمہارے گھر نہیں جائے گی۔''

''مگر میں نے کہا ناں کہ میں تو فہمی کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے فہمی کے علاوہ کسی کا ساتھ پسند نہیں ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو بھابی جان سے کہو کہ مجھ سے آ کے وہ معافی مانگیں اور پھر خود فہمی کو لے کر جائیں......'' فیروزہ بیگم نے دانت پیس کر کہا۔

''پھپھو! آپ امی کی عادت جانتی ہی ہیں' وہ آپ کی بات کبھی نہیں مانیں گی اور اس میں سراسر نقصان میرا اور فہمی کا ہوگا۔''

''میں نے کہا ناں' اب فہمی تمہارے گھر نہیں جائے گی۔ میں نے تم سے اس کی شادی کر کے جو غلطی کی ہے' اس سے میری بیٹی کی زندگی تہس نہس ہو کر رہ گئی ہے۔''

''پلیز پھپھو!...... اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لیجیے۔ میں فہمی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مت ظلم کریں آپ مجھ پر'' فہد پریشان سے لہجے میں استدعا کر رہا تھا۔

''اب تو بھابی جان جوتیاں آ کر رگڑیں گی میرے دروازے پر...... میں بھی کورٹ میں مقدمہ کروں گی کہ بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی ہو رہی ہے۔ نہ ماں بیٹا جیل میں سڑے تو میرا نام بدل دینا۔''

''بس امی! بس......'' فہمی بے قراری ہو کر بولی۔

''تم چپ رہو...... تمہیں کیا پتا' جھگڑالو لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے' آج کل ذلیل کے ساتھ ذلیل بننا پڑتا ہے۔''

''پلیز امی! اب آپ کچھ مت کہیں' نہ فہد کو اور نہ ہی ممانی جان کو...... جس گھر میں مجھے زندگی گزارنی ہے' انہیں برے ناموں سے مخاطب نہ کریں۔''

''فہمی' تم اپنے کمرے میں جاؤ اور ہاں فہد! تم میری ہر بات اپنی ماں سے ضرور کہنا کہ جتنی مکار وہ ہیں' میں ان کے اس روپ سے بھی پوری واقف ہو چکی ہوں۔''

''فہد! چلو گھر چلتے ہیں۔ اگر ہم یہیں کھڑے رہے تو امی کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔''

''فہمی! میں تمہیں منع کر رہی ہوں' فہد کے ساتھ تم مت جاؤ۔''

''امی! میں فہد کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔ وہ مجھے لینے آئے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔'' فہمی نے فہد کا ہاتھ تھام کر آگے کی جانب قدم بڑھایا۔

''تم یہ سوچ کر باہر قدم رکھنا کہ اگر تم گئیں تو آئندہ اپنے تمام معاملات خود ہی بھگتانا۔ میں تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہوگی' فہمی نے دوسرا قدم بڑھایا۔

فہد نے ایک نظر فہمی کو دیکھا اور اسے لے کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

''الو کی پٹھی! میاں کو دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ اب دیکھنا' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مکاری سے اجازت نامے پر دستخط کروائے گا اور دوسری شادی کر لے گا۔ یہ فہد...... مکار ماں کا مکار بیٹا ہے'' فیروزہ بیگم نے صدمے کی حالت میں کہا۔

''کیا واقعی فہد بھائی دوسری شادی کر لیں گے؟'' چپ چاپ ساکت سی نگین اس معاملے میں پہلی بار بولی۔

''ان کے ہاں دوسری شادی کی پوری پوری تیاریاں ہیں۔ بری کے کپڑے منظور ٹیلر کے پاس سل رہے ہیں۔ شادی کا جوڑا بسم اللہ ٹیلر سی رہا ہے۔ سونے کا سیٹ جو انہوں نے فہمی کو چڑھایا تھا' وہ لاکر میں سے نکلوا کر اجلوا لیا گیا ہے۔ کون سی تیاری ایسی ہے جو ان کے ہاں نہ ہو رہی ہو۔''

''آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟''

''ان کے محلے والے رائی سے رتی کی ہر خبر مجھے فون پر دے رہے ہیں' اسی وجہ سے میں فہمی کے سامنے فہد کا ذکر تک نہیں کرتی تھی مگر وہ چالاک لڑکا' اپنی باتوں کے جال بچھا کر کس چالاکی سے اسے لے کر گیا ہے کہ مجھے غصہ آ رہا ہے۔''

''اس تمام معاملے میں فہمی باجی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ پھر ممانی جان ان کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہیں؟''

''مجھ سے یہ بھول بہت زبردست ہوئی ہے کہ دونوں بیٹیوں کی شادی اکلوتے بیٹوں سے کر دی۔ عقل مند کہتے ہیں کہ ایسے گھرانے میں کبھی رشتہ نہیں دینا چاہیے کیونکہ اکلوتے بیٹے کی ماں کو اپنی بہو سے بے حد توقعات ہوتی ہیں جو کہ پوری کرنی بے حد مشکل ہوتی ہیں۔ اب فہمی کی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے مگر انہیں پوتے پوتی کی ضرورت اتنی زیادہ محسوس ہوئی کہ وہ فہد کی دوسری شادی خوب طمطراق سے کر رہی ہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟'' نگین پریشان سی ہو گئی۔

''یہی ہوگا' چند دنوں بعد فہمی کو گھر سے نکال دیا جائے گا اور روتی بلکتی وہ گھر واپس آ جائے گی۔'' فیروزہ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنے بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔

☆☆☆

نکہت آرا بہت دنوں کے بعد صابرہ کے گھر آئی تھیں۔ صابرہ انہیں اپنے گھر میں دیکھ کر طنز سے بولی

’’بھابی پاشا‘ آج کیسے ادھر کا رستہ بھول گئیں آپ؟‘‘

’’کیا آنا نہیں چاہیے تھا میرے کو؟‘‘

’’آپ تو آپ ہی آپ منہ کو پھلا کے بیٹھے تھے۔ رعنا کو فاخرہ انکار کری تو اس میں میرا کیا دوش! لڑکیاں کے تو سو گھر سے رشتے آتے ہیں ناں۔ اب ہر ایک کو توہاں نہیں بھر سکتے۔‘‘ صابرہ نے بتایا۔

’’آپ برابر بولی...... اس لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک کری آپ‘ جو ایسا سوچے۔‘‘

’’صابرہ! میں اللہ کا شکر کہ کبھی غلط نئیں کری‘‘ زعم بھرے انداز میں کہا گیا۔

’’ہاں‘ یہ اچ تو میرے کو ہمیشہ سے معلوم ہے۔‘‘ صابرہ نے ہنس کر کہا۔

’’آج میں تمہارے پاس بڑے خاص کام سے آئی ہوں۔‘‘

صابرہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا ’’ہاں ہاں‘ بولیے ناں۔‘‘

’’ثنا کیسی لڑکی ہے...... بول کے؟‘‘

’’بہوت پیاری‘ منہ ہارے (اندھیرے) میں بھی بیٹھے سو اجالا ہو جاتا۔‘‘

’’سستاڑی تو نئیں ناں......؟‘‘

’’اللہ توبہ‘ کیسی باتاں کرتی ہیں آپ۔‘‘

’’صابرہ‘ آپ چپ اس کی تعریفاں نکو کرو جی۔‘‘

’’کیوں نہ کروں‘ وہ ہے اتی تعریف کے لائخ (لائق)۔‘‘

’’پھر میرا ایک کام کروگی تم؟‘‘

’’کیسا کام...... کائے کا کام‘ کہاں کا کام......؟‘‘

’’تم کو اتنی پنچائیت کائے کو جی...... بس حامی بھر کو بیٹھو۔‘‘

’’بھابی پاشا! پہیلیاں نکو بجھواؤ۔ صاف صاف بول دیو کہ بات کیا ہے...... آپ کی گول گول باتاں سے تو میرے پیٹ میں سول اٹھ رہا اے۔‘‘

’’تم ثنا کی شادی میرے بھتیجے سے کرا دیو۔ میں ساری زندگانی تمہاری احسان مند رہوں گی بول کے۔ فقط اتا اچ کام ہے...... پلیز صابرہ!‘‘

’’بھابی پاشا! شادی کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے ناں۔ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ثریا بھابی تو ساروں میں بو ما بوم (ذلیل) کر کو رکھ دیویں گی...... میں تو لوگاں میں مونہہ دکھانے کے خابل نکو رہ جاؤں گی۔‘‘ صابرہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

’’ایسا نہیں ہوئیں گا...... میرے بھتیجے کے سنگات انوں بہوت خوش رہیں گی۔ میرے بھابی پاشا بھی بہوت اچھے ہیں۔‘‘

’’بھابی پاشا! ایک ترکیب ہے میرے ذہن میں‘‘ صابرہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

’’اللہ‘ خربان جاؤں...... جلدی سے بول دیو۔‘‘

’’آپ خود اچ بات کر لیو ثریا بھابی سے...... ان کی لڑکی ہے‘ انوں کو حخ ہے کہ کوئی بی جواب دیں‘ ہاں یا

ہاں ...‘‘

’’اللہ‘ میں کیا بولوں ان سے؟‘‘ نکہت آرا نے پریشان ہو کر کہا۔

’’بس جو بات ہے وہی بول دیو کہ آپ ثنا کے واسطے آئے ہیں‘‘ صابرہ نے سمجھایا۔

’’ٹھیک ہے‘ میں جاتی ہوں ان کے پاس۔‘‘

صابرہ رواداری میں اپنی بھابی کے ساتھ ساتھ ثریا کے پورشن میں گئی اور کہا ’’ثریا بھابی! آپ سے ملنے کو ہماری بھابی پاشا آئے ہیں۔‘‘

ثریا نے ان کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اتنے میں صابرہ وہاں سے اڑن چھو ہو گئی۔ ثریا حیران تھیں کہ صابرہ کی بھاوج ان سے ملنے کیوں آ گئیں؟ جبکہ اس سے پہلے پچاسیوں دفعہ آتی تھیں تو صرف منہ دیکھنے کا سلام کر کے قدم بڑھا جاتی تھیں۔

’’آج میں بہت ضروری بات کرنے کے لیے آئی ہوں‘‘ نکہت آرا نے کہا۔

’’جی فرمائیے‘‘ ثریا ہمہ تن گوش تھیں۔

’’میں ثنا کے لیے آئی...... میرا بھتیجا بہوت اچھا ہے۔ انوں کمپنی میں ملازم ہے‘ اچھی تنخواہ ملتی ہے اس کو۔‘‘

’’آپ کے بھتیجے کی تعلیم کتنی ہے؟‘‘

’’انوں گریجویشن کیے ہیں۔ میری بھاوج بڑے لاڈاں سے رکھے گی ثنا کو۔‘‘

’’نکہت آرا! آپ کی ہر بات درست ہو گی مگر میری بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے اور ڈاکٹر بننا کوئی مذاق نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر لڑکی اس فیلڈ میں آ سکتی ہے۔‘‘

’’جی آپ برابر بولے۔‘‘

’’میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر لڑکی کی ڈاکٹر سے ہی شادی ہونی چاہیے۔ ان دونوں میں جو ذہنی ہم آہنگی ہو گی ی میں نہیں ہو سکتی۔ اب ثنا کے کئی رشتے میرے اپنے خاندان میں سے آئے مگر میں نے سب کو منع کر دیا۔ میں تو اپنی بیٹی کی قابلیت کے حساب سے اپنا داماد چنوں گی اس لیے میں آپ کے بھتیجے کے بارے میں تو کیا‘ میں تو کسی لاٹ صاحب کی اولاد کو بھی ثنا کا ہاتھ نہ دوں۔‘‘

’’آپ کے خاندان کے کتنے لڑکے ڈاکٹر بن کو بیٹھے ہیں؟‘‘ نکہت آرا کو غصہ ہی آ گیا۔

’’اب خاندان میں کون شادیاں کرتا ہے؟ میں باہر کروں گی۔ جب میری بیٹی ڈاکٹر بن جائے گی تو ہر طرف سے رشتوں کی بھرمار ہو گی۔ اس میں سے کسی اچھے اونچے ڈاکٹر کا انتخاب کر لوں گی۔‘‘

’’اور اگر ڈاکٹر نہ ملا تو پھر آپ کیا ایسا ہی اچ بٹھا کر رکھیں گے؟‘‘ نکہت بھی کچھ کم نہ تھیں۔ زہر اگلنے میں وہ ماہر تھیں۔

’’جلنے والوں کے منہ میں خاک! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میری بیٹی چاند کا ٹکڑا ہے۔ جہاں جاتی ہے پوری محفل پیاسی جاتی ہے۔ اس کے آگے سب لڑکیاں معمولی سی لگنے لگتی ہیں۔‘‘

’’اللہ آپ کو ڈاکٹروں کا بھی باپ دے......‘‘ نکہت آرا تن فن کرتی اٹھ گئیں اور صابرہ کو بھی خدا حافظ کیے باہر نکل آئیں۔ ’’الو کی پٹھی! اتراتی کتنا اچ ہے‘‘ ان کے دروازے کی طرف منہ کر کے انہوں نے تھوک دیا اور آتے ہوئے رکشا میں بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

سمندروں کے مسافر تھے دربدر رہتے
تمہاری آنکھ نہ ہوتی تو کدھر رہتے
زہے نصیب کہ تم سا ملا ہے دوست ہمیں
دگرنہ درد کی لذت سے بے خبر رہتے

سڑک پر بائیک تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

لوگ ...... ٹریفک ...... درخت سب اسے اپنے ہمراہ بھاگتے ہوئے لگ رہے تھے اور اس کا سر علیحدہ گھوم رہا تھا۔

اپنے دل کی دھڑکن اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی اور ہاتھ پیر سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب بے کلی سی تھی۔

ممانی جان کی قہر برساتی آنکھیں اسے ہر سو نظر آ رہی تھیں...... جو اس سے برملا کہہ رہی تھیں...... 'خبردار! جو تو نے میرے دروازے پر قدم رکھا'

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ فہد کے شانے پر رکھا ہوا ہاتھ اس کی گود میں گر گیا۔

''کیا بات ہے، بائیک سے اترو گی نہیں؟'' اسے یوں منجمد سا دیکھ کر فہد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

وہ بائیک سے اتر کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ کتنے دنوں بعد وہ اپنے گھر آئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے مکان کا بڑا سا گیٹ اس سے پوچھ رہا ہو۔ فہمی تم کتنے دنوں بعد گھر آئی ہو؟ کوئی گھر سے جا کر اپنے گھر کو یوں تو نہیں بھولا کرتا، جیسے تم مجھے بھول گئی تھیں؟

''کیا تم میری راہ دیکھ رہے تھے؟'' اس نے دل میں سوچا۔

کھلے ہوئے گیٹ کا پٹ یوں ہلنے لگا جیسے اثبات میں اپنا سر ہلا رہا ہو۔

فہمی نے ایک نظر اوپر بالکونی کی جانب ڈالی۔ دیوار کے ساتھ چڑھی ہوئی چنبیلی کی بیل اسے دیکھ کر یوں جھوم رہی تھی، جیسے اس کا سواگت کر رہی ہو۔

''بہت ہی خوش ہو تم'' اس نے سوچا۔

'تم جو آئی ہو اسی لیے خوشی سے لہلہا رہی ہوں ورنہ تمہارا انتظار کرتے کرتے تو میں تھک چکی تھی۔ تمہاری غیر موجودگی میں میری کلیاں کھلے بغیر سوکھ رہی تھیں۔'

''رک کیوں گئیں تم......؟'' فہد نے اسے یوں ساکت و صامد کھڑے دیکھ کر پوچھا۔ وہ یوں کھڑی تھی جیسے کسی نے اس کے پیروں میں میخیں ٹھونک دی ہوں۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے فہد......!'' دل کی بات اس نے کہہ ڈالی۔

''پاگل ہو تم...... اپنے گھر میں تو چیونٹی بھی شیر ہوا کرتی ہے اور ایک تم ہو'' اس پر ایک نظر ڈال کر اس نے گھر

میں قدم رکھا۔

تب ڈرتے ڈرتے فہمی نے بھی قدم بڑھایا مگر خوف خوشی پر غالب تھا۔ فہمی اس کی پشت کے پیچھے چھپ سی گئی۔

آنگن میں ممانی کسی دوپٹے پر بیل ٹانک رہی تھیں۔ بیل کا بڑا سا گولا ان کے پاس تخت پر دھرا تھا اور ان کے چہرے پر خوشیوں کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ دوپٹے کو ٹانکتے سے ایک دھیمی سی مسکان ان کے لبوں کا بھی احاطہ کیے ہوئے تھی۔

فہد اور فہمی کو دیکھ کر دوپٹا پاس رکھی ہوئی ٹوکری میں رکھا اور چشمہ ماتھے پر چڑھا کر ناگوار لہجے میں فہمی سے گویا ہوئیں ''تمہاری اماں تو بڑے پلان بنا کر تمہیں لے کر گئی تھیں، اتنی جلدی کیسے آ گئیں تم؟''

''اپنے گھر میں تو آنا ہی تھا'' وہ ہمت کر کے بولی۔

''مگر تمہیں ابھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ اپنی ماں کی بات کا پاس ہی رکھ لیتیں۔ تمہاری ماں کے پاس پیسے ختم ہو گئے یا ہمت ٹوٹ گئی، چار دن بیٹی کو اپنے پاس رکھا نہیں گیا۔ لے کر تو بڑی تن فن کے ساتھ گئی تھیں۔ شکل دیکھو تو ایسا لگ رہا ہے ناک پکڑو تو دم نکلے زچہ تو کھا پی کر نکھر جاتی ہے، تم تو مرجھا کر آئی ہو۔ کیا آئینے میں شکل دیکھنی چھوڑ دی ہے تم نے؟ یہی دعوے پورے کرنے کے لیے تم کو تمہاری ماں اپنے ساتھ لے گئی تھیں'' اب وہ طنزیہ ں ہنس رہی تھیں۔

فہمی نے ڈر کر اپنا ہاتھ فہد کے ہاتھ میں دے دیا۔

''کس نے بلایا ہے تمہیں؟ کیوں آ گئیں تم؟'' ان کی سوئی پھر چلنے لگی۔

''امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں...... فہمی اور کتنے دن پھپھو کے ہاں رہتی۔ اپنے گھر تو بالآخر اسے آنا ہی تھا۔''

''فہد! مجھے افسوس ہو رہا ہے تم میری اجازت کے بغیر فہمی کو لینے اس کے گھر کیوں چلے گئے؟''

''کیوں، کیا مجھے نہیں جانا چاہیے تھا؟'' فہد نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''ہرگز نہیں...... تم نے جا کر اپنی بے عزتی خود کرائی ہے۔''

''وہ میری پھپھو کا گھر پہلے ہے، سسرال بعد میں ہے...... اور میں اپنی بیوی کو لے کر آیا ہوں، اس میں بے عزتی کی کون سی بات ہو گئی؟''

''جس کی ماں تمہاری ماں کی عزت نہ کرے، اس گھر میں تمہیں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا۔'' انہوں نے طنز سے کہا۔

''غلط فہمیوں کو اپنے سر سے جھٹک دیں، پھپھو آپ کی بہت عزت کرتی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے، کتنی کرتی ہے وہ عزت۔ اس سے تو یہ ناتا جوڑ کر میں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ''

''چلیں، پھپھو کو چھوڑیں...... فہمی تو آپ سے بہت پیار کرتی ہے'' اپنے پیچھے کھڑی ہوئی فہمی کو سامنے کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''وہ بھی نفرت کرے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اب تو نئی دلہن آ رہی ہے، دیکھنا وہ کتنی اچھی ہو گی۔''

''نئی دلہن......!'' فہد نے حیرت سے ماں کو دیکھا...... اور فہمی کے چہرے پر سرسوں سی پھیل گئی۔

''لڑکی والوں نے ہامی بھر لی ہے اور شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔ تم نُہی کو اس کے گھر ہی چھوڑ آتے تو اچھا تھا۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ اگر طلاق نہ دیں تو پہلی والی کو الگ رکھیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں وہ' پہلی والی کو بھی برداشت کر رہے ہیں ورنہ سب طلاق کی بات کرتے ہیں۔''

''افوہ...... کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو...... کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ منع کر دیں ان لوگوں کو...... میں نے کسی سے کوئی شادی وادی نہیں کرنی...... اور ہاں نُہی' تم جاؤ اپنے کمرے میں' اسے ٹھیک ٹھاک کرو۔''

نُہی اپنے کمرے کی جانب یوں بھاگی جیسے اگر وہ نہیں گئی تو ممانی جان اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیں گی۔

فہد جب سے آیا تھا' ماں کے پاس نیچے ہی لیٹ رہا تھا۔ نُہی جس تیزی سے گئی تھی' اسی تیزی سے واپس لوٹ آئی۔ اس کا چہرہ ایسا خوف زدہ سا تھا جیسے اس نے کمرے میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''کیا بات ہے...... کیا ہوا؟'' فہد نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ...... ہمارے کمرے میں تو نیا بیڈ روم سیٹ لگا ہوا ہے' میرا فرنیچر کہاں گیا؟''

''میں نے اوپر کمرے میں ڈلوا دیا ہے۔ تم اپنے لیے اوپر کا کمرا ٹھیک کر لو' نیچے چھوٹی دلہن رہے گی'' ممانی جان نے کمال اطمینان سے کہا۔

''مگر...... یہ سامان ہمارے گھر میں کیوں آیا ہے؟'' فہد نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''شگفتہ کے بھائی آج صبح ہی پہنچا گئے۔ اب شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ دو چار روز پہلے جہیز سب ہی پہنچا دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہر کام وقت سے پہلے اور چلن سے کرنے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دس با دن پہلے یہ سامان پہنچا دیا ہے' کل ایک ٹرک میں بقیہ سامان آئے گا۔ ماشاء اللہ ایسا عمدہ فرنیچر ہے۔ قالین او پردے بھی خود لگوائے ہیں۔ جا کر تو دیکھو اپنا کمرا' کیسا روشن روشن سا نظر آ رہا ہے۔ ہر چیز بے حد عمدہ ہے۔ پردے نئے ڈیزائن کے ہیں۔''

نُہی کو یوں لگا جیسے اس کے وجود میں زلزلے کے جھٹکے محسوس ہو رہے ہوں۔

''آپ ابھی فون کریں کہ مجھے کوئی شادی نہیں کرنی ہے اور وہ اپنا سامان فوری اٹھا لیں'' فہد نے غصے سے بے حال ہوتے ہوئے کہا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا' دنیا کے مرد اولاد کے لیے دوسری شادی کیا کرتے ہیں۔ تو دنیا کا پہلا مرد تو نہیں ہے جو دوسری شادی کرنے جا رہا ہے۔ اپنے خاندان میں ہی دیکھ لو...... فیروزہ کے بہنوئی نے تین شادیاں کیں۔ فیروزہ کے دادا نے تو چار شادیاں کی تھیں۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''کی ہوں گی...... مگر مجھے نہیں کرنی۔''

''اب اگر تم بدنصیبی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو مجھے اس سے کیا۔ میں تو چاہتی تھی' تمہارے آنگن میں بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ تم قبرستان جیسی خاموشی رکھنا چاہتے ہو تو رہتے رہو نُہی کے ساتھ۔ سنتے رہو باتیں اس کی اماں کی۔ برداشت کرتے رہو صلواتیں اس کے خاندان کی۔ اور کڑھتے رہو سدا اس بیمار روگی کے ساتھ' جس کے آنے سے ہمارے گھر کی خوشیاں تک روٹھ گئی ہیں۔''

ممانی جان غصے میں بھری آنگن سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں نئے سمدھیانے میں انہیں فون کرنا تھا کہ شادی ناگزیر وجوہ پر ملتوی کی جا رہی ہے۔

نُہی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے فہد کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' سارا قصور میرا ہے' میری بدنصیبی نے یہ دن بھی دکھایا ہے کہ محبت کا وجود بھی خس و خاشاک بن کر رہ گیا ہے'

تب فہد نے اسے محبت سے دیکھا۔ اس کی حوصلہ بڑھاتی ہوئی آنکھیں اسے یہ نوید دے رہی تھیں۔

ہر اک انسان کے ہمراہ اپنی اپنی قسمت ہے
مخالف لاکھ ہو دنیا محبت پھر محبت ہے

تب نُہی آنسو بھری آنکھوں کے سنگ مسکرا دی۔

☆☆☆

''پاگل ہے تو اول نمبر کا......'' نصیر نے اشرف سے کہا۔

''اس میں پاگل پنے کی کیا بات ہے؟ نہ بیوی نے مجھ سے کہا نہ ہی گھر والوں نے...... میں کیسے اسے لے کر گھمانے چلا جاتا؟''

''تیری اپنی عقل کام نہیں کرتی کیا......'' نصیر کو غصہ آ رہا تھا۔

''ہاں یار......! کبھی کبھی تو واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کروں تو کیا کروں؟'' اشرف کھسیا کر ہنسا۔

نصیر اس کے بچپن کا دوست تھا۔ عرصہ پہلے کینیڈا شفٹ ہو گیا تھا۔ وہیں کسی پاکستانی فیملی میں اس کی شادی ہوگئی تھی' جس کا تعلق کراچی سے تھا۔ سال دو سال بعد کینیڈا سے پاکستان آنا ہوتا تو کراچی ہی آتا۔ نیشنلٹی حاصل کرنے کے بعد اس کے والدین بھی کینیڈا پہنچ گئے تھے اور اب وہ ایک عرصے بعد اپنے گاؤں کے دوستوں سے ملنے کے لیے بطور خاص گاؤں آیا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اشرف شادی کے بعد کہیں بھی گھومنے کے لیے نہیں گیا ہے' تو اسے غصہ ہی آ گیا۔

''باہر کے لوگ تو اپنے آپ کو تازہ دم رکھنے کے لیے ہفتہ وار چھٹی بھی بھرپور طریقے سے مناتے ہیں اور تو شادی کے بعد بھی کہیں گھومنے کے لیے نہیں نکلا؟''

''ہمارے گاؤں میں بیوی کو لے کر گھومنے کا فیشن ہی نہیں ہے' تو میں کیا کروں؟''

''کیا سوچتی ہوگی تیری بیوی' کس گھامڑ سے شادی ہوئی ہے'' نصیر نے مسکرا کر کہا۔

''فرح بہت اچھی ہے' کبھی اس نے میرے آگے زبان نہیں کھولی۔''

''وہ تیرے ساتھ خوف کی زندگی گزار رہی ہے' جب ہی تو تیرے بچے نہیں ہو رہے'' نصیر نے نیا نکتہ ڈھونڈا۔

''پاگل تو' تو خود ہے یار! جو لوگ گھومنے پھرنے نہیں جاتے تو کیا ان کے بچے نہیں ہوتے؟ ہمارے گاؤں والوں کے ہاں بچوں کی فوجیں ہیں اور کوئی بھی آج تک شادی کے بعد گھومنے پھرنے نہیں گیا'' اشرف نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تو یار! تجھے جانا چاہیے۔ سیر و تفریح سے دماغ کا بوجھل پن کم ہوگا۔ مزاج کا تناؤ بھی ہلکا ہوگا۔ تب باہر سے آ کر گھر کی پرانی چیزیں بھی نئی سی لگنے لگیں گی۔''

''مگر میرا جانا مشکل ہوگا'' اشرف نے کچھ سوچ کر کہا۔

''کیوں...... اس ملک میں اجنبی ہے تو' راستے نہیں آتے' کہیں جاتے ہوئے ڈرتا ہے یا گھر والے جانے نہیں دیں گے؟''

''نہیں یار! یہ بات نہیں ہے؟''

’’پھر کیا بات ہے‘ جو تو یوں بقراط بن کر سوچ رہا ہے۔‘‘

’’گھر سے قدم باہر نکالو تو پیسا پہلے خرچ ہوتا ہے اور اگر گھومنے پھرنے کے لیے چلا گیا تو خرچہ تو بہت ہوگا۔ راستے کے ٹکٹ‘ ہوٹل کا کرایہ‘ کھانا پینا...... شاپنگ تو خیر نہ بھی کی جائے تو کوئی بات نہیں۔‘‘

’’رہا بنیا کا بنیا...... ہر بات میں ناپ تول کرنے والا۔ پیسا‘ پیسا‘ پیسا‘ کیا کرے گا تو پیسے جمع کر کے۔ اولاد تو تیرے نہیں ہے۔ پیسا جمع کر کے کیا بہت خوشیاں مل جائیں گی تجھے؟‘‘ نصیر نے جل کر کہا۔

’’یار! پیسا بہت بڑی طاقت ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی سے دل غنی رہتا ہے۔ ایک آسودگی سی محسوس ہوتی ہے۔‘‘

’’جھلا ہے تو ایک دم۔ پیسے سے آسودگی محسوس مت کیا کر‘ محبت سے آسودگی حاصل کیا کر۔ یہ تیرے دل کو بھی غنی رکھے گی اور طاقت بھی دے گی۔‘‘ نصیر نے اسے سمجھایا۔

نصیر کی بات شاید اس کے دل کو لگ گئی تھی۔ اس شام دکان بند کر کے گھر پہنچا تو پہلی بات یہی کی۔

’’اماں‘ میں فرح کے ساتھ گھومنے پھرنے جا رہا ہوں۔‘‘

’’دماغ تو تیرا خراب نہیں ہوگیا۔ آتے جاڑوں میں کوئی گھر سے نکلتا ہے؟‘‘

’’ارے جانے دو‘ تم کیوں اس کا پیر پلنگ سے باندھے بیٹھی ہو۔‘‘ نانی اماں نے لاڈ سے اشرف کی کمر پہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

’’اماں‘ آپ سے زیادہ روشن خیال تو ہماری نانی ہیں۔‘‘ وہ لگاوٹ سے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

’’اشرف‘ کامونگی چلا چل۔ میں بھی تیرے ساتھ چلی جاؤں گی۔ بڑی بھابی کا آخری وقت چل رہا ہے ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا۔ اچھا ہے‘ ہم جا کر انہیں معاف کر دیں۔‘‘

’’کامونگی آپ اماں کے ساتھ چلی جائیے‘ میں یہاں نہیں جا رہا۔‘‘

’’ارے ہے‘ تو پھر تو گراں لے چل۔ بڑا اچھا گاؤں ہے‘ لوگ اسے شہر کہتے ہیں۔ تیرے چھوٹے ماموں سے بھی مل لوں گی۔ کب سے نہیں آیا وہ میرے پاس۔‘‘ نانی اماں نے پروگرام بناتے ہوئے کہا۔

’’نہیں نانی! مجھے جہلم بھی نہیں جانا ہے‘‘ اشرف نے نفی میں سر ہلایا۔

’’ارے ہم سب چلتے ہیں۔ اگلے اتوار کو بڑی خالہ کی نواسی کی بیٹی کی شادی ہے چیچہ وطنی میں‘ کب سے بلاوا آیا رکھا ہے‘ میں تو بھول ہی گئی تھی‘ سیر کی سیر بھی ہو جائے گی اور لگے ہاتھوں شادی میں شرکت بھی ہو جائے گی۔‘‘ اماں نے قہقہہ لگا کر کہا جیسے اشرف کا مسئلہ انہوں نے چٹکی بجاتے ہوئے حل کر دیا ہو۔

’’بہت قریبی رشتہ ہے ناں‘ جہاں جا کر بہت مزہ آئے گا‘‘ اشرف برا سا منہ بناتا ہوا بولا۔

’’اچھا تو پھر تو ہی بتا دے ہم سب تیرے ساتھ کہاں گھومنے کے لیے جائیں......؟‘‘ نانی اماں نے ساری ذمے داری جیسے اس کے سر تھوپ دی۔

’’نانی اماں! آپ نہیں جا سکتیں میرے ساتھ مری۔ بہت چڑھائی ہوتی ہے وہاں‘ کیسے چلیں گی میرے ساتھ...... اور اماں کو تو شادی میں جانا ہے اور جانا بھی چاہیے۔ خاندان‘ برادری کی شادیوں میں نہیں جائیں گی تو ہماری بہنوں کی شادیوں میں کون آئے گا؟‘‘

’’تیری ماں بے شک شادی میں چلی جائے مگر میں تیرے ساتھ مری ضرور جاؤں گی‘‘ نانی اماں ایک اڑیل اور گھومنے پھرنے کی سدا کی شوقین۔

’’گھر میں تو آپ دیوار پکڑ پکڑ کر چلتی ہیں‘ وہاں کیسے چلیں گی؟‘‘

’’مجھے حکیم جی کی بیوی نے بتایا تھا۔ جب وہ اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ مری گئی تھیں‘ وہاں وہ ریڑھے پر بیٹھ [illegible] آتی رہی تھیں۔‘‘

’’آپ اماں کے ساتھ ریڑھے میں بیٹھیے گا یا ٹھیلے میں۔ فی الحال میں اور فرح ہی جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی [illegible] اکیلے بھی گھومنا چاہیے۔‘‘ نصیر کا پڑھایا ہوا سبق وہ دہرا رہا تھا۔

’’کل ہی گئی تھی فرح اپنے میکے‘ اسی نے پڑھائے ہوں گے یہ کوتک (الٹا سیدھا)‘‘ نانی اماں نے چڑ کر کہا۔

’’میری بھولی بھالی بیوی پر الزام تو نہ لگائیں۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔ ’’اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ کہاں ہم [illegible] یں گے؟‘‘

’’ارے جان عذاب کر رکھی ہے تیری بیوی نے ہماری‘ ہم تو اسے لا کر پچھتائے اور پڑوس کے سمدھیانے الگ خوار کر رکھا ہے۔‘‘ اماں نے شکایتوں کا پٹارا کھولنا شروع کر دیا۔

’’دلہن بیگم چھت پر کپڑے پھیلانے گئیں تو وہیں رک گئیں۔ دیوار کے پاس اپنی بہنوں سے مشوروں کی [illegible] وصول کرتی ہیں۔‘‘

’’[illegible]ت دھلوایا کریں فرح سے کپڑے۔ کبھی آپا کی بھی باری لگا دیا کریں‘‘ اشرف کو چینو کا جھونگی سن کر مزہ [illegible] تھا۔

’’اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ میں نے فرح سے کہا‘ گوشت میں اروی ڈال لے تو کہنے لگی‘ گوشت میں ساگ [illegible]تی ہوں۔ میں نے کہا نہیں‘ آج میرا اروی گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے‘ نیبو نچوڑ کر کھاؤں گی تو مجھے ایسی [illegible] سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو ہاں اماں! میں تو تمہیں ضرور پکا کر کھلاؤں گی‘ تمہاری سیوا کرنے نہیں آئی [illegible]۔ اور پھر وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی۔ سبزی والا آیا تو اس کے پاس اروی تھی ہی نہیں اور دلہن بیگم ساگ لے [illegible]اں وفرحاں میرے پاس آ گئیں‘ جب کہ ساگ کھانے کو آج میرا بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا تھا‘ سر علیحدہ [illegible] رہا تھا۔ ساگ دیکھ کر تو آگ لگ گئی‘ غصے سے ایک ہاتھ مارا تو ہنسنے لگی۔‘‘

’’تم بھی پاگل ہو۔ سبزی والے کو کہتیں‘ جا لے کر آ‘ اپنی دکان سے لے آتا۔ اس کی مرضی کا سالن بنوانے کی [illegible]رت تھی۔ ایسے عیش کون کراتا ہے بہوؤں کو۔‘‘ نانی اماں نے تنک کر کہا۔ ’’تمہارے آگ لگا کر تو وہ اب [illegible]ے گی‘ دیکھ لینا تم ہاں۔‘‘

’’ہم تو ایسے ہی پاگل ہیں۔ ہمارے گھر آ کر دوسرے لوگ ہمیشہ راج کرتے ہیں۔‘‘ اب اماں آنکھوں میں [illegible]نے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔

’’[illegible]ی میں نے روٹی پکا دی ہے۔‘‘ دور بنے باورچی خانے سے فرح نے آ کر کہا اور دوپٹے سے اپنا چہرہ [illegible]ھا۔

’’[illegible]ت بڑا احسان کیا تم نے ہمارے سر پر۔ رات کو روٹیاں کیا تم نہیں کھاؤ گی؟‘‘

’’[illegible]‘‘ وہ حیرت سے کبھی ساس کو دیکھ رہی تھی تو کبھی ننھیا ساس کو‘ جن کے بوتھے سوجے ہوئے تھے اور [illegible] ماتھے پر لگی ہوئی تھیں۔

’’[illegible]ل جا کر سوٹ کیس تیار کر‘ جانا ہے ہم نے۔‘‘ اشرف نے اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

’’[illegible]‘‘ نہ پوچھے یوں چل دی جیسے جانے کے پروگرام سے وہ بخوبی واقف ہو۔

’’دیکھا‘ کیسی مکار ہے سب جانتی ہے کہ میاں کہاں لے کر جا رہا ہے مگر ہوا نہیں لگنے دی۔ سارا وقت ایسی ہی رہی جیسے اسے کچھ پتا ہی نہ ہو۔‘‘

’’اماں! تم لوگ میری معصوم بیوی کو واقعی بہت تنگ کرتے ہو‘‘ اشرف نے مسکراتے لبوں سے کہا۔

’’بڑی گھنی ہے‘ ہر بات کی خبر رکھتی ہے مگر شکل سے پتا نہیں چلنے دیتی۔‘‘

’’اسے سچ میں کچھ نہیں معلوم کہ کہاں جا رہے ہیں؟‘‘

’’تو یہ ایکا ایکی جانے کی کیا سوجھی تجھے‘ کوئی خزانہ ملے گا وہاں جو یوں بلک کر جا رہا ہے؟‘‘ نانی کو تو غصہ ہی آ گیا تھا۔

’’شاید خوشیوں کے خزانے سے مجھے بھی کچھ مل جائے‘‘ اشرف دل ہی دل میں سوچتا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

’’پکا کیا ہے کوئی عمل فرح نے‘ جو یوں باؤلا سا ہو رہا ہے اشرف‘‘ نانی اماں کی یہ رائے تھی۔

’’اس کی بہنوں نے اپنے اپنے میاں کو بے وقوف بنا کر رکھا ہوا ہے‘ کچھ تو کیا ہی ہوگا۔ اب یہ بھی اسی ڈھرے پر آ گئیں‘‘ بڑی آپا جو خود باقاعدگی سے میاں کو گھول کر تعویذ پلاتی تھیں‘ غصے سے کہا۔

’’میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا‘ یہ اکیلے گھومنے کی بیماری کیوں آ گئی؟ دنیا چار لوگوں کے ساتھ جا کر خوش ہوتی ہے‘ وہ جھلا اکیلا جا رہا ہے۔‘‘

’’دیکھ لینا‘ کیسے بور ہو کر آئیں گے‘‘ چھوٹی باجی نے ہنس کر کہا۔

’’ہاں‘ ایسا ہی ہوگا اور جب آ کر کہے گا کہ مزہ نہیں آیا جا کر‘ تب میں لتے لوں گی۔‘‘

☆☆☆

دل نہ جانے کیوں گھبراسا رہا تھا۔ اشرف کی اٹیچی بنا کر وہ نماز پڑھنے بیٹھ گئی۔ نماز پڑھ کر سجدے میں سر رکھے روتی رہی۔ سر اٹھایا تو باہر سے تیز تیز آوازیں اس کے کمرے میں آ رہی تھیں۔ (پتا نہیں کیا بات ہے‘ وہ ڈر سی گئی تھی)

’’اللہ تو مجھے اپنی پناہ میں رکھنا۔‘‘ اس نے دعا مانگی اور ریک سے کتاب اٹھالی۔

’’اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق اللہ کی فرمانبردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جس مخلوق کو جس عبادت کا حکم دیا وہ تا زندگی اسی عبادت میں مصروف رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے تمام رینگنے والے جانوروں کو حالت سجدہ میں پیدا فرمایا۔ وہ ہمیشہ سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔

تمام پہاڑوں کو التحیات کی حالت میں تخلیق فرمایا۔ تمام درختوں کو قیام کی حالت میں تخلیق فرمایا۔ تمام چوپایوں کو رکوع کی حالت عطا کی اور اپنے پیارے انسان کو ان تمام حالتوں کا مجموعہ ’’نماز‘‘ کی صورت میں عطا فرمایا اور ساری مخلوق کی عبادت نماز میں جمع فرما کر انسان پر عظیم الشان احسان کیا۔‘‘

فرح نے کتاب پڑھ کر ایک گہرا سانس لیا ’’واقعی‘ میں کتنی غافل تھی۔ دنیاوی کاموں میں لگ کر تھکن سے چور ہو جاتی تھی مگر نماز پڑھنے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔‘‘

جب سے اس نے نماز پڑھنی شروع کی تھی‘ اس کے دل میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ من کی بے چینی اور ذہن کے اضطراب میں خاصی کمی واقع ہوئی تھی۔ یوں بھی اشرف ان دنوں اس پر خاصا مہربان سا تھا۔

’’فرح تم تھک گئی ہوگی‘ کچھ دیر آرام کر لو۔ اپنا سوٹ کیس آپا کو مت دینا‘ وہ واپس نہیں کریں گی۔ پوچھیں تو لہ دینا اشرف نے منع کیا ہے۔ اپنے کپڑے کسی کو مت دو۔ نانی کی خدمت بہنیں بھی کر سکتی ہیں۔ تم ہر وقت ان ے پلنگ سے جڑی کیوں بیٹھی رہتی ہو؟‘‘

’’وہ مجھے ہی پکارتی ہیں۔ کبھی منہ دھلوانے کے لیے‘ کبھی سر میں مہندی لگوانے کے لیے اور کبھی پیر دبوانے ے لیے‘‘ فرح نے دھیمے لہجے میں اسے بتایا۔

’’ان کے پاس جو بہنیں بیٹھی رہتی ہیں‘ وہ کیا تماشائی بن کر بیٹھنے کے لیے ہیں۔‘‘

’’اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘ میں ان سے بھی کہہ دوں گا‘ فرح کے علاوہ بھی کوئی نام یاد کر لیں جنہیں پکارا جائے۔‘‘

’’امی برا مان جائیں گی‘‘ وہ ڈر سی گئی کہیں اس بات پر بھی واویلا نہ مچ جائے۔

’’نہیں برا مانیں گی‘ تمہارا کام کیا سب لوگوں کی خدمت کا ہی رہ گیا ہے۔ کیا تمہارا آرام کرنے کو دل نہیں چاہتا؟‘‘

’’چاہتا ہے......‘‘ وہ نظریں نیچی کیے کیے بولی۔

’’تمہارا دل چاہتا ہے‘ کہیں گھومو پھرو......؟‘‘ وہ آہستہ آہستہ لائن پر آ رہا تھا۔

’’ہاں‘ کیوں نہیں۔ گاؤں سے میری سہیلی بیاہ کر شہر گئی تھی تو اس کا میاں اسے کراچی لے کر گیا تھا۔ میں نے تو ابھی تک لاہور بھی نہیں دیکھا۔‘‘

’’کبھی مری جانے کا سوچا ہے؟‘‘ اشرف نے اپنی مسکراہٹ داب کر پوچھا۔

’’نہیں‘ وہ تو کبھی نہیں سوچا۔ وہاں تو بڑے لوگ جاتے ہیں‘ ہوٹلوں میں رہتے ہیں‘ تو ایسی جگہ کا سوچ کر بھی لیا کروں گی‘‘ اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

’’سوچنے میں تو کوئی پیسے خرچ نہیں ہوتے‘ میں تو خوابوں میں باہر کے ممالک تک گھوم آتا ہوں۔‘‘

’’مجھے تو خواب میں بھی نانی کی آوازیں آتی ہیں‘ فرح میری کمر کھجا دے شاید کوئی چیونٹی چڑھ گئی ہے۔ فرح‘ میرے پیر دھلا دے‘ مجھے پیروں سے بخار چڑھ رہا ہے۔‘‘ فرح نے نانی کے انداز میں کہا تو اشرف بے اختیار نس دیا۔

تب فرح نے اسے بغور دیکھا۔ ہنستا ہوا اشرف اچھا لگ رہا تھا یا شاید ہنستے ہوئے ہر شخص کے چہرے سے تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ نرمی اپنی جگہ بنا لیتی ہے تو چہرے پر نور سا چھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہنستے ہوئے کوئی بھی برا نہیں لگتا۔

’’کیا دیکھ رہی ہے؟‘‘ اشرف نے اس سے پوچھا۔

’’کچھ نہیں‘‘ مجوب ہو کر اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

’’فرح!......ہم کل صبح مری جا رہے ہیں۔ میری اٹیچی میں اپنے کپڑے بھی رکھ لے۔‘‘

’’کیا واقعی......!‘‘ وہ حیرت سے بولی۔

’’ہاں فرح! ہم دونوں جا رہے ہیں کل‘‘ اشرف ہنسا۔

☆☆☆

آج مری آئے ہوئے ان کو تیسرا دن تھا۔ فرح کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

مرغی خانے کے پاس ایک سستے سے ہوٹل میں وہ ٹھہرے تھے۔ ان دنوں جشن کہسار مری کی وجہ سے بے حد رش تھا۔ مال روڈ پر ہجوم بہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اشرف یہ دیکھ کر حیران تھا' ہر شخص اپنے حال میں مست تھا۔ کسی کو بھی کسی کی جانب دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ نو بیاہتا جوڑے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پنڈی پوائنٹ سے کشمیر پوائنٹ تک ٹہلتے رہتے۔ نہ کسی تھکان کا احساس ہوتا اور نہ ہی کسی بوریت کا لمحہ آتا۔ ایک ایک لمحہ وہ مسرتوں کو کشید کرتے۔

فرح روزانہ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے جہیز کا کوئی سوٹ نکال کر پہنتی' دل بھر کے میک اپ کرتی اور اشرف کا ہاتھ پکڑے گھومتی رہتی۔ پاپ کورن' آئس کریم' چائے راستے میں چلتے چلتے کھاتے پیتے اور مسکراتے ہوئے گھومتے۔

زندگی اتنی بھی خوبصورت ہو سکتی ہے' اس کا احساس فرح کو پہلی بار ہو رہا تھا۔ اشرف اتنا برا نہیں ہے' جتنا کہ وہ سمجھ بیٹھی تھی۔

محبت کرنے والے خوبصورت ہوتے ہیں۔ فرح کو اشرف کی اس وجاہت کا احساس ہو رہا تھا جو شاید اس میں تھی ہی نہیں۔

''تم ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہو'' ایک دن اس نے اشرف سے کہا۔

''اور تم میرے ساتھ چلتی ہوئی کتنی حسین لگتی ہو۔ ایسا لگتا ہے کوئی ملکہ میرے ساتھ جا رہی ہے۔''

''ملکہ اپنے بادشاہ کے بغیر نہیں جاتی......'' فرح نے ہنس کر کہا تو وہ بھی اس کا مذاق جان کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یوں بھی ان دنوں وہ فرح کی ہنسی' اس کی شرارتیں اور اس کا الھڑ سا لہجہ دل بھر کر انجوائے کر رہا تھا۔

گاؤں میں تو وہ جلدی سونے کے عادی تھے مگر یہاں مری میں وہ رات گئے تک گھومتے رہتے اور نیند کا شائبہ تک نہ ہوتا۔

''کیسا شہر ہے یہ' ساری رات جاگتا ہے۔ تمام رات دکانیں کھلی رہتی ہیں اور لوگ ساری رات شاپنگ کرتے رہتے ہیں'' اشرف حیرت سے کہتا۔

''اب تم بھی گاؤں جا کر اپنی دکان دیر تک کھولنا تاکہ بکری زیادہ ہو'' فرح مشورہ دیتی۔

''گاؤں کے لوگ جاگیں گے تو خریداری کریں گے۔ اب مری والے تو میری دکان پر آنے سے رہے'' وہ ہنسا۔

''تم اپنی دکان یہاں کھول لو۔''

''کیسے کھول لوں۔ دو چار روز کے لیے تو یہاں رہ سکتے ہیں مگر ہمیشہ کے لیے تھوڑی آ سکتے ہیں'' اشرف کے لہجے میں جیسے ملال سا گھل گیا۔

''پتا نہیں اب دوبارہ آنا بھی ہوگا یا نہیں؟''

''پریشان نہ ہو' اب ہم ہر سال آیا کریں گے۔''

''ایمان سے......!'' وہ خوشی سے کھل اٹھی ''اشرف آپ تو بہت اچھے ہیں' بہت ہی اچھے۔''

''کیا میں شجاع سے بھی زیادہ اچھا ہوں؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا اور فرح کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کیسی بات پوچھ لی تھی اشرف نے اس سے۔ یہ بات تو وہ خود اپنے آپ سے بھی نہیں پوچھتی تھی۔

''ہو گئی ناں سٹی گم...... عاشق سے مقابلہ کہاں کیا جا سکتا ہے' ہے ناں!'' اشرف کا غصہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''آپ کا اور شجاع کا بھلا کیا مقابلہ...... آپ میرے سر کے سائیں ہیں اور وہ ایک اجنبی شخص۔ آپ سے زندگی بھر کا ناتا ہے اور اس سے میرا ایک بے وقوفی کا سمبندھ تھا جو کب کا ختم ہو چکا ہے۔'' فرح نے اس کا [illegible] سنبھل کر آہستگی سے کہا۔

''سچ کہہ رہی ہے ناں تو......؟'' اب اشرف اسے دونوں بازوؤں سے تھامے' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں پوچھ رہا تھا جیسے حلف اٹھوا رہا ہو۔

''ہاں بالکل سچ......!'' اس نے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا اور آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو آنکھوں میں جذب کر لیا۔ اپنے آپ پر قابو پانے میں اس کا اپنا وجود ہچکولے لے رہا تھا۔

''فرح' تم بہت اچھی ہو' بے حد اچھی'' اشرف نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''آپ مجھ سے زیادہ اچھے ہیں۔'' (اپنی بڑی بہن کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں' شوہر کی اتنی عزت کرو جس کا وہ اہل بھی نہ ہو پھر دیکھو وہ کتنا خوش ہوگا)

''اس کا تو یہ مطلب ہوا' ہم دونوں ہی بہت اچھے ہیں'' اشرف ہنسنے لگا۔ اس کا اچھا موڈ دیکھ کر فرح کی جان میں جان آئی۔

''فرح' آج تجھے گھوڑے کی سیر نہ کرا دوں؟'' اشرف نے محبت سے کہا۔

''اللہ...... کیا میں گھوڑے پر بیٹھوں گی'' فرح کی خوشی دیدنی تھی۔

''ہاں' کیوں نہیں بیٹھے گی۔''

''گھوڑے پر بیٹھ کر تو بڑے لوگوں کی بیگمیں سیر کرتی ہیں؟''

''تو کیا کسی سے کم ہے'' اشرف نے نتھنے پھلا کر کہا۔

''ہاں' یہ تو ہے۔''

''مگر میری ایک شرط ہوگی'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے بولا۔

''سب شرطیں منظور...... بس گھوڑے کی سواری کرا دیں۔ بچپن سے شوق ہے میرا۔''

''اپنا لال دبکے کے کام والا سوٹ پہن کر چلنا ہوگا' جو تو نے اس عید پر پہنا تھا۔''

''مگر وہ تو بہت بھاری سوٹ ہے' شادیوں میں پہننے والا ہے'' فرح شرما کر بولی۔

''اب مری میں' یہاں کس کی شادی آنی ہے' میں نے بطور خاص یہ جوڑا اسی وجہ سے رکھوایا تھا' تجھے اس لباس میں دیکھوں۔''

''ٹھیک ہے' میں ابھی تیار ہوتی ہوں'' اس نے چٹکی بجا کر کہا اور پھر واقعی وہ پندرہ منٹ میں ایسی سج دھج کر [illegible] جیسے کوئی دلہن کھڑی ہو۔

پہلے وہ دونوں مال روڈ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے۔ لوگ ان کو مڑ مڑ کر نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ باہم مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہو رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر پہلا تاثر یہی لگ رہا تھا فرح رخصت ہونے کے بعد سیدھی اسی شاہراہ پر ٹہلنے آ گئی ہو۔

جشن کہسار مری کی تقریبات کی رپورٹنگ کرتے پریس فوٹو گرافرز کی ایک بڑی تعداد ان دنوں مری میں موجود تھی جو مال روڈ کی چہل قدمی کی بھی کوریج کر رہی تھی۔

اشرف اور فرح جس طرح اور جس حلیے میں گھوم رہے تھے' فوٹو گرافرز کی نظروں سے بھی بچ نہ سکے اور ان کی

تصویریں ایسے کھینچیں کہ خود ان کو بھی پتا نہیں چل سکا۔

اور جب کشمیر پوائنٹ پر وہ گھوڑے پر بیٹھی اور اشرف گھوڑے کی راسیں تھام کر آگے چلا تو فرح کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اپنے گرد لپٹی ہوئی چادر اور سر کو ڈھانپا ہوا دوپٹا بھی اس کی گود میں آ گرا تھا۔ بالوں کی چٹیا کھل گئی تھی جو اس کی کمر پر کسی آبشار کی طرح بہہ رہی تھی۔

لوگوں نے پہلے اسے شوق سے دیکھا اور پھر اس کے اطراف مجمع سا لگتا گیا۔ ایسی پزیرائی اس سے قبل اس نے کہاں دیکھی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاید یہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے اور بعض کا خیال تھا کسی قبیلے کی کوئی دلہن اپنی کسی رسم کو پورا کرنے کے لیے باہر نکلی ہے۔

ٹی وی کیمرے کی چکا چوند نے انہیں کچھ حراساں کیا مگر لوگوں کی پرمحبت تالیوں اور نعروں نے اشرف کو مغرور سا کر دیا۔ اتنی اہمیت زندگی بھر اسے کہاں ملی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے یہاں آ کر اس کی عزت وتوقیر میں اضافہ ہو گیا ہو۔

اور جب مجمع چھٹا تو فرح نے کہا ”آج کا دن بہت خوبصورت ہے۔“

”آج کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن ہے“ اشرف نے فخر سے کہا۔

☆☆☆

رات کو خبرنامے کے بعد جشن کہسار مری کی کوریج ٹی وی پر دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک فرح گھوڑے پر بیٹھی نظر آئی۔

”ارے یہ تو فرح جیسی لگ رہی ہے“ بڑی آپا نے کہا۔

”اونہہ...... یہ تو کوئی ہیروئن ہو گی، کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔“

”آپا، فرح بھابی چلتے وقت ہری چوڑیاں پہن کر گئی تھیں، ہاتھوں کی ہری چوڑیاں صاف نظر آ رہی ہیں“ ایک چھوٹی بہن کو شبہ سا ہوا۔

”دیکھو، کتنے پیارے انداز میں ہنس رہی ہے۔ لوگوں کو ہاتھ ہلا رہی ہے“ چھوٹی بہنیں بھی اسے دیکھ کر سراہ رہی تھیں۔

”یہ تو کوئی شہزادی ہے۔ ہاں، کسی باہر کے ملک سے آئی ہو گی۔“

”اونہہ...... ایسی خوبصورتی فرح میں کہاں ہے، کسی لڑکی سے تو آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی، لوگوں کے نعروں کے جواب ہاتھ ہلا کر دے سکتی ہے وہ بھلا؟“ اماں جان کی رائے سب پر بھاری تھی۔

اگلی صبح بارش کی وجہ سے موسم میں خنکی سی ہو گئی تھی۔ گھر میں سب ابھی سو ہی رہے تھے، محلے کی استانی کی بیٹی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”یہ اتنی صبح کون آ گیا؟“ نانی اماں نے آلکس بھرے لہجے میں پوچھا۔

بڑی آپا غصے میں بڑبڑاتی دروازہ کھولنے اٹھیں تو نعیمہ ہاتھ میں اخبار لیے کھڑی تھی۔ ”مبارک ہو، تمہارے بھائی، بھابی مری میں خوب مشہور ہو رہے ہیں۔“

”کیا بک رہی ہو...... انہیں وہاں کون جانے گا؟“

”یہ دیکھو، فرح کی تصویر اخبار میں چھپی ہے“ بڑی آپا نے جھپٹ کر اخبار لیا۔ فرح کی بڑی سی رنگین تصویر تھی جس میں وہ گھوڑے پر بیٹھی ہنس رہی تھی اور اشرف گھوڑے کی راسیں تھامے کھڑا تھا۔ تصویر کے نیچے واضح کیپشن لکھا ہوا تھا۔ ”مری میں خوش فکری سے گھومتا ہوا ایک نوجوان جوڑا۔“

”ناک کٹوا دی تمہاری بہو نے......“ آپا نے اماں کو اخبار دکھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تب اماں بولا کر رہ گئیں۔

اب گھر میں اخبار ناچ رہا تھا اور نانی اماں فضیحتے کر رہی تھیں۔ ”اور بھیجو اکیلا بہو کو۔ اس نے تو یہ ننگ پناہ دکھانا ہی تھا۔ بڑی کائیاں (مکار) لڑکی ہے، دیدہ دیکھو کیسا ہوائی ہے۔“

”میں کیا کرتی، جب اپنا بیٹا ہی اسے لے جانے کے لیے باؤلا ہو رہا تھا۔ کتنا تو اسے سمجھایا تھا، مان کر کہاں دیا اس نے؟“

”تم خود جاتیں اس کے ساتھ، آخر حکیم جی کی بیوی بھی تو ساتھ گئی تھیں۔ اس نے منع کر دیا، تم چپ ہو کر بیٹھ گئیں۔“

”میری کہاں چلتی ہے گھر میں، یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔“

”کل کلاں کو وہ کوئی اور ایسی بیہنگی حرکت کر لیتے تو پھر انہیں پولیس اسٹیشن سے چھڑوانا پڑتا“ نانی اماں کا ذہن اونچی نیچی اڑانیں طے کر رہا تھا اور وہ اپنے کلّے مستقل پیٹ رہی تھیں۔

”آئیں ذرا گھر میں پھر پوچھتی ہوں ان سے“ اماں کا دماغ کھول کر رہ گیا تھا۔

”انہوں نے جو ذلالت دکھائی تھی، دکھا دی۔ اخبار میں شکل آ گئی، ٹی وی پر کام کر لیا، اب ڈرامے رہ گئے، کسی دن اس میں بھی مٹک کر آ جائیں گی۔“

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے اس لڑکی پر جو بغیر برقع کے پڑوس میں نہیں جاتی، بغیر چادر لیے دروازے پر کھڑی نہیں ہوتی، گھوڑے کے گلے میں بانہیں ڈالے ایسے ہنس رہی ہے، جیسے کسی فلم میں کام کر رہی ہو، لاحول ولا قوۃ۔“

”ہم تو منحوس کو ٹی وی پر دیکھ کر بھی پہچان نہیں سکے اور گاؤں کے لوگوں نے اخبار کی تصویر دیکھ کر ہی پہچان لیا۔“

”اللہ، اب میں کیسے نظریں ملاؤں گی اپنے محلے والوں سے“ اماں نے اخبار کو پرے پھینکتے ہوئے غصے سے کہا۔

”تم بس اس بات پر ڈٹی رہو، یہ فرح کی تصویر نہیں ہے، کوئی اور ہے“ نانی اماں نے مشورہ دیا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے“ اماں کی ساری پریشانیاں بھک سے اڑ گئیں۔

☆☆☆

جب سے تو نے پاؤں دھرا ہے دل کے سونے جنگل میں
خوشبو اک پھوٹ رہی ہے دل کے سونے جنگل میں
لمحہ بھر جو دیکھیں تیری روشن ہنستی جھلمل آنکھیں
جگنو رستہ پوچھ رہے ہیں دل کے سونے جنگل میں

بس تیزی سے مری کی بل کھاتی سڑکوں سے نیچے کی جانب دوڑ رہی تھی۔ فرح کھڑکی پر سر لگائے سیٹی بجاتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب اسے الوداع کہہ رہے ہوں۔

”کتنا خوبصورت راستہ ہے، پہاڑوں سے بادلوں کے ٹولے ہمیں چھپ چھپ کر دیکھ رہے ہیں۔“

”کہاں......؟“

”یہاں......“ اس کی پشت سے ہوتا ہوا ہاتھ اس کو اشارے سے بتا رہا تھا۔

”فرح......!“

”ہوں......!“

”مری میں گزارے یہ دس دن دس ساعتوں میں گزر گئے۔“

”پتا نہیں پھر کب یہاں آئیں گے؟“

”ہر سال آئیں گے۔ آسمان پر چمکیلے رنگوں کی برکھا کا رقص دیکھا کریں گے۔“

”زندگی محبت کے ساتھ گزرے تو ہر بات اچھی لگا کرتی ہے۔“ فرح اس کے کاندھے پر سر رکھے اس چاند کو دیکھ رہی تھی جو اس کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ ”دیکھو، یہ مری کا چاند ہمیں گاؤں تک چھوڑنے جا رہا ہے“ فرح نے کہا۔

”ہاں...... یہ تو واقعی ہمارے ساتھ ہے“ اشرف ہنسا۔

بس تیزی سے گاؤں کی جانب گامزن تھی۔ فرح کھڑکی پر سر ٹکائے بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ گزرے ہوئے دن اسے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔

”فرح! کیا سوچ رہی ہو؟“ اشرف نے پوچھا۔

”یہی کہ یہ دس دن...... ہیرے جیسے تھے۔“

”ہاں، بہت اچھا وقت گزرا مری میں ہمارا۔“

”کیا ہم ہر سال آیا کریں گے؟“ فرح معصومیت سے بار بار پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، میں تمہیں ہر سال لے کر آیا کروں گا۔“

”گاؤں جا کر بھی میرا خیال رکھا کریں گے؟“

”تو کیا میں نہیں رکھتا......؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ ہر وقت رعب جماتے ہیں۔ مجھے کوئی کتنا ہی ذلیل کر دے، اسے ایک لفظ نہیں کہتے۔“

”اب ایسا نہیں ہوگا“ اشرف نے اس کے ملائم ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ آپ کا پکا وعدہ ہے ناں......؟“ فرح نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ اشرف خان کا وعدہ ہے“ اس کے ہاتھ پر دوسرا آہنی ہاتھ اشرف کا تھا۔

تب دونوں ہی ہنس پڑے اور ان کی ہنسی کی دلنواز کھنک اس بس کے تمام مسافروں نے محسوس کی۔

”نیو کپل ہے شاید!“ کسی نے سرگوشی کی...... اور اشرف نے آسودگی سے آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

نگین کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی۔ گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی ڈاکٹر نے اسے الٹرا ساؤنڈ کروانے کے لیے کہا تھا۔ اس سے بچے کی جنس کے ساتھ ساتھ اس کی پوزیشن کے بارے میں آگاہی ہو جاتی تھی۔

”امی! پہلے سے یہ پتا چل جائے کہ ہمارے ہاں بیٹا یا بیٹی آ رہی ہے تو سارا سسپنس تو ختم ہو کے رہ جاتا ہے“ نگین نے کہا۔

”یہ تو اچھی بات ہے، لڑکی ہوگی تو اس کی فراکیں کڑھائی والی اور شوخ رنگوں میں لے لیں گے اور لڑکا آنے والا ہو گا تو میں پہلے ہی سے اس کے لیے چھوٹی سی شیروانی اور کرتہ لے لوں گی۔“

”سسپنس رہے تو مزہ آتا ہے، یکدم سے پتا چلے تو خوشی زیادہ ہوتی ہے“ نگین بدستور اپنے مؤقف پر قائم تھی۔

”اب زیادہ افلاطون مت بنو، زندگی کی بہت سی باتوں میں سسپنس موجود ہے۔ اب اس لفظ سے نفرت ہو گئی ہے مجھے“ فیروزہ بیگم نے اسے سمجھایا۔

اور جب ڈاکٹر مسرت نے اس کو الٹرا ساؤنڈ کے بعد بتایا کہ پیارا سا بیٹا آنے والا ہے مگر اس وقت آنول نال اس کی گردن میں گھوم گئی ہے۔

فیروزہ تو پریشان سی ہو گئیں ”اللہ نہ کرے، کہیں بچے کو کوئی نقصان نہ ہو جائے؟“

ڈاکٹر مسرت نے انہیں سمجھایا۔ ”بچہ ماں کے پیٹ میں گھومتا رہتا ہے، آنول نال کے یہ بل خود بھی نکل سکتے ہیں۔ مگر آئندہ ماہ ایک اور الٹرا ساؤنڈ کروا لینا مناسب ہوگا۔“

دونوں ہی خوش آئی تھیں مگر دل میں غم کی ایک پھانس بھی موجود تھی۔

”خدا کا یہ کرم ہے کہ میری بیٹی کے ہاں اولادِ نرینہ ہونے والی ہے۔ بس اللہ اپنا یہ رحم بھی فرمائے کہ بچہ بخیر و عافیت کے ساتھ تولد ہو“ فیروزہ ہر نماز کے بعد یہ دعا بڑی رقت کے ساتھ مانگ رہی تھیں۔

”امی! میں شجاع کو بتا دوں، الٹرا ساؤنڈ میں لڑکا بتایا ہے؟“ نگین نے بڑے پرجوش لہجے میں ماں سے پوچھا۔

”نہیں، ابھی بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ فیروزہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

”عجیب بات کر رہی ہیں آپ بھی۔ باپ سے بھی بھلا یہ بات چھپانی چاہیے“ نگین خاصی جز بز سی تھی۔

”ہاں......“ انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپا کر کہا۔

”یہی تو پوچھ رہی ہوں آخر کیوں......؟ اگر میں شجاع کے ساتھ الٹرا ساؤنڈ کرانے جاتی تب بھی تو انہیں فوراً پتا چل جانا تھا۔“

”شجاع گاؤں میں ہے، تمہارے پاس تو نہیں ہے، تو کیا ضرورت ہے اسے بتانے کی؟ تم اسے بتاؤ گی، وہ مارے خوشی کے اپنی ماں کو بتا دے گا۔ ماں اس سے زیادہ جذباتی، وہ پورے گاؤں میں ڈھول پیٹ دیں گی، شجاع کے ہاں بیٹا ہونے والا ہے۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔ وقت سے پہلے ہی سب کو پتا چل جائے گا۔“

”اگر ایکدم سے پتا چلے تو زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“ فیروزہ نے نگین کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیے۔ تب نگین بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆☆☆

صابرہ مشین پر اپنا بلاؤز سی رہی تھی اور ثریا ساس سے قدرے زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا مقصد صابرہ کو سنانا تھا۔

”امی! آپ خود ہی بتائیے کہ کیا ثنا کا رشتہ کمپل گریجویٹ کے ساتھ ہونا چاہیے؟“

”بیٹا، جسے تم مناسب سمجھو اس کے ساتھ ثنا کا رشتہ طے کرنا“ شائستہ بیگم نے سادگی سے کہا۔

’’میں تو ڈاکٹر کے علاوہ کسی سے بھی نہیں کروں گی۔ میں تو خاندان میں تو کیا‘ برادری میں بھی دور دور تک نہیں کروں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے بیٹا! تم اس کی ماں ہو‘ اس کے لیے بھلا ہی سوچو گی۔‘‘

’’مگر لوگ ہمارے گھر میں کیوں منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو دیکھتے نہیں ہیں اور منہ کھول کر ثنا کا نام لے لیتے ہیں۔‘‘

’’ثریا بیٹا‘ لڑکیوں کے ہر طرح کے رشتے آتے ہیں۔ اس میں اتنا ناراض ہونے کیا بات ہے؟‘‘ شائستہ بیگم نے اس کا غصہ کم کرنے کی سعی کی۔

’’اب صابرہ کی بھابی ایک دم جاہل لٹھ اپنے بھتیجے کا رشتہ لیے چلی آئیں اور بھیجنے والوں نے بھی اپنا دل پشوری کرنے کے لیے میرے پاس بھجوا دیا۔‘‘

صابرہ سمجھ رہی تھی‘ ثریا کی توپوں کا رخ اس کی طرف ہے‘ اس نے بلند آواز میں ٹی وی کھول لیا۔ ثریا کافی دیر تک تنتنا کر بولتی رہیں مگر صابرہ بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔

جب ثریا ٹی وی لاؤنج سے ٹیلی فون اٹھا کر اپنے بیڈ روم میں گئیں تو صابرہ نے سکون کا سانس لیا۔ ٹی وی بند کر کے اپنے بلاؤز کو ایک نظر دیکھا‘ جس کی آستین وہ جوڑ رہی تھی۔ معلوم ہوا دونوں آستینیں ایک ساتھ سی دی تھیں۔

’’میرا یہ سوب غلط......‘‘ تب بلاؤز مشین سے کھینچ کر دور پھینک دیا۔ اس وقت ادھیڑنے کی ہمت اس میں قطعی نہیں تھی۔ ثریا کی تقریر نے اس کو ہی خاصا ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

ایک اتوار کا ہی دن ہوتا تھا جب خاصی دیر سے ناشتا ہوتا تھا مگر دس بجے تک سب میز پر آ جاتے تھے۔ جہاں پراٹھوں کے ساتھ بھنا ہوا قیمہ‘ آلو کی ترکاری اور طرح طرح کے حلوے ہوتے تھے۔

اور آج ساڑھے دس بج چکے تھے اور گھر میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ باورچی خانے سے کسی قسم کی کوئی آواز ہی نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی پراٹھوں کی خوشبو کمروں میں آ رہی تھی۔

ثنا نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی اور چونک سی گئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ انکل کو باورچی خانے میں جاتے دیکھا تو خود بھی باہر نکل آئی۔

’’السلام علیکم انکل! آج آنٹی سونا بنا رہی ہیں......؟‘‘ اس نے شائستگی سے پوچھا۔

’’بیٹا‘ تمہاری آنٹی کو تیز بخار ہو رہا ہے۔ میں ڈبل روٹی لے آیا ہوں‘ ناشتا ابھی بن جاتا ہے۔‘‘

’’کیا ہوا آنٹی کو؟ رات تو وہ بالکل ٹھیک تھیں؟‘‘

’’رات ان کے حلق میں تکلیف تھی‘ شاید اس کی وجہ سے ہی بخار چڑھ گیا۔‘‘

’’آپ آنٹی کو دیکھیے‘ آج میں ناشتا بناتی ہوں‘‘ وہ کچن میں چلی آئی۔

حمیدہ اچھی طبیعت کی تھیں۔ ثنا پر کام کا بوجھ بالکل بھی نہیں ڈالتی تھیں۔ چھٹی کے دن بھی وہ خود ہی ناشتا بنایا کرتی تھیں مگر آج ثنا نے بڑے سلیقے سے ناشتا بنایا۔ میز پر سجایا‘ آنٹی کا ناشتا ان کے کمرے میں پہنچایا اور خود انکل اور طاہر بھائی کے ساتھ ناشتے کی میز پر آ گئی۔

’’ثنا تم تو چھپی رستم نکلیں۔ ایسے بل دار پراٹھے اور کلونجی زیرے کی آلو کی ٹکیاں بنائی ہیں‘ سچ ناشتے میں مزہ

آ گیا‘‘ طاہر نے کہا۔

’’یہ سب میں نے اپنی دادی اور پھپھو سے سیکھا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘ اب ہر چھٹی کے دن تم ناشتا بنایا کرو گی۔‘‘

’’جی نہیں‘ میری بیٹی یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہے‘ کام کرنے کے لیے نہیں؟‘‘

’’انکل! چھٹی کے دن تو بنا سکتی ہوں‘‘ ثنا نے ہنس کر کہا۔

حمیدہ کا بخار جب چار دن تک نہیں اترا تو سب ہی پریشان ہو گئے۔ ثنا صبح سویرے ناشتا بناتی‘ آنٹی کو ناشتا ا کے دوا کھلا کر کالج جاتی‘ کالج سے آ کر آنٹی کو ان کے کمرے میں سوپ بنا کر انہیں پلاتی‘ دوائیں کھلاتی ب اپنے کمرے میں آتی۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ دس دن بعد جب وہ بستر سے اٹھیں تو ثنا نے سکون کا سانس لیا مگر آنٹی کو اس کا خلوص انداز دل سے بھا گیا۔

’’ثنا کتنی محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں‘ جو دوسروں کا بھی احساس کریں‘‘ اور آخر ایک دن انہوں نے اپنے میاں سے کہہ ہی دیا اگر طاہر کی انگیج منٹ آپ کی بھتیجی سے نہ ہوتی تو میں ثنا کو اپنی بنالیتی اور کبھی اسے کراچی نہ جانے دیتی۔‘‘

’’مگر طاہر کی انگیج منٹ ہو چکی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو خاصا پسند کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں یہ تو ہے......‘‘ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’اگر میرا چھوٹا بھائی کینیڈا سے آ جاتا‘ تو میں اس کی شادی ثنا سے کروا دیتی۔‘‘

’’تمہارے بھائی کو کینیڈا انگل چکا ہے۔ وہ وہاں کے تام جھام سے اتنا متاثر ہے‘ کبھی پاکستان نہیں آئے ‘‘

’’پھر ثنا کو کس طرح ہم روک سکتے ہیں؟‘‘

’’پرائی امانت پر نظر مت رکھو۔ اس کے والدین جہاں چاہیں گے اس کا رشتہ طے کریں گے‘ ہم کون ہوتے ں جو اس جانب سوچیں۔‘‘

’’ارے واہ...... ہم ہی تو اسے ڈاکٹر بنا رہے ہیں‘ اگر اس کا رشتہ اپنی فیملی میں کرا دیں گے تو شاہنواز بھائی تو آپ کے مزید مشکور ہوں گے۔‘‘

’’حمیدہ! بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو‘ مانا کہ شادی سے پہلے تم میرج بیورو چلاتی تھیں مگر اب اس شوق کو کردو۔ یہ والدین کی ذمے داری ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے خود رشتے کا انتخاب کریں۔‘‘

’’ہم ان کو بتا تو سکتے ہیں ناں......‘‘

’’طاہر کے علاوہ اگر دوسرا بیٹا ہوتا تو ہم اس کا پرپوزل بھجوا سکتے تھے‘ مگر اب تیرے میرے کے بارے میں اں سوچیں۔‘‘

’’مگر مجھے ثنا بے حد پسند ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے پھر اس کو اپنی بیٹی بنا لو‘ طاہر بھی بہن پا کر خوش ہو جائے گا۔‘‘

☆☆☆

عدیل ان دنوں بے حد پریشان سا تھا۔ جس دکان پر پہلے وہ سیلز مین تھا‘ وہاں کام کی غرض سے گیا تو مالک

نے اسے دھتکار کر بھگا دیا۔ رشتے داروں کے پاس گیا تو انہوں نے منہ نہیں لگایا۔ دوستوں کے پاس گیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔ اماں سے پیسے مانگے' کہیں کوئی ٹھیلا لے کر ہی کھڑا ہو جائے تو انہوں نے بے نقط سنا ڈالیں۔

''عدیل! تجھ پر میں اتنا پیسا خرچ کر چکی ہوں کہ اتنے میں تو میں اپنی دو بیٹیوں کو بیاہ دیتی۔''

''قسمت ہی خراب نکلی تو کیا کروں۔ میرے ساتھ کے دوست سب نکل گئے' میں ہی چند لوگوں کے ساتھ پکڑا گیا'' عدیل نے خجل ہو کر کہا۔

''اب تجھ پر میں مزید پیسا تو نہیں خرچ کر سکتی' تو خود کما اور اپنا خرچہ اٹھا۔''

''اماں' اب کچھ کمانے کے لیے بھی پاس سے پیسا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کٹورا لے کر تو کہیں کھڑا نہیں ہو سکتا۔''

''دنیا کے لڑکے کماتے ہیں' ایک تو ہے ماں بہنوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرماتا تک نہیں ہے۔ یہ تک نہیں دیکھتا' بہنیں ہر وقت مشین پر بیٹھی رہتی ہیں۔ رات رات بھر سلائی کرتی ہیں تب ہاتھ میں کچھ آتا ہے۔''

''اماں' میرے تو سارے خوابوں میں آگ لگ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اپنی زندگی کا سفر کس رخ سے شروع کروں جو میرے لیے کامیابیوں کا رستہ کھول دے۔'' عدیل نے تفکر بھرے لہجے میں کہا۔

''تو ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر لے۔ سنا ہے وہاں بہت پیسا ملتا ہے'' بڑی آپا نے مشورہ دیا۔

''کمال کرتی ہیں آپا......! یہاں بغیر سفارش کون جا سکتا ہے۔ اہلیت تو بعد کی بات ہے' یہاں گھسنا ہی بہت مشکل ہے۔'' عدیل کے لہجے میں رنج گھلا ہوا تھا۔

''شکل تو تیری اچھی ہے' ہاتھوں ہاتھ لے لیں گے سب' تو کوشش تو کر۔ آخر کیسے برے برے ہیرو ہیروئنیں ٹی وی کے ڈراموں میں آ رہے ہیں۔'' چھوٹی باجی نے بھی ہنس کر کہا۔

''اگر مجھے چانس مل جائے تو سچ دھماکا کر دکھاؤں گا' لوگ شاہ رخ کو بھول جائیں گے'' اس نے کالر کھڑا کر کے کہا۔

''خیر اب اتنا برا وقت بھی نہیں آیا ہے ٹی وی فلموں پر کہ تمہارے آنے پر لوگ اتنے بڑے فنکار کو بھول جائیں۔'' چھوٹی آپا شاہ رخ کی زبردست فین تھیں' وہ کہاں یہ بات برداشت کر سکتی تھیں۔

''اچھا اماں! یہ بات آپ سچ سچ بتائیں' میری شکل آپ کو کیسی لگتی ہے؟'' اب وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ ٹکائے اماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

''ماشاء اللہ! شکل وصورت میں تو ہیرا ہے' غریب ہونے کے باوجود شکل سے بڑا پن چھلکتا ہے اور جب اچھے سے کپڑے پہن کر کہیں باہر جاتا ہے تو یوں لگتا ہے کوئی رئیس زادہ جا رہا ہے۔''

''اماں' مجھ رئیس زادے کی قسمت میں پیسا کیوں نہیں ہے؟'' اس نے ہنس کر شوخ سے لہجے میں کہا۔

''اس لیے کہ تو ہڈ حرام ہے۔ باتیں بنا کر پیسا کمانا چاہتا ہے۔ محنت کرے گا تو پیسا بھی ہاتھ میں آئے گا۔''

''اماں' وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو باتیں بنا کر پیسا کما لیتے ہیں؟'' اس نے ماں سے پوچھا۔

''وہ بہت بڑے شاطر ہوتے ہیں۔ مکاری' عیاری اور دوغلا پن ان کی فطرت میں رچا ہوتا ہے۔''

''حیرت ہے' یہ سب خوبیاں مجھ میں موجود ہیں اور پھر بھی پیسا مجھ سے کالے کوسوں دور ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور مسکرا کر باہر نکل گیا۔

اگلے دن سے ہی وہ گرلز کالج کے سامنے تیار ہو کر کھڑا ہونے لگا۔ صبح کے وقت وہ یہ اندازہ کیا کرتا کہ کتنی

لڑکیاں اپنے گھر کی گاڑیوں میں آتی ہیں' کتنی لڑکیاں بسوں سے آتی ہیں اور کتنی پیدل! کون پیسے والی ہے اور کون غریب' یہ سب تجزیہ وہ مسلسل پندرہ دن کرتا رہا۔

اور پھر ایک دوپہر کالج سے چھٹی کے وقت وہ ایک لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے بولا ''مس پلیز! صرف دو منٹ آپ میری ایک بات سن سکیں گی؟''

''جی فرمائیے'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''یہ میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں...... آپ کو دیکھ کر میرا دل میرا نہیں رہا۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھا مگر جب سے آپ پر نظر پڑی ہے' میں اپنے آپ کو' اپنے بزنس کو' سب بھول چکا ہوں۔ بس میرے خیالوں میں آپ ہی کا پرنور چہرہ رہتا ہے۔''

''جی...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔'' لڑکی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''صرف ایک کپ چائے' میرے ساتھ پینا پسند کریں گی؟''

''نہیں...... میرا ڈرائیور آتا ہوگا...... ہرگز نہیں۔''

''اچھا چلیں' کل...... پلیز! میری خاطر یہ وعدہ کر لیں۔''

''دیکھا جائے گا'' اپنی گاڑی کو دیکھ کر وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''تم بہت جلد میری ہوگی مہناز...... بہت جلد۔'' اس کی گاڑی کو جاتا دیکھ کر وہ مسکراتے لبوں سے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

''میرے لیے اس سے بہتر جاب شاید کوئی اور نہیں ہو سکتی'' گھر جاتے سمے وہ خوش انداز میں سوچ رہا تھا اور آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

فریال اور صادقہ باجی اپنے بوتیک جا رہی تھیں۔ آج مارکیٹ جانے کی وجہ سے انہیں قدرے دیر ہو گئی تھی۔ سگنل پر جیسے ہی گاڑی رکی فریال کی نظر برابر کی جانب کھڑی بائیک پر پڑی تو وہ ششدر سی رہ گئی۔ ثنا کسی لڑکے کے ساتھ بائیک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکے نے کچھ کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

فریال کو یوں لگا جیسے وہ عدیل کے ساتھ کہیں جا رہی ہو۔ اس سے پیشتر کہ فریال' ثنا کو مخاطب کر کے کچھ کہتی' سگنل کی لائٹ گرین ہوتے ہی بائیک تیزی سے آگے چلی گئی۔ فریال نے نوٹ کیا' ثنا اپنے کالج کی یونیفارم میں تھی۔

''خدایا......! یہ ثنا کس ڈگر کی جانب جا رہی ہے۔'' دکھ کا احساس اس کے دل کو تڑپا سا رہا تھا۔

اس دن بوتیک میں اتنا رش تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ثنا سے رابطہ نہ کر سکی۔ شام کو جیسے ہی وہ گھر پہنچی تو اپنے کمرے میں جاتے ہی سب سے پہلے ثنا کو فون کیا۔

''پھپھو! میں آج سوچ ہی رہی تھی آپ کو فون کروں گی' سچی آج آپ کی یاد بے حد آ رہی تھی'' ثنا نے کہا۔

''جھوٹی کہیں کی...... جب بھی میں فون کروں' ہمیشہ یہی کہتی ہو۔''

''نہیں پھپھو! آپ تو ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہیں۔''

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''ٹھیک ٹھاک' اس سمسٹر میں بھی میں ٹاپ ٹین میں رہوں گی۔''

''اور کوئی نئی تازی......؟'' فریال نے اسے بولنے پر اکسایا۔

''آنٹی کی طبیعت خراب چل رہی ہے۔ انہیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے' گاہے بہ گاہے بخار چڑھ جاتا ہے۔''

''موسم بھی تو خراب ہے' ہر شخص کو فلو ہو رہا ہے'' فریال نے کہا۔

''نہیں' آنٹی کے گلے میں تکلیف ہے۔ شاید ٹانسلز وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ آج بھی انہیں بخار تیز تھا۔ پھر ایکدم ویگنوں کی ہڑتال ہو گئی' اس کے باوجود انہیں میری فکر اتنی تھی...... طاہر بھائی کو کالج بھیج دیا کہ ثنا کو لے کر گھر آؤ۔''

''کیا طاہر تمہیں اکثر کالج لینے آتا ہے؟'' فریال کی پریشانی حتمی طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں' انکل ڈرائیور کو بھجواتے ہیں' جو انہیں آفس کی جانب سے ملا ہوا ہے۔ طاہر بھائی تو مجھے آج پہلی مرتبہ لینے آئے تھے۔'' ثنا کے لہجے میں سچائی اور معصومیت دونوں یکجا تھیں۔

''پھر بھی کیسے ہیں یہ طاہر بھائی؟'' فریال اپنی تشفی کے لیے کرید رہی تھی۔

''بہت اچھے' بے حد ڈیسنٹ۔ کبھی آیئے ناں آپ آنٹی کے گھر' میں آپ کی ان سے ملاقات کراؤں گی۔''

''میں نے دو سوٹ تمہارے لیے بنوائے ہیں اور ایک تمہاری آنٹی کے لیے...... کسی دن آؤں گی۔''

''پھپو! آپ اتوار کو آ جائیں۔ پیر کو تو میں ویسے بھی کراچی جا رہی ہوں' ایک ساتھ چار چھٹیاں آ رہی ہیں اس وجہ سے۔''

''کس بہانے سے آؤں میں تمہارے پاس؟''

''میں کہہ دوں گی میں نے اپنی سائرہ پھپو کے لیے سوٹ آپ سے منگائے ہیں۔ آپ وہی دینے آئی ہیں۔''

''اچھا' تم کراچی جا رہی ہو پیر کو......'' فریال کا دل اتھل پتھل سا ہو گیا۔

''ہاں پھپو......!''

''اگر میں سائرہ باجی اور امی کے لیے سوٹ دوں تو کیا تم لے جاؤ گی؟''

''پھپو' میں لے تو جاؤں گی مگر میں ان سے کیا کہوں گی...... کس نے بھیجے ہیں یہ سوٹ اور کیوں بھیجے ہیں یہ سوٹ کا کوئی جواب تو میرے پاس ہونا چاہیے؟''

''اسلام آباد میں نمائش لگی تھی۔ آخری بچ جانے والے سوٹ بے حد سستے مل رہے تھے جو تم نے تین تین سو روپے کے خرید لیے۔ اتنی شاپنگ تو تمہارا جیب خرچ کر ہی سکتا ہے۔''

''مگر آپ کے قیمتی جوڑوں پر تین سو روپے کا لیبل نہیں لگ سکتا۔''

''چلو' تمہاری آنٹی کے سامنے تو میں یہ کہہ سکتی ہوں میری ایک دوست تمہارے محلے میں رہتی ہیں' ان کو یہ سوٹ پہنچا دینا۔''

''ہاں' یہ بات صحیح ہے۔ وہاں کا معاملہ میں سنبھال لوں گی۔''

''اب کے امی اور سائرہ باجی کی تصویریں ضرور لانا۔''

''آپ کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں' میں ضرور لاؤں گی۔''

''ایک بات کہوں ثنا' اگر برا نہ مانو......؟'' فریال نے کچھ لمحے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں پھپو! کہیے ناں' آپ کی بات کا میں نے کبھی برا مانا ہے' جو اب مانوں گی؟''

''اپنے پڑھنے کے دوران اپنے کلاس فیلو یا کسی بھی لڑکے سے فری مت ہونا...... اور محبت کے نام پر کبھی کسی کا اعتبار مت کرنا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھپو! مجھے اس قماش کی لڑکیاں خود بھی پسند نہیں ہیں۔''

''بیٹا...... یہ لڑکے محبت کی چکنی چپڑی باتوں سے لڑکیوں کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں' تب وہ کہیں کی نہیں رہتیں۔''

''جی پھپو!''

''اور جب ایک مرتبہ زندگی تہس نہس ہو جائے تو دوبارہ اپنی اصل حالت میں نہیں آتی ہے۔'' فریال اپنے دل کی' اپنے اوپر بیتی ہوئی بات کے حوالے سے ثنا کو سمجھا رہی تھی۔

اور ثنا یہ سوچ رہی تھی کہ فریال پھپو اس سے کیا کہنا چاہتی ہیں جو وہ کھل کر کہہ نہیں پا رہی ہیں' یقیناً ان کے دل ں ایسی کوئی بات ضرور ہے' جس سے میں آگاہ نہیں ہوں۔

''اچھا پھپو! پھر آپ اتوار کو آ رہی ہیں ناں؟'' ثنا نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں' میں ضرور آؤں گی۔''

☆☆☆

''ارے اتنے خوبصورت کپڑے...... یہ تو بہت قیمتی ہیں'' ثریا تو دیکھ کر ہی سرشار ہو گئی۔

''امی! ایک سوٹ آپ کا ہے' ایک دادی کا اور دو سائرہ پھپو کے'' فریال نے ماں کا جوڑا ان کے حوالے رتے ہوئے کہا۔

''ارے پاگل ہو گئی ہے کیا۔ دادی اور پھپو کو دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے لیے رکھ لے' تقریبات میں ہنے کے کام آ جائیں گے اور یوں بھی اتنے سستے جوڑے کراچی میں تو کبھی نہ ملیں۔''

''امی! اسلام آباد میں ایسی نمائشیں رات دن لگتی رہتی ہیں۔ اگر آپ کہیں گی تو میں لا دوں گی۔ ہاں' میرا ب خرچ تھوڑا تگڑا دے دیا کریں۔''

''ٹھیک ہے' دے دو۔ کیا یاد کریں گی' ثریا کی بیٹی کیسی دیالو ہے۔''

اور جب ثنا نے سائرہ اور دادی کو ان کے سوٹ دیے تو وہ متحیر سی رہ گئیں۔

''ارے بیٹا! بچوں سے تھوڑی تحفے وصول کیے جاتے ہیں۔ تم نے کپڑے خریدے تو اپنے لیے رکھو۔''

''اماں' جب میں نے یہ آف وائٹ سوٹ دیکھا تو بوتیک والی باجی کہنے لگیں' یہ سوٹ دادی کے لیے ہے۔''

''انہیں کیا پتا' تمہاری دادی بھی ہیں'' شائستہ بیگم نے چونک کر کہا۔

''اماں' ان کا مطلب تھا کہ یہ سوبر سوٹ ہے۔'' ثنا نے سنبھل کر کہا۔

''مجھے تو حیرت ہو رہی ہے ثنا میرے فیورٹ کلر میں کیسے سوٹ لے آئی'' سائرہ نے کہا۔

''اب کیا مجھے اپنی پھپو کی پسند ناپسند کا بھی معلوم نہیں ہو گا؟'' ثنا مسکرائی۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی' تمہاری اتنی عمدہ چوائس ہو گی؟'' سائرہ کی تعریفیں کسی صورت ختم نہیں ہو رہی ں

''اپنی اتنی عمدہ چوائس کا احساس مجھے بھی پہلی بار ہو رہا ہے۔'' ثنا ہنس کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''یا بات ہے' بڑے تحفے تحائف بانٹے جا رہے ہیں؟'' منور باہر سے آ کر بیٹھا تھا۔ دادی کے کمرے سے والی باتوں کی آواز سن کر بولا۔

''ہاں' تحفے تو دینے ہی چاہئیں' اس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔''

"تم میرے لیے تو کچھ بھی نہیں لائیں" وہ ہنسا۔

"کیوں' تمہیں بھی سوٹ چاہیے...... رعنا کو دینے کے لیے؟"

"پاگل ہو تم...... میں اپنی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ...... تمہارے لیے تو میں کچھ بھی نہیں لائی' اب میں تمہیں کیا دوں؟" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

"آئس کریم تو کھلا سکتی ہو" وہ ہنس کر بولا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ آج رات کھانے کے بعد آئس کریم پارلر چلیں گے' وہاں کھائیں گے۔"

"مگر پے منٹ تم کرو گی......" منور نے شرارتی لہجے میں کہا۔

"منظور ہے" ثنا نے رضامندی میں سر ہلایا اور بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور پاس سے گزرتی صابرہ کے کانوں میں زہر سا گھل گیا۔ اس کی ہنسی اس کے سینے میں انی سی چبھو گئی۔

منور تھوڑی دیر بعد ماں کے کمرے میں آیا تو صابرہ نے غصے سے پوچھا "کیا باتاں کر رہے تھے تم ثنا کے ساتھ؟"

"کچھ بھی نہیں...... بس ایسے ہی" اس نے کندھے اچکائے۔

"ہمیں باتاں تو ہو رہی تھیں' میں آپ سنی۔"

"ثنا کے بال لمبے ہو گئے ہیں ناں' وہ تیل کے بارے میں بتا رہی تھی" منور نے بوکھلا کر کہا۔

تب صابرہ طنز سے بولی "ائی ماں! تیکو بالاں پسند آ گئیں چھوکری کے...... کرتا شادی؟"

"کیا بات کر رہی ہیں امی آپ......" منور نے دکھ سے ماں کو دیکھا۔

"پھر کہاں کو جانے کا پروگرام بناتے بیٹھے تھے تم؟"

"آئس کریم کھانے جائیں گے ہم۔" منور نے واضح طور پر بات بتائی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ اس کا تمہارے ساتھ جانے کو کوئی خ (حق) ہمیں بنتا۔"

"امی پلیز! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہم ایک گھر میں ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔ کوئی غیریت تو نہیں ہے ناں اس کے ساتھ...... اور پھر کیا میں کبھی ثنا کے ساتھ اکیلا کہیں گیا نہیں کیا......" منور نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر اب یہ سوب ہمیں چلے گا۔"

"مگر کیوں؟" وہ مجسم سوال تھا۔

"میں دیکھتی بیٹھی ہوں یہ ثنا تم کو دیکھ کر جان بوجھ کر ٹمی ٹمی کرتی ہے۔"

"اب کیا وہ ہنسے بھی نہیں؟" منور جھنجلایا۔

"ہاں' اب اس کو تم سے گوشہ (پردہ) کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے نہیں جا رہا میں مگر آپ اس ٹاپک پر بات ختم کریں" منور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

اور پھر شام سے پہلے آئس کریم کے ڈھیروں ڈھیر پیکٹ وہ ثنا کو دے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اور ثنا دادی پھپھو کے ساتھ آئس کریم کھاتے ہوئے خوب ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی کی آوازیں صابرہ کے دل میں غصے کے نئے طوفان کو آوازیں دے رہی تھیں۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ تیز بارش کی وجہ سے موسم میں خنکی رچ گئی تھی۔ ربیع اور اماں کب کی سو گئی تھیں مگر جمال جاگ رہا تھا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

آج شام اس نے نگین کو دیکھا تھا' ماں کے ساتھ کہیں سے واپس آئی تھی۔

'تم یہاں ہو اور میں یہاں سے جا رہا ہوں' اس نے سوچا۔

اگلی صبح وہ اماں اور ربیع کے ساتھ اسلام آباد جا رہا تھا۔ رشتے کی ایک خالہ وہاں مقیم تھیں۔ اماں چلتے وقت ے ملنے کی خواہش مند تھیں اور جمال نے ماں سے پوچھے کچھے بغیر جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

اسلام آباد سے آ کر ہفتے بھر میں کینیڈا روانہ ہو جانا تھا۔ یہ یک طرفہ محبت کی زندگی کتنی مختصر ہوتی ہے' جیسے لہ سے نکلا قطرہ...... رخساروں پر گرے اور پھسل جائے؟

لوگ تو کہتے ہیں کہ محبت اپنی جگہ خود بناتی ہے۔ تو ایسی جگہ میری محبت کیوں نہ بنا سکی؟

'تمہاری محبت میں یقیناً ایسی کمی ضرور ہو گی جس کی وجہ سے وہ بے ثمر رہی۔' دماغ نے اسے سمجھایا۔

'مگر میں نے تو بے حد دل سے اسے چاہا تھا' جمال نے اپنا تجزیہ خود کر ڈالا۔

'یہ سب نصیب کی باتیں ہیں اور محبت بھی نصیب سے ملا کرتی ہے۔'

'پھر بھی......'

اگر وہ مہربان ہوتا
تو میری آنکھ میں
نہ جھلملاتی یہ نمی ہوتی
نہ میرے دل کی وادی میں
خزاں کا قافلہ رکتا
میری بے نور آنکھوں میں
تارے قید کر دیتا
میری زخمی ہتھیلی پہ
وہ کوئی پھول رکھ دیتا
ے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر وہ یہ کہتا
بت روشنی ہے' رنگ ہے' خوشبو' ستارہ ہے
م مجھ کو محبت کی!
مجھے تو سب سے پیارا ہے
مگر ایسا وہ تب کہتا
اگر وہ مہربان ہوتا

اہ! جب قسمت ہی روٹھی ہو تو وہ مہربان کیسے ہو سکتی تھی۔ اس نے مجھے بارہا دیکھا مگر اسے میں نظر نہیں ں نے محبت بھرے لہجے میں اس سے بات بھی کی مگر میرا لہجہ بھی کسی پتھر کی طرح رہا۔ نہ وہ چونکی' نہ اس نے ات کو محسوس کیا۔

یب بات ہوتی ہے جب کوئی شخص کسی کے لیے انتہائی اہم ہو بلکہ رگ جان سے بھی قریب ہو مگر وہی سرے کے لیے ایک اجنبی سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔

ں مر بھی جاؤں...... تو نگین کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نہ آئے۔ اور اگر خدا نہ کرے نگین کو کوئی بھی

دکھ پہنچے...... نہیں نہیں اس کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہو...... ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ اس نے سوچا۔

یا اللہ میری نگین کو سلامت رکھنا" اس نے دعا مانگی۔ اگر وہ میرے نصیب میں نہ تھی...... تو نہ سہی مگر ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو ہاتھ سے پونچھا۔

کراچی میں تھا تو کبھی کبھار اس پر نظر پڑ ہی جاتی تھی۔ کینیڈا میں تو بس خیالوں میں ہی آ جائے تو بہت

وہ اپنے آپ کو جتنا دلاسا دلا رہا تھا اتنا ہی بے چین ہو رہا تھا۔

چاند کی چودھویں رات کی یہ تاثیر ہوتی ہے محبت کرنے والوں کو جگائے رکھتی ہے۔ جمال بھی جاگ رہا تھا۔

تکیے پر سر پٹختے پٹختے جب وہ تھک گیا تو یہ احساس در آیا۔

کٹھن ہے زندگی کتنی

سفر دشوار کتنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے
کبھی رستہ نہیں ملتا

ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزاروں تو
یہ روز و شب نہیں کٹتے
مجھے پھر بھی میرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں
میں ہر دکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے
محبت ہم سفر میری

(صغیر انور)

"جمال! تف ہے تم پر...... کسی کی بیوی کو اپنا ہم سفر بنانے کے تمنائی ہو۔ ڈوب مرو تم...... کیسے ذلیل شخص ہو تم" اس نے اپنے آپ کو صلواتیں سنا ڈالیں۔

"کسی کے خیال میں کوئی آ جائے تو یہ میرا قصور کہاں ہے" دل نے تسلی دی۔ "میں تو اس کو نہیں بلاتا خیالوں کے دریچوں میں خود آ بیٹھتی ہے تو میں کیا کروں؟"

"دریچے بند کر لیا کرو جمال!" یہ دماغ کی رائے تھی۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا" اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں مگر پلکوں کے کناروں پر جگنو بن کر وہ آ بیٹھی تھی...... جیسے وہ اس سے یہ کہنے آئی تھی۔

نہ پھولوں کی مالا نہ کلیوں کی بارش
خس و خار ہی ہیں محبت کا حاصل

☆☆☆

ہر کسی کے چہرے میں
اک ضیا سی ہوتی ہے
رخ کے ایک حصے میں
حسن کے علاقے کی
ایک اداسی ہوتی ہے
اس کو میں نے دیکھا تھا
گرم خو مہینوں میں
اک خوشی کی محفل میں
شہر کے مکینوں میں
اک طرف کھڑے تنہا
جس طرف کو رستے تھے
جن کے ساتھ گلیاں تھیں
جن میں لوگ بستے تھے
بے کشش مکانوں میں
جیسے چاند راتیں تھیں
اس کے سرد چہرے میں
خوشگوار آنکھیں تھیں

(منیر نیازی)

☆☆☆

زبور نے نظم پڑھ کر کتاب اپنے سینے پر رکھ لی رات کو سونے سے پہلے اسے مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ مطالعہ کرنے کی وجہ سے نیند جلدی آ جاتی تھی مگر آج تو یہ نظم پڑھ کر اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذہن وہیں جا رہا تھا جہاں وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔

مدیل سے دوستی کے بعد...... جب وہ اس کے ساتھ گرلز کالج کے سامنے کھڑا ہوتا تو سوائے نگین کے اسے [illegible] کچھ نہیں آیا کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی ہوتی تھی جو اس سے بات کرنے میں بھی آڑے [illegible]۔

کشش بھورا سی آنکھیں کھول کر جب وہ زبور کی کسی بات کا جواب دیتی تو پہلے پہلے تو وہ بات ہی بھول جایا [illegible] کہ اس سے کیا پوچھا ہے؟

خوبصورت بہت سے چہرے ہوتے ہیں مگر ان میں مقناطیسیت کم کم ہی ہوتی ہے نگین کی خوبصورتی میں

ایک طاقت بھی تھی' جب ہی میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا۔

''کیا حاصل ہوا ایسی محبت کرنے کا......'' وہ خود ہنسا۔ نہ وہ ملی اور نہ ہی اس کی یاد دل سے نکل پائی۔ وہ چلی گئی تھی تو اپنی یادیں بھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ مگر اس نے ایسا بھی نہ کیا۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' زبور کی بیوی شب خوابی کے لباس میں اندر آئی تو اس کے سینے پر دھری کتاب اٹھائی۔

''تم خود ہی دیکھ لو......'' زبور نے آنکھیں بند کر لیں۔

''ارے واہ! اس نظم میں تو میرا نقشہ کھینچا گیا ہے۔'' اس نے سرشار سے لہجے میں کہا۔

''تمہارا نقشہ......'' بے چین ہو کر زبور نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''ہماری پہلی ملاقات زینی آنٹی کے ہاں ڈنر میں ہوئی تھی ناں۔ اس تقریب میں' میں بلو سوٹ کے ساتھ بلو لینس لگائے ہوئے تھی۔ تمہاری ماما نے تم سے سرگوشی میں کہا تھا۔ زبور دیکھو' اس لڑکی کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں' تم نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔ بلیوی...... ماما کی سرگوشی میں نے صاف سنی تھی اور تمہیں مڑتے دیکھ کر مجھے فخر سا ہوا تھا' کتنا ہینڈسم بندہ مجھ سے متاثر ہو گیا ہے...... ہے ناں' یہی بات تھی ناں......؟'' وہ اعتراف چاہ رہی تھی۔

''ہاں' یہی بات تھی......'' زبور نے گہرا سانس لے کر کہا کہ اسے یہی کہنا تھا۔

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

☆☆☆

کتنے عرصے بعد فیروزہ بیگم کو سکون ملا تھا۔ فہمی اپنے گھر میں طمانیت کے ساتھ رہ رہی تھی۔ بھابی جان نے طعنے تشنے دینے کے بجائے اپنا کمرا پکڑ لیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وقت وہ اپنے کمرے میں گزارنے لگی تھیں۔ فہمی اور فہد سے بلاضرورت بات کرنے سے اجتناب کرتی تھیں۔ یہ ان کی ناراضگی کا انداز تھا یا حالات کا تقاضا ......اب وہ ان دونوں پر اپنی رائے ٹھونسا نہیں کرتی تھیں۔

نگین کی طبیعت بھی اب پہلے سے بہتر تھی۔ بچے کی گردن سے آنول نال کا چکر خود ہی نکل گیا تھا۔ تب فیروزہ بیگم کے سر سے ایک بھاری بوجھ خود ہی ہٹ گیا تھا۔

بچے کم ہوں یا زیادہ......ان سے وابستہ مسائل والدین کو خصوصاً ماں کو زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ فہمی کی پریشانی کی وجہ سے فیروزہ بے حد پریشان رہا کرتی تھیں۔

جب سے وہ اپنی سسرال گئی تھی اور فہد کی دوسری شادی کا واویلا ختم ہوا تھا وہ پرسکون سی ہو گئی تھیں۔ ہفتہ دس دن بعد وہ ماں اور بہن سے ملنے کے لیے بھی آ رہی تھی۔

بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش ہوں' ماؤں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ آج کتنے دنوں بعد انہوں نے اپنے بالوں میں ہیئر کلر لگایا تھا کمرے کی سیٹنگ چینج کی تھی' بیڈ پر نئی چادریں بچھائی تھیں۔

الماری ٹھیک کی تو اس کی درازیں بھی صاف کرنے لگیں۔ ایک خاکی رنگ کا لفافہ پلاسٹک کی تھیلی میں تہ ہوا نظر آیا تو حیرت سے اسے دیکھا۔

آخر کون سی چیز انہوں نے اتنی احتیاط سے رکھی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے میرا دماغ' خود چیزیں رکھ کر بھول جاتی ہوں'' انہوں نے اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے وہ لفافہ باہر نکالا تو وہ گوند سے بند تھا۔

''میں نے تو اسے گوند سے بند نہیں کیا' اب اتنا بھی دماغ خراب نہیں ہے'' انہوں نے لفافہ تیزی سے پھاڑا تو نینا کی دو بڑے سائز کی تصویریں ان کی گود میں آ گریں۔ اور فیروزہ کو سانپ سا سونگھ گیا۔

فہمی کی عمر اس وقت اٹھائیس سال تھی اور نگین کی بائیس سال۔ ان کی اپنی شادی کو کم و بیش تیس سال ہو گئے تھے اور یہ نینا ابھی بھی فرید احمد کی زندگی میں ہے؟

انہوں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ پینتالیس سال کی' لمبے قد کی بھرے بھرے جسم کی عورت کے چہرے پر پکی عمر کا احساس نمایاں تھا۔

''کیا عورت کو اپنی عمر کے کسی بھی حصے میں' اپنے شوہر کی جانب سے بے پروا نہیں ہونا چاہیے؟'' وہ تو شاید بھول بھی چکی تھیں مگر آج نینا کی تصویر دیکھ کر انہیں اپنی شب عروسی یاد آ گئی۔

جب فرید احمد نے انہیں نینا کی تصویر دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔ ''اس لڑکی سے میری خاصی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ میں نے امی اور آپا عظمت کو اس کے بارے میں بھی بتایا مگر جب ان دونوں نے ریجیکٹ کر دیا تو میں نے ان کی پسند سے شادی کر لی یوں بھی تم بے حد خوبصورت ہو' خوبصورتی میں نینا سے بھی زیادہ ہو۔ مگر یہ بات میں نے تمہیں اس لیے بتا دی ہے کہ میں میاں بیوی کے درمیان اعتماد کا رشتہ رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بات جواب میرے لیے ختم ہو چکی ہے' اس کے بارے میں تم کبھی سوچنا بھی مت۔''

تب فیروزہ بیگم کو فرید احمد کی سچائی اور پارسائی نے بے حد متاثر کیا۔ یوں بھی فرید احمد کا شمار ان شوہروں میں ہوتا تھا جو گھر کی ایک ایک چیز میں دلچسپی لیتے ہیں۔

فرید احمد نے اس کے بعد نینا کا ذکر اس وقت کیا تھا جب اس کی شادی حیدرآباد کے ایک بڑے تاجر سے ہو گئی تھی' تب فیروزہ بیگم کے ذہن میں تفکر کا کوئی شائبہ بھی نہیں رہا تھا۔

اور اب عرصہ دراز بعد نینا کی تصاویر دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گئیں۔

یہ تو انہیں معلوم تھا' فرید احمد گاہے بہ گاہے حیدرآباد اپنے دوستوں سے ملنے جایا کرتے تھے مگر آج انہیں یہ لگ رہا تھا' فرید احمد نینا سے ملنے کے لیے یہ سفر اختیار کیا کرتے تھے۔

شام کو فرید اپنی دکان سے ذرا جلدی آ گئے اور ٹیلی فون کا بل دیکھ کر اس کا اگلا صفحہ تو ژمروڑ کر پھینک دیا۔ فون کا بل زیادہ آ جانے پر وہ ہمیشہ واویلا مچایا کرتے تھے اور آج زیادہ بل دیکھ کر وہ کچھ نہیں بولے تھے۔

فیروزہ کو حیرت تھی اور وہ سوچ رہی تھیں' پتا نہیں کب سے اس طرح کے بل ان سے چھپائے جاتے ہوں گے اور وہ اپنے گھر میں لاعلم بنی بیٹھی تھیں۔

فرید احمد نماز پڑھنے کے لیے گئے تو انہوں نے پیپر باسکٹ سے وہ پھٹا ہوا کاغذ نکال کر جوڑا۔ حیدرآباد کا نمبر اور ایک موبائل نمبر ایسا تھا جس کی وجہ سے ٹیلی فون کا بل ہزاروں میں بنا تھا۔

شاید نینا کا شوہر مر گیا ہے......اور وہ فرید احمد کی جانب متوجہ ہو گئی ہے۔ ان کا ذہن اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آ گئیں ورنہ جب سے نگین آئی تھی' وہ اپنا کمرا چھوڑ کر اس کے پاس ہی سو رہی تھیں۔

''تم نگین کے پاس جا کر لیٹو' اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' فیروزہ کو کمرے میں اپنے تکیے سمیت آتا دیکھ

کر انہوں نے کہا۔

"نگین سو گئی ہے اور اب اس کی طبیعت بھی ٹھیک ہے۔"

"ہوں......" فرید احمد بے اعتنائی سے بولے اور نظریں ٹی وی پر جما دیں۔ جس پر ٹی وی کا بور ترین کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔

"فرید......! زندگی کے تیس سال گزر گئے اور پتا بھی نہیں چلا۔" فیروزہ نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں......" وہ چشمہ اتار کر اس کے شیشے پر بلاوجہ پھونکیں مارنے لگے۔

"چند ہفتوں بعد ہم نانی' نانا بھی بن جائیں گے۔"

"ہوں......" جمائی بھر کر آلکس بھرے انداز میں انہیں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اس وقت اس بکواس کی کیا ضرورت ہے؟

"ہاں' یاد آیا......شادی سے پہلے آپ کی ایک دوست تھی......اب تو وہ بھی نانی' دادی بن چکی ہوگی۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا......؟" فیروزہ اپنے سر پر ہاتھ رکھے کمال اداکاری سے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں' نینا تو ابھی دادی نانی نہیں بنی......" وہ بے ساختہ بولے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" انداز جارحانہ تھا۔

"اس کا شوہر شوکت میرے دوست کا دوست ہے۔ اسی سے پتا چلتا رہتا ہے۔ اس کے ماشاءاللہ چار بیٹے ہیں۔" فرید احمد کے لہجے میں تفاخر نمایاں تھا۔

"کراچی میں ہی رہتے ہیں وہ لوگ......؟" بے پروائی سے پوچھا گیا۔

"نہیں' حیدرآباد میں رہتے ہیں۔"

"کبھی ملاقات ہوئی نینا سے؟"

"ہاں' کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔ بے حد نائس عورت ہے۔ میری بیماری کا سن کر تو وہ گھنٹوں روتی رہی تھی۔ میں تو اسے چپ کراتے کراتے ہلکان سا ہو گیا تھا۔"

"کیوں روتی رہی' اس کا آپ سے تعلق ہی کیا ہے؟"

"فیروزہ بیگم! تم کم پڑھی لکھی عورت ہو' تم کیا جانو دوستی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ نینا میری بہت اچھی دوست ہے۔ اس سے بات کر کے میں جتنی طمانیت محسوس کرتا ہوں' تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ مگر وہ میری صرف دوست ہے' بے لوث دوست!"

"نینا کے شوہر سے بات چیت کر کے آپ کو خوشی نہیں ہوتی کیا؟" فیروزہ نے غصے سے کہا۔

"میری دوستی تو شروع سے ہی نینا کے ساتھ تھی۔ وہ تو تم بیچ میں آ گئیں جو ہماری شادی نہیں ہو سکی۔ پھر اس کی بھی شادی ہو گئی' اب عرصۂ دراز بعد وہ مجھے ملی ہے تو صرف دوست بن کر۔ اپنے گندے ذہن میں کوئی اور بات مت لانا......ورنہ دوستی کا پوتر رشتہ بدنام ہو جائے گا۔" فرید احمد ناصحانہ انداز میں انہیں سمجھا رہے تھے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں' مرد اور عورت کی دوستی واقعی بڑا مقدس رشتہ لیے ہوتی ہے۔ مگر اس دوستی میں آپ نے مجھے کیوں نہیں شریک کیا' نینا نے اپنے شوہر کو کیوں نہیں ساتھ رکھا؟"

"وہ اس لیے کہ تم لوگ ہماری بے لوث دوستی کی نہج تک پہنچ ہی نہیں سکتے ہو۔"

تب فیروزہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتار لیا تھا۔

اگلے دن انہوں نے نینا کے موبائل پر فون کیا۔ ان کا نمبر سی ایل آئی پر دیکھ کر وہ جلدی سے بولی "فرید! کل کہاں تھے تم' کتنا انتظار کروایا تم نے' کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"میں مسز فرید بول رہی ہوں۔" چند لمحے توقف کے بعد وہ بولیں۔

"اچھا......تم......فیروزہ! کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہی ہوں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ بچوں اور شوہر کی موجودگی کے باوجود آپ میرے شوہر پر کیوں صدقے واری جا رہی ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی فیروزہ کے لہجے میں تلخی گھل سی گئی۔

"فیروزہ پہلے تو تم یہ جان لو' میں تمہارے درمیان نہیں آئی ہوں بلکہ تم ہمارے درمیان آئی تھیں۔ فرید کالج کے زمانے سے ہی مجھ سے محبت کرتے تھے اور میں بھی ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی مگر حالات کا ستم فرید کی شادی تم سے ہو گئی' مگر میں نے ہر رشتے کے لیے انکار کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی فرید کی خواہش تھی جو میں نے شوکت سے شادی کر لی۔"

"مجھے افسوس ہے نینا! تمہاری شادی فرید احمد سے نہیں ہوئی مگر اب جب تم چار بچوں کی ماں بن چکی ہو تو تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ مخلص رہنا چاہیے نا کہ دلی طمانیت حاصل کرنے کے لیے دوسروں کے شوہر کو پکارتی پھرو۔"

"تم سے شادی کر کے فرید کو سوائے پریشانیوں کے حاصل ہی کیا ہوا ہے؟ دو بیٹیاں اور ان کے دو ہزار مسائل......!"

"الحمدللہ' ہم بہت خوش ہیں۔ یہ نرمی اور گرمی تو ہر ایک کی زندگی میں آتی ہے مگر خدانخواستہ ہمارے مابین کوئی ایسا خلا نہیں ہے جس کو پاٹنے کے لیے تمہاری ضرورت پڑے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو ناں' تمہیں کیا پتا' محبت کیا ہوتی ہے۔ تم تو فرید احمد سے کبھی محبت کر ہی نہیں سکیں۔ وہ مجھ سے بات کر کے جتنا سکون حاصل کرتے ہیں' اتنا تمہاری قربت میں بھی حاصل نہیں کرتے" اب نینا ہنس رہی تھی۔

"سنا تھا......مگر آج پہلی مرتبہ اس حقیقت کا اندازہ ہو رہا ہے کہ شادی شدہ عورتیں بھی بدمعاش ہوا کرتی ہیں۔ انہیں محبت' طمانیت اور دوستی کے پردے میں بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر میں تمہاری حقیقت تمہارے شوہر سے بیان کر دوں تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری......؟" فیروزہ نے اسے ڈراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں ہے' تم کہہ دو' زیادہ سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتا ہے؟ ایک گولی مجھے مار دے گا اور دوسری گولی فرید احمد کو۔ الٹے دماغ کا آدمی ہے وہ' ذرا سی بات بھی برداشت نہیں ہے اسے۔ پھولوں اور ستاروں کی زبان سے تو ناآشنا ہے وہ۔ ریوالور لے کر تو وہ سویا کرتا ہے۔ اچھا ہے' یہاں نہیں تو اگلے جہان میں ہم ساتھ اتھ چلے جائیں گے۔"

ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے وہ پسینے پسینے ہو چکی تھیں اور سوچ رہی تھیں' واقعی! وہ ایک پاگل عورت ہے۔ جس عورت کو اپنے نقصان کی پروا نہ ہو' وہ کیا کسی دوسرے کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ زندگی کے بعض چیزیں کیسے مواقع پر لگتے ہیں؟ ایسے میں نہ کوئی اپنے زخم کسی کو دکھا سکتا ہے' نہ رو سکتا ہے' نہ واویلا مچا سکتا ہے۔

’اب مجھے دکھ کا یہ زہر خاموشی سے ہی پینا ہوگا۔ اس کی بھنک بھی میری بیٹیوں کو نہیں ملنی چاہیے‘ فیروزہ پانی کا یخ گلاس چڑھا کر سوچ رہی تھیں۔ ’ایسے ذلیل باپ کے کرتوت تو پتا لگنے چاہئیں۔ وہ بیٹیاں جو ابو جی ابو جی کہتے ہوئے تھکتی نہیں ہیں‘ انہیں بھی تو پتا چلے‘ ان کا باپ کیسا ہے؟ بڑھاپے میں بھی لچا لفنگا سا‘ ان کے دل نے انہیں سمجھایا۔

’نہیں‘ ایسا ہرگز مت کرنا...... اگر تم نے باپ کے خلاف بیٹیوں کو کچھ بتایا تو ان کے دل میں اپنے باپ کی عزت ختم ہو جائے گی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی‘

’’تو پھر میں کیا کروں...... کس سے کہوں‘ کس کو بتاؤں‘ کس سے مشورہ لوں...... کروں تو کیا کروں؟‘‘ ان کی آنکھوں سے سیلاب امڈ آیا۔

’’امی! ایک گلاس ملک شیک ملے گا کیا؟‘‘ نگین نے اپنے کمرے سے لاڈ بھری آواز لگائی۔

فیروزہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ پانی کی بوتل منہ سے لگائی اور وہیں سے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔ ’’جانو......! ابھی لائی تمہارے لیے شیک ...... اور اگر کہو تو فرنچ فرائز بھی لے آؤں؟‘‘

’’پھر تو مزہ آجائے گا......‘‘ نگین کی چہکار لیتی آواز انہیں سنائی دی۔

’’بس ابھی لاتی ہوں‘ اتنے میں تم فریش ہو لو۔‘‘

’’او کے مام!‘‘

اور چند منٹوں بعد وہ اپنی بیٹی کو بڑے پیار سے جوس پیتے دیکھ رہی تھیں۔ یہ قطعی دوسری بات تھی کہ ان کے آنسو ان کے دل پر گر رہے تھے۔

☆☆☆

یوں غلط تو نہیں چہروں کا تاثر بھی مگر
لوگ ویسے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

اشرف‘ فرح کا ہاتھ تھامے جب گھر میں داخل ہوا تو دونوں کے چہروں پر شگفتگی سی تھی۔

’’ارے میرا بچہ‘ کتنے دنوں بعد آیا ہے‘‘ اماں نے لپک کر اشرف کو گلے لگایا۔

’’ماشاء اللہ کتنا سوہنا لگ رہا ہے میرا پتر!‘‘ نانی اماں نے بھی ماتھے پر بوسہ دے کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا۔

’’تمہاری بہو کچھ کم پیاری لگ رہی ہے۔‘‘ اشرف نے محبت آمیز نظروں سے فرح کو دیکھتے ہوئے کہا جو شاکنگ پنک سوٹ میں کسی کھلے ہوئے گلاب کی طرح تر و تازہ سی تھی۔

’’ہاں تو بھی میرے پاس بیٹھ‘ کتنے ڈھیر سارے دن ہو گئے تم دونوں کو دیکھے ہوئے۔ نانی امان نے بحالت مجبوری فرح کو بھی اپنے پلنگ پر بٹھا لیا۔

’’نہ کوئی خط نہ کوئی فون‘ تجھے ہم لوگ کیا یاد نہیں آئے؟‘‘ اماں نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

’’اماں‘ وہ دس دن چٹکی بجاتے میں گزر گئے‘ جب بس میں بیٹھا ہوں‘ تو پھر آپ سب لوگ مجھے بے تحاشا یاد آنے لگے۔ وہاں سے کیسے خط لکھتا تم کو‘‘ اشرف کھلکھلاتے ہوئے بولا۔

’’مری میں مزہ آیا یا اکیلا جا کر بور ہوا؟‘‘ بڑی آپا آہستہ آہستہ اسے اصل موضوع کی طرف لا رہی تھیں۔

’’بور کیوں ہونا تھا‘ ہم تو گئے تھے ہی سیر کرنے‘ خوب مزہ آیا۔ ایسا لطف تو کبھی نہیں آیا‘ جتنا اس باری آیا ہے۔‘‘ اشرف نے چور نظروں سے فرح کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ہاں ہاں‘ کیوں نہ لطف آتا‘ جورو جو ساتھ گئی تھی تمہارے‘‘ نانی اماں کھانسی کی ہمراہی میں بولیں۔

’’اور کیا کیا دیکھا مری میں ...... اور کیا کیا دکھایا لوگوں کو......؟‘‘ اماں نے بڑی آپا کی کہنی کا مطلب سمجھ کر اسٹارٹ لیا۔

’’اماں! جب ہم مری پہنچے‘ وہاں اتنا رش تھا‘ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اتنا رش‘ اتنی گہما گہمی میں بتا نہیں سکتا آپ کو‘ لگتا تھا پورا پاکستان ہی وہاں آیا ہوا ہے۔‘‘ اشرف سرشار لہجے میں بولا‘ بہنوں کے باہم اشارے اور اماں کا طنز بھرا لہجہ وہ سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔

’’اس گھوڑی کو گھوڑے پر بٹھانے کی کیا ضرورت تھی‘‘ چھوٹی آپا سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔

’’آپ کو کیسے پتا چلا‘ فرح نے گھوڑے کی سیر کی تھی؟‘‘

’’تمہاری یہ ننگ حرکتیں‘ اخبار والوں نے بھی چھاپ دیں‘‘ اماں نے اپنے سرہانے سے مڑا تڑا اخبار نکال کر اشرف کو دکھایا۔ سنڈے ایڈیشن میں فرح اور اشرف کی بڑی سی رنگین تصویر اخبار میں جگمگا رہی تھی۔

’’اللہ کتنی خوبصورت تصویر آئی ہے فرح تیری‘‘ اشرف نے جھپٹ کر اخبار دیکھا اور پھر فرح کو دکھانے لگا۔

’’ڈوب نہ مرے یہ بے عزتی کروانے سے پہلے؟‘‘

’’واہ بھئی واہ! آپ لوگ بھی خوب سوچتے ہو‘‘ اشرف دل کھول کر ہنسا۔ ’’اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے‘ مری میں ہزاروں لوگ گھوڑے کی سیر کرتے ہیں۔ اب اگر ان ہزاروں لوگوں میں سب کو فرح اچھی لگی تو اس میں فرح کا کیا قصور......! یہ تو فخر کی بات ہے‘ فرح کیسی شہزادی سی لگ رہی ہے۔ اتنی لڑکیاں اس کے بالوں کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھیں کہ اصلی ہیں یا نقلی۔ کاش! آپ لوگ وہاں ہوتے تو یہ بھی دیکھتے‘ لوگوں کا ہجوم ہم لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا‘ تالیاں بجا رہا تھا۔ جیسے ہم کسی ملک کے بڑے بادشاہ ہوں۔‘‘ اشرف فخر اور سرشاری میں بیان کر رہا تھا۔

’’مگر اپنی اوقات تو تم جانتے ہی ہو ناں‘ اس چھوٹے سے گاؤں میں کریانے کی دکان ہے۔ نہ تم بادشاہ ہو اور نہ ہی فرح ملکہ! یہ کیسے تم بھول گئے وہاں جا کر؟‘‘

’’ہاں‘ یہ تو ہے‘‘ اشرف کھسیا سا گیا۔

’’اگر کوئی تصویر کے بارے میں پوچھے تو مکر جانا اور کہہ دینا‘ یہ ہماری تصویر نہیں ہے بلکہ اپنا مری جانے کا بھی نہیں بتانا‘ کہہ دینا کراچی گئے تھے۔‘‘

’’ٹھیک ہے اور کوئی حکم......؟‘‘ اشرف خفیف سا ہو کر اپنا رومال اپنی گردن میں باندھنے لگا۔

’’بیوی کے اشاروں پر چلو گے تو بے عزت ہو گے۔ بیوی کو بیوی سمجھو‘ پیر کی جوتی کو سر پر مت رکھو‘‘ اماں نے غصے سے کہا۔

’’بیوی تو اپنی ساتھی ہوتی ہے۔ سنگی ساتھی بن کر ساتھ رہتی ہے۔‘‘ دوست کا سبق ابھی وہ بھول نہ پایا تھا۔

’’وہ کوئی اور ہوتی ہوں گی‘ پر یہ نہیں ہے ایسی‘‘ اماں نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اشرف نے فرح کو دیکھا‘ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ بس سے اترے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی وہ کیسے بھول سکتا تھا کہ فرح سے کوئی وعدہ بھی کیا تھا۔

’’فرح ایسی نہیں ہے، بہت اچھی ہے۔ آپ لوگوں نے اس کی جان عذاب کر رکھی ہے۔ مت کریں ایسا ظلم اس پر، آپ بھی بیٹی والی ہیں۔‘‘

فرح کے آنسو بے آواز اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

’’یہ آنسوؤں کا سمندر اس کے سامنے بہانا، اکیلے میں لٹاتا یہ مگرمچھ کے آنسو۔ ہم پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا‘‘ بڑی آپا نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا۔

’’چلو فرح! اپنے کمرے میں، ابھی تو راستے کی تکان بھی نہیں اتری تھی، ان لوگوں نے لے کر موڈ آف کر دیا‘‘ اشرف اس کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ فرح چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی۔

’’ارے مری سے تو یہ فسوں کا جوڑا بن کے آیا ہے‘‘ نانی اماں نے ہنس کر کہا۔

’’ہونہہ...... پتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ ہنی مون منانے اکیلے اڑ گئی۔ کوئی جایا کرتا ہے اس طرح...... یوں، جیسے یہ نکل گئی، بھری سسرال سے۔‘‘

’’اس جیسی حرافہ کوئی اور ہو گی بھلا؟‘‘

’’آج کی لڑکیاں دس منٹ میں قابو کر لیا کرتی ہیں اپنے میاں کو۔ اس کو تو پھر چند مہینے لگے ہیں۔‘‘

’’مجھے خبر ہوتی کہ یہ اتنی علامہ (چالاک) ہو گی تو کبھی اپنے گھر نہ لاتی۔‘‘

’’اب آئی ہے یہ لائن پر، ابھی تو اس سے زیادہ تمہیں دیکھنے کو ملے گا‘‘ نانی اماں نے ڈرایا۔

’’اب اور کیا دیکھوں گی، یہی دیکھ کر میرا کلیجا پھٹا جا رہا ہے‘‘ اماں نے غصے سے کہا۔

’’تمہارے تین بھائی ہیں، کسی ایک نے مجھے نہیں رکھا۔ آخر اب) اپنا وقت بیٹیوں کے ہاں گزار رہی ہوں یا نہیں۔ تین مہینے ایک کے ہاں، تو تین مہینے دوسری کے ہاں اور جب بیٹیاں بھی گھبرا جاتی ہیں تو زیادہ عرصے تمہارے ہاں رہنا پڑتا ہے۔‘‘

’’اماں، کیا واقعی میرے ساتھ بھی ایسا ہو گا‘‘ اماں کے آنسو اب بھل بھل بہہ رہے تھے۔

’’میرے تو تین بیٹے تھے...... تو انہوں نے نہیں رکھا۔ تمہارا تو اکلوتا ہے، وہ تو ہرگز نہ رکھے گا‘‘ نانی اماں نے سفاکی سے کہا۔

اب اماں بڑی آپا کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔

☆☆☆

ایک ہی گھر میں رہیں اور فاصلہ صدیوں کا ہو
اس جہاں میں اس طرح کے ضابطے بھی ہوتے ہیں

شائستہ بیگم کی پرانی ملنے والی مسز علی بہت عرصے بعد ان سے اسپتال میں ملی تھیں۔ جب انہیں سائرہ کی طلاق کی بابت پتا چلا تو انہیں بے حد افسوس ہوا اور آج وہ ان سے ملنے کے لیے شائستہ بیگم کے پاس آئی تھیں۔ سائرہ اسکول سے آ کر کھانا کھا کر لیٹی ہوئی تھی جبکہ شائستہ بیگم ہاتھ میں تسبیح لیے پتا نہیں کیا کچھ سوچ رہی تھیں۔ اپنے بارے میں، سائرہ کے بارے میں اور فریال کے بارے میں۔ اس تکون میں کسی سمت کہیں سے کوئی چین اور سکون انہیں میسر نہیں تھا۔

مسز علی کو اپنے گھر یوں اچانک دیکھ کر وہ خاصی حیران بھی تھیں۔ ان کا دل چاہا کہ وہ انہیں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھائیں۔ برق رفتاری سے انہوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ وہاں صوفے پر ثریا اپنی ہن کے ساتھ بیٹھی راز دارانہ لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔

’’اماں، میں اپنی بہن سے باتیں کر رہی ہوں، کیا بات ہے؟‘‘ انہوں نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’کچھ نہیں......‘‘ وہ واپس پلٹ آئیں اور ایک نظر لاؤنج میں صابرہ کو دیکھا جو ساس اور ان کے ساتھ آئی مہمان کو کانی نظروں سے دیکھنے کے باوجود ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھنے میں محو تھیں۔

’’شائستہ، میں آپ کے کمرے میں بیٹھنا چاہوں گی۔‘‘ مسز علی چند لمحے توقف کے بعد خود ہی گویا ہوئیں۔ وہ ان کی دونوں بہوؤں کے انداز دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں، ان کی نظر میں ساس کے مہمان کی کوئی قدر قیمت نہیں ہے۔

مسز علی کو لے کر وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ جہاں دو بیڈ، ایک کرسی اور ایک چھوٹی میز پورے کمرے کی بوں حالی کی تصویر کھینچ رہی تھی۔

مسز علی خود ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں اور سائرہ سے اس کے اسکول کے بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔ سائرہ دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی اور مسز علی بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھیں۔

’’تمہارا کیا خیال ہے، تم بطور ٹیچر زیادہ کامیاب رہ سکتی ہو یا اپنا اسکول زیادہ کامیابی سے چلا سکتی ہو؟‘‘

’’میرا اپنا اسکول ہو گا تو میں اس میں وہ خامیاں نہیں رہنے دوں گی جو بطور ٹیچر میں اپنے اسکول سے ختم نہیں کروا سکتی۔‘‘

’’تو پھر تم اپنا اسکول کیوں نہیں کھول لیتیں......؟‘‘ مسز علی نے پوچھا۔

’’میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے، یہ باتیں میں تصور میں تو ضرور سوچ سکتی ہوں مگر حقیقت میں عملی جامہ نہیں پہنا سکتی۔‘‘

سائرہ چائے بنانے کے لیے اٹھ کر باہر گئی تو مسز علی نے شائستہ بیگم سے کہا ’’میرا تمہارا برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ چند برسوں میں، میں اپنی مصروفیات کے سبب ملک سے باہر رہی تو تم سے بے خبر ضرور رہی ہوں مگر ایسا ہرگز نہیں کہ تم مجھے نہ جانتی ہو یا میں تم سے بے بہرہ رہی ہوں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ہے، ہم تو ایک عرصے تک ایک دوسرے کے پڑوسی بھی رہے ہیں۔‘‘

’’بس اسی امید کو لے کر میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ میری بہو ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئی ہیں۔ اس کی دو پیاری پیاری نشانیاں میرے پاس ہیں۔ میرا بیٹا اپنی بچیوں کی وجہ سے دوسری شادی کرنے میں ہچکچاتا ہے، اس کا خیال ہے کہ سوتیلی ماں میرے بچوں کو پیار نہیں دے سکے گی۔ وہ ایک بڑا پرائیویٹ اسکول چلا رہا ہے۔ صبح جب وہ اسکول جاتا ہے تو بچوں کی آیا بچیوں کو ساتھ لے کر اس کے ساتھ جاتی ہے۔ شائستہ! میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے، کیسے سوتیلے بچوں کو تم نے محبت سے پالا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ وصف تمہاری بیٹی میں بھی ضرور ہو گا۔‘‘

’’اس سلسلے میں، میں کیا کہوں...... مجھے اپنے بیٹوں سے رائے لینی ہو گی‘‘ شائستہ بیگم نے ایک آہ کے ساتھ کہا۔

’’اور اگر انہوں نے تمہاری بات نہیں مانی تو......؟‘‘

’’پھر میں تم سے معذرت کر لوں گی۔‘‘

’’تم ماں ہو، کیا تمہاری رائے کا کوئی احترام تمہارا بیٹا نہیں کرتا؟‘‘

’’پتا نہیں......‘‘ شائستہ بیگم کے بے آواز آنسو ان کے چہرے پر پھسلنے لگے۔

''کیا تم سائرہ کی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتیں؟''

''یہ میری دلی خواہش ہے' میری بیٹی اپنے گھر میں جا کر آباد ہو' اس کا اپنا گھر ہو' جہاں اس کا شوہر ہو' بچے ہوں اور میں اس کی یہ خوشیاں دیکھوں۔''

''تو کیا تمہیں میرا بیٹا بلال اس وجہ سے پسند نہیں ہے کہ اس کے پاس دو بچیاں ہیں۔''

''نہیں' یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر بات کیا ہے...... تمہیں بلال پسند بھی ہے اور پھر بھی یہ رشتہ قبول کرتے ہوئے تم اتنی ہچکچا کیوں رہی ہو؟''

''اصل بات یہ ہے کہ میرے بیٹے نہیں چاہتے کہ اب سائرہ کی شادی ہو۔''

''کیوں' وہ اپنی بہن کے لیے ایسا کیوں سوچتے ہیں؟''

''وہ اس کی پہلی شادی کی ناکامی سے ڈر گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دوسری شادی اگر ہوئی تو وہ بھی ناکام ہوگی اس لیے اس جھنجٹ ہی میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

''شائستہ' ایک ماں ہو کر بھی تم نے اپنے بیٹوں کا یہ فیصلہ کیوں قبول کر لیا ہے۔''

''وہ اس لیے کہ میں شاہنواز اور دلنواز کو چھوڑ کر جی نہ پاؤں گی۔''

''ان دونوں کو میں نے جنا تو نہیں ہے مگر ان کو پالا ہے اور پالنے والے کے دل میں بھی محبت کسی طرح کم نہیں ہوتی ہے۔''

''تو کیا سائرہ کے ساتھ اس ناانصافی پر تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوگا۔''

''دکھ ہے اور ہمیشہ رہے گا...... مگر میں سوائے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے کچھ نہیں کر سکتی۔''

''اگر سائرہ کی نیا پار لگنی ہے تو وہ قادر مطلق ایسا ضرور کچھ کرے گا اور اگر اسے ہی منظور نہیں ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' شائستہ بیگم اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولیں۔

اور دروازے پر اچانک آیا ہوا شاہنواز چند لمحے سوچ کر اندر کمرے میں آ گیا۔

''السلام علیکم آنٹی......!'' وہ مسز علی کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

''امی! آپ آنٹی کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ جائیے ناں......'' شاہنواز نے کہا۔

''بیٹا! میں خود شائستہ کے کمرے میں آئی ہوں' یوں بھی بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے ان سے۔''

''آنٹی! آپ بلال کو لے کر کیوں نہیں آئیں؟ میں نے تو بہت عرصے سے اسے دیکھا تک نہیں ہے۔''

''بیوی کے مرنے کے بعد وہ کہیں آتا جاتا ہی نہیں ہے۔ بس ہر وقت گھر میں رہتا ہے۔ اسکول بھی پتا نہیں کیسے چلا جاتا ہے۔''

''بلال کو ہمارے گھر تو آنا پڑے گا بلکہ یوں کیجیے آئندہ ویک آپ بلال' اس کی بچیوں سمیت ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گی۔''

''بیٹا' میں بلال سے پوچھ کر بتاؤں گی۔''

''نہیں' آپ بلال کو لے کر ہر صورت میں ہمارے گھر آئیں گی' جب ہی تو ہماری امی آپ کی بات پر ہامی بھریں گی......'' شاہنواز نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

شائستہ بیگم نے ایک نظر بیٹے کو دیکھا' اس کے چمکتے مسکراتے چہرے پر بہت کچھ تھا۔ بے ساختہ انہوں نے

اپنے سینے سے لگالیا۔

میرے بچے' محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی۔'' اگر مجھے تم بھائیوں سے محبت ہے' تو تمہارے دل بھی میری ہت سے لبریز ہیں۔''

''نہیں امی! ہم دونوں ہی ناخلف اور نافرمان ہیں اور آپ تو بہت اچھی ہیں' بہت ہی اچھی۔''

تب مسز علی نے بھی اپنی آنکھوں میں آتے آنسو اپنی ساڑی کے پلو سے پونچھ لیے اور ایک طمانیت بھری سکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

☆☆☆

جتنے رستے ہیں انجانے دیس کو جاتے ہیں
جانے والو! پیچھے پیچھے ہم بھی آتے ہیں
کچھ میرے تیرے دکھ ہیں' کچھ دکھ ہیں ہم سب کے
اولے پتھر برسا کے آنسو بن جاتے ہیں
اپنی اپنی مجبوری ہے جو جس کا ہو جائے
سچ پوچھو تو جھوٹے سارے رشتے ناتے ہیں

(شبنم رومانی)

☆☆☆

ربیع اسلام آباد آ کر بے حد خوش تھی۔ ملیحہ اور مدیحہ اس کا حد سے زیادہ خیال رکھ رہی تھیں۔ روزانہ ہی وہ اس لے کر کہیں نہ کہیں نکل جاتیں۔ کبھی شکر پڑیاں تو کبھی دامن کوہ۔ پھر چپے چپے کی مووی بنائی جاتی۔

ربیع جو اپنے پیر کی وجہ سے کہیں آنے جانے میں دلچسپی کھوتی جا رہی تھی' مدیحہ اور ملیحہ کی وجہ سے وہ پہلی والی بن گئی تھی۔ جمال اپنی بہن کو یوں ہنستا مسکراتا دیکھ کر از حد خوش ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں' آپ لوگ اتنے عرصے کراچی میں کیوں رہتے رہے۔ یہاں اسلام آباد میں شفٹ ہو جانا چاہیے ب کتنا مزہ آتا'' ملیحہ نے ربیع سے کہا۔

''ہاں واقعی' میں بھی یہی سوچ رہی ہوں' کیوں بھائی!''

''کراچی سے تو میرے دل کا ناتا ہے'' جمال دل ہی دل میں ہنس کر مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اس بات کا تو اس پاس جواب ہی نہیں تھا۔

اسلام آباد آئے ہوئے جمال کو تین دن ہو گئے تھے۔ ان کی صنوبر خالہ ان کے آنے سے بے حد خوش تھیں۔

صنوبر خالہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹیاں ربیع کی ہم عمر اور بیٹے جمال کے ساتھ کے' اعلیٰ تعلیم یافتہ' اعلیٰ پوسٹ پر فائز اور عمدہ اخلاق کے۔

جمال کی امی صنوبر خالہ کی چچا زاد بہن ہوتی تھیں۔ ایک طویل عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ صنوبر عرصہ ۲۰ سال سے اسلام آباد میں مقیم تھیں۔ کراچی آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا اور اب سب ایک دوسرے سے مل کر خوش

ربیع کے آنے سے تو میرے گھر میں حقیقی معنوں میں بہار آ گئی ہے۔ کس قدر شگفتہ مزاج بچی ہے۔ اس کے نے سے تو ہر طرف قہقہوں کے پھول کھل اٹھے ہیں۔

صنوبر اپنی خوشی اور پسندیدگی کا برملا اعتراف کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی ربیع کے پیر کے بار میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس کے باوجود جمال کی والدہ نے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا ذکر کیا۔

"آپ کو تو اللہ کا شکر کرنا چاہیے' اللہ تعالیٰ نے آپ کی پھول سی بچی کو بچا کے رکھا۔ خدانخواستہ اگر اس ہو جاتا تو...... یہ غم زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا۔"

"ڈاکٹر کہتے ہیں' اس کے پیر کا یہ لنگ بھی ٹھیک ہو جائے گا" جمال کی امی ربیع سے متعلق ہر بات وضا سے کر رہی تھیں۔

"اگر نہ بھی ٹھیک ہو تو کیا ہوا۔ آج کل کی لڑکیاں اونچی ہیلیں پہن کر بھی لہراتی ہوئی چلتی ہیں" صنوبر نے ہنس کر کہا۔

اور ربیع کے من میں دور تک طمانیت کے قمقمے روشن ہو گئے۔ یہ پہلا گھرانا تھا جہاں ربیع کے اس عیب کو نہیں بنایا گیا تھا۔ صنوبر خالہ کی بڑی لڑکی تو ربیع کے ساتھ اتنی کلوز ہو گئی تھی کہ اس نے ربیع سے یہاں تک کہا

"تم اپنے بھائی کے ساتھ کینیڈا مت جاؤ' ہمارے گھر رہ جاؤ۔"

"ہم دو سال میں آ ئیں گے۔ اس طرح اکیلی میں آپ کے گھر کیسے رہ سکتی ہوں؟" ربیع نے حیرانی پوچھا۔

"آخر ہم کزن ہیں' رہنے میں مضائقہ بھی نہیں ہے۔"

"میں اپنی امی اور بھائی کے بغیر کہیں نہیں رہ سکتی۔"

"اچھا تو پھر تم مجھے اپنے ساتھ کینیڈا لے چلو" ملیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کینیڈا جانے کو دل چاہتا ہے؟" اب ربیع سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں' مجھے یہ خوبصورت ملک بہت امپریس کرتا ہے' میرا دل چاہتا ہے ہمیشہ وہاں رہوں۔"

"پھر اس کی ایک ہی صورت ہے' تمہاری شادی کینیڈا میں ہو جائے" ربیع نے مسکراتے لبوں سے کہا شرم سے گلنار ہو گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ' تم اپنے ہونے والے شوہر میں کیا کیا خوبیاں دیکھنا پسند کرو گی؟"

"تعلیم یافتہ ہو' اپنے خاندان سے ہو تو کیا کہنے۔ دراز قد ہو' چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ گندمی رنگت ہو' اچھی ہو۔ فیملی چھوٹی ہو کیونکہ بڑی فیملی کے مسائل بھی زیادہ ہوتے ہیں اور پھر سیدھے سادے لوگ ہوں' محبت والے۔"

ربیع کو یوں لگا جیسے وہ جمال کو پسند کر بیٹھی ہو اور اس کو دیکھ کر اپنے تصوراتی پیکر میں رنگ بھر رہی ہو۔ جمال گندمی رنگت کا چھ فٹ دو انچ کا سیدھا سادا سا لڑکا تھا جسے بناوٹی باتیں کرنا پسند نہیں تھیں جو ہ سچائی سے اور ایمانداری سے کرنے کا عادی تھا۔

صنوبر خالہ کے دونوں بیٹے ارباز اور وقاص جمال کو نہ صرف کمپنی دے رہے تھے بلکہ ان کا مشورہ بھی کینیڈا سے آنے کے بعد جمال اسلام آباد کی کسی فرم کو جوائن کر لے جہاں اسے مزید بہتر مراعات ہوں گی۔

"جس کمپنی سے میرا معاہدہ ہوا ہے' میں اسے بیچ میں ختم نہیں کر سکتا کہ یہ بے اصولی ہو گی' جن کے خر

نیڈا جاؤں' واپس آ کر انہیں دھوکا دوں۔"

"آج کل ہر جگہ' ہر شخص اپنا فائدہ دیکھتا ہے" ارباز نے کسی ماہر وکیل کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھتے ہوں گے مگر میرے جیسے سر پھرے لوگ بھی ضرور ہوں گے جو اپنی بات کی صداقت کو پہلے اہمیت تے ہیں۔"

"بیٹا' دو سال کے لیے جا رہے ہو تو شادی کر کے جاؤ۔ تمہاری ماں کو بھی دوسراہٹ رہے گی۔" صنوبر خالہ ام کا حلوہ جمال کو دیتے ہوئے کہا۔

"جب تک ربیع کی شادی نہیں ہو گی' اس بارے میں' میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"مگر تم تو ربیع سے بہت بڑے ہو' تمہاری پہلے شادی ہونی چاہیے۔"

"ربیع میری ذمے داری ہے' ہر بھائی پہلے اپنی ذمے داری کو پوری کرتا ہے۔"

"اگر میں ربیع کی یہ ذمے داری لے لوں تو کیا پھر تم پہلے شادی کر لو گے" صنوبر خالہ نے صاف گوئی سے

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا؟"

"میں ہر بات صاف صاف کہنے کی عادی ہوں۔ لگی لپٹی کرنا مجھے پسند نہیں ہے اس لیے میں تمہیں اپنا سمجھ کر ہی ہوں۔" وہ اپنی بات کہہ کر چپ ہو گئیں جیسے اس کے چہرے کا ردعمل دیکھ رہی ہوں۔

"جی کہیے......" وہ اپنی سماعتوں کے ساتھ ان کی جانب متوجہ تھا۔

"تم ملیحہ سے شادی کر لو...... اور شادی کر کے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ دو سال کے بعد جب تم اپس لوٹو گے تو ربیع کی شادی میں اپنے بھانجے سے کروا دوں گی۔"

"اپنے بھانجے سے کیوں کروا دیں گی؟" جمال نے حیرت سے پوچھا۔ یہ کیسی ماں تھی جو اپنے بیٹے کے اپنے بھانجے کو فوقیت دے رہی تھی؟

"میں نے اپنی مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا' رشید کی شادی میں کراؤں گی۔"

"کیوں' ان کی شادی ہونا کیا کوئی مسئلہ تھا......؟" یکبارگی جمال کے ذہن میں یہ بات آئی تو اس نے پوچھ

"رشید بہت اچھا لڑکا ہے۔ راولپنڈی میں بڑے سے مکان میں تن تنہا رہتا ہے۔ چار دکانوں کا کرایہ آتا ہیں تیس ہزار کی آمدنی کوئی کم تھوڑی ہوتی ہے۔"

"وہ خود کوئی کام نہیں کرتا' صرف کرائے پر قانع ہے؟" جمال کے حیرت آمیز لہجے میں طنز کا رنگ بھی کمل

"ایک تو اسے ضرورت نہیں ہے' دوسرے وہ پولیو کا مریض ہے۔ سارا دن وہیل چیئر پر بیٹھا مزے سے ٹی پروگرام دیکھتا رہتا ہے۔" لفظ "مزے" کو انہوں نے اس طرح استعمال کیا جیسے وہ اس کی اضافی قابلیت

"کیا آپ ربیع کی شادی ایسے شخص سے کرنا چاہتی ہیں؟"

ہاں' برائی کیا ہے؟ خاندان کا لڑکا ہے۔ یہ دکھ سکھ تو کسی کی زندگی میں بھی آ سکتے ہیں۔ آج میں اپنی بیٹی کی ی صحت مند شخص سے کروں' کل وہ کسی حادثے میں معذور ہو جائے تو میری بیٹی اس کے ساتھ زندگی

گزارے گی' اسے دھکا دے کر نہیں آئے گی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر مجھے اپنی بہن کے لیے ایسا رشتہ منظور نہیں ہے۔"

"ہم لیحہ سے شادی کرلو۔ دوسال کے بعد میں اپنے بیٹے سے ربیع کی شادی کردوں گی۔ اب تو خو ہوناں" صنوبر خالہ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں خالہ جان! مجھے فی الوقت اپنی شادی نہیں کرنا ہے۔" جمال نے اپنے اوپر قابو پاتے ہو کہا...... کہ اسے دور نگین کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ جو اسے دیکھ کر تمسخر سے ہنس رہا تھا۔ دوسری طرف ربیع کا چہرہ...... اس سے اپنی خوشیوں کا سوال طلب کررہا تھا۔

"جمال بیٹا......! میں تمہارے دل کی کیفیت کو بخوبی سمجھ سکتی ہوں' مجھے معلوم ہے تم اپنی بہن کی شادی لیے پریشان ہو...... ہے ناں یہی بات؟"

جمال نے اثبات میں سرہلایا۔

"تو پھر میری بات پر ہامی بھرلو۔"

"خالہ جان! میں پہلے ربیع کی شادی کروں گا' اس کے بعد اپنی......" جمال کا لہجہ مضبوط تھا۔

"جس طرح تمہاری ترجیح پہلے تمہاری بہن ہے' اسی طرح میری پہلی ترجیح پہلے میری بیٹی ہے۔"

"پھر ایک ساتھ کردو دونوں کی شادی۔" جمال کی امی' جو کافی دیر سے یہ باتیں سن رہی تھیں' پہلی مرتبہ معاملے میں بولیں۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" جمال ایک توقف کے بعد بولا۔ "یوں آپ کی بھی خواہش پوری ہوجائے گی۔"

"نہیں بابا! ایک ساتھ دو شادیاں تو میں کبھی نہ کروں۔" صنوبر خالہ پہلو بدل کر برا سا منہ بناتے ہو بولیں۔

"وہ کیوں......؟" جمال کی ماں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"جب دو بچوں کی ایک ساتھ شادیاں ہوں تو ایک خوش رہتا ہے اور دوسرا دکھی۔"

"خالہ جان! یہ آپ کس زمانے کی باتیں کررہی ہیں؟"

"میں تو یہی دیکھتی اور سنتی چلی آرہی ہوں۔"

"مگر میں ان سب فضولیات پر یقین نہیں رکھتا۔"

"اگر ایسا ہے تو تم پہلے ملیحہ سے شادی کیوں نہیں کرلیتے' دو سال تو پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔"

"یہی بات' میں بھی آپ سے کہوں تو پھر......؟" جمال نے سنجیدگی سے کہا۔

"دو سال بعد تم اپنی بات سے پھر جاؤ تو میں کیا تمہارے پیچھے لٹھ لے کر دوڑوں گی؟ اگر اس اثنا میں کو پوتی ہوگیا تو بہو کو اس کے گھر میں بھی نہیں بٹھا سکتی" اب صنوبر خالہ کھل کر اس کے سامنے آرہی تھیں۔

"خالہ جان! جب آپ کے دل میں اس نہج کی باتیں ہوں تو ہمیں آپس میں رشتے داری کرنے سے کرنا چاہیے۔"

"میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میری تو بیٹی بھی خوبصورت اور بیٹا بھی...... جبکہ تمہار عیب باقی ہے۔"

جمال کے دل پر گھونسا سا پڑا اور وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی بالکونی میں آکھڑا ہوا' جہاں

ں ربیع ملیحہ کے ساتھ شٹل کاک کھیل رہی تھی۔ اس نے دیکھا ربیع کو ٹیڑھا میڑھا بھاگتے دیکھ کر ملیحہ اور مدیحہ ایک سرے کو دیکھ کر بری طرح ہنس رہی تھیں۔ جمال کو یوں لگا جیسے وہ ربیع کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

"ربیع! اوپر آؤ" وہ وہیں سے دہاڑا۔

"جی بھائی جان......" ربیع نے سر اٹھا کر اوپر کھڑے جمال کو دیکھا۔

"فوراً آؤ...... میں مارکیٹ جارہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو' ہم نے رات کو ہی کراچی کے لیے جانا ہے۔"

"اتنی جلدی ہم کراچی جائیں گے" ربیع نے منہ بسورا۔

ملیحہ نے مدیحہ کے کہنی ماری اور زیر لب بہن سے کچھ کہا۔

"ہوں...... پھر ربیع کا مذاق!" جمال نے دیکھ کر سوچا۔

"بھائی جان! ہم اپنے ساتھ ملیحہ اور مدیحہ کو بھی لے لیں۔ مارکیٹ میں گھومتے ہوئے مزہ آئے گا" ربیع نے کہا۔

"نہیں' صرف تم جاؤ گی میرے ساتھ۔ ہمیں جلدی آنا ہے۔ ہماری کراچی کی فلائٹ میں زیادہ ٹائم نہیں گا' ہم وہیں سے ائرپورٹ چلے جائیں گے۔"

ملیحہ اور مدیحہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے جمال کو دیکھا اور کندھے اچکا کر اوپر آگئیں۔

جمال کی والدہ نے آکر صنوبر اور ان کے بچوں کو خاصے قیمتی تحائف دیے تھے مگر ان کو جاتے دیکھ کر سب ے انداز میں الوداع کہہ رہے تھے۔

وہ صنوبر خالہ جو ربیع کو دیکھ کر واری جاتی تھیں' چلتے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ جمال ماں اور بہن کو لے کر سیدھا ہوٹل پہنچا۔ اگلے دن واپسی کے ٹکٹ کرائے اور ربیع اور ماں کو لے کر اسلام آباد گھومنے کے لیے نکل گیا۔

"واؤ...... اس بوتیک کے کپڑے کتنے خوبصورت ہیں؟" ربیع نے پرپل کلر کا خوبصورت کٹ دانے کا شلوار یص منتخب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جتنے سوٹ پسند ہیں' سب لے لو" جمال نے کہا۔

"یہ دیکھیے' بالکل جدید کام کا یہ سوٹ ہے" فریال نے ربیع کے سامنے ورکنگ گرل سے سوٹ اس کے منے رکھواتے ہوئے کہا۔

ربیع نے ایک نظر سوٹ پر اور دوسری نظر فریال پر ڈالی اور کہا "آپ نگین کی دوست ہیں ناں۔"

"ہاں' ہوں...... مگر میں آپ کو پہچانی نہیں" فریال نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ نگین کے گھر کے عین سامنے رہتے ہیں۔ آپ کو اکثر نگین کے ساتھ آتے جاتے بارہا دیکھا تھا اس ے پہچان گئی۔"

"کیسی ہے نگین؟" فریال نے اپنے دل کو تھامتے ہوئے پوچھا۔

"آج کل اپنی امی کے گھر آئی ہوئی ہیں۔"

"تو کیا اس کی زبور سے شادی ہوگئی؟" فریال کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"زبور سے منگنی ہوکر ٹوٹی اور ان کی امی نے ان کے پھوپی زاد سے شادی کردی" ربیع نے بتایا۔

"بہت اچھا کیا......" فریال نے کہا۔

جمال نے دیکھا' فریال کے چہرے پر جیسے دکھوں کا کوئی قافلہ سا گزر گیا ہو۔

‘‘آپ شادی ہو کر اسلام آباد آ گئیں؟’’ ربیع پوچھ رہی تھی۔

‘‘دیکھو' یہ نیلا سوٹ تم پر بہت جچے گا’’ فریال اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہہ رہی تھی' ‘‘اور یہ سفید سلک کا سوٹ براؤن ایمبرائیڈری کے ساتھ آپ کی امی کے لیے اچھا لگے گا۔’’

جمال اس کو مشینی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گزرتے ہوئے سائے بھی اسے نظر آ رہے تھے۔

‘‘چلو ربیع...... کہیں اور سے بھی کچھ لے لو یا ساری خریداری یہیں سے کرنی ہے؟’’

‘‘ہاں' ہاں آپ دوسری بوتیک بھی ضرور ٹرائی کریں' ہمارے پاس تو اسٹاک بھی نیا نہیں ہے۔’’ فریال کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ربیع یہاں سے جلدی سے چلی جائے۔

جمال نے جیسے ہی باہر کی جانب قدم بڑھائے' فریال اپنا سر تھام کر اپنی چیئر پر جیسے گر گئی۔

‘‘کیا ہوا محبت کرنے کا انجام؟ میں حاصل کر کے نقصان میں رہی اور میری دوست جو میرے نقش قدم پر چلی اس نے بھی اپنا وقت ضائع کیا۔ زیور جو بظاہر بہت اچھا نظر آتا تھا وہ بھی نگین کا نہ ہو سکا۔ یہ سڑکیں ناپتی محبتیں بھی کیسی زہریلی سی ہوتی ہیں۔ جو پورے من میں زہر اتار کر خوشیوں سے دور رکھتی ہیں۔ روشنی اور امید سے فاصلہ رکھتی ہیں۔ بھروسے اور اعتماد کا خون کرتی ہیں۔ اور تاوان میں کسی سے زندگی کی بھینٹ لے لیتی ہیں تو کسی کو آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں رکھتیں۔

اور پھر بھی جانتے بوجھتے ہوئے اکثر لڑکیاں ان محبتوں پر ایمان لے آتی ہیں۔ اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

کاش...... کوئی انہیں سمجھائے کاش......!

☆☆☆

سب ہی نے یوں تو کیا تجزیہ محبت کا
کسی سے حل نہ ہوا مسئلہ محبت کا
وہ جس کے ہجر میں رونا اسے دعا دینا
سمجھ میں آتا نہیں فلسفہ محبت کا

عدیل کے چہرے پر فتح کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ خوشی کا عکس اس کی آنکھوں میں ہنس رہا تھا۔ کالج کے قریب کیفے میں اس کے سامنے مہناز شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔

‘‘منو' تم یقین کرو میری اس بات کا' اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے لیے ہی بنایا ہے۔’’

‘‘منو...... آپ کو کیسے پتا چلا؟’’ وہ یکبارگی اچھل سی گئی۔ اس نام سے تو اس کو صرف پاپا پکارتے تھے۔

‘‘یہ نام...... میرے دل نے تمہیں دیا ہے۔’’ (اب وہ کیا بتاتا کہ اس کے والد کے منہ سے اس نے کئی بار سنا تھا جب وہ اسے کالج ڈراپ کرنے آتے تھے۔ منو...... تم کو ڈرائیور لے لے گا...... اور یہ نام اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا۔

‘‘آپ تو پہلی ملاقات میں ہی مجھے کتنا جان گئے ہیں۔ جب کہ میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ آپ کون ہیں' کیا کرتے ہیں؟ اور مجھ سے دوستی کر کے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟’’

‘‘محبت کرنے والے تو کچھ بھی نہیں ہوتے' نہ ان کا نام ہوتا ہے اور نہ ان کا کوئی کام ہوتا ہے۔’’ عدیل

اری سے ہنستا ہوا بولا۔

‘‘کیا...... کیا...... آپ کوئی کام نہیں کرتے؟’’ اس نے حیرت سے پوچھا۔

‘‘اب ڈیڈی کا بزنس مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا۔ وہ بار بار فون کر کے مجھ سے کہہ رہے ہیں' دوبئی آ کر اپنا گارمنٹ کا بزنس دیکھو...... مگر منو! جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے' کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔’’

‘‘یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے' بندے کو پہلے اپنے کام کی فکر کرنی چاہیے۔’’ مہناز نے شرماتے ہوئے ہنس کر کہا۔ اور عدیل کو اسی لمحے یہ ادراک ہو گیا کہ یہ لڑکی فریال جتنی سیدھی اور بے وقوف ہرگز نہیں ہے۔ اس کو لائن پر لانے کے لیے خاصے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

‘‘اچھا یہ بتاؤ' کل کہاں مل رہی ہو؟ اب تمہارے بنا رہنا میرے لیے مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔’’

‘‘کل تو میرا ٹیسٹ ہے' سوال ہی نہیں پیدا ہوتا’’ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

‘‘میں کالج ٹائم کے بعد کی بات کر رہا ہوں۔’’

‘‘مگر میں آپ سے دوستی نہیں کر سکتی...... اور آج آپ کو یہی سب بتانے کے لیے میں یہاں آئی ہوں۔’’

‘‘تمہیں مجھ پر ترس نہیں آ رہا...... صرف تمہاری وجہ سے میری زندگی خوار ہو رہی ہے۔ کتنے عرصے سے امنے نیم کے نیچے کھڑے ہو کر میں تمہیں تکتا رہا ہوں۔’’ عدیل کا لہجہ جذبات سے بوجھل ہو گیا۔

‘‘مگر اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر میں آپ کو اچھی لگتی ہوں تو میں کیا کروں؟’’ وہ شرما کر دھیرے ے بولی۔

‘‘مہناز مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ پاگل ہو گیا ہوں میں تمہارے لیے۔ اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔’’ عدیل نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر زعم بھرے لہجے میں کہا۔

‘‘ارے آپ مجھ سے عشق کرنے لگے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔’’ وہ چائے کا ہلکا سا سپ لیتے ہوئے شرارت ے بولی۔

‘‘اڑا لو میرا مذاق' جتنا اڑا سکتی ہو۔ مگر مہناز اب میں زندگی کا یہ جیون تمہارے بنا بتا نہ پاؤں گا۔’’

‘‘ارے نہیں بھئی' اب پہلی ملاقات میں تم فرہاد بننے کی کوشش تو مت کرو’’ مہناز پھر ہنسی۔

‘‘مہناز' میں تمہیں دیکھ کر اپنی سدھ بدھ جو کھو بیٹھا ہوں تو اس کی اصل وجہ تمہارا معصوم مگر شرارے برساتا او سن بھی ہے' جسے دیکھ کر میں گھائل ہو گیا ہوں۔ تمہاری مسکراہٹ کتنی خوبصورت ہے' کبھی تمہیں احساس ہوا ؟’’

‘‘نہیں......’’

‘‘تم ایسی ملکہ ہو جو میرے دل پر ہمیشہ راج کرو گی۔ ڈیڈی بے شک مجھے اپنی جائیداد سے عاق کر دیں' مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیں مگر میرے لبوں پر سوائے مہناز کے کوئی نام نہیں ہوگا۔ دنیا کی کوئی بھی حسینہ میرے امنے آ جائے مگر میں صرف تمہیں پکاروں گا۔’’

‘‘کیا واقعی......!’’ اب مہناز کے ہاتھ پاؤں لرزنے سے لگے تھے۔ ایسی صورت حال کا سامنا اسے بھلا کہاں پڑا تھا۔ ‘‘مگر عدیل! مجھے ڈر لگتا ہے......’’ اس نے اپنا ہاتھ عدیل کے ہاتھ سے آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

‘‘میرے ہوتے ہوئے ڈر کیسا......؟’’ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے گہرے سے لہجے میں

بولا۔

''اگر کسی کو پتا چل گیا، کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا، محبت کے میدان میں اترنے والی تم پہلی لڑکی نہیں ہو......اور محبت تو انسان کو بہادر بنا دیا کرتی ہے۔''

''تم نہیں جانتے عدیل! میرے پاپا بے حد سخت ہیں۔ اپنے اصولوں کے......اور میری ماما ان سے بھی زیادہ......''

''میں صرف تمہیں جانتا ہوں، تمہیں چاہتا ہوں، اس سے زیادہ جاننے کی مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''اگر آپی کو پتا لگ گیا تو میں کیا کہوں گی ان سے......؟'' اب وہ روہانسی سی ہو رہی تھی۔

عدیل دیکھ رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا کہ وہ اس سے دوستی کرنا چاہ بھی رہی ہے اور ڈر بھی رہی ہے۔ اس کو اس تذبذب میں دیکھ کر وہ بڑے ڈرامائی انداز میں، اس کے دونوں ہاتھ تھام کر، اس کی آنکھوں میں جھانک کر سحر انگیز لہجے میں بولا۔

میری پیاری منو......

تم نہ مانو مگر یہ حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے
اس کی محفل میں بیٹھ کے دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

تم کالج کی بور کتابوں کے ساتھ اتنی خوش نہیں رہ سکتیں، جتنی میری ہمراہی میں رہو گی۔''

''ٹھیک ہے، مجھے تمہاری دوستی قبول ہے'' منو نے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں گھر تک ڈراپ کر دوں......؟'' عدیل نے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا۔ (اسے پورا یقین تھا وہ انکار کر دے گی)

''نہیں، میں خود جاؤں گی...... مجھے محتاط رہنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، کل ملیں گے'' عدیل نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا دبایا ''ٹیک اٹ ایزی!''

مہناز اپنا کالج کا بیگ سنبھالتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ عدیل کرسی پر سر پیچھے کیے مسکراتا رہا۔ آج کا دن اس کی توقعات کے مطابق گزرا تھا۔

☆☆☆

نہ جانے کون سی منزل کی سمت ہم ہیں رواں
گھڑی تو کیا کہ یہاں پل کا اعتبار نہیں
کسی کو ٹوٹ کے چاہیں کہ چاہ کر ٹوٹیں
ہمارے پاس تو اتنا بھی اعتبار نہیں

کان پک گئے تھے ثنا کی تعریفیں سنتے سنتے۔ ثنا بہت قابل ہے، اپنے کالج میں ٹاپ ٹین میں رہتی ہے۔ ثنا بہت خوبصورت ہے، جو کپڑا پہنے اس پر کھل جاتا ہے۔ ثنا کے بال بے حد لمبے ہیں۔ اتنے لمبے بال تو آج کل لڑکیوں کے نظر ہی نہیں آتے۔ ثنا کے ہاتھ میں ذائقہ بھی ہے اور پھرتی بھی۔ کچن میں جائے تو بجلی کی سی سرعت

میں کھانا پکا کر لے آتی ہے۔ کاش، ثنا ہمیں پہلے ملی ہوتی۔

یوں تو بیلا کی اپنے منگیتر طاہر کے ساتھ بے حد ذہنی ہم آہنگی تھی مگر جب بھی وہ اپنے تایا کے گھر جاتی، ثنا کی اس قدر تعریفیں سنتی کہ اسے ثنا سے خواہ مخواہ کی جلن سی ہونے لگتی تھی۔

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ بیلا جب بھی تایا کے گھر جاتی، ثنا سے اس کی ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ کبھی وہ کراچی گئی ہوتی، کبھی کسی سہیلی کے گھر اسٹڈی کے لیے اور کبھی اپنا کمرا بند کر کے پڑھائی میں مصروف ہوتی۔

''منگنی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اچھے اچھے گھرانے منگنی توڑ کر نادم تک نہیں ہوا کرتے اور پھر یہ بھابی جان تو ویسے بھی خاصی چالاک سی ہیں۔'' ایک دن اس کی ماں نے اس سے کہا۔ ثنا کا مستقل قیام ان کو بھی خوف زدہ سا کر رہا تھا۔ اگلے دن ہی وہ بغیر بتائے تایا کے گھر تھی۔

اس وقت گھر کے سب لوگ روزہ افطار کر کے بیٹھے تھے۔ بیلا نے دیکھا، ہلکے گلابی سوٹ میں اس کا حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ بالوں کی دو چوٹیاں اس کے سینے پر پڑی تھیں۔ وہ طاہر کی کسی بات پر ہنسی تھی اور طاہر اس کی جانب دیکھ کر مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔

''السلام علیکم......!'' بیلا نے قصداً زور سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......افطار سے پہلے ہی آ جاتیں۔ آج ثنا نے اتنے مزے مزے کی چیزیں بنائی تھیں'' تایا نے بیلا کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

''اونہہ، یہ روزہ کہاں رکھتی ہے'' طاہر نے شرارت سے کہا۔

''کیوں، تمہیں یہ کب سے الہام ہوا، میں روزے نہیں رکھتی؟''

''تمہارے گھر سے صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ پر ہمارا گھر ہے۔ اگر تم بیس منٹ پہلے نکلتیں تو ہمارے ساتھ افطاری میں شریک ہو سکتی تھیں۔''

''میں پون گھنٹے پہلے نکلی تھی مگر ٹریفک جام تھا، وقت پر کیسے پہنچ پاتی؟''

''ارے پہلے یہ دہی بڑے کھاؤ، میری ثنا نے بے حد لذیذ بنائے ہیں۔'' تائی نے اس کے سامنے دہی بڑے کا ڈونگا بڑھایا۔ بیلا نے سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں دہی بڑے نہیں کھاتی۔''

''اچھا تو یہ چکن رول لے لو، یہ بھی ہماری ثنا نے بنائے ہیں'' تایا نے کہا۔ بیلا نے بادل ناخواستہ رول لے لیا۔

''اچھا ہے ناں؟'' طاہر نے وارفتگی سے پوچھا۔

''ہاں اچھا ہے۔'' اسے طاہر کا اس طرح تعریف کرنا اچھا نہیں لگا۔

''آپ اپنے گھر کو مس نہیں کرتیں؟'' بیلا نے ثنا سے پوچھا۔

''ہاں کرتی تو ہوں مگر بہت زیادہ نہیں۔ انکل، آنٹی اور طاہر بھائی میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ میں تو اپنے آپ کو اسی گھر کا ایک فرد محسوس کرتی ہوں۔''

''پتا نہیں لوگ کیسے کسی کے گھر میں رہ جاتے ہیں، میں تو کسی کے گھر ایک دن نہیں رہ سکتی'' بیلا کی ناپسندیدگی ب نے ہی محسوس کی۔

''تم تو ہمیشہ کی گھامڑ ہو'' طاہر نے مذاق میں کہا۔

”اسی گھامڑ کے ساتھ آپ کی شادی ہو گی“ بیلا نے جتاتی ہوئی نظروں سے ثنا کو دیکھتے ہوئے طاہر سے کہا۔

”اب قسمت میں یہی لکھا ہے تو کیا کر سکتے ہیں۔“ طاہر خوش دلی سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

گھر کے سب لوگ ان دونوں کی نوک جھوک سے لطف لے رہے تھے مگر بیلا کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”آپ شادی کے بعد اپنی جاب جاری رکھیں گی؟“ ثنا نے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے اپنی جاب کیا چھوڑ دینی چاہیے“ بیلا کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، یہ تو آپ کی اپنی مرضی ہے۔“

”میں نے سوچا اپنی نند سے بھی پوچھ لوں، اس گھر کی فرد تم جب اپنے آپ کو سمجھتی ہو تو میری تو نند ہی ہوئیں ناں......“ بیلا کا لہجہ خاصا کٹیلا سا تھا۔

”ہاں، رشتے میں تو میں آپ کی نند لگتی ہوں مگر پابندیاں اور اعتراض کرنے والی نہیں، آپ کا دل چاہے جاب کریں، آپ کا دل چاہے گھر میں ٹھاٹ سے رہیں۔ میں آپ پر کوئی قدغن لگانے والی کون ہوتی ہوں؟“

”ہاں، تم نے اپنا مقام پہچان لیا“ بیلا کا لہجہ ایک بار پھر کاٹ دار ہو گیا۔

بیلا کو اس طرح طنز آمیز گفتگو کرتے دیکھ کر مسٹر اور مسز خان دونوں ہی خجل سے ہو گئے تھے۔ طاہر علیحدہ سکی سی محسوس کر رہا تھا۔ ثنا کیا کہتی ہو گی ...... میری منگیتر بات چیت کرنے میں کتنی بدتمیز سی ہے، یہ احساس اسے بار بار ہو رہا تھا۔

”میرا تو کل ٹیسٹ ہے، اس لیے اپنے کمرے میں جا رہی ہوں“ ثنا اپنی پلیٹ کے ساتھ دیگر پلیٹیں اٹھا کر کچن میں رکھ کر بولی۔

”میڈیکل کی اسٹوڈنٹ کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی ...... تم تو پھر بھی خاصا ٹائم ویسٹ کرتی ہو“ بیلا اپنی گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

”کیا کروں، جب آنٹی، انکل اور طاہر بھائی سے باتیں ہو رہی ہوں، تو مجھے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ ثنا نے جاتے جاتے کہا اور بیلا کے آگ سی لگ گئی۔ اتنی خوبصورت لڑکی کا یوں بے تکلفانہ انداز میں رہنا اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ تائی سے بولی ”آپ نے یہ خواہ مخواہ کی پخ کیوں پال رکھی ہے؟ ایک دن کا مہمان دو دن کا مہمان تیسرے دن کا تو بے ایمان کہلاتا ہے۔ آپ ان ثنا صاحبہ کو ہوسٹل کا رستہ کیوں نہیں دکھاتیں؟“

”ثنا تو بہت پیاری بچی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اب تو اگر وہ کہے گی بھی تو میں اسے جانے نہیں دوں گی۔“

”ڈاکٹر بن کر بالاخر اسے اپنے والدین کے پاس تو جانا ہی ہو گا۔ وہ آپ کے پاس ساری زندگی کے لیے تو نہیں آئی ہے۔“

”ہاں، وہ میرے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تو نہیں آئی ہے، ڈاکٹر بن جائے گی تو میرا گھر ویران کر کے چلی جائے گی۔“ تائی کے لہجے میں ملال سا گھلا ہوا تھا۔

بیلا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں ہر طرف بجنے لگیں۔ اس لڑکی کا یہاں رہنا اس کے لیے آئندہ زندگی میں بھی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔

ثنا کو یہاں سے جلد سے جلد چلا جانا چاہیے۔ اس نے سوچا اور اس کمرے کی جانب نفرت سے دیکھا جہاں

اب، چاند جا کر غروب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے، راستے بھی چلتے ہیں

آج فہمی پندرہ دن کے بعد آئی تھی۔ فیروزہ اور نگین اس کے پاس بیٹھی اس کے گھر کے حالات پوچھ رہی تھیں۔

”ممانی جان بہت تیز ہیں۔ بظاہر تو اپنے کمرے میں ڈیرا جما لیا ہے مگر طنز کرنے سے باز نہیں آتی ہیں۔“

”تم ان کی کسی بات کا تو جواب دے دیا کرو“ نگین نے کہا۔

”میں کوئی ایسی بات کرنا نہیں چاہتی، جس سے فہد کو دکھ ہو۔ جب وہ میرے ساتھ ہیں تو پھر مجھے پریشانی ی؟“

”ماموں جان کچھ نہیں کہتے ممانی سے؟“

”وہ ان کے آگے کچھ بھی بولنے پر قادر نہیں ہیں، وہ جو بھی کہتی ہیں، چپ چاپ ہامی بھرتے رہتے ہیں۔“

”ماموں جان کو اپنی بھانجی کا بھی خیال نہیں آیا۔“

”سنا ہے وہ اس شادی پر راضی نہیں تھے اور انہوں نے فہد سے کہا تھا کہیں اور شادی کر لو مگر فہمی سے مت کرو ہیں ایسا نہ ہو وہ یہاں آ کر مزید دکھی ہو جائے۔“

”بیوی ہو یا شوہر جو دب جائے، وہ آخر تک دبا ہی رہتا ہے۔“

”امی! مجھے اپنی سسرال میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ فہد میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ میری آنکھ یں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ صرف ممانی جان کی باتیں میری خوشیوں کا گلا گھوٹنے کا سبب بنتی ہیں۔“

”فہمی بیٹا! خوشیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی پھانس ضرور ہوا کرتی ہے، کبھی یہ پھانس معمولی نوعیت کی ہوتی ہے ں سے کبھی کبھی چبھن ہوتی ہے اور کبھی یہ پھانس کسی چھری کی سی کاٹ رکھتی ہے۔ جہاں چبھتی ہے، لہولہان ر دیتی ہے۔ تم خوش قسمت ہو، تمہارے ساتھ ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ممانی جان بھی تمہاری ایک اچھی دوست بن جائیں گی۔“

”فہد بھی یہی کہتے ہیں، امی دل کی بہت اچھی ہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے، تمہیں اپنے گھر میں خوش دیکھ کر میں مطمئن سی ہو گئی ہوں۔“

”مگر آپ کا چہرہ تو بالکل زرد سا ہو رہا ہے اور آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں۔ آپ کیوں دل پر لے رہی ہیں جبکہ ایسا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے“ فہمی نے ماں کا ہاتھ تھام کر انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میں بہت کمزور دل ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھانے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی ناں......“ ان کے آنسو ساروں پر اتر آئے۔

فہمی نے اپنی ہتھیلیوں سے ماں کے آنسو پونچھے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پلیز امی! آپ ہرگز پریشان نہ ہوں میں ہر لحاظ سے خوش ہوں اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہوں گی۔“

”آمین، ثم آمین!“ فیروزہ بیگم نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا اور مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

آنکھوں نے کیسے خواب تراشے ہیں ان دنوں
دل پر عجیب رنگ اترتے ہیں ان دنوں
رکھ اپنے پاس اپنے مہ ومہر اے فلک
ہم خود کسی کے آنکھ کے تارے میں ان دنوں
دست سحر نے مانگ نکالی ہے بارہا
اور شب نے آ کے بال سنوارے ہیں ان دنوں
اک خوشگوار نیند پہ حق بن گیا میرا
وہ رت جگے اس آنکھ نے کاٹے ہیں ان دنوں
وہ قحط حسن ہے کہ سب ہی خوش جمال لوگ
لگتا ہے کوہ قاف میں رہتے ہیں ان دنوں

(پروین شاکر)

سائرہ دھیمے لہجے میں گنگنا رہی تھی۔ آواز اس کی شروع سے ہی اچھی تھی مگر آج کتنے عرصے بعد اس کے لب گنگناہٹ سے آشنا ہوئے تھے۔

اسکول سے آ کر وہ اپنے کمرے میں قید ہو جاتی تھی مگر آج وہ آنگن میں کیاری کے پاس بیٹھی تھی۔ پھول جھوم جھوم کر اسے دیکھ رہے تھے اور سائرہ بھی انہیں ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کے سنگی ساتھ ہوں۔

”سائرہ......تم خوش ہو ناں......؟“ سرخ گلاب نے اس کے ہاتھوں کو چھو کر پوچھا۔

”ہاں، بہت......“ اس نے اپنا چہرہ جھکا کر گلاب سے مس کیا۔

بے حد پیاری اور حواس گم کر دینے والی شام کا افتتاح ہو رہا تھا۔ آنگن میں موتیے اور رات کی رانی کی خوش ہوا کے گلے لگ کر آ رہی تھی اور سائرہ اپنے ہاتھ کی انگلی میں پڑی خوبصورت سی انگوٹھی کو گھمائے چلی جا رہی تھی۔

”خدا کرے زندگی کا یہ سفر ادھورا نہ رہے“ اس نے سوچا۔ کل رات ہی مسز علی اس کو یہ انگوٹھی پہنا کر گئی تھیں، ان کے ساتھ بلال بھی آیا تھا اور اس کی دونوں پیاری پیاری سی بچیاں بھی۔

بلال بھرپور وجاہت کا حامل تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس کا اسکول شہر کا جانا پہچانا اسکول تھا جو پانچ ہزار ا زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ اس اسکول میں سیکڑوں بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

بلال کی یہ خواہش تھی کہ اس کا ادارہ ایک اچھے طالب علم اور ایک اچھے انسان کی شناخت ٹھہرے۔ اس کی بیوی ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی جو ہمہ وقت اس کا خیال رکھا کرتی تھی اور اس کی حادثاتی موت نے بلال ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک سال تک تو وہ اس کے تصور سے ہی ہم کلام رہتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ یہ قبول کر پر تیار ہو گیا کہ اس کی زندگی کی ساتھی اسے چھوڑ کر وہاں جا چکی ہے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا ہے

بیگانگی سے جب وہ ہوش میں آیا تو ہمہ وقت اپنی بچیوں کو اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ ایک خوف سا اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا، کہیں اس کی بچیاں اس سے جدا نہ ہو جائیں۔

دوسری شادی کرنے سے وہ بدکتا تھا مگر جب اس کی ماں نے شائستہ بیگم کی مثال اسے دی تو اس کے ذہن کے آسمان پر ایک جھلملاتا سا چاند طلوع ہو گیا جس میں شائستہ بیگم کا چہرہ چمک رہا تھا۔

اسے اچھی طرح یاد تھا، شاہنواز اور دلنواز سے وہ بے حد محبت کیا کرتی تھیں۔ بلال کا گھرانہ ان کے پڑوس میں ہی تھا اور ان کے گھر کی ہر بات سے وہ باخبر تھا۔

ایک دفعہ دلنواز سڑک پر گر گیا تھا۔ نیچے گرنے سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ شائستہ بیگم کو پتا چلا تو وہ ننگے پیر سڑک پر آ گئی تھیں اور اپنے دوپٹے کا پلو پھاڑ کر اس کے ماتھے پر باندھ کر فوراً ڈاکٹر کے کلینک لے گئی تھیں۔ بچے سے زیادہ وہ سراسیمہ سی ہو گئی تھیں۔ شاہنواز کی پٹائی محلے کے کسی شریر سے بچے نے کر دی تھی تو وہ اس کو لے کر اس کے گھر پہنچ گئی تھیں۔

”آئندہ اگر کسی نے میرے بیٹے کو ہاتھ لگایا تو میں خود آ کر اس کا ہاتھ توڑ دوں گی“ مارے غصے کے وہ کانپ رہی تھیں۔

پورے محلے میں ان کا کردار ایسا مثالی سا تھا کہ اکثر گھرانے کے لوگ یہی کہا کرتے تھے، اب تو اپنے بچوں سے سگی مائیں اتنی محبت نہیں کرتی ہیں جتنی یہ سوتیلی ماں کرتی ہے۔

”ماں ہو تو شائستہ بیگم جیسی......“ ہر گھر میں یہی مثال دی جاتی تھی۔

”امی! اگر کوئی ان جیسی عادتوں والی اور ان جیسی محبتیں لٹانے والی ملے تو میں ضرور اس سے شادی کر لوں گا“ بلال نے ہامی بھری بھی تو مشروط انداز میں۔

مسز علی کو جب یہ معلوم ہوا کہ سائرہ کو طلاق ہو گئی ہے تو وہ پہلی فرصت میں ان کے پاس پہنچی تھیں۔ بلال ان کی بیٹی کو ضرور قبول لے گا، یہ ان کا دل کہہ رہا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بلال نے سائرہ کو دیکھے بغیر اپنی رضامندی دے دی تھی۔ شائستہ بیگم کے گھر تو آ گیا تھا مگر اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر سائرہ کو نہیں دیکھا تھا۔

”بیٹا، ایک نظر دیکھ تو لو“ مسز علی نے اس سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر سامنے بیٹھی ہوئی سائرہ پر ڈالی جو آف وائٹ پلین سوٹ میں خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر کسی خوشی کی کوئی رتی تک نہیں تھی۔

شاید یہ لڑکی یہ سوچ کر دکھی ہو رہی ہے کہ اس کی شادی دو بچیوں کے باپ سے ہو رہی ہے۔ بلال کے ذہن میں یہی وجہ آئی۔

”میری یہ دونوں بچیاں بے حد محبت کرنے والی ہیں۔ میرا یہ خیال ہے، یہ آپ کو تنگ بھی نہیں کریں گی اور یوں بھی ان کا ہر کام کرنے کے لیے گورنس ان کے ساتھ رہتی ہے۔“ بلال نے ذرا سا کھنکھار کر سائرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میں بچیوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ یہ اتنی پیاری پیاری سی شہزادیاں تو اللہ مجھے بغیر مانگے دے رہا ہے......اور اب یہ میری ذمے داری ہوں گی گورنس کی نہیں“ سائرہ نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''پھر آپ...... اتنی پریشان سی کیوں لگ رہی ہیں؟'' بلال نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو دیکھا جو اپنے بالوں کو انگلی میں لپیٹے چلی جا رہی تھی۔

''بدقسمت ہوں ناں...... اس لیے ڈر سا لگ رہا ہے'' [illegible] نے پھر دھیرے سے کہا اور ہیرے کی طرح کوندتا ہوا آنسو اس کے رخساروں سے پھسل گیا۔

''سائرہ! امی نے آپ کو ابھی جو انگوٹھی پہنائی ہے...... تو اسے محبت اور یقین کا وہ دائرہ سمجھیے گا جو اب آپ کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔''

سائرہ نے استفہامیہ انداز میں اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ بلال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اطمینان دلایا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے تب اس نے مطمئن ہو کر سر جھکا لیا۔ اب اس کے رخساروں پر خوشی کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔

اور بلال سوچ رہا تھا' امی نے میرے لیے سائرہ کا انتخاب کتنا صحیح کیا ہے۔ یہ لڑکی نہ صرف میری زندگی کی ایک اچھی ساتھی بن کر رہے گی بلکہ میری بیٹیوں کی ایک اچھی اور ذمے دار ماں بھی ہو گی۔

اور اس کے اگلے دن پھولوں کے تختے کے پاس بیٹھی سائرہ اپنی انگلی میں انگوٹھی گھماتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ خوشیوں کی واضح چمک اس کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھیں کیسے مسکراتی ہیں...... اس کو دیکھ کر شائستہ بیگم کو ایک طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ کاش اس وقت فریال بھی پاس ہوتی' دل میں ایک پھانس بدستور پیوست تھی۔

کوئی ایک آدھ سپنا ہو تو پھر اچھا بھی لگتا ہے
ہزاروں خواب آنکھوں میں سجا کر کچھ نہیں ملتا
اسے کہنا کہ پلکوں پر نہ ٹانکے خواب کی جھالر
سمندر کے کنارے گھر بنا کے کچھ نہیں ملتا

☆☆☆

ثریا کا بس نہیں چل رہا تھا اپنی ساس اور نند کو بے مہار سنا ڈالے۔ ان کی بھلا یہ مجال' اس سے مشورہ لیے بغیر انہوں نے سائرہ کا رشتہ طے کر دیا اور اسے دودھ کے بال کی طرح باہر نکال پھینکا۔

اس گھر میں سب کو میں ہی اپنا سمجھتی رہی' کسی نے مجھے اپنا نہیں سمجھا...... یہ احساس بھی اسے اپنی تذلیل کا موجب لگ رہا تھا۔ میرے میاں کی لائی ہوئی چیزیں ایسے پکڑتی ہیں' جیسے اس کی اصل حق دار صرف وہی ہوں۔ ان کو ہر ہر موقع پر رد کر علیحدہ دکھاتی ہیں' جیسے ان سے زیادہ محبت کرنے والی کوئی ہے ہی نہیں۔ میری بیٹی کے لائے ہوئے جوڑے کیسے مٹک کر پہنے تھے' ان ماں بیٹی نے...... اور جب اپنا وقت آیا تو بڑی بہو کی موجودگی کی بھی کوئی اہمیت نہیں رکھی گئی' جیسے میں کوئی سوتیلی تھی اور وہ سوتیلی ہو کر بھی شاہنواز کی سگی بن گئیں۔

ثریا اپنی آپا کے گھر رہنے کے لیے اکثر جایا کرتی تھی۔ سائرہ کی منگنی کی اطلاع اس کے اپنے چھوٹے بیٹے نے دی تھی جو وہیں پر تھا۔ شاہنواز سے تو اتنا بھی نہیں ہوا تھا کہ ٹیلی فون پر ہی بتا دیتا۔

یہ ماں بیٹی تو مکار ہیں ہی مگر شاہنواز بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس کا ذہن بری طرح کھولے جا رہا تھا۔ گھر آ کر وہ شاہنواز کی ہر سیدھی بات کا الٹا جواب دے رہی تھی۔ ماتھے پر تیوریاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

''موڈ کیوں آف ہے تمہارا؟'' شاہنواز نے حیرت سے ثریا سے پوچھا۔

''پاگل ہوں میں' اس لیے بوتھا سجا کر رکھتی ہوں'' شاہنواز سے وہ بری طرح الجھ رہی تھی۔ ''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا بھی اور آپ کی اماں جان کا بھی......'' ثریا اپنی آپا کے گھر سے آئی تو صابرہ نے اسے بتایا' تمہاری غیر موجودگی میں سائرہ کی منگنی ہو گئی ہے اور ثریا نے یوں سنا جیسے یہ بات پہلی مرتبہ سن رہی ہو۔

''دماغ خراب کی کیا بات ہے' کیا سائرہ کی دوسری شادی نہیں ہونی چاہیے؟'' اب شاہنواز اس سے پوچھ رہا تھا۔

''بالکل نہیں ہونی چاہیے'' وہ غصے سے ابرو چڑھا کر بولی۔

''مگر کیوں......؟ آخر کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''سائرہ جیسی لڑکیاں گھر نہیں بسایا کرتی ہیں۔ اتنا سارا جہیز ہم نے اسے دیا' ان ذلیل لوگوں نے واپس تک نہیں کیا۔ اب دوسری شادی ہو گی تو کیا پھر ہم جہیز دیں؟'' ثریا نے تنک کر کہا۔

''گویا تم یہ تو مانتی ہو کہ سائرہ کی پہلی شادی جہاں ہوئی تھی' وہ لوگ ذلیل تھے' جب ہی تو شادی ختم ہو جانے کے باوجود انہوں نے جہیز تک واپس نہیں کیا۔'' شاہنواز نے کہا۔

''ہاں...... وہ لوگ بھی ذلیل تھے اور آپ کی بہن بھی کم نہیں تھی۔ لڑکی ہو کر لچک نام کو نہیں تھی جب ہی تو نہیں بن پائی۔''

''کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے' جاوید نے دوسری شادی جس لڑکی سے کی تھی' اس نے جاوید سے خلع لے لیا اور اس کے بھائیوں نے جاوید کی ٹانگیں تک توڑ ڈالی تھیں۔''

''ہاں ہاں' سنا تھا میں نے مگر اس وقت تو آپ کی بہن کی بات ہو رہی ہے۔''

''میری بہن بہت اچھی ہے اور بلال بھی بہت اچھا لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے اس دفعہ انتخاب بالکل صحیح کیا ''

''نہیں...... سائرہ اب بھی گھر نہیں بسا سکتی' یہ میری بات یاد رکھیے گا۔''

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو تم......؟'' شاہنواز بیوی سے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''سوتیلے بچوں کو نبھانا آسان ہوتا ہے بھلا۔ سوتیلی ماؤں نے کبھی دوسروں کے بچوں سے پیار کیا ہے جو یہ پیار کے خزانے لٹائے گی۔ ہمیشہ سوتیلی ماں ہر ظلم توڑا کرتی ہے پرائی اولاد پر۔ اور جب اس کے اپنے بچے ہو جائیں گے تو وہ بلال کی اولاد کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھے گی اور یہیں سے لڑائیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا اور آخر وہ دو چار بچے لے کر پھر اپنے گھر آ بیٹھے گی' یہی ہو گا ہاں۔''

''نہیں ثریا! تم غلط کہتی ہو بالکل غلط۔ سائرہ اس ماں کی بیٹی ہے جس نے سوائے محبتیں لٹانے کے کچھ نہیں کیا۔ ہم بھائیوں کو تو اپنی سگی ماں یاد تک نہیں' ہمیں تو انہوں نے ہی پالا' پڑھایا لکھایا ہے۔ ہمارے باپ تو ان میں سے تھے جو بچوں کو جوتے کپڑے دلا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ ہونے کا حق ادا کر دیا امی نے سوتیلی ماں ہو کر ہمیں ایسا پالا کہ شاید ہماری سگی ماں بھی اس نہج پر ہمیں پال نہیں سکتی...... اور تم دیکھنا سائرہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی۔''

''ہاں ہاں' سائرہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی...... تو فریال نے کس کی پیروی کی؟ اس سے قبل کیا آپ کے خاندان میں کسی اور لڑکی نے بھی بھاگ کر شادی کی تھی؟''

''بکواس بند کرو' اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ناں......'' شاہنواز کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔

''سچی بات سب ہی کو کڑوی لگتی ہے' میں تو ایک عام بات کر رہی ہوں۔''

''ثریا! تمہیں سوائے ذلیل باتیں کرنے کے آتا ہی کیا ہے؟''

''اب جو بھی کہو مگر میں نے اپنے بچوں کی ایسی تربیت نہیں کی ہے جو کسی کی نظر میں آئے۔ فریال ا عاشق کے ساتھ بائیک پر اڑی اڑی پھرتی تھی' میرے بچوں نے دیکھا اور پوچھا تو وہ لڑنے مرنے پر آ گئی ا میرے بچے نادم سے ہو گئے۔ آپ کی صابر اور شاکر اور بے حد محبت کرنے والی ماں نے کم از کم اپنی بیٹیوں تربیت تو اچھی نہیں کی...... اگر کرتیں تو ایک بیٹی گھر سے کیوں بھاگتی؟ میں تو کہتی ہوں بلال کی امی کو آپ یہ با خود سے بتا دیں' سائرہ کی چھوٹی بہن نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے ورنہ بعد میں کسی اور سے معلوم ہو تو کوئی اچھ بات ہو گی کیا؟''

''تمہیں اس ضمن میں اپنی للو چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مجھے کیا' جو دل چاہے کہیں' کہہ دیں ان سے کہ پی ایچ ڈی کرنے گئی ہوئی ہے امریکا۔''

''ثریا! تم کیوں اس معاملے میں بکواس کر رہی ہو' جو معاملہ تمہارا ہے ہی نہیں؟''

''میں سب سمجھتی ہوں' میری غیر موجودگی میں بہن کی منگنی ہی اس وجہ سے کی گئی تاکہ اس کی سسرال والا کے آگے خوب جھوٹ بول سکو۔''

''تم جو دل چاہے بکتی پھرو' مجھے پروا نہیں ہے مگر اس ٹائپ کی کوئی بات سائرہ کے سسرال میں پہنچی تو اپنا ح سوچ لینا...... اسی وقت گھر چھوڑ آؤں گا تمہارے۔''

''اب بھی میں تمہاری بہنوں کو ذلیل نہ کہوں تو کیا کہوں' جن کی وجہ سے ہر وقت میاں بے بات کی باتیں مجھے سناتا ہے۔ تف ہے میری زندگی پر' جوان بچوں کی ماں ہو کر بھی میاں کی گالیاں کھاتی ہوں۔ میر کوئی عزت ہی نہیں ہے۔''

''جن عورتوں کی زبان خراب ہوتی ہے' ان کی عزت کبھی نہیں ہوا کرتی اور اس کی ذمے دار تم خود ہو۔ بجا اس کے کہ سائرہ کی شادی پر خوش ہو' اپنی جلن اور حسد کا اظہار کر رہی ہو۔''

☆☆☆

''ثریا...... تو' تو پاگل ہے ایک دم' خواہ مخواہ پریشان ہو گئی'' آپا نے ثریا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا یہ آپ کے نزدیک کوئی بڑی بات ہے ہی نہیں؟''

''نہیں' کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اچھا ہے تمہاری سسرال سے ایک فرد اور کم ہوا۔'' آپا نے ہنس کر کہا۔

''اور شاہنواز نے جو مجھے بے شمار گالیاں دی ہیں' اس کو کس کے کھاتے میں ڈالوں؟''

''اری پاگل...... میاں کی گالی ہنس کر ٹالی۔ اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

''اب وہ کلو پھر خوب جہیز لے کر چلی جائے گی۔ ہم تو بس یہی کرنے کے لیے ہو گئے کہ پیسے جمع کر نندوں کی شادیاں کریں۔''

''تم شاہنواز سے کہہ دو' بلال کی ماں نے جہیز کے لیے ازخود منع کیا ہے۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں' یہ بات کہنا کیا آسان ہو گا' وہ ساس صاحبہ سے نہیں پوچھیں گے کیا؟''

''پھر ایسا کرو تم اپنی ساس کے ساتھ ایک دن بلال کے گھر ہو آؤ۔ دیکھو تو وہ کتنے پانی میں ہیں ا سے کم جہیز سے وہ خوش ہو سکتے ہیں؟'' آپا نے اسے دلار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپا آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں' آج کل کسی کے پاس کتنا ہی ہو' فری کا جہیز سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ اور مجھے تو وہ ویسے بھی کنجوس سے لوگ لگتے ہیں۔ صرف دو کلو مٹھائی اور ایک عام سی انگوٹھی لے کر آ گئے' نہ لڑکی کا جوڑا' نہ پھول' نہ ہار اور نہ ہی کوئی اور چیز۔ بس ان لوگوں نے کھانا کھایا ہے اور چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ پر ہزار' دو ہزار تک نہ رکھے۔''

''نا ٹھے نگوڑے ایسے ہی ہوتے ہیں' جو لوگ چار مہمان جمع نہ کر سکیں وہ دنیا میں آخر کیا کریں گے؟'' آپا نے بھی ہنس کر رائے دی۔

''میرا خیال ہے وہ شادی پر بھی کچھ نہیں لائیں گے' جب ہی سادگی سادگی کا رونا رویا جا رہا ہے۔'' ثریا نے انہیں جتایا۔

''تمہاری دیورانی تو اس دن گھر میں تھی' اس نے تمہیں رپورٹ نہیں دی کہ کیسا لڑکا تھا اور اس کی ماں کتنے تیور والی تھی؟''

''صابرہ کہہ رہی تھی دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک تھے مگر کسی کی شکل پر تھوڑی لکھا ہوتا ہے کہ وہ کتنے نمبر کے ذلیل ہیں۔ سنا ہے یہ لوگ کبھی ان لوگوں کے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔ بہت عرصے بعد ملے ہیں۔ فریال کا قصہ تو انہیں معلوم ہی نہیں ہے۔''

''تم یوں کرو' کسی ذریعے سے ان کو یہ بات بتا دو کہ تمہارا نام بھی نہ آئے اور کام بھی ہو جائے۔''

''اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟''

''سائرہ کا رشتہ ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا۔ شاہنواز جھنجھلا جائے گا' بہن اور ماں کی محبت اور عزت اس کے دل میں کم ہو گی اور ظاہر ہے اس کے دل میں پھر تم ہی تم رہو گی...... اور کیا؟'' اب آپا ٹھٹھے لگا رہی تھیں۔

''مگر آپا...... یہ بات ان لوگوں کو کیسے بتائی جائے۔''

''ایک خط لکھ دو لڑکے کے اسکول کے ایڈریس پر۔ جس لڑکی سے تم شادی کر رہے ہو' وہ اچھے خاندان کی نہیں ہے' اس کی چھوٹی بہن نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے۔ بھائیوں نے اسی وجہ سے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ آپ بھی سوچ سمجھ کر شادی کیجیے۔ یہ نہ ہو آپ کے نام پر سائرہ کی وجہ سے کوئی دھبا لگ جائے۔''

''ہاں' یہ ٹھیک ہے' اچھا ہے...... ذرا بڑی بی کو مزہ تو آئے' جو اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتی ہیں۔ میں اگر دو دن کے لیے اپنے میکے ہو آئی تھی تو مجھے کسی نے فون کر کے بلایا تک نہیں اور میری غیر موجودگی میں منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔''

''ارے یہ سب پلان ہو گا بڑھیا کا۔ اسی نے شاہنواز سے کہا ہو گا کہ ثریا کو بلانا نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے یہی بات ہو مگر مجھے تو اب اس وقت سکون ملے گا جب سائرہ کی منگنی ٹوٹے گی۔''

''ایسا ہی ہو گا' تم اپنے دل کو زیادہ مت لگاؤ اور جھٹ پٹ زہر میں بجھا خط ڈال دو۔''

''وہ تو میں آج ہی ڈال دوں گی مگر اب میں کروں کیا؟''

''بس اپنی خوشیوں کا اظہار کرو تاکہ کسی کو تم پر شک تک نہ ہو۔''

''اس کی تو آپ فکر بھی مت کیجیے گا'' ثریا ہنسی۔ ''آج ہی جا کر ڈھولک سنبھالتی ہوں۔''

''ڈانس بھی کرنا تاکہ پتا چلے بھابی کس قدر خوش ہے۔''

''ڈانس وانس تو مجھے نہیں آتا۔''

“ارے ایسے ہی مٹک لینا' تمہاری ساس اور تمہارے میاں خوش ہو جائیں گے۔ اور تھوڑا بہت ناچنا تمہیں آتا ہی ہے۔ چھوٹے بھائی کی شادی پر نہیں ناچی تھیں تم؟”

“ٹھیک ہے آپا' میں وہی کروں گی جو آپ نے کہا ہے۔ پھر دیکھیے گا کہ کیسی ہنسی میں رونا پڑتا ہے۔”

“کچھ تو سزا ملنی چاہیے ناں انہیں۔ تجھے بلائے بغیر اپنے گھر میں تقریب کر لی انہوں نے؟” آپا نے جلا بھرے لہجے میں کہا۔

“اور کیا......” ثریا نے بہن کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

“خوب بڑا سا گھر تھا۔” صابرہ خواب ناک سے لہجے میں گویا ہوئی۔ “شاید شاہنواز بھائی اور دلنواز کرائے پر لیا تھا یا دولھا والے انوں کو دیے تھے۔”

“کیا محل جیسا گھر تھا؟”

“ہاں' میرے کو تو ایسا ہی دکھتا تھا۔ بڑے بڑے کمرے' دالاناں' باغیچے......”

“پھر کیا ہوا......؟” ثریا نے لہجے میں ذائقہ بھر کے پوچھا۔

“ہر رات جگمگاتی سی تھی...... یہاں سے وہاں تک چراغاں ہی چراغاں۔ ایک سے ایک کھانے پک رہے تھے۔ بیرچی خانہ (باورچی خانہ) سے ہر وخت خوشبوئیں آتی تھیں۔ امی جان سائرہ پاشا کو بار بار گلے لگا کر پیار کرتی تھیں۔”

“کیوں بھئی......؟” ثریا الجھ کے بولی۔

“اتی مشکلوں سے تو شادی ہو رہی ہے' اس پر بھی اپنا غم دکھانے کا فیشن کیا ضروری ہے؟ بھابی پاشا! بیاہنا بھی کوئی معمولی کام تو ہے نہیں۔ اجاڑ دل کیسا بھاری ہو جاتا کی پہاڑ بن جاتا۔ بیاہ ہے سو مصیبت' نہیں بیاہ سو مصیبت۔” صابرہ نے یوں کہا جیسے اس کی اپنی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو۔

“ہاں' یہ تو ہے...... پھر کیا ہوا؟” ثریا کو سب کچھ جلدی سے سننے کی چاہ تھی۔

“ساری نوکرانیاں برآمدوں میں سو رہی تھیں۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ امی جان کو غصہ ہی آ گیا۔ کہ تک سوئیں گیاں یہ لوگاں۔ میں تو کتی بار بول دی انوں کو اٹھتی اچ ہی نہیں...... پانی ڈال دیوان پر۔ رات کو پہناونیاں دوں گی' وہ لوگاں سانچن لے کر آئیں گے۔ دولھے والوں کے استخبال (استقبال) کی کوئی فکر نہیں انوں کو۔ امی جان کی پریشانی دیدنی تھی۔ پھر میں سوب نوکرانیوں پر پانی ڈال دی تب سوئے والیوں میں ذرا کی ذرا ہلچل پیدا ہوئی۔ اللہ بھائی' یہ آپ کیا کری۔ سوب شکایتیں لگا کو بیٹھے۔ تم لوگاں سب پاؤں پسار کھلے ڈھکے سے بے خبر ساں ساں سوئی پڑی تھیں ناں' اس لیے میں ایسا کری......”

“پھر بتاؤ ناں کیا ہوا؟” ثریا کو صابرہ کی بے کار کی وضاحتیں بری لگ رہی تھیں۔

“بس ایک سائرہ کی آنکھیں تھیں کہ نیند سے دشمنی مول لیے بیٹھی تھیں۔”

“کیوں جاگ رہی تھی وہ؟”

“اپنے دولھا کے بارے میں سوچ رہی ہوئیں گی کہ کیسا ہوگا؟” صابرہ نے ہنس کر شرمائے ہوئے لہجے میں بتایا۔

“پھر کیا ہوا؟” ثریا نے بے تابی سے پوچھا۔

[illegible] چلے کی رات گئی' مہندی کی رات تو ناچ اور گانوں میں کٹی۔ ایک سے ایک بڑی مغنیہ گانا گانے واسطے [illegible] تھی پھر شادی کی رات آئی۔ برات خوب دھوم دھڑکے سے آئی۔ بلال پاشا گھوڑے پہ بیٹھ کر آئے تھے۔ [illegible] اتنا تیز تھا کہ کاناں میں دوسری آوازاں سنائی نہیں پڑتی تھیں۔ میں کسی کو بولی بلال کی یہ دوسری شادی [illegible] ایسا شوق ہے انوں کو؟ اس کی خالہ بولی' اجاڑ تم کو اتی پنچایت کائے کو جی۔ ہوئیں گی سو ہوئیں گی۔ [illegible] نے پوچھا سنا ہے دولھا کے دو بچیاں بھی ہیں بول کے۔ اس پرانوں کی رشتہ دار بولے۔ ہو ہے تو' پن [illegible] ہے کی اجاڑ دولت کتی ہے؟ عمر بھر سونے چاندی میں کھیلتی رہیں گی۔ ہاں' ہاں سونے چاندی کے طفیل [illegible] خرید لیا جاتا ہے ناں' میں یہ بول دی۔ تم کون ہو جی......؟ تمہارے انگ میں کائے کو آگ لگ رئی [illegible] بلال کی طرف سے پورے چاؤ چو چلے پہلی شادی کی طرح ہو رہے تھے۔ آرسی مصحف میں دونوں [illegible] ایک ساتھ آئینے میں اپنی شکلاں دیکھے۔ چاول گنانے کی رسم بھی ہوئی۔ ریشمی پاجامے میں ازار بند [illegible] رسم بھی کی گئی۔ دلھن کے دودھ سے پیر بھی دھلائے گئے۔ اور جب رخصتی کی رسم ہوئی تو بلال کی امی [illegible] ہزار کے نوٹ سائرہ پر سے وار کے اتارے۔”

“پھر کیا ہوا؟”

“پھر...... میں نے دیکھا زرتار پھولوں سے لدی مسہری کے ایک کونے پر سر ٹکائے اپنی سائرہ بی بی پھوٹ [illegible] رو رہی ہیں۔”

“پھر کیا ہوا؟”

“[illegible] پھر کیا ہونا تھا۔ اس سے قبل کہ میں سائرہ سے کچھ پوچھتی' میری آنکھ کھل گئی۔ ثریا بھابی' جب سے میں [illegible] دیکھی ہوں' برے برے خیالاں آ رہے میرے من میں۔”

“[illegible] پہر کا خواب سچا ہوتا ہے' مجھے لگتا ہے کہ سائرہ کی یہ شادی بھی کامیاب نہیں ہوگی” ثریا نے بے رحمی [illegible] کہا۔

“[illegible] لوگاں بولتے' خواب الٹا بھی ہوتا ہے۔” صابرہ نے پریشان سے لہجے میں کہا۔

“مگر تمہارا یہ خواب مجھے تو بالکل سچا لگ رہا ہے۔ سائرہ کی شادی اول تو ہوگی نہیں اور اگر ہو بھی گئی تو دیکھ لینا [illegible] بے تابانہ روتی ہوئی گھر آئے گی” ثریا نے دور کہیں سوچتے ہوئے کہا۔

“اللہ نہ کرے ایسا سچ ہوئے۔ میرے کو تو یہ سوب اچھا نہیں دکھتا” صابرہ نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

“صابرہ! بعد میں سب اچھا لگے گا۔ تم بھی میرے ساتھ ہنسو گی' ہاں۔”

☆☆☆

آج کے بعد کوئی بات نہ ہونے دیں گے
ہم تیری آنکھ سے برسات نہ ہونے دیں گے
آج کے بعد مقدر ہی تیرا دن ہوگا
تیری خوشیوں کو کبھی رات نہ ہونے دیں گے

[illegible] اپنے آفس میں بیٹھا بظاہر کام میں مصروف تھا مگر اس کا ذہن سائرہ کی جانب ہی گھوم رہا تھا۔ [illegible] اور سنجیدہ سی لڑکی تھی' دکھوں نے اسے حد درجہ محتاط سا بنا دیا تھا۔ کل شب اس کی ماں نے فون پر اس [illegible] کلرز کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔

“آنٹی! میری کوئی پسند نہیں ہے‘ جو رنگ مل جائے وہ پہن لیتی ہوں۔“

“پھر بھی بیٹا‘ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی فیورٹ کلر تو ہوتا ہی ہے۔“ اس کی ماں اس کے سامنے بیٹھی ہوئی اس سے بات کر رہی تھیں۔

“آنٹی‘ زیادہ تر میں سفید اور آف وائٹ کلرز ہی پہنتی ہوں۔ شوخ رنگ شاید شوخ لوگوں کے لیے ہوتے ہیں“ اس کے لہجے کی یاسیت اور اداسی کو انہوں نے بے حد محسوس کیا تھا اور بلال سے کہا تھا کہ سائرہ کے لیے کوئی بھی ڈل کلر نہ خریدنا۔ میں نہیں چاہوں گی کہ اب اس کی زندگی میں کوئی پھیکا اور بدرنگ موڑ بھی آئے۔

چپراسی آج کی ڈاک بلال کے سامنے رکھ کر گیا تو اس نے وہ لفافہ اٹھایا جسے بیک سے سرخ اسکوائش ٹیپ سے بند کیا گیا تھا۔

لفافے سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ اسے ایسے شخص نے لکھا ہے جسے نہ ایڈریس لکھنے کے آداب آتے ہیں اور نہ ہی لفافہ بند کرنے کے اصول معلوم ہیں۔ لفافے کے چاروں کناروں پر جلی حروف سے لکھا گیا تھا“ ارجنٹ لیٹر‘ جس کا پڑھنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے“ بلال نے مسکرا کر لفافہ اٹھا کر علاقے کی مہر چیک کی اور پھر بڑے اشتیاق کے ساتھ خط کھولا‘ پڑھا اور بے پروائی سے جیب میں ڈال لیا۔

شام کو جب وہ گھر آیا تو امی سے کہا“ میرے نزدیک ایسے بے تکے خطوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے مگر اس زنانہ رائٹنگ سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ سائرہ کے بدخواہ ان کے اپنے گھر میں موجود ہیں۔“

مسز علی نے خط پڑھ کر اس کے پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔“ فریال کے بارے میں شائستہ بیگم مجھے ازخود بتا چکی ہیں...... اور مجھے تو ان کی ہمت اور صبر پر حیرت ہو رہی ہے کہ کیسے ناسا حالات میں وہ اپنا وقت گزار رہی ہیں۔“

“آپ کے خیال میں یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟“

“سوائے ان کی بہوؤں کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔“

“میرا بھی یہی خیال ہے“ بلال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

“بیٹا‘ تمہیں آئندہ بھی محتاط رہنا ہوگا۔ اس قسم کے لوگ اپنے مذموم مقاصد میں ناکام ہو جائیں تو پھر مز اوچھے ہتھکنڈوں پر آ جایا کرتے ہیں۔“

“میں جانتا ہوں امی‘ آج کل لوگ کسی کو خوش دیکھنا بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔“

“مجھے تو ان کی بڑی بہو پر کچھ شک ہے۔ پرسوں وہ ہمارے گھر آئی تھیں تو ہر چیز کو آنکھیں پھاڑے پھا دیکھ رہی تھیں جیسے حیرت کے ساتھ انہیں صدمہ بھی ہو رہا ہو۔“

“ہاں‘ مجھ سے بات کی تھی تو یہ کہ آپ نے اپنی فیملی میں شادی کیوں نہیں کی؟“ بلال نے مسکرا کر ماں بتایا۔

“پھر تم نے کیا کہا؟“

“یہی کہ اگر سائرہ جیسی لڑکی ہوتی تو ضرور کر لیتا۔“

“بالکل ٹھیک جواب دیا تم نے۔ مجھ سے بھی اسی طرح کی فضول بات کی تھی۔ آنٹی! آپ کو جہیز تو چاہیے ناں؟ میں نے کہا جب مجھے سائرہ مل رہی ہے تو پھر کس چیز کی ضرورت رہ جاتی ہے؟“

“پھر بھی آپ سائرہ کے دونوں بھائیوں سے یہ واضح طور پر کہہ دیجئے کہ ہمیں جہیز کے نام پر کوئی چی

ہا ہیے۔ الحمدللہ ہمارے گھر میں ہر چیز موجود ہے‘ یہ چیزیں ان لوگوں کو چاہیے ہوتی ہیں‘ جو ساری زندگی ان ے لیے بلکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں پاتے کہ خود محنت کر کے کوئی چیز حاصل کر سکیں۔“

“ہاں بیٹا! یہ کمزور لوگوں کا المیہ ہے جنہیں نہ اپنے اوپر اعتماد ہوتا ہے اور نہ ہی بھروسا۔“

“آپ نے کہہ دیا ناں کہ ہم برات میں صرف گھر کے لوگ ہی لائیں گے اور ان کے گھر سے ہی سائرہ کو را کے لے آئیں گے؟“

“ہاں میں نے کہہ دیا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہیں۔“

“آپ سائرہ کے سارے ڈریسز اس کی الماری میں لگوا دیجئے گا۔ ان کے ہاں صرف ایک جوڑے اور ایک ے کچھ نہ لے جائیے گا۔“

“میرا بھی یہی خیال تھا کہ خواہ مخواہ کی نمائش سے بچا جائے۔ یوں بھی اس کے قیمتی ملبوسات دیکھ کر اس کی اں خواہ مخواہ کلسیں گی۔“

“ہاں امی! اس خط کا آپ سائرہ سے اشارتاً بھی ذکر نہ کیجئے گا ورنہ اسے صدمہ ہوگا۔“

“ہاں بیٹے! میں تمہاری بات سمجھتی ہوں۔ ہمارے گھر میں آ کر سائرہ کو کوئی ایسا دکھ نہیں ملنا چاہیے جو وہ آج نی ہوئی آئی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ میری بہو اس گھر میں آ کر ہمیشہ خوشیوں پر راج کرے۔“

☆☆☆

“شادی تو بے حد سادگی سے ہوئی تھی۔ ایک گاڑی میں گھر کے لوگ آ گئے تھے۔

“ہونہہ...... دیکھا‘ کیسے کنجوس لوگ ہیں“ ثریا بڑبڑاتی ہوئی صابرہ سے کہہ رہی تھی۔

“ہاں بھابی! اب لوگاں سادگی کے نام پر کنجوسی کرتے بیٹھتے۔“

شائستہ بیگم بے حد مطمئن تھیں۔ انہیں بلال حد سے زیادہ پسند تھا۔ شاہنواز نے جہیز تو نہیں دیا تھا مگر رخصتی ت سائرہ کو ایک لفافے میں دو لاکھ روپے رکھ کر دے دیے تھے۔

“کیا دے رہے ہو بیٹے؟“ شائستہ بیگم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

“کچھ نہیں امی! بس تھوڑے سے پیسے ہیں۔“

“پھر بھی کتنے پیسے ہیں‘ آپ امی کے ساتھ ساتھ اس کی سسرال والوں کو بھی بتائیے“ ثریا نے جرح کرتے ے کہا۔

“میں اپنی بہن کو دے رہا ہوں‘ کسی پر کوئی احسان تھوڑی کر رہا ہوں جو اتنی معمولی رقم کی تشہیر بھی کرتا “

بلال نے چہرے کے زاویے بدلتی ثریا کو دیکھا اور سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی تیزی سے ہو گئی۔

یہ بات نہ شائستہ بیگم کے علم میں تھی اور نہ ہی شاہنواز اور دلنواز کو معلوم تھی کہ وہ لوگ خوب دھوم دھام سے یں گے۔

اس دن بعد بلال نے فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے ولیمے کی تقریب منعقد کی تھی‘ جس میں اس کے بہت سے یک تھے۔ مہمانوں کا استقبال مسز علی کے ساتھ ساتھ بلال اور سائرہ خود کر رہے تھے۔ نیوی بلیو سوٹ ال جہاں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا‘ نیوی بلیو ستاروں سے بھرے غرارے میں سائرہ بھی پہچانی نہیں جا رہی

تھی۔

تقریب کے اختتام پر سائرہ نے دونوں بھابیوں کو سونے کے سیٹ گفٹ کیے تھے۔

"یہ کس خوشی میں دے رہی ہو؟" صابرہ نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ رسم بلال کے ہاں کی ہے کہ لڑکے والے اپنی سسرال والوں کو گفٹ دیا کرتے ہیں۔" ایک خوب صورت سی چین اس نے اپنی ماں کے گلے میں بھی ڈالی تھی۔ "اور یہ لاکٹ کا سیٹ میری ثنا کے لیے ہے" اس نے ثریا بھابی کو دیتے ہوئے کہا۔

"ثنا کو میں نے بتایا نہیں تمہاری شادی کا۔ اس کے ان دنوں امتحان ہو رہے ہیں۔ پتا چل جاتا تو وہ اڑ کر آ جاتی۔"

"اچھا کیا آپ نے......" سائرہ نے کہا۔

"آج فریال ہوتی تو ایک سیٹ اس کو بھی مل جاتا۔ اس لڑکی نے ہر ہر موقع پر اپنا نقصان خود ہی کیا ہے" ثم نے سائرہ سے کہا۔

اس سے قبل کہ سائرہ کی آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہنے لگتے' بلال نے سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر دوسری جانب لے جاتے ہوئے کہا "سائرہ! اپنے اسکول کے اسٹاف سے تو مل لو...... جو کتنی دیر سے تم سے ملنے کا منتظر ہے۔"

سائرہ نے ایک نظر اپنی ہونق ہوتی بھابی کو دیکھا اور بلال کی ہمراہی میں آگے بڑھ گئی جہاں پچاس کے قریب خواتین و حضرات اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔

"اللہ' کتنی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے ان ماں بیٹیوں نے" ثریا دل میں سوچے چلی جا رہی تھی۔ "ویسے تو ہمیش یہی رونا روتی ہیں کہ ہم کہیں آتے نہیں' کہیں جاتے نہیں...... مگر یہ ملنے والی کیسے نکل آئیں؟ یقیناً یہ دونوں چھپ چھپا کر لوگوں سے ملتی ہوں گی اور کیا پتا یہ بلال بھی سائرہ کے عاشق ہوں۔ آخر فریال نے بھی تو اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ بڑی بہن چالاک نکلی جو اپنے عاشق صادق کو گھیر کر گھر لے آئی۔"

بلال سائرہ کا ہاتھ تھامے تھامے اسے اپنے مہمانوں سے ملاتا پھر رہا تھا۔ اس کی پیاری پیاری بچیاں گود کے ساتھ چہکتی پھر رہی تھیں اور مارے غم اور حسد کے ثریا کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔

"کم بخت کی دوسری شادی تو شہزادے سے ہو گئی۔ اب اپنے زیور اور کپڑے لتے سے مجھے آ کر جلا کرے گی" یہ سوچ کر ہی ثریا کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

☆☆☆

تیرا خیال ہے کہ دل سے نکلتا نہیں ہے
اک زخم ہے سینے میں جو بھرتا نہیں ہے

"پھپو! بڑی گرینڈ نیوز ہے' آپ مجھے کالج سے پک کر لیں" ثنا نے فریال سے فون پر کہا۔

"کیا بات ہے' ابھی تو میں بوتیک پہنچی ہوں۔"

"فون پر بتانے والی بات نہیں ہے' آپ کو اپنے سامنے بٹھا کر سناؤں گی۔"

"آ گئے ہوں گے ٹیسٹ میں نمبر زیادہ' اس سے زیادہ کیا بات ہو گی' ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں' تم دس بعد اپنے کالج کے گیٹ پر پہنچو" فریال نے کہا۔

"تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک قریبی کیفے میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

"اب بک بھی چکو' کیا بات ہے؟"

"سائرہ پھپو کی شادی ہو گئی ہے" ثنا نے کہا۔

"کب...... کہاں...... کس سے؟" فریال پاگلوں کی طرح اسے جھنجوڑ کر پوچھ رہی تھی۔

"میں اچانک ہی گھر پہنچی تو معلوم ہوا...... ایک دن قبل پھپو کا ولیمہ ہوا تھا۔ شادی کی خبر سے مجھے بھی لاعلم ھا گیا تھا۔"

"اس قدر چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا لڑکا دیکھنے' دکھانے کے قابل نہیں ہے؟" فریال اب پریشانی ے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' بلال پھوپا بے حد شاندار پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ آپ یہ دیکھیے' ان دونوں کی صویر" ثنا نے اپنے پرس سے سائرہ اور بلال کی بڑی سی تصویر نکال کر دکھائی۔ یہ ان دونوں کے ولیمے کی تصویر تھی۔ سائرہ بلال کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی اور بلال اس کے ساتھ کھڑا اسے محبت بھری نظروں سے یکھ رہا تھا۔

"اچھا' یہ ہیں بلال بھائی...... جو کبھی ہمارے پڑوس میں ہوا کرتے تھے' پھر یہ لوگ امریکا چلے گئے تھے۔"

"ہاں' وہی ہیں۔ دادی کی بہت گہری سہیلی ہیں ان کی امی۔ بے حد پیار اور محبت سے سائرہ پھپو کا رشتہ انگا گیا تھا۔ جہیز کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا۔"

"واقعی' بہت اچھی لگ رہی ہیں سائرہ باجی! کتنے عرصے بعد میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔" فریال نے بے اختیار تصویر اٹھا کر چوم لی اور نہ چاہتے ہوئے آنسو امڈ آئے۔

"اور اب یہ دیکھیے دادی کی تصویر......" ثنا نے دوسری تصویر دکھائی' جس میں امی سائرہ کو سینے سے لگائے ڑی تھیں۔ ان کے چہرے کا حزن و ملال صاف عیاں تھا۔ خوشی اور غم کی یکساں صورت حال ان کی آنکھوں یں نظر آ رہی تھی۔

"امی...... پیاری امی! میں بھی آپ کے لمس کو ترس رہی ہوں' اپنی بانہوں میں میرے لیے بھی جگہ رکھنا" ریال نے زیر لب کہا۔

"یوں تو یہ پورا البم ہی میں آپ کے لیے لائی ہوں" ثنا نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا البم نکال کر اسے یا۔

"میں نے ہر اس تصویر کی کاپی کروائی ہے جس میں دادی' فریال پھپو اور پھوپھا ہیں۔ باقی غیر ضروری لوگوں ی اکا دکا ہی تصاویر ہیں" ثنا نے ہنس کر اس سے کہا۔

"سب ہی اہم لوگ ہیں۔ غیر ضروری تو میں تھی جو یہاں آ گئی۔ اپنے آپ فیصلے کرنے والی لڑکیاں' جو موں کی فصل کاٹتی ہیں۔ میں بھی اپنوں سے دور رہ کر کاٹ رہی ہوں۔"

"پھپو اب آپ ہی بتائیے...... اتنی اہم خبر کیا ٹیلی فون پر سنائی جا سکتی تھی؟" ثنا اس کا دھیان پھر تصویروں کی ب موڑتے ہوئے بولی۔

"ہرگز نہیں...... ثنا' آج تم نے مجھے اتنی بڑی خوشی عطا کی ہے' اس کا احسان تو میں کبھی اتار ہی نہیں سکتی۔"

"پھپو! فی الحال چکن بروسٹ کے ساتھ گرما گرم کافی منگوا لیں' سخت بھوک لگ رہی ہے اور ویٹر کافی دیر گھور رہا ہے کہ ابھی تک آرڈر کیوں نہیں کیا؟" ثنا نے کہنی مار کر دھیرے سے کہا۔

''ہاں ہاں' جو دل چاہے منگواؤ۔ میرا تو اب تصویریں دیکھنے سے دل نہیں بھرے گا۔ بھوک' پیاس تو غائب ہو گئی ہے۔''

''مجھے معلوم تھا...... آپ کو بہت خوشی ہو گی۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ سائرہ پھپو کو بتا دوں کہ آپ کہاں ہیں تاکہ وہ اب خود آ کر مل لیں...... مگر گھر میں یہ سنا کہ پاپا امی سے کہہ رہے تھے...... سائرہ کی سسرال میں یہ بات ہرگز نہ جائے کہ فریال نے اپنی پسند سے شادی کی ہے۔''

فریال کا چہرہ یہ سن کر ہی سفید سا پڑ گیا۔

''ہاں' پاپا نے پھپو کو دو لاکھ روپے دیے جو بلال پھپا نے بڑی مشکلوں سے وصول کیے۔ مگر ولیمے کی شب سب کو گفٹ کی صورت میں واپس کر دیے۔''

''شاہنواز بھائی بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ یہ میری ہی غلطی تھی جو میں نے انہیں دکھ پہنچایا۔''

''ارے چھوڑیے پھپو! اب پھپا اتنے برے نہیں ہیں کہ آپ ہر غلطی اپنے کھاتے ہیں ڈالتی چلی جاتی ہیں۔''

''بیٹا! تمہیں کیا پتا کہ لڑکیوں کو غلطی کرنے کے بعد ہی احساس ہوتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ ورنہ اس سے پہلے برا بھی برا نظر نہیں آتا۔''

''آپ کا یہ دقیق (مشکل) فلسفہ تو میں نہیں سمجھ سکتی'' ثنا نے بروسٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ثنا! کیا تم ایک دن میرے پاس گزار نہیں سکتیں؟''

''وہ کس لیے؟''

''میں تمہارے ساتھ سائرہ اور امی کی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''گھر میں کیا بہانہ بناؤں گی؟''

''کیا تم اپنی کسی سہیلی کے ہاں اسٹڈی کے لیے نہیں جاتیں؟''

''نہیں' آنٹی کہتی ہیں اپنی سہیلی کو یہیں بلا لو۔''

''ہوں' یہ ٹھیک ہے۔ جس دن تمہاری آنٹی کہیں جائیں' تم مجھے فون کر لو' میں تمہارے پاس آ جاؤں گی' اس اثنا میں اگر آنٹی آ گئیں تو کہہ دوں گی' تمہارے محلے میں میری کزنز کی شادیاں ہونے والی ہیں' میں ان کے لیے جوڑے لائی ہوں اور جب تم کراچی جاؤ تو وہ جوڑے اپنی جانب سے سائرہ کو دے دینا۔''

''نہیں پھپو! میں اب جوڑے نہیں لے جا سکتی۔ پہلے بھی امی کو بہت برا لگا تھا۔ جتنی مشکلوں سے میں نے دیے تھے' میں ہی جانتی ہوں۔''

''پھر میں کیا کروں...... میرا دل چاہ رہا ہے' اپنی بہن کے لیے کچھ بھیجوں۔''

''پیاری پھپو! آپ انتظار کیجیے' اس اچھے وقت کا جو بہت جلد آنے والا ہے۔''

''بہت مشکل ہے...... مجھے نہیں لگتا کہ میں اپنوں کی شکل اب دیکھ بھی پاؤں گی؟''

''اس دفعہ جاؤں گی تو سائرہ پھپو کے ولیمے کی کیسٹ لا کر آپ کو دوں گی۔ آپ روزانہ لگا کر دیکھا کیجیے گا۔''

''کب جاؤ گی کراچی؟''

''اس مرتبہ تو ڈیڑھ ماہ بعد جانا ہو گا' سمیسٹر کا اینڈ ہونے ہی والا ہے۔''

☆☆☆

محلے سے نیاز کے چاول آئے تو چاولوں کی ڈش پر وہی اخبار ڈھکا ہوا تھا جس میں اشرف اور فرح کی تصویریں ہیں تھی بلکہ چاول بعد میں نظر آئے...... اوپر فرح اشرف اور گھوڑے کی تصویر پہلے نظر آئی۔

چھوٹی باجی کے پاس محلے کی چار بچیاں ٹیوشن پڑھنے آتی تھیں۔ اب ان چاروں بچیوں کی کاپی پر اشرف اور رح کی تصویر والا اخبار چڑھا ہوا تھا۔ بقول بڑی آپا' یہ حرکتیں ان کے محلے والے جان بوجھ کر کر رہے تھے اور ان ہاتوں کا مقصد انہیں ذلیل کرنا تھا۔

اشرف نے اپنے دوستوں سے یہی کہا تھا کہ کسی دوسرے کی تصویر ہو گی' مری تو وہ گیا ہی نہیں تھا مگر جب ماما بان ہاؤس پر وہی اخبار چپکا تو اشرف کو غصہ آ گیا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی شریف زادیوں کی تصویریں تم اپنی دکان پر لگاتے ہو؟''

''مگر یہ تو کوئی فلم والی ہے۔ شاید کسی ڈرامے کا سین ہے' مجھے اچھی لگی اس لیے دکان پر لگا لی۔''

''مگر مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا'' وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔

''اشرف باؤ! یہ میری دکان ہے' تم اپنی دکان پر مت لگانا۔''

تب اشرف اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے چلا آیا مگر جب رات گئے اس نے وہ تصویریں جا کر اکھاڑ دیں تو ب کو یہ یقین ہو گیا کہ اشرف اپنی تصویروں کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

اب محلے کے لڑکوں نے اس کی چڑ سی بنا لی تھی' رحمان اس کے پاس ایک دن نیلا شلوار قمیص مانگنے چلا گیا' ں پر ہاتھ کی کڑھائی بھی تھی۔ اشرف نے اسے اپنا جوڑا دے دیا۔

اشرف کو غصہ جب آیا جب وہ اس کا شلوار قمیص پہن کر وہی اخبار لیے اس کے پاس آیا اور کہا' دیکھ ذرا...... اس تصویر کو بالکل یہی رنگ اور یہی کڑھائی والا سوٹ اس بندے نے بھی پہنا ہوا ہے' جو تیری شکل سے ملتا ہے۔''

''ارے بے وقوف! جس کمپنی نے یہ کپڑا اپنایا ہو گا تو اس نے صرف ایک سوٹ تھوڑی بنایا ہو گا۔ ہزار دو ہزار تو بنے ہوں گے۔'' اشرف بھی جواب دینے میں کم نہیں تھا۔

''ہاں' ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ ہاتھ کی کڑھائی بھی بے شمار سوٹوں پر ہوئی ہو گی۔''

اشرف جتنا اس بات کو چھپا رہا تھا' گاؤں کے لڑکے اس بات کو اتنا ہی اچھال رہے تھے۔ اشرف محسوس کر رہا تھا جیسے ہی وہ اپنے دوستوں میں جاتا' وہ گھوڑوں کی باتیں کرنے لگتے۔ اکثر کا یہ کہنا تھا کہ اب سارے کاروبار بیکار ہو گئے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں گھوڑے اور خچر کرائے پر چلانا سب سے سودمند کاروبار ہے۔

اشرف ان کی یہ سب کمینی باتیں سمجھ رہا تھا مگر خاموش تھا۔ بولنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی' ان ہوں ایک انجانا سا دکھ' ایک غم...... ایک کسک سی اس کے اندر پل رہی تھی۔

بظاہر وہ گھر میں ہنس بول بھی رہا تھا مگر اندر سے گم صم سا تھا۔ کوئی چیز اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا غم کا کوئی پتھر اس کے سینے پر آ گرا ہے اور وہ شدید بیمار ہے۔

دوسری جانب شجاع کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ شاید بدلتے ہوئے موسم کا اثر تھا۔ سر میں شدید درد تھا' جسم ا لگ رہا تھا جیسے ٹوٹ رہا ہو۔ نہ کچھ کھانے کو دل چاہ رہا تھا اور نہ پینے کو۔ دو مرتبہ حفیظ بلانے آیا' اس کو بھی منع دیا۔

''پتر' باہر گھوم کے آ...... تیری طبیعت بہلے گی۔ بندہ ہر ویلے بستر کا ہو جائے تو طبیعت خراب ہی ہوتی ہے' عظمت بیگم نے شجاع سے کہا۔

''میرا کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔''

''لگتا ہے تیری طبیعت خراب ہے۔''

''نہیں' میں ٹھیک ہوں۔''

''اچھا بتا' آج کیا کھائے گا؟ تیرے پسند کی کوئی چیز پکا دوں۔ گوشت میں پالک ڈالوں یا کریلے' پائے بنالوں یا اسٹو واچھا لگے گا؟''

''آپ کا جو دل چاہے بنالیں' مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''تجھ سے نہیں پوچھوں گی تو کیا دیواروں سے پوچھوں گی۔ اس گھر میں ہے ہی کون...... میں اور تو......''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ کا جو دل چاہے پکالیں۔ میں تو چکھوں گا بھی نہیں۔ کھانے کے نام سے ہی میری طبیعت مالش کر رہی ہے۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ بات کیا ہے؟ بھوک کل بھی نہیں تھی' پرسوں بھی نہیں تھی۔ عید کے بعد سے پتا نہیں تجھے کیا ہو گیا ہے؟ چپ چپ بیٹھا رہتا ہے۔''

''امی! بندہ کیا ایسے ہی پریشان نہیں ہو سکتا؟''

''کیسی پریشانی......؟ بغیر وجہ کے تو کوئی پریشانی ہوتی ہی نہیں ہے۔''

''سچ کہہ رہا ہوں امی! ان دنوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ عجیب بے کلی سی چھائی رہتی ہے۔ اول تو رات کو نیند نہیں آتی......اور جب کبھی آ جاتی ہے تو ایسے ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں جو آنکھ کھل جانے کے بعد بھی مجھے خوف زدہ رکھتے ہیں۔''

''ہائے' میں مرجاواں......تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں' میں مولوی صاحب سے تعویذ لے کر آ جاتی۔''

''کیا بتاتا......آپ کو' عجیب سا ڈیپریشن ہے' جس کا میں کوئی نام ہی نہیں دے سکتا۔''

''پھر بھی' ڈاکٹر کو جا کر بتانا چاہیے......چل اٹھ' میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔''

''نہیں' میں کہیں نہیں جا رہا' ڈاکٹر صاحب بھی عجیب ہی ہیں' کوئی بھی بیماری بتاؤ' دو لال کیپسول' دو سفید گولیاں اور دو پیلی دیتے ہیں۔''

''اچھا......آ...... میں تیرے سر میں تیل لگا دوں' اس سے تجھ کو سکون ملے گا۔ اپنے گاؤں کے ڈاکٹر کے ہاتھ میں بے حد شفا ہے۔ شام کو ضرور جانا' دوا وہ کیسی بھی دے' آرام ضرور آتا ہے۔''

''لگا دیں تیل!'' شجاع ان کے پیروں کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

عظمت بیگم نے اپنی ہتھیلی پر ذرا سا تیل ڈالا اور پوروں کی مدد سے اس کے سر میں لگانے لگیں۔ شجاع نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا سر وہیں تخت کے ساتھ ٹکا دیا۔

وہ پوروں کی مدد سے ہلکے ہلکے مالش کرنے لگیں۔ دونوں انگوٹھوں کی مدد سے گردن کا بھی نیچے اوپر مساج جاری تھا۔ تب چند ہی منٹوں میں شجاع پر غنودگی سی طاری ہو گئی اور اس کا سر خود ہی ماں کے زانو پر آ گیا۔

اس اثنا میں پڑوسن آئیں تو عظمت بیگم نے انہیں بھی اشارے سے خاموش کر دیا کہ شجاع کی آنکھ کھل جائے گی۔ بلغوں نے قیں قیں کر کے شور مچایا تو ملازم بچے سے اشارے سے کہا' دروازہ کھول کر انہیں باہر نکال ''۔

اب شجاع ماں کے زانو پر سر رکھے سو رہا تھا اور ماں کے ہاتھوں کی شفیق سی گردش اس کے سر پر جاری تھی اور ان کی یہ خواہش تھی کہ شجاع کو زیادہ سے زیادہ آرام ملے اور وہ کچھ نیند بھر لے۔

کتنا تھکا تھکا سا لگ رہا تھا وہ۔ اب وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ ایک انجانا سا دکھ اس کے ہرے پر رقم تھا۔

''ایسی کیا بات ہے' جو مجھے نہیں معلوم اور میرے بچے کو دکھی کر رہی ہے؟'' وہ اپنے دل میں سوچ رہی تھیں۔

یک ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجی۔ عظمت بیگم نے غصے سے فون کی جانب دیکھا۔ اس وقت اس کی آواز انہیں بے حد بری لگی تھی۔ ملازم بچہ بھی باہر تھا ورنہ وہ اس کو اشارہ کر کے کہہ سکتی تھیں' ٹیلی فون کا بٹن بھی بند کر دے۔ پڑوسن بھی اکتا کر واپس جا چکی تھیں۔ ٹیلی فون پھر دہاڑ رہا تھا۔ وہ اس سچوئیشن میں بیٹھی تھیں کہ خود بھی نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ ٹیلی فون مسلسل چیخ رہا تھا۔ شجاع نے گھبرا کر آنکھ کھولی اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔

''اچھا......واقعی...... ہرا......'' وہ دیوانہ وار چیخا۔

عظمت بیگم کو یوں لگا جیسے شجاع کا دماغ الٹ گیا ہو۔ ''پتر جی! خیر تو ہے......؟'' ان کا لہجہ سراسیمہ سا ہو گیا۔

''اچھا......ٹھیک ہے'' بہت جلدی کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور ماں سے آ کر لپٹ گیا۔

''کیا بات ہے بیٹا!'' وہ عجیب روہانسی سی ہو رہی تھیں۔

''آپ دادی بن گئی ہیں...... پوتا ہوا ہے آپ کے۔'' شجاع نے سرشار لہجے میں بتایا۔

''پوتا ہوا ہے......؟'' سرشاری سے بلند آواز میں وہ بولیں۔

''ہاں امی' ابھی اسپتال سے فون آیا ہے۔ میرا بیٹا خوب صحت مند ہوا ہے۔ دس پاؤنڈ کا ہے۔ نگین اسی وجہ سے مجھے فون نہیں کر رہی تھی۔ وہ چار دن پہلے سے اسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ جھلی نے مجھے بتایا تک نہیں' میں خواہ مخواہ پریشان ہوتا رہا۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر' تو نے مجھے یہ دن دکھایا۔''

''فرحت کو بتا آؤں جا کر؟'' وہ کھل کھلاتے سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کی ساری جھلاہٹ اور پریشانی ہوا ہو چکی تھی۔ اب اسے نہ کوئی تکان تھی اور نہ کوئی الجھن۔ اس وقت تو اس کا گھوڑے کی طرح قلانچیں مارنے کو جی کر رہا تھا۔

''خالی ہاتھ نہیں جاتے' مٹھائی لے کر جا۔''

''کتنی لاؤں مٹھائی؟'' اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟

''فی الحال دس سیر مٹھائی لے آ...... محلے میں بھی بانٹ دوں گی۔''

وہ گھر سے باہر نکلا تو حفیظ جاتا نظر آیا۔ اسے آواز دے کر بلایا اور بتایا ''بھئی تم چچا بن گئے ہو'' حفیظ نے مبارک باد دی۔ اسلم نظر آیا تو اسے بتایا۔

شجاع کا بس نہیں چل رہا تھا کہ راستے میں ملنے والے ہر شخص کو یہ نوید دیتا ہوا چلے......کہ میں باپ بن گیا ہوں اور میرے یہاں ایک پیارا سا بیٹا ہوا ہے۔ اب وہ خود ہی مسکرا رہا تھا۔ فیروزہ نے اسے کراچی آنے کو کہا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے جلدی آنے کی حامی بھر لی تھی۔

شجاع کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر نگین کے پاس پہنچ جائے اور اپنے بیٹے کو دیکھے۔

''شجاع بادا! کیا بات ہے' خود سے باتیں کرتے ہوئے جا رہے ہو' طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری......؟' اپنی دکان سے آتے ہوئے اشرف نے اسے دیکھا تو ہنس کر پوچھا۔

''آج میرا بیٹا ہوا ہے...... مٹھائی لینے جا رہا ہوں۔ آپ کے گھر بھی مٹھائی آئے گی۔ شجاع نے معصوم سے لہجے میں اسے بتایا۔

''اچھا اچھا......'' اشرف کو تو یہ سن کر ہی پتنگے لگ گئے...... اور مبارک باد دیے بغیر ہی وہ آگے تیزی سے بڑ گیا۔ شجاع تو اپنی دھن میں مست تھا' اسے تو اشرف کے چہرے پر پھیلنے والی نفرت کی سلوٹوں کا بھی احساس نہیں ہوا۔ مگر اشرف دندناتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ راستے میں رکھے جگ پر ایک ٹھوکر ماری۔ ٹیڑھی کرسی کو لات مار کر سیدھا کیا اور فرح کے پاس کمرے میں جا پہنچا۔

وہ مری کی تصویریں دیکھ کر خود ہی خود ہنس رہی تھی۔

''بند کرا اپنی ٹھٹھے بازیاں......'' وہ چلایا۔

''کیا بات ہے جی!'' وہ پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔

''شجاع کے بیٹا ہوا ہے'' وہ نفرت سے بولا۔

''تو پھر ہم کیا کریں...... وہ جانے اور اس کی بیوی جانے۔ اس کے بیٹا ہوا ہے تو کیا ہم ڈھول با بجائیں؟'' فرح نے اپنے لہجے میں تمسخر پیدا کیا۔

''پھر ہرا دیا اس نے مجھے...... ہمیشہ ہراتا رہا ہے وہ مجھے۔ میں کب تک اس سے شکست کھاتا رہوں گا؟'' وہ جیسے پاگل ہو رہا تھا۔

''کوئی نہیں ہارے تم...... میری تم سے شادی ہوئی ہے' شجاع سے نہیں۔''

''شجاع سے ہو جاتی تو اچھا تھا ناں' پھر وہ بے اولاد رہتا اور میرے اولاد ہو جاتی...... صرف تیری وجہ سے م بے اولاد ہوں...... صرف تیری وجہ سے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! ڈاکٹرنی نے بتایا تھا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''بڑی آپا نے بتایا ہے' تمہارے خاندان میں نامرادی زیادہ ہے۔ تمہاری ایک پھپھو کے بچے نہیں ہیں۔ تمہاری بڑی خالہ بے اولاد ہیں۔ تمہاری ایک تائی نے کسی کا بچہ گود لیا تھا اور...... اب تمہاری چھوٹی بہن کے ہ کوئی بچہ نہیں ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ایسی مثالیں تو ہر خاندان میں ہوتی ہیں' اور میری چھوٹی بہن کی شادی کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی کسی کے بچہ ہوا ہے جو میری بہن کے ہوگا؟''

''تیری شادی کو تو اتنے سال ہو گئے ہیں۔ وقت تیزی سے بھاگتا جا رہا ہے۔ تیرے تو بلی کا بچہ بھی نہیں ہوا۔''

''اللہ نہ کرے' میرے بلی کا بچہ ہو۔'' فرح اچھل ہی تو پڑی۔

''تڑ تڑ جواب دیے جائے گی' خاموش نہیں رہ سکتی'' اشرف کو غصہ ہی آ گیا۔ ''اتنا پیسا خرچ کیا' اتنا گھما پھرایا...... کیا فائدہ ہوا' جب تیرے نصیب میں ہی اولاد نہیں ہے تو کیسے ہو سکتی ہے۔''

فرح دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔ مری کی وہ چار تصویریں جو اس نے وہاں ڈیجیٹل کیمرے س بنوائی تھیں' انہیں واپس لفافے میں رکھ کر مچان پر رکھ دیا تھا۔

''اب بھیں بھیں کرنے کی ضرورت نہیں' جا میرے لیے کھانا لے کر آ۔''

ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی جب وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو بڑی آپا نے اماں کے کہنی مارتے ہوئے آہستگی سے کہا ''تعویذ نے اثر تو دکھانا شروع کیا ہے۔ آج کتنے عرصے بعد اشرف نے فرح کو ڈانٹا ہے ورنہ ان کے کمرے سے ہر وقت قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں جو ہمارے سر پر پتھر کی طرح لگا کرتی تھیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے بھی آج عرصے بعد سکون سا محسوس ہوا ہے ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی یہ اپنا اشرف ہاتھ سے نکل گیا ہے۔''

☆☆☆

''امی حضور آج آپ کو کھانے پر بلائے تھے تو آپ کائے کو نہیں آئے؟'' رعنا ٹیلی فون پر منور کی کھنچائی کر رہی تھی۔

''یونیورسٹی میں گروپ ڈسکشن تھا اس لیے دیر ہو گئی۔ واپسی پر یونیورسٹی کا پوائنٹ خراب ہو گیا' اس میں مزید دیر ہوئی۔ گھر گیا تو کھانا کھا کر سو گیا۔ ایسی تھکن کی حالت میں' میں تمہارے گھر کیسے آ سکتا تھا؟''

''تو تمے اتا گھما پھرا کو کائے کو بول رہے باوا؟ صاف بول دیو بھول گیا'' رعنا نے چاپلوسی زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں' بھول گیا تھا۔''

''میں یاد ہوں ناں...... یا وہ بھی تمی بھول کو بیٹھے؟''

''تم کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں؟'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''سچی بولتے ناں آپ؟''

''نہیں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اب میں قسما قسمی کرا کروں گا تمہارے سامنے۔ جو بھی بات کرتی ہو' تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ پہلے میں حلف اٹھاؤں اس کے بعد بات کروں؟''

''اللہ' ایسا میں کب بولی؟'' رعنا بے اختیار ہنسنے لگی۔

''آہستہ ہنسو' کیا چیخ چیخ کر ہنس رہی ہو' خالہ سمجھیں گی پتا نہیں میں تم سے کس ٹائپ کی باتیں کر رہا ہوں۔''

''میں تو بول دی امی جان کو' انوں تو میرے عاشق ہو بھی چکے۔'' رعنا نے بے حد اطمینان سے کہا۔

''لگتا ہے امتحان میں فیل ہو گی' پڑھنے میں دل لگانے کے بجائے بیکار کی باتوں میں تمہارا دل لگتا ہے' یہ ہر وقت ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھ کر فلمیں دیکھنے کا نقصان ہے۔''

''اچھا...... میں تو فائدے میں ہوں۔ آپ کو نخ صان دکھتا؟'' رعنا پھر ہنسی۔

''ہر بات کا الٹا جواب دینے میں تو تم ماسٹر ہو۔''

''اب یہ آپ کے نصیباں...... میں کیا کرے سکتی؟'' وہ شرارت سے ہنسی۔

''اچھا خالہ سے کہنا' میں کل امی کے ساتھ آؤں گا۔'' منور نے سادگی سے کہا۔

''اکیلے نکو آ سکتے آپ؟''

''کیوں بھئی' اکیلے بلانے کی کوئی وجہ؟''

''میرے کو نکو اچھا دکھتا کہ آپ ہمیشہ پہرہ داری میں آتے۔ کھالہ کی انکھاں ہر وخت آپ کو کھوجتی رہتیں۔ کہاں گئے...... کدھر مڑے...... کاں چلے' کاں رکے؟'' وہ صابرہ کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔ امی کو اگر میں بتا دوں تمہاری باتیں تو وہ ایک منٹ میں منگنی کی انگوٹھی اتار لیں گی، آئندہ ان کا مذاق مت اڑانا۔"

"جی نہیں، میں تو یہ سوب مجھاں میں بول رئی۔ میری کھالہ میرے کو کتنے اچھے لگتے، میں آپ جانتی بیٹھی، مگر آپ سے تو مذاخ میں بھی کچھ بولتیوں تو آپ کا لہجہ تو فوراً تلوار بن جاتا ہے، میاں تو عاشخ ہوتا ناں...... کائے کو آپ ایسا بولتے؟" رعنا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"میرا دماغ خراب ہے۔ بس تم یہ بات یاد رکھا کرو" منور نے کہا۔

☆☆☆

ہوتا ہے ذرا مشکل ہر کام زمانے میں
منزل کے سب ہی راستے آسان نہیں ہوتے

شوہر آفس تھے، چاروں بیٹے اپنی اپنی دلچسپیوں میں گم گھر سے باہر تھے۔ ملازم گھر کے کام سے فراغت پا کر سرونٹ کوارٹر میں چلے گئے تھے اور نینا کافی کا مگ تھامے صوفے پر بیٹھی تھی۔ بظاہر اس کی نظریں ٹی وی کے چیختے پکارتے پروگرام کی جانب تھیں مگر اس کا ذہن فیروزہ اور فرید احمد کی جانب تھا۔

فرید احمد اس سے عشق کرتا تھا۔ وہ کتنا چاہتا تھا اس سے شادی کرنا...... مگر نینا کو ایک دکان دار سے شادی کرنا پسند نہیں تھا۔ کیسی عجیب بات تھی، اس کی عاشقی اچھی لگتی تھی، اس کی باتیں جاں افزا ہوا کرتی تھیں۔

وہ اسے پسند کرتی تھی، اس کی ہمراہی میں خوش ہوتی تھی مگر بطور شوہر ساری زندگی ایک دکان دار کے ساتھ زندگی بسر کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ جس دن فرید احمد کی اماں اور آپا اسے دیکھنے کے لیے آنے والی تھیں، فرید احمد نے بطور خاص اسے سمجھایا تھا۔

"اماں کو جھک کر سلام کرنا، دوپٹا سر پر رکھنا، اونچی آواز میں بات مت کرنا، ماڈرن تنگ فٹنگ کے کپڑے مت پہننا۔ شادی کے بعد جس طرح چاہے رہنا۔ تم میرے ساتھ الگ گھر میں رہو گی مگر اس وقت ان کے حساب سے رہنا۔"

اور وہ قصداً سلیو لیس شرٹ پہن کر ان کے سامنے آئی تھی۔ فرید احمد نے تو اونچی آواز میں بولنے کو منع کیا تھا اور اس نے ان کے سامنے اونچے اونچے قہقہے لگائے تھے۔ ان کی ہر بات کاٹی تھی۔

"بیٹا، تم چادر نہیں لیتی ہو؟" آپا عظمت نے اس سے ایک ہی بات پوچھی تھی جبکہ ان کی اماں تو اس کا پہناوا دیکھ کر ہی سہم گئی تھیں۔

"ہمارے ہاں چادریں صرف بیڈ پر بچھتی ہیں۔" اس نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا اور اماں اس کا جھولتا ہوا دوپٹا دیکھ رہی تھیں جو زمین پر لوٹیں لگا رہا تھا اور پھر وہی ہوا، جو وہ چاہتی تھی۔ فرید احمد کے سامنے مظلوم بھی بنی رہی اور اپنا مقصد بھی پورا کر لیا۔

مگر ایک سرمائے دار سے شادی ہونے کے بعد فرید احمد اسے سچے دل سے یاد آیا، اس کی کمی اس نے ایمانداری سے محسوس کی۔ اپنے غلط فیصلے کا اسے شدید دکھ ہوا۔ یوں دوستی کے ناتے میں اس نے فرید احمد کو بھی اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس سے دوری اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔

کافی کی کڑواہٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس کے دل میں یک دم خالی پن کا احساس ابھرنے لگا۔ اسے دفعتاً یوں محسوس ہوا کہ فیروزہ نے ہاتھ پکڑ کر فرید احمد کو اٹھا لیا ہو...... اور وہ اس کی ہمراہی میں آگے ہی آگے بڑھتا ایک مرتبہ بھی اسے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا ہو۔

اس لیے اس نے خود کو صفر ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

کیا میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ کیا میری ذات یوں ہی بے یقین، بے سمت اور بن محبت کے ہی رہے گی؟ میری اولین غلطی یہ رہی کہ میں نے فرید احمد سے شادی نہیں کی۔ اگر کر لیتی تو وہ ہمیشہ میرا دیوانہ رہتا اور ساری زندگی مجھے محبوب بنا کر میری ہر بات مانا کرتا۔ سرمائے دار خاں صاحب سے شادی کر کے مجھے ملا ہی کیا؟ بے یقینی اور بے سکونی۔

کافی کا مگ اس نے میز پر رکھ دیا اور وہ فیروزہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ جتنا وہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی اتنا ہی اس کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اخروٹ کی طرح اسے توڑ ڈالے۔

میرا شمار شاید ان عورتوں میں ہے، جنہیں بروقت جواب نہیں سوجھتا۔ اب گھر میں ہمہ وقت رہنے والی عورت مجھے باتیں سناتی رہی اور میں نے اس کی طبیعت بھی صاف نہیں کی۔ نینا کو فیروزہ کی باتیں یاد رہی تھیں اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ "اس کی یہ مجال کہ اس نے مجھے بدمعاش تک کہہ دیا۔"

نینا کا غصہ جب سوا نیزے پر پہنچنے لگا تو اس نے فیروزہ کے گھر فون کیا۔ اس وقت فرید احمد اپنی دکان پر

فیروزہ نے نینا کی آواز سن کر طنز سے کہا "محترمہ! آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت آپ کے محبوب گھر نہیں ہوا کرتے ہیں۔ لگتا ہے عمر کے ساتھ آپ میں بھول بڑھ رہی ہے۔"

"معلوم ہے مجھے" وہ چڑ کر بولی۔

"پھر کس لیے فون کیا ہے مجھے؟ آپ کی تو مردوں سے دوستی ہوتی ہے، آج ایک عورت کو فون کر لیا؟ شاید غلطی سے ہوا ہے...... ہے نا؟"

"نہیں، میں نے تمہیں ہی فون کیا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ فرید تم سے کسی صورت شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ وہ تم سے شادی کر لے۔ یہ میرا تم پر احسان ہے کہ آج تمہارا شمار بیاہی ہوئی خواتین میں ہوتا ہے ورنہ تمہاری کئی کزنز بوڑھی ہو گئیں مگر انہیں کوئی بر نہیں جڑا۔" نینا رعونت بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ کا بہت بھاری احسان، جو آپ نے فرید پر زور دیا۔ کاش، آپ خود شادی کر لیتیں...... اور یہ احسان اپنی ذات پر کرتیں تا کہ اس بڑھاپے میں آپ کو یوں در در بھٹکنے کی نوبت تو نہ آتی" فیروزہ نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

"فیروزہ! تم آخر مجھے سمجھتی کیا ہو؟" چیخ کر پوچھا گیا۔

"صرف ایک کرپٹ عورت، جو اپنے آپ کو، اپنے شوہر کو اور اپنے بچوں تک کو دھوکا دیتی ہے، جو صرف نام کی مسلمان ہے۔ اس کا ہر لمحہ یوں گزرتا ہے کہ جتنی بھی نفرین بھیجی جائے، وہ کم ہے۔"

"سارا مسئلہ کلاس کا ہے، جو تم سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ فرید احمد میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتا ہے اور میں بھی اس سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرتی ہوں اور تم کیا سمجھ سکتی ہو، جس کا کوئی دوست نہیں ہوتا وہ ہوتا ہے۔"

"بڑی بے حیا کلاس سے تم تعلق رکھتی ہو۔ شوہرانہ خصوصیات غیر بندوں میں ڈھونڈتی پھرتی ہو۔"

"وہ غیر کہاں ہے' وہ تو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ ہم ساتھ ہی جوان ہوئے' اس کی محبت میری رگ رگ میں خون کے ساتھ رواں دواں ہے۔ میں تو جب تک اس سے بات نہ کرلوں' مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ میرا گسار ہے اور میں اس کی دم ساز ہوں۔"

"تم جس کلاس سے تعلق رکھتی ہو' وہاں مرد اور عورتوں کی دوستی کا مطلب ہی طوائفانہ ہوتا ہے۔"

"مگر ہمارے بیچ نہ کوئی ایسا مسئلہ ہے اور نہ کبھی اس کی ضرورت پیش آئی...... مگر فیروزہ بیگم' تمہارا چھوٹا دماغ یہ سب نہیں سمجھ سکتا۔"

"تم اپنے شوہر کی جتنی گناہ گار ہو' کاش اس جانب بھی سوچا کرتیں تو تمہیں اچھے برے کی تمیز بھی رہتی۔ یہ تمہارا شماران عورتوں میں ہے جو اپنے آپ کو عورت بھی نہیں سمجھتی ہیں۔ تم تو ان بری عورتوں سے بھی بدتر ہوجا جسم بیچتی ہیں۔"

"اسٹوپڈ عورت! تعلیم سے تم آراستہ نہیں ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ مجھ جیسی عورتوں کا مقام کتنا بلند ہے۔"

"نینا! اگر کہیں سے چلو بھر پانی ملے تو اس میں ڈوب جانا...... تم ہر روز پستی کی جانب سفر کررہی ہو' تم جس کی اپنی ادائیں' شاطرانہ حرکتیں کرکے غیر مردوں کو گرفتار رکھتی ہو' وہ یہی باور کراتی ہیں کہ تمہاری حقیقت سوا ڈسٹ بن کے کچھ بھی نہیں۔ ہاں' تم وہ ڈبا ہو جس میں کوڑا پھینکا جاتا ہے۔"

فیروزہ نے اس کا جواب سننے سے پہلے نہ صرف لائن کاٹ دی تھی بلکہ ٹیلی فون کا پلگ بھی باہر نکال دیا تھا۔ نینا اپنے گھر میں بیٹھی فیروزہ کو گالیاں دے رہی تھی۔ "نہ تجھے طلاق دلوائی تو میرا نام بدل دینا۔" وہ بیٹھ پلان بنارہی تھی۔ فیروزہ کی باتیں سن کر وہ سلگ ہی اٹھی تھی۔

فرید احمد نے ہمیشہ فیروزہ کے لیے سیدھی سادی' گنوار اور کم تعلیم یافتہ خاتون کا نقشہ کھینچا تھا مگر وہ تو چالا مکار اور چلتر سی محسوس ہوئی تھی۔ زہر اگلنے میں تو کوئی اس کا ثانی ہی نہیں تھا۔

"ایسی عورت کو تو مجھ سے ڈر کر رہنا چاہیے تھا۔ میرے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنے مجازی خدا کی بھ مانگنی چاہیے تھی۔ بے وقوف عورت کو صرف یہ معلوم ہے کہ اس کا میاں میرے قبضے میں ہے' وہ یہ نہیں جانتی کہ میں فرید سے یہ کہوں کہ فیروزہ کو طلاق دے دو' تو وہ طلاق دینے میں دیر نہیں لگائے گا اور پھر جب اجڑ جائے گ آنسوؤں کا سمندر بہاتی پھرے گی۔ اس کو اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اس کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ فیر بیگم' تم کن خیالوں میں ہو' میں اگر چاہوں تو تم روزانہ آٹھ آٹھ آنسو روؤ اور تمہارے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی ہو۔"

اپنی گھناؤنی سوچ پر وہ زعم بھرے انداز میں مسکرائی اور پھر اس کی انگلیاں فرید احمد کے موبائل کے نمبر پر چ لگیں۔

☆☆☆

"صابرہ' محلے سے یہ دو سیپارے آئے ہیں' ذرا ان کو پڑھ دو۔ اب قرآن خوانی کا یہ نیا انداز شروع ہورہا کہ دو دو سیپارے لوگوں کے گھروں میں بھجوا دیتے ہیں' انہیں پڑھ دو" ثریا نے کہا۔

"نہیں بھابی پاشا! میں نہیں پڑھ سکتی۔"

"اچھا' تم نے ابھی تک قرآن پاک نہیں پڑھا ہے؟" ثریا نے حیرت سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بھابی! میں قرآن شریف پڑھی' حدیثاں پڑھی' پھر اسکول جا کو پڑھی۔ اردو' انگر

ساب کتاب سوب میرے کو آتا۔"

"تو پھر نہ پڑھنے کی کوئی وجہ......؟"

"میرے کو پھولاں آئے وے ہیں ناں" صابرہ نے شرما کر کہا۔

ثریا سمجھ تو گئی تھیں مگر مذاق میں نقالی کرتے ہوئے اسی کے لہجے میں بولیں "صابرہ! کیا آپ پودا ہیں کی آپ کو پھولاں لگتے؟"

"ہاں بھابی! ہر عورت پودا ہوتی' ہور اس کو پھولاں آتے۔"

"اچھا' یہ تو مجھے آج نئی بات پتا لگی۔" ثریا ہنسنے لگی۔

"بھابی پاشا! آج کل میں "ویسی" ہوں ناں......"

"ایسی ویسی...... کیسی" ثریا کو بھی اس سے بات کرنے میں مزہ آرہا تھا۔

"اللہ...... آگے کیسے سمجھاؤں...... میں...... ابھی میں پاکی کا نہانا نکو نہائی' اس واسطے پڑھ نکیں سکتی ناں" صابرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' اماں کے کمرے میں بھجوا دو۔ وہ پڑھ لیں گی' میں سونی ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھ رہی ہوں۔ روپ ریکھا اس میں گا رہی ہے۔"

"اللہ میرے کو بھی یہ دیکھنا ہے۔ خاضی تو خیر (قاضی توقیر) کی آواز کی تو میں بی دیوانی ہوں ناں' آپ بول دیوانی کو۔"

"امی......! ارم باجی نے آپ کے لیے دو سیپارے بھیجے ہیں' آپ پڑھ کر ان کے ہاں بھجوا دیجئے گا" ثریا ساس کے کمرے کے سامنے رکھ کر کہا اور ان کا جواب سنے بغیر اپنے کمرے میں آگئی جہاں اس کی پسندیدہ گلوکارہ تھرکتے ہوئے ملکہ ترنم نور جہاں کا شہرہ آفاق گیت چاندنی راتیں' تاروں سے کریں باتیں گا رہی تھی۔ ثریا بھی اپنی بے سری آواز اس کے ساتھ ملا کر گانے لگی۔

شاہنواز کمرے میں داخل ہوا تو ثریا کو احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی اس کمرے میں آیا ہے۔ صوفے پر بیٹھے شاہنواز نے ریموٹ سے ٹی وی بند کردیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" ثریا نے پھر کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاہنواز ماتھے پر تیوری چڑھائے اسے غصے سے گھور اٹھا۔

"کوئی عقل' کوئی تمیز' کوئی تہذیب' کوئی شائستگی بھی ہے تم میں؟" وہ بپھر کر بولا۔

"میں نے کیا' کیا ہے آخر؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"سائرہ کی شادی کو اتنے دن ہوگئے۔ وہ لوگ گھوم پھر کر بھی واپس آگئے' تم نے ابھی تک اس کی دعوت نہیں لی؟"

"دو چار روز کے بعد وہ ملنے کے لیے آتو جاتی ہے ناں۔ ایسا تو نہیں ہوا ناں کہ وہ گھر میں نہ آئی ہو۔" ثریا رسان سے میاں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہاری وجہ سے نہیں آتی' وہ امی سے ملنے آتی ہے۔"

"اچھا' میں تو سمجھ رہی تھی کہ مجھ سے ملنے بھی آتی ہے؟"

"ثریا بیگم! ویسے تو تم اپنے آپ کو بے حد سمجھ دار اور سوشل کہتی ہو' ہر رسم و رواج سے واقف ہو' مگر تمہیں اتنا

یاد نہیں رہا کہ شادی کے بعد بہن، بہنوئی کو بطور خاص بلایا جاتا ہے۔"

"آپ نے کہہ دیا، میں اس سے کہہ دوں گی" ثریا زچ ہو کر بولی۔ شاہنواز کا یہ ناصحانہ انداز اسے ناگوار گزر رہا تھا۔

"یہ طریقہ نہیں ہوتا کسی کو بلانے کا کہ اپنے گھر میں ہی بیٹھ کر اسے دعوت دے دو۔"

"تو کیا خط لکھ کر بھیجوں یا تار دوں کہ تمہاری دعوت ہے۔"

"بکواس کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کے گھر فون کر کے کہو اس کی ساس کو بھی بطور خاص اور بلال کو میں فون کروں گا۔"

"اللہ دعوت کیا ہو گئی، قیامت ہو گئی۔ ایک ایک شخص کو الگ الگ نوتا دیا جا رہا ہے" ثریا غصے میں بولی۔

"ثریا......! تم نے زندگی کے اتنے ڈھیر سارے دن میرے ساتھ گزارے ہیں، نہ تم میرے مزاج سے واقف ہوئیں اور نہ ہی تم میں شائستگی آئی۔ وقت نے تمہیں تو بالکل بھی نہیں سنوارا۔" تب تم ثریا حیرت، غصہ اور صدمے سے میاں کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

پہلے تو یونہی گمان سا ہوا۔ ان کا ذکر ان کی باتوں میں سے کسی سر کی طرح ابھرا تھا۔

"اچھا...... یہ بات ہے۔ یہ دونوں بہنیں بیٹھ کر میرے خلاف کوئی محاذ بنا رہی ہیں" ثریا نے سوچا۔ ان کے لال نے پھر شبہے کا رنگ اختیار کیا۔ صابرہ اپنی بہن کے کانوں میں منہ ڈالے کھی کھی کر رہی تھی۔

صابرہ کی یہ بہن گاہے بہ گاہے آتی ہی رہتی تھیں مگر آج جس انداز میں وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں ثریا کو اب یقین ہو چلا تھا کہ تختۂ مشق ان ہی کی ذات ٹھہری ہے۔

اب ثریا بظاہر بے پروائی سے ان کے کمرے کے سامنے سے گزری تھیں مگر ان کی سماعت ان ہی کی جانب تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بھی اس کرسی پر بیٹھیں جہاں سے صابرہ کے کمرے کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی اں۔

"اللہ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا ناں......" آپا نے حراساں سے لہجے میں کہا۔

"یہی میں بولتیوں ہوں نا...... پر انوں کو جیسے کوئی فکر اچ ہی نہیں، ایسے مزے لے کو گھومتی کہ اللہ توبہ نفرت ال، یہ کو......"

"پہلے ٹھنڈا پانی ڈالو...... ہاں، بس اتنا...... نہیں تھوڑا اور بڑھالو" صابرہ کی آپا بول رہی تھیں اور ثریا کو یوں ہا تھا، کوئی جادوئی پانی ان پر انڈیلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

"انوں بہوت تیز ہے آپا...... مجھے دیکھ کر بھاگ جائے گی۔"

"چل کے پاگل کدھر کی...... تیرے کو معلوم بھی پڑ گیا جیسا......"

"آپا میں اس کی انکھاں پہچانتی ہوں۔"

"اچھا، کیسی نظراں ہے انوں کی......؟"

"انوں بہوت مکار ہے۔ کل کیسے نظراں تھے کی بس...... میں تو لرز کر رہ گئی تھی۔"

"آج انوں تمہارے کمرے میں آتے تو کھولتا گرم پانی اس پر چپکے سے ڈال دو۔"

باہر بیٹھی ثریا غصے اور صدمے سے سرخ سی ہو گئیں۔

"آج وہ ٹکیں آئیں گی...... دیکھ لینا۔"

"ے کو؟"

"وہ بجھ کو بیٹھی ہے، آج اس کے سنگات کیا ہونے والا ہے بول کے......!"

"ت سارا نمک اور مرچاں بھی ڈال دیو۔" آپا ایک کے بعد ایک تیر بہدف نسخہ بتا رہی تھیں۔ اس سے قبل ل پر پہنچتیں کہ ثریا کو گن سے شوٹ کر دو، ثریا تنتناتی ہوئی ان کے کمرے میں گئیں اور اشتعال انگیز لہجے میں بولیں

"صابرہ! تم مجھے مارنے کے پلان بنا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں اور حرکتیں کرتے ہوئے؟"

"اللہ، مر جاؤں میں......" صابرہ اپنے گالوں کو انگلیوں سے ہولے ہولے مارتے ہوئے بولی۔ کیسی بری

زبان نکالے جی آپ! اللہ نہ کرے آپ کی چھاؤں کو بھی کچھ دھکا لگو۔''

''جھوٹ مت بولو' میں نے خود سنا ہے' تم مجھے مارنے کے پلان بنا رہی تھیں'' ثریا ہنوز سیخ پا تھیں۔

صابرہ نے آپا کو اور آپا نے صابرہ کو دیکھا اور دونوں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''بھابی پاشا! آپ نے بھی کمال کر دیا' بات کو کاں سے کاں لے گئے۔ میرے کمرے میں ایک چوہیا نے بل بنالیا ہے' پریشان کر کے رکھ دیا ہے مجھے۔ اسے کمرے سے نکالنے کی ترکیبیں لڑا رہے تھے ہم لوگاں......''

صابرہ پھر ہنسی۔

ثریا کی حالت ایسی تھی' ان سے ہنسا تک نہیں گیا اور وہ کھسیا کر اپنے کمرے میں چل دیں۔

''یہ تمہاری جٹھانی تو پولیس بن کر پھرتی ہے ایکدم۔ کون کیا باتاں کر رہا ہے' سوب اپنے نوٹس میں رَ چاہتی ہے بول کے۔'' آپا نے کہا۔

''ہاں' انوں کی عادت شروع سے ہی ایس اچ ہے۔''

''ایسی عورت سے زیادہ ملنے کو ضرورت نکیں ہے ناں۔ خواہ نخوائی بے وخت پریشان کر سکتے ویسے لوگا

آپا کا لہجہ خاصا محتاط تھا۔

''میں سوب جانتی اس کو' آپ فکر اچ نکیں کرو۔''

''واقعی ایک دم چالاک لگتی ہے یہ' تیرے کمرے کی چوہیا ویسی......'' آپا نے ہنس کر کہا تو صابرہ بھی اختیار ہنسنے لگی۔

ادھر کمرے میں ثریا بیٹھی نخوت سے سوچ رہی تھیں' جاہل کہیں کی' چوہیا کے بارے میں ایسے باتیں کر تھیں جیسے دونوں نے ہی اس کے اوپر ریسرچ پیپر تیار کرنا ہو۔

باؤلیاں کم بخت...... ابھی تک اسی چوہیا پر ہنسے چلی جا رہی ہیں' جیسے دنیا میں بات کرنے کے موضوعات ختم ہو گئے ہوں۔

☆☆☆

موسم کا اثر تھا یا ثریا کی زہریلی باتوں کی کوفت' صابرہ کے سر میں شدید درد تھا۔ نہ کہیں آنے کو دل چاہ رہا نہ کہیں جانے کو۔ بار بار ثریا بھابی کی باتیں اس کے ذہن میں سنگ باری کر رہی تھیں کہ تم مجھے مارنا چاہتی ہو؟ سوئی لینے کی ان کی پرانی عادت تھی مگر بات کو وہ اس انداز میں بھی کر سکتی ہیں' وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ گو وقت وہ مذاق کی بات مذاق میں ہی ٹل گئی تھی مگر صابرہ کے ذہن میں ایک چنگاری سی بیٹھ گئی تھی۔

اس کے اپنے میکے میں چچازاد بہن کی چوتھی تھی۔ اس کا اس میں بھی جانے کو دل نہیں چاہا۔

''امی! آپ چلی جائیے' باہر جانے سے آپ فریش ہو جائیں گی اور یہ سر کے درد کو بھی افاقہ ہوگا'' منور ماں سے کہا۔

''میرا دل نکو چاہتا کہیں جانے کو۔ تو کیا کروں میں؟''

''آپ بے شک بے دلی سے چلی جائیں۔ لوگوں سے ملیں گی تو آپ اپنا یہ سر کا درد سب بھول جائیں گ

تب صابرہ' فاخرہ اور رعنا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ نگہت آرا اپنی بھاوج اور شوکت آپا کے ساتھ وہاں گ تھیں۔

یو پی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ہاں چوتھی کی رسم شادی کے چوتھے دن ہوتی ہے مگر حیدر آبادی لو

ں یہ رسم شادی کے دوسرے دن ہوتی ہے۔ فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ تمام مہمان خواتین گاؤ تکیوں سے ٹیک ئے آرام سے بیٹھی تھیں۔ ایک سرخ مخمل کا ٹکڑا جس پر گوٹے اور دھنک کا کام تھا' وہ لا کر کسی نے بچھایا۔

''اللہ' یہ کس نے بچھا دیے...... اس کو خبلہ رخ (قبلہ رخ) بچھانا تھا ناں......'' ایک مہمان بیوی نے تنقید کی۔

''دلہن رانی ہمارے گھر میں خبلہ (قبلہ) اسی رخ پر پڑتا ہے۔'' میزبان خاتون نے مسکرا کر رسان سے کہا۔

سرخ کپڑے پر پیلے گاؤ تکیے اور سبز کشن رکھے گئے۔ مردانے سے دولھا کو بلایا گیا اور اس سرخ کپڑے پر ٹھایا گیا۔ اس کے برابر بٹھانے کے لیے دلہن کو اس کی سہیلیاں تھام کر لائیں۔ اس بڑے کمرے میں بیٹھی ہوئی مام خواتین کو جھک کر دلہن نے آداب کیا اور دولھا کے برابر بیٹھ گئیں۔ دلہن کے برابر دلہن کی بہن بیٹھ گئی اور دولھا ے برابر دولھا کی بہن بیٹھ گئی۔

مووی کے کیمرے اور دیگر کیمرے ان دونوں کے چہرے پر روشن ہو گئے۔ سب سے پہلے دلہن کی ماں نے اپنی بیٹی اور داماد کو پھولوں کے ہار پہنائے۔

دونوں کو جوڑے دیے۔ اس کمرے میں بیٹھی ہوئی خواتین کو وہ جوڑے دکھائے بھی گئے۔ پھر سونے کا ایک یٹ دلہن کو دیا۔ دولھا دلہن ہر شے وصول کرتے ہوئے آداب کرتے تھے۔

اب دلہن کی بہن نے دو پتلی سی ڈنڈیاں جن پر پھول چڑھے ہوئے تھے اور بالکل پھولوں کی ڈنڈیاں لگ ہی تھیں۔ ایک دلہن کے ہاتھ میں اور دوسری دولھا کے ہاتھ میں تھمائی۔ دلہن کی بہن نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور ولھا کی بہن نے دولھا کا ہاتھ پکڑا' اب وہ دونوں یہ پھولوں کی ڈنڈیاں آپس میں اس طرح ٹکرا رہے تھے جیسے واریں چلاتے ہیں۔

لڑکی والیاں ہنس کر کہہ رہی تھیں' ''یہ ڈنڈیاں ٹوٹیں گی' تب کھانا کھانے کو ملے گا۔''

جب کہ دولھا والیاں یہ کہہ رہی تھیں۔ ''بس دونوں کی ڈانڈیوں سے پھولاں جھڑنے چاہئیں۔''

دلہن والوں نے گیت گانے شروع کر دیے تھے۔ آڑا پاجامہ ریشم کا کمر بند...... اگر میں ہوتی راجا...... کو مکیا لے لوکو۔

دلچسپ مقابلہ ہو رہا تھا۔

دولھا کی بہن نے ڈنڈی کچھ اس طرح چلائی کہ دلہن کی بہن کے ہاتھ پر جا لگی۔ دلہن کی بہن نے مذاقاً اس کا ہ اس طرح دیا کہ دولھا کی بہن کے لگی۔ دونوں پارٹیاں ہنس رہی تھیں۔

تب صابرہ کے لب بھی مسکرانے لگے۔ دلہن کی بہنوں نے کاغذ کے گولے بنا کر ان پر پھول چڑھا کر پہلے ے تیار کر رکھے تھے۔ ڈنڈیوں کے جب یہ پھول جھڑ گئے تو پھولوں کے گولے ایک دوسرے پر پھینکے گئے اور دانت بھینچ کر بیٹھنے والی خواتین بھی کچھ دیر کے لیے مسکرانے لگیں اور یہی سب اس تقریب کا مقصد تھا۔

اس اثنا میں سالیاں دولھا کا جوتا غائب کر چکی تھیں دس ہزار کا مطالبہ ہوا جو گھٹتے گھٹتے دو ہزار پر آیا۔ دولھا ا پہلے سے ہی لفافہ بنا کر لائے تھے۔ انہوں نے جیب میں سے لفافہ نکال کر اپنی سالی کو دے دیا۔ جوتا پہننے یہ پتا چلا دولھا میاں نے صرف ایک ہزار روپے دیے تھے۔

ب ختم ہو جانے کے بعد دولھا' دلہن دونوں نے سب مہمانوں کو جھک کر آداب کیے۔ صابرہ کی سب پوچھ رہے تھے اور صابرہ دیگر عزیزوں سے مل رہی تھی اور یوں ملنے جلنے اور ہنسنے ہنسانے کی وجہ سے وہ یش ہو گئی تھی۔

مشینی زندگی نے تمام رسموں کو کھا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں پھیکا پن نمایاں نظر آتا ہے مگر ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہلکی پھلکی بے ضرر سی رسمیں بڑے شوق سے کرتے ہیں اور ان کے طفیل لوگوں کے لب ہم سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ صابرہ یہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

"کائے کو ہونٹاں پر تالا لگا کو بیٹھے تم......" اس کی آپا نے پوچھا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی اگر میں آج کی تخریب میں نکو آتی تو میرے سر کا درد ٹھیک نہیں ہونے کو تھا۔ میں ا کری کہ آ گئی" صابرہ نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔

دن سہانے تلاش کرتے ہو
گم خزانے تلاش کرتے ہو
وہ پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے
جو زمانے تلاش کرتے ہو

☆☆☆

صبح ہوتی تو فریال کے ہاتھ میں البم ہوتی۔ رات ہوتی تو اس کے ہاتھ میں البم ہوتی۔ ثنا نے جب سے ا سائرہ کی شادی کی البم لا کر دی تھی، اس کا کام ہی یہ رہ گیا تھا کہ وہ ایک ایک تصویر سے باتیں کیا کرتی۔

آج بھی وہ البم پر جھکی اپنی ماں کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

"امی! آپ سائرہ باجی کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں لیے آنسو بہا رہی ہیں۔ کیا ان آنسوؤں میں کو آنسو میری بدنصیب ذات کے لیے بھی ہے یا نہیں؟"

"امی...... باجی کو تو یہ خوشی پھر میسر آئی کہ انہیں دعاؤں کے حوالے میں رخصت کیا جا رہا ہے اور میں جو ز بھر کے لیے آپ سب سے رخصت ہو گئی تو کیا میرے لیے دعائیں آپ کے لبوں پر ہوتی ہیں یا نہیں......!

اس نے صفحہ پلٹا۔ شاہنواز بہن کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں اور چہرے پر حزن و ملا سا تھا۔

"بھائی جی، مجھے گھر سے نکالنے کے بعد میری یاد کا کوئی لمحہ آپ کے دل میں جاگا یا نہیں؟"

"تم اس قابل نہیں ہو فریال کہ کوئی تمہیں یاد کرے۔" اس کے کانوں میں آوازیں شور سا مچانے لگیں۔ "تمہاری حرکت ہی ایسی تھی جو یہ کہا گیا تھا کہ فریال، آج سے تم ہمارے لیے مر گئیں اور آئندہ اس دہلیز پر قد رکھنا......!"

"بھائی جی، کیا آپ نے بھی یہ سمجھ کر صبر کر لیا کہ میں نیست و نابود ہو چکی ہوں یا مرے ہوئے لوگوں کو کو نہیں کیا کرتا ہے؟ اپنے میکے سے رخصت ہونے والی لڑکیاں کتنی خوش نصیب ہوا کرتی ہیں۔"

سائرہ کے چہرے کی خوشی اس کی اداسی پر غالب نظر آ رہی تھی۔ "خدا کرے باجی، تم ہمیشہ اپنے گھر میں رہو۔" البم سینے سے لگا کر اس نے دعا مانگی۔

صد شکر کہ امی کے سر سے یہ فرض بہ حسن خوبی پورا ہوا۔ سائرہ باجی کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہو گ کاش، میں نے بھی یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا تو آج میرا شمار بھی ان لڑکیوں میں ہوتا جن کی شادی پر دعائیں والے ہاتھ اٹھا کرتے ہیں۔

غم کی یہ خلیج کب پٹے گی؟ اس نے سوچا۔ شاید سائرہ باجی اپنے میاں کے ساتھ آ جائیں اور مجھے ساتھ لے جائیں اور ان کی وجہ سے مجھے معافی مل جائے۔

شاید بھائی جی ثنا کے پاس راولپنڈی آئیں اور ثنا ان کو لے کر میرے پاس آ جائے...... اور وہ مجھے معاف ر کے اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔ یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے۔

دروازے پر دستک بڑھ رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ دروازہ کھولتی، دروازہ خود ہی کھل گیا۔ اس نے دیکھا ثنا ے ساتھ بھائی جی کھڑے تھے۔

"میری بہن، میری جان، فریال......!" بھائی جی دونوں ہاتھ بڑھا کر آگے بڑھے۔ فریال ان کے سینے سے لگ گئی۔ آنسو ان کا گریبان تر کر رہے تھے۔

"بھائی جی، میں آپ کو بے حد یاد کرتی تھی۔"

"پگلی! میرا دل کون سا تیری یاد سے غافل تھا۔"

"بھائی جی، بہت دیر میں آئے آپ مجھے لینے۔ میں تو تھک گئی تھی، آپ کو یاد کرتے کرتے......"

"فرو اب یہ شکایتیں ختم کرو اور فوراً اپنا سامان سمیٹ، ہم آج ہی کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔"

"آج ہی......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں آج ہی۔ امی تجھے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ تجھے کیا پتا، تیرے جانے کے بعد سے ان کے لب مسکرانا بھول گئے ہیں۔"

"امی کو معلوم ہے، آپ مجھے لینے آئے ہیں؟"

"نہیں، ایک دم سے ہی تمہیں دیکھیں گی تو بہت اچھا لگے گا۔"

"امی، میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں،" اس کی آنکھوں سے مینہ بہہ نکلا اور سسکیاں لیتے ہوئے اس کی حالت غشی کی سی ہو گئی۔

صادقہ باجی اس کے کمرے میں آئیں تو اسے یوں سسکتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ وہ بیڈ سے نیچے گر گئی تھی۔ ہاتھ میں البم تھا، جسے وہ سینے سے لگائے سسک رہی تھی۔

"فریال! ہوش میں آؤ۔" اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"مجھے بھائی جی لینے آئے ہیں مجھے بھائی جی لینے آئے ہیں۔"

"اچھا، کہاں ہیں......؟" صادقہ باجی نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ثنا کے ساتھ آئے ہیں۔ ثنا ان کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی ہے۔" صادقہ باجی ڈرائنگ روم میں بھی ھانک آئیں اور فریال کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تصویریں تم ضرور دیکھو مگر خوابوں میں سفر مت کرو۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم اپنے گھر ضرور جاؤ گی مگر کب جاؤ گی، اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ تم ان کا انتظار ضرور کرو مگر اس اضطراب کو اپنے اوپر غالب مت ہونے ۔"

"کیا کروں باجی! وہ سب لوگ مجھے چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ ان کی آوازیں میرے کانوں یں ایسے آتی ہیں، میں انہیں محسوس کرتی ہوں۔"

"فریال بیٹا! یہ خیالات اور تصورات کی اڑانیں، بڑی تیز رفتار ہوتی ہیں۔ گمان سے بھی بڑھ کر اونچی پینگیں لیتی ہیں۔"

’’پھر میں کیا کروں؟‘‘

’’حقیقت میں رہنا سیکھو۔ خوابوں میں تو کاہل لوگ رہتے ہیں۔ اور تم ایک بے حد ایکٹو لڑکی ہو' جس کا ایک نام ہے' ایک ساکھ ہے اور عزت ہے۔‘‘

☆☆☆

خوشی اور سرشاری میں فیروزہ کے ہاتھ پیر پھول سے گئے تھے۔ ایک پیارے سے بچے کی نانی بننا انہیں بے حد اچھا لگا تھا۔ ایک بہت بڑا اعزاز مجھے مل گیا ہے۔ یہ احساس انہیں بار بار نوید دے رہا تھا۔

گزشتہ تین دن سے وہ مستقل نگین کے پاس تھیں اور اس وقت بھی وہ سوپ اور جوس بنانے کے چکر میں گھر آئی تھیں۔ لپ جھپ سارا کام انہوں۔ نے منٹوں میں کرلیا تھا۔

’’اچھوانی (پسے ہوئے میوے' دودھ میں ڈال کر اوپر سے اصلی گھی میں لونگ کا بگھار لگایا جاتا ہے) زچہ کو خاص الخاص کھچڑی۔ (ہلکی مرچ کا مرغی کا سالن بنا کر' اس میں مونگ کی دال چھلکوں والی اور چاول ہم وزن ڈال کر پتلی گھٹی ہوئی کھچڑی بنتی ہے' جس پر اوپر سے اصلی گھی کا بھگار لگتا ہے) اور دیسی مرغی کی یخنی تیار کر کے باسکٹ میں رکھ لی تھی۔

ان دنوں فرید احمد گاڑی گھر پر ہی چھوڑ کر دکان جا رہے تھے۔ ڈرائیور بھی تھا۔ شادر لے کر انہوں نے چیخ کر اور دو نفل شکرانے کے ادا کیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر و عافیت کے ساتھ نگین کو فارغ کیا تھا۔

ابھی وہ ڈرائیور سے گاڑی میں سامان رکھوا ہی رہی تھیں کہ طفیل (دکان پر کام کرنے والا ملازم) اپنے ساتھ کسی مرد و عورت کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ پوچھا تو معلوم ہوا یہ لوگ طفیل کے غریب رشتے دار ہیں جو عرصہ ہ گاؤں چھوڑ کر کراچی آ گئے ہیں۔

’’مگر اس وقت...... میرے گھر آنے کا کیا مقصد ہے؟‘‘ انہوں نے طفیل سے ہی پوچھا۔

’’باجی جی! یہ لوگ آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔‘‘

’’میرا شکریہ' وہ کس لیے؟‘‘ انہیں حیرت تھی۔

’’بیگم صاحب! آپ بہت خوش قسمت ہو...... صاحب جی بہت بڑے آدمی ہیں۔ میرا میاں بیمار تھا کراچی آ کر ہم پیسے پیسے کو ترس گئے تھے۔ ایسے وقت میں صاحب جی نے ہمارا ماہانا باندھا۔ کھانا پینا' بیماری کا علاج' سارا ہی بار انہوں نے اٹھایا۔ ان کی وجہ سے آج میرا میاں ٹھیک ہوا ہے' اگر صاحب جی نہ ہوتے تو ہم سب لوگ در بدر ہو جاتے۔‘‘

’’پالنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے' کسی کی اتنی کیا بساط کہ وہ کسی کے لیے بھی کچھ کر سکے‘‘ فیروزہ نے کہا۔

’’پھر بھی آپ لوگوں نے بہت کیا ہے۔ ایسا کرنے والا تو میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ آج میں اپنے بچوں کو آپ کے پاس اس لیے لائی ہوں' آپ جس کو چاہے گھر کے کام کے لیے رکھ لیں۔‘‘

’’نہیں' مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے گھر میں صبح مائی آ کر سارا کام کر جاتی ہے' تم اپنے بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھو۔‘‘

’’بیگم صاحب! غریب کا بچہ ہے۔ آپ کے ہاں کام کرے گا تو کھانا پینا بھی فری کا مل جائے گا۔ اس کا آپ ہم پر ترس کھا کے ہی رکھ لیں‘‘ وہ عورت خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

فیروزہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب کو گھر سے روانہ کر کے جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں۔ وہ ننھی ک

ا پتال میں چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی تھیں اور اب وہ عورت فرید احمد کے ترانے گانے ان کے ہاں بیٹھی گا رہی تھی' جس کو روکنے پر وہ کسی طرح بھی قادر نہیں تھیں۔

’’میرے خیال سے اب میں چلوں' کافی دیر ہو گئی ہے۔‘‘ انہوں نے یہ بات تیسری مرتبہ کہی۔ اس کا طلب ہی یہی تھا کہ جلدی سے دفع ہو جاؤ۔

’’اللہ آپ کو سلامت رکھے' اللہ صاحب جی کو سلامت رکھے‘‘ اس عورت کے گیت جاری تھے۔

’’باجی' ان دنوں تو گھر میں کام بڑھا ہوا ہے۔ آپ اس کے بڑے بچے کو رکھ لیں۔ اوپر کا کام ہی کر لے گا۔ اپ کو بھی سہولت ہو جائے گی۔‘‘ طفیل نے وکالت کرتے ہوئے کہا۔

’’میں اسے کیسے رکھ لوں' میں ان لوگوں کو جانتی تک نہیں ہوں‘‘ فیروزہ نے طفیل کو اندر بلا کر کہا۔

’’باجی' آپ اسے نہیں جانتیں مگر ان کے گاؤں کی ہونے کی وجہ سے فرید بھائی تو اسے اچھی طرح جانتے یں۔ کیا آپ کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے؟‘‘ طفیل انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

’’فرید کس کس کو جانتے ہیں' ان سب کو جاننا میرے لیے ضروری نہیں ہے‘‘ فیروزہ کو غصہ ہی آ گیا۔ اور یوں طفیل کے اس جملے کے پیچھے سے نیناں کا وجود ابھر کر اس کے سامنے آ گیا اور فیروزہ کو یوں لگا جیسے وہ اس سے ہ رہی ہو' تمہیں کیا پتا فرید احمد کس کس کو جانتا ہے' اس نے تو کبھی تم سے ذکر تک نہیں کیا کہ تم اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ کوئی بھی بات تم سے شیئر کرتا۔

وہ شوہر اپنی بیویوں کو ہر بات بتایا کرتے ہیں' جن سے ان کی ذہنی ہم آہنگی ہو۔ تم اپنے شوہر کے لیے ایک کیا اہم ہستی ہو۔ ان کے گھر میں تو ضرور رہتی ہو مگر ان کے دل تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔

تب انہوں نے فیصلہ کر لیا ’’طفیل! میں کسی کو نہیں رکھ سکتی۔ کیا پتا وہ چور ہو' کچھ گھر میں سے لے اڑا تو میں ں کے پیچھے بھاگوں گی۔‘‘ انہوں نے طفیل کو منع کرتے ہوئے کہا۔

’’باجی! اس بات کا ذمہ میں لیتا ہوں' یہ بچہ چور نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کو خاصی سہولت ہو جائے گی' صبح آنے والی ماسیاں تو کام کو ٹالنے والے انداز میں یہ جا' وہ جا کر کے بھاگتی بنتی ہیں۔‘‘

فیروزہ کا فیصلہ جو چند لمحے پہلے آہنی سا تھا' طفیل کی بات سن کر کسی بھربھری مٹی کی طرح نیچے بیٹھ گیا۔ ’’ٹھیک لو مگر اس وقت تو میں نگین کے پاس اسپتال جا رہی ہوں' یہ کہاں رہے گا؟‘‘

’’یہ آپ کے ساتھ جائے گا اور آپ کے ساتھ ہی واپس آ جائے گا‘‘ طفیل نے کہا۔

’’ٹھیک ہے‘‘ کچھ سوچ کر فیروزہ نے ہامی بھر لی ورنہ ان کا دل بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس عورت کے بطور ملازم اپنے گھر میں رکھیں' جس کی ماں ان کے سامنے بیٹھ کر فرید احمد کے گیت گا رہی تھی اور ان کی ایسی تعریفیں کر رہی تھی جو فرید احمد میں کبھی تھیں ہی نہیں۔

اور جب وہ گاڑی میں بیٹھیں تو ان کا ذہن نگین کی جانب مڑ گیا۔ کتنی دیر لگ گئی مجھے گھر میں' میری بچی انتظار میں سوکھ رہی ہوگی۔ تف ہے مجھ پر' خواہ مخواہ اس عورت کے قصیدے سننے بیٹھ گئی' جلدی پہنچ جاتی تو نگین کو یخنی پلا چکی ہوتی۔

اہداری میں آئیں تو اس کے روم سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ نھی آج اتنی زور زور سے ہنس رہی انہوں نے سوچا اور تیزی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئیں۔

شجاع نگین کے بیڈ پر چڑھا کینو کی ایک ایک پھانک اسے کھلا رہا تھا۔ نگین اس کی باتوں پر ہنس رہی تھی۔

''السلام علیکم ممانی جان!'' شجاع انہیں دیکھ کر قریب بچھے ہوئے صوفے پر آ گیا۔

''فہمی کس کے ساتھ گئی؟''

''ماموں جان آئے تھے بچہ دیکھنے۔ ان کے ساتھ ہی باجی چلی گئیں اور شجاع تو اسٹیشن سے سیدھے ہی یہاں آ گئے تھے۔''

بیٹی کو طمانیت بھرے انداز میں دیکھ کر انہیں بھی دلی سکون حاصل ہوا۔

''اس باسکٹ میں جو کھانا ہے' وہ تم دونوں کے لیے کافی ہے۔ تم دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ کھاؤ پیو۔ میں رات کو آ جاؤں گی' تب شجاع آرام کرنے گھر چلا جائے گا۔''

''نہیں ممانی! اب آپ گھر میں آرام کیجیے' مستقل اسپتال میں رہنے سے آپ تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ رات کو میں ہی نگین کے پاس رک جاؤں گا۔ ابھی ڈیوٹی نرس نے بتایا تھا' کل صبح نگین کی چھٹی ہو جائے گی۔ تو اب ہم دونوں کل صبح گھر آ جائیں گے۔''

''مگر بیٹے! تم تھکے ہوئے ہو گے؟''

''اپنے پیارے سے بیٹے کو دیکھ کر میری ساری تھکن اتر گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے' پھر میں گھر چلتی ہوں۔ صبح ڈرائیور گاڑی لے کر آ جائے گا۔'' نواسے کے ماتھے پر بوسہ دے کر وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔ قادر (ملازم بچہ) ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

یکبارگی رک کر انہوں نے اسے دیکھا۔ پندرہ سولہ سال کا بے حد دبلا پتلا سا لڑکا' جس کے چہرے پر غربت اور بدحالی صاف نظر آ رہی تھی۔

''تم اپنے اور کپڑے نہیں لائے؟'' انہوں نے اس کے بے حد پرانے اور پیوند لگے کپڑوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں جی'' اس نے سر جھکاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

اس وقت گاڑی صدر کی مارکیٹ سے گزر رہی تھی۔ فٹ پاتھوں پر فروخت ہونے والے کپڑے بھرے پڑے تھے۔

''ڈرائیور تھوڑی دیر کے لیے یہاں گاڑی روکنا۔''

''جی باجی!'' ڈرائیور نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''اس بچے کے لیے دو شرٹس اور دو جینز کی پتلونیں یہیں سے لے لو۔'' پندرہ منٹ میں وہ جن کی سی پھرتی سے کپڑے لے آیا اور شاپر فیروزہ کو دے کر گاڑی بڑھالی۔

''بیٹا' گھر جا کر پہلے غسل کرنا' پھر یہ صاف ستھرے کپڑے پہننا' اپنے ناخن کاٹنا پھر کسی کام کو ہاتھ لگانا۔''

''ٹھیک ہے جی'' اب بچہ اس شاپر کو دیکھ رہا تھا' جس میں اس کے لیے کپڑے تھے اور شاپر ابھی تک فیروزہ کے ہاتھوں میں تھا۔ فیروزہ نے وہ شاپر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور بچے کی آنکھوں کی جوت بڑھ سی گئی۔

☆☆☆

شجاع کے گھر سے چار لڈو آئے تھے اور فرح یہ سوچ رہی تھی' اب ان لڈوؤں کے طفیل اس کے گھر میں ہنگامہ ضرور ہوگا۔ یہ بھی اتفاق تھا' جب فرحت کا بیٹا مٹھائی لے کر آیا تو اس وقت گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ فرح نے مٹھائی لے کر باورچی خانے میں رکھ دی اور سوچ لیا' کسی کو یہ نہیں بتائے گی کہ یہ لڈو شجاع کے گھر سے آئے ہیں۔

نانی اماں نے باورچی خانے کا چکر لگایا تو پہلی بات یہی پوچھی ''اے ہے' یہ لڈو کہاں سے آئے ہیں؟''

''پتا نہیں' کوئی بچہ دے گیا ہے۔ اتنے میں' میں پوچھتی کہ کس کے گھر سے آیا ہے' وہ تو ہوا ہو گیا۔''

''کونے والے گھر میں تو ماں مری ہے' وہاں سے تو نہیں آ سکتی مٹھائی۔'' اماں نے لڈو کھاتے ہوئے اپنی سوچ کے در کھولے۔

''امرود کے پیڑ والی کے ہاں پوتی ہوئی ہے' وہاں سے بھی نہیں آ سکتی مٹھائی۔''

''سفید مینار والی کے ہاں لڑکی کی منگنی ٹوٹی ہے' وہاں سے آنے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔''

''اے ہے تو پھر کہاں سے آئی یہ مٹھائی' کس نے بھیجی یہ مٹھائی اور کیوں بھیجی یہ مٹھائی؟'' چھوٹی باجی نے واویلا مچاتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں' کسی نے کچھ پڑھ وڑھ کر پھونکیں مار کر یہ مٹھائی ہمیں بھیجی ہو...... تاکہ ہم پاگل ہو جائیں...... اور کوئی مہارانی جو دل چاہے کرتی رہے۔'' انہوں نے فرح کو کانی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا بھلا کون ہوگا جو خواہ مخواہ کی دشمنی چاہے گا'' بات جتنی الجھ رہی تھی' اتنی ہی گھبراہٹ سی فرح کو ہو رہی تھی۔

''ایسے لوگوں کی کوئی کمی تھوڑی ہوتی ہے' بہت سے لوگ ہیں۔'' اب بڑی آپا نے بھی دلچسپی لینی شروع کی۔

''مجھے تو لگتا ہے کوئی ہم پر عمل کرنا چاہتا ہے۔''

''کیسا عمل......؟'' نانی اماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''زبان بندی کا عمل...... تاکہ کوئی کسی کو کچھ کہہ ہی نہ سکے اور کسی کا جو دل چاہے' وہی کرے'' اماں نے فرح کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ذرا سی بات کتنی بڑی ہو جائے گی' فرح سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''ارے یاد آیا......'' وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ''شاید فرحت باجی کا بیٹا تھا...... وہ دے گیا مٹھائی۔ اس سے قبل میں پوچھتی کہ کس سلسلے میں آئی ہے' وہ چلا بھی گیا'' فرح نے اصل بات بتا کر سکون کا سانس لیا' ورنہ وہ تو شاید کے طفیل جو جملے سن رہی تھی' سارے کے سارے اس پر برچھی بن کر گر رہے تھے۔

''اچھا...... شجاع کے ہاں بیٹے کی خوشی منائی گئی ہوگی' ہمیں جلانے کے لیے یہ مٹھائی بھیجی ہے۔''

''اس میں جلانے کی کیا بات ہے۔ کوئی شجاع کے ہاں دنیا سے انوکھا بچہ تو نہیں ہوا۔ سب کے ہاں ہوتے ہیں۔'' فرح نے مطمئن سے لہجے میں جتایا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم سب کے ہاں ہی بچے ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں نہیں ہوتے۔ تمہاری شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں۔ شجاع سے پہلے ہوئی تھی تمہاری شادی' تمہارے ہاں تو بلی کا بچہ بھی نہیں ہوا۔''

''اللہ نہ کرے' میرے ہاں کیوں ہوتا بلی کا بچہ۔'' فرح کو غصہ ہی تو آ گیا۔

''ارے' اب تو ہم اس کا بھی شکر ادا کریں گے کہ کوئی آغوں آغوں کرنے والا بچہ نہیں' تو چلو میاؤں میاؤں کرنے والا ہی آ گیا۔'' اماں بہالت سے رچے لہجے میں بولیں۔

تب مارے غصے کے فرح کا چہرہ سرخ سا ہو گیا اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''اونہہ! بہائیں گی اب آنسو بیٹھ کر۔ بتائیں گی اب پاگل اشرف بھائی کو'' باجی نے طنزیہ لہجے میں بلند آواز میں کہا۔

اور فرح اپنے دوپٹے سے کانوں کو لپیٹ کر بستر پر اوندھے منہ گر گئی اور سوچنے لگی۔ کیا زندگی میں ہر وقت تقریریں کرنی ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے یہ غلط ہے کے دلائل ہمہ وقت دینے ہوتے ہیں؟ کیا سکون اور طمانیت کے لمحات بہت مشکل سے میسر آتے ہیں؟ کیا سسرال کے لوگوں کا کام اپنی بہو پر صرف چڑھائی کرنا ہوتا ہے؟ ان کے پاس پیار و محبت کا کوئی ایسا پیکج نہیں' جس سے بہو خوش رہے' مسکراتی رہے...... اور زندگی کی خوشیوں سے ہم کنار رہے؟

ہاں' ہوتا تو ضرور ہوگا مگر میرے لیے یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہ بچی خوشیاں بھی شاید قسمت والیوں کو ملتی ہیں۔ ایک تو میاں ہی بے ڈھب سا ہے' یہ پتا بھی نہیں ہوتا کہ کس وقت کس بات پر بے عزتی ہو سکتی ہے؟ جو بات آج اسے خوش کر رہی ہے' وہی بات کل اس کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ سسرال کے تمام لوگوں کا وتیرہ' صرف اور صرف اس کا دل جلانا ہے' کسی بات پر بھی وہ خوش ہوتے ہی نہیں ہیں۔

فرح جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی یہ احساس تیر بن کر اس کے دل کو لگ رہا تھا کہ شاید میری شادی ہی غلط ہوئی ہے۔ میری شادی اگر شجاع سے نہیں ہو سکی تو اشرف سے بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ایسی شادی کا فائدہ جس کا ہر دن کسی نئی کسک کے ساتھ شروع ہو اور کسی پرانے دکھ کو ہرا کر دے۔

فرح کے سر میں درد ہو رہا تھا اور کنپٹیاں پھٹ سی رہی تھیں۔ اس نے اپنے سر پر دو تکیے رکھ کر رضائی اوڑھ لی اور دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆

''بس میں نے کہہ دیا ہے پتر! کچھ بھی ہو' کرنا تو نے وہی ہے جو میں نے کہا ہے۔ برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے' لاہور تک تو جہاز سے آجا' وہاں سے گڈی میں آجانا۔ ہاں چھوٹو کو میرا پیار دینا......'' عظمت بیگم نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

شجاع تو اگلے دن ہی کراچی چلا گیا تھا اور اب دس دن گزر گئے تھے اسے کراچی رہتے ہوئے' اسی لیے آج انہوں نے فون پر اس سے کہہ دیا کہ اپنے ساتھ تگین کو بھی لے آؤ۔

ماسٹر صاحب کی بیگم نے بھی یہی مشورہ دیا تھا' تمہارا پہلا پہلا پوتا ہوا ہے' اب بہو کو اپنے گھر آجانا چاہیے تاکہ بچے کو دیکھ کر تمہارا بھی دل خوش ہو۔

عظمت بیگم اب طمانیت بھرے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ شجاع نے ان سے یہی کہا تھا کہ وہ دو چار دن کے اندر گاؤں پہنچ رہا ہے۔ فرحت بھی بچے کے لیے چھ جھبلے سی کر لائی تھی۔ عظمت نے بچے کا گدا اور رضائی بنا کر پہلے ہی رکھ لی تھی۔ آج بچے کی شنیل کی رضائی پر گوٹے کے پھول ٹانک رہی تھیں۔

''یہ تام جھام تو لڑکیوں کی رضائی پر اچھا لگتا ہے۔'' ماسٹر صاحب کی بیگم نے کہا۔

''میرا منا سا شہزادہ گھر میں آرہا ہے۔ وہ تو ایسی ہی چمکتی دمکتی رضائیاں اوڑھے گا۔ کتنے برسوں کے بعد اس گھر میں کسی بچے کی چہکار گونجے گی۔''

''ہاں' یہ تو ہے......'' ماسٹر صاحب کی بیگم نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔

☆☆☆

اسلام آباد سے کراچی آنے کے بعد جمال کی اداسی بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کی باتوں میں چالاکی کے ساتھ مکاری بھی کتنی آگئی ہے۔ ہر ہر معاملے میں صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ رشتے داریوں میں بھی اپنا مفاد پیش نظر

لھا جانے لگا ہے۔ اسے لوگوں کے قول و فعل پر حیرت ہو رہی تھی۔ صنوبر خالہ جس انداز سے کھل کر سامنے آئی تیں' اس سے اسے سخت اذیت سی ہو رہی تھی۔ اگر ربیع کی شادی نہیں ہو رہی تو نہ سہی مگر میں کسی غلط جگہ یا نامناسب رشتے کے لیے کبھی ہامی نہیں بھروں گا۔ شاید ہم دونوں بہن بھائی سدا ایسے ہی رہیں۔ یہ خیال بھی اس ے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔

یونہی تو یونہی سہی...... اے اللہ' میں ہر حال میں راضی ہوں' بس تو مجھ سے راضی رہنا۔ اس نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کی۔

اب ان کے کینیڈا جانے کے دن تھوڑے رہ گئے تھے۔ نیچے کا پورشن خالی کر کے محلے میں ہی ایک صاحب کو کرائے پر دے دیا تھا۔ کرائے کی مدت صرف ڈیڑھ سال رکھی تھی جب کہ انہیں وہاں سے دو سال بعد واپس آنا تھا تاکہ ان کے آنے سے پہلے پہلے گھر خالی ہو جائے۔

اب ان کا سارا سامان اوپر کے پورشن میں آگیا تھا۔ جمال نے یہ بات محلے کی کمیٹی کے صدر کو واضح طور پر لہہ دی تھی کہ کرائے کی رقم قریبی دارالعلوم میں باقاعدگی سے بھجوانی ہے' جہاں بیوائیں اور یتیم بچے رہائش ذیر ہیں۔

گھر کا پرانا سامان' پرانے کپڑے اور بیکار کی فالتو چیزیں اس نے سب بانٹ دی تھیں۔ امی اس بات پر مترض بھی ہوئی تھیں کہ کیا وہاں سے آکر ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

''امی' جو چیز آپ پانچ سال سے استعمال نہیں کر رہی ہیں' وہ دو سال بعد بھی نہیں کریں گی اس لیے یہ اچھی ات نہیں ہوگی کہ کسی ضرورت مند کو دے دی جائے؟''

''میں تو کہتی ہوں سوائے بیڈز اور باورچی خانے کے ضروری برتنوں کے سوا کچھ نہ رکھیے۔ ہم لوگ جب ینیڈا سے آئیں گے' تب ضرورت کی چیزیں نئی خرید لیں گے۔'' ربیع نے بھائی سے کہا۔

''تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔'' جمال مسکرایا۔

''یہ کرو' یہ مکان بھی بیچ دو' جب دو سال بعد آؤ گے تو نیا خرید لینا' ورنہ زمین پر بوریا بچھا کر بیٹھ جانا۔'' امی لس کر کہا۔

''امی! اللہ تعالیٰ ہمارا ہر دن پہلے سے بہتر بنا رہا ہے تو انشاءاللہ آئندہ بھی اچھے سے اچھا ہی ہوگا...... تو پھر وں نہ ہم اس کی رضا کے لیے ایسے کام بھی کریں' جن سے وہ خوش ہو۔''

''میں منع کرتی ہوں کیا......؟''

''منع تو نہیں کرتیں مگر ہماری ہستیں بھی تو آپ کو اور بڑھانی ہوں گی کہ ہمارے اپنے دل اندر سے اتنے اد اور کائی زدہ سے ہیں کہ کسی کی مدد کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کسی پر رحم نہیں آتا' ہر مانگنے والا ہمیں جھوٹا دکھائی تا ہے۔ اپنی ایسی چیزیں جنہیں ہم استعمال بھی نہیں کرتے' ان سے ہم ایسی محبت کرتے ہیں کہ ان کی جدائی بھی وارا نہیں ہے۔ چیزیں خراب ہو کر پھنک جائیں مگر ہم انہیں کسی کو دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ پرانے کپڑوں کے ار رکھے ہوئے جوتوں کے ڈھیر' بدرنگ سوئیٹرز' بے ڈھب برتن' بدنما فرنیچر ہر گھر میں نظر آتا ہے۔ جس کی جودگی ماحول میں وحشت کی کمی کا سبب بھی بن سکتی ہے' مگر ہم سب ان وحشتوں کے عادی ہیں اور ایک وجہ ہے کہ آج کل لوگوں کے مزاج میں برہمی' سختی اور کٹ کھنا پن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سڑک پر' دکان پر' دفتر ازار میں ہر جگہ ہر شخص لڑنے کو تیار نظر آتا ہے۔ نرمی' ملائمت' اپنا پن' رواداری' مروت اور رائے سے اتفاق

کرنے والی خوبیاں تو اب عنقا (غائب) ہو گئی ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو جمال تم۔ اب ہم صرف اپنی ہی مدد کر کے زیادہ خوش ہوتے ہیں' کسی دوسرے کے آنسو پونچھنے کی نہ ہمیں ضرورت ہے' نہ وقت ہے اور نہ ہی ہمت ہے۔ ربیع ٹھیک کہہ رہی ہے صرف ضروری چیزیں رکھ دو' باقی سب سامان دارالعلوم میں پہنچا دو۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا ہم پر فرض بھی ہے۔''

''اب امی آپ نے کہا ہے تو یہ میرے لیے حکم کا درجہ ہو گیا۔'' جمال مسکراتے ہوئے دارالعلوم فون کرنے لگا تا کہ ان کی گاڑی آ کے گھر کا سامان لے جائے۔

☆☆☆

زندگی ایک معمول پر آ گئی تھی۔ بلال صبح اپنی اکیڈمی جاتے اور وہاں سے دو بجے کے قریب گھر پہنچتے۔ سائرہ کے پاس دونوں بچیاں گھر میں رہا کرتیں۔ وہ ان کی ایسی ہی دیکھ بھال کرتی جیسے کوئی ماں اپنے بچوں کی کیا کرتی ہے۔

بچیوں کے کام کاج کے لیے ایک گورنس گھر میں ہمہ وقت موجود تھی مگر بچیوں کو تیار کرنے کا کام اس نے خود اپنے ذمے لے لیا تھا۔ وہ ان سے ان کی دلچسپی کی باتیں کرتے ہوئے' ان کے کام کرتی جس سے وہ دونوں بچیاں اس کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

بلال دوپہر کو گھر آتے تو سب ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے۔ دوپہر کو سب آرام کرتے اور شام کو کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے۔ زندگی کا رنگ اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے' یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

بھابیاں جب اسے کوئی کپڑے کا جوڑا دیتی تھیں تو ان کے تیوروں سے یہی اندازہ ہوتا جیسے انہوں نے اس کے سر پر کوئی احسان کیا ہو اور اپنے گھر میں اسے ہر چیز پر مکمل حاکمیت حاصل تھی۔ اس کے لیے بغیر مانگے ہر چیز اعلیٰ ترین حاضر تھی۔ الماریاں اعلیٰ ترین ملبوسات سے پٹی پڑی تھیں۔ اس کے باوجود بلال کا یہی اصرار ہوتا تھا کہ وہ بازار سے جا کر جو دل چاہے خرید سکتی ہے مگر سائرہ کبھی اکیلی بازار نہیں گئی تھی۔

اور اب بھی وہ بلال کے ساتھ ہی شاپنگ کرتی تھی۔ ایک دن بلال کو اکیڈمی میں ہونے والی میٹنگ کے سبب دیر سے آنا تھا۔ سائرہ بچیوں کو کھانا کھلا کر ان کو لے کر بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ پر مریم تھی اور دوسرے ہاتھ پر عائشہ...... اور دونوں ہی کی یہ خواہش تھی کہ سائرہ اس کی پسند کی کہانی سنائے۔

''ماما' بندر والی کہانی سنائیے ورنہ میں غصہ ہو جاؤں گی'' عائشہ نے سائرہ کے گلے میں ہاتھ ڈالے کہا۔

''ماما! کالی بلی کی کہانی سنائیے ورنہ میں کٹی ہو جاؤں گی'' مریم نے اپنی چھنگلی دکھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی' ایک ساتھ دونوں کہانیاں چلیں گی۔ جب میں عائشہ کی طرف منہ کروں گی تو بندر والی کہانی چلے گی اور جب میرا چہرہ مریم کی طرف ہو گا تو کالی بلی کی کہانی ہو گی۔''

دونوں بچیاں خوشی سے سرشار ہو گئیں اور سائرہ کی کہانیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ وہ کہانی سناتے ہوئے مختلف آوازیں بھی نکال رہی تھی اور بچوں کی دلچسپی کے سارے لوازمات ان میں سموئے ہوئے تھی۔ دونوں بچیاں خوب ہنس رہی تھیں اور کہانی کے دوران میں ان کے دلچسپ اور معصوم سے سوالات بھی جاری تھے جن کا وہ بڑی مزاحیہ سچویشن کے ساتھ جواب دے رہی تھی۔

بلال جو میٹنگ کینسل ہو جانے کی وجہ سے جلدی گھر آ گیا تھا' سائرہ کا یہ روپ دیکھ کر حیران رہ گیا اور کمرے میں داخل ہونے کے بجائے اپنی امی کے پاس جا کر بولا۔

''یہ سائرہ تو بالکل حقیقی ماں کی طرح بچیوں کو ٹریٹ کر رہی ہے۔''

''ہاں بیٹا! وہ محبت کا پیکر ہے۔ میں نے کئی دفعہ خاموشی سے چیک بھی کیا ہے' اس کا بچیوں کے ساتھ رویہ ظاہر و باطن بالکل ایک ہے۔''

''ہاں امی! میں کبھی اسے کہیں اکیلے چلنے کا کہوں تو بچیوں کے بغیر جانے کو راضی نہیں ہوتی ہے۔''

''سب سے بڑی بات...... جب سے شادی ہوئی ہے' ایک رات کے لیے بھی اپنے میکے میں رہنے کے لیے نہیں گئی ہے' تمہارے ساتھ جاتی ہے' تمہارے ساتھ ہی واپس آ جاتی ہے۔''

''امی' میں نے اس سے کئی بار کہا تم اپنی امی کے پاس جا کر رہ لیا کرو ورنہ وہ لوگ سمجھیں گے کہ میں ظالم قسم کا شوہر ہوں' اپنی بیوی کو کہیں جانے نہیں دیتا۔''

اس پر وہ بولی ''میں مریم اور عائشہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ وہاں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی تو بچیوں کو وہ آرام نہیں ملے گا جو انہیں اپنے گھر میں میسر ہے۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ میں امی سے تھوڑی دیر کے لیے مل آؤں'' بلال نے بتایا۔

''تم اس سے کہو' ہفتے اتوار کو اکیڈمی کی چھٹی ہوتی ہے۔ تم بہ آسانی بچیوں کو دیکھ سکتے ہو۔ کسی بھی ویک اینڈ وہ چلی جائے اور اتوار کی شام تک آ جائے۔'' ماں نے سمجھایا۔

''امی! یہ بھی کہہ کر دیکھ لیا ہے مگر اس کا یہاں سے کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

''بے حد پیاری بچی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ خوش رکھے'' امی کے لہجے میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''امی' کبھی کبھی میں سوچتا ہوں' اس کے اچھے ہونے میں ایک خاص وجہ بھی پنہاں ہے'' بلال نے کچھ سوچتے ہوئے لہجے میں ماں سے کہا۔

''کون سی خاص وجہ؟''

''سائرہ شاید اس وجہ سے بھی اچھی ہو کہ ابھی اس کے اپنے بچے نہیں ہیں' اگر اس کے بچے ہو جائیں تو شاید اس کا یہ رویہ عائشہ اور مریم کے ساتھ روا نہ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ ماں بن جانے کے بعد اس کے دل میں سگے سوتیلے کا امتیاز جاگ اٹھے۔''

''نہیں بیٹا! مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے' وہ ہر معاملے میں اچھا ہوتا ہے۔ سائرہ کے بارے میں میری یہ رائے سو فیصد ہے کہ وہ بچیوں سے حقیقی محبت کرتی ہے۔ مکاری اور چلتر پن اس میں دور دور تک نہیں ہے۔'' امی نے بلال کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی! آپ شاید مجھے ایک مطلبی انسان کہیں' مگر میرا دل یہی چاہتا ہے کہ سائرہ کے بچے نہ ہوں تو زیادہ اچھا ہوں' عائشہ اور مریم ہمیشہ ہمیشہ اس کی پوری توجہ پاتی رہیں گی اور اچھی طرح پل جائیں گی۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو بلال تم' ایک ماں کے بارہ بچے بھی ہوتے ہیں تو وہ ہر بچے کو پوری توجہ اور محبت دیا کرتی ہے...... اور تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ سائرہ سے ہونے والے بچے صرف اس کے بچے ہوں گے کیا وہ تمہارے بچے نہیں ہوں گے؟ اتنی بڑی کوٹھی میں جتنے گھر کے لوگ نہیں' اس سے زیادہ ملازم موجود ہیں۔ گھر میں بچوں کی چہکار بڑھے گی تو اس گھر کی رونق میں مزید اضافہ ہو گا۔ میری تو یہ دلی خواہش ہے کہ تمہارے خوب

سارے بچے ہوں۔"

سائرہ جو کار پورچ میں بلال کی گاڑی دیکھ کر ان سے کھانے کا پوچھنے آئی تھی' بلال کی باتیں سن کر بے حا سی ہو گئی اور بغیر کچھ پوچھے الٹے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔ اپنی ذات کا اعتماد قائم کرنا ہر عورت کے لیے اہ مشکل کام ہوتا ہے۔ اسے معصوم سی بچیوں سے واقعی محبت ہو گئی تھی مگر محبت اور ممتا میں فرق ہوتا ہے اسی لیے کی محبت میں وجوہات تلاش کی جا رہی تھیں۔

دونوں بچیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ بلال کو آتا دیکھ کر وہ واش روم میں گھس گئی اور اپنے تمام آنسو پانی ساتھ بہا دیے۔

"کیا بات ہے' چہرہ اترا ہوا سا ہے تمہارا۔ طبیعت تو تمہاری ٹھیک ہے ناں......؟" بلال نے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔" سائرہ نے کہا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"پیٹ میں سخت درد ہے۔ مجھے اس کے لیے آپریشن کروانا ہوگا" وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔

"پیٹ کے درد کے لیے...... میں نے آپریشن کا تو کبھی نہیں سنا۔ آج شام ڈاکٹر احسان چوہدری سے لے کر چلتے ہیں۔ وہ اچھی سی میڈیسن دے دیں گے اور تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"مجھے گائنی کی کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیے۔"

"خیریت تو ہے ناں سائرہ......؟"

"مجھے آپریشن کروا کے اپنی یوٹرس (بچہ دانی) نکلوانی ہے۔ شاید یہی مجھے تکلیف دے رہی ہے۔"

بلال نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ اس نے اس کے لہجے کیا' وہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی اذیت کا شکار ہو۔

بلال کو یہ سمجھنے میں لمحہ بھی نہیں لگا کہ سائرہ نے اس کی تمام باتیں سن لی ہیں اس لیے وہ اپنی بچہ دانی نکلوا کے درپے ہے۔

"آئی ایم سوری سائرہ! میرے جملوں سے تمہیں تکلیف پہنچی مگر خامیاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں' یہ خود غرضی تھی جو میں نے اس نہج پر سوچا۔"

"مجھے آپ کی بات سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے بلکہ اب تو میری یہ دلی خواہش ہے کہ بچہ دانی ہی نکلوا دو بچیاں ہمارے لیے بہت ہیں۔"

"مگر میرے لیے کم ہیں۔ ہمیں اور بچوں کی بھی ضرورت ہے" بلال کا لہجہ شوخ سا ہو گیا۔

"آئندہ سال سے بچیاں اسکول جانے لگیں گی تو میں بھی اکیڈمی جوائن کر لوں گی۔ اسکول کی چھ کرے گی تو ہم سب ساتھ ہی واپس آ جایا کریں گے۔" سائرہ نے اپنا پلان اسے بتایا۔

"عائشہ اور مریم کا کوئی بھائی بھی تو ہونا چاہیے...... ورنہ وہ ہمیشہ شکایت کریں گی۔"

"اب یہ تو کسی کے پاس گارنٹی نہیں ہے کہ بچہ ہوگا تو وہ لڑکا ہی ہوگا۔"

"پھر بھی امید پر دنیا قائم ہے۔" بلال اب ہنس رہا تھا اور سائرہ اس کی بات سمجھتے ہوئے جھینپ سی رہی

"سائرہ' تم بہت اچھی ہو' بے حد اچھی' ایک آئیڈیل ماں اور ایک آئیڈیل بیوی۔" بلال نے اس کا

تے ہوئے محبت سے معمور لہجے میں کہا۔

اور سائرہ کے دو آنسو اس کے رخساروں سے پھسل گئے مگر یہ آنسو شکر گزاری کے تھے' ممنونیت بھرے تھے کہ وہ ایسا انسان تھا' جو بات کہنے سے پہلے سمجھ جایا کرتا تھا۔

☆☆☆

ہمی کی اب ممانی جان سے برائے نام ہی بات چیت ہوتی تھی' دوپہر کو وہ دونوں گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ کھانا بے شک ایک میز پر بیٹھ کر کھاتی تھیں مگر دونوں کے مابین گفتگو صرف ہوں' ہاں تک محدود ہوتی تھی۔

آج دوپہر کو کھانے کی میز پر فہمی اکیلی تھی اور وہ تخت پر چپ چاپ بیٹھی تھیں "آئیے ممانی جان! کھانا کھا لیں" فہمی نے میز پر کھانا لگانے کے بعد معمول کی طرح ان سے کہا۔

"میں نہیں کھا رہی۔"

"اس وقت بھوک نہیں ہے آپ کو......؟" فہمی نے پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔

"بعد میں کھائیں گی آپ کھانا؟"

"ہوں......" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ فہمی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی اور سالہ پڑھنے لگی۔ یہ اس کی ہمیشہ سے عادت تھی' بستر پر لیٹنے کے بعد مطالعہ ضرور کیا کرتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں جھپکی سی آئی تو رسالہ بند کر کے وہ دلائی اوڑھ کر سونے کا موڈ بنانے لگی۔

نیند ابھی ہلکی سی آئی تھی' اسے ممانی جان کے بری طرح اوکنے کی آوازیں آئیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ تخت پر سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ فہمی بجلی کی سی سرعت سے باہر لپکی۔ اس کے پہنچتے پہنچتے وہ ایک دا ی الٹی کر چکی تھیں۔

ہمی نے تاول سے ان کا منہ صاف کیا۔ سہارا دے کر ان کو کمرے میں لا کر لٹایا۔ پرانے کپڑے سے باہر کی صفائی کرنے کے بعد ٹاکی لگائی اور ممانی جان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ممانی جان تکیے پر سر ڈالے نڈھال سی لیٹی تھیں اور ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے سے قطرے جگمگا رہے تھے۔

ہمی نے تولیا گیلا کر کے اس پر پرفیوم کا اسپرے کیا اور ممانی کے ماتھے' چہرے اور گردن سے پھیرتے ہوئے ان کی پشت پر پھیرنے لگی۔ "آپ کی طبیعت خراب ہو رہی تھی تو مجھے بتانا تھا ناں......" وہ ان سے شکوہ آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کیا بتاتی...... طبیعت تو میری کل سے خراب چل رہی ہے" وہ افسردگی سے بولیں۔

"حد ہو گئی ہے ممانی جان! آپ کی بیٹی تو میں ہوں ناں' مجھے نہیں بتائیں گی تو پھر کس کو بتائیں گی؟"

"اب طبیعت کچھ بحال محسوس کر رہی ہوں" انہوں نے کہا۔

"میں ایک گلاس موسمی کا جوس دیتی ہوں' اس کو پی کر آپ کو ضرور تقویت ہوگی۔" وہ سرعت سے جوس نکال لے آئی۔ ممانی جان کو سہارا دے کر بٹھایا اور انہیں اپنے ہاتھ سے جوس پلایا۔

"اب میں بہتر ہوں...... باہر کی صفائی کر دوں' تخت کے پاس ہی الٹی ہو گئی تھی" وہ بمشکل اٹھتے ہوئے

"صفائی میں کر چکی ہوں۔ آپ آرام سے لیٹیے۔ میں آپ کے پاس ہی ہوں' شام کو ڈاکٹر سے چیک اپ

کرائیں گے۔“

”ارے بیٹا! تم نے صفائی......“ ممانی جان کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں اور آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا۔

فہمی نے ان کے اوپر ہلکی سی رضائی ڈال دی۔ جب دو گھنٹے بعد وہ گہری نیند لے کر اٹھیں تو فہمی نے ان سر میں تیل لگا کے چوٹی باندھی۔ نیم گرم ڈیٹول اور عرق گلاب ملے نیم گرم پانی سے ان کا اسپنج کر کے ستھرے کپڑے پہنوائے اور ہلکا سا دلیہ بنا کر انہیں کھلایا۔

”بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے آپ کو بالکل فریش محسوس کر رہی ہوں۔ شاید بدہضمی ہو گئی تھی وجہ سے ایسا ہوا......مگر تمہاری جادوئی تیمارداری نے تو مجھے ہشاش بشاش سا کر دیا۔“ فہمی ان کی بات مسکرانے لگی۔

عین اسی لمحے فہد ماں کے کمرے میں داخل ہوا تو ان دونوں کو مسکراتا دیکھ کر حیرانیہ انداز میں ماں کو دیکھنے

”فہمی نے آج مجھے سنبھالا ہے، ورنہ میری تو طبیعت خراب ہو رہی تھی۔“

”یہ آپ کی بہو ہے، یہی آپ کو سنبھالے گی۔“

”بہو بعد میں ہوں اور بیٹی پہلے، مجھ پر تو دوہری ذمے داریاں ہیں ممانی جان!“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے یہ فہمی۔“

”اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند اور سلامت رکھے اور ہم آپ کی دعائیں سمیٹتے رہیں۔“ فہمی ان کے سے لگ کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔

تب ممانی جان نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور ان کے آنسو بے اختیار گرنے لگے۔

☆☆☆

”اب وہ لاٹ صاحب کی بچی دعوت قبول نہیں کر رہی تو کیا میں اب اس کے قدموں گر جاؤں؟ ’سائرہ! خدا کے واسطے تم آنے کا اقرار کر لو ورنہ تمہارے بھائی جی اپنی زبان کے بگولوں سے جان جلاتے رہیں گے‘“ ثریا نے آپا سے کہا۔

”تم نے کہہ دیا، تمہارا فرض پورا ہو گیا۔ وہ آتی ہے آئے، نہ آئے تمہاری جوتی سے۔“

”آپا، آپ شاہنواز کو نہیں جانتیں، جتنے اچھے دکھائی دیتے ہیں ناں، اس سے زیادہ یہ برے ہیں۔ جو مجھے ہی دکھائی دیتے ہیں۔“

”اب اگر تمہاری نند نہیں آ رہی تو اس میں تیرا کیا قصور۔“

”اب وہ یہ کہیں گے کہ تم نے صحیح طرح نہیں کہا ہو گا۔“

”صحیح طرح کس طرح کہا جاتا ہے؟“ آپا نے ہنس کر پوچھا۔

”پہلے میں ان کی چشمے والی ساس کی خوشامد کروں، پھر میں ان کے لمبے سے میاں جی کے آگے ہاتھ جو اور پھر ان بنورانی کے پیر پکڑوں۔“

”اپنی ساس سے کہہ دو کہ آپ سائرہ کو دعوت کے لیے کہہ دیں۔ وہ جانیں اور ان کی بیٹی۔ آ جائیں اچھا ہے، نہیں آئیں گی تو اس سے زیادہ اچھا ہے۔“

”ہاں آپا، آپ نے یہ ترکیب بڑی لاجواب بتائی ہے۔ میں اسی پر عمل کروں گی، ورنہ سچی بات تو یہ

ں سائرہ کی شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔“

”ثریا، تم تو بڑی لکی ہو، دونوں نندوں سے فارغ ہو۔ ایک دیورانی ہے، وہ بھی تم سے پنگا نہیں لیتی ہے۔ کوئی ت تم کہہ بھی دو، وہ ہنس کر ٹال بھی دیتی ہے۔“

”ہاں آپا! یہ تو ہے، صابرہ بہت سی باتوں میں میرا ساتھ دیتی ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، تم بہت قسمت والی ہو۔ فریال نے بھاگ کر تمہارے لیے تو اچھا ہی کیا، ورنہ جاہل نند کنواری سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تمہارے لیے سائرہ بھی اچھی رہی، وہ دعوت کھانے سے انکاری ہے۔ کھڑے کھڑے آتی ہے، اپنی ماں کو دیکھ کر چلی جاتی ہے۔ کسی غریب گھر میں بیاہ کر جاتی تو اس کی یہی حسرتیں جوان ہوتی رہتیں کہ اس کے آگے اور اس کے میاں کے آگے ٹرے لگتی رہے۔“

”ہاں آپا! یہ بات تو ہے، اپنی سسرال میں میرا راج ہے۔“

”تیرا راج پاٹ یونہی برقرار رہے گا تو بھی اپنی بیٹی کے لیے کوئی بڑا گھرانا ڈھونڈنا، بلکہ ابھی سے یہ معلوم نے کی کوشش کرو بلال کے خاندان میں کتنے کنوارے لڑکے موجود ہیں۔“

”اگر اس نیت سے میں ملوں گی تو سائرہ کی دعوت کے لیے مجھے خوشامد بھی کرنی چاہیے“ ثریا نے کچھ دیر نے کے بعد آپا سے پوچھا۔

”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ یہ کرو، کل اپنی ساس کے پاس بیٹھ کر سائرہ کو فون پر خوشامدانہ انداز میں دعوت ڈالو۔“

”ٹھیک ہے آپا، میں بھی آپ کی بہن ہوں، ایسے پانسا پھینکوں گی، ہر حال میں چھا آئیں گے“ تب آپا بے اختیار کھلکھلا اٹھیں۔

☆☆☆

سائرہ اور بلال ان کے ہاں کھانے پر آ گئے تھے۔ ثریا نے اس قدر اصرار کیا تھا کہ سائرہ کو منع کرنا دشوار ہو گیا سائرہ اپنے ساتھ کیک اور مٹھائی کے ہمراہ دونوں بھابیوں کے لیے سوٹ لائی تھی جو سب کو بہت پسند بھی تھے۔

زعلی اور بچیاں گھر پر ہی رہ گئی تھیں اور اب ثریا بار بار یہی کہے جا رہی تھی۔ ”آنٹی بھی آ جاتیں تو مجھے بے شی ہوتی۔ آخر وہ ہماری امی کی بہت پرانی سہیلی ہیں......اور تمہاری بچیاں تو مجھے پریاں سی لگتی ہیں۔ انہیں مجھے اتنا پیار آتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔“

یا کا یہ انداز سائرہ کے لیے نہ صرف نیا تھا بلکہ اجنبی بھی تھا۔ اس انداز میں تو انہوں نے کبھی بات نہیں کی

کھانے میں بھی بے حد اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر چیز گھر میں سلیقے سے پکائی گئی تھی، جس میں لذت بھی موجود شائستہ بیگم بھی حیرت کے ساتھ ثریا کی یہ گفتگو سن رہی تھیں۔

”سائرہ! تمہاری شادی ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے میکے والوں سے تعلق ہی ختم کر لو۔ ہر ویک ہمارے ساتھ کھانا کھایا کرو گی۔ تم ہماری لاڈلی سی بہن ہو، ہر وقت یاد آتی ہو۔ ہفتے میں ایک آدھ بار میں اور تمہاری بچیوں سے ملنے آیا کروں گی۔“ ثریا کا دوسرا جملہ سن کر سائرہ چونکی کہ وہ یہ بات اچھی طرح ثریا کو صرف اپنے میکے والوں سے ملنا پسند تھا بقیہ جگہ وہ مارے باندھے ہی جایا کرتی تھیں۔

”ثریا بھابی! ہر ویک اینڈ پر نہ ہی میں آ سکتی ہوں اور نہ ہی آپ آ سکیں گی کہ آپ کی معروفیات تو بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ہاں، جب بھی فرصت ملے گی، میں آپ لوگوں سے ملنے کے لیے آتی رہوں گی بلکہ آ ہی ہوں“ سائرہ نے کہا۔

”یہ بھی کوئی تمہارا آنا ہوتا ہے، چڑیا کی طرح پانچ منٹ کے لیے جھانک کر چلی گئیں“ ثریا نے شکوہ ہوئے کہا۔

”نہیں بھابی، ہم لوگ بھی آئیں گے اور آپ سب لوگوں کو بطور خاص اپنے گھر میں بلائیں گے“ بلا ضمن میں پہلی مرتبہ بولا۔

”یہ ہوئی ناں بات...... جو ہمارے داماد جی نے ہمارے دل کی کہی۔“ ثریا مسکراتے ہوئے بولیں تو ا خوشامدانہ لہجے کو محسوس کرتے ہوئے شائستہ بیگم کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”آئندہ ویک ثنا آئے گی تو اس کو لے کر تمہارے گھر آؤں گی“ ثریا نے کہا۔

”ہاں ہاں ضرور“ سائرہ نے پرمحبت لہجے میں کہا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ثریا نے شیفون کی کامدانی کی ساڑی سائرہ کو دی، پینٹ شرٹ بلا ان کی ساس کے لیے چکن کا سوٹ اور بچیوں کے لیے خوبصورت فراکیں دیں تو ایک لمحے کے لیے شائستہ چکرا سی گئیں۔

شاہنواز محبت بھرے انداز میں ثریا کو دیکھنے لگے اور سائرہ سے کہا ”مجھے تو پتا نہیں، یہ سب ثریا نے خود خریدا ہے۔ یہ تمہیں اپنی بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔“

”ہاں واقعی، بہنوں کی طرح“ بلال نے دل میں سوچا اور اس کی نظروں میں وہی خط لہرا گیا جو ثریا نے کے ایڈریس پر لکھا تھا۔ یہ عورت اتنی محبت بھرے مظاہرے کیوں کر رہی ہے؟ بلال سوچ رہا تھا۔

ثریا کا یہ انداز تو آج تک دیکھنے کو نہیں ملا تھا، یہ یکدم بدل کیسے گئی؟ اس کے اس طرح تحائف دینے ک کیا ہے؟ شائستہ بیگم بھی پریشان ہو کر سوچ رہی تھیں۔

یہ بھابی پاشا میرے کو بتایا بھی نہیں خود جا کو لے آئیں سوب چیزاں اگر بتا دیتیں تو میں بھی کچھ نہ کچھ دے دیتی۔ اس دخت ایسے خالی ہاتھاں تو نہیں بیٹھتی۔ صابرہ بھی خفت بھرے انداز میں سوچ رہی تھی۔

اور سائرہ کے دماغ میں ایک انجانا سا سائرن بج رہا تھا، کسی بھی شخص کی عادت بدل سکتی ہے مگر نہیں۔ ثریا بھابی کبھی دیالو فطرت کی نہیں تھیں تو آج ایک دم کایا کیسے پلٹ گئی؟ ضرور کوئی خاص بات ان ان تحائف کے پیچھے چھپی ہوئی ہے؟ سائرہ سوچ رہی تھی۔

ثریا اور شاہنواز وہاں سے ہٹے تو سائرہ نے اپنی ماں سے سرگوشی بھرے لہجے میں کہا ”امی! میرا دل لے جانے کو نہیں چاہ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان تحائف کے پس پشت بھابی کا کون سا مطلب چھپا ہوگا

”بری بات ہے بیٹا! تحائف کبھی واپس نہیں کیا کرتے۔ اس کا دل خواہ مخواہ برا ہوگا۔ مطلب جو بھی سامنے آ جائے گا، اس وقت تم یہ تحائف قبول کر لو۔“

سائرہ نے ماں کی بات سن کر بلال کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

”سائرہ! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

سائرہ اور بلال جب رخصت ہو رہے تھے تو ثریا بھابی کا بطور خاص شکریہ ادا کر رہے تھے۔ اور ثریا م

اس وقت تک کھڑی رہیں جب تک ان کی سیلون دکھائی دیتی رہی۔

☆☆☆

وہ فاطمہ حسن کی پیاری سی نظم ”اچھا لگتا ہے“ پڑھ رہی تھی اور اس کے لب از خود مسکرا رہے تھے۔ گنگناہٹ کی آواز ذرا سی تیز ہوئی تو پاس بیٹھا فہد بھی اس کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

مجھے پھولوں کا موسم
یہ پودے اور پرندے
اچھے لگتے ہیں
مجھے اک دور تک جاتی سڑک پر چلتے رہنا
اچھا لگتا ہے
مجھے مچھلی کا پانی پر اچھلنا
اچھا لگتا ہے
مجھے تتلی کا پھولوں پر بھٹکنا
اچھا لگتا ہے
مجھے برسات میں پھیلی دھنک بھی
اچھی لگتی ہے
مجھے ہاتھوں میں چوڑی کی کھنک بھی
اچھی لگتی ہے
مجھے تم اچھے لگتے ہو۔

وہ اس کی پشت پر سے کتاب کی سطریں پڑھتے ہوئے بولا ”فہمی......! میں اچھا ہوں، تب ہی تو اچھا لگتا ہوں۔“

”ہاں یہ تو ہے“ وہ سرشار سے لہجے میں بولی۔

”مگر تم اچھی نہیں ہو“ فہد نے بے ساختہ کہا۔

”ارے واقعی، میں تو اس غلط فہمی میں رہی کہ میں اچھی ہوں......“ فہمی کے لہجے میں ملال بھر سا آیا۔

”غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔“

”ہاں یہ بھی میری غلطی ہے“ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھر آیا۔

”تم پوچھو گی نہیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں؟“

”میں پوچھ کر بھی کیا کروں گی؟“

”کبھی پوچھو تو سہی، اپنے مجازی خدا کے حقیقی خیالات سے واقف تو ہونا چاہیے۔“

”اچھا تو بتایئے...... میں اچھی کیوں نہیں ہوں؟“ اس نے اپنی جھکی جھکی پلکیں لمحے بھر کو اٹھا کر پھر گرا دیں۔

”اس لیے فہمی......“ فہد نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں کسی کتاب کی طرح تھام لیا۔

اور مارے خفت کے اس نے اپنی دونوں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ پتا نہیں وہ کیا بم گرانے والا تھا۔

”اس لیے فہمی......!“ اس نے مکرر کہا۔ ”کہ تم بے حد اچھی ہو...... بے حد اچھی! صرف اچھی ہونا تمہاری [illegible] اعتراف نہیں کرتا۔“

تشکر کے دو آنسو فہد کے ہاتھوں پر آ گئے۔

"فہد! میری ہستی آپ کے دم سے ہے۔ آپ کی محبت میرا حوصلہ ہے' آپ کی چاہت میرا وقار ہے۔ جس بیوی کو یہ سب کچھ حاصل ہو' تو اسے بھی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔"

"ہاں یار! یہ بات تو تم صحیح کہہ رہی ہو" فہد ہنس کر بولا۔

☆☆☆

"کیا کہا' تم میرے گھر آؤ گی" فرید احمد خوشی سے اچھل ہی تو پڑے۔

"ہاں جان! میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم کہاں بیٹھتے ہو؟ کہاں سوتے ہو اور کہاں چلتے پھر تا کہ جب میں تم سے فون پر باتیں کروں تو میرے خیالوں میں بھی حقیقی رنگ بھر سکے۔"

"مجھے بے حد خوشی ہوگی' تم میرے گھر میں آؤ گی ورنہ اس سے قبل جب بھی تم سے کہا تم نے ہمیشہ انکار

"کچھ غلطیاں تو مجھ سے بھی ہوئی ہیں' اگر نہ ہوتیں تو ہم آج یکجا ہوتے۔ ندی کے دو پاٹوں کی طرح علیحدہ علیحدہ نہ ہوتے۔"

"ہاں نینا! غلطیاں مجھ سے بھی ہوئی ہیں' اگر میں تم سے کورٹ میرج کر لیتا تو میری زندگی بھی یوں صحرا سی نہ

"فرید' لوگ کہتے ہیں محبت جوانی میں ہوتی ہے' مگر عمر کے اس حصے میں پہنچ کر بھی میری محبت میں واقع نہیں ہوئی ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ تم جوان نہیں رہیں۔ جوانی تو تم پر آ کر ٹھہر سی گئی ہے۔ وہی دلنشین آنکھیں' ویسا چہرہ اور قاتل لب!"

"اگر تم نے فیروزہ سے شادی کر ہی لی تھی تو اس کو اتنا عرصہ چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ ختم کر دیتے قصے کو تو پھر شاید میں کسی دروازے سے تم تک پہنچ جاتی۔"

"ارے فیروزہ کی میری زندگی میں نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی کوئی جگہ۔ بس وہ میری دو بچیوں کی ما ہے اس لیے گھر کے ایک کونے میں ڈال رکھا ہے۔ نیناں! تم...... تم ہو...... اور تمہاری جگہ آج تک کوئی سکا ہے" فرید احمد اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے کہہ رہے تھے۔

"ہاں جان! اس کا مجھے اندازہ ہے اور یقین بھی ہے کہ میری محبت کبھی یکطرفہ کیسے ہو سکتی تھی۔" سرشار سے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں ایک ریستوران میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کافی اور سینڈوچز ان کے سامنے رکھے ہو اور ان کی باتیں کسی ٹین ایجرز کے لڑکیوں کی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

"کیا میں فیروزہ کی موجودگی میں تمہارے گھر آؤں؟" نینا نے پوچھا۔

"ہاں' اس کی موجودگی میں بھی آ سکتی ہو۔ یہ بات میں اس کو بتا چکا ہوں' تم میرے لیے کیا درجہ ر یوں بھی وہ ایک جاہل' گنوار اور پاگل سی عورت ہے۔ بات کرنی اسے آتی نہیں ہے۔ بے حد سیدھی ہے او

"فرید! تم فیروزہ کو جاہل' گنوار' پاگل اور بدتمیز تو ضرور کہہ سکتے ہو مگر وہ سیدھی سادی عورت ہ ہے۔" نینا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" فرید احمد نے حیرت سے پوچھا۔

"فیروزہ نے فون پر مجھ سے بات کی ہے اور انتہائی بدتمیزی کے ساتھ۔"

"اس کی یہ ہمت!" فرید احمد کے چہرے پر غیظ و غضب کی شکنیں پڑنے لگیں۔

"لول ڈاؤن! مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی اس کی بکواس سن کر۔ میں تم سے محبت کرنے سے باز لی ہوں۔ میں نے تو تمہاری محبت کے لیے اپنی جان بھی تلوار کی نوک پر رکھی ہوئی ہے۔ اگر میرے شوہر کو کچھ چاہا تو وہ بے شک مجھے شوٹ کر ڈالے مگر تمہارا نام میرے لبوں پر وہ کبھی سن نہ سکے گا۔"

"ایسے شقی القلب شخص کو تم چھوڑ کیوں نہیں دیتیں......؟"

"اس نہج پر بھی ہمیں سوچنا تو ہوگا" نینا اب اصل موضوع کی جانب آ رہی تھی۔

"میں تم سے ملنے کو ترستا رہتا ہوں۔ تم کتنی مشکلوں سے میرے لیے وقت نکالتی ہو۔ میں نے کراچی' آباد ایک کر رکھا ہے اور تمہیں وقت بھی نہیں ملتا" فرید احمد شکوہ کر رہے تھے۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ اب ہمارا اچھا وقت بے شک دیر سے ہی سہی مگر آ رہا ہے" نینا نے کہا۔

"یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔"

"اگر میں تم سے کہوں کہ فیروزہ کو طلاق دے دو تو تم دے دو گے؟" نینا نے پوچھا۔

فرید احمد یکدم چپ سے ہو گئے اور لگے اسے تکنے جیسے وہ کوئی واہی تباہی بک رہی ہو۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے فرید" نینا کی آواز نے سکوت توڑا۔

"یہ فیروزہ ہمارے بیچ میں کہاں سے آ گئی؟"

"وہ ہمارے مابین موجود ہے۔"

"مگر میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

"میں سمجھتی ہوں۔"

"نینا! تم یقین کرو' تمہارے سامنے اس کی ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں ہے۔"

"مگر میں تمہارا نام اس کے نام کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔"

"تو مت دیکھو' اس کا تم سے بھلا واسطہ ہی کیا ہے؟"

"بے شک واسطہ نہیں ہے مگر ایک تعلق ضرور ہے اور میں جب تک یہ تعلق نہیں توڑوں گی' میرا تم سے واسطہ ں ہو سکتا" نینا نے آہنی لہجے میں کہا۔

"بیکار کی باتوں میں الجھ رہی ہو تم۔ ہم دونوں کو آج تک کسی کی ضرورت رہی ہے نہ اہمیت...... تو تم فیروزہ ا پاگل عورت سے کیوں الجھ رہی ہو؟"

"میں فیروزہ سے نہیں الجھی ہوں' وہ مجھ سے الجھی ہے...... اور تم میری عادت جانتے ہی ہو کہ خود سے میں کو چھیڑتی نہیں ہوں اور جو مجھے چھیڑے' اسے میں چھوڑتی نہیں ہوں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں تو صرف تمہاری محبت کا تمنائی ہوں۔"

"اصل کام تو تمہیں ہی کرنا ہوگا فرید احمد!" نینا نے گمبھیر سے لہجے میں کہا۔

"ارے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" بات کو ہلکا کرنے کے لیے فرید احمد زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔ "جو کام ہے وہ میں جانتا ہوں۔ صرف تم سے محبت کرنے کا کام ہے میرا' ہاں۔"

"تمہیں صرف فیروزہ کو طلاق دینا ہوگی اور بس......!" نینا نے کھلکھلاتے سے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

نگین کے جانے کے بعد فیروزہ کا دل اپنے گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا گول مٹول سا بیٹا ہمہ وقت یاد آ رہا تھا۔ اس کا لمس، اس کی خوشبو اپنے ہر سو محسوس کر رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر نگین کے پہنچ جائیں اور بچے کو اپنے سینے سے لگا لیں مگر اتنی جلدی نگین کے پاس جانا انہیں کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ نگین کو اپنی سسرال گئے ابھی چار دن ہی تو ہوئے تھے۔ کیا کہیں گی آپا...... بیٹی کے پیچھے پیچھے بھاگی چلی آ رہی ہیں۔

اپنی اولاد سب ہی کو پیاری ہوتی ہے، کہتی ہیں تو کہتی رہیں...... میں تو ضرور جاؤں گی۔ ننھا منا سا ار بے پناہ یاد آ رہا تھا۔

اس کا رونا، اس کا ہاتھ پیر چلانا...... اس کا سونا...... واقعی، اولاد کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے...... بے مسلسل بڑھ رہی تھی۔

'میں فرید سے کہہ دیتی ہوں، میں آئندہ ہفتے نگین کے پاس جا رہی ہوں، انہوں نے دل ہی دل میں بتایا۔

وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ انہیں اس بات سے چڑ تھی، فیروزہ گھر چھوڑ کر کسی رشتے دار کے گھر رہنے جا اپنے سگے بھائی کے گھر بھی کبھی دو چار روز رہنے کے لیے نہیں گئی تھیں۔

کتنا ان کا دل چاہتا تھا، وہ بھائی جان کے ساتھ بیٹھ کر دیر تک باتیں کریں۔ اتنی باتیں کہ رات ہو جائے اور صبح سے شام...... مگر وقت کی تلوار ان کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہی۔

''فیروزہ، تم شام کو گھر آ جانا۔''

''فیروزہ، تم دو گھنٹے بعد آ جانا۔''

''پاگل ہوئی ہو کیا...... اتنی سردی میں کیا کوئی کسی کے گھر جایا کرتا ہے؟''

''دماغ خراب ہو گیا ہے کیا...... اتنی گرمی میں لڑکیوں کو لے کر کہیں جاؤ گی۔ بچیاں علیحدہ پریشان اور تمہارے رشتے دار علیحدہ اکتائیں گے...... خواہ مخواہ کسی کے گھر جا کر پڑ جاؤ۔''

''میرا بھی تو یہ دل چاہتا ہے کہ اپنے بھائی بہن کے گھر جا کر رہوں، اس میں سردی اور گرمی کے موسم دخل ہے؟'' وہ اکتا کر شکایتی لہجے میں میاں سے کہتیں۔

''جس کو ملنا ہوگا، وہ تم سے آ کر خود مل لے گا۔''

''مگر بڑوں کے گھر جایا جاتا ہے، بڑے چھوٹوں کے گھر دوڑ دوڑ کر نہیں آتے'' وہ سمجھاتیں۔

''اب کوئی چھوٹا نہیں ہے...... سب اپنے اپنے گھر کے بڑے ہیں۔ مجھے پسند نہیں ہے کہ تم گھر میں کے بجائے...... رشتے داروں میں ہمہ وقت گھومتی رہو۔''

تنگ آ کر فیروزہ نے آنا جانا کم کر دیا تھا، جہاں ضروری ہوتا تھا وہ لڑ بھڑ کر تھوڑی دیر کے لیے چلی جا تھیں۔ اب انہیں نگین سے زیادہ اپنا نواسا یاد آ رہا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ وہ فرید احمد سے پوچھیں گی تو وہ

مع کر دیں گے۔

ہمی کی بات وہ نہیں ٹالا کرتے تھے۔ کیوں نہ میں فہمی سے زور دلواؤں، تا کہ فرید احمد مجھے پنجاب جانے سے ہ لیں۔ یہی سوچ کر انہوں نے فہمی کو فون کیا۔ فون فہمی نے ہی ریسیو کیا تھا۔ ماں کی بات سن کر وہ بے ساختہ [illegible]

''کیا ہو گیا ہے امی، آپ کو...... نگین کو اپنے گھر گئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ہے؟''

''بس، میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔ گھبراہٹ ہو رہی ہے مجھے۔''

''ابھی آپ رک جائیں۔ اتنی جلدی جانا کچھ مناسب نہیں لگے گا۔''

''فہمی، میں نے تمہیں اس لیے فون نہیں کیا ہے کہ تم اپنی پند و نصائح کا لیکچر مجھے دو......'' فیروزہ کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

''آپ اگلے ماہ چلیں، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ دونوں مل کر پنجاب میں خوب گھومیں گے'' فہمی نے وش دلی سے کہا۔

''ارحم مجھے ابھی یاد آ رہا ہے...... اور تم کہہ رہی ہو کہ اگلے ماہ جانا؟''

''کمال کرتی ہیں امی آپ بھی...... ایک مہینہ تو چٹکیوں میں گزر جائے گا۔''

''مگر میرے لیے تو ایک دن ایک سال کے برابر کا ہو رہا ہے۔''

''لگتا ہے، آپ کی طبیعت خراب ہے...... نگین کے جانے کا اثر لیا ہے آپ نے۔ یوں کریں آپ شاپنگ رلیں۔ اس سے بھی دل بہلتا ہے۔ اب کے ویک اینڈ میں گھر رہنے کے لیے آ جاتی ہوں۔ دونوں مل کر اپنی پند کی موویز دیکھیں گے۔'' فہمی لاڈ بھرے لہجے میں ماں سے کہہ رہی تھی اور فیروزہ اس کی بات سن کر صرف ہوں ہاں کر رہی تھیں۔

شام کو فرید احمد دکان سے گھر آئے تو ان کی طبیعت میں برہمی رچی ہوئی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا، جب سیلز مین بے پروائی کر کے کوئی نقصان کرتے تھے تو ان کو سخت و سست کہنے کے باوجود ان کا مزاج بگڑا بگڑا ہی رہتا تھا۔

''گاڑی تو آپ کی خراب تھی...... آپ گھر کیسے آئے؟'' پانی کا گلاس دیتے ہوئے فیروزہ نے پوچھا۔

''جہاز پر......'' فرید احمد برہمی سے بولے۔

فیروزہ نے حیران ہو کر میاں کو دیکھا۔

''ظاہر ہے، ٹیکسی پر ہی آنا تھا'' پانی کا گلاس پاس رکھی تپائی پر رکھ کر وہ صوفے پر ڈھے جانے والے انداز میں کر گئے۔

''چائے لاؤں آپ کے لیے......؟'' فیروزہ مشینی انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔''

''کافی پئیں گے؟''

''ہاں، اچھی سی بنانا'' اب ٹی وی کھول کر وہ مختلف چینلز چیک کر رہے تھے۔

'نینا بھی کافی شوق سے پیتی ہے اسی لیے اب انہوں نے بھی کافی زیادہ پینی شروع کر دی ہے۔ کافی پینے ے دوران میں بھی ان کی تیوریاں ماتھے پر سجی ہوئی تھیں۔ فیروزہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''فرید! ایک بات کہوں......؟''

''ہوں......'' ان کی نظریں ٹی وی پر بدستور قائم تھیں۔

''میرا دل پنجاب جانے کو چاہ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کچھ دنوں کے لیے نگین کے پاس چلی جاؤں' مجھے اپنا ارحم بے حد یاد آ رہا ہے۔''

''ارے اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے' تم کل ہی چلی جاؤ'' فرید نے پرمحبت لہجے میں کہا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟'' فیروزہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ انہیں اتنی آسانی سے جانے کا پروانہ مل چکا ہے۔

''اس میں ناراضی کی کیا بات ہے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ارحم مجھے بھی بہت یاد آ رہا ہے۔''

''تو پھر آپ بھی چلیے ناں میرے ساتھ۔ آپا بھی خوش ہو جائیں گی آپ کو دیکھ کر۔'' فیروزہ کا لہجہ سرشاری سے مزین تھا۔

''آج ہی دکان پر خاصا بڑا نقصان ہوا ہے' یہ سیلز مین جانے بوجھے بغیر ادھار پر سپلائی کر دیتے ہیں......اور لوگ غلط شناختی کارڈ دے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ فی الحال تو میرا جانا مشکل ہے......تم وہاں مزے سے رہو۔ میں آئندہ ماہ تمہیں لینے آ جاؤں گا۔''

''تو کیا میں عظمت آپا کے ہاں ایک ماہ رہوں گی؟'' فیروزہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیا مضائقہ ہے' وہ بیٹی کی سسرال تھوڑی ہے' میری بہن کا گھر بھی ہے......اور پھر وہاں اتنے سارے رشتے دار ہیں ہمارے' سب سے مل کر آئیں گے' سب کی خفگیاں بھی اسی طرح ختم ہو سکیں گی۔''

''ٹھیک ہے' تو پھر میں کل ہی چلی جاتی ہوں۔''

''میں تمہارا ٹکٹ کرواتا ہوں۔ اپنے ساتھ طفیل کو لے جانا تاکہ راستے میں سہولت رہے۔''

''دو چار روز کے بعد کی سیٹ کرا دیں......تاکہ آپ کے لیے دو چار سالن تو بنا کر رکھ جاؤں۔'' مشرقی بیوی کی چاہت جاگ اٹھی تھی۔

''ارے میری فکر مت کرو' یہ بچہ قادر تو ہے ناں میرے پاس......کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ تم جلد از جلد نگین کے پاس پہنچو......اور یہ لو پیسے......یہ کیش تم نگین کو دے دینا کہ جو دل چاہے اپنی پسند سے خرید لے۔'' دس ہزار کی رقم فراخ دلی سے فیروزہ کو دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''میں تو ڈر رہی تھی' آپ مجھے جانے کی اجازت بالکل نہیں دیں گے مگر آپ تو بہت اچھے ہیں' بہت اچھے......'' فیروزہ کا لہجہ ممنونیت سے بھرا ہوا تھا۔

''کس لیے کماتا ہوں......صرف تمہارے لیے۔ اللہ کا شکر ہے بچیوں کے فرض سے فارغ ہو گئے ہیں......اب جتنا بھی پیسہ ہے' صرف تم پر ہی خرچ کرنا ہے۔ یہ لو پیسے......تم لاہور سے اپنے لیے بھی شاپنگ کر لینا۔

''پندرہ ہزار کی خطیر رقم فرید احمد نے فیروزہ کے ہاتھ میں تھمائی۔

''لاہور تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گی......جب آپ آئیں گے......تو واپسی پر لاہور کا چکر لگاتے ہوئے آئیں گے۔''

''مجھے تو آنا ہے ہی......مگر یہ پیسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔''

اور فیروزہ پھر ایک مرتبہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئیں۔ فرید ایک نمبر کے کنجوس تھے۔ ان سے پیسہ حاصل کرنا جوئے شیر حاصل کرنے سے کم نہ تھا اور آج وہ حاتم طائی بنے ہوئے تھے۔

اس وقت ان کی سرشاری کا یہ عالم تھا کہ اگر فیروزہ ان کا پورا بٹوا بھی طلب کر لیتیں تو وہ بے چوں و چرا ان ے قدموں میں رکھ دیتے۔

''فرید! کبھی کبھی تو آپ مجھے واقعی حیران کر دیتے ہیں'' فیروزہ نے چاہت بھرے لہجے میں میاں سے کہا۔

''محبت کرنے والے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں'' فرید نے قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

صابرہ سو کر اٹھی تو جی کسمنا سا ہو رہا تھا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ چائے بنا کر پی جائے۔ آج کچھ سردی بھی زیادہ تھی۔ اس سے قبل وہ اٹھتی' آپا اور رعنا کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑی سی باسکٹ تھی' س کا مطلب یہ تھا' وہ کچھ پکا کر اس کے لیے لائی ہیں۔

ایسا اکثر ہوتا تھا' وہ جب بھی کوئی اچھی چیز پکاتیں' صابرہ کے لیے بھی لے کر آتیں۔

''آپ کیا لے آئی ہیں......؟'' صابرہ نے بہن سے پوچھا۔

''آج میں نے بخرے (بکرے) کے پاواں بنائے تھے ناں......میں سوچی' دلنواز کو اور منور کو بھی اچھے لگتے یں اس لیے لے کو آئی میں۔''

''اتی سردی میں تو سوب کو اچھے لگتے......اور پکے پکائے تو بہوت اچھے لگتے'' صابرہ نے ہنس کر کہا۔

''خالہ' آپ کا لچھا کاں کو گیا......؟'' رعنا نے اس کے گلے کے سیاہ پوت کے ہار کی بابت پوچھا۔

صابرہ نے فوراً اپنے گلے کو چھوا ''صبح تو میرے گلے میں تھا'' اللہ کاں کو گیا وہ......''

''دوسرے کمرے میں دیکھ کر آؤ......شاید وہیں گرا کو آئے ہو تم......'' فاخرہ نے بہن سے کہا۔

صابرہ بجلی کی سی سرعت سے گئی اور جب واپس آئی تو منہ لٹکا ہوا تھا۔

''اپنی کام تن (ملازمہ) سے پوچھا تم......''

''وہ نہیں لے سکتی۔ ایماندار ہے......اور پھر اپنے بلدہ (حیدر آباد) کی ہے وہ۔''

''ہونہہ......کوئی نکو ہوتا ایماندار......کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کون کتنا ایماندار ہے۔ مائی سے پوچھا ہوتا ناں......'' فاخرہ نے بے چین ہو کر کہا۔

ان کی آواز شاید باورچی خانے میں بھی پہنچ گئی تھی۔ مائی ان کے کمرے کی چوکھٹ پر آ کر بولی۔ ''ائی' میرے کو کیا معلوم ماں......میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ صابرہ بی بی دن بھر بستر گھوس لیتے پھرتے......وہیچ میں ہوں گی ان کی چیزاں......چادراں اٹھا کو دیکھیے کیا......''

فاخرہ نے بستر پر پھیلائی ہوئی دلائی اٹھائی تو لچھا اسی کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

''شاباش ہے صابرہ! کیسے اپنی چیزاں کی حفاظت کو بیٹھتے تم......تمی ایسے ہو......تو تمہاری بہو کیسی ہوئیں گی؟'' فاخرہ نے ہنس کر بہن سے کہا۔

''ایک سے بڑھ کو ایک......'' رعنا نے قہقہہ لگایا ''کیوں خالہ......!''

''جی ہو......برابر بولے'' اب صابرہ بھی مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

آج پھر فرید احمد اور نینا ہوٹل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نینا اپنے گھر اور اپنے بچوں کی بابت بتلا رہی یں اور فرید احمد اپنی تنہائی اور بے کلی بیان کر رہے تھے جو نینا کے بنا انہیں محسوس ہوتی تھی۔

"فرید! تمہاری باتیں میرے دل کو سکون دیتی ہیں۔"

"تمہاری باتیں میرے زخموں پر پھاہے رکھا کرتی ہیں۔" فرید نے کہا۔

"میرا شوہر میرا ہو کر بھی میرا نہیں ہے، ساری زندگی اس نے مجھ پر شک کیا کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی" نینا نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

"اس کا شک صحیح ہے ناں، محبت تو تم مجھ سے ہی کرتی ہو۔" فرید اس کا ہاتھ دبا کر ہولے سے ہنسے۔

"مگر اس کے ساتھ رہ کر میں نے اپنے آپ کو تج دیا اور میری محبت لہولہو ہو کر بکھر گئی۔"

"نیناں، محبت کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو ہمیشہ پھول بن کر مہکتی ہے۔"

"میں بھی یہ بات جانتی ہوں اور کبھی سوچتی ہوں کہ طلاق لے کر تم سے شادی کر لوں۔"

"میں تیار ہوں...... یہ تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں علیحدہ گھر میں رکھوں گا۔"

"مگر بیٹی کی وجہ سے میں یہ سب نہیں کر سکتی ورنہ اس کی شادی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔"

"چلو ہم اگر باقاعدگی سے ملتے رہیں...... تو دلی طمانیت تو حاصل رہے گی۔"

"ہاں، یہ تو ہے" نینا مسکرائی۔

"تو پھر وعدہ کرو کہ ہر ہفتے نہیں تو مہینے میں ایک بار دوبدو ضرور ملو گی؟"

"ٹھیک ہے" اس نے اپنا ہاتھ فرید احمد کے ہاتھ پر رکھ دیا، جس پر فرید احمد نے اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا اور نینا اپنے دل میں یہ سوچنے لگی، فیروزہ بیگم! تم اپنے آپ کو بہت سورما سمجھتی ہو...... مگر تم پر ایسا وقت جلد آنے والا ہے کہ تم میرے سامنے اپنا کاسہ لے کر گڑگڑاتی ہوئی آؤ گی، تب نینا بے اختیار ازخود ہنسنے لگی۔

"کیوں ہنس رہی ہو......؟" فرید احمد اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

"میں اب اس وقت کی منتظر ہوں جب تم فیروزہ کو طلاق دو گے۔" اب وہ سرشاری سے گنگناتے ہوئے فرید احمد کو دیکھ رہی تھی۔

"اب تم مجھ سے اتنی بہادری کی بھی توقع مت کرو۔ یوں بھی محبت کرنے والوں کا دل چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کی پریشانیوں سے گھبرا جاتے ہیں" ریستوران میں تھائی سوپ پیتے ہوئے فرید احمد نے نینا سے کہا۔

"یہ بہادری کی نہیں...... اصول کی بات ہے" نینا اپنے موقف پر بدستور ڈٹی ہوئی تھی۔

"بات یہ ہے کہ اب عمر کے اس دوراہے پر فیروزہ کو چھوڑ دینا کوئی اچھی بات نہیں ہو گی...... اور یوں بھی اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تم سے برسوں سے مل رہا ہوں، وہ کبھی ہمارے درمیان نہیں آئی۔"

"ہمارے درمیان...... کوئی آ بھی کیسے سکتا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت جو کرتے ہیں لیکن جب میں اپنے شوہر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکی ہوں تو ایسا فیصلہ تمہیں بھی کرنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، اس موضوع پر بھی سوچیں گے۔ فی الحال تو وقت سے لطف اندوز ہونا سیکھو۔ تمہارا شوہر کتنے عرصے بعد ملک سے باہر گیا ہے۔"

"ہاں، مجھے تو یقین ہی نہیں تھا کہ وہ پورے ایک ماہ کے لیے جائیں گے۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں کہ نہ تم کوئی فیصلہ جلدی کرو اور نہ ہی میں اس بکھیڑے میں پڑنا چاہتا ہوں۔ وقت ہماری مٹھی میں ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر کوئی طمانیت نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم...... مگر میں تم سے ملنے تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں۔"

"تم صرف اپنا پروگرام بتا دو کہ کب آ رہی ہو...... میں فیروزہ کو اپنے گھر سے تو کیا، اپنے شہر سے دفع کر دوں ا۔"

"الی...... تم اس نہج پر بھی سوچ سکتے ہو؟" نینا کا لہجہ مسرتوں سے لبریز تھا۔

"ہاں...... اب دل کی رانی جب آئے گی تو اس کی موجودگی میں کسی کی کیا مجال...... کہ وہ وہاں قدم جما کر ٹے۔"

"ٹھیک ہے، میں آئندہ جمعے کو تمہارے گھر آ رہی ہوں۔"

"چار دن رہنا چاہو تو رہ سکتی ہو۔"

"ں فرید! میں صرف تمہارا گھر دیکھنے آؤں گی۔ تمہارے ساتھ صرف ایک کپ کافی پیوں گی اور ا۔"

"آؤ تو سہی...... آنے کے بعد تمہارا جانے کو دل نہیں چاہے گا۔"

"اچھا......" وہ ناز سے مسکرائی۔

"ب کے گھر پہلی مرتبہ آ رہی ہو...... اتنی جلدی کیسے جاؤ گی؟"

"ں جلد ہمیشہ کے لیے بھی آ سکتی ہوں...... مگر راہ میں اتنی مسائل کی دیواریں ہیں...... میں ان سب کو نہیں الی۔"

"میں تو تمہیں بے حد بہادر سمجھتا تھا" فرید احمد نے اکسایا۔

"ہر بہادر عورت...... تھوڑی سی ڈرپوک ضرور ہوتی ہے اور میری تو تمام تر بہادری صرف تمہارے وجود سے ہے۔"

"تم جتنی بہادری دکھاؤ گے...... دکھا لو۔ میں تو سوائے محبت میں مر مٹنے کے، کیا کر سکتی ہوں؟ جب سے تم ا ہوئی ہوں، فنا کی سولی پر سوار ہوں اور نہ جانے کب تک رہوں گی۔"

کیوں نہ اک جھوٹی تسلی پہ قناعت کر لیں
لوگ کہتے ہیں عزم خواب حسین ہوتے ہیں

☆☆☆

یل آج منو کو اپنے ساتھ سی سائیڈ پر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں گیلی ریت پر ے کا ہاتھ تھامے گھوم رہے تھے۔

یل کا گمبھیر لہجہ محبت کے جذبات سے مزین اس کے کانوں میں فسوں پھونک رہا تھا۔

"...... وہ وقت بہت دور نہیں ہے، جب ہم دونوں دبئی میں رہا کریں گے۔ سب سے دور الگ تھلگ اپنی یں گے۔"

"پ کسی دن آ کر میرے ڈیڈی سے کیوں نہیں ملتے؟"

"ر لگتا ہے۔ اگر انہوں نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تو کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔"

"مجھے یقین ہے ڈیڈی آپ کو ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتے۔" وہ وثوق بھرے لہجے میں بولی۔

"ہ بات تو تمہارا دل کہہ رہا ہے ناں۔"

"ہاں، میرا دل کبھی غلط نہیں کہتا...... اتنے اچھے لڑکے کو وہ کیوں ریجیکٹ کریں گے...... منو نے ہنس کر کہا۔

‘‘اچھا تمہارا دل میرے بارے میں اور کیا کہتا ہے؟’’ عدیل نے اس کے سینے پر اپنا سر لگاتے شرارت سے کہا۔

‘‘میں ٹھیک کہہ رہی ہوں عدیل! تم واقعی کسی شام میرے ڈیڈی سے مل لو۔’’ منو نے اسے پرے ہوئے کہا۔

‘‘فی الحال تم میری محبت کی نشانی اپنی انگلی میں ڈال لو تا کہ تم میری وکالت کر سکو۔’’ ایک خوبصورت ڈیز پیتل کی انگوٹھی جس پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا تھا‘ عدیل نے محبت بھرے انداز میں اس کی انگلی میں پہناتے ہو۔

‘‘اللہ اتنی قیمتی انگوٹھی آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں’’ وہ حیرت اور سرشاری سے بولی۔

‘‘تم سے زیادہ تو نہیں ہے یہ انگوٹھی۔ ہاں‘ تمہاری مخروطی انگلی میں آ کر اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔’’

‘‘گھر میں کسی نے دیکھ لی یہ انگوٹھی تو میں کیا کہوں گی......؟’’ اب وہ پریشان سی ہو گئی۔

‘‘گھر جا کر اپنی الماری میں ڈال دینا۔ کسی کو دکھانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔’’

‘‘مگر میرا دل چاہے گا کہ بار بار اسے دیکھوں۔’’

‘‘یہ تو میرا دل بھی چاہتا ہے کہ بار بار تمہاری کسی نشانی کی طرف دیکھوں’’ وہ اس کی انگلی کی موٹی سی سو انگوٹھی کو چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

‘‘مگر میں نے تو ابھی تک آپ کے لیے کوئی گفٹ خریدا ہی نہیں ہے۔’’

‘‘خریدنے کی کیا ضرورت ہے......’’ وہ اس کی انگوٹھی ہاتھ سے اتار کر اپنی انگلی میں ڈال کر چومتا ہوا بو

‘‘مگر یہ تو زنانہ انگوٹھی ہے......’’ منو ہنسی ‘‘کوئی دیکھے گا تو مذاق اڑائے گا آپ کا۔’’

‘‘میں بھی تمہاری طرح اسے اپنی الماری میں چھپا دوں گا اور روزانہ اس سے باتیں کیا کروں گا۔ بازگشت تم اپنے دل میں بھی محسوس کرو گی۔’’

‘‘ممی نے اگر پوچھ لیا کہ میری انگوٹھی کہاں گئی تو میں کیا کہوں گی...... یہ میٹرک پاس ہونے کی خوشی نے مجھے گفٹ کی تھی۔’’

‘‘بتا دینا کوئی بھی بہانہ...... تمہارے پاس کون سی گنتی کی انگوٹھیاں ہوں گی۔’’

‘‘ہاں‘ یہ تو ہے...... مگر میں تمہیں ایک اچھا سا پرفیوم دوں گی تا کہ جب تم اسے لگاؤ...... تو میری یاد میں مسحور ہو جاؤ۔’’

‘‘پرفیوم کا میرے پاس بہت بڑا اسٹاک ہے۔ پرفیوم دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے‘ بس یہ انگوٹھی ہے۔ اس کے ہر نگینے سے مجھے تمہاری شبیہ نظر آئے گی۔’’

‘‘ٹھیک ہے’’ منو سادگی سے مسکرا دی۔

‘‘چلو تمہیں ایک راؤنڈ گھوڑے کی سواری کا کراتا ہوں۔’’

‘‘ہاں چلو......’’ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

عدیل اس کا پرس تھامتا ہوا گھوڑے کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور پھر اس نے کمال مہارت سے پا نوٹ اس کے پرس سے اڑا لیا۔

اور ہنستی مسکراتی منو کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ عدیل اس کے ساتھ کیا گیم کھیل گیا ہے۔

☆☆☆

ید احمد نے جب فون پر عظمت آپا کو اطلاع دی کہ فیروزہ آج گاؤں پہنچ رہی ہیں تو انہیں حیرت ل نگین کو آئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ شاید وہ نگین کا سوا مہینہ کرنے آ رہی ہو۔ یکبارگی ان کے ذہن یال آیا۔

ب وہ سرشار سے لہجے میں بھائی سے بولیں۔ ‘‘فیروزہ نے اچھا کیا جو آ رہی ہے‘ تم کو بھی اس کے ساتھ آنا ھا۔ اللہ نے خوشی کا یہ دن دکھایا ہے۔ زچہ بچہ دونوں ماشاءاللہ خیریت سے ہیں۔’’

‘‘میں بھی آؤں گا...... فی الحال تو آپ اپنی بھاوج سے نمٹیں’’ فرید احمد نے ہنس کر کہا۔

‘‘ارے اس کے آنے سے تو میرے گھر میں رونق اور بڑھ جائے گی۔’’ عظمت آپا نے ہنس کر کہا۔ مگر جب گلے لگا کر استقبال کیا تو انہیں یوں لگا جیسے فیروزہ کسی انجانی تھکن سے نڈھال ہو۔

‘‘یا راستے میں بہت تکلیف ہوئی؟’’ انہوں نے پوچھا۔

‘‘نہیں‘ سفر تو بے حد آرام سے گزرا۔’’

‘‘مگر تم تو بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی ہو۔’’

‘‘آپا! سفر تو سفر ہی ہوتا ہے۔ آنے جانے کی ٹینشن ہی اچھا خاصا تھکا ڈالتی ہے۔’’

‘‘ہاں‘ یہ تو ہے......’’ فیروزہ کی بات ان کے دل کو لگی۔

نگین ماں کو دیکھ کر سرشار ہو گئی اور فیروزہ ننھے سے ارحم کو کلیجے سے لگا کر یوں چوم رہی تھیں جیسے کتنے عرصے ے دیکھا ہو۔ ننھے سے ارحم کا گداز ان کے دل کو ایک طمانیت سی بخش رہا تھا۔

‘‘فیروزہ‘ تم پہلے بھی گاؤں آئی تھیں تو رشتے داروں سے ملنے نہیں گئی تھیں۔ اب سب سے ملنا......’’ آپا نے ان ان سے کہا۔

‘‘جس نے ملنا ہوگا‘ وہ مجھ سے ملنے خود یہاں آ جائے گا۔ میرا تو ارحم کو چھوڑ کر کہیں جانے کو دل نہیں چاہ ’’ ان کی اس بات پر شجاع کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

انہیں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ طبیعت کی بے کلی اور بے چینی پھر سر ابھارنے لگیں...... ان کا ل چاہا کہ وہ بھاگ کر اپنے گھر چلی جائیں۔

تا نہیں فرید احمد کو میرے بغیر کتنی پریشانی ہو رہی ہوگی۔ بازار کا کھانا وہ شوق سے کھاتے نہیں ہیں۔ یہ الجھن گھبراہٹ بن کر چھا رہی تھی۔ اپنے موبائل سے انہوں نے گھر فون کیا۔ ملازم بچہ قادر گھر پر تھا۔ فون اسی نے یو کیا تھا۔

‘‘صاحب کہاں ہیں؟’’ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

‘‘دکان پر ہوں گے’’ اس نے کہا۔

‘‘اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ فرید تو ہمیشہ سے ہی نو بجے دکان بند کر دیا کرتے تھے۔’’

ید احمد کے موبائل پر فون کیا تو وہ آف تھا۔ اب فیروزہ ایسی پریشان سی پھر رہی تھیں جیسے کوئی نئی بیاہتا دلہن شوہر کے بغیر بے چین ہو رہی ہو۔

‘‘کیا بات ہے امی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......’’ نگین نے سرسوں کی طرح زرد ماں کا چہرہ دیکھ کر ش لہجے میں پوچھا۔

‘‘پتا نہیں تمہارے پاپا کہاں ہیں؟ گھر پر بھی نہیں ہیں اور اپنا موبائل اٹھا نہیں رہے ہیں۔’’

"افوہ...... اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ وہ کوئی بچہ تھوڑی ہیں جو کہیں کھو جا گے۔" نگین کو ماں کی پریشانی کی وجہ جان کر ہنسی آ رہی تھی۔

اور فیروزہ سوچ رہی تھیں کہ وہ یہ بات اپنی بیٹی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ اس کے پاپا تو زندگی کے میلے میں جانے کب کے کھو چکے ہیں۔ میرے ساتھ تو ان کی صرف ایک پرچھائیں رہتی ہے۔ جسے تم اپنا باپ سمجھ ہو...... مگر تمہارا باپ تو اپنی بیٹیوں کو بھی بھول بیٹھا ہے...... اور اپنا وقت ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارتا ہے جس کی ذات منظرِ عام پر آ جائے...... تو میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں؟

کیسی بدنصیب عورت ہوں میں بھی...... بڑھاپے میں ہمہ وقت متفکر رہتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہ ویسا نہ ہو جائے۔

"کیا ہو گیا امی آپ کو...... خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔"

"ہاں...... میں ہوں ہی ایسی تو کیا کروں...... پریشانیاں پالنے کی مجھے عادت جو رہی ہے......" فیروزہ کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"آپ گھر میں اکیلے رہنے کی وجہ سے بہت تنہا ہو گئی ہیں۔ یوں کریں' خوب گھوما پھرا کریں۔ پاپا کی طرح خوب انجوائے کریں گی...... اب آپ پاپا کو دیکھیے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں تو کتنے فریش رہتے ہیں نا۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم...... مگر مجھ میں اور تمہارے پاپا میں بہت فرق ہے...... میں تمہارے پاپا جیسی کبھی نہ ہو سکتی' کبھی نہیں۔"

نگین ادھر ادھر ہوئی تو انہوں نے فہمی کو فون کر ڈالا۔ اس نے بتایا' وہ آج ہی شام گھر گئی تھی۔ پاپا بالکل خیریت سے ہیں اور وہ ان کی پسند کی دو تین ڈشز بھی بنا کر فریج میں رکھ آئی ہے۔ فیروزہ چپ چاپ فہمی کی باتیں سنتی رہیں۔

"امی! آپ پاپا کی طرف سے بالکل پریشان مت ہوں۔ پاپا تو آج مجھ سے مذاق میں کہہ رہے تھے تمہاری امی کے جانے کے بعد میں آزادی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ بھی وہاں انجوائے کیجیے...... وہاں پر آپ کسی قسم کی ذمے داری تو نہیں ہے۔ پاپا کی وجہ سے تو آپ بندھی رہتی تھیں۔"

"ہوں......" فیروزہ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"امی' آپ بھی خوب سارے دن پنجاب میں رہیے اور خوب فریش ہو کر آئیے۔" فہمی ماں سے کہہ رہی تھی۔

اور فیروزہ کا دماغ اڑا سا جا رہا تھا۔ کب بات ختم ہوئی...... اور کب موبائل آف کر کے انہوں نے پرس میں رکھا۔ انہیں بالکل بھی یاد نہیں تھا۔ یاد تھی تو بس یہ بات...... فرید احمد نے فہمی سے کہا تھا' تمہاری امی کے جانے کے بعد میں آزادی محسوس کر رہا ہوں۔

کیسی آزادی محسوس کر رہے ہیں وہ...... انہوں نے سوچا۔ تب انہیں یوں لگا' وہ اپنا زیادہ وقت نینا کے ساتھ گزار رہے ہوں گے۔

نینا کی ہنسی' نینا کی باتوں کی گونج ان کا دماغ پھاڑنے لگی اور وہ بستر پر نڈھال ہو کر یوں گر گئیں جیسے وہ شدید علیل ہوں۔

ان عظمت آپا فیروزہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے شفقت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وں آپا! میں بیمار ہوں۔" فیروزہ نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہیں کیا ہوا ہے؟" وہ یکدم پریشان سی ہو گئیں۔

"ے ایک رسولی سی ہو گئی ہے' جو خاصی زہریلی ہے۔"

"وا لے' اب تو سرجری بڑی ایڈوانس ہو گئی ہے۔"

"ے زیادہ فرید ڈرتے ہیں اس لیے وہ رسولی کا آپریشن نہیں کرواتے۔"

"ل ہو گیا ہے کیا...... آئندہ چل کر رسولی تمہیں نقصان دے گئی تو کیا؟"

"اں یہ تو ہے...... مگر آپریشن تو آپریشن ہی ہوتا ہے آپا! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری بچیوں کا تو میکا ختم گا۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ میکا تو ماں کے دم سے ہوتا ہے۔ باپ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں' وہ ماں کا نعم ت نہیں ہوتے۔"

"ل ہو گیا؟ کچھ نہیں ہو رہا تمہیں۔"

"ی دن مجھے کچھ ہو گیا ناں' تب آپ کو یقین آئے گا۔" فیروزہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"یا بات ہے فیروزہ! تم پریشان کیوں ہو؟" عظمت آپا نے ان کے ہاتھ تھام کر شفقت بھرے لہجے میں

"اں میں عجیب قسم کے ڈپریشن کا شکار ہوں۔ بس ہر وقت روتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ بس کسی بھی کل آتا...... ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔"

"اس ڈپریشن کی کوئی نہ کوئی تو وجہ بھی ہو گی۔"

"شاید میری تنہائی...... سارا دن گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہوں تو طرح طرح کی سوچیں مجھ پر حملہ کرتی رہتی

"اگر ایسی بات ہے تو اپنے آپ کو مصروف رکھو' لوگوں سے ملو جلو...... تاکہ تنہائی سے بچو۔"

"میرا لوگوں سے ملنے کو دل چاہتا ہے اور نہ ہی کہیں آنے جانے کو جی چاہتا ہے۔ بتائیے ایسی صورت میں وں؟"

"مطالعے کی تو تم ہمیشہ سے عادی ہو' اپنی پسند کی کتابیں پڑھا کرو۔ روزانہ قرآن پاک کا ترجمہ بھی پڑھو۔ یہ حقیقی سکون دے گا۔"

"کہہ رہی ہیں آپ...... مگر میں کل کراچی کے لیے سوار ہونا چاہتی ہوں۔ آپ طفیل کو شجاع سے کہہ کر ی بھی ٹرین کے ٹکٹ لے لے۔"

"رید نے مجھ سے یہ خود کہا تھا کہ ایک ماہ بعد وہ تمہیں لینے خود آئے گا...... اور آج تمہیں آئے صرف تو ہے۔"

"اب میرا یہاں دل ہی نہیں لگ رہا۔"

"ی مانو تو ابھی تم یہاں اور رہ لو۔ سب کے ساتھ دل بھی بہلے گا۔"

"آپا! اب میرا دل کسی بہلاوے میں نہیں آتا۔ میں تو اپنے آپ کو سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی ہوں۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئیں تم......؟"

"شاید ایسا ہی ہو......مگر میں کل ہی گھر جاؤں گی" انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے انہیں عظمت آپا انہیں روک نہ لیں۔

"ٹھیک ہے' چلی جاؤ......مگر اپنا خیال خود رکھنا سیکھو ورنہ بیمار ہو جاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے آپا......!"

"وعدہ کرو' میرے پاس تم جلد آؤ گی۔" چلتے سے وہ انہیں کلیجے سے لگائے کہہ رہی تھیں۔

"میں ضرور آؤں گی آپا......بس آپ میرے لیے دعا کریں۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے' شاد و آباد رکھے۔" انہوں نے فیروزہ کا ماتھا چوم کر دعا دی۔

"ممانی جان! آپ بہت جلدی جا رہی ہیں' اتنی جلدی جا کر آپ وہاں خود بور ہوں گی" ریل چ ہوئی تو شجاع ان سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں بیٹا! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہاں جا کر بور ہوں گی مگر بالآخر مجھے جانا ہی تھا" فیروزہ کھسیا لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

سارے راستے وہ کھڑکی سے منہ نکالے بھاگتے ہوئے منظروں کو دیکھتی رہیں۔

گھر پہنچوں گی تو فرید سو رہے ہوں گے۔ وہ صبح خاصی تاخیر سے اٹھنے کے عادی ہیں۔ شاید وہ ناشا ہوں تو اخبار پڑھ رہے ہوں گے۔ نہیں' وہ پودوں کو پانی دے رہے ہوں گے۔ نہیں' وہ ٹی وی دیکھ ر گے۔ ان کا دل انہیں نئی نئی تاویلیں دے رہا تھا۔

نہیں' ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جب تم گھر پہنچو گی' اس وقت وہ نینا سے فون پر باتیں کر رہے ہوں کے دماغ نے ان سے کہا۔

"ہاں' ایسا ہی ہوگا" دل بھی ان کی یہ بات مان رہا تھا۔ اب ہوا کے جھکڑ ان کے دماغ میں ہو گئے تھے اور وہ سراسیمہ سی بیٹھی تھیں۔

ٹرین اپنے وقت مقررہ سے دو گھنٹے لیٹ تھی۔ طفیل کے ساتھ جب وہ گھر پہنچیں تو فرید گھر میں طفیل ان کا سامان رکھ کے اپنے گھر چلا گیا۔ قادر (ملازم بچہ) چپ چاپ گھر کا کام کر رہا تھا۔

"میرے پیچھے گھر میں فہمی کے علاوہ کوئی اور بھی آیا تھا......؟" گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"کوئی میڈم آئی تھیں" وہ نادم ہو کر بولا۔

"کون تھیں......کیسی تھیں؟ کس کے ساتھ آئی تھیں؟" ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال پو

"میں نہیں جانتا" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"اچھا......تھیں کیسی وہ؟"

"لمبی سی تھیں۔"

"گوری تھیں یا کالی؟"

"ٹھیک تھیں......بس" وہ ہونٹ کاٹتا ہوا بولا۔

"کیا باتیں کر رہی تھیں وہ؟" وہ نینا کی پل پل کی رپورٹ حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

"نہیں جی' اس دن انہوں نے میری چھٹی کر دی تھی۔"

ہاری چھٹی کیوں کر دی تھی؟"

علوم نہیں......بس انہوں نے مجھے سو روپے دیتے ہوئے کہا تھا' کہیں باہر گھوم لو......شام کو آنا۔ نے تو صاحب سے کہا تھا' میں میڈم کے لیے چائے بنا دوں مگر صاحب نے منع کر دیا۔ شاید وہ چائے چلی گئی ہوں گی۔"

"اں' ایسا ہی ہوا ہوگا۔" فیروزہ نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر کہا۔

وہ اپنے بیڈروم میں آئیں تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر نیلے رنگ کی چوڑیاں رکھی ہوئی ملیں۔ یہ فیروزہ کی تھیں۔ فیروزہ کے سوا دو نمبر کی چوڑی آتی تھی جبکہ یہ ڈھائی نمبر کا سائز تھا۔ فہمی اور نگین کے دو نمبر کی آتی تھی اس لیے ایسی بات بھی نہیں تھی کہ بچیوں کی چوڑیوں کا کوئی سیٹ سامنے آ گیا ہوگا۔

لی سی سرعت سے کمرے سے باہر آئیں اور قادر سے پوچھا" وہ میڈم نیلے رنگ کا سوٹ پہن کر آئی ں؟"

"ہاں' مگر آپ کو کیسے پتا چلا......؟" اب قادر حیرت سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اس لیے کہ اس کے پاس صرف ایک ہی سوٹ ہے۔" وہ خود ہی ہنس کر بولیں۔ قادر نے انہیں ایسی دیکھا جیسے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

وہ ابھی لیٹی ہی تھیں' فرید احمد گھر آ گئے۔ "ارے اتنی جلدی آنا تھا تو جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

دل ہی نہیں لگا تو کیا کرتی......اپنا گھر اتنا یاد آ رہا تھا۔"

"ں کے کوئی سینگ تھوڑی ہوتے ہیں" فرید احمد نے ہنس کر کہا اور لگے ٹی وی دیکھنے۔

"یہ میڈم کون آئی تھیں' میرے پیچھے؟"

ان کا خیال تھا اب فرید احمد کوئی لمبی سی کہانی سنائیں گے کہ اس کے پیچھے گھر میں کوئی بھی نہیں آیا۔ وہ سارا سے باہر رہتے تھے تو گھر میں کون آ سکتا تھا؟ مگر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولے۔

"ایک دن نینا آئی تھی' ہمارا گھر دیکھنے۔ پھر وہ فوراً ہی چلی گئی۔"

"ئی جلدی کیوں چلی گئی؟"

"وہ گھر دیکھنا چاہتی تھی۔"

تو گھر والی سے ہوتا ہے' اسے میری موجودگی میں آنا چاہیے تھا تا کہ اس کی مجھ سے بھی تو ملاقات یا وہ مجھے نہیں دیکھنا چاہتی تھی؟"

"کہا ناں......وہ بتائے بغیر آ گئی تھی" فرید احمد زچ ہو کر بولے۔

"ایسا تو نہیں ہو سکتا......اس کے آنے سے پہلے آپ ملازم کو چھٹی دینے کے پروگرام بنا رہے ہوں اور آپ بے خبر ہوں۔"

"اچھا' وہ میرے بلاوے پر آئی تھی......ٹھیک ہے' میں اس کو اپنا گھر دکھانا چاہتا تھا۔ میں کوئی تم سے ڈرتا دبوں گا۔ ہزار مرتبہ بتایا ہے کہ وہ صرف میری دوست ہے اور بس......تمہارے دماغ میں اگر گندگی ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

لی اس منزل پر پہنچ کر......میں اس قسم کے لیکچرز بالکل برداشت نہیں کر سکتی جبکہ میں جانتی ہوں کہ تم

بالکل جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"میری جان! جتنی تم نے عذاب کر رکھی ہے' یہ میں ہی جانتا ہوں...... سچ کہوں تو وہ نہیں مانتی کہوں تو اسے نہیں مانتی ہو۔ بات صرف یہ ہے کہ تم ایک نفسیاتی مریضہ ہو...... جس کا کام سوائے شک کے کچھ نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' میں نفسیاتی مریضہ ہوں...... لیکن اگر میں تمہارے دامادوں کو تمہاری حقیقت تمہاری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"تم جس سے دل چاہے جو کہنا چاہتی ہو' کہہ ڈالو۔ شاید اسی طرح تمہیں سکون مل جائے۔ میں تم بات نہیں مانتا' شک نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔ اگر میرے دل میں کوئی غلط بات ہوتی تو میں نینا کا کرتا۔"

تب فیروزہ یکدم چپ سی ہو گئی اور یکبارگی خود ہی سوچنے لگی۔ فرید نے واقعی نینا کی آمد کے با بالکل نہیں چھپایا تھا۔

کیا میں واقعی نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی ہوں؟ رات کو سوتے وقت بھی وہ یہی بات بار بار سوچ رہ

اگلے دن فون پر نینا نے جب اس سے کہا۔

"فیروزہ بیگم! میں اپنی چوڑیاں تمہارے گھر بھول آئی تھی۔ تم فرید احمد کو دے دینا" نینا کے لہجے م پھوٹ رہے تھے۔

"اور کچھ بھی بھول گئی تھیں شاید تم...... وہ میں تمہارے بیٹے کو بجھوا دوں گی۔ یقیناً...... وہ خوش ہوگا زعم ہوگا اسے' میری ماں اپنی پرسنل چیزیں کہاں کہاں اور کس کس کے پاس پھینکتی پھرتی ہے۔ میرا خیال بیٹا اپنی ماں کے کرتوت دیکھ کر تو دل سے کھل اٹھے گا۔" اس سے قبل کہ نینا اسے کچھ جواب دیتی' فیروز کاٹ کر ریسور نیچے رکھ دیا۔

☆☆☆

دل جب گھبرائے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ یہی حالت ان دنوں فیروزہ بیگم کی ہو رہی تھ رونے پر آتیں تو روئے چلی جاتیں۔ سونے کے لیے لیٹتیں تو گھنٹوں سوتی رہتیں۔ نماز پڑھتیں ا طویل ہو جاتے۔ دیر تک آنسوؤں کے ساتھ سجدے میں سر رکھ دعائیں مانگتی رہتیں۔

اور جب چپ لگتی تو سارا سارا دن خاموش پڑی چھت تکا کرتیں۔ فرید احمد کے سلوک نے انہیں تو تھا۔ بھی کئی روز سے آنے کا کہہ رہی تھی مگر آ نہیں پا رہی تھی۔ ایک صبح رکشا روک کر وہ بغیر اطلاع د گھر پہنچ گئیں۔

گیٹ ممانی جان نے ہی کھولا تھا۔ "ارے میری فیروزہ!" وہ بے اختیار ہو کر فیروزہ سے چمٹ گئیں فیروزہ اتنے دل سے سواگت پر حیران ہوئیں۔

"اتنے دنوں بعد تم آئی ہو" انہوں نے شکوہ کیا۔

"آپ نے بھی تو مجھے نہیں بلایا تھا۔"

"تمہارے بھائی کا گھر تھا' خود آ جاتیں۔"

"بغیر بلائے کیسے آ جاتی؟ دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا۔ پتا نہیں آپ کو میرا آنا اچھا لگا ہے

"پاگل ہو تم...... بھابی جان نے فیروزہ کو ایک بار پھر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارا آنا برا کیوں لگتا...... میری چھوٹی بہن ہو تم اور فہمی میری پیاری سی بیٹی ہے۔"

"اب تو آپ فہمی سے ناراض نہیں ہیں ناں......؟" فیروزہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہرگز نہیں' وہ اتنی اچھی بیٹی ہے۔ میرا خیال رکھنے والی' مجھ سے محبت کرنے والی...... ایسی بیٹی تو قسمت والوں ملا کرتی ہے۔ میں جب بیمار ہوئی تو فہمی نے میری ایسی خدمت کی شاید میری اپنی بیٹی ہوتی تو وہ بھی اتنی خدمت پاتی۔ میرے بال بناتی تھی' میرے سر میں تیل لگاتی تھی اور روزانہ گھنٹوں میرے ہاتھ پاؤں دباتی تھی۔ آج ل اتنا خیال رکھنے والی بیٹیاں نہیں ہوتیں مگر میری بہو...... تو...... سب پر بازی لے گئی...... اور فیروزہ' یہ سب یڈٹ تم کو جاتا ہے' تم نے اپنی بیٹی کی تربیت ہی اتنی عمدہ کی ہے' جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اچھا ہوا جو آج نو آ گئی ہو...... ورنہ میں تو کب سے سوچ رہی تھی' تمہارے پاس آؤں مگر میری ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔"

بھابی جان کی باتیں سن کر فیروزہ کا دل بھر سا آیا اور آنسو ان کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے لگے تب وہ ان ہاتھ تھام کر گلوگیر سے لہجے میں بولیں "بھابی جان! آج تو میں آپ کے پاس اس وجہ سے آئی تھی کہ شاید کبھی ں نے ایسی کوئی بات کہہ دی ہو جو آپ کو ناگوار گزری ہو تو پلیز' مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

"فیروزہ! ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" وہ شاکی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"پلیز بھابی جان! مجھے دل سے معاف کر دیجئے گا۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کون سا پل زندگی کا آخری ہو...... اور یں اپنی کوتاہیوں کی کسی سے معافی مانگنے کی مہلت بھی نہ ملے۔"

"فیروزہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا دل تمہاری جانب سے صاف ہے اور اگر تمہارے دل میں میرے کوئی ملال ہو تو وہ بھی صاف کر لینا...... غلطیاں مجھ سے بھی ہوئی ہیں کہ انسان ہونے کے ناتے ایسا ہو جاتا ہے مگر دل میں نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ ایک اچھا اصول ہے' اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ہمیں ہمیشہ اچھی وں کو یاد رکھنا چاہیے اور بری باتوں کو اپنے دل و دماغ سے مٹا دینا چاہیے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... بھابی جان!" فیروزہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

ثنا گھر آئی تو ثریا بیگم کی یہی ضد تھی "سائرہ! پھپھو کے گھر چلو۔"

"آپ پھپھو کو یہاں بلا لیں۔ ان کے گھر جانے کی کیا تک ہے بھلا" ثنا نے اکتا کر کہا۔

"تمہاری پھپھو تم کو اتنا یاد کرتی ہیں۔ تمہیں ان کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔" اب ثریا نے دوسرا قدم چلا۔

"ٹھیک ہے' چلیں گے کسی دن۔ اس مرتبہ تو میں پورے دو ہفتے کے لیے آئی ہوں۔"

"کسی دن نہیں' پرسوں اتوار کو چل رہے ہیں ہم سائرہ کے ہاں۔" ثریا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"او کے امی! آپ تو جان کو ہی آ گئی ہیں۔ ویسے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ ایکا ایکی سائرہ پھپھو کی محبت آپ ل میں کیوں ٹھاٹھیں مارنے لگی ہے؟" ثریا نے بظاہر آہستگی سے کہا تھا مگر آنگن میں کیاری کے پاس وضو لی شائستہ بیگم نے بھی سن لیا اور ان کے لب مسکرانے لگے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' میری ہمیشہ سے سائرہ کے ساتھ دوستی رہی ہے۔"

"ہاں امی! مجھے معلوم ہے' آپ کی اور پھپھو کی دوستی کا......"

"اچھے سے کپڑے پہن کر چلنا۔ بلیک شیفون کا سوٹ جو تم نے اپنی سہیلی کی منگنی میں پہنا تھا' وہی پہن لینا۔"

"کیوں امی! اتنا سجا بنا کر کیوں لے جا رہی ہیں آپ مجھے؟ ان کا تو کوئی چھوٹا بھائی بھی نہیں ہے۔" ثنا شرارت سے ہنس کر ماں سے کہا۔

"پاگل ہے تو...... بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا...... اس کے کزنز بھی سب اسی کی طرح امیر کبیر اور شہزادے ہے......"

"ان سے ہمارا کیا تعلق......" ثنا دکھ اور صدمے سے رنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے سنا ہے کہ سائرہ کی ساس ان دنوں اپنے دو بھتیجوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔" ثریا اپنی سرشاری چھپانے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے جا کر ان کی ساس کو رجھانا ہوگا۔" ثنا کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"اری پگلو! آج کل...... لڑکیاں اسی طرح دکھاتے ہیں۔"

باہر بیٹھی شائستہ بیگم اپنی بہو کے ارادے سن کر ساکت سی رہ گئی تھیں۔ ان کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر ا کمرے تک چلی جائیں۔ یہ ثریا کیسی اوچھی باتیں اپنی بیٹی سے کر رہی تھی۔

"اب میں آپ کے ساتھ سائرہ پھپھو کے گھر ہرگز نہیں جاؤں گی" ثنا نے برملا اعلان کر دیا تھا اور ثریا بے صلواتیں اسے سنائے چلی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

"عدیل، عدیل...... عدیل......" ہر وقت اس کے خیالوں میں عدیل چھایا ہوا تھا۔ منو یوں تو بڑی سمجھدا اچھی بچی تھی مگر عدیل کی نشیلی آواز میں پرمحبت ڈائیلاگز نے اسے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمہ و عدیل اس کے خیالوں پر چھایا ہوا تھا۔

کالج سے بھی وہ پیریڈ چھوڑ کر اس سے ملنے کے لیے نکل جاتی، جس کا نتیجہ یہ ہوا، وہ اپنے ماہانہ ٹیس میں فیل ہو گئی۔

ہر ماہ اس کی ماما اس کی ٹیسٹ رپورٹ پر سائن کیا کرتی تھیں مگر اس ماہ اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی ک ماما سے سائن کروائے۔ عدیل سے جب اس نے تذکرہ کیا تھا تو ہنس کر اس نے کہا تھا کہ وہ خود سائن کر کے رپورٹ واپس کر دے، ماما کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟

اور اس نے ایسا سوچ لیا تھا کہ وہ خود سائن کر کے دے دے گی مگر اس سے قبل ہی اس کی ماما نے ا رپورٹ چیک کر کے اس کے بیگ میں رکھ دی۔

"منو......! اس ماہ تمہارے کالج میں ٹیسٹ نہیں ہوئے؟" ایک دن انہوں نے بظاہر بے پروائی سے کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اس ماہ کالج میں گیمز چل رہے ہیں، کوئی ٹیسٹ ہی نہیں ہوا" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"اچھا جب ہی تم ان دنوں سنجیدگی سے نہیں پڑھ رہی ہو؟"

"ہاں ماما! کالج میں تو پڑھائی بالکل ہی نہیں ہو رہی۔ میں تو پھر بھی پرسنلی کافی آگے ہوں۔"

اس کے اس طرح جھوٹ بولنے پر انہیں دکھ سا ہوا اور کہا "پھر کالج جانے کی کیا ضرورت ہے، گھر اسٹڈی کرو۔ وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں ماما! کالج جانا تو بہت ضروری ہے۔ حاضری چیک ہوتی ہے ورنہ داخلہ روک سکتی ہیں میڈم

تڑپ کر کہا کہ ان کے دماغ میں دور کہیں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

وہ اس کی غیر موجودگی میں روزانہ اس کے بیگ کی تلاشی لینے لگی تھیں اور چند دن میں ہی انہیں یہ اندازہ ولی لڑکا ان کی بیٹی کو بے وقوف بنا کر گھومتا پھرتا ہے۔

"تمہاری انگوٹھی کہاں ہے، ایک دن اس کو کھانا کھانے کے دوران میں اس کی خالی انگلی دیکھ کر وہ چونک لیں۔

"انگلی میں ذرا تنگ ہو گئی تھی، اس لیے اتار کر رکھ دی ہے۔"

"مجھے دے دو، میں سنار سے اسے ٹھیک کروا دوں گی۔"

"دوں گی، پتا نہیں الماری میں کہاں ڈال دی ہے۔"

ب وہ ایک ہفتے بعد بھی انہیں دے نہیں سکی تو وہ سمجھ گئیں کہ اس کی انگوٹھی یا تو کھو گئی ہے یا وہ کسی کو بخش

وقار ان عورتوں میں سے تھیں جو اپنی بچیوں کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتی ہیں۔ اب وہ منو کو کالج کے بعد بھی اس پر نظر رکھ رہی تھیں۔ چند دن میں ہی انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عدیل نامی لچا لفنگا ان کی نہ صرف گھومتا پھرتا ہے بلکہ اس کی قیمتی انگوٹھی بھی وہ اینٹھ چکا ہے۔ ایک دوپہر جب منو عدیل کے ہی کیفے میں چائے پی رہی تھی، مسز وقار کیفے میں داخل ہوئیں۔

ان کی جانب سے پشت تھی۔ عدیل مکارانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"! میرے ڈیڈی نے کہا، اپنی پسند کی شادی کی صورت میں وہ مجھے عاق کر دیں گے...... مگر مجھے تم سے اسی لیے میں شادی تو تم سے ہی کروں گا...... اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آئندہ ویک کیوں نہ ہم میں جا کر شادی کر لیں؟"

وقار کا سر گھوم کر رہ گیا مگر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولیں "پیارے بیٹے" کورٹ میں شادی کرنے ورت ہے؟ میں خود کروں گی تمہاری شادی منو سے...... چلو میرے ساتھ۔"

ماں کو اپنے سر پر کھڑے دیکھ کر ایک دم بوکھلا سی گئی اور عدیل بھی سرپٹ بھاگنے کا سوچنے لگا مگر انہوں نے ملازم کو اشارہ کیا جو اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ کر ایک گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔ منو کو جس طرح کھینچتی اپنے ساتھ لائی تھیں، وہ سہم کر خاموش سی ہو گئی تھی۔

اس وقت ڈرائنگ روم میں عدیل چپ چاپ سا کھڑا تھا۔ ایک جانب منو بیٹھی تھی اور ان کے سامنے مسٹر وقار بیٹھے تھے۔

"م تمہیں گولی مار کر کسی گٹر میں بھی پھینک سکتے ہیں مگر ہم ایسا نہیں کریں گے پر ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ تم میں از خود بتاؤ کہ یہ سوانگ کیوں بھرا...... جیبیں کاٹتے کاٹتے...... اس لڑکی کو کیوں بے وقوف بنانے ؟"

پہلے تو عدیل ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا رہا مگر جب اس کے شناختی کارڈ کی کاپی اور اس کے گھر کا حوالہ دیا گیا تو پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی اصل حقیقت بیان کر دے۔

☆☆☆

م سرما کا خوشگوار ترین دن تھا۔ آج دھوپ کھل کر نکلی تھی۔ کئی روز کے بعد سردی کا زور ٹوٹا تھا۔

منو اپنی خالہ کے ہاں فیڈرل بی ایریا آئی ہوئی تھی اور گزشتہ ایک ہفتے سے ان کے ہاں ہی مقیم تھی۔ منز نے اس کا داخلہ ایک پرائیویٹ کالج میں کروادیا تھا جہاں ڈرائیور کے بجائے وہ خود لینے اور چھوڑنے جاتی مگر ان دنوں تعطیلات تھیں اس لیے وہ اپنی خالہ کے گھر آئی ہوئی تھی۔

کم عمر اور نادان سی لڑکی اپنا احتساب ہی نہیں کر پائی تھی کہ اس سے کب اور کہاں غلطی ہوئی تھی؟ ہر وا اپنے ڈرائنگ روم میں ملزم کی طرح کھڑے عدیل کا چہرہ بھی نظر آتا تھا جو اسے کسی فلم کے کردار کی طرح نظر تھا، کبھی مظلوم اور کبھی شاطر۔ کبھی کبھی تو اسے ایسے لگتا جیسے اس کی ماں نے اس پر ظلم کیا ہو۔

ٹی وی ڈراموں میں اس نے یہی دیکھا تھا جو بظاہر سچ نظر آتا ہے وہ جھوٹ ہے اور جو جھوٹ ہے اس کا کہیں نہ کہیں کسی سچ سے ضرور جڑ جائے گا۔

عدیل کے بارے میں ماما نے کیا کچھ سنا ڈالا تھا اور وہ خاموش کھڑا استار رہا تھا اور جب ماما ایک منٹ لیے سامنے سے ہٹی تھیں تو اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"منو! میں تمہاری خاطر ہر الزام سہ لوں گا۔ بس تم خوش رہنا...... مجھے ہر حال میں تمہاری خوشی عزیز ہو محبت کرنے والوں کے سروں پر ایسے ہی خاک ڈالی جاتی ہے۔ میرے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں، پاکستان میں نہ ہے اور نہ عزت۔ تم میرے پاس دبئی آجاؤ اور اپنے بزنس کی دیکھ بھال کرو...... مگر مجھے تو محبت کرنے کے میں رسوائی نصیب ہوئی ہے جو تمہاری خاطر مجھے قبول ہے۔ میں تمہاری ماما کے سامنے ایک لفظ نہیں بولوں گا۔"

اس وقت خالہ کے ہاں بیٹھی وہ عدیل کی باتیں ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا معصوم سا ذہن صحیح غلط کے ما الجھا ہوا تھا۔

ماما نے اس سے، اس کا موبائل بھی لے لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عدیل نے اس سے دوبارہ رابطہ بھی نہیں کیا تھا منو ابھی آرام کرسی پر دھوپ ہی سینک رہی تھی کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔ گیٹ پر مامور واچ مین کسی کام اندر آگیا تھا۔ وہ گیٹ پر خود چلی آئی اور آہستگی سے چھوٹا گیٹ کھولا۔ دونوں ہاتھوں میں باسکٹ پکڑے عد کھڑا تھا جو سر جھکائے بڑی روانی سے کہہ رہا تھا۔

"واش روم صاف کروالیں...... ہمارے پاس ٹائلز صاف کرنے کا بہترین پاؤڈر ہے، جس کا بڑا ڈبا سو روپے کی رعایتی قیمت میں آپ کو دیں گے اور دو ڈبے خریدنے کی صورت میں یہ ڈبے صرف چار سو رو میں آپ کو دیں گے۔ ہماری کمپنی کا یہ پاؤڈر اعلیٰ ترین صفائی اور کیڑے مکوڑوں کے مکمل خاتمے کے لیے مشہور ہے۔"

منو حیرت سے عدیل کا اصل روپ دیکھ رہی تھی اور اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔

"میڈم جی! آپ کہیں تو میں آپ کے باتھ روم خود صاف کر کے دکھا دوں؟"

وہ تب بھی چپ رہی۔

اس نے پیکٹ سے ایک شیشی نکال کر اس کو دکھاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور یکبارگی یوں پیچھے ہٹا جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

"باتھ روم صاف کر کے نہیں دکھاؤ گے تم......؟" وہ طنز سے بولی۔

"اپنی کمپنی ہے، اپنی کمپنی کا کوئی کام خود کرنا کوئی معیوب بات نہیں۔" وہ خجالت سے ہنستے ہوئے بولا۔

"تم جس کمپنی کی بات کر رہے ہو اس کا جنرل منیجر میرا ماموں ہے، جو تم جیسے جھوٹے اور فراڈیے اور چ

ے جوتے بھی لگا سکتا ہے اور نوکری سے باہر بھی کر سکتا ہے۔"

تب عدیل اپنا آپ سنبھالتا ہوا وہاں سے بھاگا اور منو کے دماغ سے عشق کا بھوت پوری طرح اتر گیا کہ آج اس نے عدیل کا اصلی چہرہ خود دیکھ لیا تھا۔

اب وہ لان میں بیٹھی خفت سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے محبت کے دھوکے میں کیسے ذلیل شخص کا ہاتھ تھاما تھا، جو محبت تو کیا، بات کرنے کے بھی قابل نہ تھا۔ اب ایک ایک پردہ اس کے سامنے سے ہٹ رہا تھا۔

جب بھی عدیل سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، اس کی پرس سے کبھی ہزار، کبھی پانچ سو کا نوٹ غائب ہو جاتا تھا اور وہ گھر کے ملازمین پر چلاتی رہ جاتی تھی۔

اس کی قیمتی انگوٹھی اس نے کیسے اتروائی تھی اور ایک جھوٹی نگینوں کی انگوٹھی اسے دے کر کیسا بے وقوف بنایا تھا۔

یہ لڑکے محبت کے نام پر کیسے کیسے فراڈ کر جاتے ہیں؟ اس نے سوچا۔

جب لڑکیاں اپنی آنکھیں بند کر کے چلیں اور سامنے والے کی ہر بات کا یقین کرتی چلی جائیں تو وہ قصر ذلت میں ہی گرا کرتی ہیں۔

"اے اللہ، تیرا لاکھ لاکھ احسان، تو نے مجھے ایسے رذیل شخص سے بہت جلد بچا لیا۔" وہ بے اختیار سجدے میں جھکتی چلی گئی۔

☆☆☆

کبھی نرم، کبھی گرم...... زندگی کی گاڑی ہچکلے لے کر چل رہی تھی۔ اشرف کبھی فرح کا خیال کر لیتا تو اس کے ساتھ کھانا کھاتا۔ اس کو لے کر ٹہلنے جاتا۔ گھر میں بہنیں کچھ کہتیں تو ان کا منہ بھی توڑنے کو موجود رہتا اور جب بے پروا ہوتا تو نظر بھر کر فرح کو نہ دیکھتا۔

بہنیں اس سے منہ ماری کرتیں تو وہ ان کو ہی مزید چڑھاتا۔ فرح کے رونے تک کی اسے پروا نہ ہوتی۔ مزید غصہ آتا تو اپنا تکیہ اور کھیس لے کر بیٹھک میں چلا جاتا اور وہیں سوتا۔

آج پورے ہفتے بعد اپنے کمرے میں آیا تھا۔ دونوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ چائے پی کر وہ بستر پر لیٹا تو بڑے افسردہ لہجے میں بولا "مجھے یوں لگتا ہے، ہمارے اولاد ہی نہیں ہو گی۔ ہم ساری عمر دوسروں کے بچوں کو پیار کریں گے۔ دوسروں کے بچوں کو عیدی دیں گے۔ نہ ہمارے بچے ہوں گے نہ ہی کوئی انہیں تحفے تحائف دے گا اور نہ ہی عیدی شیدی۔ اپنی زندگی تو صرف دینے ہی دینے میں گزرتی نظر آ رہی ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... بچے کوئی قاضی کی پیٹھ پر تھوڑی چڑھے ہوتے ہیں۔ جہاں نکاح ہوا اور بچے کود کر گھر آ جائیں۔ دیر سویر تو ہو جاتی ہے۔"

"دیر کا لفظ صرف میرے ہی ساتھ کیوں لگا ہے۔ سب کے بچے جلدی جلدی ہو جاتے ہیں، یہ دیر ہمارے لیے ہی کیوں ہے؟"

"میں نے تو ڈاکٹر سے اپنا مکمل معائنہ کروا لیا ہے، دو چار ٹیسٹ بھی ہو گئے ہیں، ڈاکٹرنی کا کہنا ہے کہ مجھ میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہے۔"

"تو پھر کس میں خرابی ہے؟" اشرف نے پوچھا۔

"آپ بھی اپنا معائنہ کروا لیں، ڈاکٹر خود ہی بتا دے گا۔"

"مجھے معلوم ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ تیری

بدنصیبی ہے کہ مجھے اولاد کا پھل نصیب نہیں ہو رہا۔"

"دعائیں تو میں ہر پل مانگتی ہوں۔ دیکھ لینا میرا سوہنا رب مجھے اولاد سے ضرور نوازے گا۔"

"ہاں‘ خوابوں میں بچے پالتی رہ۔ نہیں ہونے والا تیرے کوئی بچہ‘ دیکھ لینا تو یونہی نامراد رہے گی۔"

"آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں؟" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"مجھے امید نہیں رہی اب......" وہ گہرا سانس لے کر مایوسی سے بولا۔

"ایسا ہے تو ہم کوئی بچہ لے کر پال لیتے ہیں" فرح نے کہا۔

"نہیں پرایا بچہ کبھی اپنا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بعض گھرانوں کے اپنے بچے بھی اپنے نہیں رہتے۔"

"میرا بچہ میرا ہی ہوگا۔ اگر میری اولاد نہ ہوگی تو میرے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

"اللہ آپ کو سلامت رکھے‘ ایسی باتیں مت کریں۔"

"فرح‘ کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے کہ تجھ سے شادی کر کے میں نے اپنے ساتھ تو زیادتی کی‘ مگر تیرے ساتھ بھی زیادتی ہوئی۔ شجاع سے تیری شادی ہو جاتی تو آج کسی دوسری عورت سے نہیں‘ تیرے بطن سے بیٹا ہوتا۔"

"نہیں اشرف! میں ایسا کبھی نہیں سوچتی۔ جب میرا جوڑ آپ کے ساتھ تھا تو میری شادی کسی دوسری جگہ کیسے ہو سکتی تھی؟"

"میں جانتا ہوں شجاع تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔" اشرف کو آج اپنے ساتھ ساتھ فرح کے اوپر بھی ترس آ رہا تھا۔

فرح ساکت سی اشرف کو تک رہی تھی کہ آج اشرف کس ٹائپ کی باتیں کر رہا ہے۔

"فرح‘ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ تجھے طلاق دے دوں" اشرف نے اس پر ایک رحم بھری نظر ڈال کر کہا۔

"خدا کے لیے آئندہ یہ مکروہ لفظ اپنی زبان پر بھی مت لانا" فرح تڑپ کر بولی۔ "اشرف! کوئی بھی لڑکی یہ سوچ کر شادی نہیں کرتی کہ اسے طلاق ہو گی...... پلیز‘ میرے ساتھ ایسا کبھی مت کرنا...... ورنہ میں کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

"پگلی! میں تجھے بدنام کرنے کے لیے تھوڑی طلاق دینا چاہتا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ شجاع تجھ سے شادی کر لے اور تو بھی اپنے پہلے پیار کو پا لے۔ یاد ہے‘ تو نے اپنی دوسری چٹھی میں شجاع کو یہ لکھا تھا کہ اگر وہ تجھے نہیں ملا تو...... تو مر جائے گی۔"

"اشرف! میرا اب شجاع سے کوئی ناتا نہیں ہے اور میں بھلا اس سے شادی کرنے کے بارے میں کیوں سوچوں گی۔ ماشاءاللہ اس کی پیاری سی بیوی ہے‘ بچہ ہے۔ اس کی اپنی فیملی کمپلیٹ ہے۔ اب میری وہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"شجاع تجھ سے بہت محبت کرتا ہے‘ وہ تجھ سے دوسری شادی کر لے گا۔"

"مگر میں کیوں اس سے شادی کروں گی‘ مجھے تو اب اس کا ساتھ نہیں چاہیے۔"

"میرے ساتھ رہ کر بھی تجھے کیا مل رہا ہے؟ بہنوں کی جھڑکیاں‘ اماں کی صلواتیں‘ نانی کی پھٹکاریں‘ اتنے لوازمات کے ساتھ بھلا کون لڑکی خوش رہ سکتی ہے؟"

"مگر میں خوش ہوں اشرف! کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے تو میرے سر کا سائیں ہے۔ تیرے نام سے میری

عزت ہے۔ دیکھ‘ یہ اپنا نام مجھ سے کبھی مت چھین لینا......" اب فرح اشرف کے دونوں پیر پکڑے بیٹھی تھی اور اس کے آنسو ان پر گر رہے تھے۔

تب اشرف نے اس کو دونوں شانوں سے تھام کر اوپر اٹھایا۔ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

☆☆☆

ثریا سو کر اٹھی تو جی کسمسا سا ہو رہا تھا۔ وہ چائے بنانے کچن میں آئی تو سائرہ آئی ہوئی تھی۔

"ارے...... تم کب آئیں‘ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"ابھی آئی ہوں بھابی!"

"رات کو رکو گی ناں؟...... میں حلیم پکا رہی ہوں۔"

"نہیں بھابی! رات کو تو نہیں رکوں گی...... بچیاں میرے بغیر نہیں رہتی ہیں۔"

"اچھا تو حلیم اپنے ساتھ لے کر جانا۔ اپنے میاں کو بھی کھلانا اور اپنی ساس کو بھی۔"

"نہیں بھابی! اب میں کہاں لے کر جاؤں گی۔ وہ لوگ تو ویسے بھی جلدی کھانا کھانے کے عادی ہیں۔" سائرہ نے الکس بھرے لہجے میں کہا۔

"ایک بات کہوں سائرہ؟" ادھر ادھر دیکھ کر ثریا نے رازدارانہ لہجے میں سائرہ سے کہا۔

"جی کہیے......" وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"تم اپنی ثنا کے لیے کسی رشتے کا خیال ویال رکھا کرو۔"

"مگر ثنا تو ابھی پڑھ رہی ہے۔ بیچ میں اگر آپ شادی کر دیں گی تو اس کا میڈیکل ادھورا رہ جائے گا۔"

"اگر کوئی کروڑ پتی رشتہ مل جائے تو کیا ضرورت ہے گندے مریضوں کے ساتھ زندگی کے خوبصورت دن ضائع کیے جائیں؟"

"مگر کروڑ پتی رشتے ہیں کہاں؟" سائرہ کو ان کی باتیں سن کر وحشت سی ہوئی۔

"تمہاری ساس ہی بتا رہی تھیں کہ آج کل وہ اپنے بھتیجوں کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔"

"مگر ان کے بھائی کے ہاں کا ماحول قطعی مختلف ہے‘ ثنا وہاں نہیں رہ پائے گی۔"

"تم پھوپی ہو...... تم کوشش کرو۔ ثنا کس طرح رہے گی‘ یہ اس کا کام ہوگا۔"

"مگر میں اپنی ساس سے یہ بات کیسے کہہ سکتی ہوں؟" سائرہ زچ ہو کر بولی۔

"ارے واہ! اب اتنی ننھی سی بھی نہیں ہو۔ اتنی سی بات تم سے کہی نہیں جائے گی؟"

"نہیں بھابی! یہ سب میں نہیں کہہ سکوں گی۔" سائرہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں کے کمرے کی راہ لی۔

"اچھا‘ تو یہ بات ہے‘ تم یہ ہرگز نہیں چاہتیں کہ اب خاندان کی کوئی لڑکی تمہاری طرح عیش کرے۔ ظاہر ہے [illegible] تمہاری ویلیو جو کم ہو جائے گی۔ اور یوں بھی تمہیں ثنا سے کون سا پیار ہے جو اس کے لیے کوشش کرو گی۔ تم [illegible] چاہو گی کہ اسے تم سے کم تر نصیب ہو...... تاکہ تمہاری خوشیاں بڑھ سکیں۔"

تب سائرہ کے ساتھ شائستہ بیگم بھی منہ کھولے ثریا بیگم کو دیکھنے لگیں...... جو منہ کھولے بکواس کیے جا رہی تھیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

محبت!
مشغلہ ہرگز نہیں ہوتی
یہ اک کارِ عبادت ہے
شبوں کو جاگ کر اس میں
عبادت کرنی پڑتی ہے
کبھی برسوں‘ کبھی صدیوں
ریاضت کرنی پڑتی ہے
جگر کا خون دے کر
اس چمن کو سینچا جاتا ہے
خود اپنے ہاتھوں سے
سولی پہ خود کو کھینچا جاتا ہے
محبت جب نیا گھاؤ لگائے
کہیے بسم اللہ
یہ اک کارِ عبادت ہے
محبت!
مشغلہ ہرگز نہیں ہوتی

☆☆☆

یہ نظم ایک گلابی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی اور یہ کاغذ فرید احمد کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ فیروزہ اسے نہ جانے کتنی بار پڑھ چکی تھیں۔ یہ نینا نے لکھا تھا یا کسی اور نے۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ نینا کی ہینڈ رائٹنگ سے بھی وہ آشنا نہیں تھیں۔

”یہ کتنی خوبصورت نظم ہے......“ انہوں نے کاغذ لہرا کر فرید احمد سے کہا۔

”ہوگی......“ فرید احمد نے ایک اچٹتی سی نظر اس کاغذ پر ڈال کر بے رغبتی سے کہا۔

”اچھا...... آپ کو پسند نہیں آئی یہ نظم؟“ فیروزہ کے لبوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ سج گئی۔

”مجھے شعر و شاعری سے کہاں دلچسپی ہے۔“ لہجہ لٹھ مار تھا۔

”مگر یہ نظم تو بہت خوبصورت ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے‘ اس کی شاعرہ کا نام منزہ ہے۔ اس کا کلام دل کو چھوتا ہے...... اور محبت کرنے والے ایسی نظموں کو اپنے کلیجے سے لگا کر پھرتے ہیں۔“

”پھر میں کیا کروں......؟“ وہ الجھ کر بولے۔

”یہ آپ کی جیب سے ہی برآمد ہوئی ہے۔“ فیروزہ تحقیر آمیز لہجے میں بولیں۔

”ے گیا ہوگا کوئی سودے کی سلپ کے ساتھ۔“

”اچھا آپ کی دکان کے گاہک...... اب اس قسم کی سلپ بھی دے کر جاتے ہیں؟“

”ہاں بہت کچھ دے کر جاتے ہیں۔ خط بھی دے کر جاتے ہیں۔ گفٹ بھی دیتے ہیں...... اور اپنی تصویروں ساتھ ملاقات کا ٹائم بھی طے کرتے ہیں...... اور میں ہر دوسرے دن ڈیٹ پر جاتا ہوں...... یہی سننا چاہتی ہو نا تم......؟“ فرید احمد اچانک ہی بھڑک اٹھے۔

ابھی فیروزہ منہ کھولے حیرت سے اپنے میاں کو دیکھ ہی رہی تھیں کہ اتنا غصہ اتنی سی بات پر انہیں کیوں آ گیا وہ خونخوار سے لہجے میں بولے ”فیروزہ‘ تم ایک بات میری غور سے بلکہ کان کھول کر سن لو...... بچپن میں ہیں لومت پکارو۔ اب تمہاری کوئی بات‘ کوئی حرکت ایسی نہیں رہی ہے جو معقول ہو‘ جب دیکھو کاٹ کھانے کو بات نہ ہو تو آنسو بہاتی رہتی ہو۔ یہ میرا گھر ہے‘ اس کو گھر ہی رہنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں آ کر مجھے ہونے لگے تو میں آنا ہی چھوڑ دوں۔“ فرید احمد نے انہیں بے مہار سنا ڈالیں۔

”یں نے تو آپ سے کچھ بھی نہیں کہا۔“

”ح ہوتے ہی تفتیش کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہو‘ یہ کیا کم ہے؟ اگر کوئی بات نہ ہو تو تھوتھنی سجا کر رکھتی یہ ایسا قصور ہے‘ جو خواہ مخواہ تلوار بن کر لٹک رہی ہو۔ کیوں میری جان کو آ رہی ہو‘ کوئی بات ہو تو حسابات بھی تم نے تو خواہ مخواہ ہی میری زندگی ضیق (پریشان) کر کے رکھ دی۔ اب تو مجھے گھر میں قدم رکھتے ہوئے دی ہونے لگی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہاں سے دور کہیں چلا جاؤں گا اور وہیں کہیں مر کھپ جاؤں۔“

”ب انسان غلط حرکات کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔“

”یں نے ایسا کچھ نہیں کیا‘ جس پر میں نادم ہوتا پھروں۔“ فرید احمد بپھر کر بولے۔

”سارا قصور میرا ہی ہے‘ آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا اور زندگی گزار دی۔“

”یہ زندگی بھی خوشی کے ساتھ گزر جائے گی اگر تمہاری مثبت سوچیں تمہارے ساتھ رہیں‘ مگر وہ نہیں رہ اب تم ہر چیز کا منفی رخ دیکھنے لگی ہو۔ روشن چمکیلی صبح بھی تمہیں اندھیری رات نظر آنے لگی ہے۔“

”ید! بات یہ ہے کہ نینا کسی خیالی ہیولے کا نام نہیں ہے‘ وہ جیتی جاگتی ایسی بدکردار عورت ہے جس نے ندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ وہ ایک ایسی چڑیل ہے جو ہمہ وقت میری زندگی کا خون پیتی رہتی ہے۔“

”ت لگاؤ کسی شریف عورت پر الزام۔ وہ چار جوان بچوں کی ماں ہے۔ مت لگاؤ ایسے بہتان جسے کوئی تمہارے ہی جسم پہ تھوکے۔“

”ید......! جوان بچیوں کے باپ تو تم بھی ہو۔ یہ مرتبہ حاصل کر کے کوئی شرافت کا سرٹیفکیٹ تھوڑی مل جاتا عاشی اور لچا پن تو فطرت میں ہوتا ہے‘ اس کا عمر اور وقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“

”روزہ......! اگر تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے...... اور اگر تمہاری زندگی طرح آہیں بھرنا لکھا ہے تو بھرتی رہو‘ میں ہمہ وقت صفائیاں نہیں پیش کروں گا۔“

”بھی نہیں سکتے......“ وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنس دیں۔

”مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم ہو ہی اسی قابل کہ اپنے آپ کو ایذائیں دیتی رہو۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم‘ میں واقعی اسی قابل ہوں“ فیروزہ نے اپنا تکیہ اٹھایا اور دوسرے کمرے میں چلی آئیں کہ اعصاب قطعی اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ فرید احمد کی طنز و تشنیع مزید برداشت کرتیں۔

وہ تکیے پر سر رکھے آنسو بہا رہی تھیں مگر دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

یہ خیال ان کو پہلے کیوں نہ آیا۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ اٹھیں۔ پانی کا ایک گلاس انہیں توانائی مہیا کر گیا تھا۔

"یہ ہوئی ناں بات......" خوش ہو کر انہوں نے از خود اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بے اختیار کھلکھلا کر پڑیں۔ ان کی ہنسی کی آواز برابر کمرے میں بیٹھے فرید احمد کے کانوں تک بھی گئی تھی۔

"پاگل' کم بخت......" وہ غصے سے بڑبڑا کر رہ گئے۔

☆☆☆

محبت لاشعوری جبر ہے اور ہے قوی اتنا
کہ اس کے سامنے سب بے سروسامان رہتے ہیں

وہ بہار کی خوبصورت شام تھی' موتیے اور چنبیلی کی خوشبو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ فہمی خوش رنگ میں چہکتی ہوئی گڑیا سی لگ رہی تھی۔ فہد کے آنے سے پہلے پہلے اس نے صحن میں چائے کا سامان رکھ سینڈوچز اور سموسے اس نے خود بنائے تھے۔ ایسا روز ہی ہوتا تھا' وہ فہد کے آنے سے پہلے چائے کی ٹیبل رکھتی تھی۔

فہد روزانہ چھ' پونے چھ بجے تک گھر میں آجاتا تھا اور فہمی اس کے آنے سے پہلے تیار ہو کر چائے کی ٹیبل' کر کے اس کا انتظار کیا کرتی۔

صحن میں پھولوں کے کنج کے پاس بیٹھ کر شام کی چائے پینا اسے اچھا لگتا تھا۔ تھکا ہارا فہد جب چہکتی مہکتی کو دیکھا کرتا تو اس کی تھکن بھی اتر جایا کرتی تھی اور مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر لیتی۔

مگر آج تو وہ چہرے سے بھی بہت پژمردہ داخل ہوا تھا۔ پانی کا گلاس دیتے ہوئے اس کے ہاتھ نے بریف کیس تھام لیا۔

"میں لیٹوں گا کمرے میں" وہ آگے کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔

"پہلے چائے تو پی لیں...... میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" لاڈ بھرا شکوہ اس کے لبوں پر سج گیا

"سر میں سخت درد ہے۔ کچھ دیر سوؤں گا" فہد بیزار سے لہجے میں بولا۔

"پہلے آپ چائے پیجیے' سینڈوچ لیجیے' پھر میں کوئی پین کلر دیتی ہوں' آپ کے سر کا درد یوں اڑن ہو جائے گا......" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

تب وہ کرسی پر ڈھے سا گیا۔ چائے وہ برائے نام پی رہا تھا۔ چہرے پر پریشانی کی تمام لکیریں ثبت تھیں

"فہد......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟"

"ہوں...... میں ٹھیک ہوں۔"

"پھر اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"نہیں' میں پریشان تو نہیں ہوں" وہ زبردستی مسکرایا۔

"کیا کوئی آفس میں بات ہوئی ہے؟" وہ اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں......" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"تو پھر آپ اتنے پریشان سے کیوں ہیں؟"

"نہیں' میں تو پریشان نہیں ہوں۔ بالکل بھی نہیں' ارے واہ! آج تو تم نے بڑے لذیذ کباب بنائے ہیں"

وہ اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

رات کا کھانا بھی اس نے برائے نام کھایا۔ عشا کی نماز پڑھ کر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو وہ بظاہر ٹی وی ہا تھا مگر چہرہ تفکرات سے سجا تھا۔

"یہ ڈراما کتنا اچھا ہے۔ اب دیکھیے گا اس میں عالیہ کی شادی عدنان سے ہی ہوگی" اس نے ڈرامے پر تبصرہ ے ہوئے کہا۔

"کون عدنان......؟" اس نے ایسے حیرت سے پوچھا جیسے وہ کسی دوسرے کا تذکرہ کر رہی ہو۔

"ڈرامے کا عدنان......" فہمی نے مسکرا کر کہا اور اس نے یوں بے دلی سے سر ہلایا جیسے اسے ڈرامے سے دلچسپی نہ ہو۔

فہمی نے ٹی وی آف کر کے اس سے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔ "فہد! مجھے تو بتا دو کہ کیا بات ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے......اور میرے لیے تو اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔"

"جس بات کی آپ کے لیے کوئی اہمیت نہیں ہے تو میرے لیے بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ بتایئے ناں' ایسی کیا ے جس نے آپ کا چہرہ بھری بہار میں یوں خزاں رسیدہ کر دیا ہے؟"

"کہا ناں...... کہ ایسی کوئی بات نہیں" فہد نے قدرے منہ پھیر کر کہا۔

"فہد! آپ کو میری قسم' آپ مجھ سے تو نہ چھپایئے" فہمی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"تمہاری رپورٹ...... جس کے بارے میں' میں نے تم سے کہا تھا......اسپتال میں کہیں کھو گئی...... وہ کھوئی تھی۔"

"تو پھر......؟" اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

"رپورٹ میں لکھا ہے اب تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوگئی ہیں جس میں بچے ہونے چانسز بے حد کم ہیں۔"

"اوہ......!" فہمی کے دونوں بازو جو اس کے شانے پر دھرے تھے کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے ے اور اس کا سر جھکتے جھکتے گھٹنوں سے جا لگا۔

"میں اسی وجہ سے تمہیں بتانا نہیں چاہ رہا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔"

"فہد! کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کہ ہمارے آنگن میں کبھی پھول نہیں کھلیں گے......اور جو پہلے دو ید ہوئی تھی وہ میری بدقسمتی کی وجہ سے پائمال ہو گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟"

"نہیں' میرے لیے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی ہے۔"

"مگر میں کیسے رہ پاؤں گی بچوں کے بغیر......" اب آنسو اس کی آنکھوں سے بھل بھل بہہ رہے تھے۔

"ایسے ہی' جیسے میں رہوں گا۔"

"فہد! اب میں خوشی سے اجازت دے رہی ہوں' آپ دوسری شادی کر لیں۔ ممانی جان کے آپ اکلوتے ہیں۔ ان کے ارمانوں کا خون نہ کریں۔ جو خواب وہ آپ کے حوالے سے دیکھتی ہیں' انہیں پورا ہونے

"فہمی! اگر میری قسمت میں اولاد ہوتی تو تمہارے بطن سے ہی ہوتی' میں تمہاری ہمراہی میں بے حد خوش

ہوں' اولاد کا نہ ہونا ایک محرومی ضرور ہے مگر میری زندگی میں یہ محرومی کوئی خلا نہیں پیدا کرے گی۔ زندگی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے' اسے خوش ہو کر اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے گزارنا چاہیے۔ میرے رب نے مجھے کچھ دیا ہے...... میری اوقات سے زیادہ' اگر اس نے اولاد نہیں دی تو کوئی بات نہیں' یقیناً اس میں بھی اس کی مصلحت ہوگی۔“

”کیسے شخص ہیں آپ' پریشان ہو کر بھی اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرتے۔“ فہمی نے فہد کی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”میری پریشانی تمہاری وجہ سے تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جب تمہیں حقیقت کا علم ہو تو تم گھبرا جاؤ۔ میں اسی کشمکش میں تھا' تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں؟“

”فہد......! میں آپ جیسے حوصلے والی نہیں ہوں۔ میرا تو چڑیا کا سا دل ہے' ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہے اور یہ تو پھر بہت بڑی بات ہے۔ ممانی جان کو معلوم ہوگا تو وہ تو آنسوؤں کے سمندر بہا دیں گی۔“

”انہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے“ فہد نے کہا۔

اور آنسو بہاتی فہمی' فہد کے چہرے کو دیکھنے لگی جو اپنی پوروں سے اس کے آنسو چن رہا تھا اور جس چہرے پر اس کے لیے صرف محبت ہی محبت تھی۔

☆☆☆

جمال اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ٹورنٹو آ گئے تھے۔ ان کو ایک لگژری فلیٹ ”مس از ساگا“ (جگہ کا نام) مل گیا تھا۔ جمال کو اپنی کمپنی کی جانب سے کافی مراعات حاصل تھیں۔ نئی گاڑی ان کے تصرف میں تھی' فلیٹ ضروریات اور آسائشات کی ہر چیز موجود تھی۔

ربیع یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ گھنٹوں کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کا خوبصورت منظر دیکھا کرتی۔

ان کی امی کا بھی یہاں آ کر دل بہت خوش تھا۔ جلد ہی ان کا یہاں پاکستانی فیملیز سے ملنا جلنا بھی ہو گیا جس سے چھٹیوں کے ایام خوب گہما گہمی میں گزرتے۔ کبھی یہ لوگ کہیں چلے جاتے تو کبھی ان کے ہاں آ جاتا۔

ربیع اکثر کہتی ”پاکستان میں رہ کر لوگوں سے اتنا ملنا جلنا نہیں تھا' جتنا یہاں آ کر ہو گیا تھا۔“

جمال بھی اپنی ماں بہن کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا۔ ان کے سامنے خوب ہنستا بولتا مگر رات کو جب بستر پر لیٹا نگین کی یاد اس شدت سے آتی کہ وہ از خود پریشان ہو جاتا۔

ایک لڑکی جس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں بے حد خوش و خرم بھی ہے' تو اس کو یاد کرنے سے کیا حاصل ہے؟ اب تو اسے میرے خیالوں میں بھی نہیں آنا چاہیے۔

وہ اپنے اوپر جتنی پابندیاں عائد کرتا' اتنی ہی وہ اس کے خیالوں اور خوابوں میں دھرنا مار کر بیٹھ جاتی۔

آج موسم خاصا سرد تھا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے بستر پر لیٹا تو نیند کی دیوی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ ٹی وی کے مختلف چینلز چیک کیے۔ کسی بھی چینل پر اس کی پسند کا کوئی بھی پروگرام نہ تھا۔

اپنے کمرے میں وہ یونہی ٹہلتا رہا۔ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے' آنکھیں بند کیے وہ اپنے کمرے میں گھومتا چلا جا رہا تھا۔ مگر بند آنکھوں کے پیچھے کبھی وہ دریچے سے جھانکتی نظر آتی' کبھی دروازے پر استادہ اور کبھی ساحل سمندر پر ننگے پیر بھاگتی ہوئی۔ گھبرا کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اب اس کی یادیں ٹیسیں بن

میں ابھر رہی تھیں اور وہ اپنی کنپٹیاں تھامے اپنے بستر پر آ بیٹھا تھا۔

”ایسا میرے ساتھ کیوں ہوتا ہے؟“ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا مگر دل کوئی بھی جواب دینے سے قاصر

بانٹنے کے لیے اس نے پھر ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں لے لیا۔ اب جو چینل اس کے سامنے آیا تھا وہ چینل تھا جس میں ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے گیت گائے جا رہے تھے۔

ال بے خود سا ان گیتوں کو سن رہا تھا۔ آخر میں جو گلوکار آیا اس نے تمہید کے طور پر کہا کہ میرا گیت ان لیے ہے جو محبت اور ملن کے معاملے میں ناکام رہے ہوں' مگر ان کی یہ ناکامی عارضی ہے اور میری دعا ان کی زندگی میں ان کی گم شدہ محبت ضرور ملے گی اور ان کا ملن بھی ہوگا...... کہ کبھی کبھی محبت کہیں کھو جاتی نے اور مرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس لیے محبت کرنے والوں کو امید کا دیا اپنے دل میں ضرور ھنا چاہیے کہ یہ دیا ناکامی کی ساری سیاہی کو نگلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

”میں دیا کس کے لیے روشن کروں گا؟ وہ تو خود چاند ہے۔ اسے کسی دیے کی روشنی کی کیا ضرورت۔“ جمال اور ریموٹ دبا کر چینل تبدیل کر دیا۔ اب جو چینل اس کے سامنے آیا تھا' وہ اردو کمیونٹی کے لیے تھا۔ ہی ویلنٹائن ڈے کی مناسبت سے گیت پیش ہو رہے تھے۔

”گل ہو گئے ہیں سب لوگ' محبت کے لیے بھی دن مخصوص کرنے لگے ہیں۔ آگے بڑھیں گے تو ٹائم رنے لگیں گے۔ چھ سے آٹھ تک محبت کے اظہار کا ٹائم...... چودہ فروری کے دن۔“ اپنے اس خیال پر سی آئی۔

ے قبل کہ وہ مزید چینل بدلتا' گلوکار کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز نے اسے متوجہ کر دیا۔

کبھی کبھی یوں ہی دل میں گماں سا ہوتا ہے
کبھی تمہیں بھی محبت نے مات دی ہوگی
تمہارے دل کے دھڑکنے کا آخری موسم
کہیں حسین نظاروں میں کھو گیا ہوگا
تمہارے دل میں مچلتا ہوا کوئی ارمان
وہ سرد چاندنی راتوں میں سو گیا ہوگا
تمہارے ساز محبت کے تار جب ٹوٹے
ملن کا گیت سرابوں میں کھو گیا ہوگا
کبھی کبھی یوں ہی دل میں گماں سا ہوتا ہے
گزرتے وقت نے پھر زخم بھر دیے ہوں گے
تمہارے چاک گریباں بھی سی دیے ہوں گے
تمہارے اشک ستاروں نے چن لیے ہوں گے
تمہارے خواب نظاروں نے بن لیے ہوں گے
یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے دل کا نقیب
تمہاری زیست کی راہوں میں چھپ گیا ہوگا

تمہاری کھوجتی آنکھوں میں اور دل کے قریب
وہ ایک درد مسلسل کہ بس گیا ہوگا
کبھی کبھی یوں ہی دل میں گماں سا ہوتا ہے
تمہاری شربتی آنکھوں میں اک نمی سی ہے
تمہاری زیست میں شاید کوئی کمی سی ہے
تمہارے سرد بدن اور لرزتے ہونٹوں پر
کبھی جو برف گری تھی وہ اب جمی سی ہے
تب ہی تو تم کو کسی بات کا خیال نہیں
مگر مجھے بھی تغافل کا کچھ ملال نہیں
میں مطمئن ہوں کہ تم چپ کی دسترس میں ہو
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لیے سوال نہیں
مگر یہ کیا کہ جگر میں دھواں سا ہوتا ہے
کبھی کبھی یوں ہی دل میں گماں سا ہوتا ہے
کبھی تمہیں بھی محبت نے مات دی ہوگی

(شاعرہ ذکیہ)

گیت ختم ہوگیا تھا مگر جمال اسی استغراق میں گم تھا۔ یہ شاعر لوگ دوسروں کے احساسات کس خو
بیان کر دیتے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے ہوں۔

''تم جہاں رہو...... خوش رہو'' اس نے دعا کی اور کمبل ٹانگوں پر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیند تو اس
ہوئی تھی...... اور اب اسے یوں ہی رات بتانی تھی' کچھ سوتے' کچھ جاگتے یا پھر سپنوں میں' جو اسی کے تص
آباد تھے۔ میں احمد جمال...... اپنی تنہائیوں کو نگین کے تصور سے کیوں آباد کرتا ہوں؟ یہ سوال وہ اپنے آ
پوچھ رہا تھا۔

میں اس کے عشق میں کیوں اتنا بے بس ہوگیا ہوں کہ اس کو اپنے پاس چلتا پھرتا دیکھتا محسوس کرتا ہو
تم ایک برے شخص ہو' اس لیے ایسا سوچتے ہو۔ تمہارا ہر تصور اس کے بنا ادھورا ہے۔ یہ بھی بڑی
بات ہے کہ تم پرائی عورت پر نظر رکھتے ہو۔ اب وہ اپنے آپ پر خود نفرین بھیج رہا تھا۔

''احمد جمال! آج تم خود سے یہ وعدہ کرو کہ اب تم نگین کے بارے میں سوچو گے بھی نہیں۔'' وہ
از خود پہرے بٹھا رہا تھا۔

''ہاں' میں ایسا ہی کروں گا۔'' اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''کسی صورت اسے ڈھونڈو گے بھی نہیں۔''

''ہاں' میں نہیں ڈھونڈوں گا۔''

تب وہ اٹھا۔ برف باری ہوتے موسم میں کھڑکی کھول کر کھڑا ہوگیا۔ ٹھنڈی یخ ہوا جب اس کے چہر
ٹکرائی تو آنسوؤں کی ایک لمبی قطار اس کے چہرے پر سے گزر گئی۔

☆☆☆

[illegible] یدر آباد کے لیے پانچ بجے شام کو روانہ ہوئے تھے۔ سات بجے تک وہ پہنچ جائیں گے۔ ان کی
[illegible] ے یقیناً ساڑھے سات اور آٹھ کے درمیان ہوگی۔ فیروزہ اپنے گھر میں بیٹھ کر حساب لگا رہی تھیں۔
[illegible] نے آٹھ بجے اپنے گھر میں نہیں ہوگی اس لیے انہوں نے فون کرنے کے لیے اسی ٹائم کا انتخاب کیا

[illegible] وقت پر بیل ہوئی ''احسن اسپیکنگ!'' ریسیور ان کے بڑے بیٹے نے اٹھایا تھا۔

''[illegible] اچی سے بول رہی ہوں اور آپ کی ماما نینا سے دوستی ہے۔''

''ماما تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں'' احسن نے شائستگی سے کہا۔

''[illegible] جانتی ہوں' اس وقت وہ باہر گئی ہوئی ہیں مگر اس وقت بیٹا میں تم سے ہی بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''[illegible] یے......؟'' وہ مودب لہجے میں بولا۔

''[illegible] میں اس وقت جو بات کرنے والی ہوں' تم وعدہ کرو کہ صبر سے سنو گے...... اور نینا کو ایک سائیکی
[illegible] ٹ کرو گے۔ جوش میں آ کر ہوش نہیں کھو دو گے۔''

''[illegible] آپ کہیے...... آپ ایسا کیا بتانے والی ہیں؟'' اس کی متوحش سی آواز انہیں سنائی دی۔

''[illegible] ن بیٹا! مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تمہارے والد ایک سخت شخص ہیں' ان کی پابندیوں سے گھبرا کر
[illegible] ماں نے اس شخص سے راہ و رسم بحال کر لیے جس سے وہ شادی سے پہلے محبت کرتی تھیں۔''

''[illegible] اس ہے...... آپ کی ہمت کیسے ہوئی میری ماما پر کیچڑ اچھالنے کی......'' احسن بپھر کر بولا۔

[illegible] ے بیٹے! میں تم سے یہ وعدہ لے چکی ہوں کہ تم میری پوری بات سنو گے۔ ان دنوں تمہارے والد
[illegible] باہر گئے ہوئے ہیں اور تمہاری ماں اس وقت بھی میرے شوہر کے ساتھ کسی ہوٹل میں بیٹھی اپنی شادی
[illegible] ما رہی ہیں۔''

[illegible] سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا بکواس کر رہی ہیں اور مجھے یہ سب بتانے سے آپ کا کیا مقصد پورا
[illegible] ہے؟''

''[illegible] تمہارا باپ نہیں کر سکا ہے' وہ تم کرو اور اپنی ماں کو ٹائم دو...... اور انہیں اپنے گھر میں اتنی محبت دو کہ وہ
[illegible] دوسروں کے در نہ کھٹکھٹاتی پھریں۔''

''[illegible] پ ہیں کون......؟''

''[illegible] کی بیوی...... جس کا پیچھا تمہاری ماں نے لے رکھا ہے۔''

[illegible] ی ماں پچاس سے اوپر ہیں...... اس عمر میں وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں رہیں کہ کوئی ان سے عشق کرے
[illegible] وہ اتنی پاگل ہیں کہ محبت کے آگے وہ سب کچھ بھول جائیں گی...... مجھے تو آپ کی کوئی دشمنی نظر آ رہی
[illegible] ری ماما کے خلاف ایسا بول رہی ہیں۔ حد ہوگئی ہے بھلا...... چار جوان بچوں کی ماں پر آپ ایسے
[illegible] ہیں' میں کسی صورت آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔'' احسن اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ پھر وہ
[illegible] لے کر بولا ''میرا خیال ہے کہ سائیکی میری ماں نہیں' آپ ہیں۔''

[illegible] ہے تو تمہاری ماما جب آئیں تو ان سے صرف یہ پوچھ لینا...... ماما' آپ فرید احمد سے مل آئی
[illegible] شادی کرنے کا پروگرام کب ہے۔ پاپا سے علیحدگی کب لے رہی ہیں اور پھر ان کے چہرے کے
[illegible] رنا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ......'' فیروزہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"آپ جو بھی کہیں مگر میرا دل یہ کسی طرح نہیں مان رہا کہ عمر کے اس حصے میں میری ماں محبت کے یوں بلک رہی ہے......" احسن کا لہجہ روہانسا سا ہو گیا۔ بیس بائیس سال کا لڑکا' یہ سب سن کر بری طرح ہو گیا تھا اور اس لمحے وہ سچ اور جھوٹ کے مابین تھا۔

تب فیروزہ نے کہا "پیارے بیٹے' میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتی ہوں مگر جو کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے' تو پانی کم نہیں ہوتا۔ تو یہ سودا ایسا ہی ہے جس کے سر میں سما جائے' و نقصان نہ اپنا دیکھتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا۔ اسے نہ دوسرے کی عزت کا احساس رہتا ہے اور نہ اپنی بے ۔ اور ایسے ہی محبت کے دریا میں تمہاری ماں اتر چکی ہے۔ جو خود ڈوبے یا نہ ڈوبے مگر دوسروں کو ذہنی اذیت پہنچا رہی ہے۔

احسن بیٹا! تمہارے لیے یہ مسئلہ شاید اتنا اہم نہ ہو کہ تمہاری ماں تمہارے باپ کو چھوڑ کر دوسری شادی کر ہے مگر میری بیٹیاں بے عزت ہو جائیں گی' جب ان کی سسرالوں میں یہ کتھا (کہانی) پہنچے گی کہ بڑھاپے میں کی ماں کو طلاق ہو گئی ہے۔ ان کا باپ کسی کرپٹ عورت کے جال میں پھنس گیا ہے۔"

"شٹ اپ......اٹ از ٹو مچ......" احسن نے چلا کر کہا اور لائن کاٹ دی۔

اور فیروزہ نے مسکرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور صوفے پر ڈھے سی گئیں۔ دل میں یہ سوچ ہی ان کے خوش کن تھی کہ آج انہوں نے نینا کو گرا دیا ہے۔

تم بہت تعلیم یافتہ تھیں' طرح دار تھیں' یہ خیال تھا کہ مجھے شکست دے دو گی' مجھے بے گھر کر دو گی مگر آ نے تمہیں تمہارے بیٹے کے آگے بے عزت کر دیا ہے۔

میاں بیوی کا رشتہ تو بڑا بے غیرت سا ہوتا ہے۔ کتنی ہی بڑی بات ہو جائے' کچھ ہی دنوں میں دو ہو جاتی ہے۔ جیسے کچھ عرصے بعد مجھے یہ یاد بھی نہیں رہے گا کہ فرید کی زندگی میں کوئی ناگن آئی تھی مگر ماں رشتہ بڑا اپوتر ہوتا ہے۔ کوئی بھی ماں اپنی اولاد کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہونا پسند نہیں کرتی' مگر آج یہ وقت خود آ گیا ہے کہ بیٹا سوال کرے گا اور تم جواب دینے کی بھی اہل نہیں ہو گی۔

فیروزہ سوچ سوچ کر سرشار ہو رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھیں اور اپنی الماری میں سے ڈارک کلر کا سوٹ نکالا' جیولری نکالی اور شاور لے کر اپنے آپ کو آراستہ کیا۔

گیارہ بجے شب جب فرید احمد گھر میں داخل ہوئے تو وہ کسی چوتھی کی دلہن کی طرح تیار تھیں۔

"کسی تقریب میں گئی تھیں تم......؟" انہوں نے ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

"ہاں' آج میری سالگرہ ہے۔ تمہارا انتظار کر رہی تھی' تم آؤ گے تو کیک کاٹوں۔" انہوں نے کیک سا رکھ کر کہا۔

"مگر تمہاری سالگرہ تو خزاں میں ہوتی تھی" ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے وہ کچھ سوچ کر بولے۔ سالگر کی تاریخیں یاد رکھنا ان کے لیے کہاں ممکن تھا۔

"اب میں بھری بہار میں اپنی سالگرہ منایا کروں گی" فیروزہ ہنس کر بولی۔

"تمہارے داماد ہنسا کریں گے۔ بڈھی گھوڑی لال لگام......" فرید احمد نے ان کے سرخ پھولوں وا دوپٹے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"آپ تو میرا مذاق نہیں اڑائیں گے ناں......" وہ بولیں۔

"میں نے کبھی اڑایا ہے......جو اب اڑاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' اب پھر پہلے کی طرح آپ سے دوستی" فیروزہ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"لڑائی کب تھی تم سے......" وہ فیروزہ کے سرشار سے انداز کو دیکھ کر دل میں حیران ہو رہے تھے۔ وہ تو ہمیشہ ائی کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں۔

"بہت پریشان کر لیا میں نے آپ کو......اب وعدہ ہے کہ آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

"یہ ایکا ایکی انقلاب کیسے آ گیا تم میں؟ گزشتہ چند ماہ سے تو تم مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی رہی ہو۔"

"اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ غلطی میری ہے۔ خواہ مخواہ کے وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ آپ تو چاہنے والے شوہر ہیں' آپ سے ناراض رہ کر میں خوش نہیں رہ سکتی۔"

"چلو شکر' تمہاری عقل میں کوئی ڈھنگ کی بات تو آئی۔" فرید احمد مسکرا کر بولے اور طمانیت سے سوچا۔ پگلی بھی نہیں معلوم کہ میں ابھی نینا سے مل کر آ رہا ہوں اور ہمارے مابین کیا کیا پلاننگ ہو چکی ہے۔

"فرید! میں نے ایک اور خاص بات بھی سوچی ہے۔" فیروزہ نے انہیں کچھ سوچ کر زیر لب مسکراتے دیکھ کر

"کون سی خاص بات......؟"

"اب ہم زندگی کی سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ پتا نہیں کب زندگی کی شام ہو جائے' اس لیے میاں سے لڑنے نے کا کیا فائدہ......وہی تو اپنے کاندھے سے قبرستان تک پہنچائے گا۔"

"افوہ......بڑی گہری سوچ ہے تمہاری" فرید مسکرا کر بولے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ آپ بھی چھپن سال کے ہیں' کیا خیال ہے' مزید پچاس یا تیس سال اور جی گے؟"

"پتا نہیں......شاید نہیں۔"

"اس عمر میں آ کر تو ہمیں زیادہ اللہ اللہ کرنی چاہیے اور ایسے کام کرنے چاہئیں جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ......اور ہم خواہ مخواہ آپس میں بے وجہ لڑے چلے جا رہے ہیں۔ وہم اور شک نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ واقعی' سچ کہتے تھے' آپ صرف مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ نینا آپ کی دوست ضرور رہی ہو گی' مگر آپ کے دل بھی ایسی بات نہیں آئی جو غلط ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے تمہیں میرا یقین تو آیا......" فرید احمد کا لہجہ کھل سا اٹھا۔ "آؤ' باہر چلتے ہیں' ذرا لانگ ڈرائیو ئے گی۔" انہوں نے فیروزہ کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنے تھکے ہوئے تو آئے ہیں' باہر جائیں گے تو مزید تھکن ہو جائے گی۔" فیروزہ مشرقی بیوی بن جن کا کام ہی شوہر کی سیوا کرنا ہوتا ہے۔

"بہت دن ہو گئے' تمہارے ساتھ باہر نہیں نکلا' باہر سے کوئی اچھا سا جوس پی کر آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے......چلیے" انہوں نے اپنا بڑا سا دوپٹا اوڑھ کر ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ناز سے کہا۔

☆☆☆

جس سے نفرت ہو جائے' جس کو دیکھ کر غصہ آئے۔ جس کا نام سن کر ہی وہ قعر ذلت میں گڑ سی جائے' جس کا بھی ہیجان میں مبتلا کر دے......

وہی عدیل اس سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ کبھی کہیں' کبھی کہیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا ......مگر وہ برداشت کر رہی تھی' دشمن کو جھیلنا کتنا مشکل ہوتا ہے' اس کا اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔

منو آج اپنی فرینڈ کے ساتھ بازار جا رہی تھی' اب وہ حجاب لینے لگی تھی۔ سیاہ حجاب اس کے بالوں کے ساتھ اس کے چہرے کو بھی چھپائے رکھتا تھا۔

سگنل پر گاڑی رکی تو عدیل ہاتھ میں کئی رسالے لیے آگے بڑھا۔ وہی نیلے رنگ کی گریبان کھلی شرٹ' کٹ مال پینٹ' وہی پرفیوم۔

''باجی جی! دیکھیے یہ فیشن کا' یہ صحت کا اور یہ بہنوں کا رسالہ ہے...... اور اس میں تو آپ کی دلچسپی کی موجود ہے۔'' وہ گاڑی کی کھڑکی سے لگا خوشامدانہ انداز میں روانی سے بول رہا تھا۔

''آپ پلیز! میرا اعتبار کریں اور یہ میگزین خرید لیں۔ اس کو پڑھ کر آپ کو میرا اعتبار آجائے گا۔''

منو نے اپنی چادر کا ایک سرا اپنے ہاتھوں پر بھی کر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب عدیل اسے کسی طرح بھ پائے یا اس کی ناپاک نظریں اسے چھو سکیں یا اسے دیکھ سکیں۔

کیسی کیسی بے وقوف بنی تھی وہ اس شاطر لڑکے کے ہاتھوں۔ اس کا قیمتی موبائل تک اس نے ہتھیا لیا تھ سگنل کھلا' گاڑی فراٹے سے آگے بڑھی مگر عدیل کی مکروہ آواز اس کے کانوں میں ابھی تک زہر گھول تھی۔

''یہ مجھ سے بار بار کیوں ٹکرا رہا ہے'' اس نے سوچا۔

''منو جی! یہ اب ہر بار تم سے نئے روپ میں مل رہا ہے تاکہ تم جان سکو کہ اس شخص کے کتنے بہروپ ایسے لڑکے معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو کس آسانی سے شیشے میں اتار لیتے ہیں'' اس کے دل نے سمجھایا۔

''اگر میری ماں میری چوکسی نہ رکھتی تو شاید یہ اپنے مذموم عزائم میں بھی کامیاب ہو جاتا'' منو نے سو اسے جھرجھری سی آگئی۔

گاڑی سگنل سے بہت آگے بڑھ چکی تھی مگر منو کو ہر جانب عدیل کھڑا نظر آ رہا تھا' جیسے وہ کوئی آسیب اس کو کھانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو۔

''ڈرائیور! گاڑی گھر کی جانب موڑ لو اب ہم کہیں نہیں جا رہے'' اس نے کہا۔

''کیوں' کیا شاپنگ نہیں کرنی......؟'' اس کی فرینڈ نے حیرت سے کہا کہ آج کا یہ پروگرام منو کی وج ہی بنا تھا۔

''شاپنگ کا کیا ہے پھر کبھی کر لیں گے۔ اپنے قریبی مال سے بھی ہر چیز مل جاتی ہے۔ اس وقت گھر م کر گرما گرم چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''گھر کے قریب سے شاپنگ کرنی تھی تو پھر مجھے کیوں بلایا تھا؟'' دوست نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

''میری اس وقت طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے گھر جا رہی ہوں'' منو نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ارے تمہارے تو ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' دوست اس کے ہاتھ تھام کر پ سی ہوگئی۔

''مجھے خود نہیں پتا' مجھے کیا ہوا ہے اسی لیے تو گھر جانا چاہتی ہوں۔''

منو اس کے شانے کے سہارے بیٹھ گئی اور اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔

ب اس کی دوست نے چیخ کر کہا۔ ''ڈرائیور گاڑی تیز چلاؤ۔ منو بے ہوش ہوگئی ہے۔''

☆☆☆

میں نے سب کے ہاتھ میں دیکھی محبت کی لکیر
کون کہتا ہے یہ دنیا پیار کے قابل نہیں

اور آخر ثریا...... اپنا مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔

ائرہ اپنی ساس کو ڈاکٹر سے چیک اپ کراتے ہوئے گھر آئی کہ اپنا بیگ' جو بھول گئی تھی وہ لیتے ہوئے چلی مگر ثریا نے اسے اور اس کی ساس کو اندر آکر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

''بھابی' اس وقت نہیں بیٹھ سکتی' گھر پر بلال ہمارے منتظر ہوں گے۔'' سائرہ کسی صورت میں رکنا نہیں چاہ ھی مگر وہ ثریا ہی کیا' جو اپنی بات منوا کر نہ چھوڑے۔

اس نے لپ جھپ قریبی بیکری سے چائے کا نہ صرف سامان منگوالیا بلکہ شامی کباب اور مٹر بھی تل کر رکھ سائرہ کی ساس اس کی میزبانی پر متحیر سی تھیں۔

''مجھے اچھا لگتا ہے' جب سائرہ میرے پاس آتی ہے' میں تو اس کو دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ یہ تو مجھے اپنی ثنا کی ح پیاری ہے۔ اس کے آنے سے یوں لگتا ہے کہ میری ثنا مجھ سے ملنے آئی ہو...... اور بیٹی کے آجانے سے اس قدر خوشی ہوتی ہے' کتنی طمانیت ہوتی ہے' وہ بتائی نہیں جاسکتی۔''

''پھر بھی آپ نے بہت تکلف کر دیا ہے......'' اس کی ساس بھری پری میز کو دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دن آپ خاص طور سے ہمارے گھر آئیں اور ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔''

''ارے میرا کہاں نکلنا ہوتا ہے...... اور سائرہ تو گاہے بگاہے اپنے گھر آتی ہی رہتی ہے۔''

''نہیں آنٹی' آپ کی اہمیت اپنی جگہ ہے...... اور میں تو ان ماؤں میں سے ہوں جو بیٹی سے زیادہ اس کی اس کو اہمیت دیتی ہوں۔ مجھے تو بہت اچھا لگے گا کہ آپ بھی سائرہ کے ساتھ ہمارے گھر آیا کریں۔ آپ کے نے سے ہمارے گھر میں حقیقی رونق ہوگی۔ ایسی ہی رونق جو بزرگوں کے وجود سے پھوٹا کرتی ہے۔'' ثریا ے بول رہی تھی اور شائستہ بیگم منہ کھولے ہکابکا سی اس کی تقریر سن رہی تھیں۔ ثریا کو اس انداز سے باتیں وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھیں۔

سائرہ کی ساس بھی اپنی مسکراہٹ دابے اس کی باتیں پہلی مرتبہ سن رہی تھیں۔

''اب اللہ کرم کرے اور میری ثنا کی بھی شادی ہو جائے تو میں اس کا بھی سائرہ کی طرح انتظار کیا کروں گی۔''

''ثنا تو ابھی پڑھ رہی ہے' اس کی پڑھائی ختم ہوگی تب ہی شادی ہوگی'' سائرہ کی ساس نے ہنس کر کہا۔

''نہیں آنٹی' ایسی بات نہیں ہے...... اگر کوئی اچھا رشتہ آئے گا تو میں شادی کر دوں گی۔ پڑھائی کا کیا ہے وہ شادی کے بعد بھی جاری رہے گی۔''

''پھر بھی رخنہ تو پڑ جاتا ہے'' وہ بولیں۔

''میری بیٹی بے حد ذہین ہے' وہ مینیج کر لے گی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے'' اب ثریا کی تائید کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اس سے قبل' وہ سائرہ کو

اٹھنے کا اشارہ کرتیں' ثریا چمک کر بولیں۔

"آنٹی! آپ کی نظر میں کوئی اچھا لڑکا ہو تو ضرور بتائیے مگر بلال جیسا ہو' اسمارٹ اور سمجھ دار سا۔"

"آپ کی بیٹی بہت اچھی ہے' انشاء اللہ اس کو بر بھی اچھا ہی ملے گا۔"

"پھر بھی اچھی چیز کے لیے کوشش تو کرنا پڑتی ہے۔ لوگوں سے کہنا پڑتا ہے۔ اب جیسے آج میں نے آ سے کہا ہے' تو وہ یقیناً اپنی فیملی میں کسی بھانجے' بھتیجے کو ضرور دیکھیں گی۔ ماشاء اللہ آپ کے تو بھتیجے بھی کنوار ہیں اور بھانجے بھی۔"

تب سائرہ کی ساس نے نظروں ہی نظروں میں اپنی بہو کو دیکھ کر گہرا سانس لیا۔ اب ان کی سمجھ میں با آ گیا تھا کہ ثریا ان کے آگے خاطر مدارات کا یہ جال کیوں پھیلا رہی ہے۔

گھر آ کر انہوں نے سائرہ سے کہا "تمہاری بھابی ثریا کی نظریں تو تمہارے سسرال کے لڑکوں پر ہیں۔"

"وہ بہت زیادہ بولتی ہیں اور زیادہ بولنے والے کچھ انٹ شنٹ بھی بول جاتے ہیں" سائرہ کھسیا کر بولی۔

"وہ تو ہر مرتبہ عجیب وغریب انداز میں باتیں کرتی ہیں۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ مجھے تو ہر مرتبہ ان کی باتوں ایک چال نظر آتی ہے۔"

"ہوں......" سائرہ نے شرمندگی سے ہنکارا ابھرا۔

"تمہاری بھابی کے مزاج کا مجھے کچھ کچھ تو اندازہ ہے......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سائرہ کو دیکھنے لگیں۔

"نہیں امی! آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔" سائرہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"تمہاری بھتیجی ثنا کیسی ہے؟"

"وہ تو بہت اچھی ہے۔ شکل کی بھی اور عادتوں کی بھی۔"

"مگر میں لڑکی کی ماں کو پہلے دیکھتی ہوں کہ ماں کے اثرات اس کی بیٹی پر زیادہ پڑتے ہیں۔"

"ثنا پر کسی کے اثرات نہیں ہیں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"مگر مجھے ثریا کی اوچھی حرکات بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"وہ دل کی اچھی ہیں' مگر زبان کی بعض مرتبہ ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔"

"سائرہ بیٹا! یہ زبان ہی شخصیت کی چابی ہوتی ہے جو کسی بھی انسان کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ کتنا ہے اور کتنا برا۔"

"میرے ساتھ تو میری دونوں بھابیاں بہت اچھی ہیں" سائرہ نہیں چاہ رہی تھی' اس کے میکے والوں بارے میں اس کی ساس کسی بری رائے کا اظہار کریں۔

"مجھے اندازہ ہے' وہ کتنی اچھی ہوں گی' یہ ہماری شائستہ اچھی تھیں جنہوں نے ان کے ساتھ گزارہ کر لیا' و یہ ثریا تو اس قابل تھیں علیحدہ اپنے بچوں کو لے کر رہتیں اور خاندان کا کوئی فرد ان کے ہاں جھانکتا تک نہیں۔"

تب سائرہ چپ سی ہو گئی کہ اس کی ساس کی بات سو فیصد بالکل صحیح تھی اور اس کے کانوں میں ابھی ان جمل کی بازگشت بھی ختم نہیں ہوئی جو ثریا بھابی نے اسے بے مہار سنایا تھا کہ وہ ثنا کی شادی اس لیے نہیں کروانا چا کہ بلال سے اچھا کسی کو بر نہ ملے۔

☆☆☆

رعنا کی منگنی کی کوئی بہت زیادہ تشہیر نہیں ہوئی تھی۔ فاخرہ کی کوئی پرانی سہیلی اپنے بیٹے کا رشتہ رعنا کے

گئیں جو امریکا میں پڑھنے کے لیے آ گیا تھا۔

امریکا سے آنے والے رشتے کا سن کر تو فاخرہ بی ایڑیوں کے بل اچھلنے لگیں۔ اب انہیں صابرہ کو یہ احسان لانا تھا کہ منور سے اچھا رشتہ ان کی بیٹی کے لیے آیا ہے۔ ہیرو ٹائپ لڑکے کی تصویر وہ اس دلار سے اپنے میں رکھ کر صابرہ کے پاس آئی تھیں جیسے وہ ان کا ہونے والا داماد ہو۔ اور وہ اسے صابرہ کو دکھانے کے لیے ہوں۔

"امریکا کے نام پر خوش ہو رہی ہو ناں تم؟" صابرہ نے پوچھا۔

"پی بولنا صابرہ! اتنے اچھے رشتے کس کے ہاں آتے ہیں بول کے......" فاخرہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"اگر تم یہ رشتہ کر بھی دیو تو کیا ہاتھاں آئیں گے تمہارے۔ کیا بہوت پیسہ ملے گا بول کے۔" اب صابرہ اچھی سی جرح کر رہی تھیں۔

"پیسہ بہوت بڑی تاخت (طاقت) ہوتا ہے ناں۔ اتا اچھا رشتہ پہلے کو آ جاتا تو میں کب کی فارغ ہو کو بیٹھی کائے کو میں انتظار کرتی منور کا...... انہوں کی تو پڑھائی ہی کھتم (ختم) نہیں ہوتے۔"

"فاخرہ آپا! یہ پہلے ہوتا تھا کہ بات کی اہمیت ہوتی تھی' آپ بے شک منگنی توڑ دیو' آپ کی کوئی پونچھ)نہیں ہوں گی جی!"

"اللہ! ایسا میں کب بولی......" فاخرہ لگیں ہنسنے' کھی کھی کھی......

"آپا! اپنے میکے میں آپ کے ساتھ بیٹھ کے کھٹی دال چاول کھانے کو بھی اتی اچ خوش ہوتی تھی جتنا لوگاں اں ہور بریانیاں کھا کو رہتے ہوئیں گے...... اس وخت تو آپ پیسہ پیسہ نکو بولتے تھے...... مگر آج آپ کو اس کی تاخت (طاقت) کا اندازہ ہو کو بیٹھے۔"

"میں غلط سوچی کیا...... کیا لوگاں آج کل اچھے سے اچھا نکیں دیکھتے بیٹھتے؟"

"بالکل سچ بولے آپ...... آپ کی انگارہ باتاں نے تو منہ ہارے (اندھیرے) میں بھی اجالا اچ کر دیا آپ شوخ سے (شوق سے) کرو شادی رعنا کی امریکا کی' میرے کو نکو پریشانی نکیں۔" صابرہ نے جل کر کہا۔

ب فاخرہ امریکا میں رہائش پذیر لڑکے کی معلومات میں جت گئیں...... اور چند ہفتے بعد ہی رپورٹ آ گئی۔ صاحب زادے کسی کالی امریکن کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ ہر شرعی برائی ان میں موجود ہے۔ پاکستان میں ی اماں کے ارمانوں کو پورا کرنے کے لیے کر رہے ہیں کہ سال دو سال کے بعد جب وہ آئیں تو ان کو خوش نے والی ہستی یہاں بھی دستیاب ہو' جو ان کے جانے کے بعد ان کی تنہا ماں کی خدمت گار رہے۔

"یہ میری دوست بھی بڑی سناڑی نکلی...... اتے خوب جھوٹ باتاں کر کے دماغ خراب کر دیے میرا۔ میں اپنے منور پاشا کو چھوڑ کر جاؤں گی۔ رعنا تو ہے ہی آپ کی۔ میرا تو دماغ خراب کر دیے لوگاں نے۔ ایسی اں بولیں کہ کچھ سمجھ میں ہی نکیں آیا بول کے۔"

"ا اب معاملہ پلٹ گئے تو تم دوبارہ آ گئے۔ جیسے میرے منور میں اب لال لگ گئے ہوں بول کے۔"

"بھی اب کیا باتاں لے کو بیٹھے۔ میں بس ایک بات بول دی' رعنا کی شادی ہو گی تو بس منور کے سنگات کی...... اور جلدی ہوئیں گی۔" فاخرہ نے جلدی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جلدی نہیں ہے ہمارے گھر میں۔ ابھی میرا بچہ پڑھتا بیٹھا ہے۔ اتنی جلدی نکو اچ کرے گا وہ شادی۔"

"صابرہ' منگنی والی لڑکی کا تو کہیں سے بھی نکو رشتہ آتا۔ ساروں میں یہ خبراں گھوم کے رہتی کہ اس لڑکی کی

بات پکی ہو کے بیٹھی۔ اب میرے کو رعنا کی شادی کی جلدی ہے ناں' تو تم ہی کوئی جلدی کا وخت سوچو ناں۔"

"تم کو جلدی ہے ناں' تم سوب کو بول دیو رعنا کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔" صابرہ نے غصے سے تنگ کر کہا۔

"لڑکے کی ماں ہوں ناں اس لیے ایسا اچ بول کے بیٹھی ہو۔" "لڑکی کی ماں ہوتی ناں تو کبھی ایسا اچ نہ بولتے تم" فاخرہ نے جھلا کر کہا۔

"تم تو لڑکی کی ماں ہو ناں' بہوت اچھا کام کری آپ' میرا دل بہوت خوش کری آپا...... آپ ہیں اچ ایسی ہستی جو صرف اپنے فائدے کی باتاں سوچتے بیٹھتے۔ آپ کیا آئینہ نکیں دیکھے کیا......؟

"آپ کیا کر کے بیٹھے' وہ تو آپ کی خسمت اچھی تھی جو امریکا کے رشتے کی ملومات آپ کو ہو گئی۔ اگر کو ہوندا جواب دے کو بیٹھتا کہ وہ لڑکا بڑا اچھا ہے' شریف بولتے سوب اس کو کوئی خامی نکیں اس میں...... تو آپ صاف جواب دے کر بیٹھتے میرے منور کو۔ رشتہ پسند نہیں آیا تو آپ لوگاں میرے منور کی طرف آ کو بیٹھ گئے میرے کو سمجھا کیا آپ نے؟ کیا میں پاگل دکھتی آپ کو؟ کیا میرا بیٹا آپ کو گدھا لگتا جس کو باندھ کر آپ کھونٹا ڈھونڈ کر بیٹھتے۔"

"پلیز صابرہ! میرے کو معاف کر دو۔" اب فاخرہ نے دوسرا پینترا بدلا۔

"میرے بچے کو تو پہلے ہی پسند نکیں تھی رعنا۔ اب میں سوچ کر جواب دیوں گی آپ کو۔" صابرہ نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آپا اب تم چلی جاؤ۔"

☆☆☆

فیروزہ بظاہر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں مگر ان کی پوری سماعت فرید احمد کی جانب تھی۔

فرید اپنے موبائل سے کہیں فون کر رہے تھے اور کسی کی آواز سن کر از خود کاٹ رہے تھے۔ فیروزہ کو پورا یقین تھا کہ فرید اس وقت نینا کے گھر میں فون ملا رہے ہیں۔ وہ بظاہر نیچی نظروں سے اپنے کام میں محو نظر آ رہی تھیں مگر دزدیدہ نظروں سے اپنے شوہر کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

چوتھی بار انہوں نے فون کی لائن نہیں کاٹی۔ "نینا کو بلا دیں......" وہ انتہائی دھیمے لہجے میں بولے۔ اس سے فیروزہ نے اندازہ لگایا کہ تمام فونز احسن ہی ریسیو کر رہا ہے۔

"امی تو پاپا کے ساتھ گئی ہوئی ہیں' شاید اس نے یہی کہا تھا تب ہی فرید نے کہا۔

"تمہارے پاپا تو ملک سے باہر ہیں۔" اس کا جواب سن کر چند تیوریاں ان کے ماتھے پر آئیں اور بولے۔

"اچھا...... وہ اتنی جلدی آ گئے؟"

احسن نے انہیں پہچان کر شاید کچھ اور بھی کہا تھا مگر...... جس کے جواب میں فرید نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔ یقیناً اس نے منع کیا ہوگا فون کرنے سے۔ فیروزہ دل ہی دل میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ اس نے فرید احمد کو کس انداز میں لتاڑا ہوگا۔

اب فرید نینا کے موبائل پر فون کر رہے تھے اور وہ شاید آف تھا۔ جھنجلا کر انہوں نے اپنا موبائل جیب میں رکھا اور کمرے میں ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے۔

فیروزہ نے ٹھنڈی ٹھار لسی بنائی اور ایک گلاس فرید احمد کو دیا۔ وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گئے۔

"چاولوں میں تو میں مٹر ڈال رہی ہوں' سالن کیا بناؤں؟" انہوں نے بڑے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"خاک دھول پکا لو......" وہ غصے سے بولے اور فیروزہ دل ہی دل میں ہنس دیں۔ وہ خوب سمجھ رہی تھیں

نینا سے بات نہ کرنے کی وجہ سے آف ہو رہا ہے۔ ڈائیلاگ بولنے کو نہیں مل رہے۔ پرانی عادتیں کیسے ں کی ٹھیک ہے...... اب آہیں بھریں۔

ے اس کے بیٹے احسن نے کس طرح بات کی ہوگی؟ وہ بار بار سوچ رہی تھیں۔ ان کی سوچ کی اڑانیں ہیں جا رہی تھیں اور کبھی کہیں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی' جب نینا گھر میں داخل ہوئی تو احسن لاؤنج میں بیٹھا ان کا ر رہا تھا۔

"بہت دیر ہو گئی ماما آج آپ کو؟ کہاں چلی گئی تھیں؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"گئی تھی میں کہیں...... وہیں دیر ہو گئی۔" نینا نے مبہم سا جواب دیا۔

"پاپا کب آئیں گے؟ اتنے سارے دن ہو گئے' ان کے بغیر کتنا عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"اچھا...... مجھے تو کچھ بھی نہیں لگ رہا۔ یہاں رہتے ہیں تو وہ کون سے گھر میں ٹکتے ہیں۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ ان کے آنے یا نہ آنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور میرے ہوسٹل سے آنے کا آپ انتظار کرتی ہیں یا وہ بھی نہیں؟"

"تمہارا انتظار تو میں ہمیشہ کرتی ہوں۔"

"ماما! اب میں ہوسٹل نہیں جانا چاہتا۔ آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے بغیر میری پڑھائی بھی اچھی نہیں ہو رہی۔"

"ایسا مت کرنا' ورنہ تمہارے پاپا ناراض ہوں گے بلکہ سارا الزام میرے سر ہی رکھ دیں گے۔"

"میں انہیں خود بتا دوں گا کہ میری وہاں لڑائی ہو گئی ہے اور وہ لوگ میرے دشمن بن گئے ہیں' مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"تیری کس سے لڑائی ہوئی ہے' مجھے بتا تو سہی" نینا تڑپ کر بولی اور احسن کے قریب ہی صوفے پر آ بیٹھی۔

"اُفوہ...... آپ اتنی پریشان خواہ مخواہ ہو رہی ہیں' یہ سب تو پاپا کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بولوں گا ورنہ کسی سے بھی لڑائی نہیں ہوئی ہے مگر اب میں وہاں بالکل نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہاں سخت وحشت سی ہو رہی ہے۔"

"تم میرے پاس کیوں آنا چاہتے ہو؟ اس سے پہلے تو تمہیں ماما کی کبھی یاد نہیں آئی۔ یہ اکیلا اکیلی ماما کی محبت تمہارے دل میں کیسے پیدا ہو گئی؟"

"ماما......! میں آپ کا بیٹا تو ہوں ناں' بس اب آپ کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ چھوٹی بہن اکیلی کالج جاتی ہے اس کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ میرے سب دوست اپنی بہنوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ ڈرائیور کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ کی ذمے داری بھی وہ خود اٹھاتے ہیں۔ یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اپنی چھوٹی بہن کا خیال رکھوں۔"

"تمہارے باپ کا تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس نے تو آج تک ایسا نہیں سوچا" نینا اپنے ناخن کترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایسا نہ کہیے آپ...... اللہ میرے باپ کو سلامت رکھے۔ میرے باپ کی موجودگی میں نہ کوئی آپ کو کچھ کہہ سکتا ہے اور نہ میری بہن کو۔ خدانہ کرے اگر میرے باپ کو کچھ ہو جائے تو اس بڑھاپے میں بھی لوگ آپ پر انگلیاں اٹھا سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ مذاق میں میرے دوست نے کہہ دیا تھا کہ آج ہوٹل میں ایک خاتون کسی صاحب سے عشق لڑا رہی تھیں' ان کی شکل تمہاری ماما سے ملتی تھی تو میں نے اسی وقت اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ اگر

شاید میرے پاس پستول ہوتا تو اسے جان سے مار کر خود پھانسی چڑھ جاتا مگر اپنی ماما کی عزت پر حرف نہ آنے دیتا۔“ احسن نے دیکھا اس کی ماں پسینے پسینے ہو گئی ہے۔ اس کا رنگ خوفناک حد تک زرد ہو گیا ہے۔ اس سے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتی‘ اس نے اپنی ماں کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

”امی......! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ جن کے جوان بیٹے ہوتے ہیں‘ انہیں تو کسی قسم کی بھی پریشانیاں نہیں پالنی چاہئیں۔ اب میں آ گیا ہوں آپ کے پاس۔ آپ کے ساتھ ہر جگہ گھوما کروں گا۔ ماں بیٹے دونوں مل کر خوب انجوائے کریں گے‘ پھر آپ دیکھیے گا کہ پاپا کیسے ہماری کمپنی جوائن کرتے ہیں۔“

”تمہارے پاپا نے مجھے بے حد دکھ دیے ہیں۔ کبھی محبت کا ایک جملہ انہوں نے نہیں بولا‘ کبھی نہیں......!“

”امی......! پاپا کا اسٹائل ہی ایسا ہے۔ انہوں نے کبھی زندگی میں کسی سے ڈائیلاگ نہیں بولے‘ تو وہ آپ سے کیسے بول سکتے تھے۔ آپ کی یہ غلطی رہی کہ آپ ان میں ایک مجنوں قسم کا شوہر ڈھونڈتی رہیں‘ جو ان میں کبھی تھا ہی نہیں۔“ احسن نفسیات کا طالب علم تھا‘ اس وقت ماں کی نفسیاتی گرہیں کھولنا بھی اسے سہل لگ رہا تھا اور کسی معمول کی طرح اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”امی! آپ ہم سب بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتی ہیں نا......؟“ احسن نے پوچھا۔

”ہاں...... اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔“

”آپ نے پاپا سے بھی بڑھ کر ہم سے محبت کی ہے؟“

”ہاں...... کی ہے۔“

”تو ہمیں بھی آپ بہت پیاری ہیں اور اپنی جان اور اپنی آن سے بھی زیادہ......“

”ہوں......“ نینا نے ایک گہری سانس لی۔

”ایک بات کہوں ماما...... اگر آپ برا نہ مانیں......؟“

”کہو......“ وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

”آپ پاپا کو معاف کر دیں...... میں جانتا ہوں ان کی اکھڑ شخصیت اور اکھڑ لہجے نے آپ کو لہولہان رکھا ہے۔“

تب نینا نے آنکھیں میچ لیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ احسن نے بھی اسے خوب رونے دیا تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔

نینا جب خوب رو چکی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”جس شخص نے مجھ سے محبت تو کیا‘ کبھی میری عزت بھی نہ کی ہو اس سے میرا تعلق ہی کیا......؟“

”تعلق کی کڑی تو آپ کے بچے ہیں جو آپ کو دل و جان سے چاہتے ہیں‘ اور ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ آپ پاپا کو معاف کر دیں۔“

”کر دوں گی معاف...... کہ میری زندگی تو ہمیشہ خسارے میں ہی گزری ہے...... میں نے اپنی زندگی کبھی اپنے لیے نہیں بسر کی۔ اب سوچا تھا کہ اب میں اپنے لیے جیوں گی تو یہ بھی نہ سہی۔ شاید میری سوچ ہی غلط تھی۔“ فیروزہ کے لہجے میں پھر ملال جھلکنے لگا۔

احسن ماں کی ہر بات سمجھ رہا تھا۔ فیروزہ کے جملے بھی اس کے کانوں میں تھے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اسے ماں کو ایک سائیکی کیس سمجھ کر ڈیل کرنا ہے۔ اس لیے اب وہ ایک سائے کی طرح ماں کے ساتھ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت ماں کو ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ انتہائی توجہ کی بھی شدید ضرورت ہے۔

ہوٹی بہن جب کالج سے آئی تو احسن نے اس سے بھی یہی کہا ”ماما شدید ڈپریشن کا شکار ہیں۔ تم ان کو ے زیادہ ٹائم دو ورنہ وہ شاید ہم میں نہ رہیں۔“

ازہ بھی نینا کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ باہر سے آنے والا ہر فون احسن خود ہی ریسیو کر رہا تھا۔

اور جب فرید احمد کے فون نے تانتا ہی باندھ لیا تو احسن کو ان سے کہنا پڑا ”پلیز انکل! آپ ہمارا گھر نے کی کوشش نہ کریں۔ ہم بہن بھائیوں کو اپنے والدین کے ساتھ سکون سے رہنے دیں۔ میری ماما کو اس پے میں ایسی زک نہ پہنچائیں جو ان کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کے لیے بھی ہزیمت کا سبب بنے۔ اگر لو اپنی عمر‘ اپنی فیملی اور اپنی حیثیت کا احساس نہیں ہے تو کم از کم ہمارا تو کریں“ پھر اس کے بعد موبائل اور گھر ن نمبرز احسن نے تبدیل کروا دیے۔

ھر فرید احمد نے نینا سے کبھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ فیروزہ کے ایک چھوٹے سے فون نے وہ کام کر دکھایا جس جے جمائے گھروں کا شیرازہ بکھرنے سے روک دیا۔

یروزہ بے حد خوش تھیں۔ فرید احمد کا اترا اترا چہرہ انہیں دلی طمانیت عطا کر رہا تھا۔ اگر عورت دوسری عورت کو ے تو فاتح بن جانے والی کی خوشی دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ یہی حال اس وقت فیروزہ کا ہو رہا ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسجد میں اعلان کروا دیں۔ ”حضرات! نینا جیسی بدکردار عورت کو اس کے بیٹے ے نکال دیا ہے اور وہ منہ چھپا کر کہیں دور نکل گئی ہے...... اور اب اس کا فرید احمد سے کوئی تعلق نہیں رہا ستانہ ثابت کرنے والے کو اپنی منہ کی کھانی پڑے گی۔“

ہی کو بلاوجہ فون کیا اور کہا ”آج میری طبیعت خاصی بہتر ہے‘ کل تم اور فہد رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ بھابی جان اور بھائی جی کو بھی ساتھ لانا۔“

ہی سے گپ شپ کے بعد نگین سے فون پر بات کی۔ شجاع اور آپا سے بھی ان کی خیریت پوچھی۔ آپا کو کراچی تک کی دعوت دے ڈالی۔ حکیم جی کی بیوی اس وقت ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ ان تک سے فون پر بات ان کے گھر نہ جانے کی معذرت کی۔ فیروزہ کا بس نہیں چل رہا تھا ہر ایک سے اپنے رابطے بحال کرے۔

تنی عجیب بات ہے‘ پریشانیوں اور دکھوں میں انسان‘ انسان سے دور بھاگتا ہے مگر خوشیوں میں وہ قریب جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ فیروزہ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ٹی وی پر مغنیہ نے کوئی گیت گانا شروع کیا تو فیروزہ بھی از اس کے ساتھ ملا کر گانے لگیں...... اور پھر خود ہی کھلکھلا اٹھیں۔

☆☆☆

ز رحمان کی بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ ہر روز ہی ان کا اپنی امی کے ہاں جانا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ثنا کو پنے ساتھ لے جاتی تھیں۔

ناسب میں گھلنے ملنے والی لڑکی تھی۔ شادی کے گیت گائے جاتے تو وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ اس کا لرنے والا احسن سب کو ہی اچھا لگا کرتا۔ ان دنوں مسز رحمان کا بھائی نادر کینیڈا سے شادی میں شرکت او لینڈی آیا ہوا تھا اور ثنا کو دیکھ کر سو جان سے اس پر عاشق ہو گیا تھا۔

”آپا! تمہیں میرے لیے کوئی لڑکی نظر نہیں آئی؟“ اس نے مسز رحمان سے کہا۔

”خاندان والے تو تمہیں جانتے ہیں‘ پڑھ کر تم نے دیا نہیں اور جو حرکتیں روا رکھیں‘ وہ بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں‘ کوئی نہیں دے گا تمہیں لڑکی۔“

''تو باہر کے خاندان میں میرے لیے کوئی لڑکی دیکھ لو۔'' اس نے ایک اچٹتی سی نظر ثنا پر ڈال کر کہا۔

''کوئی نظر آئے گی تو دیکھوں گی۔'' بہن نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''کیسی بہن ہیں آپ' اپنے بھائی کا خیال تک نہیں۔ بہنیں تو اپنے بھائی کے لیے گھر گھر لڑکیاں جھانکتی پھر ہیں اور یہاں ایک پیاری سی لڑکی آپ کے اپنے گھر میں موجود ہے اور پھر بھی وہ آپ کو نظر نہیں آ رہی۔'' وہ ہنسا

''دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تمہارا۔ ثنا تو ڈاکٹر بن رہی ہے۔ وہ تمہارے رینج کی کہاں سے آ گئی۔ کہاں کہاں وہ۔ اس پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ سوچ تو لیا ہوتا' رحمان کے بہت عزیز دوست اور بزنس پارٹنر کی بیٹی ہے کوئی ہما شما نہیں ہے کہ تم کہہ دو اور میں پاگلوں کی طرح تمہاری بات مان لوں'' انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔

''یہ بات تو آپ مانتی ہیں ناں' لڑکی وہ بہت اچھی ہے۔'' اس نے چاپلوسی سے بہن کے گلے میں بانہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں' لڑکی تو وہ بہت اچھی ہے۔ اگر میرے طاہر کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے بچے کے لیے ضرور سو سکتی تھی۔''

''آپا.....! کیا چھوٹا بھائی بیٹے جیسا پیارا نہیں ہو سکتا۔ جو بات آپ طاہر کے لیے سوچ رہی تھیں' میر لیے نہیں سوچ سکتیں.....اور میری تو ابھی کہیں کوئی منگنی شنگنی بھی نہیں ہوئی ہے'' وہ پھر ہنسا۔

''نادر! تم مجھے اپنے بیٹے سے بھی پیارے ہو مگر ثنا جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے' تم اس کے بارے م بالکل نہیں جانتے' وہ تمہیں دیکھے گی بھی نہیں۔ اسے تو سوائے پڑھنے کے کسی چیز سے دلچسپی ہے ہی نہیں۔''

''اچھا.....ایسی بات ہے.....'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

''ہاں نادر' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور پھر اپنے گھرانے کی اکلوتی بیٹی بھی ہے' تم جانو' اکلوتی بیٹی کے والد کا کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہوتا ہے۔ ان کی ماں سے ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تو کسی کروڑ پتی' ارب کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ کہا تھا مجھ سے بڑے رعونت بھرے لہجے میں۔ بھابی' کوئی اچھا سا پائلٹ' کوئی معرو سا بیورو کریٹ بتائیں۔''

''آپ اپنے بھائی کا نام دے دیتیں۔''

''کاش تو اس قابل ہوتا تو ضرور لیتی.....ورنہ ثنا جیسی لڑکی تو کسی خوش قسمت گھرانے میں جائے گی۔''

''تو آپ مان جایئے' آپ کا یہ بھائی بے حد خوش قسمت ہے۔''

''اچھا جا.....زیادہ باتیں مت بنا۔'' اس کی ہڑ دنگی باتیں سن کر انہیں ہنسی سی آ گئی۔

''آپا.....آپ ثنا کی امی سے جلد بات کریں گی ناں......'' نادر کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں' اس کی ماں نہیں مانے گی۔ میٹرک تو تیری تعلیم ہے' وہ کیسے کر دیں گی اپنی ڈاکٹر سے تیری شادی۔''

''آپا! میں کینیڈا میں رہتا ہوں تو کیا اس کے ''اضافی نمبر'' نہیں ہوں گے۔''

''وہاں ہوٹلوں میں میزیں صاف کرتے ہو' تمہاری جاب وائٹ کالر جاب تو نہیں ہے' جو بطور فخر انہیں بتا جائے۔''

''اور جو میں اتنا وجیہہ ہوں' تو کیا اس کے نمبر نہیں ہوں گے؟''

''پاکستان میں لڑکے کی شکل نہیں دیکھی جاتی۔ اعلیٰ تعلیم اور اچھی جاب کے آگے کالا کلوٹا اور ناٹا سب

۔''

''پا! میں بہت جلد آپ پر یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ وجاہت کے نمبر شخصیت میں سب سے زیادہ گنے ہیں۔''

''را خیال ہے کہ تم اپنی نفی خود کرتے پھرو گے'' انہیں اس کے ہڑ دنگے پن پر ہنسی آ گئی۔

کی شادی کے بعد وہ آپا کے ہاں رہنے آ گیا مگر ہمہ وقت عاشق کے روپ میں۔ ثنا اس کی موجودگی اور انداز دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ چائے کی میز پر اس کی جانب کپ بڑھایا اور نادر نے تے ہوئے اس کی انگلیاں بھی چھو لیں۔

ثنا کے ہاتھ سے پیالی چھلکتے ہوئے بچی۔ ثنا بچی نہیں تھی' وہ ایک سمجھ دار لڑکی تھی۔ نادر کے چہرے اور میں لکھے ہوئے محبت اور دوستی کے پیغام کو صاف پڑھ رہی تھی۔

اس کی ان حرکتوں سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ چلتے ہوئے اس سے مس ہو جاتا۔ اس کا پلو تھام لیتا۔ اس ہوئے مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرتا۔ ذہنی پریشانی رنگ لائی اور وہ اپنے ٹیسٹ میں فیل ہو گئی۔

گلے دن وہ اپنی دوست نیلما کے سامنے اپنی پریشانی لیے بیٹھی تھی۔

''نہیں لگ رہا کہ اب میں رحمان انکل کے ہاں رہ پاؤں گی۔ ان کے سالے کی وجہ سے میں بہت ان فیل کر رہی ہوں۔ پتا نہیں وہ صاحب زادے کینیڈا جاتے بھی ہیں یا نہیں۔ دھرنا تو اس انداز میں مارے ہیں کہ جیسے اب یہیں رہیں گے۔''

''تم ہوسٹل میں آ جاؤ.....وہاں رہ کر تمہیں پریشانی ہی ہو گی۔''

''اس سے زیادہ اور کتنی پریشانی ہو سکتی ہے کہ میں ٹیسٹ میں فیل ہو گئی ہوں۔ آج تک فیل ہونے کا ذائقہ چکھا تھا مگر اس بن مانس کی وجہ سے یہ دن بھی دیکھنا پڑا۔''

''تم کل ہی آ جاؤ۔ وہاں رہو گی تو تم مزید پریشان بھی ہو سکتی ہو۔''

''یک کہہ رہی ہو تم۔ میں جلد از جلد ہوسٹل آنے کی کوشش کرتی ہوں مگر آنٹی' انکل سے کیا بہانہ بتاؤں کہ آپ بدتمیز' بے تکے' پھٹیچر سے بھائی کی وجہ سے میں یہاں رہنا پسند نہیں کرتی۔'' ثنا نے سنجیدگی سے کہا۔

''گل ہو تم بھی' سچی بات بتانے کی کیا ضرورت ہے۔'' نیلما کو اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔

''ھوٹی بات بتاؤں گی تو وہ آنے نہیں دیں گی۔''

''م اپنے انکل سے کہہ دو فائنل ایئر کی پڑھائی خاصی ٹف ہے' اس کے لیے گروپ اسٹڈی کی بھی ضرورت میرا ہوسٹل میں رہنا بہت ضروری ہے۔''

''طاہر بھائی تو ضرور سمجھ جائیں گے۔ کل وہ بھی نادر کو عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل اس کا منہ توڑ دیں۔''

''طاہر اتنا ڈیسنٹ لڑکا اور اس کا ماموں اتنا برا......؟'' نیلما نے پوچھا۔

''ماموں بھانجے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کل تو ناشتے کی میز پر جب میرے برابر نادر نے بیٹھنا بھائی اس کے بیٹھنے سے پہلے خود بیٹھ گئے کیونکہ انہوں نے ایک دن دیکھ لیا تھا' میز کے نیچے وہ میرے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''طاہر کی بیوی آئے گی تو جل جائے گی کہ طاہر تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں۔''

"یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ ان کی شادی سے پہلے میں اپنا میڈیکل کمپلیٹ کر کے انشاء اللہ کراچی جا چکو میرا کسی سے بھی کوئی تعلق نہ ہے اور نہ رہے گا۔"

"بس...... تمہارے مسئلے کا یہی حل ہے کہ تم رحمان انکل سے ہوسٹل میں آنے کا کہہ دو۔ کمرے کا بندوبس کرا دوں گی' پھر ہوسٹل میں آنے کے بعد کراچی گھر میں بتا دینا کہ امتحان کی تیاری کی وجہ سے ہوسٹل شفٹ ہو گ

اگلے دن صبح ناشتے کی میز پر اس نے سب کے سامنے انکل سے ہوسٹل میں جانے کو کہا۔ اس کی اس با رحمان انکل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ثنا بیٹا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے کیا؟"

"نہیں انکل! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس پڑھائی خاصی ٹف چل رہی ہے ان دنوں......" وہ ا جھکائے بول رہی تھی اور طاہر اپنی ماں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا۔ دیکھا ناں...... یہی ہونا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! دو دن اور رک جاؤ پھر چلی جانا" آنٹی نے اس سے کہا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی

نادر دل میں خوش ہو گیا کہ ویلنٹائن ڈے پر اسے سرخ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ ضرور پیش کرے گا

اگلے دن وہ کالج سے آئی تو نادر سامنے گیٹ پر بیٹھا اس کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ جب متواتر تین دن وہ ا نہیں آیا تو وہ طاہر سے پوچھ بیٹھی۔

"نادر بھائی نظر نہیں آ رہے؟"

"وہ کینیڈا واپس جانے والے ہیں۔ نانی کے گھر میں ہیں وہ۔"

"اوہ......!" ایک گہرا سانس اس کے منہ سے خارج ہوا۔

"ہوسٹل جانے کا پروگرام تو کینسل سمجھوں ناں......" طاہر نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں...... وہ تو مجھے جانا ہے" اس نے مصنوعی لہجے میں کہا۔

"اب اپنے بھیا کے سامنے بھی جھوٹ بولو گی؟"

"آپ کہتے ہیں تو میں نہیں جاتی......" وہ ہنس کر بولی۔

اور اسی لمحے طاہر کی منگیتر بیلا گھر میں داخل ہوئی تھی' اس نے ثنا کا یہ جملہ سن لیا۔

اف...... اتنی قربت ہے ان دونوں میں کہ ایک دوسرے کا اتنا کہنا مانا جا رہا ہے۔ یکبارگی وہ سر تھام کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ثنا کا محبت سے منور چہرہ دیکھے۔

"نادر بھائی کینیڈا کیوں جا رہے ہیں؟" ثنا نے پوچھا۔

"میں نے اور ابو نے ان سے کہا تھا کہ آپ کا خاصا نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کب تک پاکستان میں رہیں گے' جائیے اور اپنی جاب سنبھالیے۔"

ثنا نے طاہر کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں نے اچھا کیا ناں......؟" اب طاہر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"بہت اچھا کیا......" ثنا اس کی بات کا مطلب سمجھ کر کھلکھلا اٹھی۔

بیلا کے کانوں میں اس کا قہقہہ زہر سا گھول۔ اس نے باہر راہداری میں کھڑے کھڑے کچھ سوچا قدموں واپس لوٹ گئی۔ اس کے آنے اور جانے سے طاہر اور ثنا قطعی لاعلم تھے۔

☆☆☆

قریہ معرفت جہاں تک ہے
منزل عشق بھی وہاں تک ہے
دل کی دیوانگی یہ پوچھتی ہے
ہوش کی سلطنت کہاں تک ہے

"اری منہ سے کچھ تو پھوٹ (بول)۔ جب سے آئی ہے' تنتناتی دوئی گھوم رہی ہے۔" جمیلہ بیگم نے اپنی بیٹی کہا۔

"جہنم میں جھونک دیا ہے آپ نے مجھے۔ اس کے سوا میں اب کہہ بھی کیا سکتی ہوں۔ طاہر جیسا آپ کو نظر وہ ویسا ہرگز نہیں ہے۔ منگنی اس کی میرے ساتھ ہوئی ہے اور شادی وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ کرے

"اری کیا تو بالکل پاگل ہو گئی ہے؟ جانتی نہیں ہے' اپنے رحمان انکل کو...... کس قدر شریف اور وضع دار شخص تمہارے باپ کے سوتیلے بھائی ہیں مگر سگوں سے زیادہ خیال رکھنے والے۔ میں جو بات بھی کہہ دوں' اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا ہے۔ ایسے شریف لوگ دنیا میں بھلا کہیں دیکھے ہیں کسی نے...... اور ایسا ہی ماشاء طاہر ہے' نیک اور شریف...... اور ایسا پیارا کہ اسے بس دیکھتے ہی رہو اور دل نہ بھرے۔ جب سے منگنی وہ میرا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ کیا کوئی داماد اپنی ساس کا رکھے گا...... اور جب شادی ہو جائے گی تو مجھے ماں ہی سمجھے گا۔ بہت شریف لڑکا ہے' ایسے لڑکے کہیں نظر نہیں آتے۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ ایسا والا ہے۔"

"کا شریف ہے' لڑکا شریف ہے' میرے تو کان پک گئے ہیں آپ کی باتیں سنتے ہوئے مگر ہوا وہی جو ہونا اب ماں کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ اس کا ضبط شاید جواب دے گیا تھا۔

"ارے ہوا کیا؟ صاف صاف بتا۔ طاہر کس کو لے کر بھاگ گیا یا تیری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ ہر وقت بکواس لی تیری پرانی عادت ہے۔"

"بھاگا نہیں تو بھاگ جائے گا۔" وہ پیر سے سینڈل اچھالتے ہوئے بولی۔ دوپٹا اور پرس پہلے ہی کارپیٹ پر چکی تھی۔

"اللہ! تیرے تو بہتان ہی ختم نہیں ہوتے۔ خواہ مخواہ کی پریشانیاں نہ صرف پالتی ہے بلکہ انہیں عہد بلوغت پہنچاتی ہے ظاہر ہے ایسے میں یہ پریشانیاں ناگ بن کر ہی ڈستی ہیں۔ اری کیوں اپنے آپ کو ایذائیں ایسی باتیں کر کے' کبھی خاموش بھی بیٹھا کر۔"

"ہزار دفعہ کہا ہے میرے ساتھ بقراطی لہجے میں بات مت کیا کیجیے۔" وہ روہانسی سی ہو گئی تھی۔

"آ میرے پاس بیٹھ۔ اب بتا کیا بات ہے؟" ماں نے بیٹی کو اپنے پہلو میں بٹھا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تو

مجھے سچ سچ بتا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟''

''نظر تو مجھے کافی دنوں سے آرہا تھا مگر آج میں نے اپنے کانوں سے بھی سن لیا ہے۔ طاہر اپنے گھر ہوئی خوبصورت بلا شا کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے میری منگنی جلد ہی ٹوٹ جائے گی اور وہ منگو لے اڑے گی۔ آپ ایسا کچھ کیجئے کہ آنٹی' انکل جلد شادی کر دیں۔''

''ایسا تو میں پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکی ہوں مگر انہوں نے صاف منع کر دیا ہے۔ پتا نہیں انہیں تیری بی ڈگری کیوں اتنی اہم لگتی ہے؟''

''امی! جو لوگ پڑھائی کی آڑ لیتے ہیں ان کے دل میں فتور کا بیج ضرور ہوتا ہے اور اب یہ بیج نہ صرف کی شکل اختیار کر گیا ہے بلکہ پھل پھول بھی دینے والا نظر آرہا ہے' اس سے پہلے کہ بازی الٹ پلیز...... امی! آپ کچھ کیجئے ورنہ پانی سر سے گزرنے والا ہے...... ہاں!''

''میری سمجھ میں تو نہیں آرہا کہ کیا کروں' دیکھ تو سہی مارے ہول کے میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے سے ہو انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کہہ دیں کہ آپ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔'' بیلا نے چٹکی بجا کر سرشار سے لہجے میں کہا جیسے اس مسئلے کا واحد حل ہو۔

''مگر مجھے تو نہیں ہوا؟'' (اب ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنی شروع ہو گئیں)

''کہنے میں حرج کیا ہے۔ اس سے آپ کی بات میں وزن ہو گا کہ صحت مند شخص کی استدعا کے مقا بیمار شخص کی التجا ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ پہلے پرانے بڈھے مرتے دم بھی بہت سے فیصلے کر جاتے تھے۔''

''پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔ بری بات منہ سے کیوں نکالتی ہے؟ اور اگر سچ مچ مجھے کچھ ہو گیا تو پھر...... کہیں کی نہیں رہوں گی۔ منی خالہ کی بات یاد ہے' ہمیشہ اپنے میاں سے کہتی تھیں' میرے ہاتھ سن ہو گئے سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے' ان کے میاں بے چارے ان کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر پریشان ہو جاتے سب کام چھوڑ کر ان کی ناز برداری میں جت جاتے تھے اور وہ سب کو خوب ہنس ہنس کر سنایا کرتی تھیں کہتی تھیں' گلو کو الو بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر ایک دن جب انہیں سچ مچ کا فالج ہو گیا تو ان کے باؤ پر یقین ہی نہیں کر رہے تھے۔ نا بابا ناں میں تو کبھی نہ کہوں' کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔''

''اگر ہو بھی گیا تو اس سے برا تو نہیں ہو گا کہ شنا طاہر کو لے کر اڑ جائے۔''

''نہیں اڑ سکتی وہ' طاہر بہت شریف ہے۔''

''میں جو کہہ رہی ہوں کہ اب وہ شریف نہیں رہا' پھر بھی آپ کو یقین نہیں آرہا ہے۔''

''اچھا...... اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کراتی ہوں اور اسے کچھ پیسے د ہوں کہ ایسا اپنے لیٹر ہیڈ پر لکھ کر دے کہ مجھے انجائنا کا سخت اٹیک ہوا ہے۔''

''ہاں' یہ ہوئی نا بات۔''

''اب میں سنبھالتی ہوں بستر' اور تم اپنے کالج سے چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاؤ اور ماں کی تیمارداری کر مزے مزے کے کھانے پکا کر مجھے بستر پر کھلاؤ'' جمیلہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

''ہاں' پہلے تم رونا بلکنا فون تو کر دو تا کہ وہاں بھی ہلچل سی مچ جائے'' انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

☆☆☆

بات ملنے کی بار بار کرو
میں خزاں ہوں مجھے بہار کرو
زندگی دھوپ میں گزاری ہے
اب تو سائے سے ہمکنار کرو

لی امی اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ ان کے سرہانے میز پر بہت سی دوائیں رکھی تھیں۔ کمرے کی پوری فضا ی تھی۔

ماں کے پاس مغموم سی بیٹھی تھی۔ رومال سے بار بار آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ رحمان صاحب اور ان کی بیگم رے میں موجود تھے۔

''ابی کی طبیعت ایکا ایکی اتنی خراب ہو گئی اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔ اور آج تین دن بعد تم نے ہمیں حد ہے آخر۔''

''یا بتاتی انکل! منگل کی رات 2 بجے یہ بے ہوش ہو کر بیڈ سے نیچے گری ہیں۔ میں نے پڑوس کی آنٹی کو ن کے شوہر نے گاڑی نکالی اور وہ اسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تو معلوم ہوا یہ ہارٹ ھا۔ امی ہاتھ میں درد کی شکایت تو کر رہی تھیں مگر مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کی اتنی طبیعت خراب ''

''ابی! اب سرجری بڑی ایڈوانس ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بائی پاس کروا لیں گے اور......''

''نہیں بھیا! آپریشن سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ جتنی زندگی ہو گی' وہ ہر حال میں جیوں گی۔ بس بیلا کا فرض پورا ے تو چین سے سوؤں گی۔ اب تو یہی پریشانی ہے کہ بیلا کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔'' انہوں نے ان صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لا ہماری بیٹی ہے...... اور یہ کوئی پریشانی تھوڑی ہے۔ پہلے آپ کی طبیعت ٹھیک ہونی چاہیے کہ آپ کی ہمیں پہلے عزیز ہے۔ آپریشن تو آپ کو کروانا ہی ہو گا۔ میں خود کسی اچھے سے سرجن سے بات کرتا ہوں۔''

''مان بھیا! ڈاکٹر نے احتیاط کرنے کو کہا ہے۔ ابلی ہوئی سبزیاں کھانے کو کہا ہے۔ کولیسٹرول کم ہو گا تو اللہ آئندہ اٹیک کا خطرہ بھی کم رہے گا۔ اب میری فکر کرنے کے بجائے اپنی بہو لے جانے کی فکر کریں ''

''آپ کہیں تو ہم کل ہی لے جاتے ہیں مگر دو ماہ بعد طاہر کا ایم۔ کام کا امتحان بھی ہے۔ اس سے ذرا فارغ شادی کے بعد باہر گھومنے پھرنے بھی بہ آسانی جا سکتا ہے۔ جیسے آپ کہیں' ہمیں آپ کی ہر بات قبول ''

بیگم نے پانی کا گلاس منہ سے لگانے سے قبل بیلا سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔ اس نے ماتھے پر اں یوں لہرائیں جیسے ماتھے پر آئے ہوئے بال سمیٹ رہی ہو۔

وہ نقاہت بھری آواز میں یوں گویا ہوئیں ''مجھے طاہر کا زیادہ خیال ہے اس لیے دو ماہ بعد شادی زیادہ ہے گی۔ ہاں' اس اثنا میں اگر مجھے کچھ ہو جائے تو یہ وعدہ کر لو' مجھے بعد میں دفناؤ گے' پہلے بیلا کا نکاح ساتھ کرو گے۔''

''ابی جان! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ بیلا ہمارے لیے کیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ ہے آپ کو۔''

مسز رحمن اب ان کے ہاتھ پکڑے بیٹھی تھیں اور بیلا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”یہ ہمارے گھر کی شہزاد ہمارے اکلوتے بیٹے کی پیاری سی دلہن‘ جس کو دیکھ کر ہم خوش ہوا کریں گے۔“

”یہی تو مجھے اطمینان ہے کہ میری بچی اپنے گھر میں جا رہی ہے۔ جہاں سب لوگ اس سے محبت والے ہیں۔“

”امی! اب مجھے پورا یقین ہے‘ آپ کی طبیعت از خود ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ نے جو یوں اتنے دنو بستر پر ڈیرا جما رکھا ہے‘ وہ بھی ختم ہو جائے گا اور آپ پہلے کی طرح ہو جائیں گی“ بیلا نے ماں کے پا ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں‘ تمہاری خوشیاں مجھے سرشار کر دیں گی‘ تب یہ بیماری بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”انشاء اللہ‘ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ مسز رحمان ان کے بالوں کو چہرے سے ہٹا کر سہلا ہوئے بولیں۔

”انشاء اللہ! اب تو اٹھنا ہی پڑے گا۔ دو ماہ بعد بیٹی کی شادی ہے‘“ جمیلہ نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔

”اب طاہر کو بھی جا کر بتا دیں کہ اس کی شادی جلدی ہو رہی ہے ورنہ وہ تو ایک سال بعد کے چکر میں رحمان صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

”میں بھی اتنی جلدی کہاں چاہ رہی تھی۔ سوچا تھا‘ بیلا کا کم از کم بی اے تو ہو جائے مگر لگتا ہے طاہر کی میں اتنی ہی تعلیم والی لکھی تھی۔“ جمیلہ بیگم نے اپنے لہجے میں افسردگی گھول کر کہا۔

”ایسا نہ کہیں بھابی! طاہر کو بے حد شوق ہے‘ اس کی بیوی پڑھی لکھی ہو۔ بیلا کو شادی کے بعد پڑھنا ہو گا۔“

”آنٹی! مجھے خود شوق ہے پڑھنے کا۔“ بیلا نے شرماتے ہوئے انداز میں کہا۔ (وہ کسی قسم کا رسک لینا نہیں تھی)

جمیلہ بیگم نے آنکھ کے اشارے سے اسے کمرے سے جانے کو کہا اور اس کے جانے کے بعد بولیں۔

”میں تو سادگی سے ہی شادی کر پاؤں گی‘ میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ بازار میں ماری ماری پھرو

”یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ بیلا کے لیے کچھ کریں۔ اللہ نے ہمیں بے حد نوازا ہے‘ اور وہ سب طاہر کے لیے ہی تو ہے۔“

”پھر بھی دل تو چاہتا ہے کہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ کیا جائے۔ آج اس کے باپ دوسری شادی کے چکر پڑتے اور امریکا سے واپس آ جاتے تو بہتیرا کچھ ہوتا مگر وہ تو وہاں جا کر ایسے بھولے کہ پلٹ کر ہی نہیں آ دشمنوں نے یہ اڑا دی کہ میں نے ان سے خود خلع لیا تھا اس لیے وہ پریشان ہو کر گھر سے ایسے نکلے کہ واپ کر نہ آئے‘ جبکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت کے ہمیشہ سے دلدادہ تھے۔ مجھ سے شادی ان کے کتنے اسکینڈل میرے سامنے آئے اور میں مارے شرم کے چپ رہی‘ کبھی ان کو بے عزت نہ کیا۔ آج وہ ڈالر میں کھیل رہے ہیں اور ہم......“ انہوں نے آہ بھری۔

”چھوڑیں بھابی! جو ہوا سو ہوا۔ اب آپ اپنے گھر کی خوشیوں کو دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ بیلا کو سدا خوش سہاگن رکھے۔ آپ اپنا ذہن خواہ مخواہ بھاری نہ کریں۔“

”میرا تو رواں رواں دعا گو ہے اپنی بچی کے لیے۔“ جمیلہ بیگم اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں

ال

”ولا! تم شادی اور ولیمے کے لیے اپنی پسند کے جوڑے کسی بھی بوتیک سے بک کروا لو‘ پے منٹ میں کر دوں سز رحمان نے چلتے ہوئے کہا۔

”او کے آنٹی!“ بیلا انہیں گیٹ تک چھوڑنے بھی گئی۔

ان دونوں کے جاتے ہی ماں بیٹی قہقہہ مار کر لگیں باتیں بنانے۔ ہنسی ان کے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ لو بے وقوف بنانے میں ان دونوں کو ملکہ حاصل تھا۔

”یہ لوگ اسی قابل تھے کہ انہیں یہ ڈراما دکھایا جاتا۔ شادی کا معاملہ آگے بڑھاتے جا رہے تھے (کمینے کہیں ای! مجھے تو ڈر لگ رہا تھا‘ یہ ثنا کہیں طاہر کو قابو نہ کر لے۔“

”کیوں نہ کرتی قابو وہ‘ گھر کے سارے افراد کو تو اپنا بنا لیا ہے اس لڑکی نے۔“

”اب دیکھو‘ کتنا تلملائے گی وہ......“ بیلا نے ہنس کر کہا۔

”شادی کے بعد ہی اس کا پتا صاف کرنا ہے تمہیں“ جمیلہ بیگم نے ہنس کر کہا۔

”نہیں امی! میں ہر کام سوچ سمجھ کر کروں گی۔ آپ نے ابو پر اتنے بہتان لگائے کہ دوسرے شہر جا کر انہوں ادی کر لی۔ وہ تو آپ کی کہانیاں اتنی ڈرامائی تھیں کہ سارے خاندان کو یہ یقین آ گیا کہ وہ امریکا جا کر عیش رت میں پڑ گئے اور اپنی بیوی اور بچی کو بھول گئے۔“

”ایسا نہ کرتی تو کیا تمہاری دادی یہ شاندار مکان‘ جس کے چار کرائے کے پورشن ہیں میرے نام کرتیں۔ دو کانیں مجھے دیتیں‘ ہرگز نہیں۔ تمہارے جھکی قسم کے باپ کے مرنے سے یہ فیض ہمیں پہنچا ہے کہ اس کے گھر لی نے مارے شرمندگی یہ جائیداد ہمارے نام کر دی ورنہ میں تو کبھی ان کی پسندیدہ بہو نہیں تھی۔“

”مگر یہ آئیڈیا تو بالکل میرا اپنا تھا کہ آپ کا ہارٹ اٹیک کر دیا جائے ورنہ رحمان انکل شادی کے لیے اتنی ی نہیں مانیں گے۔“

”ہونہہ‘ خواہ مخواہ کی شرط! لڑکی بی اے ضرور ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرا انٹر بھی کلیئر نہیں ہوا تھا“ بیلا اس کر ماں سے کہا۔

”کون سی ڈگریاں چیک کرے گا طاہر! جو اسے کبھی پتا چلے گا۔“

”ں امی‘ ایک غلطی ہو گئی ہے‘ ہم نے رحمان انکل سے یہ کہہ دیا کہ پڑوس کے انکل آپ کو اسپتال لے کر ے۔ اگر کبھی رحمان انکل نے ان سے آپ کی بیماری کے بارے میں کچھ پوچھ لیا تو وہ تو صاف منکر ہو جائیں

”ارے ہے‘ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں کل پڑوس میں جا کر خود بتا دوں گی کہ ل کی تکلیف چل رہی ہے‘ اسی وجہ سے بیلا کی شادی جلدی کرنا پڑے گی‘ اور ایک رات تو مجھے اپنے کرائے دار ساتھ اسپتال میں جانا پڑ گیا تھا تا کہ بات بھی کھلنے والی رہے۔“ جمیلہ نے ہنس کر کہا۔

”امی طاہر بہت اچھے ہیں‘ میرا بہت خیال رکھتے تھے مگر جب سے ان کے ہاں وہ بلا آئی ہوئی ہے انہوں نے بھی بند کر دیے ہیں۔ میں فون کروں تو بات کر لیتے ہیں‘ خود سے نہیں کرتے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شادی کے بعد ہر مرد پاگل سا ہو جاتا ہے۔ جو بیوی کہتی ہے‘ وہی دکھائی دیتا ہے‘ جو لی ہے وہی سنائی دیتا ہے۔ تم اس کے کان میں ثنا کے خلاف ایسا زہر بھرنا کہ اسے اس کی شکل سے نفرت

ہو جائے اور ثنا کو وہاں سے بھاگنے کے علاوہ کوئی راہ نظر نہ آئے۔"

"بے فکر رہیے امی! میں آپ ہی کی بیٹی ہوں' ایسا کھیل کھیلوں گی کہ آنٹی انکل صرف میرا ہی کلمہ پ اور وہ ثنا تو ایسی فنا ہو گی...... کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"جیتی رہ میری بچی! تو نے تو میرا دل خوش کر دیا" جمیلہ بیگم نے پٹاری قریب کر کے پان کا ٹکڑا ڈ رکھتے ہوئے کہا۔

تب بیلا از خود مسکراتے ہوئے گنگنانے سی لگی کہ اس وقت اس کے من میں خوشیوں کے پھول سے ک تھے۔

وہ میرے دل میں رہتا ہے گل امید کی صورت
زمانے کی شب تاریک میں خورشید کی صورت

☆☆☆

علم کچھ بھی نہیں کسی کو یہاں
سب کو دعویٰ ہے جانتے کچھ ہیں

فریال کا بوتیک عروسی ملبوسات کی تیاری میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا اور شہرت بھی زیادہ تھ ملبوسات کا آرڈر بک کروانے جو لڑکیاں اس کے بوتیک پر آتی تھیں سب ہی کی یہ خواہش ہوتی تھ عروسی جوڑا شاندار سا ہو' جس کو پہن کر وہ سب میں نمایاں سی لگیں۔ لڑکیوں کی اس ٹائپ کی باتوں کی تھی۔

مگر بیلا کچھ مختلف ترین کلائنٹ ثابت ہو رہی تھی۔

"میرا لباس مجھے اٹھائے کہ پوری تقریب میں مجھ جیسی کوئی نظر نہ آئے' سب کی نظریں مجھ پر ہو علاوہ کوئی نظر نہ آئے۔ لباس ایسا ہو کہ میرے شوہر کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور میرے سوا اسے کوئی ن آئے۔"

"دولہا کو اپنی دلہن کے سوا نظر بھی کہاں آتا ہے" فریال نے ہنس کر کہا۔

"مگر میرے منگیتر کو ایک بلا نے گھیر رکھا ہے۔ اس نے اس کو قابو کر رکھا ہے۔ اس کے سوا اسے ک نہیں آتا۔"

"پھر وہ تم سے شادی کیوں کر رہا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتا ہے' اسی سے شادی کر لیتا" فریال ہمدردی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ نیچ سی لڑکی ہے' وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ یوں بھی وہ لڑکیاں جو آسانی سے حاصل ہو کے ساتھ زندگی تھوڑی بتائی جاتی ہے۔ انہیں تو جو مسکرا کر دیکھ لے' اسی کی ہو جاتی ہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہے" فریال کے چہرے پر بھی ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ محبت میں پاگل ہونے والیوں ک ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔" "یہ دیکھیے' یہ لباس خاصا قیمتی ہے۔ اس کو پہن کر آپ ایک مغلیہ شہزادی سی ل فریال نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ فراک دکھائی۔

"شہزادی تو میں ضرور لگوں گی مگر میاں صاحب بھی شہزادہ سلیم جیسی خو بو رکھتے ہیں۔ اپنی کنیز سے تو پیچھا نہیں چھڑائیں گے۔" (وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنس دی)

"شہزادی شہزادی ہوتی ہے اور کنیز کنیز۔ اس کی حقیقت تو کم ہی ہوتی ہے' آپ کیوں گھبرا رہی ہیں۔"

"جب تک وہ دفان نہیں ہو گی' مجھے چین نہیں پڑے گا۔ کاش میں اسے زہر دے سکتی" وہ دھیمے سے [illegible]

"آخر ہے کون وہ؟" فریال بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"وہ طوائفیں جو پس پردہ رہتی ہیں' ان میں سے ایک ہے۔ ان کا تو کام ہی یہی ہے جہاں شکار نظر آیا جال ال پھانس لیا۔"

"اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"بلایات ہوتی ہیں اس ٹائپ کی لڑکیاں' کسی سے چمٹ جائیں تو پیچھا بہت مشکل سے چھوڑتی ہیں۔"

"اچھا' کب ہو رہی ہے تمہاری شادی!"

"دو مہینے بعد کی تاریخ ٹھہری ہے۔"

"اتنی جلدی تم اپنا لباس کیوں تیار کروا رہی ہو۔"

"آئی تو میں صرف دیکھنے کے لیے تھی مگر یہ ڈیزائن مجھے حد سے زیادہ پسند آ گیا ہے' میں ایسا ہی لباس لوں گی۔ آج آپ میرا آرڈر بک کر لیجیے مگر آپ سے دو ماہ بعد میں لوں گی' ہاں ٹرائی لینے کب آؤں؟"

"دو ویک بعد......؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا...... اس ڈیزائن کو آپ کبھی ری پیٹ نہ کریں" بیلا نے مسکرا کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟"

"میرے جیسا لباس بعد میں بھی کوئی نہ پہنے۔"

"ہمارے ہاں لباس میں انفرادیت رکھی جاتی ہے۔ دوسرا لباس جب تیار ہو گا' بے شک اس ڈیزائن سے [illegible] سی ہو مگر اس میں کوئی اور نئی چیز ہو گی' اس لیے تم مطمئن رہو کہ تم جیسا کوئی نہیں لگے گا۔"

"آپ بہت اچھی ہیں' آپ کا کیا نام ہے" سرشار سے لہجے میں وہ بولی۔

"مجھے فریال کہتے ہیں۔"

"کیا آپ میری دوست بنیں گی؟"

"میرے بوتیک پر جو آئے وہ میرا دوست ہی ہوتا ہے۔"

"آپ میری شادی پر آئیں گی؟"

"اس سلسلے میں معذرت خواہ ہوں' میری مصروفیتیں مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتیں۔ نو بجے کے بعد تو بوتیک سے گھر جاتی ہوں۔ وہاں جا کر پھر کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اپنی دوستوں کی تقریبات میں بھی آپ نہیں جاتیں۔" اس کا لہجہ ہلکا سا شکوہ لیے ہوئے تھا۔

"نہیں......" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ وہ آگے بڑھ گئی۔ اس قسم کی چپکو کلائنٹ کو وہ ہمیشہ ایک فاصلے پر رکھا [illegible] اور یوں بھی اسے گھومنا پھرنا بالکل بھی پسند نہیں رہا تھا۔ گھر جا کر وہ ہوتی اور صادقہ باجی۔ اور وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتیں اور جب تھک جاتیں تو تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیا کرتیں۔ [illegible] کو مشکل سے آتی تھی۔ اکثر راتیں جاگنے میں کٹ جاتی تھیں۔ زندگی کا سفر دھیرے دھیرے گامزن تھا [illegible] اگلی منزل کیا ہو گی اس سے وہ قطعی ناآشنا تھی' قطعی بے خبر تھی۔ اس کی زندگی ان اشعار کی مکمل تفسیر تھی۔

کون تھا جس سے اپنا دکھ کہتی
آئینے پر ہی سر رکھا‘ رولی
اب نہ وہ خواب ہیں‘ نہ وہ نیندیں
بچپنے میں جو سوتا تھا‘ سولی

(حمیدہ شاہین

☆☆☆

ہم سفر ہاتھ تھام کر نہ چلا
ٹھوکروں نے بہت نڈھال کیا

صبح اس کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس ٹوٹا‘ راستے میں کالی بلی راستہ کاٹ گئی۔ پھر بائیں آنکھ پھڑکی۔ طبیعت میں بھی اس دن بے کلی زیادہ تھی۔ دکان پر بھی سارا دن دل نہیں لگا تھا۔ بات ذرا سی تھی۔ فرحت کے بچے اس دکان سے ٹافیاں لینے آتے تھے۔ (اکثر آیا کرتے تھے)

اس نے یوں ہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا ”یہ آج اتنی ساری ٹافیاں کیوں خرید رہے ہو؟“

تو وہ بچے بڑے مان سے بولے۔ ”یہ ٹافی کا پیکٹ ہم شجاع ماموں کے بیٹے ارحم کو دیں گے۔“

اس کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا مگر پھر بھی وہ بات کو سنبھالتے ہوئے بولا ”شجاع کا بیٹا تو ابھی بہت چھوٹا ہوگا۔ اتنے چھوٹے بچے ٹافی کہاں کھاتے ہیں“ یہ کہہ کر وہ کھسیائی ہوئی ہنسی بھی ہنس دیا تھا۔

”چاچا! آپ کو کیا پتا‘ ہمارے ماموں کا بیٹا کتنا تیز ہے۔ کوئی چیز اسے دکھاؤ تو فوراً لپکتا ہے۔“ یہ کہہ کر۔ تو اڑن چھو ہو گئے تھے مگر اشرف کی وحشتوں میں اضافہ سا ہو گیا تھا۔

”اب میری یہ اوقات ہو گئی‘ ٹانگ برابر کے بچے آ کر مجھ سے یہ کہنے لگے ہیں کہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ شاید اب یہ بات محلے کے بچوں کو بھی معلوم ہو گئی ہے کہ مجھے بچوں کے بارے میں معلومات نہیں ہیں کہ کب لپکتے ہیں‘ کب بیٹھتے ہیں اور کب پہچانتے ہیں‘ جب ہی تو بچے اتنی بڑی بات کہہ گئے۔“

اس کا دل جب زیادہ گھبرایا تو وہ وقت سے پہلے ہی دکان بند کر کے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی مگر وہ ادھر سے ادھر بلا ارادہ گھومتا رہا۔ سکون اسے کسی طرح نہیں رہا تھا۔ راستے میں کوئی کانٹا اس کے پیر میں چبھا مگر اس کو احساس تک نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح گھنٹوں چلتا رہا۔

جب وہ گھر آیا تو اس کا پیر خون سے لت پت تھا اور کانٹا بدستور اس کے پیر میں موجود تھا۔

”ارے یہ کیا ہوا؟ کہاں چوٹ لگی ہے آپ کو؟“ فرح اس کی سفید شلوار پر خون کے بڑے بڑے دھبے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ تب اس نے چونک کر پیر کو دیکھا اور ایک جھٹکے سے کانٹا نکال کر پھینک دیا۔

”اللہ...... پورا پیر سوج گیا ہے آپ کا“ فرح اس کے پیر کو لوٹے سے دھارتے ہوئے پریشان سے لہجے میں بولی۔

”کانٹا تھا نکل گیا......“ وہ بے پروائی سے بولا اور اس کے دماغ میں شجاع کا ہنستا مسکراتا‘ ہاتھ چلاتا‘ چیزوں کی جانب لپکتا ہوا گل گوتھنا سا بچہ در آیا۔

”کتنا خوش نصیب ہے یہ شجاع‘ گھر آ کر اس کا کتنا دل لگتا ہوگا۔ اپنے بچے کو دیکھ کر وہ ساری تھکان بھول جاتا ہوگا۔“

”آپ ڈاکٹر کو دکھا دیں‘ اپنا پیر تو دیکھیں کیسا ورم آ گیا ہے اس پر“ فرح نے اس کے پیر کو تولیے سے چھپاتے ہوئے ملائمیت بھرے لہجے میں کہا۔

”پاگل ہو گئی ہے کیا تو‘ اتنا نازک سمجھ لیا ہے مجھے کہ کانٹا چبھ جائے تو ڈاکٹروں کے پاس دوڑتا پھروں اب کل کو تو مجھ سے یہ بھی کہنے بیٹھ جائے گی دوپٹا کاڑھتے ہوئے سوئی کھچ دینی سے انگلی میں چبھ گئی ہے ڈاکٹر کے پاس لے چلو...... تو کیا میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا؟ حرام کی کماتا ہوں جو ڈاکٹروں کے وظیفے باندھ دوں‘ جھلی کہیں کی۔“

”میں تو آپ کے پیر کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ اپنے پیر کی حالت تو دیکھیے آپ...... ہاں‘ وہ کانٹا نہیں تھا‘ زنگ لگی ہوئی کیل تھی۔“

”یہ میرا پیر ہے‘ میں اس کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں۔ کانٹا ہو یا کیل‘ کوئی بھالا نہیں تھا جو میں شوروغل مچاتا پھروں گا۔“ وہ اس کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے‘ جیسی آپ کی مرضی‘ میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی جی!“

”مت بولا کر ایسے ہی۔ میرا اس پیر کا تیس سال سے ساتھ ہے‘ اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

اگلے دن جب اشرف سو کر اٹھا تو نہ صرف اس کا پیر پورا سوجا ہوا تھا بلکہ اسے چلنے میں بھی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ پہلے آپا نے معائنہ کیا اور کہا ”لگتا ہے گرم گرم ریت پر ننگا پاؤں رکھا ہے۔ چنبیلی کا تیل مل دو۔ یہ ورم کانٹے کی وجہ سے نہیں ہے۔“ فرح نے اس کے پیر پر تیل لیپ دیا۔

تیل ملنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیر پر سرخی مزید بڑھ گئی۔ ذرہ بھر بھی افاقہ نہیں ہوا۔ اماں نے معائنہ کیا تو ان کی رائے یہ تھی۔ ”کسی کیڑے نے کاٹا ہے۔ گرم گرم پیاز باندھ دو‘ ابھی دو گھنٹے میں ورم اتر جائے گا اور آرام بھی آ جائے گا۔“

فرح نے پیاز گرم کر کے پٹیوں کی مدد سے باندھ دی اور جب پٹی کھولی گئی تو پیر مزید بھاری ہو گیا تھا اور اب اس میں چمکیں بھی شروع ہو گئی تھیں اور اشرف نے ہائے ہائے کے نعرے بھی لگانے شروع کر دیے تھے آخر الی۔

نانی اماں نے اپنا چشمہ چڑھا کر پوری ٹانگ کا معائنہ کیا۔ ٹانگ پر جگہ جگہ انہیں نیلے نیلے دھبے بھی نظر آ گئے۔ ”یہ صدقے کی کسی چیز کو پھلانگ کر گیا ہے۔ اس کا چنے کی دال سے صدقہ اتار دو اور تین جمعرات تک ایسا کرو تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اشرف! کیا تو نے کسی شے کو پھلانگا تھا؟“ اماں نے پوچھا۔

”شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کہاں گھوم رہا ہوں اور کیوں گھوم رہا ہوں۔ میرے حواس ایسے تھے جو مجھے اڑائے لیے پھر رہے تھے۔ میں کہاں کہاں گیا‘ یہ بھی یاد نہیں ہے۔“

”اب تو یہ بالکل صاف اشارہ ہے کہ جس چیز پر سے اشرف پھلانگ کر گیا ہے‘ اس پر جادو بھی کیا گیا تھا۔ لوگ چوراہوں پر‘ سڑکوں پر ایسی چیزیں ڈال دیا کرتے ہیں تاکہ ان کی صحت اچھی ہو جائے اور ان کی بیماری دوسرے کو لگ جائے۔“ نانی اماں کا لہجہ حتمی تھا۔

”ہائے اللہ‘ اب کیا ہوگا۔ پتا نہیں کس کم بخت نے یہ سب کیا ہے؟“ اماں نے چھاتی پیٹ کر دوہائی دی۔

”اللہ میرے بھیا کا کون دشمن ہے؟“ بہنوں نے بھی سر ملائے۔

''پریشان مت ہو۔ ابھی اشرف کی نانی زندہ ہے' اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے لڈن خالو کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا' ایمان سے۔'' ہماری اچھی خالہ تو بے چاری مرتے مرتے بچی تھیں مگر جادو کا اتار ہو گیا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سمجھاتی ہوں کہ کبھی کسی چیز پر سے پھلانگ کر نہیں گزرتے۔ آج کل کسی کا کوئی پتا تھوڑی ہے کہ کون دوس ہے اور کون دشمن۔'' نانی اماں نے فرح کو کانی نظروں سے دیکھتے ہوئے اماں کو دیکھا۔

اشرف کی ٹانگ دو ہفتوں میں بری طرح پک گئی۔ اس اثنا میں گاؤں کے کمپاؤنڈر کو دکھایا تو اس نے ٹیکہ لگا کر پٹی باندھ دی۔ دو پیلی' دو لال اور دو سفید گولیاں تینوں ٹائم کھانے کو دیں مگر کسی دوا سے کوئی افاقہ نہ تھا۔

اشرف کے پاؤں کی سوجن بڑھتی چلی جا رہی تھی اور آرام رتی بھر کا نہیں تھا۔ اس کی دکان مسلسل بند تھی جس کو پتا چل رہا تھا' اسے دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔ شجاع کو پتا چلا تو وہ بھی آیا۔ اس وقت اشرف اپنے کمرے میں لیٹا تھا (ورنہ سارا دن بیٹھک میں لیٹا رہتا تھا) شجاع کے آنے کا سنا تو فرح کو اندر جانے کو کہا اور اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''یار' تیرے پیر کی حالت تو خاصی خراب ہے۔ کاموکی کے قریب ایک بڑے اچھے حکیم ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ تم وہاں دکھا دو۔''

''یار! میں اس حالت میں کاموکی کیسے جا سکتا ہوں۔ دو قدم مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔ میں بسوں میں کیسے جا پاؤں گا؟''

''اشرف! تو فکر کیوں کرتا ہے' پرائیویٹ گاڑی کا انتظام میرا۔ کل صبح تیار رہنا' میں تم کو لے کر حکیم صاحب کے پاس چلوں گا۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' اشرف نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا تب شجاع اسے دلاسے دے کر گھر لوٹ آیا۔ نہ فرح اسے نظر آئی اور نہ ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

اگلی صبح جب وہ اشرف کو لینے گیا تو بڑی سی چادر لیے فرح اپنی ساس نندوں کے ساتھ اشرف کو خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھی۔

شجاع نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اسے پھیکی سی لگیں۔ اسے دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے خوشیوں کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

حکیم صاحب نے اشرف کا بطور خاص معائنہ کیا۔ ٹانگ کی حالت پر انہیں سخت تشویش تھی۔ دوائیں پینے کے لیے دیں اور خاص قسم کے مرہم اسے لگانے کے لیے دیے۔ حکیم صاحب کو ان دواؤں کے شجاع نے ہی دیے جو پانچ سو سے زیادہ بنے تھے۔

اشرف نے احتجاج کرنا چاہا مگر شجاع نے محبت آمیز دھمکی سے اسے خاموش کرا دیا۔

حکیم صاحب کی دوا کھانے سے یہ افاقہ اسے پہلے ہفتے ہی محسوس ہوا کہ ٹانگ کا درد بھی کم تھا۔ اس کی چمکیں بھی نہیں تھیں اور دوا کھانے سے اسے نیند بھی اچھی آ رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ آپ کو افاقہ ہے۔ اب آپ کی ٹانگ ٹھیک ہو جائے گی'' فرح نے ایک شب اس کے پیر پر مرہم کا لیپ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سب شجاع کی نوازش ہے ورنہ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے؟''

''سیانے جب ہی تو کہتے ہیں کہ اچھے دوست ہمیشہ کام آتے ہیں'' فرح نے ہنس کر کہا۔

''ہاں وہ ہے ہی اتنا اچھا کہ سب کے کام آتا ہے'' اشرف نے سوچتے ہوئے کہا۔

اس کے بدلتے چہرے سے وہ چونکی سی ہوئی اور بولی ''ہمیں کسی کے اچھے' برے ہونے سے کیا مطلب۔ فائدہ پہنچا ہے' ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ اب آپ کو حکیم صاحب کے پاس کب جانا ہے؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ ہر ہفتے آ کر دکھاؤ اور دوا لے کر جاؤ۔ کم از کم تین ماہ تک علاج ہوگا۔''

''ٹھیک ہے' آپ باقاعدگی سے کاموکی جائیے اور اپنے لیے دوا لائیے۔''

''مگر شجاع نے مجھے پیسے ہی نہیں دینے دیے۔ اگر اب بھی اس نے ایسا کیا تو یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ اگر اس نے اس بار بھی ایسا کیا تو میں اس کے بچے کو دیکھ کر پیسے دے آؤں گی۔ یوں حساب برابر ہو جائے گا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس طرح تو دونوں کا ہی بھلا ہو گیا'' اشرف کچھ سوچ کر کھلکھلا کر ہنسا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''حالانکہ تمہیں تو فوراً ہی سمجھ جانا چاہیے تھا۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں ایمان سے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔''

''شجاع ہر ہفتے مجھے لینے اور چھوڑنے آیا کرے گا تو آرام سے تمہارا دیدار کر لیا کرے گا۔ سنا ہے کہ عاشقوں کے لیے دیدار بھی امرت کا پیالہ ہوتا ہے۔ اور تم اس کے بچے کو دیکھنے کے بہانے اور کبھی اس کی بیوی کو دینے کے بہانے اس کے گھر جایا کرو گی تو تم بھی اپنے عاشق کو رج کر دیکھ لیا کرو گی' خطوط کا تبادلہ بھی شاید ہوتا رہے گا' ہے ناں؟''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ کانپ سی گئی۔

''تمہارے من کی باتیں جب میں کرتا ہوں' تو تمہیں کیوں نہیں اچھی لگتیں؟''

''اس لیے کہ ان میں کوئی سچائی نہیں ہے۔''

''شجاع سے میرا یارانہ ایسا تو کبھی نہیں تھا کہ وہ اپنے پاس سے کرائے کی گاڑی میں دوسرے گاؤں تک لے جائے' حکیم صاحب کو اپنے پاس سے پیسے دے...... اور آج وہ اتنا دیالو بن گیا ہے۔ چاچے' مامے کے پتر سے بھی زیادہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے...... آخر کیوں؟''

''مجھے کیا پتا؟'' اب وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''وہ اس لیے کہ اس کی معشوقہ اس گھر میں رہتی ہے اور شجاع ان مردوں میں سے ہے جو بیوی کے ساتھ ساتھ ایک معشوقہ رکھ کر بھی فخر کرتے ہیں۔''

فرح ساکت سی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''کیا سمجھتا ہے وہ اپنے اس پلان میں کامیاب ہو جائے گا' میں بے وقوف بن جاؤں گا؟ ہرگز نہیں...... اب اس کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ بہت حکیم ہیں اور سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میں کسی دوسرے حکیم کو دکھاؤں گا مگر شجاع والے حکیم کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

''مگر اس حکیم کی دوا سے تو آپ کو فائدہ ہو رہا ہے'' فرح نے اس سے کہا۔

''دوسرے حکیم بھی مٹی نہیں کھودتے۔ وہ بھی علاج کرتے ہیں' ان سے بھی مریض شفایاب ہوتے ہیں۔''

اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ بدستور رچی ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہے' اب آپ کو دوسرے حکیم کو ہی دکھانا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے حکیم سے بھی اچھا ہو'' اب اس کا چہرہ دیکھ کر اپنی بات مکمل کر رہی تھی۔

''یہ بات تو کیسے کہہ سکتی ہے کہ دوسرا حکیم زیادہ اچھا ہوگا'' اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''میں تو ایسے ہی بول رہی ہوں' مجھے کیا پتا۔'' اب وہ حراساں سی ہو گئی۔

''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ زیادہ نہ بولا کر...... مگر تجھے تو شوق ہے ہر ہر بات میں بولنے کا۔''

''ٹھیک ہے' میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔ آپ جس کو دل چاہے دکھائیں' آپ کی ٹانگ ہے' آپ بہتر سمجھتے ہیں۔''

''شجاع کیا سمجھتا ہے کہ وہی لے کر جائے گا تو میں حکیم کے پاس جاؤں گا۔ میں خود بھی جا سکتا ہوں۔ میں اس کے حکیم کے پاس ہی جاؤں گا۔ اس کا کوئی رشتے دار تھوڑی ہے' جو میں اس کے پاس نہ جاؤں۔ میں کے پاس جاؤں گا اور خود ہی جاؤں گا۔''

تب فرح کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ گئی کہ اشرف کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس بات پر اسے غصہ آ سکتا اور کس بات پر وہ بھڑک سکتا ہے۔ مسکرانا یا خوش ہونا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ جب سے ٹانگ کی تکلیف بڑھی ہر وقت غصے سے الٹی سیدھی صلواتیں بڑبڑاتا رہتا تھا۔

کوئی دوست اس کی خیریت پوچھنے بھی آ جاتا تو خواہ مخواہ ہی اس کے لتے لے لیتا اور اب خواہ مخواہ ہی شجاع پر غصہ آیا تھا تو فرح کو بھی لتاڑ کر رکھ دیا تھا اور خود ہی بعد میں اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ اسی حکیم علاج جاری رکھے گا جس کے پاس اسے شجاع لے کر گیا تھا۔

فرح آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے پل پل بدلتے تیوروں کو دیکھ رہی تھی اور اپنے سینے میں گھٹی سسکی کو دانتوں تلے دبائے بیٹھی تھی کہ اگر منہ سے ہی آہ آزاد ہو جاتی تو وہ اس کے ایسے ایسے معنی اخذ کرتا کہ نڈھال ہو جاتی۔ اگر کوئی آنسو پلکوں کی چوکھٹ عبور کر لیتا تو تب بھی ایسی ہی صلواتیں اس نے سنی تھیں۔

''اب ٹکر ٹکر کیوں دیکھ رہی ہے مجھے' جا ماں کے پاس' کوئی کام کر'' اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

تب وہ چونک کر اٹھی اور اس تیزی سے قدم اندر کی جانب بڑھائے کہ اگر وہ رک گئی تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔

''ہونہہ' بدنصیب' کم بخت!'' اشرف بڑبڑایا۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں سیسہ ڈال گئی مگر اس نے کر نہیں دیکھا۔

ہوائیں تھک کے سونا چاہتی ہیں
مگر کوئی دریچہ وا نہیں ہے
ہم ایسے راستے میں ہیں جہاں پر
کوئی جگنو' کوئی تارا نہیں ہے

☆☆☆

''ارے نہیں'' اس کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں'' وہ شرمائے شرمائے لہجے میں بولی۔

''اقعی ......!'' اب وہ سرشار سا اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں ......'' اس کے چہرے پر گلال سا پھیل گیا۔

''ارحم کو کھیلنے کے لیے ساتھی مل جائے گا۔ بچہ بھی خوش ہو جائے گا'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''مگر دونوں میں بہت کم فرق رہے گا؟'' اس کا لہجہ تفکر آمیز تھا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو اچھی بات ہے۔'' شجاع ہنسا۔

''اتنے چھوٹے بچوں کو اکیلا سنبھالنا بھی تو میرے لیے دشوار ہوگا۔ مجھ سے تو ابھی ارحم بھی صحیح طرح نہیں سنبھلتا۔''

''پریشان کیوں ہوتی ہو' امی ہیں ناں تمہاری مدد کے لیے۔''

''ارحم نے ہی انہیں پریشان کر رکھا ہے۔ وہ بھی کیا کہیں گی'' نگین نے ہنس کر اسے دیکھا۔

''خوش ہو جائیں گی امی اپنے بیٹے کے بچوں کو دیکھ کر۔''

''میں نے تو ابھی تک اپنی امی اور باجی تک کو نہیں بتایا ہے۔''

''فون پر بتا دو...... بتانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟''

''شرم آئے گی مجھے'' اب وہ سر جھکا کر اپنے دونوں ہاتھ باہم مروڑنے لگی تھی۔

''تو پھر بیٹھ کر شرماتی رہو۔ میں تو چلا اپنی ماں کو یہ خبر بتانے۔'' شجاع سرشار سا ماں کے پاس آنگن میں آ گیا جہاں بیٹھی وہ پالک بنا رہی تھیں۔ شجاع کی بات سن کر وہ پریشان سی ہو گئیں۔

''اے ہے اتنی جلدی...... ابھی ارحم تین ماہ کا ہی تو ہوا ہے۔''

نگین کو سامنے آتے دیکھ کر وہ شرارت سے بولا۔ ''کیا بتاؤں امی! آپ کی بہو کو بچوں کا بہت شوق ہے۔ وہ کہتی ہے گھر میں خوب سارے بچے ہونے چاہئیں۔''

نگین شرماتی ہوئی آنگن میں آتے آتے واپس اپنے کمرے میں پلٹ گئی۔ شجاع کی باتیں سن کر وہ پھوپھو کے سامنے کس طرح بیٹھ سکتی تھی۔

''بچے ہی پیدا کرنے کا شوق ہے' اس کے علاوہ کوئی اور شوق نہیں ہے'' عظمت بیگم اس کو مٹکتا لچکتا جاتا دیکھ کر جلے سے لہجے میں بولیں۔

شجاع ان کی برہمی کو جیسے پی گیا اور بدستور ہنستے ہوئے بولا ''اماں! یہ کام کوئی کم تھوڑی ہے۔ آپ کے آنگن میں ہر طرف پوتے' پوتیاں گھوم رہے ہوں گے۔ کیا یہ آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔''

''ہاں بھئی' ہمیں تو ہر چیز اچھی لگتی ہے اور لگے گی۔ پوتے بھی اچھے لگیں گے اور پوتیاں بھی مگر تمہاری بیگم کو اپنا گند اچھا لگنا چاہیے؟''

''اماں! میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔'' شجاع ماں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''گھر گندا ہو تو وہ نہیں دیکھتی' باورچی خانہ پھیلا ہوا ہو تو وہ نہیں سمیٹتی۔ گھر میں کوئی مہمان آ جائے تو سر پر مکھی والے انداز میں سلام کرتی ہے اور اپنے کمرے کی راہ لیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں' کیا تیری بیوی کا گھر اس کا کمرا ہے؟ وہیں سے ہنسی کی آواز آتی ہے' وہیں سے باتوں کی آوازیں آتی ہیں۔ باہر آتی ہے تو جیسے قفل پڑا ہوتا ہے۔ کیا شہر کی لڑکیاں صرف اپنے کمرے کو اپنا گھر سمجھتی ہیں باقی گھر سے انہیں سروکار نہیں کوئی مہمان آئے تو مجال ہے کہ کبھی دو باتیں ہی کر لے۔ ایک دن حکیم جی کی بہو آئی' اس نے جتنے سوال

کیے' ان کے ہی جواب دیے' وہ بھی ہاں ناں میں۔ اس بھلی لوک سے اتنا نہیں ہوا کہ آگے سے اس سے بھ پوچھ لیتی کہ تم کیسی ہو؟ گھر کا کام کیسے کرتی ہو؟ سلائی کڑھائی کیسی آتی ہے؟ میز پوش پر گلدان بنانا آتا نہیں؟ تکیے غلاف پر شعر کبھی کاڑھا تو اس پر سونے کا کتنا سواد آیا؟"

"امی! نگین کو ایسی باتیں نہیں کرنی آتیں۔ وہ کبھی گاؤں میں نہیں رہی اس لیے وہ کیا جانے' یہاں خواتین کیا سننا پسند کرتی ہیں۔" شجاع بیوی کی طرف داری کرتے ہوئے بولا۔

"بولنا تو آتا ہے ناں تمہاری بیوی کو...... تو کیا خیریت پوچھنے میں بھی بل بیل لگتے ہیں؟ یا یہ بھی پوچھنا نہیں آتا؟" عظمت بیگم کا غصہ کسی طرح ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"اماں! آپ بھی بس نگین کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔ آخر جب نگین اس گھر میں نہیں آئی تھی تب بھی تو آ ہی آنے جانے والوں سے باتیں کرتی تھیں۔ اب کیا یہ ضروری ہے کہ نگین بھی انہیں کمپنی دے؟"

"نہیں' کوئی ضروری نہیں ہے۔ وہ بس ہر وقت اپنے حجرے میں پڑی رہا کرے۔"

"اماں! اس کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ اتنی جلدی دوسرے بچے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کو بھی آ رہے ہیں اور اس کو الٹیاں بھی بہت آتی ہیں۔ دیکھیں تو کس قدر پیلی ہو گئی ہے وہ۔ ارحم کو ہی سنبھالنا ا دوبھر ہو رہا ہے۔ آگے وہ کیا کام کرے گی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس کے لیے کسی ملازمہ کا بندوبست کر دوا ارحم کو بھی سنبھالے اور نگین کو بھی ہر وقت تو اس کے سر میں درد رہتا ہے۔ ملازمہ ہو گی تو اس کے سر میں تیل لگا دیا کرے گی اور دبا بھی دیا کرے گی۔ کچھ تو بے چاری کو آرام ملے گا۔ گاؤں کی گرمی بھی تو شہر سے زیادہ۔ یہ اس کا ہی حوصلہ ہے کہ خوشی خوشی سب برداشت کر رہی ہے۔"

"ارے...... آج تک تجھے اپنی ماں کا خیال نہیں آیا کہ اس بڑھاپے میں کتنے کام کرتی ہیں۔ اتنے بڑ آنگن کی جھاڑو بھی لگاتی ہیں اور اسے لیپتی بھی ہیں۔ ان کے پیروں اور جوڑوں میں بھی درد رہتا ہے۔ اما دیوار کا سہارا لے کر چلتی ہوئی تجھے نظر نہ آئیں اور نہ ہی ان کے لیے کبھی ملازمہ رکھنے کا سوچا۔"

اماں' جب گھر میں ملازمہ آئے گی تو ظاہر ہے کہ آپ کا بھی کام کر دیا کرے گی۔ آپ کو بھی دبا دیا کرے گی۔ دونوں کا ہی فائدہ ہو گا۔"

"ہاں' کرے گی بہت۔ جیسے کہ میں جانتی نہیں ہوں نگین کو۔ ایک دن ماسی بھاگ بھری خود ہی آ گئی تو میں نے کہا' آج سارے گھر کے جالے اتار' کھڑکیاں پونچھ اور سب طرف کی صفائی ستھرائی کر۔ نگین اسے کر اپنے کمرے میں جو گئی تو وہ وہاں سے شام کو برآمد ہوئی۔ اپنی الماری صاف کرائی گئی' سارے کپڑے ا کروائے گئے اور ہمارا کمرا یونہی پڑا رہا' بہو بیگم نے ملازمہ کو یوں قابو کیا کہ وہ ان کے سوا کوئی دوسرا کام کر ہی پائی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں اماں آپ بھی' بھاگ بھری ہمیشہ کی کام چور ہے۔ اس کو نہ رکھنے کی وجہ آپ نے یہی بیان کی کہ اس سے کام لینا انتہائی مشکل ہے۔ اس کے پیروں میں بلیاں بندھی رہتی ہیں' کبھی ادھر' ادھر۔ یہی سب سوچ کر نگین نے اسے پکڑ کر کام کروا لیا ہو گا' ورنہ بھاگ بھری کو سوائے باتیں بنانے کے آ کیا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا! ہر بات ٹھیک کہہ رہے ہو مگر جب سے بہو ہمارے گھر آئی ہے' ہم نے کوئی سواد اٹھایا ہے۔ ہمیں تو یہ پتا ہی نہیں چلا کہ کوئی عورت ہمارے گھر آئی ہے۔ آتے ہی چکر الٹے' میکے آنا جانا۔ پھر

ائی پلر...... ہمیں تو اس کے وجود سے کبھی کوئی آسودگی نصیب ہی نہیں ہوئی' نہ حرام کہیں کی۔ وہ اور گھرانے گے جہاں بہوئیں ذمے داری سے اپنے گھر کا نظم و نسق چلاتی ہیں اور گھر کے بزرگوں کو عزت و تکریم "

"اماں! نگین نے کبھی آپ کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی۔"

" نے اسے ایسا کون سا بھالا مارا ہے جو وہ ہم پر چڑھ کر آئے گی۔ کیا یہی کسر رہ گئی ہے کہ وہ منہ پھاڑ کر لڑے گی؟"

" بری بہوؤں سے اللہ بچائے' وہ تو چلتی ہوا سے لڑتی ہیں۔ حکیم جی کی بہو کی آوازیں نہیں سنیں آپ ہے وہ؟"

" کا بہت برا حشر بھی ہوتا ہے۔ انیقہ کی بہو کو دیکھ لو' کیسی تن فن کرتی آئی تھی۔ اب اپنے ابا کے گھر میں ہے۔ شمیم کی بھاوج کے شب و روز دیکھ لو' کیسے روتے پیٹتے گزر رہے ہیں۔ اپنی سسرال میں آ کر کیسی یاں کی تھیں...... اور اب ان ہی کا ثمر سمیٹ رہی ہے۔" عظمت بیگم نے پاس پڑوس کی بد بہوؤں کے شروع کر دیے۔

" بہت اچھی ہے۔ آپ کی بے حد عزت کرتی ہے اور آپ سے محبت بھی کرتی ہے۔" شجاع نے رسان سمجھانا چاہا۔

" نے وہ تجھ سے ہی بیان کرتی ہو گی...... اور تو بھی ان پر یقین کر سکتا ہے مگر میں نہیں کرنے والی۔ اپنی الگ شناخت ہوتی ہے۔ اس کو اچھا کہنا نہیں پڑتا' وہ سب کو اچھی دکھائی دیتی ہے۔"

"اماں! آپ نے تو میری معصوم بیوی کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ جب دیکھو' آپ اس کے خلاف محاذ کھولے ہیں۔ آپ کو اتنی بری لگتی تھی تو اسے بیاہ کر کیوں لائی تھیں' جواب آپ کو اس میں اتنے کیڑے نظر میں نے تو آپ سے فرمائش نہیں کی تھی کہ نگین سے میری شادی کریں۔"

" ہے بیٹا! اب میں اسے کچھ نہیں کہوں گی' مگر اپنا کام وہ خود کرے۔ اپنے لیے بھی روٹی ڈالے اور لیے بھی۔ میں اپنی روٹی خود پکا لوں گی۔ مجھے نہیں چاہیے اس کے ہاتھ کا پکا ہوا۔"

" کرے گی۔ آپ خود ہی اسے باورچی خانے میں آنے نہیں دیتیں اور بعد میں الزام بھی اسی پر لگاتی کام کرنا چاہتی ہے۔"

سنبھالے گھر' میں تو ہفتہ دس دن کے لیے فرحت کے گھر جا رہی ہوں۔ اس کے بچے کب سے ہیں نانو ہمارے پاس رہنے کے لیے آؤ۔"

جائیں گی آپ فرحت کے ہاں؟" شجاع نے سوچا اچھا ہے کہ ان کا غصہ کہیں جانے سے کم

کل تھا' لیکن اگر مجھے تو ابھی چھوڑ آئے تو زیادہ بہتر ہے۔" عظمت بیگم نے اپنی پٹاری پاس رکھی لیتے ہوئے کہا۔

ابھی چلتے ہیں۔" شجاع اسی وقت جانے کو تیار ہو گیا۔ عظمت بیگم نے ایک بیگ میں اپنے دو چار اور چادر لے کر جانے کو تیار ہو گئیں۔

لو گود میں لے کر باہر آئی تو وہ شجاع کے ساتھ جانے کو تیار تھیں۔

"اماں! آپ کہاں جارہی ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اسے یہ ت ہو گیا تھا کہ ماں بیٹے کا کسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے مگر یہ نہیں پتا تھا کہ وہ اس وقت فرحت کے گھر جارہی ہی

"تم اکیلے گھر میں بیٹھ کر موجیں اڑاؤ' اس لیے جارہی ہوں اپنی بیٹی کے گھر۔"

"مجھے اکیلے گھر میں وحشت ہوگی' پلیز مت جائیں۔"

"کوئی نہیں ہوتی وحشت...... اب تو ساس کی شکل سے وحشت ہوتی ہے بہوؤں کو' ساس کی آ وحشت ہوتی ہے۔ میں جاؤں گی تو تم ہنسی خوشی رہنا شجاع کے ساتھ۔"

"پھپو! مجھے تو آپ کے ساتھ رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔" نگین نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سچ کہہ رہ میں۔"

"یہ ڈائیلاگ اپنے میاں سے بولا کرو' وہی یقین کرتا ہے تمہاری باتوں کا' میں تو شکل دیکھ کر پہچان لی کہ کس کے من میں کیا ہے؟" عظمت بیگم نے جملہ مکمل کر کے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ شجاع ایک پر ڈال کر کندھے اچکا کر ان کے پیچھے نکل گیا۔ تب نگین ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

فیروزہ جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ نینا سے تعلق ختم ہونے کے بعد راوی ان کے حق میں چین ہی چین لکھے گا تھا۔ فرید احمد کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر میں پڑ گئے تھے۔ ہر وقت چپ چاپ خاموش پڑے فیروزہ کچھ بولتیں تو ایسی آنکھیں نکال کر انہیں گھورتے جیسے کہ کچا ہی چبا جائیں گے۔ کتنے مہینے گزر گئ ان کا غم کم ہی نہیں ہونے پایا تھا۔ بات بھی ایسی تھی' وہ کسی سے کہہ کر اپنا دل ہلکا نہیں کر سکتے تھے۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے" (پرانی بیماریاں پلٹ کر آرہی ہیں)

"دکان پر اب دل نہیں لگتا" (مہنگائی نے گاہکوں کو بدتمیز اور خود سر بنا دیا ہے)

"بزنس کے برے حالات نے ٹینشن میں اضافہ کر دیا ہے۔"

لوگوں کے پوچھنے پر وہ یہ رٹے رٹائے جوابات دیا کرتے۔

"فرید! کیا بات ہے؟" فیروزہ ان کو یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر پوچھا کرتیں۔

"کوئی بات نہیں......" وہ چشمہ اتار کر شیشے پر بلاوجہ پھونکیں مارنے لگتے۔

"بات کیوں نہیں کرتے آپ مجھ سے؟" وہ شکوہ کرتیں۔

"میرے پاس کوئی بات ہی نہیں رہی۔"

دل تو ان کا چاہتا وہ اپنے میاں سے یہ پوچھیں کہ نینا جاتے ہوئے آپ کی زبان بھی اپنے ساتھ لے مگر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولیں "بولنے کا تو تمہیں ہمیشہ مراق تھا' اب ہونٹوں پر کیوں قفل ہے۔"

"تم سے مطلب......؟" وہ ترش لہجے میں بولے۔

"میں آپ کی بیوی ہوں' آپ کو یوں پریشان دیکھ کر کیا مجھے پریشانی نہیں ہوگی؟"

"اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ زیادہ بک بک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"فرید! میں آپ کی بیوی ہوں' آپ کی یہ حالت دیکھ کر دکھی ہو جاتی ہوں۔ آپ اپنے دل کی باتیں ا کیوں نہیں کہہ ڈالتے؟ اس طرح منہ میں گھنگنیاں ڈالے کیوں بیٹھنے لگے ہیں۔"

ہ وہ ان کی جانب دیکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے جیسے ان کے علاوہ کمرے میں ہی کوئی نہ ہو۔

ھانے پینے کے وہ سدا سے شوقین تھے۔ وہ ان سے پوچھتیں "آج دوپہر کو آپ کے لیے کیا پکاؤں؟"

وہ کہتے "کھانا۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں' کھانے میں کیا پکے گا؟"

"پتا نہیں۔"

"گوشت میں اروی ڈالوں یا لوکی؟" وہ انہیں بولنے پر اکساتیں۔

"پتا نہیں۔ جو دل چاہے پکا لو' مجھے کوئی ڈش خصوصیت سے پسند نہیں ہے۔ بس پیٹ بھرنے کو کھا لوں گا۔

ل ے دینا' بے شک بھنے ہوئے چنے دے دو۔"

وزہ ان کے دکھ کو سمجھ رہی تھیں' مگر وہ ان دکھوں کے سامنے یوں سپر ڈال دیں گے' انہیں پتا نہیں تھا۔

ان کا دل چاہا وہ نینا کا حال پوچھیں کہ وہ اب کس انداز میں زندگی گزار رہی ہے مگر اس کا شاید ہر فون نمبر ہو گیا تھا۔

احمد کی پرانی ڈائری سے اس کے گھر کا ایڈریس ملا تو انہوں نے اسے ایک رجسٹرڈ خط لکھ دیا جو ہفتہ بھر بمار کس کے ساتھ واپس آ گیا کہ مکتوب الیہ اب وہاں نہیں رہتا۔

نحوس عورت جب ان کی زندگی میں تھی' تب زندگی ضیق تھی اور اب' جب وہ عورت ان کی زندگی سے دفان ب بھی پریشانیوں کے ڈیرے ان کے گھر میں موجود تھے۔

قیقت ہے' سکھ کو دکھ سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دکھ کو سکھ سے...... مگر فرید احمد تو لگتا تھا کسی دکھ کے ستقل رہنے لگے ہوں۔

آتی تب بھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ نہ آتی۔ وہ باپ سے ادھر ادھر کی بہتیری باتیں کرتی مگر وہ ہوں' لجھ بول کر نہ دیتے۔

ابی! آپ کبھی میرے گھر نہیں آئے" ایک شام فہمی نے ان سے کہا۔

"یا ہوا؟"

ا دل چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ آ کر تو دیکھیں' آپ کی بیٹی کہاں رہتی ہے؟"

مجھے پتا ہے' تمہارا گھر کیسا ہے؟"

ے جانے کے بعد اب وہ کیسا لگتا ہے' یہ تو آپ کو دیکھنا چاہیے۔"

لوں گا" انہوں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ل آپ میرے گھر آ رہے ہیں' بلکہ آپ اور امی کل رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا رہے ہیں۔" اس ر کہا "میں ساری چیزیں آپ کی پسند کی بناؤں گی۔ کھڑے مسالے کا گوشت' فرائی فش' نرگسی کوفتے

بیٹا! میرا کھانے کو دل بھی نہیں چاہتا" انہوں نے فہمی کی بات کاٹ کر کہا۔

نہ لیجیے گا' مگر آپ ضرور آئیں گے۔ گھر سے باہر نکلیں گے تو آپ کی طبیعت پر بھی اچھا اثر پڑے

کہ سے کیا باہر نکلوں گا۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔ "اب تو زندگی سے ہی باہر نکلنے کو دل چاہتا ہے"

انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

فیروزہ بیگم نے ان کی بات سن لی تھی۔ ان کا چہرہ مارے غم کے فق سا ہو گیا۔ فہمی کی نظر اچانک ما چہرے پر پڑی۔ انہیں یوں غم سے چور دیکھ کر وہ پوچھ ہی بیٹھی ''امی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں' آپ تو خوفناک حد تک پیلا ہو رہا ہے۔''

''نہیں بیٹا' مجھے کیا ہونا ہے' میں تو بالکل ٹھیک ہوں' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لا کر کہا ایکدم پریشان سی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی کو تنگ کیا جائے' پرانی باتوں پر کوئی سبق دیا جائے۔ یہی سب سو دنوں صابرہ اپنی بڑی بہن فاخرہ کے ساتھ اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔ فاخرہ فون کرتیں تو ریسیو نہ کرتیں۔ و گھر بلاتیں تو بہانے بنا کر ٹال دیتیں۔ کسی تقریب میں ملاقات ہوتی تو ان سے بیس گز دور بیٹھتیں۔

فاخرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اس لیے وہ خود دوڑ دوڑ کر ان کے پاس آتی اور اپنی محبت ان پر جتا نگہت آرا کے ہاں میلاد میں ان کا فاخرہ سے آمنا سامنا تو ہونا ہی تھا۔ کھانے سے نمٹ کر وہ شامیا نکل کر اندر کمرے میں آ گئیں اور پاندان کھول کر پان بنانے لگیں۔

فاخرہ ان کو کھوجتی ہوئی آئیں تو ان کے آگے سے پاندان اپنی جانب کرتے ہوئے بولیں ''نکو پاشا آپ کائے کو بنا لے رئیں۔ میں مر گئی کیا' اجاڑ کتھے کے لال داغاں اتے خوبصورت ہاتھاں پو پڑ گئے تو جلد چھٹیں گے۔''

''میں تو پان کھانا چھوڑ دی' ایسے ہی ایلچی کے واسطے کھولی تھی پاندان۔'' صابرہ نے ان کے ہاتھ کا لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اب نکو کھاتے تم؟'' فاخرہ نے پریشانی سے پوچھا پھر گلوری منہ میں داب لی۔

صابرہ تیزی سے جانے کے لیے مڑیں تو سامنے رکھی الماری سے ٹکرائیں۔ ان کے منہ سے تو شاید '' آواز بھی نہیں نکلی تھی مگر فاخرہ آگے بڑھ کر رندھے ہوئے لہجے میں لاڈ سے صابرہ کو لپٹاتے ہوئے بولیں۔

''اللہ...... میں مر گئی جی! تم کو کچھ ہوا تو نئیں۔''

''بس ذرا سا سر گھوم گیا میرا۔'' صابرہ سر دبا کر وہیں کرسی پر ٹک گئیں۔ الماری کا کونا لگا تھا۔

رعنا دوڑ کر پانی کا گلاس لے آئیں اور خالہ کے لبوں سے لگا دیا۔ فاخرہ نے کسی بوتل کے جن کی تقریب کے بھرے پرے گھر سے بام کی شیشی ڈھونڈ نکالی اور ڈھیر سارا بام صابرہ کے ماتھے پر تھوپ دیا۔

''اب میں ٹھیک ہوں' گھر جاؤں گی' منور آ گیا ہوگا۔ جا کر روٹی ڈالوں گی' کام تن بھی نئیں ہے ناں اسی کمرے میں ان کی کوئی رشتے دار کپڑوں کے ڈھیر میں ڈوبی بیٹھی تھیں۔ وہیں سے ایک ڈ کر کے بولیں ''اوئی پاشا...... اتا گھابرے بھی نکو ہو۔ مل جائیں گی کام تن تم کو۔ گلی گلی پڑی ہیں' ایک کو جائیں گی۔''

''میں بولتیوں' ایکچ مل جائے سو غنیمت۔''

''لیو اور سنو' کتا گھابرے خوائی نخوائی میں۔''

''صابرہ! کیا ہوا تیکوں...... کیسی زرد زعفران ہو کو رہ گئی۔'' فاخرہ نے محبت سے کہا۔

''میں ایکدم برابر ٹھیک......'' صابرہ زبردستی کی ہنسی ہنسی۔

''غلط بولے تم...... میں جانتی ہوں' کوئی طاقت نئیں تم میں۔ بہوت کمزور دکھ رہے تم۔''

''اب کیا کروں میں...... موٹاپا میرے پو چڑھتا ہی نئیں۔'' صابرہ نے کہا۔

''اس لیے تو بولتی ہوں' بہو جلدی لے کو آؤ تم تا کہ خدمت کرے تمہاری۔''

''ابھی میرے بیٹے کے پاس نکو ٹائم ملتا۔ جب انوں پڑھ کے بیٹھیں گے تب شادی ہوئیں گی' اس سے پہلے ل نئیں۔''

''میں آ کو رہ جاتی دو چار دن تیرے پاس۔ اپنی حالت تو دیکھ' کیا بنا کے بیٹھی۔''

''ٹھیک ہوں آپا میں...... آپ بیکار میں ایسا اچ بولتے......'' صابرہ کے لہجے کے تناؤ میں کمی آنے لگی۔

''اب ایکچ لفظ بھی نئیں بولنے کا۔ میں بول دی کہ بس...... میں کل تمہارے گھر آنے کا ہے۔''

''جی ہو...... سو بار آؤ آپ۔''

''بستر سے بھی نکو اٹھنے کا ہے۔ تم نے آرام کرنا ہے' فقط آرام'' فاخرہ کسی ڈاکٹر کی طرح انگلی اٹھا کر اسے ھا رہی تھیں اور صابرہ ان کی بات سن کر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''جی ہو...... آپ برابر بولے۔''

☆ ☆ ☆

نگین کی طبیعت ازحد خراب تھی۔ بی پی بھی لو ہو گیا تھا۔ بستر سے اٹھنا اس کے لیے محال تھا۔ ایسے میں ت بیگم بھی فرحت کے گھر چلی گئی تھیں۔ کوئی ہاتھ بٹانے والا گھر میں نہیں تھا۔

جاع نہ صرف نگین اور بچے کو دیکھ رہا تھا بلکہ کھانا بھی باہر سے لے کر آ رہا تھا۔ پڑوس میں حکیم جی کی بیوی کو ا تو انہوں نے آ کر باورچی خانہ سنبھالا۔

''خبردار جو باہر سے کھانا آیا' میں پڑوس میں بیٹھی ہوں اور بہو بیمار ہے' میں اسے خود دیکھ لوں گی'' وہ صبح ے آ جاتیں' ناشتا بناتیں' گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد چلی جاتیں۔ پھر دوپہر کو آ کر شام تک کا کھانا تیں۔

وس کی اس سہولت نے نگین کو بڑی تقویت دے دی تھی مگر اسے الٹیاں بے حد آ رہی تھیں' جس سے اس کی ری کسی طرح رفع نہیں ہو رہی تھی۔ کام کرنا تو محال' اس کے لیے کھڑا ہونا ناممکن تھا۔

جاع ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے اسے فوری ڈرپ لگوانے کو کہا۔ نگین تین گھنٹے بعد کلینک سے لگوا کر ابھی گھر میں آئی تھی کہ اسی وقت فرحت غصے سے پھنکارتی داخل ہو گئی۔ تیوریاں اس کے ماتھے پر ں اور آنکھیں شرارے برسا رہی تھیں۔

''اے زن مرید بھیا! ماں کو گھر سے نکال کر خوش ہو رہا ہے۔ تجھے یہ خیال بھی نہیں کہ ماں تجھے یاد کر کے ل ہو گی۔ آج دس دن ہو گئے' تجھے ایک بار بھی ماں کا خیال نہیں آیا۔'' فرحت اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ن میں کھڑی چیخ رہی تھی۔

''نگین اتنی بیمار تھی' میں کیسے آتا؟'' شجاع نے کہا۔

''نگین بیمار تھی' تجھے تو الٹیاں نہیں لگی تھیں' جو تجھ سے آیا نہیں گیا۔ نگین کے ساتھ ساتھ کیا تجھے بھی چکر آ رہے ہیں؟''

''فرحت! زیادہ باتیں مت بنا۔ پوچھ لو خالہ سے' ہم لوگ کتنے پریشان تھے۔ ابھی تو نگین آئی ہے ڈا کلینک سے۔ ایک پل کا سکون نہیں مل رہا ہے...... اور تم الگ زن مریدی کا طعنہ دے رہی ہو۔''

''تو ہے ہی زن مرید۔ جسے بیوی کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا...... اور تجھے سکون مل بھی کیسے سکتا تمسخر سے ہنسی۔ ''جو لوگوں کا سکون تباہ کرتے ہیں' انہیں سکون ملتا بھی نہیں ہے۔ بھائی' تم نے ماں کو دکھ سکھ تمہیں بھی کیسے مل سکتا ہے۔ ہر کوئی اکیلا رہ کر موجیں نہیں اڑا سکتا۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اماں اپنی مرضی سے تمہارے گھر گئی ہیں' میں ان کو چھوڑ کر نہیں آیا۔ تم مجھے الزام نہ دو۔''

''تم نے اور تمہاری بیوی نے گھر میں حالات ہی ایسے کر دیے کہ انہیں یہاں سے جانا پڑا۔ بھائی' بہت برا کیا ماں کے ساتھ۔'' فرحت اب چیخنے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہانے لگی۔ بیانات اس کے چا اور سینہ کوبی اس کے سوا تھی۔

''فرحت' چپ ہو جاؤ...... رو کر مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔ نہ میرا قصور ہے اور نہ ہی نگین کا۔ نے اکھڑے لہجے میں بہن سے کہا۔

''اماں بھی بے قصور ہیں تو یہ سارا سیاپا کس نے ڈالا ہے'' فرحت نے نگین کو کن انکھیوں سے دیکھ کہا۔

''میرا یہ خیال ہے' یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ گھر آ کر اماں کو الٹی سیدھی پٹیاں تم ہی پڑھاتی ر اپنی بھاوج سے خواہ مخواہ خار کھاتی ہو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ہی ایما پر اماں گھر چھوڑ کر گئی ہیں۔ یہ سارا پلا ہی بنایا ہوا لگتا ہے۔ سارے فساد کی جڑ صرف تم ہو۔''

فرحت یہ سنتے ہی اپنے بال نوچ نوچ کر چیخنے لگی ''ایسے بھائی سے تو میں بے بھائی کی بھلی۔''

تب حکیم جی کی بیوی بولیں ''فرحت بیٹا! چپ ہو جاؤ۔ بھائی سے اس انداز میں بات نہیں کرتے...... ہی جوش میں ہوش کھوتے ہیں۔ اللہ اسے بھی سلامت رکھے اور تمہیں بھی۔ مگر آج تو تمہارے گھر آ کر ا لگ رہا ہے جیسے میں اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی ہوں۔ عظمت بہن کو ہمیشہ یہ تو فکر رہتی تھی کہ ان ماحول بہت اچھا ہے۔ بہن بھائی میں بہت محبت ہے' ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں مگر مجھے تو ایسا ہے کہ ہمارے ماحول میں اور تمہارے ماحول میں بالکل بھی فرق نہیں ہے۔ میرا بیٹا بھی ایسے ہی بولتا کی طرح اور میری بیٹیاں بھی اسی طرح روتی بلکتی اور چیختی ہیں' فرحت کی طرح...... مگر اس تمام خرابے کی دار بہوئیں تو نہیں ہو سکتیں...... یا......''

''خالہ! آپ کو کیا پتا' کون کتنے پانی میں ہے۔'' فرحت ایک ہاتھ سے منہ پر آئے بال سنوار کر ان کاٹتے ہوئے بولی۔ ''نگین بھابی جتنی آفت کی پرکالہ ہیں آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ انہوں نے آ کر جنت جیسے گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔ کاش' بھائی کی شادی فرح سے ہو جاتی تو ہمیں یہ دن دیکھنے تو نہ پڑتے۔''

تب نگین حیرت سے کبھی فرحت اور کبھی شجاع کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے اسے اس بات کا یقین نہ آ رہا

☆☆☆

جی لینا اور زندہ رہنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ایک میں مجبوری جھلکتی ہے اور دوسرے میں خوشی دکتی نینا کو یہ احساس نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ خوش ہے یا ناخوش۔ بچے اسے بھرپور کمپنی دے رہے تھے......

سکراتے چہرے دیکھ کر وہ اپنے اندر ایک ایسی آسودگی محسوس کر رہی تھی' جو اس نے کبھی محسوس نہیں کی

ہر کی بے رخی میں بھی کمی آئی تھی۔ وہ اس کی بیماری کا سن کر باہر سے فوراً آ گیا تھا' مگر اس کا انداز وہی تھا۔ خیریت بھی پوچھی تو لہجے میں کوئی پریشانی پوشیدہ نہیں تھی۔

وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنے شوہر اور فرید احمد کا تقابل کرتی تو فرید کو ہر لحاظ سے بہتر پاتی۔

''میں خودسر عورت ہو کر بھی بچوں کی محبت میں ملیا میٹ ہو گئی'' وہ اپنے آپ سے کہتی۔

سن ہر ہر لمحہ اس کے پاس تھا۔ نیند کی گولی بھی اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتا تھا۔ جب تک وہ سو نہ جاتی' اس س بیٹھا رہتا۔ نینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سانس لینے کا انداز بھی یکسر بدل چکا ہے۔

بت میں ملنے کی شرط نہیں ہوتی' اس نے سوچا اور دو آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ وہ فرید کی ے خواب بہت دور تک دیکھ چکی تھی...... اور یوں آگے بڑھنے کے بجائے' پیچھے پلٹنے سے ایک کسک اس ل میں تلوار کا سا گھاؤ لگا رہی تھی۔

گھ کے فون' موبائل سمیت اس سے دور کر دیے گئے تھے۔

''میرا موبائل کہاں ہے؟'' اس نے احسن سے کئی مرتبہ پوچھا تھا۔

''امی! اس کی بیل آپ کی نیند ڈسٹرب کر دیتی ہے۔''

''مگر اس وقت تو میں جاگ رہی ہوں بیٹا! چند ضروری فونز کرنے ہیں میں نے!''

''اپنے بیٹے سے زیادہ ضروری ہیں کیا؟'' وہ اس کے بازو پر اپنا سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

''نہیں......'' وہ سچائی سے بولی۔

''تو پھر مجھ سے باتیں کیا کریں۔ اپنے بچپن کی' اپنے اسکول کی۔ نانی امی آپ کو کن باتوں پر خوب پیار کرتی ن شرارتوں پر ڈانٹ پٹا کرتی تھی؟ درخت پر چڑھ کر کبھی پھل کھائے آپ نے' غلیل سے کبھی نشانہ مارا؟ ج کھیلنا کیسا لگتا تھا؟'' وہ ایک ہی سانس میں کتنے سوال پوچھ گیا تھا۔

''پہل دوج بہت شوق سے کھیلتی تھی' مگر آخر میں میرا ''ہوم'' بننے سے رہ جاتا تھا۔ سب لڑکیاں جیت جاتی ور میں ہار جاتی تھی۔''

''امی! آپ کا ہوم تو ہم سب بھائی بہنوں کے دم سے ہے ناں...... اور کتنا بھرپور ہے؟ آپ کے بچے آپ بت کرتے ہیں۔ انہیں زندگی میں تمام تر خوبصورتی صرف آپ کے وجود سے نظر آتی ہے۔''

''ن بیٹا! میں نہ اچھی بیوی ہوں اور نہ ہی اچھی ماں......'' اس وقت شاید نینا اپنا محاسبہ کر رہی تھی۔

''آپ سے کس نے کہہ دیا'' اس نے ماں کے دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔

''ا دل کہتا ہے۔''

''امی...... دل کی ہر بات نہیں مانی جاتی'' احسن نے ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''ایک آدھ بات ماننے میں کیا حرج ہے'' نینا نے مسکرا کر بیٹے کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماما! آپ ایسی کوئی بات نہ مانیں' جس سے ہمیں تکلیف ہو' آپ ہماری خوشیوں کا منبع ہیں۔ ہماری تو یاں آپ کے وجود سے پھوٹتی ہیں اس لیے یہ کبھی مت کہیے گا کہ آپ اچھی ماں نہیں ہیں۔''

''نی موٹی موٹی باتیں تجھے کس نے سکھائی ہیں؟''

"اب یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کی ہونے والی موٹی سی بہو نے......" احسن کان کھجاتے ہوئے شرارت م
گندھے لہجے میں بولا۔

"ارے کیا واقعی...... تمہارا کسی سے کوئی چکر بھی ہے؟" نینا اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"ماما! آپ کس دنیا میں رہ رہی ہیں۔ بچے آپ کے جوان ہیں۔ اب آپ نے اپنی بہوؤں کا ہی تو ا
کرنا ہے۔ ان کے داؤ غلط ثابت کرنے ہیں...... اور مجھے بھی کوئی افلاطونی فقرے بتائیں کہ وہ موٹی مجھ
نہ ہونے پائے۔"

"کون ہے وہ موٹی؟ مجھے بتائے گا نہیں کیا؟ کیسی ہے وہ؟ کیا تجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ شادی کرنے
سیریس ہے تو؟" اب نینا سرشار سے لہجے میں دوستانہ لہجے میں بیٹے سے پوچھ رہی تھیں۔

وہ، جو کمبل اوپر تک ڈالے لیٹی تھیں، احسن کے پرلطف جملوں نے انہیں بٹھا دیا تھا۔

"وہ اس وقت رانی باغ میں ٹہلنے آتی ہے۔ آپ تیار ہو جائیں...... پہلے ایک نظر اسے دیکھ تو لیں۔
ایک شوخ سی دھن ہونٹوں سے بجاتا ہوا بولا۔

نینا ایک ہی جست میں بستر سے باہر تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر جلدی سے لپ
لگائی، بالوں میں برش مارا اور کندھے پر پرس لٹکا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تو ماما......! یہ کپڑے ملگجے لگ رہے ہیں۔ وہ تو اتنی تیار ہو کر آتی ہے، آپ اس حلیے میں چلیں گی تو
سے خاک امپریس ہو گی؟"

"اچھا...... تو پھر میں کیا پہنوں؟" انہوں نے مسکرا کر بیٹے سے پوچھا۔

"کوئی سا بھی ڈارک اور شوخ سے کلر میں سوٹ پہن لیں۔" اس نے ٹی وی کے چینلز چیک کرتے
کہا۔

وہ انتہائی سرعت سے شاکنگ پنک سوٹ میں تیار تھیں۔ لپ اسٹک بھی ڈارک کر لی تھی۔ کانو
چھوٹے چھوٹے ٹاپس بھی پہن لیے تھے۔

"واہ...... دیکھ کر دل خوش ہو گیا امی! آپ واقعی بے حد خوبصورت ہیں...... اور میں جو اتنا ہینڈسم دک
ہوں، سارا کا سارا آپ پر گیا ہوں، اگر پاپا سے میری شکل ملتی، تو کوئی لڑکی بھی مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھتی۔"
شرارت سے کہا اور نینا بے اختیار ہنس پڑی۔

گارڈن جاتے وقت وہ بہن کو بھی ساتھ لے گیا۔ سارا وقت وہ ادھر سے ادھر گھومتے رہے۔ نینا ہر
کو احسان کی مطلوبہ لڑکی سمجھتی رہی۔

"لگتا ہے کہ آج وہ موٹو گھومنے ہی نہیں آئی" احسن نے ان سے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر مجھے کیوں گھسیٹ لائے" نینا نے بینچ سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی معلوم تھوڑی تھا کہ وہ آج نہیں آئے گی، اپنی ہونے والی ساس کو دیکھ کر گھر میں
گی۔"

"تم اسے فون کر دیتے کہ آج بھی آ جاؤ۔"

"میں کیوں کہتا اس سے، مجھے کیا فرق پڑا اس کے نہ آنے سے۔ میری شام تو اپنی ماں اور اپنی بہن
آج بہت خوبصورت گزری ہے۔ آپ جب میری باتوں پر ہنستی ہیں تو مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میرا

مل ہے۔"

نینا نے چونک کر احسن کو دیکھا۔ اس کا غم اس کے بیٹے میں کیسے سرایت کر گیا تھا؟

"احسن! تو ٹھیک تو ہے ناں...... میرے لعل!" وہ یکبارگی اس کے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر بولیں۔

"امی! ہوسٹل میں مسلسل تنہا رہنے کی وجہ سے میں بہت ڈسٹرب رہا ہوں۔ وہاں ڈاکٹر کو جب میں نے اپنے
مسلسل سر کے درد کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا۔ "تم اپنے گھر اور اپنی والدہ کو بہت مس کر رہے ہو۔ اس
لیے تم ہوسٹل میں رہنے کے بجائے اپنی تعلیم اپنے گھر میں، اپنے شہر کے کالج میں مکمل کرو۔ گھر والوں کی قربت
تمہاری طبیعت میں سکون اور طمانیت فراہم کرے گی۔"

نینا نے تفکر بھرے انداز میں احسن کو دیکھا اور لاڈ بھرے انداز میں کہا۔ "احسن! اب ہم روزانہ پارک آیا
کریں گے۔"

"نہیں، کل کسی دوسرے پارک میں چلیں گے تاکہ دیکھیں تو سہی ہمارے شہر میں کیسے کیسے پارک ہیں؟"

"تو پھر تمہاری موٹی کو میں کیسے دیکھوں گی" نینا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہاں کسی اور موٹی کو دیکھ لیجئے گا، موٹی لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔ اور ہمارے حیدرآباد میں تو موٹی لڑکیاں
ال ابعد ہیں۔ ایک سے ایک موٹی...... مجال ہے کہ ذرا اپنا خیال رکھ لیں۔ ہر وقت منہ چلتا رہتا ہے، بھوکیوں
"

نینا اس کا مذاق سمجھ کر بے اختیار ہنسنے لگی۔

"سچ کہہ رہا ہوں امی! کل میں ایک شاپ کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دکان دار بضد تھا کہ باجی جی! آپ کا
سات میٹر سے کم میں نہیں بنے گا اور وہ صاحبہ اسی بات پر اڑی ہوئی تھیں، میرا سوٹ صرف چار گز میں بنتا
بلکہ میں ان کا مٹاپا دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ان کے لیے سات میٹر بھی کم پڑے گا۔ پہاڑ کی پہاڑ تھی وہ۔"

نینا احسن کا جوک سمجھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے ایک اجالا سا کر دیا تھا۔
بہن کی مسلسل ہنسی ایک جلترنگ سا بجا رہی تھی۔ تب احسن نے دعا مانگی۔ "یارب العالمین! میری ماں کو
ایسے ہی خوش و خرم رکھنا۔"

دوسری جانب نینا یہ سوچ رہی تھی...... زندگی میں کچھ پلٹ کر نہیں آتا۔ ہر دن نیا، ہر شام نئی اور ہر رات جدا
ہوتی ہے...... تو پھر غموں کو سینت کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

☆☆☆

زیادہ غور اچھا نہیں ہے ایسی باتوں پر
کسی کا نام لکھ لکھ کر مٹانا اس کی عادت ہے
محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہنا
محبت ہر کسی سے جتانا اس کی عادت ہے

پہلے فاخرہ کی یہی تمنا تھی کہ اس تقریب میں صابرہ ضرور شرکت کرے وہ اپنی بہن کے مابین پھیلنے والی پاٹنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی مگر اس وقت اس کے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا کہ کاش......! آج صابرہ شادی میں نہ آئی ہوتی اور اگر آئی ہوتی تو اس ٹیبل پر نہ بیٹھی ہوتی۔

غوثیہ اچھی خاصی پوری محفل میں راؤنڈ لگا رہی تھیں۔ اپنی نئی چوڑیوں کو بھی بار بار چھنکا کر اترا رہی تھیں صابرہ کو دیکھ کر سلام کرنے آئیں تو وہیں ان کی ٹیبل پر بیٹھ گئیں...... چلو چپ چاپ بیٹھی رہتیں تو کوئی ایسی با نہیں تھی...... مگر اب ان کی لشکارے والی گفتگو اپنے عروج پر تھی۔ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تمام خواتین ان کی لچھے گفتگو سن کر مسکرا رہی تھیں۔ صابرہ بھی دبی دبی مسکراہٹ لیے اس کی جانب متوجہ تھیں اور فاخرہ کا خون کھول تھا۔

فاخرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی نند کے منہ پر ہاتھ رکھ دے مگر غوثیہ جب بولنے پر آتیں تو کوئی بھی ا چپ کرانے پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ زبان کے نیچے زبان ہونے کا محاورہ ان کے لیے ہی وجود میں آیا تھا۔

بہت دنوں بعد خاندان میں کوئی شادی ہوئی تھی اور اس تقریب میں فاخرہ اور صابرہ ایک ہی ٹیبل پر ہوئی تھیں۔ صابرہ نے بظاہر اپنی ناراضی ختم کر دی تھی مگر دل میں ایک ہلکی سی آنچ ہنوز باقی تھی۔ غوثیہ کی چٹخار دار گفتگو سے فاخرہ اپنے دل میں جہاں سبکی محسوس کر رہی تھیں' وہیں صابرہ کے سامنے ایک عجیب شرمندگی احساس نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔

''ہمارے بابو کے لیے کوئی گرین کارڈ ہولڈر بتایئے ناں...... ہمارا بیٹا بہت خابل ڈاکٹر ہے۔'' غوثیہ کسی رشتے دار خاتون سے خوشامدی لہجے میں کہہ رہی تھیں' جو اس شادی میں شرکت کرنے امریکا سے آئی تھیں

''امریکا میں تو ڈاکٹر کو ڈالر کی مشین بولتے۔ اگر اس کی شادی وہاں ہوگئی تو آپ لوگاں کے پاکستان محلاں بن جائیں گے۔''

''تو پھر جلدی کیجئے ناں...... ایسی اچ لڑکیاں آپ کی جاننے والیاں ہوں گی' آپ کا حلقۂ احباب انہوں کے واسطے کچھ کیجئے ناں۔''

''میں آپ کو اچھی لڑکی بول تو دوں پن اس وخت تو دوسری اچ بات ہے۔''

غوثیہ نے حیرت اور اچنبھے سے ان کا منہ دیکھا کہ جیسے پوچھ رہی ہوں کہ اری مردار! اس میں نہ بتانے کون سی بات ہے؟

''اگر آپ لوگاں کو میری بتائی لڑکی پسند اچ نہیں آئی...... تو بے چاری کا دل ٹوٹ جائیں گے۔'' وہ بھی

سروں جمانا چاہتی تھیں یا بعض لوگ شادیوں کو گڈے گڑیا کا کھیل ہی سمجھتے ہیں۔

''دل کائیں کو ٹوٹیں گا...... ابھی اچ یہ وخت نئیں ہے کہ امریکا کی لڑکی کو ریجیکٹ کیا جائے'' دل کی بات کہہ دی گئی۔ (اب بات ہی مک گئی تھی)

''آپ خوائی نخوائی فکر کرتے پاشا! بات پکی سمجھو ہاؤ۔''

یہ جملہ کیا تھا' من مانگی سوغات تھی۔ تو فکی کا تاج تھا جو انہیں مل گیا تھا۔ اب وہ مارے محبت کے ان صاحبہ کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔

یہ صورت حال دیکھ کر ان صاحبہ نے سرشار سے انداز میں اپنا پرس کھولا...... دو چار زپیں کھولیں' بند کیں پھر آنکھیں چندھی کر کے ادھر ادھر ٹٹولا۔ بالآخر ایک لفافے میں سے ایک تصویر نکال کر انہوں نے غوثیہ کو دکھائی۔

''آپ کو مبارک ہو...... پہلے اچ اپنی بہو کو منہ دیکھ لو آپ۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

غوثیہ نے جی ہو کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور تصویر پر نظر پڑتے ہی ان کے ہاتھوں میں لرزہ سا شروع ہو گیا اور چہرہ کالے سے جامنی ہو گیا۔

''لڑکی میری سگی بھتیجی ہے...... بول کے۔ آپ انہوں کے واسطے رشتہ دیے۔ آپ...... آپ بول دیو...... میں کب لڑکے کو انگوٹھی ہور پھولاں پہنانے کے لیے آؤں؟''

غوثیہ کی حالت تو دیدنی تھی۔ آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کوئی نادیدہ چیز دیکھ لی ہو۔ ان کے ہاتھ سے فاخرہ نے تصویر اچکی اور ایسے ہی رنگ ان کے چہرے پر چھا گئے۔ وہ بھی جب بولنے کے قابل نہ رہیں تو وہ تصویر صابرہ نے اچک لی۔

ایک انتہائی موٹی لڑکی...... جو شارٹ اور بلاؤز میں تھی۔ اچھی عمر رسیدہ بھی تھی' آئس کریم کھاتے ہوئے اس بری طرح ہنس رہی تھی کہ بتیس سے زیادہ دانت دکھائی دے رہے تھے۔

''پہلے ڈاکٹر صاحب کو تو اپنی بیوی کا علاج کرنا پڑے گا'' صابرہ نے ہنس کر کہا تو غوثیہ کے حواس ذرا بحال ہوئے۔

''میرا بابو ابھی شادی کے ننٹے میں نکیں پڑنا چاہتا۔ یہ میں ہی اچ چاہتی ہوں۔'' وہ تاسف زدہ لہجے میں بولیں۔

''یہ تو سب ماواں کے ارماناں ہوتے ناں بول کے۔ آپ بتاؤ ناں...... ہم لوگاں نے کب آنے کا آپ کے گھر؟'' وہ صاحبہ بھی شہد کے چھتے کی طرح چمٹ رہی تھیں۔

''ابھی میں کچھ نکیں کہہ سکتی آپ کو'' غوثیہ نے کرسی پیچھے کرتے ہوئے بھاگنے کی راہ سوچی۔

''اچھا...... آپ اپنا موبائل نمبر دیجئے ناں...... باتاں ہوتی رہیں گی ناں آپ سے۔''

''میرے پاس موبائل نکیں ہے'' انہوں نے جھوٹ بولا۔

''خاور بھائی کے خریب گھر ہے ناں آپ کا......؟'' وہ بھی کسی بلا سے کم نہیں تھیں۔

''نہیں...... وہاں سے تو ہم چلے گئے...... میں تو کبھی اپنی امی کے ہاں ہوتی تو کبھی بھائی کے۔ مجھے تو خود یہ پتا نہیں ہوتا کہ میں آج کہاں ہوں گی'' اب غوثیہ لگیں پاگل پنے کی باتیں کرنے۔

آپ کے بیٹے کا تو مستخبل سنور جائے گا جی! ڈالر کما کما کر آپ کا گھر بھر دیں گے وہ......'' انہوں نے پھر خواب دکھانے شروع کر دیے۔

"فاخرہ بھابی! آپ میرے کو بولے تھے...... میرا بیٹا کسی کے چکر میں ہے' یہ صحیح بات تھی ناں......؟" [illegible] نے اپنی بھاوج کا ہاتھ دباتے ہوئے چال چلی۔

"چکر میں کیا...... میرا تو پکا خیال ہے کہ اس نے شادی بھی کر لی ہے...... آپ خوائی نخوائی لڑکیاں دیکھنے بیٹھے" فاخرہ نے ان کی بات سمجھ کر کچھ زیادہ ہی لمبی چھلانگ لگائی۔

"ہونہہ...... ایسا اچ بولو ناں...... شادی شدہ کے لیے لڑکیاں ڈھونڈتے بیٹھے تم......" ان صاحبہ نے اس موئی کی تصویر چھینتے ہوئے کہا اور اس ٹیبل سے اٹھ کر چلی گئیں تب غوثیہ اور فاخرہ کو پر سکون حالت میں آتے دیکھ کر صابرہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ فاخرہ اور غوثیہ کیسی نڈھال سی ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔

اک ذرا سی بات نے انہیں کتنا پریشان کر دیا تھا۔ صابرہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھیں اور وہ دونوں خفت زدہ سی ہو کر ہنس بھی نہیں پا رہی تھیں۔

☆☆☆

شجاع ماں کو گھر لے آیا تھا۔ عظمت بیگم کا موڈ بہت زیادہ اچھا نہیں تھا۔ گھر تو وہ آ گئی تھیں مگر نگین سے بات چیت کرنا انہوں نے بالکل بند کر دیا تھا۔

کہاں تو وہ اپنے پوتے کو صبح سویرے ہی لے کر بیٹھ جاتی تھیں' وہاں اب وہ اسے نظر بھر کر نہ دیکھتیں' خصوصاً نگین اور شجاع کے سامنے تو وہ بالکل ہی لاتعلق سی بن جاتیں۔

نگین نے آ کر ان کا شجاع ان سے چھین لیا ہے۔ یہ احساس ان کے دل میں جڑ پکڑ گیا تھا۔ نگین نے نہ تو ان سے کبھی بدتمیزی کی تھی اور نہ ہی وہ ان سے کبھی بحث و مباحثہ کرتی تھی۔ دوسرے بچے کی آمد نے اسے بے حد کمزور سا کر دیا تھا۔ مستقل الٹیوں اور چکروں نے اسے نڈھال سا کر دیا تھا۔

اس کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ پھپھو کا ہاتھ بٹائے مگر وہ کچھ کر ہی نہیں پاتی تھی۔ بےبسی کا احساس اس پر مسلسل حاوی ہو رہا تھا۔

ایک دن جب شجاع گھر سے باہر تھا' نگین نے ان سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں امی کے پاس چلی جاؤں......؟ یہاں میں اپنا کام بھی خود نہیں کر پا رہی ہوں۔"

"نگین! تم نہ جانے کس قماش کی بہو ہو۔ تمہارا دل اپنی سسرال میں لگنے کے بجائے اپنے میکے میں زیادہ لگا کرتا ہے۔ جتنا عرصہ تمہاری شادی کو ہوا ہے' اس میں زیادہ دن تو تم اپنی امی کے ہاں رہی ہو۔ اگر شادی سے پہلے یہی پلان تھا تم لوگوں کا تو پہلے ہی بتانا تھا' میں شجاع کو رخصت کر کے تمہارے گھر بھیج دیتی۔ فیروزہ کے لڑکا بھی نہیں ہے' گھر داماد ملتا تو مفت کا بیٹا ہاتھ آ جاتا۔"

"نہیں پھپھو! میں شجاع کو اپنے ساتھ لے جانے کو تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ میں تو اکیلی جانا چاہتی ہوں" نگین ساس کی باتیں سن کر روہانسی سی ہو گئی۔

"یہ بات تم جانتی ہی ہو کہ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے گا۔ تم سے زیادہ ارحم کو وہ سنبھالتا ہے' بچے کے بغیر وہ ہرگز نہیں رہ پائے گا۔"

"میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو میں جلد گھر آ جاؤں گی۔"

"یہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں' تمہاری طبیعت یہاں رہ کر کیوں نہیں ٹھیک ہوتی' یہاں بھی اچھی ڈاکٹر ہیں' ان کے ہاتھ میں بھی شفا ہے...... تو پھر تم کراچی کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"یہاں رہ کر میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" نگین نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ماں' بیٹے کی مسلسل لڑائیوں سے وہ واقعی عاجز آ چکی تھی۔

"یہ کہو...... ہماری شکل دیکھ کر تمہیں وحشت ہوتی ہے۔ سو بار جاؤ...... اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کہہ یا کوئی بات شجاع سے...... وہ تو تمہاری ہر بات کا یقین کرتا ہے۔ خدا جانے میرے بچے کو کیا گھول کر پلا دیا ہے گھر میں داخل ہو کر چیخ و پکار مچانے لگتا ہے۔"

"لڑائی جھگڑے سے مجھے ڈپریشن ہوتا ہے...... یہ سب مجھے بالکل بھی نہیں اچھا لگتا ہے۔"

"پھر تمہیں کیا اچھا لگتا ہے......؟" وہ تحقیر بھرے لہجے میں بولیں۔

"مجھے سکون اچھا لگتا ہے' خاموشی اچھی لگتی ہے۔ یہ سب جو گھر میں ہو رہا ہے...... اس سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ شجاع جب زور سے بولتے ہیں تو میری روح فنا ہوتی ہے۔"

"واہ' بھئی واہ! بڑے اچھے بیان ہیں تمہارے...... یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوتا ہے اور تمہیں ہی اچھا نہیں لگتا؟ بی بنو......! تمہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ اب صرف لڑائی جھگڑوں سے تمہیں مزہ نہیں آ رہا...... جو تم بیزار بھی جانی چاہیے...... تا کہ کچھ نیا پن پیدا ہو...... اور تم مزید لطف حاصل کر سکو۔" عظمت بیگم کے جملے پتھروں کی طرح اس کے لگ رہے تھے اور وہ حواس باختہ سی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ مٹکے کے پاس بھرا ہوا کٹورا وہ اپنے لبوں تک بھی نہیں لے جا سکی تھی۔

تب عظمت بیگم حکیم جی کے ہاں چلی گئیں کہ آج کی لڑائی کی تفصیل بھی تو انہیں سنانی تھی۔

چھوٹے چھوٹے سے' ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے مکانوں میں ایک بات انتہائی اہم ہوتی ہے۔ ان کے ہر دکھ سکھ' راز و نیاز سے وہ مکمل آگہی رکھتے ہیں۔ بہوؤں کے دکھڑوں سے بہوئیں آگاہ اور ساسوں کے مسائل سے ساسیں آگاہ ہوتی ہیں اور یوں ہر گھر اور ہر محلے میں بغیر چناؤ کے دو پارٹیاں خود ہی وجود میں آ جاتی ہیں۔

اب عظمت بیگم پڑوس میں اسی وجہ سے گئی تھیں کہ آج کی کارروائی کی وہ حکیم جی کی بیگم سے داد لے سکیں اور وہ کہنا بھول گئی ہیں' وہ حکیم جی کی بیگم سے وصول کر کے لے آئیں کہ ان کی تین بہوئیں تھیں' اس لحاظ سے وہ عظمت بیگم کے مقابلے میں سینئر تھیں اور ان کی باتیں انتہائی عاقلانہ تھیں۔

"عظمت! میرا تو یہ خیال ہے کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے ایشیا میں بہوؤں کی صرف تین اقسام ہوتی ہیں۔" انہوں نے انتہائی مدبرانہ انداز میں پان کی گلوری منہ میں رکھ کر تمباکو پھانکتے ہوئے کہا۔

"کون سی اقسام ہیں؟" عظمت بیگم نے دلچسپی لیتے ہوئے پاندان اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ دو گھنٹے سے ان کا خالی منہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مارے غصے میں انہیں پان تک کھانا یاد نہیں رہا تھا۔

"بہوؤں کی صرف تین ہی قسمیں ہیں۔ چاہے کسی کے گھر چلے جاؤ...... سب ان ہی قسموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ پڑھی لکھی ہوں یا جاہل' گاؤں گوٹھوں کی ہوں یا شہروں کی...... مگر ہوتی سب ایک ہی ہیں۔" اب حکیم جی کی بیگم کسی سیاست داں کی طرح خلاؤں میں گھورتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"اب جلدی سے بتا بھی چکو...... تا کہ مجھے بھی تو پتا چلے کہ نگین کی قسم کون سی ہے اور اس سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے؟"

"پہلے نمبر پر ہیں بری بہوئیں......" انہوں نے انگلی پر گنتے ہوئے کہا "دوسرے نمبر آتی ہیں بہت بری بہوئیں...... اور تیسرے نمبر پر ہیں بدترین بہوئیں' جن کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔"

’’اس لحاظ سے تو نگین کا نمبر پہلا ہوا کہ بری ہے...... میاں کو سکھاتی پڑھاتی ہے، مجھ سے منہ ماری نہیں کرتی ہے۔‘‘ عظمت بیگم نے طمانیت سے کہا۔

’’نگین زیادہ بری بھی نہیں ہے...... بس شہر اور گاؤں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکی ہے...... دنیا کی عورتوں کے بچے ہوتے ہیں، اس کے کوئی انوکھے بچے تھوڑی ہو رہے ہیں، جو وہ حجرے میں بند رہتی ہے۔ تم سے محبت سے اپنی پریشانی بتاتی تو تم خود اسے اپنے سینے سے لگائے رکھتیں۔ تمہاری عادت کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ کس قدر جان چھڑکنے والی ہو۔‘‘

’’مگر وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے...... میری شکل دیکھ کر اس کا منہ بن جاتا ہے۔‘‘

’’یہی تو کہہ رہی ہوں کہ وہ مکار ہونے کے بجائے تھوڑی سی پاگل بھی ہے اس لیے اسے کم بری بہو یا قدرے بہتر بہو بھی کہہ سکتے ہیں۔‘‘

’’نہیں بھابی! آپ کو اپنی بہوؤں کے مقابلے میں ہمیشہ نگین بہتر لگتی ہے...... جب کہ میرا خیال ہے نگین کے مقابلے میں آپ کی بہوئیں زیادہ بہتر ہیں۔ کس قدر کام کاج کرتی ہیں گھر کا...... آپ تو اپنے گھر میں پھلی نہیں پھوڑتی ہیں...... جبکہ میرا تو وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ مجھے تو احساس ہی نہیں ہوا کہ گھر میں کوئی آیا ہے، اس کے وجود کی آسودگی کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ رات کو سونے سے پہلے پانی کی بوتل بھر کر پہلے بھی رکھتی تھی، اب بھی رکھتی ہوں۔ دودھ گرم کر کے بیٹے کو دیتی تھی، اب بھی دیتی ہوں بلکہ اب بیٹے کے ساتھ ساتھ بہو کو بھی دیتی ہوں جو وہ روزانہ پیتی ہے مگر دودھ کا گلاس اس نخرے سے وصول کرتی ہے جیسے میں خواہ مخواہ لے آئی اور وہ اسے چکھیں بھی نہیں۔‘‘

’’اس کی ماں نے اسے طور طریقے سکھائے ہی نہیں۔ یہ تو تربیت کی باتیں ہیں جو ہر لڑکی کو اپنے گھر سے سیکھ کر آنی چاہئیں۔ اگر اسے نگین نہیں جانتی تو اس میں زیادہ قصور فیروزہ کا ہے، جس نے بیٹی تو پال لی مگر اسے سنوارنا بھول گئی۔‘‘

’’مگر ان تمام باتوں میں میرا کیا قصور ہے...... اچھی خاصی فرح آنا چاہ رہی تھی...... اور مجھے بھی وہ اچھی لگی تھی...... بیٹے کی پسند بھی تھی۔ میں تو بھتیجی لا کر پچھتائی...... پھپھو زبان سے ضرور کہتی ہے مگر اس رشتے کا پاس نہیں کرتی ہے۔ شجاع جب اس کے سامنے مجھ پر چڑھ کر آتا ہے تو بجائے اسے روکنے کے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس طرح بیٹھ جاتی ہے جیسے تصویر بنوانے کے لیے ادائیں دکھا رہی ہو۔‘‘

تب حکیم جی کی بیگم کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور رازدارانہ لہجے میں بولیں ’’...... ادائیں تو تم نے دیکھی ہی نہیں جو میری نئی بہو نے اپنائی ہیں۔ جہاں اس کے خلاف مزاج بات ہوئی اس پر دورہ سا پڑ جاتا ہے اور وہ ایسی ایسی غلیظ گالیاں سناتی ہے کہ الٰہی توبہ! اور جب اس کا یہ بھوت اتر جاتا ہے تو ایسی معصومیت سے مجھ سے کہتی ہے اماں جی! مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ میں نے آپ سے کیا کہا تھا؟ تب میں اس سے کہتی ہوں کہ تو مجھے چڑیل، ڈائن اور جانے کیا کیا کہہ رہی تھی...... مگر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر کمال مکاری سے ہائے ہائے کی آوازوں کے ساتھ کہتی ہے اماں جی! میرے منہ میں خاک، میں اپنی پیاری پیاری اماں کے لیے ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔‘‘

تب عظمت بیگم بھی ہنسنے لگیں۔ لسی کے گلاس ایسے ہی ہنسی مذاق میں پی گئے۔ وہ جو اپنی من بھر کی ٹینشن لے کر پڑوس میں گئی تھیں، وہ خاصی رفع ہو گئی تھی۔ دوسری جانب گھر میں نگین، شجاع کو یہ سمجھا رہی تھی۔

’’آپ پھپھو سے نرم لہجے میں بات کیا کریں، آپ کے غصے سے وہ بے حد دکھی ہو جاتی ہیں، کتنی محبت کرتی

وہ آپ سے اور آپ غصے میں حفظ مراتب تک بھول جاتے ہیں۔‘‘

’’نگین! تمہیں ہر وقت دوسروں کا خیال رہتا ہے، مگر تمہیں تو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ فرحت آتی ہے تو وہ ے کیڑے تمہارے اندر ڈال دیتی ہے اور اماں ہر پریشانی کی وجہ تمہاری ذات کو ٹھہراتی ہیں۔ دودھ ابلتا ہے تو تمہاری وجہ سے کہ تم نے چولہے کی آنچ تیز کر دی تھی۔ ان کے ہاتھ سے گلاس ٹوٹتا ہے تو وہ بھی تمہاری وجہ تم نے گلاس گھڑونچی پر آگے رکھ دیا تھا جو ان کی کہنی لگنے سے ٹوٹ گیا۔ تمہیں الٹیاں ہوتی ہیں تو وہ اسے ی کے خانے میں لے جاتی ہیں، تمہیں چکر آتے ہیں تو اسے وہ تمہاری اداکاری کہتی ہیں۔ کیا میں یہ سب نہیں ہوں، تو پھر میں ان کی غلط بات کیسے مان سکتا ہوں...... میں کوئی اندھا تو نہیں ہوں۔‘‘

’’آپ میرے کہنے کا اتنا بھی خیال نہیں رکھ سکتے‘‘ نگین نے پریشان سے لہجے میں کہا اور آنکھوں میں آنسو ئے۔

’’تم جو کہو گی، میں وہی کروں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہیں دکھی کیسے دیکھ سکتا ہوں۔‘‘

’’تو پھر آپ وعدہ کیجیے...... پکا والا وعدہ......‘‘ نگین نے ہنس کر کہا۔

’’میری جان! بالکل پکا وعدہ کرتا ہوں، اب کہو کیا بات ہے؟‘‘

’’بات کوئی نئی نہیں ہے...... وہی پرانی ہے، آپ پھپھو اور فرحت آپا کے ساتھ اسی طرح پیش آئیے جیسے میں کہتی ہوں۔‘‘

’’اچھا...... ٹھیک ہے جانو!‘‘ شجاع اس کی بات سن کر ہنسا اور گھر میں داخل ہوتی ہوئی عظمت بیگم نگین کے یہ ن کر تھرا کر رہ گئیں۔

’’اس کی یہ ہمت...... میرے چھ فٹ کے گبرو کو اپنے حساب سے چلائے گی؟ جو یہ کہے گی، وہی وہ بولے اتنی سی لڑکی...... اتنی بڑی آفت۔‘‘ وہ وہیں آنگن میں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس سے ان کا سر بری طرح ر ہا تھا۔

☆☆☆

پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے گرا اور پانی کے ساتھ کانچ کے ٹکڑے اشرف کے پیر پر آ گرے۔

’’تو نے سوچا کہ میرا دوسرا پیر کیسے ٹھیک ہے، اس میں بھی کچھ ہو جانا چاہیے‘‘ اشرف اسے خونخوار نظروں سے تا ہوا بولا۔

’’پتا نہیں کیسے گر گیا......‘‘ وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی کہ اصل بات کیسے بتاتی کہ اے ذلیل شخص، تم ل میرے مرے ہوئے باپ کو گالیاں دے رہے تھے اور میری برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے تو یہ گلاس تمہارے سر پر دے مارنا چاہیے تھا۔ وہ تو میں نے زمین پر ہی مار کر اپنے غصے کو کم کرنے کی سعی کی تھی۔

’’یہ تو ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہے؟ میں بات کرتا ہوں تو تیرا دماغ کہیں اور ہوتا ہے۔ اب کانچ کے ٹکڑے نے کے ساتھ نیم کے درخت کو کیوں تکے چلی جا رہی ہے‘‘ اشرف کا چوکیداری نظام خاصا سخت تھا۔

’’نیم کو دیکھ رہی ہوں کہ اس میں آم کب لگیں گے؟‘‘

’’سارے ہی پاگل اس گھر میں آنے تھے...... تمہارے گھر میں نیم کے درخت میں آم ہوتے ہوں گے۔‘‘

وہ چپ رہی اور کسی کام کے بہانے سے اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اشرف کے پیر کی تکلیف بڑھتی ں تھی۔ جس حکیم سے اسے آرام آیا تھا، اس کے پاس وہ گیا نہیں تھا اور اب جس کا علاج ہو رہا تھا، اس کی

باتیں اور دلاسے اتنے قوی تھے کہ اشرف کا یہی خیال تھا کہ بہت جلد اس کی ٹانگ ٹھیک ہو جائے گی۔ ان دنو بیساکھی کے سہارے اپنی دکان جا رہا تھا اور جب دکان سے آتا تو اپنی تمام ٹینشن اور بے چینیوں کا ازالہ فر ڈانٹ پھٹکار کر نکال لیا کرتا تھا۔

''پتا نہیں کیسی بہو گھر میں آئی ہے' پریشانیوں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اس کے آنے کے بعد سے نانی اماں پیروں کا درد ہی نہیں جاتا۔ اماں کی آنکھ میں اچانک موتیا پک گیا۔ بڑی آپا کی سسرال میں خواہ مخواہ کی ہونے لگیں...... اور بیٹھے بٹھائے اشرف بھائی کی ٹانگ میں ایسی تکلیف شروع ہوئی ہے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے'' چھوٹی آپا نے بلند آواز میں اپنی ماں سے کہا۔

''اپنی قسمت ہی خراب تھی تو کیا کر سکتے ہیں......'' اماں نے آہیں بھرنی شروع کیں۔ ''ایسی اچھی نظر میری اندھیرے میں رکھی چیز نظر آ جاتی تھی' سوئی کے ناکے میں کچے سے دھاگا ڈال لیا کرتی تھی اور اب دیکھو مخواہ کی پریشانی سر چڑھ آئی اور آنکھ میں موتیا اتر آیا۔''

''تمہاری بہو کے آنے سے پریشانی نہیں' پریشانیاں گھر میں آ گئی ہیں۔ میری ٹانگوں میں مجال ہے کہ درد ہوتا ہو۔ ہر جگہ ایسی گھوڑا سی گھوما کرتی تھی میں اور اب...... ٹخنوں میں ایسا درد ہوتا ہے کہ گھر میں بھی چلا جاتا اور یہ اتنی بدذات ہے کہ جب کہو تب دباتی ہے' کبھی خود سے مجال ہے کہ گھنٹے دو گھنٹے میری ٹانگیں داب کرے...... اور کل تو ایسے پولے پولے ہاتھوں سے دبا رہی تھی کہ مجھے غصہ ہی آ گیا۔ وہی ٹانگ ماری اور سے کہا دبا رہی ہے یا سہلا رہی ہے؟ اتنی بڑی لوتھا کی لوتھا ہو گئی' تجھے ٹانگیں تک دبانی نہیں آتیں۔''

''ہاں اماں! اب اپنی قسمت ہی خراب ہے تو کہاں تک روئیں۔ جوان بیٹا جب بیساکھی کی کھٹ کھٹ ساتھ چلتا ہے تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے مگر چپ کی چپ رہ جاتی ہوں اور اس کو ایک لفظ نہیں کہتی۔''

''ایسی بادشاہی کہاں ملنی تھی اسے۔ کوئی اسے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔ ساری ساری رات سوتی رہتی اتنا آرام کرنے سے اس کی کمر نہیں ٹوٹتی ہے۔'' اب نانی اماں کے ساتھ اماں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ تھیں اور ان سے دس گز کے فاصلے پر بیٹھی فرح خاموشی سے پالک بنا رہی تھی۔

☆☆☆

قندیل کے بچوں کی سالگرہ تھی۔ اپنے تمام دوست احباب بلائے تھے۔ اس کی گہری سہیلی سلمیٰ مرزا ساتھ جمال' ربیع اور ان کی والدہ کو بھی لے کر آئی تھی۔

سلمیٰ مرزا جمال کی کمپنی میں کام کرتی تھیں اور بہت شفیق سی خاتون تھیں۔ ان سے جب جمال نے کہا '' ازسا گا'' آ کر دوستوں کی نہ صرف کمی محسوس ہو رہی ہے بلکہ والدہ اور بہن بھی گھر میں نظر بند ہو کر رہ گئی انہوں نے قندیل کو فون کر کے کہا تھا' میں تمہارے فنکشن میں پاکستان سے آنے والی ایک نئی فیملی کو بھی آؤں گی۔

''تم جس کو دل چاہے اپنے ساتھ لا سکتی ہو'' قندیل نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

اور آج کی تقریب میں جمال اپنی بہن اور ماں کے ساتھ قندیل کے ہاں موجود تھے۔

قندیل نے بطور خاص اپنے تمام مہمانوں سے ان کا تعارف کروایا اور بڑی محبت سے کہا کہ یہ لوگ اب ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے ہیں اس لیے ہر تقریب میں ان کی شرکت ضروری ہونی چاہیے۔

تب سلمیٰ مرزا نے کہا ''آئندہ ہفتے میں اپنی رہائش گاہ پر جمال کی فیملی کے اعزاز میں ایک ڈنر رکھ

ہم سب میں یہ اچھی طرح مکس ہو جائیں۔''

''سلمیٰ باجی! اس کا آپ تکلف نہ کریں' ہم آپ لوگوں سے گاہے بگاہے ملتے رہیں گے' مگر اپنا ویک اینڈ تو ادا کریں۔''

''یہ باتیں مت کرو...... کہ سب سے نمٹ کر تمہاری باری بھی آئے گی...... اور ہم سب تمہارے اپارٹمنٹ ہوں گے۔'' سلمیٰ نے ہنس کر کہا۔

''تو پھر یوں کیجیے...... آئندہ ویک اینڈ پر آپ سب لوگ میرے غریب خانے پر تشریف لائیے...... کیوں '' جمال نے اپنی والدہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ بات بالکل صحیح ہوگی'' والدہ نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں آنٹی! آپ کا نمبر سب سے آخر میں آئے گا' پہلے آپ سب کے گھر تو دیکھ لیں' اور یہ اندازہ بھی لیں کہ ہم لوگوں کی کوکنگ کیسی بری بری ہے۔ کیسی کیسی ڈشز وجود میں آتی ہیں جو ہم ہی جانتے ہیں'' قندیل را کر سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''قندیل کی بات سے ہم متفق ہیں'' سب مہمانوں نے یک زبان ہو کر کہا' تب جمال کو ان کی بات قبول نی ہی پڑی۔

ع کو یہاں آ کر اس لیے بھی لطف زیادہ آیا تھا کہ اس کی ہم عمر لڑکیوں کی بڑی تعداد تھی جو سب ربیع سے بت سے باتیں کر رہی تھیں۔

اس کے لمبے سیاہ بالوں کی تعریف کر رہی تھیں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کو سراہ رہی تھیں' اس کی چمکتی وبصورت اسکن کی تعریف کر رہی تھیں مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی لڑکھڑاتی چال کے اسباب نہیں تھے۔

ع ان سے باتیں کر کے بے حد لطف محسوس ہو رہی تھی اور اس کی معلومات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

''یہاں ہر علاقے میں ایک بڑی لائبریری ہے' جس میں اردو سیکشن بھی موجود ہے۔ یہ لائبریری کئی منزلہ ہے اور اس کے منتظم ہر فلور کے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ یہاں جا کر مطالعہ کرنے میں بے حد لطف آتا ہے یکشن میں جا کر پاکستانی ادیبوں کی کتب دیکھ کر تو ازحد خوشی ہوتی ہے۔ اس سیکشن میں نقوش کے شمارے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن کے ناول نظر آتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان کی کتابیں بھی ہیں۔ بانو قدسیہ' ممتاز مفتی کی کتب وہاں انجم انصار کی جلترنگ اور چاندنی بھی موجود ہے۔''

''میں واقعی ان لائبریریوں کو دیکھنا چاہوں گی۔'' ربیع نے بے ساختہ کہا۔

''اس میں مشکل کون سی ہے' کسی بھی شام کو ہم تمہیں اپنے ساتھ لائبریری لے جائیں گے اور واپسی پر تمہیں ے گھر ڈراپ کر دیں گے۔''

ع حیرت اور مسرت کے ساتھ اپنی ان دوستوں کو دیکھ رہی تھی' جن سے اس کی پہلی پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے ساتھ انتہائی پرخلوص تھیں۔

ایک ایک کر کے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گزر رہے تھے۔ ربیع کا اور ان کی امی کا دل ٹورنٹو آ کر لگ گیا تھا۔ یہاں پاکستانی کمیونٹی نے جس طرح انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا' ایسی تو رشتے داروں نے بھی کبھی نہیں کی تھی۔

اب ربیع کا دل یہاں لگ گیا تھا۔ ٹیلی فون پر بھی اس کی بات ہوتی رہتی اور ہر ویک اینڈ پر کسی نہ کسی میں کوئی تقریب ہوتی۔

ربیع اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ جلد ہی سب سے مانوس ہوئی اور ان سب اسے اچھا لگنے لگا اور جب ایک شام اس نے جمال سے یہ کہا کہ بھائی جان کراچی سے یہاں آ کر ہم نے تو وہ یکدم چپ سا ہو گیا۔

"کیوں بھئی...... چار دن میں یہاں کی عادی ہو گئیں؟" ماں نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہاں آ کر دل لگ سا گیا ہے۔ وہاں تو بہت گھبراہٹ ہوتی تھی مجھے...... اور یہاں ایسی کوئی بات لگتی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ پردیس میں آ کر تم پریشان نہیں ہوتیں؟" جمال جب بولنے کے قابل ہوا نے کہا۔

"کیا آپ یہاں انجوائے نہیں کرتے......؟" ربیع اس سے بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"کیوں نہیں......؟" وہ زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

"میرا دل تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ یہیں رہوں......" ربیع نے ہنس کر کہا۔

"مگر میں تو جانا چاہوں گا" جمال تڑپ کر بولا۔

"ارے بیٹا! اپنا ملک اپنا ہوتا ہے' یہاں ہم لوگ عارضی طور پر آئے ہوئے ہیں' واپس تو جانا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک کہتی ہیں امی آپ! مگر یہاں کے سب لوگ مجھے بہت یاد آئیں گے۔" ربیع نے سوچتے ہو میں کہا۔

"دیکھیں امی! ربیع تو ایسے پریشان ہو گئی ہے جیسے اسے کل کراچی جانا ہو' جمال نے مذاق میں اس کھینچتے ہوئے کہا۔

تب ربیع بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔ "میں تو ایسے ہی ایک بات کہہ رہی تھی بھائی جان! آپ مذاق بھی بنا لیا۔"

"نہیں گڑیا! میں بھی ایسے ہی کہہ رہا ہوں۔ تم ہنستی رہو' خوش رہو' مجھے تم ایسے ہی اچھی لگتی ہو...... بلکہ اچھی لگتی ہو۔"

جمال اس کے چپت مارتے ہوئے باہر نکل گیا اور ربیع ماں کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ گئی جہاں وہ اخبارات کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ پاکستان سے آنے والے' ملنے والے اپنے ساتھ جہاز میں بانٹے گئے اخبارات و رسائل کے پلندے بھی ساتھ لے آیا کرتے تھے' جو باری باری تمام ملنے والوں میں گھوما کرتے۔

☆☆☆

بعض فیصلے اچانک ہی ہو جاتے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ ان فیصلوں میں نہ کسی کوششوں کا ہے اور نہ ہی برس ہا برس کی دوستی اس کا سبب بنتی ہے۔ کس کا جوڑا کہاں بنایا گیا ہے' اس بارے میں کو جانتا۔

جمال' اس کی والدہ اور ربیع سے مل کر مسز مختار کو ایک ہی خیال آیا تھا کہ یہ لوگ بے حد بھلے' محبت کرنے اور ریاکاری سے پاک ہیں۔ ان سے دوستی اب رشتے داری میں بدل جانی چاہیے۔

نہ صرف انہیں بلکہ ان کے بیٹے کو بھی پہلی ملاقات میں ہی اچھی لگی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک دم سے ے جائے سوچوں میں غرق تھیں۔ ان کی پہلی دو بہوئیں بے حد خوبصورت اور چاق چوبند تھیں۔ جس ہا تیں' چھا سی جاتیں مگر ان کا اخلاق اتنا برا تھا کہ وہ خوبصورت ہونے کے باوجود انہیں کبھی خوبصورت لگیں۔

رتی صرف اچھے اخلاق کی مرہون منت ہوتی ہے۔ بدتمیز اور بداخلاق لوگ کبھی خوبصورت ہو ہی نہیں ان کا احساس ایک یقین سا بن گیا تھا۔

ے لیے جب انہوں نے ربیع کا نام لیا تو ان کے میاں نے فوراً خوشی کا اظہار کیا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ تھے کہ اس کا یہ معمولی سا عیب مستقل فزیوتھراپی سے دور ہو جائے گا۔

آپ بھولے آئیے۔ اس کے پیر کے مسئلے کی وجہ سے کسی سوچ و بچار کے طوفانوں سے مقابلہ نہ

اب مجھے کسی سوچ و بچار کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی پیاری عادتوں والی بچی ہے کہ دیکھ کر دل خوش شائستگی اس کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ بڑوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے' چھوٹوں سے مخاطب انداز کیا ہونا چاہیے' وہ سب جانتی ہے اور جس محفل میں بھی چلی جائے' ایک غیر محسوس انداز میں میزبان ہیلپ کرتی ہے کہ کسی کو پتا تک نہیں ہونے دیتی کہ اس نے آ کر کیا کیا کام نمٹا دیے ہیں۔"

☆☆☆

جمال کے اپارٹمنٹ میں سب مہمان جمع تھے۔ ربیع نے اپنی والدہ کی مدد سے بہت سی ڈشز بنائی تھیں۔ م کا قیمہ' بہاری کباب اور ہرے مسالے کی چانپیں بطور خاص بنائی تھیں۔ سب مہمان ہر نوالے پر کھا کر ے برسا رہے تھے۔

ر بطور خاص ربیع کو دیکھ رہی تھیں۔ ہنستی' کھلکھلاتی معصوم سی لڑکی انہیں بڑی سلیقہ مند سی لگی تھی۔ کی بات اور تھی کہ ہر چیز لذت لیے ہوئے تھی مگر اس کو پیش کرنے کا سلیقہ نہ صرف بے حد دلکش تھا بھی تھا۔ تلی ہوئی چانپوں کی ہڈی پر المونیم فائل کو لپیٹا گیا تھا تاکہ کھانے والوں کے ہاتھ بھی چکنے نہ ہیں۔ جوسز میں مہمانوں کی پسند کا خیال رکھا گیا تھا ورنہ ہر دعوت میں کوئی بھی ایک جوس رکھا جاتا تھا مگر لے والی چند دعوتوں میں شرکت کرنے کے بعد اسے یہ تک اندازہ ہو گیا تھا کہ کسے شوگر ہے اور کسے ل اور ان دونوں کیٹیگری سے تعلق رکھنے والے مہمانوں کو کیا دینا چاہیے۔ اتنی خوبیوں کی حامل لڑکی الی تھی کہ وہ ایک ٹانگ قدرے گھسیٹ کر چلتی تھی۔

ساری خوبیوں کی موجودگی میں یہ خامی کچھ بھی نہیں۔ بہت سی لڑکیاں ٹھیک ٹھاک ہوتے ہوئے بھی ایسی چال چلتی ہیں' اتنے بھیانک طریقے سے ہنستی ہیں' اتنے عیارانہ انداز میں بولتی ہیں کہ نہ ان کی طرف ل چاہتا ہے اور نہ ان کی کوئی بات سننے کو دل چاہتا ہے۔

نے ابھی ربیع کی انگیج منٹ کی یا نہیں؟" مسز مختار نے ان کی والدہ سے پوچھا۔

نہیں ہوئی...... مگر اب ہو جانی چاہیے' ہماری فیملی چھوٹی سی ہے اس لیے ایسا ہے۔"

کے ہاں فیملی سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے؟"

یسی باتیں کہاں اپنائی جاتی ہیں۔ جو اچھا ہے' وہ اچھا ہے۔ چاہے وہ فیملی سے ہو یا باہر سے۔"

”تو اگر میں اپنے بیٹے جرار کے لیے آپ سے ربیع مانگوں تو......؟“ مسز مختار نے بڑے محبت آ ان سے کہا۔

”تو میں جمال سے مشورہ کر کے آپ کو ضرور بتاؤں گی۔“

”میں کل ہی جرار کا بائیو ڈیٹا لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔“

”اس کی ایک تصویر بھی لے آئیے گا۔“

”جرار آج آیا نہیں مگر دیگر تقریبات میں تو آپ اس سے مل چکی ہیں۔“

”اس نظر سے میں نے نہیں دیکھا‘ اب دوسری نظر سے دیکھوں گی۔“ جمال کی والدہ نے مسکرا ک مختار بھی مسکرانے لگیں۔

اب وہ کیا بتاتیں کہ جرار کا دل ربیع کے لمبے سیاہ بالوں میں اٹک کر رہ گیا تھا......اور وہ ان سے کہہ رہا تھا کہ ربیع کے لیے ان کی امی سے جلد بات کریں......اور یہی ان کی بھی خواہش تھی۔

☆☆☆

”ایمان سے......؟“ فہمی نے سرشار سے لہجے میں حیرانی سمیٹ کر پوچھا۔

”تمہاری قسم!“ فہد نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کب تک......؟“ وہ چہرے پر خوشیاں سجائے پوچھ رہی تھی۔

”تم کہو تو کل تک......“ فہد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا۔

”ممانی جان کو آپ نے بتا دیا ہے؟“ یک لخت وہ پوچھ بیٹھی۔

”نہیں......“ وہ بھی ایک دم خاموش سا ہو گیا۔ چہرے کی خوشی اور لہجے کی سرشاری ایک دم اڑن

”کیوں......؟“ اس نے نظریں نیچے کیے پوچھا۔

”کسی دوسرے کی اولاد کو گود لینے کے حق میں وہ کبھی نہیں رہیں۔“

”مگر وہ بچہ تو ہم پالیں گے۔ وہ تو ہمارا بچہ کہلائے گا......پھر بھی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے‘ ان کے دماغ میں جو بات بیٹھی ہوئی ہے‘ اسے نکالنا کوئی آسا ہے۔“

”نہیں فہد! ایسا ہرگز نہیں ہو گا‘ میں ممانی جان کو ضرور سمجھاؤں گی اور مجھے پورا یقین ہے‘ وہ میر مان جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے‘ تم بات کرنا چاہتی ہو تو کر لو......ورنہ میں تو یہی چاہ رہا تھا کہ ان سے بات کیے لے آتے‘ کچھ دن وہ ناراض رہتیں‘ بعد میں بچے کو دیکھ کر اس کی محبت ان کے دل میں خود ہی پیدا ہو

”پہلے میں اپنی سی کوشش کر لوں‘ پھر آپ جو دل چاہے کیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے‘ تم اپنی سی کوشش کر لو“ فہد پھیکی سی ہنسی ہنسا۔

اگلے دن فہمی نے دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے ممانی جان سے کہا۔ ”فہد کے آفس کے ایک دوس بچہ گود لیا ہے۔ بہت پیارا سا بچہ ہے‘ آنکھیں تو اس کی بہت خوبصورت ہیں اور......“

”پاگل پنے کا ثبوت دیا ہے‘ آج کل اپنی اولاد اپنی نہیں ہوتی‘ پرائی اولاد کب اپنی ہو گی‘ جو وہ رہا ہے۔“ انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مانی جان! وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ دونوں میاں بیوی اس بچے کی اچھی سی تربیت کریں گے تو وہ بچہ بھی حقیقی ماں باپ سمجھے گا۔“

کو اپنے والدین نہیں سمجھتا۔ جب وہ بڑا ہو گا تو وہ پہلا سوال ان سے یہ کرے گا کہ میرے اصل ہیں۔ خدارا...... مجھے ان تک پہنچا دو۔“

اس نے نہیں پوچھا تو......؟“

بے وقوف سا ہو گا“ ممانی جان نے پلیٹ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

آپ کو...... کھانا تو کھائیے ناں آپ۔“

نے ذکر ہی ایسا چھیڑ دیا ہے کہ میرے بھی زخم ہرے ہو گئے۔“

نں تو اس وقت فہد کے دوست کی بات کر رہی تھی۔“ فہمی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

نں تو تم سے صرف بچے کی بات کر رہی تھی۔ پرایا خون کبھی اپنا نہیں ہوا کرتا ہے۔“ انہوں نے ایک انس بھری۔

پ تو کہہ رہی تھیں کہ آج کل اپنی اولاد بھی اپنی نہیں ہوتی......تو پھر پرائی اور اپنی میں فرق ہی کیا

ست کا...... جن لوگوں کے نصیب اچھے ہوتے ہیں ان کی اولاد بھی نیک اور فرمانبردار ہوتی ہے بھی ایسا ہی سلسلہ چلتا ہے۔“

مانی جان! اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیک امیدیں رکھنی چاہئیں۔ انشاء اللہ منزلیں آسان ہوتی چلی جائیں

میں بھی یہی دعا مانگتی ہوں۔“

تیسرے روز فہد آفس سے واپسی پر ایک پیاری سی بچی لے آیا۔

کس کو تو اٹھا لایا؟“

کولیگ کی وائف کا ڈلیوری کے دوران انتقال ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ بچی میں پال ان کے آٹھ بچے ہیں اور ان کے لیے اپنے دیگر بچوں کی کفالت ہی بمشکل ہو رہی ہے“ فہد نے

ان کے حالات اچھے ہو جائیں گے تو وہ بچی مانگنے آ جائے گا۔“

ئیں گے وہ۔ ان کی پہلے ہی چھ بیٹیاں اور ہیں‘ ساتویں بچی مانگ کر وہ کیا کریں گے؟“

بچی کو پال کر تو کرے گا کیا؟“ اب ان کی جرح کی نوعیت تبدیل ہوئی۔

ڈاکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ اب میرے اولاد نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے کسی کا بچہ پال کر اپنی پدری سکوں گا۔“

کسی کا بچہ لے لیتا۔ غیروں کا لینے کی کیا ضرورت تھی؟“

کس کے بچے اتنے زیادہ ہیں جو وہ کسی کو بانٹیں گے؟ میرا دوست تو میرا احسان مند ہو رہا تھا کی بچی لے لی ہے بلکہ میں نے قانونی طور پر کاغذات بھی تیار کروائے ہیں کہ اب یہ بچی میری سے واپس نہیں لے سکتا۔“

''لینا ہی تھا تو لڑکا لیتا...... ہمیشہ تیرے ساتھ تو رہتا' لڑکی بڑی ہوگی تو اس کی شادی کرنی پڑے گی
تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جائے گی تو پھر اکیلا کا اکیلا رہ جائے گا۔''

''امی! جن بچیوں کی شادی ہو جاتی ہے' وہ اپنے والدین سے قطع تعلق تھوڑی کر لیتی ہیں اور رہی با
کی......تو جس کی قسمت میں جو ہوتا ہے' وہ اسے ضرور ملتا ہے۔ آج میں اس بچی کو لے کر گھر آیا ہوں
پہلے آفس کی جانب سے میرے دو انکریمنٹ کا اضافہ ہو گیا ہے' اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ
کے آنے سے پہلے اس کا رزق میرے گھر میں دینا شروع کر دیا ہے۔ جب وہ وحدہ لاشریک ہر شے
میں کس وجہ سے پریشان ہوں کہ کسی کے بچے کو پالنے سے ایسا ہو جائے گا' ویسا ہو جائے گا۔ میں ٹھیک
اس بچی کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالوں گا تو یہ بچی بھی ہم سب سے محبت کرے گی۔''

''چلو' یہ تجربہ بھی کر دیکھو لو......'' انہوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ''فہمی جب بچے کا ذکر کر رہی تھی
وقت سمجھ گئی تھی کہ ایسا کچھ یہاں بھی ہونے والا ہے۔ اب میں اتنی پاگل نہیں ہوں جتنی کہ تم دونوں

''اس کا کیا نام رکھیں؟'' فہمی بچی کو گود میں لیے فہد سے پوچھ رہی تھی۔

''اب تم اس کی ماں ہو' جو دل چاہے رکھ لو۔''

بچی بالکل گلابی سی ہے۔ اس کا نام پنکی رکھ لیں؟''

''نام اسلامی ہونا چاہیے۔ نام کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے۔'' فہد نے بچی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا

''ٹھیک ہے آج سے اس کا نام عائشہ ہے' اب ہم اسے عائشہ کے نام سے ہی پکارا کریں گے۔''

''او کے......'' فہد نے مسکرا کر کہا۔ اب وہ دونوں ہی بچی کو ایسی محبت سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ
مرتبہ دیکھ رہے ہوں۔

عائشہ کے آنے سے فہمی کی زندگی بالکل ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ او
گنگناہٹ سی آ گئی تھی۔ گھر کے کام وہ جلدی جلدی نمٹا کر بچی سے کھیلتی رہتی۔

اولاد......اللہ تعالیٰ کی جانب سے کتنی بڑی دولت ہے یہ بات اولاد والے سوچ ہی نہیں سکتے
جاگتا کھلونا......زندگی میں کتنی خوشیاں لے کر آتا ہے' جس کے دم سے تنہائیاں اڑن چھو ہو جائیں اللہ
کا وجود نظر نہ آئے۔

عائشہ کے آنے سے اس کی زندگی کسی خوش رنگ گلاب کی طرح تر و تازہ اور مسحور کن ہو گئی تھی
مہکتی مینا سی بچی نے اس کا سارا ڈپریشن دور کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ جب عائشہ کو دیکھتی تو اس کی محبت خون میں ایسے جوش مارنے لگتی جیسے وہ اس کی اپنی بچی ہو' اس
حصہ ہو۔

''پتا نہیں لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے کے بچے سے محبت نہیں ہو سکتی' جتنی اپنے بچے سے
ایسا کہنے والے کسی لے پالک کو اپنے سینے سے لگا کر تو دیکھیں۔ اس کا نرم و نازک لمس انہیں وہی مہ
عطا کرے گا جتنا ان کا بچہ کر سکتا تھا۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔ محبت کا ذائقہ مٹھاس بھرا ہوتا ہے' اس میں کبھی تلخی اور ترشی نہیں ہوتی مگر ضرور
جب تجربہ کیا جائے۔''

''اور زیادہ تر لوگ سنی سنائی باتوں اور مفروضوں پر یقین رکھتے ہیں۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بہت جلد ممانی جان بھی عائشہ سے محبت کرنے لگیں گی؟''

''یقیناً! ایسا ضرور ہوگا' اور بہت جلد ہوگا'' فہد نے کہا۔ اور فہمی نے سرشار ہو کر طمانیت سے آنکھیں بند کر لیں
یہ منظر بے حد واضح نظر آ رہا تھا کہ ممانی جان عائشہ کو اپنے گھٹنوں پر لٹائے۔ جھوجھو نٹے ماموں موٹے
ہلا رہی تھیں اور عائشہ مارے خوشی کے کلکاریاں مار رہی تھی۔

☆☆☆

لے کر پہلی دفعہ وہ ماں کے ہاں رہنے آئی ہوئی تھی۔ فیروزہ بھی عائشہ کو دیکھ کر خوش تھیں۔

''امی! آپ نگین کو کچھ دنوں کے لیے گھر لے آئیے ناں......؟'' فہمی نے عائشہ کو گدے پر لٹاتے ہوئے

''لت آپا کیا کہیں گی' اتنی جلدی جلدی میکے جا رہی ہے۔'' فیروزہ بیگم نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''گین کی طبیعت جو خراب ہے' کل بھی اس کا فون آیا تھا......تو بی پی لو تھا اور اس سے بات تک نہیں
ں گی۔ مجھے لگ رہا تھا وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے' میں ابھی شجاع کو فون کرتی ہوں کہ وہ جلد از جلد نگین کو کراچی چھوڑ کر جائے۔ ابھی ارحم ہی اتنا
ہے اور دوسرے بچے کا سلسلہ ہو گیا ہے۔ بچی اپنے آپ کو سنبھالے گی یا بچے کو دیکھے گی۔'' فیروزہ نے اسی
ن ملایا تو شومئی قسمت اسے عظمت بیگم نے ریسیو کیا۔

''آپا! آپ نگین کو کراچی بھجوا دیجئے۔ یہاں میں اس کو سنبھال لوں گی......اور بچے کو بھی۔''

''ہرا خیال ہے کہ تم شجاع کو بھی سنبھال لوگی...... کہ تم بڑی باہنر عورت ہو۔ میاں بھی ہاتھ میں رہا اور داماد
تمہارے قابو میں ہے۔ کراچی میں بیٹھ کر جو حکم جاری کرتی ہو' وہ اس کے لیے فرمان کی حیثیت رکھتا ہے۔
را لرنا اس کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ بیٹی کی شادی کر کے تم تو بڑی لکی رہیں' ایک پلا پلایا بیٹا بھی
ل گیا۔''

''آپا! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ داماد بے شک بیٹے جیسا ہی ہوتا ہے مگر بیٹا نہیں ہوتا......اگر ایسا ہوتا تو
بیٹی کی دعائیں کرنا بھول جاتے۔''

''تم تو اس معاملے میں خوش نصیب ہو۔ تمہارا داماد تمہارے لیے سگے بیٹے سے زیادہ ہے۔''

''اس وقت تو میں نگین کو بلانا چاہ رہی ہوں' میری بچی بے حد حساس سی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسی باتیں
ت مند ہوگی۔''

''یاب کہہ رہی ہو تم' اصل صحت مند اور ہٹی کٹی تو اس گھر میں' صرف میں ہوں۔ تمہاری بیٹی بیمار ہے' تمہارا
شان سا ہے۔ میں دونوں کو بھجوائے دیتی ہوں کہ اپنی اصلی اماں کے پاس چلے جاؤ۔''

نے اس سچویشن میں زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر اگلی شام وہ نگین اور شجاع کو اپنے گھر پر دیکھ
گئیں۔

''امی! ابھی ہی آپ کا میسج ملا' فوراً لے آیا ہوں میں نگین کو'' شجاع نے کہا۔ ''جہاز کے ٹکٹ بھی آسانی سے مل

بے حد کمزور ہو رہی تھی اور ارحم بھی انتہائی لاغر سا تھا۔

لیوری تک آپ کے پاس ہی رہے گی اور میں کل شام گاؤں چلا جاؤں گا۔'' شجاع نے فہمی کو بتاتے

ہوئے کہا۔

"اتنے دنوں بعد آپ آئے ہیں' دو چار دن مزید رک جاتے۔" ضحی نے کہا۔

"وہاں امی اکیلی ہیں' اس وقت بھی میں فرحت آپا کو ان کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں اور کہہ کر آیا دوسرے دن کی فلائٹ سے میں واپس آجاؤں گا۔"

مگر جس شام شجاع کو جانا تھا' اسی دن ارحم سیڑھی سے گر پڑا اور اس کی پیشانی پر سات ٹانکے آئے زیادہ بہہ جانے سے بچے کو بخار بھی ہو گیا اور تب شجاع نے اپنا جانا کینسل کر دیا۔

ارحم یوں بھی باپ سے زیادہ مانوس تھا۔ بیماری کی حالت میں وہ باپ کو بالکل بھی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ دس دن کے بعد شجاع اپنے گھر پہنچا تو گھر کے دروازے پر بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

پڑوس میں حکیم صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ فرحت اپنے ساتھ ماں کو اپنے گھر لے گئی کے بچوں کے اسکول کھلے ہوئے تھے۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر اتنے دن ماں کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔

تب وہ حواس باختہ سا فرحت کے گھر پہنچا تو دونوں نے ہی اس کو دیکھ کر تیوریاں چڑھا لیں۔

"وہ اماں......! بس حالات ہی ایسے ہو گئے کہ مجھے اپنی فلائٹ کینسل کرانا پڑی۔"

"میں تجھ سے وضاحتیں نہیں پوچھوں گی کہ تیرا پیرا اپنے پلنگ کے ساتھ نگین نے کیونکر باندھا تھا؟" بیگم نے غصے سے کہا۔

"وہ ارحم جو گر گیا تھا...... ماتھے پر اتنی زبردست چوٹ آئی تھی اس کے......" شجاع نے پریشان میں کہا۔

"بچوں والے گھر میں خیریت کہاں ہوتی ہے۔ کسی کو کچھ کسی کو کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ تیرے پیچھے فر ایک بچے کو اچانک بخار آ گیا۔ ایک گر پڑا تو اس کا آگے کا دانت ٹوٹ گیا۔ تیسرے کو جھپاکی (پتی) چوتھا والا خواہ مخواہ کی ضدیں کرنے لگا کہ فرحت بے چاری کی جان آدھی رہ گئی مگر اس کا مطلب یہ نکل اپنے گھر کو بھول گئی ہو۔ اپنے ساس سسر کی سیوا نہ کر سکی ہو' اور دیوروں' نندوں کے لشکر کی خدمتوں سے چرالی ہو۔ کوئی بات ہی ہے اپنی فرحت میں' جو پوری سسرال میں اس کے گیت گائے جاتے ہیں۔ تیری طرح اڑیل اور چالاک نہیں ہے۔ جو یہ چاہتی ہے کہ تو بات بھی کرے تو اس کی پسند کے حساب سے کر

"اماں! وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ تو مجھ سے اس بات پر خفا ہوتی ہے کہ میں آپ کا کیوں نہیں رکھتا۔"

"ہاں...... ہاں' مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے' کتنی عزت کرتی ہے' میری شکل خوش ہوتی ہے' اور کتنا اس کا ہمارے گھر میں دل لگتا ہے۔ جب ہی تو وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہاں ہے میں کراچی جانا چاہتی ہوں۔ میں نے منع کیا تو اس کی اماں نے ٹیلی فون پر حکم دے دیا کہ فوراً ...... خبردار! جو زیادہ عرصے سسرال کی دہلیز پر رکیں' اور وہ ماں کا فون سنتے ہی کراچی بھاگی...... اور اس تم ایسے کہ جیسے وہ کوئی شیشے کی ہو۔"

"جہاز میں کہاں کوئی دو سراہت کے لیے جاتا ہے۔ اب تو ذرا ذرا سی بچیاں امریکا تک اکیلی اور ان نازک پدمنی سے پنجاب سے کراچی تک اکیلا نہ جایا گیا۔"

"چھوڑیں امی! کوئی دوسری بات کریں...... جو جس فطرت کا ہوتا ہے' وہ ویسا ہی رہتا ہے۔ اس

ے نگین اپنی سرشت تبدیل تو نہیں کر سکتی ناں......" فرحت نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

ب شجاع نے ماں کا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا "چلیں' گھر چلیں......"

"بھائی' کچھ کھا پی تو لو...... پھر چلے جانا۔" فرحت نے کہا۔

"تمہاری باتوں سے حلق تک میرا پیٹ بھر گیا ہے' اب مزید کچھ کھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔" شجاع نے ے کہا اور ماں کو باہر آنے کا کہہ کر گھر سے قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

محبت نہ رہے تو رہا کچھ بھی نہیں کرتا
کہ تیز آندھیوں میں بچا کچھ بھی نہیں کرتا
وہ پھر مجھ سے رہتا ہے خفا اکثر نہ جانے کیوں
میں جس کو دیکھتے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا

یوں تو سارے گھر کی فضا ہی سوگواری تھی مگر فرح کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

اشرف کی ٹانگ میں جب تکلیف زیادہ بڑھی تو وہ اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ جا کر لاہور کے کسی ڈاکٹر کو آیا تھا اور انہوں نے اس سے کہا تھا کہ جتنی جلدی اپنی ٹانگ کٹوا لو بہتر ہے ورنہ زہر پورے جسم میں پھیل گا۔

"ڈاکٹر ایسے ہی بکواس کیا کرتے ہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے ٹانگ کٹوانے کی۔ بھلا یہ کوئی عمر ہے کہ لنگڑا ساری زندگی گزاری جائے۔" نانی اماں نے فوراً منع کر دیا تھا اور بہت سی گالیاں ڈاکٹر کو سنا دی تھیں جس یسا باؤلا مشورہ ان کے نواسے کو دیا تھا۔

"پیارے بیٹے' میں تجھے لنگڑے کے روپ میں ہرگز نہیں دیکھ پاؤں گی' تو کسی ایسے ڈاکٹر کو دکھا جو ٹانگ کا مشورہ نہ دے" اماں نے خاصا رو پیٹ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اماں! تین ڈاکٹروں کو دکھا چکا ہوں اور تینوں کی ایک ہی رائے ہے کہ اگر ٹانگ نہ کٹوائی گئی تو پورے جسم ہر پھیل جائے گا۔"

فرح تھرا کر رہ گئی اور بے ساختہ بولی "اشرف! تم جلدی سے ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔ ٹانگ کٹ کوئی بات نہیں مگر زہر تو جسم میں نہ پھیلے۔"

"ی بیوی ہے' جسے اس بات کی جلدی ہے کہ میاں کی ٹانگ جلدی سے کٹ جائے" بڑی آپا نے اسے یکھتے ہوئے کہا۔

"آپا! اگر ٹانگ نہ کٹی تو اس سے زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"ی اچھی بات منہ سے مت نکالنا۔ اچھی بات نکالو گی تو اچھا ہو گا اور بری بات نکالو گی تو اچھا ہوتے بھی برا ہو جائے گا۔ کیا یہ بات تمہاری ماں نے کبھی نہیں سکھائی تھی" چھوٹی آپا نے اس سے غصے سے کہا۔

"آپا! مجھے اس وقت واقعی کچھ نہیں معلوم کہ کیا بات اچھی ہے اور کیا بات بری ہے۔ مجھے تو صرف یہ پتا ہے ی زندگی ہمارے لیے بہت اہم ہے۔" فرح نے سسکتے ہوئے کہا۔

"ھیک کہہ تو صحیح رہی ہے۔ ٹانگ کٹوانے کے لیے ڈاکٹر نے بہت زور دیا ہے۔ میں نے تو بہت منتیں یں کسی طرح ٹانگ بچ جائے مگر ان کا یہ کہنا تھا کہ اب وقت گزر گیا ہے اور ٹانگ میں زہر پھیل گیا ہے

اس لیے ٹانگ کٹنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔" اشرف نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

اسی شام اشرف لاہور کے اسپتال میں ایڈمٹ ہوگیا اور پھر اس کی ٹانگ گھٹنے سے اوپر تک کاٹ دی پندرہ دن بعد جب وہ گاؤں آیا تو بیساکھی کے سہارے تو آیا تھا مگر اس کی شلوار کا ایک پائنچا ہوا میں جھول ر شدید غم اور یاس اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔

گاؤں میں جس نے سنا' جس نے دیکھا' اس کو دیکھنے آ رہے تھے اور اشرف کا غم ہر روز بڑھتا جار عیادت کرنے والوں کے جملے اس کو ہمت دلانے کے بجائے اس سے تعزیت کر رہے تھے۔ ان کی زور بیانی اس بات پر تھی کہ اب وہ پہلے جیسا بالکل نہیں رہا ہے' زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اور اب زندگی کا ہر نیا دن اس کے لیے انتہائی مشکل ہوگا' اور اپنی زندگی بسر کرنا تکلیف دہ ہوگا۔ اب وہ خاندان کی خدمت کرنے کے بجائے ان سے خدمت لینے پر مجبور ہوگا۔ اولاد ہوتی تو بڑھاپے میں بھ آ جاتی' ایسی صورت میں بڑھاپا بھی خاصا مشکل ترین ہوگا۔

مسلسل یہ باتیں سن کر ایک شام اشرف اپنے گھر میں بیٹھا بیٹھا بے ہوش ہوگیا۔ فرح اپنی ساس' نند چیخ و پکار سن کر باورچی خانے سے بھاگتی ہوئی آئی تو دیکھا' اشرف بے سدھ سا پلنگ پر پڑا ہے۔

"کیا ہوا انہیں......؟" اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں کیا ہوا' بیٹھے بیٹھے گر گیا۔ ذرا دیکھ تو سہی' نبض بھی چل رہی ہے یا نہیں؟" تائی نے کہا۔

تب اماں نے بے ساختہ اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور کہا" کچھ نہیں ہوا' میرا اشرف زندہ ہے۔" پا چھینٹے مارے گئے تو اس کو بمشکل ہوش آیا مگر آواز میں اتنی نقاہت تھی کہ بولا تک نہیں جا رہا تھا۔

"شکر خدایا' میرا بچہ زندہ ہے...... ورنہ میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔" اماں روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اگر میں مر ہی جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اپاہج آدمی تو صرف بوجھ ہوا کرتا ہے۔ میرا تو ہونا نہ ہونا برا اشرف کے لہجے میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔

"اللہ تجھے سلامت رکھے...... میرے لیے تیرا ہونا میری زندگی جیسا ہے۔ خبردار! جو آئندہ ایسی بات ک

فرح چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ اشرف نے ایک نظر اس پر ڈالی اور گہری سانس لے کر منہ پھیر دھیمے لہجے میں بولا" فرح! تو واقعی بہت بدقسمت ہے' بے حد بدقسمت۔ کوئی سکھ تو نے میرے ساتھ نہیں دی نہ ہی آئندہ دیکھ پائے گی۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کریں' مجھے تکلیف ہوتی ہے" فرح نے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں' اب میری زندگی کسی کام کی نہیں رہی ہے۔ زخم ٹھیک ہونے کے باوجود مجھ سے کے ساتھ چلنا مشکل ہو رہا ہے اور جب میں اپنے کام خود نہیں کر سکتا تو تیرے کیا کر پاؤں گا۔ واقعی' تو بدقسمت ہے" اشرف نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا اور فرح کی آنکھوں سے برسات جاری ہوگئی۔

☆☆☆

فریال ان دنوں بہت مصروف تھی۔ اس کی بوتیک پر شادی کے ملبوسات کا رش چل رہا تھا۔ ان دنوں ہاں آرڈرز کے ملبوسات تیار ہو رہے تھے۔

مسز رحمٰن نے انیس جوڑے تیار کروائے تھے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک' طاہر کی بری کے لیے۔ وہ اکلوتے بیٹے کے لیے خوب سے خوب تر بری تیار کروا رہی تھیں۔ پیسے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

فریال نے ثنا کے لیے دو عمدہ قسم کے جوڑے از خود تیار کروا دیے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ اس شادی میں ثنا کو ایسے جوڑوں کی ضرورت پڑے گی۔

مسز رحمٰن نے ثنا کے لیے بھی دو جوڑے بنوائے تھے مگر وہ بہت زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ اچھے ضرور تھے مگر اتنے خوبصورت نہیں تھے جو ثنا کی سج دھج کو بڑھا دیتے۔ فریال پھوپی تھی' اس کے دل میں یہی خیال تھا کہ میری بھتیجی خوبصورت ترین لگے۔

جس روز فریال وہ دونوں جوڑے پیک کر رہی تھی کہ بیلا آ گئی۔ "ارے' یہ کس کے جوڑے ہیں' کیا آپ مجھے دکھانا پسند کریں گی؟"

"آپ دیکھ تو سکتی ہیں مگر وہ آپ کو دے نہیں سکتی۔"

"چلیں دکھا ہی دیں" بیلا نے ضد کی تو فریال نے ثنا کے دونوں جوڑے اسے دکھا دیے۔

"مجھے یہ دونوں جوڑے چاہئیں۔"

"میں نے کہا ہے ناں کہ یہ سیل ہو چکے ہیں۔"

"اچھا' آپ اسی ڈیزائن کے جوڑے میرے لیے بھی تیار کروا دیں۔"

"میں اپنا ڈیزائن دہرایا نہیں کرتی۔ آپ کے لیے اس طرح کے جوڑے تیار ہو جائیں گے مگر ڈیزائن اور کلرنگ قدرے مختلف رہے گی۔"

"اگر میں بالکل ایسا ہی چاہوں تو......؟"

"یہ میرے لیے ناممکن ہوگا۔"

"اگر یہ لڑکی میری شادی میں آ گئی تو...... مجھے ہرا دے گی۔"

"اس کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بے فکر رہیں' یہ آپ کی شادی میں نہیں آئے گی۔"

"شکر خدایا! ایسے خوبصورت ملبوسات پہن کر تو کوئی مہمان نہیں آنا چاہیے۔"

"مگر تم تو مجھے بھی بلا رہی تھیں اپنی شادی میں؟" فریال نے اس سے کہا۔

"آپ تو میری باجی ہیں' آپ کی کیا بات ہے؟ آپ آئیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں آنے کی کوشش کروں گی تاکہ دیکھوں تو سہی کہ تم کیسی لگ رہی ہو اور تمہاری سہیلیاں کیسی لگ رہی ہیں؟"

"وعدہ کریں آپ......!"

"وعدہ تو نہیں کرتی...... کہ نبھا نہ سکوں تو وعدہ خلاف کہلاؤں گی۔ ہاں' کوشش ضرور کروں گی کہ تم کو آ کر ملوں۔"

☆☆☆

"یہ سب سن کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے" ضیا نے چائے کا کپ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں اور تم حیرت کر رہے ہو؟"

"میری ماں تو میرے لیے ایسا کبھی نہیں سوچ سکتی تھی۔" ضیا نے منور کے چہرے پر اپنی نگاہ جما کر کہا۔

"میری ماں سگی ہے' سوتیلی نہیں۔ محبت بھی مجھ سے بہت کرتی ہے' مگر اس معاملے میں نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے" منور الجھ کر بولا۔

''جب ہی تو مجھے حیرت ہو رہی ہے۔''

''ہاں یار! پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے...... کہ جو ہم چاہتے نہیں' وہ ہو جاتا ہے...... اور جب اپنے آپ کو سنبھالیں تو وہ سب ختم ہو جاتا ہے۔''

''رعنا میری کزن ہے۔ اس کے بارے میں' میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ میری زندگی کی ساتھی ہو گی' مگر میری ماں نے میری مرضی پوچھے بنا اس سے میری منگنی کر دی۔ میں کافی عرصے تک پریشان رہا...... جب میں نے اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہوں تو معلوم ہوا کہ میری خالہ اس کے لیے کسی نئے آنے والے رشتے کے لیے کوشاں ہیں۔ امی ان سے ناراض ہو گئیں اور میرا ذہن ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں پہلے کوئی انجانا سا بوجھ میرے ذہن سے از خود ہی ہٹ گیا ہو۔''

''مگر رعنا کے رشتے کی ابھی جانچ پڑتال ہی ہو رہی تھی کہ پتا چلا کہ وہ لڑکا ٹھیک نہیں ہے اور خالہ صاحبہ جو بہتر سے بہتر کے چکر میں تھیں' اب پھر مجھ پر قناعت کر رہی ہیں اور بضد ہیں کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے ہی کریں گی۔''

منور یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اپنے دوست کے ساتھ کسی کیفے میں بیٹھا تھا اور آج اسے اپنے بارے میں انتہائی پریشانی کے عالم میں بتا رہا تھا۔

''تمہاری امی' اب اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''پہلے تو وہ خالہ سے خاصی ناراض تھیں اور گھر میں برملا کہہ دیا تھا کہ وہ رعنا کی شکل تک نہیں دیکھیں گی' مگر جب خالہ نے ان کی خوب خوشامد درآمد کی تو ان کا تمام تر غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ ابھی ہامی نہیں بھری مگر بھر لیں گی۔''

''اب مسئلہ یہ ہے کہ تم نہیں چاہتے ہو کہ رعنا سے تمہاری شادی ہو؟''

''ہاں' یہی بات ہے'' منور نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے؟'' ضیا نے بقراطی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں' ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' منور نے سچائی سے کہا۔

''یونیورسٹی کی صبا' جویریہ اور عائشہ کے ساتھ تو تم خوب چہکتے ہوئے نظر آتے ہو۔'' ضیا نے انگلیوں پر نام گنواتے ہوئے جرح کی اور چشمہ اتار کر اس کے شیشوں پر پھونکیں مارنے لگا۔

''نہیں یار! وہ صرف کلاس فیلوز ہیں' اور کلاس فیلوز سے مسکراتے ہوئے باتیں کرنا کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے جس کی تفتیش میں تم لگے ہوئے ہو۔''

''اچھا...... خاندان کی کوئی لڑکی' جو تمہیں پسند بھی ہو؟''

''نہیں' کسی کے بارے میں بھی اس نہج پر نہیں سوچا۔''

''میرے بھیا! تم بارہ برس کے تو ہو نہیں' اب کسی ایسی لڑکی کے بارے میں سوچ لو جسے تم اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہو ورنہ اب تو ننھے ننھے سے بچے کہتے ہیں کہ میں دولہا بنوں گا اور فلاں لڑکی سے شادی کروں گا۔'' ضیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یونیورسٹی سے آخری سمسٹر ختم ہونے والا ہے' اب میرے ذہن میں سوائے جاب کے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت میں کسی کا بھی جھمیلا برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''تو تم یہ سب اپنی امی سے کیوں نہیں کہہ دیتے؟''

''امی سے کہا تھا میں نے۔ پہلے خالہ نے آپ کو چھوڑا...... اب آپ ان کی باتوں میں مت آئیے گا۔ مجھے ان کی باتونی سی بیٹی ہرگز پسند نہیں ہے۔''

''تو کیا کہا انہوں نے؟''

''یہی کہ وہ میری بھانجی ہے اور میں اپنی بہن کی آس نہیں توڑ سکتی۔''

''پھر یہ کہو ناں کہ جو سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا' دوبارہ وہیں سے جوڑ دیا گیا ہے۔'' ضیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! ایسا ہی سب کچھ ہو گیا ہے مگر اب مجھے یہ سب بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ اب تو مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں رعنا سے اچھی خاصی نفرت کرتا ہوں' نہ اس کی مسکراہٹ اچھی لگتی ہے' نہ خاموشی۔ پرسوں وہ خالہ کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ میں نے اس سے ایک بات بھی نہیں کی۔ جبکہ اس کی یہ حتی الامکان کوشش تھی کہ میری ہر بات کا جواب دے' میرے ہر معاملے میں دخل دے اور حد تو یہ ہوئی کہ وہ میرے بیڈروم میں آ گئی اور لگی صفائیاں کرنے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے کمرے سے نکل جائے تو وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولی' بعد میں بھی تو صفائیاں کرنے کو ہوں گی ناں' پہلے کر لی تو کیا ہو جائیں گا۔''

''میں اپنے کمرے میں کسی کو بھی برداشت نہیں کرتا ہوں' اس لیے پلیز تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' میں نے اس سے خاصا ڈپٹ کر کہا تھا۔

تب وہ اپنے دانتوں میں انگلی داب کر شرمیلے لہجے میں بولی ''اچھا...... بعد کو کیا ایسا ہی اچ کریں گے آپ؟''

''مجھے نہیں معلوم......'' مارے غصے کے صرف یہی کہا تھا۔

''سنیے...... ایسا اچ نہیں کرنا آپ۔ میرے کو تو آپ سے بہوت محبت ہے' میں تو مر کے جاؤں گی...... ہاں۔''

''اس میں بے چاری لڑکی کا تو کوئی قصور نہیں ہے'' ضیاء ساری روداد سن کر بولا۔

''یار! اس میں قصور' بے قصور کی بات نہیں ہے۔ مجھے تم یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اپنے گلے سے رعنا کا پھندا کس طرح نکال پھینکوں؟'' منور نے پریشان سے لہجے میں کہا اور امید بھری نظروں سے ضیاء کو تکنے لگا۔ اس کا یہ دوست بچپن کا ساتھی تھا۔ اسے یہ پورا یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسا مشورہ دے گا' جس سے اس کی ساری پریشانیاں اڑن چھو ہو جائیں گی۔

☆☆☆

کیا یہ پتھر دلوں کا شہر ہے
یہاں صرف بیگانگی کی لہر ہے
ایک دوسرے کو کچھ نہیں دے سکتے
ان کے اندر باہر صرف زہر ہی زہر ہے

کتنی عجیب سی بات ہے کہ بعض غم اتنے طویل ہوتے چلے جاتے ہیں کہ ان کا انت دکھائی ہی نہیں دیتا!

گاؤں میں کتنے جوانوں تو کیا بوڑھے لوگوں کو چوٹیں بھی لگی تھیں اور ہاتھ پیروں کی ہڈیاں بھی ٹوٹی تھیں ان کے ساتھ ایسا تو نہیں ہوا تھا جیسے اشرف کے ساتھ ہو رہا تھا...... ایک دکھ کے بعد دوسرا دکھ خود آگے بڑھ کر مل رہا تھا۔ (پریشانیوں کا دور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا)

شادی کے بعد اکثر لڑکیوں کے ابتدائی دن سسرال میں خاصے بھاری ہوتے ہیں...... انہیں یہ لگتا ہے کہ کسی امتحانی ہال میں بیٹھی ہوں۔ یہ امتحان سب کے ختم بھی ہو جاتے ہیں...... مگر فرح کا یہ امتحانی دور کسی صو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

سرخ و سفید سی فرح سرسوں کی طرح پیلی ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ سر درد تو اس کے اکثر ہی رہا کرتا تھا۔ اب اسے چکر بھی آنے لگے تھے۔ مگر سسرال کا ماحول ایسا تھا کہ اپنی بیماری کے بارے میں وہ لب کھولنے کی اہل نہ تھی۔ اس کا درد' چکر یا بخار تو اداکاری کے زمرے میں آتا تھا۔ اس لیے وہ سے کچھ نہ کہتی تھی۔

یوں بھی ان دنوں اشرف کی ٹانگ کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں تھا۔ اشرف کی ٹانگ کا زخم ابھی ٹھیک ہوا تھا کہ گھر میں لڑھکنے کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگ گئی' جس کے باعث اس کی صحیح ٹانگ بھی کام کرنا بند کر دیا تھا۔ دیکھنے والوں کو اشرف کی حالت پر رحم آتا تھا۔ فرح گنگ سی ہو گئی تھی۔

اس کی ساس نے اس کا بستر نانی کے پلنگ کے برابر برآمدے میں ڈال دیا تھا اور خود بیٹے کے پاس بیٹھنے لگی تھیں۔

اب فرح کا سارا دن باورچی خانے میں گزرتا تھا یا پھر وہ ساس کے بلاوے پر دوڑ دوڑ کر جاتی...... اشر اس کو دیکھ کر کبھی کڑھتا...... کبھی اسے اس پر غصہ آتا اور کبھی وہ چپ سادھ لیتا۔ اس کا ڈپریشن روز بروز تھا۔

ایک شام فرح کو روتے دیکھ کر اس نے اپنی ماں سے کہا "ماں...... اب فرح کو اپنے ساتھ رکھنا ظلم کے برابر ہے۔ میں اسے آزاد کر دیتا ہوں تا کہ اس کے ماں باپ جہاں چاہیں اس کی دوسری شادی کر دیں۔"

"کیا ایسی بات تجھ سے فرح نے کہی ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں' اس نے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔"

"تو پھر مفت کی نوکرانی کو کیوں گھر سے نکالنا چاہتا ہے۔"

"اماں! یہ تو اس کی ساتھ زیادتی ہے ناں...... کہ میں مکمل مفلوج ہو چکا ہوں...... اس کو اپنے نام کے ساتھ باندھنے کی کیا ضرورت ہے' یوں بھی میں اسے ہر وقت روتا دھوتا ہی دیکھتا ہوں۔ مجھ سے شادی کے بعد اس کا سارا وقت رونے دھونے میں ہی گزرا ہے۔"

"دوسری شادی تو اس کی ہو نہیں سکتی۔ آزاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر باتیں کر کے تجھے کچھ سکون ملتا ہوگا۔ اب تو اس کی فکر نہیں' اپنی کر۔ تجھے اس کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' صرف اپنے بارے میں سوچا کر۔"

"نہیں اماں! اب اسے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ شاید میں نے اس پر بہت ظلم کیے ہیں...... جو یہ دن [illegible] نصیب ہوئے ہیں۔ اماں' اب اس زخمی کبوتری جیسی لڑکی کو آزاد کرنا زیادہ بہتر ہے۔"

"[illegible] سبز قدم ہے تو کیا کریں......؟" ماں نے اسے سمجھایا۔ "تیری پریشانیاں اس کے آنے کے بعد بڑھی [illegible] ہے کم بخت' تو ہم کیا کریں؟"

"ہو سکتا ہے تمہاری بات ٹھیک ہو...... اس سے شادی کرنے کے بعد تو میں جان و مال دونوں ہی لحاظ سے [illegible] گیا۔"

"میں تو شروع سے ہی یہ کہتی تھی کہ بہو بھاگوان نہیں ہے۔"

"تو اب کیا کریں......؟" اشرف پریشان ہو کر بولا۔

"پڑی رہنے دے' ایک کونے میں۔ تیرا کیا لے رہی ہے؟"

"نہیں اماں! اسے دیکھ کر مجھے عجیب پشیمانی کا سا احساس ہوتا ہے۔"

"پاگل ہے تو' پشیمانی کیسی...... وہ تو تیری نوکرانی ہے۔" اماں نے اسے دلار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ بیوی [illegible] خدمت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

"تمہاری سب باتیں ٹھیک ہیں اماں!...... مگر اب مجھے اسے دیکھ کر وحشت سی ہونے لگی ہے۔ اب اسے [illegible] بہت تھک گئی ہے۔"

"[illegible] تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں' اس لیے ایسی باتیں سوچتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد تجھے پہیے والی [illegible] یہ گھوما کرے گی تو تیری طبیعت بھی بہلے گی۔ اب خود سے تو' تو کہیں آ نہیں پائے گا۔ فرح تیرے [illegible] تو روز تازہ ہوا میں باہر گھوم پھر تو آئے گا۔ یہ تیری بیوی ہے' تیری خدمت کرنا اس پر فرض ہے۔"

اشرف کو یوں لگا...... کسی اپاہج فقیر کو لے کر کوئی جوان عورت گھوم رہی ہے...... راستے میں گزرنے [illegible] نظریں فقیر کے بجائے اس عورت پر پڑ رہی ہوں...... اور وہ ہنس رہے ہوں۔

"نہیں اماں نہیں...... فرح میری کبھی دوست نہیں رہی...... میں اس کے ساتھ باہر جاؤں گا تو یہ مجھ پر ہنسے [illegible] نظریں میرا مذاق اڑائیں گی۔"

"[illegible] اس کی بھلا کہاں مجال کہ تجھ پر ہنس سکے' وہ تو ہر وقت روتی رہتی ہے اور اگر مذاق اڑائے گی تو منہ [illegible] اس کا۔"

"[illegible] بے رونق ہو گی' میرے لیے نہیں۔" اشرف کے دماغ میں نیا سودا سمایا۔ "وہ میرے ساتھ ہرگز خوش [illegible] مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"[illegible] پوچھ لیتے ہیں کہ یہ آنسوؤں کے دریا کس لیے بہاتی ہے؟" اماں نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔

فرح کو بلایا گیا تو وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا وجود کانپ سا رہا تھا

''فرح' تو آج یہ بتا...... تو ہر وقت کیوں آنسو بہاتی رہتی ہے؟''

''مجھے پتا نہیں......'' وہ سراسیمہ سے لہجے میں بولی۔

''تو چھم چھم نیر بہاتی ہے اور تجھے پتا بھی نہیں کہ کس کے واسطے بہاتی ہے'' اماں کا تفتیشی لہجہ خاصا سخ

''آنسوؤں نے تو لگتا ہے میری آنکھوں میں گھر بنا لیا ہے۔ جب دل چاہے وہ باہر نکل پڑتے اداس لہجے میں بولی۔ ''بنا کسی بات بھی آنسو باہر نکل آتے ہیں تو میں کیا کروں؟''

''کمینی عورت! کیا تو کسی فلم کی ہیروئن ہے جو ایسی باتیں کر رہی ہے'' اماں کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

''میں تو سب کی جوتیوں کی خاک ہوں...... اس سے زیادہ میری اہمیت کیا ہو سکتی ہے؟'' وہ دھیمے میں بولی۔

''کچھ زیادہ ہی بقراطن نہیں بن گئی ہے تو......'' اماں نے دو ہتڑ مار کر کہا ''تیری یہ ہمت کہ ہر بات کا دے رہی ہے۔'' تب وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اماں کو دیکھتی رہ گئی مگر ان آنکھوں میں نہ جانے کم کہ اشرف تھرا سا گیا اور بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''فرح! میں تجھے طلاق دیتا ہوں...... فرح میں تجھے طلاق دیتا ہوں...... فرح' میں تجھے طلا ہوں...... جا...... تو اپنے گھر چلی جا...... جا تو یہاں سے چلی جا...... تو فوراً چلی جا۔''

اماں حق دق سی اشرف کو دیکھتی رہ گئیں کہ وہ کیا بک گیا تھا۔

فرح نے ایک نظر اشرف کو دیکھا' دوپٹا اٹھایا...... اور وہ ننگے پیر ہی بھاگتے ہوئے اپنے گھر چلی آئی۔

اسے یہ خوف تھا کہ اگر وہ لمحہ بھر کو بھی رکی تو اس کی ساس کسی نہ کسی بہانے اسے روک لیں گی۔

''اب کیا ہوا فرح......!'' اس کی ماں نے آنسو بہاتی فرح کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ خیال تھا شاید کسی نئے ظلم نے بیٹی کو یوں حراساں کر دیا ہے)

''اب ہونے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں......'' وہ کھوکھلی سی آواز میں بولی۔

بہنوں کو جب اس کی طلاق کا پتا چلا تو انہوں نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا ''فرح' تو اللہ کا شکر تیری ایک دکھ بھری آزمائش کا وقت ختم ہوا۔''

''پتا نہیں آپا! آزمائش ختم ہوئی ہے یا شروع ہوئی ہے؟'' فرح نے کہا تو اس کی ماں کی ہچکیاں گئیں۔ ان کی نازوں پلی بیٹی نے کس قدر دکھ اٹھائے تھے۔ یہ بات وہی جان سکتی تھیں کہ پڑوس کا گھ کے باعث اس پر پڑنے والی ہر بات کی انی کا زخم وہ اپنے دل پر محسوس کرتی تھیں۔

فرح نے اپنی شادی کے چھ سال کس طرح بسر کیے تھے۔ انہیں یہ عرصہ چھ صدیوں پر محیط محسوس لڑکیاں شادی کے بعد اپنے میکے ہنستی ہوئی آتی ہیں۔ اپنے میاں کی محبت بھری باتیں اپنی بہنوں کو آواز میں سناتی ہیں...... اور میکے آنے کے بعد ہی میاں کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو جا دروازے کے ہر کھٹکے پر' ٹیلی فون کی ہر بیل پر انہیں یہی لگتا ہے کہ میاں جی نے انہیں پکارا ہو...... مگر فر کے بعد میکے آتی تھی تو سہمی سہمی سی' بہنیں باتیں کرتیں تو وہ ہوں' ہاں میں جواب دیا کرتی...... نہ اس کے کوئی ہنسی کا پھول کھلتا اور نہ ہی چہرے سے خوشی کی کوئی رمق ظاہر ہوتی...... اسے دیکھ کر اس کی ماں کو یوں جیسے اس کی نازوں پلی بیٹی کسی قید بامشقت میں گرفتار ہو...... جس کو پیشی پر ملنے اور بولنے کی بھی اجاز

ماں اس کو دیکھ کر محبت سے گلے لگاتی تو وہ اپنی آنکھیں میچ لیتی۔ ماں اس کے منہ میں نوالہ دیتی تو اس کے حلق میں پھنسنے لگتا۔

ایک بار جب وہ تیز بخار میں گھر آئی تو ماں نے اس سے کہا۔ ''فرح' اگر تو چاہے تو گھر آ کر بیٹھ جا۔ ہم خلع لینے کے لیے مقدمہ دائر کر دیتے ہیں...... مجھے پورا یقین ہے کہ تو اپنے گھر میں بالکل بھی خوش نہیں ہے۔''

''نہیں اماں' اگر میں نے ایسا کیا تو انہیں یہ یقین آ جائے گا کہ میں شجاع سے محبت کرتی ہوں۔ میں اپنے ہر عمل سے اشرف کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ شادی کے بعد میرے دل و دماغ میں شجاع کا کوئی خیال تک نہیں ہے مگر ان کا شمار ان مردوں میں ہے جو کسی کی غلطی معاف کر کے بھی معاف نہیں کرتے۔ کسی کو پیار کرنے کی سزا اتنی بڑی ملے گی' میں نے کبھی سوچا نہیں تھا...... اور دوسری بات یہ کہ میں اذیت پسند شخص کی بیوی ہوں اور ایسے لوگوں کی بیویاں...... مجھ سے مختلف زندگی نہیں گزارا کرتیں۔''

اب فرح کی طلاق نے انہیں دلی سکون عطا کیا تھا۔ شاید ہی کسی کی ماں اپنی بیٹی کی طلاق کا سن کر اتنی خوش ہوئی ہو جتنی کہ فرح کی ماں ہوئی تھی۔ اس نے شکرانے کے نفل تک پڑھے تھے۔

فرح نے اپنی عدت ختم ہونے کے بعد سیاہ جوڑا پہنا تو اس کی ماں نے ٹوکا۔ ''فرو! سیاہ رات کا اندھیرا تیری زندگی سے چھٹ چکا ہے۔ آج تو یہ رنگ نہ پہن۔ کوئی دوسرا رنگ پہن لے۔ یاد تو کر...... فیروزی رنگ تیرا پسندیدہ تھا۔ گلابی رنگ تجھ پر اچھا لگتا تھا۔ سرخ پہن کر تو گلاب کی کلی لگتی تھی۔''

''اماں! اب یہ کالا رنگ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس رنگ کو پہن کر نہ جانے کیوں مجھے سکون سا ملتا ہے۔ ویسے بھی یہ رنگ بڑا رازدار سا ہے۔ میرے آنسوؤں کو ایسا سمیٹتا رہا کہ خود مجھے بھی پتا نہیں چلا۔ اس رنگ کو پہننے کی تو میں عادی ہو گئی ہوں......'' اور اماں' ایک آہ بھر کر خاموش سی ہو گئیں۔ ان کی جوان لڑکی اجڑ کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ جب تک بیاہی رہی' وہ خون کے آنسو پیتی رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی اشرف سے علیحدگی پر خوشی کا اظہار کس طریقے سے کریں۔

محلے کی خواتین اور عزیز و اقارب اس کے تمام تر احوال سے واقف ہی تھے...... اس لیے ہر ایک ہی فرح کی ماں کو مبارک باد دے رہا تھا کہ تم شکر کرو کہ تمہاری پھول سی بیٹی ایک جلاد کی قید سے رہا ہو گئی ہے۔

اشرف کی ماں اور بہنوں کو پورے محلے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا...... اور فرح پر کیے گئے ظلم کے بعد تو کوئی بھی ان کے لیے سوفٹ کارنر نہیں رکھتا تھا۔ ہر آنے والا ان کو باتیں سنا رہا تھا۔

حکیم جی کی بیوی نے تو آ کر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اشرف کو اس کے کیے کا پھل ملا ہے...... ورنہ پیر میں کانٹا لگ جانا اتنی بڑی بات تو نہیں تھی کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور پھر ہلکے سے لڑھکنے پر ایسی چوٹ آئی کہ دوسری ٹانگ بھی از خود مفلوج ہو گئی۔

فرح کو یہ سب باتیں سننے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے مہمانوں کے سامنے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہوتی اور اس کا کمرا...... وہ چپ چاپ اپنے بستر پر گھنٹوں پڑی رہتی۔

ماں سامنے کھانا رکھ دیتی تو کسی روبوٹ کی طرح کھا لیتی۔ عظمت بیگم اپنی بیٹی فرحت کے ساتھ ان کے ہاں آئیں تو اس وقت بھی فرح اپنے کمرے میں تھی۔ فرحت اسے لے کر باہر آئی تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

''کتنی کمزور ہو گئی ہو فرح!'' عظمت بیگم اسے دکھ سے دیکھ رہی تھیں۔ ورنہ وہ ان کے گھر کیسی چہکتی ہوئی آتی تھی۔ ہنسی تو اس کے لبوں سے جیسے روٹھ سی گئی تھی۔

"غم کم اٹھائے ہیں اس نے" ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

فرح ماں کی باتیں اس انداز میں سن رہی تھی جیسے وہ کسی دوسرے کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ ہر آئے گئے کے سامنے وہ اپنے دوپٹے کا کونا اپنی انگلی میں لپیٹتی رہتی۔

"خالہ! آپ فرح کو لے کر ہمارے گھر آئیے گا۔ یہ باہر نکلے گی تو اس کی چپ ٹوٹے گی۔ ہر وقت ہنسانے والی فرح کے ہونٹوں پر کیسی خاموشی کے تالے پڑے ہوئے ہیں......" فرحت نے کہا تو فرح کے لبوں ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"فرحت آپا! میں بالکل ٹھیک ہوں" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"مجھے تو بے حد بیمار لگ رہی ہو۔ اپنا خیال رکھو اور خوب گھومو پھرو۔ میں آج کل امی کے ہاں آئی ہو ہوں...... تم آؤ ناں ہمارے گھر۔"

"کون سے گھر؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"ارے شجاع بھائی کا گھر کیا تم بھول گئیں...... تم تو اس گھر میں کئی بار آئی ہو" فرحت نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں...... آں...... یاد ہے مجھے وہ گھر۔ آؤں گی میں کسی دن۔"

"میں انتظار کروں گی تمہارا" فرحت نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا اور اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ شجا اس کا ہاتھ اسی انداز میں دبا کر کہہ رہا تھا کہ "کل تم میرے گھر آنا...... میں تمہارا انتظار کروں گا۔" بات کرنے انداز اس کا بھی اسی طرح تو تھا۔

"مگر شجاع...... خالہ جی! کیا کہیں گی...... کہ پچھلے ہفتے تو میں تمہارے گھر آئی تھی...... اب پھر آ گئی؟" اس نے شرما کر کہا تھا۔

"کہہ دینا...... تم کہ یہاں اپنی سہیلی کے گھر آئی تھیں تو واپسی پر ادھر بھی آ گئیں۔"

"پہلے بھی یہی کہا تھا" وہ چھن سے ہنسی تھی۔

"مجھے نہیں پتا...... تم نے آنا ضرور ہے" وہ کسی اڑیل، ضدی بچے کی طرح بولا تھا۔

"اور اگر میں کسی وجہ سے نہیں آ سکی تو......؟" اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں سجا کر اس نے پوچھا۔

"تو میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔" وہ اسے ڈراتے ہوئے بولا۔ اپنی مسکراہٹ وہ دبائے بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا...... کہ اس کا یہ جملہ وہ سہہ نہیں پائے گی۔ (اس کو پریشان کرنے کے تمام گر جو وہ جان گیا تھا) اور اس کے جملے کا ردعمل واقعی ایسا ہی تھا۔ ابھی فضا میں اس کے جملے کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ تڑپ کر اس نے اپنا چوڑیوں بھرا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔ "اللہ نہ کرے آئندہ ایسے الفاظ اپنے ہونٹوں سے ادا نہ کیجیے گا۔"

"تو پھر آؤ گی ناں......؟"

"ہاں آؤں گی...... آؤں گی، ضرور آؤں گی۔" وہ شریر سے لہجے میں اس کے کانوں میں چیخی تھی۔

"باہنوں میں چوڑیاں ضرور تنگ ہوں...... کہ یہ چوڑیاں بنی ہی تمہاری کلائیوں کے لیے ہیں" وہ اس کانوں میں فسوں پھونک رہا تھا اور اس کے جملے سن کر وہ شرمائے چلی جا رہی تھی۔

اور اب فرحت کے پرمحبت اصرار پر اسے ماضی کی باتیں کسی ناگ کی طرح ڈس رہی تھیں...... اور اس کی کلی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شجاع کی آوازیں اس کے دماغ پر سنگ باری کر رہی تھیں۔

"اشرف! قسمت تمہاری ہی نہیں، میری بھی خراب تھی...... ورنہ میری خوشیاں مجھ سے یوں نہ روٹھتیں

اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ عظمت بیگم اور فرحت اسے یوں رکھائی سے جاتا ہوا اور ایک آہ بھر کے اپنے گھر لوٹ گئیں۔

☆☆☆

گھر آ کر بھی ان کی گفتگو کا مرکز فرح کی ہی ذات تھی۔

"اشرف کے گھر والوں نے کیسی اچھی لڑکی کا کیا حال کر دیا ہے کہ وہ پہچانی تک نہیں جا رہی ہے۔"

"بہت ظلم کیے ہیں اشرف اور اس کی ماں نے......" پڑوس میں رہنے کے باوجود اپنی ماں کے گھر مہینوں نہیں آتی۔"

"اپنے کیے کا پھل مل تو رہا ہے ان لوگوں کو...... کہ ہر شخص ان کے گھر کا بری طرح پریشان ہے۔ شدہ بیٹیوں کو ان کی سسرال والوں نے گھر بٹھا دیا ہے۔ پہلے تو ساری پریشانیوں اور ساری نحوست کی صرف فرح کی ذات ٹھہرتی تھی۔ اب ان لوگوں کے پاس سوائے بیکار کی بکواس کرنے کے کچھ نہیں بچا"

"اگر فرح کی شادی شجاع بھائی سے ہو جاتی تو شاید ہم سب لوگ بھی خوش رہتے۔ فرح کی شادی شجاع ساتھ نہ ہونے میں میری ذات بھی رہی ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ نگین ہمارے ساتھ اس وجہ ی ہے کہ ہم نے فرح کی بھی آہ لی ہے۔" فرحت نے ماں سے کہا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سانس لے کر رہ گئیں۔

"ش بھائی کی شادی فرح سے اب ہو جائے تو فرح کی زندگی سنور جائے گی۔"

"پاگل ہو گئی ہے کیا...... نگین کی موجودگی میں وہ کیوں فرح سے شادی کرے گا؟" ماں نے کہا۔

"دو بیویاں رکھنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ فرح تو بھائی کو پسند تھی۔" فرحت نے کہا۔

کمرے میں داخل ہوتا ہوا شجاع...... فرح کا اس انداز میں ذکر سن کر ناراض سا ہو گیا اور لگا فرحت کو باتیں جس نے اس کی زندگی میں ہمیشہ پریشانیاں پیدا کی تھیں۔

☆☆☆

یہ نہ دیکھو کہ مرے زخم بہت کاری ہیں
یہ بتاؤ کہ مرا دشمن جاں کیسا ہے

نے درست کہتے ہیں کہ غصہ آگ ہوتا ہے، بندے کو خاک سے راکھ کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ ایسا ہی کچھ کے ساتھ ہوا۔ اس نے غصے میں فرح کو طلاق تو دے دی مگر بعد میں پچھتایا بہت...... اب اسے ذرا ذرا کے لیے اپنی ماں کو آواز دینی پڑتی تھی۔ بہنوں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ جس سے اس کا چڑچڑاپن جا رہا تھا۔ اس کے کسی رشتے دار نے آ کر جب یہ احوال دیکھا تو اس کو سرزنش کرتے ہوئے کہا "اگر اپنے ساتھ محبت سے رکھتے، اس کا خیال رکھتے تو تمہاری بیوی تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتی اور تمہاری شوار نہ ہوتی۔"

"پ کا کیا خیال ہے اس نے مجھ سے خلع لیا ہے" اشرف نے اشتعال آمیز لہجے میں کہا۔

ے تمہاری اس دائمی معذوری کے سبب کون بیوی [illegible] خوشی رہ سکتی [illegible] جبکہ تمہارا [illegible]

"مگر فرح تو رہ رہی تھی...... میں نے اسے خود طلاق دی ہے۔"

"اگر تم نے اسے خود طلاق دی ہے تو تم سے بڑھ کر کوئی پاگل نہیں ہے۔ اب پانی کے لیے بھی تم مرتبہ کہنا پڑتا ہے۔"

"وہ چور تھی' پانچ لاکھ روپے میرے چرا کر لے گئی۔ دس تولے سونا گھر میں رکھا ہوا تھا' وہ لے جا کر میں دے دیا۔ وہ بدمعاش تھی' اس سے ملنے لڑکے آتے تھے۔ میں ایسی عورت کو اپنے گھر بھلا کیسے رکھ سکا اشرف کے منہ سے یہ جملے کیا تھے' تیر نکل رہے تھے۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا اور مہمان رشتے دار اسے تاس دیکھ رہا تھا کہ کیسا لکھ پتی تھا یہ شخص' جو اپنے گھر میں پانچ لاکھ ہوتے کے باوجود عزیز و اقارب سے ہزارو رقوم بطور قرض حاصل کیا کرتا تھا۔

اشرف کے ذہنی دیوالیہ پن پر اسے افسوس ہوا تھا مگر اب اس کی ماں' بہنوں کے ہاتھ ایک نیا شوشا آ اب وہ ہر آئے گئے کے سامنے فرح کی ذات میں کیڑے ڈال رہی تھیں۔

"وہ چور تھی۔

وہ بدمعاش تھی۔

وہ گھر میں رکھنے کے قابل نہیں تھی۔"

سننے والے ہنس کر سنتے اور دس سے ضرب دے کر آگے بڑھا دیتے۔

فرح کی ماں تک جب یہ باتیں پہنچتیں تو وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو جاتیں۔

"کسی پر بہتان لگانا انتہائی مذموم فعل گردانا جاتا ہے مگر بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی دکھا دیتا ہے۔ کی بڑی بہن کی سسرال میں چوری ہوئی...... تو اس کی سسرال والوں نے تمام الزام اس کی بہن پر لگا دیا کا بھائی معذور ہوا ہے...... علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ دکان مسلسل بند ہے' بہنیں چوری نہیں تو کیا کریں گی' آخر گھر بھی تو چلانا ہے۔"

"چوری کا الزام تو ان لوگوں نے بھی فرح پر لگایا تھا...... کیا آپ لوگ بھی ان کی نقالی کر رہے ہیں والوں نے انہیں سنایا۔

"ہم نے تو اپنی چوری کی رپورٹ درج کروائی ہے...... کیونکہ ہمارے گھر میں واقعی چوری ہوئی کے صرف باتوں کے غبارے ہیں جس میں وہ ہوا بھر کے چھوڑ رہے ہیں اور پھر پیٹ بھر کے جھوٹے گھر میں دھیلا نہیں...... اور لاکھوں کی چوری کا الزام۔ اپنی بہو کو نقلی زیور چڑھایا...... اور دس تولے چوری کا الزام...... ایسے لوگوں کے سامنے ہی ان کے کرتوت آ جاتے ہیں...... دیکھ لو ان کے گھر کا حش ایک دوسرے سے بیزار ہے۔ جس کے گھر میں چار چار لڑکیاں ہوں' وہاں دال چاول ابالنا بھی ایک کام سب ایک سے ایک بڑھ کر کام چور اور نکمے ہیں' جنہیں سوائے باتیں بنانے اور الزام دھرنے کے کھا جب کہ یہی لوگ اول نمبر کے چور ہیں...... اگر چوری نہیں کریں گے تو کھائیں گے کیسے؟"

☆☆☆

نگین کے ست وانسی بچی ہوئی تو شجاع پھر کراچی بھاگا چلا آیا۔ نومولود بے حد کمزور تھی اور نگین کی خاصی دگرگوں۔ فرید احمد بھی پریشان سے ہو کر رہ گئے تھے۔ نگین دس دن اسپتال میں ایڈمٹ رہی دیکھنے روزانہ ہی اسپتال جاتے رہے۔ نواسا تو ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ ان کو دیکھ کر خوب خوش

اس دن نگین اسپتال سے گھر آئی' فیروزہ بیگم کی جان میں جان آئی۔

"شجاع بیٹا! میں ابھی دو چار مہینے نگین کو اپنے پاس رکھوں گی۔ ابھی یہ بچی کو تو کیا اپنے آپ کو بھی نہیں تی" فیروزہ نے داماد سے کہا۔

"ہے ممانی! جیسی آپ کی مرضی...... میں آتا جاتا رہوں گا۔" دو چار روز رہ کر شجاع جب گاؤں پہنچا تو بیگم نے اس کی روداد سن کر کہا۔

"چار مہینے کی کیا بات ہے' ایک دو سال کے لیے نگین اور بچوں کو وہاں چھوڑ دے۔ اچھا ہے دونوں بچے ل آ جائیں گے تو بھی وہاں جا کر رہ لے...... کراچی جا کر تجھے ویسے بھی خوب مزہ آتا ہے۔"

"اماں آپ سیدھی بات کو ہمیشہ ٹیڑھی کر کے دیکھتی ہیں۔ نگین اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ سہارا لے کر چلتی ہے۔ میں وہ بھلا کیسے آ سکتی تھی؟"

"میں نے تجھ سے یہ کب کہا ہے کہ نگین کو یہاں آنا چاہیے تھا' میں تو یہی کہہ رہی ہوں ناں کہ اسے وہاں ہنا چاہیے تاکہ اسے خود بھی چلنا آ جائے اور وہ دوسروں کو بھی چلا سکے۔"

"آپ کی بات کا جو مطلب ہے ناں...... وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں...... فرحت نے طنز کرنے کے تمام آپ کو سکھا دیے ہیں۔"

"اس میں فرحت کا کہاں سے ذکر آ گیا...... نہ وہ یہاں موجود ہے...... نہ اس نے تم سے کچھ کہا ہے...... مگر فطرت میں ڈوبی باتیں سن کر احساس ہو رہا ہے کہ تمہاری بھرائی بہت اچھی طرح کی گئی ہے...... بہت نے لگا ہے تمہیں اپنی بہن کا۔ ماشاء اللہ...... ہر وقت لبوں سے پھول جھڑتے ہیں...... اور تم اپنی بہن سے نے لگے ہو کہ شاید ہی کسی بھائی نے اپنی بہن سے کی ہو گی...... اب تو تمہاری کوئی بھی بات فرحت بغیر پوری ہی نہیں ہوتی ہے۔" عظمت نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اماں اب آپ بھی پہلے جیسی نہیں رہی ہیں۔ میرا اور نگین کا آپ نے پیچھا لے رکھا ہے...... میری ہر بات لگتی ہیں...... اور وہ بے چاری جو ایک لفظ بھی آپ کے خلاف نہیں بولتی ہے...... اس کے خلاف آپ مار رکھا ہے۔"

"ہم اتنے برے ہیں تو ہمارے پاس کیوں آیا ہے؟ وہیں رہتا...... جو تجھ سے تیرے حساب سے باتیں بہتر جانتے ہیں۔"

"اماں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ممانی بہت اچھی ہیں اور مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ آپ تو ان سے واہ کا بیر باندھتی رہیں...... جبکہ وہ بہت اچھی ہیں۔"

"شجاع بیٹا' تو نے شاید یہ مثل نہیں سنی...... جو ماں سے بڑھ کر چاہے وہ پھاپھا کٹنی...... کہ ماں سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا۔"

"ن کے اس دور میں تمام پرانی مثالیں اور کہاوتیں غلط ہو گئی ہیں......" شجاع نے تمسخر سے کہا اور باہر نکل بیگم یہ سوچنے لگیں کہ شجاع کے مزاج میں آگ تو ہر روز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ یقیناً فیروزہ نے کوئی ا ہے کہ میرا بیٹا میرے پاس نہ رہنے پائے...... اور وہ میرے بیٹے کو چھین لے۔

وچ کر ہی ان کا دل بھر آیا...... اور آنکھیں برسنے کو تیار ہو گئیں۔

☆☆☆

فرح کے آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگ گیا تھا مگر اس کے من کی بے کلی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی

کتنی عجیب بات تھی کہ اشرف اور اس کے گھر والوں کا خیال اس کے دماغ کی سلیٹ سے یوں مٹ جیسے اس کا ان سے کبھی ناتا ہی نہ رہا ہو۔

اور اب شجاع اسے یوں یاد آ رہا تھا جیسے اس کے بغیر اس کا رہنا محال ہو اور جیسے وہ ابھی زیادہ دور بھی اور اسے یہ یقین تھا کہ وہ آواز دے گی تو وہ لوٹ آئے گا۔ اس کی دماغی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ اگلے دن ماں نے اسے پکارا تو وہ یوں دیکھتی رہی جیسے ماں نے اس کے بجائے کسی دوسرے کو پکارا ہو۔

''فرح' کیا تجھے میری آواز سنائی نہیں دے رہی......؟'' ماں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا

''آ رہی ہے......!''

''تو پھر بولی کیوں نہیں؟''

''اماں! میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ میرا نام فرح ہے۔''

''پاگل تو نہیں ہو گئی تو؟'' اماں نے پریشان ہو کر کہا۔

''پتا نہیں اماں! کبھی کبھی میرا دماغ سن سا ہو جاتا ہے۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا...... ساری شائیں شائیں میں تبدیل ہو جاتی ہیں...... تب مجھے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کہاں ہوں...... اور کیا کر رہی

''ایسا کب سے تیرے ساتھ ہو رہا ہے......؟'' اماں نے اپنی چیخیں اپنے اندر ہی روکتے ہوئے پوچھا

''سب سے پہلے تو اس وقت ہوا تھا جب اشرف نے باہر سڑک پر کھڑے ہو کر مجھے ڈانٹا تھا کہ را متوجہ ہو گئے تھے بلکہ ایک آدھ نے یہاں تک کہہ دیا تھا...... بھائی' گھر کے مسئلے گھر میں حل کرو...... ایسے تماشے نہیں ہوا کرتے...... مگر اس کی بات سن کر انہوں نے باہر مجھے مارنا شروع کر دیا تھا اور لوگ مجھے دیکھنے لگے...... تو میرا سر گھوم کر رہ گیا تھا۔ دوسری دفعہ جب بڑی نند نے بے مہار گالیاں مجھے دی تیسری مرتبہ جب...... اشرف نے ابا مرحوم کو بلا جواز برا بھلا کہنا شروع کیا تھا...... اور ان کے یہ صورت ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے...... اس وقت میرا یہ دل چاہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھ میں پکڑا گلاس اشرف کے سر پر توڑ دوں اور چوتھی مرتبہ......''

''بس بس' مجھے اب ان بدبختوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں سننا جو انسان کے بھیس میں جانور کسی کی لڑکی اس لیے بیاہ کر لائے ہوں کہ اس پر ظلم و ستم کا ہر وار اپنایا جائے گا۔ سن لے میری یہ بات' میں اشرف یا اس کے گھر والوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہو گا۔ اپنی زندگی کے وہ سال پھاڑ کر جلا دے جو تیرے ساتھ گزر رہے ہیں۔''

اب اماں ہچکیوں سے رو رہی تھیں اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں چپ کرا سکے۔

☆☆☆

فرح کی بہنیں اسے اپنے ساتھ لے جانے کی پوری سعی کر رہی تھیں۔ وہ وعدہ بھی کر لیتی مگر عین وقت کر دیتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی بڑی بہن کے دیور کی منگنی تھی...... اس کی ماں کا خیال تھا کہ نکل کر لوگوں سے ملے گی تو اس کے ڈیپریشن میں کمی آئے گی۔

وہ ماں کے کہنے سے تیار بھی ہو گئی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس نے جارجٹ کا کالا سوٹ ہی پہنا میں چوڑیاں بھی پہن لی تھیں مگر عین وقت پر اس نے جانے سے صفا چٹ انکار کر دیا تھا۔

''فرح بیٹا! تو گھر سے نکلے گی تو اس غم کو بھلا پائے گی'' ماں نے رسان سے اسے سمجھایا تھا۔

''اماں' میرا صرف یہی غم تھوڑی ہے'' اس نے دھیمے سے کہا تھا۔

''میری جان! تو اپنے سینے سے کون کون سے غم لگائے بیٹھی ہے۔'' ماں کا کلیجا پھٹنے لگا تھا۔

''پتا نہیں......'' وہ خالی خالی نظروں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے' پھر میں بھی نہیں جاتی۔''

''نہیں اماں' آپ جائیں...... مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں کچھ وقت تو لگے گا ناں......؟''

''ہاں' کہتی تو ٹھیک ہے'' ماں نے سوچا۔

فرح اپنے کمرے میں بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ تکیے پر آنسو ڈھیرے ڈھیرے گرنے لگے۔

''اونہہ...... رونا نہیں...... مجھ پر یقین نہیں ہے تمہیں...... میں تمہارے پاس جلد آ جاؤں گا'' شجاع کا چہرہ ہالہ سا بن گیا تھا۔

اور وہ اسی کے وعدوں کی لڑیوں کو گنتے ہوئے سوچنے لگی

تم نے کہا تھا!
جب تم سیاہ رنگ پہنو گی
جب تمہارے حسین ہاتھوں کی
نازک چوڑیاں شور مچائیں گی
میں لوٹ آؤں گا
تم نے کہا تھا!
جب ہنستے چہرے کی آنکھ روئے گی
اور دل کی دھڑکن
صرف میرے نام پہ دھڑکے گی
میں لوٹ آؤں گا
آج میں کہتی ہوں!
میری آنکھیں رو پڑی ہیں
تمہارے بعد ساری عمر
بڑی تنگ میں گزری ہے
اب لوٹ آؤ ناں
دھڑکنیں تمہارے نام پہ دھڑکتی ہیں
میں نے اپنی کانچ کی چوڑیوں کو
ابھی تک بھی خاموش نہیں رکھا
دیکھو!
اب لوٹ آؤ ناں!

(دعا احمد)

کچھ دیر بعد وہ یہ سوچ کر رو رہی تھی کہ شجاع کی شادی ہو گئی ہے۔ اب وہ اس کی سمت نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

☆☆☆

طاہر کی مہندی تھی۔ لڑکیوں کی دونوں پارٹیوں میں گیتوں کا خوب مقابلہ ہو رہا تھا۔ ثنا لڑکے والیوں گروپ کو لیڈ کر رہی تھی۔ کبھی ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے گروپ میں شامل ہو جاتی تو کبھی لڈی ڈالنے والیوں گروپ میں شامل ہو جاتی۔

نادر اس وقت مووی بنا رہا تھا...... اور اس کا کیمرا صرف ثنا کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ اس کے ہنسنے کا اندا اس کی شرارتیں اور اس کی باتیں۔ وہ بہ نظر غائر دیکھ رہا تھا۔

معصوم سی' الھڑ سی ثنا...... طاہر بھائی کی مہندی میں پرجوش سی تھی۔

پھر اس نے دف اٹھایا اور نیا گیت شروع کیا۔ اس کی آواز' اس کے انداز نے سب ہی کی توجہ اپنی جا مبذول کر لی تھی۔

نادر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے دیکھے یا سنے؟ گیت ختم ہوا تو سب کی ہتھیلیاں تالیاں بجاتے بجا سرخ ہو گئیں اور ثنا شرما سی گئی۔

”ثنا' تم شاعرہ بھی تو ہو۔ اپنی کوئی غزل بھی سناؤ۔“

”اس وقت غزل سنانے کا کیا موقع ہے؟“ اس نے جان چھڑانی چاہی۔

”مہمانوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق ادب عالیہ سے جو ہے' سب کو ہی تمہاری غزل اچھی لگے گی۔“

”پلیز ثنا! سنا دوں ناں......“ نادر نے ملتجی لہجے میں کہا۔

”نہیں بھئی...... اس وقت ہم سب صرف مہندی کے گیت گائیں گے۔“ وہ ڈھولک کی کڑیاں کستے ہوئے بولی

”ثنا بیٹی! سب اتنا کہہ رہے ہیں تو سنا دو“ مسز رحمٰن نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں ثنا! تمہیں سنانا ہی پڑے گا“ طاہر نے ہنس کر کہا۔

”او کے......!“ وہ مائیک پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اور بیلا کی ماں نے صرف یہی دیکھا کہ وہ صرف طاہر کے کہنے پر راضی ہوئی ہے۔ تھوڑی سی دیر میں ہی ا کی آواز نے سب کو اسیر کر لیا

مہتاب رتیں آئیں تو کیا کیا نہیں کرتیں
اس عمر میں تو لڑکیاں سویا نہیں کرتیں
کچھ لڑکیاں انجام نظر آتے ہوئے بھی
جب گھر سے نکلتی ہیں تو سوچا نہیں کرتیں
آنگن میں گھنے پیڑ کے نیچے تری یادیں
میلہ سا لگا دیتی ہیں' اچھا نہیں کرتیں
جو لڑکیاں تاریک مقدر ہوں کبھی بھی
راتوں کو دیے گھر میں جلایا نہیں کرتیں

(نوشی گیلا

تقریب میں بیٹھی فریال کو یوں لگا جیسے ثنا اسے آئینہ دکھا رہی ہو اور سب کو یہ بتا رہی ہو کہ وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔

نہیں جانتی تھی کہ ثنا کو اس کے گھر والوں نے کیا کچھ بتا رکھا ہے مگر اس وقت اس کی یہ غزل ہی اسے چونکا نے کے لیے کافی تھی۔ وہ' جو آج یہ سوچ کر آئی تھی کہ مسز رحمٰن کے بیٹے کی شادی اور ولیمے دونوں دن کے میں شرکت کرے گی' اس کا دل اچانک ہی اچاٹ سا ہو گیا اور وہ ثنا کو بتائے بغیر مسز رحمٰن سے معذرت ی ہوئی اٹھ آئی۔

اگلے دن جب ثنا نے موبائل پر اس کی کھینچا تانی کی تو وہ صرف یہی کہہ سکی۔ ”میرے سر میں اچانک درد نے لگا تھا...... اور جب یہ درد ہوتا ہے تو میرے لیے کہیں بھی بیٹھنا عذاب ہوتا ہے اس لیے میں اٹھ گئی تھی۔“

شادی کی تقریب میں ثنا کو بلیک غرارے میں دیکھ کر نادر مبہوت سا رہ گیا تھا۔ سیاہ لمبے بال اس کی کمر سے آ رہے تھے۔

ایسی معصومیت اور ایسا حسن اس نے بھلا کہاں دیکھا تھا۔ ایک دو بار بہانے بہانے سے اس کے پاس آیا تو اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ نادر کی بولتی ہوئی نگاہوں سے اسے ہمیشہ وحشت سی ہوتی تھی۔

اس کا شمار ان لڑکیوں میں نہیں تھا...... جو لڑکوں کے اشارے' کنائے دیکھ کر خوش ہوا کرتی ہیں۔ طاہر کی سخت ت سے وہ چونکہ ڈرتا تھا اس لیے دور دور سے ہی اسے دیکھ کر وہ خوش ہوتا رہا۔

اسے اچھی طرح یاد ہو گیا تھا کہ کتنی بار وہ ہنسی ہے' کتنی بار وہ مسکرائی ہے اور کتنی بار اس نے چہرے پر آتے بالوں کو دلنشین انداز میں پیچھے کیا ہے۔

ایسی اچھی لڑکی اور مجھ سے اتنی دور ہے...... وہ اس سے بیس گز کے فاصلے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔

دوسری جانب اس تقریب میں شریک کئی خواتین مسز رحمان سے ثنا کی بابت پوچھ رہی تھیں۔

”رحمٰن کے بڑے قریبی دوست کی بیٹی ہے' یہاں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ آخری سمسٹر پورا کرنے بعد کراچی چلی جائے گی۔ ان کے والدین ولیمے کی تقریب میں شرکت کرنے آئیں گے تو آپ خود ہی بات لیجیے گا۔“

پھر ولیمے کی تقریب میں شاہنواز تو نہیں آ سکے' ہاں ثریا ضرور آئی تھیں اور بڑے تام جھام سے آئی تھیں۔ اہر کی دلہن کے لیے لاکٹ کا سیٹ لائی تھیں اور رحمٰن صاحب اور ان کی بیگم کے لیے اعلیٰ قسم کے جوڑے تھے۔

ولیمے کی تقریب میں بہت سی خواتین ثریا بیگم سے ملیں تو انہوں نے نخوت بھرا جواب یہی دیا کہ وہ ڈاکٹر' یا پائلٹ میں ہی سے کسی کا انتخاب کریں گی۔

سی گورنمنٹ آفس کا گریڈ چودہ' پندرہ یا سولہ کا افسر انہیں کسی طور قبول نہیں ہے۔ مسز عاطف کے پروفیسر کے لیے منع کرتے ہوئے انہوں نے تمسخر بھرا رویہ اپناتے ہوئے کہا تھا۔ بک بک کرنے والے' چڑچڑے فیسر کا رشتہ وہ کبھی قبول نہیں کر سکتیں...... یہ شعبہ تو انہیں کبھی پسند ہی نہیں رہا۔ اسکول ماسٹر اور پروفیسر کو وہ ایک قبیلے کا سمجھتی تھیں۔

وہ خواتین جو ثنا کو دیکھ کر آگے بڑھی تھیں' ان کی ماں سے بات کر کے خاصی دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔ ثریا کا گفتگو انتہائی چھچھورپن سا لیے ہوئے تھا۔

ٹر فیاض کی والدہ...... جنہیں ثنا کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی...... وہ صرف ثریا سے گفتگو کر کے پیچھے ہٹ گئی

تھیں۔ انہوں نے ثریا کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ان کا بیٹا معروف سرجن ہے...... جس کا اپنا نام ہے' شہرت ہے اور دولت ان کے گھر کی باندی ہے۔

نادر کئی مرتبہ ثریا کے پاس آیا' کبھی کوئی ڈش دینے تو کبھی ان کو پوچھنے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ تب ثریا کو وہ اچھا سا لگا اور جب اس نے بتایا کہ وہ مسز رحمن کا بھائی ہے اور اپنا بزنس چھوڑ کر پاکستان کی شادیوں میں شرکت کرنے آیا ہے تو ثریا نے بغور اس کا جائزہ لے ڈالا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' گوری رنگت۔ کھڑا ناک نقشہ اور دیکھے بھالے خاندان کا بزنس مین ایکدم ہی انہیں پسند آ گیا۔

''ارے بیٹا! راولپنڈی تک آئے ہو تو کراچی کا بھی تو ایک چکر لگاؤ...... میں بھی تو آخر تمہاری آنٹی ہوتی ہوں۔''

''آپ بلائیں اور میں نہ آؤں...... ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔'' نادر کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''شادی وادی ہو گئی تمہاری......؟'' دل میں آیا خوف رفع کرنے کے لیے انہوں نے جلدی سے پوچھ ڈالا۔

''آپا نے پہلے اپنے بیٹے کی کر لی ہے...... اب میرا نمبر آیا ہے تو وہی کریں گی...... کہ میں اپنی آپا کا سب سے لاڈلا اور سب سے چھوٹا بھائی ہوں۔''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں...... اللہ وہ وقت جلدی لائے'' ثریا نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ انکل کو ساتھ کیوں نہیں لائیں' آپا تو کہہ رہی تھیں کہ وہ بھی ضرور آئیں گے۔'' نادر نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''ان کی اماں کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی ورنہ وہ تو اچھا خاصا میرے ساتھ آ رہے تھے مگر جوائنٹ فیملی سسٹم کی ایک خرابی جو ہوتی ہے' رنگ میں بھنگ ڈالنا۔ وہ ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ شاہنواز چاہنے کے باوجود میرے ساتھ نہیں آ سکے...... حالانکہ ان کے بھائی' بھتیجا' داماد سب موجود ہیں...... مگر شاہنواز میرے ساتھ نہیں آئے...... اور یہ خوشی ان کی سب سے بڑی ہو گی۔''

تب نادر کو یہ بات جاننے میں دیر نہیں لگی کہ ثریا نہ صرف ایک جاہل خاتون ہیں بلکہ وہ گفتگو کے آداب سے بھی نابلد ہیں۔ مگر ثریا تو نادر کو دیکھتے ہی لٹو ہو گئی تھیں۔ اتنا خوبصورت اور اتنے پیسے والا لڑکا ان کا داماد بن جائے گا تو وہ بھی سائرہ کے سامنے اونچی اونچی باتیں کر سکتی ہیں۔

اب نادر اور ثریا کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے خوب باتیں کر رہے تھے اور ثنا کو یہ سب دیکھ کر بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

مسز رحمان نے بھی ثریا کی دلچسپی محسوس کر لی تھی...... مگر انہیں تاسف سا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی نادر کو پھر ایک جانب لے جا کر سمجھا چکی تھیں...... ''نادر! نہ تم بزنس مین ہو اور نہ ہی تعلیم یافتہ شخص...... اس لیے ثنا کی والدہ سے اس انداز میں بات نہ کرو' جس میں تمام رنگ صرف جھوٹ سے بھرے جائیں۔ اس فیملی سے ہمارے تعلقات اس نہج کے نہیں ہیں کہ ہم انہیں بے وقوف بنائیں یا جھوٹ بول کر کوئی فائدہ حاصل کریں۔''

''ارے آپا! کیا مہمانوں کا خیال رکھنا بھی نہیں چاہیے؟'' اس نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے...... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ثنا سے دور دور رہو...... اور اپنے بارے میں کسی بھی قسم

ے قلابے ملانے سے گریز کرو۔''

''آپا! ایسی کوئی بات نہیں' آپ کو خواہ مخواہ کی غلط فہمی ہوئی ہے'' نادر نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

مگر بیلا کو یہ غلط فہمی بالکل بھی نہیں ہوئی۔ ولیمے کی تقریب میں اس نے نادر کو ثنا کے آگے پیچھے دیکھتے ہی ہ لگا لیا کہ وہ ثنا پر لٹو ہو چکا ہے۔ نادر کے یہ انداز دیکھ کر اسے ایک سکون سا ملا۔

لیمے کی تقریب کے بعد اس نے طاہر سے پوچھا۔ ''آج کی تقریب میں سب سے خوبصورت مہمان کون ھا؟''

طاہر کے لبوں سے بے اختیار نکلا ''ثنا۔''

''اچھا...... کیا وہ مجھ سے بھی پیاری لگی آپ کو؟'' بیلا نے روٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تم اب مہمان تھوڑی ہو...... میں تو تقریب کے مہمانوں کی بات کر رہا تھا۔''

''نادر بھائی بھی بہت اچھے لگ رہے تھے...... بلکہ بہت سی لڑکی والیاں انہیں بہت توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔''

''ماموں کو خواتین کی محفلوں میں گھسنے کا بھی بہت شوق ہے۔ سوائے شکل کے ان کے پاس ہے کیا...... ں تک انہوں نے کیا نہیں ہے۔ بس' ہیرو بننے کا شوق ہے۔ جہاں کوئی اچھی لڑکی نظر آئی' مجنوں بن کر اسے ھنے لگے۔ مجھے تو تاسف ہوتا ہے۔''

طاہر کی یہ باتیں سن کر بیلا کو ایک عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی۔

''ثنا! اب میں تمہارا کیا حشر کروں گی' تم یہ سوچ بھی نہیں سکتیں...... اور اس گھر میں تو تمہارے قدم کبھی لوٹ ہیں آئیں گے'' بیلا مسکراتے لبوں کے ساتھ بہت دور تک سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

مارے غصے کے لسی کا گلاس اتنی زور سے اس نے میز پر رکھا کہ آدھی لسی میز پر چھلک گئی۔

''کہہ تو رہا ہوں آپ سے کہ اب میں کراچی نہیں جاؤں گا' جب اسے آنا ہو گا تو وہ خود ہی آ جائے گی'' شجاع ماں سے کہا۔ آج فرحت بھی گھر آئی ہوئی تھی اور اس کا بھی یہی پوچھنا تھا کہ وہ گاؤں کتنے دنوں کے لیے آیا اور واپس اپنے اصلی گھر کراچی کب تک جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور ان لوگوں کی یہ بات سن کر ہی شجاع کا ماغ کھول گیا تھا۔

''یہ غصہ' یہ نخرے تو کسی اور کو دکھانا' ہم صاف بات کرتے ہیں اور صاف بات پوچھتے ہیں'' عظمت بیگم نے جاع سے کہا۔

''میں بھی آپ سے کوئی لگی لپٹی بات نہیں کہہ رہا ہوں...... اور نہ ہی مجھے کراچی جاتے کا کوئی شوق ہے۔ اچی میں جا کر میرا دل بھی نہیں لگتا ہے' اپنے گھر آ کر ہمیشہ مجھے سکون ملتا ہے اور میں ہمیشہ یہیں رہوں گا۔''

''مگر نگین تو یہاں رہنا نہیں چاہتی۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا ہے' جہاں میں رہوں گا وہیں وہ بھی رہے گی۔ اس نے آج تک اس لحاظ سے ات ہی نہیں کی ہے۔''

''یہ تو تجھے وقت بتائے گا کہ وہ کہاں رہے گی اور تو کہاں رہے گا؟''

''کیا آپ لوگ مجھے کاٹھ کا الو سمجھتی ہیں؟'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''ہم جو تجھے سمجھتے تھے' تو جب وہی نہیں نکلا...... تو اب کیا کہہ سکتے ہیں۔''

"شادی کے بعد لوگوں کے بھائی اتنی جلدی نہیں بدلا کرتے جتنی جلدی تم بدل گئے ہو" فرحت نے کہا۔

"آپ لوگوں کی باتیں سن کر جتنی مجھے وحشت ہونے لگی ہے' میں بتا نہیں سکتا۔ نگین ٹھیک کہتی ہے...... یہا کے ماحول میں اس کا دل بالکل بھی نہیں لگا کرتا ہے۔ ظاہر ہے' جب باتیں ہی دل جلانے والی ہوں گی تو کس بھی دل نہیں لگ سکتا۔ وہ بھاگ بھاگ کر صبح جاتی ہے۔ کم از کم اپنے گھر میں اسے چین تو ملتا ہوگا۔" شجاع لہجے میں شعلوں کے سے لپکے تھے۔

اور پھر اس کا سارا عزم کسی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کراچی میں بچی کی حالت اچانک بگڑ جانے کے باع اسے فوری طور پر کراچی جانا پڑا۔ ننھی منی سی سیمی کو آئی سی یو میں ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔

پورے دو ہفتے وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رہی اور جب وہ گھر آئی تو اس کی طبیعت قدرے بہتر تھ ننھی منی سی بچی کا بخار دماغ پر چڑھ گیا تھا اور بچی کو اس حالت میں دیکھ کر نگین کو غشی کے دورے پڑنے لگے یہ سب دیکھ کر شجاع کی حالت بھی غیر ہو گئی تھی۔ چار ہفتے بعد جب اس نے جانے کا قصد کیا تو نگین نے کہا "آ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔"

"تم اتنی بیمار رہی ہو...... اور چھوٹی بچی بھی اتنی لاغری سی ہے...... گاؤں کی گرمی میں وہ پریشان ہو جائے گی۔"

"پھپو نے ابھی تک اپنی پوتی کو نہیں دیکھا' آخر ان کو بھی تو ارمان ہوگا؟"

"پتا نہیں......" شجاع نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔

"ہم سیمی کو لے کر چلیں گے تو وہ خوش ہو جائیں گی۔ ارحم کو بھی وہ بہت پیار کرتی ہیں اور اب تو دو ہو گئے...... ان سے زیادہ کوئی خوش ہی نہیں ہو سکتا۔"

"ہوں......" شجاع کے ذہن میں ماں کی باتیں آ رہی تھیں۔ وہ نگین سے کس قدر بدظن تھیں کہ اس کا تک سننا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اور ایک یہ نگین تھی' اسے ہر وقت اپنی پھپو کی خوشی کا خیال دامن گیر رہتا تھا۔

"آپ نے فرحت آپا اور ان کے بچوں کے لیے کچھ چیزیں خریدیں یا نہیں......" نگین نے اس پوچھا۔

"ہر ماہ تو کراچی کے چکر لگ رہے ہیں' اب ہر ماہ تو سوغاتیں خرید کر کسی کو نہیں دی جا سکتیں" شجاع اس بات سمجھ کر بولا۔

"اس دفعہ آپ کا آنا خاص نوعیت رکھتا ہے۔ فرحت آپا اب ارحم کے ساتھ ساتھ سیمی کی بھی پھپو بن گئی ان کو نیگ میں ایک اچھا سا سوٹ تو دینا چاہیے ناں...... جب سیمی کا ہم عقیقہ کریں گے تو میں اپنی بالیاں آ دے دوں گی۔ ایک ہی تو آپ کی بہن ہیں' ان کا آپ پر بہت حق ہے۔"

"ٹھیک ہے" شجاع اس کی بات سن کر رضامندی سے سر ہلاتا ہوا بولا۔

☆☆☆

حسن دل آرا کی خاطر پائی رسوائی بہت
ہم نے اپنے عشق کی سچائی دکھلائی بہت
کیا ملے گا تجھ کو زنجیر رفاقت توڑ کر
میں بھی تنہا تو بھی تنہا اور تماشائی بہت

منور ایک دم چپ سا ہو گیا تھا۔ صبح سویرے آفس نکل جاتا...... اور رات گئے گھر آتا۔

صابرہ اسے جلدی آنے کا کہتی تو نئی نوکری کا بہانہ بنا لیتا۔ کھانے پینے کے معاملے میں شروع سے ہی کوئی مون نہیں تھا۔ اب اس نے بالکل ہی دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ صابرہ' جو اس کے آگے رکھ دیتیں' چپ چاپ ار نوالے کھا کر اٹھ جاتا۔

ایک دو مہینوں میں ہی اس کی شکل ذرا سی نکل آئی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا! ایسا کائے کو کرتے ہو تم...... نہ ٹھیک سے کھاتے بیٹھتے' نکو آرام کرتے...... اپنی شکلاں آئینے میں' کیسی اجاڑ صورت لے کے بیٹھے تم' ہاؤ!"

"جیسی شکل ہو گی...... ویسی ہی تو نظر آئے گی۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"تم خوش نہیں دکھتے میرے کو۔ کیا بات ہے' بیٹا! اپنی ماں کو بی بتانے کے خاطر نکو سمجھتے ناں......" صابرہ گی سے بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی!" وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے بالوں میں الجھاتا ہوا بولا۔

"تو پھر مجھ سے کیوں نئیں باتاں کرتے تم۔ پہلے تو ہر ایک اچ بات میرے کو بولتے تھے تم' اب کائے کو منہ لگا کو بیٹھے تم...... ماں کو یہ سوب کیا اچھے دکھے گا کیا......؟"

"امی! زندگی ویسے ہی بہت مشکل ہوتی ہے...... اور بعض دفعہ ہم اسے مزید مشکل بنا دیتے ہیں۔ اپنی باتوں ے عمل سے۔ ایسے میں پریشان ہو جانا فطری بات ہے۔ میری پریشانی سے تو آپ خود واقف ہیں۔"

"نئیں' میرے کو تو کچھ نہیں پتا۔"

"امی! آپ نے میری ذات کو تو تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ...... چند ماہ پہلے آپ نے مجھ ود کہا کہ رعنا کے بارے میں اب آپ سوچیں گی بھی نہیں...... مگر جب خالہ نے خوشامد درآمد کی تو پھر رعنا پ کی منظور نظر بن گئی۔"

"بیٹا منور! یہ بات تم یاد رکھو' ہر انسان کا دوسرے پر ایک حق ہوتا ہے اور پھر فاخرہ تو تم کی خالہ ہے ناں بول کتنا پیار کرتی ناں تم سے۔ تو پھر ہم کاہ کو انہوں دکھ دیں گے۔"

"سب کو سکھ دینے کا کام کیا ہمارا ہی رہ گیا ہے؟" منور جل کر بولا۔

"ایسا نکو بولو بیٹا...... رعنا تمہاری منگیتر ہے...... اور اپنی منگیتر کے واسطے ایسا نکو بولتے ناں۔"

"امی! سب کا خیال رکھنے کا کام آپ ہی کا ہے......"

"چلو یونہی سہی......" صابرہ نے مسکرا کر کہا۔

"مگر یہ بات میں آپ سے پہلے سے کہہ رہا ہوں کہ تین سال تک میں شادی نہیں کروں گا۔ نئی نئی جاب ہے ابھی میں ان دھندوں میں نہیں پڑنا چاہوں گا۔"

"شادی کے لیے تو جب کہے گا' اسی وخت ہوئیں گی...... مگر میری بہو رعنا ہی بنے گی' اپچ تو میری بھانجی وہ میرے گھر میں آئے تو میرے کو زیادہ اچ خوشی ہوئیں گی ناں......"

"اوکے......!" منور کمرے سے باہر جاتا ہوا بولا اور صابرہ پریشان سی ہو گئیں۔ یہ آج تیسری مرتبہ ایسا ہوا ب منور نے رعنا کے سلسلے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

واز نے بارہا انہیں یہ سمجھایا تھا کہ "جوان جہان بیٹے پر زبردستی کی پسند نہیں تھوپی جاتی ہے۔ اگر وہ رعنا کو اہتا ہے تو اس کی پسند کی لڑکی لے آؤ۔ ہمارا ایک ہی ایک لڑکا ہے۔ اگر اس کی شادی اس کی پسند سے

ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"میں نے اس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا تھا کہ اگر اس کی کوئی پسند ہے تو بتا دے...... مگر اس مع
میں اس نے برملا اقرار کر لیا تھا کہ ایسا کوئی معاملہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو اس کی رعنا کے ساتھ بھی اچھی گزر جائے گی" دلنواز نے ہنس کر کہا۔

"مگر کبھی کبھی میرے کو ڈر لگتا...... گر ان دونوں کی اچھی نہیں نبھی تو پھر کیا ہوئیں گا؟"

"کچھ نہیں ہوئیں گا......" دلنواز اس کی نقل اتارتے ہوئے بولے۔ "شادی وہ زنجیر ہے...... جس
وابستہ ہو کر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ابھی جو یہ دونوں چھیاسٹھ کے ہندسوں کی طرح ایک دوسرے سے
پھیرے کھڑے ہیں' شادی کے بعد ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں پائیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی اچ ہو" صابرہ دعا مانگتے ہوئے بولی۔

"ایسا ہی ہوا کرتا ہے اور ایسا ہی ہوگا" دلنواز بے فکری سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

تب صابرہ کے دل کو بھی طمانیت کا احساس ہوا۔ سرشار ہو کر اس نے آنکھیں موندیں تو اسے یوں لگا
منور ہنستا مسکراتا اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑے اندر آ رہا ہے اور کھلتے ہوئے رنگ کا غرارہ پہنے ہوئے دلہن اس کے
ہے۔ بڑا سا گھونگٹ اس نے نکال رکھا ہے۔

صابرہ خوش ہو کر دلہن کی جانب بڑھتی ہیں' اس کے گلے میں بڑا سا پھولوں کا ہار ڈال کر اس کا گھونگٹ ا
کر اسے دیکھتی ہیں تو یہ دیکھ کر یکدم پیچھے ہٹ جاتی ہیں کہ دلہن کے روپ میں رعنا کے بجائے کوئی اور لڑکی
ہے...... یہ رعنا...... کیوں نہیں ہے منور کے ساتھ؟ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ دلنواز کو بتاتی ہیں تو وہ ہنس کر
ہیں "صابرہ! جب جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھو گی تو ایسے ہی خواب نظر آئیں گے۔"

☆☆☆

کبھی کبھی تو وہ اتنا خیال رکھتا ہے
ذرا ذرا سی تمنا سنبھال رکھتا ہے
یہی تو بات ہے اس میں کہ رنجشوں میں بھی
سکھوں کا سکھ تو دکھوں کا ملال رکھتا ہے

شجاع جب تھکا ہارا گھر پہنچا تو دروازے پر بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ غصہ اسے اس بات پر آیا
رات ہی فرحت کے گھر فون پر اطلاع دے چکا تھا کہ وہ اور نگین کل دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ وہ تو چلتے ا
اس نے نگین کو از خود منع کر دیا کہ ابھی وہ کراچی میں اور رہ لے۔

اگر بچی اور نگین بھی اس کے ساتھ ہوتیں...... تو...... یہ سوچ کر ہی اس کا دماغ گھوم گیا۔ فرحت کے گھ
جانے کے بجائے' اس نے حکیم جی کے بیٹے کو چابی لینے کے لیے بھیجا...... اور گھر کھول کر بستر پر جا گرا۔

کراچی میں بچی اور نگین کی مستقل بیماریوں نے اسے بھی تھکا ڈالا تھا۔ شام کو جب عظمت بیگم گھر میں آ
تو اس کی تھکن نے بخار کا روپ دھار لیا تھا۔

"ہائے ہائے...... تجھے تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے" عظمت بیگم نے بے سدھ پڑے شجاع کی پیشانی
ہاتھ رکھا تو گھبرا سی گئیں۔

کہاں تو وہ یہ سوچ کر آئی تھیں کہ شجاع سے بات نہیں کریں گی...... اور کہاں اب وہ اس کے لیے پر

رہی تھیں۔

"بیٹا! آ کر کچھ کھایا بھی......؟" وہ اس سے بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

"دو تین گلاس پانی کے پیے ہیں' اس کے بعد بستر پر گرا تو ہوش ہی نہیں رہا۔"

عظمت بیگم نے لپک جھپک مولی کدوکش کر کے پراٹھے بنائے' چٹنی بنائی اور دہی کی لسی کا جگ لے کر منٹوں
ں آ گئیں۔ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد قہوہ بنا کر دیا تو وہ بھی فریش ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"اماں' آپ کی پوتی بہت خوبصورت ہے...... مگر بے حد کمزور ہے...... قبل از وقت پیدائش کے سبب اس کا
بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔" اپنے والٹ سے اس نے بچی کی تصویر نکال کر دکھائی۔

"تو اس کو ساتھ لے آتا...... میں روز مالش کر کے نہلاتی' بچی نے صحت مند ہو جانا تھا۔"

"نگین اور بچے میرے ساتھ ہی آ رہے تھے...... مگر کل چلتے ہوئے میں نے خود منع کر دیا کہ ابھی ایک آدھ
مہینا اور رہ لو۔"

تب عظمت بیگم چپ سی ہو گئیں۔ چند لمحے پہلے وہ جو بچی کی تصویر دیکھ کر محبت کا اظہار کر رہی تھیں' یکدم وہ
اداس سی بھی ہو گئیں اور پھر برتنوں کی ٹرے شجاع کے کمرے سے لے کر باہر آنگن میں آ کر بیٹھ گئیں۔

"ہم تو پہلے بھی تنہا تھے...... اور آج بھی تنہا ہیں۔" آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا "بیٹے کی
شادی کرتے وقت یہ ارمان تھا' اب اس بھائیں بھائیں کرتے آنگن میں بچوں کا شور ہوا کرے گا...... مگر میرا
آنگن آج بھی پہلے کی طرح بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ میری قسمت ہی ایسی خراب ہے کہ سگی بھتیجی بھی اپنی نہیں
ہوئی...... اور اپنا بیٹا' جو میرے سکھ دکھ کا ساتھی تھا' اب وہ بھی ایسا اجنبی بن گیا ہے کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ میں نے
اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہو۔

یہ سوچ کر ہی ان کی آنکھیں بھر آئیں اور تھوڑی دیر بعد وہ بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھیں...... اور اندر
کمرے میں شجاع' نگین کی کسی بات پر ایسا ہنسا تھا کہ اس کے قہقہے کی آواز صحن تک میں آ رہی تھی۔

☆☆☆

اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھوکر مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

گرمی کس بلا کی پڑ رہی تھی۔ لگتا تھا سورج سر پر چڑھ آیا ہو۔ گاؤں کے گھر سردیوں کے لحاظ سے خا آرام دہ ہوتے ہیں مگر گرمیوں میں خوب تپ جاتے ہیں۔ شجاع کو پہلے اتنی گرمی محسوس نہیں ہوتی تھی، جتنا گرمیوں میں اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتا تو عظمت بیگم بھی لسی کا گلاس دیتیں...... اور بھی گلاس مگر اس کو پھر بھی چین نہ پڑتا۔

فرحت جب ماں کے پاس رہنے کے لیے آتی تھی تو شجاع کا زیادہ وقت گھر میں گزرا کرتا تھا۔ بہن کو د وہ ہمیشہ ہی سرشار سا ہو جاتا تھا مگر اب تو وہ جیسے گھر آنا بھول رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتا تو چند منٹوں بعد ہی ا باہر جانا یاد آ جاتا۔ ماں اس کی یہ روش نوٹ کر رہی تھیں اور دل مسوس کر رہ جاتیں۔ آج اتوار کا دن تھا، اس د ہمیشہ دیر تک سوتا رہتا تھا مگر آج شجاع دوستوں کے ساتھ باہر تھا، فرحت ماں کے پاس رہنے کے لیے آئی ہو تھی۔ ان دنوں موسم گرما کی تعطیلات تھیں۔ بچوں کے اسکول بند تھے۔ اس کے ساتھ چاروں بچے بھی آ ہوئے تھے۔

عظمت بیگم جو ہمیشہ اپنے نواسی، نواسوں کو دیکھ کر کھل سی جایا کرتی تھیں، اس مرتبہ خاموش سی تھیں۔ دکھ صدمے کے اثرات ان کے چہرے پر مجسم ہو گئے تھے۔ فرحت ماں کا چہرہ دیکھ کر دھک سی رہ گئی اور بے ا پوچھ بیٹھی۔

"اماں! خیریت تو ہے ناں...... آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟"

"ہاں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی تھیں۔ (اب تو غموں نے دل میں ڈ ڈال لیے تھے)

"بات کیا ہے آخر؟" فرحت سے ماں کو یوں خاموش بیٹھا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"شجاع کراچی چلا جائے گا...... اب وہ فیروزہ کے پاس رہا کرے گا" یہ کہہ کر وہ پھکا پھک رونے لگیں

"کیا بھائی نے اپنے جانے کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا ہے؟"

"بتایا تو نہیں ہے، مگر جب سے کراچی سے آیا ہے، فیروزہ اور نگین کے گن گائے جا رہا ہے اور مجھ ہے کہ میں خواہ مخواہ فیروزہ کے پیچھے پڑی رہتی ہوں، وہ بہت اچھی ہیں۔"

"اماں...... ان باتوں کا یہ مطلب کہیں نہیں نکلتا کہ بھائی کراچی جا رہے ہیں۔"

"دیکھ لینا...... وہ ایک دن مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اب وہ میرے پاس نہیں رہ

"آپ کا دل غلط کہتا ہے اماں!" گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے شجاع نے ماں کی آخری بات سن کر

"اب ایسا ہی ہو رہا ہے، بیٹے ماؤں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"مگر میرا اشارہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو سسرال میں پڑے رہتے ہیں اور عزت و ذلت میں کوئی خاص فرق ال نہیں کرتے۔"

"پھر میرا دل یہ کیوں کہتا ہے کہ تو جانے والا ہے؟"

"آپ محلے میں جا کر جس قسم کی حکایتیں سنتی ہیں، آپ کے دل کو اس سے بھی زیادہ باتیں کرنی چاہئیں۔ یہ ی لی بیگم پتا نہیں کہاں کہاں کی بے تکی باتیں آپ کو سکھاتی ہیں کہ آپ کو اپنے بیٹے تک کا اعتبار نہیں رہا "

"تیرے اعتبار نے تو یہ دن دکھایا ہے کہ اب تیری باتیں سن کر ہونٹوں پر ہنسی کے پھول نہیں کھلتے بلکہ وں سے آنسوؤں کے پرنالے بہتے ہیں۔"

"اب آپ نے رو کر ڈرانے کا انداز سیکھ لیا ہے...... تو میں کیا کر سکتا ہوں" وہ شانے اچکاتا ہوا بولا۔

"میں کیوں تجھے ڈراؤں گی" عظمت بیگم کو غصہ ہی تو آ گیا۔

"میری شادی کے بعد یہ سبق آپ نے حکیم جی کی بیوی سے تو سیکھے ہیں، روزانہ گھر آ کر وہ آپ کو الٹی پٹیاں ھاتی ہیں......" شجاع ہنس کر تمسخر بھرے لہجے میں بولا۔

"تو جو دل چاہے کر، میری جوتی سے...... ناخلف بیٹے سے انسان بے اولاد بھلا" مارے غصے کے وہ کانپ ہیں اور جو منہ میں آ رہا تھا بول رہی تھیں۔ "تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے، تو چلا جائے گا تو کیا میں مر جاؤں ارے بڑی سخت جان ہوں میں، مجھے کچھ نہیں ہوگا...... ہاں، تیرے سامنے ضرور آئے گا...... دیکھ لینا، "

"مجھے بھی کچھ نہیں ہوگا کہ میں نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں ہے جو غلط ہو۔ میں ہمیشہ یہیں رہوں گا، نہ کہیں ا تھا اور نہ ہی کہیں جاؤں گا......" شجاع نے غصے میں کہا اور سامنے رکھی کرسی کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔

ت، جو ماں بیٹے کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی، ماں کو سمجھاتے ہوئے بولی "آپ اپنے آپ کو ے۔ شجاع بھائی پہلے ہی غصے کے تیز ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں...... پہلے چوں کو پیار کرتے تھے، ان کے ساتھ کھیلتے تھے، ان کو اپنے ساتھ باہر لے جاتے تھے۔ آج دو دن ہو گئے ے پاس آتے ہوئے، نہ انہوں نے مجھ سے ڈھنگ سے کوئی بات کی ہے اور نہ ہی میرے بچوں کے تی بدنصیب بہن ہوں میں کہ بھائی کے ہوتے ہوئے بھی بھائی کی محبت اور چاہت کو ترسی ہوئی ہوں۔"

"ب کچھ فیروزہ کی وجہ سے ہوا ہے، اسی نے یقیناً اسے ایسا کچھ گھول کر پلا دیا ہے، جو وہ ہم سے یوں متنفر " عظمت بیگم نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پ بھی گھول کر پلا دیں۔ آپ کو کسی نے منع کیا ہے، مگر بھائی سے اس طرح بات نہ کریں کہ وہ آپ کو ا کا دشمن سمجھنے لگیں۔"

"ں نے کس سے دشمنی کی ہے جو نگین سے کروں گی۔ آج کل تو سیدھی بات بھی سب کو کڑوی لگتی ہے، اس ا تصور ہے؟"

"اں...... ! آپ اس سے لڑ کر بھی دیکھ چکی ہو۔ اپنی ضد سے تو باز نہیں آتا، جو اسے کرنا ہوتا ہے، وہ کر کے یوں ناں اسے پیار سے قابو کرو تا کہ فیروزہ ممانی کے ہتھکنڈوں میں نہ آنے پائے۔"

''اب میں اس کی جی حضوری تو کرنے سے رہی...... ماں ہوں اس کی میں۔ اگر وہ میری بات ٹھکا نا خلف تو ہوا ناں۔''

''آپ بھائی کو جو دل چاہے کہہ دیں' اگر وہ آپ کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا تو سب سے زیادہ تکلیف آ ہو گی' اس لیے کوشش کریں کہ وہ وقت نہ آنے پائے۔''

''مجھے چھوڑ کر جائے گا تو برادری کے لوگ بھی اسے تھو تھو کریں گے' کوئی اسے اچھا نہیں سمجھے گا۔ نہیں' سراج خالو کا بیٹا انہیں چھوڑ کر ولایت چلا گیا تھا تو جب اس کا ذکر ہوتا تھا تو اس پر گالیاں پڑا کرتی تھ نے بھی اس کے اقدام کو سراہا نہیں تھا۔''

''اماں' اب وہ زمانہ گیا جب ہنستوں کے ساتھ سب ہنسا کرتے تھے اور روتوں کے ساتھ سب رو تھے۔ اب تو ہنستوں کو رلانے کی سعی کی جاتی ہے اور روتوں کو دیکھ کر خوش ہوا جاتا ہے۔ بالفرض شجاع بھا چھوڑ کر کراچی چلے گئے تو بہت سے عزیز و اقارب یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ آپ کو صدمے کا سامنا ہے۔''

''ہاں' بڑی ممانی تو بہت خوش ہوں گی' وہ تو شجاع سے ہمیشہ چڑا کرتی تھیں۔ ناصرہ چچی بھی خوب گی' صرف غم ہو گا تو حکیم جی کی بیوی کو...... کہ وہی میرے سکھ' دکھ کی ساتھی ہیں۔''

''اماں' میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے...... نگین اگر کراچی میں رہ رہی ہے تو آپ اسے رہنے شجاع بھائی سے یہی کہیں کہ نگین واقعی کمزور ہے' اسے اپنے میکے میں زیادہ رہنا چاہیے تاکہ کمزور بچی کا رکھا جا سکے۔''

''ہاں' اپنے گھر کو ویران کھنڈر بنا دوں' اپنے گھر کی رونق کو فیروزہ کے گھر میں رہنے دوں؟''

''ہاں' ایسا ہی کریں آپ۔'' فرحت نے انہیں سمجھایا۔

''مگر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟'' وہ روہانسی ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

''اپنا کان لائیں میرے پاس۔'' وہ ان کے قریب ہو کر مسکرا کر بولی...... اور پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑ

☆☆☆

مسافر تھے رستے بدلتے رہے
مقدر میں چلنا تھا چلتے رہے
میرے راستوں میں اجالا رہا
دیے اس کی آنکھوں میں جلتے رہے

شجاع یہ دیکھ کے حیران ہونے کے ساتھ خوش بھی تھا کہ ماں اور بہن دونوں نے ہی یک لخت اس دوستانہ رویہ رکھا ہوا تھا۔ وہ کتنی ہی اوکھی بات کہتا...... عظمت بیگم اس کی بات مان جایا کرتیں۔ اسے سر انہوں نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ فیروزہ کی تعریفیں کرتا' نگین کی چاہت کے قصے بیان کرتا اور فر محویت سے سنتی جیسے یہ سب سن کر اسے بہت لطف آ رہا ہو۔

''بھائی' اب جب تم کراچی جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے کر جانا' میں بھی تو دیکھوں کہ ماموں کا گھر کی ایک دن فرحت نے شجاع سے کہا۔

''لے جاؤں گا...... اماں کہیں گی تو ان کو بھی ساتھ لے لوں گا۔''

''ٹھیک ہے' اب کے سب تمہارے ساتھ ہی چلیں گے۔''

''مگر نگین تو کہہ رہی تھی کہ دس پندرہ دن میں وہ گاؤں آ رہی ہے؟'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اس سے کہنا تمہیں لینے ہم سب لوگ آئیں گے' ابھی کچھ دن اور رک جاؤ۔''

ب شجاع بھی بہن کی بات مان گیا تھا۔ ایک شام شجاع آنگن میں بیٹھا ماں اور بہن کے ساتھ دہی بھلے اور چاٹ کھا رہا تھا کہ فرح اپنی بہن کے ساتھ ان کے آنگن میں داخل ہوئی۔

شجاع اس کو دیکھ کر یک لخت کھڑا ہو گیا۔ وائٹ پلین سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج وہ اپنی بہن ساتھ فرحت کے پاس آئی تھی۔ شجاع نے ایک نظر فرح کو دیکھا اور اپنی پلیٹ میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔

حت نے ان دونوں کی خوب آؤ بھگت کی۔ کافی دیر تک دونوں بہنیں ان کے پاس رہیں۔ فرحت نے آنے کی تاکید کی تو مغرب کے بعد وہ دونوں چلی گئیں۔

''کیا فائدہ ہوا انہیں بلانے کا۔ وہ تو فرح کو دیکھ کر رکا تک نہیں اور فوراً چلا گیا۔'' عظمت بیگم نے ان کے کے بعد بیٹی سے کہا۔

''میں بھائی کی عادت کو جانتی ہوں' وہ آئندہ رکے گا بھی اور فرح سے باتیں بھی کرے گا' آپ دیکھ لیجیے ۔''

مگر جب رات گئے شجاع گھر آیا تو وہ اس بات پر سخت ناراض تھا کہ اس کے گھر فرح کیوں آئی تھی۔

''ہمارے محلے میں رہتی ہے' عدت ختم ہونے کے بعد سب کے گھر جا رہی ہے تو ہمارے گھر بھی آ گئی۔ ہم ے دعوت دینے تھوڑی گئے تھے۔'' فرحت نے بھائی کو رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ اسے سمجھا دینا کہ اب اس کے ساتھ ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے گھر نہ آئے تو ہے۔'' شجاع نے سخت سے لہجے میں کہا تو عظمت بیگم بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

زیست کرنے کے سب آداب اسے ازبر تھے
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید

ت اپنی ماں کے ساتھ طیفے کی بیوی کو دیکھنے گئی تھی۔ اس کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ سب ہی لوگ اسے دیکھنے جا رہے تھے۔ سنا تھا اس کے دو بیٹے ہوئے ہیں مگر اس کی ساس لوگوں کی نظر نے کے خوف سے بیٹیاں بتا رہی تھیں اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے دونوں ان لڑکو [illegible] کی فراکیں بھی پہنا دی تھیں۔

''اللہ نے ایک ساتھ دو بیٹیاں دی ہیں' اللہ ان کی قسمت اچھی کرے۔'' ایک مہمان خاتون نے ایک ٹھنڈی س بھر طیفے کی بیوی سے کہا۔

''میری یہ بیٹیاں میرے لیے بیٹوں جیسی ہیں۔'' طیفے کی بیوی نے مسکرا کر کہا۔

''ہم اپنی بیٹیوں کو بھی بیٹا سمجھتے ہیں۔'' طیفے کی ماں بھی مہمانوں کے آزردہ جملے سن کر کہہ رہی تھیں۔

فرحت چونکہ حقیقت حال سے واقف تھی' اس نے طیفے کی بیوی سے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی نعمتوں ہے تو تم کیوں لوگوں سے جھوٹ بول رہی ہو۔ آنے والا تو مبارک باد دینے آ رہا ہے۔ اسے تمہارے ے یا بیٹی ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟''

‘‘فرحت آپا! نظر تو پتھر کو توڑ سکتی ہے۔ اس سے قبل میرے بچے اسی وجہ سے تو ضائع ہوتے رہے کہ ذ بھی چڑھ جاتے تھے تو میں لوگوں کو بتا دیا کرتی تھی۔ اپنے تین بچے کھو کر مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایسی باتیں بتانی نہیں چاہئیں۔ اپنی ذاتی باتوں کو اپنی حد تک رکھنا چاہیے۔’’

‘‘تمہاری بات کسی حد تک ٹھیک ہے مگر یہ بچے جب بڑے ہوں گے تو کب تک تم انہیں لڑکیاں بتاتی اس سے ان کی شخصیت پر غلط اثرات مرتب نہیں ہوں گے؟’’

‘‘ارے آپا! جب تک یہ بڑے ہوں گے، اس وقت تک میری ایک دو بیٹیاں بھی ہو چکی ہوں گی، تم خود ہی بھول جائیں گے۔ کسی کے چھ، سات بچے ہوں تو کس کو یاد رہتا ہے کہ کتنے لڑکے ہیں اور کتنی ہیں؟’’

‘‘مجھے واقعی تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں’’ فرحت نے ہنس کر کہا۔

‘‘وہیے، تو نے ہمیں کیوں بتا دیا کہ تیرے لڑکے ہوئے ہیں، ہمیں بھی لڑکیاں ہی بتانی تھیں۔’’ عظم نے بچوں کو پیار کر کے انہیں پیسے دیتے ہوئے کہا۔

‘‘خالہ جی! ڈاکٹر بینش تو فرحت آپا کی دوست بھی ہیں اور ان کی ہمسائی بھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائیں مگر فرحت آپا کو ضرور بتائیں گی’’ لطیفے کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

‘‘میری ڈاکٹر بینش سے بات نہیں ہوئی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے کوئی تذکرہ کیا ہے۔ میں نے میں کسی سے سنا تھا کہ تمہارے دو جڑواں لڑکے ہوئے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں، پتا نہیں لگ کس بچے کو پیار کیا ہے، بس اسی شوق میں انہیں دیکھنے آ گئی تھی۔’’

‘‘اللہ ان دونوں کو سلامت رکھے...... اور تم اپنے دونوں بیٹوں کی خوشیاں دیکھو۔’’

‘‘آپا، اب سب لوگ اس طرح دعائیں دینے والے بھی تو نہیں رہے ہیں۔ اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کی نظر نہ لگ جائے۔’’ لطیفے کی بیوی نے متفکر سے لہجے میں کہا۔

‘‘ٹھیک ہے، اب ہم چلتے ہیں مگر اپنی ان بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح پالنا ورنہ ان کی شخصیت میں کجی رہ جو نظر لگ جانے سے زیادہ تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔’’

‘‘ٹھیک ہے آپا!’’ لطیفے کی بیوی نے مسکرا کر کہا۔

ابھی یہ لوگ اپنے گھر بھی نہیں پہنچی تھیں کہ فرح ان کے گھر میں داخل ہوئی۔ آج اسے فرحت نے بلایا تھا۔ شجاع آنگن میں بیٹھا ٹیپ پر پرانی فلموں کے گیت سن رہا تھا۔

‘‘السلام علیکم جی! فرحت آپا ہیں......؟’’ فرح اس کے سامنے متوحش سی کھڑی تھی۔

شجاع اسے دیکھ کر اچھل ہی تو گیا۔ ‘‘فرحت اور اماں کہیں گئی ہوئی ہیں۔’’ شجاع نے اس سے کہا۔

‘‘اچھا، پھر میں چلتی ہوں’’ وہ یکبارگی مڑی۔

‘‘سنو فرح......! رکو......’’ شجاع کچھ سوچ کر بولا۔

‘‘جی......’’ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی تباہ حال سی جس نے زندگی میں سوائے شکست کے کچھ ہو۔

‘‘کیسی ہو تم؟’’ وہ اس کو یوں اجڑا اجڑا سا دیکھ کر بولا۔

‘‘زندہ ہوں’’ وہ پھیکے سے لہجے میں بولی۔

‘‘مجھے بہت افسوس ہوا کہ اشرف نے تمہیں طلاق دے دی۔’’ اس نے بات کرنے کی خاطر یونہی بول دیا۔

‘‘اچھا، آپ کو اس بات پر افسوس ہوا کہ میری قید با مشقت ختم کیوں ہو گئی؟’’

‘‘نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے......’’

‘‘آپ کا مطلب کچھ بھی ہو، مگر میری زندگی کو عذاب بنانے میں تمہارا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے......’’ آپ سے تم صلہ طے کرنے میں اس نے ذرا دیر نہ لگائی۔

‘‘میرا ہاتھ......؟’’ بھونچکا ہو کر اس نے پوچھا۔

‘‘ہاں، تمہارا ہاتھ...... کہ مجھے محبت کے خواب دکھائے اور جب میری اور تمہاری محبت کا شہرہ پورے گاؤں گیا تو تم فرار ہو گئے...... اور اشرف نے تم سے نفرت کرنے کا حساب مجھ سے لے ڈالا اور میری زندگی خوار’’

‘‘یہ ہماری قسمت تھی، تمہارا ساتھ میرے لیے تھا ہی نہیں تو اس میں میرا کیا دوش؟’’

‘‘تم کچھ بھی کہو مگر میری زندگی کے دکھ تمہاری ذات کی وجہ سے مجھے زیادہ ملے ہیں۔ ’’تم سے الگ ہو کر بھی تمہاری ذات نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ شاید تم وہ منحوس شخصیت ہو جس سے مل کر میں ہمیشہ ہی پریشان رہی اور تمہاری ذات میرے لیے ہمیشہ ہی پریشان کن رہی۔’’

‘‘تو پھر اب کیوں آئی ہو میرے گھر میں؟’’

‘‘فرحت آپا نے بلایا تھا کہ آج ان کے بچے کی سالگرہ ہے۔ اس میں ضرور آنا ہے، ورنہ میں تو کہیں نہیں پہلے بھی میری باجی زبردستی لے آئی تھیں۔’’

‘‘آپا کے بچے کی سالگرہ تو نہیں ہے آج؟’’ شجاع نے حیرت سے کہا۔

‘‘مگر فرحت آپا نے تو مجھ سے یہی کہا تھا؟’’

‘‘لگتا ہے تم نے شاید غلط سنا ہوگا’’ آج تو میری سالگرہ ہے۔’’

‘‘پھر تو مجھے بالکل بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہاری خوشیوں سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔’’

‘‘میری بات سنو فرح! تمہارے ساتھ جو ہوا برا ہوا...... مگر اب مزید برا نہیں ہونا چاہیے۔ اس دنیا میں ہر مرد ایسا نہیں ہوتا، تم کہیں شادی کر لو اور چین کی زندگی بسر کرو۔ تمہیں یوں پریشان اور دکھی دیکھ کر مجھے بھی ہو رہی ہے۔’’

‘‘شادی کے نام سے ہی مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ میں اب زندگی بھر شادی نہیں کروں گی۔ زندگی گزارنے کے لیے بہت سی یادیں ہیں میرے پاس، ان کے طفیل میری زندگی گزر جائے گی، تم بے فکر رہو، کبھی پاس نہیں آؤں گی۔’’

‘‘ایسا مت سوچو! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟’’ شجاع نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

‘‘نہیں شجاع! جیسی زندگی میں نے گزاری ہے وہ مجھے بہت طویل لگتی ہے۔ میری شاید اتنی عمر نہیں جتنی بڑی زندگی میں گزار چکی ہوں۔’’

‘‘میں تمہارے لیے کیا کروں؟ میری واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......’’ پریشان ہو کر شجاع نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

‘‘تم بس خوش رہو اور خوشی خوشی اپنی زندگی بسر کرو، میرے لیے یہ بھی ایک خوشی ہے۔’’

"چائے پیو گی……؟" اچانک ہی شجاع کو خیال آیا کہ وہ کب سے اس کے سامنے بیٹھی ہے اور اس نے اس کو پانی تک کو نہیں پوچھا۔

"نہیں، میں من کو مزید آگ لگانے والی چیزیں نہیں پیتی" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ گئی۔ "فرحت آپا آ ان کے بچے کو یہ پیکٹ دے دینا۔" کوئی کھلونا اس نے شاپر میں ڈالا ہوا تھا، وہ اس نے شجاع کو پکڑاتے ہ کہا۔

تب اچانک ہی شجاع نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑتے ہوئے کہا "فرح! تم مجھے معاف کر د میں نے واقعی تمہیں بے حد دکھ دیے ہیں مگر ان کا ازالہ اب میں نہیں کر سکتا۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم بیوی بچوں والے ہو اور تم پر میرا کوئی حق بھی نہیں ہے۔"

"حق تو ہے……" بے اختیار شجاع کے لبوں سے نکلا۔

"میں نے تمہیں معاف کیا شجاع……اور اب تم بھی اپنی یادوں کے کٹہرے سے مجھے آزاد کر دینا۔" فر نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے آنکھوں میں بھر رہی ہو۔

"اللہ تمہاری زندگی کے سارے غم اب مجھے دے دے۔ تمہاری آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آئے۔ تمہار سارے دکھ میرے حصے میں آ جائیں اور……"

"اللہ نہ کرے……" اس کا ہاتھ برق سرعت سے اس کے لبوں تک پہنچ گیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو احساس بھی ہے کہ مجھے کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے؟" تب دو آنسو اس کے ہاتھ پر گر پڑے۔

فرح نے دیکھا، شجاع بے آواز آنسوؤں کے ساتھ رو رہا تھا۔ "میں بہت برا ہوں، بہت برا……پلیز فر مجھے معاف کر دینا ورنہ مجھے زندگی میں ایک پل بھی سکون نہیں ملے گا۔" شجاع کی حالت دگرگوں سی ہو گئی تھی۔

"اللہ نہ کرے کہ تمہاری زندگی میری جیسی گزرے۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے، میرے لیے یہی بہت ہے۔"

"فرح، پلیز……! میری بات مانو، اپنے آپ کو سمجھاؤ اور اپنا گھر بسا لو۔" وہ اس سے خوشامدی لہجے میں ک رہا تھا۔ "تمہیں ہنستا بستا دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گی، اب تو خوش ہو ناں" وہ بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں، تمہارے اس اقدام سے میں بہت خوش ہوں گا۔"

"اب میں چلتی ہوں، شاید کبھی تم سے اب ملاقات نہ ہو……اور شاید ہو بھی جائے۔ میری شادی ہو یا نہ ہو سکے تو شرکت کر لینا……کہ انتظار کرنا میری عادت ہے۔"

"میں ضرور آؤں گا……کہ اب تم کو مثبت بھری سوچ کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے……" پھر کچھ سوچ کر اس نے کھلونے کا شاپر اٹھایا اور شجاع سے کہا "اگر فرحت آپا میر بارے میں پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں نہیں آئی تھی۔ ان کی بات میں سمجھ گئی ہوں، اچھا ہے کہ میری بات وہ بھی جا جائیں۔"

شجاع نے رضامندی میں سر ہلایا اور وہ ہوا کے جھونکے کی طرح چلی بھی گئی کہ اسے یہ پتا بھی نہیں چلا کہ ف ابھی آئی بھی تھی۔

فرحت اور عظمت بیگم جب تین چار گھنٹے باہر گھوم پھر کر آئیں تو شجاع اسی طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ چھوڑ کر

ہمارے پیچھے تو نہیں آیا گھر میں؟" فرحت نے ادھر ادھر کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے

کیا کسی نے آنا تھا؟" شجاع نے پوچھا۔

آنا تو کسی نے نہیں تھا، ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔" فرحت نے اپنے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ

کے کس بچے کی سالگرہ ہے آج؟" شجاع نے پوچھا۔

میں تو کسی کی بھی نہیں ہوتی۔" اماں بیچ میں بول اٹھیں۔

مہمان کیوں بلائے تھے سالگرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے؟"

فرح آئی تھی ہمارے ہاں؟" فرحت نے بے تابی سے پوچھا۔

آئی تھی۔"

دراصل اپنے گھر سے کہیں نکلتی نہیں ہے ناں، اس لیے بہانے سے بلایا تھا۔"

سے بلا کر آپ باہر نکل گئیں؟" شجاع کا لہجہ ذومعنی سا ہو گیا۔

نے جلد گھر آ جانا تھا مگر طیبے کے ہاں سے واپسی پر حکیم جی کے ہاں دیر ہو گئی اور مجھے یہ پتا ہی نہیں چلا ہاں آئی ہوئی ہے۔"

آئی ضرور تھی وہ مگر فوراً ہی چلی گئی۔ تم جو نہیں تھیں" شجاع نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔

نے اسے روکا بھی نہیں؟" فرحت نے پوچھا۔

……"

کیوں؟"

بہت دیر ہو چکی ہے۔ اسے روکنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا، اور میں اپنی موجودہ زندگی میں آگ لگانا تا۔"

کے مرد دو دو بیویاں رکھتے ہیں، ایک تم بھی رکھ لو گے تو کیا ہو جائے گا" عظمت بیگم نے کہا۔

……! آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟" شجاع نے حیرت سے کہا۔

کی زندگی صرف تمہاری وجہ سے برباد ہوئی ہے۔ اگر تم اس سے شادی کر لو گے تو اس کی زندگی سنور

میں اب نگین کے ساتھ ایسی بے ایمانی نہیں کر سکتا۔"

کا بھلا فرح سے کون سا تعلق ہو گا، وہ کراچی میں رہے گی اور فرح یہاں ہو گی۔"

میں تو کراچی مستقل نہیں رہنا چاہتا تو نگین وہاں کیسے رہ سکتی ہے اور دو بیویوں کا مطلب ایک میان رکھنے کے مساوی ہے اور میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔"

مطلب تو یہ ہوا کہ تم فرح کے اچھے وقت کے ساتھی تھے، برے وقت کے نہیں ہو، آج وہ اجڑ کر اپنی بیٹھی ہے تو تم اس کے لیے کچھ اچھا نہیں سوچنا چاہتے۔"

صرف سوچنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

”تو عمل کرلو۔ پہلے بھی تو تم فرح سے شادی کرنا چاہتے تھے‘ اب ہم کہہ رہے ہیں تو تم کیوں انکار کر رہے ہو؟“

”اماں! زندگی کسی مذاق کا نام نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی وقت مجھے فرح اچھی لگتی تھی اور میں اس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا مگر اب نگین سے شادی کے بعد میں اس نہج پر سوچنا بھی نہیں چاہتا۔“

”یہی تو تجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ ایسا کیا نگین نے تجھ پر پڑھ کر پھونک دیا ہے کہ اس کے کلمے کے سوا کچھ اور نہیں پڑھنا چاہتا۔“

”اماں‘ آپ جانتی ہیں کہ میں زندگی میں ترتیب اور سلیقے کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں اور نگین کی شخصیت میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ وہ مجھ سے بےلوث محبت کرتی ہے۔ میں اس کو کسی قسم کا دکھ دینے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا! اور یہ اچھی بات ہوگی کہ مجھ سے آئندہ اس موضوع پر بات نہ کی جائے“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ عظمت بیگم ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بیٹی کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

ثریا کراچی آ کر بہت خوش تھیں۔ روزانہ ہی طاہر کی شادی کا ذکر کیا کرتیں۔ ”ایسی شاندار شادی میں نے آج تک نہیں دیکھی‘ مسز رحمٰن نے بہت ہی ارمانوں کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کی اور میرا تو اتنا خیال رکھا جیسے میں مہمان خصوصی ہوں۔“

نادر انہیں بہت پسند آیا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی آپا سے بھی کر دیا تھا۔ لمبا تڑنگا‘ بانکا سجیلا سا نادر خوش اخلاق ہے‘ کینیڈا میں اس کا بہت بڑا بزنس ہے۔ پیسے والوں کا تو ایک پیر اپنے ملک میں تو دوسرا دوسرے ملک میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے تو بار بار پاکستان آنا کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے۔ دولت ان کی لونڈی ہے۔ مسز رحمٰن اس کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں ہوں گی اور ثنا سے اچھی لڑکی بھلا اور کون ہے۔ نادر کی آنکھوں میں ثنا کے لیے پسندیدگی کے رنگ وہ دیکھ ہی چکی تھیں۔ انہیں یہ پورا یقین تھا کہ نادر ثنا کے لیے ضرور آئے گا۔ اسی لیے وہ چلتے وقت مسز رحمٰن سے بطور خاص یہ کہہ آئی تھیں کہ اب آپ ثنا کے لیے کوئی اچھا لڑکا دیکھیے کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کی ایجوکیشن کے بعد اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

”ثنا جیسی لڑکی کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے بھلا۔ میرے کتنے سارے مہمان ثنا کے لیے آپ سے پوچھ رہے آئے تھے۔

مگر مجھے تو آپ پسند ہیں اور آپ کی فیملی بھی۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ اس کی شادی آپ کی طرح کہیں ہو۔“ اس سے زیادہ صاف وہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آپ اپنے بھائی نادر سے ثنا کی شادی کروا دیں۔ مسز رحمٰن ان کا مطلب سمجھ کر خود ہی خفت سی محسوس کر رہی تھیں اور دل میں سوچ رہی تھیں‘ کاش نادر اس قابل ہوتا تو وہ ہیرا جیسی لڑکی کو کہیں نہ جانے دیتیں۔

ثریا بےصبری کے مظاہرے کر رہی تھیں کہ ان کی موجودگی میں ہی مسز رحمٰن ثنا کے لیے کوئی حوصلہ افزا بات کہہ دیں مگر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔

ثریا نے اس بات سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید وہ کراچی آ کر اس مسئلے پر بات کریں گی۔ اب وہ اپنی آپا سے اس بارے میں باتیں کرتے ہوئے یہ پروگرام بنا رہی تھیں کہ کراچی آنے پر

ے ساتھ چھوٹے سے سونے کے ٹاپس بھی دیں گی‘ نادر کو رشتہ پکا ہونے پر ایک جوڑا اور پرفیوم کا سیٹ باقی لینا دینا منگنی کے موقع پر ہوگا۔

”ریا! تمہاری اکلوتی بیٹی ہے‘ شادی کے بعد کینیڈا چلی جائے گی تو تمہیں دکھ نہیں ہوگا؟ اپنی بچی کی شکل کو بھی ترس جاؤ گی۔“ ان کی آپا کو بھی باہر کی ہولناک کہانیاں خاصی یاد تھیں۔ (حوالے کے لیے)

”وہ تو سال میں چار چار چکر لگایا کرے گی اور کبھی کبھی مجھے بھی بلا لیا کرے گی۔ اس کے لیے آنا جانا کوئی تھوڑی ہے‘ نادر مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا بزنس ٹورنٹو کے علاوہ مانٹریال تک میں پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں ا بہت ہے۔“

”پھر تو تم نے بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ثنا کے لیے“ آپا نے خوشی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے طفیل امیر کہلائیں گے۔“

”آخر سائرہ کو بھی تو نیچا دکھانا تھا‘ جو ہر ہفتے اپنی نئی نکور سی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر مجھے جلانے آ جاتی ہے۔ انی ہے کہ جب بھی آتی ہے‘ نیا جوڑا امتک کر آتی ہے۔ مجال ہے کہ کبھی پہنا ہوا سوٹ اس نے دوبارہ پہنا ہو۔

”ہاری ساس تو یہ دیکھ کر جل جائے گی کہ ثنا کا رشتہ اتنے پیسے والے گھرانے میں ہو رہا ہے؟“

”اس ہی کیا‘ آگ تو ہماری دیورانی کے بھی لگے گی کہ میری بیٹی کیسے اچھے گھرانے میں بیاہی جا رہی ہے والی فقیر رہیں۔ اپنی موٹی ڈھم ڈھم سی بھانجی کو لانے کے ایسے پروگرام بنا رہی ہیں جیسے کوہ قاف سے کوئی آ رہی ہو۔ مجال ہے کہ گھر میں کوئی رعنا کا مذاق تو اڑائے‘ صابرہ بیگم ایسی تن فن کرتی ہوئی لڑنے کے لیے ہیں کہ الٰہی توبہ! اتنی خوبصورت بھی نہیں ہے جتنی انہیں نظر آتی ہے۔“

☆☆☆

نتظار ہی کرتی رہی اور مسز رحمٰن کے ہاں سے نہ کوئی فون نہ کوئی خط آیا تو اپنی بہنوں سے مشورہ کر کے سز رحمٰن کو خود ہی خط لکھ ڈالا۔

”مہ بھابی صاحبہ السلام علیکم!

ب سے طاہر کی شادی سے کراچی آئی ہوں میرا دل وہیں اٹکا ہوا ہے۔ ماشاءاللہ آپ کے بیٹے کی شرکت کر کے دلی طمانیت اور جو خوشی حاصل ہوئی ہے‘ وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ کے پ کی وضع داری کی تو میں پہلے ہی سے قائل تھی‘ اب تو دل سے قدردان بھی ہو گئی ہوں۔ کاش آپ کا بھی کوئی دوسرا لڑکا ہوتا جو ثنا سے بڑا ہوتا تو میں آپ سے ازخود کہہ دیتی کہ بھابی صاحبہ‘ آپ ثنا کو اپنی بھائی بھی اولاد کی طرح ہوتا ہے اور چھوٹا بھائی تو واقعی اولاد جیسا ہوتا ہے۔ نادر مجھے بتا رہا تھا کہ طاہر کی طرح چاہتی ہیں اور آپ ہی اس کے لیے لڑکی کا انتخاب کریں گی۔ بھابی صاحبہ‘ یہ میری دلی آپ ثنا کو اپنی بھاوج بنا لیں۔ نادر کے پاس ویزا بھی ایسا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے میری خوشی ہوگی کہ ہم لوگ اچھے دوستوں کے ساتھ ساتھ رشتے دار بھی بن جائیں۔ نادر کی عادتیں ند آئی ہیں۔ آپ کا یہ بھائی واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔ اب آپ مجھے یہ جلدی سے بتائیے کہ ں کی رسم کرنے کراچی آ رہی ہیں؟ اگر آپ آ رہی ہیں تو کیا نادر بھی آپ کے ساتھ ہی آئے گا؟ ب کی شدت سے منتظر ہوں۔ ہاں‘ میرے اس خط کی بابت ثنا کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ شرمیلی سی لڑکی

ہے اور اسے سوائے پڑھنے کے کوئی شوق بھی نہیں ہے۔ نادر جب میری تصویریں بنا رہا تھا تو اس کتنا کہا کہ آنٹی کے ساتھ تم بھی کھڑی ہو جاؤ مگر وہ منہ بنا کر اندر چلی گئی۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ شادی ایک آدھ الگ سے ہی تصویر بنوا لیتی۔ ہاں تو پھر آپ لوگ کب کراچی آ رہے ہیں۔ مجھے جلدی سے میں آپ لوگوں کے شایان شان استقبال کر سکوں۔

مسز رحمٰن نے ثریا کا یہ خط پڑھ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ نادر کے حوالے سے اتنی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

رحمٰن صاحب کو جب انہوں نے ثریا کا خط دکھایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور لگے اپنی بیوی کو

”آپ کو جب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ثریا بھابی نادر کو پسند کر رہی ہیں تو اسی وقت اس کی اوقات تھی۔ آپ کے لچے لفنگے بھائی کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ہماری مہمان کے ساتھ غلط بیانی کرے۔ ڈاکٹر بن جائے گی۔ کیا اس کی شادی انڈر میٹرک سے ہونی چاہیے۔“

طاہر کو جب معلوم ہوا تو اسے بھی اپنے ماموں پر بہت غصہ آیا اور وہ بھی اپنی ماں پر ناراض ہوا ماموں کو حد سے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ کینیڈا میں نہ جانے کتنی شادیاں کرنے کے بعد بھی ان کا سے نہیں بھرا ہے۔

☆☆☆

دروازے پر جا کر کتنی بار تو انہوں نے ڈاکیے کو دیکھا تھا۔ ہر فون کی بیل پر وہ یوں اچھلتی تھیں فون آیا ہو۔ گھر سے باہر تھوڑی دیر کے لیے بھی جاتیں تو ان کا دل اپنے گھر میں ہی اٹکا رہتا کہ سے مسز رحمٰن نے انہیں یاد کیا ہو۔ ان کا خط گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے مگر مسز رحمٰن نے نہیں دیا تھا۔

ثنا کے سیل پر فون کر کے انہوں نے مسز رحمٰن کے گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت پوچھی تو اس سے کہہ دیا کہ وہ صبح سویرے کالج آ جاتی ہے اور کالج سے اپنی دوست کے گھر جا کر اسٹڈی کرتی گھر آتی ہے۔ اسے گھر اور گھر والوں سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اس کی ہر بات کا جواب اپنی سے وابستہ تھا۔

ثریا اس سے بات کر کے خاصی بددل سی ہو گئیں۔ مسز رحمٰن کے مزاج سے وہ اچھی طرح وا بے حد اچھی عادت کی تھیں۔ چلتے وقت انہیں بہن بنا کر خوبصورت سوٹ کے ساتھ سونے کے بھی دیا۔

”میری ثنا کے وہ لوگ اتنے گن گاتے ہیں تو پھر جواب دینے میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟“

اپنی آپا سے مشورہ کیا تو انہوں نے یہ رائے دی کہ تم فون کر کے خود پوچھ لو کہ تمہارا خط انہیں ملا اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس میں تمہیں کوئی جھجک محسوس ہو۔ جہاں دوستی زیادہ ہوتی ہے اسی طرح صاف صاف کر لی جاتی ہے۔ اگر ان کا بھائی اچھا ہے تو تمہاری بیٹی کون سی کم ہے؟ تم

ایسے اچھے لوگوں سے دوستی کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ملنا جلنا تک تم نے زیادہ نہیں رکھا۔ ان کے گھر میں تمہاری بیٹی رہ رہی ہے اور تم نے ان کے گھر چکر بھی نہیں لگایا۔ ایسے قابل لڑکوں کو تو خاندان کے لوگ ہی گھیر لیتے ہیں۔ یقیناً یہی بات ہو گی، جبھی انہوں نے تمہارے خط کا کوئی جواب نہیں دیا ورنہ تم نے اپنے خط میں کوئی بھالا تو نہیں مارا تھا جس کا جواب ہی انہوں نے نہیں دیا۔

اپنی بہن کی شہ پر ثریا نے مسز رحمٰن کو فون کیا تو انہوں نے بڑی محبت سے بات کی۔ وہ اپنی چاہت اور محبت کے موتی لٹا رہی تھیں۔ ہر موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ مہنگائی سے لے کر گرمی کی شدت تک موضوع بحث تھی مگر وہ ان کے خط کا ذکر کسی صورت میں نہیں کر رہی تھیں۔ تنگ آ کر ثریا نے کہا ”بھابی، میں نے آپ کو خط لکھا تھا، کیا آپ کو ملا نہیں......؟“ تو وہ بڑے شرمندہ سے لہجے میں بولیں۔

”آپ کا خط مجھے مل گیا ہے اور میں بہت جلد آپ کے خط کا جواب دوں گی۔“ مسز رحمٰن میں اس وقت اتنی ہمت نہیں تھی کہ ثریا کو یوں واضح انکار کر دیں۔ ثریا ان کے بھائی کو نہ جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھی تھیں اور ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا انہیں دوبھر لگ رہا تھا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ آپ کو میرا خط مل گیا۔ آپ کا جواب نہیں آیا تو میں سمجھی، پتا نہیں آپ کو ملا یا نہیں۔ ڈاک کا نظام ہمارے ہاں کون سا اچھا ہے، حالانکہ میں نے تو ارجنٹ میل سروس سے آپ کو خط پوسٹ کیا تھا۔“

”بھابی، آپ کا خط مجھے فوراً ہی مل گیا تھا...... مگر اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث جلد جواب نہیں دے سکی جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

”اے لو، اس میں معذرت کرنے کی کون سی بات آ گئی۔ آرام سے جواب دے دینا، بس مجھے تسلی ہو گئی کہ اتنا اہم خط کسی اونگی بونگی جگہ نہیں پڑا، ورنہ ہماری بھاوج کا تو نکاح نامہ کھو گیا تھا جب اس کی ایک کاپی ان کی اماں کو ساہیوال بھیجی تھی۔ بعد میں ہمارے بھیا نے جا کر اپنی ساس کو دیا کہ اتنی اہم دستاویز خود جا کر دوں گا۔ طاہر کیسا ہے؟ دلہن کیسی ہے اور نادر بیٹا کیسا ہے؟ سب کو میری طرف سے دعا دینا اور ہاں، آپ کراچی کب آ رہی ہیں؟“

”میں انشاءاللہ کراچی جلد آؤں گی، اللہ حافظ!“ مسز رحمٰن نے ان سے جان چھڑانے کے لیے کہا اور ریسیور ریڈل پر رکھ دیا مگر ثریا پھر غلط فہمی کے سمندر میں ڈبکیاں لینے لگیں۔

☆☆☆

بیلا جب اپنے میکے سے آئی تو طاہر کا موڈ آف پایا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو...... کوئی بات ہی نہیں کر رہے ہیں؟“ تب طاہر نے ثریا کے خط اور نادر کے احوال کی تفصیل بیلا کو بتا ڈالی۔

”یہ تو اچھی بات ہے، آپ کے ماموں کے لیے ایک اچھی لڑکی مل رہی ہے۔ آپ لوگوں کو تو خوش ہونا ہاہیے۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی جاہل انسان کو ملے گی تو اس کی جہالت میں بھی کمی واقع ہو گی۔“

”ثنا میری چھوٹی بہن جیسی ہے، میں اس کا برا کیوں سوچوں گا؟“ تب بیلا کا دل چاہا کہ کہہ دے، ہاں آپ الکل صحیح کہہ رہے ہیں مگر وہ جس ماحول سے آئی تھی، وہاں منفی باتوں کی پرورش کی جاتی تھی اس لیے ایک تہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئی۔

اگلے دن جب طاہر آفس اور مسز رحمٰن کسی کام سے باہر گئیں تو اس نے فون کر کے نادر کو بلایا اور ثریا کا خط ے دکھایا۔ نادر تو یہ خط پڑھ کر ہی نہال ہو گیا۔

''میں تمہارا ساتھ دوں گی تو ثنا کو تم پا سکتے ہو ورنہ تمہاری بہن تو تمہاری دشمن ہیں' وہ یہ بالکل نہیں چاہتیں کہ خوشیوں کے در تمہارے لیے بھی کھلیں۔''

''پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''جو میں کہوں' وہ کرتے جاؤ...... ثنا تمہاری ہوگی۔''

''بیلا' آپ تو بہت اچھی ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی میرا اتنا خیال بھی کرنے والا ہوگا۔''

''تم روزانہ پھول لے کر ثنا کے کالج کے گیٹ پر کھڑے ہو جایا کرو' مگر اس سے ایک لفظ نہیں بولو گے۔ وہ جب تمہارے پاس سے نفرت سے گزر جائے تو وہ پھول وہیں پھینک کر تم اپنی بائیک پر گھر آ جایا کرنا۔ بعد کا سبق بعد میں بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے' یہ سب میں کرلوں گا اور اپنی بہن سے بڑھ کر آپ کی چاہت کو سلام کرتا ہوں' جس کو میرا اتنا خیال ہے'' نادر نے کہا۔ تب بیلا مسکرا کر رہ گئی۔ ادھر مسز رحمٰن نے اپنے شوہر اور بیٹے طاہر سے مشورہ کر کے ثریا کے خط کا جواب کچھ اس طرح دیا۔

''پیاری ثریا بھابی!

آداب عرض!

آپ کا خط ملا۔ ثنا آپ کی ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے اور اس کی شادی یقیناً ایسے لڑکے سے ہونی چاہیے جو اس کے لحاظ سے بہت قابل ہو۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خاصی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میرے بھائی کی تعلیمی قابلیت انتہائی کم ہے اور ٹورنٹو میں اس کی جاب بھی وائٹ کالر نہیں ہے۔ کاش وہ اس قابل ہوتا تو یہ میری خوش قسمتی ہوتی کہ ایسی ہیرا جیسی لڑکی میری بھاوج بنتی کیونکہ میں ثنا کو اپنی بیٹی جیسی ہی سمجھتی ہوں اس لیے دروغ بیانی سے کام نہیں لوں گی۔ آپ ثنا کے لیے بالکل پریشان نہ ہوں' اس کے لیے اچھا سا لڑکا میں خود دیکھوں گی۔ ہم انشاء اللہ کراچی بھی آئیں گے اور جب آئیں گے اس بابت آپ کو ضرور بتائیں گے۔ امید ہے کہ آپ نے میری صاف گوئی کو پسند کیا ہوگا۔

والسلام آپ کی بھابی مسز رحمٰن''

ثریا کی بدقسمتی کہ یہ خط جب آیا تو وہ گھر سے باہر تھیں۔ شائستہ بیگم نے شاہنواز کی ڈاک اس کی ٹیبل پر رکھوا دی جس میں یہ خط بھی موجود تھا مگر ثریا بیگم کی نظروں سے ہنوز اوجھل تھا۔

صابرہ بیگم ایسی بے وقوف ہرگز نہیں تھیں کہ گھر میں آنکھیں بند کر کے رہتی ہوں۔ جب سے ثریا پنڈی سے آئی تھیں ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھیں۔ وہ بار بار مسز رحمٰن کے گھرانے کی امارت کے قصے بڑے تکبر سے سنا رہی تھیں گو ان کے خوبصورت سے بھائی نادر کا ذکر انہوں نے خاصے ڈھکے چھپے انداز میں کیا تھا مگر کنوارے بھائی کے ذکر پر وہ خاصی چونکی بھی ہوئی تھیں۔ وہ ثریا کی عادت سے واقف تھیں کہ ہر چمکتی چیز دیکھ کر مر مٹنے لگتی تھیں اس لیے انہوں نے کن سوئیاں لینی شروع کیں تو انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ مسز رحمٰن کے بھائی کو دیکھ کر ان کی رال خاصی بہہ رہی ہے...... اور جب انہوں نے فون پر اپنی آپا سے مشورے کیے تو ان کے دروازے سے کان لگا کر انہیں بخوبی معلوم ہوگیا کہ وہ ثنا کی شادی کینیڈا سے آنے والے نادر کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔ تب ایک شام چائے پیتے ہوئے انہوں نے چھیڑ خانی کی غرض سے ثریا سے کہا۔

''اللہ بھابی' آپ بھی کچھ سنے یا نکو سنے کہ آج کل لوگاں کینیڈا سے آئے ہوئے لڑکوں کو خوب گھانس ڈال

ے بیٹھے تا کہ ان کی لڑکیاں شادیاں ہو کے وہاں آسانی سے جائیں۔''

ثریا نے صابرہ کی بات سن تو لی تھی مگر اسے ان سنی کر کے اس ڈرامے کو دیکھنے لگیں جس کی قسط اس سے قبل انہوں نے دیکھی ہی نہیں تھی۔

''ارے صابرہ! دیکھو تو سہی پڑوسی ملک کی خواتین کیسے ننگے پنگے بلاؤز پہنتی ہیں۔''

''بھابی جی! میں تو کینیڈا کے لڑکے کی بات کری تھی' کیا آپ نہیں سنی؟''

''بھئی' مجھے کیا پتا۔ جس کا جو دل چاہے کرے' مجھ سے کیا کوئی مشورہ لینے آ رہا ہے کہ کس ملک کا لڑکا زیادہ اچھا ہوتا ہے؟''

''اچھا' اگر میں پوچھی آپ سے تو آپ کیا بولیں گی؟'' صابرہ مزہ لیتے ہوئے بولیں۔

''جہاں' جس لڑکی کا نصیب بندھا ہوگا' وہ وہیں جائے گی۔ اس میں اچھے برے کا بھلا کیا سوال۔ امیر کی لڑکیاں غریبوں میں بیاہی جاتی ہیں' غریب لڑکیوں کی شادیاں امیروں میں بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ کس کی کہاں شادی ہونی چاہیے یا نہیں۔ نہ کوئی ہر ایک اچھا ہوتا اور نہ ہی برا' یہ تو قسمت کے سودے ہیں' اس بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''بھابی پاشا! آپ بالکل سچ کی باتاں بولتے۔ میں بی یہی سوچتی بیٹھی ہوں۔''

''میری ثنا کے تو اس قدر رشتے آئے جب میں پنڈی شادی میں گئی کہ لوگوں کو منع کرتے کرتے تھک گئی...... مگر ایک کے بعد دوسری خاتون مجھ سے اس طرح مل رہی تھیں جیسے لائن لگا کر آ رہی ہوں کہ اب ہماری باری...... نہیں' اب ہماری باری'' ثریا ہنس کر بولیں۔

''بھابی پاشا' کیسے کیسے لڑکوں کے رشتے آئے اپنی ثنا کے واسطے......؟'' صابرہ اپنے لہجے میں ذائقہ بھر کر پوچھ رہی تھیں۔

''پروفیسر' ڈاکٹر' انجینئر' بزنس مین ہر طرح کے رشتے تھے مگر میں نے سب کو انکار کر دیا۔''

''کیوں انکار کری آپ۔ کیا آسمان سے کوئی شہزادہ آنے کو ہے جو آپ انکار کری۔ خیر سے اپنی ثنا کا میڈیکل دو چار مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ اچھا تھا ناں کہ آپ ہامی بھر کو بیٹھتے' بعد اچ شادی ہو جاتی' ایک سال تو تیاری میں اچ گزر کو جاتا' ہو......''

''شاہنواز سے مشورہ کر تو رہی ہوں' اگر وہ مان گئے تو مسز رحمٰن کے بھائی کا رشتہ قبول کرلوں گی۔'' ثریا تو فخر بھرے لہجے میں بولیں۔

''کتنا پڑھا لکھا ہے وہ بول کے......؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''اس کی ساری ایجوکیشن کینیڈا میں ہی ہوئی ہے اور وہیں بزنس کرتا ہے۔ سال میں چھ چھ چکر لگا لیتا ہے۔''

''پھر تو بہوت پیسا ہوئیں گا انہوں کے پاس؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''ایسا ویسا! خاندانی امیر لوگ ہیں وہ۔ بس جب سے ان لوگوں نے ثنا کو دیکھا ہے۔ دیوانے ہو گئے ہیں اس کے اور میری خوشامدیں کر رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ جھول کرلیں ناں انوں کا رشتہ...... پسند کر کے بھی بیٹھے اور پھر بھی منڈی نفی میں ہلاتے بیٹھے۔''

''ہامی بھروں گی' بس تھوڑی سی اور خوشامد کرلیں وہ میری۔ سیانے کہتے ہیں کہ لڑکی کا رشتہ قبول کرتے وقت

جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے اپنی پوری رضامندی نہیں دکھا رہی ورنہ دل سے تو میں بہت خوش ہوں۔''

''جب ہی میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہی کہ آپ جب سے آئے' کینیڈا کینیڈا کیوں کر رہے؟'' صابرہ ہنسی۔

''اب میرا داماد ہی وہاں کا ہے تو وہ ملک تو مجھے اچھا لگے گا ہی ناں۔''

''ہاں' یہ تو ہے بول کے۔''

اور پھر یوں ہوا کہ مسز رحمٰن کا خط صابرہ کے ہاتھ میں آ گیا جو انہوں نے ثریا کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ کتنا واضح انکار کیا تھا انہوں نے۔ خط پڑھ کر تو صابرہ کو چکر سا آ گیا' پھر چپ چاپ گوند کی مدد سے لفافہ بند کر کے ثریا کے کمرے میں ماسی کے ہاتھ بھجوا دیا۔

صابرہ ان عورتوں میں سے تھی جو کسی کے دکھ سے کبھی خوش نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس نے کبھی کینیڈا یا مسز رحمٰن کے بارے میں کوئی سوال کیا ہی نہیں۔

ثریا کا مغموم چہرہ دیکھ کر اسے اکثر دکھ بھی ہوتا۔ مگر وہ ایسے موضوع تک پر بات کرنے سے گریز کرتی جس میں شادی کا ذکر بھی آتا ہو۔

☆☆☆

ایک سادہ سی تقریب میں ربیع کی انگیج منٹ ہو گئی۔ جمال کے حلقۂ احباب سے متعلقہ تمام لوگ اس میں شامل تھے۔ یہ سب وہی لوگ تھے جن سے ہر ویک اینڈ پر ملاقات ہوتی تھی۔

آج ربیع لائٹ پنک شلوار قمیص میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ جرار سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھا۔ مسز مختار نے ڈائمنڈ رنگ جرار کے ہاتھ میں دی۔ جرار نے ربیع کی انگلی تھام کر خود انگوٹھی پہنائی۔ تمام مہمانوں نے جمال اور ان کی والدہ کو مبارک باد دی۔

جمال کا اپارٹمنٹ مہمانوں کی وجہ سے پر رونق سا لگ رہا تھا۔ مسز مختار نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لین دین کے نام پر پیسے کا کوئی زیاں نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جمال کی والدہ نے چاہتے ہوئے بھی جرار کی والدہ اور اس کے بہن بھائیوں کو کوئی چیز بھی تحفے میں نہیں دی تھی' صرف انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ جرار کو جمال نے انگوٹھی پہنائی کہ ربیع مارے شرم کے ایسا کرنے سے قاصر تھی۔

قندیل اور سلمیٰ مرزا بے حد خوش تھیں کہ جمال کی بہن کی منگنی یہیں ٹورنٹو میں ہو گئی۔ دیگر مہمان بھی اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

ہاں تمسخر بھری نظروں اور استہزائیہ مسکراہٹ سے جرار کی دونوں بھاوجیں ربیع کو دیکھ رہی تھیں۔ ممی نے آخر اس لڑکی میں دیکھا کیا' جو ایک دم لٹو ہو گئیں؟ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں۔

''ایک معذور لڑکی کو اپنی بہو بنا کر لا رہی ہیں اور خوش ایسی ہو رہی ہیں جیسے کوئی اپلا پری لا رہی ہوں۔''

''ہمیں کیا' اچھا ہے ہم سے کم تر بہو لا رہی ہیں۔ ہماری ویلیو تو کسی طرح کم نہیں ہو گی۔'' بڑی بہو نے چھوٹی سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ چھوٹی بہو کھلکھلا کر ہنسی تو سب کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

''سبیکا تم بھی دلہن کے ساتھ تصویریں بنوا لو......'' مسز مختار نے بہو کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''ممی! آپ جرار کے ساتھ ہی بنوائیے تاکہ وہ بعد میں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہے۔ ہمارا کیا ہے' ہمیں رہنے دیجیے۔'' (ناز و ادا کے ساتھ کہا گیا)

جرار اور ربیع کے کلوز اپ لیے جا رہے تھے کہ سبیکا نے کہا۔ ''بیٹھ کے تو بہت تصویریں بن گئیں' اب ایک

یں لڑے ہو کر بھی بنوالو' وہ چاہتی تھی کہ ربیع پیر ٹیڑھا کر کے کھڑی ہو اور اس کا یہ عیب سب کی نظروں ل ہو جائے۔

یہ سن کر آگے بڑھا۔ ربیع کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ اس انداز میں کھڑا کیا کہ اس کے الوں پر جرار کے ہاتھ تھے اور وہ یوں سمٹی سمٹائی سی کھڑی تھی کہ سوائے اس کے شہابی چہرے کی مسکراہٹ وسری جانب اٹھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

ال صاحب! ٹورنٹو آنا تو آپ کے لیے بہت بھاگوان ثابت ہوا' کھانے کے دوران سبیکا نے جمال

س لحاظ سے کہہ رہی ہیں آپ؟''

پ کی بہن کی آتے ہی منگنی جو ہو گئی' سبیکا کی ہنسی میں طنز کی آمیزش تھی۔

ے رنج اور غصے کے جمال کو تاؤ سا آ گیا مگر اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ مسز مختار اپنی بہو کی پشت پر سامنے آ کر اپنی بہو سے بولیں۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو سبیکا' اگر ربیع ٹورنٹو نہ آتی تو جرار کا رشتہ کیونکر طے پاتا' کیونکہ اس کا جوڑا تو ربیع کے ھا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے جمال سے زیادہ میرا جرار بھاگوان ہے کہ ربیع کے آنے سے اس کی قسمت کھلی ب سے شادی کے لیے منع کر رہا تھا۔''

ز مختار کی بات سن کر جمال کے چہرے پر شگفتگی سی چھا گئی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ بعض باتیں کیسی تلخ ہوتی حلق تک کڑوا کر دیتی ہیں اور پورے جسم میں سوئیاں سی چبھو دیتی ہیں اور ان' ان دیکھی سوئیوں کی چبھن ہ بے حال سا ہو جاتا ہے اور پژمردگی اسے اپنا اسیر کر لیتی ہے اور بعض باتیں کیسی خوشبودار ہوتی ہیں جو ال کر دیتی ہیں جن کی لطافت ایک عجیب سی خوشی' سرشاری اور اطمینان سا عطا کرتی ہیں' تب بندہ اپنے آپ سا محسوس کرتا ہے۔

آؤ بیٹا' جرار اور ربیع کے پاس آ کر بیٹھو' مسز مختار جمال کو سبیکا کے پاس سے ہٹاتے ہوئے بولیں' تب ب سا منہ بنا کر رہ گئی جیسے اس کی بہت سی باتیں اس کے اپنے دل میں رہ گئی ہوں۔

وسری جانب ربیع کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دل کی کلی کھل سی گئی ہو۔ جرار کتنا اچھا تھا۔ اس کے شوخ اس کو کھلکھلانے پر مجبور کر رہے تھے مگر وہ اپنی مسکراہٹ دبائے بیٹھی تھی۔

یہاں سے جانے کے بعد فون کروں گا' اپنا سیل آف مت کرنا۔''

مگر کیوں......؟'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں' میں تم کو کیسے بتا دوں کہ آج تم کیسی لگ رہی ہو؟''

اس کی یہ بات سن کر وہ مزید سرخ ہو گئی اور جرار اس کے چہرے پر کھلتے گلابوں کو دیکھ کر مزید مسحور سا اٹھا۔

☆☆☆

ال ان دنوں شدید ڈیپریشن کا شکار تھی۔ طاہر کی مہندی کی تقریب ادھوری چھوڑ کر جو وہ آئی تھی تو پھر مسز ہاں وہ نہ شادی میں گئی اور نہ ہی ولیمے میں۔

بعد میں پتا چلا تھا کہ ولیمے کی تقریب میں ثریا بھابی آئی تھیں۔ ان کو دیکھنے کی حسرت اس کے دل میں

رہی اور گھر میں بیٹھ کر وہ یہ شکر ادا کرتی رہی کہ پتا نہیں مجھے دیکھ کر وہ کس طریقے سے پیش آتیں اور اس کی ا
کس کس طریقے سے نشانہ بناتیں۔

ثنا ان دنوں اپنے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی اس لیے اس سے بھی زیادہ بات چیت نہیں ہو
صادقہ باجی کا بخار ٹائی فائیڈ کی شکل اختیار کر گیا تھا تو ان کی وجہ سے اس کا اپنے بوتیک پر بھی برائے نام جا
تھا۔

''فرو! اگر مجھے کچھ ہو گیا...... تو' تو بالکل اکیلی رہ جائے گی۔'' ایک شام صادقہ باجی نے اس سے کہا۔

''آپ کو کچھ نہیں ہوگا' بخار میں کیا لوگ مرجاتے ہیں؟ خواہ مخواہ کے وہم پالنے میں آپ کو تو کمال
ہے۔ اللہ میری زندگی بھی آپ کو لگا دے۔ اپنے بارے میں آئندہ ایسا سوچیے گا بھی نہیں۔''

''فرو...... ! میں تو ایک بات کہہ رہی ہوں۔ تو جوان لڑکی ہے' اس عمر میں تیری شادی ہو جائے تو
سکون مل جائے' تیرے سوا میرا ہے ہی کون؟''

''نہیں باجی! میں اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی اور شادی کے بارے میں تو میں سوچنا بھ
چاہتی۔''

''میری بھی شاید یہ غلطی رہی' تمہاری باتوں میں آ کر اس نہج پر میں نے سوچا بھی نہیں۔ کتنی ہی خوا
تمہاری بابت مجھ سے پوچھا' مگر میں نے کسی کی بات ہی نہیں سنی کہ شاید میں بھی ایسا چاہتی تھی کہ تم کبھی مج
کر کہیں نہ جاؤ' مگر اب میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری فرو کا کیا ہوگا؟ تم تو میری بیٹی ہو
ماں اپنی بیٹی کے لیے کسی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دے سکتی......''

''صادقہ باجی...... ! پلیز' آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو پھر جو دل م
کرلیں مگر ایسی باتیں نہ کریں کہ آپ کو کچھ ہونے والا ہے ورنہ میں مرجاؤں گی۔''

''میری بچی...... ! اللہ تجھے ہمیشہ خوش رکھے' لمبی زندگی دے۔'' صادقہ باجی نے بے اختیار اسے
لگا لیا تھا۔

☆☆☆

آج فریال بہت دنوں بعد اپنے بوتیک آئی تھی۔ وہ ورکرز لڑکیوں کے ساتھ مل کر ملبوسات کی ڈ
ڈریس چینج کروا رہی تھی کہ بیلا آ گئی۔ آج وہ بڑی شاداں و فرحاں سی تھی۔

''فریال جی' میں آپ سے ناراض ہوں۔ آپ میری شادی میں نہیں آئیں۔''

''میری باجی بیمار تھیں' اس لیے نہیں آ سکی تھی۔''

''اچھا' اب آپ میرے ماموں کی شادی میں آیئے گا۔ وہ عنقریب ہونے والی ہے۔''

''ضرور......'' اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں ہامی بھری۔ (ہونہہ' میں تمہاری شادی میں تو گئی نہی
تمہارے ماموں کی شادی میں جاؤں گی۔ ایسی فالتو بیٹھی ہوں ناں)

''ہاں' اس لڑکی کا کیا ہوا؟ جو تمہارے منگیتر کے پیچھے پڑی ہوئی تھی؟'' فریال کو اچانک ہی خیال آیا
نے پوچھا۔

''اپنے منہ کی کھا رہی ہے۔ سخت تلملا رہی ہے' مگر میں نے بھی اس کا سر کچل دیا ہے اور میں اب اس
ساتھ وہ کروں گی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکے گی۔'' بیلا نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

''اب تم کیا کرو گی؟'' اچانک ہی فریال کے لبوں سے نکلا۔

''میں اسے جان سے مار دوں گی۔'' بیلا نے کہا اور فریال کو یوں لگا جیسے کسی جوان لڑکی کی خون میں تر بتر لاش
اس کے سامنے پڑی ہو اور بیلا اپنی گن لہراتی ہوئی واپس جا رہی ہو۔

بیلا نے کیا خریدا اور اس نے کتنا ڈسکاؤنٹ کیا' اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد تھی تو وہ لاش جو خون میں لت پت
اس کے سامنے پڑی تھی۔ تب وہ ایک دم خوف زدہ سی ہو گئی' اسے بیلا سے ڈر سا لگنے لگا۔

اسے یوں لگا جیسے بیلا وہ عورت ہے جو جس کو دل چاہے مار سکتی ہے۔ وہ انجانی سی لڑکی کون ہے؟ اس کا جرم
اسے جرم کیوں نہیں لگ رہا؟ وہ بری ہونے کے باوجود اسے معصوم کیوں دکھائی دے رہی ہے؟ اس اجنبی لڑکی کی
جانب اس کا دل کیوں کھنچ رہا ہے؟ فریال یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی مگر اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

میں شاید اس لیے یہ سب سوچ رہی ہوں کہ میں کون سی اچھی لڑکی رہی تھی۔ میں نے کون سا اپنے بھائیوں کا
مان رکھا تھا۔ اپنی ماں کا سر نیچا اور بہن کو بے عزت کرنے میں' میں نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔

میرے گھر والوں نے دھکے دے کر مجھے گھر سے نکالا تھا اور آج بھی میں یوں منہ چھپائے بیٹھی ہوں کہ کوئی
ی اصل حقیقت سے واقف تک نہیں ہے۔ جب ہی تو مجھے ایسی لڑکیوں سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے جنہیں
ب برا کہتے ہیں۔ مگر بیلا تو اس لڑکی کو قتل کرنا چاہتی ہے؟ اس کے اعصاب یہ سوچ کر پھر ٹوٹنے لگے۔

''نہیں' اسے مت مارو' خدا کے لیے مت مارو'' وہ بے اختیار چیخی اور چیختی چلی گئی۔

تب اپنے بستر سے اٹھ کر صادقہ باجی اسے سنبھالتے ہوئے بولیں ''فرو بیٹا! اٹھو...... پانی پی لو...... لگتا ہے
کوئی خواب دیکھ کر تم ڈر گئیں۔''

''نہیں باجی! اب مجھے خواب نہیں' حقیقت سے ڈر لگنے لگا ہے۔''

''اتنی حساس مت بنو ورنہ جی نہیں پاؤ گی۔''

''صادقہ باجی! کبھی کبھی مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں مرچکی ہوں؟'' فریال آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

''اپنے آپ کو سزا دینی بند کر دو۔ بس اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعا مانگا کرو۔ وہ رحیم ہے' کریم ہے' ستار
غفار ہے۔ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ معافی پسند کرتا ہے' اسی سے مانگو' پھر دیکھنا کیسی ہلکی پھلکی ہو جاؤ گی' اور
ا ندہ کبھی ایسی یاس بھری باتیں بھی نہیں کرو گی۔'' صادقہ باجی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

گاؤں کے اسکول کو گرلز انٹر کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ بہت سی لڑکیاں جو میٹرک کر کے گھر بیٹھ گئی تھیں انہوں نے بھی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

فرح کی آپا نے بڑی محبت سے کہا۔ ''فرح گڑیا' تم بھی کالج میں داخلہ لے لو' تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔''

''پڑھ کر کیا کروں گی میں......؟'' اس نے یاس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تعلیم ذہن کے بند دریچے بھی کھول دیتی ہے' یہ ضائع ہونے والی چیز نہیں ہے۔''

''مگر میں تو ضائع ہو گئی'' اس نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔

''اللہ نہ کرے تم ضائع ہو' اللہ لمبی حیاتی دے۔ تمہارے سارے سکھ ہم بھی دیکھیں۔''

''پر آپا' اب پڑھنے میں میرا دماغ کہاں چلے گا۔''

''کالج جا تو سہی' سب کے ساتھ پڑھے گی تو تجھے خود بھی اچھا لگے گا۔''

اور پھر واقعی فرح نے اپنی بہنوں کے کہنے پر قریبی کالج میں داخلہ لے لیا۔ روزانہ سفید یونیفارم پر نیلا ململ' دوپٹا پہن کر جاتی تو معصوم سی چھوٹی لڑکی دکھائی دیتی۔ ذرا یہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ لڑکی دکھوں کی بھٹی سے نکل کر آئی ہے۔

آرٹس کے مضامین اس نے لیے تھے جو اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بھی آسان تھے۔

ایک دوپہر وہ اپنی کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ کالج سے آ رہی تھی' اس نے دیکھا کہ اشرف ٹھیلے پر بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ ٹھیلا اس کا بڑا بھانجا چلا رہا تھا۔

اشرف کو دیکھ کر یکبارگی اس کے قدم ڈگمگائے مگر سہیلیوں کے بیچ میں وہ اسی رفتار سے چلتی رہی۔

اشرف اس کو بالکل بھی پہچان نہیں پایا تھا۔ جب فرح اس کے سامنے سے گزر کر گلی میں مڑ گئی تو اس کے بھانجے نے کہا ''ماموں...... آپ نے دیکھا...... ابھی فرح مامی جا رہی تھیں۔''

''کہاں جا رہی تھیں؟'' اشرف نے حیران ہو کر کہا۔

''ابھی آپ کے سامنے سے تو گزری تھیں۔''

''ارے پاگل! وہ تو کالج کی بچیاں گئی تھیں'' اشرف کو اس کی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔

''فرح مامی نے کالج میں داخلہ لے لیا ہے' اب وہ روز پڑھنے جاتی ہیں۔''

''منہ کھولے گزری تھی...... بے غیرت'' اشرف نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ہاں' ماموں...... بس اپنے کالج کا دوپٹا اوڑھا ہوا تھا' بڑا سا کالا بیگ ہاتھ میں تھا۔''

''اب اس عمر میں پڑھے گی ذلیل کہیں کی'' اشرف کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

''امی تو کہہ رہی تھیں کہ دیکھنا دوسری شادی ضرور کرے گی'' بھانجے نے سنی سنائی بات دہرائی۔

''ہونہہ...... کرے گا ضرور اس سے کوئی شادی...... لفنگی' بدمعاش لڑکی'' اشرف کے منہ میں کف بھر آیا۔

''مامی بہت بری تھیں......؟'' بھانجا معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

ی بہت بری...... دیکھ لینا' ابھی تو کالج میں داخلہ لیا ہے اس نے...... کل کلاں کو کسی سے عشق لڑائے گی
ے کی اپنا منہ سیاہ!''

امی تو کوری تھیں۔'' بھانجا بات کاٹ کر بولا۔

ر خبیث! اس کمینی کے علاوہ تیرے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہے کیا......'' اشرف نے زچ ہو کر

لی ایک دور پرے کی خالہ ان کے گاؤں آئی تھیں۔ مالی حیثیت بھی ان کی اچھی تھی اور بات کو سچائی
مان کرنے کی اپنے اندر ہمت بھی رکھتی تھیں۔

اشرف کی ماں نے بہو کو طلاق دینے کی کمزور ترین وجوہات بیان کرنی شروع کیں تو انہوں نے انہیں
یا۔

ا میری دیکھی بھالی لڑکی ہے۔ اس نے تمہارے گھر کے ماحول میں نباہ کرا' یہی بہت تھا۔ پھر اشرف
ہا منہ پھٹ لڑکا! برداشت کرنا آسان کام تو نہ تھا۔ وہ تو معذور شوہر کے ساتھ بھی ہر ظلم سہتی رہی اور
ی تب بھی اس پر الزام رکھ دیا گیا۔ چور اسے بنا دیا' بدمعاش اسے قرار دے دیا۔ تم لوگوں کی اوقات
ے خاندان اور گاؤں کے لوگ نا آشنا تو نہیں ہیں۔ ایسی باتیں کرنے سے تمہاری الٹی بے عزتی
ان کے ہاں تو سب مبارک باد دینے جا رہے ہیں جیسے ان کی بیٹی کوٹ لکھپت جیل سے رہا ہوئی

مرز یہ بات نہیں ہے۔ وہ لڑکی ہمیشہ کی بڑی کائیاں تھی۔ اسے تو شوہر کی قدر کرنی ہی نہ آئی' ہر وقت
ھائے رکھتی تھی اور میں کوئی بھی بات کہہ دیتی تو تیر کی طرح جواب دیتی تھی۔''

آپا' یہ باتیں کسی اور سے کرنا' اس سے قبل میں تمہارے گھر بہت سے تماشے اپنی آنکھوں سے دیکھ
ب تمہاری اماں نے اپنی لٹھیا اس کی کمر پر مار کر کہا تھا' ابھی تک ٹانگیں دبانی نہیں آئی ہے۔ تمہاری
ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں میں کیڑے نکالا کرتی تھیں اور اشرف بنا کچھ پوچھے ہی اس پر ہاتھ
تھا اور جو منہ میں آتا تھا' بنا کسی کو دیکھے بھالے بکے چلا جاتا تھا۔''

ساری رات کم بخت سویا کرتی تھی۔ سوکھی کوکھ لے کر بھی یہاں عیش کرتی رہی اور تم کہتی ہو کہ اس پر
ے ہیں۔ ہماری ہو کر بھی اس کے گن گاتی ہو......'' اشرف کی اماں کو ان پر غصہ ہی تو آ گیا۔

ن نے تمہارے گھر عیش کیے ہیں تو تمہاری ساری بیٹیاں ایسے عیش سمیٹیں' مگر کسی پر ناحق یوں بہتان
ے۔ حد ہے بیٹی والی ہو کر بھی دوسرے کی بیٹی کا دکھ تم نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اپنی ہر بات صحیح سمجھی
ات غلط سمجھی گئی۔''

پ تو نہ جانے کس کے بھڑکاوے میں آ کر ایسا اونچا اونچا بول رہی ہیں۔ ہماری تو قسمت ہی
ے بھائی کے متھے فرح جیسی بدمعاش لڑکی پڑی۔''

ے لیے یہ کہنا شاید بہت مشکل ہے کہ اشرف کی نہیں بے چاری فرح کی قسمت خراب تھی جس کی
ے بدلحاظ اور بے غیرت شخص سے ہوئی۔ کوئی اپنی بہو یا بیوی سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسے تم لوگوں
بے شک غریب ہو مگر اپنی بیوی کو سکھ سے رکھنے کے سو جتن کرتا ہے۔ مگر تمہارے گھر تو فرح کو
ے سو طریقے روا رکھے گئے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب اشرف تو کیا تمہارے گھر سے کوئی لڑکی بھی

لینے کی ہمت کرے گا۔"

زمرد خالہ تو یہ سب کہہ کر چلتی بنیں مگر ان کے جاتے ہی سب ان کو بھی گالیاں سنا کر کھی کھی کرکے پھر سب بڑی باجی زمرد خالہ کی باتوں کی نقلیں اتارنے لگیں کہ اس فن میں وہ ہمیشہ کی طاق تھیں۔

نانی اماں نے ان کا دوپٹا اوڑھنے کا طریقہ ہنس ہنس کر دکھایا۔ اماں نے ان کے اگلے پچھلوں کی میں کیڑے ڈالے۔

تب سارا گھرانا ہلکا پھلکا سا ہوگیا۔ زمرد خالہ کی باتوں سے ذہن پر جو ایک بوجھ سا آ گرا تھا' وہ ہوگیا۔ یوں بھی بے عزتی کا تعلق محسوس کرنے سے ہے۔ اگر بندہ محسوس نہ کرے تو بے عزتی نہیں ہوتی وقت سارا گھرانا یوں گفتگو کر رہا تھا جیسے ابھی ان کی کسی قسم کی کوئی بے عزتی نہ ہوئی ہو۔ ایک آسودہ سی سب کے لبوں پر تھی۔

"آج موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے ناں......" نانی اماں نے کہا۔

"ایسے اچھے موسم میں تو گیت سننے کو دل چاہ رہا ہے" اماں بھرپور سرشاری سے بڑی باجی کی طرف ہوئے بولیں۔

تب بڑی باجی نے اپنے پھٹے ہوئے گلے سے آواز نکالتے ہوئے گایا۔

رم جھم ' رم جھم بڑے پھوار
تیرا میرا نت کا پیار

"بھئی ہم سے پیار کرتی ہو تو پکوڑے بنا کر کھلاؤ" نانی اماں نے فرمائش کی۔

"اور ساتھ انار دانے کی چٹنی بھی" اماں نے بھی گرہ لگائی۔

"اچھا...... مجھے کیا فرح کی طرح پاگل سمجھ رکھا ہے جو اس حبس زدہ موسم میں گرم تنور سے باورچی جا کر مروں گی" بڑی باجی نے تڑ سے منع کرتے ہوئے کہا۔

تب اماں ایک دم ہنستے ہنستے یک لخت چپ سی ہوگئیں اور بڑی باجی بکتی جھکتی اوپر چھت پر چلی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنا انہیں ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

☆☆☆

"دیکھو مجنوں کو...... آج بھی کتنے سارے پھول لیے کھڑا ہے۔" ثنا کی دوست نے اس کو ہوئے کہا۔

"لگتا ہے دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پاگل ہوگئے ہیں بالکل۔"

"تم ان کی شکایت ان کی بہن سے کیوں نہیں کر دیتی ہو؟"

"آج سوچ رہی ہوں کہ موصوف کی طبیعت صاف کر دی جائے۔"

وہ نادر کو نفرت سے دیکھتی ہوئی جب آگے بڑھی تو نادر نے وہ پھول اس کے قدموں میں رکھ دیے۔

"آنٹی کہاں ہیں؟" ثنا گھر میں غیظ و غضب میں داخل ہوئی۔

"کیا ہوا ثنا!" بیلا اس کو یوں برانگیختہ دیکھ کر پاس آ کر بولی۔

"ذرا نادر بھائی کا دماغ ٹھیک کروانا ہے۔"

"کول ثنا...... بی کول...... آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ طاہر بتا رہے تھے' اگر کوئی ایسی ویسی

پھٹ سکتی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی جا رہا ہے۔"

میں کیا کروں......" وہ پریشان ہو کر بولی۔ "نادر بھائی روزانہ پھول لے کر میرے قدموں میں یکھنے والی لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ راہ چلتے ہنستے ہیں۔ یہ کوئی تمیز ہے ان کی' کسی دن سڑک پر دوں گی تو طبیعت ٹھکانے آ جائے گی۔"

ی چھوٹی سی پیاری سی بہن ہو۔ میں اس کو سمجھاؤں گی جو تمہارے عشق میں پاگل ہو رہا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گا...... مگر پیاری ثنا' محبت کرنا ہر شخص کا انفرادی عمل ہوتا ہے۔ ہم کسی کو کسی سے بھی نہ محبت ک سکتے ہیں اور نہ ہی نفرت کرنے سے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ نادر تم سے محبت کرتا ہے اور تم ت کرتی ہو...... اور تم دونوں ہی اپنے اپنے محاذ پر بالکل سچے ہو۔ اگر تمہاری نفرت اتنی شدید ہوئی تو وہ ھوڑ کر چلا جائے گا اور اگر اس کی محبت میں وہ طاقت ہوئی جو کہ نظر آ رہی ہے تو تم پر سے یہ نفرت کی ہی آپ پگھل جائے گی اور تم بھی اس کی محبت سچے دل سے قبول کر لو گی۔"

نہیں میں ایسی بے وقوف نہیں ہوں جو لچے لفنگوں کی محبتوں پر ایمان لے آؤں" ثنا نے جل کر کہا اور میں چلی آئی۔

تم کیسی ہو اور کیسی ہو جاؤ گی' یہ مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکے گا۔"

دل میں سوچا اور مسکراتے ہوئے نادر کے سیل کے نمبر ملانے لگی کہ تازہ ترین ہدایت کے مطابق اب وں کے بغیر ہی بس اسٹاپ پر کھڑا ہونا تھا تاکہ ثنا کے جلال کو کم کیا جا سکے۔

☆☆☆

ل شادی خیر و عافیت کے ساتھ ہوگئی تھی اور ان دنوں وہ اپنے شوہر کے ساتھ گھومنے پھرنے گئی ہوئی قندیل نے اپنے گھر چند دنوں کے لیے بلا لیا تھا۔ ان کی تینوں بیٹیاں گھر گرہستی میں بالکل کوری ندیل چاہتی تھیں کہ وہ ربیع کی طرح ہر کام سے آگاہ ہوں۔ سلیقہ ان کے ہاتھوں سے بولتا ہو۔

اماں ان کی بیٹیوں کو کوکنگ کی تربیت دے رہی تھیں اور قندیل کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اپنے فلیٹ میں بالکل اکیلا تھا۔ ایک تو ربیع کے جانے سے ہی یہ فلیٹ اس کو کاٹ کھانے کو آتا تھا' کے یوں جانے سے اس کی طبیعت بالکل ہی اچاٹ ہوگئی۔ آفس سے گھر آتا تو گھر کی خاموشی اس پر ایک بوجھ بن کر گرنے لگتی۔

آپ کب آئیں گی گھر......؟" ایک شام آفس سے آتے ہی انہیں فون کر کے پوچھا۔

آج تیسرا دن ہی تو ہے' دو چار روز کے بعد میں خود ہی آ جاؤں گی۔ قندیل نے یہاں ہمارا اتنا خیال میں ان کے کسی کام آ رہی ہوں تو کیا مضائقہ ہے ورنہ گھر میں اکیلے رہ کر تو مجھے ربیع کی یاد بھی بے ربیع ہفتے کو واپس آ رہی ہے۔ میں جمعے کو ہی آ جاؤں گی' وہاں سے آتے ہی وہ گھر بھی تو فوراً آئے

رہی ہیں آپ......" جمال نے ان کی بات سن کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

ارے دن ہو گئے تھے اسے ٹورنٹو آئے ہوئے مگر اتنی آسائشات مل جانے کے بعد بھی اس کا دل ہی نہیں لگا تھا۔

نگین کی یاد میرے دل سے ختم کیوں نہیں ہوتی" یکبارگی اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''سچی محبت دل میں جگہ سی بنا لیتی ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔'' یہ آواز اسے اپنے اندر سے، تھی۔

''نگین! میں نے یہ وعدہ اپنے آپ سے کیا تھا کہ اب تمہیں کبھی یاد نہیں کروں گا مگر کیا کروں، آپ ہی آپ لو دینے لگتی ہیں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

نہ کوئی وعدہ' نہ اقرار' نہ عہدوپیاں
نہ تم قریب نہ ہم پاس' دور کون ومکاں
پھر بھی اک خلش سی ہے سینے میں نہاں
رہ رہ کر کرتا ہے یہ دل آہ وفغاں
باربار جیتا ہے کم بخت وہ گزرے لمحات
یادوں کے سہارے انہیں کرتا ہے جواں
تم پاس تھیں تو تھا ہر سو موسم بہار
تم دور ہو تو ہر طرف خزاں ہی خزاں
بیتے دن کوئی بھی لوٹا نہیں سکتا
یہ حقیقت ہے جب کل عالم پہ عیاں
تو کیوں چاہت تمہاری ہے میری گرویدہ حیات
کس سے کریں شکوہ' کس سے گریہ زاریاں
تھا اپنے پہ بڑا زعم کہ اسیر زلف نہ ہوئے
ہنسیں گے ہم بھی اک روز' تھا کے یہ گماں
خود بخود نکل جائیں گے دام عشق سے ہمدم
مایوس نہ ہو تو' اے میرے دل ناتواں

(شاعر۔رام پرکاش

جمال نہ جانے سوچ کے بھنور میں کب تک گرفتار رہتا' اس کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی جب شور استغراق سے واپس آیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے اس کی آفس فیلو عیناں سامنے کھڑی تھی۔

جمال نے ایک نظر اس کے اوپر ڈالی۔ گھیرے گلے کا چھوٹا سا بلاؤز اور تنگ سا اسکرٹ پھیلائے مسکرا رہی تھی۔

''عیناں......! آپ یہاں......؟'' وہ تذبذب میں تھا' اسے اندر آنے کے لیے کہے یا نہ کہے؟

''کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟'' اسے یوں دروازے کے سامنے ساکت سا کھڑا پوچھا۔

''اس وقت گھر میں نہ میری بہن ہے اور نہ ہی والدہ ہیں۔''

''تم مجھے کھا تو نہیں جاؤ گے......'' عیناں اسے پرے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''واؤ......تم نے اپنا اپارٹمنٹ تو بڑا اسجا رکھا ہے اور کبھی بلایا تک نہیں؟ ارے یہ گڑیا کتنی کیوٹ سے لائے ہوں گے...... ہیں ناں؟''

''کیسے ہوا آنا یہاں......؟'' وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑی سرد مہری سے پوچھ رہا تھا۔

''تم تو آج لنچ سے پہلے ہی آفس سے نکل گئے۔ مجھے بعد میں اقبال صاحب نے بتایا' تمہیں بخار تھا۔ بتایا یوں نہیں تم نے؟'' عیناں نے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کوئی بخار وخار نہیں ہے مجھے' بس یونہی آرام کرنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے گھر آ گیا۔''

''اف......! گھر میں کتنی خاموشی ہے۔ شادی کیوں نہیں کرتے ہو تم؟'' عیناں اب چاروں طرف گھوم رہی ی۔

اس کی بات کا جواب دینے سے بہتر تھا کہ جمال ٹی وی کے بور پروگرام کو دلچسپی سے دیکھنا شروع کر دے۔

''پاکستان کی کسی لڑکی سے شادی مت کرنا' فری میں مشورہ دے رہی ہوں'' میں عیناں ٹیبل سے انگور اٹھا کر ھاتے ہوئے بولی۔

جمال چپ چاپ ٹی وی کی جانب محو رہا۔

''میرے ایک کزن نے پاکستان جا کر شادی کی تو بہت پچھتایا۔ بالآخر چھوڑنا پڑا اور یہیں کی لڑکی سے شادی لی۔ اب وہ دونوں خوش ہیں۔'' اب عیناں صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور باتیں بتا رہی تھی۔

''مس عیناں! جب مجھے اس قسم کا مشورہ لینا ہوا تو تم سے ضرور پوچھوں گا۔ اس وقت میں نے اپنے دوست و ٹائم دیا ہوا ہے مجھے وہاں فوراً پہنچنا ہے۔''

جمال کا واضح مطلب یہی تھا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ مگر عیناں بھی حرفوں کی بنی ہوئی تھی' برا مانے بغیر بولی۔ ''اس وقت میں سب وے سے یہاں تک پہنچی ہوں اگر تم مجھے میرے گھر کے قریب تک لفٹ دے دو تو ں ممنون ہوں گی۔''

جمال گاڑی کی چابی لے کر فوراً ہی باہر نکلا تا کہ یہ بلا گھر سے تو باہر نکلے۔ عیناں اس کے ساتھ ساتھ باہر آئی اور جب اس کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی جا رہی تھی تو اس کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ اسی طرح زندگی گزر جائے اور اس کا گھر نہ آئے۔

''میرے دوست کا گھر اگلی لین میں ہے۔ اس اسٹاپ سے تم بہ آسانی اپنے گھر جا سکو گی'' اپنی گاڑی بس ا ٹاپ پر روکتے ہوئے اس نے کہا۔

عیناں اس کی گاڑی سے اتر کر اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ جمال بھی اس وقت تک اس کے ساتھ کھڑا رہا' ب تک اس کی مطلوبہ بس نہیں آئی اور بس کے جاتے ہی وہ گاڑی واپس موڑ کر گھر آ گیا مگر گھر میں گھسنے سے پہلے وہ باہر کی اطلاعی بیل بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

''ہونہہ......پاکستانی لڑکیاں اچھی نہیں ہوتیں' عیناں کی آواز اس کے کانوں میں سنگ باری سی کرنے لگی۔

''اپنے آپ کو دیکھا ہے کبھی تم نے...... کہ تم کیسی ہو؟'' وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر بستر پر گر کر سختی سے یوں عیں میچ لیں جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی آنکھوں میں نہ سما جائے' کسی خواب کی صورت۔

☆☆☆

''اچھا طعنہ دے رہے ہو مگر میں طعنہ پروف ہو گئی ہوں۔'' فرحت نے شجاع کی بات سن کر تمسخر بھرے لہجے ں کہا۔

''بات طعنے کی نہیں ہے' یہ حقیقت ہے۔ نگین جب بھی گاؤں میں آئی' پریشان رہی اور اس کی پریشانیوں

میں اضافے کا ایک سبب تم بھی ہو‘ کیسی کیسی باتیں سنائی ہیں اماں نے اس کو۔“

”تم اگر یہ چاہو کہ میں اپنی ماں کے پاس آنا چھوڑ دوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ چاہے تم کتنے ہی بہتان مجھ پر اور اماں پر لگا دو‘ جب تک میری ماں زندہ ہے‘ میں یوں ہی دندناتی ہوئی آؤں گی۔ دروازے پر تالے ڈال دو گے تو دیواریں پھاند کر آ جاؤں گی‘ مگر تم میرا پیر کسی طرح نہیں روک سکتے۔“

”میری بات کا غلط مطلب نکالنے میں تم ہمیشہ کی ماہر رہی ہو۔ امی کو جس طرح تم چڑھایا کرتی ہو‘ شاید ہی کسی بہن نے ایسا کیا ہو۔“

”بھیا‘ کچھ ہی کہہ لو‘ کتنے ہی الزام میرے سر رکھ دو مگر میرا یہ میکا ہے‘ جواب صرف میری ماں کے دم سے قائم ہے۔ ماں بیٹیاں ہر موضوع پر بات کر سکتی ہیں۔ سنا تھا کہ شادی کے بعد بھائی‘ بھائی نہیں رہتا‘ اب دیکھ بھی لیا ہے۔“

”تم ان بہنوں میں سے ہو جو سب کیے کرائے پر کوچی پھیرنے میں وصف رکھتی ہو۔“

”ہاں‘ ہاں میں ایسی ہی ہوں۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں تمہاری بہت اچھی بہن ہوں‘ مگر میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں کر سکتی کہ تم سے ناراض ہو کر میں اپنی ماں سے ملنا چھوڑ دوں۔“

”دیکھ رہی ہیں امی آپ...... یہ فرحت بات کو اپنی طرف لے جانے میں کتنی مہارت رکھتی ہے۔ جب یہ میری بات نہیں سنتی تو نگین کی کہاں سنا کرتی ہو گی۔ آج تو میں اس سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ نگین آٹھ ماہ بعد گاؤں آنے والی ہے‘ اب یہ اس سے انسانوں کی طرح ملے۔“ شجاع نے شکایتی لہجے میں ماں کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا شجاع! نگین آٹھ ماہ بعد آئے یا آٹھ سال بعد وہ کوئی مہمان تو نہیں ہے‘ اپنے گھر آ رہی ہے سو بار آئے اس کے آنے یا روکنے پر کوئی واویلا تو نہیں کر رہا۔ تو پھر تم یہ کیوں چاہ رہے ہو کہ تمہاری بیگم کے آنے پر ہم ماں بیٹی ڈھول تاشے بجا کر استقبال کریں۔“

”کیا دوستانہ رویہ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے ماں......؟“ شجاع نے ایک گہری نظر بہن پر ڈال کر ماں سے پوچھا۔

”نہ یہاں دوستی ہے اور نہ ہی کسی سے دشمنی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نگین کے آنے سے پہلے ہمیں ایسا لیکچر کیوں دے رہے ہو؟“ عظمت بیگم نے تنک کر کہا۔

”وہ اس لیے امی کہ ہمارے یہ بھائی اپنی بیگم کے آگے تو چوں کرنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں‘ اس لیے سارا نزلہ بے چاری بہن اور بے چاری ماں پر ہی گرانا چاہ رہے ہیں۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں اماں! نگین نے آج تک کبھی آپ کی شکایت نہیں کی۔ اس نے کبھی فرحت کو برا نہیں کہا۔ اس نے کبھی شہر میں رہنے کو ترجیح نہیں دی مگر اس کے باوجود آپ دونوں کے ہی دل میں نگین کے لیے نہ محبت ہے اور نہ ہی کوئی جگہ ہے۔“ (شجاع کا لہجہ پھر شکایت آمیز ہو گیا۔)

”وہ اس لیے کہ ہم دونوں ہی ظالموں کی کیٹیگری میں آتے ہیں۔ میں ظالم ساس ہوں اور فرحت کمینی اور مکار نند ہے۔ جس کا کام ہی نگین کو عاجز کرنا ہے۔ اس پر بھی وہ بچاری صبر کرتی ہے اور تم یہ سب دیکھ کر ماں‘ بہن کو جو دل میں چاہے کڑوی کسیلی سناتے رہو اور وہ بے چاری یہ سب چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے‘ تم کو خاموش کرانے پر بھی قادر نہیں ہوتی ہے۔ تم اس بے چاری کے سامنے کچھ ہی کہہ دو‘ وہ نڈھال ہو کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح ماں اور بہن کو نظروں سے گرانے کے بعد گھر سے بھی باہر کرا دے۔“ عظمت بیگم نے جب غصے میں سنائیں تب شجاع ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”زن مرید کہیں کا!“ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس کے کانوں میں بہن کا جملہ پڑا۔ تب اس کے دماغ میں رارے بھر گئے اور وہ دانت کچکچا کر آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ دیر تک بلا مقصد باہر گھومتا رہا اور جب ٹانگوں میں چلنے کی مہلت نہ رہی تو گھر لوٹ آیا۔

اس وقت گھڑیال صبح کے چار بجا رہا تھا اور عظمت بیگم اس کے انتظار میں آنگن میں پریشان سی ٹہل رہی تھیں۔ بیٹے کو آتے دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا اور وہیں بستر پر دلائی اوڑھ کر یوں لیٹ گئیں جیسے اس کے آنے کا انہوں نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا ہو اور انہیں اس بات کی پرواہی نہ ہو کہ وہ کیوں اتنی تاخیر سے گھر آیا ہے۔

☆☆☆

”منا...... میں جا کے آتی......“ فاخرہ نے بڑا سا دوپٹا اوڑھتے ہوئے کہا۔

”آپ کاں جا رہے......؟“ رعنا نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”ابھی بولی ناں تھا میں تم کو...... بازار جانے کا ہے‘ تو میں جا رہی۔“

”بازار جا رہے آپ...... پھر تو شام کو آئیں گے آپ“ رعنا نے تمسخر سے کہا۔

”نکو بابا! ابھی جا کو آتی...... تم دال‘ چاول بنا کے بیٹھو“ فاخرہ نے پچکارتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی سی برسات نے اور حبس بڑھا دی۔ بیرچی خانے میں نہیں جانے کو میں“ رعنا نے تنک کر کہا۔

”اللہ اماں...... وو مٹھی دالاں لے کو ایک مٹھی املی لے کو چڑھا دیو ناں‘ کھٹی دال پکا دیو جی۔ تمہارا بھائی آ کے کھائے گا منا!“

”بس دل نہیں چاہ رہا میرا بیرچی خانے جانے کو......“

”میری رانی بیٹی ہے ناں‘ جا چڑھا دے“ فاخرہ نے ہنس کر پھر لاڈ بھرے لہجے میں خوشامد کی اور باہر نکل گئی۔

”ہونہہ! ضرور پکاتی میں۔“ رعنا نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے سوچا۔

نہ صرف آج بلکہ کئی دنوں سے وہ پریشان سی تھی۔ نہ کھانے میں دل لگ رہا تھا اور نہ ہی پکانے میں‘ ورنہ کوکنگ کرنے کا تو اسے اچھا خاصا شوق تھا۔ اس کی سہیلی نے جب سے یہ بتایا تھا کہ منور کے بدکنے کی اصل وجہ یہ کہ اس کے دل میں کوئی اور رہتی ہے۔

”جب منور مجھے پسند ہی نہیں کرتا تو میں کائے کو مری جا رہی اس سے شادی کرنے کو......“ منگنی کے یہ تین سال اس نے صرف منور کے ہی سپنے دیکھے تھے اور اب وہ اس سے بات کرنے کا تو کیا‘ بات کے جواب دینے ایسے ہی کاٹ کھانے کو آتا تھا۔

اپنی سہیلی سے رعنا نے یہ پوچھا تھا کہ کیا اس کو یہ منگنی توڑ دینی چاہیے؟

”نہیں...... ایسا نکو کرنا تم۔“

”مگر تم تو یہ بولے کہ انہوں کے دل میں کوئی اور رہتی ہے؟“

”ہاں‘ اس کے باوجود بھی۔ تم ایسا نئیں کرنا ہاں......“

”نا غدری کے لیے شادی کروں میں؟“ رعنا کے آنسو چھلک آئے تھے۔

”بعد کو ٹھیک ہو جائے گا وہ...... سارے مرداں ایسے ہی اچ ہوتے۔ شادی سے پہلے مٹاخہ مارکو رہتے بعد کو ٹھیک ہو جاتے۔“

”میں کیا غلط کری کہ ایسا اچ میرے ساتھ ہونا تھا۔“ رعنا خاصی پریشان تھی۔

''تمہارے پاس وخت بہوت ہے ناں' اس لیے ہر بات کا دس دس مطلب سوچتے بیٹھے ہو۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟ بی اے کر کے بیاہ کے انتظار تو کرتی بیٹھی ہوں ناں......''

''یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔''

''پتا ہے ناں تم کو میری انگریزی کتنی خراب ہے۔ اپنا کائے کو مزاخ بناؤں وہاں جا کر میں۔''

''اردو میں ایم اے تو انگریزی میں نہیں ہوتا۔'' سہیلی کو بھی غصہ آ گیا۔

''مگر اردو بھی کہاں اچھی ہے میری؟''

''رعنا! اب اس وخت تم فرنچ تو نہیں بولتے بیٹھے ناں۔''

تب رعنا ہنس دی۔

''فارم لا کے دوں میں؟''

''ہاں' لا دو۔ انہوں کیا سمجھتے کہ یونیورسٹی میں پڑھ کے زیادہ خابل ہو گئے وہ۔ اب میں بھی جا کو پڑھوں گی انہوں کو پتا چلے گا کہ رعنا ایسی ویسی نہیں ہے۔''

''رعنا' تعلیم یافتہ لڑکی کی ویلیو الگ دکھتی ہے۔ میاں بھی گالیاں نکالنے سے پہلے دو منٹ سوچتا ہے۔''

''ایسا ہی اچ مت بولو...... یہ سوب خسمت کی باتاں ہیں'' رعنا نے سوچ کر کہا۔ ''جاہل جاہل لڑکیاں عیش کرتی نظر آتیں اور پڑھی لکھی لڑکیاں ایسا ایسا وخت گزارتیں کہ اللہ معافی دے۔''

''تمہارے لبو کو یہ سن کر حیرانی تو ہو گی ناں کہ رعنا اب یونیورسٹی جا کے پڑھتی'' سہیلی نے اس سے کہا۔

''ہاں' حیران تو وہ ضرور ہو گا' مگر پریشان اس سے زیادہ ہو گا۔''

''اللہ...... وہ کیوں؟''

''سوچے گا' مجھ جیسی خابل بننے کو بیٹھی ہے یہ رعنا!'' اب رعنا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

☆☆☆

''اچھا......؟''

''واقعی۔''

''بہت خوب!''

منور کھانا کھاتے ہوئے ماں کی باتوں کا جواب بھی دے رہا تھا۔ صابرہ کی یہ ہمیشہ کی عادت تھی کہ جب وہ کھانا کھاتا تو وہ اس کے پاس بیٹھی رہتیں اور سارے دن کی روداد اسے سناتیں۔

''آج کام تن پھر چھٹی کر لیے۔ میرے کو تو ایسا ہی اچ لگتا ہے کہ مفت کی تنخواہ لے کے بیٹھتے وہ......''

''سفید گیٹ والی کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔ سارے محلے والے جو یہ سمجھ کو بیٹھے تھے کہ وہ شادی نہیں کرے گا' اب وہ بڑھاپے میں شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔''

''میٹرک کے رزلٹ میں بغل میں رہنے والا ناصر اے ون گریڈ میں پاس ہو گیا ہے۔ اس کی اماں مٹھا لے کو آئے تھے آج۔''

منور ماں کی باتوں کا جواب مسکرا کر اچھا' واقعی اور بہت خوب میں دے رہا تھا۔

''ارے اصل بات تو میں بتانا ہی بھول کے بیٹھی ہوں'' صابرہ ماتھے پر ہاتھ مار کر مسکرائی۔

''کون سی بات......؟'' منور نے ماں کو دلچسپی سے دیکھا۔ ان کے چہرے مہرے سے اندازہ ہو رہا تھا

آخری بات سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

''اپنی رعنا نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ اب وہ روز یونیورسٹی پڑھنے کو جاتی'' ان کے لہجے میں زعم اور غرور لشکارے مار رہا تھا۔

''امی! آپ نے غلط سنا ہو گا۔ اس نے تعلیم بالغاں میں داخلہ لیا ہو گا۔''

''ایسا کائے کو بولتے تم......؟ وہ بی اے تو کالج سے کری تھی ناں؟'' صابرہ کا موڈ یکدم آف سا ہو گیا۔ منور کا تمسخرانہ سا لہجہ انہیں ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔

''یہ رعنا کو ایکدم یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ جس طرح رو رو کے بی اے کیا تھا' مجھے معلوم ہے دو سال کا بی اے چار سال میں کیا تھا محترمہ نے۔''

''وخت گزارنے کے لیے داخلہ لی وہ'' صابرہ نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے پوچھا نہیں کہ ایم اے کتنے برسوں میں ہو گا؟''

''جب تم شادی کرو گے' وہ چھوڑ دے گی۔ ڈگری لینے کے واسطے تھوڑی داخلہ لی وہ۔''

''حد ہو گئی ہے......لوگ ڈگری کے لیے پڑھتے ہیں اور وہ وقت گزاری کے لیے پڑھ رہی ہیں۔''

''منور! اس کی کوئی بات بھی تم کو اچھی نہیں لگتی' کیا ہو گیا ہے تم کو؟''

''کچھ نہیں امی! بس آج کل مصروف زیادہ ہوں۔ پرسوں کمپنی کی طرف سے ملائشیا بھی جانا ہے۔ دس دن کا پروگرام ہے۔ آپ میرا سوٹ کیس تیار کروا دیجیے گا۔''

''اچھا' ملائشیا جانے کا ہے تیرا' پھر میرا ایک کام کرے گا؟''

''ہاں...... کیوں نہیں' آپ حکم دیجیے۔''

''رعنا کے واسطے دو چار اچھی سی بنارسی ساڑیاں لے کو آنا تم' بری میں رکھنے کے کام آ جائیں گی۔''

''سوری امی! لیڈیز کپڑے مجھے کہاں لینے آتے ہیں'' منور نے اٹھتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔

☆☆☆

شائستہ بیگم کی طبیعت کی خرابی کی وجہ موسم کے بدلتے ہوئے اثرات تھے یا ان کا ڈیپریشن......ان سے بستر سے اٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ شوگر اور کولیسٹرول کے ٹیسٹ حسب سابق ہی آئے تھے۔

انہیں نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے ہاتھ پیر ساکت سے ہو رہے ہوں۔ وہ اپنی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے کی عادی تھیں اور اب وہ بمشکل بستر پر لیٹے لیٹے ادا نہیں کر پا رہی تھیں۔

سائرہ ہر ویک اینڈ پر ان سے ملنے کے لیے آتی تھی مگر ماں کی طبیعت خرابی کا سن کر وہ پورے ہفتے ان کے پاس رہ گئی۔ شاہنواز اور دلنواز ماں کی پٹی نہیں چھوڑ رہے تھے مگر ان کی بے چینی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

صابرہ باقاعدگی سے ساس کے پیروں میں تیل نیم گرم کر کے مالش کر رہی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ثریا بھی ان کے سر کو دبانے کے لیے بیٹھنے لگی تھیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا' تم سب لوگ اپنے کمروں میں آرام کرو۔'' ایک شب انہوں نے دونوں بیٹوں اور بہوؤں سے کہا۔

''اکیلے میں آپ گھبرائیں گی......'' شاہنواز نے محبت بھرے لہجے میں ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''گھبرائی تو تمہیں آواز دے لوں گی۔''

"ہاں' یہ ٹھیک ہے' برابر تو ہمارا کمرا ہے۔" ثریا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"بھابی کے تو سر پہ کھڑا ہو کے آوازاں دے دو' پر انہوں کی انکھاں نئیں کھل سکتیں' صابرہ نے ان کے جانے کے بعد مسکرا کر کہا۔

"صابرہ! تم بھی جا کر لیٹو' تم لوگوں کی بے آرامی سے مجھے بھی پریشانی ہو رہی ہے۔"

"اماں...... میں بی گھوڑاں بیچ کے سوتی ہوں ناں' اس لیے یہیں لیٹ کو جاتی مئیں۔" صابرہ نے ان کی پائنتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا' آرام سے جا کر سوؤ میں بالکل ٹھیک ہوں" شائستہ بیگم نے اپنے چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

سب کے جانے کے بعد تکیے کے نیچے سے انہوں نے اپنا پرس نکالا اور پرس میں رکھی ہوئی فریال کی تصویر اپنے لب رکھتے ہوئے بولیں "پیاری بیٹی فریال! تو کہاں ہے......؟ ایسی ناراض ہو کر گئی ہے کہ آنے کا نام نہیں لے رہی۔ دیکھ اب تو آ جا...... کہ میرا رواں رواں تجھے پکار رہا ہے۔ اتنے برسوں سے ضبط کرتے کرتے میں اب تھک چکی ہوں۔ میری شہزادی تو جلدی سے آ جا...... کہ اب تیری جدائی مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔"

تصویر کی فریال شاید ہنس رہی تھی یا انہیں ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ تب اس تصویر کو وہ اپنے سینے پر رکھ کر سسکتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "پیاری بیٹی! جلدی سے آ جا...... ایسا نہ ہو کہ...... پھر میں تجھے پکار بھی نہ سکوں اور اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاؤں۔"

ان کے آنسوؤں نے تصویر کا چہرہ بھی تر کر دیا تھا۔

دوسری جانب فریال اسپتال میں صادقہ باجی کے پاس تھی۔ ان کا ٹائی فائیڈ بگڑ گیا تھا۔ فریال ان کے پاس بیٹھی تھی مگر صادقہ باجی کا چہرہ بار بار امی کے چہرے کا روپ دھار رہا تھا۔

"اللہ" تو میرے پیاروں کو ہر جگہ سلامت رکھنا۔ پاک پروردگار! صادقہ باجی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور میری ماں بھی خیریت سے ہوں۔"

صادقہ باجی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو حیرت سے بولیں "اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں اللہ تم شام سے اسی کرسی پر بیٹھی ہو۔ جاؤ' دوسرے بیڈ پر آرام کرو۔"

"نہیں باجی! مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"اچھا سونا نہیں مگر لیٹ تو جاؤ' اس طرح بیٹھی رہیں تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔"

بستر پر آ کر لیٹی تو پھر ماں کا خیال دل پر چھا گیا۔ "پتا نہیں کیسی ہوں گی امی! کل صبح ہی ثنا کے سیل پر امی کی خیریت پوچھوں گی۔" اپنے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر شائستہ بیگم بستر سے اتر کر کھڑکی کھول کر دیوار کے سہارے کھڑی تھیں اور تیز ہوا کو یوں سندیسہ دے رہی تھیں۔

اے ہوا!
اس سے کہنا
سانسیں تو منتظر اب بھی ہیں
لب اسے پکارتے اب بھی ہیں
آنسو اس نام پہ بہتے اب بھی ہیں

اے ہوا!
اس سے کہنا
وہ محبت جو زمانے سے چھپائی نہ گئی
یہ اور بات کہ اسے بتلائی نہ گئی
وہ عشق کی منزلیں قائم اب بھی ہیں

اے ہوا!
اس سے کہنا
اس کے وجود سے ہیں دستیاب گہر سمندروں کے
اس پیکر حسن کے دم سے سب ہی رنگ زیست کے
فضائیں اس سے مانوس اب بھی ہیں

اے ہوا!
اس سے کہنا
عشق سے وفا تک کے سب ہی سلسلے
جو ہم دونوں کی چاہتوں میں رہے
وہ سلسلے ممکنات میں اب بھی ہیں

اے ہوا!
اسے کہنا
میں جانتی ہوں وہ جو گزرا کل ہے میرا
میں مانتی ہوں وہ آنے والا کل نہیں میرا
مگر......!

اے ہوا!
اسے کہنا
میں اور میرا یہ دل
اس کی دسترس میں اب بھی ہیں

(شاعرہ۔ دعا احمد)

نرس کمرے میں داخل ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران بلکہ بہت زیادہ پریشان سی ہو گئی کہ صادقہ باجی تو گہری نیند سو رہی تھیں مگر فریال بستر سے نیچے گری بے ہوش پڑی تھی۔

وہ جب ہوش میں آئی تو اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ کب وہ بستر سے گری اور کب بے ہوش ہوئی تھی۔

اسے یاد تھا تو بس یہی کہ وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی کھڑی تھی اور وہ اسے بے اختیار پیار کیے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

صادقہ باجی کی طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ ایک دو روز کے بعد ان کی چھٹی ہو جائے گی۔ فریال مستقل ان کے پاس ہی تھی۔ وہ اس سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ ان کے پاس میڈ کو چھوڑ کر وہ

گھر پر آرام کرے مگر فریال انہیں تنہا چھوڑنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھی۔

ایک شام جب صادقہ باجی کی وکیل ان کے پاس آئیں تو فریال نے یہی سوچا کہ وہ بھی صادقہ باجی کی عیادت کے لیے آئی ہیں مگر جب کسی کاغذ پر صادقہ باجی کو دستخط کرتے دیکھا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

''میری ساری جائیداد اور روپے پیسے کی تم حقدار ہو۔ میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی۔''

''صادقہ باجی' آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ساری زندگی آپ نے محنت کی ہے' آپ یہ سب میرے نام کیوں کر رہی ہیں۔ میں نے کیا' کیا ہے آپ کے لیے' کچھ بھی نہیں۔ میری زندگی کو سہارا بھی آپ نے ہی دیا ہے۔''

''فریال! تم میری بیٹی نہ سہی مگر بیٹی جیسی تو ہو' تمہارے تو ماشاء اللہ بہت سے لوگ اس دنیا میں ہیں مگر میرا تو تمہارے سوا کوئی بھی نہیں ہے اور جب مائیں اپنی اولاد کو کچھ دیا کرتی ہیں تو یہ احسان نہیں ہوتا ہے' یہ ان کی اپنی خوشی ہوتی ہے' ان کی اپنی آسودگی ہوتی ہے...... اور یقیناً تم ایسا ہرگز نہیں چاہو گی کہ تم مجھے ایسی خوشی سے دور رکھو۔''

تب فریال گنگ سی ہو گئی۔ اور یہ سوچنے لگی کہ جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آئیں گی تو میں انہیں مجبور کروں گی کہ اپنی جائیداد اپنے ہی نام رکھیں مگر یہ نوبت تو اس وقت آتی جب صادقہ باجی ٹھیک ہو کر اپنے گھر جاتیں۔ اسی شب ان پر دل کا دورہ ایسا پڑا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔

فریال پر تو جیسے چھت گر پڑی۔ اس کے دکھوں' پریشانیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

ثنا کے ساتھ مسز رحمن بھی اس کے اپارٹمنٹ میں تعزیت کے لیے آئی تھیں۔ ثنا نے پہلی مرتبہ اپنی پھوپو کے فلیٹ پر قدم رکھا تھا۔ وہ تو ان کا گھر دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ وہ فلیٹ کہاں لگتا تھا' چار بیڈ رومز' وسیع و عریض ڈرائنگ روم اور لاؤنج' دو سرونٹ کوارٹرز پر مشتمل تھا جو خوب سجا ہوا تھا۔ کون سی آسائش کی چیز ایسی تھی جو اس میں نہ ہو۔

گھر کے کام کاج کے لیے میڈ موجود تھی۔ ڈرائیور اور گن مین ہمہ وقت دروازے پر موجود تھے۔

''پھپو! آپ تو بہت اچھے گھر میں رہتی ہیں۔ مسز رحمن کو ادھر ادھر دیکھ کر ثنا نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''مگر اس بہت اچھے سے گھر میں رہنے کے باوجود میں بہت دکھی ہوں۔''

''بہت کما لیا پیسا پھوپا نے' ان سے کہیں کہ اب وہ آ جائیں'' ثنا نے لاڈ سے فریال کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب وہ میری زندگی میں نہیں رہے'' فریال نے آہستگی سے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' ثنا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''ہاں' یہ بہت پرانی بات ہے...... مگر میں تمہیں بتا نہیں پا رہی تھی۔''

تب ثنا ڈبڈبائی نظروں سے فریال کو دیکھتی رہ گئی۔

''چلو ثنا! گھر چلو' بہت دیر ہو گئی ہے۔'' مسز رحمن نے گھر کا راؤنڈ لگا کر ثنا سے کہا۔

ثنا کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی پھپھو سے خوب دل بھر کر باتیں کرے مگر وہ اس وقت مجبور تھی۔ مسز رحمن کے کہنے پر اٹھ کھڑی ہوئی مگر چلتے سمے فریال کے کانوں میں یہ کہہ ہی دیا...... کہ آج رات کو موبائل پر آپ سے بات کروں گی۔

☆☆☆

عقل کی ساری منطق' مزاحمت اور ناراضی پر دل کی ایک ضد غالب آ گئی تھی اور شجاع نے ماں اور بہن سے بات کرنی بند کر دی تھی۔

عظمت بیگم کچھ ہی کہہ دیتیں' وہ ہوں ہاں کر کے گھر سے باہر نکل جاتا اور جب گھر میں داخل ہوتا تو سب

لگ سو چکے ہوتے۔ فرحت نے دبے دبے انداز میں اس سے معافی تلافی بھی کرنی چاہی تھی مگر ان دنوں کچھ ایسا رٹھا سا ہو رہا تھا کہ کسی کی کوئی بات اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اس طرزِ عمل سے ماں کو دلی دکھ پہنچ رہا ہے مگر اس کی ضدی طبیعت نے اسے یوں اکھڑ سا بنایا ہوا تھا۔

ایک شام جب وہ گھر میں داخل ہوا تو عظمت بیگم نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری بیوی بچے دوپہر سے آئے ہوئے ہیں اسی لیے آج رات کے بجائے شام کو گھر آ گئے ہو۔'' وہ تیزی سے اپنے کمرے میں گیا تو ارحم اس کو دیکھتے ہی لپٹ گیا۔

ننھی سی گڑیا کمرے کے کارپٹ پر ادھر سے ادھر کرولنگ کرتی پھر رہی تھی۔

''نگین! تم نے فون بھی نہیں کیا'' اس نے کہا۔

''آپ کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ آج بکنگ کارڈ لے کر گھر پر فون کیا تو پھپھو نے بتایا کہ آپ باہر جا چکے ہیں۔ شہر کے ائرپورٹ سے گاؤں تک فرحت آپا کے میاں اور ان کے بچے لے آئے تھے۔''

''تمہارے بھی سارے پروگرام ہمیشہ ایمرجنسی میں بنتے ہیں۔ دو چار روز پہلے بھی یہ اطلاع دی جا سکتی تھی۔'' شجاع کو یہ سب سن کر عجیب سی کوفت ہوئی۔

''پہلے میں امی ابو کے ساتھ ٹرین سے آ رہی تھی تو سفر کرنے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ابو کا پروگرام کینسل ہوا تو میں نے سوچا اکیلے جا کر آپ کو سرپرائز ہی دے دوں۔''

''اس قسم کے سرپرائز سے مجھے ہمیشہ وحشت ہوتی ہے۔'' شجاع نے کہا۔

''آج آپ کو گھر میں نہ پا کر مجھے بھی ہوئی'' نگین نے ہنس کر کہا۔

رات کے کھانے پر عظمت بیگم نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے کھانے سے انکار کر دیا۔ شجاع جب کھانا کھانے تخت پر بیٹھا تو نگین فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کھانا کھاؤ...... کہاں جا رہی ہو؟ دونوں بچے سو گئے ہیں۔''

''پھپھو کو بلا لوں پہلے'' اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''انہیں بھوک نہیں ہے...... وہ اکثر رات کو دودھ پی کر سو جاتی ہیں۔''

مگر نگین اس کی بات سنے بغیر عظمت بیگم کے کمرے میں بڑھ گئی۔ وہ چپ چاپ چھت کی کڑیوں کو دیکھ رہی تھیں۔

''چلیں پھپھو' کھانا کھا لیں۔''

''نہیں بیٹا! مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''میں اتنے دنوں بعد آئی ہوں' آج آپ کو میرے ساتھ کھانا پڑے گا' چاہے بھوک ہو یا نہ ہو۔''

اور وہ اس کی خاطر چلی آئیں۔ شجاع نے ایک نظر ماں کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

عظمت بیگم نے چپ چاپ ایک چپاتی کھائی اور اٹھ گئیں۔ وہ جب اپنے کمرے میں گئیں تو شجاع کی آواز نے ان کا دل دکھا سا دیا۔

''بڑھاپے میں آ کر لوگ اسی طرح خوشامدیں کروا کے خوش ہوا کرتے ہیں۔''

نگین کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی انی بن کر ان کے سینے میں کھب گئی تھی۔

☆☆☆

جس کو دیکھا نہیں اسے چاہے
دل بھی کرتا ہے فیصلے کیا کیا
جب کبھی وقت ساتھ دیتا نہیں
ٹوٹ جاتے ہیں رابطے کیا کیا

کتنی عجیب سی بات تھی کہ نیناں کا نام سن کر کچھ عرصے پہلے اس کی رگیں تن سی جایا کرتی تھیں اور منہ بھر سا جاتا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے تہس نہس کر ڈالے۔

اس میں فیروزہ کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔ ہر بیوی یہی چاہتی ہے کہ اس کی زندگی پرسکون انداز میں بسر وہ اپنے شوہر پر بادل بن کر چھائی رہے۔

مگر نیناں نے تو فیروزہ کی زندگی ہلا کر رکھ دی تھی۔ وہ اپنا دکھ کسی سے کہنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ طرف کا دیا ہوا ہر تلخ گھونٹ وہ از خود پی رہی تھی مگر اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ سیلاب کے تیز و تند ریلے نے کے آشیانے کو تباہ و برباد کرنے کے بجائے اپنا رخ خود ہی موڑ لیا تھا اور یہ سب اللہ نے کس آسانی سے کر تھا کہ اسے حیرت ہوتی تھی۔

تب فیروزہ کو یوں لگا کرتا جیسے نیناں کا ہیولا کوئی غیر فطری ہو مگر جب اس کا خیال تک دل و دماغ سے گیا اور تمام تر واہمے ختم ہو چکے۔ (عرصہ ہو چکا تھا اس کے فون کو آئے ہوئے) ایسے میں اس کا فون ریسیو کر اسے حیرت ہی ہوئی تھی۔

’’کیسی ہو فیروزہ!‘‘ نیناں بڑے شگفتہ سے لہجے میں بول رہی تھی جیسے وہ اس کی بڑی قریبی دوست رہی

’’اچھی ہوں......‘‘ فیروزہ نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

’’میں بھی بے حد خوش ہوں‘‘ اس نے ہنس کر کہا۔

’’فرید اس وقت گھر میں نہیں‘ ورنہ میں تمہاری بات کروا دیتی‘‘ فیروزہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

’’اس وقت میں نے تم سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔‘‘

’’خیریت تو ہے ناں......‘‘ (دل میں اچنبھا سا ہوا کہ تم سے میرا کب ایسا یارانہ رہا ہے کہ مجھ سے کرنے اور میری خیریت پوچھنے کے لیے تم نے فون کیا ہے)

’’فیروزہ...... جب شوہر بیوی کو اپنی جوتی سمجھنا شروع کردے تو بعض مرتبہ وہ چوٹ کھائی ناگن کا دھار لیتی ہے اور جو نظر آئے اسے ڈسنا شروع کر دیتی۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ جس طرح میرا گھر اجڑا ہے‘ میں دوسروں کے گھر اجاڑ رہی ہوں۔ ایک عجیب سی طمانیت اس کے اندر اتر آتی ہے۔ مگر یہ اس کی بھول ہو ایسے میں بھی اس کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔‘‘

’’تم کیا کہنا چاہتی ہو...... میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی ہوں......‘‘ فیروزہ کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

’’یہی کہ...... میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ میری باتوں سے میری حرکتوں سے تمہیں جو تکلیف پہنچی

نادم ہوں۔‘‘

’’اچھا‘‘ فیروزہ نے آہستگی سے کہا۔

’’ہم جیسی قماش کی عورتیں معافیاں نہیں مانگا کرتیں کیونکہ انہیں اپنا ہر اقدام درست ہی لگا کرتا ہے مگر مجھے ہر ل پر تاسف ہوا ہے جو مجھ سے انجانے میں سرزد ہوا۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... میں نے تمہیں معاف کیا کہ ان دنوں میں بھی خاصے ڈپریشن کا شکار رہی تھی۔‘‘

’’فرید احمد صرف میرے ماضی کے دوست رہے ہیں‘ حال یا مستقبل میں‘ میں ایسی دوستی کی بھی روادار نہیں فیروزہ! میں اپنے گھر میں بفضل خدا بے حد خوش ہوں۔ میرے شوہر میں خوبیوں سے زیادہ خامیاں ہیں میں اس کی خامیوں کو نظر انداز کر دیتی ہوں کہ انسان ہونے کے ناتے کوئی بھی صرف خوبیوں کا مجموعہ نہیں اور محبت کا پہلا اصول یہ ہے کہ جس سے محبت کرو اسے اس کی خامیوں سمیت پسند کرو۔ وہ میرے بچوں ب اور بہت اچھا باپ ہے۔ میرا بھی خیال رکھتا ہے گو کہ وہ محبت کا اظہار کبھی نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں‘ عمل ہی اس کے جذبوں کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ میں کسی فلمی سچویشن میں تو نہیں رہتی کہ ڈائیلاگز بھی بولے اب زندگی بڑی پرسکون گزر رہی ہے......اور......‘‘

’’مگر تم یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہی ہو......؟‘‘ فیروزہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

’’وہ اس لیے فیروزہ کہ تم بھی فرید کے ساتھ خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا سیکھو۔‘‘

’’میری زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی ہے......‘‘ وہ پھیکے سے لہجے میں بولی۔

’’فیروزہ‘ زندگی اچھی طرح گزارو‘ خوشیوں کے ساتھ بسر کرنا سیکھو...... معمولی باتوں میں سے بھی خوشیاں یا کرو کہ یہی زندگی کی کامیابی ہے کہ ہم خوش رہیں اور اپنے وجود سے دوسروں کو خوش رکھیں۔‘‘

’’مگر یہ نیناں‘ تمہاری اس محبت کا......اور اس پرخلوص ٹیلی فون کا۔ ہاں‘ کبھی میری بات تمہیں بھی ناگوار ری ہو تو معاف کر دینا۔‘‘

’’میں اب اچھی باتیں یاد رکھتی ہوں‘ بری باتیں بھول جاتی ہوں۔‘‘

’’اچھا کرتی ہو......اور اب میں بھی یہی کروں گی۔‘‘ فیروزہ نے ہنس کر کہا تب نیناں نے خدا حافظ کہہ کر بند کر دیا اور فیروزہ نے گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں طمانیت سے بند کرکے سوچا کہ بعض اندھیرے خود ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ اب نیناں کبھی فرید احمد سے رابطہ نہیں کرے گی۔

مگر یہ اندازہ بالکل بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے معذرت کرے گی اور آئندہ کبھی اس کے لیے پریشانیوں کا بھی نہیں بنے گی۔

☆☆☆

وہ دور کوئی اور تھا جب دل کا بھرم تھا
اب ملتا ہے بازار میں دوچار درہم کا

دل میں بال آجائے تو ذرا ذرا سی باتیں بھی بہت بڑی نظر آنے لگتی ہیں اور جب باہمی محبت سے دل ہوں تو بڑی سے بڑی بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔

بچوں کی باتوں میں بڑے تو کبھی بولتے ہی نہیں ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد ہی یہ مل بیٹھیں گے۔

بچوں میں جہاں بہت سی اور خوبیاں ہوتی ہیں' وہاں بھول جانے کا وصف ایسا ہوتا ہے کہ وہ کبھی کسی یاد نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے کبھی اہمیت دیتے ہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں تھی کہ نگین کو فرحت کے بچوں قسم کا بیر تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے بچوں کو پیار کرنے والی تھی اور فرحت آپا کے بچے تو اسے ہمیشہ ہی اچھے لگا کرتے تھے۔ فرحت آپا کے بچوں کی پسند کی ڈشز بنا کر اسے ہمیشہ خوشی ہوا کرتی تھی۔

اور ایسی ہی محبت فرحت کے دل میں اپنے بھتیجے کے لیے بھی تھی۔ آج تک نہ اس نے کبھی ارحم کو ڈانٹا نہ ہی بچوں کے حوالے سے کبھی نرم گرم بات نگین سے ہوئی تھی۔

نگین تو ایسی محبت کرنے والی تھی کہ بچے تو کیا' کسی بھی معاملے میں اس کی پھپھو یا فرحت آپا سے تو تو میں نہیں ہوتی تھی' حالانکہ حکیم جی کی بیوی کو اس بات کا خاصا ارمان تھا کہ نگین ان کی بہو کا ریکارڈ توڑ ڈا نگین نے یہ سیکھا ہی نہیں تھا کہ اپنے بڑوں سے منہ ماری کرے۔ لڑائی جھگڑا کرنے والی خواتین کو دیکھ کر سخت وحشت سی ہوا کرتی تھی۔

مگر آج ذرا سی بات اتنی بڑی ہوتی چلی گئی کہ ایک لمحے کے لیے وہ بھی حیران سی رہ گئی۔ فرحت آ رویے پر اسے خاصا دکھ ہو رہا تھا۔ بات انتہائی معمولی تھی مگر تھوڑی دیر بعد خاصی بڑی بن گئی تھی۔

فرحت کا بیٹا ارحم کی سائیکل پر بیٹھا تو وہ ٹوٹ گئی۔ نگین نے بچے سے صرف یہی کہا تھا کہ تم اتنے بڑ چھوٹے بچے کی سائیکل پر بیٹھو گے تو اس نے ٹوٹنا ہی تھا۔

''اب دیکھو' صرف تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ارحم کتنا رو رہا ہے۔ گاؤں میں اس سائیکل کو ٹھیک کرانا محال ہوگا۔ کراچی میں ہوتی تو پانچ منٹ میں ٹھیک کروا لیتی۔''

بچے نے گھر جا کر ماں سے نہ جانے کیا کچھ کہا کہ فرحت اس کی ہر بات پر یقین کر کے تنتناتی ہوئی گھر داخل ہوئی اور ہزار کے دو نوٹ نگین کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ بونی سی سائیکل دو ہزار سے زیادہ کی کیا ہوگی جو تم نے اس سے زیادہ میرے بچے کو باتیں سنا دیں۔ تمہارے ابا نے بچے کو سائیکل دی ہے تو وہیں رکھتے' گاؤں میں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور تم کیا چاہتی میرے بچے نانی کے گھر میں غیروں کی طرح آئیں؟''

''فرحت آپا...... میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا' آپ امی سے پوچھ لیں۔''

''بچے کو ڈانٹتے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا تھا' مگر تم شہر والوں کا یہ طریقہ بڑا ہی اوکھا ہے کہ سب کا ڈالو اور پھر جھوٹ بولتے ہو کہ ہم نے کچھ کہا ہی نہیں ہے۔ یہ کون سی ادا ہے کہ سب کچھ کہنے کے بعد مکر بھی جا

شجاع اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ننھے ارحم کی پیشانی پر گرنے کے باعث بھی لگی تھی۔ وہ بچے کو گود میں لے کر کھانے کے دسترخوان پر بیٹھا تھا۔

ابھی ایک نوالہ بھی اس کے منہ میں نہیں گیا تھا کہ اس کے سامنے شکوے شکایتوں کے دفتر کھل گئے ہوئی سائیکل اس کے سامنے پڑی تھی' جس کو دیکھ کر ارحم بار بار اس کی توجہ دلا رہا تھا۔

''بھائی نے توڑی...... بھائی نے توڑی......'' اس کی گردان کسی صورت رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

شجاع کے چہرے کو غصے سے لال بھبوکا دیکھ کر نگین نے اسے پانی کا گلاس دیا اور فرحت سے محبت لہجے میں کہا۔

''آپا! بچوں کی باتوں کو چھوڑیں...... آئیں' کھانا کھائیں۔ دیکھیے آج میں نے چکن نئے اسٹائل میں

اس کا مزہ بالکل نیا نیا سا لگے گا۔''

یہ نئے نئے وار تم ہی اپناتی رہا کرو۔ میں تو اپنے گھر سے کھا کر آئی ہوں۔ اللہ قائم رکھے میری ماں کو نئی پکاتی ہے' پہلے مجھے بھیجتی ہے' پھر اس کے حلق سے اترتا ہے۔''

نے پانی کا گلاس بمشکل حلق سے اتارا اور پلیٹ پیچھے کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

''والوں کا تو کیا' اب سدا سے گاؤں میں رہنے والوں کا دل گاؤں میں نہیں لگتا ہے اور سچ پوچھیں تو اب ہی دل چاہتا ہے کہ کراچی جاؤں اور سکون سے وہیں رہوں۔ یہاں تو سوائے ذہنی تناؤ کے کچھ نہیں رہ پتا نہیں کون لوگ ہوتے ہیں جو کنوئیں کے مینڈک بن کے سدا ایک ہی جگہ گزارہ کر لیتے ہیں۔ پتا نہیں ان میں صبر کا مادہ کہاں سے آ جاتا ہے۔'' عظمت بیگم نے چونک کر شجاع کو دیکھا۔

ریں جھکائے بظاہر لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ فرحت کی کسی بھی بات کا اس نے براہ راست کوئی جواب بھی ا تھا۔

اینٹھی سی سامنے کھڑی تھی۔ اس کا غصہ بھی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر وہ اپنی باتوں سے اور اپنی لاتعلقی سے جو اشارہ ماں کو دے رہا تھا' وہ ماں نے وصول کر لیا تھا...... لیکن وہ اس اشارے مجھنے کی بھی صلاحیت رکھتی تھیں کیونکہ وہ اس کی ماں تھیں۔ وہ ایک لمحے میں ہی جان گئی تھیں کہ شجاع جو وہ اس کے مستقبل قریب کے عزائم ہیں۔ وہ جو شروع دن سے یہ کہتی چلی آ رہی تھیں کہ نگین اسے لے چلی جائے گی' وہ وقت شاید اب آن پہنچا تھا۔

م جی کی بیوی نے ان کی باتوں کو سن کر ان کا وہم قرار دیا تھا اور وہ کسی صورت یہ یقین کرنے پر تیار نہیں ان کا اکلوتا بیٹا انہیں گاؤں میں چھوڑ کر کراچی چلا جائے گا۔

دیر تو وہ خاموش سی رہیں...... مگر پھر اپنی ہمتوں کو یکجا کر کے انہوں نے شجاع سے پوچھا ''تو پتر...... جانے کا کب تک ارادہ ہے؟''

''ہم لوگ کل کراچی جا رہے ہیں؟'' شجاع نے کھردرے سے لہجے میں کہا اور روتے ہوئے ارحم کو گود میں باہر نکل گیا اور نگین کے ہاتھ کا نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

کیا کہہ گیا تھا...... کہ ہم کراچی جا رہے ہیں؟ ابھی تو اس کا کراچی سے آیا ہوا سامان بھی پوری طرح اس نے جانے کا پروگرام اسے بتائے بغیر بنا بھی لیا تھا۔

اس نے نہیں چاہا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ پھپھو تو یہی سوچیں گی سارا پروگرام میں نے اللہ ان کا غصہ کم کر دے۔ غصے میں آ کر تو یہ کچھ بھی نہیں دیکھتے اور نہ بولتے ہوئے کچھ سوچتے ہیں۔

اسی وقت اپنے بچوں کو لے کر گھر چلی گئی تھی جبکہ اگلے دن اسکول کی چھٹی بھی تھی۔

نے چادر سر سے پیر تک تان لی تھی اور یہ ان کا واضح اعلان تھا کہ وہ سو رہی ہیں' ان کو کوئی نہ جگائے۔ گھر کوئی مزاحیہ پروگرام چل رہا تھا مگر نگین اور شجاع دونوں کے چہروں پر ہنسی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

ٹی وی بند کر دوں؟'' نگین نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے ایسا چونک کر ہنکارا بھرا جیسے وہ تنہا سا بیٹھا ہو۔

نے شجاع کی شکل اور اس کے اکتائے ہوئے لہجے کی آنچ سے ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اس کے فیصلے ٹوٹے ہوئے دل کو فوقیت حاصل تھی۔

رات کو جب وہ کمرے میں آیا تو اس نے محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہا
لیے آئی ہوں کہ تمہارے ساتھ، اماں کے ساتھ مل کر رہوں اگر مجھے کراچی رہنا ہوتا تو یہاں کیوں آتی، تم
دیتی کہ تم آجاؤ۔“

”اسی وجہ سے تو میں کراچی جانا چاہتا ہوں کہ وہاں تم بھی خوش رہو، میں بھی خوش رہوں اور یہاں کے
بھی رہیں۔ تم یہ بات بالکل بھی نہیں جانتی ہو کہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟“

”شجاع، تم غلط سوچ رہے ہو، تمہارے کراچی جانے سے اماں بھی خوش نہیں ہوں گی اور نہ ہی فرح
یہ سب اچھا لگے گا اور میں یہاں کسی کو تکلیف دینے تو نہیں آئی ہوں۔“

”یہ بات تم کہتی ہو مگر وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ انہیں تو سدا ہی تم سے شکایت رہی ہے۔“ وہ الجھ کر بولا
پھڈے کا ذمے دار صرف تمہاری ذات کو ٹھہراتی رہی ہیں۔“

”شجاع، میں انسان ہوں، ہوسکتا ہے مجھ سے بھی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہوں۔ میں نے جانے انجانے
لوگوں کا دل دکھایا ہو۔ وہ لوگ میرے معاملے میں حق بہ جانب ہو سکتے ہیں۔“

”مگر میں نہیں مانتا، وہ ہمیشہ تمہاری شخصیت کو گراتی رہی ہیں اور خاص طور پر فرحت کو تم سے خدا وا
ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہی امی کو سکھاتی پڑھاتی ہے اور اس کی باتوں کی وجہ سے میری ماں مجھ سے کھ
رہنے لگی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ الگ رہیں، الگ گھر میں، الگ شہر میں۔ جب ہم دور رہ
تب ہی ان کے دل میں ہماری محبت جاگ سکتی ہے۔ ساتھ رہنے میں تو ہر وقت کی تو تو، میں میں ہے اور م
گھوم جاتا ہے ان اوندھی سیدھی باتوں کو دیکھ کر۔ میں غلط بات برداشت ہی نہیں کرسکتا۔“

”اتنے دنوں بعد میں یہاں آئی ہوں، سب یہی کہیں گے کہ آتے ہی سکھا پڑھا کر میاں کو اپنے
گئی......“ نگین نے اس کے گلے میں اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

”اس میں تمہارا ذکر کہاں سے آ گیا، کراچی جانے کا فیصلہ سو فیصد میرا ہے“ وہ ہنوز اکھڑے لہجے م
کر رہا تھا۔

”اچھا، اس بار اپنا فیصلہ بدل دو۔ آئندہ کبھی کوئی ایسی صورت ہوئی جو ہم دونوں کو ہی ناگوار لگی
جانے کا بھی سوچ لیں گے۔“

”تمہیں تو یہاں بہت مزہ آتا ہے، جب ہی تو دونوں بچوں کو لے کر اکیلی ہی چلی آئیں۔“

”جہاں اپنا شوہر ہوگا، وہ جگہ بیوی کو اچھی ہی لگنی چاہیے۔“ اس نے مسکرا کر اسے یخ گلاس پانی
ہوئے کہا۔

شجاع نے پانی پیا تو غصے کی گرمی کچھ کم ہوئی اور وہ دھیمے لہجے میں بولا ”ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو کرا
کینسل کر دیتے ہیں مگر تم اماں سے کہہ دینا کہ آئندہ فرحت مجھ سے منہ ماری نہ کرے۔“

”سب سے کہہ دوں گی، آپ کہیں گے تو مسجد میں بھی اعلان کروا دوں گی مگر اب آپ اپنا غصہ ختم
بری بات ہے، آپ کی باتیں سن کر بے چاری پھپھو اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ مائیں بچوں کو
پالتی ہیں کہ جب وہ جوان ہوں تو انہیں خون کے آنسو رلائیں۔“

”ایسے لیکچر مجھے دیتی ہو تو امی کو کیوں نہیں دیتیں تاکہ ان کے دل میں تمہارے لیے محبت کا کوئی کونا

”پھپھو مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں، یہ ان کی ہی تو پسند تھی جو میں شادی ہو کر یہاں آئی ورنہ آپ

ر بھی نہیں دیکھا تھا۔“ نگین نے ہنس کر کہا۔

”نہیں نہیں دیکھا تو پھر کس کو دیکھا تھا......“ بے ساختہ شجاع کے منہ سے نکلا۔

”رح کو دیکھتے تھے اور بس......“ نگین کے منہ سے بھی یہ جملہ یوں نکلا جیسے بندوق سے گولی۔ بات کہہ کر
ادم سی بھی ہو گئی تھی۔

اع تو حیرت سے نگین کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس سے پوچھ رہا ہو کہ جب تمہیں میرے اور فرح کے پیار
ے میں سب کچھ پتا تھا تو تم نے مجھ سے شادی کرنے کی ہامی کیوں بھری؟

ین اس کی آنکھوں کا یہ سوال پڑھنے کے بعد نظریں جھکائے، چپ چاپ بیٹھ گئی کہ اس سوال کا جواب تو
ے پاس بھی نہ تھا اور وہ اپنے ماضی کی اپنی کوئی بات اپنے شوہر کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ جانتی تھی شجاع
ہروں میں سے ہی ہے جو اپنی بیوی کی کوئی کوتاہی، کوئی غلطی معاف کرنا جانتے نہیں ہیں، چاہے ان کی
زندگی ان کوتاہیوں کے سنگ بسر ہوئی ہو۔

☆☆☆

قرار راحت جاں بھی وہی ہے کیا کیجیے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

رسٹی میں ایڈمیشن لینے سے رعنا کا دل واقعی بہل گیا تھا۔ نئی سہیلیوں کا ساتھ بھی اسے اچھا لگا تھا اور
یں بھی کوئی خاص بوریت نہیں ہو رہی تھی۔ مطالعہ کرنے کا اسے کبھی شوق نہیں رہا تھا مگر اس کے گروپ کی
لڑکیوں کو افسانے اور ناول پڑھنے کا کریز تھا۔ وہ لائبریری سے روزانہ دو دو کتابیں ایشو کرواتیں اور
ن وہ پڑھ کر دوسری لے جاتیں۔

”اللہ جی...... اتنی جلدی کیسے پڑھ کے بیٹھ گئے تم لوگاں......؟“ وہ حیرت سے پوچھتی۔

”ب پڑھنے کا تمہیں شوق ہوگا تو تم بھی ہماری طرح پڑھا کرو گی“ سہیلیاں اس سے ہنس کر کہتیں۔

”می بولتے کہ کہانیاں، ناولیں پڑھ کو لڑکیاں گمراہ ہو جاتے......“ وہ بقراطی لہجے میں کہتی۔

”آج کل جو نہ پڑھے، وہ بھٹک سکتا ہے۔ لاعلمی کبھی دولت نہیں رہی، پڑھنے سے ذہن کے جالے صاف
ے ہیں۔“

”مگر مجھے تو کبھی کتاباں پڑھنے کا شوخ نکو رہا“ وہ کھسیا کر ہنستے ہوئے بولی۔

”پڑھ لیا کرو، عمر تو نہیں گزر گئی...... کتابیں پڑھ کر سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے...... ایسا ہمارے ساتھ کبھی
ا کوئی کتاب پڑھی ہو اور ہمیں کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی ہو۔“

عنا نے بھی اپنی سہیلیوں کی دیکھا دیکھی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ شروع شروع میں تو بہت بور ہوئی،
عارضہ بھی لاحق ہوا مگر جب تواتر سے وہ پڑھنے لگی تو اسے مطالعہ کرنے کا نیا لطف آنے لگا۔

یونیورسٹی سے آکر کھانا کھا کر جو اپنے بستر پر لیٹتی تو اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی۔

ن تھا اور رعنا کئی گھنٹوں سے کتاب میں منہ دیے لیٹی تھی۔ فاخرہ نے کھانے کو کہا تو اس نے منع
ام کی چائے کا وقت آیا تب بھی رعنا کتاب پڑھنے میں محو تھی۔

”ا پڑھنے بیٹھے تم آج...... کھانے بھی نکو کھائے؟“ ماں نے دلار سے پوچھا۔

”ں بڑی اچھی کہانی پڑھ رہی میں۔“

''میرے کوبھی سنادوناں'' فاخرہ نے دلچسپی سے کہا۔

''آپ کے سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

''چلو تھوڑا سا سنادیو۔''

تب رعنا نے کھنکھار کر پڑھنا شروع کیا۔

بڑی پاشا کا غصہ اپنے شباب پر تھا۔

''اجاڑ انے دیوان صاحب' اتا سا کام اب تک کر کو نکو دیے۔ کتے دفعے بول بول کے بھیج دی کاناں جیسے نکو ہیں۔ کیا پورے محلے پرے میں ایک بھی پیٹ والی سیدانی نکو مل رئی ہوئیں گی؟''

مغلانی بی بادام' کشمش' منقہ' چھوہارے' میووں اور زعفران کے ڈھیر میں بیٹھی تھیں۔ وہیں سے اوںچا کر کے بولیں۔

''اوئی پاشا' اتا گھابرے بھی نکو ہوا بھی دلہن پاشا کی زچگی کے خود دس پندرہ دن پڑے ہیں' ملیچ جا
''گلی گلی سیدانیاں پڑے ہیں۔ ایک چھوڑ دس مل جائیں گے۔''

''تم بھی کیا باتاں کرتے ماں...... ایک چھوڑ دس مل رئے۔ میں بولتیوں ایکچ مل جائے سو غنیمت بھی دیر سے ملی تو ناخ بے چاری دولہن کو تکلیف۔''

مغلانی بوانے ذرا گڑبڑا کر بڑی پاشا کو دیکھا ''ہو پاشا' نو مہینے پیٹ میں رکھے سو تکلیف نکو ہوئی دودھ پلا لینے سے کائے کی تکلیف ہو جائیں گی۔''

''ماں پھر ماں ہوتی اچ ہے۔ ہور پاشا کوئی میرے سے پوچھے تو میں یہی اچ بولوں کی سب سے اپنی ماں کا۔''

بڑی پاشا نے ذرا تیور بدل کر انہیں دیکھا۔ ''لیو اور سنو......''

''ہوتے اتا نہیں معلوم دولہن کو سولھواں بھر کو ابھی اچ ستر ہواں لگا۔ اتی سی جان' دھان پان بچے کو دودھ پلائیں گی؟ اول اچ تو کیسی زرد زعفران ہو کو رہ گئی' اس دن تمے سنے نکو بڑے سرکار بھجائے تمے' انے دیکھ کو کیا بولی......

''بہوت کم طاخت ہے۔'' مغلانی بوا کشمش تنکے کے چنتی چنتی اسی بے نیازی سے کہے گئیں۔

''دوئی پاشا' یہ ڈھونگ دھتورے سوب موئے ڈاکٹران پھیلائے سو ہیں۔ نکو تو کدو کی بیل کو پھل بھاری نکو جاتا' یہ تو انسان اچ ہے۔''

بڑی پاشا نے گھور کر مغلانی بوا کو دیکھا۔ ان کی بزرگی اور سفید سر آڑے آ جاتا تھا...... ورنہ ایسا ان کا جی چاہتا' بڑھیا کا چونڈا پکڑ کر ڈیوڑھی سے نکال باہر کریں۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی' جب سے وہ بیاہ کر اس ڈیوڑھی میں آئی تھیں' تب سے ہی زنان خا بات میں مغلانی بوا کا سکہ چلتا تھا۔

رعنا نے کتاب بند کی اور ماں سے کہا۔ ''میری ہونے والی سسرال میں تو منور کی تائی ثریا کا دو چلتے ناں......''

''یہ تم کس طرح کی کتابیں پڑھتے بیٹھے...... ابی تمہاری شادی ہوئی نہیں...... اور تم اتنی دور دور کیسے سمجھ کو بیٹھتے؟''

''امی...... ابی کنواری اور شادی شدہ عورتوں کے لیے کتاباں الگ الگ تو نہیں چھپتی۔''

''پھر بھی خیال رکھو کروناں بیٹا...... ایسے ایسے مشکل باتاں والی کتابیں پڑھو گی تو دماغ کی ساری تازگی کہیں یف لے کو جائے گی۔''

''امی! اس کہانی میں تو ایسا کچھ نکو ہے۔ بس پڑھ کو یہ ہی پتا لگتا کہ مالک لاکھ کا نہ چاکر خاک کا۔''

''یہ سوب تو پرانی باتاں ہیں...... جب پیسے والے گھرانوں میں بچوں کو اپنا دودھ پلانا فیشن میں نہیں تھا' ے آ گا ہی بڑھ کے پچھلی' امیر غریب سوب اپنے بچوں کو اپنا دودھ پلائے بیٹھتے اور سب سے ضروری بات ماں کا دودھ ضروری نہ ہوتا تو اللہ میاں عورت کے سینے میں دودھ اتارتاچ کیوں؟'' فاخرہ نے کتاب بند ریک پر رکھتے ہوئے کہا۔

اور ماں کی بات سن کر رعنا مسکرا دی۔

''چلو' جلدی سے اچھی سی تیار ہو جاؤ۔ تمہاری خالہ صابرہ کی طرف چلنے کا جی ہے میرا...... آج اتوار نور بھی گھر میں ہوئیں گا۔ کتے سارے دناں ہو گئے' میں اس کو دیکھی اچ نکو۔''

''امی! آپ جا کے آؤ...... میرا دل اچ نکو جانے کو چاہتا خالہ کے گھر۔''

''کیسا بول رئی تم......؟'' فاخرہ نے بیٹی کو حیرت سے دیکھا۔

''ٹھیک کہہ رہی میں' وحشت ہوتی میرے کو وہاں جا کو۔''

''دماغ تو نکو خراب ہو گیا تیرا؟''

''میرا دل وہاں جا کو مر سا جاتا ہے۔'' وہ پھیکے سے لہجے میں بولی اور فاخرہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا پ سی گئیں۔

''نور تیرے کو اچھا نکو لگتا کیا......؟'' اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''انہوں کو میں اچھی نہیں لگتی'' وہ یاس بھرے لہجے میں بولی۔

''پاگل نکو تو......'' فاخرہ ایک دم ہنس پڑی۔ ''بے وقوف نے لے کو ڈرا ہی دیے تمے۔ منور تو تیرا عاشق ہے کاں ہے؟'' فاخرہ نے اس کی ٹھوڑی اوپر کر کے محبت بھرے لہجے میں سمجھایا تو اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ اپنی ماں سے پوچھے کہ وہ کیا خصور کری تھی کہ جس کی سزا میں منور کا انتخاب انہوں نے کیے تمے۔ ''کوئی ایسا نا ہے کسی کا...... جو جب بھی باتاں کرے...... انگارہ منہ اچ رکھ کو کرے' اپنی منگیتر کا مزاخ اڑا کے خوش

اس وہ چپ رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنی ماں کو اس سلسلے میں کوئی دکھ دے۔

''ٹھیک بولی ناں رعنا......؟'' ماں نے اپنا جملہ دہرا کر کہا تب اس نے نفی میں منڈی ہلاتے ہوئے ہاں

اس کا دل اس قدر رو رہا تھا کہ من کی بے کلی اس کے چہرے پر آشکارا تھی۔ آنکھیں اس کی یکدم سرخ ہونٹ دھیرے دھیرے لرز رہے تمے۔

''ے کو کیا ہوا اماں......؟'' فاخرہ نے دہل کر پوچھا۔

''ہے میرے کو بخار چڑھنے کا ہے۔'' اس نے سراسیمہ سے لہجے میں پردہ رکھا۔

☆☆☆

خواب' خواہش' واہمہ ہے زندگی

ایک بھیانک حادثہ ہے زندگی
آج تک یہ مسئلہ سلجھا نہیں
میں خفا ہوں کہ خفا ہے زندگی

بیس یا تیس سیکنڈ کی جھلک تھی جو ٹی وی کے شام کے پروگرام میں دکھائی گئی تھی۔

صادقہ باجی انتقال کر گئیں۔ انہوں نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اپنی منہ بولی بیٹی فریال کردی۔ مرحومہ راولپنڈی اسلام آباد کی ایک معروف شخصیت تھیں۔

عدیل‘ جو چوراہے پر میگزین بیچ کر گھر آیا تھا‘ ٹی وی پر یہ نیوز سن کر اچھل ہی تو گیا۔

”آپا! کچھ پیسے ملیں گے‘ واپس آ کر دو گنے کر کے دے دوں گا۔“ اس نے ملتجی لہجے میں بہن سے کہا پر سر جھکائے کپڑے سی رہی تھی۔

”کتنے چاہئیں......؟“ اس کا موڈ بھی اس وقت اچھا تھا ورنہ عدیل کے پیسے مانگنے پر وہ بے حساب سناتی تھی۔

”صرف دو ہزار دے دیں...... بس سے راولپنڈی جاؤں گا۔ ایک دوست سے مل کر دو چار دنوں آ جاؤں گا۔ کچھ پیسے میرے پاس بھی ہیں۔“ وہ اپنی پینٹ کی جیب تھپتھپا کر بولا۔

آپا نے دو ہزار دیتے ہوئے کہا ”یاد رکھنا‘ تم نے چار ہزار واپس کرنے ہیں۔“

”ٹرپ کامیاب رہا تو دو گنے سے بھی زیادہ......“ وہ ہنستا ہوا باہر نکلتا ہوا بولا۔

راولپنڈی پہنچتے ہی اس نے صادقہ باجی کے اپارٹمنٹ میں فون کر کے کہا ”مس فریال سے بات کراؤ کا کلائنٹ بول رہا ہوں۔“

فریال نے فون ریسیو کیا تو وہ بڑی لجاجت سے بولا ”پیاری فریال! تمہارے تنہارہ جانے کی خبر پڑھ کر پھر بے تاب ہو کر تمہارے شہر آ پہنچا ہوں۔ تم چاہو گی تو ہمیشہ ہم اسی شہر میں رہیں گے۔ میں کراچی تو کیا کا نام بھی نہیں لوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ عورت کبھی اپنے پہلے پیار کو نہیں بھولتی ہے۔ جب ہی تو تم آج تک ہم پھر دوبارہ نکاح کر لیں گے اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ جہاں خوشیاں ہمارے سنگ رہیں گی

فریال نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون کاٹ دیا اور میڈ کو ہدایت کر دی کہ اب کوئی نہ دیا جائے۔

عدیل سمجھا کہ وہ اس کی باتیں سن کر شاید شرما سی گئی ہے یا اس سیدھی سادی بے وقوف لڑکی کو کوئی سوجھا ہے اس لیے اس نے سوچنے کی مہلت لی ہے۔

دو دن کے بعد جب وہ اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو فریال اسی وقت بوتیک سے گھر آئی تھی۔ ا کے سامنے ایک بوسیدہ سی پتلون میں عدیل کو دیکھا‘ گردن پر سرخ رومال لپٹا ہوا تھا اور چہرے پر موجود تھا۔

فریال کو دیکھ کر ہمت سے آگے بڑھا اور کہا ”پیاری فریال! کیا تم مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“

”شٹ اپ! تمہاری ہمت کیسے ہوئی‘ میرا نام اپنے ہونٹوں پر لے کر آئے؟“

”کیسی باتیں کرتی ہو جانم! آخر میں تمہارا......“ اس نے کالر اکڑا کر اسے دیکھا‘ پتا نہیں وہ کیا کہنے

فریال نے اپنے پیچھے آنے والے گارڈ کو کہا ”سلطان! اس شخص کو غور سے دیکھ لو۔ اب یہ مجھے

اپاؤنڈ میں‘ نہ بوتیک میں اور نہ ہی آس پاس کہیں نظر آئے۔ اس شخص سے میرا کسی قسم کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر یہ پھر بھی باز نہ آئے تو ڈی ایس پی صاحب کو فون کر دینا کہ فریال باجی نے کہا ہے کہ اسے جیل میں لوادیں اور اس کی مزاج پرسی اچھی طرح کریں۔ یہ شاید مجھے ابھی تک پانچ سال پہلے والی فریال سمجھ رہا ہے۔“

گارڈ جب اسے کالر سے پکڑ کر نیچے کی طرف گھسیٹ کر چلا تو عدیل کو اندازہ ہوا کہ صادقہ باجی کے مرنے بعد وہ کوئی آسان کھیر نہیں رہی ہے جسے وہ لپ لپ کر کے کھا لیتا۔ اس کا لہجہ ایسا کڑوا اور فولادی تھا کہ وہ تو اس کا یہ روپ دیکھ کر ہی گنگ سا رہ گیا تھا۔

”کاش‘ میں آنے سے پہلے اسے فون ہی کر لیتا تو یہ سب میرے ساتھ نہ ہوتا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شیرنی مرنے کے بعد وہ چھوٹی سی ڈرپوک لڑکی (جس کی ہاں یا ناں کہنے کی عادت نہیں تھی) اس کی باتوں میں پھر آجائے گی مگر شیرنی کے ساتھ رہ کر وہ بھی ویسی ہی ہو گئی تھی اور پیسے کی طاقت نے اسے مزید مضبوط کر دیا تھا۔

راچی واپس آ کر وہ روز اسے گالیاں دیتا اور سوچتا۔

”ایک بار میرے قابو میں آجاتی تو وارے کے نیارے ہو جاتے۔ ناحق ہی اسے طلاق دی۔ اپنی زوجیت میں اتی تو ٹھوکر مار کر اس کے فلیٹ میں داخل ہو جاتا۔ مگر اماں کی باتوں میں آ کر میں نے اپنا بیڑا خود ہی غرق کر لیا۔“

”عدیل بیٹے! آج تو کیا کھائے گا؟“ اماں نے اس سے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

”زہر کھاؤں گا......“ وہ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ہمارے دل کا دروازہ کھلا ہے
چلے آؤ یہ کیسا فاصلہ ہے
تم ہی نے لے لیا ہے میرا جیون
ہمارے پاس کیا باقی بچا ہے

فہمی نے کتنی ہی بار بچی کو ممانی جان کی گود میں دینا چاہا تھا مگر وہ ہر بار بڑی بے اعتنائی سے اپنا پہلو بچا جاتی ں۔ بچی جب بڑی ہوئی تو وہ ہاتھ بڑھا کر آنے کو ہمکتی بلکہ ان کی طرف دیکھ کر گرنے سی لگتی۔

”میری نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔“

”نہیں بھئی‘ تم میرے پاس آؤ گی تو میری ساری چیزیں بکھیر دو گی۔“

”نہیں بھئی‘ اس وقت تو میں سونے کے لیے لیٹوں گی۔“

”ارے مجھے کہاں عادت ہے بچے گود میں لینے کی۔ میرے گھر میں بچے ہوتے تو ایسی عادتیں بھی ہوتیں۔“

”فہمی‘ اسے پکڑ و بھئی...... خوامخواہ میری جان کو چمٹ رہی ہے“ وہ آلکس بھرے لہجے میں کہتیں۔

فہمی نے مونا کو ان کے پاس لانا قطعی بند کر دیا تھا۔ وہ نیچے کسی کام سے آتی تو بچی اوپر کمرے میں ہی ممانی جان نے بھی اس سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ تم مونا کو لے کر نیچے کیوں نہیں آتی ہو۔

فہمی کو ایسا لگتا تھا کہ چھوٹی سی بچی سے انہوں نے بیر باندھ لیا ہو۔ لوگوں کو غیر کے بچے پر پیار آ جاتا ہے۔ یہ نوں کی اس گھر میں آئی تھی‘ ان کے سامنے چھوٹی سے بڑی ہو رہی تھی مگر انہوں نے اپنے آپ کو اس سے الگ تھلگ رکھا ہوا تھا جیسے وہ کوئی کمی کمین ہو...... یا جس کو ہاتھ لگانے سے ان کے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔

معمول کا ہی دن تھا‘ فہدا اپنے آفس اور فہمی شاید کسی کام میں محو تھی جب ہی بچی کرومنگ کرتی ہوئی گیلری

میں چلی گئی۔ ممانی جان نیچے آنگن میں بیٹھی موتیے کی کلیاں گجرے کی صورت میں سوئی سے پرو رہی تھیں اچانک ان کی نظر بچی پر پڑی۔ وہ گیلری سے نیچے کی طرف جھانک رہی تھی۔

گیلری کا ایک تختہ کمزور تھا اور بچی اسی سے لگی کھڑی تھی۔ انہیں یوں اوپر کی طرف دیکھتا پا کر وہ مزید پر ہو رہی تھی۔

"فہمی...... فہمی!" انہوں نے کئی آوازیں دیں مگر وہ شاید اسٹور میں کسی کام میں لگی تھی۔ ان کی آواز اس نے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔

ممانی جان کو یوں لگا جیسے ابھی تختہ بچی کے وزن سے نیچے گرے گا اور بچی دھڑام سے نیچے آ گرے گی۔

"فہمی...... جلدی آؤ......" وہ جتنا چیخ سکتی تھیں' چیخیں اور سر اس بری طرح چکرایا کہ بیٹھے سے وہیں تخت لڑھک گئیں۔

فہمی جب بچی کو لے کر نیچے اتری تو وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھیں۔ "بچی کہاں ہے؟" انہوں نقاہت سے پوچھا۔

"یہ رہی......" فہمی نے اس کو ان کے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

تب وہ اسے سینے سے لگا کر سسکنے لگیں۔ "اللہ نے اسے بچا لیا ورنہ آج یہ گر جاتی۔ اگر اسے کچھ ہو جا تو......" وہ بار بار اسے چومتے ہوئے رو رہی تھیں۔

"نہیں ممانی جان! یہ تو گیلری میں تھی...... اور زینے کا دروازہ بند تھا۔" فہمی نے نہ سمجھتے ہوئے ان سے کہا۔

"مگر گیلری کا تختہ تو گلا ہوا سا ہے' وہ ٹوٹ جاتا پھر......؟" وہ پھر زرد سی ہو گئیں۔

"وہ تختہ تو میں نے کئی مہینے پہلے ٹھیک کروا لیا تھا" فہمی نے کہا۔

مگر ممانی جان بچی کو مسلسل اپنے سینے سے لگائے بیٹھی رہیں۔ وہ' جو بچی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی پرائے خون سے محبت کرنے کی قائل نہیں تھیں' آج وہ اس کی خاطر آنکھوں میں آنسو بھرے بیٹھی تھیں اور سوچ رہی تھی کہ بچے خواہ کسی کے بھی ہوں' ان میں یہ مقناطیسیت ضرور ہوتی ہے کہ سب کے دل موہ لیتا ہیں اور آج مونا نے انہیں خود جیتا تھا۔

اس دن کے بعد ان کا زیادہ وقت بچی کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ اس کو ہنستے دیکھ کر وہ ہنسا کرتیں اور وہ سو تو اس کے معصوم سے چہرے کو تکا کرتیں۔ انہیں وہ ایسا کھلونا لگتی' جس سے کھیل کر ان کا دل نہیں بھرتا تھا۔ ان سے مانوس ہو گئی تھی' ان کو دیکھ کر خوب خوش ہوتی۔

"فہمی! تم مونا کو میرے پاس نیچے چھوڑ دو اور اپنے جو کام نمٹانے ہیں' نمٹا لو۔" وہ صبح ہوتے ہی فہمی کو آوازیں لگاتے ہوئے کہتیں۔ چھٹی کے دن جب فہمی اور فہد سو رہے ہوتے تو وہ اوپر آ کر کہتیں "......ار تم لوگ سوتے رہو مگر اس ننھی جان کو زبردستی تو مت سلاؤ۔"

فہد مسکرا کر بچی ماں کو پکڑا دیتا اور وہ گڑیا کلکاریاں مارتی ہوئی ان کے ساتھ چلی جاتی۔

"کیا آپ سوچ سکتے تھے کہ کبھی ممانی جان مونا سے ایسا پیار کریں گی' جیسے ان کی اپنی پوتی ہو؟"

"جب ہم نے اسے اپنی بیٹی مان لیا ہے تو وہ ان کی بھی پوتی ہی ہے اور مجھے یہ یقین تھا کہ وہ اس سے ایسا پیار کریں گی۔"

☆☆☆

فضا میں پھیل چکی ہے میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں

لچے لفنگوں کو اگر عاشقی کے پچاس اسٹائل آتے تھے تو نادر کو اس سے زیادہ آتے تھے۔

وہ مجنوں کا روپ دھارے کبھی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوتا تھا' کوٹ اپنے ہاتھ میں اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ل۔ منہ میں کبھی سگار دبا ہوتا تو کبھی سگریٹ۔

بائیک پر ہوتا تو اس انداز میں جیسے جم جاتے جاتے وہ یہاں آ رکا ہے۔ بار بار گھڑی دیکھنے کا اسٹائل جیسے ا ے کہیں جانے کی بھی بڑی جلدی ہے۔

کبھی اس کی گاڑی کے ڈیک میں غم زدہ گانے اونچی آواز میں لگے ہوتے اور وہ کھڑکی پر سر رکھے یوں پوز ے رہا ہوتا جیسے اپنی محبوبہ کے انتظار میں اس کی حالت دگرگوں سی ہو رہی ہے۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی تھی۔ وہ کسی کالج بوائے کے اسٹائل میں بیگ کندھے پر ڈالے ایسے کھڑا تھا جیسے کسی کو پک کرنے آیا ہے۔

اس کی ہر روز کی ڈریسنگ بڑی لاجواب ہوتی تھی' جسے ثنا کی سہیلیاں دیکھ کر بعد میں اس کا مذاق تک اڑایا رتی تھیں۔ شاید ہی کوئی اتنا ڈھیٹ ہو جتنا کہ نادر تھا۔ ایک دن تیز برستی بارش میں وہ چھاتا لیے کھڑا تھا۔ بارش وہ شرابور ہو گیا تھا مگر گھر جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بارش میں بھیگتی ثنا کو دیکھ کر اس کا دل اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سب دکھاوے کی باتیں چھوڑ کر ثنا کو اغوا کر کے کہیں لے جائے اور اپنے نفس ٹھنڈا کر لے مگر اس کے حسن کی ایسی دہشت تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ایک لفظ نہیں کہہ پاتا تھا۔ اس دیکھ کر اس پر نہ جانے کیوں ہیبت سی چھا جاتی تھی۔

نادر روزانہ بڑی باقاعدگی سے کالج کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا تھا مگر ثنا اس پر نظر ڈالے بغیر گزر جایا لی تھی' کسی بھی دن اس نے اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

اس کو یہی لگ رہا تھا کہ اگر وہ یونہی کھڑا رہا تو اس کی عمر بیت جائے گی مگر وہ اس کی جانب نہیں دیکھے گی۔

"دفع دور......" ایسی لڑکی سے کیا دل لگانا جو دل کی جگہ لوہا فٹ کیے ہو۔ بیلا کو اس نے جب جا کر روداد سنائی وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"بڑے کامل عاشق ہو' اتنی جلدی گھبرا گئے۔ یوں کرو کہ اب دو چار دن کے وقفے کے بعد کھڑے ہو جایا کرو ابھی مسلسل کھڑے رہنا ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے میں یونہی کھڑے کھڑے ختم ہو جاؤں گا اور وہ اپنا میڈیکل مکمل کر کے کراچی چلتی بنے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ آپ نے یہ کام مجھے سونپا ہے تو میری جانب سے ناامیدی کو ہرگز گلے نہ لگائیں۔"

"ٹھیک ہے' کل کی تو میری چھٹی۔ پرسوں اتوار ہے' پیر کو دیکھیں گے۔"

اس شام چائے پیتے ہوئے جب بیلا نے طاہر سے کہا "مجھے لگتا ہے یہ اپنی ثنا نادر بھائی میں دلچسپی لیتی ہے" طاہر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے' وہ بھلا کیوں لے گی ان میں دلچسپی؟"

"بھئی مجھے کیا پتا' آج صبح وہ ہی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اب نادر بھائی گھر میں کیوں نہیں آتے ہیں؟"

"کمال ہے بیلا تمہارا بھی۔ ہر سنگل بات کا ہوا بنا دینا بھی تمہارا ہی کام ہے۔ اس سیدھے سادے سے جملے

میں تمہیں پسندیدگی کا اندازہ کیسے ہوگیا؟''

''اس نے جس ادا سے اور جس لگاوٹ سے پوچھا تھا' اس سے مجھے شبہ سا ہوا اور نہ میری بلا سے...... وہ سے دل چاہے عشق کرے۔ راتوں کو موبائل پر رات رات بھر ہنسی ٹھٹھول وہ کسی نہ کسی سے تو کرتی ہی ہے۔ دفعہ میں نے اس کے کمرے سے آوازیں سنی ہیں۔''

''تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ وہ ہماری مہمان ہے' آئندہ چند مہینوں میں وہ اپنے فائنل ایگزام، فارغ ہو کر اپنے گھر بھی چلی جائے گی۔ تمہیں آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو ثنا کو بری لگے۔''

''اس کے ڈاکٹر بننے کا سارا کریڈٹ آپ لوگوں کو جاتا ہے' آنٹی نے اس کو اپنے گھر میں اتنی مراعات د کہ پکا پکایا کھانا' استری کیے کپڑے ملتے تھے' تو وہ کیوں نہ ڈاکٹر بنتی مگر مجھے حیرت تو ان کے والدین پر ہوتی کہ کیسے انہوں نے اپنی جوان لڑکی کو غیروں کے ہاں چھوڑ دیا؟''

''بیلا! وہ غیر نہیں ہیں' ہمارے عزیزوں جیسے ہیں۔ ان کے والد کا ابو کے ساتھ بزنس ہے۔ جس کو پنڈی ہمارے ابو اور کراچی میں شاہنواز انکل دیکھتے ہیں اور ان دونوں کی محنت کی وجہ سے وہ بزنس خوب پھیل گیا۔ ایسا سب باہمی محبت' ایمانداری اور احساس فرض کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''آپ کی ساری باتیں صحیح ہوں گی مگر ثنا کو آپ کے گھر نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔''

''کیا تم کوئی دوسری بات نہیں کرسکتیں؟''

''ہاں ہاں' کیوں نہیں...... کیا آپ مجھے شاپنگ کروانے لے جاسکتے ہیں؟''

''اچھا چلو' کیا یاد کرو گی کہ......'' طاہر نے ہنستے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ثنا نے موبائل پرس سے نکال کر اس کی ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ یہ نمبر فریال کا تھا۔ ایک نظر اس نے گھڑ ڈالی' اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ثنا اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ اس وقت کبھی فریال نے فون نہیں کیا اس نے فون کان سے لگا کر کہا ''السلام علیکم پھپھو! خیریت تو ہے ناں؟''

''ہاں' خیریت تو ہے مگر ان دنوں امی شدت سے یاد آرہی ہیں۔ کیا تم مجھے صبح فون کر کے ان کی خیر بتاسکتی ہو؟''

''پھپھو! میں نے تو آج شام بھی گھر میں فون کیا تھا' سب خیریت سے ہیں۔ منور بھائی پچھلے دنوں ملائشیا ہوئے تھے۔ وہ بھی واپس آگئے ہیں۔ چچا' چچی بھی ٹھیک ہیں۔ سائرہ پھپھو بھی اپنی فیملی کے ساتھ خیریت ہیں۔ ان کی فیملی میں اضافہ ہونے والا ہے۔ دادی کی طبیعت پچھلے ویک خراب تھی' بخار نہیں اتر رہا تھا مگر اب بھی ٹھیک ہیں۔'' ثنا نے سب کی خیریت بتاتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں کیوں' اس وقت شدت سے سب گھر والے یاد آرہے ہیں اور نیند کسی صورت میں نہیں آ ہے۔'' فریال کا لہجہ غم سے لبریز تھا۔

''آپ اکیلی ہیں ناں...... اس لیے ایسا لگ رہا ہے۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتی تو ہم دونوں مل کر انجوائے کرتے۔''

''یہ دوریاں ہماری قسمت نے ڈال دی ہیں تو کیا کرسکتے ہیں'' فریال کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

''پھپھو! آپ پریشان نہ ہوں' پریشانی کے یہ دن جہاں اتنے گزرے اور بھی گزر جائیں گے اور

آپ اپنوں کے درمیان ہوں گی۔'' ثنا نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اب ایسا نہیں لگتا۔ پانچ سال گزر گئے ہیں مگر میرے کسی بھائی کو میری یاد نہیں آئی۔ شاید میں ان کی ی بہن ہوتی تو وہ اس نہج پر نہ سوچتے۔''

''نہیں پھپھو! ایسی بات نہیں ہے' آپ کے دونوں بھائی' آپ سے اور سائرہ پھپھو سے بےحد محبت کرتے یں مگر آپ امی کی تیزی اور چاچی کی چالاکی سے تو واقف ہی ہیں...... تو وہ کیوں چاہیں گی کہ آپ دوبارہ اپنے ر میں آجائیں۔''

''نہیں ثنا' میرا جرم بھی کوئی کم تو نہیں تھا۔ اپنے گھر والوں کے اعتماد کا خون کیا تھا تو پھر میرے ساتھ ایسا ہی لوک ہونا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی جو صادقہ باجی جیسی ہستی نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا ورنہ میں نہ جانے کہاں کہاں دھتکاری جاتی۔''

''پھپھو! آپ پرانی باتیں بھول جائیے۔ آج آپ کا معاشرے میں باعزت مقام ہے۔ لوگ آپ کا نام زت سے لیتے ہیں۔ کسی اچھے سے گھرانے کے لڑکے سے آپ کی شادی ہوجانی چاہیے۔ تب بچوں اور میاں ں آپ ایسی الجھیں گی کہ کسی کو بھی یاد کرنے کی فرصت نہیں رہے گی آپ کے پاس۔''

''ثنا...... اب دوبارہ شادی کے بارے میں' میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔''

''کیوں پھپھو! دوسری شادی کرنا کوئی گناہ تھوڑی ہے؟''

''میرا ایک ہی تجربہ اتنا تلخ ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ طلاق دینے کے بعد بھی وہ موصوف مجھے اذیت دینے کا لہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں کتنا ہی دھتکار دوں' کتنا ہی ڈرا دوں وہ کچھ عرصے بعد سب بھول جاتے ہیں ر مجھے بےوقوف سمجھ کر پرچانے کے طریقے اپناتے ہیں جیسے میں کوئی فرسٹ ائر فول قسم کی لڑکی ہوں۔''

''اگر آئندہ کبھی ایسا ہو تو آپ موصوف کی ایف آئی آر کٹوا دیں۔''

''دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کے کوڑے لگوادوں مگر میں ازخود اس ضمن میں کوئی شور ہنگامہ نہیں چاہتی ہوں۔''

''اگر اس نے پھر پریشان کیا تو پھر......؟''

''وہ بےحد لالچی انسان ہے اور بےغیرت بھی۔ ایسے لوگ گاہے بہ گاہے حملہ کرنے سے چوکتے نہیں ہیں' وجہ ہے کہ میں نے چوکیدار اور گارڈ چوبیس گھنٹوں کے لیے رکھا ہوا ہے' اس لیے میں اس سے خوف زدہ نہیں وں' بس صادقہ باجی کے انتقال کے بعد تنہائی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔''

☆☆☆

ضعیفی اور غم جب ساتھ ساتھ چلیں تو بیماریاں جلدی حاوی ہوجاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ شائستہ بیگم کے ساتھ چل ہا تھا۔ بھی وہ بالکل ٹھیک ہوجاتیں اور کبھی اچانک ہی وہ بستر پکڑ لیتیں۔

صحیح کہتے ہیں لوگ کہ مرے کا صبر آجاتا ہے مگر جیتے کا صبر کرنا کہاں ممکن ہوا ہے۔

کسی کے گھر میں بھی چھوٹا بچہ ہو' وہ سب سے زیادہ لاڈلا ہوتا ہے' اس کی بےجا ضد بھی مان لی جاتی ہے مگر ال تو ایسی گھر سے نکالی گئی کہ اسے نہ کسی بھائی نے ڈھونڈا اور نہ ہی شادی شدہ بہن سائرہ نے ایسی کوئی سعی کی۔

''سائرہ! کیا تجھے اپنی بہن یاد نہیں آتی یا اپنے گھر کے سکون میں تو سب کچھ بھول چکی ہے؟'' شائستہ بیگم نے ی سے بھی پوچھا تھا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں امی آپ!...... ایک تکیے پر ساتھ سر رکھ کر سونے والی بہن کو میں بھول سکتی ہوں؟

فریال تو مجھے اتنی یاد آتی ہے کہ بیٹھے بیٹھے میری آنکھیں از خود بھیگ جاتی ہیں۔"

"مگر تو نے اسے ڈھونڈا تو نہیں؟"

"اسے کیسے ڈھونڈوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ اس نے بعد میں کبھی رابطہ کیا ہی نہیں

"اپنے میاں کو اس ضمن میں کچھ بتایا؟"

"نہیں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ فریال نے اپنی پسند سے شادی کی ہے اور گھر والوں نے اس سے ملنا بند کر دیا

"تمہارے شوہر نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ چلو تم اپنی بہن سے مل لو۔ میرے گھر آ کر تو تم اس پابندی مستثنٰی ہو گئی جو تمہارے گھر والوں نے فریال پر عائد کی ہے؟"

"نہیں انہوں نے ایسا کچھ مجھ سے نہیں کہا ہے اور یوں بھی وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص ہیں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم نے کبھی فریال کی باتیں بھی اپنے میاں سے نہیں کی ہوں گی۔"

"نہیں امی...... جب ہی تو مجھے ڈیپریشن سا رہنے لگا ہے۔ ڈھیر ساری باتیں جب اپنی یادوں کے ہیں تو میں لہولہان سی ہو جاتی ہوں۔ اب آپ بتایئے کہ میں اپنے میاں اور اپنی ساس کو کیسے بتاؤں کہ میری نے بھاگ کر ایک لوفر سے لڑکے سے شادی کی تھی اور جب اسے گھر سے نکالا تو اس میں بھی ایسی اکڑ آ گئی معافی مانگنے بھی نہیں آئی۔ معافی مانگنا کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں تھا' اسے آنا چاہیے تھا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اس نے اپنے بچوں کو بھی نہیں بتایا ہوگا کہ کوئی ان کی نانی ہے...... کوئی ان کی خالہ ماموں بھی ہیں۔"

"ہاں' وہ بچپن سے ہی بہت ضدی ہے' اس نے واقعی اپنے بچوں کو نہیں بتایا ہوگا۔"

"ذرا سی غلطی پھیل کر کتنی بڑی ہو جاتی ہے' اس کا بچیوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا" شائستہ بیگم کا لہجہ دکھی سا ہو گیا

ان کے بار بار بیمار پڑنے کی اصل وجہ فریال ہی تھی' جو دکھ بن کر ان کے پورے اعصاب پر چھا گئی تھی۔ ان کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو انہوں نے ہلکی غذا بھی لینی شروع کر دی۔ سائرہ روزانہ ہی ماں کو دیکھنے لیے آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی صحت کا ٹانک صرف فریال کی ذات ہے اس لیے وہ جب آتی' زیادہ زیادہ فریال کی باتیں کیا کرتی اور شائستہ بیگم دلچسپی سے اس کی باتیں سنا کرتیں۔

"یاد ہے امی! جب فریال کا پہلا روزہ رکھوایا گیا تھا تو اس نے نل کھول کر اپنا منہ نیچے کر لیا تھا اور خوب غٹ غٹ پانی پی گئی تھی۔

اور جب میں نے اسے ٹوکا تو کیسی معصومیت سے اس نے کہا تھا' میں خود تھوڑی پانی پی رہی ہوں' وہ سے منہ میں پانی جا رہا ہے' اپنے ہاتھ سے تھوڑی پیا ہے۔"

"اس وقت وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ پانچ سال کی بھی نہیں ہوگی۔ اتنے چھوٹے بچے کو جسے دین کی سمجھ بھی نہ ہو' اسے روزہ نہیں رکھوانا چاہیے۔"

"اچھا' جب شاہنواز بھائی کی شادی ہوئی تھی' اس وقت تو وہ آٹھ نو سال کی ہوگی۔ اس نے طوطے کو رٹوا دیا تھا۔ ہمارے گھر میں کالی بھابی آئی ہیں اور ثریا بھابی کا بس نہیں چلتا تھا کہ طوطے کی گردن مروڑ کر دیں۔ اور طوطا ان کو دیکھتے ہی آوازیں لگانے لگتا تھا۔

"ہمارے گھر میں کالی بھابی آئی ہیں

ہمارے گھر میں کالی بھابی آئی ہیں۔"

اور جب انہوں نے شاہنواز بھائی سے شکایت کی تھی تو بھیا نے ہنس کر کیسے تصحیح کی تھی۔

"ثریا! تم نے غلط سنا ہے' ہمارا طوطا تو یہ کہتا ہے' ہمارے گھر میں پیاری بھابی آئی ہیں...... بے شک تم کسی بھی پوچھ لو۔"

ثریا بھابی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے شاہنواز بھائی کی بات دہرائی تھی اور جب فریال سے پوچھا تو اس نے صفاچٹ کہہ دیا تھا کہ طوطا تو یہ کہتا ہے' ہمارے گھر میں کالی بھابی آئی ہیں۔ اس کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ طوطے لو لفظ کالی کی ہجے رٹوا دے۔

"ان ہی باتوں کی وجہ سے ثریا شروع سے ہی فریال سے خار کھاتی تھی۔ کبھی اس نے فریال سے محبت نہیں کی' ہمیشہ اس کی دشمن بنی رہی۔ شاہنواز کسی بات پر جب فریال کو ڈانٹتا تو اس وقت اس کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔"

"ہاں امی! یہ سب بے وقوفی کی باتیں تھیں...... جن کے بارے میں اب سوچو تو صرف ہنسی آتی ہے۔"

"چھوٹی ہونے کے ناتے اسے کسی شرارت پر میں نے نہیں ڈانٹا تھا...... اس لیے اس کے حوصلے بڑھ گئے اور اس نے اتنا بڑا اقدام اٹھا لیا' جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

"امی' اس نے شادی ہی تو کی تھی' معاف کر دینا چاہیے تھا بھائیوں کو' پتا نہیں اس کے اس اقدام کی سزا اس کے ہر نے کیا دی ہوگی۔" سائرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر وہ یکدم چپ ہو گئی۔ وہ کوشش کرتی تھی' ماں کے امنے ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے ان کے ملال میں اضافہ ہو مگر وہ کہہ چکی تھی وراس کی بات شائستہ بیگم نے اپنے ل پہ لے لی تھی۔ اسی وقت ان کے جسم سے پسینہ بارش کی طرح بہنا شروع ہو گیا۔ سائرہ ان کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

"امی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"کچھ نہیں' بس دل گھبرا سا رہا ہے۔"

"یہ لیں' پانی پی لیں۔" گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے' اپنے دوپٹے سے ہی ان کا پسینہ اس نے خشک کرتے ئے کہا "امی! آپ کو یاد ہے' گزشتہ ماہ جب ثنا آئی تھی تو اس نے ہم لوگوں سے کہا تھا' اس نے فریال سے ملتی جلتی کوئی لڑکی راولپنڈی میں دیکھی تھی۔"

"ہاں...... ہاں' اس نے کہا تو تھا......" شائستہ بیگم نے چہرے پر سرشاری لاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ فریال راولپنڈی میں ہے اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔" سائرہ نے ماں کو طمانیت کا اساس دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں' شاید ایسا ہی ہو۔ اپنے میاں' اپنے بچوں میں وہ سب کو بھول بیٹھی ہو۔"

"میں سوچ رہی ہوں' موسم سرما کی تعطیلات میں راولپنڈی اسلام آباد کا چکر لگا آؤں' کیا پتا...... میری اس کہیں مڈبھیڑ ہو جائے۔"

"تیرا کیا خیال ہے' وہ گھر میں بیٹھنے کے بجائے سڑکوں اور چوراہوں پر گھومتی پھرتی ہوگی۔"

"امی اب میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں' اپنی بہن کو میں خود ڈھونڈوں گی اور انشاءاللہ وہ ہمیں ضرور مل جائے گی۔"

"انشاءاللہ!" شائستہ بیگم نے دھیرے سے کہا اور آنسو ان کے رخساروں پر خاموشی سے بہنے لگے۔ اتنی خاموشی کہ پیٹھ موڑے باتیں کرتی ہوئی سائرہ تک کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کی ماں اس زار و قطار سے رو رہی ہے۔

☆☆☆

یہ پچھلے عشق کی باتیں ہیں
جب آنکھ میں خواب دمکتے تھے
جب دل میں داغ چمکتے تھے
جب پلکیں شہر کے رستوں میں
اشکوں کا نور لٹاتی تھیں
جب سانسیں اجلے چہروں کی
تن من میں پھول سجاتی تھیں
جب چاند کی رم جھم کرنوں سے
سوچوں میں بھنور پڑ جاتے تھے
جب ایک تلاطم رہتا تھا
اپنے بے انت خیالوں کا
ہر عہد سنبھالنے کی قسمیں
خط خون سے لکھنے کی رسمیں
جب عام تھیں ہم دل والوں میں
اب اپنی اجڑی آنکھوں میں
جتنی روشن سی راتیں ہیں
اس عمر کی سب سوغاتیں ہیں
جس عمر کے خواب خیال ہوئے
وہ پچھلی عمر تھی بیت گئی
وہ عمر بتائے سال ہوئے
اب اپنی دید کے رستے میں
کچھ رنگ ہے گزرے لمحوں کا
کچھ اشکوں کی باراتیں ہیں
کچھ بھولے بسرے چہرے ہیں
کچھ یادوں کی برساتیں ہیں
یہ پچھلے عشق کی باتیں ہیں

(محسن نقوی)

فرح نے نظم پڑھ کر گہرا سانس لیا اور سوچنے لگی۔ واقعی وہ دور اور ہی تھا جب چاہتا اور چاہے جانا **اچھا لگ**

لاتھی نہ پروا' عشق نے ایک عجیب سکون سا عطا کیا ہوا تھا...... محبوب یا اس کے تصور کے سوا کوئی کام ہی نہ

ہر بات پر ہنسی امڈی چلی آتی تھی جیسے ہنسی نے اس کے من میں بسیرا کر لیا ہو۔

''فرح اتنا مت ہنسا کر۔'' اماں دہل کر ٹوکا کرتیں۔

''کیوں' ہنسنے سے کیا ہوتا ہے؟''

''ڈر لگتا ہے' مجھے' خواہ مخواہ نظر لگ گئی تو......''

''اونہہ! نہیں لگتی مجھ پر نظر اور جس نے نظر لگانی تھی اس نے نظر لگا بھی دی۔'' وہ ہنستے ہوئے دھیرے سے لی

''ارے کس نے لگا دی نظر تجھے' آنکھیں نہ نکال لوں گی اس کی۔'' اماں اس کی ادھوری بات سن کر اٹھیں۔

''یں تمہیں ایسا کام کرنے نہیں دے سکتی۔'' اس کی ہنسی پھر شروع ہو جاتی۔

''مگر کیوں بھئی......؟''

''اس لیے کہ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''یکار کی باتیں کروا لو اس سے۔'' وہ جھلا کر کہتیں۔

''اماں! میں تو بہت پیاری باتیں کرتی ہوں۔'' اس کی ہنسی پھر شروع ہو جاتی۔

دروازے پر بیل ہوتی تو وہ سرپٹ بھاگ کر جاتی' اور جب بڑی آپا تیزی سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس اتیں تو اس کی ہنسی چھوٹ جاتی۔

آپا اپنا سر تھامے دیر تک بیٹھی رہتیں' اور وہ ان کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کر بھی ہنسا کرتی۔

اور اب تو شاید وہ ہنسنا ہی بھول گئی تھی' بہنیں اس کو مسکراہٹ پر آمادہ کرنے کے لیے کیسے کیسے دل سے جوڑ کر باتیں کرتیں اور وہ چپ چاپ ہنستی رہتی مجال ہے کہ کوئی ہنسی کا کوندا اس کے لبوں پر کوند جائے۔

بھی وہ اپنے آپ کو نفسیاتی مریضہ سی سمجھتی۔ اس کا یہ یقین ہوتا کہ خوشیاں اس کی زندگی کا حصہ نہیں ہیں اور اس کا ان سے کوئی واسطہ ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو مظلوم سی سمجھا کرتی اور کبھی وہ ایسی بے حس ہو جاتی جیسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اپنی ماں کے کمرے میں کئی کئی دن نہ جاتی اور کبھی وہ بالکل نارمل سی ہوتی۔

ات کے اندر یہ خوبی ماننے والی ہے' جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے۔ بعض راتیں طویل ضرور ہوتی ہیں مگر ان کا انجام سحر پر ہوتا ہے۔

ف سے چھٹکارا پانے کے بعد اسے حقیقی سکون ضرور ملا تھا مگر اس سے علیحدہ ہو کر وہ اب اپنے آپ کو ہمہ ارغ سی پاتی۔

سے آجاتی تو چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ کوئی آجاتا تو زیادہ تر یہی کوشش کرتی کہ سامنے سے ہٹ جائے ف سے متعلقہ کسی بات کا کوئی جواب نہ دے۔

لیہ فرح اس نے تجھے پریشان کیا تھا' اس کا صلہ کیسا اسے دنیا میں ہی مل گیا۔ اس کی ٹانگ تک کٹ خلہ اس سے آکر کہتے) فرح تیری بددعا لگ گئی۔'' (کمینوں نے دکھ بھی تو تجھے بہت دیے تھے واقارب ان جملوں کے ساتھ اس سے بات کا آغاز کرتے۔ تب وہ کانپ سی جاتی۔

''میری تو کبھی دعا پوری نہیں ہوتی بددعا کیسے پوری ہوگئی؟ اور پھر میری وجہ سے کسی کو یوں دکھ کیوں ملیں۔ اس کی قسمت میں یہ دکھ لکھے تھے اس لیے ملے' میری قسمت میں جو لکھا تھا وہ مجھے ملا۔''

''فرح تو اسے کوستی تو ضرور ہوگی' تیری زندگی کے کتنے خوبصورت سال اس نے تباہ و برباد کر دیے؟''

''نہیں میں کسی کو نہیں کوستی۔''

''تو پھر خالی بیٹھی کیا سوچتی رہتی ہے' ڈھیرے ڈھیرے کیا بڑبڑاتی رہتی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ گھبرا سی جاتی۔

''اللہ کرے کوئی اچھا سا ساتھی تجھے مل جائے جو تیرے سارے دکھوں کو بھلا دے۔''

اور وہ خاموش سی ہو جاتی' ایسی باتوں کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''آج کل اچھی اچھی لڑکیوں کے لیے تو بر ہیں نہیں' مجھ جیسی جنم جلی' مطلقہ کے لیے پرستان سے ضرور آئے گا۔''

''کیا پتا شاید کوئی آ جائے......'' وہ سوچتی تب اپنی سوچ پر اسے خود ہنسی سی آ جاتی۔

کالج میں داخلہ لے کر یہ فرق ضرور آیا تھا کہ اب وہ شام کے وقت ماں کا ہاتھ بھی بٹانے لگی تھی۔ رسالے کتابیں جنہیں وہ شروع سے ہی شوق سے پڑھا کرتی تھی اب انہیں دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ کالج کی سہیلیوں کے ساتھ بھی رسائل اور کتب کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ کالج جانے اور مطالعہ کرنے سے اس کی روزمرہ کی خواہ مخواہ کی پریشانیاں از خود ختم ہو گئی تھیں ورنہ پہلے تو یہی ایک مسئلہ تھا۔

آج کا دن کیسے گزرے گا' کل گزرے گا کیسے؟
کل جو پریشانی میں گزرا' وہ بھولے گا کیسے؟
کتنے دن ہم اور جئیں گے' کام ہیں کتنے باقی
کتنے دکھ ہم کاٹ چکے ہیں اور ہیں کتنے باقی
خاص طرح کی سوچ تھی جس میں سیدھی بات گنوادی
چھوٹے چھوٹے واہموں میں ساری عمر بتادی

☆☆☆

رعنا کو ڈرامے میں کام کرنا تو کیا' ڈراما دیکھنا بھی پسند نہیں تھا۔ ٹی وی وہ ضرور شوق سے دیکھتی تھی مگر میوزک کے اسے کچھ دیکھنا پسند نہیں تھا۔ گیت' غزلیں' ری مکس سب ہی وہ بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ فاخرہ اسے بارہا سمجھاتی تھی کہ اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھا کر' خانگی زندگی سے متعلقہ بہت سی باتیں قبل از وقت معلوم ہو جائیں گی (بعد کو مشکل نہیں پڑے گی) مگر اسے ڈرامے دیکھنے سے کبھی دلچسپی نہیں سیکڑوں قسطوں والے سوپ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کرتے۔

''پتا نہیں کون کس کا کیا لگتا ہے' میرے کو تو ذرا پتا نہیں چلتا۔''

''توجہ لگا کر دیکھو ناں' پھر پتا پڑنے کا ہے؟'' ماں کہتی۔

''امی' سوب عورتاں تو ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے بیٹھتے' میرے کو تو وحشت ہوتی دیکھ کے۔''

''ایسا ہی اچ ہو رہا آج کل' یہ ڈرامے تکو زندگی کی اصلی کہانیاں ہوتے۔''

''پلے پڑتے تو دیکھتی ناں......'' وہ جملہ کھینچ کر بولتی۔

''ہر وخت گانے سن کر تم تکو گھبراتے اماں......''

''میرے کو سکون ملتا۔ میوزک سن کر تھکن اتر جاتی امی۔'' وہ ہنس کر کہتی اور اماں کو بالآخر دوسرے ٹی وی پر اپنے من پسند ڈرامے دیکھنے پڑتے۔

اور اب بھی رعنا یونیورسٹی میں سالانہ ڈراما فیسٹول میں کام کرنے کو تیار ہو گئیں (حیرانی کی بات ہی تھی' جس لی کو ڈرامے دیکھنے سے دلچسپی نہ ہو وہ اس میں کام کرنے چلی تھی)

رعنا نے اپنے گروپ کی سہیلیوں کے کہنے میں آ کر ڈرامے میں حصہ اس وجہ سے بھی لے لیا تھا کہ اس میں اس کا کردار ایک حیدرآبادی کا تھا۔ مکالمے بولنے میں اسے کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہونی تھی۔

مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں تحیر سے پھٹ گئی تھیں کہ رعنا نے اس کردار میں واقعی جان ڈال دی تھی۔ ساڑی کا الٹا پلو لیے' بائیں جانب چابیوں کا گچھا لٹکائے وہ آنکھیں چلاتے ہوئے اپنے کردار میں بالکل لن تھی۔

اس کے ڈائیلاگز تو جیسے سب کے دل میں اترے جا رہے تھے۔ اس کی اداکاری حقیقت کی ترجمانی کر رہی تھی جب وہ اپنی ناک چڑھا کر کہتی۔

''اری نیک بختی ذرا ہلو بول......کوئی سن لیا تو......نوی مصیبتاں کھڑی اچ ہو جائیں گی' ہاں۔''

''ویسے بھی' یہ بھی کوئی زندگی ہے کیا کہ دوسروں کا مونہہ دیکھ کر باتاں کرو۔''

میں تو آج سوچ لے کر بیٹھی ہوں کہ جاؤں نچ نکیں۔ سارے گھر کے لوگاں خوائی نخوائی چیخاں مارتے......

ابھی ہے' وہ برا ہے مگر سامنے جا کو کہنے کا حوصلہ نکیں۔ ہمارے گھر کے سوب لوگاں اندر کے گھر گھسنے ہیں بول گھر کے شیر باہر کے گیدڑ رد کھتے......جی ہو۔

''اگے کوئی بات بھی ہوئی......اجاڑ......یہ بچی دیکھو سولہ یا سترہ کی ایک دم گڑیا سی دکھتی میرے کو اور دولہا سو پوری دگنی عمر کا۔ ایسا کیا کال پڑا تھا چھوکروں کا' کاں غارت ہو گئے تھے سارے کے سارے' امریکا کھا کیا......؟ بول کے۔ مگر اب امی بیچاری بی کیا کرے......گڑیا بی کا رشتہ ہی تکو آئے۔''

''اب شاید ایسا ہی اچ ہوتا ہے۔ برابر بولتے ہیں سوب لوگاں ایک نہ ایک جگہ تو جھکنا ہی پڑتا ناں دیکھو سب چیز تو برو بر ہے بس عمر ہی زیادہ دکھتی ناں اور پھر مرد کی عمراں کون دیکھتے اس کے کھیسے میں تو پیسا ہونا ہے......ہاں ہاں پیسا! بہوت طاقت ہوتی اس میں۔

آپ یہ سوچتے ہوں گے دولن والے شاید بالکل غریب غرباد کھتے......اس لیے میں پیسے کو اہمیت دیتی بیٹھی ہاں۔

ایسی ہی اچ کوئی باتاں نکیں۔ ہماری گڑیا کو تو خدرت نے خوب نوازا ہے۔ آپ تو پیسے والے ہو کر بری کیسی ساری لے کو آتے ہو۔ نہ لچھا' نہ جھمکا' نہ بازو بند اور نہ ہی گلشن پٹی......پیروں کے توڑے تک تو نہیں ساڑیاں دیکھ کو تو چکرا آتے۔ اللہ توبہ! ایسی بری لانے سے تو آپ سوب خالی ہاتاں آ جاتے......یہ دھوتی ساڑیاں کون پہن کو بیٹھے گا' ایسی اچ ساڑیاں تو ہماری کام تن اٹھا کو پھینک دے اور ناراض ہو کر بیٹھ ......''

''کیا بولے تم' ذرا زور سے بولو۔ تمہاری یہ ہمتاں کہ میرے آگے باتاں کرتے۔ ہاں' ہاں بولو......میرے کو ...کی پہچان تکو ہے اور......اور دولہا کی عمر ہی ذرا زیادہ ہے......اس سے کیا فرخ پڑ جائیں گا؟ خدا کی

خصم (خدا کی قسم) فرخ کی باتاں تو جانے دیو۔ دولھا کی چال بھی ٹھمکے والی ہے۔ ایسا لہرا کے چلتے کہ اللہ طاہر کے بجائے طاہرہ بولنے کو جی کرتا اور اگر وہ ہماری گڑیا کے سنگات سج کو بیٹھتا یا چال ہی ڈھنگ کو ہوتی تو ہر صورت جھول کر کے بیٹھتی۔"

"یوں بھی پیسا تو ایک آدھ خامی کو تو چھپا کے بٹھتا ناں مگر یہاں تو دولھا کے اندر خوبی دیکھنے اچ کو نہیں ملا اس نے ہنس کر ایسی طرح داری سے کہا کہ سامعین کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

اگلے دن نوٹس بورڈ پر رعنا کی بے شمار تصویریں جگمگا رہی تھیں۔ بہترین ڈراما بھی اس کا ہی قرار تھا۔ ایوارڈ، میڈل نہ جانے کیا کیا اسے ملے تھے۔

یوں رعنا گوشہ گمنامی سے اچانک ہی باہر آ گئی تھی۔ دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی بہت سی لڑکیاں، لڑکے اس کا کر خوش ہو رہے تھے۔ اس سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔

"آپ میں تو بہت ٹیلنٹ ہے، آپ کو تو ٹی وی کے کسی پلے میں کام کرنا چاہیے، جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کے آذر نے جب بڑی چاہ سے کہا تو وہ جھکے سے لہجے میں بولی۔

"میرے کو کام کرنے کی اجازت نکو ملے گی ناں۔"

"ارے کیا کردار کی چھاپ اب بھی باقی ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"نہیں...... میں ایسا ہی اچ بولتی ہوں ناں...... اس لیے یہ کردار آسانی سے کر کو بیٹھی ناں میں۔"

"مذاق کر رہی ہیں آپ، کراچی کے اسکول، کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں ایسی صاف اردو بولتی ہیں کہ زبانوں کو ہرا دیتی ہیں۔"

"برو بر بولتے آپ مگر میں اسکول کے سوب امتحاناں پرائیوٹ دے کے بیٹھی۔"

"اور پھر کالج کیسے پاس کیا؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"ایک پرائیوٹ کالج میں آہستہ آہستہ کر کے پاس کیے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے آپ واقعی بڑی محنتی ہیں۔"

"یہ سوب تو مجھے نہیں پتا، اب ذرا شوخ میں داخلہ لے لی میں کہ یونیورسٹی کو بھی دیکھنے کا ہے۔"

"مس رعنا جتنی پیاری سی آپ ہیں ایسی ہی معصوم سی باتیں بھی کرتی ہیں آپ، کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟" جمیل آذر نے اپنی آنکھوں میں محبتوں کے دیے جلا کر اس سے پوچھا۔

"ارے یہ کیا بول رئے ہیں آپ......" وہ پریشان سی ہو گئی۔

"میری دوستی منظور ہے ناں آپ کو......" اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اللہ...... کیا اول فول بک رہے آپ...... میری سمجھ میں نکو آتا کہ آپ کا مطلب کیا اچ ہے......" رعنا گم ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"مس رعنا آپ کو کیا اپنے اوپر اعتماد نہیں؟"

"وہ تو ہے......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"تو بس آج سے ہماری آپ کی دوستی پکی......" جمیل نے اس کے ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تب رعنا لرز کر رہ گئی "ائی ماں یہ سوب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔" وہ بے اختیار سوچنے لگی۔

☆☆☆

عظمت بیگم کا موڈ حکیم جی کی بیوی کے پاس جا کر ہمیشہ بہل جاتا تھا۔ یوں بھی پڑوس کا گھر تھا اور وہ شگفتہ اج کی حامل خاتون تھیں۔ عظمت بیگم کی شکل دیکھ کر ہی وہ پہچان جایا کرتی تھیں کہ ان کے گھر میں پریشانی چل رہی ہے یا نہیں۔ ان کے گھر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہیں، تینوں بہویں گھر میں تھیں۔ ساس کی غیر ودگی میں ان کی سہیلی کو دیکھا تو بڑی بہو نے آگے بڑھ کر سواگت کیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کبھی آپ بے بے کی غیر موجودگی میں تو آئیں۔ میں تو آپ سے بات کرنے کو ترستی ہوں مگر ساس صاحبہ کا حکم ہی نہیں ہے کہ آپ سے مخاطب ہو سکیں۔"

"ارے ایسی کیا بات ہے اور...... وہ...... تمہیں کیوں منع کرے گی۔" عظمت بیگم کھسیا کر ہنستے ہوئے لیں۔

"یہی تو آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کی بی پڑوسن کیسی ہیں؟"

"کیسی ہیں؟" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

"ان کا تو بس نہیں چلتا کہ ایک بالٹی میں جوتے بھگو کر رکھیں اور شام کو جب ان کے بیٹے آئیں تو ان سے کہیں کہ اپنی اپنی بیویوں کا جوتوں سے منہ سجا دو اور ہاتھ پیروں میں نیل ڈال دو۔"

"اللہ توبہ...... اس طرح وہ کیوں کرے گی؟" عظمت بیگم کو یہ بہتان سن کر ہی غصہ سا آ گیا۔

"خالہ جی...... ہر کوئی آپ جیسا تو اچھا نہیں ہو سکتا ناں، جتنا خیال آپ نگین کا رکھتی ہیں، کیا ہمیں پتا نہیں یا ہم جانتے نہیں ہیں۔ کاش ہماری ساس آپ جیسی ہوتیں تو ہمارے حق میں راوی چین ہی چین ا" اپنی تعریف خواہ کتنی ہی جھوٹی کیوں نہ ہو کبھی کسی کو بری نہیں لگتی ہے۔ یہی حال اس وقت عظمت بیگم کا تھا انہیں حکیم جی کی بہو کی تمام باتیں ایکدم سچی لگنے لگی تھیں اور اپنی تعریف سن کر انہیں اپنے آپ سے از ردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

نگین میں انہیں ہمیشہ خامیاں نظر آتی تھیں اور آج وہ خامیاں مزید بڑھ گئی تھیں اور حکیم جی کی بہو انہیں ایسی ی نظر آ رہی تھی کہ اس کی مکاری کی باتیں سن کر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں اور کمر کو اس انداز میں لگیں جیسے وہ اسے دلاسہ دلا رہی ہوں۔ ابھی ان کی باتیں ختم بھی نہیں ہوئی تھیں کہ حکیم جی کی بیگم بلی کی ل چلتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئیں۔ اس وقت ان کی بہو دل سے گڑھ کر وہ کہانی سنا رہی تھی جب حکیم جی کی نے اسے لکڑی سے مار کر کہا تھا 'جا اپنے میکے سے دس ہزار لے کر آ' اور وہ چپ چاپ مار کھاتی رہی تھی۔

"تا جب میں نے تجھے اتنا مارا تھا تو کوئی نہ کوئی تو نشان تیرے جسم پر ضرور ہو گا، جب کہ بقول تیرے کہ یہ ا واقعہ ہے۔" حکیم جی کی بیوی نے پیچھے سے آ کر بہو سے پوچھا۔

اس کو دیکھ کر تو اس کی سٹی گم ہو گئی اور وہ لگی آئیں بائیں شائیں بکنے۔

"ہاں ہاں...... ہمیرا، ضرور ہو گا چوٹ کا نشان، تم دکھا دو ڈرومت، میں کبھی کسی کی ناجائز طرف داری نہیں ہوں۔" مگر عظمت بیگم تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ان کی بہو اپنی ساس کے آگے ہاتھ جوڑے معافیاں رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میں نے یہ باتیں اسٹار پلس کے ڈرامے سے سیکھیں ہیں۔"

یم جی کی بیوی نے عظمت بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا "میری معصوم بہوؤں کے کرتوت تو تم نے دیکھ ہی لیے لی بنی ہوئی ہیں اور اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے پر ہمہ وقت تلی رہتی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عظمت بیگم نے سر ہلایا۔

"میرے خیال سے وہ وقت اب بہت دور نہیں جب سب کے لڑکے شادی کے بعد علیحدہ رہا کر گے۔" حکیم جی کی بیوی نے کہا۔

"یہ بات کہنا آسان ہے مگر جب کسی ماں کا بیٹا اسے چھوڑ کر جاتا ہے تو اس کا دل دکھ سے مرجاتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کرے تو کیا کرے......روئے تو کس کونے میں منہ چھپا کر روئے اور آج میں تمہار یہی بتانے آئی تھی کہ شاید ایسا دکھا وقت میرے گھر میں بہت جلد آنے والا ہے۔"

"خدا نہ کرے۔" حکیم جی کی بیوی نے کہا اور عظمت بیگم کو دیکھنے لگیں جن کی آنکھوں سے چپ چاپ آ بہہ رہے تھے۔

"عظمت تم ایک وہمی عورت ہو اور یہ وہم تمہارے دل میں شروع سے ہی بیٹھ گیا ہے کہ شجاع تمہیں چھو چلا جائے گا۔"

"میرا دل کبھی مجھ سے غلط نہیں کہتا' وہ کافی عرصے سے یہ الارم دے رہا ہے کہ اب شجاع جانے والا ہے۔"

"جانے والا ہے مگر گیا تو نہیں۔" حکیم جی کی بیوی نے تسلی کے پھاہے رکھتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے اب مجھ میں بھی برداشت نہیں رہی ہے' غلط بات سن کر غصہ اتنا آتا ہے کہ بس نہیں کہ اپنے آپ کو ختم کردوں یا سامنے والے کو۔"

"عظمت یہ شاید ہماری عمر کا تقاضا بھی ہے' وقت کے ساتھ ساتھ برداشت کی کمی ہوتی چلی جاتی ہے' جن بچے فرماں بردار ہوتے ہیں وہ ہنس کر اپنے والدین کی کڑوی کسیلی بھی جھیل لیتے ہیں اور جن کے بچے ہوتے ہیں وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔ جس سے بدمزگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔"

"تمہاری بہو کی باتیں سن کر تو میرے ہوش اڑ گئے' کس قدر نیچ قسم کی باتیں کرتی ہے وہ تمہارے بار میں۔"

"ابھی تو تم نے صرف ایک بہو کی باتیں سنی ہیں' باقی کی باتیں سنو گی تو پہلی والی کو معصوم قرار دو گی۔" جی کی بیوی ہنستے ہوئے بولیں مگر ان کے چہرے کے دکھ عظمت بیگم سے چھپ نہیں سکے تھے۔

"چائے پیو گی یا لسی۔" وہ ان کی توجہ ہٹانے کے لیے بولیں کہ عظمت بیگم یکدم ہی چپ سی ہوگئی تھیں۔

"نہیں اب میں گھر چلوں گی' اس وقت دل بے حد گھبرا رہا ہے۔" وہ انہیں خدا حافظ کہے بغیر لوٹ آئیں۔ عظمت بیگم کے دل میں غبار بھی بھرا ہوا تھا۔ حکیم جی کے گھر سے آنے کے بعد بہوؤں پر سے اعتماد اتر گیا تھا۔ ڈپریشن اور ٹینشن اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ان کے آنسو از خود بھل بھل بہہ رہے تھے۔

نگین نے انہیں یوں روتے دیکھا تو ایک گلاس پانی دیتے ہوئے کہا "پھپھو طبیعت تو ٹھیک ہے ناں کی؟ لیں یہ پانی پی لیں' دوپہر میں بھی آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا۔"

عظمت بیگم نے ایک نظر نگین کو نفرت سے دیکھا اور گلاس اٹھا کر پھینک دیا۔ شوئی قسمت وہ گلاس کمر باہر نکلتے ہوئے شجاع کے عین ماتھے پر جا کر لگا' شکر کہ وہ اسٹیل کا گلاس تھا کانچ کا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا مگر غصے میں تپ کر بولا۔

"امی جی باتوں کی انیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اب چیزیں بھی دے کر ماری جانے لگیں۔"

"ہاں میرا جو دل چاہے گا کروں گی' تجھ سے مطلب۔" روہانسی سی ہو کر وہ چیخیں۔

"میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ ایسے چیخ چیخ کرتے ماحول میں' میں نہیں رہ سکتا۔ میں یہ

رہا ہوں کہ یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"شجاع تو کل کا جاتا آج چلا جا' تیرے جانے سے مجھے واقعی سکون آجائے گا۔ تو کب تک مجھے یہ کہہ کر رہے گا کہ تو بہت جلد مجھے چھوڑ کر جانے والا ہے......ارے جانا ہے تو چلا جا ٹریلر کائے کے دکھاتا ہے۔"

"جب چلا جاؤں گا ناں تو ہر طرف روتی پھرنا کہ میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے......" شجاع کا لہجہ بھرا تھا۔ "مگر میں پھر واپس نہیں آؤں گا' چاہے آپ کتنی خوشامدیں کریں۔"

"جا تو چلا جا میں تجھے خود نکال رہی ہوں' تیرے جیسی اولاد سے میں بے اولاد بھلی' تیرے جانے سے شاید مل جائے مگر تیرے رہنے سے تو مجھے دکھ ہی مل رہا ہے......اور یہ تو نے کیسے سوچ لیا کہ میں تجھے روکنے لیے تیری خوشامدیں کروں گی۔" انہوں نے چیختے ہوئے کہا۔

"سوچ لیں آپ......کہ کیا کہہ رہی ہیں' میرا مزاج آپ جانتی ہی ہیں۔"

"شجاع تو اب چلا جا......میں تیرے جانے کا ذکر سن سن کر اب تھک چکی ہوں' اب تو تجھے واقعی چلا جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔" شجاع بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔

نگین جو بچی کو لیے صحن میں کھڑی تھی' شجاع کا یہ انداز دیکھ کر تھرا سی گئی۔

"سنیے......یہ سب پھپھو غصے میں کہہ رہی ہیں۔" اس نے شجاع کے غصے کو ہلکا کرنا چاہا۔

"تجھ سے کس نے کہا کہ میں یہ غصے میں کہہ رہی ہوں' آج میں اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں کہ اب میں تجھے اور تیرے بچوں کو نہ دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ رکھنا چاہتی ہوں۔"

"ہم آج ہی چلے جائیں گے آپ بے فکر رہیں۔" شجاع تمسخر سے ہنستے ہوئے بولا۔

"تو کس پر ہنس رہا ہے؟"

"اپنے آپ پر ہنس رہا ہوں کہ میں پہلے ہی کیوں نہ چلا گیا۔ آپ بے فکر رہیے میں آج ہی یہاں سے جاؤں گا۔" اس کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

"آج نہیں ابھی چلے جاؤ اسی وقت' اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ شام تک تیری شکل دیکھتی رہوں۔"

ب شجاع تیزی سے کمرے میں گیا اور اپنا ضروری سامان اٹیچیوں میں ٹھونسنے لگا۔

☆☆☆

ریل تیزی سے بھاگ رہی تھی' فرسٹ کلاس کے کوپے میں نگین بالکل ساکت سی بیٹھی ہوئی تھی۔ شجاع کھڑکی دیکھ رہا تھا مگر اس کا دماغ اس کا اپنا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"......میں امی سے جا کر کیا کہوں گی کہ ہم کراچی کیوں آئے ہیں؟"

"بیٹیاں جب ماں کے گھر آئیں تو کیا وہ پہلے وجہ پوچھتی ہیں کہ کیوں آئی ہو' کس لیے آئی ہو؟ کیسے آئی تک رہو گی؟ کب جاؤ گی؟" شجاع غصے میں بڑبڑاتا ہوا چڑ کر بولا۔

"پھر بھی کچھ تو کہنا ہی ہوگا ناں ابھی تو میں آئی تھی اور اتنی جلدی پھر کراچی جا رہی ہوں۔"

"سچ بات ہے بتا دینا کہ تمہارے ساتھ بھی روایتی کردار روا رکھا گیا۔ چیخ چیخ پٹ پٹ کے ساتھ وقت

ساس بن کر رہیں اور فرحت آپا نے نند کا سیاپا ہمیشہ ڈالے رکھا۔ ایک لمحہ سکون کا نہیں ملا۔ جب تک میں گھر رہے' ہر ایک نے ناک میں دم کر دیا تھا۔

"یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوگی کہ ہم اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے کے لیے دوسروں کو برا بنا دیں۔"

"تمہارا جو دل چاہے کہہ دو' مجھے تو جھوٹ بولنا نہیں آتا......" شجاع لٹھ مار لہجے میں بولا۔ اس کے کا
ماں کے غصیلے جملے تا حال سنگ باری سے کر رہے تھے۔

"میں یہ کہہ دوں گی کہ بچوں کی طبیعت گاؤں میں خراب ہوگئی تھی اس لیے ہم کچھ عرصے کے لیے
آگئے ہیں۔" نگین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاؤں سے آگیا ہوں' اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔" (اس کا لہجہ حتمی

"ایسا نہیں کہتے شجاع...... وہاں آپ کی ماں ہیں۔"

"مگر ماں کو اب میری ضرورت نہیں رہی ہے' تم نے سنی نہیں تھیں ان کی باتیں' اب وہ میری شکل د
نہیں چاہتی ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ...... غصے کی باتوں کے بھی بھلا مطلب کشید کیے جا سکتے ہیں؟"

"وہ غصے کی باتیں نہیں تھیں' سچی سچی باتیں تھیں۔"

"چلیے مان لیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر آپ یہ بات یاد رکھیے گا بچوں کو اپنی ماں کی ضرورت ہر و
ہے' چاہے وہ کتنے بڑے ہو جائیں۔ ہم پھپھو کے پاس واپس ضرور جائیں گے اور بالفرض ہم کسی وجہ سے
پاس نہ جا سکے تو ہم ان کو اپنے پاس کراچی بلا لیں گے مگر ہم سب ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔"

شجاع نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دوڑتے منظروں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ
وہ اس وقت نہ جانے کیسی حالت سے گزر رہا تھا کہ گود میں بیٹھا بچہ سوتے سے اچانک اٹھ کر رویا تو
کو خبر نہیں ہوئی۔

نگین نے بچے کو اس کی گود سے لے لیا۔ تب بھی وہ یوں اجنبی سا بیٹھا رہا۔ وہ جو ارحم کی آواز سن کر
لپکا کرتا تھا آج نگین کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی قوت سماعت پر کوئی فرق پڑ گیا ہو۔

"سنیے ہم کراچی میں کہاں رہیں گے؟" تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے والدین کیا سڑک پر رہتے ہیں۔" وہ غصے میں بولا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" وہ ہڑبڑا کر بولی۔

"ظاہر ہے جب کراچی جا رہے ہیں تو تمہاری امی کے ہاں ہی اتریں گے اور وہیں رہیں گے۔"

"کیا ہمیں مستقل وہاں رہنا ہوگا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے مگر آہستگی سے پوچھا۔

"تمہاری امی کو تمہارا رکھنا کیا مشکل ہوگا۔"

"نہیں یہ بات بھی نہیں ہے۔" وہ کھسیا کر بولی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"امی کے ہاں مستقل طور پر رہنا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"میں کوئی کام ڈھونڈ لوں گا تو پھر ہم کرائے پر کہیں شفٹ ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ بے ساختہ مسکرا کر یوں بولی جیسے اس کے سر سے کوئی انجانا سا بوجھ اتر گیا

"دو چار ہفتے تو تمہاری امی رکھ لیں گی یا میں فوراً ہی مکان نظر میں رکھوں۔" اس نے طنز سے لفظ

"ارے امی تو یہی چاہیں گی کہ میں ہمیشہ ان کے پاس رہوں۔" یہ سب باتیں تو میں اپنے دل کی

رہی تھی۔

"ہوں......" اس پر پھر خاموشی کا دورہ پڑا اور وہ چپ چاپ باہر خلاؤں میں ایسے دیکھنے لگا جیسے کوئی چلتی
تی تصویریں اسے نظر آ رہی ہوں۔

کراچی اسٹیشن پر اسے ریسیو کرتے فرید احمد کے ساتھ فیروزہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ بیٹی کو اتنی جلدی دوبارہ
یکھ کر ان کے چہرے کی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"ارے اپنے ساتھ عظمت آپا کو بھی لے آتے' کتنے سارے دن ہو گئے وہ کراچی نہیں آئیں۔" فرید احمد
نے شجاع کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور شجاع نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی مگر نگین نے بات سنبھالتے ہوئے کہا "اس وقت تو ہم بچوں کی
مسلسل بیماری سے گھبرا کر آئے ہیں' جب پھپھو کا پروگرام بنے گا تو تب وہ بھی آ جائیں گی۔"

"ارے پروگرام بننے میں کتنی دیر لگتی ہے وہ بھی تمہارے ساتھ آ جاتیں۔ اب اکیلے گھر میں رہ کر ان کی
طبیعت کیا اکتائے گی نہیں' فرحت کب تک ان کے پاس رہ سکتی ہے اس کے بھی اسکول جانے والے بچے ہیں۔"

"اگر انہوں نے کراچی آنا ہوتا تو پھر ہم یہاں نہ آتے۔" شجاع نے سوچا مگر منہ سے ایک لفظ نہیں کہا اور
اب وہ فرید احمد کی گاڑی میں بیٹھا ان کے گھر جا رہا تھا اسے یوں لگا جیسے یہاں آ کر بھی اسے سکون نہ ملا
طبیعت میں بے چینی' غصہ بہ دستور موجود تھا۔ سگنل پر گاڑی رکی تو اسے غصہ آیا' ٹریفک جیم میں گاڑی پھنسی تو
سے غصہ آیا۔ جب گھر کے قریب ہی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوا تو وہ غصے سے بپھر سا گیا۔

"ماموں اپنی گاڑی کی تو دیکھ بھال کر لیا کریں' اتنے لمبے سفر نے جو خوار کیا وہ علیحدہ...... آپ کی گاڑی نے
اس سے زیادہ تنگ کر دیا۔ اس گاڑی میں بیٹھنے سے تو بہتر تھا کہ اسٹیشن سے پیدل چل کے گھر آ جاتے۔"

نگین کا چہرہ مارے شرمندگی کے پیلا سا پڑ گیا۔ فیروزہ خجالت سے ہنسنے لگیں اور فرید احمد کھسیا کر
لے "کراچی کی سڑکیں اتنی اعلیٰ ہیں کہ یہاں شوروم سے نکلی ہوئی زیرو میٹر گاڑی اپنے گھر جاتے جاتے پنکچر
ہو جاتی ہے اس میں میرا اتنا قصور نہیں ہے جتنا کہ یہاں کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کا ہے۔"

"اونہہ! پتا نہیں کس کا قصور ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑا کر غصیلے انداز میں باہر دیکھنے لگا اور نگین اس کی باتیں سن
کر یدہ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

☆☆☆

نادر کئی دنوں سے کالج کے گیٹ پر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دو دن تو ثنا نے کوئی خیال نہیں کیا مگر جب تواتر سے
غائب پایا تو دل کو ایک گونہ سکون سا محسوس کیا۔

گھر آئی تو بیلا نے بتایا "نادر اسپتال میں ہے' بہت طبیعت خراب ہے۔"

"کیا ہوا؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے' کسی کو پہچان بھی نہیں رہا' آنٹی بھی دوسرے شہر گئی ہوئی ہیں' مجھے لگتا ہے کہ وہ
جائے گا۔"

"کیا بخار میں لوگ مر جاتے ہیں؟" ثنا نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں جب یہ حالت ہو جائے تو مشکل سے ہی بچتے ہیں' میرے خاندان میں تو ایسی کئی ڈیتھ ہوئی ہیں۔"

"بھابی آپ آنٹی کو فون کر کے بلا لیں تاکہ وہ انتقال والے دن اپنے بھائی کے پاس موجود ہوں۔" ثنا انتہائی

سادگی سے بیلا سے کہہ رہی تھی۔

”کیسی کٹھور ہو تم ثنا‘ ایک جوان شخص مر رہا ہے اور تم کو افسوس تک نہیں ہے۔“

”میرے افسوس کرنے سے کیا اسے زندگی مل جائے گی؟“

”ڈاکٹر اسے فوراً ڈسچارج کر رہے ہیں کہ آخری وقت پر اسے گھر لے جاؤ‘ تم اگر اس کی خیریت پوچھ لو یہ تمہارا آنٹی پر بھی احسان ہوگا کہ ان کے جوان بھائی کی کسی نے جان بچا دی۔“

”نادر بھائی جب گھر آ جائیں تو مجھے بتا دیجیے گا‘ میں آپ کے ساتھ خیریت پوچھ لوں گی۔“

”ابھی ثنا اپنے کمرے میں نماز پڑھ کر کے لیٹی ہی تھی کہ بیلا آندھی طوفان کی سی تیزی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی اور کہا ”ثنا جلدی سے آ جاؤ نادر شاید آخری سانسیں لے رہا ہے۔“

”کیا وہ آ گئے۔“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہاں آنٹی کے کمرے میں لیٹے ہیں...... جلدی سے آ جاؤ۔“ ثنا دوڑ کر اس کے ساتھ باہر نکلی۔

”تم جاؤ میں طاہر کو فون کر کے جلد گھر آنے کا کہتی ہوں۔“ ثنا جب آنٹی کے کمرے میں پہنچی تو نادر سفید پر سینے تک چادر اوڑھے آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ لبوں سے آہیں جاری تھیں جیسے وہ کسی سخت تکلیف میں ہو ہمت کر کے کمرے میں بڑھی نادر کو یوں مرتا ہوا دیکھ کر اسے واقعی دکھ سا ہوا۔

”سنیے آپ ٹھیک ہو جائیں گے‘ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ بہ مشکل جملے اس کے لبوں سے نکلے۔ نادر نے کر آنکھیں کھولیں اور گلوگیر لہجے میں کہا۔

”ثنا میں مر رہا ہوں۔“

”ابھی طاہر بھائی آنے والے ہیں‘ وہ آپ کو اچھے سے اسپتال لے جائیں گے۔“ وہ پریشانی میں بول رہی تھی

”مجھے بیکار کی امید مت دلاؤ‘ اب میں خوشی خوشی موت کو گلے لگا لوں گا کہ میں نے اپنی محبت کو اپنے دیکھ لیا۔“ اے موت تو جلدی میرے پاس آ جا کہ میری زندگی کی آخری خواہش پوری ہو گئی۔“ نادر نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”اللہ نہ کرے‘ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”ثنا پلیز صرف ایک بار کہہ دو تم...... کہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔“

”جی......!“ مارے تحیر کے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”پلیز ثنا صرف ایک بار مرتے ہوئے شخص کی خوشی پوری کر دو۔“

”آپ کو کچھ نہیں ہوگا آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

اب اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے قریب آئی تو یکبارگی نادر نے اس کا ہاتھ لبوں سے لگا کر چوم لیا اور اپنی گردن تکیے پر یوں ڈال دی جیسے اس کا دم نکل گیا ہو اور ثنا کے سارے جسم میں سی پھیل گئی۔ اس کے ساتھ آج تک ایسا کہاں ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے ہاتھ پہ کوئی آبلہ نکل آیا ہو۔

”ارے...... نادر مر گیا۔“ بیلا کمرے میں داخل ہو کر چلائی تو اسے تازہ صورت حال کا علم ہوا۔ تب ثنا آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔

”ہاں بھابی...... نادر بھائی مر گئے۔“

”میں طاہر کو فون کرتی ہوں کہ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔“ بیلا روتی ہوئی کمرے سے بھاگی اور ثنا

نادر کے سرہانے پہنچ گئی اور گلوگیر لہجے میں بولی۔

”نادر مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو ورنہ میں تمہیں کبھی مرنے نہیں دیتی۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میری بے اعتنائی نے تمہاری جان لے لی...... کاش میں تمہاری محبت کو پہچان جاتی ......“ وہ دونوں ہاتھوں کو چہرے پر ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور نادر کی موت کا خود کو ذمے ٹھہرا رہی تھی۔ تب نادر نے انتہائی ہولے سے پکارا۔

”ثنا...... پانی...... پانی...... پانی“ برق رفتاری سے پاس رکھے جگ میں سے پانی انڈیل کر ثنا نے اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ پانی پلاتے سمے اس کی پیٹھ کو اس نے سہارا دے رکھا تھا اور جب اسے لٹایا تو اس کے ہاتھ نادر ہاتھوں میں تھے اور وہ انہیں اپنی آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا اور جب بیلا کمرے میں گھبرا کر داخل ہوئی تو نے شرما کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور مسکرا کر باہر نکل آئی۔ اندر کمرے میں بیلا خوشی سے چیخ رہی تھی ”اللہ تیرا صد نادر کو اللہ نے بچا لیا...... اللہ تیرا احسان۔ نادر جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔“

دوسری جانب ثنا از خود مسکرا رہی تھی۔ محبت کے بیج میں سے کونپل پھوٹ آئی تھی اور اس وقت نادر اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ تو چلا گیا مگر اس کے وجود کی
خوشبو بسی ہوئی میرے شام و سحر میں ہے
یہ واہمہ ہے یا کہ حقیقت‘ خبر نہیں
میں اس کا ہم سفر ہوں وہ جس رہگزر میں ہے

☆☆☆

”امی میرا معاہدہ ختم ہونے والا ہے اور اب میں پاکستان جا سکتا ہوں۔“ ایک شام جمال نے ماں سے کہا۔

”یہاں ٹورنٹو میں کیا تکلیف ہے؟ معاہدہ بڑھ بھی سکتا ہے‘ تمہاری کمپنی والے تو تمہیں بہت مانتے ہیں۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر مجھے اپنا ملک بہت یاد آ رہا ہے...... دل چاہ رہا ہے دوڑ کر اپنے گھر پہنچ جاؤں۔“

”مگر ربیع کے تو چند ماہ بعد بال بچہ ہونے والا ہے‘ میں اس کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“ انہوں نے لہجے میں کہا۔

”آپ ربیع کے پاس رہ لیں اور جب دل چاہے پاکستان آ جائیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے اس کے فارغ ہونے کے بعد میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“

”پھر میں آئندہ ویک پاکستان چلا جاؤں؟“

”ارے کیا تم اتنی جلدی جانا چاہتے ہو؟“ انہیں اس پر حیرت سی ہوئی۔

”امی آپ پریشان نہ ہوں‘ میری کمپنی میں اللہ کے فضل سے ساکھ بہت اچھی ہے‘ جب میں کینیڈا آنا چاہوں آسانی آ سکتا ہوں مگر ان دنوں میرا یہاں دل بہت گھبرا رہا ہے‘ سخت گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے ملک گا‘ اپنے دوستوں سے ملوں گا تو میں یقیناً بہتر محسوس کروں گا۔“

”شادی کے نام پر تو بھاگتا ہے‘ آج یہاں شادی کر لیتا...... بیوی بچے ہوتے تو کاہے کو دل گھبراتا‘ خوش نہیں رہتا۔ ربیع کو بھی اچھا لگتا کہ پردیس میں وہ تن تنہا نہیں ہے‘ بھائی کا گھر موجود ہے اور وہ جب دل آ سکتی ہے۔“

"امی، میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے سا

"قندیل اپنی بہن سے تیری شادی کرنا چاہتی ہے، شکیل بھائی نے کئی بار اپنی بھانجی کے لیے کہا، نس تو کھلم کھلا اپنی بیٹی کا نام لے کر کہا...... آنٹی مجھے جمال بہت اچھا لگتا ہے اور میں اپنے داماد میں ایسی ہی دیکھوں گی۔ تمہارے آفس کی کتنی لڑکیاں گھر تک آئیں مگر ہر ایک کو دیکھ کر تم نے منہ پھیر لیا۔ اس پر تم یہ ک تمہارے ہاتھ میں شادی کی لکیر نہیں ہے۔"

"اس وقت تو مجھے پاکستان جانے دیں، وہاں سے واپس آؤں گا تو پھر اس مسئلے پر سوچیں گے۔"

"جو بات کل سوچنی ٹھہری اس پر آج ہی سوچ لو۔"

"نہیں امی میں ابھی کسی سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا کسی کو آس دلا کر آئے ہو جو وعدہ نہیں کر سکتے۔" ماں کو غصہ ہی تو آ گیا۔ بات کو ٹالنے کا وہ ہر ہنر جو جانتا تھا۔

"امی، آپ جانتی ہیں کہ میں اس ٹائپ کا لڑکا ہرگز نہیں ہوں۔"

"نہیں بیٹا جمال میں تجھے واقعی نہیں جانتی، اگر جانتی ہوتی تو کب کی اپنی منواتی اور تو یوں تنہا، یوں یوں پریشان سا نہ پھر رہا ہوتا۔ تیرے ساتھ کے تمام دوستوں کی شادیاں ہو گئیں اب صرف تو ہی بچا ہے تنہا اکیلا اور پریشان سا گھومتا رہتا ہے۔"

"حد ہو گئی ہے امی...... آپ نے تو میرے اندر نہ جانے کئی خامیاں ڈھونڈ لی ہیں جیسے تمام شادی شد بڑے خوش و خرم رہتے ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے، شادی کا نام ہی خوشی ہوتا ہے مگر تو ہے کہ ایسی تمام خوشیوں کو اپنے سے دور ہوئے ہے۔ پیارے بیٹے آج تو مجھے سچ سچ بتا دے کہ تیرے دل میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں امی۔" وہ پریشان سا ہو کر بولا۔

"جھوٹ مت بول بیٹے! کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے، کوئی نہ کوئی لڑکی تیری زندگی میں ہے جس کی سے تو شادی سے انکاری ہے۔ پیارے بیٹے اگر ایسا ہے تو مجھے بتا دے، میں ہر صورت میں تیری شادی اس کردوں گی، چاہے وہ کتنی ہی غریب ہو، کتنی ہی معمولی شکل کی ہو، کسی بھی فیملی سے تعلق رکھتی ہو، کم از کم سکون تو ہو گا کہ میرے بیٹے کا گھر بس گیا ہے۔"

"پلیز امی آپ میرا یقین کریں۔" جمال نے بات ادھوری کہہ کر پیٹھ موڑ لی۔ اس کی ہمت نہیں تھی کہ بگڑی حالت کو ماں کو دکھلائے۔

"پہلے تیرے پاس یہ بہانہ تھا کہ چھوٹی بہن کی شادی ہو جائے، اس کے فرض ادا کرنے سے پہلے میں بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ربیع کی شادی نہ صرف خیر و عافیت سے ہو گئی بلکہ وہ میں بھی بے حد خوش و خرم ہے۔ ربیع کے جانے کے بعد میں کتنی اکیلی رہ گئی ہوں تجھے میری تنہائی تک کا احسا نہیں ہے۔"

"کہا ہے ناں امی آپ سے کہ جب میں کینیڈا آؤں گا تو آپ جہاں دل چاہے میری شادی کر دیجیے۔"

"تیری اپنی کوئی پسند نہیں؟"

"نہیں۔"

"تیرے دل میں واقعی کوئی نہیں بستی؟"

"نہیں......؟"

"اگر ایسا ہے تو قندیل کی چھوٹی بہن سے منگنی کر کے چلا جا، جب آئے گا تو شادی ہو جائے گی۔"

"نہیں امی ابھی کچھ نہیں جب میں آؤں گا تب آپ کسی سے کچھ کہیے گا اتنی جلدی کچھ نہ کریں۔"

"جمال بیٹا...... مجھے تو واقعی اتنی جلدی ہے کہ اگر تجھے پاکستان میں کوئی پسند آ جائے تو شادی کر لینا، ولیمہ میں ہو جائے گا۔"

"اب ایسی ہنگامی سچویشن بھی نہیں ہے۔" ماں کی بات سن کر اسے ہنسی آ گئی...... اور اپنے آپ پر اس نے قابو لی سعی کی۔

"اپنے محلے میں فیروزہ فرید بہت اچھی خاتون ہیں، ان کی لڑکی نگین مجھے پسند تھی اگر اس کی کوئی کزن وغیرہ ہو فرید احمد سے پوچھ لینا اچھے لوگ ہیں۔" انہوں نے بیٹے کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"امی ان کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں، اب انہیں کسی سے بھلا کیا دلچسپی ہو گی۔ جمال کو ماں کی باتیں ن کر اب وحشت سی ہو رہی تھی کہ جانے انجانے میں ان کے لبوں پر نگین کا ذکر آ ہی گیا تھا۔ اس نام سے وہ جتنا خود بچنا چاہ رہا تھا وہ از خود اس کے مابین آ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنکھیں سختی سے بند ر لیں۔ تب اسے لگا سامنے بر فیلے تودے پر نگین کھڑی اسے دیکھ کر ہنس رہی ہو۔

"کیوں ہنس رہی ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری حالت پر۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟"

"تم منافق ہو گئے ہو، تمہارا دل کچھ کہتا ہے اور زبان کچھ اور کہتی ہے۔"

"میرے دل کی بات تم کیا جانتی ہو۔" اس نے حراساں ہو کر پوچھا۔

"جس کو تم ہمہ وقت یاد کرتے ہو کیا اس کو پتا نہیں چلتا۔"

"تمہیں پتا ہے کیا کہ میں......" وہ پوچھتے پوچھتے رک سا گیا۔

"ہاں...... مجھے پتا ہے۔" یہ کہہ کر نگین کا ہیولا غائب ہو گیا اور جمال اپنا سر تھام کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

امی ٹی وی لاؤنج میں اردو چینل سے فراز کی غزل سن رہی تھیں اور جمال کو یوں لگ رہا تھا جیسے ٹی وی پر بھی اس کا ذکر ہو رہا ہو۔

پھرا ہوں سارے زمانے میں دربدر کیسا
میں تیرے بعد بھی زندہ رہا مگر کیسا
وہ جانتا تھا کہ کچھ روز وہ نہیں تھا تو میں
پکارتا رہا اس کو ادھر ادھر کیسا
نہ اعتبار نہ آسودگی نہ قرب تیرا
فقط تکلیف دیوار و در ہے گھر کیسا
عزیز تر تھی جسے نیند شام وصل میں بھی

وہ تیرے ہجر میں جاگا ہے عمر بھر کیسا
بس ایک شخص کی خاطر بس ایک دل کے لیے
وطن کو تج دیا دیوانگی میں گھر کیسا
کہاں کی دوستی' کیسا فراق' کون فراز
میں خود کو بھول گیا' تجھ کو بھول کر کیسا

آنکھوں میں آنسوؤں کی حنا سی ہے ان دنوں
دل کو بھی شوق درد شناسی ہے ان دنوں
گر ہوسکے تو آکہ میری جاں تیرے بغیر
ماحول میں شدید اداسی ہے ان دنوں

☆☆☆

شجاع اور نگین کے جانے کے بعد عظمت بیگم نے بستر کی کمر پکڑ لی تھی۔ کہاں تو وہ ہر جگہ خوب گھومتی تھیں' شجاع کے جانے کے بعد ان سے از خود بستر سے اٹھنا محال ہو گیا تھا۔ آنگن تک جانا ہوتا تو دیوار سہارے چلتی ہوئی جاتی تھیں۔ گاؤں کے ہر گھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ شجاع ماں کو چھوڑ کر بیوی بچوں کو لے کر کراچی چلا گیا ہے۔ اب ہر کوئی عظمت بیگم کے پاس آرہا تھا اور عظمت بیگم کو لگ رہا تھا جیسے لوگ ان کے پاس تعزیت کے لیے آرہے ہوں۔ کسی کے دلاسے انہیں کسی قسم کا بھی سکو پہنچانے سے قاصر تھے۔ تنگ آکر انہوں نے فرحت سے کہہ دیا۔

''اب کوئی بھی آئے اسے لے کر تم میرے کمرے میں مت آنا۔ لوگوں کی باتیں سن کر مجھے وحشت ہو لگی ہے' میں اکیلی تھی' اکیلی رہوں گی...... دنیا کے بیٹے اپنی ماؤں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں' میرا بیٹا بھی مجھے کر چلا گیا ہے تو اس میں کون سی عجیب بات ہے۔''

حکیم جی کی بیگم کے آنے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی کہ ان سے دوستانہ عرصے سے تھا مگر جب انہوں بھائے رکھنے کی غرض سے عظمت بیگم سے یہ کہا۔

''تم دیکھ لینا شجاع کراچی جا کر پریشان ہو جائے گا' جس طرح اس نے آپ کو دکھ دیا ہے' دنیا اسے دکھ د گی۔'' تو عظمت بیگم چیخ ہی تو پڑیں۔

''خبردار! جو آگے ایک لفظ بھی کہا...... ابھی شجاع کی ماں مری نہیں جو تم میرے بچے کو کوسنا بھی ہو گئیں۔ اللہ اسے لمبی حیاتی دے' پریشان ہوں اس کے دشمن...... اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے اگر وہ دکھی ر کیا میں سکھ سے رہ پاؤں گی ہرگز نہیں۔'' اب وہ سینے پر دوہتڑ مار کر بین کر رہی تھیں۔

فرحت ماں کی یہ حالت دیکھ کر پریشان تھی کہ شجاع کے جانے کے دکھ نے ان کے دل' دماغ پر بری طرح ڈالا تھا مگر وہ اپنی مامتا سے مجبور تھیں۔ زبان سے بہت کچھ کہنے کے باوجود وہ اس کا ہرگز برا نہیں چاہتی تھیں کی یاد میں وہ اشکبار ضرور تھیں مگر ان کا رواں رواں اس کے لیے دعا گو تھا۔ یہ ایک ماں کی محبت تھی جسے شجاع کوئی بیٹا بھی سمجھ نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

ایک مدت دھڑکتا رہا میرا دل
آپ کی راہ تکتا رہا میرا دل
اک کلی سی کھلی تھی تمناؤں کی
ایک عرصہ مہکتا رہا میرا دل

نادر کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا...... اسے تو یوں لگتا تھا جیسے اسے کہیں سے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ خوبصورت' کم عمر' ڈاکٹر لڑکی کی محبت پا لینا اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہ جگہ یہ اعلان کرا دے کہ ثنا اس کی محبت ہے اور اب وہ بہت جلد اس سے شادی کرے گا۔

کیا ہوا کہ اس نے کینیڈا میں کئی شادیاں کی تھیں' کیا ہوا کہ اس کے خاندان والے اسے اپنی لڑکی دینا پسند ہیں کرتے تھے' وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ثنا اور اس کا خاندان اس کے ماضی سے سے قطعاً نا آشنا ہے۔

بیلا کو جب اس کے خیالات کا علم ہوا تو اس کا مشورہ یہ تھا کہ ''ابھی تم شادی کے چکر میں بالکل نہیں پڑو گے' پہلے ثنا کو اپنی محبت کے جال میں اتنا جکڑ لو کہ وہ باہر نکلنے کے بارے میں سوچ تک نہ سکے۔''

''آپ کا آئیڈیا زیادہ اچھا ہے' میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی۔'' وہ بھانجے کی بیوی کو ایسی تعظیم دے رہا ہیے' وہ اس کی پرنسپل ہو۔

''ثنا بے حد تیز اور چالاک لڑکی ہے' تم نے کہیں بھی غلطی کی تو وہ نہ صرف تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی تمہاری امی' پاپا کی نظروں سے ساری زندگی کے لیے تمہیں دور کردے گی۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بیلا آپا۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

''فی الحال خوب گھومو پھرو' خوب کھلاؤ پلاؤ' چھوٹے موٹے گفٹس دو...... لڑکیوں کے لیے شروع میں یہ یں بھی بڑی اہمیت کی ہوتی ہیں۔''

''مگر اس کو دیکھ کر اپنے آپ پر قابو پانا بھی خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔'' وہ لفنگے پنے سے کہہ رہا تھا۔

''مت پانا قابو مگر ابھی نہیں ہر کام دھیرے دھیرے ہی کرنا چاہیے کہ مت بھولو وہ ایک پڑھی لکھی اور خاصی ن لڑکی ہے۔''

''مگر میرے عشق نے اسے بھی نکما کر دیا ہے۔''

''تمہارے عشق نے نہیں' میری پلاننگ نے۔'' بیلا نے ہنس کر اس پر احسان جتاتے ہوئے کہا۔

''جو بھی کہیں مگر لاٹری تو میری نکلی ہے ناں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس کو یوں سرشار دیکھ کر بیلا بھی مسکرانے لگی۔

نادر خوشی سے گنگناتے ہوئے بولا۔

''کچھ یوں اس کا چہرہ باتیں کرتا ہے
جیسے صبح کا تارا باتیں کرتا ہے''

''یہ بات نہیں ہے نادر...... محبت میں ہر چیز بولتی ہوئی نظر آتی ہے...... خاموش مناظر بھی داستانیں سنا ہوئے محسوس ہوتے ہیں' دھوپ کی تمازت بھی ایسی لگتی ہے جیسے سونے میں سے چھن چھن کر روشنی آ رہی ہو۔'' نے فلسفیانہ انداز میں کہا تو نادر بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر گھڑی دیکھ کر ثنا کے کالج جانے کے لیے تیزی سے لپکا۔

وہ دونوں اس وقت ایک کیفے میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ثنا کے چہرے پہ شرمیلی سی مسکراہٹ تھی نادر اس کے کانوں میں فسوں پھونک رہا تھا۔

''تم میرے لیے وہ تحفہ عظیم ہو جس کے لیے میں جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہوگا۔ میں یہ سب نہیں جانتا حسن کس کو کہتے ہیں اور خوبصورتی کیا ہوتی ہے' مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ جہاں آنکھ جا کر ٹھہر جائے' منظر ہوئے رک سے جائیں وہ ثنا کا وجود ہے۔ جس کو دیکھ کر کبھی دل نہیں بھرتا۔ یاد کرو ثنا تم مجھ سے کتنا بھاگیں۔ کیسے ڈرٹی لکس دیے مگر میں میدان عشق میں ثابت قدم یہاں تک رہا کہ موت کو بھی جل دے کر آ گیا۔''

''پلیز نادر اب ان پرانی باتوں کو چھوڑ یئے ناں۔''

''تمہیں دیکھ کر تو میں اپنے آپ کو بھولا جا رہا ہوں' رات کھانا کھائے بغیر سو گیا' تمہاری یادوں میں مست ہوں کہ اب کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔''

''یہ تو غلط بات ہے' اپنے آپ سے اس قدر غافل نہ ہوا کریں۔ میں بحیثیت ڈاکٹر آپ سے یہ کہوں گا اپنا خیال آپ نے بے حد رکھنا ہے۔''

''نہیں ثنا اب تو بس تمہیں دیکھ دیکھ کر جینا ہے۔''

''میں آپ کے پاس ہی تو ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''تمہارا میڈیکل ختم ہو جائے گا تو پھر سے کراچی چلی جاؤ گی۔''

''میں امی سے کہوں گی کہ مجھے ہاؤس جاب بھی یہیں کرنا ہے یوں ایک سال کی مدت مجھے مزید مل جا گی۔''

''یہ ہوئی ناں بات۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''چلیں اب گھر چلیں۔'' وہ اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

''دل تو نہیں چاہ رہا۔'' وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوا اپنی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈالتے ہو بولا۔

''اب ہر وقت دل کی تو نہیں سنی جائے گی ناں......'' ثنا کو اس کے انداز دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔

''اگر سن لی جائے تو کیا مضائقہ ہے۔''

''باقی باتیں کل ضرور سنوں گی...... کالج سے دیر سے گھر پہنچوں گی تو بیلا بھابی کیا سوچیں گی۔''

''پیار کرنے والوں کو کسی کی پروا نہیں ہوا کرتی ہے اور بیلا تو بڑی گریٹ لڑکی ہے۔ اسے ہمارے بارے سب علم ہے ان سے کاہے کا کھٹکا۔''

''مگر مجھے شرم آتی ہے جب وہ مجھے چھیڑتی ہیں۔''

''تم تو پاگل ہو۔'' نادر کا لہجہ لاڈ بھرا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو نادر۔'' ان دنوں تو شاید میں واقعی پاگل ہو گئی ہوں' تمہارے سوا مجھے کچھ دکھائی

انا ایسا لگتا ہے کہ ہر سو تم ہی تم ہو' جدھر نظر اٹھاتی ہوں مجھے تم ہی نظر آتے ہو۔''

''پاگل لڑکی اسی کو تو محبت کہتے ہیں۔'' وہ اس کے شانوں کو اپنے ہاتھ سے دباتے ہوئے بولا۔

''ثنا اچھل کر فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔''

''کیا ہوا......؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

''کیا کرتے ہیں آپ...... سب لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں' کیا سوچتے ہوں گے بھلا۔''

''سوچنے دو' میں کیا ان سے ڈروں گا۔''

''آپ نہ ڈریں مگر یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''کیا تمہیں میں اچھا نہیں لگتا۔'' وہ مخمور لہجے میں مسکرا کر بولا۔

''یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔''

''پیاری لڑکی واضح طریقے سے اقرار کرنا بھی سیکھو......'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آگے کی جانب لئی قدمی کرتے ہوئے بولا۔

''اگر اچھے نہ لگتے تو روز کالج کے بعد تمہارے ساتھ ٹائم گزارتی میں......'' اس نے شکوہ بھرے انداز سے لہا۔

''ہاں یہ تو ہے جانم......'' نادر نے بے ساختہ اس کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے چوم لیا اور وہ بلش ہو گئی۔

''نادر......'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے تیکھی انداز میں دیکھا۔

''اچھا یار معاف کر دو۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ کر منمنا کر کہا۔

تب وہ اس کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی۔

''ویری نائس...... ہنستے ہوئے تم بہت کیوٹ لگتی ہو۔''

''یہ مجھے معلوم ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

اور نادر اس کی اس بات پر بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

☆☆☆

''کہاں غائب تھیں چار دن سے۔'' پشت پر آواز سن کر رعنا نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جمیل آذر اس سے بڑی بت سے استفسار کر رہا تھا۔

''گھر میں کام بہت تھے ناں۔''

اب وہ کیا کہتی کہ میں تم سے ڈر سی گئی تھی' تمہارے لہجے نے مجھے ڈرا دیا تھا اس لیے جان بوجھ کر یونیورسٹی ہیں آئی تھی۔

''سچ رعنا مجھے یہ چار دن اتنے بور لگے کہ بتا نہیں سکتا۔ مت کیا کرو چھٹی۔ تم سے باتیں کرتا ہوں تو ایک ب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔'' وہ انتہائی سادگی سے اور صدق دل سے کہہ رہا تھا۔

''ایسا کائے کو بول رہے آپ......؟''

''جو میں محسوس کر رہا ہوں وہی کہوں گا ناں۔''

''یہ سوب غلت باتاں ہیں بول کے...... امی جی بولتے کہ لڑکیوں کو لڑکیوں کے سنگات رہنا چاہیے تو پھر آپ کائے کو میرے پیچھے پیچھے پھرتے۔''

”کیسی باتیں کر رہی ہو رعنا تم۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”جمیل صاب میں آپ سے دوستی نکو کر سکتی۔“

”کیوں……!“ وہ تیوری تان کر اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”لوگاں بولیں گے ان دونوں کے بیچ کوئی بات ہوئیں گی اس واسطے مل کو بیٹھے یہ دونوں۔“

”بولنے دو لوگوں کو‘ مجھے پروا نہیں ہے۔“

”مگر میرے کو تو پروا ہے ناں‘ یونیورسٹی میں اس وجہ سے تو نہیں آئی کہ بدنامی لے کو گھر جاؤں۔“

”رعنا…… کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی نہیں ہو سکتے۔“ جمیل آذر ملتجی لہجے میں بولا۔

”اتنا مت ڈرا کرو ورنہ ہمیشہ پریشان رہو گی۔“

”چلیے ٹھیک ہے خالی دوستی ہوئیں گی…… کوئی بیچ میں دوسری بات نکیں ہوئیں گی۔“

”دوسری بات سے کیا مراد ہے تمہاری……“ جمیل کو اس کے اس انداز پر ہنسی ہی تو آ گئی۔

”عشق کا لفڑا نہیں ہوئیں گا…… محبت کا کوئی تماشا نکو کھڑا کرنا۔“

”او کے…… اب ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں۔“ جمیل آذر نے اس کا نرم ملائم ہاتھ تھام لیا۔

رعنا نے ایک لمحے سوچا اور پھر اپنا دوسرا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا۔

رعنا نے یہ سوچ لیا تھا کہ جمیل سے دوستی کے طفیل اس کو یونیورسٹی میں گپ شپ کرنے میں لطف ہی آ کہ اس کی سہیلیوں کے گروپ کو بھی جمیل کی باتیں بڑی اچھی لگا کرتی تھیں اور انہیں اس بات پر حیرت ہوتی کہ ایک اتنا اچھا…… لڑکا رعنا سے اس قدر امپریس بھی ہے۔

اب روزانہ جمیل آذر رعنا سے ضرور ملاقات کیا کرتا تھا۔ رعنا بھی انتہائی سادگی سے اس سے ہر با کر لیا کرتی تھی۔

”آج میرے کو عید کی خریداری کے لیے جانا ہے‘ امی بول رہے تھے اچھا سا جوڑا لے کو آؤ تا کہ عید کے پہن کے صابرہ خالہ کے ہاں جاؤں۔“

”صابرہ خالہ کے ہاں کیوں جانا ہے تم کو؟“

”شاید میں ان کی بہو بن کے جاؤں…… لگتا تو نہیں میرے کو مگر شات (شاید) ایسا ہو جائیں گا۔

”تمہیں ایسا کیوں نہیں لگتا۔“ جمیل کو تو دھڑکا سا لگ گیا۔

”خالہ کے بیٹے منور اپنے آپ کو لاٹ صاب سمجھ کو بیٹھے ناں۔“ اپنے اگے کسی کو پوچھتے نکو‘ میرے کو تو چا بولتے…… مگر امی جی یہ چاہتے ناں کہ میری شادی منور کے سنگات ہوں۔“

”جب منور تم کو پسند نہیں کرتا‘ تو ایسی زبردستی کی شادی کا فائدہ کیا۔“ جمیل نے اسے رسان سے سمجھا ہوئے کہا۔

”میں بھی یہی اچ بولی تھی مگر امی یہ بولتے کہ بعد کو سوب ٹھیک ہو کو جائے۔“

اور جمیل آذر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

”منور بہوت اچھا دکھتے‘ نئی جاب بھی اچھی ہے انوں کی‘ خابل بھی بہت ہیں مگر زبان کے بہوت کڑو ایک دم نیم دکھتے…… مگر امی بولتے کہ منور بہوت اچھے ہیں اس لیے میں چپ کر کے بیٹھی۔“

”جمیل چپ چاپ اسے دیکھتا رہا‘ ایسی معصوم‘ ایسی سادہ سی لڑکی اس نے کہاں دیکھی تھی۔

اس نے تو چالاک‘ مکار اور چالباز ٹائپ لڑکیاں دیکھ کر ہی اپنے آپ کو اپنے خول میں قید کر لیا تھا مگر رعنا کا معصوم سا حسن اور سچا کھرا انداز دیکھ کر وہ اس کی جانب کھنچا چلا آیا تھا مگر اس سے مل کر یہ احساس ہوا تھا کہ وہ بھی ی کی امانت تھی۔

جمیل آذر کا دل بجھ سا گیا تھا مگر رعنا کی شخصیت میں اسے ایک ایسی مقناطیسیت سی محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس ے ملنے کے لیے ہر وقت بے چین سا رہتا تھا۔

”تم جادوگرنی تو نہیں ہو رعنا؟“ ایک دن یونیورسٹی میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے جمیل نے ہنس کر پوچھا۔

”اللہ کیا اول فول بک رہے آپ‘ میں آپ کو اس طرح کی دکھتی۔“

”ہاں جادوگرنی تو ہو‘ اس وقت میں اچھا خاصا لائبریری جا رہا تھا‘ تم سامنے سے آتی نظر آئیں میں لائبریری جانے کے بجائے تمہارے پاس آ گیا۔“

”میں تو نکو بلائی ناں آپ کو……“ وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

”تم نہ بلاتیں تو میں کیسے آتا‘ تمہارا وجود تو مجھے آوازیں دے رہا تھا۔“

”خدا کی خصم میں کوئی آواز نکیں دی آپ کو۔“ وہ معصوم سے انداز میں بولی۔

”رعنا بعض آوازیں بالکل سنائی نہیں دیتیں مگر ان کی پکار محسوس ہوتی ہے۔ جیسے مجھے لگا کہ تم مجھے دیکھ کر کہہ رہی ہو۔

”آ جا…… آ جا رے میرے دلبر…… آ جا……!

میں کب سے کر رہی ہوں تیرا انتظار آ جا!“

”اللہ میں کاں جاؤں‘ کیسی جھوٹی باتاں کرتے ہیں آپ‘ میں تو کچھ نکیں بولی تھی آپ سے۔“

”میں نے کہا ہے ناں کہ بعض آوازیں سنائی نہیں دیتیں‘ تو تم نے وہ آواز نہیں سنی مگر میں اس پکار پر دوڑا چلا آیا۔“

”اب میں کیا بولوں جی کہ عقل کام نکو کرتی اب۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم…… جب دل کی باتیں غالب آ جاتی ہیں تو عقل کام وام نہیں کیا کرتی ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور رعنا کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کے اہر آ جائے گا۔

☆☆☆

”سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں‘ بے ایمانی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں بے پروائی ڈبو دیتی ہے۔ ہزار بار میں ع کیا تھا ادھار کسی کو سامان نہیں دینا ہے مگر دیتے رہے‘ ایجنسی کے سامان کا رجسٹر تک کھو دیا ہے۔“ فرید احمد الی ٹاپ سے آ کر مسلسل چلا رہے تھے۔

”دکان میں تو یہ سب چلتا ہی رہتا ہے مگر آپ کیوں چیخ چیخ کر اپنے آپ کو پریشان کر رہے ہیں۔“ فیروزہ بھانے کی سعی کی۔

”بہت محنت سے پیسا آتا ہے مگر یہ ملازمین سارے کے سارے چور ہیں‘ ان کا کتنا ہی خیال رکھو مگر ہمیشہ ہو جاتے ہیں۔“

”کوئی قابل بھروسا شخص ان کی نگرانی کے لیے کیوں نہیں رکھ لیتے؟“

''کہاں سے لاؤں ایماندار شخص' آج کل ہر شخص کے منہ کو بے ایمانی کا خون لگا ہوا ہے۔''

''اے لو...... تم شجاع کو کیوں نہیں بٹھا لیتے اپنی دکان پر' ان دنوں وہ نوکری بھی ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کو کی ضرورت ہے اور ہمیں ایماندار شخص کی' اس سے بہتر شخص ہمیں کہاں مل سکتا ہے۔'' فیروزہ کے ذہن اچانک ہی اپنے داماد کا خیال آ گیا۔

''کہنا بھی نہیں تم اس سے۔'' فرید احمد نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بہت بڑے لاٹ صاحب ہیں تمہارے داماد...... دکان پر ان کا دل نہیں لگے گا۔''

''مگر کراچی تو بے روزگاروں کا شہر ہے یہاں اچھے اچھوں کو نوکری نہیں ملی' شجاع کو ملنی کیا آسان ہو گی۔''

''سال' چھ مہینے خوار ہو کر گاؤں چلا جائے گا اور اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا کر سکتا ہے۔''

''نگین کہہ رہی تھی وہ ہمیشہ کے لیے کراچی آیا ہے۔''

''دماغ چل گیا ہے کیا اس کا...... آپا اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہیں۔''

''رہ ہی رہی ہیں وہ...... شجاع کے لیے ایک فون بھی ان کا نہیں آیا اور نہ ہی اس نے یہاں آ کر ماما سے کوئی بات کی ہے۔ اب تو اتنے مہینے ہو گئے ہیں اس کو کراچی آئے ہوئے۔''

''خفا ہے شاید...... ایسے لوگ جتنی جلدی روٹھتے ہیں اتنی ہی جلدی من بھی جاتے ہیں۔ جب مان آئے گی تو جانے میں دیر بھی نہیں لگائے گا۔ اس وقت تو اس کی نوکری کا مسئلہ ہے اگر آپ کہیں تو میں اس بات کروں؟''

''مگر میں پانچ ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

''اتنے پیسے تو آپ اپنی دوکان میں کام کرنے والوں کو دیتے ہیں۔ پانچ ہزار تو کم رہیں گے' آپ کم از کم پندرہ ہزار روپے تو دیں۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا...... اتنے پیسے اگر میں شجاع کو دینے لگوں تو دکان تو چل گئی۔'' فرید احمد ہی تو آ گیا۔

''آپ کے بے ایمان نوکر ہر مہینے ہزاروں کا نقصان کروا دیتے ہیں اس کو آپ برداشت کر لیں گے مگر داماد کو پندرہ ہزار نہیں دے سکتے جو سب نوکروں کی چیکنگ بھی کرے گا۔''

''میں دس ہزار تک دے سکتا ہوں' اگر وہ دکان میں بیٹھنا چاہے تو پوچھ لینا' اس سے زیادہ تو ایک پیسہ دے سکتا۔''

''ٹھیک ہے میں ضرور شجاع سے بات کروں گی۔''

اور جب وہ شجاع سے بات کرنے کا سوچ ہی رہی تھیں...... شجاع ہنستا کھلکھلاتا اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ اس سے کہہ رہا تھا ''ہم کراچی میں خوب گھومیں گے' اس وقت میں بچوں کو لے کر کلفٹن جا رہا ہوں۔''

''مگر ہماری گاڑی تو ان دنوں خراب ہے' کیسے جاؤ گے؟''

''ممانی جان شہر کراچی میں ٹیکسیاں چلنی بند تو نہیں ہوئیں ناں۔'' وہ تمسخر سے ہنستا ہوا بولا۔

''اچھا تو کیا تم ٹیکسی پر جاؤ گے؟''

''میں نے ایک ہفتے کے لیے گاڑی ہائر کی ہے۔ بچوں کو' نگین کو یہاں کی سیر تو کرا دوں۔''

''میں تو سوچ رہی تھی کہ تم پہلے جاب وغیرہ کی فکر کرو گے۔'' فیروزہ آہستہ آہستہ لائن پر آنا چاہ رہی تھیں

''جاب بھی کر لوں گا پہلے اپنے ذہن کی گھٹن تو ختم کر لوں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

تب فیروزہ چپ سی ہو گئیں ''جب شجاع کو خود ہی نوکری کرنے کی فکر نہیں تھی تو وہ از خود اسے کیسے احساس الگیا۔''

نگین کو تنہا پا کر اسے سمجھانا چاہا کہ ''سیر سپاٹے تو بعد میں بھی ہو سکتے ہیں' پہلے اسے نوکری کی فکر کرنی ہیے...... '' تو اس نے بھی انہیں لاجواب کر دیا۔

''امی' شجاع کو میں کوئی بات بھی سمجھا نہیں سکتی' ان کے دماغ میں جو بات بیٹھ جاتی ہے اسے وہ کر کے رہتے ہیں۔''

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے' ایسے لوگوں کو تو لوگ پاگل کہتے ہیں۔''

''اچھی ہو یا بری...... آپ کا داماد ایسا ہی ہے' اسے آپ پاگل کہیں یا ذی عقل مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو اس کے ساتھ خوش تو ہے ناں؟''

''ہاں بہت خوش ہوں وہ میرا بے حد خیال رکھتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جو دل چاہے کرو مگر یہ بات اس کے کانوں میں ضرور ڈالتی رہنا کہ نوکری اسے بہر حال ضرور کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے کہہ دوں گی۔'' وہ مسکرا کر اٹھ گئی کہ شجاع اسے آوازیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے فریال کی طبیعت خراب تھی۔ جاتی گرمیوں اور آتے جاڑوں نے اسے بھی فلو میں مبتلا کر دیا وہ اپنے بوتیک سے گھر جلدی آ جایا کرتی تھی۔

ایک دن وہ گھر جا رہی تھی' تین ساڑھے تین کا عمل تھا اس کی گاڑی کے پاس سے تیزی سے بائیک گزری ۔ یوں لگا جیسے کسی لڑکے کے ساتھ ثنا بیٹھی ہوئی ہو۔ سگنل پر سرخ بتی آویزاں تھی مگر وہ بائیک سرخ روشنی کی ا لرتے ہوئے تیزی سے گزرتی چلی گئی تھی۔ لمبے بالوں کی چوٹی اور لڑکی کی پشت دیکھ کر اس کا دل دھڑک سا تھا۔

''خدا نہ کرے کہ وہ ثنا ہو۔'' اس نے دل میں گڑگڑا کر دعا کی۔

گھر پہنچتے ہی اس نے ثنا کے موبائل پر رنگ کیا تو ثنا نے کئی بیلز کے بعد اسے اٹھایا اور جماہی لیتے ہوئے لی' پھپو میں اتنی گہری نیند سو رہی تھی' لے کے آپ نے اٹھا دیا۔''

''کیا آج تم کالج نہیں گئی تھیں۔''

''گئی تھی مگر جلدی آ گئی...... میڈم افروز کے انتقال کی خبر آتے ہی ساری کلاسز آف ہو گئی تھیں۔''

''اللہ کا شکر کہ وہ تم نہیں تھیں۔'' فریال نے کھسیا کر کہا۔

''کون...... وہ نہیں تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''آج میں نے تمہارے جیسی لڑکی کو کسی لڑکے کے ساتھ بائیک پر جاتے دیکھا تھا۔''

''بیہودہ میرے جیسی ہو گی مگر میں تو نہیں تھی ناں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' فریال کے لبوں سے دعا نکلی۔

"آپ پریشان نہ ہوں آپ کی بھتیجی اس وقت اپنے گھر میں آرام کر رہی ہے۔"

"یہ جاسوس محترمہ کون تھیں۔" کیفے میں بیٹھے ہوئے نادر نے اس کی باتیں سن کر مسکرا کر کہا۔

"ابو کے ملنے والوں میں سے ایک خاتون تھیں۔ آج انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا ہے۔"

"دیکھنے دو جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔"

"نہیں نادر...... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"تو پھر کیا کریں...... اب ہم لوگوں کی آنکھیں تو پھوڑنے سے رہے۔"

"اب میں بائیک پر بڑا سا دوپٹا لپیٹ کر بیٹھا کروں گی۔"

"اور خالہ اماں نسل کا چشمہ بھی لگا لیا کرنا۔" نادر نے اس کی بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب یہ سب تو کرنا ہی ہوگا ناں۔"

"میں تو کہتا ہوں اپنے گھر میں ہی مل لیا کرو' آپا تو ویسے بھی ان دنوں ملتان میں ہیں' تم میرے گھر آجایا کرو۔"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا' گھر میں طاہر بھائی ہوتے ہیں' بیلا بھابی ہیں کیا سوچیں گے وہ لوگ۔"

"کچھ بھی سوچیں ہمیں اس سے مطلب نہیں ہے' میں تم سے ابھی دل بھر کر باتیں بھی نہیں کر پاتا جانے کی جلدی ہونے لگتی ہے۔"

"ٹیلی فون پر باتیں تو کر لیتی ہوں ناں۔"

"ثنا میں تم سے ساری ساری رات باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"پرسوں تیسرا ٹیسٹ ہے فی الحال نہیں کر سکتی' جلدی گھر چلو اس سے قبل کہ مجھے کوئی اور دیکھ لے۔" سے اٹھتے ہوئے بولی' مجبوراً نادر کو بھی اس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔

☆☆☆

"سائرہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کرنے راولپنڈی آئی تھی' اس کی ساس تو شا ولیمے سے فارغ ہو کر کراچی چلی گئی تھیں مگر سائرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بچیوں کے ساتھ مری میں بھی رہے اور اسلام آباد میں بھی وقت گزارے۔"

بلال ایک محبت کرنے والا شوہر تھا' وہ بھی سائرہ کے کہنے پر ان لوگوں کو مری گھمانے لے گیا تھا۔ سا عرصے کے بعد مری آئی تھی' اسے ایک ایک چیز اچھی لگ رہی تھی۔ دونوں بچیاں بھی بے حد خوش تھیں۔ موسم بھی اچھا تھا۔ سائرہ' بلال خوب انجوائے کر رہے تھے۔

مال روڈ سے انہوں نے خوب شاپنگ بھی کر ڈالی تھی۔ سب کو دینے کے لیے تحائف خریدے چکراتے راستوں سے جب وہ اسلام آباد پہنچے تو بارش نے ان کا استقبال کیا' ہرا بھرا سا اسلام آباد بارش نکھر گیا تھا۔

"کاش میرا شہر کراچی بھی اتنا صاف ستھرا سا ہو جائے جتنا کہ یہ اسلام آباد ہے۔" سائرہ نے بلال

"جب تک لوگ صفائی کو ایمان کا حصہ نہیں سمجھیں گے' ہمارا شہر صاف نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا آپ کے خیال میں اسلام آباد کے لوگ یہ سب سمجھتے ہیں۔"

"اسلام آباد میں لوگ ہی کتنے رہتے ہیں' کراچی کے مقابلے میں تو صرف بیس پچیس فی صد لوگ

تنے کم لوگوں کا خیال رکھنا اور شہر کو صاف ستھرا رکھنا کوئی بڑی خوبی کی بات نہیں ہے۔ بڑے شہروں کا خیال رکھنا ل بات ہوتی ہے۔" بلال کسی سیاست دان کی طرح بول رہے تھے۔

"پتا نہیں کب میرا شہر صاف ستھرا اور دھوئیں سے پاک ہوگا۔" وہ حسرت زدہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اپنے دل میں پورا یقین رکھو اور ایک اچھے شہری کے فرائض میں کبھی ڈنڈی مت مارو' ہمارا شہر بھی اچھا جائے گا' ٹوٹی ہوئی سڑکیں اور کھدی ہوئی گلیاں سب بن جائیں گی' انشاء اللہ۔"

راولپنڈی میں بلال اپنے عزیزوں کے گھر بھی جا رہے تھے اور سب انہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔

ائرہ کو دیکھ کر ان کی ایک ممانی نے خاص ناک بھوں چڑھا کر جب بلال سے پوچھا "غیروں میں تم نے رشتہ تو یا اب تمہاری بچیاں ٹھیک سے بھی پل رہی ہیں یا ان کی ذمے داری تمہاری ماں پر چل رہی ہے۔"

بلال نے پہلے یہ شکر کیا کہ اس وقت سائرہ کمرے میں نہیں تھی اور پھر اپنی ممانی سے کہا "سائرہ جیسی بیوی تو ت والوں کو ملتی ہے' میں اس ضمن میں جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہوگا۔ سائرہ نہ صرف ایک اچھی بہو اور بیوی بلکہ وہ ایک بہترین ماں بھی ہے' بے شک اس نے ان بچیوں کو جنم نہیں دیا ہے مگر وہ ان سے جتنی محبت کرتی اور جتنا ان کا خیال رکھتی ہے وہ ایک اچھی ماں ہی کر سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری بیوی کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا ہے' ورنہ دنیا جانتی ہے کہ سوتیلی ماں کبھی بھی ی ماں کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

"ممانی جان آپ بھی ٹھیک کہتی ہیں مگر ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔"

اتنے میں سائرہ کمرے میں آ گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ممانی جان نے بلال سے کیا کہا تھا اور اس کا بلال یا جواب دیا تھا۔

"ماما آج آپ مجھے آئس کریم کھلائیں گی ناں......" چھوٹی بچی نے سائرہ سے بلند آواز میں کہا۔

"ہرگز نہیں آئس کریم تو میں تمہیں بالکل نہیں دوں گی۔"

ممانی جان آنکھوں میں تمسخر بھر کے بلال کو دیکھا اور کھنکھار کر خواہ مخواہ مسکرانے لگیں۔ ان کی جتاتی ہوئی ہیں صاف صاف کہہ رہی تھیں "لو دیکھ لو سگی' سوتیلی کا فرق۔"

"آپ کا گلا خراب ہے ناں بیٹا' جب تک طبیعت اچھی طرح سے ٹھیک نہیں ہو جائے گی کوئی آئس کریم نہیں ے گا' آپ کی ماما بھی نہیں۔" سائرہ بچی کا ربن ٹھیک کرتے ہوئے آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

ب بلال دل میں ڈھیروں طمانیت محسوس کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس وقت ممانی جان کا چہرہ خفت زدہ سا ہو رہا

"ممانی جان اب اجازت دیجیے۔"

"یہ تو تم غیروں کی طرح آئے ہو' کم از کم دو چار دن رکتے تو مجھے خوشی ہوتی۔" وہ رسمی جملے ادا کر رہی ان کے چہرے سے دفع ہو کا سگنل صاف نظر آ رہا تھا۔

"آئندہ پھر کبھی سہی' آج سائرہ کو شاپنگ کروانی ہے اور رات کو تو ہماری روانگی ہے۔" سائرہ بھی ان سے باہر نکل آئی۔

ڑی میں بیٹھنے کے بعد بلال اپنا بریف کیس لینے کے لیے جو اندر گیا تو اس کے کانوں میں ممانی جان کی رہی تھی۔

"یسا ہیرا جیسا لڑکا ہاتھوں سے نکل گیا اگر اس کی منحوس ماں ہماری ہما کو پسند کر لیتی تو آج ہماری بچی عیش

کر رہی ہوتی، کیسی معمولی شکل کی لڑکی بلال جیسے شہزادے کی بیوی بنی بیٹھی ہے اسے تو کسی گھر کی ملازمہ چاہیے تھا۔ ہما جاتی تو بچیوں کو تو کب کا ان کے ننھیال میں چلتا کر دیتی۔“

بلال نے خاموشی سے ڈرائنگ روم میں رکھا اپنا بریف کیس اٹھایا اور چپ چاپ باہر نکل آیا مگر اس کا جان کی سائرہ کے لیے نفرت کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی اور اپنی ماں کی بصیرت پر وہ نازاں تھا۔

”آئندہ کبھی ان کے گھر آنا ہوا تو سائرہ اور بچیوں کو لے کر ہرگز نہیں آؤں گا۔“ وہ کھڑکی سے باہر ہوئے سوچ رہا تھا۔

”ممانی جان کا گھر کتنا خوبصورت تھا ناں ......“ سائرہ نے کہا۔

”ہوں......“

”ممانی جان بڑی محبت کرتی ہیں، کتنی تعریفیں کر رہی تھیں میری۔“

”ہوں۔“

”کتنا پیار اپرس دیا ہے ہما نے مجھے۔“

”ہوں......“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو بول کیوں نہیں رہے؟“

”اس موضوع کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کر سکتیں کیا؟“

”کیا بات کروں؟“

”یہی کہ پنڈی کے شاپنگ مال سے کیا کیا خریدو گی۔“

”اس قدر تو شاپنگ کر چکی ہوں، سب کے لیے کچھ نہ کچھ خرید لیا ہے، پورے دو سوٹ کیس تحائف ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تو پھر یوں کرو میری امی، اپنی امی اور اپنی بھابیوں کے لیے سونے کے ٹاپس لے لو اور اپنے لیے کوئی سا سیٹ لے لو۔“

”آپ کی امی کے لیے ٹاپس لے لوں، یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے مگر باقی لوگوں کے لیے لوں؟“ اس نے الجھ کر کہا۔

”تحائف دینے سے محبت بڑھتی ہے، کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہے۔“

”مگر اتنے مہنگے تحائف دینے کی کیا ضرورت ہے، سب کے لیے ہی سوٹ، سوئٹر شال میں خرید چکی ہوں“

”تم دو گی تو مجھے اچھا لگے گا۔“ بلال نے محبت سے کہا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ بلال کی شخصیت کتنی مسحور اس کا ادراک وہ کر ہی نہیں پائی تھی۔

شام کو وہ بچوں کے ساتھ اسلام آباد کا ایک چکر لگا کر واپس اپنے ہوٹل جا رہے تھے۔ تب ہی سگنل پر اپنے برابر کھڑی سیاہ مارگلہ کو دیکھا۔ آگے باوردی ڈرائیور اس کے برابر گن مین اور پشت پر ایک لڑکی کپڑوں میں ملبوس کسی فیشن میگزین کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

سائرہ تو اس کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

”فریال......“ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ پڑے اور بھاگتی ہوئی اپنی بہن کے گلے لگ جائے اور اسے گاڑی سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے تاکہ روتی بلکتی ماں کو صبر آ جائے۔

”فریال زندہ ہے، فریال آسودہ حالت میں ہے......“ ایک لمحے کے لیے یہ احساس اس کے دل کو طمانیت سا س گیا۔

”فریال......!“ وہ بے اختیار چیخی اور چیختی چلی گئی۔ اس کی آواز میں جو درد تھا، اس کی پکار میں جو محبت تھی اور اس کے لہجے میں جو حزن تھا وہ سب پر آشکارا تھا۔

ڈرائیور نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا، بلال نے گھبرا کر کہا ”سائرہ کیا ہوا؟“

مگر سائرہ تو سگنل کھلنے پر آگے بڑھتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی جس کے دبیز شیشے بند تھے اور اس کی اپنی گاڑی کے شیشے بھی بند تھے۔

سائرہ کی آواز یوں لوٹ کر اس کے اپنے ہی کانوں سے ٹکرا جائے گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ فریال اپنی ھلک دکھلا کر یوں آگے چلی جائے گی یہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”سائرہ کیا بات ہے، یہ ایک دم تم کیوں چیخی تھیں؟“ بلال اس سے پوچھ رہا تھا۔

”میں نے اپنی بہن سے ملتی جلتی ایک لڑکی دیکھی تھی۔“

”اف خدایا، بہن سے ملتی جلتی دیکھی تھی بہن تو نہیں تھی ناں۔“

”شاید وہ فریال ہی تھی۔ مجھے تو وہ فریال ہی لگی تھی۔“ اس کے پڑھنے کا اسٹائل ہی ایسا ہوتا ہے کہ الٹے ہاتھ لی دو انگلیاں اس کی پیشانی کو ٹچ کرتی رہتی ہیں۔“ وہ سر جھکائے کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔

”افوہ سائرہ ...... کیسی بچی لگ رہی ہو تم اس وقت مجھے، تمہاری بہن نے تمہیں دیکھا بھی نہیں کہ اس کی ناسائی تمہیں سچا ثابت کرتی۔ تم نے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کو سائیڈ پوز سے اپنی بہن کے مشابہ جان کر سچ سمجھ لیا۔“ بلال نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں وہ فریال تھی یا نہیں مگر وہ مجھے فریال ہی لگی۔“

”اللہ تعالیٰ کو جب ملوانا مقصود ہو گا تو وہ بہ آسانی ملوا دے گا، تم خواہ مخواہ پریشان مت ہو۔“

”میں پریشان نہیں ہوں میں تو خوش ہوں کہ آج بہت عرصے بعد میں نے اپنی بہن کو دیکھ لیا اور اسے اچھے حالوں میں دیکھا ہے۔“

”اچھے حالوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا اسے برے حال میں ہونا چاہیے تھا۔“ بلال سائرہ سے پوچھ رہا تھا اور سائرہ کے ذہن میں وہ فلم چل رہی تھی ...... جب سائرہ کو اپنے گھر سے دھکے دے کر نکالا گیا تھا کہ آئندہ اس گھر کی دہلیز پر قدم نہ رکھنا تو وہ اپنے گھر سے خالی ہاتھ رخصت ہوئی تھی۔

☆☆☆

”ثنا بیٹا تم نے کہا تھا اس ویک اینڈ پر کراچی آؤ گی تو آئی کیوں نہیں سب کو انتظار رہا؟“ ثریا فون پر ثنا سے رہی تھی۔

”امی میری اچانک پریزنٹیشن آ گئی تھی اس کی تیاری میں اتنی محو ہوئی کہ کراچی جانا کینسل کرنا پڑا۔“

”اچھا اس ویک اینڈ پر ایک دو روز کی چھٹی لے کر آ جاؤ، تمہاری خالہ کی بیٹی سیما کا نکاح ہو رہا ہے سب لوگ ہوں گے، تم آ جاؤ گی تو خالہ بھی خوش ہو جائیں گی۔“

”امی میں کوشش کروں گی آنے کی، مگر وعدہ نہیں یوں بھی میرا آخری سمسٹر چل رہا ہے اگر کسی پرچے میں ہو گئی تو خواہ مخواہ مسئلہ ہو جائے گا۔“

”ارے بیٹا اتنے سارے دن ہو گئے تجھے کراچی آئے ہوئے سب لوگ اتنا یاد کر رہے ہیں۔“

”امی میں کیا کروں‘ پڑھائی بہت سخت چل رہی ہے۔“

”بیٹا اتنی محنت کرے گی تو بیمار پڑ جائے گی‘ کراچی آ جائے گی تو کم از کم فریش تو ہو جائے گی‘ تیرے پاپا تجھے اتنا یاد کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے امی‘ میں آ جاتی ہوں......“ ثنا نے ان سے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

اور جب نادر کو پتا چلا کہ وہ کراچی جا رہی ہے تو اس نے برملا کہہ دیا۔ ”ثنا تم اتنی جلدی کراچی نہیں جا ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

”کوئی مرنے والے نہیں ہو تم دو تین روز میں‘ میں واقعی آ جاؤں گی۔“

”پلیز ثنا میری بات کا یقین کرو اب میرا دل تمہارے بغیر نہیں لگ سکتا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو آنٹی سے کہو کہ وہ میری امی‘ پاپا سے بات کریں۔“ وہ شرماتے ہوئے بولی۔

”کاش آپا میری بات مان جاتیں...... تو یہ نوبت ہی نہیں آتی مگر ہماری خاندانی جائیداد کا تنازعہ چل رہا اور آپا کسی صورت نہیں چاہتیں کہ میں پاکستان میں بھی رہوں‘ ان کا تو بس نہیں چلتا کہ میری شادی پاکستان کہیں ہو؟“

”وہ کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”شادی کے بعد میں اکیلا نہیں رہوں گا‘ میری پشت پر میری سسرال والے ہوں گے اور آپا کسی صورت ایسا رسک نہیں لینا چاہتیں۔“

”مگر آنٹی تو بہت اچھی‘ بے حد خیال رکھنے والی اور بہت محبت کرنے والی ہیں۔“ ثنا نے کہا۔

”بہن تو وہ میری ہیں‘ میں ان کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہوں یوں بھی جو لوگ بہت زیادہ اچھے تو ان کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی کونا تاریک ضرور ہوتا ہے۔ میری آپا سب کے لیے بہت اچھی ہیں مگر ان کی طبیعت نے اپنے بھائی کو ایک فاصلے پر رکھا ہوا ہے۔“

”مجھے تو واقعی یقین نہیں آ رہا...... آنٹی ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔“

”کیا تم نے نہیں دیکھا جب آپا اور بھائی صاحب یہاں ہوتے ہیں تو میں ان کے گھر میں بے حد کم آتا میں تو ظاہری موجودگی میں بھی نہیں آتا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو نادر آپ ان سے کہہ دیں کہ آپ کو کوئی جائیداد نہیں چاہیے‘ خواہ مخواہ کے جھگڑے ختم کر دیں۔ ہماری قسمت میں جو رزق ہو گا وہ تو ہمیں ہر صورت میں ملے گا۔“

”کیسے چھوڑ دوں میں اپنی جائیداد‘ وہ ہزاروں یا لاکھوں میں نہیں ہے بلکہ کروڑوں میں ہے‘ کروڑوں کون شخص چھوڑ سکتا ہے جو میں چھوڑ دوں۔“

”اچھا جائیداد کی گتھی بعد میں سلجھایئے گا‘ فی الحال میری کزن کا نکاح ہو رہا ہے مجھے اس میں لازمی کرنی ہے اگر نہیں گئی تو نہ صرف امی ناراض ہوں گی بلکہ میری کزنز بھی مجھ سے ناراض ہو جائیں گی۔“

”اچھا وعدہ کرو کہ صرف دو دن میں آ جاؤ گی۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤں گی۔“

”پکا وعدہ ہے ناں۔“

”ہاں بھئی کہہ تو دیا شادی‘ ولیمے سے فارغ ہو کر اگلے دن آ جاؤں گی‘ جمعے کو میں جا رہی ہوں انشاء اللہ اتوار کو نائٹ میں‘ میں راولپنڈی میں ہوں گی۔“

”ثنا کراچی آئی تو معلوم ہوا کہ ولیمہ شادی کے چار دن بعد ہے اور اس کے بعد چوتھی ہے۔“

”امی میرا بہت حرج ہو رہا ہے اس نے واویلا مچایا مگر امی کے سامنے اس کی کہاں چلنی تھی۔“

”پاگل ہو گئی ہے کیا‘ سیما کی شادی اتنے بڑے گھرانے میں ہو رہی ہے‘ ولیمے کی تقریب میں بڑی بڑی شخصیات شرکت کریں گی‘ اس میں شرکت کے لیے میں نے تمہارے لیے دس ہزار کا شرارہ بنوایا ہے‘ اس تقریب میں تمہیں ہر صورت شریک ہونا ہے۔“

تب ثنا مجبور سی ہو گئی‘ دل اس کا چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر نادر کے پاس پہنچ جائے مگر یہ کسی صورت ممکن نہ تھا۔

”ولیمے کی تقریب میں وہ ریڈ کلر کا لہنگا کرتی پہنے کھڑی تھی۔ چہرے پر اداسی رقم تھی۔

منور نے اسے دیکھا تو ہنس کر کہا ”کسی فلمی ہیروئن کی طرح کیوں کھڑی ہو‘ کیا کسی گانے پر پرفارم کرنے والی ہو جو چہرے سے بقراطن بوا دکھائی دے رہی ہو۔“

”امی نے مجھے زبردستی روک لیا ہے‘ اب میں ٹیسٹ میں فیل ہو جاؤں گی۔“

”واقعی ٹیسٹ کا مسئلہ ہے یا کوئی اور بات ہے۔“ منور نے اس کے غم آلود سے چہرے کو جانچتے ہوئے پوچھا۔

”منور میں سچ کہہ رہی ہوں پچھلے کئی ٹیسٹوں میں میرے بی گریڈ آ رہے ہیں مجھ سے پڑھا ہی نہیں جا رہا اور اب اگر سی گریڈ آ گیا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“

”کس کو منہ دکھانا ہے۔“ منور نے عام سے لہجے میں بطور شرارتاً یہ جملہ کہا تھا مگر وہ تو پریشان سی ہو گئی اور لگی تاویلیں دینے۔

منور نے رنگ بدلتے چہرے کو پھر دیکھا اور انتہائی نرمی سے ثنا سے کہا۔

”ڈیئر فرینڈ میں یہ بات تم سے حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس دفعہ تم مجھے نارمل نہیں لگ رہیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے‘ تم جانتے ہی ہو کہ سوائے پڑھنے کے میرے کوئی ذوق و شوق نہیں ہیں۔“

”مگر اب میں تم سے یہ بات بھی کہہ سکتا ہوں کہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ بھی کوئی شغل حائل ہو گیا ہے۔“

”منور دیکھ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر بدستور بیل ہو رہی تھی اور وہ نمبر دیکھ کر نہ صرف پریشان ہو رہی تھی بلکہ لائن ڈسکنیکٹ بھی کر رہی تھی۔

منور یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ بات کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہے تاکہ سکون سے فون ریسیور کر سکے۔

وہ قصداً اس کے پاس سے ہٹ گیا مگر اس طرح کہ وہ اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔

اس کی پوزیشن اس طرح تھی کہ وہ اس کو اچھی طرح دیکھتا رہے مگر ثنا اس کو نہ دیکھ پائے کہ ان دونوں کے مابین ایک ستون بھی حائل تھا۔ منور نے دیکھا کہ اس نے موبائل بڑی بے تابی سے کانوں سے لگایا۔ منور جگہ سے مزید آگے بڑھا‘ ثنا بے حد آہستگی سے بول رہی تھی مگر منور جیسا ذہین لڑکا اس کے لبوں کی جنبش سے مہ ملتا تھا کہ وہ کیا بات کر رہی ہے۔

”ہاں بتا تو رہی ہوں کہ میں کراچی آ کر پھنس گئی ہوں‘ تم بے شک یقین مت کرو مگر میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میرا دل تمہارے بغیر بالکل نہیں لگ رہا۔“

’’کیا کہا تقریب سے نکل کر ائیر پورٹ چلی جاؤں اور وہاں سے خود آ جاؤں۔‘‘

’’نہیں جان ایسا میں نہیں کر سکتی کل نہیں تو پرسوں میں تمہارے پاس ہوں گی۔‘‘

’’اچھا اب زیادہ ڈائیلاگز بولنے کی نہیں ہو رہی ہے' رات کو دیر سے میں خود فون کروں گی اب تمہیں فو کرنے کی ضرورت نہیں ہے او کے۔‘‘

اور جب ثنا نے اپنا آخری جملہ ختم کر کے موبائل آف کیا تو وہ یہ دیکھ کر گھبرا سی گئی اس کے سامنے منورا دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

’’میری فرینڈ کا فون تھا اب وہ مجھ پر ناراض ہو رہی ہے کہ میں آئی کیوں نہیں' خواہ مخواہ کالج میں غیر حاض ہو رہی ہے۔‘‘ اس نے زبردستی کی ہنسی لبوں پر سجا کر کہا۔

’’ہوں......!‘‘ منور نے ایک ہنکارا بھر کے اسے دیکھا۔

’’وہ......وہ......دراصل ہمارا گروپ بڑا پڑھا کو قسم کا ہے ناں اس لیے میری ساری سہیلیاں سوائے پڑھ کے کچھ نہیں کرتیں اس لیے۔‘‘ ثنا ہکلا ہکلا کر اپنا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’مجھے یقین ہے ثنا کہ جو کچھ تم مجھ سے کہہ رہی ہو وہ سو فی صد درست ہے۔‘‘ منور نے تمسخر بھرے لہجے م کہا اور آگے بڑھ گیا۔

تب ثنا کا دل دھک سے رہ گیا۔

’’یہ منور کیا کہہ گیا تھا اس سے۔‘‘

’’اس کے لہجے میں طنز کی آری بھی فٹ تھی۔‘‘

’’کیا اس کو پتا چل گیا ہے کہ میں کسی سے محبت کرنے لگی ہوں۔‘‘

’’اگر اسے پتا چل گیا ہے تو وہ سارے گھر والوں کو بتا دے گا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی۔‘‘ وہ یک پریشان سی ہو گئی۔

کچھ سوچ کر وہ منور کے پاس گئی تو وہ ایک کرسی پر تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

’’منور......میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’ہاں کہوں۔‘‘ وہ غیر دلچسپی سے سنتا ہوا بولا۔

’’ابھی تم مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے۔‘‘

’’کیا کہہ رہا تھا؟‘‘ اس نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

’’تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے تھے ناں۔‘‘

’’یہ میں نے کب کہا ہے؟‘‘

’’تمہارے لہجے نے......بچپن سے کیا میں تمہیں جانتی نہیں ہوں۔‘‘ وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

’’جانتی تو ہو مگر مانتی نہیں ہو کہ ہمارے گھرانے کے کیا اصول و قوانین ہیں۔‘‘ وہ ڈھکے چھپے لہجے میں ا سرزنش کر رہا تھا۔

’’یہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔‘‘

’’کاش میں تمہیں واقعی غلط سمجھ رہا ہوتا مگر میں تو تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں یہاں تک جانتا ہوں ک کو جھوٹ سے نفرت ہے اور اس سے جھوٹ بولا بھی نہیں جاتا۔‘‘ منور نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

’’اب اگر تم میری بات کا یقین نہیں کرتے تو میری بلا سے' اب میں تمہارے سامنے قسمیں تو کھانے سے رہی۔‘‘ اس نے بے اعتنائی سے اپنے شانے اچکائے اور تیزی سے آگے کی جانب بڑھ گئی اور منور اسے غم اور تاسف سے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

نگین جتنا سوچ رہی تھی' اتنا ہی الجھ رہی تھی۔ شجاع کراچی آ کر یکسر بدل سا گیا تھا' کبھی اونچے اونچے قہقہے لگاتا اور کبھی چپ سادھ لیتا۔ ضروری بات کا جواب تک نہ دیتا یا پھر کبھی گھر سے سویرے نکل جاتا اور شام گئے گھر میں آتا' کبھی لہجہ خوشگوار ہوتا اور کبھی یاس انگیز۔ نگین کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اس سے یہ پوچھ سکے کہ ’’تم گئے کہاں تھے یا صبح سے شام تک تمہارا وقت کیسے گزرا؟ کیا کھایا؟ کیا پیا؟‘‘

آج بھی وہ آتے ہی واش روم چلا گیا۔ غسل کر کے جب وہ کمرے میں آیا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔ نگین کو یوں لگا جیسے اس کے آنے سے کمرا روشن سا ہو گیا ہو۔

’’چائے لاؤں میں آپ کے لیے؟‘‘

’’لے آؤ ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی لے آنا۔‘‘ اس نے کہا۔

فروٹ چاٹ اور ویجیٹیبل رولز کے ساتھ وہ بھاپ اڑاتی چائے لے کر آئی تو وہ خوش ہو گیا۔

’’نگین تم بہت اچھی ہو' تمہارے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔‘‘ رول کھاتے ہوئے وہ تعریف کر رہا تھا۔

’’فہمی باجی کے ہاں چلیں گے' جب سے آئے ہیں ہم ایک بار بھی نہیں گئے' فہد بھائی کتنی بار بلا چکے ہیں۔‘‘

’’آج نہیں پھر کسی دن چلیں گے۔‘‘

’’جیسی آپ کی مرضی۔‘‘ اس نے سر جھکا کر کہا۔

’’نگین میں کئی دنوں سے اپنے لیے جاب تلاش کر رہا ہوں مگر کہیں کوئی جگہ ہی نہیں ہے جہاں جاتا ہوں مفاجٹ انکار ہو جاتا ہے۔‘‘

’’امی کہہ رہی تھیں اگر آپ ابا جی کی دکان سنبھال لیں تو انہیں کسی اور کو رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔‘‘

’’کیا کہا......ماموں کی دکان پر کام کر لوں میں۔‘‘ اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

’’اس میں مضائقہ ہی کیا ہے' تیرے میرے کی نوکری کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنی دکان پر کام رلیا جائے۔‘‘

’’تم کیا چاہتی ہو کہ میں کراچی آ کر مزدوری کروں۔‘‘

’’مزدوری کرنے کو کس نے کہا آپ سے۔‘‘

’’تمہارے باپ کی دکان پر میں پھونک مار کر تھیلی کھولوں اور اس میں نمک' مرچ بھر کر گاہکوں کو دوں اور پھر شانے سے کپڑا اٹھا کر مکھیاں بھی اڑاؤں۔‘‘ وہ ایک دم ہی سیخ پا ہو گیا۔ کپ اٹھا کر دیوار سے دے مارا' رول کی ایٹ نیچے پھینکی۔

شکر ہے اس شام فیروزہ اپنے میاں کے ساتھ فہمی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔

’’آپ غلط سمجھ رہے ہیں شجاع......بالکل غلط۔‘‘ نگین روہانسی ہو کر اسے سمجھانے کی کوششیں کر رہی تھی۔

’’تمہاری ماں کے گھر میں رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں یہاں کتا بن کر رہوں۔‘‘

’’آپ کو تو نوکروں کی نگرانی کرنی ہو گی اور کیش کا حساب کتاب......اور آپ سے کس نے کہا ہے کہ مرچ

مسالے باندھ کر آپ کو دینے ہوں گے' آپ جانتے ہیں ابا کی دکان یوٹیلٹی اسٹورز کی طرح ہے ہر چیز ملتی ہے مگر ملازموں کی نگرانی بھی خاصی کرنی پڑتی ہے۔ ابا جان جہاں چوک جاتے ہیں وہیں انہیں نقصان ہو جاتا ہے۔"

"اس شہر میں صرف تمہارے باپ کی ہی دکان تو نہیں ہے اور بھی بہت سی دکانیں ہیں جب دکان پر نوکری کرنی پڑی تو کسی اور کی دکان پر بھی کی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ مگر یہاں تو آپ مالک کی حیثیت سے کام کریں گے' آپ کا سب پر رعب ہوگا مگر آپ پر کسی کا نہیں۔"

"کیوں بھئی کیا ماموں میرے نام دکان کر رہے ہیں؟"

"دکان آپ کے نام نہیں کر رہے آپ کی معاونت چاہ رہے ہیں' اس کے لیے وہ آپ کو اچھی خاصی تنخواہ بھی دیں گے۔"

"کتنی تنخواہ دیں گے' ایک لاکھ دے دیں گے کیا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"تم بھی تو خوب ڈینگیں مار رہی ہو' جیسے دکان نہ ہوئی مارکیٹ ہو گئی۔"

"ابا جی کی دکان جیسی بھی ہے آپ کی دیکھی بھالی ہے' میں کیوں بے پر کی اڑاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے دیکھ لیں گے' فی الحال دوبارہ چائے بنا کر لاؤ۔" نگین جو اس اثنا میں کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ چکی تھی فوراً ہی چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

وہ بہت خوش تھا یا خوشی کا اظہار کر رہا تھا نگین اس باریکی کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ روزانہ ہی وہ اس کو کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتا' شام کو وہ جب گھر لوٹتے تو تھکان کا ذرا سا اثر بھی اس کے چہرے پہ نہ ہوتا۔

"ارے تم لیٹ کیوں گئیں' اٹھ کے بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔"

"مجھ میں بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے' سارا دن گھوم گھوم کے اب سر بھی چکرا رہا ہے' پورا ہفتہ ہو گیا ہے روزانہ ہی کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں بس بہت گھوم لیے اب کل کہیں نہیں جائیں گے۔"

"کل زرینہ خالہ کے ہاں چلنا ہے۔ بہت اچھی ہیں اور بے حد محبت کرنے والی۔"

"کون زرینہ خالہ...... میں تو انہیں نہیں جانتی اور نہ ہی ان کا نام کبھی پھوپھو یا امی کے منہ سے سنا ہے۔"

"زرینہ خالہ ہماری رشتے دار نہیں ہے مگر رشتے داروں جیسی ہیں' ان کے سب بچے جب ملک سے باہر چلے گئے تو وہ کراچی میں آ کر رہنے لگیں' بڑا سا فلیٹ ہے ان کا' دو فلیٹ کرائے پر گئے ہوئے ہیں' وہ سب سے الگ تھلگ اور اکیلی رہتی ہیں مگر میں جب بھی کراچی آتا ہوں ان سے ضرور ملتا ہوں' اس بار میری خواہش ہے کہ تم بھی ان سے ضرور ملو۔

اگلے دن نگین جب ان سے ملنے گئی تو انہوں نے بڑی گرمجوشی سے گلے لگایا' بچوں کو کتنی دیر تک سینے سے لگا کر پیار کرتی رہیں "یہ شجاع مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے' اس کو دیکھ کر میں جتنی خوش ہوتی ہوں بتا نہیں سکتی۔"

"خالہ آپ اپنے بچوں کے پاس باہر کیوں نہیں چلی جاتیں' یوں اکیلے رہنے میں آپ کو پریشانی ہوتی ہوگی۔" نگین نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے پوچھ لیا۔

"میرے بچے سال دو سال بعد ملنے کے لیے آ جاتے ہیں اور میں ان کی یادوں کے سہارے اپنا وقت گزار رہی ہوں' اگر میں ان کے پاس چلی گئی تو وہ تنگ ہو جائیں گے۔ اب تو یہاں کی لڑکیاں ساس کو برداشت ہیں کرسکتیں تو گوریاں کہاں مجھے برداشت کرسکیں گی۔ کاش میری کوئی لڑکی ہوتی تو وہ اپنے بچے لے کر میرے پاس رہنے کے لیے آتی۔"

"خالہ میں آپ کے پاس رہنے کے لیے آیا کروں گی۔" ان کو آب دیدہ دیکھ کر نگین نے کہا تو وہ بے اختیار ہوکر اس کی پیشانی چومنے لگیں۔

"بچے مجھے اتنے اچھے لگتے ہیں' میں زیادہ تر کھڑکی میں بیٹھی رہتی ہوں تاکہ باہر کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ سکوں۔"

"خالہ جی اگر آپ گاؤں میں رہتیں تو آپ کو اس قسم کی تنہائی کا احساس تو نہ ہوتا۔"

"گاؤں والے گھر میں میرے بچے نہ آتے' ان کے بچوں کو وہاں آ کر تکلیف ہوتی اس لیے بہت کچھ سوچ ر یہاں آنا پڑا اور اب تو اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ میں بھی اس تنہائی کی عادی ہو گئی ہوں۔"

جب شجاع جانے کے لیے اٹھا تو اس نے کہا "زرینہ خالہ' میں کچھ عرصے کے لیے کراچی آیا ہوں اگر آپ ے کرائے دار کا پورشن خالی ہو تو میں اس میں بحیثیت کرائے دار کے رہنا چاہوں گا۔"

"شجاع بیٹے یہ چھ کمروں کا فلیٹ مجھ اکیلی بڑھیا کے لیے حویلی جیسا ہے اگر تم آنا چاہو تو تین کمرے تم لے لینا' تین میرے لیے بھی بہت زیادہ ہیں۔ تم تو میرے ساتھ بھی رہ سکتے ہو تم تو میرے بیٹے جیسے ہو۔"

"مگر میں کرایہ دے کر رہنا چاہوں گا۔" شجاع نے کہا۔

"چلو یونہی سہی مگر آؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"تھوڑے دن سسرال میں رہ لوں تو پھر آپ کے پاس آتا ہوں۔" شجاع نگین کو شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ کیوں......؟" زرینہ خالہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ اس لیے کہ کہیں ہماری ممانی جان ناراض نہ ہو جائیں کہ ان کے پاس رہنے کے بجائے آتے ہی علیحدہ گھر کر لیا۔"

"ہاں یہ تو ہے' ہر ماں کو اپنی بیٹی کا ساتھ کبھی برا نہیں لگتا ہے اور پھر تمہارے بچے اتنے پیارے پیارے ہیں کہ ان سے کھیلتے رہو تب بھی دل نہ بھرے۔"

☆☆☆

"ایمان سے!"

"ہاں امی' میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"تم نے اسے صحیح طریقے سے پہچان لیا تھا ناں؟"

"بالکل پہچان لیا تھا وہ سوفی صد فریال ہی تھی۔"

"اس کا شوہر اور بچے اس کے ساتھ تھے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں وہ اکیلی تھی' ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا' گن مین آگے کی نشست پر اپنی وردی میں تھا اور فریال پیچھے کی ٹ پر بیٹھی تھی۔"

"چہرے سے خوش لگ رہی تھی یا خاموش' صحت پہلے سے بہتر تھی یا کمزور تھی' اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی

یا ملال؟'' امی ایک سانس میں سوال پہ سوال کیے جا رہی تھیں۔

''آپ جو کہتی تھیں کہ فریال مر چکی ہے وہ خیال تو باطل ہو گیا' ہماری فریال نہ صرف زندہ ہے بلکہ آسودہ سے زندگی گزار رہی ہے اس کا مطلب ہے وہ خوش باش ہے۔''

''مگر اس نے جس لڑکے سے نکاح کیا تھا وہ تو پیسے والا نہیں لگ رہا تھا' کس حلیے میں آیا تھا ہمارے گھر ہے ناں۔''

''شاہنواز کہہ رہا تھا کہ وہ تو شکل سے ہی اٹھائی گیرا سا لگ رہا تھا۔'' انہوں نے پرانی باتوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب یہ فریال کی اپنی قسمت ہے کہ اس کے نصیب سے اس کے پاس پیسا آ گیا ہو گا۔''

''اللہ نے اسے زندہ رکھا ہوا ہے تو انشاءاللہ ملوا بھی دے گا۔'' امی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں امی میرا دل کہتا ہے فریال ہم سے ضرور ملے گی۔''

''جب تم نے فریال کو دیکھ ہی لیا تھا تو اپنے آنے کا پروگرام کینسل کر دیتیں دو چار روز راولپنڈی میں اور رک جاتیں۔''

''امی اگر میرے پاس فریال کا ایڈریس کوئی اتا پتا ہوتا تو رکتی ناں...... اب میں اسے سڑکوں پر تو تلاش نہ کر سکتی تھی۔''

''سائرہ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ اس سڑک پہ جا کر بیٹھ جاؤں جہاں سے فریال کی گاڑی گزری تھی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی...... فریال کو ڈھونڈنے کے لیے کیا سڑک پر بیٹھا جائے گا۔''

''تو پھر بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ایک دو ماہ بعد میں پھر پنڈی جاؤں گی وہاں کے اسکولوں' کالجوں میں معلوم کروں گی کہ کیا فریال وہاں تو نہیں ہے۔''

''اس سے پہلے اگر میں مر گئی تو...... میری آنکھیں بھی مرنے کے بعد بند نہیں ہو سکیں گی۔''

''پلیز امی حوصلہ رکھیں' اللہ تعالیٰ نے جہاں اس کی ہمیں جھلک دکھائی ہے وہ ہمیں اس سے ملوانے کی سبیل بھی نکالے گا' بس آپ ناامید نہ ہوں۔''

''اے پاک پروردگار میری بیٹی کو مجھ سے ملوا دے۔'' شائستہ بیگم نے کچھ ایسے رقت زدہ لہجے میں کہا کہ سائرہ بھی تڑپ اٹھی۔ دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب روئیں۔

ثریا کے کانوں میں جب سائرہ کے رونے کی آواز آئی تو اس کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔

''اونہہ بڑی بنتی تھیں محبت کی تصویر اور ممتا کی عکاس! آج ضرور انہیں کوئی سبق ملا ہے جو دونوں ماں بیٹیاں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں۔'' تھوڑی دیر بعد ثریا ان کے کمرے میں پہنچی تو دونوں کی آنکھیں متورم تھیں۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے سائرہ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''تم نہ بتاؤ مگر ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں' بلال نے طبیعت صاف کی ہو گی تمہاری' ہے ناں؟'' ثریا ہنسی۔

''وہ کس لیے۔'' سائرہ نے تیوری تان کر پوچھا۔

''تم نہ صرف سوتیلی ماں ہو بلکہ تم بلال کی بچیوں کی نوکرانی بن کر گئی ہو' تم نے یقیناً اپنا کوئی رنگ دکھایا ہو گا اور ظاہر ہے اس نے تمہاری اوقات یاد دلا دی ہو گی۔''

''ثریا تم بات کرتے ہوئے تمیز' تہذیب سب ہی کچھ گروی رکھ دیتی ہو۔'' شائستہ بیگم کو غصہ ہی تو آ گیا۔

''تو پھر یہ بن بادل برسات کیوں ہوئی؟'' اس نے سائرہ کی سوجی ہوئی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھابی آپ اپنے معاملے سے معاملہ رکھا کریں کسی دوسرے کے بارے میں اپنی رائے دینے یا اپنی ٹانگ اڑانے سے گریز کیا کریں۔ میں کس حیثیت سے گئی ہوں اور میری اپنے گھر میں کیا حیثیت ہے اس سلسلے میں آپ کو چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' الحمدللہ میں اپنے گھر میں خوش باش ہوں اور مجھے کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہے' اس لیے آپ کو بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میرے بارے میں انٹ شنٹ بکیں۔''

''افوہ...... بڑا زعم ہے تمہیں اپنے اوپر' مت بھولو کہ جب جاوید تمہیں گھر سے نکال سکتا تھا تو بلال بھی تمہیں گھر بٹھا سکتا ہے۔ امیر خاندان میں شادی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنا ماضی بھول جاؤ۔'' ثریا بڑی بے باکی سے بول رہی تھی۔

سائیرہ نے ان کے منہ لگنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

اچانک منور گھر میں داخل ہوا' اس نے اپنی تائی کی باتیں پوری سن لی تھیں' مارے غصے کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی غصے میں اپنی تائی سے بولا۔

''تائی جی آپ بات کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کریں کہ کس سے بات کر رہی ہیں' سائیرہ پھپو ہمیں بے حد عزیز ہیں' ان کی بے عزتی کرنے والا اس گھر میں نہیں رہ سکتا' آپ شاید تایا کے مزاج کو بھی بھول بیٹھی ہیں اگر میں انہیں بتا دوں کہ آپ نے سائیرہ پھپو کو کن الفاظ سے مخاطب کیا ہے تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اسی لمحے سارا حساب بے باق کر دیں گے۔''

ثریا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ منور ان سے کبھی اس لہجے میں بھی مخاطب ہو سکتا ہے یوں بھی وہ زیادہ گھلنے ملنے والا لڑکا نہیں تھا۔

ثریا تو یکدم ڈر سی گئیں اور انہیں لگا کہ شاہنواز گھر میں داخل ہوتے ہی ان پر سنگ باری شروع کر دیں گے' یوں بھی وہ زبان کے خاصے پھوہڑ تھے' غصے میں آ کر انہیں یہ تک پتا نہیں چلتا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔

''منور بیٹا میری بات کا یہ مطلب تھوڑی تھا' میں تو ان سے ان کے رونے کا سبب پوچھ رہی تھی۔''

''آپ جس انداز میں بات کر رہی تھیں وہ میں نے دروازے پہ کھڑے ہو کر پوری سن لی تھی۔''

''پھر بھی سائیرہ تو مجھ سے چھوٹی ہے میری بیٹی جیسی ہے اگر اس سے میں کوئی سخت بات کہہ دوں تو اب میں اس سے معافی تو نہیں مانگوں گی ناں۔'' ثریا نے دوسرا داؤ آزماتے ہوئے کہا۔

''سخت بات اور غلط بات میں بہت فرق ہوتا ہے' آپ نے پھپو کو تکلیف پہنچائی' آپ کی باتوں سے دادی کو دکھ پہنچا ہے' آپ کے جملوں نے مجھے زک پہنچائی ہے۔'' منور بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔

''اچھا بابا میری توبہ' میرے باپ کی توبہ۔ جواب میں ان سے کوئی بات کروں' غلطی میری ہی تھی کہ نند صاحبہ کی بات پوچھنے چلی گئی تھی۔'' ثریا نے تنک کر کہا اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

جمال پاکستان آ گیا تھا اور گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنے گھر میں تھا۔ اپنے شہر اپنے محلے میں آ کر اسے گونا گوں سکون سا ملا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنے گھ ہو۔

ایک دوپہر وہ اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فیروزہ آنٹی ساتھ نگین باہر دروازے پر کھڑی سبزی والے سے سبزی لے رہی تھی۔

جمال کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ ان کے سامنے سے گزرا تو فیروزہ آنٹی کو سلام کیا۔

''میں نے پہچانا نہیں بیٹا۔'' فیروزہ آنٹی نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آنٹی میں جمال ہوں......'' اسے اپنا نام بتاتے ہوئے عجیب خفت سی ہوئی۔

''ارے پروفیسر جمال۔'' نگین نے حیران ہو کر کہا'' آپ تو بالکل ہی بدل گئے ہیں' پہلے تو بہت د سے ہوا کرتے تھے۔''

کینیڈا جا کر اپنے دوست احباب کے کہنے پر جم بھی جوائن کیا تھا جس سے اس کا نہ صرف چہرہ سا ہو گیا تھا بلکہ جسم بھی کسرتی ہو گیا تھا۔ ان کی حیرانی پر جمال مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اسے یوں چپ اور دیکھ کر نگین نے ربیع کے بارے میں پوچھا۔

''اس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ وہیں ٹورنٹو میں ہے۔''

''خالہ آئیں ہیں آپ کے ساتھ؟''

''نہیں' ابھی وہ ربیع کے پاس ہیں مگر وہ بھی پاکستان ضرور آئیں گی۔''

''اپنی امی کو فون کرو تو ہمارا سلام کہنا اور ربیع کی شادی کی مبارکباد بھی۔'' فیروزہ نے کہا۔

''جی ضرور۔''

''بیٹا کسی دن ہمارے گھر آؤ ناں۔'' فیروزہ نے محبت سے کہا۔

''جی کسی دن چکر لگاؤں گا' ان دنوں تو لگتا ہے کہ آپ کے ہاں مہمان داری ہو رہی ہے۔'' اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کہا۔

''نگین تو اب ہمیشہ کے لیے کراچی آ گئی ہے اس کے شوہر کا دل اب گاؤں میں لگتا ہی نہیں ہے تو کرے۔'' فیروزہ بھی وہیں کھڑے کھڑے اسے بتا رہی تھیں۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا اور انہیں سلام کرتے ہوئے وہ آگے گیا۔

اس کا پروگرام اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کا تھا مگر نگین کو دیکھ کر اس کی آواز سن کر اب وہ اس قا رہا تھا کہ کہیں جا کر وہ کسی سے ملتا۔ کسی دوسرے کی خیریت پوچھتا یا اپنے بارے میں کسی کو کچھ بتاتا۔ وہ چاپ گلی کا چکر کاٹتا ہوا پچھلے دروازے سے اپنے گھر میں آ گیا۔

''یہ محبت کی جڑیں اپنے دل سے نکال کر کیوں نہیں پھینکی جا سکتیں۔'' وہ یہ سوال اپنے آپ سے کر رہا تھا۔

''جمال تم نے تو ایسا بارہا کہا مگر بعض خودرو پودے خود ہی اگ آتے ہیں اور محبت بھی ایسے ہی ایک پو کا نام ہے جو بغیر نمو کے دل کی بنجر زمین سے پھوٹ پڑتا ہے اور خود ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس پر کسی کا بس چلتا۔''

''فرید احمد نے عظمت آپا کے گھر فون کیا تو مسلسل گھنٹی بجتی رہی پریشان ہو کر انہوں نے فرحت کے گھر فون تو معلوم ہوا عظمت آپا اسی کے پاس ہیں۔

''آپا اب آپ بھی کراچی آ جائیں وہاں کب تک فرحت کے گھر میں پڑی رہیں گی۔''

''اکثر ماؤں کا وقت اپنی بیٹیوں کے گھر ہی گزرتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک بیٹی سے نوازا۔ ت نہ ہوتی تو میں بے یارو مددگار اکیلی پڑی رہتی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو آپا' تمہارا بھائی ابھی مر تو نہیں گیا تم میرے پاس آ جاؤ' شجاع اور نگین بھی میرے اس ہیں' تمہارے آ جانے سے مجھے دلی طمانیت حاصل ہو گی۔''

''نہیں بھیا ساری زندگی گاؤں میں رہی اب میرا دل کراچی میں نہیں لگ سکتا یوں بھی بڑے شہروں کا غل مجھ سے کہاں برداشت ہوتا ہے۔''

''اچھا یوں کرو کچھ دنوں کے لیے آ جاؤ۔''

''نہیں بھیا اب کہاں اتنی ہمت رہی کہ اکیلی سفر کر سکوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں بوڑھے لوگ جب بے مصرف ہو جائیں تو وہ کہیں بھی پڑے رہیں ان کے کہیں جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں ہے۔''

''آپا ایسی باتیں مت کرو اگر آپ کہیں تو میں طفیل کے بھائی کو بھجوا دیتا ہوں آپ اس کے ساتھ آ جایئے۔''

''تم کسی کو مت بھیجنا میں کہاں آ سکوں گی' اب کہیں جانے کو دل بھی نہیں چاہتا۔''

''عید آ رہی ہے آپ کو ضرور آنا چاہیے ورنہ کیا عید پر بغیر شجاع اور بچوں کے آپ کو مزہ آئے گا؟''

''میری کیا عید! وقت گزار رہی ہوں اللہ گزروا دے گا جو جہاں رہے خوش رہے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''نہیں آپا آپ یہ عید ہمارے ساتھ کریں مجھے اچھا لگے گا' نگین' شجاع کے ساتھ ساتھ آپ بھی میرے پاس ں گی' کتنے بہت سے تہوار میں نے آپ کے بغیر گزارے ہیں مگر اس عید پر تو آپ ہمارے گھر آ جایئے۔''

''تمہیں اچھا لگے گا مگر شاید کسی دوسرے کو اچھا نہ لگے۔'' عظمت بیگم نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہہ ڈالا۔

''فیروزہ ایسی نہیں رہی ہے۔'' انہوں نے ان کی بات کا مطلب یہی نکالا تھا۔

''میں تو ایسے ہی ایک بات کہہ رہی تھی یوں بھی بوڑھے لوگ پریشانی کا باعث ہوتے ہیں کہیں چلے جائیں یشان ہوتے ہی ہوں گے مگر جس کے پاس جائیں وہ اس سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ بوڑھے لوگوں سائل بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں اس لیے ان سے دور ہی رہنا چاہیے ورنہ بندہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتا ''

''آپا آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں اگر آپ کہیں تو میں آپ کو لینے آ جاتا ہوں اور آپ کے آنے سے میں یشان نہیں ہوا یہ بات آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے' میں آ رہا ہوں۔''

''ایسا مت کرنا یہ عید میں فرحت اور اس کے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے فرحت کے بچوں عدہ کر لیا ہے کہ میں اس عید کو ان کے پاس رہوں گی اس لیے تم اپنے دل میں کوئی ایسی بات مت لاؤ یوں دماغ سٹھیا سا گیا ہے نہ کسی بات کی سمجھ رہی اور نہ کسی کی پرکھ۔ اس لیے بھیا اگر میری کوئی بات ناگوار تو مجھے معاف کر دینا۔'' عظمت بیگم نے خدا حافظ کہہ کر فون کی لائن ہی کاٹ دی تب فرید احمد ششدر

سے رہ گئے۔

”آج عظمت آپا کی باتوں کا انداز ہی نرالا تھا‘ وہ تو ایک بات میں سے دس دس جملے کشید کرنے کی عاد تھیں اور اب وہ اپنی بات کو خود ہی رد کر رہی تھیں۔ عظمت آپا یقیناً بیمار ہیں پہلا خیال ان کے دل میں یہی آ

”وہ بے شک میرے ساتھ نہ آئیں مگر ان کو جا کر مجھے ضرور دیکھنا چاہیے۔“

اپنے جانے کے بارے میں انہوں نے نہ فیروزہ سے کوئی تذکرہ کیا اور نہ ہی نگین اور شجاع بتایا۔ ضروری کام سے سکھر جانے کا پروگرام بیوی کو بتا کر وہ بائی ائیر پنجاب پہنچ گئے۔

عظمت آپا کے پاس جب پہنچے تو اس وقت رات کے نو بج رہے تھے‘ فرحت اور اس کے بچوں کے عظمت آپا کھانا کھا رہی تھیں۔

بھائی کو دیکھا تو نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ان کے گلے لگ کر وہ اس قدر روئیں کہ فرید احمد پریشا ہو گئے۔

”آپا...... خیریت تو ہے ناں‘ مجھے تو کچھ بتاؤ کہ بات کیا ہے؟ تم اس قدر دکھی سی کیوں ہو رہی ہو؟“ نے پیار سے بہن کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو شجاع نے کچھ نہیں بتایا کیا؟“ فرحت نے ماموں سے کہا۔

”شجاع نے تو کچھ نہیں کہا؟“ وہ حیران سے ہو کر بولے۔

”کیا نگین نے بھی کچھ نہیں بتایا؟“ فرحت نے پوچھا۔

فرید احمد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”شجاع ماں سے لڑ کر کراچی گیا ہے‘ کبھی نہ آنے کے لیے‘ اس کے غم میں یہ بیمار ہو گئی ہیں۔“

”مجھے تو یہ بات معلوم ہی نہیں۔“ فرید احمد پریشان سے ہو گئے۔ ”جب ہی وہ کراچی جا کر بھی اکثر ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”غصے کے تو بھائی ہمیشہ سے تیز ہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی ہیں مگر کچھ دنوں ہر ایک سے الجھنے لگے ہیں۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”بس یہی کہ اب وہ گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اماں نگین کا خیال نہیں رکھتیں

”نگین نے تو کبھی ایسی بات نہیں کہی‘ میں نے تو پوچھا تھا کہ آپا کیوں ساتھ نہیں آئیں تو اس نے کہ وہ بہت جلد ہمارے پاس آ جائیں گی۔“

”ایسی ہی بہانے بازیاں کرتے ہیں لوگ۔“ فرحت نے جل کر کہا ”ساس کو اپنے پاس کوئی لڑکی چاہتی تو پھر نگین بھی یہاں کیوں رہتی۔“

”اس کی ساس میری سگی بہن ہے۔“ فرید احمد کی تیوری چڑھ گئی۔ ”آپا اگر آپ حکم دیں تو میں ان کانوں سے پکڑ کر آپ کے پاس کل ہی لے کر آتا ہوں۔“

”نہیں فرید تم ایسا ہرگز مت کرنا‘ میں نے شجاع سے خود کہا تھا کہ وہ کراچی چلا جائے اب اگر وہ چلا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”والدین کو اپنے پاس رکھنا آج کی اولاد کے لیے مشکل ترین کام ہے اور میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گی

ں مشکل میں گرفتار ہو‘ جہاں رہیں وہ خوش رہیں‘ شاد و آباد رہیں بس میری یہی دعا ہے۔“ عظمت بیگم نے ان لہجے میں کہا۔ اس وقت انہوں نے کس قدر ضبط کیا ہوا تھا یہ بات وہ خود ہی جانتی تھیں۔ وہ آنسو جو ہر وقت ں کی باڑھ سے از خود نیچے اتر آتے تھے ان کو انہوں نے اندر ہی اتار لیا تھا۔

”مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر پاگل لڑکا ہے‘ ماں سے لڑ کر کراچی چلا گیا...... اس ماں سے لڑ کے گیا س نے اپنی ساری زندگی اپنے دونوں بچوں پر نچھاور کر دی۔“ فرید احمد کو واقعی تاسف ہو رہا تھا۔

”تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے ناں‘ تمہیں کیا پتا لڑکے کتنے خودسر ہوتے ہیں‘ ان کا پالنا اور سنبھالنا لڑکیوں کے لے میں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔“ عظمت بیگم نے کہا۔

”ہاں آپا اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری ہو گی کہ میں اولاد نرینہ سے محروم رہا۔ پلیز آپا اس وقت آپ میرے ساتھ چلیے تب شجاع کو بھی احساس ہو گا کہ اگر وہ ماں کو چھوڑ کر آیا تو ان کا بھائی انہیں اپنے پاس لے آیا۔“

”نہیں فرید میں کسی کو کوئی احساس دلانا نہیں چاہتی‘ بعض ماؤں کی قسمت میں ایسی تنہائیاں لکھی ہوتی ہیں اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہے‘ مجھے تو بہت عرصے سے یہ اندازہ تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا مگر دل یمان دلاسے دیتا تھا کہ شاید میرا خیال غلط ہو مگر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔“

”آپا اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں کو اپنے گھر سے نکال دوں تا کہ آٹے‘ دال کا بھاؤ معلوم ہو ان لوگوں ۔“

”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم ان سے کوئی برا سلوک کرو‘ شجاع بہر حال میرا بیٹا ہے اسے تکلیف میں کر میں پریشان ہو جاؤں گی‘ اب دل و جان میں اتنی سکت نہیں رہی ہے کہ مزید تکلیفوں کا بار سہوں‘ وہ خوش ں میں بھی خوش ہوں۔“ فرید احمد بہن کا یہ انداز دیکھ کر خفت زدہ سے ہو گئے۔

دوسرے دن ہی وہ کراچی آ گئے۔ انہوں نے آ کر کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ گاؤں عظمت آپا سے ملنے گئے تھے ان کے دل میں شجاع کے خلاف ایک بال سا پڑ گیا۔

اتنا اچھا لڑکا جب اپنی ماں کے ساتھ ایسا رہا تو پھر ہمارے ساتھ اس کے معاملات کیسے بہت اچھے ہو سکتے ۔

یہی وجہ تھی کہ جب فیروزہ نے ان سے خوشی خوشی کہا ”سنیے شجاع کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کی شاپ میں بیٹھا ے گا‘ شجاع کی وجہ سے آپ کو بھی بڑی آسانی ہو جائے گی‘ ملازمین بھی پریشان نہیں کر سکیں گے جب وہ یں گے کہ مالک ہر وقت شاپ میں موجود ہے۔“

”مگر میں اب بالکل یہ نہیں چاہتا کہ شجاع ہماری شاپ پر بیٹھے۔“ فرید احمد نے جل کر کہا۔

”ارے کیا ہو گیا آپ‘ آپ نے تو اس سلسلے میں خود ہی رضامندی دی تھی اور اب آپ خود ہی منع کر رہے ۔“ فیروزہ نے حیرت سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”دماغ خراب ہو گیا میرا ابھی کہنا چاہتی ہو ناں‘ مگر میں شجاع کو اپنی دکان میں گھسنے نہیں دوں گا۔“

”مگر کیوں......؟“ فیروزہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ اس لیے کہ وہ اس قابل نہیں ہے۔“ فرید احمد نے اشتعال بھرے لہجے میں کہا۔

تب فیروزہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

مجھے خبر ہے' تجھے سوچنے کی خاطر ہم
بہت سے کام مقدر پہ ٹال رکھتے ہیں
تمہارے بعد یہ عادت سی ہوگئی اپنی
بکھرے سوکھے پتے سنبھال رکھتے ہیں

''اللہ کیا واقعی......؟''فیروزہ بیگم نے اپنی دلی خوشی چھپاتے ہوئے فرید احمد سے پوچھا۔

''ہاں' آپا بتا رہی تھیں...... شجاع انہیں چھوڑ کر کراچی چلا گیا ہے۔''

''کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ضرور ہوگی جو بیٹے نے اپنی ماں کو چھوڑ دیا......؟''وہ اپنے تئیں کرید رہی تھیں اصل بات ان کے سامنے آجائے۔

''بدبخت بیٹے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں' بات کیا ہوگی؟''وہ جھنجلا کر بولے۔

''حیرت ہے' عظمت آپا نے ایسی کیا بات شجاع سے کہہ دی' جس سے اس کا میٹر گھوم گیا۔''فیروزہ اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

''فرحت بتا رہی تھی کہ شجاع کو اب گاؤں میں رہنا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کے ہمیشہ ہمیشہ کراچی میں رہے۔''

''یہ کون سی غلط بات ہے' سب لوگ آگے کی جانب سفر کرنا پسند کرتے ہیں......اور آپ کی آپا سدا کی فقیر......انہیں اپنا گھر' اپنے طور طریقے' اپنے اصول وقوانین کے سوا کوئی بھاتا ہی نہیں ہے......اور نہ ہی ان مزاج میں کسی قسم کی کوئی لچک ہے۔''

''ان باتوں کا یہ مطلب تو نہیں کہ اولاد اپنی ماں کو چھوڑ آئے......وہ تو فرحت ہے وہاں' اگر بیٹی نہ ہو محلے والے سنبھالتے انہیں......''فرید احمد کا جلال کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔

''شجاع کوئی بے وقوف لڑکا تو نہیں ہے۔ اس کی تو آپ مثالیں دیا کرتے تھے' اس نے پہلے تو اماں سمجھانے کی کوشش کی ہوگی۔''

''خاک کوشش کی ہوگی......اگر وہ چاہتا تو عظمت آپا کو اپنے ساتھ لے کر آسکتا تھا۔''

''آپ کو کیا پتا' آپ کی بہن کتنی ضدی ہیں؟''

''ان کا بڑھاپا ہے......اور اس عمر میں تہوار کے موقع پر اکیلا چھوڑ کر آنا کتنی بری بات ہے......''فرید مسلسل تاسف ہو رہا تھا۔

''آپ گئے تھے......اور آپ نے انہیں ساتھ لانے کی بھی کوشش کی تھی تو انہوں نے کون سی آپ کی مانی؟''

''کسی کا جوان بیٹا اپنی ماں کو چھوڑ کر چلا جائے' تو اس کے دل و دماغ میں کہاں سکت ہوگی کہ وہ [illegible] کر سکے۔''

''یہ بات نہ کہیں آپ' ان میں عقل بھی بہت ہے اور طاقت بھی......اپنی زبان سے دوسرے کے دماغ کی ی توڑنا جانتی ہیں۔ یاد ہے آپ کو نہی کے بارے میں......''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''فرید احمد بیوی کی بات کاٹ کر برس ہی تو پڑے۔

''شجاع آپ کا بھانجا بھی ہے اور داماد بھی' اگر اس کو اپنی شاپ پر رکھ لیں گے تو مجھ سے زیادہ آپ کی آپا ش ہوں گی......''فیروزہ اب دوسری چال چل رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے' کہہ دینا اس سے' کل سے دکان پر بیٹھا کرے۔''فرید احمد ناگوار لہجے میں بولے۔ ان کے ے سے لگ رہا تھا جیسے یہ فیصلہ انہوں نے بہ حالت مجبوری کیا ہو۔

فرید احمد کے باہر نکلتے ہی وہ خوشی سے سرشار نگین کے پاس پہنچیں اور لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے پاگل! تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں...... شجاع اپنی ماں سے لڑ کر آیا ہے۔''

''امی! یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''نہ ہو اچھی...... مگر تیرے لیے تو اچھی ہے کہ ساس یا نند کے کانٹوں سے جان چھوٹی اور گاؤں سے رہائی ب ہوئی۔ اپنے شہر میں' اپنے میکے میں رہ کر ہر لڑکی کو سکون ملا کرتا ہے۔''

''شادی کے بعد تو ہر لڑکی کو اپنا گھر اچھا لگتا ہے اور اچھا لگنا چاہیے۔ پھپو کو اس طرح چھوڑ کر آنے پر میرا دل ہت دکھا ہے۔''

''تو' تو پاگل ہے...... جو انہوں نے کیا ہے' اسی کا پھل کھائیں گی۔ بہت ستایا تھا انہوں نے مجھے' اب میری ہیں خالی تھوڑی گئی ہوں گی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ......؟''اس نے تاسف سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سچی بات کیوں نہ کہوں؟''عظمت آپا جیسی زبان خدا دشمن کو نہ دے' لفظوں سے سنگ باری کیا کرتی یں۔

''امی! آپ اتنی اچھی ہیں' پانچوں وقت نماز پڑھتی ہیں' پورے روزے رکھتی ہیں' اپنی بیٹیوں سے اتنی محبت رتی ہیں' ان کا خیال رکھتی ہیں...... تو پرانی اور بری باتوں کو بھول جائیے......اور اچھی باتوں کو یاد رکھیے۔''

''کیسے بھول جاؤں' بہت کلسایا تھا انہوں نے مجھے۔''

''پیاری امی! یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ معاف کر دیں آپ انہیں۔ وہ بھی ساٹھ سے اوپر ہیں اور آپ ں سے اوپر۔ اس عمر میں لڑائی جھگڑے' فتنے فساد کی باتیں بالکل بھی زیب نہیں دیتیں۔ شجاع کے اس طرح پنی آنے پر انہیں واقعی بہت تکلیف پہنچی ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا وقت کسی بھی ماں پر آئے' اگر آپ کی باتیں یں تو ان کے زخموں پر تو نمک پاشی ہو جائے گی۔''

''میں کس کے بھالا مارنے جا رہی ہوں جو وہ زخمی ہوں گی۔''نگین کی بات سن کر وہ چڑ سی گئیں۔

''شجاع اپنا گھر اور پھپو کو چھوڑ تو ضرور آئے ہیں مگر وہ حاضر غائب رہتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں یقیناً ہی خیال رہتا ہے۔ بظاہر وہ ہنستے بولتے بھی ہیں مگر اپنی ماں کو کون بھول سکتا ہے۔''

''یہی تو میں کہتی ہوں کہ تو ہمیشہ کی پاگل ہے۔ نہ اپنے شوہر کو پہچان سکی ہے اور نہ کوئی بات سیکھ سکی ہے۔''

''تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''ہاں' بالکل غلط...... ہر لحاظ سے غلط!''

"تو پھر......؟" اب وہ ہونق سی بنی ماں سے پوچھ رہی تھی۔

"دنیا کے مرد اپنی بیوی بچوں میں مست ہو جاتے ہیں اور ان کے رنگ میں ایسے رنگ جاتے ہیں انہیں ماں یاد آتی ہے نہ بہن بھائی اور نہ ہی کوئی اور......"

"امی! آپ ہی تو کہتی ہیں کہ جسے اپنی ماں یاد نہ رہے اسے کوئی دوسرا بھی یاد نہیں رہتا۔"

"یہ باتیں اب پرانی ہو گئی ہیں' آج کے بچے اپنے والدین کو بڑی جلدی بھول جاتے ہیں۔"

"مگر میں تو آپ کو ہر لمحہ یاد رکھتی ہوں۔ گاؤں میں تھی تب بھی ہر نماز کے بعد آپ کی صحت اور زندگی ا لیے' فہمی کے لیے اور اس کے بچے کے لیے روزانہ دعائیں مانگتی تھی۔"

"میں تمہاری بات نہیں شجاع کی کر رہی ہوں۔ وہ ماں کو چھوڑ کر آیا ہے' دیکھ لینا کبھی واپس نہیں جا اس کی ماں بھی بڑی ضدی عورت ہے...... وہ بھی کبھی اس کے پاس نہیں آئے گی۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا' وہ جائیں گے اور انہیں جانا چاہیے۔ اگر وہ نہیں گئے تو ان کا بیٹا بھی مجھے چھوڑ جائے گا۔"

☆☆☆

فرحت نے بہت روکا تھا' نواسی نواسوں نے بھی بہت خوشامد کی تھی اور داماد نے بھی سمجھایا بہت تھا مگر بیگم نے اپنے گھر آ کر ہی دم لیا۔

پہلے ہفتے تو فرحت بھی آ کر ان کے ساتھ رہی مگر بچوں کے اسکول کا مسئلہ' شوہر اور سسرال والوں کی ا داریوں کے سبب وہ اپنا گھر چھوڑ کے ماں کے پاس آ کر نہیں رہ سکتی تھی اس لیے ان دنوں عظمت بیگم ا میں اکیلی رہ رہی تھیں۔ حکیم جی کی بیگم روزانہ ہی ان کے پاس چکر لگا لیتی تھیں اور یوں دن گزر جاتا تھا رات کو نیند انہیں مشکل سے ہی آتی تھی مگر اچھا برا وقت گزر ہی رہا تھا۔

جب سے عزیز و اقارب کو معلوم ہوا تھا کہ شجاع انہیں چھوڑ کر کراچی چلا گیا ہے' ان کی آمد بھی بڑھ گئی آنے والے کو وہ یہ کہتے کہتے تھک گئی تھیں کہ شجاع عارضی طور پر کراچی گیا ہے۔

"اس کے بچے یہاں بیمار رہتے تھے۔ یہاں کوئی اچھی نرسری بھی نہیں ہے' جس میں بچوں کو پڑ آسانی ہو۔ کچھ دنوں بعد وہ لوگ واپس آ جائیں گے۔"

مگر ان کی باتیں ان کے چہرے کا ساتھ نہیں دیتی تھیں اور تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ باتیں حکیم جی کی بیوی کے توسط سے ان کی بہوؤں تک پہنچ چکی تھیں جو بھاری بھرکم ہو کر گاؤں میں تھیں۔

شجاع نے ماں سے کہا تھا کہ "میں کسی ایک کے ساتھ ہی زندگی گزار سکتا ہوں اور ماں کے مقابلے میں بیوی زیادہ اچھی ہے جو مجھے سمجھتی ہے۔"

اس پر عظمت بیگم نے کہا "تجھے قسم ہے کہ میرے مرنے پر تو گاؤں آئے۔ میں یہ وصیت کر کے جاؤں اگر شجاع آئے تو اس کو میری شکل مت دیکھنے دینا۔"

بڑھتی ہوئی باتوں کی گونج اشرف کے گھر میں بھی پہنچی تو نانی نے کہا۔ "دیکھ دمّے! تیرا معذور بیٹا سامنے تو ہے۔ عظمت کا صحت مند بیٹا اپنی ماں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ تیرا بیٹا زیادہ اچھا ہے۔"

"نانی! بھائی تنگ کتنا کرتا ہے۔ اپنی بیساکھی تک سے چھوٹی بہنوں کو مارنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہی ہو اس کو آگ بن کر لگتی ہے۔ اس کا دل یہی چاہتا ہے کہ اپنی زبان کے ہنٹر سے ہر ایک کو مارے۔" بہنیں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اشرف کو...... پہلے ایسا تو نہیں تھا۔ فرح کے ساتھ جب ہنستا بولتا تھا تو تم لوگوں کو کتنا صہ آتا تھا۔" نانی اپنی ترنگ میں بول رہی تھیں۔

"فرح کم از کم اس کے کام تو نمٹا لیتی تھی۔ اب تو سارا دن اس کے کام کر لیں مگر وہ ختم ہونے میں نہیں آتے اور وہ نہ ہی مطمئن ہوتے ہیں۔" چھوٹی بہن کا لہجہ بھی شکایتی تھا۔

"شجاع کراچی چلا گیا ہے تو ماں پریشان ہو گئی ہے۔ اشرف اگر صبح سے شام تک بھی بھولے سے دکان پر جا بیٹھے تو پورے گھر کو سکون مل جاتا ہے اور جیسے ہی وہ گھر میں آتا ہے' سارے گھر کو پریشان کر دیتا ہے۔" ماں بھی تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ اپنے اشرف پر کسی نے جادو کیا ہے' جب ہی اس کے ساتھ ایسا برا ہوا ہے۔ چھوٹی بہنوں ے رشتے اچھی شکلوں کے باوجود نہیں آ رہے۔" نانی نے اپنی پنڈلیوں پر بام کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بچے پر جادو فرح کے گھر والوں کے سوا کون کر سکتا ہے۔ جوان جہان بیٹے کی ٹانگ کٹ گئی اور وہ رح طلاق کا جھومر سجانے کے بعد بھی کالج میں لڑکی بنی گھوم رہی ہے' نہ اسے کوئی غم نہ کوئی فکر اور نہ کوئی پریشانی۔ بے غیرت اتنی کہ شادی کے بعد تو برقع لیتی تھی مگر طلاق کے بعد برقع اتار پھینکا' صرف چادر لے کر کالج جاتی ہے۔" اشرف کی اماں نے کلستے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے تو سنا ہے کہ طیفے کے چھوٹے بھائی کا رشتہ بھی گیا ہے فرح کے لیے جو رکشا چلاتا ہے۔"

"اس کی ماں تو فوراً ہی کر دے گی ورنہ طلاقن کو کون پوچھتا ہے۔"

"طیفے کے بھائی کا رشتہ ہمارے گھر بھی تو آ رہا تھا۔" نانی نے بیٹی کی بات سن کر کہا۔

"ہاں' اس کی ماں بہنیں آئی تھیں۔ فرخندہ کو پسند بھی کر گئی تھیں مگر فرح نے بیچ میں کوئی ایسی بات ضرور کہہ ی ہو گی جو اچھا خاصا آتا ہوا رشتہ واپس چلا گیا۔"

"تو تم جا کر کہتیں کہ آپ لوگ کیوں نہیں آئے بلکہ دعوت کر دینی چاہیے تھی ان لوگوں کی۔"

"ہاں' میں تو دو تین بار گئی بھی تھی' مگر وہ لوگ آئے ہی نہیں۔ ہاں آئیں گے جیسے جملے بول کر وعدہ کرتے مگر آئے نہیں۔"

"چالاک بلکہ مکار قسم کی بہوئیں ایسے ہی کیا کرتی ہیں...... اکبر کی بہن کی تو اس کی بھاوج نے منگنی تڑوا دی ھی اور اس کے بعد اپنی بھتیجی سے فوراً شادی کر دی تھی۔"

"اب ہر کوئی اکبر جیسا تو نہیں ہو سکتا۔ بیوی کی چالاکی کا مزہ فوراً ہی چکھایا اور فوراً گھر بٹھا دیا...... اور وہ مکار ایک کے آگے روتی رہی کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ فرح کی شادی طیفے کے بھائی سے ضرور ہو گی۔" اماں ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں ہو گی...... تم مرغی والے بابا کے پاس چلی جاؤ۔" نانی نے مشورہ دیا۔

"اماں' ہر کام کروانے پر ایک مرغی اور سو روپے لیتا ہے' گھر کی ساری مرغیاں ختم ہو گئیں۔"

"کام بھی تو تمہارے کتنے سارے ہوئے ہیں۔" نانی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ بات تو ہے......"

تم کل کی جاتی آج چلی جاؤ۔ بابا سے یہ بات خاص طور پر کہنا طیفے کے بھائی سے فرح کی شادی ہرگز
ورنہ اشرف کا دل برا ہوگا۔“

☆☆☆

حیرانی کی بات ہی تھی۔ انٹر آرٹس کے رزلٹ میں فرح نے اے گریڈ میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔

اس کی سہیلیوں نے تو اسے یہی رائے دی تھی کہ وہ سی۔ ٹی کی ٹریننگ کر کے کسی گورنمنٹ اسکول پڑھائے تاکہ ہر ماہ ایک معقول آمدنی بھی اس کے ہاتھ آئے۔

سہیلیوں کی بات اسے پسند آئی تھی۔ مانا کہ امی اس کی ہر ضرورت پوری کرنے کو تیار رہتی تھیں مگر اب یہ دل چاہتا تھا کہ اپنے اخراجات ازخود پورے کرے اور ایسا اسی وقت ہوسکتا تھا کہ وہ ٹریننگ حاصل کرنے بعد معلمی کا پیشہ اپنائے۔

ٹریننگ کرنے کا کالج اس کے گاؤں میں نہیں تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں لاہور جارہی تھیں اور وہاں ہوسٹل میں کرسی ٹی کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ فرح نے بھی اپنی ماں سے کہا کہ وہ بھی لاہور جانا چاہتی ہے اور سی ٹریننگ کے ساتھ پرائیویٹ طور پر بی اے کرنا بھی چاہتی ہے۔

”فرح بیٹا! ایک اجنبی شہر میں اکیلے کیسے رہو گی؟“

”جس طرح دیگر لڑکیاں رہیں گی۔ فاطمہ اور بتول بتارہی تھیں کہ وہ ہوسٹل میں رہیں گی۔“

”فرح! جس طرح تم بی اے پرائیویٹ کرو گی' اسی طرح ٹریننگ کا امتحان بھی پرائیویٹ پاس کرلو دوسرے شہر جانے کا ٹنٹا بھی ختم ہوجائے گا۔“

”امی! ٹریننگ پرائیویٹ طور پر نہیں کی جاتی' اس کے لیے کالج میں داخلہ لے کر پڑھنا پڑے گا۔“

امی اس کو لاہور بھیجنے میں کشمکش و پیچ میں گرفتار تھیں۔ فرح کی بڑی بہنوں سے مشورہ لیا تو وہ بھی ماں کی ہم خیال نکلیں۔

”فرح کی آپ شادی کردیں' اس کے لیے یہی کافی ہے۔“ ان دنوں طیفے کے بھائی کا رشتہ بھی فرح کے لیے آیا ہوا تھا۔

”اب مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی' چاہے مجھے پڑھنے کی آپ لوگ اجازت دیں یا نہ دیں۔“ فرح نے برملا کہہ دیا۔ تب بہنوں کے مشورے سے اس کا لاہور میں سی ٹی کالج میں داخلہ کروادیا گیا اور فرح سہیلیوں کے ساتھ لاہور چلی گئی۔

بہنوں نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس نکتے کو بھی ذہن میں رکھا تھا کہ اشرف کے پڑوس سے اسے وقتی طور نجات ملے گی۔ کچھ عرصے سے اشرف نے ان اوقات میں دروازے پر بیٹھنا شروع کردیا تھا جب اس کے کالج جانے اور وہاں سے آنے کا ٹائم ہوتا۔

فرح کی یہ پوری کوشش ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے نظریں اٹھائے بغیر گزر جائے مگر اشرف کھنکھار فرش پر تھوکتا۔ لاحول ولاقوۃ اونچی آواز میں کہتا اور چہرے ایسے برے برے بناتا کہ فرح سہمے ہوئے انداز میں تیزی سے چلتی اور بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوتی۔

مگر یہ سب روز ہی ہو رہا تھا اور یہ پراگندہ ماحول اسے پریشان ضرور کرتا تھا۔ اس کے گھر میں اشرف کا نام بھی کوئی نہیں لیا کرتا تھا اور نہ ہی فرح اب اس کا تذکرہ کسی بھی حوالے سے کرتی تھی۔ روزانہ اس کی وا

حرکتیں دیکھنے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں کہتی تھی' مگر تنہائی میں یہ سب سوچ کر اس کا ذہن بھاری ضرور ہو جاتا تھا۔

اس کے لاہور جانے کا فیصلہ گھر والوں کے لیے خاصا مشکل تھا مگر جب تمام نکات کو ملحوظ رکھ کر سوچا گیا تو اس کا یہاں سے لاہور جانا سب ہی کو بہتر حل محسوس ہوا۔

دو چار روز تو اشرف کو پتا ہی نہیں چل سکا کہ فرح اب کالج جاتی نظر کیوں نہیں آرہی؟ مگر جب پندرہ سے بیس دن ہوگئے تو محلے کے گھروں سے معلومات کروائی گئی کہ اب فرح کہاں ہے؟

کہیں اس کی شادی تو نہیں ہو رہی جو وہ گھر میں دبک کر بیٹھ گئی ہے۔ فرح کی بہنوں نے لاہور کے بجائے کراچی کا نام لے دیا کہ وہ وہاں پڑھنے کے لیے گئی ہے۔

کراچی کا نام سن کر ہی اشرف کا دماغ دہک سا گیا۔ یہ تو اس نے سن ہی لیا تھا کہ شجاع اپنی ماں کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا ہے۔ اب فرح کے کراچی جانے کا سنا تو اس کے بیمار ذہن نے ایک ہی بات سوچی جو سب جگہ پھیلا دی گئی۔

”فرح اپنے پرانے عاشق کے پاس کراچی چلی گئی ہے۔ شجاع میں اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ وہ اپنی معشوقہ سے گاؤں میں شادی کرتا' اس لیے اس نے یہی سوچا کہ کراچی میں شادی کرلیں گے یوں وہ اس کے پاس چلی گئی۔“

گاؤں والے اس کی بات سنتے اور اس کو ترحم سے دیکھتے۔ فرح جیسی لڑکی تھی' اس کے بارے میں یہ بہتان ہضم نہیں ہو رہے تھے مگر اشرف اور اس کے گھر کے لوگ خوش تھے کہ انہوں نے فرح کو رج کر بدنام کردیا ہے۔

”اب لگ پتا جائے گا فرح کی ماں کو کہ ذلت کیا ہوتی ہے؟“ اشرف کی ماں گھر میں خوش ہو رہی تھی۔

”کیا پتا شجاع بھی اسے چھوڑ دے...... تو فرح کی ماں تمہارے پاس خوشامد کرنے آئے کہ اشرف سے دوبارہ شادی کروادو۔ اب تو حلالہ کی شرط بھی پوری ہوگئی ہے“ نانی بھی خوب دور کی کوڑی لائیں۔

”میں نہیں کرنے کی اپنے لال کی شادی اس منحوس سے۔“ اشرف کی ماں نے ہنس کر کہا۔

”اللہ تو پھر اس نگوڑی کی کہاں شادی ہوگی؟“ بڑی آپا نے بے مہار ہنستے ہوئے اماں سے پوچھا۔

”ہمیں کیا پتا...... ہماری بلا سے۔ کالے چور سے ہو ہماری جوتی سے۔“ اماں بھی خوب کھلکھلا رہی تھیں۔

”اے لو...... کالا تو اپنا اشرف بھی ہے۔ پہلے بھی تو اس کی شادی کون سے طرم خاں سے ہوئی تھی جواب ہوگی۔“ نانی سادہ لوحی میں اپنے نواسے کا خود ہی مذاق اڑانے لگیں۔

اور جب تک اماں کو ان کی بات سمجھ میں آتی' نانی کسی پرانے گیت کو اپنے بڑے حافظے کے ساتھ انٹ شنٹ گا رہی تھیں اور وہ بھی بلغمی لہجے میں۔

”اگر میں ہوتی راجا......!
کالی بندریا......
لٹک رہتی راجا
تورے بنگلے پر!
اگر میں ہوتی راجا
گوری دلہنیا
مٹک رہتی راجا

تورے بنگلے پر......!"

☆☆☆

شجاع باقاعدگی سے فرید احمد کی شاپ پر بیٹھ رہا تھا اور اس کے بیٹھنے کی وجہ سے مثبت اثرات سامنے آ رہے تھے۔ نوکروں کو من مانی کرنے کا موقع بالکل بھی نہیں مل رہا تھا' جس کی وجہ سے دکان کا منافع ہر ماہ بڑھ رہا تھا۔

فرید احمد شجاع سے بے حد خوش تھے اور انہوں نے اس کی تنخواہ میں ازخود پانچ ہزار کا اضافہ کر دیا تھا۔ نگین کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی' "دیکھا' میں نے کہا تھا ناں' ابا جی آپ کی تنخواہ میں اضافہ ضرور کریں گے۔ آپ نے کہا بھی نہیں اور انہوں نے بڑھا دیے۔"

"میں بھی تو دن رات جتا ہوا ہوں دکان میں۔ گودام کے مال تک کا اندراج کروا رہا ہوں...... جو پہلے کسی کھاتے میں نہیں تھا۔"

"میرا کہنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آپ اپنے آپ کو ملازم نہ سمجھا کریں۔ آپ اس دکان کے مالک ہیں اور مالکوں کی توجہ سے ہی ہر کام احسن طریقے سے ہوا کرتا ہے۔"

"اتنی محنت کر کے بھی مجھے کیا مل رہا ہے' پندرہ ہزار...... زیادہ سے زیادہ فرید ماموں مجھے بیس ہزار تک دے سکیں گے مگر یہ رقم آج کے اخراجات کے حساب سے تو نا کافی ہے۔ ان پیسوں میں اپنے بچوں کو ڈھنگ کے اسکول میں بھی نہیں پڑھا سکتا۔"

"کیسی باتیں کرر ہے ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔"

"شجاع...... وقت سے پہلے اور نصیب سے زیادہ کبھی کسی کو نہیں ملا کرتا۔ آپ اتنے بے صبرے مت بنیے......" نگین نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا بے صبرا پن نہیں ہے حقیقت ہے۔ اگر یہاں میری اپنی دکان ہوتی تو میں بلا شرکت غیرے اس کے تمام منافع کا حقدار ہو جاتا۔"

"آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ کراچی آتے ہی میں جس چیز کو ہاتھ لگاؤں وہ سونا بن جائے' ایسا نہیں ہوا کرتا ہے اور بزنس تو ہمیشہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے۔"

"تم مجھے یہ سمجھانا چاہ رہی ہو کہ میں بے وقوف ہوں......" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟"

"میں گاؤں میں پلا بڑھا ضرور ہوں' مگر شہریوں کی ہر بات سمجھ لیتا ہوں...... جو زبان پر ہو اور جو دل میں ہو۔"

"پھر تو آپ بے حد ذہین ہیں جو ان کہی بھی جان لیتے ہیں اور میں شاید بے حد بدھو کہ زبان کی ہر بات کا مطلب کشید کرنے سے قاصر رہتی ہوں۔"

"اصل بات یہ بھی ہے کہ تمہارے والد بزرگوار بے حد چالاک بھی ہیں۔ وہ اگر باہر سے کسی کو رکھتے تو انہیں پندرہ پندرہ ہزار کے دو لڑکے رکھنے پڑتے۔ انہوں نے سوچا اپنے داماد کو پندرہ ہزار دے دو اور احسان علیحدہ دھر دو کہ ہم نے اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے اور کھلا پلا بھی رہے ہیں...... اور شاید اسی وجہ سے وہ احسان بھی ہمارے سر رکھ رہے ہیں۔"

"ابا جی تو احسان کی بات زبان پر کبھی نہیں لائے؟"

"پھر تو واقعی بہت بڑی چیز ہیں یہ ماموں جان بھی۔ زبان پر نہیں لاتے اور مجھے اچھی طرح محسوس کرا دیا کہ میں ان کے احسان کے طفیل تنخواہ پا رہا ہوں۔ وہ جب شاپ پر آتے ہیں تو ملازموں کو کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد جس نظر سے مجھے دیکھتے ہیں' اس میں میرے لیے کتنی محبت و شفقت ہوتی ہے' وہ میں اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔" شجاع نے تلخی سے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو آپ اپنی پسند کی جاب ڈھونڈنے کی کوششیں جاری رکھیے' مل جائے تو پہلی فرصت میں اس کو چھوڑ دیجیے گا۔ ابا جی آپ کو باندھ کر تھوڑی بیٹھے ہیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں' اتنے کچھ تجربہ بھی ہو جائے گا ورنہ میں نے اپنی زمینوں کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔"

"اب آپ کی زمینوں کو کون دیکھ رہا ہے؟" اس کو خیال آیا تو پوچھا۔

"گاؤں میں را کھے بھی ہیں ہمارے پرانے...... اور حکیم صاحب کا بڑا لڑکا شروع سے ہی میرے ساتھ ہوتا تھا' آج کل وہی دیکھ رہا ہے۔ اماں نے تو اسی کے ہاتھ مجھے پچاس ہزار بھجوائے تھے۔"

"تو پھر......!" نگین نے گہرا سانس لے کر پوچھا۔

"میں نے واپس کر دیے...... کہ اس کی اماں کو زیادہ ضرورت ہے' میں یہاں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔"

"پھپھو اگر برا مان گئیں تو......؟"

"میں جا کر انہیں سمجھا دوں گا۔"

اور نگین یہ سن کر ہی خوش ہو گئی کہ اس پتھر دل انسان کے دل میں گاؤں جانے اور اپنی ماں سے ملنے کا خیال آیا ہے اور یہ ایک اچھی بات تھی ورنہ پھپھو کی ڈبڈباتی آنکھیں اور پریشان سا چہرہ...... سوچ کر وہ دکھی سی ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

فرید احمد کا شمار ان لوگوں میں تھا جو اپنی گاڑی کو کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے تھے۔ ان کی پرانی مارگلہ ان کے حساب سے ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی...... اور اگر اس میں کچھ خرابی ہو جاتی تو وہ اپنے پرانے مکینک جسے عرف عام میں حاجی کہہ کر بلایا جاتا تھا' اس سے ٹھیک کروا لیتے' حاجی کے علاوہ کسی دوسرے مکینک نے ان کی گاڑی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

ایک مرتبہ حاجی کو کسی شادی میں شرکت کرنے اندرون سندھ جانا پڑا۔ جہاں سے وہ پورے بیس دن بعد کراچی آیا اور فرید احمد نے ان بیس دنوں میں اپنی بائیک استعمال کی' گاڑی کا سائلنسر جو نکل گیا تھا وہ کسی دوسرے مکینک سے نہیں لگوایا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی گاڑی شجاع کو بھی نہیں دی تھی۔ حالانکہ فیروزہ یہی چاہتی تھیں جب گاڑی گھر میں کھڑی ہے تو اس کو شجاع ہی استعمال کرے۔

گھر سے دکان کا راستہ بھی بہت زیادہ نہیں تھا۔ فرید احمد سے پوچھے بغیر وہ دے نہیں سکتی تھیں اس لیے ان سے ہی اجازت کا پروانہ چاہا۔

"فیروزہ! تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ آج میں شجاع کو گاڑی چلانے کے لیے دے دوں تو کل مجھے بھی

کے شوہر کو بھی ایک گاڑی خرید کر دے دینی چاہیے...... وہ بھی تو اپنے آفس بائیک پر بیٹھ کر جاتا ہے۔“

”نہ فہد ایسا ہے اور نہ ہی فہمی اس مزاج کی ہے اور پھر آپ کوئی مستقل طور پر تھوڑی اپنی گاڑی شجاع کو دیں گے۔ بس دوکان پر آنے جانے کے لیے دے دیں۔“ فیروزہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں اپاہج تو نہیں ہوا ہوں‘ روزانہ نہ سہی مگر دو تین دن بعد دوکان کا چکر تو لگاتا ہی ہوں‘ میری گاڑی اگر شجاع لے جائے تو میں بھونکتی ہوئی بائیک پر بیٹھ کر جاؤں گا یا تم چاہتی ہو کہ میں اپنی دکان داماد کے ہاتھ میں دے دوں۔“

”ٹھیک ہے مت دیں آپ۔ میں شاید غلطی پر ہوں اس لیے آپ نے ایسا کہا......“ فرید احمد کی لن ترانی سن کر فیروزہ نے زچ ہو کر کہا۔

فیروزہ جب چپ ہو کر بیٹھ گئیں تو فرید احمد نے پوچھا ”شجاع دکان پر بس سے جاتا ہے یا رکشا ٹیکسی کرتا ہے؟“

”بس سے وہ کہاں جاتا ہے۔ کبھی رکشا اور کبھی ٹیکسی۔ روزانہ کے ڈھیروں پیسے تو بے چارے کے کرائے کی مد میں خرچ ہو جاتے ہیں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو اسے میری بائیک دے دو۔ جب میں اس عمر میں بائیک چلا سکتا ہوں تو وہ تو پھر جوان لڑکا ہے۔ بائیک پر دکان چلا جایا کرے۔“

”بائیک آپ کی بہت پرانی سی ہے...... ہو سکتا ہے وہ منع کر دے۔“ فیروزہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”منع کرتا ہے تو سو دفعہ منع کر دے۔ ہم اس کی خوشامد تو نہیں کریں گے...... اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ میں داماد جی کو نئی بائیک خرید کر دوں۔“

”سیکنڈ ہینڈ اچھی حالت کی بائیک کتنے میں آ جاتی ہو گی؟“ فیروزہ نے پوچھا۔

”اگر بیوی پاگل ہو تو اسے بحث و مباحثے سے پرہیز کرنا چاہیے۔“ فرید احمد کو غصہ ہی تو آ گیا ”کان کھول کر سن لو فیروزہ! شجاع کو میں نے اپنے گھر میں اس وجہ سے رکھ لیا ہے کہ ان کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے...... مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میرے پاس جو تھوڑی بہت جمع پونجی ہے‘ اس میں آگ لگا دوں...... اور کبھی میری اپنی کوئی پریشانی آئے تو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔“

”اللہ نہ کرے...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”شجاع کو اگر میری پرانی بائیک دکان آنے جانے کے لیے چاہیے تو وہ لے لے‘ اس سے زیادہ میں نہ کچھ کر سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے‘ میں پوچھ لوں گی۔“

نگین کا تو خیال تھا کہ وہ فوراً منع کر دے گا...... مگر اس نے ہامی بھر لی اور بائیک کے اچھے یا برے ہونے پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔

نگین نے شجاع کو گاؤں میں بائیک چلاتے ہوئے دیکھا تھا مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کراچی کی مصروف اور پرہجوم شاہراہوں پر چلانا مشکل ہو گا۔ پہلے ہی دن دکان جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بائیک کسی کی گاڑی پر ٹھونک دی۔

یہ بھی اچھا تھا کہ شجاع کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہاں‘ جس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی اس کا خاصا نقصان

ہوا مگر بقول شجاع کے وہ بہت شریف شخص تھا۔ اس نے نہ صرف شجاع کی مرہم پٹی کروائی‘ گھر تک چھوڑا بلکہ ائیک ٹھیک کروانے کی بھی ذمے داری لے لی۔

”شجاع! یہ کراچی ہے‘ یہاں ایسے ہمدرد سڑکوں پر نہیں ملا کرتے۔ تم جان لو کہ وہ بائیک چلی گئی ہے جس کی گاڑی کا تم نے نقصان کیا ہے وہ تمہاری بائیک بیچ کر اپنا نقصان پورا کرے گا۔“

”اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ تو کرتا......“

”جیسی سڑی ہوئی بائیک پر تم بیٹھے تھے...... کیا اسے اندازہ نہیں ہوا ہو گا کہ تمہاری مالی پوزیشن کتنی اسٹرونگ ہے؟“

”تو آپ کا کیا خیال ہے‘ وہ بائیک لے اڑا؟“ شجاع نے ممانی سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں‘ سو فی صد یہی خیال ہے۔ اگر تم اسے دو چار ہزار دے دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ وہ پرانی بائیک بھی کم از کم تیس سے پینتیس ہزار کی ہو گی۔“

”آپ کا خیال غلط ہے ممانی! وہ بہت ہی نیک بندہ تھا۔ اس نے نہ صرف میری مرہم پٹی کروائی بلکہ اسپتال کینٹین سے مجھے چائے منگوا کر بھی پلائی۔ آپ دیکھ لیجئے گا‘ دو تین روز میں وہ میری بائیک ٹھیک کروا کے لے آئے گا۔“

”بیٹا یہ کراچی ہے۔ اسٹریٹ کرائمز جتنے یہاں ہوتے ہیں‘ پورے پاکستان میں نہیں ہوتے اور پھر تمہاری بائیک نے تو اس کی گاڑی کو نقصان پہنچایا تھا۔ بقول تمہارے گاڑی کے بمپر بھی ٹوٹ گئے تھے اور پچھلی لائٹس بھی...... گاڑی پر ڈینٹ علیحدہ پڑ گئے تھے...... اس لحاظ سے تمہاری بائیک لے لینا اس کا حق بھی بنتا ہے۔“ فیروزہ بیگم نے جب اس سے کہا تو وہ کھسیا کر رہ گیا۔

اس کا تو یہ خیال تھا کہ وہ لوگوں کی شکلیں پہچان لیتا ہے مگر اسے اس میں اچھی خاصی ناکامی ہوئی تھی۔

فرید احمد کو جب تمام صورت حال معلوم ہوئی تو انہوں نے شجاع کے سامنے تو کچھ نہیں کہا مگر فیروزہ کو اکیلے میں بے نقط سنائیں۔

”جب شجاع کو بائیک چلانی آتی ہی نہیں تھی تو تم نے اسے بائیک کیوں دی؟“

”مجھے کیا معلوم تھا؟ اور پھر وہ گاؤں میں تو خوب چلاتا پھرتا تھا۔“

”اس کی اپنی بائیک تو گاؤں میں بھی نہیں تھی یونہی دوستوں کی لے کر چلا لیتا ہو گا۔ کراچی کو اس نے گاؤں سمجھ لیا جو اندھا دھند چلاتے ہوئے اس نے کسی کی گاڑی پر دے ماری۔“

”شکر کریں کہ اللہ نے اسے بچا لیا...... ہاتھ‘ پیر کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔“ فیروزہ نے ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا نقصان تو اچھا خاصا کر دیا‘ اچھی خاصی بائیک تھی‘ گاڑی خراب ہوتی تھی تو کام میں آ جاتی تھی‘ اب اس سے بھی گئے۔“

”اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی۔“ فیروزہ بدستور بات کو ہلکا کر رہی تھیں۔

”ہاں...... اب بڑھاپے میں رکشا‘ ٹیکسی کے پیچھے بھاگنا لکھا ہو گا تو بھاگیں گے...... داماد کو گھر میں رکھا ہے تو تکلیف تو پہنچے گا ہی۔“

لاؤنج سے ماں کے کمرے میں آتی نگین نے یہ باتیں سنیں تو اسے بے حد ملال سا ہوا...... اور شجاع کی یہ

بات پہلی مرتبہ صحیح لگی کہ انہیں الگ گھر میں رہنا چاہیے۔

تیسرے دن ہی بائیک ٹھیک ہو کر گھر آ گئی تھی اور اس کی مرمت پر صرف بارہ سو پچاس روپے لگے بقول شجاع کے اس کا وہ دوست لے بھی نہیں رہا تھا۔

بائیک دیکھ کر فرید احمد کی باچھیں بھی کھل سی گئیں ’’ارے یہ تو اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہے...... کیریئر تھا اس نے وہ بھی لگوا دیا...... سیٹ کا کور تک تبدیل کروا دیا۔‘‘

’’ماموں! وہ بہت اچھا شخص ہے اور میرا دوست بھی بن گیا ہے۔‘‘

’’بیٹے جی...... اس شہر میں کسی کو دوست بنانے کی غلطی مت کرنا...... کیا پتا وہ بائیک واپس کر کے حاصل کرنا چاہ رہا ہو...... اور آئندہ کسی بڑی واردات کرنے کا خواہاں ہو۔‘‘ فرید احمد نے اسے اچھا خاصا ہوئے کہا۔

’’آپ کی بائیک تو واپس آ گئی ہے...... میرے دوست نے آپ کا ایک خیال تو غلط ثابت کر دیا۔‘‘ نے الجھ کر کہا۔

’’ہاں' یہ تو ہے۔‘‘ فیروزہ بھی بائیک آنے پر خاصی خوش تھیں۔

’’امی! ہم لوگ بہت جلد فلیٹ میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ یہ فلیٹ ان کی گاؤں کی ایک عزیزہ کا ہے...... بھی دلی خواہش مند ہیں کہ ہم بطور کرائے داران کے ساتھ رہیں۔‘‘

نگین نے ازخود جب ماں سے کہا تو شجاع نے حیرانی سے بیوی کو دیکھا۔ کہاں تو وہ یہاں رہنے کے مختلف استدلال دیا کرتی تھی اور اب وہی...... فلیٹ میں جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

’’ٹھیک ہے...... تم لوگ جہاں رہنا چاہو خوشی سے رہو...... ہم تم پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کرنا کو ہمارے ساتھ رہنا ہوگا...... مگر کیا تمہاری رہائش سے دکان کا فاصلہ زیادہ تو نہیں بڑھ جائے گا؟‘‘

’’نہیں' ایسا کوئی خاص زیادہ نہیں ہوگا۔‘‘

’’تم یہ بائیک اپنے ساتھ لے جانا اور ذرا سنبھل کر چلانا...... کہ آئندہ کسی کی گاڑی سے دے فیروزہ نے شجاع سے کہا۔

’’نہیں ممانی...... میں کراچی کے ٹریفک میں بائیک نہیں چلا پاؤں گا۔ احمد صاحب تو شریف نے مجھے بائیک بھی واپس کر دی اور گاڑی توڑنے کا کوئی حرجانہ بھی وصول نہیں کیا مگر ہر کوئی احمد صاحب کی نہیں ہوتا۔ وہ تو بے حد شریف آدمی ہیں۔‘‘

’’ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ کراچی میں بائیک اور گاڑی چلانا...... اب جی داروں کا ہی کام رہ گیا ہے۔ ماموں جب تک گھر نہیں آتے ہیں' مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے۔‘‘ فیروزہ نے مطمئن سے لہجے میں کہا۔

تب نگین کو یوں لگا جیسے شجاع کے بائیک نہ لینے پر اس کے والدین خوش ہوئے ہوں اور ان کے سر انجانا سا بوجھ اتر گیا ہو...... تب نگین کے دل میں کچھ سے سوئی سی چبھ گئی۔

☆☆☆

فاخرہ نے دروازہ کھولا تو تین لڑکیوں کے ساتھ ایک خاتون اچھے حلیے میں کھڑی تھیں۔

’’جی فرمایئے......؟‘‘ وہ یہ سمجھی شاید اوپر کرائے داروں کے کوئی مہمان انہیں پوچھتے ہوئے نیچے کے میں آ گئے ہیں۔

’’یہ رعنا کا گھر ہے ناں...... خاتون نے مسکراتے لبوں سے پوچھا۔

’’جی ہاں' یہ رعنا کا ہی اچ گھر ہے پر آپ کون...... میں نکو جانتی آپ لوگاں کو؟‘‘ فاخرہ نے حیرت سے آنے الیوں کو دیکھ کر کہا۔

’’رعنا کے یو میں پڑھتی ہے ناں...... ہم اس کی یونیورسٹی فیلو کی سسٹرز ہیں۔‘‘ بڑی لڑکی نے آگے بڑھ کر عارف کروایا۔

’’اندر آیئے ناں...... آپ لوگاں...... میں رعنا کو بولتیوں...... آج وہ یونیورسٹی پی نمیں گئی ناں......‘‘

فاخرہ نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ رعنا کے کمرے لی گئیں وہ مزے سے بستر پر لیٹی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھیں۔

’’رعنا' تم بتاتی بھی نمیں...... تمہاری یونیورسٹی کی سہیلیاں آ کو بیٹھی ہیں گھر میں۔‘‘ فاخرہ نے اسے جلدی آنے کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے کہا۔

رعنا دوپٹا لیتی ہوئی دوسرے لمحے ہی ڈرائنگ روم میں تھی۔

’’میں تو آپ لوگاں کو نہیں جانتی...... وہ ان آنے والیوں کو دیکھتے ہوئے۔‘‘ ماں کو دیکھ کر بولی۔

’’کیا آپ جمیل آذر کو بھی نہیں جانتیں......؟‘‘ بڑی لڑکی نے مسکراتے لبوں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

’’ان کو کون نہیں جانتا...... وہ تو یونیورسٹی کے مشہور و معروف شخصیت ہوتے ناں......‘‘ رعنا نے قدرے جھینپ کر کہا۔

’’رعنا...... یہ کون ہوتے جمیل آذر؟‘‘ فاخرہ نے بیٹی سے پوچھا۔

’’امی' انہوں ہماری یونیورسٹی میں پڑھتے اور میں جس ڈرامے میں کام کری تھی ناں' انہوں لکھے تھے اس کی اسٹوری!‘‘

’’اچھا...... اچھا......‘‘ فاخرہ نے مسکراتے ہوئے ان کی ماں کی طرف دیکھا' جیسے یہ کہہ رہی ہوں...... کہ آپ کے آنے کا مقصد کیا ہے؟

رعنا کسی کام سے وہاں سے اٹھی تو جمیل آذر کی والدہ نے کہا ’’بے شک جیسا ہمارے بیٹے نے کہا تھا' ویسی ی پیاری آپ کی بیٹی ہے۔ آج ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے جمیل آذر کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ ہمارا یہ بیٹا...... شادی کے نام سے ہمیشہ بھاگتا تھا مگر جب سے اس نے رعنا کو دیکھا ہے تو اس کا یہی کہنا ہے کہ اگر رعنا یا رعنا ی لڑکی ملے گی تو وہ شادی کرے گا ورنہ ہرگز نہیں۔‘‘

’’اچھا...... کیا آپ لوگاں کو یہ نہیں معلوم کہ رعنا کی منگنی ہو کے بیٹھی ہے۔‘‘ فاخرہ نے انہیں حیرت سے دیکھتے ے کہا۔

’’منگنی ہی تو ہوئی ہے' نکاح تو نہیں...... اگر آپ اپنا فیصلہ بدلنا چاہیں تو ہم رعنا کے پہلے طلب گار ہیں۔‘‘

’’ایسا اچ تو نہیں ہو سکتا ماں...... رعنا کو میں اپنے بھانجے کو دی ہوں......‘‘ فاخرہ نے پریشان سے لہجے میں کہا۔

’’کھیے بہن! اب شادی بیاہ کے معاملات میں بچوں کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ زندگی جن لوگوں نے بسر ی ہے ان ہی کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھیں گے تو کس کا خیال رکھیں گے اور اب تو رشتے داروں میں شادی نے کا رجحان پاکستان میں بے حد کم ہو گیا ہے اور آپ ابھی تک لکیر کی فقیر بنی ہوئی ہیں۔‘‘ جمیل آذر کی ماں

اس انداز میں بول رہی تھیں کہ فاخرہ چپ سی ہو گئیں۔

"کیا میں امید رکھوں کہ آپ جمیل آذر کے بارے میں مثبت جواب دیں گی۔" انہوں نے اپنے بیگ اپنے بیٹے کی تصویر جو فریم میں تھی' ان کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی لگی یہ تصویر آپ کو؟"

"آپ کا بیٹا بہوت اچھا دکھتا ہے۔ پر میں کیا کروں۔ میں اپنی زبان دے کو بیٹھی ہوں۔ آپ لوگاں آتے تو شاید میں کچھ کر بی سکتی...... مگر اب نکو کر سکتی کچھ میں۔"

"کیا آپ کو اپنا بھانجا بہت پسند ہے؟"

"ہاں' میں انہوں سے بہوت محبت کرتی۔"

"وہ آپ کی بیٹی کو بہت پسند کرتا ہے؟" ان کا لہجہ استفہامیہ سا تھا۔

"ہاں...... ہاں' کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے فاخرہ کے حلق میں کچھ پھنس سا گیا۔ (کاش ایسا ہوتا... انہوں نے سوچا۔

"بہن' میں ایک التجا تو آپ سے کرنا چاہوں گی۔"

"جی کہیے......" فاخرہ پریشان سے لہجے میں بولیں۔

"اگر آپ کی بیٹی کی شادی کسی وجہ سے آپ کے بھانجے سے نہ ہو پائے تو آپ جمیل آذر کا رشتہ فورا کرلیں گی۔"

"ہاں...... ہاں' کیوں نئیں' حبول کروں گی میں۔ مگر ایسا اچ کیوں ہوئیں گا؟" فاخرہ پریشان سی ہو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک اجنبی خاتون کو اتنی پرسنل معلومات کس نے دی ہیں کہ انہیں یہاں تک اندا ہے کہ یہ شادی ناممکن بھی ہو سکتی ہے؟

جب جمیل آذر کی والدہ اور بہنوں نے جانے کی اجازت چاہی تو فاخرہ نے پریشان ہو کر انہیں خدا حاف کہہ دیا۔

رعنا جب چائے کی ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں آئی تو مہمان جا چکے تھے اور فاخرہ وہیں صوفے پر سی بیٹھی تھیں۔

"اللہ' وہ لوگاں چلے بی گئے' آپ میرے کو بتائی بھی نئیں۔"

"کیوں آئے تھے یہ سوب!" فاخرہ نے پوچھا۔

"میرے کو کیا معلوم...... آپ پوچھا نئیں ان سے؟"

"ہاں' پوچھی تھی میں...... اپنے بیٹے جمیل کے لیے آئیں تھیں وہ۔"

"کائے کو آئی تھیں......" رعنا ابھی تک حیران تھی۔

"رعنا...... میرے سامنے معصوم بنتی ناں تم......؟ انہوں کے بیٹے کو پسند کرتی ہو ناں...... یونیورسٹی واسطے گئی تھیں ناں تم؟ صابرہ سن کے بیٹھے گی تو کیا بولے گی مجھ سے؟" فاخرہ کی کڑوی کسیلی باتیں ختم ہونے نہیں آ رہی تھیں۔

"امی! میں کیا غلط کری...... آپ کائے کو یہ سوب بول رہی مجھ سے...... میں تو کسی کو نہیں بولی...... کہ میر گھر کو آؤ۔"

"نہیں رعنا! ایسا نکو بولو تم...... کچھ نہ کچھ اشارہ تم دی ہو...... جو یہ سوب لوگاں آ کو بیٹھے۔ انہوں کی اماں

ام پڑ گیا...... کہ یہ شادی ٹوٹ بھی سکتی ہے بول کے۔"

"امی جی! میں سچ بولتیوں...... ایسا اچ میں کچھ نئیں بولی۔ جمیل آذر میرے گروپ میں آ کو بیٹھتا تھا...... مگر ے کو نئیں معلوم تھا...... کہ وہ ایسا ہی اچ کرے گا۔"

"آج ایک کا رشتہ آیا ہے کل کو دوسرے کا بھی آنے کا ہو سکتا ہے' صابرہ کو معلوم پڑے گا تو وہ چیخ نئیں ے گی کیا۔ منگنی والیوں کے رشتے نکو آتے۔ رعنا جی! منگنی کا مطلب ہی یہ ہوتا کہ ہماری زندگانی کسی دوسرے ات باندھ کے بیٹھی ہے۔"

"میں جانتی ہوں...... مگر میں کوئی خصور (قصور) نہیں کری۔" وہ اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اپنے ں ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"چلو' میں مان کے بیٹھتی...... مگر دوسرا تو نکو مان سکتا ناں...... آئندہ احتیاط کرنا ماں......!"

"جی ہو...... اب جمیل آذر کے تو دماخ کو ٹھیک کردوں گی میں۔ کیا سمجھ کے بھیجا وہ اپنی ماں' بہنوں کو...... میں لی ایسا اقرار نئیں کری تھی۔"

"کوئی ضرورت نہیں باتاں کرنے کی......"

"تم بس چپ ہو کے بیٹھو...... ناں بات کرو اور ناں جواب دو۔ پھر وہ پاگل تھوڑی ہوگا ناں...... جو پیچھے کو گا۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی اچ کروں گی میں۔ آپ فکراں نکو کرو۔"

گر رعنا تو حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان ہو گئی کہ پہلے وہ خاموش رہی تھی۔ جمیل آذر کی کسی بات کا ہیں دیا مگر وہ اس کے پاس روزانہ آتا تھا۔

اس نے اسے خوب لتاڑا۔ بے مہار سنایا مگر وہ برا مانے بغیر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی ی نہیں دیکھتا مگر وہ تو ایسا مستقل مزاج تھا' ڈانٹ پھٹکار کا بھی اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ جب تک وہ اسے نہ اسے چین نہ پڑتا تھا۔

"اگر تم یہ سمجھ کے بیٹھے ہو کہ میں تم سے شادی کروں گی...... تو دھوکے اچ میں ہو تم۔ میں ہر حال میں منور کے شادی کروں گی' ہاں۔"

"میں کب منع کر رہا ہوں تمہیں...... ضرور کرو۔" وہ ہنس کر کہتا۔

اور اس کے اس انداز کو دیکھ کر وہ مزید چڑ جاتی۔

☆☆☆

جاگتی راتوں کے سارے سلسلے اچھے لگے
آنکھ میں جو جم گئے وہ رت جگے اچھے لگے
لمحہ لمحہ زندگی ہونے لگی عنبر فشاں
اب کی رت میں خوشبوؤں سے رابطے اچھے لگے
رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں دید کے منظر سبھی
پھول تیرے گلستاں کے ادھ کھلے اچھے لگے
ان سے میری خواہشوں کو ہر جہاں آباد ہے

راہ الفت کے حسین ' یہ حادثے اچھے لگے
جن کو جان آرزو جانا تھا ہم نے شاہدہ
ان کو ترک آرزو کے مشورے اچھے لگے

(شاہدہ)

شجاع کی آواز بہت اچھی نہیں تھی مگر گنگناتے ہوئے بھلی لگتی تھی۔ آج وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سا بناتے ہوئے مسلسل گا رہا تھا۔

تگین نے اسے مسکراتے لبوں سے دیکھا اور پوچھا "خیریت! یہ آج آپ کے اندر کا گلوکار کا آ گیا؟"

"آج اس گلوکار کی سالگرہ ہے...... تو وہ اپنے آپ کو خوش تو کرے گا ہی ناں......" اس نے شوخی پھر گنگنانے لگا۔

ان سے میری خواہشوں کا ہر جہاں آباد ہے
راہ الفت کے حسین' یہ حادثے اچھے لگے

"مگر آپ نے تو بتایا تھا کہ آپ کی اصلی تاریخ 20 مئی ہے؟" تگین نے اس سے استفسار کر کہا۔

"مگر جب کاغذات پر بارہ دسمبر لکھی ہے تو میں وہی دن مناؤں گا۔"

"مگر یہ اصلی دن تو نہیں ہے سالگرہ کا۔"

"20 مئی کو تم کراچی میں تھیں اور میں پنجاب میں۔ اماں سے کہا تو انہوں نے کہا...... میں بھول دسمبر میں کر لینا۔ اور اب دسمبر کی بارہ تاریخ آئی ہے تو تم پھر مئی کی بات کر رہی ہو۔"

"آپ خوش ہو جائیں' اب میں آپ کی سالگرہ بارہ دسمبر کو بھی منایا کروں گی اور بیس مئی کو بھی۔" ہنس کر کہا۔

"یہ ہوئی ناں اچھی بات۔"

"بتائیے...... شام میں آپ کے لیے کون سی ڈش بطور خاص تیار کروں؟"

"آج باہر کھانا کھالیں گے۔ بہت دن ہو گئے دکان کے چکر میں باہر جانا بھی نہیں ہوتا ہے۔"

"بہت پیسے خرچ ہو جائیں گے...... پیسے بچا کر رکھیں اپنے پاس۔"

"اس سلسلے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شام اچھی طرح تیار ہو جانا' آج شا کرتے ہیں۔ بچے امی کے پاس چھوڑ جائیں گے۔"

"نہیں' بچے بھی ساتھ لے کر چلنا۔ مجھے بچوں کے ساتھ مزہ آتا ہے۔"

"ٹھیک ہے......" شجاع نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔ وہ کوٹ پہنتے ہوئے ہنوز گنگنا رہا تھا۔ شجاع کی خوشی سے سرشار آواز امرت کی صورت اس کو محظوظ کر رہی تھی۔

جاگتی راتوں کے سارے سلسلے اچھے لگے
آنکھ میں جو جم گئے وہ رت جگے اچھے لگے

☆☆☆

ھانا کھاتے ہوئے اس کے پشت سے ہنسی کی آواز آئی تو منہ تک جاتا ہوا ہاتھ یکدم رک گیا۔

"یہ لڑکی تگین کی طرح ہنس رہی ہے۔" زبور نے سوچا۔ تگین کو ہنستا دیکھ کر وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ تمہاری ہنسی دار ہے۔ ایسی سچی اور خوبصورت ہنسی میں نے آج تک نہیں سنی۔

"ارحم بیٹا! تم میرے ہاتھ سے کھا لو' اپنے پاپا کو تنگ مت کرو۔" تگین اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی۔

ہور اپنی ٹیبل سے یک لخت کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ......؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"میں ابھی آیا۔" وہ ہال کے پیچھے تک گیا اور وہاں سے دھیرے دھیرے آتے ہوئے اس نے بخوبی دیکھ لیا مین اپنے دونوں بچوں اور شوہر کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ تگین کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی مگر زبور نے اس کو دیکھ لیا تھا۔

"یا ہو گیا تھا آپ کو جو اٹھ کر ڈائننگ ہال میں ٹہلنے لگے؟" اس کی بیوی تمسخر بھرے لہجے میں پوچھ رہی

"میرا پیر سو گیا تھا...... میں نے سوچا کہ مجھے ٹہلنا چاہیے۔" زبور اب کھانا برائے نام کھا رہا تھا اور اس کے مین اور اس کے شوہر کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔

"یا خیال ہے...... اب کشور تائی کے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں۔" شجاع تگین سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں سے آپ کو شاپ دور پڑے گی...... یہ سوچ لیجیے گا۔"

"ہو جانے دو...... مگر گھر تو بڑا ہو گا...... یہاں تو ہمارے پاس ایک ہی کمرا ہے ناں!"

"ی نہیں' پورا گھر ہمارا ہے۔" تگین نے شوخی سے کہا۔

"ہی باجی! جب آتی ہیں تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ علیحدہ کمرا انہیں نہیں ملتا...... امی کے کمرے میں رہنا ہ اور ابا جی ڈرائنگ روم میں چلے جاتے ہیں۔"

"ہی باجی کون سی روز روز آتی ہیں۔ مہینوں میں آتی ہیں رہنے کے لیے۔"

"ان باتوں سے تمہارا کیا مطلب ہے...... کیا تم کشور تائی کے فلیٹ میں نہیں رہنا چاہتیں؟"

"یہ میں نے کب کہا ہے۔ مجھے تو ہر اس جگہ رہنا پسند ہے جہاں آپ ہوں۔ مجھے تو گاؤں بھی کبھی برا نہیں لگا ہاں آپ تھے۔ وہاں کی پریشانیوں نے بھی مجھے کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچایا۔"

ہ زبور کے دل میں کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی۔

لین کیسی مثبت سوچوں کی حامل لڑکی تھی جسے ہر حال میں اپنے شوہر کی رائے سے اتفاق تھا' ایک اس کی ی۔ جو اس کی سیدھی بات کو بھی پہلے ٹیڑھی کر کے دیکھتی تھی۔ اس کی کسی بات سے متفق نہیں ہوتی تھی۔ لڑنا اور شور مچانا اس کے روز کے معمولات تھے۔

ادی کے تین سالوں میں اس نے دو مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کر کے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا اور وہ پ کو حالات کے دھارے پر ڈال چکا تھا۔

ج ہی تگین کو دیکھ کر حسد میں جلا ہو گیا۔ کتنے سکون سے زندگی گزار رہی ہے یہ...... اس کی زندگی میں لی ہونے کے باوجود کوئی پریشانی ہی نہیں۔

ایک میں ہوں' جہاں دولت گھر کی باندی ہے مگر ماں کے غلط انتخاب نے اس کا ہر سکون تج دیا

تھا۔ سائیکی بیوی کو نبھاتے نبھاتے وہ خود سائیکی ہوتا جا رہا تھا۔

کھانا ختم کر کے وہ قصداً بیٹے کو گود میں لے کر نگین کے سامنے سے گزرا۔ بیوی کو بھی بڑی محبت جب وہ اس کی ٹیبل کے سامنے چند لمحوں کے لیے رکا تو نگین کی نظروں میں اس کے لیے شناسائی کا نظر نہیں آیا۔ کتنی کٹھور بنی دیکھ رہی تھی وہ اسے' جیسے اسے پہچانتی ہی نہ ہو۔

☆☆☆

نہ چھڑا سکو گے دامن' نہ نظر بچا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن
جو میں دل کی بات کہہ دوں' تو کہیں نہ جا سکو گے
نہ چھڑا سکو گے دامن!

اداکارہ صبیحہ اپنے شرارے کو چٹکی سے پکڑے ہوئے زینے سے اترتے ہوئے گا رہی تھیں اور ان کے ہر وار پر مڑ کر متبسم چہرے کے ساتھ صبیحہ کو دیکھ رہے تھے مگر پھر بھی شیروانی کے بٹن بند کرتے بڑھ رہے تھے۔

فیروزہ کو پرانی فلمیں دیکھنے کا خاصا جنون تھا۔ خود ان کے پاس بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا خاصا جسے وہ گاہے بگاہے دیکھا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ صبیحہ' سنتوش کی رومانی فلم "دامن" دیکھ رہی تھیں نگین ماں کے کمرے میں آئی تو ہنس کر بولی "امی! بار بار ان فلموں کو دیکھ کر آپ کا دل نہیں بھرتا؟"

"مجھے یہ فلمیں آج کی فلموں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا...... آج کی فلمیں نئی ٹیکنیک اور نئے موضوعات پر بن رہی ہیں۔"

"آج کی فلموں میں ڈانس دیکھے ہیں' سرکس کے کرتب لگتے ہیں۔ کبھی ہیروئن' ہیرو کی پیٹھ پر سوا کندھے پر' کبھی وہ ٹانگوں کے بیچ سے پھسلتی ہوئی جا رہی ہے۔ ایسے ہوتے ہیں ڈانس؟ جو چک مک خونخوار سے داؤ نظر آتے ہیں۔ ایسے ڈانس دیکھ دیکھ کر مجھے تو وحشت سی ہوتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' ڈانس اب کرتب کا نام بن گیا ہے۔" نگین نے ہنس کر کہا "ایسا اثرات کے سبب ہے' بالی وڈ صرف ہالی وڈ سے متاثر ہے۔"

شجاع ان دنوں شاپ پر جا رہا تھا۔ صبح دس بجے جاتا تو رات نو بجے آتا اور نگین یہ خوب سارا وق باتیں کر کے گزارا کرتی یا کبھی اپنی بہن فہمی کے ہاں چلی جاتی۔

ممانی جان کے محبت بھرے سلوک نے فیروزہ کے پیر بھی کھول دیے تھے اور وہ بھی وقتاً فوقتاً ان جانے لگی تھیں۔ اس وقت یہ دونوں ماں بیٹیاں فلم دیکھنے کے دوران باتیں بھی کر رہی تھیں۔ نگین کے اپنے کمرے میں کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو نگین باہر گئی۔ آنے والے کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ جمال ہاتھ میں مٹھا ڈبے لیے کھڑا تھا۔

"یہ لیجیے' ایک ڈبا فیروزہ خالہ کا ہے اور ایک آپ کا ہے۔" جمال نے اس کے ہاتھ میں دونوں ڈ ہوئے کہا۔

"کیا آپ کی شادی ہو رہی ہے......؟" نگین کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ رشتہ طے ہونے کی

نر وہ آیا ہے۔

"اللہ نہ کرے......" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"تو پھر کس سلسلے کی یہ مٹھائی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ربیع کے بیٹا ہوا ہے' میں ماموں بن گیا ہوں۔" اس کے چہرے پر خوشی چھائی ہوئی تھی۔

"بہت مبارک ہو۔" نگین نے کہا۔

"شکریہ۔"

"ربیع سے فون پر بات ہو تو میری جانب سے بھی مبارک باد دیجیے گا۔"

"جی ضرور۔"

"اندر نہیں آئیں گے کیا......؟" اس نے اخلاقاً کہا۔

"پھر کبھی......" وہ مسکرا کر اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کے بولا۔ جمال کی آنکھوں میں ایسی نرمی' ایسی لاک...... اور چاہت کی ایسی پھوار تھی کہ وہ اس کی برکھا میں نہا سی گئی...... اور چپ چاپ اسے دیکھے چلی گئی۔

"آپ تو شاید ربیع کو بھول گئی ہوں گی مگر وہ آپ کو اب بھی بہت یاد کرتی ہے۔" جمال نے اپنی محبت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

اور اسے جھرجھری سی آ گئی۔ یہ آنکھیں اس نے کہاں دیکھی تھیں۔ ایسی مانوس سی نرمی...... جو دستک سی ے رہی ہوں۔ اپنے اس احساس پر وہ گھبرا سی گئی۔

"اچھا' اب میں چلتا ہوں۔" اسے یوں چپ سا دیکھ کر جمال نے کہا۔

"ہاں' ٹھیک ہے۔" بے اختیار اس نے کہا جیسے وہ یہ کہہ رہی ہو کہ تم کو فوراً چلا جانا چاہیے۔

جمال نے جاتے جاتے اس پر ایک بار پھر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ مگر اس کی بولتی ہوئی آنکھیں اپنا احوال بتا رہی تھیں۔ اس کے بارے میں پوچھ رہی تھیں' اس کو سراہ رہی تھیں۔

نگین اس کی بے چین سی آنکھوں کو سوچ کر پریشان سی ہو گئی۔ جمال کا گھر اسی گلی میں آخری سرے پر تھا۔ گین ابھی تک مٹھائی کے دونوں ڈبے لیے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ جمال سیدھا اپنے گھر کی جانب ہی جا رہا ا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے قدم بمشکل اٹھ رہے ہوں کہ اس کی رفتار بے حد دھیمی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہی سوچ کر قدم بڑھا رہا ہو۔

کیا جمال صرف ہمارے گھر میں ہی مٹھائی دینے آیا تھا کہ نہ تو اس کے ہاتھ میں مزید ڈبے تھے اور نہ ہی وہ ن کے دروازے پر رکا تھا۔ نگین سوچ رہی تھی۔

"یہ جمال مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا جو کہہ نہیں سکا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے کس قسم کا گلہ کر رہی تھیں۔ جب وہ صت ہو رہا تھا۔ ایسی چمک اور وارفتگی...... نہ میں نے زبور کی آنکھوں میں دیکھی اور نہ شجاع کی آنکھوں میں۔ تو پھر یہ کیوں مجھے خلجان میں مبتلا کرنے آ گیا؟ اس شخص سے نہ میرا کبھی تعلق' نہ ناتا...... مگر یہ پہچان کے اتنے ے بڑے دلائل چراغوں کی طرح روشن کر کے ان دیوں کو اپنی آنکھوں کی منڈیروں پر بٹھائے کیوں آ گیا؟

وہ جتنا سوچ رہی تھی' اتنا ہی الجھ رہی تھی۔ اگر جمال کے دل میں کوئی خاص بات ہے تو یہ ایک بار پیچھے مڑ کر رور دیکھے گا...... چند روز پہلے دیکھی فلم کے مناظر اس کے ذہن پر چھا سے گئے اور پھر نگین بھی فلم کی اس ہیروئن طرح حیران رہ گئی کہ اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے وہ پیچھے پلٹ کر دیکھ رہا تھا...... اور دروازے پر

ایستادہ نگین کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔

یہ جمال کی شخصیت مجھے طلسماتی سی کیوں لگ رہی ہے؟ اس نے سوچا...... اور مٹھائی کے ڈبے اس ہاتھوں میں کانپ گئے۔

پاگل ہوگئی ہوں میں...... وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ان دنوں وہ کتنی فلمیں دیکھ رہی تھی۔ آج تک اس نے وی کے ڈرامے اتنی پابندی سے نہیں دیکھے تھے۔ جتنی کہ آج کل فلمیں دیکھ رہی تھی۔

فیروزہ بیگم تو فلم دیکھنے کے دوران میں سبزی ترکاری کاٹا کرتی تھیں۔ کھانا بھی ڈائننگ روم میں کھا بجائے ٹی وی لاؤنج میں فلم دیکھتے ہوئے کھایا جاتا تھا۔

جب امی کے ساتھ بیٹھ کر روزانہ رومانس سے لت پت فلمیں دیکھوں گی تو ایسے ہی اینگے بینگے خیال آئیں

”کہاں رہ گئیں...... ایسا اچھا سین چل رہا ہے۔ بے چاری صبیحہ اس قدر رو رہی ہے۔ وحید مراد ا ڈانس کر رہا ہے۔“ فیروزہ اندر سے بول رہی تھیں۔

”یہ فلم بند کریں اور مٹھائی کھائیں۔ ربیع کے لڑکا ہوا ہے۔“

”اسے کہتے ہیں قسمت‘ معذور لڑکی کتنی اچھی جگہ بیاہی گئی اور پہلے پہل کا لڑکا بھی ہوگیا۔ ایک ہماری کہ پرائی اولاد پال کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر رہی ہے۔“ فیروزہ بیگم نے مٹھائی کھاتے ہوئے تاسف سے کہا۔

”امی! ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ فہمی باجی کی پریشانیاں اللہ تعالیٰ نے ختم کر دی ہیں اور وہ سکھ سے اپنی زندگی گزار رہی ہیں ورنہ یاد کریں وہ دن...... جب ان کی منگنی ٹوٹی تھی اور وہ نفسیاتی کیس گئی تھیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو...... ان دنوں تو فہمی کی شکل اور آواز تک چینج ہوگئی تھی...... اور میں تو یہ سمجھنے لگی تھی کہ کسی کا اثر ہوگیا ہے۔“

”اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ زندگی کی گاڑی جب چلتی ہے تو بہت سے ہچکولے آتے ہی ہیں۔

”ہاں‘ ٹھیک کہہ رہی ہو تم......“ فیروزہ ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلاتی ہوئی بولیں۔

☆☆☆

محبت دو دلوں کا سلسلہ ہے
محبت خود بڑا ہی واقعہ ہے
محبت روح کی تابندگی بھی
محبت کہکشاں کا راستہ ہے
محبت ایک جنوں ہے درحقیقت
محبت آپ ہی ایک معجزہ ہے

(ثنا)

ثنا جتنا سوچ رہی تھی‘ اتنا ہی پریشان ہو رہی تھی۔ محبت نے اسے کیسا پاگل سا بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ جا کر اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کتنی بے چین سی رہی تھی۔

”میرے خدایا! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے کہ میں جدھر دیکھوں...... نادر نہ ہوتے ہوئے بھی نظر آتا

”وہ چلا جاتا ہے...... تو دل چاہتا ہے کہ وہ آجائے...... اور جب وہ آتا ہے تو دل کرتا ہے کہ وہ چلا جائے...... تا کہ میں اس کا انتظار کروں۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور وہ اپنے نوٹس کھولے ہوئے نادر کے بارے میں سوچے چلی جا رہی تھی۔

محبت میں کچھ کچھ اثر ہو رہا ہے
کہ دل اپنا زیروزبر ہو رہا ہے

میں...... جو نادر کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا کرتی تھی...... اور اب اس کو دیکھ کر دل اور چہرا دونوں ہی کھل جاتے ہیں۔ مسز رحمٰن چار دن بعد آنے والی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ راز ان پر افشا نہ ہو جائے...... نادر نے اس سے ہی کہا تھا...... کہ ان معاملات کی ہوا بھی آپا تک نہیں جانی چاہیے۔

خدا نہ کرے...... اگر مسز رحمٰن کو یہ پتا لگ گیا تو میں اور نادر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان کو کس قدر غصہ آئے گا۔ جب وہ اپنے بھائی کی اس قدر دشمن ہیں تو میری دوست کیونکر ہو سکتی ہیں۔

یا اللہ‘ میرا یہ راز افشا نہ ہونے پائے ورنہ نادر بیچارے بھی پریشان ہو جائیں گے۔ محبت کو چھپانا ضروری کیوں ہوتا ہے؟ اس کے ذہن میں یہ سوال خود ہی ابھر کر آیا۔

شاید محبت ڈرپوک ہوتی ہے یا محبت کرنے وال بزدل ہوتے ہیں؟

مگر نادر دیگر باتوں میں تو ایسا نہیں ہے۔ وہ تو کورٹ میرج تک کے پلان بناتا ہے تو پھر اپنے دل کی بات بہن سے نہیں کہہ سکتا تو ماں سے کہہ دے...... یا کسی اور سے...... اس نے سوچا۔

کل میرا ٹیسٹ ہے...... اور میں پڑھنے کے بجائے صرف نادر کے بارے میں ہی سوچے چلی جا رہی ہوں‘ جیسے کہ اس کے بارے میں ہی سوالات آئیں گے۔ وائے وا...... بھی اسی کے بارے میں ہوگا؟ اپنی سوچ پر اسے از خود ہنسی سی آگئی۔

یہ محبت بھی واقعی عجیب ہی چیز ہے۔ آسمان سے زمین پر لانے میں دیر نہیں لگاتی۔

کیا محبت...... نفرت کی گود سے بھی جنم لے سکتی ہے؟ اس نے سوچا۔

شاید...... ہاں‘ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا۔ کسی کو پسند کرنا کیا محبت ہوتی ہے؟

ایسا شخص جو اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا‘ وہ اسے یکدم کیوں اچھا لگنے لگا تھا؟ وہ جو ذی شعور لڑکی تھی‘ ہر بات کو چھان پھٹک کر دیکھنے کی عادی تھی‘ اس میں اور کسی عام سی لڑکی میں کوئی فرق کیوں نہ رہا تھا؟

کیا مردانہ وجاہت اور مخمور لہجے لڑکیوں کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں؟ ثنا اکیلے میں بیٹھ کر اپنا تجزیہ خود کر رہی تھی۔

وہ جو ایسی لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھا کرتی تھی‘ جو کسی نہ کسی لڑکے کی محبت میں گرفتار تھیں۔ اب وہ خود ایسی کیوں ہوگئی تھی۔

نادر بلاشبہ بے حد وجیہہ شخص تھا...... جب وہ ثنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا...... تو اس کا دل اتھل پتھل سا ہو جایا کرتا تھا۔

پتا نہیں یہ شخص مجھے کیوں اچھا لگنے لگا ہے؟ پتا نہیں اس کی ذات میں ایسا کیا سحر ہے...... جو میں اسیر ہوگئی ہوں۔ اس نے کتاب سرہانے رکھ دی اور لیٹ گئی۔

دو دن اگر وہ مجھے نظر نہ آئے تو دل بیکل سا ہونے لگتا ہے۔ اب وہ کھڑکی سے باہر ٹمٹماتے ستارے کو دیکھ کر

سوچ رہی تھی۔

ان تمام معاملات میں ثنا کا اتنا قصور نہیں تھا جتنا کہ حالات کا تھا۔ مسز رحمن اپنے خاندان کی شادیوں میں شرکت کے لیے مسلسل کئی مہینے سے ملتان میں تھیں۔ شادیاں نمٹا کر آئیں تو لاہور میں ان کے بڑے ماموں کا انتقال ہو گیا۔ ممانی پہلے ہی فالج کی مریضہ تھیں۔ تعزیت اور عیادت کا سلسلہ بھی کئی ہفتوں پر محیط ہو گیا۔

کسی کے اکیلے گھر میں کوئی جوان لڑکی ہو جہاں کی ایک خاتون اسے ہر صورت میں برا بنا کر اپنے گھر سے نکالنے کی خواہاں ہو تو...... کچھ نہ کچھ تو برا ہونا ہی تھا۔ یوں بھی برائی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اپنے اندر بے مقناطیسیت رکھتی ہے۔ کوئی ذرا سا بھی ایک قدم اس کی جانب بڑھائے...... وہ بیس قدم آگے بڑھ کر اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔

اپنے آپ کو اچھا بنانے کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ مگر برا بننے کے لیے تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا...... بس آنکھیں بند کر لو برائی ہاتھ پکڑ کر جدھر دل چاہے لے جاتی ہے۔

ثریا بیگم اپنے تئیں بے حد عقل مند تھیں مگر انہیں یہ عقل نہیں تھی کہ جوان بیٹیوں کو کسی کے گھر چھوڑا نہیں جاتا۔ ثنا اگر ڈاکٹر نہ بن پائی تو کوئی قہر نہ ٹوٹ پڑتا مگر اب وہ جس روش پر گامزن تھی اس کا ہر راستہ اندھیری گلیوں میں جاتا تھا۔

کراچی سے آئے ہوئے اسے تین دن ہو گئے تھے اور نادر کی خفگی کسی صورت میں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”کہہ تو دیا غلطی ہو گئی...... معاف کر دو۔“ ثنا نے زچ ہو کر کہا۔

”نہیں معاف کر سکتا۔ تم دو دن کا کہہ کر گئی تھیں، پورے دس دن کے بعد واپس آئی ہو۔“

”اچھا...... اب نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے، قائم رہنا اپنے وعدے پر۔“ نادر نے کہا۔

اور تب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ طاہر اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ثنا کو نادر کے ساتھ یوں بے تکلفانہ باتیں کرتے دیکھ کر بیلا سے پوچھا۔

”کیا بات ہے، ثنا پڑھنے کے بجائے اپنا ٹائم کیوں ضائع کر رہی ہے۔“

”یہ بات تو آپ اسی سے پوچھیے...... جسے نادر کے ساتھ باتیں بنانے میں خوب مزہ آتا ہے۔“

”خواہ مخواہ کی بکواس میرے سامنے مت کیا کرو۔“ طاہر کو بیلا کی بات سن کر غصہ ہی تو آ گیا۔

”آپ مجھ پر کیوں چلا رہے ہیں، خود ثنا سے پوچھ لیں کہ وہ چار گھنٹے سے نادر سے کیوں اترا اترا کر باتیں کر رہی ہے؟“

طاہر کے زور سے بولنے کی آواز نادر کے کانوں میں بھی آ گئی تھی۔ وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے ڈرائنگ روم کے دروازے سے ہی باہر نکل گیا۔

ثنا ابھی وہیں صوفے پر بیٹھی تھی کہ طاہر کمرے میں آ گیا۔

”یہاں کیا کر رہی ہو تم؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا جو چائے کے خالی مگوں کو وہاں سے اٹھا رہی تھی۔

”نادر بھائی کے سر میں درد تھا...... ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہی تھی۔“ اس نے کہا۔

”ثنا...... ! کسی کو بھی چائے پانی دینا تمہارا کام نہیں ہے۔ تمہارے لاسٹ سمسٹر کا بھی آخری منتھ چل رہا

ہے۔ تم اپنی پڑھائی کی جانب بھرپور توجہ دو۔“

”اچھا بھیا!“ وہ مگ باورچی خانے کے کاؤنٹر پر رکھ کر اپنے کمرے میں مڑ گئی۔

ان دنوں کالج کی چھٹیاں تھیں۔ فون پر نادر نے بارہا کہا کہ باہر نکل کر ملو مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے یہاں سے پاس ہو کر جانا ہے۔“ اس کے دل میں یہ خیال راسخ ہو رہا تھا۔

طاہر کے جانے کے بعد جب بیلا نے نادر کو فون کر کے گھر بلایا تب بھی وہ اس سے بات کرنے کے لیے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ اپنے کمرے کی کنڈی بند کیے اپنی اسٹڈی میں متوجہ رہی۔

جس دن کالج کھلا...... تو وہ شیو بڑھائے، آنکھوں میں لالی لیے بائیک پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایک ٹھوکر سے اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

”نادر...... میں گھر جاؤں گی۔“

”ثنا...... پلیز!“ اس نے ایسی لجاجت سے کہا کہ وہ دوپٹا لپیٹ کر اس کے شانے پر ایک ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے، کھانا کھاؤ گی؟“ نادر نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ”جانو، ایسا نہ کیا کرو...... ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”ایسی کیا پڑھائی...... کہ نہ دیکھتی ہو...... نہ بولتی ہو اور نہ سنتی ہو۔“

”میرے پڑھنے کا یہی اسٹائل ہے۔ اپنے گھر میں ہوتی تھی تو سارا سارا دن کھانا تک نہیں کھاتی تھی۔“

”جانو...... یہ تم اپنے اوپر ظلم نہیں کر رہی ہو بلکہ مجھ پر کر رہی ہو۔“ نادر نے اس کے منہ میں نوالہ دیتے ہوئے کہا۔ یہ اس کا اسٹائل تھا۔ وہ جب بھی کہیں کھانا کھانے جاتے، نادر اس کے منہ میں نوالے دیا کرتا۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ثنا کو رشک سے دیکھا کرتے کہ کیسا چاہنے والا ہے...... جو خود کھانے کے بجائے اس کے منہ میں نوالے دے رہا ہے۔ ثنا کو اس کے اس انداز پر بہت شرم آتی تھی مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔

شاید ثنا کے انکار پر اسے تکرار کرنے میں مزہ آیا کرتا تھا۔ ابھی وہ سوئیٹ ڈش کا ایک چمچہ اس کے منہ میں دے رہا تھا۔ ثنا نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بالآخر چمچہ منہ میں لے لیا تھا۔

”گڈ گرل!“ نادر اس کے انداز پر ہنس کر بولا تھا۔

اور ان ہی لمحات میں فریال اپنی فرینڈ کے ساتھ داخل ہوئی۔ وہ کسی نمائش دیکھنے کے بعد یہاں لنچ کرنے آئی تھیں۔ ثنا کو ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ دیکھ کر...... فریال سیدھی اس کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔

”کیسی ہو ثنا...... اور یہ کون ہیں؟“

”ٹھیک ہوں...... اور یہ میرے فرینڈ ہیں، نادر!“

”اور نادر! یہ فریال ہیں...... نازک بوتیک کی اونر...... جہاں سے میں اپنے لیے کپڑے خریدا کرتی ہوں۔“

”تمہارے ساتھ پڑھتے ہیں؟“

”جی...... جی ہاں......“ وہ بوکھلا کر جلدی سے بولی۔

”کب فارغ ہو جاؤ گی تم...... اپنے امتحانات سے؟“ فریال نے اس سے پوچھا۔

”آئندہ ماہ تک۔“

''تو پھر تم کراچی چلی جاؤ گی ناں......'' فریال نہ جانے کیوں اتنی تفصیل سے بات کر رہی تھی۔

''جی دیکھتی ہوں......'' ثنا کو جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہ ہاؤس جاب بھی یہیں کریں گی۔'' نادر نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا......!'' فریال نے اچھا پر زور دے کر ثنا کو دیکھا اور پھر نادر کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اسے یہ ا کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ثنا محبت کے جال میں پھنس چکی ہے۔

''ابھی میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا ہے۔'' ثنا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

فریال سمجھ گئی' وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر نروس ہو رہی ہے۔

''ٹھیک ہے' تم لوگ کھاؤ...... ہم بھی اسی کام کے لیے آئے ہیں۔'' فریال نادر پر گہری نظر ڈالتی ہوئی ا دوست کے پاس آ گئی۔

''توبہ ہے...... لڑکی تھی کہ آفت...... اس کی جرح ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی......'' نادر نے اس جانے کے بعد تبصرہ کیا۔

''میں ان کے بوتیک پر بہت عرصے سے نہیں گئی ہوں شاید اسی لیے پوچھ رہی ہوں گی۔''

''کبھی ایک خاص دکان سے شاپنگ نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ دکان دار...... سر پر چڑھ جاتا ہے اور گاہک اپنا حق جتانے لگتا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی سی ہیں۔ قیمت میں بھی خاصی رعایت دیتی ہیں۔''

''مگر مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئیں...... آئندہ مہنگی شاپنگ کر لینا مگر ان کی شاپ پر ہرگز نہیں جانا۔''

''وہ کیوں؟ انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ کو برا لگا؟'' ثنا حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ تم پر حق کیسا جما رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ تمہاری قریبی رشتے دار ہوں...... اور مجھے تو ایسی نفر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل سے باہر نکال دیں۔''

تب ثنا ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

''وہ منحوس کھانا کھاتے ہوئے بھی ٹہل رہی ہے۔ چلو یہاں سے چلتے ہیں۔'' نادر نے فریال کو کانی نظرو سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلیے......'' ثنا بیگ اور چادر اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ تب فریال نے اس کے کالج کی یونیفارم کو دیکھتے ہو سوچا۔ ثنا کالج سے ہی اس لڑکے کے ساتھ یہاں آئی ہو گی۔

ثنا...... تم کس راہ پر چل پڑی ہو۔ اس نے دکھ سے سوچا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اسی راہ پر چل کر تمہاری پھو گھر سے بے گھر ہوئی ہے۔

''فریال! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟'' اس کی دوست نے اسے یوں سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' تم کھانا کھا لو پھر گھر چلتے ہیں۔''

گھر پہنچتے ہی ثنا کے موبائل پر فریال نے رنگ کیا۔ ننھی سی اسکرین پر فریال کا نمبر دیکھ کر ثنا نے کہا ''جی پھپھو!''

''پیاری ثنا! اتنے عرصے سے میں جو تمہیں سمجھانا چاہ رہی تھی...... تم اس کو سمجھ ہی نہیں سکیں۔''

''پھپھو! نادر...... صرف میرا دوست ہے اور بس......!''

''ثنا بیٹا! لڑکیوں کے دوست نہیں ہوا کرتے...... ان کی سہیلیاں ہوتی ہیں...... اور جب لڑکیوں کے ت بننے لگیں تو پھر خیریت نہیں ہوتی۔ دال میں کالا ہوتا ہے۔''

''فرو پھپھو! بلیومی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نادر میرا...... صرف اور صرف دوست ہے اور بس۔''

''تمہاری پھپھو اتنی نادان نہیں ہے ثنا...... جو نادر کی آنکھوں میں تمہارے لیے اس نئے جذبے کو نہ پہچان ے جس کا تم نام بھی نہیں لینا چاہتیں۔''

''پھپھو! میں کیا کروں...... وہ بس اچانک ہی مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔''

''وہ تمہیں اس لیے اچھا لگنے لگا ہے کہ وہ خوبصورت ہے اور لڑکیاں ہمیشہ خوبصورتی سے ہی زیر ہوا کرتی ہیں۔''

''وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو اس سے کہو کہ شریفانہ انداز اپنائے۔''

''وہ ایسا ہی کرے گا...... امی کو بھی نادر بہت پسند ہے۔''

''کیا بھابی نے نادر کو دیکھ رکھا ہے؟''

''ہاں پھپھو! نہ صرف دیکھا ہے...... بلکہ انہیں میرے لیے پسند بھی آیا ہے۔''

''جب دونوں ہی پارٹیوں کو پسند ہے تو پھر دیر کیوں ہو رہی ہے؟''

''بس میں امتحان سے فارغ ہو جاؤں تو یہ سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔''

''فرو! یہ پنڈی چھوٹی جگہ ہے...... کراچی کے مقابلے میں چھوٹا شہر ہے' تم اس کے ساتھ گھومو گی تو سب اگ پہچان جائیں گے۔''

''تو پھر......؟'' وہ ہراساں سی ہو کر بولی ''لوگ کیا کہیں گے؟''

''کہیں گے تو کچھ نہیں مگر عزت نہیں کریں گے اور لڑکیوں کو اپنی عزت پر کبھی کوئی حرف آنے نہیں دینا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے پھپھو!''

''اگر تم چاہو تو...... نادر کے ساتھ میرے گھر آ سکتی ہو۔''

''نہیں پھپھو...... میں ابھی آپ کے گھر نہیں آنا چاہتی۔ وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی کہہ رہے تھے...... کہ رعب کیسا جما رہی ہیں' جیسے قریبی رشتے دار ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ لڑکا بہت چالاک بھی ہے۔'' فریال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں پھپھو! آج کل بے وقوف کون ہے؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو...... مگر لڑکیاں...... جو ہمیشہ اپنے آپ کو عقل مند سمجھتی ہیں' وہ بے وقوف ہوتی ہیں اور بے وقوف بن بھی جاتی ہیں۔''

''کیا بات ہے پھپھو! آج آپ بڑا فلسفہ بول رہی ہیں؟'' ثنا نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ثنا...... آج میں تمہیں یوں ہوٹل میں کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں۔''

''پھپھو...... آپ بس یہ سمجھیں...... کہ میں اپنے فیانسی کے ساتھ گئی تھی۔''

''ثنا...... فیانسی کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہوا کرتی' اللہ تعالیٰ تمہیں برے وقت اور برے لوگوں سے ہمیشہ چا کر رکھے۔''

''آمین!'' ثنا نے بے اختیار کہا اور اس کی انگلیاں نادر کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

☆☆☆

دل کی مٹی نرم بہت ہے
زرخیزی زخم بہت ہے
ہر شے بے ترتیب بظاہر
لیکن ضبط و نظم بہت ہے
کشتی اپنے آپ پر نازاں
طوفاں بھی سرگرم بہت ہے

مارے غصے کے اس کا برا حال تھا' اس کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی کنپٹی دبائے صوفے پر آڑا سا لیٹا ہوا تھا۔ آوازیں سنگ باری کیسے کیا کرتی ہیں اس حقیقت کا ادراک آج اسے بخوبی ہو رہا تھا۔

''آؤٹ!'' انضمام دہاڑا تھا اور وہ میچ دیکھنے میں اپنی دلچسپی بھی برقرار نہیں رکھ پا رہا تھا۔

''اف...... آج میں آفس سے جلدی کیوں آ گیا۔'' اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے منور نے تیسری بار سوچا۔

میچ وہ ہمیشہ یکسوئی سے بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا مگر آج تو اس کی حالت دگرگوں سی ہو گئی تھی۔ ثریا تائی پھر زور سے ہنسیں' ان کا قہقہہ خاصا زوردار تھا اور پھر مزید قہقہے اس سے بھی سوا تھے۔ ان کی گونج ایسی تیز تھی کہ سونے والے بھی متاثر ہو کر جرح کر سکتے تھے پھر گفتگو بھی خاصی بلند تھی' قصداً بلند تھی یا سرشاری کی وجہ سے ایسا تھا یہ منور سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ یہ تو بخوبی جانتا تھا کہ جب ثریا تائی فون پر بات کرتی ہیں تو گھر والوں کو بہرا سمجھنے لگتی ہیں۔ فون پر باتیں کرتے وقت وہ ہنسنے اور رونے تک کے مظاہرے کرنے پر قادر تھیں۔

وہ آفس سے آ کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر میچ دیکھ رہا تھا مگر اسے نہ صرف ثریا تائی کی باتیں سنائی دے رہی تھیں بلکہ ان کی باتوں سے یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ثنا ان سے کیا کچھ کہہ رہی ہے۔

ثریا کارڈلیس کانوں سے لگائے اپنے بیڈ پر لیٹے ہوئے ہنس کر ثنا سے کہہ رہی تھیں۔

''ثنا میری جان جب تم اپنے امتحان سے فارغ ہو چکی ہو تو فوراً کراچی کیوں نہیں آ جاتیں؟ ارے چندا کسی ڈاکٹر کے کلینک میں اٹیچ منٹ تو تم کراچی آ کر بھی کر سکتی ہو' وہاں کے ڈاکٹر اور یہاں کے ڈاکٹروں میں کوئی فرق تو نہیں ہو گا۔ ارے میری شہزادی مجھے تو تمہاری تھکن کا احساس ہو رہا ہے' تم اپنے گھر آؤ گی تو فریش نس کا احساس تو ہو گا۔''

''کیا کہا...... نادر میرے پاس آئے گا......!''

''ماشاءاللہ جم جم آئے مگر مسز رحمٰن سے کہو کہ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بات کریں۔''

''ہاں' ہاں...... ٹھیک کہہ رہی ہو مگر میری گڑیا' میں اتنی دور بیٹھ کر ہر بات تمہیں سمجھا تو نہیں سکتی۔''

''اچھا...... ارے واقعی......!''

''ایمان سے...... یا اللہ میں کہاں چلی جاؤں۔''

''میری جان مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ نادر کروڑوں کی جائداد کا مالک ہو گا' یوں بھی میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوا کرتے۔''

''نہیں گڑیا...... آئیں بائیں شائیں کبھی نہیں ہانکی میں نے' چہرے پڑھنا جانتی ہوں میں' تمہیں تو اب پتا چلا ہے میں نے چھ ماہ پہلے ہی اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر دیکھ لیا تھا' تم ہمیشہ کی بے وقوف رہیں اس پیسے والے لڑکے کو دو کوڑی کا سمجھتی رہیں...... اس کی حیثیت کا اندازہ تو اس کی شکل دیکھ کر ہی ہو جاتا ہے۔''

''ماشاءاللہ اس کے چہرے پر ایسا بڑا پن ہے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے ورنہ لوگوں کے چہرے پر کیسا کیسا نیچ پن ہوتا ہے کہ دیکھ کر دل گھبراتا ہے۔''

''اب بڑی چچی کے بیٹے جب سامنے آتے ہیں تو قسم خدا کی چیخیں مارنے کو دل چاہتا ہے' شجو خالہ کے بیٹے اچھے خاصے پیسے والے ہیں مگر اللہ تو بہ ان کی شکلیں اور اس سے زیادہ ان کے برے حلیے دیکھ کر تو دل چاہتا ہے کہ چپل اٹھا کر بغیر گنے مارتے چلے جاؤ۔''

''ثنا میری جان تو بہت قسمت والی ہے جو نادر کا دل تجھ پر آ گیا ورنہ پیسے والے لڑکوں کو تو خاندان کی لڑکیاں ہی بلا یات بن کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔''

''ارے...... میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو تیری ہنسی نہیں رک رہی' میں تو سچی بات کہتی ہوں...... ہاں......!''

''ہوں...... اچھا......!''

''پھر...... اوہ......!''

''اللہ...... یہ کہا اس نے...... ماشاءاللہ......!''

''کہیں ایسی بات تو نہیں کہ تمہیں کراچی آنے سے نادر روک رہا ہو؟'' ثریا نے اب اپنی آواز خود ہی دھیمی کر لی تھی اور ہاتھ سے اپنے کمرے کا دروازہ بھی قدرے بھیڑ دیا تھا مگر منور ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا' مارے طیش کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ثریا تائی سے ریسیور چھین کر ثنا کو بے حساب سنا ڈالے۔

وہ ایسی تو نہیں تھی جیسی وہ وہاں جا کے ہو گئی تھی' جب لڑکیوں کو اپنی عزت' وقار اور نیک نامی کا احساس نہ رہے تو وہ تہی دامن ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے ہونٹوں کو مسلسل اپنے دانتوں تلے چبا رہا تھا۔

ثریا فون سے نمٹتے ہی باہر چلی گئی تھیں' ان دنوں شاہنواز کو اپنے آفس سے ڈرائیور کی سہولت ملی ہوئی تھی اس لیے ان کا زیادہ وقت سیر سپاٹوں میں گزرتا تھا۔

شاہنواز بدستور اپنی پرانی گاڑی میں آفس جا رہے تھے اور ثریا نئی گاڑی میں توفگی کے ساتھ بیٹھ کر گھوما کرتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد منور غصے سے بولا۔

''اگر ثریا تائی کو اب اچھے برے کی تمیز نہیں رہی ہے تو کیا سارے گھر کے لوگ بھی ان ہی کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔''

''ہر شخص اپنے مسائل کو آپ جان کے بیٹھتا' تم کائے کو دبلے ہوتے۔'' صابرہ نے اسے رسان سے سمجھانا چاہا حالانکہ ثریا کی باتیں سن کر خود انہیں بھی خاصا برا لگا تھا۔

صابرہ کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی مگر وہ یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بیٹیوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔ اس وقت جس انداز میں ثریا نے اپنی بیٹی کو اکسایا تھا وہ انہیں بھی نامناسب لگا تھا۔

دوسری جانب شائستہ بیگم تو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ جوان جہان بیٹی سے ماں کس انداز میں باتیں کر رہی تھیں! اف خدایا...... کیا اب ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں جو اپنے بچوں سے اس انداز میں مخاطب ہوتی ہیں۔ للچاتا ہوا لہجہ' ترستی ہوئی تمنائیں' قابض کرنے والے ارادے...... مارے شرمندگی اور غصے کے ان کا سر پھٹنے لگا تھا۔

''امی آپ مجھے یہ بتائیے ثنا کے اگر امتحان ختم ہو گئے ہیں تو وہ غیروں کے گھر میں کیوں رکی ہوئی ہے' امتحان کے بعد اس کا وہاں رکنے کا جواز کیا ہے؟ ایک تو لڑکیوں کو کبھی کسی کے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے چاہے وہ رشتے داروں کا ہی گھر کیوں نہ ہو مگر ہمارے گھر میں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ ثریا تائی جو بھی انٹ شنٹ فیصلے کر رہی ہیں وہ سب ہی کو صحیح نظر آتے ہیں' آنے دو آج تایا کو گھر...... میں ان سے بات کرتا ہوں وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟''

''تیرے کو کیا فکراچ ہے بول کے۔ تم کو اتنی پنچایت کائے کو جی...... بھابی جان جو کریں گی سو کریں گی تم کاہے کو سارے میں یو مابوم کرنے بیٹھے۔ وہ ثنا کی ماں ہیں ناں انہوں جو دل چاہے کریں باپ...... تا خچ کی مصیبت میں کائے کو بولتے بیٹھتے تم۔''

''ثنا اس گھر کی لڑکی ہے' اس کی ذمے داری گھر کے سب لوگوں کی ہے۔''

''میکیں بولتیوں چپ ہو کے بیٹھو...... تمہارے انگ میں کائے کو آگ لگ رئی بول کے۔''

''اگر تایا' تائی کو احساس نہیں ہے تو کیا میں بھی بے غیرت بن کے چپ ہو جاؤں۔''

''نکو بولو...... منور...... نکو بولو' میں اللہ کا واسطہ دیتی خواہی نخوائی آفت مچا کو دئیں گی ثریا بھابی' کیا جانتے نئیں تم اُن کی عادت' بات شروع کر کے بیٹھتی تو خیامت تک چل کو بیٹھتی وہ۔'' صابرہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

''منور صحیح کہہ رہا ہے۔'' شائستہ بیگم دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہیں لاؤنج میں آ گئیں' ان کے چہرے سے غم اور تاسف کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں کب بولتیوں کہ منور غلط بولتے مگر اصل رخ تو ماں باپ کا ہوتا ہے ناں' ثریا بھابی کو آپ بھی جانتے کوئی بات اں انہوں کو غلط لگتیں تو وہ جھاڑ کی طرح پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتیں۔''

''پتا نہیں اس گھر میں اب اور کیا ہونے والا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' شائستہ بیگم پریشان سے لہجے میں بولیں۔

''کچھ نئیں ہوئیں گا آپ نکو فکراچ کریں' ثریا بھابی بہوت تحمل مند ہیں' وہ سوب اچھا ہی اچھا کریں گی۔'' صابرہ نے ساس کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے تسلی بھی دی۔

ادھر ثریا اپنے میکے میں بیٹھی تھیں' تکبر ان کے چہرے پر رچا ہوا تھا۔

''میری بیٹی ڈاکٹر بن گئی ہے تو کروڑ پتی لوگوں کے رشتے آ رہے ہیں۔'' وہ زبردستی کی ہنسی ہنس کر بولیں۔

''اے ہے کس کا رشتہ آیا ہے ثنا کے لیے' ہمیں بھی تو بتاؤ۔'' ان کی بڑی بہن کا چہرہ ہی فق ہو گیا۔ ان کی ماشاء اللہ چار چار بیٹیاں تھیں اور چاروں ہی شادی کے قابل اور ابھی تک کہیں سے بھی کوئی رشتہ نہیں آیا تھا اور ثنا تو ان سے کئی سال چھوٹی تھی اس کا رشتہ بھی آیا تو کروڑ پتی کا...... ان کے لیے یہ خاصی پریشان کن بات تھی۔

''لڑکا کینیڈا میں رہتا ہے ان دنوں پنڈی آیا ہوا ہے۔''

''کینیڈا میں کہاں ہے وہ......'' ان دنوں ان کے کرائے دار کا ایک لڑکا اوٹاوہ گیا ہوا تھا جس کے لیے ان کی

لیاں دیکھ رہی تھیں' آپا کو یوں لگا جیسے ثنا بیاہ کر ان کی چھت پر ہی آ رہی ہو۔

''نادر ٹورنٹو میں مس ازساگا میں رہتا ہے۔''

ٹورنٹو کا نام سن کر آپا کی جان میں جان آئی ''شکر ہے نام بھی نادر ہے' اوپر والوں کے لڑکے کا نام تو اقبال ہے'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

''اتنے بڑے لوگ ہیں کہ بتا نہیں سکتی' پیسہ بھی ہے' وجاہت بھی اور سادگی۔''

''اچھا تم سے کیسے رابطہ کر لیا؟'' آپا کی حیرت ہنوز برقرار تھی کہ اپنی بہن کی عادات سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں۔

''لڑکے کے گھر والے اس کے لیے خوبصورت ڈاکٹر لڑکی ڈھونڈ رہے تھے' انہوں نے کہیں ثنا کو دیکھ لیا بس ہو گئے اس پر۔''

''تمہاری تو سمجھ لو لاٹری نکل آئی۔''

''کچھ ہی کہو مگر میری ثنا ہمیشہ کی قسمت والی ہے تو اس معاملے میں کیسے ہٹی رہتی۔'' ثریا کا تو فنگی بھرا لہجہ اب شرارے برسا رہا تھا۔

''میں نے کتنی بار تم سے کہا اپنی نجمہ' سلمیٰ کو سائنس دلواؤ وہ میڈیکل میں آ جائیں گی مگر تم ہمیشہ کی لکیر کی فقیر اپنی بیٹیوں کو آرٹس پڑھوایا اور ایم اے کروا کے ایسی نہال ہو گئیں جیسے لڑکیوں نے نہ جانے کون سی ایسی بڑی ڈگری حاصل کر لی جس سے ان کو بھاگ لگ گئے۔''

''ان کا شوق سائنس کی طرف تھا ہی نہیں تو میں کیا کرتی۔'' آپا کا لہجہ تاسف سے مزین ہو گیا۔

''کوئی آیا کرے تو چشمہ اتروا دیا کرو' چھوٹے سے چہرے پر ایسے بڑے بڑے چشمے پہن کر آتی ہیں کہ عجیب لگتی ہیں اور اپنی عمر سے زیادہ بڑی دکھائی دیتی ہیں...... اور......''

''ارے ثریا' اس لڑکے کا کیا کوئی اور بھائی وائی نہیں ہے۔'' بہن کی طولانی تقریر کو روکتے ہوئے آپا نے اپنی بال اپنے دوپٹے میں سمیٹتے ہوئے بہن کی بات کاٹی۔

''سب کی شادی ہو چکی ہے۔'' ثریا چھن سے ہنس دیں۔ ''یہی بچا ہے جو سب بھائیوں میں نادر بھی ہے اور اب بھی ایسے لڑکے کس کو ملا کرتے ہیں جو میری بیٹی کو مل رہا ہے' یہ بھی سب سے چھوٹا اور سب کا لاڈلا' اس کے گھر والے کب سے اس کے لیے لڑکی دیکھ رہے تھے۔''

''دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟'' آپا کی جرح جاری تھی۔

''بے حد خوبصورت! یہ شاہ رخ' عامر خان' رنگ تو اس کے آگے اٹھائی گیرے سے لگتے ہیں۔''

''ارے واقعی......!'' آپا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''شاہ رخ خان اور عامر خان تو کس قدر رکوڈ وسے ہیں مگر نادر کا قد ہی چھ فٹ تین انچ ہے' جسم کسرتی اور سرخ وسفید' کنجی کنجی سی تو اس کی آنکھیں ہیں۔''

''واقعی...... بہت خوبصورت ہو گا وہ۔'' آپا تو ٹرانس میں آ گئیں۔

''ایسا ویسا...... جو اسے دیکھتا ہے' دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے' راہ چلتے رک کر اسے دیکھنے لگتے ہیں' کسی میں وہ چلا جائے تو آٹو گراف لینے والی لڑکیوں کی لائن لگ جاتی ہے۔''

''مگر وہ شوبز میں تو نہیں ہے۔'' آپا کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

''یہی تو اس کی پرسنالٹی ہے کہ جو اسے دیکھتا ہے کھنچا چلا آتا ہے' سچ آپا اپنے خاندان میں کوئی بھی اس نہیں ہے۔''

''تمہاری دیورانی کا لڑکا تو اچھا خاصا ہے۔'' آپا نے توجہ دلائی۔

''ہونہہ...... وہ منور...... انتہائی بدتمیز اور خودسر لڑکا! جب وہ کڑوی کسیلی گفتگو کرتا ہے تو وہ مجھے انتہائی بد لگا کرتا ہے' یوں بھی کالا کلوٹا سا ہے' مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر غصہ آتا ہے۔''

''ایسا تو نہ کہو' کالا کہاں ہے وہ' کھلتی ہوئی گندمی رنگت ہے میری سلمٰی کہہ رہی تھی بالکل شاہ رخ کی طرح ہے۔'' آپا کی رال پھر بہنے لگی۔

''توبہ ہے آپا...... کہاں کی بات کہاں لے جاتی ہو' میں ذکر کر رہی تھی نادر کا اور تم لے گئیں اس خرا لڑکے کی جانب جو مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔''

''نادر کی تعلیم کتنی ہے؟''

''اے لو وہ تو کینیڈا کا ہی پڑھا ہوا ہے کوئی پاکستان میں تھوڑی ناں پڑھا ہے وہ جو میں یہاں کی ڈگر کے نام بتاؤں گی۔ پتا نہیں کیا کچھ پڑھ رکھا ہے اس نے' ڈگریوں کے تو ڈھیر لگے ہوئے ہیں اس کے پاس۔''

''پھر تو تم واقعی بہت خوش قسمت ہو ثریا۔'' بڑی آپا اپنی سسکیاں اپنے دل میں گھونٹ کر بحالت مجبورا رہی تھیں۔

''اس میں کیا شک ہے۔'' ثریا نے اپنی ایڑی کی ہیل ان کے فرش پر بجاتے ہوئے کہا۔

''جیسا رشتہ تم ثنا کے لیے چاہ رہی تھیں ویسا ہی مل گیا۔'' آپا نے اپنا دکھ چھپا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یقیناً میری کوئی نیکی کام آئی ہے۔'' ثریا رغبت سے ہنس کر بولیں۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں۔'' آپا کے حلق میں پھندا سا لگنے لگا۔

''میری بھی تو یہ عادت ہے کہ ہر ایک کے کام آتی رہتی ہوں' اپنے تمام پہنے ہوئے کپڑے تمہاری دیتی ہوں کہ نہیں؟ اسی طرح ہر سال بڑے بھیا کی بیٹیوں کو ثنا کے تمام پہنے ہوئے کپڑے بھجواتی ہوں' مجھے ہے کہ بھاوج کبھی دل سے شکریہ ادا نہیں کرتی۔ مگر میں یہی سوچتی ہوں کہ گھر گھر پھرنے والی ماسیوں کو د بجائے گھر کی لڑکیوں کو نہ دوں جو میرے دس کام بھی آئیں۔'' گفتگو کی روانی میں وہ دل کی بات بھی کہہ یہ بتانے کی ہمت نہ کر سکیں کہ ان کے دیے ہوئے کئی جوڑے ان کے گھر کی ماسیاں ان کے منہ پر مار گئی تھیں ہمیں نہیں چاہئیں' ایسے بدرنگ اور بدہیت کپڑوں کا ڈھیر ہر ایک کے پاس ہوتا ہے' ایسے کپڑے سوائے صاف کرنے کے کسی کام نہیں آتے ہیں۔

آپا حق دق سی انہیں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔ ثریا کی تقریر جاری تھی' ''اب آپ ہی بتایئے میری کے کاموں کا اجر مجھے کیوں نہ ملتا؟ اب خاندان میں سب سے اچھا داماد مجھے مل رہا ہے تو کوئی تو ایسی بات بھی ہوگی جو لوگ میرے خاندان سے رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں' میں نہ صرف عادت میں بلکہ اخلاق میں بھی ہیرا ہوں جو مجھ سے ایک بار مل لے وہ بار بار میری طرف لپک کر آتا ہے اور ہر ایک کے کام آنا تو میری شامل ہے۔ میرے محلے کی تمام عورتیں میری اس قدر تعریف کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ثریا اس محلے میں تمہارا کسی نعمت سے کم نہیں ہے' کبھی یہ محلہ چھوڑ کر مت جانا ورنہ سب پریشان ہو جائیں گے۔''

''بازار چلنے کو کہو تو فوراً تیار ہو جاتی ہو' فلم دیکھنے کا پروگرام بناؤ تو کبھی کن من نہیں کرتیں' دن ڈش

ارادہ ہی ظاہر کرو تو تم تکمیل کروا کے دم لیتی ہو' سہیلیوں کا دل رکھنا تم ہی جانتی ہو۔ اب مسز عارف نے اپنے مہاں کو پچاس گالیاں سنائی تھیں اور تم نے اس کا دل رکھنے کے لیے نئی نکوری پچیس گالیاں از خود اس کے سسرال والوں کو دیں کہ وہ خوش ہو گئی' اب اس کے کلیجے میں ٹھنڈک تم نے ہی ڈالی ناں' باقی سب تو حیران سے اسے دیکھ ہے تھے کہ تسلی دیں تو کس طرح دیں۔'' تب ان کی آپا' ثریا کو اپنے دل میں ہزاروں صلواتیں سناتے ہوئے رہی تھیں۔

''ثریا تم کیا چیز ہو مجھ سے زیادہ بھلا کون تمہارے بارے میں جان سکتا ہے۔ غیر تو کیا اپنے سگے رشتے داروں کے تم کتنے کام آتی ہو' یہ حقیقت سب ہی جانتے ہیں کہ تم کام تو کیا کام کے وقت اپنی شکل بھی نہ دکھانے والوں میں سے ہو۔'' مگر ثریا کی باؤلی باتیں سن کر وہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں کہ یہ ان کی مجبوری بھی تھی۔

''خالہ...... نادر بھائی کی تصویر تو دکھا دیں۔'' ان کی چاروں بھانجیاں جوان کے اطراف میں آ کے بیٹھ گئی تھیں بڑی لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

''تصویر کیا...... اصلی نادر ہی کو تم لوگ دیکھ لینا۔'' ثریا نے ہنس کر کہا۔

''کیا تم کوئی رسم وسم بھی کرنے والی ہو؟'' اب آپا پھیکے سے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''اے ہے...... وہ لوگ تو فوراً ہی چاہتے ہیں مگر میں ابھی ٹائم لے رہی ہوں۔''

''اتنے اچھے رشتے کو اگر لٹکا کر رکھو تو بھاگ جاتے ہیں' اچھا وقت اور اچھے رشتے کبھی ٹھہرا نہیں کرتے ہیں۔''

''ابھی تو ثنا کا ہاؤس جاب بھی نہیں شروع ہوا۔''

''ہاؤس جاب کا کیا ہے وہ تو شادی کے بعد بھی کر سکتی ہے' اصل تو میڈیکل کی پڑھائی تھی' خیر سے وہ اختتام کو تو کوئی رسم بھی کر ڈالو۔ اچھا ہے خاندان میں ہی کوئی ہلچل مچ جائے۔''

''وہ تو مجھے معلوم ہے کہ سارے لوگ خوب جلیں گے' کسی کی خوشی سے خوش کون ہوتا ہے' زیادہ تر کلسنے والے تے ہیں۔''

''میں تو بھئی بہت خوش ہوئی ہوں' ثنا میری تو ویسے بھی لاڈلی بھانجی ہے' اچھے گھر بیاہی جائے گی تو ہماری ی عزت ہوگی۔'' آپا نے تھوک نگل کر کہا۔ بڑی بھابی تو خیر بہت جلیں گی۔''

''چھوٹی بھابی بھی خوش ہونے والوں میں سے نہیں ہیں' بظاہر بڑے محبت بھرے ڈائیلاگ بولتی ہیں مگر مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مجھ سے بہت کلستی ہیں۔ آفس سے شاہنواز کو جب زیرو میٹر گاڑی ملی تو اسے دیکھ کر انہیں سانپ سونگھ گیا تھا اور جب بولیں تو یہی بولیں' کون سی تمہاری اپنی ہے۔ آج شاہنواز اس آفس کو چھوڑ دیں و ان کی گاڑی چھین لی جائے گی۔''

''میکے والوں کی چھوڑو اپنے سسرال والوں کی کہو' وہ اس رشتے پر کیا رائے دیں گے۔'' آپا نے ان کی توجہ کی تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''میرے تو سارے کے سارے سسرالیے کمینے سے ہیں کوئی خوش ہونے والا نہیں ہے۔

☆☆☆

ید احمد کو اپنے پرانے نوکر شکور پر پورا اعتماد تھا' گزشتہ پندرہ سال سے وہ ان کی شاپ پر ملازم تھا۔ فرید احمد پورا بھروسا کرتے تھے۔ یہ شکور ہی تھا جس نے گزشتہ سال نئے نوکر کی چوری پکڑی تھی۔ یہ بھی شکور کا ہی

کارنامہ تھا جس نے شاپ میں ہونے والی ڈکیتی میں اس کے اصلی مجرموں کو پکڑوایا تھا' جو سیلز مین کا روپ کر دکان پر ملازم ہوئے تھے۔

شکور کے فرید احمد پر اتنے احسانات تھے کہ وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے مگر اسی شجاع کو رتی بھر بھروسا نہیں تھا۔ شجاع کا یہ دعویٰ تھا کہ اس دکان کا اصلی چور یہی شکور ہے۔ سابقہ چوریوں شکور کا ہی ہاتھ تھا' یہی شکور ہے جو چوری کرنے کے لیے اپنے مہرے استعمال کرتا ہے' یہی شکور ہے جو بھی ورغلاتا ہے اور تھوک کے سامان کا غلط اندراج کر کے خوب مال اڑاتا ہے۔ ڈکیتی بھی اسی نے پڑوائی بعد میں اسی نے دوسرے لوگوں کو پکڑوا کے انعام واکرام علیحدہ حاصل کیا تھا۔

"تمہارے کہنے سے میں اپنے دیرینہ ملازم کو فارغ نہیں کر سکتا۔" فرید احمد کو شجاع کی لن ترانی سن کر آ گیا تھا۔

"آپ نے مجھے جب انچارج بنایا ہے تو مجھے اپنی مرضی سے مداخلت کا حق حاصل ہونا چاہیے۔"

"مگر تم کسی کی پیٹھ پر لات مار رہے ہو۔"

"مگر وہ آپ کے پیٹ پر لات مار رہا ہے' میں سمجھتا ہوں کہ پیٹھ پر لات مارنا' پیٹ پر لات مارنے بہتر ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے ضدی بھی ہو گے۔" فرید احمد نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔

شجاع نے شکور کو فوراً ہی فارغ کر دیا اور جب پرانے کھاتے کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ لاکھوں روپے کا کیا گیا تھا۔ فوری طور پر پانچ لاکھ کا فائدہ ہوا جو اس کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔

فیروزہ تو شجاع کے گیت گانے لگیں' داماد کا قدم تو بڑا بھاگوان ثابت ہوا تھا۔ نگین بھی بے حد خوش تھی نے اپنی محنت وایمانداری کی بہترین مثال پیش کر کے اس کے والدین کو فائدہ پہنچایا تھا۔

"اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اس لیے لوگوں کے چلتر پن کو نہیں پہچان سکتا۔" فرید احمد بھی سرشار میں یہی کہہ رہے تھے۔ فیروزہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

"شکور تو آپ کو برس ہا برس سے لوٹ رہا تھا اگر میرا شجاع نہ آتا تو آپ کی یہ شاپ ڈوب چکی ہوتی۔"

"شجاع کا کراچی آنا میرے حق میں تو اچھا ہی ثابت ہوا۔" فرید احمد فیروزہ سے کہہ رہے تھے۔

"آج تک آپ کو اپنی دکان سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا کہ آج کل ہو رہا ہے۔" فیروزہ بار بار احسان تھیں تاکہ فرید احمد کو احساس ہو ان کا داماد کس قدر قابل ہے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو فیروزہ' اگر شجاع کچھ عرصے پہلے آ جاتا تو ہم ایک اور دکان شروع کر سکتے تھے۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہیں اسی شاپ سے آپ کی انشاءاللہ دوسری دکانیں بھی قائم ہو جائیں گی۔"

"ہاں اب مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" فرید احمد نے سرشار سے لہجے میں کہا۔

"اللہ نے ہمیں بیٹا نہ دیا تو کیا ہوا داماد اتنا اچھا دے دیا کہ بیٹے کی کمی دور ہو گئی...... ہے نا۔" فیروزہ بھرے لہجے میں میاں سے کہہ رہی تھیں۔

"ایسا نہ کہو فیروزہ۔" فرید احمد کچھ سوچ کر گم صم سے ہو گئے۔

"کیوں نہ کہوں میرا شجاع میرے بیٹے کی طرح ہی تو ہے۔"

"فیروزہ اگر ہمارا کوئی بیٹا ہوتا تو شاید وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا۔ شجاع بھی تو اپنی ماں کو چھوڑ آیا ہے ناں۔"

فیروزہ میاں کی بات سن کر ایک دم خاموش سی ہو گئیں۔

"فیروزہ...... اللہ کی مصلحت انسان کو سمجھ میں نہیں آتی ہے ہمارے یہاں بیٹا شاید اسی وجہ سے نہ ہوا ہو کہ اگر وہ ہوتا...... اور بڑھاپے میں ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا تو ہم کس قدر پریشان ہو جاتے۔"

"ہم اپنے بیٹے کے ساتھ کبھی ناروا سلوک نہ کرتے جیسے آپ کی بہن نے کیا' اس لیے وہ ہمیں کبھی چھوڑ کر نہ جاتا۔ آپ کی بہن نے صرف اپنے آپ سے محبت کی' بیٹے سے نہیں کی اگر وہ بیٹے سے محبت کرتیں تو وہ کبھی ان کو یوں چھوڑ کر نہیں آتا۔"

"یہ بات تم اس وجہ سے نہیں کہہ سکتیں کہ تمہارے کوئی بیٹا نہیں ہے مگر میں جانتا ہوں عظمت آپا نے بڑی منتوں سے شجاع کو پالا ہے اور وہ اس سے بے حد محبت بھی کرتی ہیں' اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ شجاع اپنی ماں کو چھوڑ کر آ گیا ہے تو یکبارگی میرا دل کانپ سا جاتا ہے اور مجھے شجاع اچھا لگتے لگتے ایک دم برا سا لگنے لگتا ہے۔"

"ہونہہ آپ تو ہیں ہی شروع سے مراقی قسم کے' ہر بات کو الٹا کر کے دیکھتے ہیں۔ جو شخص اچھا ہوتا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا ہوتا ہے اور جو برا ہوتا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ برا ہوتا ہے اگر ہمیں شجاع اچھا لگتا ہے تو اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔" فیروزہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ تب فرید احمد رضامندی میں سر ہلاتے ہوئے سوچوں میں ڈوب گئے نہ جانے کیوں؟

☆☆☆

نگین اور شجاع کشور تائی کے اپارٹمنٹ میں آ گئے تھے' تین کشادہ کمرے' دو بالکونیاں ان کے حصے میں آئی تھیں' ہال باورچی خانہ' ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ہی تھا۔

"تائی اب آپ کو کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔" نگین اب کھانا پکائے گی اور آپ ہمارے ساتھ کھائیں گی۔

"نہیں بیٹا میں اپنا کام خود کرنے کی قائل ہوں' اگر کام نہیں کروں گی تو ہاتھ پیر جام ہو جائیں گے۔"

"تائی جس فلیٹ میں دو شور مچاتے بچے ہمہ وقت موجود ہوں گے وہاں سارے جوائنٹ ہل سکتے ہیں' جم نہیں سکتے...... میرے بچے آپ کو اکیلا کہاں بیٹھنے دیں گے۔"

"ارے بیٹا بچوں کے لیے تو میں ترسی ہوئی ہوں' تمہارے بچے کھلاؤں گی تو میری ممتا کو تسکین ملے گی۔"

"نگین نے آتے ہی فلیٹ کو سجا دیا' ٹی وی لاؤنج کے لیے صوفہ وہ دوسرے دن ہی لے آئی تھی۔ فیروزہ بیگم نے ایک اچھا سا بیڈروم سیٹ خرید کر بھیج دیا تھا۔ کشور تائی نے اپنے پردے ان کے کمروں میں بھی لگا دیے' خوبصورت سا اپارٹمنٹ نگین کے سلیقہ مند ہاتھوں کے طفیل مزید دلکش سا ہو گیا۔

لڑکیاں جب اپنا گھر سجاتی ہیں تو ان کا دل چاہتا ہے کہ میکے والے آئیں اور ان کی تعریف کریں اور میکے والوں کی ویسے بھی ہر بات بچی اور اچھی لگا کرتی ہے۔

نگین نے پہلے فہد اور فہمی کو بلایا' ماموں اور ممانی کو بھی بطور خاص آنے کو کہا۔ فہمی آئی تو اپنے ساتھ ایک خوبصورت بیڈ کور کے ساتھ ٹی فال کی دیگچیوں کا سیٹ بھی لے آئی۔

"آپا' یہ اس قدر تام جھام سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"مجھے معلوم ہے تمہارا سارا جہیز گاؤں میں ہے' نئے گھر میں گھرداری شروع کرو گی تو ہر چیز نئی لینی پڑ رہی ہو گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے آپا...... کشور تائی کے باورچی خانے میں ہر چیز موجود ہے' سل بٹا اور کو ہے۔ تائی کو لہسن کی چٹنی گرینڈر میں پسی اچھی نہیں لگتی' جو مزہ سل پر پسی چٹنی کا ہوتا ہے اس کا مقابلہ کوئی کر سکتی۔"

"اب اتنی فرصت کس کے پاس ہے نگین جو سل بٹے پر چٹنی پیسے گا۔"

"ہماری کشور تائی کے پاس ہے۔ اس عمر میں اتنی ایکٹو ہیں کہ رشک آتا ہے۔" نگین نے خوب کھانے بنائے تھے جسے ماموں ممانی نے بھی خوب تعریف کر کے کھائے۔

ایک ہفتے بعد نگین نے اپنے امی ابو کو کھانے پر بلا لیا۔ فیروزہ سب کے لیے سوئٹر لائی تھیں۔ اچھی کہ وہ کشور تائی کا بھی سوئٹر لے کر آئی تھیں۔

نگین کو یہ دیکھ کر بہت اچھا لگا تھا۔ آج کا کھانا پائے اور بھیجے پر محیط تھا جو کشور تائی نے بنایا تھا۔ مو اچھا خاصا سرد ہو گیا تھا اس لیے سب کو پائے کھا کر مزہ آ گیا۔ فرید احمد بھی بیٹی کے گھر سے خوش خوش گئے۔

"نگین میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے دوست احمد کی بھی دعوت کر دوں' کراچی شہر میں وہ میرا واحد دوس ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ ان کی فیملی کو بلا لیں اچھا ہے' میری بھی ان کی بیوی سے ملاقات ہو جائے گی۔"

اگلے دن جب شجاع گھر آیا تو اس نے بتایا کہ احمد نے دعوت کے لیے منع کر دیا ہے۔ کھانے پینے کا شوق بھی نہیں ہے ورنہ وہ آ جاتے۔

"ٹھیک ہے ان کی مرضی...... آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آنا نہ آنا دوسرے کی ذمے داری ہوتی ہے۔"

کشور تائی جن کی زندگی میں تنہائی اور خاموشیوں نے بسیرا کر لیا تھا انہیں شجاع کے آ جانے سے طمانیت حاصل ہوئی تھی۔ بچوں کے ساتھ ان کا وقت تیزی سے گزر جاتا تھا۔ انہیں یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وقت ہوا ہو گیا۔

☆☆☆

"یہ بلیک والا سوٹ ڈمی پر سے اتار دیں مجھے پسند ہے' یہ سلور کلر کی ساڑی بھی پیک کر دیجیے' یہ شاکنگ پر کڑھائی والا سوٹ بھی ادھر رکھ دیں۔ ہاں یہ اورنج اور گرے کامبنیشن کا سوٹ بھی مجھے اچھا لگ رہا وائٹ اور پرپل والا بھی مجھے چاہیے۔" فریال اپنے روم سے باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ بیلا نے اپنی پسند کپڑوں کی ڈھیری لگا رکھی تھی۔

"کوئی تقریب ہے تمہارے ہاں؟" فریال نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"اب تو ہر روز ہی عید کا دن ہے۔" اس کا لہجہ و چہرہ سرشار سا تھا۔

"تمہارے میاں آزاد ہو گئے اس لڑکی کے چنگل سے۔" کچھ سوچتے ہوئے فریال نے پوچھا۔

"کیسے نہ ہوتے یوں بھی موری کا پانی موری میں ہی جاتا ہے۔"

"چلو تم تو اب خوش ہو ناں۔"

"نہیں ابھی میں رج کر خوش نہیں ہوئی ہوں' میری حقیقی خوشی ابھی دور ہے۔"

"کیوں بھئی۔" فریال نے حیرت سے پوچھا۔

"میری خوشیاں ابھی ادھوری ہیں۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں ادھوری ہیں؟"

"مجھے ابھی وہ مزہ نہیں آیا ہے' جو مجھے آنا چاہیے۔" فریال اب حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں فرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"میں اس لڑکی کا وہ حشر کروں گی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ارے چھوڑو بھئی تم کیوں جل جل کر اپنے آپ کو اذیت دے رہی ہو۔" اس کے منتخب کیے سوٹ دیکھتے فریال نے سرسری لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے نہیں جانتیں فریال۔" وہ ایک عجیب سی ہنسی ہنسی۔ "اس لڑکی سے مجھے اتنی نفرت ہے کہ اس کی مت ہی مجھے خوشی پہنچا سکتی ہے۔"

"ایسی نفرت؟" چند لمحوں کے لیے فریال بھی لرز کر رہ گئی۔

"ہاں ایسی ہی وہ جب پاتال کی گہرائیوں میں گرے گی تب ہی مجھے سکون آئے گا۔"

"تم تو اسٹار پلس کے ڈرامے بیان کر رہی ہو' حقیقی زندگی میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ لو چائے پی لو۔" ائے کی ٹرے لائی تو فریال نے ایک مگ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"فریال آپ نہیں جان سکتیں کہ وہ لڑکی کیا چیز ہے' اس کے اندر کیسی مقناطیسیت ہے' میں نے اس کے ال جو مہرہ کھڑا کیا تھا وہ بھی اس سے پٹ گیا مگر میں بھی بیلا ہوں کسی طور بھی شکست قبول نہیں کروں گی' اس لو میں جھکا نہیں سکی تو توڑ ضرور دوں گی اور کبھی کبھی توڑنے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اتنا جوڑنے میں بھی نہیں ا۔"

بیلا کیا کہہ رہی تھی اور کیا کرنا چاہتی تھی' فریال منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی کوئی بات بھی اس بھ میں نہیں آ رہی تھی مگر یہ احساس اسے ضرور ہو گیا تھا کہ بیلا کی نس نس میں کسی ناگن کی طرح زہر ا ہوا ہے۔

فریال اپنے روم میں آئی تو اس نے پہلا کام یہی کیا کہ ریسیپشن پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو فون کر کے کہا "آئندہ یہ ا میرے بوتیک میں نہ آئے اگر کبھی یہ آئے تو باہر سے ہی کہہ دینا کہ نیا اسٹاک نہیں آیا ہے اور پرانا مال بھی ختم ا ہے۔" پتا نہیں کیا بات تھی وہ جب جب بیلا سے ملی تھی وہ لڑکی اسے ناگن سی لگتی تھی' اس کا لہجہ اسے اریں مارتا ہوا محسوس ہوتا' اس کی منفی باتیں اور کرمنل عزائم سے اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا۔ فریال کا امد یقین تھا کہ ایسے لوگ جو اپنے دلوں میں نفرتوں کے الاؤ لیے پھرتے ہوں وہ ملنے کے تو کیا دیکھنے کے اقابل نہیں ہوتے۔

☆☆☆

پہلی غلطی تو اس کی یہ تھی کہ وہ رانگ وے سے آیا تھا۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ اس نے اس تیزی سے اپنی بائیک ل گاڑی پر دے ماری تھی جیسے اسے اپنی بائیک روکنے کا واحد یہی حل نظر آیا ہو۔ جس زوردار انداز سے اس یہ معرکہ سرانجام دیا تھا اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی گاڑی خوب اچھی طرح زخمی ہو گئی ہے۔ گاڑی سے اتر وہ باہر آیا تو وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میرا کتنا نقصان کیا ہے۔" اس نے خاصے درشت لہجے میں کہا۔

"جی سر۔" شجاع نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تب جمال اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

’’یہ تو نگین کا شوہر ہے۔‘‘ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا ’’شہر میں پہلی مرتبہ بائیک چلائی ہے آپ سے
نے مسکرا کر اسے دیکھا‘ لہجے میں نرمی از خود آ گئی تھی۔

’’آپ کو کیسے پتا چلا۔‘‘ اب وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’اس طرح جی داری سے اندھا دھند وہی لوگ بائیک چلاتے ہیں جنہیں بہت اچھی گاڑی چلانی آ
جنہیں بالکل بھی نہیں آتی۔‘‘

’’میرا شمار دوسری قسم کے لوگوں میں ہے۔‘‘

جمال نے موبائل کر کے اپنے مکینک کو بلایا اور اس کی بائیک حوالے کرتے ہوئے کہا ’’اس کی
کر دو اور شجاع کو لے کر قریبی کلینک میں گیا‘ ہاتھ اور پیر جہاں جہاں سے چھل گئے تھے اس پر دوا لگوا کر
انجیکشن لگوایا۔

’’آپ تو بہت اچھے ہیں‘ کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتا ہوں؟‘‘

’’احمد جمال......!‘‘

’’کیا میں آپ کو احمد کہہ کر بلا سکتا ہوں‘ گاؤں میں میرا دوست احمد ہے اور وہ مجھے بہت پیارا ہے۔‘‘

’’کیوں نہیں......‘‘ جمال بے اختیار مسکرا دیا۔

’’اس شہر میں اگر کوئی آپ جیسا دوست مل جائے تو اسے اور کیا چاہیے۔‘‘ شجاع کا دل نہ جانے کیوں
جانب کھنچ رہا تھا۔

’’آپ مجھے اپنا دوست ہی سمجھیے۔‘‘

’’میرا نام شجاع ہے۔‘‘

جمال کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم شجاع ہو اور تمہاری بیوی کا نام نگین ہے مگر وہ
بات اس انداز میں سن رہا تھا جیسے وہ اس کے نام سے نا آشنا ہو اور پھر شجاع گاہے بہ گاہے احمد سے ملنے لگا۔

احمد جمال اسی محبت اور احترام کے ساتھ اس سے ملتا جیسے وہ اس کا قریبی عزیز ہو اور یوں ہی کئی
گئے اور پھر ایک دن وہ یہ سن کر حیران رہ گیا جب شجاع نے احمد سے کہا ’’کل شام آپ ہمارے ساتھ کھانا
گے اور اپنی فیملی کو بھی لے کر آئیں‘ میری بیگم بہت لذیذ کھانے پکاتی ہیں۔‘‘

’’میرے گھر کے لوگ ان دنوں یہاں نہیں ہیں بعد میں دیکھا جائے گا!‘‘ نگین کے لذیذ کھانوں کا ذ
بھی اس نے کوئی کمنٹ پاس نہیں کیا۔

’’احمد جب گھر والے یہاں نہیں ہیں تو روزانہ کھانا پینا کیسے ہوتا ہوگا؟‘‘ شجاع نے پریشانی سے پوچھا

’’میرے گھر میں ملازم لڑکا کھانا بھی پکاتا ہے اور دیگر کام بھی کرتا ہے‘ بس یوں سمجھو کہ اللہ کی رحمت سے
ایک آل راؤنڈر قسم کا ملازم مل گیا ہے جو صفائی ستھرائی سے لے کر استری تک کا کام کر لیتا ہے اور کھانا
اچھا پکا لیتا ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میرے گھر نہیں آئیں گے؟‘‘ شجاع منہ پھلا کر بولا۔

’’ہماری روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی ہے‘ ملنے ملانے کے لیے ایک دوسرے کے گھروں میں جانا
ضروری ہے۔‘‘

’’مگر میں تو آپ کے پاس ہر دوسرے دن آ جاتا ہوں۔‘‘

’’دوستی میں حساب کتاب کہاں ہوتا ہے‘ کوئی بھی آ جائے بس ملاقات ہونی چاہیے۔‘‘ جمال نے اسے رسان سے سمجھایا۔

محبت میں مقناطیسیت ضرور ہوتی ہے‘ شجاع جمال کی چاہت میں ایسا کھنچا چلا آیا تھا کہ بعد میں اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی۔ مگر وہ احمد سے ملے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھا کرتا۔ جب تک وہ اسے اپنا حال دل نہ سنا لیتا اسے سکون نہ ملا کرتا۔ اس نے احمد کو اپنے بارے میں رائی سے رتی تک ہر بات بتلا دی تھی۔ اس نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے فرح کو نہ صرف پسند کرتا تھا بلکہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا مگر میری ماں اپنی پسند سے اپنی بھتیجی لائیں اور بعد میں اس کے ہی خلاف ہو گئیں جبکہ میری بیوی بہت اچھی ہے‘ گھریلو سیاستیں کرنی اسے بالکل نہیں آتیں‘ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں ماں کا خیال رکھوں‘ ان سے بلند آواز میں بات نہ کروں اور ان کی ہر بات چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو وہ مانوں۔

شجاع کی بات سن کر جمال ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور اس کی بات سن کر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

’’احمد بھائی جس گھر میں دیکھو میاں بیوی کی لڑائی نظر آتی ہے‘ بیویاں حتیٰ الامکان یہی کوشش کرتی نظر آتی ہیں کہ ان کا شوہر اپنی ماں اور بہن بھائیوں پر کوئی توجہ نہ دے‘ نہ وقت دے اور نہ پیسا مگر نگین ایسی نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ شہر میں تو زیادہ مکاریاں ہوتی ہیں اور یہاں کی لڑکیاں گاؤں کے مقابلے میں خاصی چنٹ ہوتی ہیں لڑنے جھگڑنے میں بھی وہ کوئی عار نہیں سمجھتیں مگر میری بیوی ایسی نہیں ہے‘ وہ ایسی کیوں ہے احمد بھائی؟‘‘ شجاع اس سے پوچھ رہا تھا۔

’’اچھی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں اس لیے وہ ایسی ہے اور اس کے لیے جگہ‘ مقام اور ماحول کی اہمیت نہیں ہوا کرتی ہے‘ اچھا ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے اور برا ہمیشہ برا ہوتا ہے چاہے وہ کہیں پر بھی پلا بڑھا ہو‘ اس میں ساری اہمیت فطرت کی ہوتی ہے۔‘‘

☆☆☆

ٹریننگ کالج کے ہوسٹل میں کراچی کی عبیر‘ فرح کی روم میٹ تھی۔ شروع میں تو فرح بے حد گھبرائی‘ بڑے شہر سے تعلق رکھنے والی عبیر نہ جانے کیسی ہو؟ گاؤں کی دیگر دو لڑکیاں جو سی ٹی کرنے اس کے ساتھ لاہور آئی تھیں‘ انہیں لاہور آ کر بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ انہوں نے سوچا کہ لاہور میں داخلہ لینے کے بجائے کیوں نہ ہم ملتان میں داخلہ لے لیں وہاں رشتے داروں کے گھر بھی ہیں۔ ہوسٹل میں رہنے کی دہشت بھی ختم ہو گی یوں بتول اور سلمیٰ لاہور سے چلی گئیں۔ فرح نے چونکہ اپنی ایڈمیشن فیس جمع کروا دی تھی اس لیے اس نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

عبیر اچھی لڑکی تھی۔ دونوں کالج ساتھ جاتیں اور ایک ساتھ ہی پڑھا کرتیں‘ عبیر پڑھائی میں زیادہ اچھی تھی وہ فرح کی خاصی مدد کیا کرتی۔

’’کراچی میں تو کئی ٹریننگ کالج ہوں گے تو تم وہاں سے لاہور کیوں چلی آئیں۔‘‘ ایک دن فرح نے عبیر سے پوچھا۔

’’جب وہاں ایڈمیشن بند ہو گئے تب مجھے سی ٹی کرنے کا خیال آیا۔ میں نے سوچا ایک سال وہاں کے ایڈمیشن کھلنے کا انتظار کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اس اثنا میں‘ میں اپنی سی ٹی مکمل بھی کر آؤں۔‘‘

’’مجھے تو لگتا ہے کہ میری تم سے ملاقات ہونی تھی اس لیے تم لاہور چلی آئیں۔‘‘ فرح نے ہنس کر کہا۔

’’ہو سکتا ہے یہی بات ہو ورنہ سی ٹی کرنے کا میرا ارادہ ہی نہیں تھا۔‘‘ عبیر کی سادگی اور محبت بھرے سلوک

نے بہت جلد فرح کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ اب وہ دونوں شام کے وقت ہوسٹل کے لان میں خوب باتیں کرتیں۔ عبیر کی دلچسپ باتوں نے فرح کا ڈپریشن ختم کرنے میں بہت مدد کی تھی۔ انہیں کالج میں آئے ابھی چار ماہ ہوئے تھے، کالج میں فینسی ڈریس شو ہوا۔ عبیر کے کہنے پر اس نے بھی اس میں حصہ لیا۔ کالج کے پروفیسر نے فرح کو وادی کیلاش کی دلہن کا کردار دیا تھا، اپنے سر پر ستاروں والی ٹوپی لگائے، بالوں کی چھوٹی چھوٹی میڈھیاں بنائے، سرخ اور کالے گھیردار چمکتے ہوئے لباس میں وہ واقعی کوئی حور لگ رہی تھی۔ کالج کی پرنسپل نے جب فرح کو پہلا انعام دیا تو عبیر نے اس سے ہنس کر کہا۔

"ہوتا اگر کوئی مرد پرنسپل تو ایوارڈ کے ساتھ اپنی شادی کا پیغام بھی دے دیتا۔"

"وہ...... کیوں بھلا!" فرح نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارے کالج میں نہ تم سے زیادہ کوئی خوبصورت ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔"

"نہ مجھ سے زیادہ کوئی بدقسمت ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔" فرح نے اس کے جواب میں کہا اور دو آنسو اس کے رخساروں پر ہیرے کی طرح پھسل گئے۔

"ایسی بات تم نے کیوں کی؟"

تب فرح نے اشرف کے ساتھ اپنی شادی کا احوال سنایا اور یہاں تک بتایا کہ اس کی ٹانگ کٹ جانے پر اس کے سائیکی انداز نے اس کو طلاق دے دی۔"

"اف، اتنی سی عمر میں تم نے اتنی زیادہ تکالیف اٹھائی ہیں۔"

"ہاں عبیر اب تو دل یہی چاہتا ہے کہ کبھی گاؤں واپس نہ جاؤں۔ اشرف کے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ہر وقت کی پریشانی ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی شکل صبح و شام دیکھنی پڑتی ہے۔ اس کی چڑھی ہوئی تیوری، اس کی شرارے برساتی آنکھیں، اس کی طنزیہ مسکراہٹ اور سب سے بڑھ کر اس کے بے ہودہ فقرے ہمہ وقت میرے اعصاب پر کسی ہنٹر کی طرح برسا کرتے ہیں۔"

"تمہاری والدہ کو تمہاری دوسری شادی جلد کر دینی چاہیے تا کہ تم یہ سب دکھ بھول جاؤ۔" عبیر اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے اب کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا ہے میں دوسری شادی کبھی نہیں کروں گی۔"

"پیاری فرح ہر مرد اشرف جیسا نہیں ہوتا۔"

"مگر زیادہ تر سسرالیے اشرف کے گھر والوں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ اشرف کی ماں، اس کی بہنوں نے میری زندگی ضیق کر کے رکھ دی تھی، کون سا ایسا چرکہ تھا جو ان لوگوں نے میرے دل پر نہ لگایا ہو۔ کام کرتے کرتے میں نڈھال ہو جایا کرتی تھی مگر کسی کو مجھ پر رحم نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں کسی بیگار کیمپ میں رہتی ہوں جہاں روکھی سوکھی کے طفیل مجھ سے کام لیا جاتا ہے۔ اشرف شاید میرے ساتھ اتنا برا نہ رہتا اگر اس کے گھر والے میرے ساتھ نہ رہتے۔ ان خواتین کو میری کوئی بھی خوشی عزیز نہ تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسے لوگ اپنے بیٹوں یا اپنے بھائیوں کی شادیاں کیوں کرتے ہیں؟ عبیر میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میں اپنی سسرال میں ہمہ وقت اتنی حراساں سی رہتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش تک ہو جاتی تھی۔ میرے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی کوئی نہیں تھا، کمزوری جب رفع ہوتی تھی تو ہوش بھی خود آ جایا کرتا تھا۔ میرے اس طرح اچانک گر جانے کو ساس، نندیں ڈرامے بازیاں کہا کرتی تھیں۔ اب تم ہی بتاؤ جب میں نے ایسے ایسے چرکے کھائے ہوں تو شادی کے نام سے وحشت نہیں ہو گی کیا؟"

"میرا یہی ارادہ ہے کہ اپنی باقی ماندہ زندگی گاؤں کے اسکول میں پڑھا کر بسر ہو، ہاتھ میں میرے پیسہ آئے گا تو کسی کی محتاج بھی نہیں رہوں گی، مہنگائی کے اس زمانے میں آج کل سگا بھائی بھی ساری عمر روٹی کپڑا نہیں دے سکتا۔"

"میں تمہارے گاؤں آؤں گی اور تمہاری امی کو سمجھاؤں گی کہ اب کے فرح کی شادی دیکھ بھال کر کیجیے گا، کم از کم یہ تو ضرور دیکھیے گا کہ سسرال بہت بڑی نہ ہو، چھوٹی فیملی کے اتنے مسائل نہیں ہوا کرتے جتنے کہ بڑی فیملی کے ہوتے ہیں۔"

"ہمارے گاؤں میں جوائنٹ فیملی میں رہنے کا رواج ہے، کوئی بھی لڑکا اپنی بیوی کو الگ گھر لے کر نہیں رہ سکتا کہ وہاں اس طرح رہنا کبھی پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔"

"فرح میں تم سے یہ بات کہنا تو نہیں چاہتی لیکن کہہ رہی ہوں، ہم صرف دو بہن بھائی ہیں، ہم چھوٹے سے ہی تھے جب والدین اللہ کو پیارے ہو گئے، میرا نکاح ہو چکا ہے، منگیتر سعودی عرب میں ہے ایک سال بعد میری رخصتی ہو گی تو میں سعودی عرب چلی جاؤں گی۔ میرا منگیتر جدہ میں مکینک کا کام کرتا ہے۔ اس تمہید کو بیان کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہماری چھوٹی سی فیملی ہے۔ میری بھابی کا انتقال ہو گیا ہے، میرا بڑا بھائی اقبال گھر میں اکیلا ہوتا ہے۔ وہ ایک بوائز کالج کے آفس میں اکاؤنٹنٹ ہے، بھابی کے انتقال کو کئی سال ہو گئے ہیں مگر بھائی نے شادی نہیں کی ہے اگر تم برا نہ مانو تو میں اپنے اقبال بھائی کا رشتہ لے کر تمہارے گھر آؤں؟"

"نہیں عبیر شادی کے لیے میرا دل نہیں مانتا ہے، تم اپنے بھائی کی کراچی میں ہی کوئی لڑکی دیکھ کر شادی کر دینا۔ میں پنجاب سے کہاں کراچی جاؤں گی، یوں بھی بڑے شہروں سے اور بڑے لوگوں سے مجھے ڈر ہی لگتا ہے۔"

"فرح میری بات توجہ سے سنو، تمہیں تو اشرف اور اس کے گھر سے دور ہی رہنا چاہیے اس لیے تمہارے لیے کراچی سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔"

"عبیر میرے ذہن میں مستقبل کا کوئی پروگرام نہیں ہے اس لیے میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ کون سا شہر میرے لیے اچھا رہے گا یا برا۔"

"پڑوس میں رہنے والے اشرف سے ڈرتی بھی ہو اور اس سے دور رہنے کی کوشش بھی نہیں کرو گی۔"

"لاہور میں آ کر پڑھنا ایک کوشش ہی تو ہے۔"

"یہاں چار مہینے گزر گئے ہیں بقیہ آٹھ ماہ بھی گزر جائیں گے پھر کیا کرو گی؟"

"ہاتھ میں ٹریننگ ہو گی تو کسی بھی اسکول میں جاب کر لوں گی اور میرا وقت آسانی سے گزر جائے گا۔"

"مگر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمہارا روزانہ کا آنا جانا اسی کے سامنے ہو گا، اسی کی شکل دیکھ کر نکلو گی اور اسی کی شکل دیکھ کر گھر میں داخل ہو گی۔"

"میری قسمت میں بہت سی پریشانیاں میرے وجود کے ساتھ بندھی ہیں، گاؤں میں مکان کا بیچنا اور خریدنا اتنا آسان نہیں ہوا کرتا ہے جتنا کہ شہروں میں ہوتا ہے۔"

"تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ تم کراچی اپنے مستقل قیام کے بارے میں سوچو۔" عبیر نے ہنس کر کہا۔

"کسی کے سوچنے سے کچھ نہیں ہوا کرتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کے رہتا ہے۔" فرح نے کہا تو عبیر

بھی خاموش ہوگئی اور بات آئی گئی ہوگئی مگر عمیر کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کے بھائی کی شادی فرح سے ہونی چاہیے۔

کالج میں موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو عمیر کراچی جاتے وقت اپنے ساتھ فرح کی تصویریں بھی لے گئی۔

☆☆☆

فرح جب گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گھر پہنچی تو اس کی اچھی صحت اور سرخ وسفید شاداب سا چہرہ دیکھ کر ماں' بہنیں بہت خوش ہوئیں۔

"لاہور کی آب وہوا نے تیری صحت پر کتنا اچھا اثر ڈالا ہے۔" بڑی باجی اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"یہاں سے نکل کر میں کہیں بھی چلی جاتی میری صحت نے اچھا ہی ہونا تھا۔" وہ جب سے آئی تھی اشرف دروازے پر کھڑا ہوکر خواہ مخواہ گالیاں بک رہا تھا۔ اس کی بہنوں نے اس کی شکل دیکھ کر یہاں تک کہنا شروع کردیا تھا کہ نہ صرف فرح کی شادی ہوچکی ہے بلکہ ان دنوں وہ حاملہ بھی ہے۔ گاؤں کی عورتیں اشرف کی بہنوں کی باتیں جب اس کے گھر آکر بتا رہی تھیں تو فرح کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

اس شام وہ کسی کام سے باہر نکلی' اشرف دروازے پر مونڈھا ڈالے بیٹھا تھا' اس کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور سامنے نفرت سے تھوکتے ہوئے بلند آواز میں بے غیرت کہا۔

تب فرح غصے سے بے حال اس کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی اور قدرے بلند آواز میں بولی۔

"بے غیرت تو تم ہو اشرف جو غیر عورت کو دیکھتے ہوئے آوازیں کستے ہو اب اگر مجھے دیکھا تو تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی' تمہیں اگر شرم نہیں آتی تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ مجھ پر آتے جاتے اپنے فحش جملے اچھالو' اب اگر تم نے مجھے دیکھ کر ایک لفظ بھی کہا تو ڈنڈا لے کر تمہارا سر بھی توڑ دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے چلتی چلی گئی۔

اشرف نے ہمیشہ فرح کو سہمی ہوئی ڈری ہوئی دیکھا تھا' غصے سے آنکھیں نکالے درشت لہجے میں بولتی ہوئی وہ اسے دوسری لڑکی لگی۔ اس قدر بارعب شخصیت ایسا جاہ وجلال! یکدم وہ ڈر سا گیا اسے یوں لگا فرح صرف کہہ ہی نہیں رہی بلکہ کر بھی سکتی ہے۔ اشرف جو اپنے سامنے کسی کو کچھ بولنے نہیں دیتا تھا یکدم خاموش سا ہوگیا۔ بعض لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انہیں ان کی اوقات یاد دلائی جائے' فرح نے پہلی مرتبہ اسے آئینہ دکھایا تو وہ واقعی سہم گیا۔

شام کو جب فرح لوٹی تو اشرف بدستور اپنے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس نے اپنے ہاتھ کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی جیسے اسے یہ باور کرانا چاہتا ہو کہ وہ بے حد دیر سے لوٹی ہے۔ فرح سوچ رہی تھی کہ اب وہ برے منہ بنا کر کچھ اول فول بکے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا' اسے دیکھنے کے بعد اس نے اپنی نظریں اپنے گود میں پھیلے اخبار پر جمادیں اور یوں منہمک سا ہوگیا جیسے کوئی اہم اور گرما گرم خبر پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہو۔

☆☆☆

"ایسی ہوتی ہیں لڑکیاں اور اسے کہتے ہیں خوبصورت۔" عمیر نے فرح کی پانچ چھ تصویریں جو فینسی ڈریس شو میں کھینچی گئی تھیں اقبال کے سامنے پھیلا دیں۔

"ایسا حسن بھی دنیا میں موجود ہے۔" وہ ٹکٹکی باندھے اس کی تصویریں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور ہے کیسی وہ......؟" اقبال نے پوچھا۔

"تمہاری کلو رضیہ کی طرح نہیں ہے جس میں اللہ معاف کرے ہر خامی موجود تھی۔" عمیر نے تمسخر سے کہا۔

"وہ بدشکل تھی مگر میں نے کبھی بدصورتی کا طعنہ نہیں دیا۔ وہ پھوہڑ تھی مگر میں کبھی اس سے نہیں جھگڑتا تھا مگر وہ اوڑتھی' بدمعاش تھی یہ برداشت کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔"

"اقبال بھائی' آپ نے رضیہ بھابی کو طلاق دے کر کوئی غلطی نہیں کی' وہ اس قابل تھیں ہی نہیں کہ انہیں گھر میں بسایا جاتا۔"

"بدتمیز عورت سے نباہ کیا جاسکتا ہے مگر بدسیرت عورت سے نہیں۔" اقبال نے کہا۔

"آپ مطمئن رہیں۔ فرح ایسی نہیں ہے اس کے ساتھ تو ایسا تجربہ ہوچکا ہے کہ اسے شادی کے نام سے ہی نفرت ہوچکی ہے۔"

"حیرت ہے کہ اشرف جیسے اپاہج شخص نے اتنی خوبصورت لڑکی کو طلاق دے دی۔"

"اشرف ایک نفسیاتی مریض ہے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا اور جب ایک بدصورت شخص کی شادی کسی خوبصورت لڑکی سے ہوتی ہے تو اس کا احساس کمتری' احساس برتری کی صورت میں ابھر آتا ہے' ایسا ہی سب کچھ اشرف کے ساتھ ہوا' اس نے احساس کمتری کے کسی غلبے میں فرح کو طلاق دے دی۔"

"اس نے شاید طلاق ہی اس وجہ سے دی ہوگی تاکہ میری فرح کے ساتھ شادی ہوجائے۔" اقبال نے ہنس کر کہا۔

عمیر بھی بھائی کو خوش دیکھ کر خوش ہوگئی۔ تب اقبال نے سرشار لہجے میں کہا "مجھے سیدھی سادی بیوی اچھی لگتی ہے' رضیہ چالاک بھی تھی اور مکار بھی جب ہی تو ہماری نبھ نہ سکی مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ فرح ہم سب کی تمناؤں کے مطابق ہوگی۔"

"مگر ایک بات ہے بھائی؟" عمیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا......؟" اقبال نے حیرت سے اپنی بہن کو دیکھا۔

"میں نے فرح سے یہی کہا ہے کہ ہماری بھابی کا انتقال ہوگیا ہے۔"

"تم نے غلط کیا کہا ہے ہمارے لیے تو وہ مر ہی چکی ہے۔"

"مگر اس کو تو طلاق دی گئی ہے۔"

"پاگل ہو عمیر تم بھی' غیر لوگوں میں شادی کرنے کا کم از کم یہ فائدہ تمہیں نظر نہیں آرہا کہ ہم جو کچھ بھی کہیں گے ہماری بات کی کوئی تردید کرنے والا نہیں ہوگا۔"

"لیکن اگر اسے کہیں سے یہ پتا چل گیا کہ آپ کی سابقہ بیگم نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہٹی کٹی موجود ہے اور آپ کی سات آٹھ سال کی ایک بیٹی بھی ہے تو پھر کیا کہیں گے آپ؟"

"پھر کیا پھر ہوتی ہے کچھ نہیں ہوگا ایسا......" اقبال ہنستا ہوا بولا۔

"بات یہ ہے اقبال بھائی' وہ لڑکی بہت سیدھی سادی سی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ہمیں غلط سمجھے' یوں بھی وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ جب سے ہوسٹل میں ہوں ایک دن بھی نہ اپنے کپڑے دھوئے اور نہ انہیں پریس کیا' بغیر کہے بغیر پوچھے میرا وہ ہر کام اس طرح کرتی ہے جیسے میرا کام کرنا اس کی اپنی ذمے داری ہو۔"

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے' رضیہ کے برعکس ہے وہ شاید۔"

''شاید نہیں یقیناً' اس کی باتیں سن کر اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

''پھر دیر کس بات کی ہے' تم میری اس کے ساتھ جھٹ پٹ شادی کروادو۔''

''وہ نہیں کرے گی شادی...... ہمیشہ یہی کہتی ہے وہ۔''

''پاگل ہے کیا وہ؟ لڑکیاں تو دوسری شادی کے لیے بے قرار ہو جاتی ہیں' اب جیسے رضیہ نے بھی تو کھٹ دوسری شادی کر لی۔''

''ہاں' بھائی وہ شاید پاگل ہی ہے' وہ آپ تو کیا کسی سے بھی شادی کرنے کی خواہش مند نہیں ہے۔''

''کہیں پیار کی روگی تو نہیں ہے' ایسی باتیں تو وہی لوگ کرتے ہیں۔''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی' وہ ایسی لڑکی ہرگز نہیں ہے' پڑوس سے رشتہ آیا حالانکہ وہ لڑکا اسے پسند بھی تھا مگر گھر والوں کے سامنے خاموش رہی اور چپ چاپ شادی کر لی مگر اس کی سسرال والوں نے اسے بہت رکھا اور ٹانگ کٹ جانے کے بعد شوہر بھی آدھا پاگل ہو گیا۔''

''تو پھر یہ بیل کیسے چڑھے گی؟'' اقبال بھی سوچ میں پڑ گیا۔

''سوچ رہی ہوں کہ ایک بار گاؤں چلی جاؤں' وہاں اس کے گھر والوں سے بات تو کر کے دیکھوں۔''

''سوچ کیا رہی ہو' چلی جاؤ۔''

''اب لاہور جاؤں گی تو اس کے کان میں یہ بات ڈال آؤں گی کہ مجھے بہت جلد اس کے گھر بھی آنا ہے۔''

''اس بیچ اسے کوئی دوسرا لے اڑا تو ناچتی رہ جانا۔''

''کوئی نہیں آئے گا بیچ میں۔'' بھائی کی جلد بازی پر عبیر کو ہنسی ہی تو آگئی۔

''اب کوئی تم سے پوچھنے تو نہیں آئے گا...... بی بی اجازت ہو تو فرح کے گھر چلا جاؤں۔''

''میں فرح کو اچھی طرح جانتی ہوں۔'' عبیر نے توقف سے کہا۔

''آج کل کوئی کسی کو نہیں جان سکتا' فرح تمہارے بارے میں بھی یہی کہتی ہو گی کہ بہت اچھی طرح جانتی ہے مگر وہ تمہارے اور میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو گی' جو تم نے اسے بتا دیا اسے ہی سچ سمجھ رہی ہو گی۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو بھائی۔'' عبیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اب اس معاملے کو جلدی نمٹاؤ' جو بھی کرنا ہے جلد فیصلہ کرو۔ اب رضیہ کو دیکھو عدت ختم ہونے کے دوسرے دن ہی اس نے شادی رچا لی اور میں عورتوں کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔''

''آپ فکر نہ کریں جیسے ہی کالج جاؤں گی فرح کو شیشے میں اتارنے کی پوری کوشش کروں گی۔'' عبیر نے آس بندھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شجاع کو شاپ گئے ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ نگین باورچی خانے میں سالن بگھار رہی تھی۔ ارحم اسکول جا چکا تھا' قریبی نرسری کے پلے گروپ میں اس کا ایڈمیشن کروا دیا گیا تھا۔ گڑیا کارپٹ پر بیٹھی اپنے کھلونوں میں مگن تھی' کشور تائی بھی اس کے قریب بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔ شجاع کو مٹر پسند تھے' نگین سالن کے ساتھ آلو مٹر ٹماٹر کی مشترکہ سبزی بھی بنانا چاہتی تھی۔

''نگین یہ مٹر تو چھل گئے اب آلو دے دو تاکہ وہ بھی کاٹ دوں۔'' اس سے قبل کہ نگین تائی کو آلو پکڑاتی شجاع تیزی سے اندر داخل ہوا اور اپنے بیگ میں اپنے کپڑے نکال کر ڈالنے لگا۔

''خیریت تو ہے کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''گاؤں جا رہا ہوں' اماں کے پاس۔''

''آپ کہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟''

ایک توقف کے لیے شجاع نے کچھ سوچا اور بیگ کی زپ تیزی سے بند کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ کب تک آئیں گے؟''

''پتا نہیں......''

''پھپو کی طبیعت کیسی ہے؟''

''پتا نہیں......''

''تو آپ ایسے ہی جا رہے ہیں؟''

''ہوں......'' اس نے بیگ اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''شجاع...... یوں گھبرایا گھبرایا سا کیوں گاؤں گیا ہے؟'' تائی نے پوچھا۔

''یہ ایسے ہی بھاگتے دوڑتے فیصلے کرتے ہیں' گاؤں جانے کا خیال آیا تو شاپ چھوڑ کر چلے آئے اگر پہلے سے ان کا پروگرام ہوتا تو ابا جی کو بتانا چاہیے تھا تاکہ وہ آ کے شاپ پر بیٹھ جاتے۔''

''یہ شجاع جلد باز قسم کا لڑکا نہیں ہے۔'' کشور تائی نے آلو کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ شروع سے ہی ایسے ہیں۔''

''تم سمجھایا کرو اپنے میاں کو' ہر معاملے میں ایسی جلد بازی ٹھیک نہیں ہوا کرتی ہے۔'' تائی دھیمے لہجے میں نگین سے کہہ رہی تھیں اور نگین دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ کیا ایسے شخص کو میں کچھ بھی سمجھا سکتی ہوں جو اپنی نظر سے دیکھتا ہے' اپنے کانوں سے سنتا ہے اور پھر اپنی زبان سے فیصلہ کرتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں مشورہ لینا اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا' وہ کب سے کہہ رہی تھی کہ اسے پھپو کے پاس جانا چاہیے یا ان کو لے کر کراچی آ جانا چاہیے مگر وہ اس کی بات اس طرح خاموشی سے بیٹھا سن رہا تھا جیسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہا ہو اور جب اس کا اپنا دل چاہا تو آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔

شام کو امی کا فون آیا تو انہوں نے بتایا' ''گاؤں سے طیفے کا بھائی آیا تھا' اس نے بتایا تھا آپا عظمت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے شجاع فوراً ہی گاؤں چلا گیا۔''

''طیفے کے بھائی نے کیا ابا جی کو بھی آ کر بتایا تھا؟''

''ہاں بتایا تھا' انہوں نے فوراً فون کیا مگر آپا کہہ رہی تھیں کہ اب وہ ٹھیک ہیں' سردی کی شدت کی وجہ سے معمولی نزلہ بخار ہوا تھا مگر اب وہ بھی اتر گیا ہے۔''

''کیا یہ شجاع کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی؟''

''ہاں تمہارے ابا نے شجاع کو بتا دیا تھا کہ اب عظمت آپا کی طبیعت بہتر ہے مگر وہ تو اسی وقت جانے کو تیار ہو گیا تھا۔''

''اچھا ہے اسی بہانے اپنی ماں سے مل آئیں گے۔''

''میں تو کہتی ہوں یہ سب ڈھکوسلا بازی ہے عظمت بیگم کی۔'' فیروزہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

’’کیوں......؟ وہ ایسا کیوں کریں گی۔‘‘

’’تاکہ بیٹا دوڑ کر ان کے پاس آئے اور وہ اپنی اس چالاکی میں کامیاب بھی ہو گئیں۔‘‘

’’امی میں آپ کی بات کا مطلب واقعی نہیں سمجھ سکی ہوں۔‘‘

’’جیسا تمہاری ساس نے چاہا ویسا ہی ہو گیا لطیفے کے بھائی کے ہاتھ بیماری کا بہانہ رچایا اور شجاع دوڑتا گاؤں چلا گیا۔‘‘ اب فیروزہ تمسخر سے ہنس رہی تھیں۔

’’وہ تو انہیں خود ہی جانا چاہیے تھا' ماؤں سے کوئی لڑا تھوڑی کرتے ہیں۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے بیٹا' ماں بیٹے کی لڑائی تو دودھ کی سی ملائی ہوا کرتی ہے' نہ ماں اپنے بیٹے سے لڑ کر علیحدہ سکتی ہے اور نہ ہی بیٹا اسے کچھ کہہ کر دور بیٹھ سکتا ہے' اصل آگ تو عظمت بیگم کو یہ لگی ہو گی کہ شجاع ہماری شاپ نہ صرف بیٹھ رہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہمارا لاکھوں کا فائدہ بھی ہو گیا۔‘‘ فیروزہ دور کی کوڑی لائی تھیں۔

’’نہیں امی آپ کا خیال غلط ہے' ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے۔‘‘

’’نہ کر میری بات کا یقین جب شجاع آئے گا تو تجھے خود پتا چل جائے گا۔‘‘

’’امی اگر ایسی بات ہوتی تو پھپھو کبھی فون پر ابا جی کو یہ نہیں کہتیں کہ اب ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے' موسم نزلہ بخار تھا وہ ٹھیک ہو گیا۔‘‘

’’ارے تم کیا جانو ان مکار عورتوں کی بازیوں کو' ایسے ایسے گر بتا رکھے ہیں اپنی بیٹی فرحت کو کہ اس نے ا میاں اپنی مٹھی میں رکھا ہوا ہے' فرحت کے اشارے پر چلتا ہے وہ۔‘‘

’’کوئی کچھ بھی کرے ہمیں اس سے کیا۔‘‘ نگین نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور ماں کو خدا حافظ کر کے ٹیلی فون ریسیور پر رکھ دیا۔

کشور تائی جو گڑیا کو کاٹ میں لٹا کر تھپک تھپک کر سلا رہی تھیں' وہ نگین کی بات سن کر بولیں۔ ’’برا مت مانو تمہاری امی کی باتیں ایسی نہیں ہیں جن پر کوئی بیاہی بیٹی عمل کرے۔‘‘

’’ہاں تائی جو ان کے دل میں آتا ہے وہ وہی کہہ دیتی ہیں۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے' انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ بیاہی بیٹیوں کے معاملات میں ماؤں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔‘‘ نگین کھسیا کر بولی۔

’’تم بہت اچھی ہو نگین' ہمیشہ ہر بات کا مثبت پہلو دیکھتی ہو' ایسی لڑکیاں ہمیشہ خوش و خرم رہتی ہیں۔‘‘

’’تائی کیا ذہین اور عقل مند بیویاں ہمیشہ خوش رہا کرتی ہیں؟‘‘

’’ہاں زیادہ تر تو رہتی ہیں۔‘‘ تائی نے ہنس کر کہا اور ارحم کو کھانا کھلانے بیٹھ گئیں جو تائی سے اس قدر ہل گیا تھا کہ اسکول سے آ کر ان کے ہاتھ سے کھانا کھایا کرتا تھا اور کشور تائی بھی روزانہ کالے اور سفید بکرے کی کہانیاں سناتے ہوئے اس کے منہ میں نوالے دیا کرتی تھیں مگر نگین کا دل پھپھو میں لگا ہوا تھا اور ان کی طبیعت کی طرف سے وہ بے چین تھی۔

’’شجاع پہنچ جائیں گے تو پھر ٹیلی فون کروں گی تاکہ میری آواز سن کر وہ کاٹنے نہ پائیں۔‘‘ نگین نے دل ہی دل میں سوچا اور وہ مطمئن سی ہو گئی۔

☆☆☆

پورٹ سے گاؤں وہ ٹیکسی میں آیا تھا۔ اپنا گھر دیکھتے ہی وہ بھاگتے ہوئے آیا۔ شام کا وقت تھا دروازہ ا تھا' وہ تیزی سے آنگن پھلانگتا ہوا اماں کے کمرے میں پہنچا۔

’’اماں......!‘‘ وارفتگی سے پکار کر بیٹھی ہوئی عظمت بیگم کو اپنی بانہوں کے ہالے میں لے لیا اور مارے خوشی کھوں سے پرنالہ بہنے لگا' کتنے بہت سارے دن بعد وہ ماں کے پاس آیا تھا۔ ان کو دیکھ کر دل میں خوشیوں راغ سے جل اٹھے تھے۔

’’میرا بچہ۔‘‘ اسی گرمجوشی سے انہوں نے بھی اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور ان کے آنسو اس کی چھاتی کو تر لگے تھے۔

’’یں بہت برا ہوں ناں اماں' تجھے یوں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔‘‘ وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

’’نہیں بیٹے تو برا نہیں ہے تو تو میرے پاس آ گیا ہے۔‘‘

’’اماں تم مجھے برا کیوں نہیں کہتی ہو۔‘‘ وہ ان کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔

’’پتر تو برا ہے ہی نہیں تو کیسے کہہ دوں۔‘‘ اب وہ اس کے بالوں میں اپنے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

’’تمہارے بغیر اماں کچھ اچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’اپنے بیٹے کے بغیر ماں کو بھی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی' یقین کر شجاع میں کھانا کھاتی تھی تو نوالہ حلق میں اٹکتا ’’عظمت بیگم اس کا ہاتھ پکڑے کہہ رہی تھیں۔

’’میرا بھی یہی حال تھا کچھ ہی کھا لوں مگر سواد نہیں آتا تھا' کتنا ہی گھوم پھر لوں مگر سکون نہیں ملتا تھا' حد تو یہ ہے الہ مجھے اپنے بچے تک اچھے نہیں لگتے تھے۔‘‘

بچوں کے ذکر پر عظمت بیگم کی آنکھیں پھر بھر آئیں اور پوچھنے لگیں۔

’’میرے بچے کیسے ہیں؟ کاکا اور گڑیا تو مجھے بہت یاد آتے ہیں۔‘‘

’’بچوں نے کہا ہے میری دادی کو گھر لے کر آؤ۔‘‘ شجاع نے مسکرا کر کہا۔

’’نہیں پتر میں کہاں جا سکتی ہوں۔‘‘ وہ گہری سانس لے کر بولیں۔

’’اماں میں تو تمہیں لینے ہی آیا ہوں اگر تم نہیں جاؤ گی تو میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔‘‘

’’جھلا کہیں کا' بیوی بچوں کے بغیر تو یہاں کیسے رہ سکتا ہے۔‘‘

’’جب میں رہ کر دکھاؤں گا ناں تب آپ کو یقین آئے گا۔‘‘

’’ہاں' ہاں جانتی ہوں میں تجھ کو اور تیری باتوں کو بھی کتنا پکا ہے۔‘‘ عظمت بیگم کو ہنسی ہی تو آ گئی۔

’’یاد ہے تجھے بچپن میں ڈاکٹر نے قلفی کھانے کو منع کیا تھا کہ گلا مزید خراب ہو جائے گا' ڈاکٹر سے تو نے وعدہ تھا اور اس وعدے کے باوجود روزانہ قلفیاں کھاتا رہا تھا اور ڈاکٹر بیچارہ دوائیں بدل بدل کر تھک گیا تھا۔ پھر لیلنے کا شوق...... کتنے کتنے وعدے کرنے کے باوجود تو پتے کھیلتا رہتا تھا۔ پتنگ نہ اڑانے کے لیے بھی کتنے عدے کیے تھے مگر کبھی کوئی وعدہ ایفا نہیں کیا تھا تو نے۔‘‘

’’اماں یہ آپ کے ساتھ وعدہ ہے۔ چیزوں کے ساتھ وعدہ نہیں ہے' آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہے تو ہے ورنہ میں یہیں آپ کے ساتھ رہوں گا۔‘‘

’’نگین کیا اپنے بچوں کے ساتھ وہاں اکیلی رہے گی؟‘‘

’’وہ اپنی اماں کے پاس چلی جائے' میں اپنی اماں کے پاس۔‘‘

''اچھا چل پہلے روٹی کھالے تقریریں بعد میں کرنا۔'' اماں کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ بھوکا ہوگا۔

''ہاں اماں جلدی سے لے آؤ بہت بھوک لگی ہے۔''

''لاتی ہوں روٹی میں' آج تیری پسند کا کھانا بنا ہے' کریلے گوشت۔'' تب شجاع دونوں ہتھیلیاں رگ
اماں کے پلنگ پر آ بیٹھا۔ شجاع ابھی کھانا کھا کر چائے ہی پی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر نگین کی کال آ گئی۔

''پہنچ گئے آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں پہنچ گیا ہوں۔''

''پھپو کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''آپ کب واپس آئیں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کب واپس آؤں' یہ سب اماں پر منحصر ہے وہ کہیں گی چلو تو میں آجاؤں گا اور اگر
گی نہیں تو میں یہاں رہتا رہوں گا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' وہ پریشان ہو کر بولی۔

''تم چاہو تو اپنے گھر چلی جاؤ۔'' شجاع نے اس کا جواب سنے بغیر نہ صرف لائن ڈسکنیکٹ کر دی ا
موبائل بھی آف کر کے رکھ دیا۔

وہ...... جو یہ سوچ رہی تھی کہ شجاع سے بات کرنے کے بعد پھپو کی بھی خیر و عافیت پوچھے گی وہ شجاع کے
انداز پر تپ سی گئی۔

''کشور تائی جو نماز پڑھ کر اس کے سامنے بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولیں۔

''نگین بیٹا پریشان نہ ہو اتنے عرصے بعد بیٹا اپنی ماں کے پاس گیا ہے اس وقت وہ اپنے آپ کو بھ
ہوگا۔''

''مگر وہ تو کہہ رہے ہیں کہ دل بھر کے گاؤں میں رہیں گے۔''

''اس کی باتوں سے اس کی ماں خوش ہو رہی ہوگی تو ہونے دو' تم اپنا دل کاہے کو چھوٹا کرتی ہو۔''

''شاید یہی بات ہوگی کیونکہ مجھے پھپو کے ہنسنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔''

''تم اگر چاہو تو اپنے گھر چلی جاؤ' شجاع آ جائے تو واپس آ جانا۔''

''نہیں تائی میں آپ کو بھلا اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔''

''پاگل کہیں کی' میں تو عرصے سے تنہا رہنے کی عادی ہوں' میرے لیے تم اپنے آپ پر پابندیاں عائد
کرو۔''

''تائی آپ کے ساتھ رہ کر مجھے بالکل بھی تنہائی کا احساس نہیں ہو رہا ہے' ارحم یوں بھی اسکول جانے ل
'امی کے گھر تو میں اب ہفتہ' اتوار کو ہی جایا کروں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' تائی بچوں کو پیار کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں اور نگین اپنے بستر پر لیٹ
شجاع کے بارے میں سوچنے لگی۔ ہر ہر معاملے میں اس کی انتہا پسندی اسے پریشان سا کر کے رکھ دیتی تھی۔
کے مزاج اور عادتوں میں ذرا بھی میانہ روی نہ تھی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ وہ گاؤں جانے کے لیے ہی تیار نہ
نگین اسے کتنا ہی سمجھاتی مگر اس پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور اب وہ وہاں پہنچنے کے بعد اس سے ہم

تھا کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کب واپس آؤں اور پھر بچوں کی خیریت پوچھے بغیر...... ارحم سے بات کیے بغیر...... اس
لو خدا حافظ کیے بغیر...... یہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی کہ تم چاہو تو اپنے گھر چلی جاؤ۔ جتنا وہ سوچ رہی تھی اتنا ہی وہ
الجھ رہی تھی' گھبرا کر فیروزہ بیگم کو فون کیا۔

''کیا بات ہے نگین' شجاع سے بات ہوئی یا نہیں؟ کس وقت پہنچا وہ؟'' ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی
وال کر دیے۔

''وہ پہنچ بھی گئے' بات بھی ہو گئی مگر وہ یہ کہہ رہے ہیں انہیں یہ پتا نہیں کہ کب واپس آئیں گے۔ ان کی اماں
ہیں گی تو آجائیں گے اور اگر ان کی اماں نے منع کر دیا تو وہ واپس نہیں آئیں گے۔'' ماں کو پوری روداد بتا کر وہ
یدہ سی ہو گئی۔ اس کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو دے مگر اپنے آپ پر وہ ضبط کر رہی تھی۔

''نگین بیٹا میری ہر بات تمہیں غلط لگتی ہے ناں مگر کان کھول کر سن لو تمہاری ساس پکی جادوگرنی ہے یہ میرا
و فیصد خیال ہے۔''

''جی...... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''عظمت آپا نے یقیناً کوئی پڑھی ہوئی چیز اسے گھول کر پلا دی جس سے شجاع کا دماغ پلٹ گیا ہے' جب ہی
تو اس نے تم سے ایسی باؤلے پنے کی باتیں کی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ انہوں نے الو کا گوشت ابال کر اس کا پانی
پلا دیا ہوگا۔''

''افوہ! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کو ایسی نجس چیز کیوں پلا سکتی ہے؟''

''تجھے کیا پتا یہ محبت کیا کچھ کروا دیتی ہے' اپنا جوان بیٹا اپنے ہاتھوں سے نکلتا چلا جائے تو ماں تو سب کچھ داؤ
آزمائے گی اپنے بیٹے کو پانے کے لیے۔''

''ہاں شاید وہ کچھ پی تو رہے تھے فون پر بات کرتے ہوئے۔'' نگین نے کچھ سوچ کر کہا۔

''نگین تو صبر کر تیرا شجاع تیرے ہاتھ سے گیا۔'' فیروزہ بیگم نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

تب پریشان ہو کر ریسیور نگین کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

☆☆☆

کتنا اچھا لگتا ہے
جب تو اپنا لگتا ہے
تیری بات میں کیا جادو ہے
ہر بندہ جھوٹا لگتا ہے
(عطوفت را

’’ہرا! آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا، دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لوں، آنٹی آپ مجھے اپنا بیٹا ما کے لیے تیار ہیں میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔‘‘ نادر موبائل پر ثریا سے بات کرتے ہو کہہ رہا تھا، خوشی اور سرشاری اس کے لہجے سے چھلکی پڑ رہی تھی، وہ بے بات ہنس رہا تھا۔

’’تمہاری بات ٹھیک ہے مگر تمہاری آپا کو میرے پاس آنا چاہیے۔‘‘ ثریا اپنی دلی خوشی چھپاتے ہوئے کہہ تھیں۔

’’آنٹی جب خاندانی دشمنی کی اصل وجہ پیسہ ہو تو بہت سے کام چاہتے ہوئے بھی پورے نہیں ہو سکتے آپ کے پاس اب تک کیوں نہیں آئیں اس کی وجہ بھی میرا پیسہ ہے، جسے ہر شخص یہ ہی چاہتا ہے کہ خود ہی ہڑپ کر لے۔‘‘

’’مگر مسز رحمٰن کی تو کوئی نند وغیرہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس نہج پر سوچتیں۔‘‘

’’نند تو نہیں ہے مگر ان کے دیوروں اور جیٹھ کے ہاں لڑکیوں کی قطاریں موجود ہیں اور ان کے سب سسرا والے بھی زور ڈال رہے ہیں کہ میری شادی ان میں سے کسی لڑکی سے ہو جائے۔‘‘

’’بیٹا اب وہ دور کہاں رہا ہے جہاں زور دے کر زبردستی شادیاں کروائی جائیں۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی...... مگر جب بات پیسوں کی ہو تو خون کے رشتے بھی بدل جاتے ہیں، سب رالیں بہنے لگتی ہیں اور ایسے میں اپنے مفاد کے لیے بہتان بازیاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔‘‘ نادر کی باتوں خاصی دور اندیشی بھی چھپی ہوئی تھی۔

’’تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔‘‘

’’آنٹی پھر میں یہ سمجھوں کہ آپ نے ثنا کے ساتھ میرا رشتہ پکا کر دیا ہے اور جلد ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔‘‘ وہ ہتھیلی پر سرسوں جما رہا تھا۔

’’ہاں، ہاں کیوں نہیں مگر مجھے کچھ وقت تو تم دو ناں، تمہارے انکل سے تو میں پوچھ لوں۔‘‘ ثریا نے ہوئے کہا۔

’’انکل کی مجال ہے کہ آپ کی بات سے انحراف کر سکیں اور یوں بھی میں اور ثنا ایک دوسرے سے بہت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔‘‘ تب ثریا خاموش سی ہو گئی تھیں، اپنے سر وجود کو سنبھالتے ہوئے ہاں کا ہنکارا ابھرنا مشکل لگ رہا تھا۔

’’نادر کو بھی شاید کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اس لیے خدا حافظ کہہ کر اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا اور ثریا ہ یٰ کی گہری وادیوں میں اترتی چلی گئیں۔

☆☆☆

’’میں کیوں برداشت کروں؟ مجھے کسی ایک نے نہیں دس لوگوں نے سنائی ہے منور کی بکواس جو وہ دروازے ا بک رہا تھا۔‘‘ ثریا نے صابرہ کو بے مہار سنائی تھیں۔

’’منور کی اوقات کیا ہے کہ وہ میری باتوں کی کن سوئیاں لیتا پھرتا ہے، میں کسی سے کچھ بھی کہوں کیا اس سے ہازت لوں گی؟ وہ ہوتا کون ہے مجھ پر باتیں بنانے والا۔‘‘

’’خدا نہ کرے کہ ثنا نہ اس کی بہن ہے اور نہ اس کا کوئی ایسا رشتہ ہے جس کے طفیل وہ منہ کھولنے کا حق رکھتا ہے۔‘‘

’’اسے باتیں بنانے کا شوق ہے تو اپنے خاندان کی رعنا پر بنائے۔ وہ ہی سر پکڑ کر سن سکتی ہیں جس کی منور ے ساتھ قسمت پھوٹ رہی ہے۔‘‘

’’میری ثنا کا اگر کہیں سے رشتہ آ رہا ہے تو منور کو غل مچانے کی کیا آفت آ گئی کہ محلے کے لوگوں کو بھی پتا چل گیا وہ بھی کہنے لگے منور کے سر پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔‘‘

’’بھابی جی...... منور تو ایسا نکو بولے۔‘‘ صابرہ بار بار کہہ رہی تھیں۔

’’آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں پاگل ہوں یا کان بند کیے بیٹھی ہوں، لوگ مجھے بتائیں گے تو میں یقین بھی نہیں دوں گی اور کہوں گی بہن تم نے غلط سنا ہوگا میرا بھتیجا تو میری بہت عزت کرتا ہے کہ اس کی ماں نے اس کی یت ہی بہت اعلیٰ کی ہے۔ دراصل برچھی آپ کے سینے پر بھی لوٹی ہے کہ ثنا کا رشتہ اچھے گھرانے سے کیوں گیا ہے، آپ سب لوگ جل کر رہ گئے ہیں، کسی سے برداشت ہی نہیں ہو رہا ہے جب ہی تو ایسا ہو رہا ہے۔‘‘

’’سائرہ کی شادی دولت مند رنڈوے سے ہوئی تھی تو ساس صاحبہ خوب اچھلی تھیں کہ سائرہ کے بھاگ کھل اچھے نصیب کی تھی کہ طلاق لے کر بھی اچھی جگہ بیاہی گئی، اس کا شوہر عمر والا تھا مگر وہ انہیں لڑکا نظر آیا، جتنی ریفیں ہو سکتی تھیں کی جاتی تھیں اور اب میری بچی کا رشتہ اچھی جگہ سے آیا ہے تو سارے کے سارے جل کر رہ ئے ہیں۔‘‘

’’بھابی جی میں بولی ناں آپ سے، ہم سب لوگاں آپ کی خوشی میں خوش ہو کے بیٹھتے۔‘‘ صابرہ کا لہجہ لجاجت ا تھا اور وہ ان کو کول کرنے کی بہت کوشش بھی کر رہی تھیں۔

’’سب کی خوشیاں مجھے ان کے چہروں سے ہی نظر آ رہی ہیں، سب کے چہروں کے زاویے جیسے بگڑے ے ہیں کیا وہ مجھے نظر نہیں آ رہے۔‘‘

’’اللہ تیرا احسان ہے، میری بیٹی غیروں میں بیاہی جائے، گی جو عزت، مرتبہ، تمیز، تہذیب اور اخلاق کے والے سے بہت اچھے ہیں، اگر خدانخواستہ اپنے اس ذلیل خاندان کا کوئی رشتہ مجھے قبول کرنا پڑ جاتا تو میں بھی اری زندگی خوشیوں کو ترس جاتی اور میری بیٹی مسکراہٹ کو۔‘‘ اب ثریا کی باتیں سن کر صابرہ کا دماغ چکرا کر رہ گیا ا۔

اپنے مزاج کی کڑواہٹ اب وہ اپنی ملازمہ پر نکال رہی تھیں ’’ایو ماں، اجاڑ وخت کاں سے کاں پہنچ گیا، ہور اماں دیکھو کتے پڑے۔‘‘ طوفان کی طرح چکراتی، بلبلاتی، آگ برساتی صابرہ اپنی کام تن پر بری طرح برس

رہی تھیں جو ثریا کی کسی بات پر ہنس رہی تھی اور صابرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لے۔

”تحیلہ یہ کیا فضول باتاں لگائے بیٹھے تم' کچھ عقل ہے کہ نئیں' یہ گھر کی صفائی کیسی کرتے ہو تم۔“ وہ جالے تلاش کرنے لگیں۔

”پنکھوں پر کتی گرد جم گئی' کب کے نئیں کرے صاف تم نے؟ گملے دیکھے نئیں کیا سوکھے لگتے ایک میرے کو۔“ پھر ایک دم انہوں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

”اجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ میری یاد' بہاری کباب تھے ناں ہور میں چولھا بند بھی نہیں کری۔“ اور جب وہ بھاگ باورچی خانے میں پہنچیں تو بہاری کباب جل کر کوئلہ ہو چکے تھے اور صابرہ اپنی ملازمہ کو قصوروار ٹھہرا رہی تھیں نے باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے چولھے پر چڑھی ہنڈیا کا بھی خیال نہیں رکھا تھا۔

ادھر ثریا اس محاذ سے نمٹ کر اپنی بھاوج سے فون پر جرح کر رہی تھیں ”بھابی آپ نے بڑی آپا سے کیا مجھے تو ہمیشہ سے شو مارنے کی عادت ہے' خاک کی بات بھی لاکھ کی بنا کر کرتی ہوں اور چھچھوری تو میں ہوں' میں نے تو آپ کو نادر کے بارے میں چند جملے بتائے تھے اور آپ نے میری طرف سے مقالہ سنا دیا' اپنی طرف سے کلی پھندنے ٹانکنے کب بند کریں گی۔ بیس سال ہو گئے آپ کی شادی کو' بچے آپ کے ہو گئے مگر مکاروں کی طرح ادھر کی بات ادھر کرنا ختم نہیں کی' کب سدھریں گی آپ' یہ تو بتا دیں؟“

”اب بھاوج لاکھ کہتی رہی کہ جو سب آپ نے سنا ہے آپ کی اپنی آپا نے از خود اپنے دل سے گھڑ کر کہا' اور نام میرا لگا دیا ہے تو میں کیا کروں؟“

”میرے ساتھ تو یہ ہمیشہ سے ہو رہا ہے کہ ہر فن مولا نندیں جو بات کسی کے خلاف بھی کہنا چاہیں تو آسانی میرے نام کے حوالے سے کہہ دیتی ہیں۔“

”آپ کی بہنوں کی مثال تو ایسی ہے کہ تیر بھی خود مارتی ہیں' زخمی بھی خود کرتی ہیں اور مسیحا بھی کہلاتی ہیں میں جو نہ کسی کے تیرے میں نہ میرے میں' ہمیشہ بری بنتی ہوں اور بنتی چلی آ رہی ہوں۔“ بھاوج بیچاری اپنی صفائیاں دے رہی تھی مگر میں نامانوں کی عادت کے طفیل بکتے جھکتے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا گیا۔

اگر کوئی عام عورت ان محاذوں پر شرکت کرتی تو اس کو بھی اچھا خاصا ڈپریشن ہو جاتا مگر یہ ثریا تھیں' سے نمٹ کر وہ دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھیں۔

آئے موسم رنگیلے سہانے' جیا نہیں مانے تو چھٹی لے کے آجا بالما...... ہو...... ہو...... ہو

☆☆☆

”ارے کیا واقعی نادر نے تم سے ایسا کہا؟“ شاہنواز شاک میں آ گئے۔

”ایمان سے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا راج دلارا لڑکا میری ثنا کے لیے بات کرے گا' سنیے لاٹری نکل آئی۔“ ثریا نے خوش ہو کر بتایا۔

”عجیب عورت ہو تم لڑکے سے براہ راست بات کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی۔“ شاہنواز نے برہمی کہا۔

”نادر نے فون مجھے کیا تھا میں نے اسے نہیں کیا تھا۔“

”تمہیں کہہ دینا تھا کہ رحمٰن صاحب اور ان کی بیگم بات کریں ہم سے! اس سے بات تمہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”میں نے کہا تھا اس سے مگر یہ بات اس نے اپنی طرف سے کی تھی۔“

”مگر نادر تو کینیڈا چلا جائے گا' ایک ہی ہماری بیٹی ہے اتنی دور کیسے بھیجیں گے ہم...... اگر مسز رحمٰن کا بھی فون آئے تو ٹال دینا' ہم نے نہیں کرنی اتنی دور شادی۔“ شاہنواز نے بے پروائی سے کہا۔

”عجیب باپ ہیں آپ! بیٹی پڑھ لکھ کر فارغ ہو گئی ہے اس کی شادی کے بارے میں سوچیں۔“

”سوچ لیں گے۔“

”مگر نادر پیسے والا لڑکا ہے' ایسا لڑکا ہے جس کے خاندان کی تمام لڑکیوں کی نظریں اس پر ہیں۔“ ثریا نے دلی سے بتایا۔

”پھر تو اسے اپنی فیملی میں ہی شادی کرنی چاہیے' باہر شادی کرنے میں ویسے بھی بہت مسائل ہوتے ہیں۔“

”مگر وہ کروڑ پتی لڑکا ہے' کینیڈا میں اس کے نام بہت پراپرٹی ہے۔“

”ہمیں کسی کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اگر اس کے پاس بہت زیادہ پیسہ ہے تو پھر ہمیں ایسے لوگوں سے ناتا باندھنا بھی نہیں چاہیے' میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری بیٹی احساس کمتری کا شکار ہو۔“

”احساس کمتری کی کون سی بات ہے' آج کل ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد اونچے گھرانے میں بیاہی جائے۔“

”مگر مجھے اس وقت زیادہ خوشی ہو گی جب ثنا اپنے جیسے لوگوں میں بیاہی جائے اور اگر کراچی میں ہی اس کی شادی ہو تو دوہری خوشی ہو گی۔“

”شاہنواز آپ تو دنیا سے انوکھے شخص ہیں' آج کل ہر کوئی امریکا' کینیڈا کے خواب دیکھ رہا ہے اور آپ وہی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔“ ثریا نے جل کر کہا۔

”مجھے اپنی بیٹی سے بہت محبت ہے اس لیے میں اس نہج پر سوچتا ہوں۔“

”غلط سوچتے ہیں آپ' پاکستان میں رہی تو ہر چیز ترس کر ہی ملے گی۔“

”ثریا یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو' جو مقدر میں لکھا ہوتا ہے وہ ضرور ملتا ہے' میں نے تو امریکا' کینیڈا میں بھی بھوکے ننگے دیکھے ہیں۔“

”مگر نادر بہت اچھا لڑکا ہے اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ وہ میرا داماد بنے۔“

”تمہارے دل چاہنے سے کیا ہوتا ہے' رحمٰن مجھ سے خود بات کرے' بھابی سے کہے وہ آ کر بات کریں گی تو ہم سوچ سکتے ہیں' ہماری بیٹی میں کوئی کمی تھوڑی ہے۔ کراچی سے ہی دیکھ لینا اس کے لیے کتنے رشتے آتے ہیں۔“ شاہنواز نے تعلی بھرے لہجے میں کہا۔

”مگر نادر بہت اچھا ہے اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ ثنا کی شادی نادر سے ہو۔“ ثریا نے للچائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تمہارا؟ کیا ہم اپنے منہ سے خود کہیں گے کہ اپنے بھائی کی شادی ہماری بیٹی سے کرو۔“

”ان کا بھائی تو خود ہمارے ہاں رشتہ کرنا چاہتا ہے۔“

”اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے جب تک رحمٰن نہ کہے اور میں اپنے اس دوست کو بہت عرصے سے جانتا ہوں' وہ کبھی غلط بات تو کیا غلط مشورہ دینا بھی گناہ سمجھتا ہے۔“

"ایسے ہی لوگ دوسروں کے پیسے کھا جاتے ہیں۔" ثریا نے غصے میں تیزی سے کہا۔

"مگر اس نے تو ہمارے پیسے کبھی نہیں کھائے' ہم دونوں کا مشترکہ بزنس عرصہ دراز سے چل رہا ہے او اسے دیکھتا ہے میں تو اسے دیکھ بھی نہیں پاتا ہوں مگر مجھے تو کبھی پیسے کے معاملے میں کوئی شکایت نہیں۔" نے حیرت سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو ایسے ہی ایک بات کہہ رہی ہوں کہ کوئی بھی شخص نہ تو تمام معاملات میں اچھا ہوتا ہے او برا۔" ثریا نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"مگر رحمٰن تمام معاملات میں اچھا ہے اور قابل بھروسا ہے۔ رحمٰن جیسے دوست قسمت والوں کو ملاکر اور مجھے اس پر پورا بھروسا ہے اگر وہ اپنے سالے کے لیے بات کرے گا تو شاید میں اسے انکار نہ کرسکوں بات خود بھی جانتا ہے اور اگر وہ مجھ سے اس کے لیے بات نہیں کر رہا تھا تو یقیناً وہ ایسا چاہتا بھی نہ ہوگا۔"

"آپ کی آخری بات زیادہ صحیح ہے' ان کی اپنی بھانجیاں اور بھتیجیاں موجود ہیں اور وہ بھی چاہتے ہیں کی ان میں سے کسی ایک سے شادی ہو جائے۔" ثریا نے میاں کو بتایا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے' گھر میں رشتہ موجود ہو تو باہر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اگر رحمٰن ایسا کرنا چا تو یہ اس کا حق بھی ہے۔"

"عجیب باپ ہیں آپ بھی' دوسرے لوگوں کی تمام باتیں آپ کو درست نظر آتی ہیں۔" ثریا تنک بولیں۔

"میں مطلبی نہیں ہوں' دوسروں کے مفادات کو بھی عزیز رکھتا ہوں۔" شاہنواز نے کہا اور بے پروا یوں باہر نکل گئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

☆☆☆

فرح اماں کی بیماری کا سن کر کالج سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گاؤں آ گئی تھی۔ اماں پر موسم تھا یا کمزوری کا۔ ان سے بستر سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا اور اگر وہ زبردستی اٹھنے کی کوشش کرتیں تو ہر چیز گول گھومتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

فرح ماں کی یہ حالت دیکھ کر ان کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ انہیں کھلاتی خود ہی چوٹی گوندھتی اور کپڑے پہناتی۔

ڈاکٹر نے چیک کر کے کہہ دیا تھا' کوئی بیماری نہیں ہے' اس دفعہ پنجاب میں زیادہ سردی پڑی ہے برداشت نہیں ہو رہی۔

فرح کو دیکھ کر وہ خوش ضرور ہوئی تھیں مگر اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ان کے دماغ میں تھیں۔ جوان بیٹی جب اجڑ کر گھر بیٹھ جائے تو ماں سے زیادہ پریشان ہونے والی کوئی دوسری ہستی ہو سکتی۔

فرح کو ماں کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے صاف نظر آ رہے تھے' وہ انہیں سہارا دے کر درواز باہر لے جانے لگی تھی۔ باہر کی کھلی فضا میں جا کر وہ اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کیا کرتی تھیں۔ یہ بھی ان دنوں پڑوس کے مکان پر تالا تھا۔ اشرف کا پورا گھرانا اپنے ماموں' ممانی کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر گیا ہوا تھا۔

فرح کو آئے ہوئے ابھی تیسرا ہی دن تھا' وہ ماں کو باہر سے ٹہلا کر ابھی گھر میں لے کر آئی تھی کہ دروازے پر عبیر کو کھڑا دیکھ کر وہ حیرت سے اچھل ہی پڑی۔

"عبیر...... تم......" وہ واقعی گنگ سی ہو گئی۔

"تمہاری امی بیمار ہیں تو کیا انہیں دیکھنے کے لیے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔" وہ اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

"مگر تمہیں یہاں آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی۔"

"جن سے ہم پیار کرتے ہیں تو دل کے ساتھ کرتے ہیں' دوسری غیر ضروری باتوں پر سوچنے کا ٹائم نہیں ہوا کرتا ہے۔"

اماں بھی فرح کی شہری دوست کو یوں اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گئی تھیں۔

"خالہ جی...... آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔"

"ہاں پیاری تو بہت ہے مگر قسمت کی بہت ماڑی ہے۔" اماں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"زندگی کا ہر تجربہ کڑوا کسیلا نہیں ہوتا' یہ اتفاق ہی تھا کہ اشرف جیسا بدنصیب اس کی قسمت میں آیا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

عبیر کے آنے پر فرح واقعی خوش ہو گئی تھی' اپنی سب بہنوں کے ہاں لے کر گئی' نہر کے ساتھ بھٹے کھاتے ہوئے خوب لمبا چکر لگایا' کھیر بنوائی گئی' ماش کی دال کی کھچڑی پر اصلی گھی رکھ کر کھایا گیا اور سرسوں کے ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کا مزہ لیا گیا اور گنے تو خوب ہی چوسے۔ عبیر نے گاؤں پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ یہاں آ کر خوب انجوائے کر رہی تھی۔

"فرح سب کو دیکھ لیا مگر اشرف کو نہیں دیکھا' وہ تو تمہارے پڑوس میں رہتا تھا' اب کہاں ہے وہ؟"

"یہ بھی اچھا ہی ہے کہ ان دنوں وہ گاؤں میں نہیں ہے' اس کی تو شکل دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔"

دوسرے دن عبیر نے جانے کا پروگرام بنایا تو فرح نے روک لیا۔ دو دن بعد جب میں جاؤں گی تو میرے ساتھ ہی چلنا اور عبیر اس کی خوشی دیکھ کر یوں راضی ہو گئی جیسے اس کا بھی وہاں سے جانے کو دل نہ چاہ رہا ہو مگر جانے سے پہلے اس نے فرح کی اماں کے آگے اپنی جھولی پھیلاتے ہوئے کہا۔

"خالہ جی...... آپ فرح کی شادی میرے بھائی سے کر دیں' یہ گاؤں کے ماحول سے باہر نکلے گی تو اس کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا اور ذہن پر بھی اور آپ جو ہر وقت ڈیپریشن کا شکار ہیں فرح کی شادی کے بعد آپ بھی تمام فکروں سے فارغ ہو جائیں گی۔"

"بیٹا یہ تمہاری بہن جیسی ہے اگر تم اس کے بارے میں کچھ سوچو گی تو اچھا ہی سوچو گی۔" فرح کی ماں نے سادگی سے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ اس وقت انہیں یہ لگ رہا تھا جیسے عبیر ان کی کوئی قریبی عزیزہ ہو۔

"خالہ جی اگر فرح میری بہن ہے تو آپ بھی میری ماں جیسی ہیں۔" عبیر نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اماں کے آنسو عبیر کے ہاتھوں پر آ گرے۔

"نہیں خالہ جی آپ نے بالکل آنسو نہیں بہانے بس آپ راضی خوشی فرح کو میرے بھائی سے بیاہ دیں اور

وہ بھی سادگی کے ساتھ اور آپ کی آسانی کے لیے ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں کہ آپ لوگ آئندہ ماہ لا آجائیں وہاں سادگی سے نکاح کے بعد فرح کراچی چلی جائے گی۔”

“لاہور کیوں آجائیں؟” اب وہ منہ کھولے پوچھ رہی تھیں۔

“یہاں کا ماحول آپ کے حق میں نہیں ہے اور پھر اسی گھر سے فرح دلہن بن کر پڑوس میں گئی اور اب پھرا گھر سے دلہن بن کر نکلے گی تو اس کے دل و دماغ پر برا اثر پڑے گا۔”

“ٹھیک کہتی ہو تم!” اماں کو عبیر کی ہر بات سے اتفاق تھا یا اس کا لہجہ ہی ایسا محبت بھرا تھا کہ اماں کو اختلا کرنے کا کوئی نکتہ ہی نہ آتا۔

فرح تک جب عبیر کی بات پہنچی تو اس نے صاف منع کر دیا۔ “نہیں عبیر سی ٹی کی ٹریننگ ختم ہونے میں اگ تین ماہ باقی ہیں، میں اپنی ٹریننگ ادھوری ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔”

“ارے یار تم نے کون سی نوکری کرنی ہوگی، ٹریننگ کو گولی مارو۔” عبیر نے ہنستے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔

“نہیں عبیر، میرے ساتھ زندگی کا تجربہ اتنا تلخ ہوا ہے کہ اب میرا لوگوں پر بھروسا نہیں رہا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ ہر لڑکی کو اتنی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے کہ وہ بہ آسانی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے، مشکل گھڑی کبھی کہہ کر نہیں آتی خود ہی آجاتی ہے بغیر بتائے، ایسے میں اگر مالی پریشانی بھی ہو تو دیگر پریشانیاں بھی سر چڑھ کر آتی ہیں۔”

“ٹھیک ہے، تمہارا فیصلہ سر آنکھوں پر مگر آج سے تم میرے بھائی کی ہونے والی بیوی ہو۔” یہ کہہ کر عبیر نے اپنے ہاتھ سے سونے کا چھلا اتار کر فرح کی انگلی میں پہنا دیا اور فرح بات کرتے کرتے یکدم چپ سی ہو گئی۔

“یکبارگی اس کا دل چاہا کہ اسے اتار پھینکے مگر ماں کے چہرے پر خوشیوں کا اجالا تھا اور عبیر کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں تب اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا مگر اس کی آنکھیں موتی لٹانے سے باز نہ آئیں۔

“اری پگلی تم رو رہی ہو؟”

“اپنی قسمت سے ڈر لگتا ہے؟”

“میرا بھائی تعلیم یافتہ ہے اور بہت محبت کرنے والا ہے۔” اس نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ ایک دبلا پتلا نوجوان چہرے پر گھنی مونچھوں کے سنگ عبیر کے ساتھ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

“اچھا ہے ناں میرا بھائی؟” عبیر نے اماں سے پوچھا۔

“ہاں اچھا ہے۔” اماں نے تصویر دیکھ کر واپس کرتے ہوئے کہا۔

“اور تمہیں کیسے لگے اقبال بھائی؟” عبیر اس کی آنکھوں کے سامنے تصویر لہراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

اور فرح کے ذہن میں شجاع کی تصویر ابھر آئی جب اس نے خط میں رکھ کر خوشبوؤں میں بسا کر اسے بھیجی تھی جسے وہ کتاب میں رکھ کر بار بار دیکھتی تھی اور اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔ شجاع کی گہری براؤن غلافی آنکھیں ہر سم اسے تکتی نظر آتی تھیں۔ اسے ہمہ وقت ایسا ہی لگتا تھا کہ جیسے وہ ان کے حصار میں ہو۔

“کیا تصویر دیکھ کر مبہوت ہو گئیں؟ منہ سے بھی کچھ بولو ناں۔” عبیر اسے بولنے کے لیے واقعی اکسا رہی تھی۔

“ٹھیک ہی ہوں گے۔” وہ تصویر سامنے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

“کیا مطلب ہے تمہارا؟ تصویر میں کیا وہ تمہیں ٹھیک نہیں لگ رہے؟ میرا ابا نکا سجیلا بھائی کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟”

“یہ بات نہیں ہے، ساری بات اچھے برتاؤ کی ہوتی ہے، جو اچھے سلوک سے کام لیتا ہے وہ ہر لحاظ سے اچھا

ہوتا ہے اس میں شکل و صورت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔”

“ایسا تو نہ کہو، نرم دل لوگوں کے چہروں پر نرمی ہوتی ہے اور شقی القلب لوگوں کے چہروں پر بھی سختی ہوتی ہے اور ان کی شکلوں پر ایک عجیب قسم کا تناؤ ہوتا ہے، تیوریاں تنی ہوئی ہوتی ہیں اور آنکھوں میں شرارے لپک رہے ہوتے ہیں اور ایسے لوگ اپنے ہونٹوں کو تو دانتوں سے چباتے ہیں ان کا بس نہیں چلتا لوگوں کو کاٹ کھائیں۔”

“بڑا گہرا تجزیہ ہے تمہارا۔” فرح نے ہنس کر کہا۔

“تجزیہ تو گہرا ہی ہونا چاہیے، آخر میں بہت اچھی معلمہ بننے والی ہوں، لوگوں کے چہرے پرکھنے نہیں آئیں گے تو اپنی طالبات کو کیسے جانوں گی۔”

“شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔”

“اللہ کی بندی کبھی یہ بھی کہہ لیا کر...... عبیر تم یقیناً بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔” عبیر نے ہنس کر کہا تو اماں بھی اس کی بات پر مسکرانے لگیں اور تب فرح کو یوں لگا جیسے کوئی انجانا سا شخص اس ننھے منے سے چھلے میں سے جھانک رہا ہو۔

“کیا مجھے پھر کسی اندھے کنوئیں میں اترنا ہوگا؟” اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

“ہاں جس کو جانتے نہیں، اس کے بارے میں کیا پتا وہ کیسا ہوگا، اشرف کو تو میں جانتی تھی مگر وہ اتنا برا نکلا جتنا کہ سوچا نہیں جا سکتا تھا اور اب اقبال کیسا ہوگا؟” وہ اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے مسلسل سوچ رہی تھی۔

“شاید وہ اجالوں کی طرح ہو اور زندگی کسی سبک سی ندی پر سفر کرتے ہوئے گزر جائے اور پریشانی کا کوئی لمحہ زندگی میں نہ آئے، شاید وہ میٹھے خوابوں کی طرح ہو، اس کا ہاتھ پکڑ کر چاندی کے رتھ میں سوار ہو کر کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں پھولوں اور خوشبوؤں کی فضا ہو کسی کڑوی کسیلی بات کا وہاں گزر نہ ہو اور زندگی کی شام ہو جائے اور شاید وہ شجاع جیسا ہو اور ہمہ وقت اس کے کانوں میں محبت کا فسوں پھونکتا رہے اور ہنستے مسکراتے زندگی بسر ہو جائے۔”

“میں اب بہت رو چکی اب مزید رونا نہیں چاہتی، محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے اگر میری محبت مجھے نہ ملی تو کوئی بات نہیں اب اقبال میری محبت کا ستارہ ہوگا۔”

“ستارے تو ٹوٹ جاتے ہیں۔” اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

“اللہ نہ کرے۔” وہ من ہی من میں بڑبڑائی۔

“اگر اقبال کے سنگ زندگی کا سفر سہل نہ گزرا۔” اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا؟

“پھر تو یہ مفروضہ سچ ہو جائے گا کہ میں واقعی بدقسمت تھی، بدقسمت ہوں اور بدقسمت رہوں گی۔”

“فرح میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں، تمہیں سنائی تک نہیں دے رہا۔ اتنی گہری سوچیں رکھو گی تو ان میں ہی ڈوب جاؤ گی۔” عبیر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ میں تو پریشانیوں کے جال میں جکڑی لڑکی ہوں، ڈوب بھی گئی تو کیا ہوا؟

☆☆☆

فرح اور عبیر کے سی ٹی کے فائنل امتحان ہو گئے تھے اور یہ دونوں ہوسٹل چھوڑ کر اپنی دوست کے گھر آگئی تھیں۔ دو روز کے بعد فرح کی ماں اپنی دو شادی شدہ بیٹیوں، دامادوں اور دو اپنے بھائیوں کے ساتھ لاہور آگئی تھیں، ادھر اقبال بھی اپنے چار دوستوں کے ساتھ لاہور آگیا۔

جمعہ کی نماز کے بعد نکاح ہوا، عصر کے بعد کی ٹکٹیں ریلوے کی لے لی گئی تھیں۔ فرح، عبیر، اقبال کراچی کے

لیے اور اماں اپنے کنبے کے ساتھ اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہوگئیں۔ اقبال کے دوست سیر کرنے کے لیے مر
کی جانب روانہ ہوگئے۔

اگلے دن شام چار بجے ٹرین کراچی پہنچی تو اسٹیشن پر کوئی بھی استقبال کرنے والا نہیں تھا (فرح کو تھوڑی سی حیرا
وئی) ٹیکسی سے یہ تینوں گھر پہنچے تو وہاں پر بھی کوئی مہمان نہیں تھا (فرح کو پھر حیرانی ہوئی مگر اس نے ظاہر نہ کی)۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں دو سنگل مسہریاں سائڈ کی دونوں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

"پہلے یہ میرا اور بھائی کا کمرا تھا' اب ان دونوں مسہریوں کو تم جوڑ کر بچھالو۔" عبیر نے کہا اور اس کے ساتھ
ئی ہوئی اٹیچی اس کے کمرے میں رکھ دی۔

فرح نے چادر اتار کر اپنا کمرا خود ہی ٹھیک کیا۔ اماں جو لاہور سے اس کے لیے ایک بڑا سوٹ کیس لے آئی
یں اسے برآمدے سے وہ کھینچ کر خود ہی کمرے تک لائی اور اس میں سے ایک پھولدار بیڈ شیٹ نکال کر بیڈ پ
بھائی۔ تھوڑی دیر میں ہی چھوٹا سا کمرا اسنور سا گیا۔

"تم بھی نہا کر اچھے سے کپڑے پہن لو۔" عبیر اسے چائے کا مگ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"پہلے نہالوں پھر پیتی ہوں چائے' غسل خانہ کہاں ہے؟" فرح نے بیگ سے اپنا سوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"آنگن میں لیفٹ سائڈ پر واش روم ہے اور ادھر رائٹ سائڈ پر اسٹور روم ہے اور باورچی خانہ بھی' کمرے
رف دو ہی ہیں' ایک تم لوگوں کا کمرا اور دوسرا میرا کمرا پلس ڈرائنگ روم۔" عبیر نے دو منٹ میں ہی اسے
رے گھر کا راؤنڈ کروادیا۔

"اپنا گھر ہے چھوٹا بھی ہے تو کوئی بات نہیں۔"

"اپنا نہیں ہے یہ بھی کرائے کا ہے۔" عبیر نے اسے بتایا۔

"کرائے کا ہی سہی مگر اس وقت ہم لوگوں کے پاس ہے تو اپنا ہی ہوا' اللہ خیر سے اپنا بھی کردے گا۔"

"انشاء اللہ!" عبیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

فرح نے نہا کر پھولدار یلو سوٹ پہن لیا تھا' چاہتے ہوئے بھی وہ گلابی سوٹ نہیں پہن سکی تھی۔ عبیر نے اسے
یفشل جیولری پہنا کر میک اپ بھی کر دیا تھا مگر اقبال ہنوز گھر سے باہر تھا۔ اس کو یوں چپ چپ سا دیکھ کر عبیر
بتایا۔

"اقبال بھائی رات کا کھانا باہر سے لینے کے لیے گئے ہیں۔"

"باہر سے لینے کے لیے کیوں گئے ہیں' میں گھر میں ہی پکا لیتی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"اب چند گھنٹوں کی دلہن سے کھانا پکواتے ہوئے کیا اچھا لگے گا' ہاں کل صبح سے اپنے باورچی خانے کا
ج سنبھال لینا۔"

ابھی یہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ اقبال قورمہ' شیرمال اور گاجر کا حلوہ لے آیا۔

"لو عبیر جلدی سے نکال لو یہ ہماری شادی کا کھانا ہے۔" وہ فرح کو رغبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

کھانا کھاتے ہی عبیرا اپنے کمرے میں چلی گئی اور اقبال فرح سے بولا۔

"میں جھوٹ بولنے سے سخت نفرت کرتا ہوں' تمہاری زندگی کی کوئی بات بھی ہو وہ تم مجھے پہلے ہی بتادو۔"

"میں مطلقہ عورت ہوں' ایک سائیکی شخص سے شادی کے بعد جو میرا انجام ہوا اس کے بارے میں ہر بات
جانتی ہے۔"

"ہاں عبیر تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔"

"مگر میں اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتی ہوں۔"

تب اقبال اس کے لب و لہجے اور انداز گفتگو کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی طرح بھی گنوار یا جاہل لٹھ نظر نہیں آتی۔ اس کو دیکھ کر بالکل ایسا نہیں لگا تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی پہلی مرتبہ اتنے بڑے شہر میں آئی ہو۔ اتنے چھوٹے سے علاقے کی رہنے والی کے چہرے پر یہ بڑاپن اور تمکنت سی کیوں ہے؟ اقبال اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا اور فرح کے ذہن میں یہی بات تھی کہ کوئی بھی شخص اشرف جتنا برا نہیں ہوسکتا۔

"عبیر بہت اچھی لڑکی ہے' اقبال اسی کا بھائی ہے اور یقیناً یہ بھی اچھا ہی ہوگا۔" فرح اپنے آپ کو از خود دلاسے دے رہی تھی۔

اور اقبال اس کا موازنہ اپنی پہلی بیوی سے کر رہا تھا جو نہ شکل کی اچھی تھی اور نہ زبان کی۔ اقبال ایک بات کہتا تو اسے دس سناتی۔ کہنا تو وہ اس کا بالکل بھی نہیں مانا کرتی تھی اور سب سے بڑی مصیبت اس کے جھگڑالو بھائی تھے جو اپنی بہن کی شکایت سنتے ہی اس کو مارنے تک آجاتے تھے اس لیے اس نے اس سے جلد چھٹکارا حاصل کرلیا کہ وہ گالیاں دینے اور مارنے سے باز نہیں آسکتا تھا۔ عبیر نے فرح کا انتخاب اس وجہ سے بھی کیا تھا' کراچی شہر میں اس کا نہ کوئی رشتے دار تھا اور نہ ہی کوئی جاننے والا۔ اور جن لڑکیوں کے میکے دور ہوتے ہیں ان لڑکیوں کو کوئی سکھانے پڑھانے والا نہیں ہوتا اور وہ دب کر رہتی ہیں۔ یہ عبیر کا خیال تھا اور فرح تو ویسے ہی پریشان کن حالات کی چکی کا شکار لڑکی تھی۔

عبیر کا یہ سو فیصد خیال تھا کہ اس کے بدمزاج بھائی کو فرح اچھی طرح سنبھال لے گی اور اسی کے رنگ میں رنگ جائے گی۔

☆☆☆

فرض کی اماں نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی کہ لاہور شادی میں گئے تھے' وہیں فرح کا سادگی سے نکاح کرکے اسے رخصت کردیا۔

محلے کی عورتیں گھر آکر مبارکباد دے رہی تھیں اور ان کے گھر سے اشرف کے گھر جاکر انہیں تاؤ بھی دلا رہی تھیں کہ "بھئی فرح کی تو دوسری شادی ہوگئی اب تم بھی اپنے اشرف کی شادی کردو۔"

"فرح نے تو بھاگ کر شادی کرلی' شریفوں کی طرح ہوتی تو اپنے گھر سے رخصت ہوتی۔" بڑی آپا دور کی کوڑی لائی تھیں۔

"شادی بھاگ کر کی جائے یا چھل قدمی کرکے' شادی تو شادی ہی ہوتی ہے اچھا ہے فرح کی شادی ہوگئی اب تم بھی اشرف کی شادی کردو۔"

"اشرف کو اب لڑکیوں پر اعتبار ہی نہیں رہا۔" نانی نے کھانسی سے نمٹ کر کہا۔

"تمہارے خاندان کی لڑکیاں بھی اس کے اعتبار پر کیا پوری نہیں اتر تیں؟" سننے والیوں نے جل کر کہا۔

"اس معذور شخص سے شادی کون کرے گا؟" نانی پھر تڑ سے بول اٹھیں (نانی کی سچی باتیں گھر والوں کو بھی بہت بری لگتی تھیں)

"ہاں یہ بات دوسری ہے مگر پھر بھی کسی بڑے عمر کی بیوہ سے رابطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اگر وہ غریب بھی ہوگی تو اس کا بھی وقت کٹ جائے گا۔" محلے کی ایک خاتون بڑے رسان سے اشرف کی اماں کو سمجھاتے ہوئے

کہہ رہی تھیں۔ جس پر نانی بڑے مزے سے ہاں کا ہنکارا بھر رہی تھیں اور اشرف کی بہنوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ محلے کی ان عورتوں کو دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیں جو فرح کی خوشیوں کی باتیں ان کے گھر میں آ کر بیان کر رہی تھیں۔

''فرح جیسی ہے اور جیسی رہے گی ہم سے زیادہ کوئی اور نہیں جان سکتا' ہم نے تو اسے برتا بھی ہے اور پرکھا بھی ہے۔ آج آپ سب جو ہمارے گھر ہنسنے کے بہانے آئی ہیں تو غور سے سن لیں فرح جیسی لڑکیاں بسا نہیں کرتی ہیں' آپ میری بات لکھ لیں۔'' بڑی آپا نے غصے میں کہا۔ کف ان کے منہ سے بہہ رہا تھا۔

''اللہ نہ کرے۔'' بے ساختہ محلے کی خواتین کے منہ سے نکلا۔

''اچھا بھئی ہم چلتے ہیں۔'' محلے کی عورتیں پھر ان کے ہاں رکی نہیں تھیں۔

''یہ ہمارے گھر تقریریں کرنے آئی تھیں۔'' اشرف کی اماں نے ایک بھاری سی گالی دے کر کہا۔

''مگر میں نے تو ان سب کی بولتی بند کر دی۔'' بڑی بہن کے لہجے میں تو فخر تھی۔

''یہ پچھلے دروازے والی کہہ رہی تھی کہ کسی بیوہ سے کر دو اپنے بھائی کی شادی' ہم تو اس کی چھوٹی بیٹی کا رشتہ بھی نہ دیں' منحوس اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔'' چھوٹی بہن کو بھی غصہ آ رہا تھا۔

''یہ ساری مصیبت کی جڑ نانی ہیں جو ہر آئے گئے کے سامنے بکواس کرنی شروع کر دیتی ہیں' اب خود ہی اپنے نواسے کو معذور' مجبور اور بے کس کہیں گی تو باہر کے لوگ تو جتنا بھی کچھ کہیں وہ کم ہوگا۔''

مگر نانی ان سب کی باتوں سے بے نیاز کوئی پرانا گیت الاپ رہی تھیں۔ اپنی جوانی میں ان کی خوب پاٹ دار آواز تھی' اپنی سکھیوں کے سنگ خوب گیت گاتی تھیں' اس لیے اب بھی اپنا یہ شوق خود ہی پورا کر لیا کرتی تھیں۔

بڑی بہن نے حقارت سے نانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں کیا سمجھتی ہیں اپنے آپ کو ان سے اچھی اور کراری تو سبزی والوں کی آوازیں ہوں گی جو وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز کے ساتھ روزانہ نکالا کرتے ہیں۔''

''جس دن یہ گا نہ گائیں اس دن ان کا شاید کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' اماں نے ہنس کر تمسخر سے کہا۔

اور نانی سب کے تبصروں سے بے نیاز انگیٹھی سے ہاتھ سینکتے ہوئے گا رہی تھیں۔

او مینا ...... او مینا
نہ جانے کیا ہو گیا
کہاں دل کھو گیا
او مینا ...... او مینا
جب سے ہوا تھا سامنا
دل کو پڑا تھا تھامنا
او میں لاج کی ماری' کہہ نہ سکی
نہ جانے کیا ہو گیا
کہاں دل کھو گیا
او مینا ...... او مینا

☆☆☆

شجاع اپنے ساتھ زبردستی عظمت بیگم کو لے آیا تھا۔ وہ کراچی آنا تو نہیں چاہ رہی تھیں مگر اس کی ضد کے آگے ہار گئی تھیں۔

''میں اپنے بھائی کے گھر اتروں گی' تیرے گھر نہیں۔'' چلتے وقت انہوں نے کہا۔

''حیرت ہے امی اپنے بھائی سے محبت ہے ان کی بیٹی سے نہیں۔'' شجاع نے ہنس کر کہا۔

''یہ بات نہیں ہے میں ہمیشہ فرید کے پاس آتی تھی اب اس کے پاس نہیں جاؤں گی تو اسے عجیب لگے گا۔''

''امی پہلے کی اور بات تھی اس وقت آپ کا بیٹا کراچی میں نہیں تھا' بیٹے کی موجودگی میں کسی دوسری جگہ رہنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی۔''

شجاع جب اطلاع دیئے بغیر ماں کے ساتھ رات گئے اپنے گھر پہنچا تو نگین حیرت کے ساتھ بے انتہا خوش بھی ہو گئی۔

''پھپھو آپ کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''میں تو نہیں آ رہی تھی یہ شجاع مجھے زبردستی لے آیا ہے۔''

''آپ کو ہم سب بے حد یاد کر رہے تھے' اچھا ہوا آپ آ گئیں۔'' نگین نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

تب عظمت بیگم خاموش سی ہو گئیں' انہیں نگین کی خوشی اور لہجے پر حیرت ہو رہی تھی۔

واقعی کراچی شہر کی لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں' دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہوتا ہے' میرے شجاع کو گاؤں سے اڑا کر کراچی لے آئی اور اب ایسی محبت اور سرشاری سے مل رہی ہے جیسے میری جدائی میں بلک رہی ہو۔

''آیئے امی آپ پہلے کھانا کھا لیں۔'' ان کے آنے کے دس منٹ بعد ہی اس نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔

''جہاز میں الم غلم چیزیں کھا لی تھیں مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''نہیں پھپھو کھانا تو آپ کو کھانا ہی ہوگا۔'' نگین انہیں زبردستی کھانے کی میز پر لے آئی تھی' جہاں شجاع بچوں کو لیے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

عظمت بیگم نے بہ مشکل آدھی چپاتی کھائی اور کشور تائی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئیں' یوں بھی کشور کے ساتھ ان کی عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

اگلے دن عظمت بیگم شجاع اور نگین کے ساتھ بھائی کے گھر گئیں تو فرید احمد بے انتہا خوش ہو گئے اور آگے بڑھ کر اپنی بہن کو گلے لگایا۔

''آپا تم نے کراچی آ کر میرا دل خوش کر دیا ہے' تمہیں دیکھ کر مجھے دلی طمانیت سی ہو رہی ہے۔''

''مگر میرا تو اپنے گھر میں ہی دل لگتا ہے۔''

''نہیں آپا اب آپ کو کراچی میں ہی رہنا ہوگا' یہاں آپ کے بیٹے کے ساتھ ساتھ پوتا' پوتی بھی ہیں۔'' فیروزہ نے بھی میاں کے دیکھا دیکھی ڈائیلاگ مارا۔

''گاؤں میں میری بیٹی' داماد ہیں' نواسے' نواسیاں ہیں ان کو بھی تو میں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''اچھا تو پھر آپ آتی جاتی رہا کریں۔ چند مہینے کراچی رہ لیں اور چند ماہ پنجاب یوں آپ کا دل بھی لگا رہا کرے گا۔'' نگین نے لاڈ بھرے لہجے میں پھپھو سے کہا مگر وہ ہنس کر خاموش ہو گئیں اور نگین کی بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

”آپا میں آپ کے سامنے شجاع کی تعریف نہیں کر رہا بلکہ پیٹھ پیچھے بھی یہی کہتا ہوں کہ ماشاء اللہ شجاع بہ سمجھ دار لڑکا ہے۔ اس نے میرے اسٹور کو جس طرح اوپر تک پہنچایا ہے کہ اب میں بہت جلد نیا اسٹور کھول شجاع کو دینے والا ہوں تا کہ وہ اسے خود ہی مکمل طور پر چلائے۔“

”ارے کیا واقعی......!“ فیروزہ کا چہرہ بشاشت سے کھل گیا اور وہ فخر آمیز انداز میں عظمت بیگم کو یوں د لگیں جیسے کہہ رہی ہوں ”دیکھا ہم تمہارے بیٹے کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔“

نگین اس لیے خوش ہوگئی کہ شجاع کی تعریف ہو رہی تھی اور اسے اچھا لگتا تھا جب شجاع کو سراہا جائے۔

ہاں لبوں پر تالا صرف عظمت بیگم لگائے بیٹھی تھیں‘ بھائی بھاوج کی باتیں سن کر انہیں رتی بھر بھی خوشی ہوئی تھی۔

☆☆☆

فرح کو کراچی آئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ وہ اقبال کو سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنی بات ہی حرف آ سمجھتا تھا‘ کسی کی رائے سے بہ مشکل متفق ہوتا تھا۔ فرح کو بحث کرنے کی عادت ہی نہیں تھی وہ اس کی ہر با حکم کا درجہ دیتی تھی مگر اسے خوش ہونا نہیں آتا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن فرح کو یہ سمجھا دیا تھا کہ محلے میں کسی کے گھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور فرح نے تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

اقبال جب چلا جاتا تو اس کا سارا دن گھر کے کام کرنے اور عمیر سے باتیں کرنے میں گزر جاتا۔ سلائی سے اسے خاصی دلچسپی تھی‘ اون منگا کر جہاں اس نے عمیر کے لیے سوئٹر بنانا شروع کر دیا تھا وہاں ٹی وی کے لیے کروشیے کا رومال بنا کر اس پر ڈال دیا تھا۔ اقبال کے کپڑے خود دھوتی‘ انہیں کلف لگاتی اور خود پریس کر کے اس کے آنے سے پہلے تیار کر کے رکھ دیا کرتی تھی۔

ایک دوپہر اقبال باہر اور عمیر بھی باہر کسی کام سے گئی ہوئی تھی کہ پڑوسن آگئیں۔ فرح نے انہیں بٹھایا سوچنے لگی کہ جلد ان سے فراغت حاصل کر لی جائے ورنہ اقبال کو برا لگے گا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثا دیکھ کر پڑوسن بولیں۔

”تم اقبال کی دوسری بیوی ہو ناں؟“

”جی...... جی ہاں......“ وہ حیران سی ہو کر بولی۔

”اچھا......شاید تمہارے میاں نے تمہیں بتایا نہیں ہے کہ پہلی بیوی اور دو بچوں کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔“ اس کے چہرے کے اڑتے رنگ دیکھ کر وہ بولی۔ فرح خاموش سی رہی۔

”بہت ظالم ہے یہ اقبال اور اس کی بہن بھی کچھ کم نہیں ہے‘ یہی کہنے آئی ہوں ورنہ جب تم ان دونوں کے ساتھ اٹیچی کیس کے ساتھ داخل ہوئی تھیں تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ یہ چالاک لوگ پھر کسی کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔“ اس سے قبل کے پڑوسن اٹھ کر جاتی عمیر گھر میں آگئی۔

”ارے زبیدہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ چلو نکلو باہر۔“ عمیر نے پڑوسن کی شکل دیکھتے ہی کہا۔

”ہاں ہاں جا رہی ہوں‘ میں تو اقبال کی دوسری بیگم کو مبارک باد دینے آئی تھی۔“ پڑوسن جاتے جاتے کہہ گئی۔

فرح دم سادھے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی‘ ان کے باہم لہجوں اور باتوں پر غور کر رہی تھی۔

”فرح......ہم لوگ ان نیچ لوگوں سے ملنے کے عادی نہیں ہیں‘ آئندہ کسی سے ملنے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ خو ہی پریشان ہوگی۔“ عمیر نے سرد سے لہجے میں کہا اور فرح کو اس کا یہ انداز بڑا عجیب سا لگا۔ وہ لڑکی جو روم میٹ

کہ اس سے ہر وقت میٹھے سے لہجے میں باتیں کیا کرتی تھی آج اس کا انداز کیسی بیزاری سی لیے ہوئے تھا۔

فرح نے بعد میں بھی اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے تو یہ کہا تھا کہ اقبال کی شادی ہی نہیں ہوسکی ہے تو یہ دوسری بیگم کا ذکر کہاں سے آگیا؟

”میری کون سی یہ پہلی شادی ہے اگر اقبال کی بھی یہ دوسری شادی ہے تو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ فرح نے ازخود اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا۔ اشرف کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد اسے ازخود اپنے زخموں پر پھاہے رکھنے آگئے تھے۔

اتوار کے دن اقبال دیر تک سونے کا عادی تھا۔ عمیر بھی سوتی رہتی تھی۔ فرح اٹھ کر صفائی ستھرائی کر لیتی‘ ان کے اٹھنے سے پہلے آلو کی ترکاری بنا لیتی‘ پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھ کر رکھ دیتی تا کہ جب وہ اٹھیں تو گرما گرم پراٹھے بنا کر دے سکے۔

وہ باورچی خانے کی تفصیلی صفائی کر رہی تھی کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ اقبال نے اسے دروازے پر جانے کو منع کر رکھا تھا اس لیے دستک سننے کے باوجود وہ کام کرتی رہی مگر جب دروازے پر مسلسل دھڑادھڑ شروع ہوئی تو وہ گھبرا کر دروازے پر بھاگی۔

باہر دودھ والا تھا‘ اس کو دیکھ کر بولا ”آپ اقبال باہو سے کہہ دیجئے کہ دو مہینے ہوگئے ہیں‘ دودھ کا حساب نہیں کیا ہے اگر آج انہوں نے پیسے نہیں پہنچائے تو ہماری دکان سے دودھ لینے نہ آئیں۔“

”جی اچھا۔“ کہہ کر ابھی اس نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ اپنی پشت پر اقبال کو کھڑے دیکھ کر اس کی جان ہی نکل گئی۔

”الو کی پٹھی یہ لال جوڑا پہن کر‘ لال لپ اسٹک لگا کر باہر مردوں کو دکھاتی ہے۔“ وہ غصے سے دہاڑا۔

”باہر دروازہ بہت دیر سے بج رہا تھا اس لیے میں پوچھنے آگئی تھی کہ آپ سو رہے تھے۔“

”کمینی عورت میں سو ہی رہا تھا ناں‘ مر تھوڑی گیا تھا جو اٹھ کے نہ آتا۔ کیسے دوپٹا سینے سے ہٹائے اس کی باتیں سن رہی تھی جیسے وہ تیرا یار کھڑا تھا۔“ اقبال منہ میں کف بھرے اب گالیاں بک رہا تھا۔

”مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کون آیا ہے بس دروازہ کھولنے چلی گئی تھی کہ آپ کی نیند خراب نہ ہو۔“ فرح آنکھوں میں آنسو بھرے کہہ رہی تھی۔

”ہاں......ہاں تو تو ننھی سی ہے پانی کو مما کہتی ہے‘ منہ میں زبان ہی نہیں ہے‘ سر میں دماغ نہیں ہے جو میرے منع کرنے کے باوجود بھاگ کر آگئی۔ وہ کیسے تجھ پر آنکھیں جمائے تقریر کر رہا تھا۔“ فرح چپ چاپ باورچی خانے میں چلی گئی۔

عمیر ناشتے سے فارغ ہو کر بولی۔ ”فرح......کوئی بھی انسان مکمل خوبیوں کا مالک نہیں ہوتا‘ میرے اقبال بھائی بہت اچھے ہیں مگر وہ شکی مزاج ہیں اور یہ خامی کوئی ایسی بڑی خامی نہیں ہے جسے تم نظر انداز نہ کر سکو‘ تم کوشش کرو کہ ان کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ دروازے پر جانے کو منع کرتے ہیں تم مت جاؤ‘ وہ آس پڑوس میں ملنے کو منع کرتے ہیں تم مت ملو یوں بھی آج کل کس کے پاس وقت ہوتا ہے کہ وہ ادھر ادھر کے لوگوں کے پاس جا کر اپنا وقت ضائع کرتا پھرے۔“

”مگر وہ تو بات بے بات گالیاں بھی بہت سناتے ہیں۔“ فرح نے دبے دبے سے لہجے میں احتجاج کیا۔

”اری پاگل‘ گالیاں دینا تو ان کی عادت ہے اور جو گالیاں روز دی جائیں تو وہ گالیاں کہاں رہ جاتی ہیں وہ تو

حالی مسدس بن جاتی ہیں۔"

تب فرح کے دماغ میں حالی کی مسدس نئے مفہوم کے ساتھ یوں گردش کرنے لگی۔

اے ماؤ' بہنو بیٹیو
دنیا کی ذلت تم سے ہے

☆☆☆

"فرح کی شادی کو چھ مہینے ہوگئے' شادی کے بعد ایک مرتبہ بھی وہ گھر نہیں آئی۔" ماں نے پریشان ہوکر بیٹیوں سے کہا۔

"اماں جب بیٹیاں اپنے گھر میں خوش ہوتی ہیں تو انہیں کوئی بھی یاد نہیں آتا۔" بڑی بہن نے ہنس کر کہا۔

"اس کے چار خط آئے ہیں ماشاء اللہ وہ راضی خوشی ہے' اس نے اپنے خطوط میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی۔" دوسری بہن نے بھی مطمئن سے لہجے میں کہا۔

"شادی کے بعد لڑکیاں گھر آیا کرتی ہیں' فرح کو اقبال کے ساتھ گاؤں آنا چاہیے تھا۔"

"کراچی بھی تو اتنا دور ہے' آنا جانا کیا آسان رکھا ہے۔"

"کچھ بھی ہو اقبال تو اپنی سسرال ایک مرتبہ بھی نہیں آیا ہے۔"

"اس کی وہاں نوکری ہے کوئی فارغ تھوڑی ہے جو جب دل چاہے منہ اٹھا کر وہ آجائے۔"

"مگر شادی کے بعد داماد اپنی سسرال میں تو ضرور آتے ہیں' کیا کہتا ہوگا وہ اپنے دل میں' اس کی سسرال والوں کو کوئی ارمان ہی نہیں ہے کہ اسے اپنے گھر میں بلائیں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو آپ اسے خط لکھ دیں کہ گاؤں آکر وہ سیر یں کرے' کراچی میں آبادی زیادہ، گھومنے پھرنے کی شاید جگہیں بھی نہ ہوں۔" بڑی بہن کو ماں کی باتیں سن کر ہنسی آرہی تھی۔

"اڑا لے میرا مذاق' مگر فرح اور اقبال کو خط ضرور بھیجو۔"

"ٹھیک ہے اماں خط بھی لکھ دیتے ہیں مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ خط ملتے ہی دوڑے چلے آئیں گے۔"

"تم تو اپنا فرض پورا کردو اگر وہ نہیں آئے تو پھر میں جا کر مل آؤں گی' شادی کے بعد وہ کس طرح رہ رہی، مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"اماں کے کہنے پر بہنوں نے ایک رجسٹرڈ خط اقبال کے ایڈریس پر پوسٹ کردیا جس میں ان دونوں، ساتھ عمیر کو بھی گاؤں میں آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

خط اقبال کے ہی ہاتھ آیا اور جب اس نے پڑھا تو وہ ہنس کر بولا "فرح اللہ کا شکر ادا کرو تمہارے گھر والے تمہیں بھولے نہیں ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا انہوں نے تمہاری شادی نہیں کی شاید تمہیں دفنا دیا ہے اس لیے بھول سے بھی یاد نہیں کرتے۔"

فرح کو اقبال کی اہانت آمیز گفتگو سے رنج سا ہوا اور چپ رہی کہ بات کا بتنگڑ وہ آسانی سے بنا لیا کرتا تھا۔

"تمہاری اماں نے تمہیں بلایا ہے کب چل رہی ہو؟" رات کے کھانے کے بعد بھی اس کی باتیں اسی حوالے سے ہی جاری تھیں۔

"جب آپ کہیں یوں بھی ہم تینوں نے ہی جانا ہے۔"

"میں ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتا ہوں' ہفتہ دس دن تمہارے گاؤں رہ کر آتے ہیں' دیکھیں تو سہی کہ تمہارے

والے اپنے داماد کی کیسی آؤ بھگت کرتے ہیں۔"

اگلے دن اس نے خط لکھ کر اقبال کو دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اقبال سینسر کیے بغیر خط پوسٹ نہیں کرے گا اس لیے اس نے اپنے خط میں صرف یہی لکھا تھا۔

پیاری امی جان السلام علیکم!

میں آپ کی دعاؤں کے طفیل خیر و عافیت سے ہوں۔ اقبال میرا بے حد خیال رکھتے ہیں اور عمیر تو مجھے بہنوں کی طرح چاہتی ہے' آپ کا خط پڑھ کر سب کو ہی بے حد خوشی ہوئی اور ہم سب انشاء اللہ آئندہ ہفتے آپ کے پاس آئیں گے۔ اقبال نے اس سے قبل کبھی گاؤں نہیں دیکھا ہے' میرا خیال ہے کہ وہ ہمارے گاؤں میں گھوم پھر کر خوب خوش ہوں گے' اب انشاء اللہ آپ سے جلد ہی ملاقات ہوگی اس لیے اب اجازت دیجئے۔ والسلام

آپ کی بیٹی' فرح

فرح کا گمان سو فیصد درست تھا' فرح کا خط نہ صرف اقبال نے پڑھا بلکہ عمیر تک نے پڑھا۔ فرح اس وقت باورچی خانے میں تھی جب عمیر کا جملہ اس کے کانوں میں پڑا جو وہ اپنے بھائی سے کہہ رہی تھی "اقبال بھائی میں نے نہیں کہا تھا آپ سے یہ فرح بے وقوفی کی حد تک سیدھی ہے' آپ اسے کیسے گالی اور لات پر رکھتے ہیں مگر اپنے خط میں اس نے آپ کی کوئی شکایت نہیں لکھی ہے۔"

"ہاں اس کا تو ہر خط پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ کس مٹی کی بنی ہے۔"

"ایک آپ کی پہلی بیگم تھیں جن کے شکوے اور شکایتیں کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں تھیں۔"

"ان کو شروع میں اپنے سر پر جو چڑھا لیا تھا اس لیے اس نے ہماری جان جوکھوں میں ڈال دی تھی۔ فرح کو شروع سے ہی اوقات میں رکھا ہے تو دیکھو کیسی سیدھی سیدھی چل رہی ہے۔" اقبال کا لہجہ معنی خیز تھا۔

تب وہ اپنی سسکیاں اپنے دل میں ہی گھوٹ کر رہ گئی مگر لبوں سے ایک آہ ضرور آزاد ہوگئی۔

"فرح کا خط پڑھ کر سب بہنیں شاداں و فرحاں سی تھیں مگر اماں کے چہرے پر مسرت کی ایک کرن بھی نہیں ابھری تھی۔

"بیٹی کا خط پڑھ کر بھی آپ خوش نہیں ہیں۔" فرح کی بھاوج نے اپنی ساس سے کہا۔

"اس کا خط بڑا ڈرا ڈرا سا ہے' وہ اس طرح کے خط تھوڑی لکھتی تھی' نہ ہنسی' نہ مذاق' نہ کوئی بات' نہ بہنوں کے نام سلام اور نہ بھانجے' بھتیجوں کو کوئی پیغام یہ تو بڑا سوکھا سا خط ہے' ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے گولی کی نوک پر اس سے خط لکھوایا ہے۔"

"ایک ہفتے بعد تو وہ آ ہی رہی ہے خوشی اور غمی کیا چھپائے چھپتی ہے۔"

"اس کے ساتھ اس کی نند بھی آ رہی ہے جو جونک بن کر ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہے گی اس سے بات بھی کہاں آسان ہوگی۔ پتا نہیں اقبال کا مزاج کیسا ہے' ہم بھی بے وقوف کے بے وقوف ہی رہے۔ اقبال کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں کروایا اور جھٹ شادی کردی کہ اس جہنم سے وہ کسی طرح نکل جائے۔"

"فرح انشاء اللہ خوش ہی ہوگی' پڑھے لکھے لوگوں سے ناتا جڑا ہے وہ اسے سکھی ہی رکھیں گے۔" فرح کی بھابی نے اپنی ساس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بس واہمے پریشان کرتے ہیں اللہ کرے کہ وہ سکھی ہو۔" اماں کی آنکھیں پھر آنسو لٹانے لگیں۔

☆☆☆

تم سمجھو کہ میری لاٹری نکل آئی ہے۔‘‘ فرید احمد سرشار سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ’’اسٹور بھی اس ہے اور مال بھی اس سے اچھی کمپنیوں کا ہے۔ میرا دوست باہر جا رہا ہے وہ مجھے دے رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے آدھی قیمت دے دو، آدھی بعد میں دے دینا اور سامان تو کمپنیوں کا ہے ان سے ڈیلنگ اب ہم کریں گے۔‘‘ احمد نے کوئی چوتھی مرتبہ بیوی سے کہا۔

’’مگر اس دوسرے اسٹور کو کون دیکھے گا جبکہ وہ ہے بھی راولپنڈی میں۔‘‘ فیروزہ نے الجھ کر کہا۔

’’یہی سوچ رہا ہوں، نیا اسٹور ہے اسے مجھے خود ہی دیکھنا چاہیے۔‘‘ فرید احمد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

’’آپ کا کراچی کا اسٹور کیا شجاع ہی دیکھ پائے گا۔‘‘

’’ہاں ہاں کیوں نہیں، میرا خیال ہے کہ وہ کراچی کا اسٹور بہ آسانی دیکھ لے گا...... گاہے بہ گاہے میں بھی آتا رہوں گا۔‘‘

’’تو کیا آپ راولپنڈی اکیلے جا کر رہیں گے؟‘‘ فیروزہ نے حیرت سے پوچھا۔

’’اکیلا کیوں رہوں گا تم میرے ساتھ چلنا جب میں آیا کروں گا تو تم میرے ساتھ آجایا کرنا، ہماری شادی ہو چکی ہے، اب ہم لوگوں کو گھومتے پھرتے رہنا چاہیے۔‘‘

’’مجھے آپ کی رائے سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ راولپنڈی کا موسم مجھے ہمیشہ سے پسند ہے مگر نگین میں اکیلی ہو جائے گی۔‘‘

’’آپا اس کے پاس آ گئی ہیں وہ کیوں اکیلے رہے گی اور پھر کشور تائی اس کے ساتھ ہمہ وقت ہیں، ان بزرگوں کا وجود اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔‘‘

فیروزہ کا دل چاہا کہہ دے کہ تمہاری آپا زیادہ رکنے والی دکھائی نہیں دیتی ہیں دیکھ لینا وہ جلد پنجاب جائیں گی مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

فرید احمد کی خواہش تھی کہ دوسرا اسٹور کراچی میں ہی کھول لیں مگر یہ اچانک راولپنڈی میں اسٹور ملنے کا کچھ ایسی تیزی سے ہوا کہ وہ اپنے دوست کو ناں کر ہی نہیں سکے۔ پہلے دو تین چکر انہوں نے خود ہی لگائے جب اسٹور کے قریب ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تو فیروزہ کو ساتھ لے کر راولپنڈی سدھار گئے اور نگین گم ہو گئی۔ دس پندرہ دن کے بعد ماں کے گھر جانا اسے اچھا لگا کرتا تھا اور اس کے بچے بھی نانی کے گھر جا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ فیروزہ بیگم بھی ان ماؤں میں سے تھیں جو اپنی شادی شدہ بچیوں کا سواگت ہمیشہ گرم سے کیا کرتی تھیں۔ فیروزہ راولپنڈی گئیں تو ایک عجیب سی تنہائی نگین کے اندر اتر آئی۔

عظمت بیگم مارے باندھے بیٹے کے گھر ضرور رہ رہی تھیں مگر ان کا دل بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا اور فرحت کے تابڑ توڑ فون اور خطوں میں ان کو آنے کو کہا گیا تو وہ بھی جانے کو تیار ہو گئیں۔

’’شجاع بیٹا میں پھر تیرے پاس آ کر رہ لوں گی مگر اس وقت تو مجھے گھر جانے دے، فرحت اور اس کے میرے لیے بہت اداس ہو گئے ہیں۔‘‘

’’پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ دوبارہ میرے پاس جلد آئیں گی۔‘‘ شجاع نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

’’ہاں ہاں کیوں نہیں آؤں گی مگر اب تو تم مجھے چھوڑ آؤ۔‘‘ اور شجاع نے ہفتے کو جانے کا پروگرام بنا لیا۔

’’عظمت بیگم جب جا رہی تھیں تو انہوں نے کشور تائی کو گاؤں آنے کی دعوت دی مگر نگین سے ایک مرتبہ بھی نہیں کہا کہ اسے ان کے پاس گاؤں آنا چاہیے۔‘‘

’’پھپھو آپ جلد کراچی آئیے گا میں آپ کا انتظار کروں گی۔‘‘ نگین نے راست گوئی سے کہا جس پر انہوں نے اسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

’’تمہیں جھوٹ بولنا بھی خوب آتا ہے، تم تو میرے جانے کے دن گن رہی ہو گی اور مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ مجھے دوبارہ کراچی آنا چاہیے۔‘‘

پھپھو کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر نگین اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ عظمت پھپھو سے دلی محبت کرتی تھی اور اس نے ان کا کبھی برا نہیں چاہا تھا مگر وہ ہمیشہ اس سے بدظن سی رہا کرتی تھیں۔

☆☆☆

نادر اپنے کسی دوست سے پجیرو مانگ لایا تھا اور اس وقت وہ ثنا کے ساتھ اسلام آباد کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ ثنا کی ہمراہی میں گھومنا پھرنا اسے بے حد پسند تھا۔ میلوڈی سے اس کی گاڑی ابھی آگے بڑھی ہی تھی کہ نازک بوتیک کا بورڈ دیکھ کر ثنا نے کہا۔

’’پلیز نادر صرف دس منٹ رکنا میں ابھی آتی ہوں۔‘‘

’’میں چلوں تمہارے ساتھ؟‘‘ وہ سامنے کی جانب شاپس دیکھ کر بولا۔

’’تم گاڑی میں رکو میں یوں گئی اور یوں آئی۔‘‘ ثنا نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

’’اوکے...... بس جلدی سے آجاؤ پھر میریٹ جا کر چائے پیتے ہیں تمہارے پسندیدہ برگر سمیت۔‘‘

ثنا بوتیک میں جیسے داخل ہوئی سامنے ہی فریال کھڑی تھی جو ثنا کو دیکھ کر ہی خوش ہو گئی۔

’’میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تم سے ملاقات ضرور ہو گی۔‘‘

’’آپ امی، دادی اور پھپھو کے لیے دو دو سوٹ فوراً دے دیں۔‘‘

’’کیا کراچی جا رہی ہو تم؟‘‘

’’ہاں امی بلا رہی ہیں کہ فوراً آجاؤ جبکہ......‘‘

’’نادر تمہیں روک رہا ہو گا؟‘‘ فریال نے بقیہ جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

’’یہاں جس ڈاکٹر کے ساتھ میں ہاؤس جاب کر رہی ہوں ان کی شہرت بین الاقوامی ہے۔‘‘ ثنا نے فخر سے بتایا۔

’’جیسے کراچی میں اچھے ڈاکٹر ہوتے ہی نہیں ہیں۔‘‘ فریال نے تمسخر سے کہا۔

’’میں تو ایسے ہی ایک بات کہہ رہی ہوں۔‘‘ ثنا کو ہنسی آ گئی۔

’’کس کے ساتھ آئی ہو؟‘‘ فریال باہر کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

’’نادر کے ساتھ۔‘‘

’’شکر کہ تم اس کو لے کر اندر نہیں آئیں۔‘‘ فریال نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

’’آپ کو اچھا نہیں لگتا کیا؟‘‘ ثنا نے پوچھا۔

’’شکل و صورت کے حساب سے تو ٹھیک ٹھاک ہے مگر اس کی آنکھوں سے لگتا ہے کہ وہ بہت چالاک ہے۔‘‘

’’نہیں پھپھو وہ بہت اچھا ہے ہر لحاظ سے اچھا ہے اور سب سے بڑی بات کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ورنہ آج کل کے لڑکے تو شادی کی بات ہی نہیں کرتے۔‘‘

’’شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو گی مگر میں اپنے دل کا کیا کروں جواب کسی پر بھی اعتبار کرنے کے قابل نہیں رہا ہے۔‘‘

فریال نے سب کے لیے سوٹ پہلے ہی سے پیک کر کے رکھے ہوئے تھے۔ ثنا نے پرس کھولنا چاہا تو فریال

نے اس کی پشت پر ایک ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

”اپنا یہ پرس کہیں اور جا کر کھولا کرو‘ یہ کسی ایرے غیرے کی بوتیک نہیں ہے تمہاری پھپھو کی ہے۔ ہاں تمہارے لیے چار سوٹ خاص طور پر ڈیزائن کروائے ہیں‘ ان کو جب تم پہنو گی تو تم ہی تم نظر آؤ گی

”پلیز پھپھو آپ مجھے رعایت دے دیا کریں مگر یہ فری کا چکر تو ختم کریں‘ سچی اگر میں روز روز آنے لگی کا یہ بوتیک تو نقصان میں چلا جائے گا۔“

”کاش تم روز روز آؤ‘ تمہارے سوا میرا ہے ہی کون۔ جس کو دیکھ کر‘ جس سے باتیں کر کے میں خوش ہو جاتی

”اس کے باوجود بھی آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں کراچی چلی جاؤں۔“ ثنا منہ بسور کر پیکٹ اٹھاتے ہو

”ہاں اس کے باوجود بھی کہ تمہاری سچے دل سے جو خیر خواہ ہوں۔“

☆☆☆

فرید احمد اپنے پنڈی کے اسٹور پر تھے۔ کراچی کا اسٹور شجاع کے پاس تھا اور وہ روزانہ اس میں سے بیٹھا بھی کرتا تھا مگر جب امی کو گاؤں چھوڑنے گیا تو وہاں طیفے کے باپ کا انتقال ہو گیا‘ تین دن اماں کا بی پی ہائی ہو گیا۔ اماں کی جب طبیعت بحال ہوئی تو انہیں فرحت کے پاس چھوڑ کر کراچی آیا مگر کاموں میں بارہ دن لگ گئے‘ بارہ دن کے بعد جب اسٹور گیا تو کئی کہانیاں موجود تھیں۔

”سیلز مین سے کسی ڈاکو نے پیسے چھین لیے جب وہ بینک میں جمع کرانے جا رہا تھا‘ ایجنسی کی پروڈ دوسری دکانوں پر سپلائی ہو رہی تھیں تو گاڑی سے گھی کے پچاس کنستر چوری ہو گئے نہ ڈرائیور کو پتا چلا گاڑی کے ساتھ چلنے والے لڑکوں کو پتا چلا۔“ شجاع ان پر جو ناراض ہوا سو ہوا مگر جب فرید احمد کراچی انہوں نے شجاع کو بے حساب سنائیں۔

”تمہیں آپا کے ساتھ گاؤں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ بائے ایئر وہ جا رہی تھیں تم جہاز کا ٹکٹ د کے بھائی کو‘ وہ ان کے ساتھ چلا جاتا اور جو تم بارہ دن وہاں ضائع کر کے آئے ہو وہ نہ ہوتے۔“

”اماں اگر گاؤں میں بیمار ہوں گی تو کیا میں اسٹور کے ساتھ بندھا ہوا بیٹھا رہوں گا۔“ شجاع کو غصہ ہی آ

”ایسی صورت میں‘ میں کوئی دوسرا انتظام کرتا مگر تم تو مجھے اطلاع دیے بغیر ہی اسٹور کو چھوڑ ئے۔“ فرید احمد کو کسی صورت تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

شجاع اس دن گھر آیا تو نگین کو خوب سنا ڈالیں‘ کہیں کا غصہ کہیں تو نکالنا ہی تھا۔

”تمہارا باپ کیا اپنے آپ کو اعلیٰ پائے کا بزنس مین سمجھتا ہے‘ اسٹور میں فائدہ ہو تو کوئی بات نہیں نقصان ہو جائے تو آنکھیں نکال نکال کر یوں چڑھائی کرتے ہیں جیسے میں ان کا کوئی زر خرید ملازم ہوں اپنے باپ کو‘ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنی آواز اتنی اونچی نہ کیا کریں جس سے میری برداشت کی حد ختم ہو

نگین بیچاری سہم کر رہ گئی‘ اس ضمن میں وہ کوئی بات بھی اپنے باپ سے نہیں کہہ سکتی تھی اور نہ ہی اس حیثیت تھی کہ اس کی بات شجاع کی سمجھ میں آ جاتی۔ کشور تائی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھیں اور کڑھ رہی تھیں۔

اتنے اچھے لڑکے میں اتنا زیادہ غصہ‘ مجھے تو واقعی ہول آتا ہے۔ رب سائیں اس کو اپنے امان میں کسی دوسرے کے اسٹور پر یہ ملازم ہوتا تو وہ کب کا اسے فارغ کر چکا ہوتا مگر وہ تو ماموں بھی ہیں اور اسے برداشت بھی کر رہے ہیں۔

”نگین تم اپنے موبائل سے چار مرتبہ تو اپنی بہن اور ماں سے بات کرتی ہو‘ کیا تم نے اپنی ماں کو

ا۔ میں اماں کو چھوڑنے گاؤں گیا ہوں۔“

”ہاں بتایا تھا۔“ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

”پھر تمہارا باپ مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے کہ اسے میرے گاؤں جانے کا پتا ہی نہیں چلا‘ اتنے ھے ہو گئے ہیں‘ سیکڑوں بیماریاں لگی ہوئی ہیں مگر پھر بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے۔“ وہ شاپ سے آ کر لسل بڑبڑا رہا تھا۔

”میں نے امی کو بتایا تھا دو دن میں واپس آ جائیں گے پھر جب آپ نہیں آئے اور آپ نے مجھے بتایا کہ طیفے ے باپ کا انتقال ہو گیا ہے تو یہ بھی میں نے امی کو بتا دیا تھا مگر آپ کے آنے کا کنفرم دن کا مجھے معلوم نہیں تھا تو انہیں ھی کیا بتاتی؟“ نگین دھیمے سے لہجے میں اسے بتا رہی تھی مگر اس کا غصہ کسی صورت کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”تمہارے گھر والے پاگل ہیں۔ جیسے وہ خود ہیں ایسے ہی وہ دوسروں کو سمجھتے ہیں مگر مجھ جیسے بندے سے ایدان کا کبھی پالا نہ پڑا ہو‘ میری یہ ہمیشہ کی عادت ہے کہ کسی دوسرے کو میں چھیڑتا نہیں ہوں مگر مجھے کوئی ھیڑے تو اسے چھوڑتا نہیں ہوں‘ تمہارا باپ جب سے آیا ہے پتا نہیں کیا کچھ بکواس کیے جا رہا ہے‘ جبکہ میں اس عاملے میں بالکل بھی قصوروار نہیں ہوں‘ اب اگر میں کچھ کہہ دوں گا تو بڑے میاں کی سٹی گم ہو جائے گی۔“

”ابا جی تو ایک دو دن میں واپس پنڈی چلے جائیں گے‘ آپ کیوں ایسی بات کرتے ہیں جس سے خواہ مخواہ ات بڑھے اور ان کی تو عادت ہی ایسی ہے‘ آج بھی امی آئی تھیں تو وہ کہہ رہی تھیں شجاع کو تم سمجھا لینا ان کا غصہ واہ مخواہ بڑھ رہا ہے۔“ تب کہیں شجاع کی تقریر کو بریک لگا اور نگین نے سکون کا سانس لیا۔

وہ شاپ جو تیزی سے ترقی کر رہی تھی اس کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جس سے مالی نقصان مسلسل بڑھ رہا تھا۔ فرید احمد کو ابھی پنڈی گئے ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ شاپ میں شارٹ رکٹ ہونے کی وجہ سے خاصا سامان جل گیا۔ فرید احمد پھر کراچی دوڑے چلے آئے اور اس حادثے کا ذمے دار جاع کو ٹھہرایا۔ ”بجلی کے وہ تار جو ٹوٹ گئے تھے وہ کسی اناڑی مکینک سے کیوں صحیح کرائے جس کی وجہ سے ارٹ سرکٹ ہوا۔“

”اب اس مکینک کے ماتھے پر تو نہیں لکھا تھا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے‘ میں نے تو اسے دکان سے بلوایا تھا مجھے یا معلوم تھا کہ اسے کام ہی نہیں آتا۔“

”شجاع ہر کام تم خود کرنا چاہتے ہو‘ جو لوگ اس دکان میں برسوں سے کام کر رہے ہیں تم کو ان سے کہنا چاہیے تھا کہ شاپ کی ٹوٹ پھوٹ کو کون لوگ ٹھیک کرتے ہیں۔“

”اب اگر میں کام کرتا ہوں تو وہ غلط ہے اور اگر نہیں کرتا ہوں تو وہ بھی غلط ہے حالانکہ آپ غلط ہیں‘ آپ کو ب یہ معلوم نہیں ہے کہ کس سے کیا بات کرنی چاہیے اور کیا نہیں تو دیگر معاملات کیسے نمٹاتے ہوں گے۔“

فرید احمد کو شجاع کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا اور ان کا دل بھی یہی چاہا کہ شجاع کو اسی وقت کان پکڑ کر اپنی اپ سے باہر کر دیں مگر انہوں نے خون کے گھونٹ پی لیے اور چپ سے ہو گئے۔

”داماد کو اپنے بزنس میں لگانا کتنا غلط ہوتا ہے اس کا اندازہ آج انہیں ہو رہا تھا۔ کاش میں نے یہ فیصلہ نہیں یا ہوتا تو میں کتنے سکون سے ہوتا۔“ انہوں نے اپنی تنی ہوئی نسوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے گردن ھا کر سوچا۔

☆☆☆

شام کے چار یا ساڑھے چار بجے کا وقت ہوگا جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ فرح نے سرخ پھولدا قمیص پہنی ہوئی تھی اور بڑی سی گرم چادر اوپر سے لے رکھی تھی۔

اقبال کالی پتلون پر آف وائٹ بوسکی کی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور اوپر کالی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ ایک اقبال کے ہاتھ میں تھا جبکہ ایک ایک بیگ فرح اور عبیر نے اٹھایا ہوا تھا۔

فرح جیسے ہی اپنے محلے میں داخل ہوئی سامنے والی اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ فرح کو دیکھ کر

"فرح مبارک ہو شادی کے بعد پہلی بار گھر آئی ہو۔" فرح نے سلام کرتے ہوئے تائید میں سر ہلا دیا۔

"فرح باجی آ گئیں...... فرح باجی آ گئیں۔" چھوٹے بچوں نے فرح کو دیکھ کر جیسے شور مچا دیا۔

فرح پچھلی گلی طے کر کے اپنی گلی میں مڑی ہی تھی کہ اسے اشرف کے دروازے پر کوئی شخص کھڑا ہوا ماتھے پر ہاتھوں کا چھجا بنائے اسے دور سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ کون حضرت ہمیں اتنی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں؟" اقبال نے فرح سے پوچھا۔

"پتا نہیں کون ہے۔" تھوڑے فاصلے سے فرح بھی پہچان نہیں پا رہی تھی کہ وہ کون ہے اور جب وہ پہنچی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے یہ تو اشرف ہے۔" فرح کی بات سن کر اقبال اور عبیر نے بھی اسے بطور خاص دیکھا۔

دبلا پتلا سا اشرف سفید کلف کی شلوار قمیص پہنے نفرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوئے تھیں اور ان سے نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

"تم تو کہتی تھیں اشرف اپاہج ہے؟" عبیر نے سرگوشی میں فرح سے کہا۔

"تم بھی تو پاگل تھیں، جو یہ کہتی رہی اور تم اس کی ہر بات کا یقین کرتی چلی گئیں۔" اقبال نے فرح کو حسر دیکھتے ہوئے بہن سے کہا۔

اور اشرف کو اسی لمحے اندازہ ہو گیا کہ فرح اس شخص کی بیوی ہونے کے باوجود اس کے دل میں جگہ نہیں کر سکی ہے۔

"میں خود حیران ہو رہی ہوں کہ اس کے پیر کیسے ٹھیک ہو گئے۔"

اب یہ لوگ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے اور یہاں سے اس کے کالے بوٹ نمایاں نظر آ رہے تھے جو اس پہن رکھے تھے۔

فرح کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب سے پہلے فرح غڑاپ سے اندر داخل ہو گئی، اس کے بعد اس کے پیچھے داخل ہو گئی۔ اقبال نے چند لمحے توقف کیا اور پھر ایک نظر اشرف پر ڈالی جو برابر کے دروا کھڑا اسے ہی مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اقبال نے کچھ سوچا اور پھر اشرف کو سلام کیا۔

اشرف ایک لمحے کے لیے تو حیرت زدہ ہوا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اقبال سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے اشر کہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور میں اقبال ہوں، کراچی سے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر اقبال رکا نہیں فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔

"اونہہ! یہ ہے فرح کا شوہر۔" اشرف نے اپنے ہاتھ پر دوسرے ہاتھ سے مکا مارتے ہوئے غصے سے کہا نفرت سے اس دروازے کو گھورنے لگا جس سے گزر کر یہ سب لوگ اندر گئے تھے۔

☆☆☆

ایسی خاطر و مدارت، اقبال واقعی حیران رہ گیا۔

دوپہر کی دعوت اگر بڑی سالی کے گھر تھی تو شام کی دعوت ماموں کے ہاں اور دعوتوں کے ساتھ ساتھ تحفے تحائف علیحدہ دیے جا رہے تھے۔ اقبال اور فرح کے ساتھ ساتھ عبیر کو بھی کڑھے ہوئے دوپٹے، سوٹ اور چادریں علیحدہ سے مل رہی تھیں۔

فرح کے گھر والے واقعی بہت محبت کرنے والے ہیں یہ احساس یہاں آ کر اسے ہو گیا تھا۔

اقبال کو خوش دیکھ کر فرح نے بھی آسودگی کا سانس لیا تھا۔

"یہ اشرف کی ٹانگ تو بالکل صحیح ہے، فرح نے تو بتایا تھا کہ اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔" ایک دن کھانے کے بعد دانت میں خلال کرتے ہوئے اقبال نے اپنی ساس سے اس طرح پوچھا جیسے یونہی تذکرہ پوچھ رہا ہو۔

"پندرہ دن پہلے کراچی جا کر مصنوعی ٹانگ لگوا کر آیا ہے اب تو اپنی دکان پر بھی جا کر بیٹھنے لگا ہے۔"

"زندگی تو حادثات کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس کے معذور ہونے کا مطلب یہ بالکل نہیں تھا کہ وہ ساری زندگی معذور رہتا۔" اقبال نے لہجہ بدل کر کچھ اس طرح کہا جیسے وہ اشرف کی وکالت کر رہا ہو۔

"مگر بیٹا! طلاق تو اس نے خود فرح کو دی ہے، فرح نے تو ہر حال میں اس کے ساتھ گزارہ کیا تھا۔"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" وہ تمسخر سے ہنستا ہوا بولا۔

"گاؤں والوں سے پوچھ لو، فرح کو بھی سب جانتے ہیں اور اشرف کو بھی۔" فرح کی امی اچانک ہی پریشان سی ہو گئیں۔ اقبال کی باتیں ان کا سر گھما سی گئی تھیں۔ اتنی خاطر و مدارت، پل پل اس کا خیال رکھنے کے باوجود وہ ایسی ٹیڑھی میڑھی باتیں کیوں کر رہا ہے۔

"خالہ جان بات یہ ہے کہ اچھے وقت کے سب ساتھی ہوتے ہیں اور برے وقت میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔" وہ اب بھی عام سے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔

مگر اس کے لہجے میں چھپی کمینگی کو فرح پہچان رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور بیٹی کے پژمردہ سے چہرے کو دیکھ کر اس کی ماں لمحے بھر میں پہچان گئی کہ اس کی بیٹی شادی کے اس جوئے میں بھی ہار گئی ہے۔

ان کے جانے سے ایک دن قبل اقبال اکیلا ہی واک کے لیے چلا گیا تھا اور ادھر ادھر کے لوگوں سے خوب آگے بڑھ بڑھ کر مل بھی رہا تھا۔

اشرف نے اپنی دکان سے اسے دیکھا تو دکان محلے کے لڑکے کے حوالے کر کے اس کے پاس آیا اور بولا "پڑوسی ہونے کے ناتے آپ ہمارے بھی مہمان ہیں، آیئے ایک کپ چائے ہمارے ساتھ بھی پی لیجیے۔"

اقبال تو خود ایسا موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ اشرف سے اس کی اکیلے میں ملاقات ہو جائے۔

اپنی دکان میں بیٹھے وہ دونوں چائے پی رہے تھے، تب اچانک ہی اقبال نے اشرف سے پوچھا۔ "اگر آپ

برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے فرح کو طلاق کیوں دی؟‘‘

’’ارے چھوڑیے صاحب، رات گئی بات گئی...... آپ کیوں اپنی زندگی خوار کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’میں تو یوں ہی برسبیل تذکرہ پوچھ رہا ہوں۔‘‘

’’نہیں بھائی میں آپ کو کوئی ایسی بات نہیں بتانا چاہتا جس سے آپ کی خانگی زندگی میں کوئی آ آئے۔‘‘ اشرف اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکا رہا تھا۔

’’ایسی کون سی خاص بات تھی جو آپ نے فرح جیسی معصوم لڑکی کو چھوڑنا گوارا کیا؟‘‘

’’اب آپ فرح کو کم از کم میرے سامنے معصوم تو نہ کہیں۔‘‘ اشرف نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

’’کیوں بھئی...... آپ اسے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔‘‘ اقبال اب اشرف کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ایک ایک بات اس کے دل پر اثر کر رہی ہو۔

’’بدمعاش عورت کو کیا آپ شریف عورت کا نام دے سکتے ہیں؟‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘

’’بدقسمتی سے میری شادی ایک بدمعاش عورت سے ہوئی، جس نے شادی تو مجھ سے ضرور کر لی تھی مگر اپ عاشق سے اس کا رابطہ برقرار تھا۔‘‘

’’فرح اور بدمعاش......!‘‘ اقبال واقعی حیران سا ہو رہا تھا۔

’’میں نے کہا تھا ناں آپ اس چکر میں مت پڑیں اور خوشی خوشی اپنی بیگم کے ساتھ وقت گزاریں، آخر بری عورتوں کو بھی جینے کا حق ہوتا ہے۔‘‘

’’اشرف بھائی...... آپ مجھ پر رحم کھائیں اور پوری بات مجھے بتائیں۔‘‘ اقبال گھگھیاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

اور اشرف کو یقین سا ہو گیا کہ فرح کا یہ شوہر شکی مزاج اور کچے کانوں کا بے وقوف سا شخص ہے جس سے میں جو بھی کہوں گا اس پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لے گا۔

اشرف کو یوں خاموش سا دیکھ کر اقبال خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ’’اگر آپ مجھے حقیقی صورت حال سے آگاہ کریں گے تو میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔‘‘

’’تب اپنے واسکٹ کی اندرونی جیب سے فرح کے دو خط نکال کر دیتا ہوا بولا ’’یہ خط شادی کے بعد فرح نے اپنے عاشق شجاع کو لکھے تھے۔‘‘

’’یہ شجاع کون ہے؟‘‘

’’اسی گاؤں کا ہے ان دنوں کراچی میں ہے۔ وہ یوں تو شادی شدہ ہے مگر اس کی معشوقہ فرح ہی ہے۔ اسی وجہ سے تو اس کی ماں نے اس کو گاؤں سے نکالا ہے۔ اور اب وہ یہ جان کر خوش ہو گیا ہوگا کہ فرح اس کے شہر میں آ گئی ہے اور یقیناً وہ دونوں آپس میں بھی ملتے ہوں گے۔‘‘

’’وہ دونوں ملتے ہوں گے۔‘‘ اقبال ساکت سے چہرے کے ساتھ سراسیمہ سا پوچھ رہا ہو تھا......!

’’ارے یار تم اس معصوم سے چہرے والی عورت کو نہیں جانتے کہ کتنی ہرفن مولا ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ اس سے فارغ ہو کر مجھے طمانیت کی نیند نصیب ہوتی ہے ورنہ میں اس کی چوکیداری کی وجہ سے ساری ساری را جاگا کرتا تھا اور یہ پھر بھی میرے چونا لگا جاتی تھی۔‘‘

’’اب میں کیا کروں؟‘‘ اقبال کسی ناسمجھ بچے کی طرح اس سے پوچھ رہا تھا۔

’’یار تم خوشی خوشی رہو، ابھی تو تمہاری شادی ہوئی ہے تم کیوں اپنے دل کو دکھ لگاتے ہو اور یوں بھی یہ میرا غم تھا، میرا دکھ تھا جو اس کے جاتے ہی ختم ہو گیا تھا، اب تو میں راضی خوشی ہوں۔ گاؤں کی کتنی ساری لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہیں مگر میرا دل اتنا ڈرا ہوا ہے کہ کہیں بھی ہامی بھرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔‘‘

’’مگر میں کس جرم میں اپنے ساتھ یہ ظلم برداشت کروں؟‘‘ اقبال اس سے پوچھ رہا تھا۔

’’تمہاری زندگی اچھی گزر رہی ہے تو کیا ضروری ہے کہ تمہاری اپنی زندگی میں پریشانیاں گھلیں۔‘‘ اشرف ایسے رسان سے اسے سمجھا رہا تھا جیسے وہ نہ جانے کتنا قریبی عزیز ہو۔

اب اقبال فرح کے وہ خطوط پڑھ رہا تھا جس کی تاریخ اشرف کے شیطانی دماغ نے ازخود تبدیل کر دی تھی۔ ہلکا پھلکا سا محبت نامہ تھا مگر فرح کی رائٹنگ کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اب اس کا دماغ کسی بگولے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔

’’میں یہ خط لے جاؤں؟‘‘ وہ انہیں اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

’’مرضی ہے آپ کی، میں تو ان کو اب پھاڑ کے پھینکنے والا تھا۔‘‘ اشرف عام سے لہجے میں بولا جیسے یہ خطوط اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتے ہی نہ ہوں۔

اقبال نے شکریہ ادا کر کے جانے کو قدم بڑھائے تو اس کا غصہ اپنے جوبن پر تھا۔ اشرف کی دکان سے فرح کا گھر کوئی ہزار گز کے فاصلے پر ہوگا مگر اقبال کو یہ مسافت بڑی طویل محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی جیب میں رکھے ہوئے خطوط اسے ایسے انگارے محسوس ہو رہے تھے جن کی تپش اسے جھلسائے دے رہی تھی۔

’’عبیرا ابھی گھر چلو۔‘‘ گھر میں قدم رکھتے ہی وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔

’’ہم نے تو کل جانا ہے۔‘‘ فرح نے پانی پی کر کٹورا صراحی پر رکھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ اسے یاد دلا رہی ہو۔

’’میں تمہارے جانے کی بات نہیں کر رہا۔‘‘ وہ غصے سے دہاڑا۔

’’اقبال پتر میں قیمے والے نان لگا رہی ہوں، دہی کی لسی کے ساتھ وہ کھاؤ تو سہی۔‘‘ فرح کی اماں اقبال کے موڈ سے بے خبر اپنی رو میں کہہ رہی تھیں۔

’’یہ نان اور ران آپ اپنی بیٹی کو کھلائیے گا، ہم کراچی جا رہے ہیں۔‘‘ وہ اٹیچی کیس اور بیگ کمرے سے باہر لاتے ہوئے بولا۔

’’پر کیوں تم لوگوں نے تو کل شام کو جانا تھا؟‘‘ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

’’بس اب ہمت نہیں رہی یہاں رہنے کی۔‘‘ وہ تلخ سے لہجے میں بولا۔

’’ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو بتا دو بیٹا، ہم بڑے شہروں کے راہ و رسم نہیں جانتے، بیٹا ہمیں معاف کر دو مگر ایسی ناراضی کی باتیں مت کرو۔‘‘ فرح کی ماں خوشامدانہ لہجے میں داماد سے کہہ رہی تھیں۔

’’غلطی تو میری بہن سے ہوئی ہے جس نے ایک آوارہ اور بدچلن عورت سے میری شادی کروائی۔‘‘ وہ فرح پر قہر کی نظر ڈالتے ہوئے بولا...... اور اس کے جملوں کی سنگینی سے وہ سرتاپا کانپ سی گئی۔

’’بیٹا جی تم کیسی باتیں کر رہے ہو، کس نے غلط پٹیاں تمہیں پڑھائی ہیں؟‘‘

’’غلط پٹیاں نہیں پڑھائیں میرے پاس سچے ثبوت ہیں، یہ دیکھیے فرح کے محبت نامے جو وہ اپنے عاشق شجاع

کو لکھا کرتی تھی۔" فرح کے خط اس کی ماں کے سامنے پھینکتے ہوئے غصے سے کہا۔

"یہ تجھے کس نے دیے ہیں۔" فرح کی ماں نے تڑپ کر پوچھا۔

"کون دے سکتا تھا' ظاہر ہے کہ اشرف ہی دے گا جس کی زندگی میں فرح نے زہر بھرا تھا۔"

"اقبال بیٹے تم گاؤں میں کسی سے بھی پوچھ لو میری فرح کیسی ہے۔" ماں کا لہجہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔

"میں بدمعاش عورت کو اپنے پاس رکھ ہی نہیں سکتا تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تو کیا تم فرح کو اپنے ساتھ نہیں لے کر جاؤ گے؟"

"نہیں' ہرگز نہیں۔"

"تو پھر فرح کا کیا ہوگا؟"

"میں اس کو طلاق دیتا ہوں' میں اس کو طلاق دیتا ہوں' میں اس کو طلاق دیتا ہوں۔" اقبال غصے سے کانپتے ہوئے کہہ رہا تھا' کف اس کے منہ سے بہہ رہا تھا۔

عبیر حیران پریشان سی اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ طلاق دینے کے بعد وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اٹھو یہاں سے اور دفع ہو جاؤ' اب تم کس ناتے سے یہاں بیٹھے ہو۔" فرح غصے سے دہاڑتی ہوئی آئی اور چلا کر بولی۔

"تمیز سے بات کر ذلیل عورت۔" وہ غرایا۔

"ایک لفظ بھی زبان سے اگر نکالا تو زبان کھینچ لوں گی۔ چلو نکلو یہاں سے اور دفان ہو جاؤ' تم میں اور اشرف میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے' دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔

عبیر نے فرح کو اس طرح غصے میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بھائی کو اشارہ کرتے ہوئے اٹیچیاں اٹھاتے ہوئے باہر کی جانب مڑی۔ اقبال بھی بیگ سنبھالتا ہوا باہر کو لپکا اور ان کے گیٹ کے باہر کھڑا ہوا اشرف چہرے پر مسکراہٹ سجائے جلدی سے اپنے گھر میں داخل ہو گیا کہ کہیں کوئی اسے کن سوئیاں لیتے ہوئے دیکھ نہ لے۔

☆☆☆

"اسے کہتے ہیں قسمت' جب مقدر میں بسنا ہی نہ لکھا ہو تو وہ کیسے بس سکتی تھی۔" فرح کی ماں چپ چاپ چھت کی کڑیاں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"اماں جب اشرف نے طلاق دی تھی تو میں پریشان اور حیران ضرور ہوئی تھی اور بیمار بھی پڑ گئی تھی مگر اقبال سے طلاق لے کر نہ تو مجھے پریشانی ہوئی ہے اور نہ ہی حیرانی۔" فرح اب اپنی ماں کو دلاسا دے رہی تھی۔

اگر بیٹی اجڑ کر گھر آ جائے تو کس ماں کو غم نہیں ہوتا اور فرح کے توسط سے یہ گھاؤ دوسری مرتبہ ان کے سینے میں لگا تھا مگر یہ سب باتیں وہ اپنے لبوں تک بھی نہیں لا سکتی تھیں۔

بہنیں افسردہ سی گھر آئیں اور فرح کو سینے سے لگا کر اپنے غم کا اظہار کرنا چاہا۔

"بس آپا بس...... جو ہونا تھا ہو گیا' اس مرتبہ بھی یہ طمانچہ مجھے اشرف کے توسط سے ہی موصول ہوا مگر اقبال وہ شکی مرد تھا جس کے ساتھ رہ کر کسی بھی بیوی کی زندگی ہمیشہ اجیرن ہی رہا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ جتنا بھی میں نے وقت گزارہ وہ ایسا بالکل نہ تھا کہ جس سے میرے دل کی کلی کھل پاتی۔"

"فرح ایسا سب تیرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔" بڑی آپا سینہ کوبی کرتے ہوئے رندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"آپا ایسا اس لیے ہوا کہ اب اچھے شوہروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے' زیادہ تر شوہر برے ہوتے ہیں یا بہت برے...... میں نے تو اس دفعہ بھی نبھانے کی پوری کوشش کی مگر شک کا ناگ میری زندگی کو نگل گیا۔"

☆☆☆

"آپ ہمیں جھوٹا سمجھتی تھیں' ہمارے بارے میں آپ کا خیال بھی یہی تھا کہ ظالموں میں سے ہیں۔ فرح کے گھر والوں کے بیانات آپ آگے لے کر چلتی تھیں۔

"اب ہم برے تھے تو کیا دوسرے لوگ بھی برے ہی نکلے' فرح کا کسی معاملے میں کوئی قصور ہی نہیں ہے۔" اشرف کی بڑی بہن محلے کے ان گھروں میں جا کر باتیں بنا رہی تھیں جو اشرف کو ہر معاملے میں برا سمجھتے تھے اور فرح کے گن گاتے تھے۔

"اب فرح بیچاری بدنصیب ہے تو کسی کو کیا دوش دینا۔" فرح کی تائی نے ملال بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں بدنصیبی کی بات کرنے نہیں آئی ہوں' میں تو برے چال چلن کا ذکر کرنے آئی ہوں جس کی وجہ سے فرح اس حال کو پہنچی ہے۔" بہن نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

"فرح کا برے چال چلن سے کیا واسطہ؟" (تائی کو حیرت تھی)

"یہ آپ اس کے دوسرے شوہر سے پوچھیے جو چلتے چلتے اسے طلاق دے کر گیا ہے۔ ہمارے ہاں تو کام کا بھی پٹن تھا اور لوگ بھی زیادہ تھے مگر دوسرے گھر میں تو دیکھنے کو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر بات وہی ہے ناں' شریف عورت کو ہر شخص رکھ سکتا ہے مگر بدمعاش کو کوئی نہیں رکھتا۔ اسی لیے تو دوسرا والا بھی اسے چھوڑ کر چلتا بنا۔"

"مگر فرح کہاں سے بری بن گئی' یہ سب بہتان ہے اس پر...... ایسی شریف لڑکی بھلا کسی نے دیکھی ہوگی۔ اب دوسرا شوہر بھی پاگل نکلا تو کیا کہیں۔" تائی کو اشرف کی بہن کی کسی بات پر ذرہ بھر بھی اعتبار نہ تھا۔

"خالہ آپ جیسا سیدھا شاید پورے گاؤں میں کوئی دوسرا نہ ہو' فرح کا شجاع کے ساتھ عاشقانہ تھا۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو' شجاع اپنی بیوی بچوں کے ساتھ خوشی خوشی رہ رہا ہے' اس کا فرح کے ساتھ کیا تعلق؟"

"تعلق ہی تو ہے' جس کی وجہ سے اشرف نے فرح کو چھوڑا اور یہ تعلق جب بعد میں بھی ختم نہ ہوا تو دوسرے نے بھی لات ماردی۔"

"حیرت ہے......؟" تائی اب اپنا سر تھامے منہ کھولے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ دیکھیں خط۔" نگہت نے ایک مڑا تڑا سا خط اپنے پلو سے کھول کر تائی کو دکھایا۔

"ایسے ہی دسیوں خط اشرف بھائی نے پکڑے تھے اور معاف کر دیا تھا مگر فرح جب بھی باز نہیں آئی تو وہ بیچارے کیا کرتے اور اب ایسا ہی سب کچھ کراچی جا کر بھی اس نے کیا...... سنا ہے وہاں تو شجاع اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں فرح سے ملنے بھی آتا تھا' جس سے وہ اپنے دکھڑے رویا کرتی تھی جب ہی تو اس نے اسے اس کے میکے لا کر طلاق دی' اگر وہ کراچی میں دیتا تو فرح وہیں شجاع کے پاس چلی جاتی اور کسی دوسری لڑکی کا گھر برباد کرتی۔"

"ہائے اللہ! میں یہ کیا سن رہی ہوں' اب شریف زادیوں کے ایسے لچھن بھی سننے میں آئیں گے۔" تائی اپنے دونوں گال پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اشرف کی بہنوں کا یہی مقصد تھا کہ ان کی پھیلائی ہوئی باتیں دوسروں کے لبوں سے پھوٹیں' جس میں وہ کامیاب ہو گئی تھیں۔ چند ہی دنوں میں فرح اور شجاع کے افسانے گاؤں کے ہر گھر میں تھے۔ فرح رج کر بدنام

ہوگئی تھی۔

سارا قصور شجاع کے اوپر آ گیا تھا۔ اب لوگ اسے بھی برا بھلا کہہ رہے تھے جس کی وجہ سے فرح کی زندگی تباہ ہوگئی تھی اور اشرف یہ سب دیکھ کر طمانیت سے مسکرا رہا تھا۔ اسے شجاع بھی اچھا نہیں لگتا تھا اب اس پر آئے الزام سن کر اس کو دلی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کی دکان پر آنے والے اشرف سے ہمدردی بھی کرنے لگے تھے اور جو لوگ یہ سب معاملہ سن کر از خود چپ تھے انہیں بولنے پر اشرف اکسایا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اب شجاع اور فرح کی کہانی پورے گاؤں میں ٹاپ پر تھی۔

حکیم جی کے گھر یہ باتیں ضرب ہوتی ہوئی آئیں تو ان کی بیگم فوراً ہی عظمت بیگم کے ہاں پہنچیں۔ عظمت بیگم تمام باتوں سے بے خبر تھیں۔ فرحت بھی ان دنوں اپنی سسرال والوں کے ساتھ کسی شادی میں فیصل آباد گئی ہوئی تھی۔ اس کے طفیل جو ایک آدھ خیر خبر انہیں مل جاتی تھی ان دنوں وہ اس سے بھی محروم تھیں۔

''عظمت تم نے اپنے شجاع کی شادی خواہ مخواہ شہر میں کی' اگر یہیں کر دیتیں تو اپنا بچہ بھی یہیں رہتا ناں۔'' حکیم جی کی بیگم نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنا اسی کو تو کہتے ہیں ورنہ میرا شجاع تو نگین سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔'' عظمت بیگم نے دال چنتے ہوئے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیا وہ کسی دوسری جگہ شادی کرنا چاہتا تھا؟''

''ہاں......'' عظمت بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا وہ کسی کو پسند کرتا تھا؟''

''ہاں وہ فرح سے شادی کرنا چاہتا تھا' شروع شروع میں تو مجھے بھی وہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔''

''بعد میں وہ بری کیوں لگنے لگی۔'' جرح جاری تھی۔

''اپنی بھتیجی سے شادی کرنے کا جو خیال آ گیا تھا' نگین کے سامنے تو وہ غیر تھی اپنا خون تو نہیں تھا ناں۔''

''شجاع شاید اسی بات پر اڑا ہوگا کہ وہ فرح سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں ہاں وہ خوب اکڑا تھا اور دھونس بھی یہی دی تھی کہ وہ فرح کے سوا کسی دوسری لڑکی سے شادی ہرگز نہیں کرے گا۔''

''کیا اسے فرح بہت پسند تھی؟''

''ہاں بہت پسند کرتا تھا اسے......وہ جب بھی ہمارے ہاں آتی اسے دیکھ کر دیوانہ سا ہو جایا کرتا تھا......وہ......'' عظمت بیگم مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''کیا فرح بھی اپنے شجاع کو پسند کرتی تھی؟''

''اس کا تو مجھے نہیں معلوم۔'' وہ سادگی سے بولیں۔

''پھر بھی کچھ اندازہ تو ہوگا ناں۔'' حکیم جی کی بیگم انہیں بولنے پر اکسا رہی تھیں۔

''ہاں فرح کی بڑی بہن کی یہ شدید خواہش تھی کہ شجاع کی شادی فرح سے ہو' ایسا وہ باتوں ہی باتوں میں شاید فرحت سے کہہ بھی گئی تھی۔''

''اس کے باوجود تم نے بیٹے کی پسند کا خیال نہیں کیا۔''

''بیٹے کی بھی کوئی پسند ہوتی ہے' نگین سے شادی ہوئی تو وہ اس کا عاشق بن بیٹھا ہے' نگین کے سوا اسے کچھ

نظر ہی نہیں آتا۔''

''کیا اسے اب فرح کا خیال نہیں آتا ہوگا کہ وہ کیسے اجڑ کر گھر بیٹھ گئی ہے۔''

''اس کے اپنے ہی بکھیڑے بہت ہیں' کہاں آتا ہوگا خیال اس کا۔'' وہ بے پروائی سے بولیں۔

''کیا تمہیں یہ ملال کبھی نہیں ہوا کہ فرح سے شادی ہو جاتی تو میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر یوں کراچی نہ جاتا۔''

''مجھے تو بہت ہوا اور میں نے شجاع کے لیے انتخاب ہی غلط کیا' مجھے فرح سے ہی شادی کرنی چاہیے تھی شجاع کی۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔

''تو اب کر لو۔'' حکیم جی کی بیگم نے رازدانہ لہجے میں کہا۔

''اب کیسے ہو سکتی ہے' نگین کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے' اسے اب نگین کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے' باہر جاتا ہے تو اسے اس طرح بتاتا ہے جیسے جانے کی اجازت لے رہا ہے۔ باہر سے آتا ہے تو اس کے پاس ایسے لپک کر آتا ہے جیسے برسوں کے بعد آیا ہے۔''

''عظمت تم نے بیٹے کو کراچی بھیج کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب وہ کبھی گاؤں میں آ کر جم کر نہیں رہے گا' یونہی پھیرنے کے لیے ایک آدھ ہفتے سے زیادہ کے لیے نہیں آئے گا۔''

''ہاں اس کا اندازہ تو مجھے بھی ہے۔''

''تو پھر کچھ سوچو ناں کہ وہ یہیں رہے تمہارے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' حکیم جی کی بیوی سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میرے پاس کوئی ایسا جادوئی چراغ تو نہیں ہے کہ جو میں چاہوں وہی بات ہو جائے۔'' عظمت بیگم کھسیا کر ہنستے ہوئے بولیں۔

''مگر میرے پاس ایسا چراغ موجود ہے۔'' حکیم جی کی بیوی نے رازداری سے ان کے کانوں میں کچھ کہا جسے سن کر وہ بے اختیار ہنس دیں اور سادگی سے بولیں۔

''باؤلی ہوئی ہو کیا' نگین چاہے کتنی ہی بری ہو پر ہے تو میری بھتیجی' میں اس کا برا کیوں چاہوں گی......ہیں۔''

☆☆☆

جمال مطالعے کا شوقین تھا' سونے سے قبل جب تک وہ مطالعہ نہ کرتا اسے نیند نہیں آتی تھی یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اسی لیے اس کے بیڈروم میں کتابوں کا بڑا سا شیلف موجود تھا جس میں اس کے پسندیدہ مصنفین کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ روزانہ رات کو وہ ماں یا ربیع سے ضرور بات کیا کرتا تھا چاہے بات کا دورانیہ دو منٹ کا ہی ہوتا مگر جب تک وہ یہ آوازیں اپنے من میں نہ اتار لیتا اسے طمانیت نہیں ہوا کرتی تھی مگر آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر اپنے مطلوبہ نمبر ڈائل کرتے کرتے رک سا گیا تھا۔

ٹی وی وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے دیکھا کرتا تھا مگر آج اس کے بیڈروم کا ٹی وی بھی آف تھا۔ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیپ جس سے وہ اپنے من پسند گیت سنا کرتا تھا آج اسے بھی آن کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا' وہ چاپ چپ ساکت سا اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور پھر لائٹ چلی گئی۔ شاید ہمارے علاقے کی لائٹ غائب ہوئی تھی ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ کس قدر تاریکی ہے' ہر چیز کو نگل لیتی ہے۔

اس نے سوچا۔

ہاں تاریکی بے حد خونخوار سی ہوتی ہے ہر چیز کھا جاتی ہے۔ اچانک ہی اسے یہ اندھیرا برا لگنے لگا' اس کا چاہا کہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔ اپنے اس خیال پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ اس وقت بھلا میں کہا جا سکتا ہوں؟ کہیں بھی نہیں۔ گھر میں جنریٹر موجود تھا مگر اس وقت اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ا سکتا۔ کراچی کے موسم میں قدرے گرمی آ چکی تھی' تھوڑی دیر بعد ہی وہ پسینے میں نہا چکا تھا۔ اس کے کمر باہر کی جانب دو کھڑکیاں تھیں جو اس وقت بند تھیں مگر اس وقت اس میں قطعی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بستر س کر کھڑا ہو پاتا۔ ایک انجانی سی تھکن اس میں در آئی تھی۔ وہ اپنے تئیں پوری کوشش کر رہا تھا کہ دماغ میں تصویر جو دھیرے دھیرے قدم بڑھا کر اس کے دل پر قدم رکھ چکی تھی واپس چلی جائے۔ اپنے تکیے پر اس ادھر ادھر سر پٹخا مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

''جمال تم کیسے ہو؟''

''ٹھیک......!''

''جمال تم مجھے بھول گئے ہو ناں......'' اسے یہ آواز اپنے اندر سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''نہیں......!''

''مگر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''سنو......میں اتنی مصروف رہتی ہوں کہ تمہیں یاد بھی نہیں کر پاتی۔''

''اچھا کرتی ہو۔''

''اور تم بھی ناں......'' وہ اسے کرید رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا بات ہے' آج تمہیں نہ کوئی بات پتا ہے اور نہ معلوم......طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟''

''ہوں......''

''نہ بولو......میں تو چلی۔'' وہ روٹھ سی گئی۔

''سنو......'' وہ جیسے بے خیالی میں بڑبڑایا۔

ایسی آواز جو اس کے سوا کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی مگر اس کے تمام تر دکھ اس کی آواز میں یوں چھپے ہو تھے کہ جیسے وہ بین کر رہا ہو۔

مجھے تم یاد آتی ہو
میری پلکوں پہ جب کوئی حسین سایہ لرزتا ہے
میری آنکھوں پہ جب کوئی دھیرے سے ہاتھ رکھتا ہے
میرے ہونٹوں پہ جب کوئی مدھر نغمہ مچلتا ہے
کسی جانب سے جب کوئی خوشبو کی لہر آتی ہے
کسی کیاری میں جب خوش رنگ کوئی پھول کھلتا ہے
کسی رستے سے جب سج بن کر کوئی گزرتا ہے

کوئی دیوانگی کی حد تلک جب پیار کرتا ہے
مجھے تم یاد آتی ہو
مجھے تم یاد آتی ہو

(خالد شریف)

جمال آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور اسے روشنیوں میں نہائی ہوئی نگین اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اتنے قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں اور عین اسی لمحے لائٹ بھی آ گئی اور اسے یوں لگا کہ لائٹ کے آتے ہی اس کی روشنی اس سے روٹھ گئی ہو۔ تب لڑکھڑاتے قدموں سے وہ بہ مشکل اٹھا' میز پر رکھا پانی کا گلاس اپنے سوکھے لبوں سے لگایا اور غٹاغٹ پی گیا اور پھر اپنا سر تکیے پر یوں ڈال دیا جیسے وہ زندگی سے جنگ لڑتے لڑتے نڈھال سا ہو گیا ہو۔

☆☆☆

نگین اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ شجاع کو اس انداز میں دیکھا تھا کہ وہ غصے میں اس پر بری طرح برس رہا تھا۔ اس وقت شجاع کی حالت اسے کسی جنونی کی سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے گلاس دیوار پر دھائیں سے مار دیا تھا۔ ماربل کی ایش ٹرے ٹی وی اسکرین پر دے ماری تھی' اسکرین کا شیشہ باریک سا ہو کر دور تک بکھر گیا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

''نگین تمہارا باپ بے حد شکی اور تنگ ذہنیت کا ہے۔''

نگین سے ایک لفظ بھی بولا نہیں گیا۔ وہ اس بات پر دل میں شکر کر رہی تھی کہ اس وقت کشور تائی نیچے اپنے ٹیلر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔

شجاع بری طرح چلا رہا تھا' اس کا غصہ کسی صورت کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''تمہارے باپ کی اس طرح کی باتیں کرنے کا مقصد یہی ہے کہ وہ تمہارا ہنستا بستا گھر توڑنا چاہتا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں باپ' جسے اپنے داماد کی عزت تک کرنی نہیں آتی اور جب بولنے پر آتا ہے تو بے مہار سناتا ہے' یہ شیمپو کی بوتلیں کہاں چلی گئیں؟ یہ پرفیوم کی بوتلیں کم کیوں نظر آ رہی ہیں؟ کیا میں انہیں پانی کی جگہ پی گیا تھا جو وہ یوں چیخ کر مجھ پر آ رہا تھا......یا پھر وہ سب کو اپنی طرح بے ایمان سمجھتا ہے۔''

''نہیں شجاع ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نگین نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی اپنے باپ کو اچھی طرح نہیں جانتی ہو۔''

''میں نہیں جانتی......اپنے باپ کو......'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں نہیں جانتیں جب ہی تو تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ تمہارے باپ نے نہ تو کسی کی عزت کی ہے اور نہ ہی کسی سے محبت کی ہے۔''

''تم بہتان رکھ رہے ہو میرے ابا جی پر......'' برداشت کی حد ختم ہو رہی تھی اور اس کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ شجاع اس وقت بالکل جنونی کیفیت کے زیر اثر تھا اور اس کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بات کرتے ہوئے اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

''دیکھ لینا' تمہارا باپ ایک دن تمہارا گھر توڑ کے رہے گا۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ابا جی میرے دشمن ہیں۔''

''ہاں...... ہیں وہ دشمن۔''

''لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''میں پاگل ہوں نہیں مگر تم سب لوگوں نے مجھے پاگل سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ تمہارے باپ کا بھی یہی خیال ہے کہ اس کے جوتے بھی لگا دو تو کچھ نہیں کہے گا۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں کو شہر والے کمتر ہی نہیں بلکہ پاگل بھی سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا خناس ہوتا ہے' کسی کو اپنے ہم سر نہیں سمجھتے۔''

''شجاع تمہارا خیال بالکل غلط ہے' ابو جی بالکل ایسے نہیں ہیں جیسا تم ان کے بارے میں سمجھ رہے ہو۔''

''میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا تمہارے ابو جی ایک غیر متوازن اور ابنارمل شخصیت ہیں' ان کا رویہ اور ان کی محبت سب مصنوعی سا لگتا ہے۔''

''آپ کا سب کے بارے میں منفی رویہ ہوتا ہے اور خاص طور پر میرے گھر والوں کو تو آپ ذلت اور نفرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں' میرے ابا جی نے آپ کے لیے اتنا کیا مگر آپ نے کبھی ان کو عزت نہیں دی۔''

''میں جتنا بے عزت تمہارے باپ کے ہاتھوں ہوا ہوں' اتنا کبھی زندگی بھر نہ ہوا ہوں گا۔ مجھے کبھی کسی نے ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھا اور تمہارے باپ نے مغلظات سنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔''

''اپنے سے بڑوں سے کیا کوئی مقابلہ کیا کرتا ہے۔'' وہ رسان سے بولی اور پانی کا گلاس اس کے آگے رکھا تا کہ اس کا ابلتا ہوا خون ٹھنڈا ہو جائے۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی' نگین سرعت سے فون کی جانب بڑھی۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر بولی ''جی ابا جی......''

شجاع نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر اپنے کانوں سے لگایا...... اس سے قبل کہ وہ فرید احمد کو کچھ کہتا فرید احمد کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ گئی جو غصے میں کہہ رہے تھے۔

''وہ الو کا پٹھا ابھی گھر پہنچا یا نہیں؟''

''پہنچ گیا ہے گھر۔'' شجاع نے دہاڑتے ہوئے کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

نگین پھر کسی پتے کی طرح لرزنے لگی ''یہ ہوتی ہے عزت تمہارے گھر میں داماد کی' گالیوں سے مخاطب کیا جاتا ہے۔''

نگین نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں بکواس نہیں کر رہا' تمہارا باپ کمینہ تھا اور کمینہ ہے۔'' وہ دہاڑا۔

وہ چپ رہی۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔'' اس نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

نگین بدستور خاموش تھی۔

''تم کیوں اپنے باپ کو برا کہو گی' تم تو مجھے غلط سمجھتی ہو ناں تو جاؤ اپنے باپ کے پاس چلی جاؤ۔ نگین میں تمہیں طلاق دیتا ہوں' میں تمہیں طلاق دیتا ہوں' ہاں میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔'' اسی لمحے کشور تائی ٹیلر سے اپنے کپڑے لے کر گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں سے کپڑوں کا تھیلا نیچے گر گیا اور وہ چیختی ہوئی شجاع کی طرف لپکیں۔

''ارے بدبخت یہ تو نے کیا کر دیا۔ اپنے ہنستے بستے گھر کو خود ہی آگ لگا دی۔ بیوی سے لڑتے ہوئے کیا ایسے برے لفظ نکالے جاتے ہیں جو تو نے نکالے۔ غصے میں ایسا آگ ہوا کہ سب کچھ خاک کر کے رکھ دیا۔''

نگین پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' اس کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا ا صدمے کے باعث اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔

شجاع صدمے اور غصے کے ملے جلے اثرات کے تحت ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر پھر نگین یکھا' اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پیروں میں میخیں ٹھونک دی ہوں وہ اسی انداز میں کھڑی تھی۔

کشور تائی چھوٹے بچے کو گود میں لیے بری طرح سسک رہی تھیں اور پھر وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''انکار کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہو گی۔'' اشرف نے ہنس کر کہا۔

''احسان علیحدہ ہو گا۔'' بڑی آپا نے بھی قہقہہ لگایا۔

''سچی بات تو یہ ہے اس جیسی مشین کی سی تیزی والی لڑکی کی ہماری گھر میں ضرورت بھی ہے۔ اب جو ہر وقت ے گھر میں کام کا پٹن رہتا ہے اس کے آجانے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ پہلے تو پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب یاں بنیں' کب سالن پکا اور کب سب کے کپڑے دھل گئے۔'' اماں نے خوب سوچ بچار کے بعد کہا۔

''میں تو خوب چمک چمک کے کپڑے پہن کر جاؤں گی اپنے اشرف کی برات میں۔'' نانی نے پاس رکھی الی بجاتے ہوئے کہا۔

''نانی کیا گانا نہیں گاؤ گی؟'' چھوٹی بہنیں ہنسیں۔

''وہ تو میں مہندی کے دن ایسا گاؤں گی کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔''

''خدا کے لیے مت گانا ورنہ الٹا تماشا بن جائے گا تمہارا۔'' اماں نے لتاڑا۔

''ارے واہ...... میرے نواسے کی شادی ہو گی تو کیا میں خوش بھی نہ ہوں گی۔'' وہ برا سا مان گئیں۔

''اور اگر ان لوگوں نے منع کر دیا پھر......'' چھوٹی بہن نے سوچتے ہوئے کہا۔

''فرح پورے گاؤں میں رج کر بدنام ہوئی ہے' اب سب ہی اس کو قصوروار سمجھتے ہیں اگر دوسرا شوہر میری ں میں نہ آتا تو میں ہی مجرم بنا رہتا۔''

''حلالے کی شرط بھی پوری ہو چکی ہے اور عدت بھی ختم ہونے والی ہے۔'' اماں اپنے گھر میں سر جوڑے ا ے کر رہی تھیں۔

''مجھے بس یہی بات کھٹک رہی ہے کہ کہیں وہ بے وقوفی میں آکر انکار نہ کر دیں۔''

''پاگل ہوں گے جو انکار کریں گے' فرح کو اب پوچھے گا کون؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے بچے کی ولی ہی سہی مگر ٹانگ تو لگ گئی ہے اب کوئی وہ معذور تھوڑی نظر آتا ہے۔ ماشاء اللہ پہلے کی طرح چلتا پھرتا پتلون قمیص پہن کر جب جاتا ہے تو بابو جی سا لگتا ہے۔''

''ہمارا بھائی تو بہت گبرو سا ہے...... فرح کا دوسرا مرد دیکھا تھا سوکھا لمبا بانس سا...... دیکھ کر وحشت ہو رہی ا دل چاہ رہا تھا اس کو کسی درخت کی اونچی سی شاخ پر بٹھا دو۔'' بڑی بہن نے تمسخر آمیز قہقہہ لگا کر کہا۔

''پھر کب جاؤ گی رشتہ مانگنے' کب سے ڈھول رکھیں ہم اپنے گھر۔'' نانی کو دیگر باتوں سے وحشت ہو رہی ان کا دل چاہ رہا تھا سوائے اشرف کی شادی کے کوئی دوسری بات درمیان میں نہ آئے۔

''بعہ کو جاؤں گی میں فرح کی اماں کے پاس' پڑوسن بتا رہی تھی بدھ کو فرح کی عدت بھی پوری ہو رہی ہے۔''

''ٹھائی' پان تو ساتھ لے کر جاؤ گی ناں۔''

''ہاں وہ تو لازمی لے کر جاؤں گی۔''

''اماں اگر انہوں نے رشتہ لوٹا دیا تو مٹھائی کے ڈبے کا نقصان نہ کروا دینا' دیسی گھی کی بنی ہوئی۔ اتنی سستی نہیں ملتی۔''

''پاگل ہوگئی ہے کیا' یا مجھے اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے تم نے' میں مٹھائی اور پان اپنے تھیلے میں ڈال جاؤں گی اگر وہ میری بات سن کر خوش ہوئیں اور چہرے مہرے سے آمادگی ظاہر کی تو ڈبا نکالوں گی ورنہ واپس لے آؤں گی۔'' اماں نے توقف بھرے چہرے کے ساتھ کہا تو اشرف بے اختیار ہنس پڑا۔

☆☆☆

اشرف کی اماں نے گھر کا دروازہ بجایا تو فرح نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ نماز پڑھ کر ابھی اٹھی تھی' اس دوپٹا اچھی طرح منڈھا ہوا تھا۔

''اماں ہیں تمہاری؟'' وہ چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولیں۔

''آپ کس لیے آئی ہیں؟'' اس نے کڑے تیور سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یونہی تمہاری اماں کی خیریت پوچھنے۔'' وہ بلاوجہ ہنس دیں...... کھی...... کھی...... کھی۔

''اماں ٹھیک ہیں۔'' وہ ان کے سامنے ڈھال بنی کھڑی تھی جیسے وہ انہیں گھر میں داخل نہیں ہونے دے گی

''فرح کون آیا ہے......؟'' اس کی آواز اندر گئی تو اماں خود ہی باہر نکل آئیں۔

''ارے بہن تمہاری بیٹی تو ایسے پوچھ گچھ کر رہی ہے جیسے جانتی ہی نہ ہو۔''

''آیئے......'' فرح کی ماں نے مروت میں انہیں وہیں آنگن میں بچھے تخت پر بٹھالیا۔

''میں تو تمہاری خیریت پوچھنے آئی تھی۔'' اشرف کی اماں نے اوپر کا برقعہ کھسکا کر سر پر دوپٹا لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا ہونا تھا میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''فرح کی عدت پوری ہوگئی ناں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اب اگر کوئی اچھا رشتہ آئے تو اسے اپنے گھر بار کی کر دینا۔'' انہوں نے اپنے تئیں بات از خود شروع کر ہوئے کہا۔

فرح کی ماں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی خاموشی کو انہوں نے رضامندی سے تعبیر کیا ہنس کر دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''ارے بہن پرانے شکوے شکایات کو بھول جاؤ یوں بھی باہر کے لوگوں نے سب سے زیادہ مزہ لیا۔ ہمارے آپس کے تعلقات خراب کرائے ہیں حالانکہ پڑوس کا حق اپنے دوسرے پڑوس پر سب سے زیادہ ہے' یہی سوچ کر میں پھر اپنے اشرف کے لیے تمہارے گھر چلی آئی۔''

''جی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' فرح کی ماں نے چونک کر انہیں یوں دیکھا جیسے وہ کوئی انہونی بات کہہ رہی ہوں۔

''ارے یہی تو کہہ رہی ہوں کہ میری فرح کو پھر سے مجھے دے دو' ہماری تھی ناں دوسرے کے گھر میں بس سکتی تھی' جب ہی تو وہاں سے آگئی اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ پھر سے میری بہو بن جائے۔'' انہوں تھیلے میں سے مٹھائی کا ڈبا نکال کر فرح کی ماں کو توقف سے تھمایا اور پھر تھیلے میں سے ٹٹول کر ایک چھٹانک

ن نکال کر انہیں دیے۔

فرح کی ماں ہکا بکا سی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

فرح جو کسی کام سے اپنے کمرے میں گئی تھی اشرف کی ماں کے ہنسنے پر باہر آئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی' مٹھائی کا ڈبا اور پان میز پر رکھ کر اشرف کی ماں فخر سے مسکرا رہی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے اشرف کی ماں سے براہ راست پوچھا۔

''وہی جو دنیا میں ہوتا ہے میں نے بھی کرلیا' بھئی لڑکی کا رشتہ لانے کا طریقہ یہی ہوتا ہے ناں۔ ہاں جب انہیں رسم کرنے آئیں گی تو تمہارا جوڑا لے کر آؤں گی۔''

''اپنے رسم و رواج کہیں اور جا کر پورے کیجیے گا' یہ ڈبا اٹھائیں اور اٹھیں یہاں سے...... دروازہ سامنے ہی ہے۔''

''اے لو یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ حیران سی ہو کر بولیں۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے' اپنا ڈبا سنبھالیں اور کسی اور گھر میں اپنی بہو ڈھونڈیں۔''

''میں تو پڑوس کی وجہ سے آگئی تھی۔''

''یہ آپ کی مہربانی ہوگی کہ ہمارے گھر سے چلی جائیں۔'' فرح نے ڈبا خود اٹھا کر ان کے تھیلے میں ڈالتے ئے کہا۔

''یہ تو تم لوگوں نے میری بڑی بھاری بے عزتی کر دی۔'' وہ برقعے کی ڈوریاں کستے ہوئے بولیں۔

''ہم آپ سے کسی بھی قسم کا رابطہ نہیں رکھنا چاہتے' ہلکی اور بھاری بے عزتی کے بارے میں کیا کہہ سکتے تھا۔''

''یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے' وہ بھی بہت اچھا کیا ہے۔'' اشرف کی دکان کے لڑکوں نے خطوط کے ٹو اسٹیٹ کی تمام کہانی ان کے ہاں آ کر بیان کر دی تھی۔ (اماں کا ملال ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا)

''میں تو اب وہ کچھ کروں گی جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں پاؤ گی۔''

''جو دل چاہے آپ میرے بارے میں بیان کریں' اب میرے پاس کچھ بچا ہی نہیں ہے جو میرا نقصان گا۔''

''جب سنو گی لوگوں کی باتیں' تب مزاج ٹھکانے آئیں گے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئیں اور پنے گھر میں جا کر فرح کو ایسی ایسی غلیظ گالیاں دیں کہ محلے والوں کی بھی کھڑکیاں پٹاپٹ کھلنے لگیں۔

''ایسے ایسے لوگ اپنے آپ کو شرفا کہا کرتے ہیں۔'' فرح نے نفرت سے سوچا اور اپنے کمرے کا دروازہ بھی د کرلیا۔

☆☆☆

رور کر اس کا برا حال تھا' کشور تائی اسے سنبھالے ہوئے تھیں مگر نگین کو کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ شجاع نے ے کیسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایسا بھی ہوگا اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''نگین بیٹا تم اپنے باپ کو فون کر کے بتا دو۔'' کشور تائی نے اس سے کہا۔

''تائی اگر ابا جی کو کچھ پتا چلا تو ان کا اسی وقت ہارٹ فیل ہو جائے گا' یوں بھی وہ دو چار روز بعد راولپنڈی کی

چلے جائیں گے' دل کے مریض وہ پہلے ہی ہیں' دل کے تین والو تو ان کے بند ہیں۔''

''بیٹا یہ بات کوئی چھپنے والی تھوڑی ہے۔''

''میں جانتی ہوں یہ بات جلد یا بہ دیر ان کو معلوم ضرور ہوگی مگر میں فی الوقت انہیں کچھ بھی بتانا نہیں چا

''عجیب منطق ہے تمہاری۔'' تائی کو عجیب سا لگ رہا تھا۔

''پلیز تائی آپ میری مدد کیجیے' ابا جی آئیں گے تو بتا دیں گے کہ وہ گاؤں گئے ہوئے ہیں' یوں بھی ابا سے ناراض ہیں اس لیے وہ ہمارے فلیٹ پر نہیں آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے جو تم کہو گی ویسے ہی کریں گے۔''

''وہ ساری رات نگین کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی' کہیں بھی ذرا سا کھٹکا ہوتا اسے یوں لگتا کہ شجاع ہو اور کبھی وہ اپنی آنکھیں مل مل کر حیرانی سے ادھر ادھر دیکھتی جیسے اس نے کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو اور وہ خواب ہی ہو جس کا حقیقت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہو مگر یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے اس کا دل لہولہا تھا۔

☆☆☆

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا کہ اس کی گھگی سی بندھ گئی تھی مگر سامنے بیٹھا ہوا شخص اسے انتہائی نفرت سے دیکھ 'نہ تو اس نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی اسے تسلی اور دلاسے کے کوئی بول بولے تھے۔ تھوڑی بعد اس نے جمال سے کہا'' مجھے کچھ تو بتاؤ اب میں کیا کروں؟''

''تمہارے پاس کچھ کرنے کو رہا ہی نہیں تو میں کیا بتاؤں۔'' وہ شکستہ سی آواز میں بولا۔

''میں نگین اور بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو' اگر ایسی بات ہوتی تو تم اس سے یہ سب نہ کہتے جو تم کہہ چکے۔''

''میں کیا کروں میرے دوست؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''مجھے کوئی مشورہ تو دو میں اپنے بچوں اور بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''شجاع اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں کسی قسم کا مشورہ دینے کا اہل بھی نہیں ہوں' اس فی الوقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

شجاع نے حیرت سے جمال کو دیکھا' اس کی آنکھوں میں بے اعتنائی مجسم تھی' لہجے کی شیرینی یک لخت غا ہو چکی تھی۔ شجاع کو وہ بالکل بدلا ہوا جمال نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو شجاع کو جانتا ہی نہ ہو اور نہ ہی ا جاننے کی کوئی چاہ ہو۔ شجاع چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا غم بانٹے مگر وہ تو اس کو دیکھنے کا بھی روادار نظر نہیں آ رہا تھا۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' شجاع جانے کے لیے اٹھا تو بھی اس نے اس پر الوداعی نظر نہیں ڈالی اور نہ ہی ا آگے بڑھ کر رخصت کیا۔

اگلی شام شجاع اپنے دو دوستوں کے ساتھ فلیٹ پر موجود تھا اور بضد تھا کہ اس نے نگین طلاق نہیں دی۔ میں اس نے جہاں ماموں کو برا بھلا کہا وہاں اس کو بھی باتیں سنائیں جس میں اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگ تمہارے باپ نے اپنی روش نہیں بدلی تو میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ تمہارے ا کی کیا حالت ہوگی' جب تم بچے لے کر گھر بیٹھ جاؤ گی۔'' شجاع کے ساتھ اس کے جو دو دوست آئے تھے وہ ہم

اس کے ہمنوا تھے اور یہی کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس سے وہ ہمارے پاس آیا تھا اور اس وقت جو جملے آپ سے کہہ رہا ہے بالکل یہی جملے وہ ہمارے سامنے بھی دہرا رہا تھا۔ اس لیے آپ کا یہ کہنا کہ شجاع نے طلاق دے دی ہے وہ بالکل غلط ہے۔''

نگین ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی اور کچھ نہیں بولی۔ شجاع کے دوست جو اس کے دکان کے ساتھی اور اس سے خاصے فرینک تھے وہ مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

''اللہ کا شکر کہ مسئلہ حل ہو گیا اور بیکار کی دردسری سے مجھے نجات ملی' جاؤ نگین تم اچھی سی چائے بنا کر لاؤ اور اس بات کا کسی سے بھی تذکرہ مت کرنا۔''

نگین چائے بنا کر لائی اور بولی'' شجاع آپ بھی یہ بات جانتے ہیں کہ آپ نے مجھے طلاق دی ہے اور میں بھی یہ بات مانتی ہوں اور ہم لوگ جس فقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس میں مذاق میں بھی طلاق ہو جاتی ہے اور غصے میں بھی ہو جاتی ہے۔ آج کل بہت سارے گھرانے ایسے موجود ہیں جو اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں اور جب علیحدگی کے نتائج سے ڈرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی بات ایسی کر لیتے ہیں کہ جس سے وہ طلاق کی صعوبتوں سے بچے رہیں اور ایسی ہی کوشش تم نے بھی کی ہے۔''

شجاع اس کی بات چپ چاپ سنتا رہا اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا'' نگین مجھے غصے میں ہوش نہیں رہا۔''

''جوش میں ہوش کھو دینا نادانی ہوتی ہے اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ اپنے ہوشوں میں رہنا چاہیے۔''

''مگر میں تمہارے اور بچوں کے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں۔''

''آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن اگر ہم دونوں ساتھ زندگی گزاریں گے تو گنہگار ہوں گے۔''

''کیا تمہارے پاس اس مسئلے کا کوئی دوسرا حل نہیں ہے؟''

''بالکل ہے' آپ کشور تائی کا باہر والا کمرا لے لیں' بچے آپ کے پاس ہر وقت رہیں گے...... یوں آپ کی بچوں سے علیحدگی نہیں ہوگی۔''

''اور تم کیا کرو گی؟''

''میں اپنی عدت کے دن پورے کروں گی اور فلیٹ کے اندرونی کمروں میں رہوں گی' ابا جی اور امی تو آج یا کل راولپنڈی جا رہے ہیں' انہیں بھی یہ معلوم نہیں ہو پائے گا کہ میرے ساتھ کیا قیامت بیت گئی ہے۔''

''اور اس کے بعد کیا کرو گی؟''

''اپنے بچے پالوں گی اور کیا کروں گی۔'' وہ اپنے آنسو اپنے اندر اتارتی ہوئی بولی۔

''نگین میں ساری زندگی اسی فلیٹ کے باہر کے کمرے میں گزار دوں گا مگر تمہیں اور بچوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

''دیکھا جائے گا مگر اب آپ اپنا سامان باہر کے کمرے میں لگا دیں۔''

''کشور تائی نے سنا' پہلے تو انہوں نے اعتراض کیا اور پھر اس شرط پر ہامی بھر لی کہ شجاع اندرونی حصے میں اپنی شکل بھی نہیں دکھائے گا' اس کی حیثیت ایک ایسے غیر شخص کی سی ہوگی جس کی نظر بھی نگین پر نہ پڑے۔''

''مجھے یہ سب منظور ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔

اور کشور تائی ان دونوں کو یوں رنجیدہ اور دل شکستہ دیکھ کر خود بھی رونے لگیں۔

☆☆☆

سمجھتی کیا ہے وہ اپنے آپ کو...... ؟ پورا گاؤں اس پر تھو تھو کر رہا ہے' عزت کون کر رہا ہے اس کی اگر ہم پوچھ لیا تو یہ ہماری مہربانی تھی کہ ہم اس کے دکھ کم کرنا چاہتے تھے۔" بڑی آپا مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔

اشرف کی اماں وہاں سے بے عزت لوٹی تھیں تو مسلسل گھر والوں کو کڑوی کسیلی سنا رہی تھیں جن کی وجہ فرح کے گھر گئیں اور یوں بے عزت لوٹ کر آئیں۔

"اب اس بدذات کی ہمت تو دیکھو کہ ڈبا تھیلے میں ڈال کر بولی' یہ سامنے دروازہ ہے اب ہم آپ سے کا رابطہ نہیں رکھنا چاہتے۔"

"دیکھ لینا خون تھوک کر مرے گی اور کوئی پانی ڈالنے والا نہیں ہوگا' رسی جل گئی مگر بل ابھی تک نہیں نکلے۔" اماں چونا چاٹ کر بدستور اسی کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔

"دفع کریں اماں اس کم بخت کو...... اگر قسمت والی ہوتی تو وہ ہمارے گھر سے ہی کیوں جاتی۔ کون سا ظلم تھا جو اس نے ہمارے گھر نہ کیا...... گاؤں میں رہ کر اتنی آزادیاں بھی حاصل کر لیں کہ ٹی وی اور اخباروں تک میں آ گئی اور ہمیشہ یہی رونا روتی رہی کہ اشرف کے گھر والوں نے بڑے ظلم کیے۔ ساری زندگی اس کی خوار کر دی۔" بڑی آپا غصے سے کہہ رہی تھیں۔

"زندگی تو خوار دیکھنا اب ہوگی اس کی جب عزیز و اقارب اسے خوشی و غمی پر نہیں پوچھیں گے' سہاگنیں اس سے دور بھاگیں گی کہ اس کا سایہ ان پر نہ پڑے۔"

"ہاں ایسا ہی ہوگا جب ہی میرے دل پر ٹھنڈ پڑے گی۔ اس منحوس کی اتنی ہمت کہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات کی اور دروازہ دکھایا۔" اماں کو ابھی تک وہ منظر نہیں بھول رہا تھا۔

"اماں اب میرے لیے جو لڑکی دیکھو وہ ہر لحاظ سے فرح سے اچھی ہو' شکل میں بھی' تعلیم میں بھی اور جہیز لانے میں بھی۔" اشرف اترا کر بولا۔

"مگر پورے خاندان کو تو یہ بات پتا ہے کہ تو لنگڑا ہے' ٹانگ تیری مصنوعی ہے۔" نانی نے تمباکو کا پھانکا مارتے ہوئے کہا۔

"نانی تم ہر معاملے میں کیوں بولتی ہو' جس بات سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہو' تم جانتی نہ ہو اس معاملے میں کیوں کودا کرتی ہو۔" اشرف نے غصے سے کہا۔

"ایل لو...... ہمارے سامنے کوئی بات ہوگی تو پوچھیں گے بھی نہیں۔"

"میں اس وقت آپ سے تو بات نہیں کر رہا تھا۔"

"ارے پاگل بات تیری شادی کی ہوگی تو کیا میں چپ رہوں گی...... اور میں چپ رہوں گی تو تیری شادی کے گیت کون گائے گا؟"

"اماں چپ ہو کر بیٹھو یہ ہر وقت کی ٹرٹر اچھی نہیں ہوتی۔" اشرف کی ماں نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"ہاں اماں...... میں کہہ رہا تھا کہ اب کوئی اچھی سی لڑکی دیکھو' فرح کے بارے میں تو ہم اس لیے سوچ رہے تھے کہ پڑوس کی لڑکی ہے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم ہے لیکن اگر وہ پڑوسیوں کے حقوق سے بے بہرہ ہے تو ہمیں بھی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے دکھوں کو کم کرنے کی کوشش کریں۔" اشرف کے لہجے میں فخر کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"جیوے میرا بھائی' گلی گلی پر جائی۔" بڑی آپا نے تمسخر کے ساتھ ہنس کر کہا تو نانی بھی اپنے پوپلے منہ سے

ساتھ ہنس دیں۔

☆☆☆

فہمی کی بچی کی سالگرہ تھی' وہ اور فہد بطور خاص کہنے آئے تھے۔

"باجی میں ضرور آتی مگر میری کمر کا مہرہ کھسک گیا' چلنے پھرنے میں سخت تکلیف ہو رہی ہے' ڈاکٹروں نے بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔"

"ارے تمہاری طبیعت اتنی خراب ہے اور تم نے نہ مجھے بتایا اور نہ امی کو' اگر امی کو پتا چل جاتا تو وہ کیوں راولپنڈی جاتیں تمہارے پاس ہی رک جاتیں۔"

"باجی کیا ہم لوگ ساری زندگی اپنے والدین کو پریشانیاں اور دکھ ہی دیتے رہیں گے' ہمارے طفیل خوشی کی خبریں تو انہیں کم ہی ملتی ہیں' دکھ ہی دکھ انہیں ملتے ہیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"تم اتنی پژمردہ سی کیوں ہو رہی ہو' کیا ڈاکٹر نے تم سے کچھ اور بھی کہا ہے۔" فہمی اسے اپنے گلے لگائے پوچھ رہی تھی۔

اور اس وقت نگین کو اپنے آنسوؤں کو روکنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔

فہمی نے اس کا چہرہ تھاما اور اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ "میری جان سچ سچ بتانا' تجھے ہوا کیا ہے؟ یہ تیرا چہرہ ہلدی کیوں ہو رہا ہے؟ اور یہ تیری آنکھیں یکدم ہی ایسی بجھ سی کیوں گئی ہیں۔ تو تو مجھے برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی ہے' کیا ہوا تجھے؟ کیا اپنی بہن کو بھی نہیں بتائے گی۔"

"باجی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر میری کمر کی تکلیف صحیح نہ ہوئی تو میں ساری زندگی کے لیے اپاہج ہو سکتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایسی دھواں دھار روئی کہ فہمی کو اس کو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

"توبہ ہے نگین تمہارا دل ایسا چھوٹا تو نہیں تھا جیسے آج ہو رہا ہے۔ تم تو مجھے اور امی کو حوصلے دیا کرتی تھیں اور آج خود حوصلہ ہاری بیٹھی ہو' کہاں ہیں شجاع بھائی میں ان سے کہتی ہوں کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔"

"وہ اسی سلسلے میں گئے ہوئے ہیں اور میں کئی ڈاکٹرز کو دکھا بھی چکی ہوں مگر سب نے ہی احتیاط کرنے کو کہا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو تم واقعی مت آنا......" فہمی اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"تمہارا کیک اور سالگرہ کا کھانا میں شام کو ہی بھجوا دوں گی۔" فہمی نے مسکرا کر کہا۔

"اور میں نے گڑیا کا تحفہ پہلے ہی پیک کر رکھا ہے کہ مجھے اس کی سالگرہ کا دن یاد تھا۔" نگین نے الماری پر رکھے ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"باجی پلیز یہ آپ خود اتار لیں' میں کھڑے ہو کر اتاروں گی تو کوئی جھٹکا نہ لگ جائے۔" نگین اپنی جانب سے ہر وہ بات کہہ رہی تھی جس سے فہمی کو یقین آ جائے کہ وہ واقعی بیمار ہے۔

"کشور تائی سپاٹ سا چہرہ لیے اس کی باتیں سن رہی تھیں مگر ان کا دل اس کے لیے دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

رات گئے جب شجاع سونے کے لیے باہر کے کمرے میں آیا تو کشور تائی نے اسے فہد اور فہمی کے آنے کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ نگین نے سالگرہ میں نہ جانے کے لیے کمر کی تکلیف کا بہانہ بنایا ہے۔" شجاع یہ سن کر مغموم سا ہو گیا اور چپ چاپ یوں لیٹ گیا جیسے برسوں کا مریض ہو۔

☆☆☆

فرحت شادی میں شرکت کر کے گھر آئی تو اسے ہر روز فرح کے بارے میں باتیں سننے کو ملا کرتیں۔

''اللہ فرح نہ ہوئی کوئی رنگا رنگ اخبار ہو گئی جیسے اس کے علاوہ پورے گاؤں میں کوئی خبر ہی نہ رہی ہو۔ اس کی دوسری شادی ختم ہو گئی تھی یہ واقعی افسوس کا مقام تھا مگر شادی ختم ہونے کی جو وجوہات بتائی جا رہی تھیں وہ ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ شجاع کو فرح پسند تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا یہ بات تو کسی حد تک صحیح تھی مگر اشرف سے شادی کے بعد اس نے شجاع کے منہ سے سوائے نگین کے کوئی دوسرا نام تک نہیں سنا تھا اور یہاں گاؤں میں ایسی ایسی کہانیاں نشر ہو رہی تھیں جن کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر۔

فرحت ماں کے پاس آئی تو اس نے انہیں بھی یہ باتیں بتائیں تو عظمت تلخی سے بولیں۔

''اب لوگوں کے پاس شاید بہت زیادہ وقت آ گیا ہے کہ کسی کو بدنام کرنے کے لیے اپنی پوری توانائیاں خرچ کر دیتے ہیں اور جب حکیم جی کی بیگم فرحت کے سامنے آئیں اور فرح کے حوالے سے الٹی سیدھی خبریں سنائیں تو فرحت نے انہیں بھی اچھا خاصا لتاڑ دیا۔

''خالہ آپ تو خود بیٹیوں والی ہیں پھر کیوں کسی کی بیٹی کے اوپر ایسے الزام دھر رہی ہیں۔''

''ارے بٹیا میں کیا' یہ تو پورا گاؤں کہہ رہا ہے۔''

''اس کے باوجود اشرف کی ماں نے دوبارہ اشرف کا رشتہ دینے کی کوشش کی' جب وہ اتنی بری ہے تو اشرف کو کیوں نیکی کمانے کا خیال آ گیا' ساری زندگی اس میں کیڑے ڈالتے رہے پھر وہ ایکا ایکی اتنی اچھی ہو گئی کہ ان کی اماں اس کا رشتہ مانگنے چلی گئیں اور جب وہ وہاں سے دھتکاری گئیں تو پھر از سر نو اس میں کیڑے ڈالنے شروع ہو گئیں۔

''مگر اس معاملے میں تو تمہارے بھائی کا نام بھی آ رہا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے' پیٹھ پیچھے جو دل چاہے کہہ لو' اگر اشرف میں ہمت ہے تو شجاع بھائی کے سامنے کہے کہ فرح کی شادی کے بعد ان دونوں کے مابین کوئی ناتا رہا ہے۔''

''اب ہمیں کیا پتا' جو لوگوں سے سنا تھا وہی تمہیں بھی بتا دیا' تمہیں اچھا نہیں لگا تو اپنے الفاظ واپس لے لیتے ہیں۔'' حکیم جی کی بیگم صلح جو طبیعت کی تھیں' یوں بھی جس گھرانے میں روزانہ کا آنا جانا ہو وہاں طبیعت میں حلیمی رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

فرحت نے حکیم جی کی بیگم کو تو باتیں سنا دی تھیں مگر ہر ایک کا منہ بند کرنا خاصا مشکل تھا۔ اس کی شادی شدہ نندوں نے جب آ کر اس سے کہا۔

''بھابی جی آپ کے بھائی تو کراچی میں سکون سے رہ رہے ہیں' برباد تو صرف فرح ہوئی ہے اگر انہیں فرح اتنی پسند تھی تو انہوں نے فرح سے شادی کیوں نہیں کی؟''

''میرا بھائی اپنی بیوی کے ساتھ محبت اور سکون کے ساتھ رہ رہا ہے اگر اسے اپنی بیوی پسند نہ ہوتی یا اس کے دل میں فرح کا عشق ایسا گہرا ہوتا تو وہ اس سے شادی بھی کر لیتا تو کوئی بری بات نہ ہوتی مگر وہ تو اس سارے معاملے میں بے قصور ہے تو وہ بیچارہ کیا کرے۔''

تب اس کی نندیں آپس میں کہنی مارتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں بولیں۔ ''اب ایسا بھی نہیں ہے کہ شجاع کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو۔''

فرحت ان کے سامنے سے ہٹی تو وہ فرحت کا مذاق اڑاتے ہوئے باہم بولیں۔ ''لگتا ہے بھابی جی کو اپنے بھائی کے کرتوت اچھی طرح پتا ہی نہیں ہیں۔''

''ہاں شاید انہوں نے وہ خط بھی نہیں پڑھے جواب اشرف بطور پڑیوں کے استعمال کر رہا ہے' اب کوئی خود ہی اندھا بن رہا ہے تو ہمیں کیا۔''

''ہاں بھئی ہماری بلا سے شجاع کراچی میں اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ خوشیوں کا سفر کرتا رہے مگر دیکھنا فرح کی آہیں اسے لگیں گی ضرور۔'' چھوٹی نند نے سرگوشی سے کہا۔

''ارے اب نہیں لگتیں کسی کی آہیں' اب کرتا کوئی ہے اور بھرتا کوئی ہے۔'' وہ ایک آواز میں کہہ رہی تھیں اور باہم ہنسی ٹھٹھول بھی کر رہی تھیں اور فرحت اندر کمرے میں کھڑی ان کی باتیں سنتے ہوئے بہ مشکل خون کے سے گھونٹ پی رہی تھی۔

اپنی لاڈلی نندوں کی طبیعت صاف کرنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

☆☆☆

اسے جمال کی عادت کا بھی اندازہ تھا اور مزاج کا بھی' اور اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ نگین کو طلاق دینے کے بعد سے اس نے اس سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر لیا تھا۔

شجاع اسے فون کرتا تو وہ ناگواری سے بات کرتے ہوئے جلد سے جلد بات ختم کر دیتا۔ وہ اس سے ملنے جاتا تو وہ ملازم سے منع کروا دیتا کہ جمال گھر پر نہیں ہے۔ شجاع کو کئی بار یہ احساس ہوا کہ اس نے قصداً اس سے ملنے کو منع کیا ہے۔ وہ ان جگہوں پر جاتا جہاں جمال موجود ہوا کرتا تھا تو وہ اسے وہاں بھی نظر نہیں آیا کرتا۔

''نگین کیا روٹھی سب ہی مجھ سے روٹھ گئے۔'' وہ سوچا کرتا۔

اس نے کئی لوگوں سے مشورہ کیا تھا اور اب وہ جمال سے اس سلسلے میں رائے لینا چاہتا تھا مگر جمال کا اس سے یوں متنفر ہونا اسے خاصا پریشان کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ اور پھر وہ ایک دن ملازم کے منع کرنے کے باوجود اندر گھستا ہی چلا گیا۔ جمال اپنے بیڈ روم میں تھا اور شکل سے بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں اور بڑھی ہوئی شیو نے اس کی حالت عجیب سی بنا رکھی تھی۔

شجاع اس کے پلنگ کی پٹی سے سر رکھ کر رو پڑا اور بولا'' جمال یاؤ میں بہت پریشان ہوں اور اگر تم بھی مجھے چھوڑ دو گے تو میں مر جاؤں گا۔''

''مرنا ہے تو جا کے مر جاؤ مجھ سے کیوں اجازت لے رہے ہو۔'' جمال سفاکی سے بولا۔

''کاش میں مر سکتا مگر میں تو مرنا بھی چاہوں تو نہیں مر سکتا' میری روح تو میرے بچوں اور نگین کے ساتھ ہے۔''

''خبردار! اپنی ناپاک زبان سے اس شریف اور پاکباز عورت کا نام بھی نہ لو جس کو تم نے تباہ کر دیا ہے۔''

''جمال یاؤ میں نے بہت سے لوگوں سے مشورہ کیا ہے' انہوں نے بتایا ہے کہ اگر نگین حلالہ کر لے تو اس سے طلاق کے بعد میں اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہوں' یوں میرے بچے بھی برباد نہیں ہوں گے اور میں بھی نہیں ہوں گا۔''

''شاید تم جیسے جاہل آدمی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ طلاق دینے کی نیت سے نکاح کرنے والا بھی گنہگار ہوتا ہے۔''

''پھر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں' کس سے کہوں؟ نگین بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کا دوبارہ مجھ سے ہی نکاح

ہوتا کہ ہمارے بچے دربدر نہ پھریں۔‘‘

’’کیا کہا...... نگین بھی یہی چاہتی ہے۔‘‘ جمال نے پہلی مرتبہ اس کی بات دل جمعی سے سنی۔

’’ہاں وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’تم سے وہ بہت محبت کرتی ہے۔‘‘

’’ہاں بے حد کرتی ہے‘ ایسی بیوی شاید ہی کسی کو ملے جو مجھے ملی تھی۔‘‘

’’تم یقیناً ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ اس نے کہا۔

’’جمال باؤ...... آپ نے اس شہر میں میری ہر قدم پر مدد کی ہے آخری بار میری یہ مدد اور کر دیں‘ آپ نگین کے ساتھ نکاح کر لیں اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اتنے میں گاؤں کا ایک چکر لگا کر آؤں گا تو آپ اسے طلاق دے دیجیے گا پھر عدت کے بعد میں چپ چاپ خاموشی سے اس سے نکاح کر لوں گا۔‘‘ شجاع کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اسے تو صرف ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی ایسے راستے پر چل رہا ہے جہاں سے ہر طرف اس پر سنگ باری ہو رہی ہو۔

’’یا اللہ میں نے نگین سے محبت کی تھی اس کی یادیں میری تنہائیوں میں کسی خوشبو کی طرح مہکا کرتی تھیں مگر میں نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا کہ میں اس کی زندگی میں صرف ایک جھونکے کی طرح داخل ہوں گا اور پھر دھول بن کر اڑ جاؤں گا۔‘‘

’’پلیز جمال بھائی اگر آپ میری یہ مدد نہیں کر سکتے تو پھر میں طیفے کے بھائی سے کہتا ہوں‘ شاید وہ میری بات مان جائے مگر وہ شادی شدہ ہے‘ ہو سکتا ہے کہ اپنی بیوی کے خوف سے انکار کر دے یا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی خوش ہو کر......‘‘

’’تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔‘‘ جمال اس کی پوری بات سنے بغیر چیخ کر بولا۔

’’پھر میں کیا کروں؟ میں نگین کے بغیر نہیں رہ سکتا۔‘‘

’’میں تمہاری ہیلپ کروں گا۔‘‘

’’کیا...... آپ...... واقعی...... نگین سے نکاح کر لیں گے۔‘‘

’’ہاں......‘‘ اس نے اپنا سر جھکا کر کہا۔

’’اور جب میں گاؤں سے واپس آؤں گا...... تو آپ اسے طلاق دے دیں گے۔‘‘

’’ہاں......‘‘ اس نے اپنا سر مزید جھکا لیا اور اس کے آنسو اس کے پیروں کو بھگونے لگے۔

☆☆☆

جب پریشانیاں آتی ہیں تو ایک ساتھ ہی آتی ہیں‘ پنڈی میں فرید کی گاڑی سامنے آتی ہوئی بس سے ٹکرائی تو اللہ نے فیروزہ اور فرید کی جان تو بچا لی تھی مگر ان کی ہڈیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں۔

فہمی کے پاس جب فون آیا تو وہ نگین کو بتائے بغیر راولپنڈی چلی گئی۔ ’’وہ دونوں گھر آ گئے تھے مگر اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔

’’نگین کیا کہہ رہی تھی‘ اس نے بھی آنے کو کہا ہوگا۔‘‘

’’امی میں نے اسے بتایا ہی نہیں‘ ان دنوں اس کا چکر دوسرا چل رہا ہے۔‘‘ فہمی اصل بات کہنے کے لیے کچھ دیر رکی۔

’’اچھا بچے کا سلسلہ ہے‘ پھر ٹھیک کیا تم نے جو اسے بتایا نہیں‘ ان دنوں اس کو پریشان نہیں ہونا چاہیے ورنہ بچے پر برا اثر پڑے گا۔‘‘

فہمی جو یہ چاہ رہی تھی اس کے کمرے کے بارے میں ماں کو تفصیل سے بتائے گی۔ ماں کے چہرے پر مسکراہٹ سی رقصاں دیکھ کر وہ از خود رک گئی۔

’’جب میں کراچی میں تھی تو اس نے بتایا ہی نہیں‘ کون سا مہینہ چل رہا ہے۔‘‘ وہ فہمی سے پوچھ رہی تھیں۔

’’ابھی تو ابتدا ہے اس لیے اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

’’الٹیاں وغیرہ تو زیادہ نہیں آ رہیں۔‘‘ وہ ایک دم پریشان سی ہو گئیں۔

’’نہیں الٹی تو اسے ایک بھی نہیں آئی۔‘‘ ماں کی پریشانی کو کم کرتے ہوئے وہ بولی۔

’’اچھا تو پھر لڑکا لگ رہا ہے۔‘‘ ارحم کی دفعہ اسے الٹیاں نہیں آئی تھیں۔

’’اچھا یہ تو مجھے نہیں معلوم۔‘‘ ان کی باتیں سن کر فہمی کو ہنسی سی آ گئی۔

پھر ایک شب وہ نگین سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں امی اور خوب ہٹی کٹی سی ہو رہی ہوں ان دنوں۔‘‘

’’یہ تو مجھے فہمی نے بتا دیا ہے ان دنوں فہمی میرے پاس آئی ہوئی ہے۔‘‘

’’اچھا باجی آئی ہوئی ہیں آپ کے پاس۔‘‘ اسے حیرت ہوئی۔

’’ہاں فہد نے بھیجا ہے اسے کہ آب و ہوا تبدیل کر کے آؤ ورنہ یہ فہمی بھی بہت دبلی ہو رہی ہے۔‘‘

’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ارے بیٹا مجھے کیا ہونا ہے میں بھی ٹھیک ہوں اور تمہارے ابو جی بھی اور اب فہمی اور اس کی بچی کے آنے سے گھر میں خوب رونق آ گئی ہے۔‘‘

’’امی آپ کراچی کب آئیں گی؟‘‘

’’دیکھو بیٹا اس مرتبہ شاید زیادہ دیر ہو جائے‘ پنڈی والی شاپ بہت اچھی چل رہی ہے‘ کراچی میں جو نقصان ہوا تھا اس دکان سے پورا ہو گیا ہے۔‘‘

’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔‘‘

’’تم شجاع سے کہنا ماموں کی بات کا برا نہ مانے‘ کچھ دنوں بعد تمہارے ابو وہ شاپ پھر اسی کو دے دیں گے۔‘‘

’’نہیں امی اب انہوں نے کسی دوسری جگہ جاب پکڑی ہے اور وہ اس سے مطمئن بھی ہیں۔‘‘

’’مجھے لگتا ہے وہ برا مان گیا ہے‘ تمہارے باپ بھی تو زبان کے پھوہڑ ہیں‘ جو دل میں ہوتا ہے وہ فوراً ہی زبان پر لے آتے ہیں‘ اب بھلا کوئی اپنے داماد کو ڈانٹا کرتا ہے جو انہوں نے اسے ڈانٹا۔‘‘

’’ہاں امی کسی کو بھی نہیں ڈانٹنا چاہیے اس کے اثرات بہت برے ہوتے ہیں۔‘‘ وہ اپنے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے بولی۔

’’شجاع اپنے ماموں سے ناراض تو نہیں ہے ناں؟‘‘

’’نہیں امی۔‘‘ وہ دھیمے سے لہجے میں بولی ورنہ اس کا تو دل چاہ رہا تھا وہ کہہ دے کہ ذرا سی چنگاری نے اس کا گھر تک پھونک کر رکھ دیا ہے۔

‘‘تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو تم بھی پنڈی کا چکر لگا لو۔’’ انہوں نے کہا۔

‘‘ان دنوں ڈاکٹر نے مجھے بیڈ ریسٹ کرنے کو کہا ہے اس لیے میں سفر نہیں کر سکوں گی۔’’

‘‘ہاں مجھے فہمی نے بتایا تھا مگر خیر یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے' تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو اور خوب کھاؤ پیو جلد طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔’’

‘‘جی اچھا......’’ اس نے غائب دماغی سے کہا۔

‘‘شجاع تو تمہارا خیال رکھتا ہو گا۔’’ انہوں نے پوچھا۔

‘‘ہاں امی بے حد۔’’ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا اور جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اب وہ کیا کہتی کہ اس نے تو میرا ایسا خیال کیا ہے کہ اللہ نہ کرے کبھی کسی بیوی کا شوہر اس کا ایسا خیال رکھے۔ شادی کے وقت یہ احساس بھول کر بھی نہیں آیا تھا کہ چند سالوں کے بعد اس کا ڈبایوں کٹ جائے گا اور وہ اکیلی کی اکیلی رہ جائے گی۔

ننھا ارحم جب باپ سے ضد کرتا کہ وہ اس کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھائیں تو اس کا دل یہ آوازیں سن کر کٹنے لگتا تھا۔

‘‘پاپا آپ اپنے کمرے میں کیوں نہیں سوتے ہیں۔’’ چھوٹا سا بچہ باپ کو باہر کے کمرے میں لیٹا' بیٹھا دیکھ کر حیران سا رہ جاتا تھا۔

باپ کا ہاتھ پکڑ کر جب وہ زبردستی اپنے کمرے میں لاتا تو ایسے میں نگین کشور تائی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ تب ساری ساری رات آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہتے اور وہ چاپ چاپ ایک ہی کروٹ لیٹی رہتی مگر اس کی ہچکیاں لیتا وجود کشور تائی کو بے خبر نہ رکھتا۔

☆☆☆

مسز رحمان کو حیرت کا ایک دھچکا سا لگا جب شیشے کے اس پار انہوں نے نادر کو اپنے ہاتھ سے ثنا کو آئس کریم کھلاتے دیکھا۔

وہ اس وقت ایک شاپنگ مال میں تھیں' کھڑکی سے باہر ان کی نظر سامنے بنے آئس کریم پارلر میں پڑی تو وہ نادر اور ثنا کو ایک ساتھ یوں بے تکلف سا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

وہ گھر آئیں اور بیلا سے پوچھا ‘‘یہ ثنا ابھی تک کیوں نہیں آئی ہے۔’’ تو وہ تمسخر سے ہنس کر بولی۔

‘‘آنٹی' ثنا تو اب اپنی مرضی سے گھر آتی ہے۔’’

‘‘تم نے پوچھا نہیں کہ دیر کیوں ہو جاتی ہے؟’’

‘‘میں کیا' میری بساط کیا جو اس سے ایسے سوالات پوچھ سکوں۔’’

تب مسز رحمٰن نے اس کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا مگر ثنا پر گہری نظر رکھنے لگیں' وہ کب جا رہی ہے اور کب آئے گی اس سے پوچھنے لگیں۔

وہ اپنے بھائی اور اس سے وابستہ تمام کہانیوں سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے انہوں نے سوچا کہ وہ ثنا سے کہیں کہ اس کا میڈیکل پورا ہو گیا ہے اب اپنی ہاؤس جاب اور رزلٹ کا انتظار کراچی جا کر کرے۔

ایک شام ثنا دیر سے گھر میں داخل ہوئی تو مسز رحمٰن کے چہرے پر ناگواری سی پھیل گئی جسے محسوس کر کے بیلا بھی مسکرا دی۔

‘‘ثنا رزلٹ آنے میں تو خاصی دیر ہے اور تمہارے ابو تمہیں یاد کر رہے ہیں' کل رات تمہارے رحمان انکل کے پاس ان کا فون بھی آیا تھا۔’’

‘‘جی آنٹی ...... کراچی تو مجھے جانا ہی ہے۔’’

‘‘تو پھر تم اسی ویک چلی جاؤ' میرا بھی کراچی آنے کا پروگرام ہے۔ تم کراچی پہنچو تو میں بھی وہاں آتی ہوں۔’’ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

‘‘آنٹی کیا آپ کراچی آئیں گی۔’’ ثنا کو تو یہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مسز رحمٰن اس کے لیے اس کے گھر آئیں گی۔

‘‘سچ آنٹی پھر تو بہت مزہ آئے گا' ہم آپ کو کراچی کا چپا چپا دکھائیں گے۔’’

‘‘کراچی میرا دیکھا ہوا ہے مگر میں تو ثریا کے پاس آؤں گی' بہت دن ہو گئے ہیں ان سے ملے ہوئے۔’’

‘‘ٹھیک ہے آنٹی میں فرائی ڈے یا سنڈے کو ہی کراچی چلی جاتی ہوں۔’’

‘‘تم اتنی جلدی کیسے جا سکتی ہو؟’’ بیلا بوکھلا کر بولی۔

‘‘کیوں بھئی وہ اپنے گھر جا رہی ہے اسے وہاں جانے کے لیے کسی قسم کی تیاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟’’ مسز رحمٰن نے اپنی بہو کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

‘‘پھر بھی اپنے گھر والوں کے لیے چھوٹے موٹے گفٹس تو ہر کوئی ہی لیا کرتا ہے' یہ جمعہ تو پانچ دن بعد آ جائے گا۔’’

‘‘گفٹس میں لے جاؤں گی کراچی' ثریا میری بہنوں جیسی ہے اور شاہنواز بھائیوں کی طرح ہیں۔’’ مسز رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب ثنا شرما سی گئی اور سوچنے لگی ‘‘یہ نادر نے اندر ہی اندر اپنی آپا کو منا بھی لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ واقعی بہت شریر ہیں وہ......’’

☆☆☆

بکھرے خواب سمیٹتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے
تمہی کو اب سوچتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے
ہم یہ نہیں کہتے بہت سادہ و معصوم ہے دنیا
تجھ پر اعتبار کرتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے
چارہ گر یہ اداسیاں یہ رتجگے یہ تیری نوازشیں
دل عشق زدہ کو الزام دیتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے
اس کو چاہا' اس کو مانگا پر اقرار نہ کرنا آیا
خود سے لڑتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے
بچھڑ کر بھی اس سے جینا ہے ہمیں دعا
محبت میں غم سہتے رہنا کچھ اچھا لگتا ہے

(دعا احمد)

مغنیہ ٹی وی پر گا رہی تھی اور جمال کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی پتھر اٹھا کر ٹی وی کی اسکرین پر دے مارے۔ ریموٹ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔

”فدا ٹی وی بند کرو۔“ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھنے کے بعد اس نے ملازم کو آواز لگائی۔

”فدا نے آتے ہی ٹی وی بند کر دیا اور متوحش نظروں سے جمال کو دیکھنے لگا جس کے ہاتھ میں ٹی وی ریموٹ موجود تھا اور ٹی وی بند کرنے کے لیے اس نے چیخ کر اسے بلایا تھا۔

”جاؤ یہاں سے' یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ وہ درشت سے لہجے میں بولا۔

فدا نے حیرت سے جمال کو دیکھا' اس انداز میں تو وہ کبھی بھی کسی سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں حلیمی اور شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ وہ پھر دہاڑا۔

فدا نے اسے پھر دیکھا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ یقیناً صاحب آج پریشان ہیں' شاید ان کی طبیعت بھی خراب ہے...... فدا مغموم سا بیٹھا جمال کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

”سب کو ہر چیز اچھی لگتی ہے مگر مجھے کیوں نہیں لگتی۔“ جمال اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بستر پر ڈھے گیا۔

”میرے اللہ میں کیا کروں؟ ایسے امتحانوں سے کیسے گزروں؟ کانٹوں بھری شاہراہ کو کیونکر پار کروں۔“ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا اس کے سر کا درد بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

”خدا نہ کرے کہ کوئی محبتوں کے غم سہے۔“ یکبارگی اس کے منہ سے ایک آہ سی نکل گئی۔

”نگین ایسا تو میں نے بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ تم مجھے مزید دکھ دینے کے اطوار بھی اپنا سکتی ہو۔“ اور پھر وہ

تکیے پر سر پٹختے ہوئے سوچنے لگا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے تم کو تو معلوم بھی نہ ہوگا کہ کوئی تمہارے لیے یوں بیکل بھی ہوا کرتا ہے' تم تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ کوئی تمہیں تم سے زیادہ بھی چاہتا ہوگا اور اس وقت تمہارا یہ دکھ مجھے اپنا دکھ محسوس ہو رہا ہے' میں تمہیں اس منجدھار سے نکال لوں گا۔“

☆☆☆

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح
راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے
جل چکے ہیں میرے خیمے' میرے خوابوں کی طرح

سوچ سوچ کر نگین کا ذہن تھک گیا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ شجاع اس سے بات چیت لکھ کر کیا کرتا تھا اور صبح و شام اس کے دس دس صفحات پڑھ کر اس کا سر گھوم جاتا تھا۔

اب وہ بضد تھا کہ نگین اس کے دوست سے نکاح کر لے دوست کشور تائی کے باہر کے کمرے میں ہی رہے گا اور جب شجاع گاؤں کا ایک چکر لگا کر واپس کراچی آئے گا تو وہ نگین کو طلاق دے گا اور نگین پھر عدت پوری کر کے مجھ سے بہ آسانی نکاح کر سکے گی۔

”میں کوئی چابی کی گڑیا ہوں' جو شجاع چاہے وہی کرتی رہوں۔“ وہ کشور تائی کے سامنے رو پڑی۔

”پھر تم اکیلی کیسے بچے پالو گی؟“

”تائی آپ تو اپنے بچے پالنے کے بعد بھی اکیلی کی اکیلی ہیں ناں' میں بھی رہ لوں گی' سمجھوں گی کہ تقدیر نے میری زندگی میں اکیلا پن ہی لکھا ہوگا۔“

”میں تو اکیلے رہ کر بھی اس تنہائی کی عادی نہ ہو پائی' ہر بچے میں اپنے بچے ڈھونڈتی پھرتی ہوں' بڑھاپے میں بھی کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ تم تو جوان ہو' خوبصورت ہو تمہارے لیے اکیلا رہنا بہت کٹھن ہوگا۔“

”تو آپ کا کیا خیال ہے میں شجاع کے دوست سے نکاح کروں' سیج سجاؤں اور پھر طلاق کا تھپڑ کھاؤں اس کے بعد عدت کے دن پورے کروں۔ خوش نصیب بیویاں تو عدت کے بجائے سہاگن فوت ہو جاتی ہیں۔ وہ عدت کے پہاڑ سے دن نہیں گزارہ کرتیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اس کے سوا کوئی دوسرا حل بھی تو نہیں ہے۔“

”میں اب کسی سے شادی کرنے کی خواہاں نہیں ہوں نہ شجاع سے اور نہ ہی ان کے کسی دوست سے۔“

”کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ بچے اپنے باپ سے ہمیشہ جڑے رہیں۔“

”تائی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں' رشتہ تو میرا ٹوٹا ہے بچوں کا تو نہیں' شجاع بچوں کے باپ ہیں اور رہیں گے چاہے وہ پاس رہیں یا دور اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”پاس اور دور کا بہت فرق ہوتا ہے' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو جاتا ہے۔“

”مگر اب میں شجاع کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا چاہتی' جو شخص اپنی ماں کی توہین کر سکتا ہے' اپنے ماموں کو ذلیل کر سکتا ہے وہ بیوی کا کب ہو کر رہ سکتا ہے۔“

”تمہارے ساتھ تو وہ ہمیشہ اچھا رہا۔ عظمت بیگم کو یہ ملال ہی رہا کہ شجاع زن مرید ہے، نگین کے آگے ماں بہن کو پوچھتا تک نہیں ہے۔“

”مجھے برا بھلا کہنے میں اس نے کبھی کوئی کسر نہیں رکھی مگر میں ہمیشہ صبر کرتی رہی، میری ماں اور باپ کو شجاع نے بے سرو پا سنائیں اور میں شہد کے سے گھونٹ پیتی رہی اور اسے روکا تک نہیں اور جب میری برداشت سے باہر حالت ہوئی اور میں نے اسے روکنا چاہا تو وہ طلاق کے تین نوک دار پتھر مار کر بھی مظلوم بنا بیٹھا ہے۔“

”غلطی تو اس سے ہوئی ہے اور وہ اس کا اعتراف بھی کر رہا ہے۔“ کشور تائی مسلسل شجاع کی طرف داری کر رہی تھیں۔

”غلطی ہوئی ہے تو اب وہ اس کا خمیازہ بھی بھگتے، یہ نوٹنکیوں کی طرح ڈرامے کیوں بنا رہا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے بیٹا تم اس وقت بہت پریشان ہو اس لیے درست فیصلہ نہیں کر پا رہیں۔“

”تائی کیا اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ اپنے باپ کی دکان کے کسی نوکر سے نکاح کر لوں اور بعد میں وہ لن ترانیاں گاتا پھرے کہ فرید صاحب کی بیٹی میری بیوی رہی ہے۔“ یہ کہہ کر نگین بے اختیار رونے لگی۔

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔“ تائی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دے رہی تھیں مگر اس کے آنسو کسی طرح رکنے پر قادر نہیں ہو رہے تھے۔

”کیا میں شجاع کو نہیں جانتی یا اس کے حلقہ احباب سے واقف نہیں ہوں، میں اس کو اور اس کے دوستوں کو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہوں اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ وہ سب کتنے پانی میں ہیں۔“

”نگین تم یہ بھی چاہتی ہو کہ تمہارے والدین کو تمہاری طلاق کی خبر پتا نہ چلے اور شجاع سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتیں۔“

”میں آہستہ آہستہ اصل حقیقت سے سب کو مطلع کر دوں گی کہ یہ چھپنے والی بات بھی نہیں ہے مگر میں یکدم اپنے ابا جی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتی، دو مرتبہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے، میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ میرے اجڑنے کی خبر سن کر اپنے آپ کو ہی مورد الزام ٹھہرا لیں اور برداشت نہ کر سکیں۔“

”تو پھر میں شجاع سے کہہ دوں کہ نگین حلالہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ تائی اس کا حتمی فیصلہ سننے کی خواہش مند تھیں۔

”ہاں کہہ دیں۔“

”تمہیں اپنے اس فیصلے پر افسوس تو نہیں ہوگا۔“

”ہرگز نہیں۔“

”زندگی کے کسی گام پر تمہیں شجاع کی کمی محسوس تو نہیں ہوگی؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے سپاٹ سے چہرے کے ساتھ کہا اور دل میں سوچنے لگی۔ ”میرا شمار تو ان لوگوں میں ہوتا ہے جو زندگی کے سفر میں صرف آگے کی جانب دیکھتے ہیں، پیچھے مڑ کر دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو زبور کی یادیں ہمہ وقت میرے دل میں چٹکیاں سی لیتی رہتیں۔“

”کیا تم زبور اور شجاع کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر رہی ہو؟“ اس کا دل اس سے سوال کر رہا تھا۔

”میری زندگی میں آنے والے یہ دونوں ہی مستقل مزاج نہیں تھے۔ زبور ڈرپوک اور وقت پر خود فیصلہ کرنے والا نہ تھا اور شجاع غصہ ور، جلالی اور اپنی ہر غلط بات کو صحیح سمجھنے والا تھا، غصے میں آگ ہو جاتا تھا جس نے

میری زندگی کو ہی خاک کر دیا۔

☆☆☆

کیا کریں اب تجھ سے ہم ترک تعلق کا گلہ
زہر جب پینا ہی ٹھہرا، ذائقہ جیسا بھی ہو
اپنی قسمت کی لکیروں پر نہیں جب اختیار
فیصلہ تقدیر کا اچھا برا جیسا بھی ہو

”کیا کہہ رہی ہیں تائی آپ؟“ شجاع پریشان سا ہو کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”ہاں بیٹا...... وہ کسی سے بھی نکاح کرنے پر تیار نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔“

”ان دنوں وہ بہت الجھی ہوئی ہے، میرا خیال ہے کچھ عرصے کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

”نہیں تائی مجھ پر تو ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا ہے، اس سے دوری مجھ سے قطعی برداشت نہیں ہو رہی ہے، وہ صرف ایک ماہ کے لیے میرے دوست سے نکاح کر لے پھر وہ اسے طلاق دے دے گا۔“

”وہ طلاق اور عدت کے چکروں سے باہر رہنا چاہتی ہے۔“ تائی اسے سمجھا رہی تھیں۔

”تائی اسے میری اذیت بھری زندگی کا اندازہ کیوں نہیں ہو رہا۔ ان دنوں میں بہت پریشان ہوں، آج بھی میں دو دفعہ بس کے نیچے آتے آتے بچا ہوں۔ میرا سر مسلسل گھوم رہا ہے، مجھے نہ کچھ سجھائی دے رہا ہے اور نہ ہی مجھے کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ نگین سے کیا دوری ہوئی ہے سکون اور طمانیت کے ساتھ ساتھ نیند بھی مجھ سے روٹھ گئی ہے، پورے پانچ مہینے ہو گئے ہیں اور میں پرسکون نیند کے لیے ترس گیا ہوں۔“

”بیٹا طلاق کو اسی لیے تو ناپسندیدہ فعل کہا گیا ہے مگر ہمارے اکثر گھرانوں میں شوہر حضرات خانگی جھگڑوں میں اس کا نام بار بار لیتے ہیں اور اپنی خوشیوں کو خود ہی الاؤ میں جھونک دیتے ہیں۔“

”پلیز تائی، آپ اسے سمجھائیے تو سہی ورنہ میں تو بن موت مارا جاؤں گا۔“

”سچی بات یہ ہے بیٹا کہ نگین اپنے باپ کی دکان کے کسی بھی سیلز مین سے نکاح کی خواہش مند نہیں ہے۔“

”میں نے کب کہا ہے کہ وہ ماموں کی دکان پر ملازم تھا یا ہے۔“

”تم نے یہ تو کہا تھا ناں کہ وہ تمہارا دوست ہے۔“

”ہاں وہ میرا دوست ضرور ہے مگر وہ فرید ماموں کے کاروبار سے کبھی منسلک نہیں رہا ہے۔“

”وہ تمہارے دوستوں کو تو جانتی ہی ہے، فرید کی دکان پر نہیں ہوگا تو کہیں اور رہا ہوگا۔“ تائی اسے بتا رہی تھیں۔

”پلیز تائی آپ اسے سمجھا دیں کہ احمد صاحب بہت اچھے ہیں، اتنے اچھے ہیں کہ مجھ جیسا ان پڑھ ان کی تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو خود نہیں مان رہے تھے مگر جب میں نے ان کی بے حد خوشامد کی ان کے پیر پکڑ کے رویا تو وہ مان گئے۔“

نگین اپنے کمرے میں بیٹھی شجاع کی ایک ایک بات سن رہی تھی اور آنسو قطار بنا کر نکلے چلے جا رہے تھے، اسے کسی بھی کل چین نہیں آ رہا تھا۔

”اے خدایا...... میں کروں تو کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ اس نے اپنا سر سجدے کی صورت

میں ٹکا دیا۔

''اے پاک پروردگار میں نہیں جانتی میرے لیے کیا اچھا ہے کیا برا ہے تو مجھے اپنی نگہبانی میں لے لے۔'' وہ ننگے فرش پر سر ٹکائے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ دعا کر رہی تھی اور آنسو اس تیزی سے بہہ رہے تھے جیسے کوئی پرنالہ بہہ رہا ہو۔

☆☆☆

شمار کیا اس سخاوت کا کریں کہ وہ شخص
چراغ مانگتا پھرتا ہے چھین کر آنکھیں

''ایک بار...... دو بار...... تین بار اس نے نہ جانے کتنی بار سوچا اور پھر فہمی کو فون ملایا۔

''فہمی باجی آپ کراچی کب آئیں گی؟'' آنسو اس کی آواز میں گھلے ہوئے تھے۔

''میری جان تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ یہ سمجھی کہ نگین کی طبیعت شاید کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی ہے۔

''اچھی نہیں ہوں میں۔'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

''کیا کمر کا درد بہت بڑھ گیا ہے؟''

''ہاں بہت...... اتنا کہ اب برداشت بھی نہیں ہو رہا۔ باجی میں آپ سے سچی کہہ رہی ہوں کہ ایسی تکلیف مجھے کبھی نہیں ہوئی۔''

''اچھا...... میں دو چار روز میں آ جاتی ہوں۔'' فہمی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فہمی باجی کیا آپ آج نہیں آ سکتیں؟'' وہ جیسے رو سی دی۔

''کیا بات ہے نگین؟'' فہمی گھبرا سی گئی۔

''بس آپ جلدی سے آ جایئے' میرا دل بہت گھبرا رہا ہے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟''

''ارے نگین تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا' میں سمجھی پتا نہیں کیا ہو گیا ہے' کراچی سے پنڈی آ گئی تو بہن کی یاد آ رہی ہے' کراچی میں ہوتی ہوں تو روز فون بھی نہیں کرتی ہو۔''

''بس آپ جلدی سے آ جائیں' مجھے نہیں معلوم۔'' وہ بے صبری سے بولی کہ کہیں فہمی اپنا پروگرام پھر بڑھا نہ دے۔

''اچھا بابا میں کراچی بہت جلد آ رہی ہوں تم بے فکر رہو' کہو تو ایئرپورٹ سے سیدھی تمہارے پاس آ جاؤں؟''

''ہاں آ جایئے میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے کل انشاء اللہ شام تک ملاقات ہوتی ہے۔''

فرید احمد کے پاس طیفے کا بھائی آ گیا تھا اور فیروزہ کے لیے فیمیل میڈ رکھ دی گئی تھی۔ گھر گرہستی کے کام کاج کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کا بھی خیال رکھ رہے تھے۔

فہمی جب راولپنڈی سے روانہ ہوئی تو فیروزہ نے بطور خاص اسے تاکید کی ''نگین کو اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں فی الحال کچھ پتا نہ چلے' وہ بے حد حساس ہے' خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گی اور یوں بھی ہم لوگ تو اب بہتر ہو رہے ہیں' واکر کی مدد سے چلنا بھی شروع ہو گئے ہیں۔'' اور فہمی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ میں نے نگین کے بارے میں کون سا بتایا ہے کہ اس کی کمر کا مہرہ کھسک گیا ہے۔ دونوں ماں بیٹی ہی ایک دوسرے سے اپنی اپنی حالت چھپا رہی ہیں۔

☆☆☆

''کیسے چھپاؤ گی تم؟'' کشور تائی اس کے پاس بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔

''میرے پاس اب کچھ رہا ہی نہیں جو میں چھپاؤں یا کچھ دکھاؤں۔'' نگین ایک آہ بھر کر بولی۔

''پھر بھی تھوڑی دیر بعد یہاں فہمی پہنچنے والی ہے' کیا تم اس کو بھی کچھ نہیں بتاؤ گی؟''

''تائی اگر میں نے باجی سے کچھ نہ کہا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔''

''ٹھیک ہے تم اسے بتا دو مگر وہ بیچاری بھی بھلا کیا کر سکتی ہے۔'' تائی تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔

''کوئی کچھ نہیں کر سکتا یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں مگر میں کیا کروں مجھے کسی کل چین نہیں آ رہا' میں کروں تو کیا کروں؟''

''اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو' یقیناً تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں ہو سکتا۔''

''تائی...... اب اس زیادہ برا ہو بھی کیا سکتا ہے۔'' اس نے کھسیانے لہجے میں کہا۔

فہمی جب گھر میں داخل ہوئی تو نگین اس وقت بچی کو گود میں لے کر ٹہل رہی تھی۔ گڑیا سونے کے لیے اسی طرح کی ضدیں کرنے کی عادی تھی۔

''ارے تم لیٹنے کے بجائے کھڑی ہو' کمر کا مہرہ کیسے ٹھیک ہو گا جب تک تم بستر پر آرام نہیں کرو گی۔'' ہاتھ کا بیگ پھینک کر وہ اس کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

''باجی میرے تو سارے کے سارے جوڑ ہل گئے ہیں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''مجھے لگتا ہے تمہاری بہت طبیعت خراب ہے' ان چار پانچ مہینوں میں تو تم ہلدی ہو گئی ہو' کمر کا مہرہ ہی تو کھسکا تھا کوئی آفت تو نہیں آئی تھی۔'' بچی کو اس کے بیڈ پر لٹا کر وہ نگین کو زبردستی بستر پر لٹا کر بولی۔

''باجی اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر آفت نہیں بلکہ آفتیں آ چکی ہیں تو پھر؟''

''کیا مطلب ہے؟'' فہمی سراسیمہ سی ہو گئی۔

''مجھے شجاع نے طلاق دے دی۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''طلاق دے دی...... مگر کیوں......؟'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بہن کو دیکھ رہی تھی۔

''دکان کی کسی گڑبڑ پر ابا جی نے انہیں بری طرح ڈانٹا تھا' غصے میں آ کر انہوں نے مجھے طلاق دے دی۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' وہ پریشان سی پوچھ رہی تھی۔

''ابا جی کے پنڈی جانے سے پہلے جب آپ سالگرہ کا بلاوا دینے آئی تھیں ان دنوں میں عدت میں تھی۔''

''مگر تمہاری تو کمر میں تکلیف......'' جملہ ادھورا چھوڑ کر فہمی نے نگین کو دیکھا۔

''کمر میں تو کیا میری تو نس نس میں تکلیف تھی مگر کیا کہتی آپ سے۔''

''پگلی تو اتنے دکھ اٹھاتی رہی اور تو نے بتایا تک نہیں۔'' فہمی نے اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو' ابا جی اور امی کو یہ سب پتا چلے۔''

''پگلی اپنے دکھ اور سکھ گھر والوں سے نہیں کہیں گے تو کس سے کہیں گے' تو نے تو اپنی بہن تک کو اجنبی سمجھا۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

”باجی یہ طلاق کا داغ میرے نصیب میں تھا، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جس سے شجاع مجھ سے ناراض ہوتا۔“

”شجاع کہاں ہے اب؟“

”وہ کشور تائی کے فلیٹ میں باہر والے کمرے میں ہے اور دو چار روز بعد وہ گاؤں جا رہا۔“

”اچھا ہے وہ یہاں سے دفع ہو، میں تو اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔“

”شجاع اپنے کیے پر نہ صرف شرمندہ ہے بلکہ پشیمان بھی بہت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں دوبارہ اس کے ساتھ شادی کر لوں۔“

”پاگل تو نہیں ہو گیا وہ۔“ فہمی کو غصہ ہی آ گیا۔

”آپ میری پوری بات تو سنیے۔“ نگین نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”ہاں اب کیا عزائم ہیں اس کے؟“

”وہ میرا نکاح اپنے دوست احمد صاحب سے کروانا چاہتا ہے۔ ایک آدھ مہینے کے بعد احمد صاحب مجھے طلاق دے دیں گے، تب میں عدت کے بعد اس سے نکاح کر لوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے شجاع سے دوبارہ شادی کرنے کی اور نہ ہی کسی اور سے۔“

”یہی سب میں نے بھی اس سے کہا ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ ہمارے بچے رل جائیں گے، ان بچوں کو کوئی نہیں پال سکتا، نہ کوئی محبت کر سکتا ہے اور نہ پیار۔“

”ان سب باتوں کا خیال اسے پہلے نہیں آیا۔“

”غصے میں اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔“

”دماغ خراب ہے تو پاگل خانے میں جا کر رہے دوسروں کی زندگی کو وبال نہ بنائے۔ خبردار جو اس کی کسی اسکیم پر عمل کیا ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا کہ مجھے نہ تو کسی کے ساتھ نکاح کرنا ہے اور نہ ہی اس سے طلاق لے کر دوبارہ شجاع سے شادی کرنی ہے۔“

”اگر اباجی کو پتا چلے تو عظمت پھپھو کو بے بھاؤ سنا ڈالیں۔“ فہمی نے غصے سے کہا۔

”باجی ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا، اباجی کو اگر پتا چل گیا تو انہیں ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے، انجائنا کے تین اٹیک پہلے ہی انہیں ہو چکے ہیں، اللہ نہ کرے کہ وہ یہ غم جان پائیں۔“

”نگین یہ چھپنے والی بات تو نہیں ہے...... جلد یا بدیر سب کو ہی پتا چل جائے گا۔“

”یہ بات صرف کشور تائی کو اور اب آپ کو معلوم ہے، نہ میں کسی کو کچھ بتاؤں گی اور نہ ہی شجاع تو پھر کیسے کسی کو کچھ پتا چل سکتا ہے۔“

”نگین تم بھی پاگل ہو گئی ہو، یہ ایک دو دن یا دو چار مہینوں کا مسئلہ نہیں ہے پوری زندگی کا معاملہ ہے...... کب تک اس آگ پر ڈھکن رکھو گی جس نے تمہیں جلا دیا ہے۔ آج بچے چھوٹے ہیں کل بڑے ہوں گے، کیا وہ خود اندازہ نہیں لگا لیں گے کہ ہمارا باپ باہر کے کمرے میں کیوں رہتا ہے، یا ہماری ماں ہمارے باپ سے پردہ کیوں کر رہی ہے، ایسے غلط رویے مت اپناؤ جو بعد کو تمہیں ہی دکھ دیں۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا، اچھا ہوا کہ فہد چار دن کے لیے سکھر گئے ہوئے ہیں جو میں یوں سیدھی تمہارے پاس آ گئی ورنہ یہاں سے گھر جاتی تو فہد میرا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ جاتے کہ میں بہت پریشان ہوں۔“

کشور تائی جو ابھی تک چپ چاپ بیٹھی دونوں بہنوں کی باتیں سن رہی تھیں وہ فہمی سے مخاطب ہو کر بولیں۔

”بیٹا جب تمہیں بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اور نگین بھی کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے تو شجاع کی بات ماننے میں کیا برائی ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے مان لو وہ دل سے پشیمان ہے اور اسے بھی اتنا بڑا دھچکا ملا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا لفظ زبان پر نہیں لائے گا۔“

”مگر تائی میں اس کے دوست سے نکاح نہیں کر سکتی۔“

”اس کے بغیر تو تمہارا نکاح شجاع سے نہیں ہو پائے گا۔“

”میں اس گھر میں کسی اجنبی سے نکاح کر کے رہوں گی تو ساری زندگی اس کا سایہ مجھے چلتا پھرتا نظر آئے گا۔“

”بیٹا ٹھوکر کھانے سے زخم تو لگا کرتا ہے اور یہ تو پھر تقدیر کی ٹھوکر ہے۔“ کشور تائی کا لہجہ بھی گلوگیر سا تھا۔

”کاش مجھے موت آ جائے، رات کو میں اس طرح سوؤں کہ پھر کبھی نہ اٹھوں۔“

”بیٹا ایسا فلموں میں ہوا کرتا ہے حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔“

”ایسا سب مجھے ناممکن سا لگ رہا ہے۔“ وہ چہرے پر آئے بال کیچر میں سمیٹتے ہوئے بولی۔ مستقل رونے سے آنکھیں سوجھ کر انگارہ ہو گئی تھیں۔

”نگین میں ہوں ناں تیرے ساتھ، کچھ سوچ کر فیصلہ کرتی ہوں، اب میں تیرے پاس آ گئی ہوں تو تجھے کچھ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فہمی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

نگین چپ بیٹھی رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کشور تائی ایک پلیٹ میں سالن اور روٹیاں ٹرے میں رکھ کر وہیں بیڈ پر لے آئیں۔

”پہلے تم دونوں کچھ کھا لو، نگین نے تو دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، صبح کی صرف ایک کپ چائے پیے ہوئے ہے۔“

”ان پانچ مہینوں میں ہڈیوں کی مالا بن گئی ہے۔ پہلے اپنا تو خیال کر انشاءاللہ یہ پریشانی بھی اللہ اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔“ فہمی نے اس کے منہ میں نوالہ دیتے ہوئے کہا، تب نوالہ اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔

اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر فہمی بھاگ کر پانی لائی۔ تائی نے منہ میں چینی ڈالی اور کمر پر تھپکی دی تب کہیں جا کر اس کی حالت ٹھکانے آئی۔

”بس باجی میرا پیٹ بھر گیا ہے، میں ایک کپ چائے پیوں گی، اس سے سر کا درد بھی ٹھیک ہو گا۔“

”چائے میں بنا کر لاتی ہوں مگر تم دو چار نوالے زبردستی ہی کھا لو، اگر کھانا بالکل نہیں کھاؤ گی تو اپنے بچوں کو کیسے سنبھالو گی۔“ کشور تائی باورچی خانے میں گئیں تو نگین ایک آہ بھر کر بہن سے بولی۔

”میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“

”نصیب میں یہ دکھ لکھا تھا اس لیے ایسا ہوا۔“

”نہیں باجی یہ بات نہیں ہے۔“ نگین سوچتے ہوئے بولی۔

”پھر کیا بات ہے؟“ فہمی اس کے لہجے پر چونکی سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''شادی سے پہلے میں اپنے والدین کو جل دے کر زبور کے ساتھ گھومتی تھی' اس سے انجانے میں محبت کرنے لگی تھی شاید اسی کی سزا مجھے ملی ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے نگین' اگر زبور تمہاری قسمت میں ہوتا تو اس سے تمہاری ضرور شادی ہوتی۔''

''پھر وہ مجھے ملا کیوں تھا؟''

''لڑکیوں کو قدم قدم پر ایسے ہی لوگ ملا کرتے ہیں مگر کسی سے ملنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اس سے محبت کرنے لگے ہیں' مگر کچی عمر میں پسندیدگی کا مطلب ہی محبت ہوتا ہے جب ہی تو کہتے ہیں اس عمر میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے' کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے دل میں کانٹا چبھا رہے۔''

''مگر میں نے تو شجاع سے سچی محبت کی تھی پھر مجھے اس کا صلا کیوں نہیں ملا؟''

''نگین زندگی کی گاڑی ہمیشہ ہموار سطح پر نہیں چلا کرتی ہے' اونچے نیچے راستے اور پیچیدہ راہیں بھی درمیان میں آتی ہیں۔''

''باجی مجھے تو اس وقت ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی صحرا سے گزر رہی ہوں' ہر طرف ریت ہی ریت ہے جو آنکھوں میں بھی چبھ رہی ہے اور چہرے پر بھی' جو سر کو بھی کاٹ رہی ہے اور جسم کو بھی نوچ رہی ہے۔''

''پیاری بہن غم کی یہ سیاہ رات جلد گزر جائے گی۔'' فہمی اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

''پتا نہیں گزرے گی بھی یا نہیں۔'' وہ یاسیت سے بولی تو فہمی اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔

☆☆☆

یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

''تم کنفرم پاگل ہو' تمہیں گھر میں نہیں پاگل خانے میں رہنا چاہیے' تمہارے شکی پن نے تمہاری زندگی میں زہر گھول رکھا ہے' اب تم یہ جان لو کہ خوشیاں اور تم علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ شاید ایسا بھی ہو کہ تمہارا اچھا وقت گزر چکا ہے اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تمہاری شادی اب کسی اور سے ہو جائے گی تو یہ تمہاری بھول ہے اور نہ ہی مجھ میں اتنا دم خم رہا ہے کہ تمہارے لیے کچھ سوچوں بھی' تم اس قابل بالکل نہیں ہو کہ کسی کے گھر جاؤ یا کسی سے بات چیت کرو۔'' عبیر گھر آ کر اقبال کو بری طرح جھاڑ رہی تھی۔

''جب اشرف نے مجھ سے کہا تھا تو کیا میں یقین نہ کرتا۔''

''ہاں وہ تمہارا چاچا تھا ناں جو تمہیں اس کی بات کا یقین کر لینا چاہیے تھا' جب میں تمہیں سمجھا کر گھر سے لے کر گئی تھی کہ جو بھی بات کرنا مجھ سے پہلے مشورہ کرنا پھر بھی۔''

''خط دیکھو اس میں اوور رائٹنگ صاف نظر آ رہی ہے' تاریخ چینج کی ہوئی آسانی سے نظر آ رہی ہے' سیدھے سادے جملوں میں کمینے جملے فٹ کیے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور تم نے یہ خطوط مجھے دکھائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ مجھے غصے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' اقبال کھسیا کر کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے جب تمہیں نظر نہیں آتا تو کوئی بیساکھی ہاتھ میں پکڑ کر زندگی گزارنا' کالا چشمہ اور سفید چھڑی لے کر نکلا کرو' تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ کسی اچھی لڑکی کی قدر کرتے' میں نے کتنا سمجھایا تھا اس پر اتنی سختی مت

کرنا کہ وہ اپنے حواس کھو دے مگر تم نے تو وہ حرکت کی کہ اب اپنے حواس کھوئے بیٹھے ہو۔''

''پلیز عبیر...... میں نے اپنی دوا کھانی چھوڑ دی تھی' شاید جب ہی میرا دماغ کام نہیں کر پایا۔''

''اقبال تم پاگل اور سنکی تو ہمیشہ سے ہی ہو مگر تم نے کبھی اپنے بارے میں خود فیصلے نہیں کیے تھے' تم ہمیشہ ایک ایک بات مجھ سے پوچھا کرتے تھے تو پھر ایسا کیوں کیا تم نے؟''

''یہ سب اشرف کی وجہ سے ہوا ہے' وہ کبھی کراچی آئے گا تو دیکھنا میں کیسے اس کا سر پھوڑتا ہوں۔''

''ہاں وہ اپنا سر پھٹوانے تمہارے گھر آئے گا ناں۔''

''تو پھر میں اس کے گھر جا کر اس کی مرمت کر دوں گا۔''

''اب تمہیں اس علاقے میں کوئی گھسنے نہیں دے گا' تم یہ بات خواب میں بھی مت سوچو کہ کبھی اس گاؤں میں قدم بھی رکھ سکو گے۔''

''ایک فری کی نوکرانی مل گئی تھی ہمیں جسے ڈانٹ پھٹکار بھی لو تو وہ کچھ نہیں کہتی تھی' ایسی بیویاں اب کہیں نظر نہیں آتیں۔''

''یاد نہیں تمہیں تم اپنی پہلی بیوی کو گالی دیتے تھے تو وہ جواب میں دس گالیاں سناتی تھی' تم نے جب اس پر ہاتھ اٹھایا تھا تو اس کے بھائی تمہارا ہاتھ توڑ گئے تھے اور جب وہ ہمارے گھر سے گئی تھی تو اپنے سامان کے ساتھ تمہارا سامان بھی لے گئی تھی۔''

''لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے تم ڈھونڈو گی تو فرح سے اچھی بھی مل جائے گی۔'' اقبال کھسیا کر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''نہ مجھ میں ہمت ہے اور نہ ہی میرے پاس وقت ہے کہ تم جیسے پاگل کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈوں گی۔''

''پیاری بہن نہیں ہو میری۔'' اقبال خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''میں نے کہہ دیا ناں اب تم اپنی اوقات کے حساب سے رہو' اپنا کام خود کرو' اپنے کپڑے خود دھو' اپنے کمرے کی صفائی خود کرو' کام کرنے کا نہ مجھے شوق ہے اور نہ ہمت۔'' عبیر برا سا منہ بنا کر بولی۔

''چالاک کتنی تھی فرح...... ان لوگوں نے جو ہمیں تحفے دیے تھے وہ والا بیگ اس نے اٹھا کر کھینچ لیا تھا۔''

''کتنے سارے کپڑے تھے ناں ہمارے' پاگل نے دے کر واپس لے لیے جیسے اس نے پہنے ہوں۔'' اقبال ہنس رہا تھا۔

''پاگل تم سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ اپنی ہنستی بستی زندگی خود ہی خوار کر لی۔'' عبیر نے اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے سوچا اور اپنے کمرے میں آ کر ٹی وی آن کر کے پروگرام دیکھنے لگی اور اقبال از خود ہی ہنسنے لگا کہ اس کے سوا کوئی احساس ہی نہیں تھا اس کے پاس۔

☆☆☆

دل سے نکلی اکثر باتیں ایسی ہوتی ہیں
کبھی کہیں ہو رنگ برساتیں ایسی ہوتی ہیں
کبھی کبھی ہم بے موت مر جاتے ہیں
کچھ لوگوں کی ذاتیں ایسی ہوتی ہیں
کبھی کہیں تو درشن دے دو اپنے

ہر جگہ کہاں پیار کی برساتیں ایسی ہوتی ہیں
تنہا ہی رہنا اچھا لگتا ہے اب تو
زندگی میں کچھ ماتیں ایسی ہوتی ہیں
کبھی تو وہ جیت کر خوش ہو مجھ سے
کبھی کبھی تو ہار کی کچھ ماتیں ایسی ہوتی ہیں

ٹی وی پر کوئی پروگرام چل رہا تھا اور فرح کا دل دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں غزل کا ہر شعر سنگ باری کر رہا تھا۔ آج دوسرے گاؤں سے اس کے چند رشتے دار آئے ہوئے تھے اور فرح نے اپنے آپ کو اپنے کمرے تک محدود رکھا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی اور اپنے آنسو اپنے اندر ضبط کر رہی تھی۔ تب ایک رشتے دار خاتون اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہائے فرح تو اب بھی ٹی وی دیکھا کرتی ہے؟“

”کیوں...... مجھے نہیں دیکھنا چاہیے کیا۔“

”ہاں ٹی وی، کیبل، ٹیپ، ریڈیو سب سے پرہیز کرنا چاہیے مطلقہ عورتوں کو۔“

”کیوں ان پر پابندی ہے؟“ اس نے تاسف سے پوچھا۔

”اچھا نہیں لگتا اس سے وہ بگڑ سکتی ہیں ناں شاید اس لیے پابندی ہو گی ان پر۔“ خاتون نے اپنے حساب سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”چاچی جی مطلقہ یا بیوہ عورت اسی معاشرے کا حصہ ہیں، وہ کوئی چھوت نہیں ہیں جن پر لوگ پابندی لگا دیں، کل کو آپ یہ بھی کہہ دیں گی کہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو شادی بیاہ میں بھی نہیں آنا چاہیے۔“

”ارے پاگل میں کیا سب ہی لوگ ایسی عورتوں پر پابندی لگاتے ہیں۔“

”میں نے تو کہیں نہیں دیکھی۔“

”اگر نہیں دیکھی تو اب آنکھیں کھول کر دیکھنا کہ خوشیوں کی تقاریب میں سہاگنوں کو آگے آگے کیا جاتا ہے، مہندی کی رسموں میں سہاگنوں سے رسم کروائی جاتی ہے، بیوہ اور مطلقہ کو تو رسم کی چوکی سے بھی دور رکھا جاتا ہے، اسی کو تو پابندی کہتے ہیں۔“

”نہیں یہ جہالت ہے، یہ زیادتی ہے، یہ دل آزاری ہے۔ لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ فرح نے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

مجھے تھا زعم مگر میں بکھر گیا محسن
وہ ریزہ ریزہ تھا اور اپنے اختیار میں تھا

بے شک وہ اپنے آپ کو از خود تسلی دے رہا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہی دن ہوں گے اور وہی راتیں، نگین ہمہ وقت لبوں پر مسکراہٹ سجائے اس کے احکام کی پیروی کرے گی۔ بچے ماں باپ دونوں کی موجودگی میں ہشاش بشاش رہیں گے مگر دل میں کہیں ایک کانٹا سا ضرور چبھ رہا تھا کہ جو اس نے کیا ہے وہ صحیح نہیں۔ کیا وہ غصے اور جلال کا ہمیشہ کا عادی تھا اور ایسے میں اسے کبھی ہوش نہ رہتا تھا اور اس بے ہوشی کی سزا اسے کیسی گمبھیر ملی تھی، اپنی متاع حیات کو کسی دوسرے کے حوالے کر دینا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ نگین کو وہ بارہا سمجھا

رہا تھا اور وہ اس کی اس بات پر کسی صورت قائل نہیں ہو رہی تھی۔

”شجاع میں تم سے ساری زندگی کی دوری شاید برداشت کر لوں گی مگر میں کسی دوسرے شخص کی قربت چاہے چند دنوں کی ہی کیوں نہ ہو کسی صورت برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“

”تم یہ تو سوچو کہ یہ کڑوی دوا پی کر ہی تم مجھ تک پہنچ سکتی ہو۔“

”شجاع یہ کڑوی دوا نہیں ہے یہ تو ایسا تیزاب ہے جو میرے تن من سب کو خاکستر کر دے گا۔“

تب شجاع اس کا جواب سن کر بے چین سا ہو گیا تھا، سارے لفظ گولے بن کر اس کے حلق میں اٹک گئے تھے۔ ان دونوں کی بات چیت پردے کے پیچھے سے ہوا کرتی تھی مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سب کچھ کہیں کھو سا گیا ہے، کوئی ایسا پردہ ان دونوں کے مابین آ گیا ہے جس نے سب کچھ چھپا دیا ہے اور وہ تہی دامن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود بھی سمجھاتا کہ جو وہ سوچ رہا ہے ایسا ہی ہو گا اور یہ کانٹے اس کی زندگی سے بہت جلد نکل جائیں گے مگر وہ اپنے آپ کو نہ صرف کانٹوں میں گھرا ہوا محسوس کرتا بلکہ ان کی چبھن سے بھی وہ خونم خون ہو رہا تھا۔ میری ہنستی بستی گھر گرہستی کو کس کی نظر لگ گئی وہ از خود اپنا تجزیہ کر رہا تھا۔

”شجاع تو نے کسی کا دل دکھایا ہے یہ اس کی سزا تجھے ملی ہے۔“ اندر سے ایک آواز اسے سنائی دی۔

میں نے کس کا دل دکھایا ہے وہ حیران سا تھا۔ یہ اپنے آپ سے خود پوچھو۔

”کون ہے وہ......؟“ لرزتے لبوں اور پرنم آنکھوں سے وہ بے خود سا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

”اپنی ماں سے تیرا رویہ کبھی اچھا نہیں رہا، غصے میں آ کر تو نے ہمیشہ اپنی ماں کی تذلیل کی ہے، اس بڑھاپے میں تو انہیں چھوڑ کر چلا آیا ہے۔“

”میں نے تو بہت چاہا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہیں مگر وہ مانی ہی نہیں۔“

”اپنی من مانیوں کے سامنے تجھے کبھی کچھ نظر نہیں آیا۔“

”میری ماں مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اس نے مجھے کبھی نہیں کوسا ہو گا۔“

”کوسا تو تجھے فرح نے بھی نہیں جس کی زندگی تو نے ازار کر دی ہے۔“

”فرح کی پریشانیوں سے میرا کیا واسطہ؟“

”تیرا واسطہ ہے تو جا کر دیکھ وہ گاؤں میں اب بھی تیرے نام کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔“

”میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

”پھر جا اور اس سے معافی مانگ۔“ اس کے دل نے صلاح دی۔

”ابھی نہیں مگر میں معافی مانگوں گا ضرور۔“

کل رات فرحت نے فون پر جہاں اس کو ماں کی بیماری کی اطلاع دی تھی وہاں فرح پر لگنے والے الزاموں کی روداد بھی سنائی تھی جس میں اس کا نام نمایاں تھا بلکہ فرح کے برباد ہونے کی اصل وجہ اسی کی ذات سمجھی جا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ذہن مختلف پریشانیوں کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ بہن کی ہر بات وہ چپ چاپ سنتا رہا نہ اسے غصہ آیا اور نہ ہی جلال۔

”شجاع تم گاؤں آ کر اس اشرف کا دماغ ضرور ٹھیک کرنا۔“ فرحت اس سے کہہ رہی تھی۔

”نہیں فرحت لڑنے جھگڑنے کا کبھی فائدہ نہیں ہوا کرتا بلکہ الٹا نقصان ہو جاتا ہے۔“

”اس نے تجھے پورے گاؤں میں جو بدنام کر دیا ہے۔“

”غلطی شاید میری ہی تھی‘ فرح کی جانب میں نے ہی قدم بڑھایا تھا‘ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”شجاع تجھے کیا ہوگیا ہے کیسی باتیں کر رہا ہے؟“

”پتا نہیں فرحت مجھے کیا ہوگیا ہے‘ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”نگین کیسی ہے؟“

”ٹھیک۔“ اس سے مختصر جواب شاید ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”اچھا‘ تم گاؤں کب آ رہے ہو؟“

”بہت جلد۔“ تب فرحت نے خود ہی فون کاٹ دیا تھا اور اسے یوں لگا تھا جیسے شجاع اپنے آپ میں نہ ہو۔ وہ جو ہمیشہ بہن کی آواز سن کر کھل اٹھتا تھا آج وہ اس کی باتوں کے جواب بھی بڑے بجھے بجھے انداز میں دے رہا تھا‘ نہ اس نے بہنوئی کی خیریت دریافت کی اور نہ ہی بچوں کو پوچھا۔ حد تو یہ تھی کہ ماں کی بیماری کا سن کر وہ خاموش ہوگیا‘ اس نے اپنی بے چینی تک ظاہر نہیں کی۔ شہر جا کر تو میرا بھائی بالکل ہی بدل گیا‘ فرحت اپنے گھر میں بیٹھ کر سوچے چلی جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آئے آنسو کسی برکھا کی طرح اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

☆☆☆

ہم سے اک بار بھی جیتا ہے نہ جیتے گا کوئی
وہ تو ہم جان کے کھالیتے ہیں ماتیں اکثر
ان سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کتابوں کی کیا کرتے ہیں باتیں اکثر

ہوٹل میریٹ میں موسم بہار کے ملبوسات کا ایک میلہ ہو رہا تھا‘ بہت سے بوتیک اس میں اپنا اسٹال لگائے ہوئے تھے۔ فریال کا بھی اسٹال تھا جس میں ہمہ وقت بے حد رش تھا۔ فریال بے حد مصروف تھی مگر جس دن میلے کا آخری دن تھا اس نے دیگر اسٹالز کا راؤنڈ بھی لگایا تا کہ دیکھے کہ دیگر اسٹالز میں ملبوسات کی ڈیمانڈ کہاں تک ہے۔ بوتیک کے ہر اسٹال پر خوبصورت ملبوسات کی قوس قزح اتری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

فریال نے اپنی پسند کے چند سوٹ خریدے تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کیوں نہ امی‘ سائرہ باجی اور ان کے بچوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ گفٹس خریدلوں۔ ثنا سے اسے یہ معلوم ہو ہی چکا تھا کہ وہ کراچی جانے والی ہے‘ بچوں کے ملبوسات کی جانب وہ ابھی بڑھی ہی تھی کہ پشت پر سننے والی آواز اس کے کانوں میں عجیب سی لگی۔

”نادر تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو‘ ثنا کے لیے جو کرنا ہے وہ کر ڈالو۔“

”وہ کراچی جائے گی تو واپس بھی آ جائے گی۔“

”نہیں آئے گی وہ۔“

”بیلا تم پاگل ہو‘ ثنا مجھ سے واقعی محبت کرنے لگی ہے۔“

”تمہاری آپا جان کراچی جا کر تمہارے اندر اتنے کیڑے ڈالیں گی کہ وہ نظر بھر کے بھی نہیں دیکھے گی۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”بیوی کی طرح ٹریٹ کرو اسے۔“ سرگوشی میں کہا گیا۔

فریال نے ترچھی نظروں سے دیکھ ہی لیا تھا کہ بیلا کسی سے محو گفتگو ہے اور جب نادر کو دیکھا تو وہ ششدر رہ گئی۔ بیلا اور نادر کا سمبندھ اسے عجیب و غریب نظر آ رہا تھا۔

”یہ بیلا جس لڑکی کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بناتی تھی کیا وہ لڑکی ثنا ہے۔“ فریال کے دماغ میں اس وقت آندھیاں سی چل رہی تھیں‘ وہ ان کی پشت پر کھڑے ایک ریک کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ اس طرح چھپا لیا کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔

”نادر تمہارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے‘ تم اسے ہر حال میں اپنے دوست کے فلیٹ پر لے جاؤ اور بس......“ وہ مکروہ سی ہنسی ہنسی۔

”اور پھر......“ اب نادر اس کی بات انجوائے کر رہا تھا۔

”پھر وہ تمہاری خوشامدیں خود کرے گی کہ اس سے ہر حال میں شادی کرو اور جلد کرو تب تمہاری آپا بھی تمہاری راہ میں رخنے نہیں اٹکا سکیں گی۔“

فریال کے ہاتھ سے پیکٹ وہیں گر گئے اور اسے ایسے چکر آئے کہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

بیلا کب گئی اور نادر کہاں روانہ ہوا‘ اسے کچھ پتا نہیں تھا‘ اسے تو بس یہی پتا تھا کہ ثنا انتہائی خطروں میں گھری ہوئی ہے اور اسے اس کو بچانا ہے۔

مسز رحمٰن کے گھر فون کیا تو فون ان کے شوہر نے اٹھایا تھا ”مجھے ثنا سے بات کرنی ہے۔“ فریال نے اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا وہ تمہاری آنٹی کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہیں۔“ رحمٰن صاحب اسے اس کی کلاس فیلو ڈاکٹر عالیہ سمجھتے ہوئے بولے۔

”کیا بیلا بھابی گھر میں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بھی کسی کام کے سلسلے میں باہر ہیں۔“ ”جی اچھا کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

آدھے گھنٹے بعد فریال نے ثنا کے سیل پر فون کیا تو وہ آف تھا۔

”مجھ سے فوراً بات کرو۔“ ایس ایم ایس کر کے وہ پریشان سی اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ثنا کا فون آیا تو وہ نادر کی محبت اور چاہت کے ایسے گن گا رہی تھی کہ فریال اس کی باتیں سن کر پریشان سی ہوگئی۔ اس وقت ثنا جس لہجے اور جس سحر میں بات کر رہی ہے وہ میری بات کسی صورت تسلیم نہیں کرے گی۔

”ثنا کیا کل تم مجھے دس منٹ دے سکو گی؟“

”پھپو پرسوں صبح کی تو میری فلائٹ ہے اور کل کا دن نادر نے لے لیا ہے۔“

”تم تو کہہ رہی تھیں کہ کل لنچ پر تمہاری سہیلیوں نے تمہیں بلایا ہے۔“

”وہ تو آنٹی سے بہانہ بنایا ہے میں نے۔“ وہ سرشاری سے ہنسی۔

”تم نادر کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے مل لو‘ امی کے لیے مجھے کچھ دینا ہے۔“

”پھپو میں جلد کراچی سے واپس آ رہی ہوں پھر آپ سے مل لوں گی‘ مجھے تو کل صبح دس بجے نادر کے ساتھ جانا ہے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”پہلے ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اور پھر کھانا کھائیں گے پھر میں گھر آ جاؤں گی۔“

“اس طرح تو تمہیں شام ہو جائے گی۔”

“شام کو بیلا بھابی مجھ کو لے جانے کو کہہ رہی تھیں گمران کے ساتھ جانے سے قبل آپ سے مل لیتی ہوں۔”

“نہیں ثنا میری تو زندگی موت کا مسئلہ ہے۔”

“کیا ہوا پھپھو؟”

“میں مر رہی ہوں ثنا۔” فریال جیسے رو دی۔

“کیا ہوا پھپھو آپ کو......؟” ثنا جیسے تڑپ گئی۔

“تم صبح نادر کے ساتھ جانے سے پہلے میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی چلو، اکیلے جانے کی میری ہمت نہیں ہو رہی۔”

“اگر آپ برا نہ مانیں تو میں نادر کو اپنے ساتھ لے لوں؟”

“نہیں میری جان میں اپنی بیماری کی کہانی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی۔”

“تو آپ مجھے کب تک فارغ کر دیں گی؟”

“میں تمہیں دس بجے لوں گی اور ساڑھے دس بجے چھوڑ دوں گی پھر تم اپنی فرینڈز کے ساتھ جہاں دل چاہے چلی جانا۔” فریال نے قصداً نادر کا نام لینے سے گریز کیا۔

“پھپھو میں آدھے گھنٹے میں فارغ ہو جاؤں گی ناں......” اس کے لہجے میں بے صبری سی تھی۔

“ہاں جان، میں ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے چکی ہوں پہلا نمبر میرا ہی ہے۔”

“ٹھیک ہے پھپھو، میں تیار رہوں گی آپ بے فکر رہیے۔”

☆☆☆

سہما سہما ڈرا سا رہتا ہے
جانے کیوں جی بھرا سا رہتا ہے
عشق میں اور کچھ نہیں ہوتا
آدمی بانورا سا رہتا ہے

وہ سر جھکائے پچھلے پندرہ منٹ سے چپ چاپ سا بیٹھا تھا، اس کی خاموشی سے جمال کو وحشت سی ہو رہی تھی۔

“احمد باؤ میری قسمت ہی خراب ہے تو میں کیا کروں۔” وہ اپنی ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

“اب کیا ہوا؟” وہ دھیمے سے بولا۔

“نگین نہیں مان رہی ہے۔”

“کس بات پر اختلاف ہے اسے؟”

“بس اس کا یہ کہنا ہے کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔”

“کیا تم نے اس کے سامنے میرا نام لیا تھا۔” جمال کپکپاتے لہجے میں بولا۔

“احمد باؤ وہ آپ کو کہاں جانتی ہے، اسے کیا پتا آپ کون ہیں، جیسے آپ کو کیا پتا کہ نگین کون ہے؟”

“ہوں......” جمال سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ کہنے سے اس نے اجتناب کیا ورنہ اس کا دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ شجاع کو کھل کر بتا دے کہ نگین کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے۔

وہ پھول جیسی ہے، وہ شبنم جیسی ہے، دیا، شمع، جگنو، فلک، چاند، تارے سب اسی کے لیے ہیں مگر وہ خاموش ہی رہا۔

“میں نے نگین سے کہا تھا میرے کسی دوست سے نکاح کر لو۔ ایک ماہ کے اندر میں گاؤں سے واپس آ جاؤں گا تو وہ تمہیں طلاق دے کر چلا جائے گا، تب تم عدت سے نمٹ کر مجھ سے نکاح کر لینا۔” شجاع اسے بتا رہا تھا “مگر احمد باؤ وہ جھلی مانتی ہی نہیں ہے، وہ کہتی ہے میں اپنی زندگی کو تماشا نہیں بنا سکتی۔”

“پھر وہ تمہاری زندگی میں کیونکر داخل ہو سکے گی۔” جمال نے اس سے پوچھا۔

“وہ کہتی ہے کہ اب مجھے تم سے بھی شادی نہیں کرنی۔”

“مگر تم تو اس سے محبت کرتے ہو ناں۔”

“ہاں جی میں تو اس سے ایسی محبت کرتا ہوں، اتنی محبت کوئی اس سے کر ہی نہیں سکتا۔” وہ جوش بیاں میں بولا۔

جمال کا دل چاہا کہ اسے ٹوک دے اور کہے شجاع تم جھوٹ بولتے ہو، تمہیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ محبت کتنی وسعت رکھتی ہے، نہ تمہیں اس کی گہرائی کا پتا اور نہ ہی اونچائی کا اور نہ ہی تم مجھ سے زیادہ نگین سے محبت کر سکتے ہو۔

“تم نے سمجھایا نہیں اسے۔”

“بہت سمجھایا، مگر وہ عقل کی دشمن مانتی ہی نہیں ہے اور کہتی ہے کہ میں اب اسی طرح ساری زندگی گزار دوں گی اور کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔”

“شجاع تم نے اس پر ظلم بھی بہت بڑا کیا ہے۔”

“میں کیا کروں جو ہوا سو ہوا، اب میں وقت کو پیچھے تو نہیں لے جا سکتا ناں......اب جو ہوگا وہی کرنا ہوگا مگر وہ لکیر کی فقیر اپنی ضد پر قائم ہے۔”

“وہ ٹھیک کہتی ہے تم صبر کرو۔” جمال نے اس سے کہا۔ وہ نگین کی ذہنی اذیتوں کو محسوس کر سکتا تھا۔

“احمد باؤ میرا تو دل چاہ رہا ہے اس جھلی کا سر پھوڑ دوں جو اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی میں بھی کانٹے بھر رہی ہے مگر کیا کروں کشور تائی نے زبردست پردہ کر دا رکھا ہے، مجال ہے کہ میں اس کی شکل بھی دیکھ سکوں۔ ایک محلے میں رہنے والے اجنبی افراد ایک دوسرے کو رج کر دیکھ لیتے ہوں گے اور ہم ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔”

“شجاع کانٹے تو تم نے اپنی بیوی کی زندگی میں بھر رکھے ہیں اس بیچاری کو کہاں مورد الزام ٹھہراتے ہو۔” جمال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

“جب وہ میری بات نہیں مانے گی تو غصہ تو آئے گا ہی ناں۔”

“اس کی بھی مرضی منشا کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔”

“اس کا خیال رکھ کے اور اس کی بات مان کے تو میں ان حالوں کو پہنچا ہوں۔” وہ غصے میں بولا۔

“کیا مطلب؟” جمال کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

“میں نے اس کے باپ کو باتیں سنائی تھیں، اسے بیچ میں اپنے باپ کی طرفداری کی کیا ضرورت تھی، یہ اس کی غلطی تھی باؤ۔”

’’اچھی بیویاں اپنے شوہر کی طرف داری کیا کرتی ہیں اپنے میکے والوں کی ہر وقت مالا نہیں جپا کرتیں۔‘‘

’’مگر نگین کے لیے تو اس کا باپ ہی اپنے میاں سے زیادہ ہے، اس نے مجھے تاؤ دلایا تو میں غصے میں پاگل ہو گیا اور جب میں نے اس سے کہا کہ غصے میں طلاق نہیں ہوتی، میرے کتنے سارے دوست غصے میں اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں اور وہ بیچاری گھر بنانا چاہتی ہیں اس لیے کوئی سیاپا نہیں ڈالتیں اور چپ کر کے رہتی ہیں مگر نگین نے تو مجھے پریشانیوں کے جال میں لا پھینکا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہوئی اور جب میں نے اس کی بات مان لی تو وہ حلالہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہی، اگر وہ میرے غصے کی باتوں کو اہمیت نہ دیتی تو کچھ بھی نہیں ہونا تھا۔ دراصل چار لفظ پڑھ کر اس نے یہ پریشانیاں مول لی ہیں......اور......‘‘

’’نہیں شجاع......‘‘ جمال نے اس کی بات کاٹی۔ ’’نگین بالکل صحیح کہتی ہے، طلاق غصے میں بھی ہو جاتی ہے اور مذاق میں بھی اور جو شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد ان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں ان کا شمار زنا کرنے والوں کے مساوی ہے۔‘‘

’’میں کیا کروں باؤ؟ پہلے تو آپ ہی مشکل سے تیار ہوئے اور جب آپ تیار ہوئے ہیں تو وہ نہیں مانتی۔‘‘

’’شجاع ابھی اسے تنگ مت کرو وہ ذہنی طور پر خاصی پریشان ہے۔ جب کوئی فیصلہ کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو کچھ عرصے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں چھوڑ دیتا ہوں مگر میں کب تک پڑوسی بن کر زندگی گزاروں۔‘‘

’’بچے تمہارے ساتھ رہ رہے ہیں تمہیں کس بات کی پریشانی ہے۔‘‘

’’پتا نہیں باؤ اب اپنا گھر اپنا نہیں لگ رہا، مجھے خود ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی دوسرے کے گھر میں آ کر رہ رہا ہوں، ایسا کیوں لگ رہا ہے باؤ؟‘‘ وہ ڈبڈبائی نظروں سے جمال کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

’’پریشان مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ جمال اس کی کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

تب وہ اپنے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

’’شجاع پھر آنا تم......میرے پاس۔‘‘

’’اگر وہ مان گئی تو میں جلد آؤں گا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ خدا حافظ کہہ کر چلتا بنا۔

’’نگین اب تم نہیں مانتا، اپنی ضد پر قائم رہنا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم سے نکاح کر کے تمہیں چھوڑ دوں اور پھر تم شجاع سے شادی کر لو۔‘‘ یکبارگی اس نے سوچا اور پھر اپنی سوچ پر خود ہی نادم سا ہو گیا۔ ’’لاحول ولاقوۃ، میں بھی کس نہج پر سوچنے لگا ہوں۔‘‘

☆☆☆

میرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے
ان ہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے

ٹہل ٹہل کر اس کے پاؤں شل ہو گئے تھے مگر اس کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ تاریخ شاید اپنے آپ کو دہرا رہی تھی، سوچتے سوچتے اس کا ذہن جیسے شل ہو رہا تھا۔

اس صبح وہ کالج یونیفارم میں عدیل سے ملنے کے لیے گئی تھی۔ کپڑوں کے دو جوڑے، سونے کی چین، ٹاپس اور دو انگوٹھیاں اس نے اپنی کتابوں کے بیگ میں رکھ لی تھیں۔

’’فرو......آج تم ناشتا کیوں نہیں کر رہی ہو؟‘‘ امی نے اسے خالی چائے کے کپ سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

’’امی آج بھوک ہی نہیں لگ رہی۔‘‘

’’رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا، کیا نہار منہ کالج جاؤ گی۔‘‘

’’کالج میں کچھ کھا لوں گی وہاں کیفے ٹیریا میں سب کچھ مل جاتا ہے۔‘‘

’’وہاں اللم غلم کھاؤ گی تو بیمار پڑو گی، گھر سے کھا کر جاؤ۔‘‘ ماں نے اسے پیار سے گھر کا تھا۔

تب بے دلی سے اس نے پراٹھے کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑا اور شامی کباب سے کھانے لگی۔

’’اچھے ہیں ناں کباب۔‘‘ ماں نے اسے رغبت سے کھاتا دیکھ کر پوچھا۔

’’ہاں ٹیسٹی ہیں، سائرہ باجی نے بنائے ہیں ناں۔‘‘

’’ہاں ایسے چٹ پٹے وہی بناتی ہے۔‘‘

’’واقعی مزہ آ گیا۔‘‘ پانی پی کر وہ بیگ اٹھا کر جانے لگی۔

’’فریال یوں کرو ایک پراٹھے کے ساتھ دو کباب اپنے بیگ میں رکھ لو۔‘‘ امی نے محبت سے کہا۔

’’کیوں امی؟‘‘ فریال کو یوں لگا جیسے ماں اس کی کتابوں کا بیگ کھول کر رکھ دیں گی اور اس کے کپڑے اور چیزیں سب کے سامنے نمایاں ہو کر بکھر جائیں گی۔

’’ارے اپنے کالج میں کھا لینا گھر آتے آتے تمہیں ڈھائی بج جاتے ہیں، اپنی بریک میں کچھ کھا لو گی تو تھوڑی سی ٹیک لگ جائے گی۔‘‘

’’امی آج کالج میں پارٹی ہے وہاں کھاؤں گی میں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے کالج کا بیگ اپنے سینے سے لگایا۔ ماں کے چہرے کو ایک بار بغور دیکھا، اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان کی شکل اپنے دل میں اتار رہی ہو۔ سائرہ باجی اسے لاؤنج میں نظر نہیں آئیں تو ان کے کمرے میں جھانک کر انہیں خدا حافظ کہا۔ صحن میں آئی تو یکبارگی اس کی نظر اپنے صحن میں لگے امرود کے درخت پر گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو ’’فریال بیٹی مت جاؤ ورنہ میں روؤں گا، فریال بیٹی میرا تمہارا بچپن کا ساتھ ہے تم اس طرح مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔‘‘ فریال نے اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پیا اور ایک بار پھر مڑ کر دیکھا، امی، ثریا بھابی کی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

’’اچھا امی خدا حافظ۔‘‘ اور ان کا جواب سنے بغیر وہ بھاگتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ اسٹاپ پر عدیل اپنے کسی دوست کی گاڑی لیے کھڑا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

’’ہم کہاں جا رہے ہیں؟‘‘

’’کورٹ۔‘‘

’’پھر اس کے بعد......؟‘‘

پھر......کیا......پھر......سہاگ دن منائیں گے۔‘‘

’’سہاگ دن......‘‘ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

’’ہاں جانو صبح دس بجے ہمارا کورٹ میں نکاح ہوگا اس لحاظ سے تو ہمیں سہاگ دن ہی منانا ہوگا ناں۔‘‘ ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ میرے لیے شاپنگ کی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں یار کی ہے مگر وہ سامان میرے دوست کے فلیٹ میں رکھا ہے۔'' دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''امی کے پاس کب جائیں گے ہم؟''

''رات کو جب تمہارے دونوں بھائی بھی گھر میں موجود ہوں۔''

''امی ہمیں معاف کردیں گی ناں؟''

''پگلی کوئی ماں اپنی بیٹی سے ناراض نہیں رہ سکتی۔''

''اور میرے بھائی؟''

''جب ماں معاف کردے گی تو بھائیوں کو تو جھکنا پڑے گا ہی' اگر وہ کہیں گے تو میں ایک ہفتے بعد باقاعدہ برات لے کر بھی آسکتا ہوں تاکہ ان کے ارمان بھی پورے ہوجائیں۔''

''تو کیا ہمارا دو مرتبہ نکاح ہوگا؟''

''نکاح تو نہیں ہوگا' ہاں بس ظاہرداری ہوگی' ایسا میرے ایک دوست کے ساتھ ہوا تھا۔''

اور پھر...... جو کچھ اس نے بتایا تھا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا' وہ ایسی دھتکاری گئی کہ وہ تھرا کر رہ گئی۔ ایسی بے عزتی اور ایسی بے قدری...... اس نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اگر صادقہ باجی اسے نہ ملتیں تو اردگرد کے بھیڑیے نما لوگ اس کی تکا بوٹی کرڈالتے مگر صادقہ باجی اس کے لیے ایک ایسا سائبان ثابت ہوئیں جنہوں نے آنچ' دھوپ اور طوفان سے اسے بچا کر رکھا مگر اب ایسا ہی گیم اس کی بھتیجی کے ساتھ کھیلا جانے والا تھا اور وہ ہرگز ثنا کو نادر کا نوالہ نہیں بننے دینا چاہتی تھی۔ خوب سوچ سمجھ کر اس نے ایئرلائن کے دو ٹکٹ کراچی کے لے لیے تھے' یہ خیر قطعی دوسری بات تھی کہ اس نے اپنا ریٹرن ٹکٹ بھی لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب بھائی اور بھابیاں اسے دھکے دیں گے تو وہ ثنا کو ان کے حوالے کرکے واپس لوٹ آئے گی۔ ایک نظر سب کو دیکھ کر اسے ایسا قرار آجائے گا جس پر وہ اپنی پوری زندگی گزار سکتی ہے۔ تین بجے جب اس کے پیر متورم ہوگئے تو وہ بستر پر ڈھے گئی۔

کراچی جانے کے لیے اس نے بیگ پہلے ہی بنالیا تھا۔ بستر پر لیٹی تو ثریا بھابی کی آوازیں کان میں پگھلا ہوا سیسہ سا ڈالنے لگیں۔

''ثنا نے دیکھا تھا فریال کو ایک کالے سے لڑکے کے ساتھ بائیک پر گھوم رہی تھی' پکی آوارہ ہے یہ فریال ہاں...... جو کچھ بڑی بہن نے کیا ہے چھوٹی اس سے زیادہ کرکے دکھائیں گی' مجھے تو لگتا ہے ان دونوں بہنوں نے خاندان کی عزت اتارنے کا تہیہ کرلیا ہے۔''

''ثریا بھابی آپ ایسی باتاں نکو کرو جی' امی جی کو پریشانیاں ہوں گی ناں۔'' صابرہ نے رسان سے جٹھانی کو سمجھایا تھا۔

''ارے واہ...... اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے یہ تو عادی ہیں اپنی بیٹیوں کی ایسی کارہائے نمایاں کی' جہاں تک کوئی سوچ نہ پائے ویسا یہ لوگ کرکے دکھادیتی ہیں۔''

''ہائے اللہ بھابی جی آپ کیسی باتاں کررہی ہیں؟ ایسی اچ بوما بوم تو نئیں کرو ناں جی۔'' صابرہ مستقل ثریا کو چپ کروارہی تھی۔

''صابرہ تمہارا تو صرف ایک بیٹا ہے سارا دن گزار کر گھر آتا ہے اور میں ایک بیٹی کی بھی ماں ہوں' مجھے تو اس

وقت سے خوف آرہا ہے کہ جب آوارہ پھپھیوں کی وجہ سے میری ثنا کے لیے کوئی پریشانی ہو۔''

''ثنا کے لیے کاہے کی پریشانی ہوگی جی' ابھی تو وہ چھوٹی سی بچی ہے۔''

''ان لفنگی لڑکیوں کی تو شادیاں ہوں گی نہیں اور جب میری بچی کی شادی کا وقت آئے گا تو میں کس کس سے یہ بات چھپاؤں گی کہ ان حرافہ لڑکیوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ثریا کیسی ماں ہے تو کہ کسی ماں کے درد کو بھی محسوس نہیں کرتی۔'' شائستہ بیگم نے تڑپ کر کہا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔

''ٹسوے بہانے سے کسی کی آوارگی پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔'' ثریا نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا اور کمرے میں بیٹھی فریال کھول کر رہ گئی تھی۔

''کاش کبھی ایسا وقت ثریا بھابی کے سامنے آئے۔'' یکبارگی اس کے دل میں خیال آیا تھا۔

''ایسا وقت تو آچکا ہے۔'' اب وہ ماضی میں گھومتے ہوئے سوچ رہی تھی اگر میں اسے لینے نہ جاؤں تو نادر اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔ بیلا کا مذموم پلان پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

''میں تو شادی کرنے کے بعد گھر سے نکل گئی تھی اور ثنا کے چہرے پر قبل از وقت کالک مل جائے گی اور تب میں بھابی سے جاکر پوچھوں گی کہ آپ کی اتنی اعلیٰ تربیت نے ایسے برے نتائج کیوں دیے کہ ثنا نے ہمارے خاندان کی پگڑی اچھال دی پھر میں دیکھوں گی بھابی کون کون سی توجیہات پیش کرتی ہیں۔'' فریال بے اختیار ہنسنے لگی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

''وقت نے کیسی مات دی ہے ثریا بھابی کو کہ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتیں۔ ان کے تکبر نے ان کو کیسی بڑی سزا دی ہے۔ تمیز' تہذیب اور اعلیٰ تربیت کے بھی پرخچے اڑ سکتے ہیں۔ مقدر کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ کب کس کو اٹھالے اور کب کس کو گرادے اور آخر ثریا بھابی میں تمہارے آنسو محسوس کرہی لوں گی جب تمہیں میں فون کرکے اس سانحے کی سب سے پہلے اطلاع دوں گی۔'' اس نے مسکراتے لبوں سے سوچا اور چہرے پر خوشی کی کرنیں جگمگانے لگیں۔

☆☆☆

اس کی جدائی کھا گئی گھن کی طرح ہمیں
ہم سخت جان پہلے تو یوں کھوکھلے نہ تھے
جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا یہ بجانہ تھا
اتنے برے بھی کب تھے اگر ہم بھلے نہ تھے

☆☆☆

نگین یوں خاموش سی ہوگئی تھی جیسے اسے چپ سی لگ گئی ہو۔ فہمی اس سے کوئی بات کرتی تو وہ ہوں ہاں میں اسے ٹال رہی تھی۔

کشور تائی کا یہ پکا پکا خیال تھا کہ وہ احمد کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اور فہمی مسلسل اسے اس موضوع کے قریب لانے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اسے لاکھ یہ سمجھانے کی کوشش کرچکی تھی کہ وہ دنیا کی پہلی عورت نہیں ہے جسے طلاق ہوئی ہو یا وہ حلالہ کرنے جارہی ہو۔

“پلیز فہمی باجی...... کیا آپ کوئی دوسری بات نہیں کرسکتیں مجھ سے۔” وہ بیزار سے لہجے میں بولی۔

“اچھا...... تم مجھے صرف ایک بات سچی سچی بتادو۔”

“جی پوچھیے۔” وہ ابرو چڑھا کر تنک کر بولی۔

“یہ احمد صاحب کون ہیں؟” فہمی نگین سے پوچھ رہی تھی۔

“شجاح کا کوئی دوست ہے۔” نگین نے بے دلی سے بتایا۔

“تم نے دیکھا ہے اس کو؟”

“نہیں، کبھی وہ ہمارے ہاں آیا نہیں۔”

“حیرت ہے شجاع کی اس سے اتنی زیادہ دوستی ہے اور وہ کبھی اس کے پاس آیا ہی نہیں۔”

“ایک دفعہ شجاع اسے کھانے پر بلا رہا تھا مگر اس نے منع کردیا تھا۔”

“کیوں نہیں آیا؟”

“مجھے کیا پتا......”

“ہوسکتا ہے وہ بھیانک سی شکل والا ہو اور عمر بھی اس کی زیادہ ہو۔” فہمی مختلف حوالوں سے سوچ رہی تھی۔

“میری بلا سے، کیسا بھی ہو وہ......!” اس نے اکتا کر کہا۔

“یہ بات تو شجاع بتاچکا ہے، کہ اس کا تعلق کسی بھی دکان شکان سے نہیں ہے، یعنی سیلز مین نہیں ہے وہ۔” فہمی اپنے ذہن میں احمد کا خاکہ تیار کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

“کیا ہوگیا ہے باجی آپ کو۔ کیوں اپنی ساری توانائیاں خرچ کررہی ہیں اس شخص پر جس سے مجھے کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں۔”

“مگر اب میری دلچسپی اس شخص میں بڑھ رہی ہے۔”

“کیوں بڑھ رہی ہے؟”

“وہ اس لیے کہ وہی ہمارے کام آرہا ہے۔”

“نہیں باجی...... نہیں۔” وہ خوف زدہ سے لہجے میں بولی۔

“تم پریشان مت ہو یہ مشکل وقت چٹکی بجاتے میں گزر جائے گا، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔”

“باجی اگر ایسا ہوا تو اس کا سایہ آسیب بن کر مجھے ہمیشہ ڈراتا رہے گا۔ وہ میری خوشی کے ہر موقع پر اپنا سر نکال کر کھڑا ہوجایا کرے گا۔”

“فہد کے ایک دوست کا فارم ہاؤس ہے، شاید حیدر آباد کے قریب ہے ایک بار میں بھی جاچکی ہوں، دور ویرانے میں تو ضرور ہے مگر بے حد خوبصورت اور سیکیورٹی وائز بھی بے حد محفوظ...... میں سوچ رہی ہوں کہ فہد سے کہتی ہوں میری ایک دوست اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہنا چاہتی ہے، آپ اسے ایک ماہ کے لیے بک کروادیں اور تمہارے بارے میں یہ کہہ دوں گی کہ تم لوگ گاؤں گئے ہوئے ہو۔”

“کیسی باتیں کررہی ہو باجی تم، میں اپنے بچوں کے ساتھ کسی غیر شخص کو لے کر فارم ہاؤس میں رہوں گی۔” نگین روہانسی ہوکر بولی۔

“یہ مت بھولو کہ نکاح کے بعد وہ تمہارے لیے غیر نہیں رہے گا اور اس فلیٹ میں رہنے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کسی غیر آباد مقام پر چلی جاؤ۔”

“پلیز باجی ایسی باتیں سن کر مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی میری گردن میں پھندہ تنگ کررہا ہے۔”

“بعد میں سب بھول جاؤ گی۔”

“نہیں باجی میں کچھ نہیں بھول پاؤں گی اور شاید میرا ذہنی توازن خراب ہوجائے، شاید میرے دماغ کی نس پھٹ جائے۔” “اگر ایسا ہوجائے تو پلیز باجی میری ایک بات آپ مانیں گی۔”

“کون سی بات؟”

“میرے بچوں کو آپ گود لے لیجیے گا، شجاع تو یہ ذمے داری نہیں اٹھا سکے گا، پھپھو بیمار ہیں وہ بھی بچے سنبھال نہیں سکتیں، آپ اپنی گڑیا کے ساتھ میرے یہ دونوں بچے بھی پال لیجیے گا۔ میری روح آپ کی شکر گزار رہے گی۔”

“نگین تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟”

“اگر نہیں ہوئی تو ہوجاؤں گی، مجھے ہمہ وقت اپنے دماغ میں ایسی ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جیسے کہیں بم بلاسٹ ہورہے ہوں، یقین کریں آپ میرا سر کسی پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔”

“نگین میں تمہاری بہن ہوں اور تم سے محبت بھی کرتی ہوں، کیا تمہیں اس کا بھی یقین ہے یا نہیں؟”

“آپ کیسی باتیں کررہی ہیں باجی، آپ تو میری جان ہیں۔”

“تو پھر یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ میں تمہارے بارے میں غلط سوچوں گی۔”

“آپ غلط نہیں سوچ رہیں، قسمت میرے ساتھ غلط کررہی ہے۔”

“ایسا نہ کہو اپنا ہر کام اللہ پر سونپ دو، وہ کبھی غلط نہیں کرے گا۔ ٹھیک ہے۔”

“جی اچھا۔” اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

“تمہارے ساتھ اس فارم ہاؤس میں کشور تائی بھی ساتھ جائیں گی۔”

"ٹھیک ہے۔"

"میری جان میں اسی شہر میں تو ہوں ناں...... تم ایک فون بھی کر دو گی تو میں فوراً تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک بات کہوں باجی؟"

"ہاں کہو۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے بے حد ڈر لگ رہا ہے' اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو...... مجھے آپ کے وجود سے تقویت رہے گی۔"

"اچھا...... ہوں...... فہد بدھ کو ایک ہفتے کے لیے لاہور جائیں گے' ہم جمعہ کا دن رکھ لیتے ہیں' میں منگل تک تمہارے ساتھ رہ لوں گی۔ فہد کو معلوم ہے کہ تم بیمار ہو اور میں تمہیں لک آفٹر کے لیے جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے باجی......" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

جمعہ کی نماز کے بعد احمد جمال اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ ان کے فلیٹ پر شجاع کے ساتھ آیا تھا۔ قاضی ان کے ہمراہ تھا۔

شجاع کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں مگر فہمی اور نگین کی حالت بھی خاصی دگرگوں تھی اور جب فہمی نے جمال کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔

"شجاع تو کہہ رہے تھے کہ احمد صاحب سے نکاح ہو گا مگر آپ تو جمال ہیں' ہمارے محلے دار ربیع کے بھائی۔"

"میرا نام احمد جمال ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کسی کو بتائیں گے تو نہیں۔" فہمی اپنے ہاتھ مروڑتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

"ایک ماہ بعد میں کینیڈا چلا جاؤں گا' شاید ہمیشہ کے لیے کبھی نہ آنے کے لیے۔" اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"جمال کو دیکھ کر فہمی کے دل کو قرار سا آ گیا تھا اور اس سے بات کر کے طمانیت سی محسوس ہوئی۔

"نگین تمہیں پتا ہے احمد کون ہے؟" فہمی نے اپنے لہجے میں سرشاری سمیٹے اسے بتایا۔

"مجھے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے باجی۔"

"سنو وہ بہت اچھا ہے۔"

"پلیز آپ خاموش ہو جائیے۔" وہ بددلی سے بولی۔ اس وقت بہن کی کوئی بات بھی اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ نہ اس نے کوئی سنگھار کیا تھا' نہ ہی اس نے اپنے تن پر زیورات سجائے تھے۔ بھڑکیلا لباس بھی نہیں پہنا تھا۔ سادہ کاٹن کا پرنٹڈ سوٹ وہ پہنے ہوئے تھی۔

کمرے میں سجاوٹ نام کو نہ تھی' اس کے بیڈ پر چادر بھی سفید بچھی ہوئی تھی۔ جمال جب اس کے کمرے میں آیا تو خفت سے اس کی نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"السلام علیکم۔" مردانہ بھاری سی آواز جس میں نرمی اور محبت رچی ہوئی تھی اسے سنائی دی۔

نگین خاموش رہی' اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

"شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔" جمال نے ایک توقف کے بعد کہا۔

نگین نے سر اٹھا کر دیکھا تو دانتوں تلے انگلی دبا کر بولی۔ "آپ......؟"

"ہاں میں...... میں ہی احمد جمال ہوں۔"

"آپ اور شجاع کے دوست؟" اسے حیرت ہو رہی تھی۔ "اس کے حلقہ احباب میں تو کوئی ایسا شخص نہیں تھا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔"

"شجاع سے میری دوستی کراچی میں ہوئی' اس سے قبل میں انہیں نہیں جانتا تھا۔"

"اس نے آپ کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔"

"ہاں۔"

"آپ کو معلوم تھا کہ شجاع میرے شوہر ہیں بلکہ تھے۔" اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

"محلے داری میں اتنی بیگانگی نہیں ہوا کرتی ہے۔"

"مگر...... آپ...... کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں آپ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

"یہ میری زندگی کے دکھ تھے ان کا آپ سے کیا تعلق؟"

"اگر میں کہوں کہ بہت گہرا تعلق ہے تو شاید آپ یقین نہ کریں۔"

"میرے دکھوں سے آپ کا تعلق۔" وہ حیرت اور اچنبھے سے اسے تکے چلی جا رہی تھی۔

"ہاں نگین اتنا گہرا تعلق ہے کہ شاید تم سوچ بھی نہ سکو' میں تمہیں پسند کرتا تھا' امی میرا رشتہ لے کر تمہارے گھر اہی چاہتی تھیں کہ میں نے تمہیں زبور کے ساتھ دیکھا۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ تم زبور کو پسند کرتی ہو' تب ں نے امی کو منع کر دیا۔ میں تم سے محبت کرتا تھا اور میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ تم اپنی محبت کو نہ پاؤ...... تم ربیع کی ست تھیں اس کے پاس آتی جاتی رہتی تھیں اور اپنی منگنی کی روداد بھی اسے سنا چکی تھیں اور میں یہ سب احوال ننے کے بعد بھی اپنے دل میں تمہیں پوجتا رہا' مجھے کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا نہ کوئی سروکار' بس تمہاری مورتی رے من آنگن میں سجی رہتی تھی اور اپنے تصورات کے زور پر جب چاہے تمہیں اپنے پاس بلا سکتا تھا' معاف کرنا ید یہ بری بات ہو اور تم اس کو سن کر ناراض بھی ہو جاؤ مگر میری خلوتوں میں تم اکثر میرے پاس آیا کرتی تھیں۔

اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تمہاری زبور سے شادی نہیں ہوئی تو مجھے سخت غصہ آیا' میرا بس نہیں چلتا تھا کہ ور کا چہرہ چانٹوں سے سرخ کر دوں۔ تم شجاع کے ساتھ شادی کر کے گاؤں کیا گئیں میرا سکھ چین سب اپنے ھ لے گئیں' میں اپنی فرم کی جانب سے کینیڈا چلا گیا' خیال تھا کہ اب کبھی واپس نہیں آؤں گا' بہن کی شادی بعد میں بھی وہیں شادی کر کے اپنی زندگی وہیں بتا دوں گا مگر کوئی بھی لڑکی تمہاری جگہ نہیں لے پائی تھی۔

جب میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گیا تو کراچی آ گیا' یہاں تمہیں دیکھا تو دل کو قرار سا آ گیا' میں ی نہ کسی بہانے سے تمہارے گھر چلا جاتا تھا' کبھی گھر کے اپنے آم کے بہانے' بازار سے انور رٹھول خرید کر لے دے آتا اور کبھی ربیع کے بیٹا ہونے کی خوشی میں...... حالانکہ اس دن امی نے اس کے الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ بتائی تھی۔ اور اللہ کا احسان میں جب بھی تمہارا خیال لے کر تمہارے دروازے پر آیا تمہیں ضرور دیکھا۔ تم ری آنکھوں میں سجے سپنے دیکھ کر حیران ہو کر مجھے دیکھتی تھیں مگر کبھی سمجھ نہیں پائی تھیں یوں بھی میری محبت یک فہ تھی اور یک طرفہ محبت کا انجام کبھی خوشگوار نہیں ہوا کرتا اور میں تو تمہارا ایسا چاہنے والا تھا جسے صرف تمہاری ی درکار تھی۔

قسمت نے شجاع کو مجھ سے ملا دیا اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمہارا شوہر ہے تو وہ میرے لیے قابل احترا ہو گیا۔ وہ کوئی بھی مشورہ لینے آتا تو میں اسے سچائی سے گائیڈ کرتا' اس کی پریشانیوں کو حل کرتا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے فرید صاحب سے اختلاف شروع ہو گئے ہیں تو میں نے اس کی دوسری جاب کے لیے کوشش شرو کر دی تھی مگر صد افسوس کہ اسے وہ جاب اس وقت ملی جب وہ اپنی بے وقوفی کے تحت تمہیں طلاق دے چکا تھا۔

نگین محبت کرنے کے بعد میں نے یہ جانا ہے کہ محبت کرنے والے کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ محبت نور ہوتی جو دل میں ایک روشنی سی کر دیتی ہے۔ شجاع کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا' اس کے منہ سے تمہارا دکھ جان کر میری پریشانیاں مزید بڑھ گئیں اور یوں میں نے تمہیں اس منجدھار سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ شجاع ایک ماہ بعد آئے گا اور میں تمہیں وعدے کے مطابق طلاق دے کر چلا جاؤں گا تاکہ تم ہنسی خوشی اپنے خاندان کے ساتھ اپنی مسرتوں بھری زندگی گزارو۔"

نگین چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی' اس کی کسی بھی بات کے جواب میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"نگین آپ سے صرف ایک استدعا ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ سرتاپا کانپ سی گئی۔

"جی کہیے۔" اس نے نظریں نیچے کیے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں کیوں...... میں اس بریف کیس میں آپ کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے خرید کر جمع کرتا رہا' انہیں آپ قبول کر لیجیے' آپ شاید یقین نہ کریں یہ ساری کی ساری چیزیں کئی سالوں کی ہیں۔" اور پھر اس نے بریف کیس کھول کر اس کے بیڈ پر الٹ دیا۔ رنگ برنگی چوڑیاں' پراندے' ربن' کیچر' مختلف رنگوں کے مہندی' مختلف ڈیزائن کی گولڈ کی بالیاں اور ٹاپس۔ نگین کے پسندیدہ رنگوں میں شیفون کے دوپٹے' ایمبرائیڈری کے اعلیٰ قسم کے پاؤچز' بیگ اور کالے مخملی ڈبے میں خوبصورت جڑاؤ جھومر......

"یہ جھومر میں نے بنارس سے لیا تھا۔ جب میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے انڈیا گیا تھا تو میرے دوست اپنے گھر والوں کے لیے بنارس سے جیولری خرید رہے تھے' میں نے ربیع کے لیے گولڈ کا ایک سیٹ لیا تھا مگر یہ جھومر میں نے تمہارے لیے خریدا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے جب میں نے اسے خریدا تھا تو مجھے ہنسی بھی آئی تھی کہ یہ تحفہ ایسی شخصیت کے لیے ہے جسے شاید میں کبھی دے بھی نہ سکوں۔"

اب نگین بیڈ پر پھیلے ہوئے سامان کو دیکھنے کے بجائے جمال کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چاہت کا یہ کیسا انداز تھا جس سے وہ واقف ہی نہ تھی۔ یہ مجنوں' فرہاد' رانجھا اور پنوں تو ماضی کی کہانیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

کیا اس دور میں بھی ایسے مجنوں ہوتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں خاصی متحیر سی تھی۔

"نگین میں آپ پر اپنا کوئی حق نہیں جتاؤں گا' سوائے اس کے کہ آپ یہ معمولی چیزیں قبول کر لیں۔"

"یہ ساری چیزیں میری پسندیدہ ہیں اور ہر کلر میرا پسندیدہ ہے'" وہ ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں حیران ہوں کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ ایسے پاؤچز' ایسے بیگ اور اس قسم کے دوپٹے مجھے پسند ہیں اور ایمبرائیڈری میں مجھے پنک اور بلیک کلر کا کامبی نیشن پسند ہے۔"

"میری تصوراتی دنیا میں تم جن رنگوں میں مزین آتی تھیں میں ان ہی کلرز سے عشق کرنے لگتا تھا۔ التماس اور......"

بیڈ پر سے چیزیں سمیٹتے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔

"یہ جھومر آپ صرف ایک مرتبہ مجھے پہن کر دکھا دیں۔" اس کے لہجے میں جو لجاجت اور نرمی تھی وہ اس کے لبوں سے ادا ہونے کے بعد کسی پھول کی طرح کھل گئی تھی۔

نگین نے اس کی بات سنتے ہی کالا مخملی ڈبا کھولا اور جھومر اپنے بالوں میں سجا لیا۔

"بہت خوبصورت جھومر ہے اور یہ میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ اتنا خوبصورت جھومر میں نے آج تک نہیں دیکھا اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے جھومر بے حد پسند ہے اتنا پسند ہے کہ ٹیکے سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔" نگین مسکراتے لبوں سے کہہ رہی تھی اور جمال ایک ٹک اسے مبہوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا۔

نگین نے جب تحفے کی تمام چیزیں بڑے سے بیگ میں رکھیں تو جمال کی محویت ایکدم ٹوٹی۔

"بہت شکریہ آپ کا...... آپ کی وجہ سے آج اس جھرمر کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔" اس کی بات سن کر نگین چھن سے ہنس دی اور وہ اس کی ہنسی کے جلترنگ میں کھو سا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس ہنسی کے طفیل اس پورے کمرے میں چاندنی سی پھیل گئی ہو۔

"جمال صاحب میں آپ کی دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے اتنے خوبصورت تحائف میرے لیے جمع کیے اور بالآخر وہ مجھے ہی ملے۔"

"شکریہ ادا کیوں کر رہی ہیں آپ' یہ تو آپ ہی کی چیزیں تھیں۔" یہ کہہ کر اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ "ہاں...... ایک بات اور۔"

نگین نے مڑ کر اسے دیکھا' وہ دروازے میں ایستادہ تھا' قد چونکہ لمبا تھا اس لیے وہ سر کو قدرے جھکائے کھڑا تھا۔

نگین اس کی جانب گھوم کر استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اسے یوں دیکھے چلا جا رہا تھا جیسے وہ اسے اپنی آنکھوں میں جذب کر لے گا۔

"نگین میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ماہ جو ہم اس فارم ہاؤس میں گزاریں گے وہ میرے لیے اتنا اہم ہو گا کہ اس کے طفیل میں ہنسی خوشی پوری زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ پلیز آپ اپنے دل میں کسی ڈر' خوف یا کسی بھی ایسے جذبے کو جگہ نہ دیجیے گا جو میری ذات کو منہا کر دے۔ مجھے آپ ہمسفر کے طور پر نہ سہی مگر ایک اچھا دوست ضرور سمجھیے گا۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں اور نہ ہی اس نے نگین کا جواب سننے کے لیے اس کی جانب نظر اٹھائی۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا گیسٹ روم کی جانب چلا گیا اور نگین ایک گہرا سانس لے کر اسے جاتا ہوا دیکھنے لگی' کیسا عجیب تھا وہ...... اور اس سے زیادہ اس کی باتیں بھی عجیب و غریب سی تھیں۔

"کیا کوئی کسی کو اس نہج پر بھی چاہ سکتا ہے۔" اب وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ "شاید جھوٹ بول رہا تھا' جھوٹے لوگ باتیں بنانے کے ماہر ہوتے ہیں مگر اس کا چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ تو نہیں لگ رہا تھا' تو کیا وہ سچا تھا۔" اس کا دماغ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں وہ سچ بول رہا تھا' اس کی آنکھوں میں جو چراغاں سا تھا وہ سچائی کے سبب تھا۔"

"جمال بے شک آپ نے مجھ سے سچ ہی بولا ہو مگر مجھے اس سچ سے کیا واسطہ؟ آپ تو میری زندگی میں ایسے مہمان کی طرح آئے ہیں جسے بھولنا ضروری ہو گا۔"

☆☆☆

مہی بے حد مطمئن ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ جمال کے اخلاق' تمیز' تہذیب اور شائستگی سے وہ بے حد متاثر

ہو کر آئی تھی۔ اس کے مزاج میں ذرا بھی چھچھورپن نہیں تھا۔ استحقاق رکھنے کے باوجود اس نے نگین پر اپنا کوئی حق نہیں جمایا تھا۔ بچوں کا تو وہ سدا کا دیوانہ تھا' نگین کے بیٹے ارحم اور بیٹی عاتکہ کو وہ جیسے لیے پھرتا تھا ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اس کے اپنے بچے ہوں۔ شروع شروع میں بچے اس کے پاس آنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ارحم تو خاصا شرمیلا سا بچہ تھا۔ جمال اسے اپنے پاس بلاتا تو وہ نفی میں گردن ہلا دیتا مگر چند ہی دنوں میں اس نے بچوں کو اپنے سے یوں قریب کر لیا تھا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ اس کے روم کی طرف بھاگتے تھے۔

ایک شام نگین حیران رہ گئی' وہ لان میں گھوڑا بنا ہوا ارحم کو اپنی پشت پر بٹھائے گھوم رہا تھا اور ارحم اس کھیل سے ایسا لطف اندوز ہو رہا تھا کہ کسی صورت اس کی پشت سے اترنے کو تیار نہیں تھا۔

”ارحم بیٹے اب کوئی دوسرا کھیل کھیل لیں۔“ وہ اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتا ہوا بولا۔

”نہیں انکل میں نہیں اتروں گا' آپ ایسے ہی گھوڑا بنے رہیں۔“ ارحم کی ضد دیکھ کر وہ پھر اس کو ساتھ لے کر گھٹنوں کے بل گھومنے لگا۔

نگین کو یہ دیکھ کر غصہ آیا اور وہ باہر آ کر بولی۔ ”ارحم یہ کیا بدتمیزی ہے' اترو انکل کی کمر سے۔“

”میں نہیں اتروں گا۔“ ارحم اسے انگوٹھا دکھاتا ہوا بولا۔

”پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم چلو اترو۔“ وہ اس کو زبردستی جمال کی پشت سے کھینچ کر اتارتے ہوئے بولی۔

ارحم روتے ہوئے گندی ماما کہتا ہوا اندر بھاگ گیا۔

”سوری جمال صاحب بچے آپ کو بے حد تنگ کرنے لگے ہیں۔“

”نہیں نگین بچے مجھے تنگ نہیں کرتے بلکہ اب تو وہ مجھ سے مانوس ہو گئے ہیں۔“

”مجھے تو لگتا ہے آپ ارحم اور عاتکہ کے اتنے لاڈ کر کے بگاڑ دیں گے۔“

”نگین میں اس تھوڑے سے وقت میں بہت سی خوشیاں کشید کرنا چاہتا ہوں' پلیز آپ بچوں کو نہ ڈانٹیں ورنہ وہ میرے پاس نہیں آئیں گے۔“

”مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے ناں کہ وہ آپ کو تنگ کریں' اس گرمی میں آپ کا کتنا برا حال ہو رہا ہے۔“ وہ اس کے پسینے سے تر چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا تو اس سے اچھا حال کبھی ہوا ہی نہیں۔“ وہ خوشدلی سے ہنسا۔ ”کاغذات پر ہی سہی مگر میں اس ہستی کا شوہر ہوں جس کو میں نے برسوں چاہا ہے' اس کے جگر گوشے مجھے اپنے بچے محسوس ہو رہے ہیں۔“

”جمال صاحب آپ بے حد اچھے اور بے حد نیک شخص ہیں' یقیناً وہ لڑکی بے حد خوش قسمت ہو گی جو آپ کی حقیقی بیوی ہو گی۔“ تب جمال چپ سا ہو گیا۔

نگین کچھ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی' اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا وہ وہیں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر سوچ کی سلوٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔

کتنا اچھا ہے یہ شخص' اللہ کرے اسے کوئی اچھی سی لڑکی مل جائے' ایسے نیک لوگوں کا واقعی کال ہے۔ شجاع نے اس کی تعریف ٹھیک کی تھی……اور مجھے تو شجاع کے پاس جانا ہے جو میرے بچوں کا باپ ہے……اور یہی صحیح فیصلہ ہے۔

☆☆☆

وہ ہم کو اچھا لگتا ہے

لہجہ اس کا سچا لگتا ہے
اب تو ہمارا نہیں رہا
یہ دل بھی اس کا لگتا ہے

(شاعرہ: فصیحہ آصف خان)

میرے ساتھ ایسا بھی ہونا تھا' ایک سرد سی آہ اس کے لبوں سے نکلی۔ میں نے تو کسی گام پر نہیں سوچا تھا کہ نگین سے میری علیحدگی ہو جائے گی۔ گو یہ جدائی تھوڑے سے دنوں کی ہے مگر مجھے اس کا ہر دن ایک ایک سال کا کیوں لگ رہا ہے۔ شاید تکلیف کا وقت طویل بھی ہوتا ہے اور کٹھن بھی۔ اب وہ نہ صرف اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا بلکہ دلاسے بھی دے رہا تھا۔

”شجاع پریشان مت ہو چند ہی دنوں کی بات ہے اب وہ شہر آئے گا تو ہر پریشانی اس کی زندگی سے رفع ہو چکی ہو گی۔“

”میں نگین کا بے حد خیال رکھوں گا' اسے کسی بات پر بھی سرزنش نہیں کروں گا' گھر کے کام کاج کے لیے ملازمہ بھی لازمی رکھنی ہے' نگین بے حد نازک سی ہے اور وہ نڈھال سی ہو جاتی ہے' طاقت کا کوئی سیرپ بھی ڈاکٹر سے اس کے لیے لوں گا۔“ یہ سب سوچنے کے باوجود اس کے دل و دماغ میں خوشی کی کوئی بھی رمق پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ چند گھنٹے کی نیند لے لے تاکہ وہ تازہ دم ہو سکے مگر ناکامی ہو رہی تھی۔

ریل آگے کی طرف دوڑ رہی تھی اور اس کا دل و دماغ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ نگین اس کا کتنا خیال رکھتی تھی' اس کی پسند کو اس نے اپنی پسند بنا لیا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اپنے کسی کام کے لیے اسے تکرار کرنی پڑی ہو۔ نازک اندام سی نگین جو گھر کے کام اور بچوں کے کام سے نڈھال ہو جاتی تھی وہ شجاع کو دیکھ کر پھر تتلی سی بن جاتی تھی۔

اس کے سر میں روزانہ تیل لگاتا' انگلیوں سے اس وقت تک مساج کرنا جب تک اسے نیند نہ آ جائے' یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ طیش میں ہوتا تو ہمیشہ دھیمے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی۔ اس کی ماں اور بہن ہمیشہ یہی سمجھتی رہیں کہ نگین نے شجاع کو ان سے دور کر دیا ہے مگر یہ نگین ہی تھی جو اس کو احساس دلاتی رہتی کہ اس نے ماں کو چھوڑ کر کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں کیا ہے۔

ماں گاؤں میں اکیلی گھبرا رہی ہوں گی' یہ خیال نگین نے ہی اس کے دل میں ڈالا تھا اور آج وہ اسے اکیلا چھوڑ کے گاؤں جا رہا تھا۔ اپنے بچے جن کے اس نے بہت زیادہ لاڈ نہیں اٹھائے تھے مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں اس وقت اس کے سینے سے لگے ہوتے اور وہ ان کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوتا۔

ریل کا یہ سفر اسے اذیت انگیز سا لگ رہا تھا۔ اسٹیشن پر کوئی شخص بھی اپنی بیوی کے ساتھ نظر آتا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی۔ ”آج وہ اپنے آپ کو تہی داماں سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ڈبے میں کوئی نئے دولہا دلہن چڑھے تو اس کے ذہن میں نگین اور احمد کا خیال آ گیا۔ ان کا بھی تو نکاح ہوا تھا۔ اکیلے گھر میں وہ بھی تو رہ رہے ہوں گے' نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہے ہوں گے اور وہ اپنی نگین کو خود چھوڑ کر جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی نگاہ پھر دولہا پر پڑی تو یہ دیکھ کر اس نے نظریں از خود جھکا لیں کہ دولہا نے اپنی دلہن کو اپنے بازوؤں کے سہارے بٹھایا ہوا تھا اور دلہن کے بازوؤں پر اپنی انگلیوں کا دباؤ ڈالا ہوا تھا۔ دلہن کے ماتھے پر آنے والے بال وہ اپنی انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔

"پتا نہیں احمد باؤ نگین کے ساتھ کس انداز میں رہ رہا ہوگا۔" اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

موبائل نکال کر فلیٹ میں فون کیا کہ کشور تائی سے ہی خیریت پوچھ لوں۔ فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے احمد باؤ نے قصداً ٹیلی فون کی بیل آہستہ کر دی ہو تاکہ فون کی کوئی گھنٹی ان کے مابین کوئی مداخلت ہی نہیں کر سکے۔ شجاع کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ٹرین سے کود کر واپس بھاگتا ہوا کراچی چلا جائے اور احمد باؤ کا گریبان پکڑ کر اس کا منہ چانٹوں سے لال کر دے اور اس سے کہے کہ فوراً یہاں سے غارت ہو جاؤ مگر ایسا وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا عمل کرنے کا ہر حق وہ کھو چکا تھا۔

دو گھنٹے بعد اس نے پھر فون کیا، ٹیلی فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی اور اسے کوئی قصداً نہیں اٹھا رہا تھا۔ ان کے پاس گھر میں صرف ایک ہی موبائل تھا جسے نگین اور شجاع مشترکہ طور پر استعمال کیا کرتے تھے اور پتا نہیں کیسے اور کب موبائل صرف اس کے پاس آ گیا تھا، اسے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ یہ موبائل نگین کے پاس ہونا چاہیے تھا۔

"احمد باؤ کو فون کرنا چاہیے کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔" کئی مرتبہ اس کا ہاتھ ان کا نمبر پش کرنے کو بڑھا اور پھر اس نے قصداً ہاتھ کھینچ لیا۔

شجاع میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسی ویسی بات سہہ پاتا۔ وہ سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھے اوپر کی برتھ پر لیٹ گیا اور اس کے آنسو اس طرح بہنے لگے جیسے کوئی پرنالا بہہ رہا ہو۔ غلطی شاید میری بھی تھی وہ اپنا احتساب خود کر رہا تھا۔ فرید ماموں نے غلط نہیں ڈانٹا تھا مجھے، ذرا سی لاپروائی سے ان کا ہزاروں کا نقصان ہوا تھا۔ ماموں کا انداز گفتگو ہمیشہ اسی انداز کا رہا تھا مجھے تو عادی ہو جانا چاہیے تھا...... تا کہ غصے میں بپھر سا گیا اور پھر اس سارے معاملے میں نگین تو بے قصور تھی اگر اس کے باپ نے غلطی بھی کی تھی تو اس کی سزا نگین کو تو نہیں بھگتنی چاہیے تھی اور بالآخر یہ سزا میں خود سہہ رہا ہوں، اپنی بیوی اور بچوں کو از خود چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

اسٹیشن آنے والا تھا گاڑی ہلکی ہوئی تو اس نے پڑوس میں حمید صاحب کو فون ملایا۔ "ہمارے گھر کا شاید فون خراب ہے، میں نے سوچا آپ سے ہی بچوں کی خیریت معلوم کر لوں۔" سلام دعا سے فارغ ہو کر اس نے بیقراری سے پوچھا۔

"آپ کے گھر کے لوگ تو جمعہ کی شام کو کہیں چلے گئے ہیں، گھر کے باہر تو تالا لگا ہوا ہے۔"

"ارے ہاں وہ لوگ میری سالی کے ہاں گئے ہوں گے۔" شجاع نے اس انداز میں کہا جیسے وہ یہ بات بھول گیا ہو۔

"یہ تو مجھے پتا نہیں مگر کشور تائی بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔" پڑوسی بڑے طمانیت بھرے لہجے میں تفصیل بتا رہا تھا اور شجاع کا دماغ اڑا جا رہا تھا۔

"یہ احمد باؤ کا ایسا پہلے تو کوئی پروگرام نہیں تھا اب وہ نگین، بچوں اور کشور تائی کو لے کر کہاں چلا گیا ہے......؟ کمینہ ہنی مون منا رہا ہوگا، کشور تائی بچے سنبھال رہی ہوں گی۔" اس کے دماغ میں زہریلے سے خیالات نے جمگھٹا سا جما لیا۔

"پڑھا لکھا ہے باتوں کے گلاب کھلا رہا ہوگا، ابھی طبیعت صاف کرتا ہوں منحوس کی۔" اس نے احمد باؤ کے موبائل کے نمبر ملائے مگر اس کا موبائل آف تھا۔ جب اس کی دسویں کوشش بھی ناکام ہو گئی تو اس کے دل میں یہی خیال آیا کہ احمد باؤ ایسا قصداً کر رہا ہے۔

اسٹیشن پر اترا تو اپنے موبائل سے فون کرنے کے بجائے پی سی او سے اس نے احمد کا نمبر ملوایا اور یہ جان کر اسے حیرت ہوئی کہ احمد کا موبائل کسی ملازم نے ریسیو کیا۔

"احمد صاحب کہاں ہیں؟"

"واش روم میں وہ غسل کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا گیا۔ نہ اس کا نام پوچھا گیا جیسے اس سے کوئی غرض نہ ہو اور نہ ہی یہ بتایا گیا کہ وہ کہاں ہے؟ اپنے موبائل سے اس نے پھر رنگ کیا تو موبائل پھر آف تھا۔ ہوں، خوب رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ اس کا دماغ کھول رہا تھا۔

اسٹیشن سے اس نے گاؤں تک کا تانگا کیا، گھوڑے کی ٹاپیں اس کے ذہن پر سنگ باری کرتی رہیں۔ شجاع خاموش تھا مگر اس کی حالت انتہائی ابتر تھی۔ ایک شور، عجیب سا ہنگامہ اور زبردست سا طوفان اس کے ذہن کو مفلوج سا کیے دے رہا تھا۔ اپنے اسٹاپ پر وہ اترا تو دور سے اس کا دوست حفیظ ہاتھ ہلاتا نظر آیا۔

"ارے شجاع اکیلا ہی آیا ہے گاؤں؟"

"ہاں یار۔"

"کیوں بھابی جی نے کیا تیرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا؟" اس نے از راہ مذاق کہا۔

"وہ کیوں انکار کرتی بھلا۔" وہ پریشان سا ہو کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اس نے سوچا ہوگا تیرے بغیر وہ زیادہ آرام سے رہ سکتی ہے۔"

"کیا مطلب۔" اس کا جیسے دم نکل گیا۔

"میاں کی روک ٹوک اور غصے سے بچ کر بیویاں زیادہ خوش رہتی ہیں۔" حفیظ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی فلسفہ بیان کر رہا ہو اور شجاع کو اس کی ہر بات ایسے لگ رہی تھی جیسے اس کا ایک ایک لفظ سچا ہو۔

اب وہ حفیظ کے ساتھ چل رہا تھا، اسٹاپ سے ان کے گھر کا فاصلہ کوئی زیادہ نہیں تھا۔ حفیظ نے اس کی اٹیچی بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

"احمد نے مجھے دھوکا دیا اور شاید نگین نے بھی۔" اس کے دماغ میں یہ سوچ کر آندھیاں مزید تیز ہو گئی تھیں۔

"سامنے سے سبزی سے بھری سوزوکی آتی نظر آئی تو بجائے اس کے کہ وہ حفیظ کے ساتھ خود بھی پیچھے ہٹ جاتا مگر وہ تو دیکھے اور سوچے بغیر اپنے قدم آگے بڑھا چکا تھا اور پھر تیز رفتار سوزوکی اسے کچلتی ہوئی آگے جا کر رک گئی تھی۔

"اللہ جی......!" ایک دل دوز چیخ شجاع کے لبوں سے برآمد ہوئی اور حفیظ اٹیچی پھینک کر اس کی طرف لپکا جو خون بہت زیادہ بہہ جانے کے باعث بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔

☆☆☆

ساری رات وہ ایک پل کے لیے نہ سوئی تھی، مسلسل بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے رات گزار دی تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو اس نے نماز پڑھی اور سجدے میں سر لگا کر بے اختیار رونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ ایک طرف اس کا دل ثنا کے لیے بے قرار ہو رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح نادر کے ناپاک ہاتھوں سے اپنی بھتیجی کو بچا کر لے آئے۔ دوسری طرف ثریا بھابی کی مکار باتیں اس کے دماغ پر برچھیاں برسا رہی تھیں۔

ثریا بھابی نے جس طرح میری ماں، میری سائرہ باجی اور مجھے اپنے لفظوں کے ہنٹر سے لہولہان رکھا۔ اس کے لیے ان کو سزا ملنی ہی چاہیے۔

فریال تمہیں ثنا سے بے حد محبت ہے' اپنی بھاوج کو معاف کر دو۔" اس کا دل اسے تاویلیں دے رہا تھا سمجھا رہا تھا۔

"معاف کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے' یہ تو بڑے لوگوں کا منصب ہے' جو معاف کر کے اپنا دل بھی صاف کر لیتے ہیں' میرے دل میں اتنی جگہ ہرگز نہیں ہے جو ان کو معاف کر سکوں۔"

"تو کیا تم یہ برداشت کر لو گی کہ نادر کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح ثنا کی بوٹی بوٹی کر دے؟"

"نہ...... نہیں...... نہیں۔" ایک تیز چیخ اس کے روئیں روئیں سے نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی سوا دس بج رہے تھے۔

"اف یہ کیا ہوا! اس ٹائم سے پہلے تو مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔" تیزی سے اس نے پرس اٹھایا اور بھاگتی ہوئی پارکنگ تک آئی۔

"ڈرائیور جلدی چلو...... ہاں گارڈ کو بھی ساتھ لے لو۔"

"باجی آج بوتیک اتنے سویرے جائیں گی آپ؟"

"نہیں تم مکھا سنگھ اسٹریٹ چلو۔"

"جی کہاں ہے وہ؟" ڈرائیور نیا تھا پنڈی کے علاقوں کا اس کو زیادہ پتا نہیں تھا۔

"مری روڈ تک چلو' آگے میں تمہیں بتاتی ہوں۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

"تیز چلاؤ ارشاد! بہت تیز۔" وہ جو ہمیشہ گاڑی آہستہ چلانے کا کہا کرتی تھی آج اپنے اصول خود توڑ رہی تھی۔

"دائیں طرف موڑو...... اب بائیں طرف...... اس اسکول کی سڑک کے ساتھ ساتھ...... بس گرین گیٹ کے برابر روک لو۔" وہ بھاگتی ہوئی مسز رحمٰن کے گھر میں داخل ہوئی' گیٹ بھی اتفاقاً کھلا ہوا تھا۔

مسز رحمٰن لاؤنج میں چائے پی رہی تھیں' فریال کو حواس باختہ سا دیکھ کر پریشان سی ہو گئیں۔ "خیریت تو ہے ناں؟"

"ثناء کہاں ہے؟" اس نے ان کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

"آج اس کی سہیلیوں نے اس کی پارٹی کی ہے وہ وہیں گئی ہے۔"

"آپ نے کیوں جانے دیا اسے۔" فریال جیسے رو دی۔

"شام تک آجائے گی...... مگر......"

"اور آپ کی بہو بیلا کہاں ہے؟" فریال جیسے ان کی کوئی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔

"وہ تو کل سے اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔"

"پلیز مسز رحمٰن...... آج نادر اور یہ بیلا میری ثنا کو تباہ کر دیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" فریال کی باتیں سن کر وہ ہکا بکا سی تھیں' اس کی کوئی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"ثنا سے فریال کا کیا تعلق ہے۔" وہ زبان کے بجائے آنکھوں سے پوچھ رہی تھیں۔

"ثنا میری بھتیجی ہے' سگی بھتیجی اور کل میں نے بیلا کو خود سنا ہے نادر سے یہ کہتے ہوئے کہ تم جب تک ثنا کو اپنی بیوی کی طرح ٹریٹ نہیں کرو گے تمہاری یہ آپا اس کی تم سے ہرگز شادی نہیں ہونے دیں گی۔"

"یہ بات تمہیں مجھے بتانی چاہیے تھی' اب کیا واویلا کرنے آئی ہو۔" انہیں فریال پر غصہ ہی تو آ گیا۔

"پلیز آپ نادر کو کہیں ڈھونڈیے آج وہ ثنا کو اپنے کسی دوست کے فلیٹ پر لے کر جانا چاہتا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ اسے کہاں لے کر گیا ہوگا' ثنا کو اتنے بڑے شہر میں ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی نادر کا کوئی خاص دوست جس سے اس کے بہت قریبی تعلقات ہوں۔" فریال پاگلوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

"ایسا دوست تو خالد ہی ہے جو فلیٹ میں رہتا ہے اور وہ بھی آج کل اپنے بڑے بھائی کے پاس دبئی گیا ہوا ہے۔"

"یقیناً وہاں ہی لے کر گیا ہوگا وہ اسے۔ خالد کی غیر موجودگی میں وہ خالی فلیٹ نادر کی عیاشی کا اڈا بھی ہوگا۔"

"اگر وہاں چلنا ہے تو میں تمہیں لے کر چلتی ہوں مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ خالد کے فلیٹ میں لے کر گیا ہوگا...... وہاں کے اردگرد کے تمام فلیٹ بسے ہوتے ہیں۔"

"پلیز آپ چلیے تو سہی۔" فریال ملتجی سے لہجے میں بولی۔

مسز رحمٰن جس حلیے میں تھیں اسی طرح چل پڑیں۔ اب گاڑی سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف دوڑ رہی تھی۔ "یہ گلی...... نہیں یہ ہے۔" مسز رحمٰن بھی گھبراہٹ میں راستہ بھٹک گئی تھیں' مطلوبہ فلیٹس انہیں نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔

اس پلازا کا کیا نام تھا' وہ تک ان کے ذہن سے نکل گیا تھا اور وہ گاڑی میں ادھر سے ادھر بھٹک رہی تھیں اور جب وہ ناامید ہو کر واپس جانے کا سوچ رہی تھیں کہ اچانک انہیں وہ فلیٹس نظر آ گئے۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو انہیں نادر کی گاڑی بھی کھڑی نظر آ گئی اور پھر زینہ چڑھتے ہوئے وہ خالد کے فلیٹ تک پہنچ ہی گئیں۔

اور جب کال بیل پر فریال نے انگلی رکھی تو پسینہ اس کے جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

آج گرمی تو تھی ہی مگر فریال تو ایسی بھیگی کھڑی تھی جیسے برکھا میں بھیگ کر آئی ہو۔

☆☆☆

ارحم کو ڈائریا ہو گیا تھا' نگین پہلے تو کشور تائی کے گھریلو ٹوٹکوں پر عمل کرتی رہی جس سے معمولی افاقہ بھی ہونے لگتا اور تھوڑی دیر بعد پھر اس کی وہی حالت ہو جاتی۔

جمال نے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو کئی دفعہ کہا مگر نگین کا خیال تھا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔

ایک شب جب وہ پانی کی کمی کے باعث بے ہوش ہو گیا تو نگین بدحواس سی جمال کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے اور جمال گہری نیند میں تھا۔

"جمال...... جمال...... جمال......" وہ گلوگیر لہجے میں اسے پکار رہی تھی۔ نگین کو یوں پریشان سا اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ بوکھلا گیا تھا۔

"جمال' جلدی سے آؤ میرا بچہ شاید مر رہا ہے' آنکھیں تک نہیں کھول رہا ہے۔"

جمال ننگے پیر اس کے کمرے میں آیا تو وہ بے ہوشی کے عالم میں تھا' ہونٹ نیلے سے پڑ رہے تھے "تم اس کو لے کر باہر آؤ میں گاڑی نکالتا ہوں۔"

"بیٹا اس وقت کون سا ڈاکٹر ہوگا؟" تائی نے کہا۔

"اسپتال میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور ہوگا۔"

"نگین ذرا راستہ طویل ہے اس لیے پانی کی بوتل زبردستی اس کے منہ سے لگا دو۔"

نگین بچے کو لے کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی اس رفتار سے چلا رہا تھا جیسے کوئی جہاز اڑا رہا ہو۔ بچہ بے سدھ اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا اور وہ دعائیں پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھی۔

اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بچے کو فوراً داخل کر لیا گیا اور ڈرپ لگا دی گئی۔ کئی انجیکشن اسے فوراً لگا دیے گئے۔

"مسٹر جمال آپ بہت لکی ہیں کہ اپنے بچے کو لے کر بروقت اسپتال پہنچ گئے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔" ڈاکٹر جمال سے کہہ رہی تھی۔

نگین کے چہرے پر طمانیت کے آثار چھا رہے تھے‘ بچے کے ساتھ بیڈ پر نگین تھی اور سامنے کرسی پر جمال بیٹھا ہوا تھا۔ جب دوسری ڈرپ لگی تو ارحم کی حالت قدرے بہتر ہونی شروع ہوئی‘ اب وہ آنکھیں کھول کر ماں اور جمال کو بھی دیکھ رہا تھا۔

نگین نے ارحم کو پیار کر کے اپنے سینے سے لگایا اور چند منٹ بعد وہ غافل سو رہی تھی۔

جمال اس کے چہرے پر ممتا کی چمک اور تسکین دیکھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بال اڑ اڑ کر آ رہے تھے‘ جمال کا دل چاہا کہ اپنے ہاتھوں سے انہیں سنوار دے۔

“نہیں جمال‘ تم اپنی حد میں رہو۔”

“یہ عورت جو سامنے بستر پر لیٹی ہے‘ میری بیوی ہے اور میں اس پر اپنا پورا استحقاق رکھتا ہوں۔” اس کے دل نے کہا۔

“ہاں ضرور رکھتے ہو مگر بعض چیزیں پاس ہو کر بھی دور رہتی ہیں۔”

“مگر نگین کوئی چیز نہیں ہے جیتی جاگتی ایک عورت ہے۔”

“یہ سب ٹھیک ہے مگر تم ایک وعدے کے پابند ہو۔ جمال یہ تمہارا نصیب ہے کہ تم اس سے ہمیشہ دور ہی رہو گے۔”

نہ جانے کون سا لمحہ تھا جب وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔ بالآخر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو ہی گئی۔

صبح جب نگین کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا جمال کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا‘ نیند میں شاید اس نے اپنی ٹانگیں بیڈ کے راڈ پر رکھی ہوں گی جو نہ جانے کیسے بیڈ پر آ گئیں اور نگین کے پیر اس کی ٹانگوں سے دب گئے۔ نگین نے چاہا کہ بستر سے اٹھ کر ایک گلاس پانی پی لے‘ شدت کی پیاس نے اس کا حلق خشک کر دیا تھا مگر وہ اپنے پیر نکالتی تو وہ بے آرام ہو کر اٹھ جاتا۔ اسی تذبذب میں تھی کہ جمال کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے پیر یوں بیڈ پر نگین کے پیروں پر دھرے دیکھ کر اسے پہلے حیرت اور پھر شرمندگی سی ہوئی۔

“سوری نگین مجھے نیند میں پتا ہی نہیں چلا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں یا کسی دوسری جگہ۔”

نگین نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر بستر سے اٹھ کر ٹیبل پر رکھی ہوئی عیسلے کی بوتل منہ سے لگا لی اور پانی پیتی چلی گئی۔

“چائے لے آؤں میں تمہارے لیے۔” وہ کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا بولا۔

“ہاں سر میں بہت درد ہے چائے تو ضرور پیوں گی۔”

“اس اسپتال میں نیچے اچھا کینٹین ہے‘ میں اپنے اور تمہارے لیے ناشتے کا کہہ کر آتا ہوں اور ارحم کے لیے میرے خیال سے دودھ اور ساگودانہ بہتر رہے گا۔” نگین نے ارحم کو پیار کرتے ہوئے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کینٹین کا بیرا گرما گرم ناشتے کی دو ٹرے لیے کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔

دونوں ایک ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ناشتا کر رہے تھے “یہ مکھن آپ کھا لیں مجھے پسند نہیں ہے۔” وہ اپنی ٹرے سے مکھن کی ٹکیا اٹھا کر جمال کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولی جو اپنی بریڈ پر چھری کی مدد سے مکھن لگا رہا تھا۔

“کس قدر تو تم کمزور ہو‘ شکل دیکھو بالکل پیلی ہو رہی ہے‘ مکھن اور دودھ ناشتے میں تمہیں لازمی لینا چاہیے۔” جمال نے اس کے سلائس پر مکھن لگا کر اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

کس قدر گھریلو سا ماحول تھا‘ بچہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور میاں بیوی ناشتا کر رہے تھے۔ اس وقت نگین کے ذہن پر نہ کسی قسم کا کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی وسوسہ۔

“اب ارحم ٹھیک ہو گیا ہے۔” یہ خوشی اس کی تمام خوشیوں سے زیادہ تھی۔

“آپ نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کب چھٹی ملے گی اور ہم گھر کب جائیں گے؟”

“میں پوچھتا ہوا آیا ہوں شام تک ہمیں یہیں رکنا ہو گا۔ کشور تائی کو بھی خیریت بتا دی ہے۔”

“ارے میں تو بھول ہی گئی‘ گڑیا انہیں تنگ نہ کر رہی ہو۔”

“آپ چاہیں تو گڑیا کے پاس چلی جائیں‘ میں اپنے دوست کو فون کر دیتا ہوں‘ اس کا ڈرائیور گاڑی لے کر آ جائے گا۔”

“تو ارحم کے پاس کون رہے گا؟” اس نے حیرت سے پوچھا۔

“میں ہوں ناں‘ اس کے پاس۔” جمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

“نہیں میں بھی شام تک ارحم کے ساتھ ہی رہوں گی۔ یہ میرے بغیر رہ نہیں سکتا۔” اور جمال کا چہرہ یکدم سفید سا پڑ گیا‘ اسے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو تم سے ارحم کا بھلا رشتہ ہی کیا ہے۔ جو بات ماں کی ہوتی ہے وہ کسی غیر شخص کی کہاں ہو سکتی ہے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر نگین نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

“آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ میرے بچے میری موجودگی میں اپنے باپ کے پاس بھی نہیں جاتے تھے اور خاص طور پر اس وقت تو بالکل بھی نہیں جاتے تھے جب وہ بیمار ہوں۔ ایسی حالت میں وہ ہمہ وقت مجھ سے ہی چپکا کرتے تھے۔”

ارحم نے آنکھیں کھولیں تو بے اختیار پکارا “انکل میرے پاس آ جائیے آپ۔”

جمال اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا “اب میرے بیٹے کی طبیعت کیسی ہے؟”

“اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں‘ شام کو آپ کے ساتھ کرکٹ بھی کھیلوں گا۔”

“پہلے میرا بیٹا میرے ہاتھ سے ساگودانہ کھائے گا۔” نگین اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

“ماما آج میں انکل کے ہاتھ سے کھا لوں؟” ارحم نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

“ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔” تب نگین نے دیکھا وہ اسے اپنے سہارے سے بٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ ساگودانہ کھلا رہا تھا اور بچے کی ہر بات پر رضامندی میں سر ہلا رہا تھا۔ اس کی دلچسپ باتوں نے ارحم کے چہرے پر مسکراہٹ کا اجالا کر رکھا تھا۔

“انکل میں بڑی والی گاڑی بھی لوں گا اور پسٹل بھی۔” ارحم فرمائش کر رہا تھا‘ ہنس رہا تھا۔

“اللہ تیرا احسان تو نے میرے بچے کو نئی زندگی دی۔” نگین سوچ رہی تھی اور بچے کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر اس کو طمانیت سی ہو رہی تھی۔ دوسری جانب جمال کے دل میں یہ دعا جاری تھی۔

“اے پاک پروردگار تیرا میں جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہو گا کہ کسی کی امانت تیرے رحم و کرم کی بدولت میرے پاس محفوظ رہی اور بے شک تو ہی ہر بات جاننے والا ہے۔”

☆☆☆

شجاع کی ٹانگ میں کمپاؤنڈ فریکچر ہوا تھا‘ پاؤں سے ران تک پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا‘ چھ ہفتے بستر سے اٹھنے کی شدید ممانعت تھی۔

عظمت بیگم بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر بے حد پریشان تھیں “بیٹا تو نگین کو فون کر دے تاکہ وہ تیرے پاس تیری دیکھ بھال کے لیے آ جائے اور اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر تجھے بھی تقویت ہو۔”

''اماں اس کی کمر کا مہرہ کھسک گیا ہے وہ خود اپنی بہن کے پاس ہے' ڈاکٹر نے اسے بھی چلنے پھرنے کو منع کر رکھا ہے۔''

''اللہ رحم کرے تم دونوں پر ایک ساتھ ہی آفت آئی ہوئی ہے' ایک کی کمر ہلی ہوئی ہے تو دوسرے کی ٹانگ' اٹھنے بیٹھنے سے دونوں محروم ہیں۔'' فرحت نے جتاتے ہوئے بھائی سے کہا۔

''اماں کو میں چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا شاید اسی کی مجھے سزا ملی ہے۔'' وہ ماں کے ہاتھ چومتا ہوا بولا۔

''نہیں پتر ایسا مت سوچ' میں نے تجھے یا نگین کو کبھی بددعا نہیں دی۔''

''میں ٹھیک ہو جاؤں اماں ..... تو ہم لوگ ہمیشہ گاؤں میں ہی رہیں گے۔''

''بیٹا تم کہیں بھی رہو' ہمیشہ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

''اماں یہ آپ کی ہی دعائیں تھیں جو میں بچ گیا ورنہ جس طرح میں گرا تھا تو لاری تو میری گردن پر سے گزر سکتی تھی۔''

''اللہ میرے بچے کو سلامت رکھے' لمبی حیاتی دے' میں ہمیشہ اس کی خوشیاں دیکھوں۔ یارب العالمین! کبھی میرے بچوں کے دکھ مجھے نہ دکھانا۔'' عظمت بیگم اپنا دوپٹا پھیلائے اشکبار آنکھوں سے دعا مانگ رہی تھیں۔

''اماں میں یہ سچ کہہ رہا ہوں کہ کراچی جا کر مجھے ذرا مزہ نہیں آیا۔''

''تو شاید وہاں کے شور وغل میں گھبرا گیا' ورنہ وہ تو بڑا شہر ہے' چھوٹے چھوٹے درجنوں شہر علاقوں کے نام سے اس میں سمٹے ہوئے ہیں۔''

''مگر میرا وہاں دل ہی نہیں لگا تو کیا کروں۔''

''بیٹا یہ تیرا اپنا گاؤں ہے' یہیں پیدا ہوا' یہیں پلا بڑھا اس جگہ کی بات تو اور ہی ہونی ہے۔''

شجاع کا دل چاہا ماں کو بتا دے کہ کراچی جا کر اس کا زندگی کی سب سے بڑا نقصان ہو گیا مگر اس عمر میں انہیں یہ صدمہ پہنچانے کی اس میں قطعاً ہمت نہ تھی۔

شجاع کی ٹانگ ٹوٹنے کی خبر جب گاؤں میں پھیلی تو سب ہی لوگ اس کی عیادت کو آنے لگے۔ تب لوگوں کی زبانی اسے یہ پتا چلا کہ فرح کی دوسری شادی ختم ہونے کے بعد نہ صرف وہ بیمار ہو گئی ہے بلکہ نفسیاتی مریضہ بھی ہو گئی ہے۔ ایک انجانا سا دکھ اس کے سینے پر آ گرا۔

''فرح کے دوسرے شوہر کو بھی تجھ پر شک تھا کہ تو فرح سے کراچی میں ملتا رہتا تھا۔ اس کے دوست نے رازدارانہ لہجے میں اسے کہا تو اس کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔

''میں نے تو کتنے عرصے سے فرح کو دیکھا تک نہیں اور لوگوں نے اس بے چاری پر اتنے بڑے بڑے بہتان لگا دیے۔''

''اس کی قسمت ہی ایسی ہے تو کیا کرے' دونوں مرتبہ ذلیل قسم کے شوہر ملے جنہوں نے اس کی قدر ہی نہیں کی۔''

''بڑا افسوس ہوا سن کر۔'' شجاع کے چہرے پر دکھ کے اثرات نمایاں تھے۔

''سارے گاؤں کو ہی افسوس ہے مگر خوش صرف اشرف ہے جو ہر طرف بغلیں بجاتا پھر رہا ہے۔''

''اشرف کیا دوسروں کے دکھوں سے خوش ہوتا ہے؟'' شجاع اپنے دوست سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں وہ تو ایسا ہی ہے دوسروں کی خوشیوں سے جلنے والا' ہاں غموں اور دکھوں میں گھرے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر وہ خوشی محسوس کرتا ہے۔''

''ایسے شخص سے گاؤں والوں نے ناتا کیوں جوڑ رکھا ہے' چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسے۔''

''اب گاؤں بھی پہلے والے نہیں رہے ہیں' اب کوئی کسی کے معاملے میں بولتا بھی نہیں' شہروں کے رجحانات اب گاؤں میں بھی پہنچنے لگے ہیں۔''

''ہاں برائی ہر جگہ ہی تیزی سے پھیلتی ہے اور یہ اشرف تو شروع سے ہی کمینہ تھا۔ اوچھی اور گھٹیا حرکتیں کرنے میں تو یہ ہمیشہ سے ہی آگے آگے تھا۔''

''اچھے برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ جو بظاہر بہت اچھے ہوتے' وہ بھی برے بن جاتے ہیں۔'' اس کا دوست کہہ رہا تھا اور شجاع سوچ رہا تھا کہ میں جو آج دوسروں کو برا کہہ رہا ہوں خود کون سا اچھا ہوں۔

''میں نے جو نگین کے ساتھ کیا کیا وہ اچھا سلوک تھا؟ ایک نیک' پارسا' فرمانبردار بیوی کو طلاق دینا کوئی اچھا عمل تھا؟''

شجاع سب سے برے تو تم خود ہو تم جتنا برا تو شاید کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' ضمیر کے ہنٹر اس پر برس رہے تھے اور وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے مسلسل کچل رہا تھا اور پھر ہونٹوں سے خون رسنے لگا۔

☆☆☆

فرید احمد اور فیروزہ بیگم اب بالکل ٹھیک تھے۔ پہلے جیسی تیزی سے نہ سہی مگر آہستہ آہستہ بغیر سہارے کے انہوں نے چلنا شروع کر دیا تھا۔

فیروزہ نے فہمی کو فون کیا کہ اب وہ کراچی آنے والی ہیں' تم نہ صرف گھر کی صفائی کروا دو بلکہ نگین کو بھی بتا دو کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔

''کتنے سارے دن ہو گئے اس نے فون بھی نہیں کیا۔ اس کے گھر میں جب نمبر ملا رہی ہوں تو صرف بیل جا رہی ہے' کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا۔''

''امی ان دنوں نگین اپنے بچوں کے ساتھ گھومنے پھرنے گئی ہوئی ہے۔ جب تک آپ آئیں گی وہ بھی چند دن بعد پہنچ جائے گی۔''

''اچھا وہ گھومنے گئی ہوئی ہے' فیروزہ خوش ہو گئیں۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں امی اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ اس اتوار کو آ جاؤں مگر تمہارے ابو جی کہہ رہے ہیں کہ جس ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس سے ایک بار پھر چیک اپ کروا لیا جائے۔''

''تو آپ چیک اپ کروا لیں اس میں قباحت ہی کیا ہے۔''

''مذکورہ ڈاکٹر نے پندرہ دن بعد کا ٹائم دیا ہے۔ میں نے سوچا کراچی میں ڈاکٹروں کی کوئی کمی ہے ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے' وہیں کروا لوں گی اپنا چیک اپ۔'' فیروزہ بیگم کا دل اب پنڈی میں کسی صورت نہیں لگ رہا تھا۔

فہمی کا دل چاہا کہ کہہ دے ہاں امی آپ فوراً آ جائیں مگر اس نے بہت سوچ سمجھ کر کہا۔ ''پلیز امی پہلے آپ لوگ اپنے آپ کو دیکھیں ہماری محبت میں آ کر اپنا نقصان نہ کریں۔''

''بیٹا اب تو ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں۔''

مگر اتنے اچھے ڈاکٹر سے فائنل چیک اپ آپ ضرور کروائیں ..... گھر کی فکر نہ کریں آپ' وہ آپ کو صاف ستھرا چمکتا دمکتا ملے گا اور آپ کی دونوں بیٹیاں بھی آپ کے استقبال کو موجود ہوں گی۔''

”فہمی اب میرا یہاں بالکل دل نہیں لگ رہا ہے۔“

”میرا کون سا آپ کے بغیر دل لگ رہا ہے اگر آپ کہیں تو ایک ہفتے کے لیے آپ کے پاس آجاؤں؟ بس جہاز کا آنے جانے کا کرایہ آپ دے دیجیے گا۔“ فہمی نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے بیٹا کرایہ کیا تجھ سے زیادہ ہے تو واقعی آجا' تیرے آنے سے میرا دل واقعی بہل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں فہد سے کہتی ہوں کہ کل دوپہر کی فلائٹ کا ٹکٹ مجھے لا دیں۔ آج شام تک گھر کی صفائی کروا کے میں گھر لاک کروا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے میں منتظر رہوں گی۔“ فیروزہ نے خوشدلی سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

کسی سے گلہ ہے نہ کوئی خوش گمانی دل
کئی دنوں سے عجب طرح کے فشار میں ہوں

فرح اسکول میں پڑھا رہی تھی مگر اشرف کی کینگیاں بدستور اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ وہ کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کی زبانی کہلواتا۔

”مس آپ کو دوسری بار طلاق کیوں ہوگئی؟“

”مس کیا گھر بسانا بہت مشکل ہوتا ہے؟“

روزانہ ایک جیسے سوال سن کر اس نے ایک بچے کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا کہ اس کی آنکھ سوجھ گئی۔ بچے کی ماں شکایت کرنے آئی تو فرح اس پر چیخ پڑی۔

تب اس کی ماں نے فرح سے تمسخر بھرے لہجے میں کہا ”بی بی اگر پاگل ہو تو گھر بیٹھو' بچوں کو پٹوانے کے لیے ہم نے اسکول میں داخل نہیں کروایا ہے۔“ ماں نے اچھا خاصا فرح کو لتاڑ دیا۔

اور جب چھٹی کے بعد وہ اسکول سے باہر نکلی تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ شجاع کے گھر کے قریب سے جب وہ گزری تو اس نے دیکھا' اپنے گھر کے سامنے تخت پر شجاع لیٹا ہے اور اس کے پیر پر پلاسٹر بندھا ہوا ہے۔

وہ دوپٹے میں منہ چھپائے اس طرح چل رہی تھی کہ شجاع بھی اسے دیکھ نہ سکے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ چکر ہی زور کا آیا یا اس کی برداشت نے حوصلہ ہارا کہ وہ چاروں خانے چت بے ہوش ہو کر وہیں گر گئی۔

”ارے بھاگو دوڑو کوئی بی بی گر گئی ہے۔“ شجاع نے شور مچایا۔

حکیم جی کی بیوی جو اپنے دروازے پر کھڑی تھیں بھاگ کر سب سے پہلے اس کے پاس پہنچیں۔ سہارا دے کر اسے شجاع کے گھر لایا گیا۔ پانی کے چھینٹے مارنے سے اس کو ہوش آگیا اور جب پانی پی کر وہ جانے کے لیے اٹھی تو وہ اپنے اندر اتنی کمزوری محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی مریضہ اسپتال سے صحت یاب ہونے سے پہلے ڈسچارج ہو گئی ہو۔

”خالہ جی آپ کو میرے ساتھ گھر تک چلنا ہوگا۔ اکیلے قدم بڑھانے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔“

”ہاں......ہاں' میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔“

شجاع نے جب اسے پاس سے گزرتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ وہ فرح تو تھی ہی نہیں' چہرے پر چھائیاں' حلقے' کمزوری کے گڑھے' متورم آنکھیں جو کھوئی کھوئی سی تھیں۔ ایک معصوم سی لڑکی نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ وہ اس کے لیے مغموم سا ہو گیا اگر میں اس کی جانب محبت کا قدم نہ بڑھاتا تو شاید اس کے نام پر وہ سیاہی نہ تھوپی جاتی جو بلاوجہ اس پر لگائی گئی۔

”اف......بے چاری!“ اس کے لبوں سے آہ آزاد ہوگئی۔

ہیڈ مسٹریس نے مسلسل شکایات آنے کے سبب فرح کو معطل کر دیا تھا۔

یہ صدمہ تھا یا کوئی اور بات......ایک صبح فرح اٹھی تو اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا' وہ اشاروں کی مدد سے ماں کو اپنی بات سمجھا رہی تھی۔

ماں پریشان ہو کر اسے لے کر اسپتال بھاگی تو ڈاکٹر نے کہا ”بعض اوقات پریشانیاں' غم اور صدمے انسان کو اتنا متاثر کرتے ہیں کہ اس میں بولنے کی سکت تک نہیں رہتی۔“

”کیا یہ ہمیشہ کے لیے گونگی ہوگئی ہے؟“ ماں نے دھواں دھار روتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا بھی ہوسکتا ہے مگر ایسی کیفیات عموماً عارضی طور پر ہوتی ہیں۔ برداشت کرتے کرتے یہ تھک گئی ہے' آپ اس کو رلانے کی کوشش کریں انشاءاللہ اس کی گویائی واپس آجائے گا۔“

اسپتال سے فرح کو گھر آنے میں ٹائم لگا ہوگا مگر پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی' فرح گونگی ہوگئی ہے۔

”اے ہے......دیکھو تو بڑی بڑی باتیں کرنے والوں کے انجام کیسے جلدی دکھائی دے جاتے ہیں۔“ نانی نے ہنس کر کہا۔

”ہمارے اشرف کی تو مصنوعی ٹانگ لگ گئی اور وہ چلنے پھرنے لگا۔ اب فرح کی ماں اپنی بیٹی کے دوسری زبان کیسے لگوائے گی جو وہ بول پائے۔“

”فرح کی ماں بہنوں کی زبانیں کندھوں پر پڑی ہوئی ہیں ان میں سے تھوڑی سی کتر کر فرح کو لگوا دیں' پھٹا پٹ بولنے لگے گی۔“ اشرف کی بہن خوب آنکھیں چمکا کر ہنس کر بولی جس پر سب ہی تو ہنس پڑے تھے۔

”ایل لوان کی للو کتر گئی تو وہ ساری کی ساری تتلائیں گی۔“ نانی بھی بال کی کھال نکال رہی تھیں۔

”یہ تو اچھی بات ہے جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں ایک خوبی اور سہی۔“

”تو یوں کہو ناں پہلے سیر تھیں بعد میں سوا سیر ہو جائیں گی۔“ نانی اپنے آپ کو پنکھا جھلتے ہوئے بولیں۔

”اماں تمہاری موٹی عقل ہے جو دل چاہے سمجھ لیں۔“

”تو تلی کے دن آئے بال......لم......ڈھولا تو ن جھولائے۔“ اب نانی اپنے پاس رکھا چھالیا کا ڈبا بجاتے ہوئے گا رہی تھیں اور اشرف کی بہنیں خوب ہنس رہی تھیں۔

☆☆☆

پلاسٹر کٹنے کے بعد شجاع پورے دو ہفتے بیساکھی کی مدد سے چلا اور اب وہ چھڑی کی مدد سے چل رہا تھا۔ گھر میں بیٹھ کر اس کا دم گھٹتا تھا اس لیے وہ چھڑی کی مدد سے باہر گھومتا رہتا۔

گاؤں کے لوگوں سے ملنا جلنا اتنا شاید کبھی نہیں رہا تھا جتنا کہ ان دنوں رہا تھا۔ تب اسے یوں لگا......فرح کی بربادی کا ذمے دار صرف وہ ہے۔

فرح کسی زمانے میں اسے بہت اچھی لگتی تھی مگر نگین سے شادی کے بعد اس کے دل میں اس کی محبت کا خمار کبھی نہیں جاگا تھا اور جوں جوں وقت گزرا فرح اس کی نگاہوں سے تو کیا دل سے بھی اوجھل ہوتی چلی گئی مگر اب وہ اپنے آپ کو ذمے دار ٹھہرا رہا تھا۔

فرح ان دنوں شدید بیمار تھی' چند دن قبل شجاع نے فرح کو دیکھا تھا جیسے کوئی ہڈیوں کا ڈھانچا ہو۔ وہ اسپتال میں دوا لینے آئی تھی۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں' پپڑی جمے ہونٹ۔ یکبارگی وہ اس کو دیکھ کر پاس آیا اور اس کی ماں کو

سلام کر کے فرح سے پوچھا۔

''اب کیسی ہو؟''

فرح کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق جاگی اور پھر جلد ہی معدوم ہو گئی اور اس نے گردن کے اشارے سے جواب دیا۔

''یہ ڈاکٹر بہت اچھا ہے تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' مگر فرح نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''خالہ جی یہ فرح کو کیا ہو گیا ہے؟'' شجاع نے اس کی ماں سے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''بس بیٹا اس کو تو غم کھا گئے' کوئی کم غم دیکھے ہیں اس بدنصیب نے' اللہ نہ کرے کسی لڑکی کا مقدر فرح جیسا ہو۔ اب اس کو لوگ منحوس کہتے ہیں تو شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس نے جس سے محبت کی اسی نے اس کو نقصان پہنچایا۔'' فرح کی ماں تھکے تھکے سے لہجے میں کہہ رہی تھیں اور فرح اس طرح سن رہی تھی جیسے کسی دوسرے کا تذکرہ ہو اور شجاع کا وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔

فرح کو برباد کرنے والا پہلا مہرہ میں تھا جس نے اس سے شادی کا وعدہ کرنے کے باوجود اس سے شادی نہیں کی۔

''میں چاہتا تو اپنی بات ماں کو سمجھا سکتا تھا مگر میں نے شاید ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس برق رفتار زمانے میں پسند' چاہت اور وعدے کیا صرف جوانی کے چونچلے ہوتے ہیں۔'' گھر آ کے وہ مسلسل یہی سوچے چلا جا رہا تھا۔

''پتر کھانا تو کھا لے کتنی دیر سے روٹی سامنے لیے بیٹھا ہے اور ایک بُرکی منہ میں نہیں گئی ہے۔''

''اماں ایک بات کہوں میں آپ سے؟'' وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

''بول بیٹا!''

''میں فرح سے شادی کرنا چاہتا ہوں ورنہ وہ مر جائے گی۔'' اس کا لہجہ ایسا فولادی تھا کہ عظمت بیگم چونک سی گئیں، انہیں ایسا لگا جیسے وہ انہیں اطلاع دے رہا ہو۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر نگین کہاں مانے گی اور پھر میرا بھائی کیا سوچے گا یہ بھی تو دھیان کر۔''

''مجھے کسی کی کوئی فکر نہیں ہے بس آپ خالہ جی سے جا کر کہہ دیں کہ کل عصر کے بعد میں فرح سے نکاح کرنے آ رہا ہوں اور رخصتی بھی نکاح کے فوراً بعد ہو گی۔''

''پھر تو پتر سارے ہی لوگوں نے یہ کہنا ہے کہ شجاع فرح سے عشق کرتا تھا اور بعد میں بھی اس سے ملتا رہتا تھا جب ہی گھر اس کے برباد ہوئے۔''

''اماں میں تو اسے آباد کرنے جا رہا ہوں' لوگوں کی پروا مجھے نہ پہلے تھی اور نہ اب ہو گی۔ فرح صحت مند ہو جائے اور زندگی کی طرف لوٹ آئے اب میری زندگی کا مقصد یہی ہو گا۔''

''ٹھیک ہے میں جا کے فرح کی ماں سے بات کرتی ہوں۔'' عظمت بیگم نے چادر سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اماں فرح مان جائے گی ناں؟''

''وہ ان دنوں بول نہیں پا رہی مگر پاگل تھوڑی ہوئی ہے۔ وہ کاہے کو انکار کرے گی' وہ تو خوشی خوشی ہامی بھر لے گی۔'' عظمت بیگم نے بیٹے سے کہا اور شجاع کے لبوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہونے میں
تو سر قائم نہیں ہوتا
محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدھم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا

(شاعر۔ امجد اسلام امجد)

بات واقعی محبتوں کی تھی۔

محبت بھی ایسی بے لوث کہ نگین کے دونوں بچے اس کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے۔

نہ جمال کو ان کے بغیر چین پڑتا اور نہ ہی بچوں کو۔ اسپتال سے آنے کے بعد ارحم نے تو باقاعدہ جمال کے ساتھ سونا شروع کر دیا تھا۔

اس شادی کو پورا ایک ماہ ہو گیا تھا اور جمال کو یوں لگتا تھا کہ چند دن ہوا بن کے گزرے ہوں۔ کس تیزی سے یہ مہینہ گزر گیا تھا یہ وہی سوچ سکتا تھا۔

اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ وقت ٹھہر جائے مگر وقت کا کام گزرنا ہی ہوتا ہے اور خوشی کے پل تو بڑی برق رفتاری سے گزرا کرتے ہیں۔

''بیٹا اب میں چند دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' نگین کی موجودگی میں اس نے بچوں سے کہا۔ اب وہ نگین اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تھا۔

''کیوں انکل! کیا آپ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں؟'' ارحم نے اپنی پلیٹ سامنے سے ہٹا دی۔

''میں ناراض نہیں ہوں، مگر تم اپنا کھانا تو کھا لو۔''

''پہلے آپ یہ بتایئے آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟ میں تو اچھا بچہ ہوں۔ آپ تو مجھے کہتے ہیں کہ میں سب سے اچھا بچہ ہوں۔ آپ کہتے ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں پھر بھی آپ مجھ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' ارحم اپنی ناراضی دکھا رہا تھا۔

”میں بعد میں آؤں گا بیٹے۔ پھر تم سے ملاقات ہوگی۔“ جمال اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں تو بس آپ کو جانے ہی نہیں دوں گا۔ میں آپ کے شوز چھپا دوں گا، آپ کی گاڑی کی چابی اپنی جیب میں رکھ لوں گا، پھر آپ کیسے جائیں گے۔“ جمال اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

”انکل آپ وعدہ کریں آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے ناں۔“ ارحم ملتجی لہجے میں جمال سے کہہ رہا تھا۔

”بیٹا مجھے جانا تو ہوگا۔“ وہ حتمی سے لہجے میں بولا۔

”اچھا تو آپ یہ بتائیے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟“

”بیٹا مجھے کینیڈا جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہے، میری امی ہیں وہاں۔ میری بہن بھی وہیں ہے۔ وہ سب مجھے یاد آ رہے ہیں، اس لیے مجھے جانا تو ہوگا۔“

”تو ہمیں بھی آپ اپنے ساتھ لے کر چلیے۔ ہمیں بھی مزہ آئے گا۔“

”آپ کے پاپا آنے والے ہیں، آپ یہاں نہیں ہوں گے تو وہ پریشان ہو جائیں گے۔“

”مگر میں تو پاپا کے ساتھ جاؤں گا ہی نہیں۔“ ارحم نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

”پاپا کو دیکھ کر تم کہو گے کہ میں انکل کے پاس نہیں رہوں گا۔“ جمال نے ہنس کر کہا۔

”نہیں انکل میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں پاپا کے ساتھ نہیں جاؤں گا، میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا۔“

”آپ میرے ساتھ چلے جائیں گے تو آپ کی ماما روئیں گی، میرا ارحم کہاں چلا گیا۔“

”تو پھر ماما کو بھی ساتھ لے جائیں گے، گڑیا بھی ساتھ جائے گی، ہے ناں ماما۔“ ارحم اپنی بات میں وزن دینے کے لیے نگین کا نام لیتا ہوا بولا۔ نگین بیٹے کی بات سن کر مسکرا دی۔

”تو پھر تو آپ کے پاپا خوب روئیں گے، میرا بیٹا کہاں گیا؟ میرے بیٹے کو کون لے گیا۔“ (جمال نے روتے ہوئے نقل اتاری)

”آپ میرے پاپا سے یہ کہہ دینا کہ میں ٹینک میں گر گیا۔ تو پھر وہ مجھے ڈھونڈیں گے ہی نہیں۔“ وہ بے اختیار بولا۔

”اللہ نہ کرے، ارحم بیٹا کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔“

”خدا نہ کرے کہ میرے بچے کو کبھی کچھ ہو۔“ نگین نے سہم کر کہا۔

”ماما، میں انکل کے ساتھ جاؤں گا۔ بس میں نے کہہ دیا کہ میں انکل کے ساتھ ضرور، ضرور، ضرور جاؤں گا۔“

”ارحم بیٹا، اگر انکل اپنے ساتھ ہمیں نہیں لے جانا چاہتے تو ہم بھلا کر ہی کیا سکتے ہیں۔“ نگین نے بہت سوچ کر کہا۔

اس سوچ کے نتائج حاصل کرنے میں اس کی تین راتیں گزری تھیں اور اس نے ہر ہر طریقے سے اپنا تجزیہ کیا تھا۔ ہر ہر بات میں جمال کو پرکھا تھا...... مگر وہ تو اس کی کسوٹی پر ہر وقت پورا اترا تھا۔ تب اس نے یہی جانا تھا۔ جمال کے ساتھ رہنا ہی اصل زندگی ہے۔ اس نے جس سکھ کے خواب دیکھے تھے وہ اس شخص کی ذات میں مجسم تھے۔

جمال نے تڑپ کر نگین کو دیکھا۔ اس کا رواں رواں اس سے سوال کر رہا تھا، ”تم جو کہہ رہی ہو، حقیقت کا اس سے کیا تعلق ہے۔“

”سو فیصد۔“ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔

”مگر نگین......“ وہ کچھ کہنے کو رکا تو نگین اس کی بات سنے بغیر ہی بولی۔

”جمال اب بچوں کے ساتھ ساتھ میرا بھی یہ فیصلہ ہے کہ میں تم سے دور کسی صورت نہیں رہ سکتی ہوں۔“

”مگر شجاع۔“ یہ لفظ کسی کونین کی طرح جمال کی زبان پر گھل گیا تھا کہ اس کے بعد اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

مگر نگین تو اپنے آپ میں مست، اس سے کہہ رہی تھی۔ ”شاید میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ ایسی محبت جو اب کسی صورت تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا تمہارے ساتھ نکاح ہوا ہے اور میں یہ نکاح کسی صورت توڑنے کے حق میں نہیں ہوں۔“

اور جمال نگین کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆

گاؤں آ کر تو اسے موبائل کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اور آج کتنے دنوں بعد موبائل اس کے ہاتھ میں آیا تو وہ اس کے میسجز پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ پڑھ رہا تھا اور ہنس رہا تھا اور پھر اس نے اس کی سم نکال کر باہر پھینک دی۔

”مسٹر موبائل اب تم سے بھی کیا یارانہ رکھنا۔“ وہ خود ہی ہنس دیا۔ ”تم نے بھی مجھے اتنی خوشیاں نہیں دیں جتنے غم دیے ہیں۔“ وہ پھر ہنسا۔

”ارے پاگل ہو گیا ہے جو آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔“ عظمت بیگم نے لسی کا گلاس پکڑایا تو اسے ٹوکا۔ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے وہ واقعی پاگل سا ہو رہا ہے۔ اسے اب کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ نہ کھانے میں مزہ رہا ہے، نہ پینے میں۔ شاید اب جینے میں بھی مزہ نہ رہے۔

”نگین تمہارے اس میسج نے مجھے فیصلے کی صحیح راہ دکھائی۔ اس نہج پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ اس کے ذہن پر پھر نگین کا میسج ایک طوفان سا بپا کرنے لگا۔

”شجاع اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہوں گی، بار بار نکاح کرنا کسی عورت کے لیے کوئی کھیل نہیں ہوا کرتا۔“

”اگر احمد جمال نے مجھے طلاق دے دی تو پھر میں اپنی ساری زندگی یوں ہی گزار دوں گی۔“

یہ میسج بھی نگین نے احمد کے موبائل سے اسے کیا تھا۔ نگین کی زندگی میں احمد باؤ کی کتنی اہمیت ہو گئی ہے۔ اسے اس کا احساس فوراً ہی ہو گیا۔

”چلو نگین تمہاری نیا تو کنارے لگی۔ میرا کیا ہے، وقت کا کام گزرنا ہی ہوتا ہے۔ زندگی گزر ہی جائے گی۔ وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

دروازہ اندر سے لاک تھا...... مگر فریال کا ہاتھ کال بیل کے بٹن سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ تیز بجتی ہوئی گھنٹی اور دروازے پر مارے جانے والے ہاتھوں کی دھڑ دھڑاہٹ سن کر نادر نے گھبرا کر دروازہ کھولا اور فریال تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

نادر اس کو دیکھ کر حیران ہوا اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ہر وقت دوسروں کے سر پر سوار رہنے کا کیوں شوق ہے۔ نہ میرا آپ سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی ثنا کا آپ سے کوئی واسطہ، پھر بھی......“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر اس کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولا۔

فریال آگے بڑھی تو ڈرائنگ روم میں ثنا بیٹھی ہوئی تھی۔ مطمئن، شاداں اور فرحاں سی۔

”تم یہاں بیٹھی ہو، جب کہ تم نے کہا تھا کہ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو گی۔“

’’پھپھو آپ نے 10 بجے آنے کو کہا تھا۔‘‘ لفظ پھپھو سن کر نادر چونکنا سا ہو گیا۔

’’میں ان کو باجی کہنے کے بجائے شروع سے ہی پھپھو کہتی ہوں۔‘‘ ثنا نے کہا۔

’’ہاں پھپھو، میں تو آپ کا انتظار کر کر کے 10 بجے کے بعد گھر سے نکلی تھی۔‘‘

’’یہاں اس فلیٹ میں کیوں آئیں تم۔‘‘

’’نادر یہ فلیٹ خریدنا چاہتے ہیں، ان کا کوئی دوست بیچ رہا ہے۔ نادر نے کہا کہ جس نے رہنا ہے پہلے اسے تو پسند کروا دوں۔‘‘ اس کے لہجے کی خوشی زعم بھری سی تھی۔

’’فلیٹ دیکھنے کے بعد بھی تم یہاں بیٹھی ہو۔‘‘

’’نادر نے کہا کہ اتنی گرمی ہو رہی ہے، کولڈ ڈرنکس ہی پی لو۔ ابھی گلاسوں میں وہی ڈالنے تو کچن گئے تھے کہ آپ آ گئیں۔‘‘

’’پھپھو آج گرمی بھی بہت ہے ناں اور آج ہی ہمارا شام تک گھومنے کا پروگرام ہے۔‘‘

’’چلو ثنا تم بھی یہ ٹھنڈا ٹھار جوس پیو اور اپنی پھپھو کو بھی پلاؤ۔‘‘ نادر ٹرے میں دو گلاس لیے چلا آیا۔

’’آپ نہیں پئیں گے کیا؟‘‘ فریال نے پوچھا۔

’’میرا گلا خراب ہے اور یہ خوب ٹھنڈا جوس پینے کا شوق ثنا کو ہی ہے۔‘‘ وہ لگاوٹ سے ثنا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ جو انگوری سوٹ میں خوب نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ دروازے پر کھڑی مسز رحمٰن اپنے بھائی کی تمام باتیں سن رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

’’نادر، مجھے معلوم ہے کہ تمہارا گلا بالکل ٹھیک ہے اور یخ جوس کے تم کہیں زیادہ شوقین ہو، تو آج تم کو پہلے پینا پڑے گا۔‘‘

’’آپا یہ بات نہیں ہے۔‘‘ بہن کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ سا ہو گیا۔

’’بات کیا ہے، مجھے سب معلوم ہے۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھ لیا ہے کہ تم اس جوس میں کچھ ملا کر لائے ہو۔‘‘

’’آپ پاگل تو نہیں ہو گئی ہیں، کیا میں ثنا کو زہر دوں گا۔‘‘ اب وہ اشتعال بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

’’میں تو تمہاری باتیں سن کر حیران ہو رہی ہوں کہ جس کے پاس دمڑی نہ ہو، وہ یہ لاکھوں کی مالیت کا فلیٹ کیسے خرید سکتا ہے، تم پر تو اعتبار ہر سطح پر ختم ہو گیا ہے۔‘‘

’’آنٹی یہ کروڑ پتی ہیں، یہ تو ایسے ایسے کتنے ہی فلیٹس خرید سکتے ہیں۔‘‘ ثنا نے نادر کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

’’کاش یہ اس قابل ہوتے تو کیا بات تھی۔ ان کے پاس جو والدین کی طرف سے ترکے کا پیسا تھا وہ بھی اپنی عیاشیوں میں اڑا ڈالا۔

’’دیکھو ثنا ایسی ہوتی ہیں بہنیں جو اپنے بھائی کو ذلیل کریں، ارے خواہ مخواہ بدنام کر کے رکھا ہوا ہے انہوں نے مجھے۔‘‘

’’کاش تم ایسے بھائی ہوتے جس سے میری نہ سہی مگر تمہاری عزت تو ہوتی۔‘‘

گھر میں گھومتی بلی کے سامنے فریال نے شربت کا گلاس رکھ دیا۔ جسے پی کر وہ وہیں لیٹ گئی۔ آنکھیں بھی اس نے یکدم بند کر لیں۔ پتا نہیں اس نے مشروب میں کیا ملایا تھا کہ بلی فوراً ہی لم لیٹ ہو گئی۔

’’ارے یہ تو مر گئی۔‘‘ ثنا نے حیرت سے زیادہ پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

’’مری نہیں ہے، یہ صرف بے ہوش ہوئی ہو گی۔‘‘ نادر کی زبان سے نکلا۔

’’تو آپ بھی مجھے یہاں لا کر بے ہوش کرنا چاہتے تھے۔ بولیے نادر! آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں، آپ تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔‘‘

’’جو لڑکیاں ذہین اور سمجھدار ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹیاں باندھ کر چلتی ہیں وہ تو پہلے ہی بے ہوش ہوتی ہیں اور اندھی بھی۔‘‘ مسز رحمٰن کا لہجہ سفاک بھی تھا۔

مارے شرم کے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ آنٹی کی کوئی بات بھی غلط نہیں تھی، اس کا نادر پر بھروسا کیسا غلط ثابت ہوا تھا۔

’’ثنا...... میں تم سے واقعی شادی کرنا چاہتا تھا مگر یہ راہ بیلا مجھے نے سمجھائی تھی۔‘‘ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

’’بیلا کو ثنا سے کیا دشمنی تھی۔‘‘ مسز رحمٰن کی یہ حیرانی کسی صورت حل نہیں ہو رہی تھی۔

’’طاہر ہمہ وقت ثنا کی تعریف کرتے رہتے ہیں اور اس کا بے حد خیال بھی رکھتے ہیں اور یہ بات بیلا کو کسی صورت گوارا نہیں۔‘‘

’’بیلا کا مزاج تو میں جیسے درست کروں گی کہ وہ سوچ نہیں سکتی مگر نادر مجھے اب تمہاری شکل نظر نہیں آنی چاہیے۔ یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ تم اور بیلا مل کر ثنا کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے۔‘‘

’’آپا میں سچ کہہ رہا ہوں میں ثنا سے واقعی محبت کرنے لگا ہوں۔‘‘ وہ آہ بھر کر بولا۔

’’نادر، سچی محبت کرنے والے نفس کے ہاتھوں کتے نہیں بنا کرتے ہیں، تم جتنی جلدی جا سکتے ہو چلے جاؤ، یہ نہ ہو کہ میں کچھ اور کر بیٹھوں۔‘‘

’’پھپھو چلیے۔‘‘ ثنا نے شرمساری سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ آنسو جیسے کسی برکھا کی طرح ٹپک رہے تھے۔ تب فریال نے اس کا ہاتھ ایسے پکڑا جسے اپنی متاعِ حیات کو تھام لیا ہو۔

☆☆☆

توڑ دے ہر اک آس کی ڈوری، آسوں میں کیا رکھا ہے
عشق و محبت سب باتیں ہیں، باتوں میں کیا رکھا ہے
قسمت میں جو لکھا ہے وہ اکثر ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں الجھی سی ہیں، ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

اماں بھی آج بہت خوش تھیں۔ بہنوں کے سر سے بھی بوجھ اتر گیا تھا۔

عظمت بیگم نے رشتہ دیتے وقت واضح طور پر کہہ دیا کہ نگین ہمیشہ کراچی میں ہی رہے گی اور فرح ان کے پاس گاؤں میں رہے گی۔ یہ آرزو نہ صرف شجاع کی ہے بلکہ ان کی اور فرخت کی بھی ہے۔ (شجاع کا نام انہوں نے دل سے گڑھ کر کہا)

اماں بار بار فرح کو یہ باتیں بتا رہی تھیں۔ پہلے فرح اشارے سے منع کرتی رہی کہ اسے شجاع سے شادی نہیں کرنی ہے اور جب بڑی آپا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ شجاع سے شادی کرنے کے بعد تو یہ سمجھ کہ تیری لاٹری نکل آئے گی۔

تو وہ بے اختیار چیخ ہی تو پڑی۔ ’’نا...... ہی کرنی مجھے یہ شادی۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ نہیں کروں گی شادی...... ہرگز نہیں...... میں کوئی کاٹ کی گڑیا ہوں کہ جو دل چاہے میرے ساتھ سلوک کر لو...... ہرگز نہیں۔‘‘

بہنیں اور اماں اس کو یوں بولتا ہوا دیکھ کر پہلے حیران پھر خوش ہو رہی تھیں اور اسے دبوچ کر گلے سے لگا کر پیار کر رہی تھیں۔ اس کے اس طرح چلانے پر انہیں ایک خوشی ملی تھی۔

"اماں پہلے تو آپ میرے یوں منع کرنے پر ناراض ہو رہی تھیں...... اور اب میرے انکار پر اس قدر خوش ہو رہی ہیں۔" وہ حیران سی ماں اور بہنوں کا یہ تضاد دیکھ کر الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"فرح...... تیری چپ ٹوٹ گئی، تیری زبان جو ساکت ہو گئی تھی، رب کے شکر سے اس میں جان پڑ گئی۔"

"اماں میں بول سکتی ہوں۔" اب وہ واقعی خوش ہو رہی تھی۔

"بیٹا...... یہ غم...... یہ دکھ...... یہ پریشانیاں انسان پر وزن سالا دیتے ہیں مگر اب تیرا دکھ کا یہ دور ختم ہوا۔ اللہ نے چاہا تو خوشیاں تیرے دروازے پر دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گی۔"

"اماں لوگ کیا کہیں گے۔ سارے بہتان سچے ہو جائیں گے۔" وہ گلوگیر سے لہجے میں بولی۔

"پیاری فرح، لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دے۔ جب اشرف نے تجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے تو تجھے کون بچانے آیا۔ جب اقبال تجھے رسوا کر کے چلتا بنا تو کس نے جا کر اقبال کی طبیعت صاف کی۔ تو پھر...... تو ان لوگوں کی فکر کرنا چاہتی ہے جنہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کیا۔"

"اماں مجھے سوچنے کے لئے وقت دو، میں یہ فیصلہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتی۔ اب دکھوں اور غموں کے سنگ زندگی نہیں گزار سکتی۔ ان پریشانیوں نے میری زبان کو منجمد کر دیا تھا تو میرے دماغ کو بھی شل کر سکتی ہیں۔ کیا فائدہ ایسی شادی کا جہاں صرف پریشانیاں ہی ملیں اور یوں بھی نگین کے ہوتے ہوئے شجاع میرا کون سا رہے گا۔ بٹا ہوا مرد کہاں اپنا ہوا کرتا ہے جو شجاع ہو گا۔ میں کب تک کنوئیں سے کھائی اور کھائی سے کنوئیں میں گرتی رہوں گی۔"

فرح کی بات میں خاصا دم تھا۔ اماں کو اس کی بات بالکل صحیح لگی۔

"کہتی تو یہ ٹھیک ہے۔" وہ سوچ رہی تھیں۔

"اماں جو بات ٹھیک لگے، تو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" بڑی بہن نے کہا۔

"ہوں، پھر میں منع کر دوں گی عظمت آپا کو کہ فرح نے انکار کر دیا۔"

☆☆☆

آدھی رات کے سناٹے میں
کس نے فون کیا ہے مجھ کو
جانے کس کا فون آیا ہے
فون اٹھا کر یوں لگتا ہے
اس جانب کوئی گم صم، گم صم، اکھڑا، اکھڑا
دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے
سہمی ہوئی اک خاموشی ہے
گھپ خاموشی
لیکن اس خاموشی میں بھی گونج رہے ہیں
ٹھنڈی سانسیں، بارش، آنسو
خاموشی سے تھک کر اس نے سانس لیا تو

چوڑی کھنکی
اُف یہ کھن کھن
ایک لمحے میں سارے بدن میں پھیل گئی ہے
تیرے علاوہ کوئی نہیں ہے

(وصی شاہ)

اسے پہلے تو یہ لگا جیسے یہ فون نگین نے کیا ہو۔

"جلدی سے آ جاؤ شجاع، میرے پاؤں کے چھالے پھوٹ گئے ہیں اور میں تمہاری راہ تک رہی ہوں۔"

تیری یاد سے رشتہ کل بھی تھا
تیری یاد سے رشتہ آج بھی ہے

نہیں، یہ نگین نہیں ہو سکتی۔ اس کا SMS اس کے دماغ پر سنگ باری سی کرنے لگا۔ میرے قصور کی اتنی بڑی سزا بھی ہو سکتی ہے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اب وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ تو پھر یہ فون کس نے کیا ہے۔

اچانک اسے خیال آیا۔ شاید، فرح نے میرا یہ رشتہ قبول کر لیا ہو، اس کو گمان ہوا۔

نہیں، میں اس قابل کہاں ہوں کہ کوئی مجھے اچھا سمجھے اگر نگین مجھے برا شخص سمجھتی ہے تو فرح مجھے کیوں اچھا سمجھے گی۔

یوں بھی اس کے لیے میں نے کیا ہی کیا تھا۔ اس کو تو تمام تر رسوائی میرے نام سے ملی۔ تو پھر کس نے کیا مجھے یہ فون؟

کیا ہو گا کسی نے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پریشانیاں سر اٹھانے لگیں۔ تب وہ آنکھیں بند کر کے بے سدھ سا ہو کر بستر پر ڈھے گیا۔

☆☆☆

وہ اک خیال جو رہتا ہے میرے دل میں سوا
وہی خیال دم گفتگو نہیں آتا......!

"کمال ہے؟" عظمت بیگم نے حیرت سے کہا۔

ہاں شجاع بہن کی بات سن کر چپ بیٹھا رہا۔ جب اس نے گھر آ کر بتایا کہ فرح کی ماں نے شجاع کا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

"فرح کہتی ہے کہ اب اس کو شادی کے نام سے خوف آتا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہے۔ اس نے اس نام پر دھوکے ہی دھوکے کھائے ہیں۔"

"فرح یہ بھی کہتی ہے کہ میں نگین کی سوت بن کر کبھی اس گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔"

"پھر تو وہ غلط کہتی ہے۔" شجاع پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

"ٹھیک تو کہتی ہے وہ۔ کیا نگین تیری بیوی نہیں ہے۔" عظمت بیگم کو شجاع کے ہنسنے پر حیرت ہوئی۔

"مگر وہ تو کراچی میں رہتی ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے اوپر بیتنے والی صورت حال سے ماں کو کس طرح آگاہ کرے۔

’’پتر، وہ جہاں بھی رہے، کہلائے گی تو تیری بیوی ہی۔‘‘

’’وہ کہتی ہے کہ اب میں ہمیشہ کراچی میں ہی رہوں گی، تم نے گاؤں جانا ہے تو جا کر رہ لینا۔‘‘

’’یہ بات تو ہمیں پہلے ہی پتا تھی، یہ بات نئی تو نہیں ہے ناں۔‘‘

’’پھر آپ فرح کو کیوں نہیں سمجھاتی ہیں کہ میں گاؤں میں ہی رہوں گا۔ بس تھوڑے دنوں کے لیے، بال بچوں کی خیریت معلوم کرنے شہر چلا جایا کروں گا۔‘‘

’’میں پھر سوالی بن کر چلی جاؤں گی، مگر وہ مانیں تو سہی۔‘‘ عظمت بیگم کو اپنا پژمردہ سا بیٹا دکھی سا نظر آ رہا تھا۔

’’امی میں سمجھاؤں گی فرح کو۔‘‘ فرحت نے بھائی کو حوصلہ دیتی نظروں سے کہا۔

اور جب عظمت بیگم اور فرحت نے فرح کے دروازے پر اپنی جوتیاں گھس دیں اور سمجھا سمجھا کر خود ان کا اپنا دماغ آدھا رہ گیا، تب کہیں جا کر فرح نے ہامی بھری۔

شجاع سادگی سے نکاح کر کے فرح کو گھر لے آیا تھا۔ عظمت بیگم خوش تھیں اب ان کا بیٹا انہیں بڑھاپے میں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ فرحت خوش تھی، اس کے بھائی کا گھر گاؤں میں بھی آباد ہو گیا۔ مگر شجاع سوچ رہا تھا کہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور خوشی کو کیسے سجائے؟ فرح کے آنے کے بعد نگین اور یاد آ رہی تھی۔ زندگی میں کیسے کیسے موڑ آ جاتے ہیں جو کہ اس سے قبل اوجھل ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنا کھویا ہوا پیار مل جاتا ہے اور کسی کا ملا ہوا پیار بھی کھو جاتا ہے۔

جب نگین اس کے پاس تھی تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اگر وہ چلی گئی تو وہ اسے یوں بے قرار ہو کر یاد کرے گا۔

فرحت کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اماں، اور حکیم جی کی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر فرح کو سونے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں تحفے میں دے رہی تھیں۔ شجاع سجے ہوئے کمرے میں تکیے پر سر رکھے آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نگین کا چہرہ تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

تمہیں میں یاد کرتا ہوں
یہ دل آباد کرتا ہوں
تمہاری یاد جب دل میں مرے آباد ہوتی ہے
نئی اک روشنی پا کر طبیعت شاد ہوتی ہے
میں بند آنکھوں میں کچھ سپنے سجا کر بیٹھ جاتا ہوں
تمہارے قرب کی مہکار کو محسوس کرتا ہوں
تمہارے مرمریں ہاتھوں کو ہونٹوں پر لگاتا ہوں
تمہاری شرمگیں آنکھوں میں یوں ہی ڈوب جاتا ہوں
نہ میں کہتا ہوں کچھ تم سے، نہ تم اصرار کرتی ہو
تمہارے لب نہیں کھلتے مگر اقرار کرتی ہو
تصور میں تمہیں پا کر میں خود کو بھول جاتا ہوں
نئی دنیا بساتا ہوں
تمہارا ہاتھ تھامے میں افق کے پار جاتا ہوں
میں سب کچھ ہار جاتا ہوں

تمہاری بولتی آنکھیں مجھے پیغام دیتی ہیں
مگر میں کیا کروں جاناں
کہ میں تو پابہ جولاں ہوں
مگر پھر بھی یقیں کر لو کہ تم کو یاد کرتا ہوں
یہ دل آباد کرتا ہوں
میں بند آنکھوں میں کچھ سپنے سجا کر بیٹھ جاتا ہوں

(شاعرہ: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی)

☆☆☆

’’میں نے بہت سوچا اور بے حد اپنے دل کو سمجھایا، تب ہی میں یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوا ہوں کہ جب شجاع آئے گا تو میں اس سے کیے گئے وعدے کے مطابق تمہیں طلاق دے کر چلا جاؤں گا۔‘‘ ایک شام چائے کا مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے جمال نے کہا۔

’’جمال آپ کا نکاح شجاع سے نہیں مجھ سے ہوا ہے اور جب میں اس تعلق کو توڑنا ہی نہیں چاہتی تو پھر......‘‘ آنسوؤں کے گولے اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

’’نگین میں شاید وہ بدنصیب شخص ہوں جس کے مقدر میں شاید خوشیاں ہیں ہی نہیں۔ میں جو اول دن سے تم کو اپنے دل میں بسائے بیٹھا تھا، تم کو حاصل کرنا کوئی مشکل تو نہیں تھا۔ تم میرے محلے میں رہتی تھیں اور اس محلے میں ہمارا گھرانا بھی باعزت گنا جاتا تھا اگر میری والدہ میرا رشتہ لے کر جاتیں تو شاید انکار بھی نہ ہوتا مگر میری راہ میں پہلے زبور آیا اور تمہاری پسند جان کر میں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر شجاع آ گیا، اب میں مزید پیچھے ہٹ گیا، قدرت نے مجھے تم سے ملوایا بھی تو مشروط انداز میں۔ میں جو ساری زندگی اصولوں پر چلتا رہا اور وعدوں کو امانت کی طرح سنبھالتا رہا اب کیسے میں خودغرضی کا چولا پہن لوں۔‘‘

’’جمال آپ کو شاید اچھا بننے کا شوق ہے۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو اچھا کہیں، دیکھو، دیکھو یہ کتنا اچھا شخص جا رہا ہے۔ ارے دیکھو، یہ جمال کتنا اچھا آدمی ہے، ہر ایک کے کام آتا ہے۔‘‘ نگین تلخ سے لہجے میں بول رہی تھی۔

’’تم یقین کرو گی کہ میں نے کبھی زندگی میں بے ایمانی نہیں کی، کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا، کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، تو کیا اب مجھے سزا ملنے والی ہے۔‘‘ جمال اپنے لب کاٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم سے دور رہ کر میں خوش رہ سکوں گا، میرے شب و روز پرسکون ہوں گے، ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ مگر میں اللہ کا شکر گزار پھر بھی رہوں گا کہ اس نے تصور سے حقیقت تک تمہیں میرے پاس پہنچایا۔ میں تو شاید اس قابل بھی نہیں تھا کہ تم سے بیٹھ کر دو گھڑی بات ہی کر پاتا۔ اس ماہ ہم دونوں نے بیٹھ کر کتنی باتیں کی ہیں اور یہ مجھ جیسے گناہ گار شخص کے لیے زندگی گزارنے کو کافی ہوں گی۔ نگین تمہارا ساتھ شاید اتنا ہی تھا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں میں دیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

’’میں بھی اب شجاع سے نکاح کرنے کے بارے میں ہرگز نہیں سوچ سکتی۔‘‘ نگین کا لہجہ اٹل تھا۔

’’وہ کیوں بھلا؟‘‘

’’اب میں اس کے ساتھ ایمانداری سے نہیں رہ سکوں گی۔ میری روح جب آپ کے پاس ہو گی تو میں اس

کے ساتھ کیسے رہ سکوں گی، کیا کبھی کوئی بغیر روح کے زندہ ہوتا ہے۔"

☆☆☆

راستہ کیسے گزرا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ دوران سفر دونوں ہی خاموش رہی تھیں۔ ایئر ہوسٹس کے دیے ہوئے لنچ باکسز تک انہوں نے واپس کردیے تھے۔ یہ راولپنڈی سے کراچی جانے والی فلائٹ کی وہ مسافر تھیں جنہوں نے پانی تک نہیں پیا تھا۔

فریال کے اردگرد اپنے شکنجے تھے جنہوں نے اس کی سوچوں تک کو لہولہان کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر بھائیوں کو غصہ نہ آجائے، منور کچھ کہہ نہ دے، بھابیاں اسے معاف نہ کرپائیں تو...... مگر ثنا نے اسے بتایا تھا کہ گھر کے ماحول میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ دونوں بھائی اکثر اسے یاد کرتے ہیں مگر یہ تو ثنا کا کہنا تھا، اصل حقیقت کا تو وہاں جاکر ہی پتا چلنا تھا، کہیں ایسا نہ ہوجائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے۔ اگر دوبارہ اپنے گھر سے دھتکاری گئی تو جینے کا آسرا ہی ختم ہوجائے گا۔

دوسری طرف ثنا اپنی پریشانیوں میں گرفتار تھی، اس کے اعتماد اور بھروسے کے جو پرخچے اڑے تھے اس کا سارا حزن اس کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ نادر کا اصلی رنگ کتنا کراہیت آمیز تھا، وہ سوچتے ہوئے بھی جھرجھری سی لے رہی تھی۔

"اپنے بازوؤں میں لے کر ڈرائیونگ کرتا ہوا وہ اسے خالی فلیٹ میں ایسے لاابالی انداز میں لایا تھا، جیسے اس کا مقصد صرف فلیٹ دکھانے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اس کے ذہن کے کسی حصے میں یہ بات تک نہیں آئی تھی کہ وہ اسے وہاں برباد کرنے کے لیے لایا تھا اور پھر بیلا کی نفرت اس قدر گھناؤنی کہ وہ اسے پاتال میں پھینکنے کی خواہش مند تھی۔

بیلا کی باتیں ایک ایک کرکے کسی فلمی منظر کی طرح اس کے سامنے آرہی تھیں (اور وہ اپنے آپ کو خود سرزنش کررہی تھی)۔

"ثنا، تم نادر کے پاس جاؤ تو سہی وہ مر رہا ہے۔ تمہارے عشق میں مر رہا ہے۔"

تب وہ روہانسی ہوکر اس کے سرہانے کھڑی نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی تھی اور اس کے جواب میں نادر نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا تھا اور وہ دھک سے رہ گئی تھی اور پھر بارہا وہ ایسی ہی حرکات کیا کرتا تھا۔ کبھی ہاتھ پکڑ لیا، کبھی اسے چوم لیا۔ کنواری لڑکی کا جسم کسی ستار کی طرح ہوتا ہے اس کو چھیڑا جائے تو ساز خواہ کیسا بھی ہو مگر بجتا ضرور ہے اور وہ جوانی کی اس دھن پر...... اپنے آپ سے کیے بہت سے وعدے بھول بیٹھی تھی۔ کیسی نادان ہوگئی تھی وہ...... جس کا اسے احساس تک نہ تھا، شاید اسی لیے سمجھدار لوگ اپنی بیٹیوں کو جان سے لگائے پھرتے ہیں مگر کسی کے ہاں چھوڑتے نہیں ہیں۔ اگر میرے ساتھ کچھ ہوجاتا تو......

ایسی ڈاکٹری کرنے کا کیا فائدہ ہوتا، جو وہ اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ بیلا بھابی جیسی بظاہر مہذب، محبت لٹانے والی، فدا ہونے والی خواتین کتنی خطرناک ہوتی ہیں جن کو پہچاننا کس قدر مشکل ہوتا ہے اور ایسی خواتین اپنی چالوں میں اسی وقت کامیاب ہوتی ہیں جب دوسروں کو پاگل کرسکیں۔ بعد کا کام شاید آسان رہ جاتا ہوگا۔

اللہ فریال پھپھو کو سلامت رکھے جنہوں نے مجھے اندھے کنوئیں میں گرنے سے بچایا (اس کا رواں رواں اپنی پھپھو کو دعائیں دے رہا تھا)۔

کراچی ایئرپورٹ سے وہ دونوں مشینی انداز میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھیں۔ ٹیکسی آگے کی جانب بھاگ رہی تھی اور ثنا کا ذہن پیچھے کی جانب سفر کررہا تھا۔

"خدا کرے نادر تمہیں کبھی سکون کا لمحہ نہ ملے جو تم نے مجھے خوب بے وقوف بنایا۔"

"بیلا بھابی، آپ واقعی طاہر بھائی کے قابل نہیں ہیں، طاہر بھائی جیسے نیک شخص کو آپ جیسی بدعورت پتا نہیں کیوں ملی ہے؟ اللہ نہ کرے کہ کبھی کوئی آپ پر بھروسا کرے۔"

اچھی شکل وصورت کی حامل اندر سے اتنی مکروہ بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ادھر فریال کا دل جیسے حلق میں آرہا تھا۔ کتنے سالوں بعد وہ اپنے جانے پہچانے راستوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی تو اسے لگا جیسے یہ کوئی دوسرا آسمان ہو، وہ آسمان جو اسے پہچانتا ہے، اسے جانتا ہے، سارے منظر بھاگ رہے تھے مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب اس سے پوچھ رہے ہوں "فریال تم بہت دنوں بعد آئی ہو، ہم تمہارا انتظار کررہے تھے فریال تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں کردی، کوئی اپنوں سے اتنے دنوں تک دور رہا کرتا ہے؟"

تیز رفتار گاڑیاں، پھٹ پھٹ کرتے رکشے، پریشر ہارن بجاتی کوچز ایک دوسرے سے آگے جانے میں سبقت لے رہی تھیں۔

فریال ٹیکسی سے منہ نکالے سب کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے عرصے بعد اپنے بچھڑے ہوؤں کو دیکھ رہی ہو اور پھر ٹیکسی اس کے محلے میں داخل ہوگئی۔ صدور بھائی کی دکان کھلی ہوئی تھی، ہمیشہ کی طرح دو چار لوگ دکان کے سامنے کرسیاں ڈالے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ چاچا پان والے کا کیبن بھی کھلا ہوا تھا اور وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے برق رفتاری سے گاہکوں کو نمٹا رہے تھے اور پھر ٹیکسی اس کے گھر کے سامنے رک گئی۔ اس وقت گیٹ کے دونوں پٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے کوئی دونوں ہاتھ کھول کر کسی کے استقبال کو کھڑا ہو۔

"فریال آگئی، فریال آگئی۔" اس کے کانوں میں شادیانے سے بجنے لگے۔ فریال ٹیکسی والے کو پانچ سو کا نوٹ پکڑا کر باقی پیسوں کا انتظار کیے بغیر اندر کو بھاگی، رکنا اور انتظار کرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ تیزی سے اندر بھاگتی چلی گئی۔

"اماں...... اماں...... کہاں ہیں آپ؟ دیکھیے میں آگئی۔" وہ بے اختیار پکارتی چلی گئی۔ ثریا لاؤنج میں تھیں، ٹی وی ریموٹ پھینک کر آگے بڑھتے ہوئے بولیں۔

"آہستہ بولو، منہ کالا کرکے گئی تھیں تم، کوئی تمغا لے کر نہیں آئی ہو کہ ہم تمہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کریں۔" کس قدر سفاک انداز تھا کہ وہ سہم سی گئی "اور تم آئی کیوں ہو ہمارے گھر میں۔ سال ضرور گزر گئے ہیں مگر باتیں نہیں گزرا کرتیں، کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے بھائیوں نے ہمیشہ کے لیے تمہیں اس گھر سے نکالا تھا کہ تمہارے طفیل کسی برائی کے اثرات ہمارے گھر میں نہ آسکیں (ثریا کا لہجہ تضحیک آمیز تھا)۔

منور جو آج ناسازی طبع کی وجہ سے آفس نہیں گیا تھا، وہ تائی کی بات سن کر غصے سے بولا۔ "چپ کریں آپ تائی، میری پھپھو بہت عرصے بعد آئی ہے، پہلے مجھے ان سے ملنے تو دیں۔" یہ کہہ کر وہ فریال کے گلے لگ گیا۔ فریال پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شائستہ بیگم جو دوا کھاکر لیٹی تھیں رونے کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکلیں اور منور کے گلے سے لگی سسکتی فریال کو دیکھ کر روہانسی لہجے میں بولیں۔

"میری بچی...... میری فریال تجھے اپنی اماں پر ترس آگیا جو واپس آگئی۔"

"اماں اس کو ترس نہیں آیا ہے اس نے آکر ہم پر ظلم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اب بھلا اس نیچ کے یہاں آنے پر میری بیٹی ثنا کی شادی کیسے ہوگی نادر سے۔ اللہ نہ کرے کہ کسی کو فریال کے بارے میں علم ہو، مجھے تو خوف ہے

کہ کہیں وہ راستہ نہ بدل دیں جب انہیں یہ پتا چلے کہ فریال جیسی بدقماش لڑکی ثنا کی پھوپھی ہے۔"

"امی پلیز خاموش ہو جائیں آپ...... آپ کی کہی ہوئی باتیں تو تھیں جو بعد میں آپ کی اولاد کے سامنے آئیں۔" ثنا جو اپنے آپ کو سنبھالنے میں چند لمحے کے لیے دروازے پر رکی رہی تھی۔ وہ چیختے ہوئے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا بک رہی ہے تو، تیرا اور فریال کا بھلا کیا مقابلہ، کہاں زمین کہاں آسمان۔"

"امی، فریال پھپھو تو نکاح کرنے کے بعد گئی تھیں، انہوں نے غلط طریقہ ضرور اپنایا تھا مگر کوئی غلطی انہوں نے نہیں کی تھی اور یہ نادر نکاح سے پہلے ہی میری دھجیاں اڑانا چاہتا تھا، وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے مجھے ایک خالی فلیٹ میں لے گیا تھا۔"

"کیا بک رہی ہے تو؟ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا، کیا واہی تباہی بولے چلی جا رہی ہے۔" ثریا نے لتاڑا۔

"امی اگر فریال پھپھو نہ ہوتیں تو آپ کو اپنی بیٹی کی صرف زندہ لاش مل پاتی۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئی، تیرا بھلا فریال سے کیا تعلق؟"

"امی محبت بھرے ڈائیلاگز اور سنہرے خواب ایسے جال ہوتے ہیں جس میں بے وقوف تو کیا سمجھدار لڑکیاں بھی بہ آسانی پھنس جاتی ہیں اور آپ کی یہ بیٹی بھی ایک ایسے ہی جال میں پھنس گئی تھی۔" اب ثنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ تو پاگل ہو گئی ہے، کیسی عجیب باتیں کر رہی ہے۔"

"شاید میرا وہ حال ہوتا کہ میں اس بارے میں سوچوں تو تھرا جاتی ہوں۔ امی میں تو پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی مگر فریال پھپھو کسی مسیحا کی طرح مجھے بچانے آ گئیں۔ امی آپ کو تو پھپھو کا احسان مند ہونا چاہیے جنہوں نے آپ کی بیٹی کی عزت بچائی۔"

"مگر بیٹا، رحمان صاحب اور ان کی فیملی بے حد شریف لگ ہیں۔" ثریا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔

"ہاں واقعی بے حد اچھے لوگ ہیں مگر ان کی بہو اور ان کا بھائی شیطانوں کے چیلوں میں سے ہیں اور امی بہت اچھے لوگوں پر بھی کلی بھروسا نہیں کرنا چاہیے، کم از کم اپنی لڑکیوں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں کرنا چاہیے، برا یا گھر برا یا ہی ہوتا ہے۔"

"تجھے ہی شوق تھا کہ ڈاکٹر بنوں گی، وہاں رہ لوں گی ورنہ میں نے تجھے کب اپنے سے الگ کیا ہے۔"

"کیا ماؤں کو اپنی بیٹیوں کی ہر بات مان لینی چاہیے؟ کیا کوئی بیٹی غلط فیصلہ نہیں کر سکتی؟" ثنا بول رہی تھی۔

فریال ششدر سی اس کو دیکھ رہی تھی اور شائستہ بیگم کے دماغ میں تو جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا ہو گیا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ ان کا نحیف سا وجود کچھ بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

"فریال مجھے معاف کر دو، تم نے میری بیٹی کو بچایا۔" اب ثریا، فریال کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے رو رہی تھیں اور ان کا سارا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔

"میں نے اپنی بھتیجی کو بچایا، آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

"امی یہ پھپھو کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں، بہت بڑی بوتیک کی مالک ہیں بلکہ پنڈی کی معروف شخصیات میں شامل ہیں جن کے ڈیزائن کیے ملبوسات معروف شخصیات پہن کر فخر کرتی ہیں۔"

"یہ تم کو کہاں سے مل گئی؟" ثریا اب پوچھ رہی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے بچانا تھا اور انہیں اپنے گھر میں آنا تھا اس لیے سب سے پہلے ہم دونوں ملے۔"

اب شائستہ بیگم اپنے دونوں ہاتھوں میں فریال کا چہرہ تھامے بے اختیار چوم رہی تھیں۔ "میری دعائیں تجھے لے آئیں ورنہ شاید تیرا انتظار لے کر ہی عدم کی راہ لیتی۔"

فریال اپنی ماں کی بانہوں کے حلقے میں یوں کھڑی تھی جیسے وہ ممتا کی برکھا میں نہا رہی ہو۔ صابرہ اور منور چپ چاپ کھڑے تھے، ایک لفظ بھی ثنا کے لیے ان کے منہ سے نہیں نکلا۔

ثریا کی ہفتہ بھر پہلے صابرہ سے کسی بات پر خاصی لڑائی ہوئی تھی جس کے بعد سے صابرہ نے ثریا سے بات کرنی بند کر دی تھی۔ ثریا نے کانی نظروں سے صابرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری معصوم سی بچی خواہ مخواہ بدنام ہو گئی اب لوگ تو ذرا سی بات کو کوٹھوں پر چڑھا ئیں گے، کیسے ہو گی میری بیٹی کی شادی۔ بدنام ہوئی لڑکی کو کوئی نہیں تھوکتا۔"

"مجھے تو کسی سے شادی ہی نہیں کرنی اس لیے آپ میری فکر میں پریشان نہ ہوں مگر آئندہ کبھی کسی پر بہتان نہ رکھیں کہ بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔" ثنا دکھے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "کاش آپ نے فریال پھپھو کو صلواتیں نہ سنائی ہوتیں، ان کو برا بھلا نہ کہا ہوتا، دادی کے کلیجے میں گھاؤ نہ ڈالے ہوتے تو شاید میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہوتا۔ یہ میرا یقین ہے کہ دکھے دل کی آہیں ضرور لگا کرتی ہیں۔ امی آپ نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"نادر کی ہمت کیسے ہوئی ایسا کچھ سوچنے کے لیے۔" ثریا دانت کچکچا کر کہہ رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نادر کو دیکھ کر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیں۔ وہ برداشت ہی نہیں کر پا رہی تھیں کہ ان کی بیٹی کے ساتھ ایسے ناسازگار حالات بھی ہو سکتے ہیں۔

"امی ایسی ہستیں ناعاقبت اندیش لڑکیاں ہی پیدا کرتی ہیں۔ نامحرم سے اگر تنہائی میں ملنے کو منع کیا گیا ہے تو اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، مگر جوانی واقعی اندھی ہوتی ہے اور اندھوں سے کسی صحیح راستے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔"

"کس قدر بدنصیب ہے تو ثنا، تجھ جیسی سمجھدار اور ذہین لڑکی بھی پاگل بن گئی۔" ثریا پھر سینے پر دوہتڑ مار کر رونے لگیں۔

"چپ ہو جاؤ ثریا، بات کا بتنگڑ مت بناؤ، ایسا کچھ ثنا کے ساتھ نہیں ہوا جو تم یوں کہہ رہی ہو۔" شائستہ بیگم نے سمجھایا۔

"میں نے تو اپنے میکے میں نادر کی ثنا کے ساتھ شادی کے ڈھیروں نقشے کھینچ دیے تھے کہ سننے والوں کے چہرے بھی بجھ سے گئے تھے۔ اب سب میری بھاوجیں چڑھ چڑھ کر آئیں گی اور میرا مذاق اڑائیں گی کہ ثنا کی شادی نادر سے کیوں نہیں ہو رہی تو میں کیا جواب دوں گی۔ نادر کا اونچا مجسمہ سب کے سامنے میں کیسے توڑ سکوں گی اور پھر یہ بات کوئی معمولی تھوڑی ہے جو چھپی رہ جائے گی...... سب ثنا پر تھو تھو کریں گے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوئیں گا...... بول کے......" صابرہ نے آگے بڑھ کر ثنا کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو تو خواہ مخواہ کی پریشان ہونے کی عادتاں ہیں ناں۔ آپ اپنے میکے والوں کو بول دیو کہ ثنا کی شادی اب منور کے سنگات ہو گی۔" صابرہ نے دھماکا کیا۔ منور نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

"صابرہ اس وقت میں مذاق برداشت نہیں کر سکتی، اس وقت مجھ میں بالکل سکت نہیں ہے کہ تمہاری تمسخرانہ باتیں سہہ سکوں۔" ثریا نے کہا۔

"مزاخ کون کر رہا ہے آپ سے، بھابی پاشا فکر اور صدمے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ناں، میں تو اس مسئلے کا حل ڈھونڈ کے بیٹھی۔" پھر وہ منور سے بولی۔ "تم کو کوئی ایک اچ اعتراض ہو تو بول دیو بیٹا۔" صابرہ نے ثنا کو دیکھتے

ہوئے کہا۔ جو دادی کے پیچھے سمٹی چلی جارہی تھی۔ منور نے نفی میں گردن ہلا دی اور ثنا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

”دیکھ لیا ناں بھابی جان آپ نے، میرے بیٹے کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب آپ بول دیو، منور آپ کو پسند ہے یا نہیں؟“

”مگر صابرہ منور کی تو منگنی ہو چکی ہے رعنا کے ساتھ۔ رعنا تمہاری بھانجی ہے، تم اگر وہ منگنی توڑو گی تو خواہ مخواہ تمہاری بہن کا دل خراب ہوگا۔“

”تم کو منور پسند ہے یا نہیں۔“ صابرہ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”منور کس کو ناپسند ہو سکتا ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اس میں، ایسے بیٹے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں صابرہ۔ میں تو بچپن سے اس کو دیکھ رہی ہوں، میرے سامنے اتنے سے اتنا ہوا ہے، اس سے محبت کیوں نہیں ہوگی مجھے۔“ ثریا ستائشی نظروں سے منور کو دیکھتے ہوئے کہہ بیٹھیں۔

”برابر بولے آپ۔ یہی سوب میں بھی ثنا کے بارے میں سوچتی ہوں، میرے سامنے ہوئی تھی ناں یہ۔ میں نام رکھی تھی اس کا۔ ڈاکٹر اس کو سوب سے پہلے میری گود میں دی تھی، میرے سامنے پلی بڑھی ہے یہ...... اپنی بچی کو دیکھ کر میں اپنے کو دکھی سمجھتی ہوں ناں، میرے کو ثنا تم دے دیو، ورنہ میرے سوب ارماناں مٹی میں مل جائیں گے۔ رعنا کا انتخاب شاید میں غلط کرلی تھی۔ جب اپنے گھر میں لڑکی تھی تو باہر اچ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رعنا کے رشتے تو ابی بھی بہوت آتے...... اس کو منور سے اچھا مل جائیں گا۔ مگر تم میرے منور کے لیے یہ پیاری سی ثنا میرے کو دے دیو۔“ صابرہ کا لہجہ ملتجی تھا۔

”صابرہ ٹھیک کہہ رہی ہے، تم اپنے دل و دماغ سے ہر پریشانی مٹا کر اس کی بات مان لو مگر سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرو، ہماری ثنا ہمارے پاس آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی اور ماں کے دل میں وہ برچھیاں نہیں لگیں جو اولاد کی ناگہانی جدائی میں ہر ماں کے لگا کرتی ہیں۔“ شائستہ بیگم ثریا کے آنسو اپنے آنچل میں سمیٹتے ہوئے بولیں۔

”اماں جان، پہلے آپ مجھے معاف کردیں، اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میں اپنے آپ سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“ اب ثریا، شائستہ بیگم کے پیر پکڑے رو رہی تھیں۔ تب شائستہ بیگم نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

”میں جتنی محبت فریال اور سائرہ سے کرتی ہوں اتنی ہی محبت مجھے اپنے پوتا، پوتی سے بھی ہے۔ یوں بھی اولاد کی اولاد، اولاد سے زیادہ پیاری ہوتی ہے اور ثنا کو تو یوں بھی میں اپنی تیسری بیٹی سمجھتی ہوں اور یہ مجھے دل سے عزیز ہے۔ جو ہوا برا ہوا...... مگر بری باتوں کو بھول جاؤ اور اچھی باتوں کو یاد رکھو۔ خبردار جو آج کے بعد نادر کے حوالے سے کوئی بھی بات اس گھر میں دہرائی جائے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ایک برے شخص سے ثنا کی جان چھوٹی۔ ایسے برے شخص کا ذکر تو کیا حوالہ بھی کوئی نہ دے۔ اب صابرہ کو دیکھو، کیسی اچھی بچی ہے جسے اپنی ثنا سے کیسی محبت ہے۔ جو ثنا کے لیے دل میں اچھے جذبات رکھتی ہے۔ دیورانیوں، جٹھانیوں میں سدا سے مقابلے کا رشتہ ہوتا ہے مگر آفرین ہے صابرہ پر، وہ ہمیشہ گھر کو گھر سمجھ کر رہی۔ انسان ہونے کے ناتے تو غلطیاں سب سے ہی ہو جاتی ہیں مگر صابرہ میں خوبیاں واقعی بہت زیادہ ہیں اور عزیز داری بھی وہی ہوتی ہے جب دوسرے کے غم اپنے دکھ لگیں اور دوسروں کی خوشیاں اپنی خوشیاں لگیں۔ یاد رکھو محبت کے بغیر ہر خوشی تشنہ ہے اور زندگی کا لطف بھی محبتوں کے سنگ آتا ہے اور جب آپس میں بے لوث محبت ہو تو ہر ایک کو بہت اچھا لگتا ہے اور زندگی کا سفر مزید خوبصورت ہو جاتا ہے۔ یہی محبت کی خوشبو اس میں نکھار سا پیدا کر دیتی ہے اور ساتھ رہنے کا مزہ بھی خوب آتا ہے، جو اکیلے رہنے والے اس خوشی کو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں دادی آپ، محبت تو ملٹی وٹامن ہوتی ہے، اس میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“ منور نے مسکرا کر ثنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ثنا چپ رہی، منور کی بات سن کر ہمیشہ کی طرح تڑاخ سے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔

”کیوں ڈاکٹر صاحبہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔“ منور نے اس کو بولنے کے لیے اکسایا۔

”ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ وہ دھیمے سے لہجے میں سادگی سے بولی۔

”ماشا اللہ...... بہت خوب...... بڑی فرمانبردار اور تابعدار ثابت ہوں گی محترمہ۔“ وہ لفظ چبا چبا کر اس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تب وہ شرمیلی سی ہنسی ہنستی ہوئی اپنی فریال پھپھو اور دادی کا ہاتھ تھامے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

بعض اوقات انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جو ہوا کے جھونکے، بارش کی بوند، صحرا میں پانی کے قطرے اور پھول کی آخری پتی کی طرح ہوتے ہیں لیکن جب ہوا کا جھونکا گزر جاتا ہے، بارش کی بوندیں برس جاتی ہیں، دھنک کا رنگ پھیکا ہو جاتا ہے اور پھول کی آخری پتی بھی جھڑ جاتی ہے تو انسان کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کی سب سے وفادار ساتھی تنہائی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ تنہائی ہر وقت ساتھ رہنے کے باوجود طمانیت کا کوئی لمحہ عطا نہیں کرتی۔ کچوکے مار مار کے سینہ چھلنی سا کر دیتی ہے، اللہ نہ کرے کہ کبھی کسی کی دوستی صرف تنہائی سے ہو۔

شجاع کے طلاق دینے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بھرے مجمع میں تنہا محسوس کیا تھا۔ کشور تائی کی ہمت افزا باتیں بھی شاں شاں ہو کر دماغ پر سے اڑ جاتی تھیں۔ فہمی باجی کے دلاسے بھی میرے کھولتے ہوئے ذہن پر چھڑکاؤ کرنے سے قاصر تھے۔ احمد جمال سے میرا نکاح شجاع کی ضد، کشور تائی کے اصرار اور فہمی باجی کے دباؤ کی وجہ سے ہوا، ورنہ میں کسی صورت نکاح کرنے کی خواہش مند نہ تھی۔ فہمی باجی کو تو شاید میں سمجھا بجھا بھی لیتی...... مگر...... کشور تائی میرے لیے بزرگ کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان کا کہا ٹالنا میرے لیے خاصا مشکل تھا۔

احمد جمال کے ساتھ جب نکاح ہوا تو ہم دونوں اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ فارم ہاؤس سے جب ہم اپنے فلیٹ پہنچے تو تائی نے مجھے بتایا کہ حلالہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس سے نکاح کیا جائے اس سے ازدواجی تعلق بھی قائم رکھا جائے۔

”تائی میں نے اس سے قبل ایسا سنا تو نہیں تھا۔“

”تمہاری دینی تعلیم نہیں ہے اس لیے تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔“

”یہ عورت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ وہ تعلق جوڑے اور توڑے...... میں پریشان سی ہو گئی تھی۔“

”جب ہی تو طلاق دینے کا عمل پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔“

”تائی میں تو بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔“

”اب شرعی اصولوں کو تمہاری آسانیوں کے حساب سے تبدیل تو نہیں کیا جا سکتا۔“

”پھر میں کیا کروں؟ اس کا کوئی آسان سا حل بتائیے۔“

”احمد جمال بہت اچھا ہے تم اس سے طلاق مت لو، بے شک شجاع سے میری رشتہ داری بھی ہے اور وہ بھی کوئی برا شخص نہیں ہے مگر مقابلتاً احمد جمال ہر لحاظ سے شجاع سے بہت بہتر ہے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ اس کی

آنکھوں سے محبت کی نرم نرم پھوار برستی میں بارہا دیکھ چکی ہوں۔“

میں تائی کی باتیں سن کر مزید الجھ سی گئی تھی۔ پریشانیوں کا گراف بھی بڑھ رہا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں زندگی کے بہت سارے تجربے ہوئے۔ پتا نہیں زندگی نے ان تمام تجربوں کے لیے اسی کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ زیور زندگی کے کسی بھی موڑ پر خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا شمار شاید ان مردوں میں تھا جو ہمیشہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ شجاع ہمیشہ کا جلد باز تھا۔ لوگ صحیح فیصلہ کرنے میں بھی وقت لیتے ہیں اور سوچ بچار سے کام لیتے ہیں مگر وہ کوئی غلط فیصلہ کرنے میں بھی لحہ نہیں لگاتا تھا۔

غصہ جن لوگوں پر ہمہ وقت سوار رہتا ہو وہ اپنی غلط بات کو بھی ہمیشہ صحیح سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا جس طرح عرصہ پانچ سال سے ہر غلط بات پر سر جھکاتی چلی آئی ہوں، زندگی کے ہر فیصلے میں میری ہمیشہ یہی روش رہے گی۔ احمد جمال سے نکاح کے بعد میں نے یہ جانا کہ ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو سی پھیل جاتی ہے اور دھنک کے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہو جاتے ہیں اور ڈالیوں پر پھول جھومنے لگتے ہیں۔ محبت کے آ جانے سے احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں ہوا بہنے لگتی ہے۔ تب میں نے سوچا میرے اور میرے بچوں کے لیے احمد جمال محبت کا ایسا سائبان ہوگا جس کے تلے بیٹھ کر مجھے زندگی اچھی لگے گی۔

احمد جمال ایک نیک اور سچا آدمی ہے جسے اپنے وعدوں کا پاس بھی امانت کی طرح تھا۔ اس نے شجاع سے یہ ضرور کہا تھا کہ میں تمہارے کہنے پر نگین کو طلاق دینے پر تیار ہوں۔ ایسی صورت حال کے لیے میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ دوبارہ شجاع سے نکاح ہرگز نہیں کروں گی اور اپنے بچے خود پالوں گی اور اس طرح پالوں گی کہ بے شک وہ بڑے آدمی نہ بنیں مگر اچھے انسان ضرور بنیں۔ مگر اللہ کو مجھ پر رحم آیا اور زندگی نے کچھ اس انداز سے کروٹ لی کہ شجاع نے گاؤں میں فرحت سے شادی کر لی اور گاؤں سے آ کر جب جمال سے یہ کہا کہ اگر تم نگین کے ساتھ اپنا نکاح برقرار رکھنا چاہتے ہو تو رکھ سکتے ہو اگر نہیں تو میں نگین سے شادی تو ضرور کر لوں گا مگر مستقل اس کے پاس شہر میں نہیں رہ سکوں گا۔ اب میں گاؤں میں رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کے دکھ کم کرنا چاہتا ہوں جس کی تمام پریشانیوں کی ایک وجہ میری ذات بھی ٹھہری ہے۔

”پیارے دوست میں تمہارا احسان مند رہوں گا کہ تم نے مجھے اپنے وعدے سے آزاد کیا مگر ایک التجا ضرور کروں گا۔“ احمد جمال لجاحت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”ہاں، بولو۔“ شجاع اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا بولا۔

”اپنے بچے ہمیں دے دو، بچوں کے بغیر نگین نہیں رہ سکتی۔“

شجاع نے ایک نظر بچوں کو دیکھا جو اس کے کمرے میں بیٹھے اس کی چیزوں کا تیاپانچا کر رہے تھے اور اپنے اس شغل میں وہ اتنے دھت تھے کہ باپ کو مسکرا کر دیکھنے کے بعد اسی کام میں جت گئے تھے۔

”لے لو بچے...... شاید میری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کچھ ازالہ ہی ہو جائے۔“ شجاع نے اپنے آنسو اپنے اندر ہی پی لیے۔ بچوں کو سینے سے لگا کر پیار کرنے کے بعد اس نے احمد سے کہا ”احمد باؤ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں نگین سے دو باتیں کر لوں۔“ احمد جمال اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

نگین چپ چاپ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار ہاتھ سے گر کر کمرے میں اڑ رہا تھا، پانی کا گلاس بھی لڑھک کر اس کے پیروں میں پڑا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا نگین کہ تمہارا اصل قصوروار میں ہی ہوں۔“ وہ دوزانو قالین پر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”میں نے بہت کوتاہیاں کی ہیں، پلیز مجھے دل سے معاف کر دینا۔“ وہ خاموش بیٹھی تھی مگر آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آنسوؤں کا پرنالہ کیوں بہہ رہا ہے۔

”میں جانتا ہوں احمد باؤ بہت اچھے انسان ہیں، وہ ہر ایک کی عزت کرتے ہیں، وہ ایسے انسان کی بھی عزت کرتے ہیں جو خود کو عزت کے قابل نہ سمجھے۔ یہ بات میں تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے شخص کی بھی عزت کی۔ یہ بات مجھے بہت دیر میں سمجھ آئی ہے کہ محبت سے پہلے عزت کرنی ضروری ہے اور یہ عزت ہر رشتے کے لیے ضروری ہے۔ ہر دوستی کی پہلی شرط ہے، ہر ناتے کا پہلا پڑاؤ یہی ہے۔ دوسروں کی عزت کرنے والے لوگ اللہ کے بھی پسندیدہ بندے ہوتے ہیں۔“

”شجاع تم بھی مجھے معاف کر دینا کہ انسان ہونے کے ناتے غلطیاں مجھ سے بھی ضرور ہوئی ہوں گی۔“

”نگین یہ میرا یقین ہے کہ احمد باؤ کے ساتھ تم بے حد خوش رہو گی لیکن......“ وہ کچھ دیر کے لیے رکا ”اگر تم نے زندگی کے کسی موڑ پر بھی مجھے پکارا تو میں فوراً بھاگ کر تمہارے پاس آؤں گا۔ تم کبھی اپنے آپ کو بے یار و مددگار مت سمجھنا۔“ شجاع کی اس بات کا نگین پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر بچوں کے پاس آیا اور انہیں خوب پیار کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور اس لمحے نگین کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ آنسوؤں کی روانی بڑھ گئی تھی اور اس کا دل اس نہج پر سوچ رہا تھا کہ کہیں میرے بچے یتیم تو نہیں ہو گئے۔ شجاع کیسا بھی تھا ان کا سگا باپ تھا۔ کیا زندگی کے کسی موڑ پر یہ اپنے باپ کی کمی تو محسوس نہیں کریں گے۔ اب تک جو میرا جیون گزرا تھا۔ زندگی کے مختلف ادوار میں مجھے زیور اور شجاع اچھے لگے تھے، پیارے محسوس ہوئے تھے مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ کتنی عجیب بات ہے جو ہمیں اچھا لگتا ہے وہ حقیقت میں بعض دفعہ بہت برا ہوتا ہے۔ ہر شخص کو پہچان لینا اور ہر ایک کے چہرے سے اس کے دل کا حال پڑھ لینا بہت مشکل ہے، بعض لوگ پہچاننے میں ہی نہیں آتے۔

”اللہ کرے کہ جمال ویسے ہی نکلیں جیسے کہ میں انہیں سمجھ رہی ہوں۔“ وہ چپ چاپ بیٹھی سوچ رہی تھی۔ شجاع کو گئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ تب جمال کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ انہوں نے اس کے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نگین تم اور بچے میری زندگی میں خوشی بن کر آئے ہو۔ میرے بارے میں تم کبھی یہ سوچنا بھی مت کہ میری ذات سے تمہیں یا بچوں کو کبھی کوئی تکلیف یا پریشانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو مجھ سے ملایا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے جو مجھ جیسے شخص کو ملا ہے۔ ہم بہت جلد کینیڈا چلے جائیں گے اور ہماری زندگی کا سفر یقیناً بہت خوبصورت ہوگا کہ چاہنے والے تو اللہ کے فضل سے ملا کرتے ہیں۔“ تب اس کے مضبوط ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بھی مسکرا دی۔

محبت اور یقین وہ طاقتور احساس ہیں جو موسم کے بدلنے پر بھی قادر ہیں۔ جمال کی گہری اور پرنور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ ان کی ہر بات کا یقین بھی ہے۔ مگر ایک کھٹک سی اس کے دل میں ہے کہ ایک محلے میں رہتے ہوئے وہ دونوں بہت آسانی سے ایک ہو سکتے تھے، ان دونوں کی منزل ایک ہی تھی مگر یہ منزل کتنی کٹھنائیوں کے بعد ملی۔ ہے ناں۔

......**ختم شد**......

"انجم انصار" کی دیگر کتب

★ چاندنی	(ناول، دوسرا ایڈیشن)
★ رنگ چاہت کے	(افسانوں کا مجموعہ)
★ کوئی جگنو ہو	(افسانوں کا مجموعہ)
★ پردے میں رہنے دو	(طنز و مزاح)
★ جلترنگ-94	(طنز و مزاح)
★ شوخیٔ گفتار	(طنز و مزاح)
★ جلترنگ	(طنز و مزاح)
★ چلتے چلتے	(طنز و مزاح)
★ شوشا	(طنز و مزاح)
★ حسینوں کے خطوط	(طنز و مزاح)
★ دل کے آس پاس	(طنز و مزاح)
★ کراچی سے کینیڈا تک	(سفرنامہ، زیر طبع)
★ جیک	(سفرنامہ، زیر طبع)
★ بساطِ دل	(افسانوں کا مجموعہ، زیر طبع)
★ شوشا	(طنز و مزاح، دوسرا ایڈیشن، زیر طبع)

★★★

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام